نمازِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مُدلّل، مُفصّل، مکمّل، مُحشّی

تالیف
مُفتی محمد اسماعیل طورو

ادارہ الدلیل ٹرسٹ

اس عظیم ذات کے نام جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا

نماز نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مؤلف

مفتی محمد اسمٰعیل طورو

ایم اے اسلامیات و عربی (پشاور یونیورسٹی)

ڈپلومہ ان اسلامک اکنامکس اینڈ پولیٹیکل سائنسز (کراچی)

ناشر

ادارہ الدلیل ٹرسٹ

جامع مسجد اقصیٰ سکیم نمبر 7 ریلوے ہسپتال نزد پاسپورٹ آفس، راولپنڈی

http://muftiismailtoru.com

www.islaminpak.info

cell: 03350290786,03114440006

نام کتاب: نماز نبوی ﷺ

مؤلف: مفتی محمد اسمٰعیل طورو

طبع: سوم

تاریخ اشاعت: 2019ء

زیر اہتمام: ادارہ الدلیل ٹرسٹ، راولپنڈی

کمپوزنگ، فارمیٹنگ: محمد حنیف اسلام آباد: 0311-5322830

فہرست مضامین

عرض مؤلف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ان الحمد للہ، نحمدہ ونستعینه ونستغفرہ، ونعوذ باللہ من شرور أنفسنا، ومن سیئات أعمالنا، من یھدہ اللہ فلا مضل له، ومن یضلل فلا ھادي له، وأشھد أن لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک له، وأشھد أن محمدًا عبدہ ورسوله.

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ[1]﴾

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا[2]﴾

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا[3]﴾

أما بعد ... فان أصدق الحدیث کتاب اللہ، وأحسن الھدي ھدي محمد (ﷺ) وشر الأمور محدثاتھا، وکل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة، وکل ضلالة في النار.

نماز سنت طریقے سے پڑھنے کے حوالے سے دو طرفہ علمائے کرام نے مختلف تحقیقی اور تفصیلی کتابیں لکھی ہیں لیکن تمام کتابوں میں اگر ایک غلطی نہ ہوتی تو یہ قابل قدر خدمت تھی اور امت کی لئے خیر کا ذریعہ تھا، پہلی کوتاہی یہ ہوئی کہ ہر ایک نے یہ کہا کہ ہماری یہ نماز (جس کو ابھی ہم مدلل پیش کر رہے ہیں) عین سنت کے مطابق ہے، اور دوسروں کی جو نماز ہے وہ سنت کے بالکل خلاف ہے، اور اس پر بحث، مناظرے، لڑائی، جھگڑے، عدالتی کیس، یوٹیوب، فیس بک وغیرہ کا بازار غیر ضروری

---

[1] سورۃ آل عمران: 102

[2] سورۃ النساء: 1

[3] سورۃ الاحزاب: 70-71

بحث و مباحثے سے گرم ہیں ، آج کے اس پرفتن دور میں پابندی سے نماز پڑھنے والوں کی تعداد تین فیصد بھی نہیں لیکن وہ بھی پریشان ہے کہ ہماری نماز کو دوسرا طبقہ سنت کے خلاف کہہ رہا ہے، تو ہم کہاں جائیں ؟ اور جو نہایت اہم کام ہے کہ 97 فیصد لوگوں کو نمازی بنایا جائے ، اس کی کوئی فکر نہیں کرتا ، جب 1200 سال کے ائمہ حدیث وفقہ ، محدثین اور فقہاء دو طرفہ مؤقفوں پر خوب علمی تحقیقی مباحث کر کے اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ دو طرفہ نماز قرآن وسنت کے عین مطابق ہے تو آج ہم کیوں بحث کو دوسری طرف لے جا رہے ہیں۔

چنانچہ آپ ترمذی او رابو داؤد اٹھا کر دیکھئے، شروع تا آخر پڑھیں، دونوں طرف ایک موقف ہوتا ہے ، مثلاً خون سے وضوء ٹوٹتا ہے یا نہیں ، آمین آہستہ یا اونچی آواز سے وغیرہ وغیرہ ، دونوں طرف دلائل ہوتے ہیں، دونوں طرف صحابہ اور تابعین ہوتے ہیں، بلکہ خود بخاری شریف میں 13 مسائل ایسے ہیں جو احناف کے خلاف جاتے ہیں اور 70 مسائل ایسے ہیں جو غیر مقلد احباب اور بزرگوں کے خلاف جاتے ہیں اور یہ برا نہیں ہے یہ فروعی مسائل کا اختلاف صحابہؓ کے زمانہ سے چلا آرہا ہے ، اور یہ اختلاف فروعی، فقہی اور فطری ہے۔ لہٰذا اس میں مناظرے ، تنقید و تعریض ، تکذیب وتردید ، تفسیق اور کسی کی تذلیل وقت کے ضیاع کے علاوہ کچھ نہیں ، اور وہاں کے کفر او ریہاں کے نفاق والے لوگ اس اختلاف سے خوش ہوتے ہیں اس لئے کہ اس سے خلافت کا راستہ دور ہو جاتا ہے، کافر دیار غیر میں اور بے دین اپنے دیار میں حکومت کرتے ہیں اور کر رہے ہیں ، اور مولوی ان باتوں پر لڑتے ہیں جن پر لڑنا بے وقوفی ہے ، اور یہ 1800 کے بعد کا کھیل ہے ، چنانچہ ہم سب کے متفقہ اکابر واسلاف علامہ ابن تیمیہ ، علامہ ابن القیم ، علامہ کشمیری اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بار بار اپنے کتابوں میں کہہ چکے ہیں کہ " اللہ اکبر " سے لیکر " سلام " تک کے دو طرفہ دلائل موجود ہیں ، دونوں طرف کے ائمہ اور علماء کی قدر ہم پر لازم ہے۔

تاہم یہ درست ہے کہ جو باتیں ایسی ہیں جو قرآن وسنت سے ثابت نہیں ہے تو اس پر لکھا جاتا ہے جیسے زبان سے نیت سنت سمجھ کر کرنا بدعت ہے ، چنانچہ حنفی فقہ کی کتاب " فتاوی ہندیہ " میں ہے کہ

زبان سے نیت کا اعتبار نہیں ہے " ولا عبرۃ للذکر باللسان" (ج:1/ص:1) نیت دل کی چیز ہے۔ اور جیسے کانوں کی طرف ہاتھ لیجاتے وقت اس کو کانوں کے ساتھ لگانا اور زبان سے نیت نہ فرض ہے اور نہ واجب ہے نہ سنت ہے بلکہ عام آدمی کے لئے مستحب بھی نہیں ہے اور جیسا کہ فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا بلند آواز سے آمین، آمین کہکر پابندی سے بدعت ہے، اور لوگ اس میں مبتلا ہیں یا اپنے آپ کو اہل حدیث کہنے والا داڑھی کاٹے تو یہ غلطی افراد کی ہے نہ حدیث کی ہے نہ فقہ کی، اسی طرح اگر کوئی اس پر لکھتا ہے کہ جنازے میں سورہ فاتحہ پڑھو یہ سنت ہے یہ حدیث میں بھی ہے اور فقہ میں بھی، لیکن یہ پڑھنا واجب نہیں ہے، اور بطور دعاء کے ہے نہ کہ بطور قراءت کے اور اس طرح تشہد میں انگلی اٹھانا تو ہے لیکن پھر رکھنا نہیں ہے بلکہ نیچے کی طرف مائل کرنا ہے (رفع السبابہ لملا علی قاری) وغیرہ وغیرہ یعنی فروعی مسائل پر لڑائی کے انداز میں لکھنے کے بجائے حکمت کے ساتھ نرمی کے ساتھ اپنے مؤقف پر لکھنا درست ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ گالم گلوچ سے بچکر اگر شرک، بدعت اور عقائد کی اصلاح پر لکھا جاتا اور زور دیا جاتا تو اچھا ہوتا۔

ہماری اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ اس موضوع پر جتنی کتابیں لکھی گئی تو اس میں یکطرفہ مؤقف سامنے رکھا گیا اور اس کی تصحیح کی گئی جبکہ ہم نے دو طرفہ مؤقف کو سامنے رکھا اور ساتھ ساتھ یہ اعلان کیا اور کرتے رہیں گے کہ دو طرفہ نماز قرآن وسنت سے ثابت ہے جبکہ بہت ساری کتابوں میں کئی کئی صفحات اس پر لکھے جاتے ہیں کہ سنت اصل چیز ہے اور سنت کے مطابق نماز پڑھنی چاہیئے، اور قرآن وحدیث پر چلو اور آخر میں یہ لکھا جاتا ہے کہ خون سے وضو نہیں ٹوٹتا اور آمین اونچی آواز سے کہو، استغفر اللہ جو چیز اتفاقی ہے اس پر پورے مضمون کو فٹ کیا جاتا تو اچھا ہوتا لیکن جس میں اختلاف ہے تو وہاں پر اختلاف استحباب کا ہے اور ہم نے غلط تاثر دیا کہ خون سے وضو نہیں ٹوٹتا اور یہی اصل ہے، تو ناواقف، عامی افراد تو اس کو جان کر لڑائی جھگڑے کریں گے تو امت کا کتنا نقصان ہوگا؟ اور لڑائی جھگڑے چل رہے ہیں ایک کہتا ہے ہم حق پر ہیں دوسرے کہتے ہیں ہم حق پر ہیں اگرچہ ان مسائل کا حق وناحق سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

اگر فروعی مسائل پر لکھنے والے مصنفین حضرات علمائے کرام اپنی کتاب کے سرنامے پر یہ لکھتے کہ دو طرفہ جو نماز پڑھی جاتی ہے یہ دونوں دلائل سے ثابت ہے اور ٹھیک ہے تو آج امت مسلمہ میں شقاق، اختلاف، باہمی خلفشار، فضول چپقلش اور بدگمانیاں نہ ہوتی۔ اور باہمی اتفاق، امتنان، یگانگی اور سکون کی فضا ہوتی۔ اور واضح ہے کہ کتاب لکھنے کے بعد ہم نے بار بار اس سے سخت اور تنقیدی الفاظ کاٹ دیئے ہیں پھر بھی اگر ایسے الفاظ آجائیں تو ہم اس کی پیشگی معافی چاہتے ہیں، اور اسی طرح نہایت ہی خاص بات اس موضوع پر لکھنے والے تمام علمائے کرام کے لئے ہے کہ ہر ایک کتاب لکھ کر شروع میں لکھتا ہے " صلوا کما رائیتمونی اصلی" کہ میں نے جو یہ کتاب لکھی ہے صحیح احادیث کو مدنظر رکھ کر لکھی ہے، لیکن فن حدیث اور اسماء الرجال ایسا بحرِ ذخار ہے کہ اور تو اور اس میں امام بخاری کے اوہام موجود ہیں، بڑے بڑے اکابر اسلاف کی غلطیاں موجود ہیں تو من وشما کجا، ہم سے بھی غلطیاں ہو نکیں اس لئے کہ بارہ لاکھ حدیث کے رواۃ اور افراد کون کنٹرول کرے۔ لہٰذا میں از خود یہ دعوی نہیں کرتا ہوں، بلکہ میں اعلان کرتا ہوں کہ میری یہ کتاب ایک غیر معصوم فرد کی ادنی سی کوشش ہے اس میں غلطیوں کا پایا جانا بعید از امکان نہیں لہٰذا جو میری غلطی پر مجھے مطلع کرے گا میں اپنی غلطی کی اصلاح کرکے اس کا شکریہ بھی ادا کروں گا، چنانچہ علامہ البانی کتنے بڑے محدث ہیں لیکن کئی کئی جلدوں میں ان کے خلاف کتابیں آئی ہیں کہ آپ نے فلانی حدیث کو ضعیف کہا پھر دوسری جگہ صحیح کہا فلانے راوی کو ضعیف کہا پھر کسی اور کتاب یا موقع پر اسی حدیث یا راوی کو صحیح کہا، اسی طرح میں نے اس موضوع پر جتنی کتابیں دیکھیں تو سب میں یہ بات مشترک نظر آ گئی کہ ہر عالم نے دوسرے عالم دین کو کہا کہ فلانے راوی کو آپ نے فلانی کتاب میں صحیح کہا اور یہاں ضعیف کہا اور فلانے راوی کو فلانی روایت میں ضعیف اور یہاں صحیح کہا، میرے نزدیک اس فن کے پانچ ماسٹر ہیں علامہ مغلطائی" الاکمال" کے مصنف، ابن حجر عسقلانی، امام زیلعی " نصب الرائ" والے، مولانا امین اکاڑوی اور زبیر علی زئی مرحوم لیکن ان کے بھی اوہام موجود ہیں، چنانچہ "صلوۃ المسلمین" اور " صلاۃ الرسول" نامی کتابوں میں دعوی کیا گیا تھا کہ اس سے صحیح کتاب نہیں ہے لیکن اس موضوع کے ماہرین جانتے ہیں کہ

اس میں کتنی موضوع اور کتنی ضعیف روایات ہیں اور کتنے بالکل غلط حوالے ہیں اس لئے کہ ہم انسان ہے غلطی ہوتی ہے، اگرچہ انہوں نے جو کچھ لکھا تھا محنت کی تھی، صحیح نیت سے لکھا تھا، لیکن حوالے بعد میں غلط ثابت ہوئے، اسی طرح نہایت ہی خوبصورت کتاب جو بہت زیادہ چھپی " نماز نبوی" ہے جو محترم جناب ڈاکٹر شفیق الرحمٰن اور میرے دوست محترم مرحوم جناب زبیر علی زئی صاحب برد اللہ مرضجعہ وجعل مثواہ جنتہ نے نہایت ہی تدقیق اور تحقیق سے لکھی، لیکن ان سے بھی کوتاہیاں ہوئیں، اور اسی طرح مجھ سے بھی ہوئی ہیں لیکن پتہ تب چلے گا جب کتاب چھپے گی حضرات علمائے کرام دیکھیں گے، اور مجھے بتائیں گے کہ آپ نے یہ حوالہ غلط دیا ہے تو میں اس کو درست کروں گا، چنانچہ محترم جناب زبیر علی زئی صاحب نے فرمایا کہ ترک رفع یدین والی ابن مسعودؓ کی روایت سفیان کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے اور مدلس کی معنعن روایت ضعیف ہوتی ہیں تو پوری نماز نبوی کو ہم نے چھان لیا تو بہت سارے احادیث کو اس میں صحیح کہا گیا ہے باوجود اس کے کہ اس میں باقاعدہ مدلسین موجود ہیں، روایات معنعن ہیں جس کی پوری لسٹ درج ذیل ہے:

نمبر شمار	مدلس کا نام	نماز نبوی صفحہ نمبر	مدلس قرار دینے والے کا نام
1	ابن عجلان	16/14	علی زئی، بدیع الدین
2	قتادہ	39	علی زئی/ بدیع الدین
3	معمر بن عاصم	74/39	مسفر الدمینی
4	عبد الزاق بن ہمام	26/46	علی زئی
5	ابوزبیر المکی	28/48	علی زئی
6	قتادہ	48	علی زئی
7	شریک	29/48	علی زئی
8	ہشام بن عروہ مدنی	29/49	ائمہ
9	سعید بن ابی عروبہ	32/31/52	علی زئی، بدیع الدین

نمبر شمار	مدلس کا نام	نماز نبوی صفحہ نمبر	مدلس قرار دینے والے کا نام
10	حکیم بن عتبہ	38/56	ائمہ، علی زئی، بدیع الدین
11	سعید بن ابی عروبہ	56	ائمہ، علی زئی، بدیع الدین
12	شریک القاضی	45/63	علی زئی، بدیع الدین
13	امام اعمش	46/64	ائمہ وغیر مقلد احباب
14	عبدلرزاق	42/69	علی زئی، بدیع الدین
15	ابن عجلان	53/52/69	علی زئی، بدیع الدین
16	حبیب بن ابی ثابت	46/64	ائمہ وغیر مقلدین
17	عدی بن عقبہ	53/69	ائمہ . بدیع الدین
18	عبداللہ بن لہیعہ	53/70	علی زئی، بدیع الدین
19	عمرو بن شعیب	55/72	حافظ ابن حجر، بدیع الدین
20	ہشام بن عروہ	62/61/79	ائمہ، بدیع الدین
21	سفیان بن عیینہ	92	علی زئی، بدیع الدین
22	سفیان ثوری	92	علی زئی، بدیع الدین
23	قتادہ ابواسحاق	109	علی زئی، بدیع الدین
24	ایوب قتادہ	92	علی زئی، بدیع الدین
25	محمد بن موسی	105/104	ائمہ
26	سفیان ثوری	114	علی زئی، بدیع الدین
27	سفیان ثوری، زید العمر	105	علی زئی، بدیع الدین
28	سفیان ثوری، ابوزبیر	109/117	علی زئی، بدیع الدین
29	جریر بن حازم	111/119	ائمہ، بدیع الدین

نمبر شمار	مدلس کا نام	نماز نبوی صفحہ نمبر	مدلس قرار دینے والے کا نام
30	حبیب بن ابی ثابت	122/127	ائمہ، علی زئی، بدیع الدین
31	قتادہ	131	علی زئی، بدیع الدین
32	سفیان ثوری	117/144	علی زئی، بدیع الدین
33	ابن اسحاق، مکحول	122/150	علی زئی، بدیع الدین
34	ابن جریج	125/154/153	علی زئی، بدیع الدین
نمبر شمار	مدلس کا نام	نماز نبوی صفحہ نمبر	مدلس قرار دینے والے کا نام
35	ابو اسحاق	132/161	علی زئی، بدیع الدین
36	خالد الحزار	155/188/187	ابن حجر، بدیع الدین
37	یحی ابن ابی کثیر	169/199/198	ائمہ، علی زئی، بدیع الدین
38	محمد بن اسحاق	171/201	علی زئی، بدیع الدین
39	موسی بن عقبہ	209	ائمہ، بدیع الدین
40	ابو اسحاق البیہقی	228	علی زئی، بدیع الدین
41	موسی بن عقبہ	228	ائمہ، بدیع الدین
42	امام زہری	231	علی زئی، بدیع الدین
43	امام اعمش	233/235	علی زئی، بدیع الدین
44	ابن عجلان	253/252	علی زئی، بدیع الدین
45	ابن لہیعہ	258/263	علی زئی، بدیع الدین
46	امام اعمش	258/264	علی زئی، بدیع الدین
47	ہشام بن عروہ	280	علی زئی، بدیع الدین
48	مکحول	274	ابن حجر، بدیع الدین

نمبر شمار	مدلس کا نام	نماز نبوی صفحہ نمبر	مدلس قرار دینے والے کا نام
49	قتادہ	303/300	علی زئی، بدیع الدین

اسی طرح آپ کے ہاتھ میں موجود کتاب میں بھی کوتاہیاں ہوں گیں اور یقینا غلطیاں ہوں گی اور حضرات علمائے کرام ہم کو بتائیں گے اور ہم خوشی سے اس کی اصلاح کریں گے۔ تاج کمپنی کا قرآن لاکھوں بار چھپ چکا ہے لیکن آج بھی اس میں کتابت کی غلطیاں باقی ماندہ نظر آتی ہے تو ہماری اس کتاب میں بھی اگر کتابت یا معنوی غلطیاں آپ کو نظر آئے تو وٹس ایپ یا میسج کرکے مطلع فرمائیں، تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح کی جاسکے۔

اور یہ بھی واضح رہے کہ یہ کتاب مختلف مشتت مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف رسائل میں چھپ چکے ہیں لہٰذا اس میں بعض دلائل کا تکرار اور غیر ترتیبی ضرور ہوگی اس کو محسوس نہ فرمائیں۔

اسی طرح ہم نے اس کتاب کے آخر میں اس کا بھی اہتمام کیا ہے کہ جس کے ذہن میں نماز کے متعلق دوسری طرف کے دلائل آجاتے ہیں تو اس کے ذہن میں اس کے ساتھ ساتھ مختلف کتابوں سے رسائل سے یوٹیوب اور فیس بک وغیرہ سے یہ آجاتا ہے کہ جو لوگ رفع یدین نہیں کرتے ہیں ان کا عقیدہ شرک والا ہوتا ہے اور یہ تقلید شخصی اور تصوف کے قائل ہوتے ہیں اور یہ ایک شرک اور دوسری چیز گمراہی ہے اور امام ابو حنیفہ تابعی اور محدث تھے یا نہیں تھے اور امام ابو حنیفہؒ پر ارجاء کا الزام بھی اس کے ذہن میں آجاتا ہے اسی طرح یہ بھی اس کے ذہن میں آجاتا ہے کہ فقہ میں اختلاف ہے یا بعض ایسے مسائل بھی ہیں جس سے طبعیت بوجھل ہوجاتی ہے اور یہ بھی اس کے ذہن میں ہوتا ہے کہ وحدۃالوجود، کشف، وسیلہ، حیات الانبیاء اور مردوں کا سماع وغیرہ جیسے مسائل کی وجہ سے مقلد احباب گمراہ ہیں تو ہم نے بطور ذمیمہ کے اس کتاب کے آخر میں متن اور حاشیہ بنا کر ان مسائل پر تحقیقی بحث کی ہے تاکہ صرف نماز کے مسائل سامنے نہ آئے بلکہ پورا ذہن صاف ہوجائے۔ اسی طرح کیا ضعیف اور مرسل حدیث سے استدلال کرنا چاہیئے؟ اس پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے جو لائق مطالعہ ہے۔

رہا یہ معاملہ اور یہ کہنا کہ تم لوگوں کی نمازیں ضائع ہوگئیں اور اللہ تعالیٰ تمہاری نمازوں کو قبول نہیں

کرے گا، اس پر وہ حدیث مبارکہ پیش کی جاتی ہے جو حدیث قدسی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے:

أن رجلًا قال: واللہ لا یغفر اللہ لفلانٍ وان اللہ تعالی قال: من ذا الذي یتألیٰ عليّ أن لا أغفر لفلان، فاني قد غفرت لفلان وأحبطت عملک۔[1]

ایک شخص نے کہا کہ اللہ کی قسم، اللہ تعالیٰ فلاں شخص کی مغفرت نہیں کرے گا، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کون ہے جو میرے بارے میں یہ کہتا پھرتا ہے کہ میں فلاں شخص کی مغفرت نہیں کروں گا، بے شک میں نے فلاں شخص کی مغفرت کر دی، اور تمہارا سارا عمل ضائع کر دیا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

ابو طہمان محمد اسمٰعیل طورو

30 جمادی الثانیہ/ 1440ہجری/8-3-2019

[1] صحیح مسلم، کتاب: 45 البر والصلة والآداب، باب: 39 النهى عن تقنيط الانسان من رحمة اللهتعالى، حديث: 2621

مقدمہ پہلا ایڈیشن

روزانہ بلا ناغہ نماز پنج گانہ پڑھنا ہر مسلمان عورت اور مرد پر فرض لازم ہے۔ یہ فرض خیر و برکت کے بے شمار امکانات و معظمات کا خزینہ ہے۔ نماز آخرت ہی کی کامیابی کی ضامن نہیں، یہ اس دنیا میں بھی مہذب زندگی کا ایسا عظیم الشان سلیقہ سکھاتی ہے جس کی نظیر دنیا کے کسی اور نظام میں نہیں ملتی۔ اللہ کی بارگاہ میں حاضری کا اعزاز، مسلمانوں کا روزانہ پنجگانہ اجتماع، نظم جماعت، اطاعت امیر، پابندی اوقات اور طہارت و نظافت کا جو روح پرور نظارہ نماز میں دکھائی دیتا ہے، وہ روئے زمین کے کسی اور مذہب میں نظر نہیں آتا۔

نماز کی اس سے بڑھ کر اہمیت اور ضرورت کیا ہو گی کہ یہ مومن اور کافر کے درمیان خط امتیاز ہے۔ جس نے (قصداً تحقیراً) نماز ترک کی اس نے کفر کیا۔ نماز فواحش و منکرات سے روکتی ہے۔ عزت و سرخروئی کی ضامن ہے۔ رسالت مآب ﷺ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ قرآن کریم نے بشارت دی ہے کہ جو اہل ایمان نمازوں میں اللہ کے حضور گڑگڑاتے ہیں، رب جلیل انہیں ضرور کامیاب فرماتا ہے۔ رسالت مآب ﷺ کو نماز کی اہمیت و عظمت کا کس قدر زبردست احساس تھا؟ اس کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ عین اس وقت بھی جبکہ نزع کا عالم طاری تھا اور آپ ﷺ اس دنیا سے رخصت ہو رہے تھے، آپ ﷺ کی لسان مبارک پر یہی وصیت جاری تھی" الصلاة الصلاة وماملکت ایمانکم"

نماز کی اسی فرضیت اور ابدی افادیت کے پیش نظر" ادارہ الدلیل" نے نماز کی تعلیم و تفہیم کے لئے ایک کتاب شائع کر رہا ہے۔ اس کتاب کی جان یہ ہے کہ اس میں نماز کے احکام و تعلیمات، اصول و مبادیات اور جزئیات و تفصیلات کے ساتھ ٹھیک وہی نماز سکھانے کی مخلصانہ کوشش کی گئی تھی جیسی نماز امام انسانیت حضرت محمد ﷺ پڑھا کرتے تھے۔ تاہم اختلافی مسائل میں جداگانہ مؤقف عوام کے لئے کوئی پریشان کن نہیں ہونا چاہیئے، لان مع کل دلیل۔

اس کتاب کے مؤلف الشیخ ابو طہمان حفظہ اللہ ہیں۔ ان کا اسلوب تحریر بڑا سادہ اور موثر ہے۔ اس کی تحقیق و تخریج تخصص فی الفقہ کی طلبہ نے کی تھی۔ پھر محمد حنیف نے دوبارہ زحمت فرمائی اور نہایت باریک بینی سے اس کی از سر نو تحقیق و تخریج کی۔

اب آپ جوں جوں اس مزید ارایڈیشن کا مطالعہ فرمائیں گے اس کی اہمیت اور منفعت آپ پر روشن ہوتی چلی جائے گی۔ فہرست پر نظر ڈالئے۔ پہلی ہی نگاہ میں اندازہ ہو جائے گا کہ یہ کتاب ایسا کوزہ ہے جس کے صفحات میں جزئیات سمیت نماز کے تمام اصول و مبادیات کا بحر ذخار سمٹ آیا ہے۔ ہر صفحے کے مندرجات قرآن و سنت کے حوالوں سے مزین ہیں۔ ابتدائے نگارش ہی میں بتادیا گیا ہے کہ اصل نماز وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے پڑھی اور صحابہ کرام کو سکھلائی۔ آپ ﷺ کو نماز سکھانے کا اس قدر اہتمام تھا کہ ایک موقع پر آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر عملا نماز پڑھ کر دکھلائی تاکہ صحابہ کرام ادائے نماز کا ہر جز اچھی طرح دیکھ لیں اور ہمیشہ کے لئے اپنے عمل میں محفوظ کر لیں، جو اختلاف ہے اس کی حقیقت امام ابن تیمیہؒ اور ابن القیم کی عبارات سے واشگاف ہوئی۔

موت ایک نا قابل تسخیر حقیقت ہے۔ اس سے پہلے کہ فرشتہ اجل آپہنچے، جلد از جلد بارگاہ ربانی میں جھک جایئے۔ اس مقدس کتاب کے مطالعے کو روزمرہ کا معمول بنائے۔ نہایت اہتمام سے تکبیر اولی کے دوام کے ساتھ نماز پڑھئے۔ اسطرح آپ کا نام اللہ تعالیٰ کے صحیفہ خوشنودی میں درج ہو جائے گا اور آپ صحیح معنوں میں احسن تقویم قرار پائیں گے۔ میری دعا ہے کہ اس کتاب کی مقدس تعلیمات ہر مسلمان بہن اور بھائی کے ذہن اور زندگی میں ہمیشہ بیدار اور تازہ رہے اور فوز و فلاح کے برگ و بار لائیں۔

ہم یہاں پر یہ بات واضح کرنا چاہتے ہیں جو حدیث یا قول اس کتاب میں ان حضرات کے اصول کے مطابق ضعیف یا نا قابل استدلال ہے، ضروری نہیں کہ وہ ہمارے نزدیک بھی ضعیف اور نا قابل استدلال ہو۔

اوران کے ذکر کردہ ہر مسئلے کے متصل بعد احادیث صحیحہ کی روشنی میں دوسرے طریقے کے مطابق نماز پڑھنے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے اور اس میں یہ واضح کیا ہے کہ ہماری اس کتاب میں بیان

کردہ نماز کا طریقہ احادیث نبویہ کے خلاف نہیں بلکہ وہ احادیثِ طیبہ کے عین مطابق اور نبی کریم ﷺ و صحابہ رضی اللہ عنہم کرام کے طریقہ نماز کے عین موافق ہے ،اُس کو نصوص و روایات کے خلاف کہنا اور عقل و قیاس کی اتباع قرار دینا درست نہیں ایک اہم بات یہ ہے کہ اگر کتاب " نماز نبوی والے او ردیگر تقلید نہ کرنے والے ہمارے بزرگ اگر اپنی کتابوں کے سرورق پر یوں لکھیں کہ ہمارا طریقہ نماز اور دوسرا طریقہ نماز دونوں احادیث مبارکہ سے ثابت ہے تو اختلاف کا بہت بڑا دروازہ بند ہو جائے گا امت مسلمہ کے عظیم فقہاو محدثین اور مجتہدین نے دونوں طرف ادلہ شرعیہ دیکھ دیکھ کر ہزار سال سے زائد غور و فکر کرکے تھک گئے ہیں اور آخر کار انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ دونوں طرف دلائل شرعیہ موجود ہے جیسا کہ ابن تیمیہ اور ابن القیم رحمہما اللہ نے فرمایا احادیث کی کتب معتبرہ میں دونوں طرف ابواب موجود ہیں لیکن بارہ سو سال بعد ہمارے اندر یہ بدعت سیئہ شروع ہوئی کہ دو طرفہ متعدل علما نہیں بلکہ متشدد مناظرین نے یہاں تک کہہ دیا کہ ہم جو نماز پڑھتے ہیں وہ تو سنت کے مطابق ہے اور باقی سب خلاف سنت ہے (نعوذ باللہ من ذلک) تو ہم نے جواب میں وہ بات کی جو اجماعی ہے کہ دو طرفہ دلائل موجود ہیں لہٰذا اس میں لڑائی جھگڑے یا مناظرے مباحثے وغیرہ کرنا وقت کی ضیاع ہے ۔ لہٰذا دونوں طریقے سنت ہے اور کسی کی تغلیط کرنا باعث انتشار ہی ہوگا ۔ رب کائنات کے حضور دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالی ہمیں قرآن وسنت کی صحیح فہم اور صحابہ رضی اللہ عنہم تابعین او رسلف صالحین کی نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے ،آمین ۔

الشیخ ابو طہمان مفتی محمد اسماعیل طورو حفظہ اللہ

مہتمم و رئیس دار الافتاء والتصنیف جامعہ بنوریہ للتعلیمات النبویہ روالپنڈی

رمضان المبارک 1439 ھ

نماز سے متعلق اہم بات

نماز اسلام کا اہم رُکن ہے، اور شعائر اسلام میں سے ہے، نماز وہ عمل ہے جو بندے کو اس کے معبودِ حقیقی اور اس کے آقا و مولا کے قریب تر لاتا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو مکمل اہتمام وآداب سے ادا فرمایا بلکہ صحابہ کو بھی نماز کا طریقہ سکھایا، صحابہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح نماز پڑھتے دیکھا اس طریقہ کو محفوظ کر لیا، اور بعد میں آنے والوں تک مکمل امانت کے ساتھ پہنچا دیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں جو کچھ پڑھا اور جو دعائیں اور دوسری کیفیات کو ادا فرمایا، صحابہ نے مختلف اوقات میں ان تمام امور کو دیکھ کر انہیں محفوظ کر لیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر معاملہ میں اپنی امت پر آسانی اور سہولت کا خیال تھا اور اسی لئے آپ انے مختلف اوقات میں مختلف طریقوں کو اختیار فرما کر امت کیلئے سہولت اور آسانی کو عام فرما دیا۔

اس حکمت کو امام شیخ ابن تیمیہؒ، ابن القیمؒ، محدث کبیر انور شاہ کشمیریؒ اور امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بار بار اپنی کتابوں میں سمجھایا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جتنے فروعی مسائل ہیں دونوں طرف قرآن و حدیث کے دلائل ہیں لہٰذا ہمیں فروعی اختلافات اٹھا کر ایک دوسرے کی تضلیل و تفسیق نہیں کرنی چاہیے۔ جس طرح الحمد للہ امت مسلمہ رفع یدین امین بالجہر کے بارے میں امام شافعیؒ کے موقف پر تنقید نہیں کرتے ہیں۔ لیکن یہ نظریہ غلط ہے کہ ہم اپنے فروعی مسائل کو حق اور دوسروں کو بالکل غلط کہتے ہیں۔

امت مسلمہ کی بڑی اکثریت جس طرح سے نماز کو ادا کرتی ہے، اس کے بارے میں ان تمام احادیث وآثار کو جمع کیا گیا ہے جو اس بارے میں موجود ہیں، تاکہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک عمل، صحابہ رضوان اللہ علیہم کا طریقۂ نماز اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم کے ارشادات، یہ سب جمع ہو جائیں اور ایک مکمل جامع تحریر بن جائے جو نماز سے متعلق ہو اور جسے ہر مسلمان پڑھ کر مکمل اطمینان و تسلی اور پورے انشراح کے ساتھ اسی طریقے پر نماز پڑھے جیسا کہ اُسے سکھایا گیا ہے اور اسے اطمینان ہو جائے کہ اس کی نماز مسنون نماز ہے اور اس کا ہر ہر عمل احادیث سے ثابت ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

اللہ تعالیٰ نے جو دین دیا ہے وہ قیامت تک آنے والی اِنسانیت کیلئے ایک مکمل دستورِ حیات اور زندگی گزارنے کیلئے ایک جامع ضابطہ حیات ہے، قیامت تک اس میں کوئی اپنی خواہشات اور خود ساختہ خیالات کو داخل نہیں کر سکتا، اگر کوئی کرنا بھی چاہے تو اللہ کے محبوب و پسندیدہ بندوں کی ایک جماعت اُس کھوٹ کو کھرے سے ممتاز و نمایاں کر کے اُمت کے سامنے واضح کر دیتی ہے اور یہ دراصل دینِ محمدی کا ایک اِعجاز ہے جو پچھلے اَدیان کو حاصل نہ ہو سکا۔

جمہور اُمتِ مسلمہ کے مسلّمہ و متفقہ نظریہ و طریقہ سے الگ رخ اختیار نہیں کرنا چاہیئے اور یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ دین و شریعت کے کسی بھی مسئلہ میں سَلفِ صالحین اور ائمہ مجتہدین کی اِتباع کی ضرورت نہیں، اور یہ بھی درست نہیں کہ ہر انسان کو چاہیئے کہ براہِ راست قرآن و حدیث کی نصوص میں غور و تدبّر کر کے اُن سے راہنمائی حاصل کرے، اس لئے کہ اس کے نتیجہ میں بسا اوقات ائمہ مجتہدین تو در کنار حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کرام کے اِجماعی اور اِتفاقی مسائل کو بھی یہ کہہ کر ردّ کر دیا جائے گا کہ یہ نبی کریم ﷺ کے کسی عمل اور آپ ﷺ کی کسی حدیث سے ثابت نہیں جبکہ اس کو عدم علم کی وجہ سے صحیح بات کا پتہ نہ ہوگا۔

چنانچہ طلاق کا مسئلہ جو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کرام کا متّفقہ اور اِجماعی مسئلہ ہے، جس پر حضرت عُمر رضی اللہ عنہ کے مبارک عہد میں جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم کرام کا اِجماع اور اِتفاق ہو گیا تھا، یا تراویح کا مسئلہ جس پر جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم کرام، تابعین اور تبع تابعین اور تمام سلَفِ صالحین متفق ہیں، اور اِسی وجہ سے ائمہ مجتہدین کا بھی اُس میں کوئی اختلاف نہیں، تو آج اگر اختلاف کیا جائے تو یہ اسلاف سے الگ راستہ اختیار کرنا ہے۔

یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ ہر وہ شخص جو اپنے دینی اُمور میں کسی مسلک اور کسی اِمام کی اِتباع کرے وہ گمراہ اور راہِ حق سے ہٹا ہوا ہے۔ چنانچہ مکتبہ دار السلام کی طرف سے نماز کے احکامات کے متعلق ایک

کتاب " نماز نبوی " کے نام سے شائع ہوئی جس کا مؤلف ڈاکٹر شفیق الرحمٰن صاحب ہے اور اس پر احادیث کے تخریج و تحقیق کا کام زبیر علی زئی صاحب نے کیا ہے اور احادیث کی تصحیح و تنقیح صلاح الدین یوسف صاحب اور مولانا عبد الصمد رفیقی صاحب نے کی طرف منسوب ہے، اس کتاب کی سرورق پر اس کی صحیح اور مستند ہونے کے بارے کچھ یوں رقم طرازی کی گئی ہے جو ان ہی کے الفاظ سے ملاحظہ ہو " یہ کتاب ایسا کوزہ ہے جس کے ۳۸۴ صفحات میں جزئیات سمیت نماز کے تمام اصول و مبادیات کا بحر ذخار سمٹ آیا ہے۔ ہر صفحے کے مندرجات قرآن وسنت کے حوالوں سے مزین ہیں۔ ابتدائے نگارش ہی میں بتادیا گیا ہے کہ اصل نماز وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے پڑھی اور صحابہ کرام کو سکھلائی " پھر آگے فرماتے ہے کہ "اس کتاب کی نمایا خوبی یہ ہے کہ اس میں صرف اور صرف صحیح احادیث کا التزام کرتے ہوئے ضعیف احادیث سے اجتناب کیا گیا ہے"۔

اور اسی طرح دیگر دعوے بھی کیے گئے ہیں(جو کہ ہماری اس کتاب کے مطالعہ سے انشاء اللہ قارئین کے سامنے اصل حقیقت واضح ہو جائیں گی) اور اپنے طریقے کے علاوہ دوسرے طریقے سے نماز پڑھنے والوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ " ہمارے غیر (العیاذ باللہ) محمّدی نماز سے دور ہیں اور وہ اپنی رائے اور قیاس کے مطابق عمل کر رہے ہیں" بعض متشدّد دوسرے مستند طریقے کے مطابق نماز پڑھنے والے کی نماز کو مسنون نماز سمجھنے کیلئے تیار ہی نہیں، اور بڑی شدّ و مد اور جوش و جذبہ کے ساتھ یہ باوَر کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ نماز میں رفعِ یدین نہ کرنے کی وجہ سے یا امام کے پیچھے سورۃ الفاتحہ نہ پڑھنے کی وجہ سے نماز ہی نہیں ہوتی حالانکہ یہ بات اچھی طرح سے سمجھ لینی چاہیئے کہ فن حدیث کے ماہر ائمہ مجتہدین نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ احادیثِ طیّبہ کی روشنی میں اور قرآن و حدیث کی نصوص کو سامنے رکھتے ہوئے ہی بیان کیا ہے اُس میں اُن کی عقل و رائے، قیاس اور ذاتی نظریہ و خیال کا کوئی دَخل نہیں، اور چونکہ کسی مسئلہ میں بعض اوقات روایات میں نبی کریم ﷺ کے قول و عمل میں بھی اختلاف ملتا ہے جس طرح کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ علامہ ابن القیمؒ اور شاہ ولی اللہؒ نے اپنی کتب میں یہ بات بار بار ارشاد فرمائی۔

اس حکمت کو عظیم محدث شیخ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے یوں سمجھایا ہے:

"جو کوئی (وتر میں) دعائے قنوت پڑھے تو بھی بہتر اور اگر نہ پڑھے تو بھی کوئی حرج نہیں، کیوں کہ دعائے قنوت تو دعاء اور ثناء ہے، اور امام، مقتدیوں اور نمازیوں کو سکھانے کی نیت سے اگر کبھی کبھار اس (دعائے قنوت) کو بلند آواز سے پڑھے تو بھی جائز ہے، کیوں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو سکھانے کی نیت سے نماز میں ثنا کو بلند آواز سے پڑھا تھا اور اسی طرح سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے لوگوں کو بتانے کی نیت سے کہ جنازہ کی نماز میں سورۃ الفاتحہ پڑھ لینا سنت ہے، اسے بلند آواز سے پڑھا تھا، اسی سے ملتا جلتا یہ عمل بھی ہے کہ امام نمازیوں کو تعلیم کی غرض سے کبھی کبھار بلند آواز سے آمین کہہ سکتا ہے، یہ وہ اختلاف ہے جس میں شدت و سختی نہیں کرنی چاہیے، جو شخص کرے یا نہ کرے دونوں پر کوئی ملامت و سختی نہ کی جائے، اس کی ایک مثال نماز میں رفع یدین کرنا اور نہ کرنا بھی ہے، اور اس کی ایک اور مثال نمازوں میں مختلف طرح کا تشہد پڑھنا بھی ہے، اور اسی طرح اذان و اقامت اور حج کے مختلف تین طریقے: افراد، قران اور تمتع بھی اسی کی طرح ہیں[1]"۔

امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے چند ایک مثالوں کے ذریعہ سمجھایا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے مختلف اوقات میں مختلف طریقے سے جو بھی طریقۂ عبادت اختیار فرمایا ان میں سے جو طریقہ بھی کوئی مسلمان اپنا لے، یقینا اسی میں بہتری ہے، چونکہ نبی کریم سے ایک ہی عمل کے دو طریقے بلکہ کئی طریقے ثابت ہیں، لہٰذا کرنے اور نہ کرنے دونوں کی گنجائش اور جواز موجود ہے، تو ان اعمال کے کرنے یا نہ کرنے میں کسی کو ملامت نہ کیا جائے کہ دونوں سنت پر عمل پیرا ہیں۔ اور بالکل اسی طرح شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ کا فرمان ہے کہ:

---

[1] زاد المعاد، ص: 96 فصل فی امور تفعل فی الصلاۃ

"ہر بندہ مومن پر، عام اہل ایمان اور علما سے محبت کرنا واجب ہے۔اور حق جہاں بھی ہو اس کا قصد اور اتباع واجب ہے۔اور یہ جاننا بھی واجب ہے کہ مجتہد مصیب کے لئے دو اجر کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اور اگر مجتہد سے اجتہاد میں خطاہو جائے تو اس کو اجتہاد کرنے پر ایک اجر ملتا ہے اور اس کی خطا کی مغفرت کر دی جاتی ہے، اور اگر امام وہ عمل کر رہا ہو جس کی شرعاً گنجائش ہے تو اہل ایمان پر امام کا اتباع ضروری ہے۔ اس لئے کہ رسول ﷺ نے "انما جعل الامام لیوتم بہ" ارشاد فرمایا ہے اس لئے " امام رفع یدین کرے یا نہ کرے نمازیوں کی نماز میں کوئی نقصان نہیں، ان کی نماز نہ امام ابو حنیفہ کے یہاں باطل ہے نہ امام شافعی کے یہاں، نہ امام مالک کے یہاں اور نہ امام احمد کے یہاں، اسی طرح اگر امام رفع یدین کرے اور مقتدی نہ کرے یا اس کے برعکس ہو تو یہ ان میں سے کسی کی نماز میں کمی یا کوتاہی کا سبب نہیں ہوگا۔ اور اگر بعض اوقات رفع یدین کیا جائے، اور بعض اوقات نہ کیا جائے تو اس سے نماز میں کوئی نقصان نہیں ہوگا اور یہ کسی کے لئے جائز نہ ہو گا کہ وہ بعض علماء کے قول کو ایسا شعار بنالے کہ اس کی تابعداری کو واجب قرار دے اور سنت سے ثابت دوسرے پہلو سے لوگوں کو منع کرے۔ بلکہ وہ تمام صورتیں جو سنت سے ثابت ہیں ان سب کی گنجائش ہے جیسے اذان واقامت کے بارے میں بخاری و مسلم میں حضور ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت بلالؓ کو کلمات اذان میں جفت اور کلمات اقامت میں طاق کا حکم دیا اور حضور ﷺ ہی سے بخاری و مسلم میں یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے حضرت ابو محذورہ کو کلمات اقامت میں اذان کی طرح جفت جفت کی تعلیم دی اس لئے جو اقامت میں جفت کی صورت اختیار کرتا ہے تو وہ بھی درست ہے اور جو افراد کی صورت اختیار کرتا ہے تو وہ بھی درست ہے، اور جو شخص ان صورتوں میں سے ایک کو واجب قرار دے اور دوسری صورت کی اجازت نہ دے تو خطاکار اور گمراہ ہے اور جو ان میں سے ایک عمل کرنے

والے سے محبت کرے اور دوسرے سے محض اسی بنیاد پر محبت نہ کرے تو وہ خطا کار اور گمراہ ہے[1]"۔

اِس لئے اُس میں ترجیح دینے کے اندر ائمہ کرام کا بھی اختلاف ہوا ہے، لیکن وہ اختلاف خود حدیث کی رُو سے کوئی ممنوع اور قبیح اختلاف نہیں کہ اُس کو ہدفِ تنقید بنا کر طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جائے بلکہ وہ اختلاف تو اُمت کیلئے رحمت اور نبی کریم ﷺ کی ساری احادیث پر عمل کی ایک بہترین شکل ہے جس کو سراسر خیر و بھلائی کا اختلاف کہا جاتا ہے، نہ کہ شرّ و فساد کا اختلاف۔

قارئین کرام! زیرِ نظر کتاب میں مکتبہ دارالسلام کے شائع کردہ کتاب "نماز نبوی" کے متن اور حاشیہ دونوں کو ذکر کیا گیا ہے اور اس کا ایک جائزہ اسی کتاب کے محققین کے اصولوں کی روشنی میں لیا گیا ہے اور "تبصرہ" کے عنوان سے ان کی پیش کردہ بعض دلائل پر تبصرہ کیا گیا ہے اس تبصرے سے قبل ہم نے ان حضرات کے دیگر کتب کا بغور مطالعہ کیا خصوصا محترم جناب زبیر علی زئی مرحوم صاحب کی دوسری کتب کا اور ان کتب سے اصول اور راویان حدیث جرح و تعدیل کو یکجا کیا، اور حدیث پر جرح و تعدیل کے انہیں کے اصولوں کی روشنی میں ان کے اس مستند ترین کتاب (نماز نبوی) کو پرکھا، اور اس کی استنادی حیثیت کو ظاہر کیا ہے۔

اور یہ کوشش اس لئے کہ جس ذات نے اپنے بندوں پر نماز فرض کی، اسے قائم کرنے اور اچھے طریقے سے ادا کرنے کا حکم دیا، اس کی قبولیت کو خشوع و خضوع پر موقوف فرمایا، اسے ایمان اور کفر کے درمیان امتیاز کی علامات اور بے حیائی اور برے کاموں سے روکنے کا ذریعہ بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا: وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم[2]

"اور ہم نے آپ کی طرف یہ ذکر (قرآن) اتارا ہے تاکہ جو کچھ لوگوں کے لئے اتارا گیا ہے آپ اس کی توضیح و تشریح کر دیں۔"

---

[1] فتاویٰ ابن تیمیہ، جلد ۲۳، صفحہ ۲۵۴

[2] النحل: 44/16

چنانچہ آپ ﷺ اللہ کے حکم کی تعمیل میں کمربستہ ہو گئے اور جو شریعت آپ پر نازل ہوئی، آپ نے اسے پوری وضاحت کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کر دیا، تاہم نماز کی اہمیت کے پیش نظر اسے نسبتا زیادہ واضح شکل میں پیش کیا اور اپنے قول و عمل سے اس کا عام پرچار کیا یہاں تک کہ ایک بار نبی کریم ﷺ نے منبر پر نماز کی امامت فرمائی، قیام اور رکوع منبر پر کیا، نیچے اتر کر سجدہ کیا، پھر منبر پر چڑھ گئے اور نماز سے فارغ ہو کر فرمایا:

میں نے یہ کام اس لئے کیا ہے کہ تم نماز ادا کرنے میں میری اقتدار کر سکو اور میری نماز کی کیفیت معلوم کر سکو[1]۔

نیز اس سے بھی زیادہ زوردار الفاظ میں اپنی اقتداء کو واجب قرار دینے کے لئے فرمایا: "تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز ادا کرتے ہوئے دیکھتے ہو"[2]۔

مزید فرمایا: "اللہ نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں جو شخص ان کے لئے اچھی طرح وضو کرے، انہیں وقت پر ادا کرے اور ان میں مکمل صحیح رکوع کرے اور خشوع کا اہتمام کرے تو اس انسان کا اللہ پر ذمہ ہے کہ اسے معاف کر دے اور جو شخص ان باتوں کو ملحوظ نہ رکھے گا اس کا اللہ پر کوئی ذمہ نہیں ہے، چاہے تو اسے معاف کرے اور چاہے تو اسے عذاب دے[3]"۔

نبی اکرم ﷺ پر درود و سلام کے ساتھ اہل بیت اور صحابہ کرامؓ پر بھی درود و سلام ہو، جو نیکوکار اور پرہیزگار تھے۔ جنھوں نے نبی اکرم ﷺ کی عبادت، نماز، اقوال اور افعال کو نقل کر کے امت تک پہنچایا اور صرف آپ کے اقوال، افعال اور تقریرات کو دین اور قابل اطاعت قرار دیا، نیز ان نیک انسانوں پر بھی درود و سلام جو ان کے نقش قدم پر چلتے رہے اور چلتے رہیں گے۔

---

[1] صحيح البخاري الجمعة باب الخطبة على المنبر حديث 917 وصحيح المسلم المساجد باب جواز الخطوة والخطوتين في الصلاة حديث 544

[2] صحيح البخاري الاذان باب الاذان للمسافر حديث 631

[3] سنن ابي داود الصلوة باب في المحافظة على وقت الصلوة حديث 1420/425 امام ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے

اسلام میں نماز کا اہم مرتبہ ہے اور جو شخص اسے قائم کرتا ہے اور اس کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرتا وہ اجر و ثواب اور فضیلت و اکرام کا مستحق ہوتا ہے۔ پھر اجر و ثواب میں کمی بیشی کا معیار یہ ہے کہ جس قدر کسی انسان کی نماز رسول اکرم ﷺ کی نماز کے زیادہ قریب ہو گی وہ اسی قدر زیادہ اجر و ثواب کا حقدار ہو گا اور جس قدر اس کی نماز نبی کریم ﷺ کی نماز سے مختلف ہو گی اسی قدر کم اجر و ثواب حاصل کرے گا۔ رسول للہ ﷺ نے فرمایا: بیشک بندہ نماز ادا کرتا ہے لیکن اس کے نامہ اعمال میں اس (نماز) کا دسواں، نواں، آٹھواں، ساتواں، چھٹا، پانچواں، چوتھا، تیسرا یا نصف حصہ لکھا جاتا ہے۔

"نماز نبوی" والے فرماتے ہیں کہ:

"شیخ ناصر الدین البانیؒ فرماتے ہیں: "ہمارے لئے رسول اکرام ﷺ کی مانند نماز ادا کرنا اسوقت ممکن ہے جب ہمیں تفصیل کے ساتھ آپ کی نماز کی کیفیت معلوم ہو اور ہمیں نماز کے واجبات، آداب، ہیئات اور ادعیہ و اذکار کا علم ہو، پھر اس کے مطابق نماز ادا کرنے کی کوشش بھی کریں تو ہم امید رکھ سکتے ہیں کہ پھر ہماری نماز بھی اس نوعیت کی ہو گی جو بے حیائی اور منکر باتوں سے روکتی ہے اور ہمارے نامہ اعمال میں وہ اجر و ثواب لکھا جائے گا جس کا وعدہ کیا گیا ہے[1]"۔

جبکہ اسی کتاب (نماز نبوی) میں اس پر تنقید ہے کہ:

"تنبیہ: [2]عرض ہے کہ واجبات وآداب وغیرہ کا علم ہونا ضروری نہیں بلکہ صرف یہی کافی ہے کہ خود تحقیق کرکے یا کسی مستند اور صحیح العقیدہ عالم سے رسول اللہ ﷺ کی نماز کا علم حاصل کیا جائے اور پھر سنت کے مطابق نماز پڑھی جائے[3]۔"

---

[1] صفۃ الصلوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

[2] نماز نبوی قدیم اور جدید میں ان حضرات نے البانی کا جملہ کاٹ دیا۔

[3] اس عبارت کے تین حصے ہیں....

"واجبات وآداب کا جاننا ضروری نہیں" جبکہ تین سطر پہلے شیخ ناصر الدین البانی کا قول نقل کرکے کہا کہ ہمارے لئے رسول اللہ ﷺ کی مانند نماز ادا کرنا اس وقت ممکن ہے جب ہمیں تفصیل کے ساتھ آپ ﷺ کی نماز کی کیفیت معلوم ہو اور ہمیں نماز کے واجبات ہیئات اور ادعیہ واذکار کا علم ہو۔۔۔ اب ہم کس کی بات کو صحیح سمجھیں نماز نبوی والے کی یا ان کے امام ومقتداء کی۔

اس جملے سے واضح ہوتا ہے کہ نماز کے اندر واجبات [1] آداب کا جاننا ضروری ہے لیکن اہل حدیث بزرگوں نے ان ضروری افعال کی اپنی پوری کتاب کے اندر قرآن وحدیث صحیح کی روشنی میں نہ تو فرض واجب اور مستحب کی تعریف کی ہے اور نہ ہی افعال کا تعین کیا ہے { سوائے غسل کے } ۔ جبکہ انہوں نے نماز نبوی قدیم وجدید کے پس ورق پر لکھا گیا ہے کہ " نماز نبوی ایک امتیاز اور انفرادیت کے حامل

تبصرہ ب: "خود تحقیق کرے" آپ کے خیال میں ہر کس وناکس اس قابل ہے کہ وہ خود قرآن وحدیث سے مسائل کا استنباط کرے بظاہر تو یہی نظر آرہا ہے کہ آپ کے ہاں کوئی علمی معیار نہیں بلکہ حکیم، ڈاکٹر، پبلشر، تاجر، گوال وغیرہ عوام وخواص سب ہی مصنف مفتی مجتہد اور محقق بن سکتے ہیں ؟۔

اور قرآن مقدس کی آیت کریمہ وماکان المومنون لینفروکافۃ .... { سورۃ توبہ آیت 122 } ترجمہ جناب محمد جوناگڑھی: اور مسلمانوں کو یہ نہ چاہئیے کہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں سو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جایا کرے تاکہ وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرلیں اور تاکہ وہ لوگ اپنی قوم کو جبکہ وہ انکے پاس آئیں، ڈرائیں تاکہ وہ ڈر جائیں۔ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں آپ کے شریک کار فرماتے ہیں" دوسری تفسیر اس کی یہ ہے کہ اس آیت کا تعلق جہاد سے نہیں ہے بلکہ اس میں علم دین سیکھنے کی اہمیت کا بیان، اس کی ترغیب اور طریقے کی وضاحت ہے اور وہ یہ کہ ہر بڑی جماعت یا قبیلے میں سے کچھ لوگ دین کا علم حاصل کرنے کے لئے اپنا گھر بار چھوڑیں اور مدارس ومراکز علم میں جاکر علم حاصل کریں اور پھر اپنی قوم میں آکر وعظ ونصیحت کریں۔

یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تحقیق کرنا ہر کس وناکس کا کام نہیں بلکہ اس کے لئے رجال کار کا ہونا ضروری ہے۔۔
صحیح بخار کتاب العلم باب العلم قبل القول والعمل کے تحت امام بخاری ایک حدیث لائے ہیں { انما العلم بالتعلیم } بے شک علم تو سیکھنے سے ہی آتا ہے یہ حدیث طبرانی اور مسند بزار میں سند کے ساتھ عبد اللہ بن مسعود کی روایت سے موجود ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں { یاایہاالناس تعلمواالعلم فانماالعلم بالتعلیم والفقہ بالتفقہ ومن یرد اللہ بہ خیرا یفقہ فی الدین } اے لوگوں علم حاصل کرو کہ علم سیکھنے ہی آتا ہے اور فقہ غور وتدبر سے آتا ہے اور جس پر اللہ تعالی خیر کا ارادہ فرماتے ہیں اسے دین کی سمجھ عطا فرماتے ہیں۔ اب آپ خود ہی اس بات پر غور کریں اور بتائیں کہ خود تحقیق کرنے والی بات کہاں تک درست ہے اس بات کا فیصلہ ہم قارئین کرام پر چھوڑتے ہیں۔

تبصرہ ج: آپ حضرات کی تنبیہ کا تیسرا حصہ ہے " کسی مستند اور صحیح العقید عالم سے رسول اللہ کی نماز کا علم حاصل کیا جائے اور سنت کے مطابق نماز ادا کی جائے" ۔ یعنی کسی غیر معصوم عالم پر اعتماد کرکے اس کی بات کو تسلیم کیا جائے اور سنت کے مطابق نماز ادا کی جائے۔ تو اسے تقلید نہیں تو کیا کہیں گے ؟۔ مزید برآں مؤلف نماز نبوی حافظ مرحوم زبیر علی صاحب { نور العینین ص: 23 } پر تقلید کو بدعت اور صفحہ 25 پر تقلید کو گمراہی کا سبب بتاتے ہیں تو آپ اپنے ہی اصول کے مطابق اس بات پر غور فرمائیں۔

[1] سنن ومستحبات قدیم صفحہ 63 جدید صفحہ 83

کتاب ہے "۔ اس کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اس میں نماز اور اس کے تمام تر مسائل کو اس قطعیت اور حجیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے" ۔۔۔ یہ نامکمل دعوی ہے جی! ۔

یہاں یہ ذکر کرنا بھی انتہائی ضروری ہے کہ توحید تمام اعمال صالحہ کی اصل ہے۔ اگر توحید نہیں تو تمام اعمال بے کار، لغو اور بے سود ہیں۔ توحید نہیں تو ایمان نہیں۔ توحید اور شرک ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ توحید کے بغیر نجات نہیں اور شرک کی موجودگی میں نجات ناممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذلک لمن یشاء ومن یشرک باللہ فقد افتری اثما عظیما[1]

بے شک اللہ شرک نہیں بخشے گا اور اس کے علاوہ جس گناہ کو جس کے لئے چاہے گا بخش دے گا۔ اور جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے وہ بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔

نیز فرمایا: الذین امنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولئک لھم الامن وھم مھتدون[2]

"جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم (شرک) سے ملوث نہیں کیا تو ایسے ہی لوگوں کے لئے امن ہے اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق آیت بالا میں ظلم سے مراد شرک ہے[3]۔

اس سے ثابت ہوا کہ بعض لوگ ایمان لانے کے بعد بھی شرک کرتے ہیں جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: وما یؤمن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون[4]

اور بہت سے لوگ اللہ پر ایمان لانے کے باوجود مشرک ہوتے ہیں۔

لہٰذا نماز کی قبولیت کے لئے شرط اول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات و صفات میں یکتا مانا جائے۔ عزت و ذلت اسی کے پاس ہے۔ ہر نیک و بد کا وہی مشکل کشا اور حاجت روا ہے۔ نفع و نقصان کا

---

[1] النساء 48/4

[2] الانعام 6 /82

[3] صحیح البخاری التفسیر سورۃ الانعام باب ولم یلبسو ایمانھم بظلم حدیث 4629 الایمان باب ظلم دون ظلم حدیث 32

[4] یوسف 106/12

مالک بھی وہی ہے اور اللہ کے مقابلے میں کسی کو ذرا سا بھی اختیار نہیں۔ ہر چیز پر اسی کی حکومت ہے اور کوئی اللہ کے مقابلے میں کسی کو پناہ نہیں دے سکتا۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کے علاوہ ہر چیز کو فنا ہے۔ یہ بھی صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ وہ لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارنے کا طریقہ، یعنی دین نازل کرے کیونکہ حلال و حرام کا تعین کرنا اور دین سازی اسی کا حق ہے اور حقیقی اطاعت صرف اللہ کے لئے ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ دین، محمد ﷺ کے ذریعے سے ہمارے پاس بھیجا، لہٰذا آج اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا واحد ذریعہ وہ احکام ہیں۔ جو محمد ﷺ نے صحابہ کرامؓ اور ان کے ذریعے سے پوری امت تک پہنچائے۔ اور ائمہ حدیثؒ اور فقہا نے کتب احادیث و فقہ میں اس طریقے کو جمع کر دیا۔

کتاب و سنت کی بجائے کسی مرشد، پیر یا امام کے نام پر فرقہ بندی کی اسلام میں کوئی اجازت نہیں ہے اور کسی پارلیمنٹ کو بھی یہ حق نہیں کہ وہ مسلمان کی زندگی اور موت کے تمام معاملات پر مشتمل ایسے تعزیراتی، مالیاتی، سیاسی، اقتصادی، سماجی اور بین الاقوامی قوانین بنائے جو اللہ کے نازل کردہ احکام کے خلاف ہوں۔ نماز کی ادائیگی سے قبل مذکورہ تمام عقائد پر ایمان لانا ضروری ہے[1]۔ یہی مؤقف ہے ائمہ اربعہ اور ائمہ حدیث کا۔

الحمد للہ اس کتاب کی ترتیب میں کوشش کی گئی ہے کہ احادیث صحیحہ سے مدد لی جائے۔ اس سلسلے میں "اعلاء السنن" سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور جن دوستوں نے اس کتاب کی ترتیب و تزئین میں تعاون کیا ہے ان تمام معاونین کی اخروی نجات کا ذریعہ بنائے۔ خصوصاً محمد حنیف، اکرم سعید اور طلبہ تخصص کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے جنہوں نے اپنے قیمتی اوقات میں سے وقت نکال کر پوری کتاب کا مطالعہ کیا اور بعض مقامات پر اصلاح فرمائی۔ آمین !

---

[1] کیونکہ اللہ کی بارگاہ میں کسی عمل کے قبولیت کا انحصار بالترتیب تین چیزوں پر ہے 1 عقیدہ کی درستگی 2 عمل کی درستگی 3 اور نیت کی درستگی۔ ان میں سے کسی ایک میں خلل واقع ہونے سے سارا عمل مردود ہو جاتا ہے۔ اور یاد رہے کہ کتاب اللہ، سنت ثابتہ، صحابہ کرام کا مجموعی طرز عمل اور اجماعِ امت ہی وہ کسوٹی ہے جس پر کسی عقیدے یا عمل کی صحت کو پرکھا جا سکتا ہے۔

طہارت کا بیان

پانی کے احکام :

نماز کے لئے وضو شرط ہے۔ وضو کے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی۔ اسی طرح وضو کے لئے پانی کا پاک ہونا شرط ہے۔

نماز نبوی کتاب میں ایک حدیث پیش کی گئی ہے :

سیدنا ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا: کیا ہم بضاعہ کے کنویں سے وضو کر سکتے ہیں۔ یہ ایسا کنواں ہے جس میں حیض والے کپڑے، کتوں کا گوشت اور بدبو دار اشیاء (بعض اوقات) گر جاتی ہیں۔ بضاعہ کا کنواں ڈھلوان پر تھا اور بارش وغیرہ کا پانی ان چیزوں کو بہا کر کنویں میں لے جاتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: الماء طهور لا ينجسه شيء[1]

اس کا پانی پاک ہے (اور اس میں دوسری چیزوں کو پاک کرنے کی صلاحیت ہے) اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی

معلوم ہوا کہ کنویں کا پانی پاک ہے۔

لیکن اس پر ہمارا تبصرہ یہ ہے:

الف: سوال یہ ہے کہ اس حدیث کو کنویں کے ساتھ کیوں خاص کیا گیا ہے جبکہ سوال خاص لیکن جواب حکم عام ہے جیسا کہ مالک بن حورث کی معیت میں وفد آیا تھا تو خاص اسی وفد کو فرمایا تھا { صلوا کما رائیتمونی اصلی } حدیث کے ان الفاظ کو عام کرنا اور اور پہلی حدیث کو خاص کرنے میں کیا راز ہے؟ قرآن و احادیث صحیحہ سے مدلل جواب مطلوب ہے۔

---

[1] ابو داؤد الطهارة باب ماجاء في بئر بضاعة حديث 22 ترمذي الطهارة باب ماجاء ان الماء لاينجسه شئ حديث 22 اسے ترمذی نے حسن جبکہ امام احمد بن حنبل، یحی بن معین ابن حزم اور نووی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح کہا ہے

مطالبہ : اورآپ سے مطالبہ ہے کہ نماز نبوی جدید صفحہ 40 میں اہل حدیث نے فرمایا ہے کہ " ثابت ہوا کہ مسئلہ وفتوی صرف وہی قابل عمل ہے جو قرآن وحدیث سے مدلل ہو تو اس اصول کی روشنی میں قلتین کی مقدار کا تعین 227 کلو گرام قرآن وحدیث سے مدلل ہے ؟

تبصرہ ب :

حدیث قلتین کے بارے میں فن حدیث کے ماہرین کیا فرماتے ہیں؟ چنانچہ السید السابق اپنی کتاب " فقہ السنہ " میں لکھتے ہیں : " عبداللہ بن عمر کی حدیث ہے کہ آپ نے فرمایا کہ پانی قلتین ہو تو نہ گندگی نہیں اٹھاتا { نجس نہیں ہوتا } یہ حدیث مضطرب ہے سنداومتنا اور ابن عبدالبر "التمہید" میں فرماتے ہیں امام شافعی حدیث قلتین کی طرف گئے ہیں ۔ یہ مذہب من جہۃ النظر والاثر { عقلی ونقلی } دونوں طور پر ثابت نہیں ہے۔ جب یہ حدیث ضعیف ٹھہری تو اس حدیث سے استلال کرنا کیا معنی رکھتا ہے جب آپ خود ہی فرماتے ہیں کہ ضعیف حدیث سے استدلال کا دروازہ بند ہی رہنے دیا جائے ۔"

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا : دریا اور سمندر کا پانی پاک کرنیوالا ہے اور اس کا مردار (مچھلی) حلال ہے [1] ۔
رسول اللہ ﷺ نے جنبی کو ٹھہرے ہوئے پانی میں غسل کرنے سے منع فرمایا [2] ۔
نبی اکرم ﷺ نے کھڑے پانی میں پیشاب کرنے اور پھر اس سے غسل کرنے سے منع فرمایا [3] ۔
نبی اکرم ﷺ نے کھڑے پانی میں پیشاب کرنے اور پھر اس سے وضو کرنے سے منع فرمایا۔ [4]

---

[1] ابو داؤد الطهارة باب الوضوء بماء البحر حديث 83 ترمذی الطهارة باب ماجاء في ماء البحر انه طهور حديث 69 اس حدیث کو ترمذی' حاکم 1 /141-140 امام ذہبی اور امام نووی رحمہم اللہ نے صحیح کہا ہے ۔
اس لئے کہ وہ کثیر جاری پانی ہے۔

[2] مسلم الطهارة باب النهي عن الاغتسال في الماء الراكد حديث 683

[3] بخاری الوضوء باب البول فی الماء الدائم حدیث 639 ،

[4] **تبصرہ الف** : ان دونوں حدیثوں سے یہ بات ثابت ہوئی کہ ساکن پانی میں نجاست گرنے سے پانی نجس ہو جاتا ہے چاہے اس کا کوئی وصف تبدیل نہ ہو کیونکہ جنبی کے نہانے سے پانی کا کوئی وصف تبدیل نہیں ہوتا پھر بھی حدیث کے مطابق نجس ہوگا اس لئے تو

منع کیا ہے اب بقول آپ کے کنویں کا پانی ساکن ہے اور نجس نہیں ہوتا۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ کنویں کا پانی پاک ہے آپ کے اس قول اور بیان کردہ احادیث میں تعارض ہے ایسے تعارض کے بارے میں جناب مرحوم علی زئی صاحب فرماتے ہیں کہ " اور رسول اللہ ﷺ کے قول کے مقابلے میں کسی امام کے قول کو پیش کرنا سخت ترین گمراہی ہے { نور العینین ص: 25 } اور مزید یہ کہ محشی صاحب کو امام و مجتہد کا رتبہ حاصل ہے ؟۔

تبصرہ ب: ان دونوں حدیثوں اور حدیث" الماء طھور لا ینجسہ شئ "میں پانی کے مقدار کا تعیین نہیں ہے۔ آپ کی تشریح کی مطابق اس اور ما قبل دونوں حدیثوں میں تعارض ہورہا ہے تو اس تعارض کو اپنے اصولوں کے مطابق کسی امام غیر معصوم کے قول کو پیش کئے بغیر قرآن و حدیث صحیحہ کی روشنی میں حل فرمائیں ؟۔

طحاوی شریف میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک حبشی یا رنجی زم زم کے کنویں میں گر گیا تو ایک آدمی کنویں میں اترا اور اسے باہر نکالا ان دونوں صحابہ کرامؓ نے دوسرے صحابہ کرامؓ کے موجودگی میں فتوی دیا تھا کہ کنویں کا پانی باہر نکالو۔ جبکہ آپ کہتے ہیں کہ کنویں کا پانی نجس نہیں ہوتا اور زم زم کا پانی آپ کے تعیین کے مطابق قلتین سے زیادہ ہے۔ اب اشکال یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے کنویں سے پانی نکالنے کا فتوی کیوں دیا ؟ (قال البیہقی فی المعرفۃ ،قتادۃ عن ابن عباسؓ مرسل، قلت : وھو کذلک ، و منھا ماراہ الطحاوی والبیہقی عن ابی الطفیل عن ابن عباسؓ وفیہ جابر الجعفی، وھو ضعیف، (آثار السنن، ص: 14)

دوسری بات یہ ہے کہ فرض کریں کسی شخص کے گھر میں کنواں ہے اس میں کتا گرا اور مر گیا اور پھٹ گیا تو اس سوال کا جواب کیا ہوگا ؟۔

جبکہ یہ بات غلط ہے کہ پانی چاہے کم ہو یا زیادہ یعنی دو قلوں سے کم ہو یا زیادہ نجاست پڑنے سے جب تک اس کے تینوں اوصاف میں سے کوئی وصف تبدیل نہیں ہوتا وہ پانی پاک ہے اور پاک کرنے والا ہے۔ تو اگر ایک بالٹی میں چند قطرے پیشاب کے گر جائیں تو اس پانی کے تینوں اوصاف میں سے کوئی وصف تبدیل نہیں ہوگا تو اس کا حکم کیا ہوگا ؟

تبصرہ: سوال ہے کہ حدیث میں مردار کو مچھلی کے ساتھ مختص کرنا کس دلیل کے تحت ہے جبکہ امام شوکانی نے نیل الاوطار میں او ر امام صفی الرحمٰن مبارک پوری نے بلوغ المرام میں اسی حدیث کے تحت لکھا ہے" اور اسی طرح یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جو جانور سمندر کے ہیں { یعنی وہ سمندر کے باہر زندہ نہیں رہ سکتے } وہ سب حلال ہیں۔

لیکن یاد رہے کہ اس حدیث کے ایک راوی عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم ہے ان کو بعض بزرگوں نے جزء قرات میں کئی مقامات پر سخت ضعیف بلکہ ان پر موضوع روایات کا الزام بھی لگا چکے ہیں صفحہ 102,105,147,181. اور دوسری طریق کے راوی اسماعیل بن ادریس عبداللہ کو بھی علامہ ابن کثیر نے ضعیف کہا ہے۔ { تفسیر ابن کثیر اردو مترجم محمد جوناگڑہی سورۃ مائدہ آیت 3 }

رفع حاجت کے آداب و مسائل

بیت الخلاء میں جاتے وقت کی دعا:

سیدنا انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب رفع حاجت کے لئے بیت الخلاء میں داخل ہونے کا ارادہ کرتے تو فرماتے: اللھم انی اعوذبک من الخبث والخبائث[1]

اے اللہ یقیناً میں تیری پناہ پکڑتا ہوں ناپاک جنوں اور ناپاک جنیوں (کے شر) سے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بیت الخلاء جنوں اور شیطانوں کے حاضر ہونے کی جگہ ہے جب تم بیت الخلاء جاؤ تو کہو: اعوذباللہ من الخبث والخبائث[2]

میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں نر اور مادہ خبیث جنوں (کے شر) سے[3]۔

بیت الخلاء سے نکلتے وقت کی دعا:

عائشہؓ روایت کرتی ہیں: جب رسول اللہ ﷺ بیت الخلاء سے نکلتے تو فرماتے: غفرانک[4]

اے اللہ میں تجھ سے بخشش چاہتا ہوں۔

---

[1] بخاری الوضوء باب مایقول عند الخلاء حدیث 124 مسلم الحیض باب مایقول اذا اراددخول الخلاء حدیث 375۔

[2] ابوداؤد الطھارۃ باب مایقول الرجل اذا دخل الخلاء حدیث 6 اسے حاکم 1 /187 ذہبی اور ابن خزیمہ حدیث 69 نے صحیح کہا ہے

[3] **تبصرہ الف:** یہ حدیث ہم مانتے ہیں اور یہاں لے آئے اور تقلید نہ کرنے والے بزرگ نماز نبوی میں لاچکے ہیں جبکہ ہمارا اس کے بارے میں تبصرہ یہ ہے کہ اس حدیث پر تحقیق کرتے ہوئے زبیر علی زئی مرحوم صاحب نے امام ابن خزیمہ سے اس کی تصحیح نقل کی ہے جبکہ ابن خزیمہ نے اس حدیث کی صحت کا حکم نہیں لگایا الدکتور محمد مصطفیٰ الاعظمی صحیح ابن خزیمہ 1 /78 طبع المکتب الاسلامی بیروت } حدیث مذکورہ کے تحت لکھتے ہیں کہ اس حدیث کے سند میں اضطراب ہے

تبصرہ ب: ابوداؤد کی مذکورہ حدیث میں قتادہ عن کے ساتھ روایت کر رہے ہیں اور قتادہ کو خود حافظ زبیر علی زئی نے { جزء قراءت صفحہ 59,93، جزء رفع یدین صفحہ 39 } پر مدلس کہا ہے۔ موصوف کے اصول کے مطابق یہ حدیث ضعیف ہے لیکن یہاں اس کو صحیح بنایا گیا ہے۔

تبصرہ ج: اس روایت کی سند میں ایک روای امیر المؤمنین فی الحدیث امام شعبہ ہے جن کو تسہیل الوصول { ص: 153,159 } پر وہم کے مریض ٹھہرا چکے ہیں۔ تو یہاں پر ان کے روایت کو کس طرح درست کہا ہے ؟۔

[4] ابوداؤد الطھارۃ باب مایقول الرجل اذاخرج من الخلاء حدیث 30 ترمذی الطھارۃ باب مایقول اذا خرج من الخلاء حدیث 7 ابن ماجہ الطھارۃ باب مایقول اذا خرج من الخلاء حدیث 300 اس کو حاکم 1 / 158 ذہبی اور نووی نے صحیح کہا ہے

﴾ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴿

رفع حاجت کے مسائل:

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جب تم قضائے حاجت کے لئے آؤ تو قبلے کی طرف منہ کرو نہ پیٹھ [1]۔

نبی اکرم ﷺ نے گوبر اور ہڈی کے ساتھ استنجاء کرنے سے منع فرمایا[2]۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: لعنت کا سبب بننے والے دو کاموں سے بچو۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا، وہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا: لوگوں کے راستے میں اور ان کے سائے کی جگہوں میں رفع حاجت کرنا۔[3]

آپ ﷺ نے سوراخ میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا[4]۔[5]

نبی اکرم ﷺ نے دائیں ہاتھ سے استنجاء کرنے سے منع فرمایا۔[6]

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو کوئی پتھر سے استنجاء کرے وہ طاق پتھر لے۔[7]

نبی اکرم ﷺ نے تین ڈھیلوں سے استنجاء کرنے کا حکم دیا[1]۔[2]

---

[1] بخاری الصلوۃ باب قبلۃ اهل الشام والمشرق حدیث 394 مسلم الطهارة باب الاستطابة حدیث 624 ـ625 اگر بیت الخلاہی قبلہ رخ بنے ہوئے ہوں تو پھر قبلے کی طرف منہ کی بجائے پشت کرنا بہتر ہے بخاری الوضوء باب التبرز فی البیوت حدیث 148 {محمد عبدالجبار}

[2] مسلم الطهارة باب الاستطابة حدیث 626

[3] مسلم الطهارة باب النهی عن التخلی فی الطرق والظلال حدیث 629

[4] ابو دؤد باب النهی عن البول فی الجحر حدیث 29 اسے حاکم 1/ 186 ذہبی اور نووی نے صحیح کہا ہے

[5] **تبصرہ الف**: اس حدیث کی تصحیح حاکم، ذہبی اور نووی سے نقل کی ہے جبکہ اسی حدیث کو یہاں حاشیہ میں صحیح کہا اور تسہیل الوصول {ص: 45} پر ان تینوں کو رد کرکے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔

تبصرہ ب: اس حدیث میں قتادہ عن کے ساتھ روایت کر رہے ہیں اور قتادہ کو زبیر علی زئی نے اپنی کتاب {جزء قرات ص: 59،93 جزء رفع یدین ص: 39} پر مدلس کہا ہے لیکن یہاں حدیث صحیح بن گئی۔

[6] بخاری الوضوء باب النهی عن الاستنجاء بالیمین حدیث 153ـ154 مسلم الطهارة باب النهی عن الاستنجاء بالیمین حدیث 267

[7] بخاری الوضوء باب الاستنثار فی الوضوء وباب الاستجمار وترا حدیث 161ـ162

نبی اکرم ﷺ نے تین ڈھیلوں سے کم کے ساتھ استنجاء کرنے سے منع فرمایا۔[3]

نبی اکرم ﷺ رفع حاجت کے لئے جاتے تو دور چلے جاتے[4]۔[5]

نبی اکرم ﷺ پانی کے ساتھ بھی استنجاء فرماتے تھے[6]۔

عبد اللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پیشاب کر رہے تھے کہ ایک آدمی نے آپ کو سلام کیا مگر آپ نے اس کا جواب نہ دیا۔[7]

اس سے معلوم ہوا کہ رفع حاجت کی حالت میں کلام کرنا مکروہ ہے۔

سیدنا ابو ھریرہؓ کہتے ہیں کہ جب نبی اکرم ﷺ قضائے حاجت کے لئے جاتے تو میں ایک برتن میں پانی لے آتا، آپ اس سے استنجاء کر لیتے، میں پھر ایک اور برتن میں پانی لے آتا جس سے آپ وضو کر لیتے[8]۔[9]

---

1 ابو داؤد الطهارة باب كرهية استقبال القبلة عند قضاء الحاجة حديث 7 و سنن نسائی 1 /28اسے امام دار قطنی اور نووی نے صحیح کہا ہے

2 تبصرہ: اس روایت کی سند میں ایک راوی محمد بن عجلان ہیں جن کو حافظ زبیر علی زئی نے جزء قراءت {ص:160} اور جزء رفع یدین {ص:77} میں مدلس کہا ہے اور تسہیل الوصول {ص:227} پر ضعیف کہا ہے لیکن یہاں آکر حدیث صحیح ہو گئی ہے۔

3 مسلم الطهارة باب الاستطابة حديث 626

4 ابو داؤد باب الطهارة باب التخلى عند قضاء الحاجة حديث 1 و 2

5 تبصرہ: ابو داؤد کی اس روایت میں ابو الزبیر المکی ہے جو کہ مرحوم علی زئی صاحب کے تصریح کے مطابق مدلس ہے۔ مدلس کی عن والی روایت صحیحین کے علاوہ ان کے اصول کے مطابق ضعیف ہے۔

6 صحيح البخاری الوضوء باب الاستنجاء بالماء حديث 150 و صحيح مسلم الطهارة باب الاستنجاء بالماء من التبرز حديث 670

7 صحيح مسلم الحيض باب التيمم حديث 370

8 ابوداؤد الطهارة باب الرجل يدلک يديه بالارض اذا استنجى حديث 45 ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے۔ معلوم ہوا کہ استنجا اور وضو کا برتن علیحدہ ہونا چاہیئے۔ الا یہ کہ کوئی مجبوری ہو۔

9 تبصرہ: اس روایت کی سند میں ایک راوی شریک القاضی ہیں جو عن سے روایت کر رہے ہیں۔ اس کو بھی مرحوم علی زئی صاحب نے جزء قراءت {ص:74} مدلس کہا ہے۔

جس شخص کو رفع حاجت کی طلب ہو اور نماز کھڑی ہو چکی ہو تو پہلے وہ حاجت سے فراغت پائے پھر نماز پڑھے۔[1]

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جب کھانا حاضر ہو یا پاخانہ وپیشاب کی حاجت شدید ہو تو نماز نہیں ہوتی[2]۔

بول و براز کے دباؤ کی حالت میں انسان اگر نماز پڑھے گا تو نماز میں خشوع، خضوع اور اطمینان حاصل نہ ہوگا، اسلئے نبی اکرم ﷺ نے ان سے فراغت حاصل کرنے کو مقدم فرمایا۔

پیشاب کے چھینٹوں سے بچنے کی تاکید:

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ دو قبروں کے پاس سے گزرے تو فرمایا: ان دونوں قبروں والوں کو عذاب ہو رہا ہے اور باعث عذاب (بچنے کے لحاظ سے تمہارے نزدیک) کوئی بڑی (مشکل) چیز نہیں (اگرچہ گناہ کے لحاظ سے بہت بڑی ہے) ان دونوں میں سے ایک پیشاب سے نہیں بچتا تھا اور دوسرا چغل خور تھا۔[3]

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پیشاب کے چھینٹوں سے سخت پرہیز کرنا چاہئے۔ وہ لوگ جو پیشاب کرتے وقت چھینٹوں سے پرہیز نہیں کرتے، اپنے کپڑوں کو نہیں بچاتے، پیشاب کرکے (پانی یا

---

[1] سنن ابو داؤد الطهارة باب ان يصلي الرجل وهو حاقن حديث 88 سنن ترمذی الطهارة باب ماجاء اذا اقيمت الصلوة ووجد احدكم الخلاء فليبتدء بالخلاء 142 وسنن ابن ماجهالطهارة باب ماجاء في النهي للحاقن ان يصلي حديث 616 اسے امام ترمذی' حاکم 1/ 168 اور ذہبی نے صحیح کہا ہے۔

[2] مسلم المساجد باب كراهة الصلوة بحضرة الطعام حديث 560، (یعنی مکروہ ہے۔)

[3] صحيح بخاري الوضوء باب ماجاء في الغسل البول حديث 618 وباب في الكبائر ان لا يستتر من البول حديث 216 وصحيح مسلم الطهارة باب الدليل على نجاسة البول ووجوب الاستبراء منه حديث 292 ۔غیب کی یہ خبر آپ کو اللہ کی طرف سے بذریعہ وحی ملی تھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کو ہر انسان کے دنیوی اور برزخی حالات کا مفصل علم عطا کیا گیا تھا یہی وجہ ہے کہ جب آپ سے مشرکین کے فوت شدہ بچوں کے انجام کے بابت سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ {بڑے ہوتے تو} کیسے اعمال بجالاتے {اچھے یا برے} دیکھیے بخاری الجنائز باب ما قیل فی اولاد المشرکین حدیث 1384 اس سے معلوم ہوا کہ غیب کے ہر خبر جاننا صرف اللہ تعالی کی صفت ہے جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف وہی خبر جانتے تھے جو اللہ آپ کو بتادیتا تھا۔

ڈھیلوں کی عدم موجودگی میں ٹشو یا ٹاکی وغیرہ سے) استنجاء کئے بغیر فوراً اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کے پاجامے، پتلوں اور جسم وغیرہ پیشاب سے آلودہ ہو جاتے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ پیشاب سے نہ بچنا باعث عذاب اور بڑا گناہ ہے۔

نجاستوں کی تطہیر کا بیان:

ایک اعرابی نے مسجد میں پیشاب کر دیا اور لوگ اس کے پیچھے پڑ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا: دعوہ وھریقوا علی بولہ سجلا من ماء[1]

اسے چھوڑ دو اور (جگہ کو پاک کرنے کے لئے) اس کے پیشاب پر پانی کا ڈول بہا دو۔

پھر آپ نے اسے بلا کر فرمایا: مسجد میں پیشاب اور گندگی کے لئے نہیں بلکہ اللہ کے ذکر، نماز اور قرآن پڑھنے کے لئے (ہوتی) ہیں۔[2]

حیض آلود کپڑے کا حکم:

اسماء بنت ابوبکرؓ روایت کرتی ہیں کہ ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ جس عورت کے کپڑے کو حیض (ماہواری) کا خون لگ جائے تو وہ کیا کرے؟ آپ نے فرمایا: اسے کھرچ لے، پھر چٹکیوں سے مل کر پانی سے دھو لے، پھر اس میں نماز ادا کر لے۔[3]

منی کا دھونا:

امی عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے کپڑے سے منی دھو ڈالتی تھی اور آپ اس کپڑے میں نماز پڑھنے تشریف لے جاتے تھے جبکہ دھونے کا نشان کپڑے پر ہوتا تھا۔[1]

---

[1] بخاری الوضوء باب صب الماء علی البول فی المسجد حدیث 220۔ 6128 و مسلم الطہارۃ باب وجوب غسل البول وغیرہ من انجاسات اذا حصلت فی المسجد حدیث 284۔ 285

[2] ابن ماجۃ الطہارۃ باب الارض یصیبھا البول کیف تغسل حدیث 529

[3] بخاری باب غسل الدم حدیث 227، 307، مسلم باب نجاسۃ الدم و کیفیۃ غسلہ حدیث 291

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کے تحت فرماتے ہیں : ﴾

منی کا دھونا :

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے کپڑے سے خشک منی کو کھرچ دیا کرتی تھی [2]۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ منی کو دھو کر پھر نماز کے لئے جاتے [3]۔

اور ایک دوسری روایت میں ان دونوں حالتوں کی وضاحت ہے :

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے کپڑے پر منی اگر خشک ہوتی تو میں کھرچ دیتی اور اگر تر ہوتی تو میں دھو دیتی [4]۔

واضح رہے کہ کھرچ کر زائل کرنے سے یہ شبہ نہ ہونا چاہیئے کہ منی پاک ہے چونکہ علامہ مبارکپوریؒ فرماتے ہیں : کہ کھرچنے والی روایت منی کی پاکی پر دلالت نہیں کرتی، بلکہ یہ تو خود اس کو پاک کرنے کی ایک کیفیت ہے [5]۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

شیر خوار بچے کا پیشاب :

ام قیسؓ اپنے چھوٹے (شیر خوار) بچے کو جو ابھی کھانا نہیں کھاتا تھا، رسول اللہ ﷺ کے پاس لائیں اور آپ نے اسے اپنی گود میں بٹھا لیا۔ بچے نے آپ کے کپڑے پر پیشاب کر دیا تو آپ نے پانی منگوا کر کپڑے پر چھینٹے مارے اور اسے دھویا نہیں [6]۔

ہم (اہل سنت) تبصرہ کرتے ہیں کہ :

---

[1] بخاري باب غسل المني وفركه حديث: 229، 230، 231، 232، ومسلم باب حكم المني حديث: 291

[2] مسلم، باب حکم المنی

[3] مسلم، باب حکم المنی

[4] دار قطنی

[5] ملخص تحفۃ الاحوذی

[6] بخاری الوضوء باب بول الصبیان حدیث 223 ومسلم الطھارۃ باب حکم بول الطفل الرضیع حدیث 287

الف: حدیث مذکور سے پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی درج شدہ دو احادیث مسلم میں اور ایک حدیث بخاری میں بھی ہے ان کو اگر ذکر کیا جاتا تو مسئلہ واضح ہو جائے گا ان کو دیکھنے سے پتہ چل سکتا ہے کہ بچے کا پیشاب دھونا ہے یا نہیں۔ بخاری میں الفاظ یوں ہیں (فاتبعه اياه)اور مسلم کی ایک حدیث میں {فاتبعه بوله} اور دوسری حدیث میں {فصبه عليه } کے الفاظ ہیں ،ان احادیث کا مطلب پیشاب کے اوپر پانی بہانے سے دھونا مراد ہے۔

(ب) حدیث مذکور لفظ " نضح" کے معانی چھینٹے مارنے کے کی ہے جبکہ نضح کی صحیح معانی چھڑکنا کے آتے ہیں ارو چھڑکنا غسل خفیف کو کہتے ہیں جیسا کہ امام مسلم نضح کے معنی کے بارے میں فرماتے ہیں وانضح فرجك فمعناه اغسل فان النضح يكون غسلا . { شرح مسلم 119/1 باب المذی} یعنی اپنی شرمگاہ کو دھو ڈالو۔ جبکہ مسلم کی دوسری حدیث میں آپ خود لفظ نضح کی معنی دھو ڈال سے کرتے ہیں۔ { نماز نبوی قدیم ص:78 جدید ص:101}

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کے تحت فرماتے ہیں: ﴾

بچے، بچی کا پیشاب ناپاک ہیں:

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ جس چیز پر بچہ نے پیشاب کیا ہے اس کو پاک کرنے کی کیفیت میں تو اختلاف واقع ہوا ہے، لیکن اس کے ناپاک ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں اور بعض علما نے بچہ کے پیشاب کی نجاست پر اجماع امت نقل کیا ہے۔

اگر بچی کپڑے پر پیشاب کردے تو اس کو پاک کرنے کے لئے زیادہ اہتمام سے دھونا چاہیئے جب کہ بچہ کے پیشاب دھونے میں اتنے زیادہ مبالغہ کی ضرورت نہیں۔

بچہ کے پیشاب سے کپڑے کو پاک کرنے کے بارے میں جتنی روایات آئی ہیں ان میں مندرجہ ذیل الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ (1) فصبه عليه ،پانی بہایا جائے (2)فاتبعه بالماء، پانی بہایا (3) ينضح (4) يرش۔ یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ پانی بہانے کا لفظ اس وقت استعمال ہوتا ہے، جب اس چیز کو

دھونے میں زیادہ مبالغہ نہ کیا ہو، اسی طرح احادیث میں نضح اور رش کا معنی بھی دھونا ہے، احادیث سے مبارکہ سے ان معنی "دھونا" ملاحظہ ہو:

عن اسماء قالت جاءت امرءة الی النبي ﷺ فقالت: احدانا يصيب ثوبها من دم الحيضة كيف نصنع به؟ قال: حتيه، ثم تقرصه بالماء ثم تنضحه ثم تصلي فيه[1].

قال النووي رحمہ اللہ: تنضحه اي تغسله.

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں نضح کا معنی ہے دھونا کہ جب ایک عورت نے حیض کے خون کے بابت پوچھا تو آپ ﷺ نے اسے دھونے کا حکم دیا۔

قال ابن حجر والخطابی فی روایة اسماء بان معنی النضح الغسل

علامہ ابن حجر رحمہ اللہ اور علامہ خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا والی روایت میں نضح کا معنی دھونا ہے۔

اسی طرح "رش" بھی دھونے کے معنی میں ہے:

عن اسماء بنت ابي بكر رضي الله عنها ان امرأة سألت النبي ﷺ عن الثوب يصبه الدم من الحيضة فقال رسول الله ﷺ حتيه ثم اقرصيه بالماء ثم رشيه وصلي فيه[2].

قال المبارکفوری رحمہ اللہ: قرص کا معنی ہے انگلیوں سے کپڑے کو ملنا تاکہ وہ خون تحلیل ہو کر نکلنے کے قابل ہو جائے۔

ثم رشيه اى صبى الماء عليه

پھر اس پر رش کرے یعنی اس پر پانی بہائے[3]۔

---

[1] مسلم، باب نجاسة الدم وکیفیة غسله

[2] ترمذی، ماجاء فی غسل دم الحیض من الثوب

[3] تحفة الاحوذی، ج: 1/ص: 424

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دودھ پیتے بچے کی بابت فرمایا: بچی کا پیشاب مبالغہ سے دھویا جائے گا اور بچے کے پیشاب کو ہلکا سا دھونا کافی ہے، جیسا کہ دوسری روایت میں ہے : عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت : أتی رسول اللہ ﷺ بصبی یرضع فبال فی حجرہ فدعا بالماء فصبہ علیہ [1].

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک دودھ پیتا بچہ لایا گیا جس نے آپ کی گود میں پیشاب کر دیا، آپ ﷺ نے پانی منگوایا اور اس پر بہا دیا۔

لبابہ بنت حارثؓ روایت کرتی ہیں کہ حسین بن علیؓ نے رسول اللہ ﷺ کی گود میں پیشاب کر دیا (جو ابھی شیر خوار ہی تھے) میں نے عرض کیا: کوئی اور کپڑا پہن لیں اور یہ تہ بند مجھے دے دیں تاکہ میں دھولوں تو آپ نے فرمایا: لڑکی کا پیشاب دھویا جاتا ہے اور لڑکے کے پیشاب پر چھینٹے مارے جاتے ہیں [2]۔

تبصرہ:

اس حدیث کا مطلب بھی وہی ہے جو پیچھے گزر گیا کہ چھینٹے مارنے سے مراد معمولی دھونا ہے۔

نجاست آلود جوتا

سیدنا ابو سعیدؓ روایت، کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی مسجد آئے تو وہ دیکھ لے اگر جوتوں میں گندگی لگی ہو تو (زمین پر) رگڑنے کے بعد ان میں نماز پڑھے۔[3]

کتے کا جھوٹا :

سیدنا عبد اللہ بن مغفلؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر کتا کسی کے برتن میں منہ ڈال جائے (یا بعض روایات کے مطابق پانی وغیرہ پی لے) تو برتن کو سات بار پانی سے دھو ڈالے اور پہلی بار مٹی سے مانجھے [1]۔

---

[1] مسلم، حکم بول الطفل الرضیع

[3] ابو داؤد الصلوۃ باب الصلوۃ فی النعل حدیث 650 اسے حاکم ذہبی اور ابن خزیمہ 2/ 107 حدیث 1017 نے صحیح کہا ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

مردار کا چمڑا :

حضرت بریرہؓ کی بکری مر گئی جوان کی لونڈی کو کسی نے صدقے میں دی تھی۔ نبی اکرم ﷺ اس کے پاس سے گزرے اور پوچھا کہ تم نے اس کا چمڑا اتار کر رنگ کیوں نہیں لیا تاکہ اس سے فائدہ اٹھاتے؟ لوگوں نے کہا: وہ تو مردار ہے۔ آپ نے فرمایا: اس کا صرف کھانا حرام ہے[2]۔[3]

ام المؤمنین سودہؓ نے فرمایا کہ ہماری بکری مر گئی۔ ہم نے اس کا چمڑا رنگ کر مشک بنالی، پھر ہم اس میں نبیذ (کھجور کا مشروب) بناتے رہے یہاں تک کہ وہ پرانی ہو گئی۔[4]

نبی اکرم ﷺ نے درندوں کی کھال استعمال کرنے سے منع فرمایا ہے[5]۔

غیر مقلد احباب کی اس روایت پر ہمارا تبصرہ یہ ہے کہ : اس حدیث کا مرکزی راوی سماک بن حرب ہے اس کے بارے میں عبد اللہ بن مبارک فرماتے ہیں۔ {ضعیف فی الحدیث} امام احمد بن حنبل، امام شعبہ، امام صالح بن محمد البغدادی، امام نسائی، امام عبد الرحمٰن بن یوسف بن خراش، اور امام یعقوب نے ان کو ضعیف کہا ہے {تہذیب الکمال} اور آپ کا اصول یہ ہے کہ جس راوی کو جمہور ضعیف کہے وہ ضعیف ہوگا {نور العینین ص: 61} رفع یدین کے مسئلے میں عبد اللہ بن مبارک کی تقلید کرتے ہوئے حدیث کو غیر ثابت کرتے ہیں تو یہاں عبد اللہ بن مبارک کو کیوں چھوڑا جارہا ہے؟۔

[1] صحیح مسلم الطہارۃ باب حکم ولوغ الکلب حدیث 279۔ 280

[2] بخاری البیوع باب جلود المیتۃ قبل ان تدبغ حدیث 2221۔ 1492 مسلم الحیض باب الطہارۃ جلود المیتۃ بالدباغ حدیث 363

[3] **تبصرہ**: اس روایت کی سند میں سفیان کا عنعنہ ہے جس کے بارے میں زبیر علی زئی فرماتے ہیں" لہذا سفیان ثوری جو کہ ضعفا اور مجاہیل سے تدلیس کرتے تھے کی یہ عن ولی روایت ضعیف ہے۔ {نور العینین ص: 138} نماز نبوی جدید میں یہ حدیث حذف کر دی گئی ہے۔

[4] بخاری الایمان باب اذا حلف ان لایشرب نبیذا فشرب طلاء او سکرا او عصیرا لم یحنث حدیث 6686

[5] ابو داؤد اللباس باب فی اھب المیتۃ حدیث 4132 ترمذی اللباس باب ماجاء فی النھی عن جلود السباع حدیث 1775 اسے حاکم اور ذہبی نے صحیح کہا ہے

تبصرہ الف:

لیکن یہاں ترجمہ میں ترمیم کی گئی ہے ،اس لئے کہ جامع ترمذی کے الفاظ ہیں " نبی ﷺ نے درندوں کے کھال بچھانے سے منع فرمایا" ابوداوٗد (ص:121)کے الفاظ ہیں کہ نبی ﷺ نے درندوں کے کھال پہننے اور ران پر سوار ہونے سے منع فرمایا جبکہ ڈاکٹر شفیق الرحمٰن زیدی صاحب اپنی کتاب نماز نبوی میں ترجمہ کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے درندوں کے کھال استعمال کرنے سے منع فرمایا ۔یہ ترجمہ غلط ہے اس لئے کہ حدیث کے الفاظ میں صراحت کے ساتھ تین چیزوں کی وضاحت ہے جبکہ زیدی صاحب عام اور مطلق منع کر رہے ہیں۔

تبصرہ ب:

جامع ترمذی کی روایت آپ کے اصول کے مطابق قتادہ کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے { جزء قراءت ص:59جزء رفع یدین ص:39 } اور آپ کے اصول کے مطابق جب حدیث ضعیف ہو تو اس کو آپ ﷺ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیئے۔

تبصرہ ج:

ابوداوٗد کی کھال پہننے اور ران پر سوار ہونے سے منع والی حدیث کا راوی بقیہ بن ولید ہے اور یہ اتنے مشہور مدلس ہیں کہ ان کی تدلیس کی مثالیں دی جاتی ہیں (طبقات المدلسین لابن حجر) اور آپ کا اپنا اصول ہے کہ راوی کا مدلس ہونا ثابت ہو جائے چاہے ایک دفعہ ہی کیوں نہ ہو اس کی عنعنہ والی روایت ضعیف ہو گی {نورالعینین ص:138}۔

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کے تحت فرماتے ہیں : ﴾

خنزیر کے علاوہ ہر چمڑہ دباغت سے پاک ہوتا ہے:

وہ احادیث جن میں درندوں کے چمڑوں کے استعمال سے منع کیا گیا ہے ان سے یہ استدلال کرنا کہ دباغت سے درندوں کے چمڑے پاک نہیں ہوتے درست نہیں، کیونکہ ان احادیث کی تحقیق اور مقتضی یہ ہے کہ ہر قسم کے چمڑے دباغت سے پاک ہو جاتے ہیں ان سے یہ خاص کیے گے ہیں تو یہ استدلال

صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ احادیث میں جو منع اور نہی وارد ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جائے گا کہ یہ نہی اس کے استعمال سے ہے مثلاً اس پر لیٹنا، سواری کرنا وغیرہ اور استعمال سے نہی کا وارد ہونا ملزم نہیں اس کی نجاست کو کہ یہ نجس بھی ہے جیسا کہ سونے اور ریشم کے استعمال سے نہی مستلزم نہیں اس کی نجاست کو۔

خنزیر کے علاوہ ہر چمڑا دباغت سے پاک ہوتا ہے احادیث صحیحہ کی روشنی:

1- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول خدا ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب چمڑے کو دباغت دی جائے وہ پاک ہو جاتا ہے۔ اس روایت کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ (ج: 1/ص: 95 حدیث 838)

2- اور عزیزی میں سند صحیح کے ساتھ عبداللہ بن حرث رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ ہر چمڑے کی پاکی اس کو دباغت دینا ہے (مسک میم کے فتحہ اور سین کے سکون کے ساتھ چمڑے کو کہتے ہیں) اس روایت کو امام حاکم نے روایت کیا ہے اور یہ صحیح حدیث ہے۔ (العزیزی ج: 2/ص: 273)

3- حضرت سلمہ بن المحبق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ غزوہ تبوک میں تھے آپ ﷺ نے ایک عورت کے ہاں سے پانی منگایا تو اس عورت نے کہا کہ میرے پاس پانی نہیں مگر ایک ایسے مشکیزے میں جو مردار کے چمڑے سے بنا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا آپ نے اس کو دباغت نہیں دی؟ عورت نے جواب دیا کہ دباغت دی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا بیشک چمڑے کی دباغت اس کی پاکی ہے۔ (نسائی ج: 2/ص: 190) امام نسائی سند سے خاموش رہے، اور امام احمد نے اپنے مسند میں اس کو روایت کیا ہے (حدیث نمبر 25654) اور اس کی سند صحیح ہے، ابن سعد اور ابن حزم نے اور ان کے علاوہ نے اس کی تصحیح کی ہے کہ ان کا صحابی ہونا ثابت ہے۔

4- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا کی بکری مر گئی تو عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ فلانی مر گئی یعنی بکری تو آپ ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں:

قُلْ لَا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَنْ يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنْزِيرٍ

"کہہ دیجئے اے پیغمبر میں نہیں پاتا اس میں جو میری طرف وحی کی گئی حرام کو ہر کھانے والے چیز کو جو وہ کھاتا ہے مگر یہ کہ وہ کھائی جانی والی چیز مردار ہو یا بہنے والا خون ہو یا خنزیر کا گوشت ہو" پس تم تو اس کو کھاتے نہیں ہو اگر تم اس کو دباعنت دیدیتے تو اس سے نفع اٹھاتے، تو سودہ بنت زمعہؓ نے اس کی طرف آدمی بھیجا اور بکری کا چمڑا نکالا گیا اور اس کو دباعنت دی گئی تو حضرت سودہؓ اس چمڑے سے مشکیزہ بنایا، یہاں تک وہ مشکیزہ ان کے پاس پرانا ہو کر پھٹ گیا۔ اس کو امام احمد نے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ (نیل الاوطار ج:1/ص:63)

ترمذی اور ابوداؤد کی روایات کا مطلب:

آپ ﷺ نے چمڑے پر سوار ہونے سے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ ظالموں کا طریقہ ہے اور متکبرین کا عمل ہے۔ واللہ تعالی اعلم (فتح الودود)

ابن الملک نے کہا کہ انمار نمرۃ کی جمع ہے، وہ سلی ہوئی چادر ہوتی تھی اس میں کراہت تنزیہی ہے اس کی اور کوئی وجہ ظاہر نہیں اس کے سوا کہ وہ سلائی سرخ ہوتی تھی، پس یہ بادشاہ لوگوں کے کپڑوں کی مشابہ ہو جاتی اس وقت[1]۔

اور نہی اس سے اس وجہ سے وارد ہوئی کہ یہ اسراف والوں اور متکبرین کی سواریاں ہیں[2]۔

حضرت عبد اللہ بن عباس ﷺ سے روایت ہے کہ حضرت میمونہؓ کی ایک باندھی پر ایک بکری صدقہ کی گئی پس وہ بکری مر گئی آپ ﷺ کا وہاں سے گزر ہوا تو فرمایا کہ آپ نے اس کا چمڑا اتارا کیوں نہیں، پھر اس کو دباعنت دیدیتے اور پھر اس سے فائدہ اٹھاتے تو صحابہ نے عرض کیا کہ یہ مردار ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کا کھانا صرف حرام ہے۔

---

[1] سنن ابی اداؤد حاشیہ ج:2/ص: 216 باب جلود النمور

[2] مرقاۃ الصعود / سنن ابی داؤد حاشیہ ج:2/ص:216 باب جلود النمور

اس روایت کو امام مسلم نے اپنی کتاب میں کتاب الحیض فی طہارۃ جلود المیتۃ بالدباغ میں نقل کیا ہے (حدیث نمبر 832) اور دار قطنی نے کتاب الحیض میں نقل کیا ہے۔ (حدیث نمبر 103)

بلی کا جھوٹا :

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بلی نجس نہیں ہے۔[1]

لہٰذا بلی کا جھوٹا پاک ہے۔

سونے چاندی کے برتن میں کھانا :

ام سلمہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص سونے چاندی کے برتنوں میں کھاتا پیتا ہے۔ وہ اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ داخل کرتا ہے۔[2]

جنابت اور حیض سے متعلقہ احکام و مسائل

مندرجہ ذیل حالتوں میں غسل کرنا فرض ہو جاتا ہے۔

جوش اور شہوت کے ساتھ منی خارج ہونے کے بعد (اس میں احتلام بھی داخل ہے)

جماع کے بعد، خواہ انزال ہو یا نہ ہو۔

حیض کے بعد

نفاس کے بعد[3]

صحبت اور غسل جنابت

ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ کے درمیان غسل جنابت کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ ایک گروہ کہتا تھا کہ غسل صرف دخول پر فرض ہو جاتا ہے انزال شرط نہیں۔ دوسرا گروہ بیان کرتا تھا کہ وجوب غسل کے لئے

---

[1] ابو داؤد الطہارۃ باب سور الھرۃ حدیث 75 ترمذی الطہارۃ باب ماجاءفی سور الھرۃ حدیث 92 اسے ترمذی حاکم ذہبی او رنووی نے صحیح کہا ہے

[2] صحیح مسلم اللباس باب تحریم استعمال اوانی الذھب والفضۃ فی الشرب وغیرہ حدیث 2065

[3] وہ خون جو بچے کی پیدائش پر جاری ہوتا ہے۔ {مؤلف}

دخول کے ساتھ انزال بھی شرط ہے۔ یہ طویل مباحثہ کسی فیصلہ کن نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ آخر کار سیدنا ابو موسیٰ اشعریؓ نے اس مسئلے کے حل کی ذمہ داری لی، انہوں نے ام المؤمنین عائشہؓ سے اس بارے میں دریافت کیا، عائشہؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اذا جلس بین شعبها الاربع ومس الختان الختان فقد وجب الغسل.

جب مرد، عورت کی چار شاخوں کے درمیان بیٹھ جائے اور اس کا محل ختنہ عورت کے ختنہ کے ساتھ مس کرے تو غسل واجب ہو جاتا ہے[1]۔

تو مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ صرف دخول پر مرد اور عورت جنبی ہو جاتے ہیں اور ان پر غسل واجب ہو جاتا ہے۔ انزال شرط نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب مرد، عورت کی چار شاخوں کے درمیان بیٹھ کر صحبت کرے تو غسل واجب ہو گیا، اگرچہ منی نہ نکلے[2]۔

عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے:

ام المؤمنین ام سلمہؓ روایت کرتی ہیں کہ ام سلیمؓ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: اے اللہ کے رسول! یقیناً اللہ حق سے نہیں شرماتا (میں بھی آپ سے مسئلہ پوچھنا چاہتی ہوں) کیا عورت پر غسل واجب ہے جب اسے احتلام ہو جائے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، جب وہ پانی (منی کا نشان) دیکھے۔ اس پر ام سلمہؓ نے (شرم سے) منہ چھپا لیا اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا: ہاں (ہوتا ہے) تیرا داہنا ہاتھ خاک آلود ہو (اگر ایسا نہیں) تو بتاؤ کہ پھر بچے کی ماں کیساتھ مشابہت کیسے ہو جاتی ہے؟[3]

---

[1] بخاری الغسل باب اذا التقی الختانان حدیث 691 مسلم الحیض 348 واللفظ له

[2] صحیح مسلم الحیض باب نسخ الماءمن الماء و وجوب الغسل بالتقاء الختانین حدیث 349

[3] بخاري الغسل باب اذا احتلمت المراة بخروج المني منها حديث313 . آخری جملہ بد دعا نہیں محض ایک محاورہ ہے مراد تنبیہ کرنا ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

معلوم ہوا کہ عورت یا مرد نیند سے اٹھ کر اگر تری، یعنی نشان منی دیکھے تو (یہ احتلام کی علامت ہے لہٰذا) ان پر غسل کرنا فرض ہو جاتا ہے اور اگر احتلام کی کیفیت انہیں یاد ہو لیکن نشان نہ پائیں تو غسل فرض نہیں ہوگا، ایسی صورت میں شک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

جنبی عورت کے بالوں کا مسئلہ :

ام سلمہؓ روایت کرتی ہیں کہ میں نے کہا؛اے اللہ کے رسول! میں اپنے سر کے بال خوب مضبوط گوندھتی ہوں۔ کیا میں انہیں غسل جنابت کے وقت کھولا کروں۔ آپ نے فرمایا: ان کا کھولنا ضروری نہیں۔ تیرے لئے یہی کافی ہے کہ تین لپ پانی اپنے سر پر ڈالے، پھر اپنے سارے بدن پر پانی بہائے ،پس تو پاک ہو جائے گی۔[1]

عائشہؓ کو خبر ملی کہ عبداللہ بن عمروؓ عورتوں کو غسل جنابت کے لئے بال کھولنے کا حکم دیتے ہیں۔ آپ فرمانے لگیں: ابن عمرو پر تعجب ہے، انہوں نے عورتوں کو تکلیف میں ڈال دیا ہے کہ وہ عورتوں کو غسل کے وقت سر کے بال کھولنے کا حکم دیتے ہیں۔ وہ انہیں سر منڈوانے کا حکم کیوں نہیں دے دیتے ؟میں اور رسول اللہ ﷺ ایک ہی برتن سے غسل کرتے اور اپنے (بال کھولے بغیر) سر پر تین چلو سے زیادہ پانی نہیں ڈالتی تھی[2]۔

معلوم ہوا کہ غسل جنابت کے لئے بال کھولنے کی ضرورت نہیں مگر یہ حکم صرف غسل جنابت کا ہے۔ غسل حیض کے لئے بالوں کو کھولنا غسل ضروری ہے۔

عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہیں رسول اللہ ﷺ نے، جب وہ حائضہ تھیں، فرمایا: اپنے بال کھولو اور غسل کرو۔[3]

---

[1] صحیح مسلم الحیض باب حکم ضفائر المغتسلة حدیث 330

[2] ابن خزیمہ/ 123 حدیث 247 مسلم الحیض باب حکم ضفائر المغتسلة حدیث 331
محققین روایت ودرایت کے نزدیک غسل جنابت پر قیاس کرکے کھولنا ضروری نہیں۔

[3] ابن ماجة الطهارة باب في الحائض كيف تغتسل حديث 641 موصیری نے کہا ہے کہ اس کے روای ثقہ ہے

جنبی سے میل جول اور مصافحہ جائز ہے:

سیدنا ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن بحالت جنابت میں نے رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی۔ آپ نے میرا ہاتھ پکڑا اور میں آپ کے ساتھ ہو لیا۔ آپ ایک جگہ بیٹھ گئے اور میں چپکے سے نکل گیا اور گھر جا کر غسل کیا، پھر واپس آیا۔ آپ ابھی بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے پوچھا: اے ابوہریرہ! تو کہاں گیا تھا؟ میں نے سارا حال کہہ سنایا تو آپ نے فرمایا: سبحان اللہ، تحقیق مومن ناپاک نہیں ہوتا۔[1]

نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان کا مطلب کہ مومن ناپاک نہیں ہوتا، یہ ہے کہ مومن حقیقتاً نجس اور پلید نہیں ہوتا۔ جنابت، حکمی نجاست ہے حقیقی و حسی نہیں، یعنی شریعت نے مصلحت کی بنا پر ایک حالت میں بوجہ نجس حکمی اس پر غسل واجب کیا ہے، چنانچہ جنبی کے ساتھ ملنا جلنا، اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا سب جائز ہے۔

سیدنا عمرؓ نے آپ سے پوچھا کہ مجھے رات کو جنابت لاحق ہو جاتی ہے (نہانے کی ضرورت پڑ جاتی ہے) تو آپ نے فرمایا: وضو کرو، اپنی شرمگاہ دھوؤ، پھر سو جایا کرو۔[2]

رسول اللہ ﷺ جب حالت جنابت میں کھانا یا سونا چاہتے تو نماز کے وضو کی طرح وضو کرتے۔[3]

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو کوئی اپنی بیوی سے صحبت کرے اور پھر دوبارہ (صحبت) کرنا چاہے تو اسے وضو کر لینا چاہئے۔[4]

---

[1] صحیح بخاری الغسل باب عرق الجنب وان المسلم لاینجس حدیث 283 وباب الجنب یخرج ویمشی فی السوق حدیث 285 وصحیح مسلم الحیض باب الدلیل علی ان المسلم لاینجس حدیث 371

[2] بخاری الغسل باب الجنب یتوضأ ثم ینام حدیث 290 مسلم الحیض باب جواز نوم الجنب حدیث 306

[3] بخاری الغسل باب الجنب یتوضأ ثم ینام 288 مسلم الحیض باب جواز نوم الجنب حدیث 305 واللفظ له

[4] مسلم الحیض باب جواز نوم الجنب حدیث 308

حائضہ سے جماع کرنے کی ممانعت :

حیض کی حالت میں عورت سے مجامعت کرنا سخت گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

فاعتزلوا النساء فی المحیض[1]

'پس (ایام) حیض میں عورتوں سے کنارہ کشی کرو (صحبت نہ کرو)۔

اگر کوئی اس گناہ کا مرتکب ہو جائے تو اس کی بابت نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص بحالت حیض اپنی عورت سے صحبت کرے تو اسے چاہئے کہ ایک دینار یا نصف دینار خیرات کرے[2]۔

دینار ساڑھے چار ماشے سونے کا ہوتا ہے تو نصف دینار سوا دو ماشے سونا ہوا، لہٰذا ساڑھے چار ماشے یا سوا دو ماشے سونا یا اس کی قیمت صدقہ کرے، یعنی کسی مستحق کو دے دے اور آئندہ کے لئے توبہ کرے۔

مذی کے خارج ہونے سے غسل واجب نہیں ہوتا :

سیدنا علیؓ بہت طاقتور نوجوان تھے اور آپ کو مذی کثرت سے آتی تھی۔ آپ کو مسئلہ معلوم نہ تھا کہ مذی کے خارج ہونے پر غسل واجب ہوتا ہے یا نہیں۔ چونکہ آپ رسول اللہ ﷺ کے داماد تھے، اس لئے بالمشافہ دریافت کرتے شرم محسوس کی تو اپنے دوست سیدنا مقدادؓ سے کہا کہ وہ مسئلہ دریافت کریں۔ مقدادؓ نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا تو آپ نے مذی کے خارج ہونے پر غسل واجب قرار نہ دیا بلکہ فرمایا: (اس نکلنے پر) صرف وضو کرنا چاہئے[3]۔

---

[1] البقر 222/2

[2] ابو داؤد الطهارة باب اتيان الحائض حديث 264 والنكاح باب في الكفارة من اتي حائضا حديث 2168 نسائي 1 /93 وترمذي الطهارة باب ماجاء في الكفارة في ذالك حديث 136 امام حاکم 1 /171.172 اور ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے۔ ماہرین روایت ودرایت کے نزدیک صدقہ کرنا مستحب ہے۔

[3] بخاری العلم باب من استحي فامر غيره بالسوال حديث 132 والوضوء باب من لم ير الوضوء الا من المخرجين من القبل والدبر حديث 178 ومسلم الحيض باب المذي حديث 303

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر مذی خارج ہو تو ذکر (آلہ تناسل) کو دھو لو اور وضو کرو[1]۔

نیز فرمایا: اور کپڑے پر جہاں مذی لگنے کا خیال ہو ایک چلو پانی لے کر چھڑک لینا کافی ہے[2]۔

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کے تحت فرماتے ہیں: ﴾

مذی سے وضو ٹوٹنے کا حکم:

حضرت سہل بن حنیفؓ سے مروی ہے اور اس میں مذی سے وضو ٹوٹنے کا ذکر ہے، کی تائید علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی احادیث سے بھی ہوتی ہے۔

اس حدیث کو بخاری، (132، 178، 269، العلم والوضوء والغسل) مسلم (ج: 3/ص: 312، 313) نے مختلف طرق اور مختلف سیاق سے روایت کیا ہے، سہل بن حنیفؓ کی حدیث میں، اسی طرح عبد اللہ بن سعدؓ کی حدیث میں بھی مذی کا یہی حکم ذکر ہوا ہے۔

حدیث سہل کو احمد (ج: 4/ ص: 485، ابوداؤد، ص:210، ابن ماجہ (506) میں روایت کیا ہے، اور اس کی سند حسن درجے کی ہے، اس میں ابن اسحاق ہیں جو مدلس ہیں مگر ترمذی اور دارمی کے علاوہ باقی سب کتب میں ان کی تحدیث کی صراحت موجود ہے، ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

حدیث عبداللہ بن مسعودؓ کو احمد (ج: 4/ ص: 342، ابوداؤد، ص: 211) نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند بھی حسن درجہ کی ہے۔ (القول المقبول، ص: 128، ت129)

بنابر ایں محمد بن اسحاق کی روایت مذکورہ روایات سے مؤید ہونے کی وجہ سے حسن درجہ کی ہے، لہٰذا علامہ نیمویؒ کا اس کو حسن کہنا درست ہے۔

---

[1] بخاری الغسل باب غسل المذی والوضوء منه حدیث 269 و مسلم حوالہ مذکورہ حدیث 303

[2] ابو داؤد الطهارة باب فی المذی حدیث 210 ترمذی الطهارة باب فی المذی یصیب الثوب حدیث 115 امام ترمذی نے اسے حسن صحیح کہا ہے۔

محدثین فقہاء فرماتے ہیں کہ حدیث کا مطلب ہے کہ معمولی دھو لیا جائے۔

مذی، منی اور ودی میں فرق:

مذی۔اس لیس دا پتلے پانی کو کہتے ہیں جو شہوت کے وقت لذت و جوش کے بغیر شرمگاہ سے نکلتا ہے اور بسا اوقات اس کے نکلنے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔اس کی وجہ سے غسل فرض نہیں ہوتا،البتہ وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

منی، شرمگاہ سے انزال کے وقت لذت و جوش کے ساتھ خارج ہونے والا سفید پانی ہوتا ہے جو انسانی تخلیق کا مادہ اور اصل ہے اور اس کے اس کیفیت کے ساتھ نکلنے سے غسل فرض ہو جاتا ہے۔

ودی۔وہ گاڑھا سفید مٹیالے رنگ کا پانی جو پیشاب سے قبل یا بعد خارج ہوتا ہے اور بغیر بو کے ہوتا ہے۔اس کے نکلنے پر غسل فرض نہیں ہوتا،البتہ وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

سیلان رحم موجب غسل نہیں :

جن عورتوں کو سفید رطوبت، یعنی لیکوریا[1] کی شکایت ہوتی ہے، اس سے ان پر غسل لازم نہیں ہوتا، تاہم اس کے نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔، لہٰذا وہ وضو کرکے حسب معمول نمازیں ادا کرتی رہیں۔

حائضہ کو چھونا اور اس کے ساتھ کھانا جائز ہے :

سیدنا انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب عورت حیض سے ہوتی تو یہودی اس کے ساتھ کھاتے پیتے نہیں تھے اور نہ اس کے ساتھ گھروں میں اکھٹے رہتے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حائضہ سے ہر کام کرو سوائے جماع کے[2]۔

یعنی حائضہ کے ساتھ کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، ملنا جلنا، اسے چھونا اور بوس و کنار وغیرہ سب باتیں جائز ہیں، سوائے فرج میں مجامعت کے۔

---

[1] **تبصرہ:** یہاں غیر مقلد احباب احباب کی طرف سے فتوی دیا گیا ہے کہ سیلان رحم {لیکوریا} سے غسل لازم نہیں۔ لیکن یہاں پر کوئی دلیل ذکر نہیں کی حالانکہ ان کے نماز نبوی والے اصول کے مطابق مسئلہ وفتوی وہی قابل عمل ہے جو قرآن وحدیث سے مدلل ہو

[2] مسلم الحیض باب جواز غسل الحائض رأس زوجها حدیث 3()2

عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مجھے (حالت حیض میں) ازار باندھنے کا حکم دیتے، سو میں ازار باندھتی۔آپ مجھے گلے لگاتے تھے اور میں حیض والی ہوتی تھی[1]۔

عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مسجد (میں اپنی اعتکاف گاہ) سے مجھے بوریا پکڑانے کا حکم دیا۔ میں نے کہا کہ میں حائضہ ہوں۔آپ نے فرمایا: تیرا حیض تیرے ہاتھ میں نہیں ہے۔[2]

عائشہؓ سے روایت ہے: نبی اکرم ﷺ میری گود کو تکیہ بنا کر قرآن حکیم کی تلاوت کرتے تھے، حالانکہ میں حائضہ ہوتی تھی۔[3]

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

حائضہ کے قرآن پڑھنے کی کراہت:

حالت جنابت و حیض میں قرآن حکیم کی تلاوت کے حرام ہونے کے بارے میں کوئی صحیح حدیث نہیں ہے مگر ان حالتوں میں مکروہ ضرور ہے۔

مہاجر بن قنفذ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بحالت پیشاب کسی نے سلام کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب نہیں دیا۔فراغت کے بعد آپ نے وضو کیا اور فرمایا: میں نے مناسب نہ سمجھا کہ طہارت کے بغیر سلام کا جواب دوں۔[4]

جب حدث اصغر کی حالت میں سلام کا جواب دینا مکروہ ہوا تو جنبی کا قرآن کی تلاوت کرنا بالاولیٰ مکروہ ہوا۔البتہ باقی اذکار کی بابت امام نووی فرماتے ہیں: جنبی کے لئے تسبیح، تحمید، تکبیر اور دیگر

---

[1] بخاري الحيض باب مباشرة الحائض حديث 300,302 وللفظ له ومسلم الحيض باب مبشرة الحائض فوف الازار حديث 293

[2] مسلم الحيض باب جواز غسل الحائض رأس زوجها حديث 298

[3] بخارى الحيض باب قراء الرجل في حجر امرأته وهي حائض حديث 297 مسلم الحيض باب جواز غسل الحائض رأس زوجها 301

[4] ابوداؤد الطهارة باب ايرد السلام وهو يبول حديث 17 نسائي ابن ماجه الطهارة باب الرجل يسلم عليه وهو يبول حاكم 1 /479۔167 ذہبی اور نووی نے صحیح کہا ہے

دعائیں اور اذکار بالاجماع جائز ہیں۔ {المجموع} اس کی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے آپ فرماتی ہیں میں ایام حج میں حائضہ ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیت اللہ کیے طواف کے علاوہ باقی ہر وہ کام کرو جو حاجی کرتا ہے[1]۔[2]

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حیض والی عورتوں کو بھی عید کے روز عیدگاہ جانے کا حکم دیا تاکہ وہ لوگوں کے تکبیروں کے ساتھ تکبیریں کہیں اور ان کے دعا کے ساتھ دعا کریں لیکن نماز نہ پڑھیں[3]۔

﴿ اہل سنت فرماتے ہیں: ﴾

غیر مقلد احباب حالت حیض میں تلاوت قرآن کے جواز پر دوسری دلیل ام عطیہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث سے لیتے ہیں حالانکہ اس حدیث میں بھی تلاوت قرآن کے بارے میں موہوم سا اشارہ بھی موجود نہیں۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ اس مسئلے پر کوئی مقبول، صحیح یا حسن حدیث موجود نہیں ہے حالانکہ جامع ترمذی میں اس بارے روایت موجود ہے اور صحیح بھی ہے۔ {کتاب الطھارۃ باب ماجاء فی الجنب والحائض انہ مالایقران القران} عبد اللہ بن عمر کی حدیث کہ حائضہ اور جنبی قرآن میں سے کچھ نہ پڑھے۔ امام ترمذی اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ یہی صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں سے اکثر اہل علم کا قول ہے جیسے سفیان ثوری، ابن مبارک، شافعی، اسحاق اور احمد بن حنبل۔ یہ

---

[1] صحیح بخاری الحیض باب الامر بالنفساء اذا نفس حدیث 294 والحج باب تقضی الحائض المناسک کلھا الا الطواف بالبیت حدیث 1650 وصحیح مسلم الحج باب بیان وجوھالاحرام 1211

[2] **تبصرہ الف:** عجیب بات یہاں پر حالت حیض میں تلاوت قرآن کو مکروہ کہا ہے جبکہ نبوی طبع جدید میں حائضہ کے تلاوت قرآن کو جائز کہا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ حدث اصغر کی حالت میں سلام کا جواب دینا مکروہ ہے لیکن حالت حیض میں قرآن کریم کی تلاوت جائز، عجیب بات ہے یا نہیں؟۔

تبصرہ ب: حالت حیض میں تلاوت قرآن پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ حدیث سے استدلال کی جاتی ہے۔ حالانکہ اس حدیث میں قرآن کریم کے تلاوت کے بارے میں نہ کوئی صراحت ہے اور نہ ہی تلاوت قرآن امور حج میں شامل ہے۔

[3] بخاری باب خروج النساء والحیض المصلی حدیث 890

حضرات کہتے ہیں کہ حائضہ اور جنبی کے لئے کسی آیت کے ایک ٹکڑے یا حرف وغیرہ سے زیادہ پڑھنے کی ممانعت ہے۔

اس روایت میں اسماعیل بن عیاش ضعیف ہے لیکن امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں: اسماعیل بن عیاش بقیہ سے بہتر ہے۔ جامع ترمذی حوالہ بالا۔

عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے رہتے تھے[1]۔

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کے تحت فرماتے ہیں: ﴾

حائضہ اور جنبی کا قرآن پڑھنا جائز نہیں:

حضر ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ حائضہ اور جنبی قرآن کریم میں سے کچھ بھی نہیں پڑھیں۔

یہی اکثر اہل علم اصحاب النبی تابعین اور تبع تابعین مثلا سفیان ثوری، ابن المبارک، امام شافعی، احمد، اسحاق اور دیگر اہل علم کا قول ہے کہ حائضہ اور جنبی قرآن میں سے کچھ بھی نہ پڑھیں الا یہ کہ آیت کا ایک ٹکڑا یا ایک حرف پڑھ سکتے ہیں۔ قرآن کے علاوہ تسبیح اور تہلیل (اور تمام ادعیہ ماثور کا پڑھنا بالاتفاق تمام ائمہ کے نزدیک) جائز ہے[2]۔

حضرت علی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں ہر حال میں قرآن سکھاتے سوائے حالت جنابت میں[3]۔

حضرت علی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں قرآن تب پڑھاتے جب ہم جنبی نہ ہو۔

---

[1] مسلم الحیض باب ذکر اللہ تعالی فی حال الجنابة وغیرها حدیث 373

[2] ابن ماجه كتاب الطهارة وسننها ،باب ماجاء في قراءة القرآن علي غير طهارة حديث 595

[3] قال ابو عيسي حديث علي حديث حسن صحيح . النسائيّ ،كتاب الطهارة ،باب حجب الجنب من قراءة القرآن حديث , حديث 265 , اخرجه الحميدي ج:1 /ص:31 , وابن خزيمه ج: 1 /ص:104 حديث 208

جمہور (حائضہ اور جنبی کے قرآن پڑھنے سے) منع کرنے پر حضرت علی کے اس روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ قرآن پڑھنے سے نہیں روکتے تھے مگر جنبی آدمی کو[1]۔

مذکورہ روایات سے معلوم ہوا کہ اکثر اہل علم صحابہ رضی اللہ عنہم تابعین اور تبع تابعین کا مذہب یہی ہے کہ حائضہ اور جنبی کا قرآن پڑھنا جائز نہیں ہے۔ البتہ حائضہ کے لئے قرآن کے مکمل آیت کے

[1] رواه اصحاب السنن وصححه الترمذي وابن حبان، بحواله تحفة الاحوذي ج:1 / ص: 430

جنبی کا قرآن پڑھنا:

یہ سب روایتیں قائین کرام کی خدمت میں پیش کر دی گئی ہیں تاکہ امام بخاریؒ کے اس قول کی حقیقت واضح ہو جائے جو انہوں نے حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کیا ہے، پہلی ایک روایت کے سوا باقی سب میں قراءۃ قرآن سے جنبی وحائضہ کو منع کیا گیا ہے، پس معلوم ہوا کہ امام بخاریؒ نے اس روایت کی سند کو ذکر نہیں کیا کیونکہ حماد بن ابی سلیمانؒ ان کی شرط پر نہیں ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ صحیح بخاری میں ان سے سندا کوئی روایت نہیں لی ہاں تعلیقات لی ہیں، نیز حمادؒ کی روایت چوتھے نمبر پر ہم نے ذکر کی ہے اس میں جنبی وحائض دونوں کو قراءۃ سے منع کیا گیا ہے کہ پوری آیت نہیں پڑھ سکتے۔ فلہذا امام بخاریؒ کی یہ دلیل تو ان کے لئے کچھ فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکی۔

حافظ صاحب نے "تعلیق التعلیق" (ج:2/ ص:171) میں حضرت ابن عباسؓ سے اپنی سند کے ساتھ ایک روایت اس طرح نقل کی ہے: ابن عباس يقول لابأس ان ايقرأ الجنب الآية ونحوها.

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ کوئی حرج نہیں کہ جنبی ایک آیت اور مثل اس کے پڑھ لے۔

(الجواب) حافظ صاحب نے محنت تو بڑی کی ہے لیکن روایت ایسے راویوں سے نقل کر دی ہے جس میں بعض تو مجہول ہیں اور بعض جھوٹے قسم کے راوی بھی موجود ہیں، چنانچہ اس میں ابو عتبہ ثنا بقیہ سے مراد احمد بن الفرج ابو عتبہ الحمصی ہے جو بقیہ بن ولید سے روایت کرتا ہے، محدث محمد بن عوف الطائی فرماتے ہیں: کہ ابو عتبہ راوی کی اپنے استاد بقیہ سے روایتیں بے اصل ہوتی ہیں، وہ ان روایتوں میں تمام مخلوق سے زیادہ جھوٹ بولنے والا ہے۔ (تہذیب لابن حجر، ج: 1/ ص: 68)

افسوس کہ جانتے ہوئے حافظ صاحب نے ایک من گھڑت روایت امام بخاریؒ کے قول کی تائید میں نقل کر دی ہے۔

قرآن مجید کا جس طرح حائضہ اور جنبی کے لئے پڑھنا حرام ہے اس طرح ہاتھ لگانا بھی حرام ہے۔ ائمہ اربعہؒ کا مسلک یہی ہے جبکہ امام بخاری، داؤد ظاہری وغیرہ کے ہاں ہاتھ لگانا بھی جائز ہے۔ دلائل درج ذیل ہیں:

(دار قطنی، ج:1/ ص. 120تا124، ونصب الرایہ، ج:1/ ص:194تا199، ومستدرک حاکم، ج: 2/ ص: 485، وموطا امام مالک، ص: 69، مشکوۃ، ص: 50، موطا امام محمد، ص: 163، مراسیل ابی داؤد، ص: 4، مجمع الزوائد، ص: 276، سنن الکبری، ج، ص: 88، مستدرک، ج:1/ ص: 397 وغیرہا کتب میں موجود ہیں۔

بغیر آیت کا ایک ٹکڑا یا ایک ایک حرف پڑھنا جائز ہے۔اس کے علاوہ تمام اذکار اور ادعیہ ماثورہ کا پڑھنا حائضہ اور جنبی دونوں کے لئے جائز ہے

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

استحاضہ کا مسئلہ[1] :

استحاضہ یہ ہے کہ[2] ایام حیض کے بعد بھی عورت کے شرمگاہ سے خون کا نکلنا جاری رہے۔ یہ ایک مرض ہے۔ جب عورت اپنے حیض کی عادت کے دن کے پورے کر لے تو پھر اسے غسل کر کے نماز شروع کر دینا لازم ہے کیونکہ خون استحاضہ کا حکم خون حیض سے مختلف ہے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضرت فاطمہ بنت ابو حبیشؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئیں اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول ! مجھے خون استحاضہ آتا ہے اور میں (بوجہ خون استحاضہ) پاک نہیں ہوتی کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں ،خون استحاضہ ایک (اندرونی) رگ (سے بہتا) ہے اور یہ خون، حیض نہیں ہے۔ پس جب تجھے حیض کا خون آئے تو ایام حیض کے بقدر نماز چھوڑ دے اور جس وقت خون حیض بند ہو جائے (اور خون استحاضہ شروع ہو) تو اپنے استحاضہ کے خون کو دھو اور نماز پڑھ۔[3]

حاصل کلام یہ کہ مستحاضہ پاک عورت کی طرح ہے۔ ایام حیض کے بعد غسل کر کے نماز شروع کر دے۔ ہاں یہ بہت ضروری ہے کہ وہ ہر نماز کے لئے نیا وضو کرتی رہے۔

---

[1] **تبصرہ**: اس عنوان کے تحت غیر مقلد بزرگ احباب نے نماز نبوی کے حاشیہ میں جتنے مسائل بیان کئے ہیں اس میں کسی بھی مسئلہ پر کوئی دلیل ذکر نہیں کیا گیا حالانکہ ان کا اصول یہ ہے کہ بغیر دلیل کے مسئلہ و فتوی مردود ہوتا ہے۔

[2] اہل سنت کے نزدیک استحاضہ اس کو کہتے ہے کہ ایام حیض کے دس دن بعد بھی عورت کی شرمگاہ سے خون کا نکلنا جاری رہے، ایام حیض کے آخر میں سفید پانی کے علاوہ تمام تر رنگ حیض ہوتے ہیں۔

[3] صحیح البخاری الحیض باب الاستحاضة حدیث 306 وباب اقبال المحیض و ادبارها حدیث 331 ,320,325

و صحیح مسلم الحیض باب المستحاضة وغسلها حدیث 333

رسول اللہ ﷺ نے فاطمہ بنت ابو حبیشؓ سے یہ بھی فرمایا: ہر نماز کے لئے وضو کر لیا کرو۔[1]

حائضہ کے لئے نماز اور روزے کی ممانعت:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب عورت حیض سے ہوتی ہے تو نماز پڑھتی ہے نہ روزہ رکھتی ہے[2]۔

ایک عورت معاذہؓ نے حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا: کیا وجہ ہے کہ حائضہ عورت روزے کی قضا تو دیتی ہے، نماز کی نہیں۔ عائشہؓ نے فرمایا:

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہمیں حیض آیا کرتا تھا تو ہمیں روزے کی قضا کا حکم تو دیا جاتا مگر نماز کی قضا کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔[3]

نفاس کا حکم:

بچے کی پیدائش کے بعد جو خون آتا ہے، اسے نفاس کہتے ہیں۔ ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ نفاس والی عورتیں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں چالیس دن بیٹھا کرتی تھیں۔[4]

یعنی عام طور پر چالیس دن نفاس کی حالت میں رہتے ہوئے نماز، روزہ اور جماع سے اجتناب کرتی تھیں۔

اکثر صحابہؓ اور تابعینؒ کے نزدیک نفاس کے خون کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن ہے۔ اگر چالیس روز کے بعد بھی خون جاری رہے تو اکثر اہل علم کے نزدیک وہ خون استحاضہ ہے جس میں عورت ہر نماز کے لئے وضو کرتی ہے۔ نفاس کی کم از کم مدت کی کوئی حد نہیں۔

---

[1] بخاری الوضوء باب غسل الدم حدیث 228۔

[2] بخاری الحیض باب ترک الحائض الصوم حدیث 304 مسلم الایمان باب بیان نقصان الایمان حدیث 79

[3] صحیح مسلم الحیض باب وجوب قضاء الصوم علی الحائض دون الصلوۃ حدیث 335

[4] ابو داؤد الطھارۃ باب ماجاء فی وقت النفساء حدیث 311, 312 ترمذی الطھارۃ باب ماجاء فی کم تمکث النفساء حدیث 139 ابن ماجہ الطھارۃ باب النفساء کم تجلس حدیث 648 اسے امام حاکم 1/ 175 اور حافظ ذہبی نے صحیح جبکہ امام نووی نے حسن کہا ہے

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نفاس کی مدت چالیس دن ہے الا یہ کہ خون پہلے ہی بند ہو جائے۔ {بیہقی}

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر عورت کو ولادت کے بعد خون آتا ہی نہیں تو اس پر ضروری ہے کہ وہ غسل کرے اور نماز پڑھے۔

نفاس اور حیض کے خون کا حکم ایک جیسا ہے، یعنی ان حالات میں نماز، روزہ اور جماع منع ہے۔ رسول اللہ ﷺ ایام نفاس کی نمازوں کی قضا کا حکم نہیں دیتے تھے[1]۔

تبصرہ: یہ بات غیر مقلد احباب کی ہے جبکہ حدیث مذکور سے روزے اور جماع کی ممانعت کا حکم لگایا گیا ہے حالانکہ حدیث ان چیزوں کے بارے میں مکمل خاموش ہے۔

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کے تحت فرماتے ہیں: ﴾

نفاس کا شرعی حکم:

امت کا اجماع: تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین تابعین رحمہم اللہ اور ان کے بعد تمام علما کا اجماع ہے کہ نفاس والی عورتیں چالیس دن کی نماز چھوڑ دیں گی۔ البتہ عورت اس مدت سے پہلے ہی طہر محسوس کر لے تو وہ غسل کر کے نماز شروع کر دے[2]۔

طہر کی حد:

طہر کی مدت کم از کم پندرہ روز ہے امام ابرہیم نخعی سے یوں نقل کیا گیا ہے[3]۔

ہمارے اس روایت کے بارے میں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں" لم اجدہ"[4] یہ روایت مجھے نہیں ملی۔

---

[1] ابو داؤد الطہارۃ باب ماجاء فی وقت النفساء حدیث 312 اسے امام حاکم اور ذہبی نے صحیح کہا ہے

[2] وقد اجمع من اصحاب النبی ﷺ والتابعین و من بعدہم علی ان النفساء تدع الصلوۃ اربعین یوما الا ان تری الطہر قبل ذلک فانما تغتسل وتصلی. (ترمذی باب کم تمکث النفساء)

[3] واقل الطهر خمسة عشر يوما هكذا نقل عن ابراهيم النخعي (با الحيض والا ستحاضه)

[4] الدرایہ، ج: 1/ ص: 45

علامہ زیلعی فرماتے ہیں " غریب جدا[1]،

علامہ عینی فرماتے ہیں " یہ روایت ان کتابوں میں نہیں جو احادیث اور اخبار کے متعلق ہیں[2]۔

حافظ ابن الہمام نے اس پر بحث نہیں کی ویسے ہی چھوڑ دیا ہے۔

لیکن اللہ تعالی کا فضل ہے میں کہتا ہوں کہ صاحب ہدایہ حافظ الدنیا تھے، اس کی نگاہ بلند ہے، اس کا مطالعہ بہت وسیع ہے، ان سب نے کہا کہ یہ روایت نہیں ہے لیکن ڈھیر ویؒ فرماتے ہیں کہ ابراہیم نخعی کا قول سنن دارمی (ج: 1/ص: 173، ص: 859) میں موجود ہیں[3]۔

ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں اگر عورت کو ایک ماہ یا چالیس دن میں تین حیض آجائیں اور عدل وانصاف والی عورتیں گواہی دے دیں اس حیض کی جس کی وجہ سے نماز پڑھنا عورتوں پر حرام ہو جاتا ہے تو بے شک عورت کی عدت مکمل ہو کر ختم ہو جائے گی۔ امام دارمی فرماتے ہیں کہ جس نے یزید بن ہارون سے سنا وہ فرماتے تھے کہ ابراہیم پندرہ دن طہر کے لئے پسند کرتے تھے۔

قائین کرام ! ابراہیم نخعیؒ سے ایک ماہ یا چالیس دن کا قول شک کے ساتھ نقل کیا گیا ہے اور یزید بن ہارون کی تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ چالیس دن والا قول صحیح ہے۔ چنانچہ پندرہ دن طہر پھر تین دن حیض پھر پندرہ دن طہر پھر تین دن حیض تو یہ کل انتالیس دن بنتے ہیں اس میں اگر عورتیں تین حیض کی گواہی دے دیں تو عدت ختم ہو جائے گی۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں " لم اجده مرفوعا[4] یہ مجھے مرفوعا نہیں ملا۔

---

[1] نصب الرایہ، ج: 1/ ص: 199

[2] (عینی، ج: 1/ ص: 405)

[3] ملاحظہ ہو: اخبر المعلي بن اسد ثنا ابو عوانة عن المغيرة عن ابراهيم قال اذا حاضت المراة في شهر وفي اربعين ليلة ثلث حيض فاذا شهد لها الشهود العدول من النساء انها رأت ما تحرم عليها الصلوة من طموث النساء الذي هو الطمث المروف فقد خلا اجلها قال ابو محمد سمعت يزيد بن هارون يقول استحب الطهر خمسة عشر.

[4] الدرایہ، ج: 1/ص: 171

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ یہ مرفوع نہیں حضرت ابن مسعودؓ پر موقوف ہے یعنی ابن مسعودؓ کا قول ہے[1] ۔

زیلعی بھی اس کو بہت تلاش کرتے رہے مگر مرفوعاان کو بھی نہ مل سکی البتہ مسند رزین کا حوالہ انہوں نے سروجی سے نقل کیا ہے کہ اس میں مرفوعا ہے لیکن وہ خود نہیں دیکھ سکے تھے[2]

حافظ ابن حجر بھی فرماتے ہیں وزعم السروجی عن بعض مشائخہ انہ فی مسند رزین[3] ۔

سروجی کا گمان ہے کہ اس نے بعض اپنے مشائخ سے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ یہ مسند رزین میں مرفوعا ہے۔

مصنف عبدالرزاق[4] میں یہ روایت موقوف ہے ابن مسعود پر، طبرانی میں بھی موقوف ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ روایت مرفوعا بھی موجود ہے علامہ عبدالرؤف مناویؒ لکھتے ہیں " اخّروھن من حیث اخرھن اللہ "[5] کہ یہ حدیث مسند رزین میں مروی ہے اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ اس حدیث کی نشاندہی مشکوۃ شریف میں موجود ہے حضرت حذیفہ سے مرفوعا روایت ہے " سمعتہ یقول اخرو النساء حیث اخرھن اللہ[6] .

---

[1] عینی، ج: 1/ ص: 730

[2] نصب الرایہ، ج: 2/ ص: 36

[3] الدرایہ، ج: 1/ص: 171

[4] ج: 3/ص: 149، وتفسیر در منثور (ج: 1/ ص: 258

[5] رزین، کنوز الحقائق، ج: 1/ص: 11

[6] رزین، مشکوۃ، ص: 444

غسل جنابت کا طریقہ :

میمونہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے غسل کا ارادہ فرمایا تو سب سے پہلے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈال کر دونوں ہاتھ دھوئے، پھر دائیں کے ساتھ بائیں پر پانی ڈالتے ہوئے شرمگاہ کو دھویا، پھر بایاں ہاتھ، جس سے شرمگاہ کو دھویا تھا، زمین پر رگڑا، پھر اسے دھویا، پھر کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا، پھر چہرہ دھویا، پھر کہنیوں سمیت ہاتھ دھوئے، پھر تین بار سر پر پانی ڈالا اور بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچایا، پھر تمام بدن پر پانی ڈالا، پھر جہاں آپ نے غسل کیا تھا اس جگہ سے ہٹ کر پاؤں دھوئے۔[1]

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: کسی حدیث مین (غسل جنابت کا وضو کرتے وقت) سر کے مسح کا ذکر نہیں ہے { فتح الباری }۔

حضرت عائشہ اور عبد اللہ ابن عمرؓ آپ ﷺ کے غسل جنابت میں وضو کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ نے سر کا مسح نہیں کیا بلکہ اس پر پانی ڈالا۔ امام نسائی نے اس حدیث پر یہ باب باندھا ہے: جنابت کے وضو میں سر کا مسح ترک کرنا۔[2]

امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں: میں نے امام احمد سے سوال کیا کہ جنبی جب (غسل سے قبل) وضو کرے تو کیا سر کا مسح بھی کرے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ مسح کس لئے کرے جب کہ وہ اپنے سر پر پانی ڈالے گا؟[3]۔

---

[1] بخاری الغسل باب الوضوء قبل الغسل حدیث 249 وباب الغسل مرة واحدة حدیث 281,276,274,265 260,259,257 ومسلم الحیض باب صفة غسل الجنابة حدیث 317

[2] نسائی الغسل باب ترک المسح الرأس في الوضوء من الجنابة حدیث 420 /205 و206

[3] **تبصرہ:** غسل جنابت میں وضو کرتے وقت سر کے مسح کے بارے میں بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایات موجود ہے کہ آپ ﷺ غسل سے پہلے اپنے دونوں ہاتھ دھوتے اور پھر اسی طرح وضو کرتے جس طرح آپ نماز کے لئے وضو فرماتے اور آپ ﷺ کی عادت تھی پھر پانی میں اپنی انگلیاں ڈبوتے اور ان سے بالوں کی جڑوں کا خلال کرتے یہاں مسح اور نماز کی طرح وضو کی بارے میں صراحت موجود ہے۔

امی عائشہؓ نے کہا: میں اور رسول اللہ ﷺ ایک برتن سے نہاتے اور دونوں اس سے چلو بھر کر لیتے تھے۔[1]

آبادی میں غسل کرتے وقت پردے کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔[2]

تنبیہ: نماز کے لئے غسل جنابت کا وضو کافی ہے۔

دیگر غسل:

غسل جنابت کے بعد اب ان احوال کا ذکر کیا جارہا ہے جن میں غسل کرنا واجب، مسنون یا مستحب ہے۔

﴿غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں:﴾

جمعہ کے دن غسل[3]:

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اذا جاء أحدكم الجمعة فليغتسل[4]

جب تم میں سے کوئی شخص نماز جمعہ کے لئے آئے تو وہ غسل کرے۔

سیدنا ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر مسلمان پر حق ہے۔ کہ ہفتے میں ایک دن (جمعے کو) غسل کرے اس میں سر اور اپنا بدن دھوئے۔[5]

---

[1] بخاري الغسل باب تخليل الشعر حديث :273

[2] بخاري الغسل باب التستر في الغسل عند الناس حديث 281,280 وصحيح مسلم الحيض باب تستر المغتسل بثوب ونحوه حديث 337,336

[3] بعض روایات سے غسل جمعہ واجب معلوم ہوتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ شروع زمانہ میں ایسا تھا، بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا مشکوۃ شریف کا غسل کے متعلق پورے باب کا مطالعہ کیا جائے۔

[4] بخاري الجمعة باب فضل الغسل يوم الجمعة حديث 277 ومسلم الجمعة حديث 844

[5] بخاری الجمعة باب هل على من لم يشهد الجمعة غسل حديث 897 ومسلم الجمعة باب الطيب والسواک حديث 849

سیدنا ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جمعے کے دن ہر بالغ مسلمان پر نہانا واجب ہے۔[1]

ابن جوزیؒ فرماتے ہیں: جمعے کے دن غسل کرنا واجب ہے کیونکہ اس کی احادیث زیادہ صحیح اور قوی ہیں۔ ابن حزم اور علامہ شوکانیؒ نے بھی اسی مذہب کو اختیار کیا ہے۔

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کے تحت فرماتے ہیں: ﴾

غسل جمعہ:

جبکہ جمہور رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ یہ وجوب ابتدائے اسلام میں تھا، جس کی تفصیل درج ذیل ہے: جمہور علما فرماتے ہیں کہ یہ وجوب ابتدائے اسلام میں تھا (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے) اور بخاری و مسلم[2] کی روایت ہے کہ عمر بن خطاب لوگوں کے سامنے خطبہ دے رر ہے تھے کہ ایک صحابی { حضرت عثمان بن عفان } آئے تو حضرت عمر نے پکار کر فرمایا کہ یہ آنے کا کونسا وقت ہے تو انہوں نے عرض کیا کہ میں آج مصروف ہوگیا تھا اپنے گھر کو لوٹ کر نہیں آیا تھا کہ میں نے آواز سنی تو صرف وضو کیا حضرت عمر نے فرمایا کہ تم نے صرف وضو کیا حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ غسل کا حکم فرمایا کرتے تھے۔امام ترمذی باب جمعہ کے دن وضو کے تحت دو احادیث لائے او رحدیث اول کے تحت امام ترمذی فرماتے ہیں: علما صحابہ اور ان کے بعد کے اہل علم کا اسی پر عمل ہے کہ جمعہ کے دن غسل کیا جائے ان کے نزدیک صرف وضو بھی کیا جاسکتا ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ غسل واجب نہیں دلیل حضرت عمر کا حضرت عثمان کو یہ کہنا کہ وضو بھی کافی ہے تمہیں معلوم ہے رسول اللہ ﷺ نے جمعہ کے دن غسل کا حکم کیا ہے۔اگر یہ دونوں جانتے کہ یہ امر وجوب کے لئے ہے نہ کہ اختیار کے لئے تو حضر عمر حضرت عثمان کو کبھی نہ چھوڑتے یہاں تک کہ ان کو واپس لوٹاتے او

[1] بخاری الجمعة باب فضل الغسل یوم الجمعة حدیث 879 و مسلم الجمعة باب وجوب غسل الجمعة علی کل بالغ من الرجال حدیث846

[2] بخاری کتاب الجمعة باب فضل الغسل یوم الجمعة مسلم باب الجمعة

رفرماتے کہ جاؤ اور غسل کرو۔ اب ہمارا سوال یہ ہے کہ خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین احایث کو زیادہ جاننے والے تھے لہذا ابن جوزی ابن حزم اور علامہ شوکانی کے قول سے صحابہ کے عمل کی اقتداء افضل ہے نیز آپ نے غسل جمعہ کو واجب تو کہہ دیا لیکن فرض ,واجب کی تعریف کو قرآن وحدیث سے واضح نہیں کیا؟۔

جمعہ کے دن کا غسل مسنون و مستحب ہے:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی جمعہ کو (یعنی جمعہ کی نماز کے لئے) آئے تو اس کو چاہیئے کہ غسل کرے (یعنی نماز جمعہ ادا کرنے کے لئے اس کو غسل کرکے آنا چاہیئے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : ہر مسلمان پر حق ہے (یعنی اس کے لئے ضروری ہے) کہ ہفتہ کے سات دنوں میں سے ایک دن (یعنی جمعہ کے دن) غسل کرے اس میں اپنے سر کے بالوں کو اور سارے جسم کو اچھی طرح دھوئے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

ان دونوں حدیثوں میں جمعہ کے غسل کا تاکیدی حکم ہے اور صحیحین ہی کی ایک اور حدیث میں ہے جو حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے غسل جمعہ کے لئے واجب کا لفظ بھی آیا ہے۔ لیکن امت کے اکثر ائمہ اور علمائے شریعت کے نزدیک اس سے اصطلاحی وجوب مراد نہیں بلکہ اس کا مقصد بھی وہی تاکید ہے جو حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی مندرجہ بالا حدیثوں کا مدعا ہے۔ اس مسئلہ کی پوری وضاحت عبداللہ ابن عباسؓ کے ایک ارشاد سے ہوتی ہے جو انہوں نے بعض اہل عراق کے سوال کے جواب میں فرمایا تھا۔ سنن ابی داؤد میں حضرت ابن عباسؓ کے مشہور شاگرد عکرمہ سے اس سوال وجواب کی پوری تفصیل اس طرح مروی ہے کہ :

" عراق کے بعض لوگ حضرت ابن عباس کے خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے سوال کیا کہ آپ کے خیال میں جمعہ کے دن کا غسل واجب ہے؟ انہوں نے فرمایا میرے نزدیک واجب تو نہیں ہے لیکن اس میں بڑی طہارت و پاکیزگی ہے اور بڑی خیر ہے اس لئے جو اس دن غسل کرے اور جو (کسی

وجہ سے اس دن) غسل نہ کرے تو (وہ گنہگار نہیں ہوگا کیونکہ یہ غسل) اس پر واجب نہیں۔ (اس کے بعد حضرت ابن عباس نے فرمایا) میں تمہیں بتاتا ہوں کہ غسل جمعہ کے حکم کے شروعات کیسے ہوئی (واقعہ یوں ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں) مسلمان لوگ غریب اور محنت کش تھے صوف (یعنی اونٹ اور بھیڑ وغیرہ کے بالوں سے بنے ہوئے بہت موٹے کپڑے) پہنتے تھے، اور محنت مزدوری میں اپنے پیٹھوں پر بوجھ لاتے تھے، اور ان کی مسجد (مسجد نبوی) بہت تنگ تھی اور اس کی چھت بہت نیچی تھی، اور ساری مسجد بس ایک چھپّر کا سائبان تھا (جس کی وجہ سے اس میں انتہائی گرمی اور گھٹن رہتی تھی) پس رسول اللہ ﷺ ایک جمعہ کو جبکہ سخت گرمی کا دن تھا گھر سے مسجد تشریف لائے اور لوگوں کا یہ حال تھا صوف کے موٹے موٹے کپڑوں میں ان کو پسینے چوٹ رہے تھے، اور ان سب چیزوں نے مل ملا کر مسجد کی فضا میں بدبوے پیدا کر دی تھی جس سے سب کو تکلیف اور اذیت ہو رہی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے جب یہ بدبوں محسوس کی تو فرمایا کہ :

یا ایھا الناس اذا کان ھذا الیوم فاغتسلو ولیمس احد کم افضل ما یجد من دھنہ وطیبہ .

اے لوگو! جب جمعہ کا یہ دن ہوا کرے تو تم لوگ غسل کیا کرو اور جو اچھا خوشبودار تیل اور جو بہتر خوشبو جس کو دستیاب ہو وہ لگا لیا کرے۔

(حضرت ابن عباس فرماتے ہیں) اس کے بعد خدا کے فضل سے فقر و فاقہ کا دور ختم ہو گیا، اور اللہ تعالی نے مسلمانوں کو خوشحالی اور وسعت نصیب فرمائی، پھر صوف کہ وہ کپڑے بھی نہیں رہے جن سے بدبو پیدا ہوتی تھی اور محنت ومشقت بھی نہیں رہی، اور مسجدوں کی وہ تنگی بھی ختم ہو گئی اور اس کو وسیع کر لیا گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جمعہ کے دن لوگوں کے پسینہ وغیرہ سے جو بدبو مسجد کی فضا میں پیدا ہو جاتی تھی وہ بات نہیں رہی"[1]۔

حضرت عبد اللہ ابن عباس کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ اسلام کے ابتدائی دور میں اس خاص حالت کی وجہ سے جسکی ان کے اس بیان میں تفصیل کی گئی ہے غسل جمعہ مسلمانوں کے لئے ضروری

[1] ہذا حدیث صحیح علی شرط البخاری، (مستدرک، کتاب الجمعۃ، ج: 1/ص: 390)

قرار دیا گیا تھا، اس کے بعد جب وہ حالت نہیں رہی تو اس حکم کا وہ درجہ تو نہیں رہا، لیکن بہر حال اس میں پاکیزگی ہے جو اللہ تعالی کو پسند ہے اور اب بھی اس میں خیر اور ثواب ہے یعنی اب وہ مسنون و مستحب ہے، اور سمرہ بن جندب کی مندرجہ ذیل حدیث میں غسل جمعہ کی یہی حیثیت صریحا مذکور ہے:

عن سمرة بن جندب قال: قال رسول اللہ ﷺ: من توضأ یوم الجمعة فبها ونعمت ومن اغتسل فالغسل افضل

حضرت سمرہ بن جدب ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص جمعہ کے دن (نماز جمعہ کے لئے) وضو کرلے تو بھی کافی ہے اور ٹھیک ہے اور جو غسل کرے تو غسل کرنا افضل ہے[1]۔

﴿غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں:﴾

میت کو غسل دینے والا غسل کرے[2]:

سیدنا ابوہریرہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص میت کو غسل دے اسے چاہئے کہ وہ خود بھی نہائے[3]۔

ابن عمر ؓ فرماتے ہیں: ہم میت کو غسل دیتے، پھر ہم مین سے بعض غسل کرتے اور بعض نہ کرتے۔

دونوں احادیث کو ملانے سے مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ جو شخص میت کو غسل دے، اس کے لئے نہانا مستحب ہے ضروری نہیں[1]۔

---

[1] رواہ احمد وابوداؤد والترمذی والنسائی والدارمی } وقال الترمذی ہذا حدیث حسن، رواہ ابن خزیمۃ فی صحیحہ العزیزی، 327/3) اعلاء السنن، ج:1/ص:231۔

[2] محدثین فقہاء فرماتے ہیں کہ غسل کرنا مستحب ہے۔

[3] ابوداؤد الجنائز باب فی الغسل فی غسل المیت 3162۔3161 ترمذی الجنائز باب فی غسل من غسل المیت حدیث 994 ابن ماجه الجنائز باب ماجاء فی غسل المیت حدیث 1463 اسے ابن حبان 751 اور ابن حزم نے 23/2 صحیح کہا ہے

تبصرہ:

یہ بات درست ہے لیکن غیر مقلد احباب کیا کریں گے اس لئے کہ اس روایت میں "فلیغتسل" مثل غسل جمعہ امر کا صیغہ ہے۔ لیکن جمعہ کے لئے غسل کو اسی امر کے صیغہ سے واجب قرار دیا اور میت سے غسل کو اسی صیغہ سے مستحب قرار دیا، غسل جمعہ کے سلسلہ میں حدیث رسول ﷺ اور قول و فعل خلفائے راشدین میں تطبیق نہیں کی جاسکی۔ لیکن غسل میت کے سلسلہ میں حدیث رسول ﷺ اور قول ابن عمر میں تطبیق کی جارہی ہے۔ واجب، مستحب اور سنت کی تعریف قرآن وحدیث کی روشنی میں بھی واضح فرمائیں اقوال فقہا پیش نہ کریں کیونکہ یہ آپ کے اصول نہیں ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

نومسلم کے لئے غسل:

سیدنا قیس بن عاصمؓ سے روایت ہے کہ جب وہ مسلمان ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ وہ پانی اور بیری کے پتوں سے غسل کریں[2]۔[3]

---

[1] **تبصرہ:** قول صحابی آپ کے ہاں حجت نہیں۔ حافظ زبیر مرحوم علی زئی صاحب فرماتے ہیں کہ: حضرت عبداللہ بن مسعود مدرک رکوع کو مدرک رکعت سمجھتے تھے (یعنی جس نے امام کو رکوع میں پالیا اس نے رکعت پالی) ---اس کی سند صحیح ہے لیکن یہ صحابی کا فتوی ہے۔ {ماہنامہ الحدیث نمبر 30 ص: 15} اسی طرح عبد اللہ بن عمر کی داڑھی کے بارے میں رویت کو رد کرتے ہیں۔ {ماہنامہ الحدیث نمبر 27 ص: 56} اور یہاں پر قول صحابی اور حدیث رسول میں تطبیق دی جارہی ہے اپنے اصول کے خلاف۔

[2] ابوداؤد الطھارۃ باب فی الرجل یسلم فیومر بالغسل حدیث 355 نسائی 1 /109 ترمذی الجمعۃ باب ماذکر فی الاغتسال عند مایسلم الرجل حدیث 604 اسے امام نووی نے حسن امام ابن خزیمہ 1 /26 حدیث 154، 155 اور ابن حبان 234 نے صحیح کہا ہے

[3] **تبصرہ:** "نماز نبوی" والے نے اس حدیث کے لئے جن کتب کے حوالے دیئے ہیں ان میں سے ایک ترمذی کتاب الجمعہ کے باب ماذکر فی الاغتسال عند مایسلم الرجل۔ لیکن اس کا کوئی باب ہمیں ترمذی شریف میں نہیں ملا۔ یہاں غسل کے واجب، سنت اور مستحب ہونے کی صراحت نہیں کی گئی جوکہ فقہاء کی اصطلاحات ہیں نہ کہ ان حضرات کے۔ لہذا ان کی تعریف بھی قرآن وحدیث سے ہونی چاہئیے۔

عیدین کے روز غسل :

نافع کہتے ہیں کہ سیدنا ابن عمرؓ عیدالفطر کے روز عیدگاہ جانے سے پہلے غسل کیا کرتے تھے۔[1]

سیدنا علیؓ نے فرمایا: جمعہ، عرفہ، قربانی اور عیدالفطر کے دن غسل کرنا چاہیے۔

تبصرہ:

"نماز نبوی" میں ہے کہ یہ عیدین کے روز غسل پر سب سے اچھی دلیل ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں: اس مسئلے میں اعتماد سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کے اثر پر ہے[2]، نیز اس کی بنیاد جمعے کے غسل پر قیاس ہے۔

احرام کا غسل :

سیدنا زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ حج کا احرام باندھتے وقت رسول اللہ ﷺ نے غسل فرمایا[3]۔

مکہ میں داخل ہوتے وقت غسل کرنا:

ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مکے میں داخل ہوتے وقت غسل کرتے تھے[1]۔[2]

---

[1] موطا امام مالک 177/1 اس کی سند اصح الاسانید ہے

[2] **ہمارا تبصرہ الف یہ ہے کہ** عبداللہ بن عمرؓ کے اس اثر کو یہاں بنیاد بنایا گیا ہے اور اس کو اصح الاسانید کہا ہے۔ حالانکہ اسی کتاب موطا امام مالک میں عبداللہ بن عمر کے قراءت خلف الامام سے منع کے بارے میں روایت موجود ہے اس سے اعراض کیا جارہا ہے اسی طرح عبداللہ بن عمر کے ڈاڑھی والے عمل کو فعل صحابی کہہ کر رد کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں ان کا قول و عمل دلیل بن گیا ہے کیسے ؟ کیوں ؟

تبصرہ ب: نورالعینین {ص: 61} میں حافظ مرحوم زبیر علی صاحب نے اصول بنایا ہے کہ روای کا مدلس ہونا ثابت ہو جائے چاہے ایک دفعہ ہی کیوں نہ ہو اس کا عنعنہ ضعیف ہوگا۔ اس روایت میں امام مالک عن سے روایت کررہے ہیں اور امام مالک بھی مدلس ہیں { دیکھیئے طبقات المدلسین ابن حجر } لہٰذا یہ روایت آپ ہی کے اصول کے مطابق ضعیف ہے۔

تبصرہ ج: اس مسئلے میں صحابہ اور اہل علم کے قول و عمل کو دلیل بنایا گیا ہے جو کہ آپ کے اصول کے خلاف جاتا ہے۔ یہاں آپ حضرت علیؓ کے قول کو دلیل بناتے ہیں اور اس کو تسلیم بھی کرتے ہیں۔ لیکن شرح معانی الاثار میں حضرت علیؓ کے قول قراۃ مع الامام سے منع والی روایت تسلیم نہیں کرتے۔ نیز یہاں آپ عبداللہ بن عمرؓ کی اثر میں امام نووی کی تقلید کرتے ہیں اور ان کے قیاس کو بھی سینے سے لگاتے ہیں۔

[3] ترمذی الحج باب ماجاء فی الاغتسال عند الاحرام حدیث 830 امام ترمذی نے اسے حسن کہا ہے

مسواک کا بیان:

سیدنا حذیفہؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ جب رات کو تہجد کے لئے اٹھتے تو مسواک فرماتے۔[3]

ابن عباسؓ فرماتے ہیں: نبی اکرم ﷺ رات کو ہر دو رکعت کے بعد مسواک کرتے[4]۔[5]

ام المؤمنین عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مسواک منہ کے لئے طہارت کا سبب اور اللہ کی رضامندی کا ذریعہ ہے۔[6]

سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے رویت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب بھی میرے پاس جبرئیل آتے تو مجھے مسواک کرنے کا حکم کرتے تھے مجھے خطرہ لاحق ہوا کہ میں اپنے منہ کی اگلی جانب نہ چھیل لوں۔[7]

سیدنا ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر میں اپنی امت کے لئے مشکل نہ جانتا تو انہیں ہر نماز سے پہلے مسواک کرنے کا (وجوبی) حکم دے دیتا۔[8]

---

[1] بخاری الحج باب الاهلال مستقبل القبلة حدیث 1553 وباب الاغتسال عند دخول مکة حدیث 1573 ومسلم الحج باب ایتحباب المیت بذی طوی عند ارادة دخول مکة حدیث 1259

[2] **تبصرہ:** حاشیہ نگار نے یہاں ترمذی کے روایت میں صرف لفظ حسن کو تو ذکر کردیا ہے۔ لیکن لفظ غریب کو چھوڑ دیا ہے۔ یہ علمی خیانت ہے۔ نیز اس روایت کی سند کا ایک راوی عبد اللہ بن یعقوب مجہول الحال ہے۔

[3] بخاری الوضوء باب السواک حدیث 245 والجمعة باب السواک یوم الجمعة حدیث 1136,889 ومسلم الطهارة باب السواک حدیث 255

[4] ابن ماجة الطهارة باب السواک حدیث 228 اسے حاکم 1/ 145 ذہبی اور ابن حجر نے صحیح کہا ہے

[5] **تبصرہ:** ابن ماجہ کی سند میں امام اعمش اور امام حبیب بن ابی ثابت ہیں جو بتصریح ائمہ محدثین اور علی زئی ان دونوں کو مدلسین کہتے ہیں { طبقات المدلسین لابن حجر ص: 67 و الفتح المبین لعلی زئی ص: 43 }۔ اور مدلس کی عنعنہ آپ کے اصول کے مطابق صحیحین کے علاوہ ضعیف ہے۔

[6] نسائی الطهارة باب الترغیب فی السواک حدیث 5 / اسے امام ابن حبان اور نووی نے صحیح کہا ہے

[7] بیہقی 49/7 امام بخاری نے اس حدیث کو حسن کہا ہے

[8] بخاری الجمعة باب السواک یوم الجمعة 887 ومسلم الطهارة باب السواک حدیث 252

وضو کا بیان:

نیند سے جاگ کر پہلے ہاتھ دھونا:

سیدنا ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا؛

جب تم نیند سے جاگو تو اپنا ہاتھ پانی کے برتن میں نہ ڈالو جب تک کہ اسے (تین بار) دھو نہ لو کیونکہ تم مین سے کوئی نہیں جانتا کہ اس کے ہاتھ نے رات کہاں گزاری۔[1]

مطلب یہ ہے کہ نیند سے جاگ کر ہاتھ پہنچوں تک تین بار دھونے کے بعد پانی کے برتن میں ڈالنے چاہیں۔ ہو سکتا ہے رات کو ہاتھ بدن کے کسی خاص حصے کو لگ کر پلید ہو گئے ہوں[2]۔

تین بار ناک جھاڑنا:

سیدنا ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم نیند سے بیدار ہو کر وضو کرنے لگو تو پانی چڑھا کر تین بار ناک جھاڑو کیونکہ شیطان ناک کے بانسے میں رات گزارتا ہے۔[3]

سونے والے کے ناک کے بانسے میں شیطان کے رات گزارنے کی کیفیت اور حقیقت اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہمارا فرض ایمان لانا ہے کہ واقعی شیطان رات گزارتا ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

---

[1] بخاري الوضوء باب الاستجمار وترا حديث162 ومسلم الطهارة باب كراهة غمس المتوضي وغيره يده المشكوك في نجاستها في الاناء قبل غسلها ثلاثا حديث 278 تین بار دھونے کا ذکر مسلم کی روایت میں ہے {ع ر}

[2] تبصرہ: اب نماز نبوی والے سے سوال ہے ہمارا تبصرہ ہے کہ حدیث میں صراحت کے ساتھ رات کی نیند کا ذکر ہے جیسا کہ آپ نے اپنے تبصرہ میں واضح کرکے کہا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ہاتھ تین بار دھونے کا حکم صرف رات کی نیند کے ساتھ خاص ہے یا دن کی نیند کو بھی شامل ہے؟ اگر صرف رات کے نیند کے ساتھ خاص ہو تو پھر اگر کوئی دن کو سوئے اور اس کے ہاتھ بدن کے کسی حصے کو لگ کر پلید ہو گئے ہو تو کیا حکم ہے قرآن وحدیث کی روشنی میں؟ اور اگر رات کی نیند کے ساتھ خاص نہ ہو تو پھر کس دلیل کی بنیاد پر حکم عام ہوگا؟۔

[3] بخاری بدءالخلق باب صفةابلیس وجنودہ حدیث3295 ومسلم الطهارة باب الایتار فی الاستنثار والاستجمار حدیث 238

مسنون وضو کی مکمل ترتیب :

وضو کے شروع میں بسم اللہ ضرور پڑھنی چاہئے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا: بسم اللہ کہتے ہوئے وضو کرو[1]۔[2]

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص وضو کے شروع میں اللہ کا نام نہیں لیتا اس کا وضو نہیں[3]۔[4]

---

[1] نسائی الطہارۃ باب التسمیۃ عند الوضوء حدیث 78 ابن خزیمہ الصلواۃ باب ذکر تسمیۃ اللہ عزوجل عند الوضوء حدیث 144 امام نووی نے کہا ہے کہ اس کی سند جید ہے۔اس سے ثابت ہوا کہ وضو کے شروع میں بسم اللہ پڑھنی چاہیئے

[2] تبصرہ: اس روایت کو امام نووی پر اعتماد کرکے صحیح کہا ہے۔جبکہ اس حدیث کا ایک مرکزی راوی معمر جس کو خود مرحوم علی زئی صاحب نے {تسہیل الوصول ص: 66} پر ضعیف تسلیم کر چکے ہیں دوسرے اس روایت میں قتادہ ہے جس کو مرحوم علی زئی صاحب نے {جزء قراءۃ ص:39'93 اور جزء رفع یدین ص:39 } میں مدلس کہا ہے۔تو آپ کی یہ دلیل آپ کے اپنے اصولوں کی روشنی میں ضعیف ٹھہری۔

[3] ابوداؤد الطہارۃ باب التسمیۃ علی الوضوء حدیث 101 اسے حافظ منذری وغیرہ نے شواہد کی بناپر حسن کہا ہے۔اگر بسم اللہ بھول گئی اور وضو کے دوران یاد آئی تو فوراً پڑھ لے ورنہ وضو دوبارہ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ بھول معاف ہے {ع،ر}

[4] تبصرہ: اس حدیث کی سند یوں ہے۔یعقوب بن سلمہ عن ابیہ عن ابی ھریرۃ. سند کے ان دونوں راویوں کے بارے میں امام بخاری یوں فرماتے ہیں کہ نہ تو یعقوب بن سلمہ کا سماع اپنے باپ سے ثابت ہے اور نہ ہی اس کے باپ کا سماع ابی ہریرہ سے ثابت ہے { تہذیب الکمال 334/4, 110/11 }۔

تبصرہ: اس حدیث کو حافظ زبیر علی زئی نے خود حسن کہا ہے۔حالانکہ یہ بسم اللہ والی حدیث ضعیف ہے اور آپ خود فرماتے ہیں کہ ضعیف احادیث کا دروازہ نہیں کھولا جائے گا۔اگر اس طرح کے ضعیف احادیث آپ کے نزدیک قطعی الدلالت اور قطعی الثبوت ہیں جن کی بنیاد پر آپ بسم اللہ کو پڑھنا ضروری قرار دے رہے ہیں تو سوال یہ ہے کہ ضروری سے آپ کی کیا مراد ہے فرض یا واجب یا سنت مؤکدہ؟۔

تبصرہ: "نماز نبوی" کا حاشیہ نگار اس مسئلے پر لکھتے ہیں کہ اگر بسم اللہ بھول گئی اور وضو کے دوران یاد آگئی تو فوراً پڑھ لے ورنہ وضو دوبارہ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ بھول معاف ہے۔یہ فتوی چونکہ بغیر دلیل کے ہے اور آپ کے اصول ہے کہ اگر مسئلہ وفتوی مدلل نہ ہو تو مردود ہے۔ نیز حاشیہ نگار فرماتے ہیں کہ اگر وضو کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو وضو دوبارہ نہ لوٹائے کیونکہ بھول معاف ہے۔تو سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص وضو میں مسح کرنا بھول جائے تو اس کو بھی وضو لوٹانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آپ کا فرمان ہے کہ بھول معاف ہے؟۔

رسول اللہ ﷺ جوتے پہننے، کنگھی کرنے، طہارت کرنے اور دیگر تمام کاموں میں دائیں طرف سے شروع کرنا پسند فرماتے۔[1]

پھر دونوں ہاتھ پہنچوں تک تین بار دھوئیں۔[2]

ہاتھوں کو دھوتے وقت ہاتھوں کی انگلیوں کے درمیان خلال کریں[3]۔[4]

پھر ایک چلو لے کر آدھے سے کلی کریں اور آدھا ناک میں ڈالیں اور ناک کو بائیں ہاتھ سے جھاڑیں۔یہ عمل تین دفعہ کریں۔[5]

پھر تین بار چہرہ دھوئیں[6]

پھر ایک چلو لے کر اسے ٹھوڑی کے نیچے داخل کرکے داڑھی کا خلال کریں[7]۔[8]

---

[1] بخاری الوضوء باب التیمن فی الوضوء والغسل حدیث 168 مسلم الطھارۃ باب التیمن فی الطھور وغیرہ حدیث 268

[2] بخاری باب الوضوء ثلاثا حدیث 159 مسلم باب صفۃ الوضوء وکمالھحدیث226

[3] ابوداؤد باب فی الاستنثار حدیث 142 ترمذی باب فی تخلیل الاصابع حدیث 38 اسے ترمذی حاکم 1 /147,148 اورنووی نے صحیح کہاہے

[4] **تبصرہ**:ترمذی ابن ماجہ کی روایت میں ایک راوی موسی بن عقبہ ہے یہ بتصریح ائمہ محدثین او ربدیع الدین [غیر مقلدبزرگ] کے مدلس ہے {جامع التحصیل للعلائی ص:110}۔اور آپ کے اصول کے مدلس کی عن والی روایت غیر صحیحین میں ضعیف ہوگی لہٰذا یہ روایت بھی آپ کے اصول سے ضعیف ہے۔

[5] بخاري باب من مضمض واستنشق من غرفة واحدة حديث 191 وباب الوضوء من التور حديث199 مسلم باب في وضوء النبي صلي الله عليه زوسلم حديث 235

[6] بخاري باب مسح الرأس حديث 185,186,192 مسلم في وضوء النبي صلي الله عليه وسلم حديث235

ماہرین روایت ودرایت کے نزدیک ایک چلوں سے منہ اور ناک دونوں پانی ڈالنا یہ بھی اور تین بار الگ الگ چلوں بھی درست اور جائز ہے لیکن مستحب یہی ہے کہ ہر بار بار کے لئے الگ الگ پانی لئے جائے۔

[7] ترمذي باب ماجاء في تخليل اللحية حديث 31 اسے ابن حبان اور ابن خزیمہ نے صحیح کہاہے

[8] **تبصرہ**:اس حدیث کی تصحیح حاشیہ نگار نے امام ترمذی ، ابن خزیمہ اور ابن حبان سے نقل کی ہے۔جامع ترمذی میں یہ حدیث سفیان بن عیینہ عن کے ساتھ روایت کر رہے ہیں اور حافظ زبیر مرحوم علی زئی صاحب نے {جزء قراءۃ ص:80 ,254} پر

پھر دایاں ہاتھ کہنی سمیت تین بار دھوئیں، پھر بایاں ہاتھ بھی کہنی سمیت تین بار دھوئیں۔[1]

پھر سر کا مسح کریں۔ دونوں ہاتھ سر کے اگلے حصے سے شروع کرکے گدی تک پیچھے لے جائیں، پھر پیچھے سے آگے اسی جگہ لے آئیں جہاں سے مسح شروع کیا تھا۔[2]

آپ نے سر کا ایک دفعہ مسح کیا۔[3]

پھر کانوں کا مسح اس طرح کریں کہ شہادت کی انگلیاں دونوں کانوں کے سوراخو میں داخل کرکے اندرونی جانب سے گزار کر کانوں کی پشت پر انگوٹھوں کے ساتھ مسح کریں[4]۔[5]

پھر دایاں پاؤں ٹخنوں سمیت تین بار دھوئیں اور بایاں پاؤں بھی ٹخنوں سمیت تین بار دھوئیں۔[6]

جب بھی وضو کریں تو ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کا خلال کریں[7]۔[1]

فرماتے ہیں" سفیان بن عیینہ مدلس عن الثقات وعن الضعفاء ہیں لہٰذا یہ معنعن سند ہے۔ امام ترمذی تو حدیث کو صحیح کہتے ہیں اس لئے اس حدیث سے ہم استدلال کرتے ہیں لیکن آپ کے اصول و قواعد اس حدیث کو ضعیف بناتے ہیں۔

[1] بخاری باب سواک الرطب والیابس للصائم حدیث1934 ومسلم باب فی وضوء النبی صلی اللہ علیہ وسلم حدیث236

[2] بخاری باب مسح الرأس حدیث185 ومسلم باب فی وضوء النبی صلی اللہ علیہ وسلم حدیث 235

[3] بخاری باب غسل الرجلین الی الكعبين حدیث186 ومسلم باب فی وضوء النبی صلی اللہ علیہ وسلم حدیث235

[4] ابن ماجة باب ماجاء في مسح الاذنين حدیث 439 ترمذي باب ماجاءفي مسح الاذنين ظاهما وباطنهما حدیث 36 بدون ذکر السباحتین ولا بهامين اسے خزیمہ 1 /77 حدیث148 نے صحیح کہا ہے

[5] **تبصرہ:** اس حدیث کا حوالہ جتنی کتب سے دیا گیا ہے سب میں ایک راوی ابن عجلان مشترک ہیں جس کو حافظ زبیر مرحوم علی زئی صاحب مدلس تسلیم کرچکے ہے { جزء قراءۃ ص:160 }۔

ماہرین روایت و درایت فرماتے ہیں کہ تین تین بار کلی اور ناک میں الگ الگ پانی ڈالنا بھی سنت ہے۔

[6] بخاری باب سواک الرطب والیابس ثلاثا حدیث 1934 ومسلم باب صفة الوضوء وكمالهحدیث226

[7] ترمذي باب فی تخليل الاصابع حدیث 39 ابن ماجة باب تخليل الاصابع حدیث557 اسے ترمذی نے حسن کہا ہے

سیدنا مستورد بن شدادؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو وضو کرتے ہوئے دیکھا کہ آپ اپنے پاؤں کی انگلیوں کا خلال ہاتھ کی چھنگلی (چھوٹی انگلی) سے کر رہے تھے[2]۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ اگر زخم پر پٹی بندھی ہوئی ہو تو وضو کرتے وقت پٹی پر مسح کر لے اور ارد گرد کو دھو لے۔[4]

تنبیہات:

کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کے لئے الگ الگ پانی لینے کا ذکر جس حدیث میں ہے اسے امام ابوداؤد { حدیث 139 } امام نووی اور حافظ بن حجر نے ضعیف کہا ہے۔امام نووی امام ابن قیم

---

[1] **تبصرہ:** "نماز نبوی" کے حاشیہ نگار نے یہاں بھی ترمذی کے حسن کے ساتھ لفظ غریب کو چھوڑا ہے۔ ترمذی کے اس روایت میں سفیان عن سے روایت کرتے ہیں اور سفیان کو آپ متعدد مرتبہ مدلس کہہ چکے ہیں۔ رفع یدین کے مسئلہ میں عبداللہ بن مسعود کی روایت کو سفیان کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف کہا ہے۔

تبصرہ: اس حدیث کے ایک روای عبدالرحمٰن بن ابی الزناد کے بارے میں محدثین کے اقوال ملاحظہ ہوں۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں " مضطرب الحدیث " یحیٰ بن معین فرماتے ہیں " ضعیف " دوسری جگہ فرماتے ہیں " عبدالرحمٰن بن ابی الزناد کی دراوردی کے علاوہ احادیث سے استدلال نہیں کیا جاسکتا " علی بن مدینی فرماتے ہیں " ہمارے اصحاب کے ہاں ضعیف ہے " عمرو بن علی فرماتے ہیں " ان میں ضعف ہے " عبدالرحمٰن بن مہدی نے ان سے روایت کرنا چھوڑ دیا تھا۔ابو حاتم فرماتے ہیں " لایحتج بہ " ذکریا بن یحیٰ فرماتے ہیں " اس میں ضعف ہے " امام نسائی فرماتے ہیں لایحتج بحدیثہ اور آپ کا اپنا اصول ہے کہ اگر جمہور محدثین نے جرح کی ہو تو راوی ضعیف ہوگا { نور العینین ص: 61 } اور مزے کی بات یہ ہے { جزء رفع یدین میں اسی معزز حاشیہ نگار تسلیم کر چکے ہیں کہ ان کا حافظہ بگڑ گیا تھا۔اپنے ہی اصولوں کے مطابق ضعیف احادیث کو صحیح کہہ کر نا کہاں کا انصاف ہے ؟؟۔

[2] ابو داؤد باب غسل الرجلین حدیث 148 ترمذي باب في تخليل الاصابع حدیث 40 اسے امام مالک نے حسن کہا ہے

[3] **تبصرہ:** اس روایت کو حافظ زبیر علی زئی نقل کرکے فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔ جبکہ اس روایت کی سند میں ایک راوی ابن لہیعہ ہیں۔اور خصوصا امام ترمذی فرماتے ہیں کہ ہم اسے ابن لہیعہ کے علاوہ اور کسی سند سے نہیں جانتے۔اس روای کے بارے میں مرحوم علی زئی صاحب کی تحقیق ملاحظہ فرمائیں { تسہیل لوصول ص: 72 } پر فرماتے ہیں " اس کی سند میں ابن لہیعہ ضعیف راوی ہیں۔ { جزء قراءۃ ص: 150 } پر فرماتے ہیں عبداللہ ابن لہیعہ یہاں اختلاط کی وجہ سے ضعیف ہے۔اور مزے کی بات یہ ہے مذکورہ روایت ابن لہیعہ عن سے روایت کر رہا ہے اور جزء قراءۃ کے اسی صفحہ پر مرحوم علی زئی صاحب فرماتے ہیں " اور عبداللہ ابن لہیعہ مدلس بھی ہے۔

[4] بیہقی 1 /228 امام بیہقی نے اسے صحیح کہا ہے

فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے ضو کا طریقہ چلو سے آدھا پانی میں منہ میں اور آدھا ناک میں ڈالنا ہے۔

تبصرہ:

جبکہ صحیح مؤقف یہ ہے کہ الگ الگ پانی لینا مسنون ہے اور ایک چلو کو آدھا آدھا کرنا بھی جائز ہے جبکہ شفیق الرحمٰن زید صاحب کی یہ بات درست نہیں کہ امام ابوداؤد نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ جبکہ مذکورہ حدیث پر امام ابوداؤد نے سکوت کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث ان کے ہاں صحیح اور قابل استدلال ہے اور حافظ ابن حجر نے بھی اس حدیث پر سکوت کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث ان کے ہاں بھی صحیح اور قابل استدلال ہے۔ اور آپ کے شریک کار اس حدیث کو حسن لذاتہ تسلیم کر رہے ہیں تو کیا یہ زیدی صاحب کی بے انصافی نہیں ہے جبکہ حافظ زبیر مرحوم علی زئی صاحب کے اصول کے مطابق ابن السکن نے بھی اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

کلی اور ناک کے لئے الگ الگ پانی لینا مسنون ہے:

کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کے لئے الگ لگ پانی لینا مسنون ہے، ابو داؤد کے جس روایت کو ضعیف قرار دیا جارہا ہے اس کی صحت کے بارے میں ائمہ محدثین کے اقوال ملاحظہ ہو:

(یہ ترجمہ ہے اصل عبارت حاشیہ میں دیکھے[1]) حضرت طلحہ اپنے باپ سے اور وہ اس کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے ہاں داخل ہوا اس حال میں کہ آپ ﷺ وضو فرمارہے

---

[1] عن طلحة، عن أبيه، عن جده، قال: دخلت - يعني - على النبي صلى الله عليه وسلم وهو يتوضأ، والماء يسيل من وجهه ولحيته على صدره، فرأيته يفصل بين المضمضة والاستنشاق .

و سكت عنه هو والمنذرى فهو صالح للاحتجاج عندهما و حسنه الحافظ ابو بكر عمرو ابن صلاح كما نقل الشوكانى فى السيل الجرار كذا فى العرف الشذى

قوله: "عن طلحة بن مصرف الخ" قلت قد صحح صاحب السعاية احاديث طلحة بن مصرف عن ابيه عن جده و أثبت احتجاج الائمة بحديثه عن ابيه و يؤيده سكوت ابى داؤد ثم المنذرى عنه, و تحسين ابن الصلاح له, قال العلامة العينى: " سكت عنه ابو داؤد و هو دليل رضاه بالصحة" و قال الزيلعى فى حديث ابى داؤد " لا يزال الله مقبلا على العبد " : قال

المنذری فی حواشیه: و أبو الاحوص من هذا؟ لا یعرف اسمه, لم یرو عنه غیر الزهری . قال النووی فی الخلاصة: هو فیه جهالة و لکن لم یضعفه ابو داؤد فهو حسن عنده ملخصا . قلت: و کذلک حدیث طلحة بن مصرف هذا و ان ضعفه بعضهم لجهالة ابیه مصرف و لکن لم یضعفه ابو داؤد و سکت عنه المنذری فهو حسن عندهما و ضعفه الحافظ فی "بلوغ المرام" و قال المحشی: " الحدیث من روایة لیث ابن ابی سلیم و هو ضعیف , قال النووی: اتفق العلماء علی ضعفه". قلت: حسن له الترمذی فی جامعه. و قال الهیثمی فی مجمع الزوائد "هو ثقة مدلس" و رمز له فی التهذیب علامة مسلم و الاربعة و تعلیق البخاری (فهو ممن اخرج له مسلم و الاربعة و علق له البخاری) و قال: " قال ابو داؤد: سألت یحیی عن لیث, فقال: " لا بأس به" و قال ابن عدی:" له احادیث صالحة" و قد روی عنه شعبة و الثوری و مع الضعف الذی فیه یکتب حدیثه و قال البرقانی: سألت الدار قطنی عنه فقال: صاحب سنة یخرج حدیثه ثم قال: انما انکروا علیه الجمع بین عطاء و طاؤس و مجاهد حسب ملخصا فالرجل مختلف فیه فلا ینزل حدیثه عن درجة الحسن . و أما علة التدلیس فقد ارتفعت بما رواه الطبرانی فی معجمه: "حدثنا الحسین بن إسحاق التستري ثنا شیبان بن فروخ ثنا أبو سلمة الکندي ثنا لیث بن أبي سلیم حدثني طلحة بن مصرف عن أبیه عن جده: أن رسول الله صلی الله علیه وسلم توضأ فمضمض ثلاثا واستنشق ثلاثا، یأخذ لکل واحدة ماء جدیدا, الحدیث" کذا فی غایة المقصود (1:137) ففیه صرح اللیث بالتحدیث فلم یبق له علة غیر ما فی مصرف ابی طلحة من الجهالة و لکنها مرتفعة بما ذکرنا . و ایضا فمثل هذا المجهول ثقة عند ابن حبان کما فی التدریب و نصه:"وَإِذَا لَمْ يَكُنْ فِي الرَّاوِي جَرْحٌ وَلَا تَعْدِيلٌ وَكَانَ كُلٌّ مِنْ شَيْخِهِ وَالرَّاوِي عَنْهُ ثِقَةً، وَلَمْ يَأْتِ بِحَدِيثٍ مُنْكَرٍ فَهُوَ عِنْدَهُ (ای عند ابن حبان) ثِقَةٌ.

وَفِي كِتَابِ الثِّقَاتِ لَهُ كَثِيرٌ مِمَّنْ هَذِهِ حَالُهُ، وَلِأَجْلِ هَذَا رُبَّمَا اعْتَرَضَ عَلَيْهِ فِي جَعْلِهِمْ ثِقَاتٍ مَنْ لَمْ يُعْرَفْ حَالُهُ، وَلَا اعْتِرَاضَ عَلَيْهِ فَإِنَّهُ لَا مُشَاحَّةَ فِي ذَلِكَ"

قلت: و الراوی عن مصرف و هو طلحة ابنه من رجال الجماعة ثقة و شیخه کعب بن عمرو و یقال عمرو بن کعب صحابی . قال فی غایة المقصود : " والذی ذهب الیه اکثر اهل الحدیث هو ثبوت الرؤیة لعمرو بن کعب کما عرفت" (1 : 130) و الحدیث الذی أتی به غیر منکر لما له من الشواهد الصحیحة, منها ما مر عن أَبِي وَائِلٍ شَقِيقِ بْنِ سَلَمَةَ قَالَ: "شَهِدْتُ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ وَعُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ تَوَضَّآ ثَلَاثًا ثَلَاثًا، وَأَفْرَدَا الْمَضْمَضَةَ مِنْ الِاسْتِنْشَاقِ، ثُمَّ قَالَا هَكَذَا رَأَيْنَا رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوَضَّأَ" رواه ابو علی ابن السکن فی صحیحه (التلخیص الحبیر 1 : 38) و بعد ذلک فحدیث طلحة هذا صالح للاحتجاج حتما و قاطع للاحتمال الذی ایراه بعض الناس فی حدیث ابی وائل شَقِيقِ بْنِ سَلَمَةَ هذا ان ظاهر لفظ "و افردا " یدل علی تجدید الماء لکل واحد منهما و ان کان یحتمل ان یمضمض و یستنشق من ماء واحد مع الافراد . و وجه القطع ما ورد فی روایة الطبرانی من التصریح بقوله " یأخذ لکل واحدة ماء جدیدا " فثبت به الفصل مع تجدید الماء لکل واحدة منهما , والله سبحانه و تعالی اعلم، والجواب عما ورد في الحدیث: (فتمضمض واستنشق من کف واحد) أنه محتمل لأنه یحتمل أنه تمضمض واستنشق بکف واحد بماء واحد ویحتمل أنه فعل ذلک بکف واحد بمیاه والمحتمل لا یقوم به حجة أو یرد هذا المحتمل إلی المحکم الذي ذکرناه(ما رواه الطبرانی و ابو داود عن طلحة بن مصرف عن أبیه عن جده: أن رسول الله صلی الله علیه وسلم توضأ فمضمض ثلاثا واستنشق ثلاثا یأخذ لکل واحدة ماء جدیدا الحدیث") توفیقا بین الدلیلین.

تھے اور پانی آپ ﷺ کے چہرہ مبارک اور داڑھی مبارک سے بہہ رہے تھے، پس نے میں نے آپ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ مضمضہ (کلی) اور استنشاق (ناک میں پانی) الگ الگ ڈال رہے تھے۔

امام ابو داؤد اور ترمذی نے اس حدیث سے سکوت اختیار کیا ہے پس یہ حدیث صلاحیت رکھتی ہے حجت کے لئے ان دونوں کے نزدیک، اور حافظ ابو بکر عمرو بن صلاح نے اس حدیث کی تحسین کی ہے، جیسا کہ علامہ شوکانی نے سیل الجرار میں نقل کیا ہے اور اسی طرح عرف الشذی میں بھی موجود ہے۔ قولہ " عن طلحہ بن مصرف" میں کہتا ہوں کہ بیشک صاحب سعایہؒ نے طلحہ بن مصرف عن ابیہ عن جدہ کی حدیث کی تصحیح کی ہے اور ائمہ کا اس کی حدیث کو اس کے باپ سے حجت قرار دینا ثابت ہے، او رامام ابو داؤد اور پھر منذری ان دونوں کی سکوت اس کی تائید کرتی ہے، اور ابن صلاح کا اس حدیث کو صحیح قرار دینا بھی مؤید ہے۔ علامہ عینی نے فرمایا ہے کہ ابو داؤد نے اس حدیث سے سکوت اختیار کیا ہے اور یہ اس کی رضا کی دلیل ہے اس حدیث کی صحت پر۔ او رامام زیلعی نے ابو داؤد کی حدیث " لایزالله مقبلا علی العبد" کہ اللہ تعالی بندے کی طرف برابر متوجہ ہے، کے بارے میں کہا کہ منذری نے اپنی حواشی میں کہا ہے اور ابو الاحوص نے بھی کہ یہ کون ہے اس کا اسم معلوم نہیں ہے او رامام زہری کے علاوہ کسی نے اس سے روایت نہیں کیا ہے، امام نووی نے خلاصہ میں فرمایا کہ یہی اس میں جہالت ہے۔ لیکن امام ابو داؤد نے اس کو ضعیف نہیں قرار دیا ہے بلکہ یہ اس کے نزدیک حسن ہے، امام زیلعی فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ اسی طرح طلحہ بن مصرف کی یہ حدیث بھی ہے اگرچہ بعض نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اور منذری نے اس سے سکوت اختیار کیا ہے پس یہ حدیث ان دونوں کے نزدیک حسن ہے اور حافظ نے اس کو بلوغ المرام میں ضعیف قرار دیا ہے، اور محشیٰ نے کہا ہے کہ لیث بن ابی سلیم کی روایت ضعیف ہے، نووی نے فرمایا کہ علما کا اس کے ضعف پر اتفاق ہے۔

وقد يقال: إن المراد استعمال الكف الواحد بدون الاستعانة بالكفين كما في الوجه، والأحسن أن يقال: إن كل ما روي عن ذلك في هذا الباب هو محمول على الجواز. (عمدة القارى ج 2 ص 444)

جبکہ امام ترمذی نے اپنی جامع میں اس کو حسن قرار دیا ہے، اور ہیثمی نے مجمع الزوائد میں کہا ہے کہ یہ راوی ثقہ مدلس ہے۔

اور ابو داؤد فرمایا کہ میں نے یحی سے لیث کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ اس میں کوئی بات نہیں، اور ابن عدی نے فرمایا کہ اس کی حدیث صالح ہیں اور بیشک اس سے ثوری اور شعبہ نے روایت کیا ہے، اور اس ضعف کے باوجود جو اس میں موجود ہے اس کی حدیث لکھی جاتی ہیں، برقانی نے فرمایا کہ میں نے درقطنی سے اس کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ صاحب سند ہے اس کی حدیث لکھی جاسکتی ہے اور فرمایا کہ اس پر علما نے عطاء، طاؤس، اور مجاہد رحمہم اللہ کا جمع ہونے سے انکار کیا ہے، پس آدمی مختلف فیہ ہے پس اس کی حدیث حس درجہ سے نہیں اتر سکتا، اور تدلیس کی علت مرتفع ہوئی ہے اس حدیث کی وجہ سے جس کو طبرانی نے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے۔

پس اس حدیث میں لیثؒ نے حدیث نقل کرنے میں تصریح کی ہے یعنی (لیث بن ابی سلیم حدثنی طلحہ بن مصرف عن ابیہ عن جدہ) پس اس میں کوئی علت بھی باقی نہ رہا علاوہ مصرف کہ جو طلحہ کے باپ ہیں کہ اس میں جہالت تھی لیکن یہ جہالت بھی مرتفع ہوئی اس حدیث سے جو ہم نے ذکر کیا، (یعنی طلحہ بن مصرف صراحتا موجود ہے) اور اسی طرح مجہول آدمی ابن حبان کے نزدیک ثقہ ہوتا ہے جیسا کہ تدریب میں موجود ہے اور نقل کیا ہے کہ "جب راوی میں جرح اور تعدیل نہ ہو اور اس سے روایت کرنے والا ثقہ ہو اور منکر حدیث بیان نہ کرتا ہو تو یہ راوی ابن حبان کے نزدیک ثقہ ہوتا ہے۔

اور کتاب الثقات یعنی ثقہ آدمیوں کی فہرست میں بہت سے ایسے آدمی ہیں جن کی یہ حالت ہے، اور اس وجہ سے بہت سے مرتبہ ان پر اعتراض کرتے ہیں جن کو ان کی حالت معلوم نہیں ثقات میں شمار کرنے میں اور ان پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ اس میں کوئی قباحت نہیں۔

میں کہتا ہوں: روایت کرنے والا مصرف اور جو اس کا بیٹا طلحہ ہے ثقہ جماعت کے آدمیوں میں سے ہیں اور اس شیخ جو کعب بن عمرو ہے اور اس کو عمرو بن کعب بھی کہا جاتا ہے صحابی ہے، "غایۃ المقصود" میں کہا ہے اور وہ آدمی جسکی طرف اکثر محدثین گئے ہیں وہ عمرو بن کعب کی رؤیت کی ثبوت

ہے، جیسا کہ آپ نے جانا اور وہ حدیث جس پر امام ابو داؤد نے اتیان کیا ہے وہ غیر منکر ہے کیونکہ اس کے صحیح شواہد ہیں ان میں وہ حدیث جو گزر گیا ابو وئل شفیق بن سلمہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا" اور حاضر ہوا علی بن ابی طالب اور عثان بن عفان پر کہ انہوں نے وضو کیا تین تین مرتبہ اور مضمضہ کو استنشاق سے الگ کیا پھر دونوں نے فرمایا اسی طرح ہم نے رسول اللہ ﷺ کو وضو کرتے دیکھا" ابو علی بن سکن نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اپنی صحیح میں، اس کے بعد طلحہ کی حدیث احتجاج کی صلاحیت رکھتا ہے حتمی طور پر اور اس احتمال کو قطع کرنے والی ہے جو بعض لوگوں نے دیکھا ہے ابو وائل بن شفیق بن سلمہ کی اس حدیث میں اس میں ظاہر لفظ جو "افرد" ہے ہر ایک کے لئے یعنی مضمضہ او راستنشاق کے لئے نیا پانی لینے پر دلالت کرتا ہے، اگرچہ اس میں احتمال ہے کہ مضمضہ اور استنشاق ایک پانی سے ہو افراد کے ساتھ، اور قطع کی وجہ وہ ہے جو طبرانی کی روایت میں تصریح ہے کہ" ہر ایک کے لئے نیا پانی لیتے تھے" پس اس حدیث سے فصل ثابت ہوا نیا پانی لینے کے ساتھ ہر ایک کے لئے واللہ سبحانہ وتعالی اعلم۔

ایک چلو سے منہ اور ناک میں پانی ڈالنے کا مطلب:

پس اس مسئلہ کا جواب جو حدیث میں وارد ہے کہ" آپ ﷺ نے مضمضہ اور استنشاق کیا ایک چلو سے" اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ آپ ﷺ نے مضمضہ اور استنشاق کیا ہو ایک پانی سے اور یہ بھی احتمال ہے کہ ایک چلو کے ساتھ نہیں بلکہ کئی چلو کے ساتھ کیا ہو لہٰذا یہ حدیث مختلف فیہ ہوا اور مختلف سے جہت واحدہ پر قطعی پر حجت قائم نہیں کی جاسکتی یا یہ محتمل اس محکم کی طرف لے جائے گی جو (دونوں ہاتھ) ہم نے ذکر کیا ہے، جو طبرانی اور ابو داؤد نے روایت کیا ہے" عن طلحہ بن مصرف عن ابیہ عن جدہ الخ" اور کہا گیا ہے کہ ایک کف کا استعمال کفین کے استعانت کے بغیر ہے جیسا کہ چہرے میں کفین کا استعمال ہوتا ہے، اور احسن بات یہ ہے کہ کہا جائے کہ جو کچھ اس سے مروی ہے اس باب میں تو یہ سب جواز پر محمول ہیں۔

سر اور کان کے مسح کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کانوں کا تعلق سر سے ہے {دار قطنی 98/1} اسے ابن جوزی وغیرہ نے صحیح کہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کانوں کے لئے نئے پانی کی ضرورت نہیں۔ کانوں کے مسح کے لئے نئے پانی لینے والی روایت کو حافظ ابن حجر نے شاذ کہا ہے۔

حافظ ابن قیم فرماتے ہیں کہ {کدی کے نیچے} گردن کے {الگ} مسح کے بارے میں قطعاً کوئی صحیح حدیث نہیں ہے۔ گردن کے مسح کی روایت کی متعلق امام نووی فرماتے ہیں: یہ حدیث بالاتفاق ضعیف ہے۔

جبکہ ہم کہتے ہیں کہ محترم جناب شفیق الرحمٰن زیدی صاحب کے شریک کار جناب عبد الصمد رفیقی صاحب {نماز نبوی جدید ص:44 اور قدید ص:29 } پر اصول ذکر کرتے ہیں" کسی مسئلے کے متعلق قرآن مجید اور مقبول احادیث مکمل طور پر خاموش ہو، صرف بعض ضعیف روایات سے کچھ راہنمائی ملتی ہو تو وہ اس مسئلے میں کسی امام کے قول پر عمل کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ اس ضعیف حدیث پر عمل کر لیا جائے۔

اور آپ کے اطلاع کے لئے عرض ہے کہ حافظ ابن حجر نے التلخیص الحبیر میں گردن کے مسح کے بارے میں احادیث لائے ہیں اور احادیث کا موجود ہونا تو آپ کو بھی تسلیم ہے۔ رہا ان کا ضعف تو آب تک آپ کتنے ضعیف روایات پر عمل کر چکے ہیں تو اگر اس پر بھی عمل ہو جائے تو آپ کے شریک کار کے اصول پر عمل بھی ہو جائے گا۔

گردن کا مسح احادیث کی روشنی میں:

1. عَنْ فُلَيْحِ بْنِ سُلَيْمَانَ عَنْ نَافِعٍ عَنْ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "مَنْ تَوَضَّأَ وَمَسَحَ بِيَدَيْهِ عَلَى عُنُقِهِ وُقِيَ الْغُلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" وَقَالَ هَذَا إِنْ شَاءَ اللَّهُ حَدِيثٌ صَحِيحٌ [1].

2. عن ليث عن طلحة بن مصرف عن ابيه عن جده انه راى رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

---

[1] التلخيص الحبير ج 1/ ص:34 سنن الوضوء 1 :93 رقم 98

وَسَلَّمَ يمسح رأسه حتى بلغ القذال و ما يليه من مقدم العنق [1]. رواه احمد رجاله الى ليث كلهم ثقات و رواه الطبراني بلفظ "فلما مسح رأسه قال: «هكذا» ، وأومأ بيده من مقدم رأسه حتى بلغ بهما إلى أسفل عنقه من قبل قفاه" كذا في غاية المقصود [2].

و قد مر تحقيق رجاله في باب افرادالمضمضة عن الاستنشاق [3].

3. حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم انصاری روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے وضو کیا اور سر کا مسح کیا۔

فأقبل بهما وأدبر بدأ بمقدم رأسه، ثم ذهب بهما إلى قفاه [4]

حضرت موسیٰ بن طلحہ سے مروی ہے:

من مسح قفاه مع راسه وقی من الغل. {شرح احیاء العلوم للعلامہ الزبیدی ج: 2 /ص: 365}

جس نے سر کے ساتھ اپنی گردن کا مسح کیا وہ بچا دیا گیا کینے سے۔

یہ حدیث اگرچہ موقوف ہے مگر حکما مرفوع ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ اس حدیث میں گردن کے مسح کا جو مخصوص ثواب و فائدہ بیان کیا گیا ہے اس میں کسی اجتہاد یا رائے و قیاس کو دخل نہیں . کیونکہ کسی عمل کا مخصوص ثواب یا مخصوص عذاب بیان کیا جانا اجتہاد و قیاس سے خارج ہے۔ لہٰذا صحابی رسول ﷺ کی اس طرح کی حدیث حکما حدیث مرفوع ہوتی ہے۔ شارح بخاری علامہ ابن حجر عسقلانی نے اصول حدیث کی مشہور کتاب شرح نخبۃ الفکر {ص: 76, 77} میں اس بات کو بہت تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔

---

[1] النیل باب مسح العنق 1 :142

[2] باب فی الفرق بین المضمضة والاستنشاق ج1 /ص137

[3] اعلاء السنن ج1/ص 120,121 ادارة القران والعلوم الاسلامية

[4] مسلم ج 1/ ص 132 , بخاري ج 1 ص 31

مسند الفردوس میں علامہ دیلمی نے حضرت عبد اللہ بن عمر سے گردن کے مسح کی حدیث مرفوعا نقل کی ہے {وقایہ ج: 1/ص: 9 } گویہ حدیث سنداً ضعیف ہے لیکن فضائل اعمال میں بالاتفاق ضعیف حدیث بھی قابل عمل ہوتی ہے غیر مقلد احباب وحضرات وضو سے پہلے بسم اللہ پڑھتے ہیں بلکہ فرض کہتے ہیں اب سن لیجئے۔اور گردن کا مسح بھی مستحب ہی کہا گیا ہے نہ کہ فرض یا سنت. مزید برآں کوئی رایت مانع بھی نہیں بلکہ متعدد احادیث کریمہ سے سر کے مسح کے ساتھ گردن کے کچھ حصہ کا مسح ثابت ہے اور جب بھی گردن کا مسح کیا جاتا ہے وہ گردن کے کچھ ہی حصے کا مسح ہوتا ہے نہ کہ پوری گردن کا۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ سر کے علاو جن جن اعضاء میں یا جن جن مواقع پر مسح کی اجازت دی گئی ہے کہیں بھی اس عضو کا استیعاب شرط نہیں ہے۔مثلاً کان کا مسح، موزوں کا مسح، پٹی کا مسح اس اعتبار سے گردن کا مسح بھی کچھ ہی حصے کا ہوگا نہ کہ پوری گردن کا۔اور جو لوگ بھی گردن کے مسح کے قائل ہیں وہ تبعیض ہی کے قائل ہیں استیعاب کے نہیں۔

مؤقف اور دلیل کا مطالبہ:

اس قسم کے فروعی مسائل میں اکثر دو طرفہ مطالبے ہوتے ہیں کہ دلیل دو اس حوالے سے ایک علمی اور مفید بات مفید بات سمجھئے، کہ حدیث شریف کی رو سے دلیل اس کی ذمہ ہوتی ہے کہ جو کسی بات کا دعوی کرے اگر ایک آدمی کسی چیز کا انکار کرتا ہے تو اس کے ذمہ دلیل نہیں ہوتی اس کا دلیل پیش کرنا احسان ہوتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ اگر مسئلہ عقیدہ کا ہے، کفر اور شرک کا ہے، اصول کا ہے تو وہاں پر قطعی الثبوت (جس کا ثبوت قطعی ہو قرآن کی آیت یا متواتر حدیث) اور قطعی الدلالت (یعنی دلیل اپنے موضوع پر بالکل واضح ہو اشارہ نہ ہو) دلیل کا مطالبہ کیا جائے گا اس طرح فرض کے لئے بھی یہی دلیل دی جاتی ہے (فرض اتفاقی نہ کہ فرض اجتہادی (یہ بات اہل علم سے سمجھو) اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ فلاں چیز وجب ہے، تو اس سے حدیث مشہور کا مطالبہ کیا جاتا ہے، اور اگر اس آدمی کا مؤقف یہ ہو کہ فلاں چیز سنت ہے تو اس سے حدیث صحیح کا مطابہ کیا جاتا ہے اور اگر ایک آدمی یہ کہے کہ

فلاں چیز مستحب ہے تو اس سے جس دلیل کا مطالبہ ہوتا ہے اس کا ضعیف ہونا بھی کافی ہے، اس کتاب میں تفصیل سے یہ بحث آپ دیکھ لیں، قیاس اور اہل علم کے پسندیدہ عمل کو بھی مستحب کہتے ہیں، جیسے : گردن کی مسح، مرد و عورت کی نماز میں فرق وغیرہ۔

وضو کے بعد کی مسنون دعائیں:

مامنکم من أحد یتوضأ فیبلغ الوضوء ثم یقول: أشهد ان لا الا الله وحده لا شریک له. وأشهد ان محمد عبده ورسوله الا فتحت له ابواب الجنة الثمانية. يدخل من ايها شاء

تم میں سے کوئی بھی شخص نہیں کہ جو پورا وضو کرے، پھر یہ کہے: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔اکیلا ہے۔ اس کو کوئی شرید نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ مگر اس کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دئے جاتے ہیں کہ جس سے چاہے داخل ہو[1]۔

ابوداؤد کی ایک روایت میں اس دعا کو آسمان کی طرف نظر اٹھا کر پڑھنے کا ذکر ہے مگر یہ روایت صحیح نہیں۔اس میں ابو عقیل کا چچازاد بھائی مجہول ہے

وضو کے بعد یہ دعا بھی پڑھیں :

سبحانک اللهم وبحمدک اشهد ان لا اله الا انت، استغفرک واتوب اليک[2]

اے اللہ ! تو اپنی تمام تر تعریفات کے ساتھ (ہر عیب) پاک ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی سچا معبود نہیں ہے۔ میں تجھ سے
بخشش مانگتا ہوں اور تیرے حضور توبہ کرتا ہوں۔

---

[1] مسلم باب الذکر المستحب عقب الوضوء حدیث 234

[2] نسائی باب عمل الیوم واللیلۃ اسے امام حاکم حافظ ذہبی اور ابن حجر نے صحیح کہا ہے۔ ترمذی کی روایت میں دعا اللهم اجعلنی من التوابین بھی مذکور ہے مگر خود انہوں نے اسے مضطرب قرار دیا ہے { ع ر }

وضو کی خود ساختہ دعائیں :

رسول اللہ ﷺ کی سنت سے وضو کے شروع میں (بسم اللہ) اور بعد میں شہادتین کا پڑھنا ثابت ہے۔ لیکن بعض لوگ وضو میں ہر عضو دھوتے وقت ایک ایک دعا پڑھتے ہیں اور وہ دعائیں مروجہ کتب نماز میں پائی جاتی ہیں۔ واضح ہو کہ یہ دعائیں سنت پاک اور صحابہ کرامؓ کے عمل سے ثابت نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب اپنے رسول اکرم ﷺ پر دین مکمل کر دیا تو پھر دینی اور شرعی امور میں کمی بیشی کرنا کسی امتی کے لئے ہر گز جائز نہیں ہے۔

امام نوویؒ اور حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں: ہر عضو کے لئے مخصوص اذکار کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی چیز ثابت نہیں ہے۔

وضو کی دعائیں روایات صحیحہ سے:

1: أشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له وأشهد أن محمدا عبده ورسوله[1].

میں گواہی دیتا ہوں کہ ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں, اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہے۔

2: اللهم اجعلني من التوابين, واجعلني من المتطهرين[2].

اے اللہ مجھے توبہ کرنے والوں میں سے بنادے اور بنادے مجھے خوب پاکی حاصل کرنے والوں میں سے۔

[1] مسلم ج 1 ص 122

[2] ترمذی ج:1/ص:9 ومسلم ج:1/ص:122

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

وضوکے دیگر مسائل :

احادیث میں وضوکے اعضاء کو دو دو بار اور ایک ایک بار دھونے کا ذکر بھی آیا ہے لیکن نبی اکرم ﷺ اور صحابہ اکرامؓ کا اکثر عمل تین تین بار دھونے پر رہا ہے۔ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ سب علماء کا اتفاق ہے کہ اعضاء ایک ایک بار دھونا بھی کافی ہے۔

ایک اعرابی نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر وضو کی کیفیت دریافت کی تو آپ نے اسے اعضاء کا تین تین بار دھونا سکھایا اور فرمایا : اس طرح کامل وضو ہے، پھر جو شخص اسے (تین تین بار دھونے) پر زیادہ کرے یا (یوں) کمی کرے (کہ کسی عضو کو چھوڑ ڈالے یا پورا نہ دھوئے) پس تحقیق اس نے (ترک سنت کی بنا پر) برا کیا اور (مسنون حد سے تجاوز کر کے) زیادتی کی اور (رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کر کے اپنی جان پر ظلم کیا[1]۔[2]

مسنون وضو سے گناہوں کی بخشش :

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : جس وقت بندہ مومن وضو شروع کرتا ہے۔پھر کلی کرتا ہے اور ناک جھاڑتا ہے تو اس کے منہ اور ناک کے گناہ نکل جاتے ہیں، پھر جس وقت چہرہ دھوتا ہے اس کے چہرے کے گناہ نکل جاتے ہیں۔چہرہ دھوتے وقت گناہ ڈاڑھی کے کناروں سے بھی گرتے ہیں اور جس وقت وہ کہنیوں سمیت ہاتھ دھوتا ہے تو اس کے دونوں ہاتھوں سے گناہ نکل جاتے ہیں یہاں تک کہ

---

[1] ابو داؤد باب الوضوء ثلاثا ثلاثا حدیث 135 نسائی 88/1 اسے ابن خزیمہ اور امام نووی نے صحیح جب کہ حافظ ابن حجر نے جید کہا ہے

[2] **تبصرہ**:اس روایت کی سند میں ایک سلسلہ راوی عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ہے۔روایت کے اس سلسلہ سند کے بارے میں محدثین کا فیصلہ ہے کہ اگر عمرو بن شعیب اس سلسلے سے روایت کرے تو وہ روایت ضعیف ہوگی اور اگر دوسری سند سے روایت کرے تو صحیح ہوگی۔ جبکہ علامہ ابن حجر نے اس کو بھی مدلسین میں شمار کیا ہے۔ { طبقات المدلسین ابن حجر } اور آپ کا اصول گزر چکا ہے کہ مدلس کی عنعنہ روایت ضعیف ہوگی ۔ نسائی کی روایت کی سند میں ایک راوی سفیان بھی ہے اور سفیان کو آپ مدلس کہہ چکے ہو۔

دونوں ہاتھوں کے ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں، پھر جس وقت مسح کرتا ہے تو اس کے بالوں کے کناروں سے گناہ نکل جاتے ہیں، پھر جس وقت پاؤں دھوتا ہے تو اس کے دونوں پاؤں سے نکل جاتے ہیں یہاں تک کہ دونوں پاؤں کے ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں، پھر اس کے بعد اگر وہ کھڑا ہوا اور نماز پڑھی، اللہ کی تعریف، ثنا اور بزرگی یوں بیان کی جیسے اس کا حق ہے اور اپنا دل اللہ کی یاد کے لئے فارغ کیا تو وہ گناہوں سے اسطرح (پاک ہو کر) لوٹتا ہے جیسے وہ اس دن (پاک) تھا جب اسے اس کی ماں نے جنا تھا۔[1]

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ آپ اپنی امت کو (میدان حشر میں) دوسری امتوں (کے بے شمار لوگوں) سے کسطرح پہچانیں گے تو آپ نے فرمایا: میرے امتی وضو کے اثر سے سفید '(نورانی) چہرے اور سفید (نورانی) ہاتھ پاؤں والے ہوں گے۔ اسطرح ان کے سوا اور کوئی نہیں ہوگا۔[2]

خشک ایڑیوں کو عذاب :

عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکے سے مدینہ کی طرف لوٹے۔ راستے میں ہمیں پانی ملا۔ ہم میں سے ایک جماعت نے نماز عصر کے لئے جلد بازی میں وضو کیا۔ پیچھے سے ہم بھی پہنچ گئے (دیکھا کہ) ان کی ایڑیاں خشک تھیں، انھیں پانی نہیں پہنچا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (خشک) ایڑیوں کے لئے آگ سے خرابی ہے، پس وضو پورا کیا کرو۔[3]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وضو بڑی احتیاط سے، سنوار کر اور پورا کرنا چاہئے۔ اعضاء کو خوب اچھی طرح اور تین تین بار دھونا چاہئے تاکہ ذرا برابر جگہ بھی خشک نہ رہے۔ ایک شخص نے وضو

---

[1] مسلم باب اسلام عمرو بن عبسة حدیث 832

[2] مسلم باب استحباب اطالة الغرة والتحجیل فی الوضوء حدیث 247 '248

[3] مسلم باب وجوب غسل الرجلین بکمالهما حدیث 241

کیااور اپنے قدم پر ناخن کے برابر جگہ خشک چھوڑ دی۔ نبی اکرم ﷺ نے اسے دیکھ کر فرمایا: واپس جا اور اچھی طرح وضو کر۔[1]

وضو سے بلندی درجات :

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: طہارت آدھا ایمان ہے۔[2]

سیدنا ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے دلی دوست محمد ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ؛(جنت میں) مومن کو زیور (نور) وہاں تک پہنچے گا جہاں تک وضو کا پانی پہنچتا ہے۔[3]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں تمہیں وہ چیز نہ بتاؤں کہ جس کے سبب اللہ تعالیٰ گناہ مٹاتا ہے اور درجات بلند کرتا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا؛ کیوں نہیں، اے اللہ کے رسول! ارشاد فرمائیں) آپ نے فرمایا: مشقت (بیماری یا سردی وغیرہ) کے وقت کامل اور سنوار کر وضو کرنا، مسجدوں کی طرف اٹھنے والے قدموں کا زیادہ ہونا اور نماز کے بعد نماز کا انتظار کرنا (گناہ مٹاتا ہے اور درجات بلند کرتا ہے)[4]

تحیۃ الوضو پڑھنے کی فضیلت :

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص وضو کرے اور خوب سنوار کر اچھا وضو کرے، پھر کھڑا ہو کر دل اور چہرے سے ظاہری و باطنی طور پر متوجہ ہو کر نفل نماز ادا کرے تو اس کے لئے جنت واجب ہو جاتی ہے۔[5]

---

[1] مسلم باب وجوب استیعاب جمیع اجزاء محل الطهارة حدیث 243

[2] مسلم باب فضل الوضوء حدیث 223

[3] مسلم باب تبلغ الحلية حيث يبلغ الوضوء حدیث 250

[4] مسلم باب فضل اسباغ الوضوء على المكاره حدیث 251

[5] مسلم باب الذكر المستحب عقب الوضوء حدیث 234

سیدنا ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز فجر کے وقت سیدنا بلالؓ سے فرمایا: اے بلال! میرے سامنے اپنا وہ عمل بیان کر جو تو نے اسلام میں کیا اور جس پر تجھے ثواب کی زیادہ امید ہے کیونکہ میں نے اپنے آگے جنت میں تیری جوتیوں کی آواز سنی ہے۔ سیدنا بلالؓ نے عرض کیا: میرے نزدیک جس عمل پر مجھے (ثواب کی) بہت زیادہ امید ہے وہ یہ ہے کہ میں نے رات یا دن میں جب وضو کیا تو وضو کے ساتھ جس قدر نفل نماز میرے مقدر میں تھی، ضرور پڑھی ہر وضو کے بعد نوافل پڑھے۔[1]

ایک وضو سے کئی نمازیں ادا کرنا:

سیدنا بریدہؓ سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ نے کئی نمازیں ایک وضو سے پڑھیں اور موزوں پر مسح بھی کیا۔ سیدنا عمرؓ نے عرض کیا؛ اے اللہ کے رسول! آج آپ نے وہ کام کیا جو آپ پہلے نہیں کیا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا: اے عمر! میں نے ایسا جان بوجھ کر کیا ہے تا کہ لوگوں کو ایک وضو سے کئی نمازیں پڑھنے کا جواز معلوم ہو جائے۔[2]

معلوم ہوا کہ وضو قائم ہونے کی صورت میں ہر نماز کے لئے وضو فرض نہیں بلکہ افضل ہے۔

دودھ پینے سے کلی کرنا:

بیشک رسول اللہ ﷺ نے دودھ پیا، پھر کلی کی اور فرمایا: اسمیں چکنائی ہے۔[3]

آپ نے بکری کا شانہ کھایا، اسکے بعد نماز پڑھی اور دوبارہ وضو نہ کیا۔[4]

آپ نے ستو کھائے، پھر کلی کرکے نماز پڑھی اور وضو نہیں کیا۔[1]

---

[1] بخاری باب فضل الطهور بالليل والنهار حدیث 1149 مسلم باب من فضائل بلال حدیث 2458

[2] مسلم باب جواز الصلوات کلها بوضوء واحد حدیث 277

[3] بخاری باب هل يمضمض من اللبن؟ حدیث 211 مسلم باب نسخ الوضوء مما مست النار حدیث 358

[4] بخاری باب من لم يتوضا من لحم الشاة والسويق حدیث 207 مسلم باب نسخ الوضوء مما مست النار حدیث 354

موزوں وغیرہ پر مسح کے متعلق احکام و مسائل :

سیدنا مغیرہؓ کہتے ہیں: میں ایک سفر میں نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ تھا۔ میں نے وضو کے وقت چاہا کہ آپ ﷺ کے دونون موزے اتار دوں ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: انہیں رہنے دو میں نے انہیں طہارت کی حالت میں پہنا تھا، پھر آپ نے ان پر مسح کیا[2]۔

شریح بن ہانیؒ فرماتے ہیں: میں نے سیدنا علیؓ سے موزوں پر مسح کرنے کی مدت کے متعلق پوچھا تو سیدنا علیؓ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے مسافر کے لئے (مسح کی مدت) تین دن رات اور مقیم کے لئے ایک دن رات مقرر فرمائی ہے۔[3]

سیدنا صفوان ابن عسالؓ کہتے ہیں کہ حالت سفر میں رسول اللہ ﷺ ہمیں حکم دیتے کہ ہم اپنے موزے تین دن اور تین راتوں تک پاخانہ، پیشاب یا سونے کی وجہ سے نہ اتاریں (بلکہ ان پر مسح کریں) ہاں جنابت کی صورت مین (موزے اتارنے کا حکم دیتے)[4]۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنبی ہونا مسح کی مدت ختم کر دیتا ہے۔ اسلئے غسل جنابت میں موزے اتارنا لازم ہے، البتہ بول و براز اور نیند کے بعد موزے نہ اتارے جائیں بلکہ معینہ مدت تک ان پر مسح کیا جاسکتا ہے۔

---

[1] بخاری باب من مضمض من السویق ولم یتوضا حدیث 209

[2] بخاری باب اذا دخل رجلیھو ھما طاھر تان حدیث 206

[3] مسلم باب التوقیت فی المسح علی الخفین حدیث 276

[4] ترمذي باب المسح علی الخفین للسافر والمقیم حدیث 96 نسائی 1 / 83 ,84 ,98 اسے امام ترمذی ابن خزیمہ ابن حبان اور نووی نے صحیح کہا ہے

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

جرابوں پر مسح کرنے کا بیان[1]:

حضرت ثوبان روایت کرتے ہیں : امرھم ان یمسحوا علی العصائب والتساخین[2].

رسول اللہ ﷺ نے وضو کرتے وقت صحابہ کو پگڑیوں اور جرابوں[3] پر مسح کرنے کا حکم دیا۔

تبصرہ:

ہمارا تبصرہ الف یہ ہے کہ مولانا موصوف نے التساخین کا معنی جرابیں بالکل غلط کیا ہے اس سے مقصد مروجہ ہر قسم کی جرابوں پر مسح کو ثابت کیا ہے جو انتہائی شنیع فعل ہے جبکہ بلوغ المرام حافظ ابن حجر نے اس روایت کو { بحوالہ ابوداؤد ومسند احمد } نقل کیا ہے جس کے آخر میں خود التساخین کی تفسیر الخفافین کے ساتھ کی ہے اور خفین عربی زبان میں صرف چمڑے کے موزے کو کہتے ہیں اونی یا

---

[1] جمہور اہلسنت فرماتے ہیں کہ باریک موزوں پر مسح کر کرکے نماز پڑھنے سے نماز نہیں ہوتی، جبکہ غیر مقلد بزرگ کہتے ہیں باریک جرابوں پر مسح کرنا درست ہے اور اس وضوء سے نماز ہو جاتی ہے۔

[2] حافظ ابن حجر درایہ میں حضرت ثوبانؓ کے روایت کے ضعف کے بارے میں لکھتے ہیں: ابن حجر نے فرمایا کہ یہ منقطع روایت ہے۔ بیہقی نے اس کو ضعیف کہا ہے امام بخاری فرماتے ہیں صحیح نہیں ہے۔ اس روایت میں جراب کا لفظ نہیں۔ التساخین کا معنی موزے ہیں (ذیلعی ص 165 ج 1 ,المنجد ص 334 ,مصباح اللغات ص 367)اور احمد کی روایت میں " خفیہ " کا لفظ صریح ہے۔ الغرض نہ یہ حدیث متواتر ہے نہ خبر واحد ہے اور نہ صحیح ہے اور نہ اس میں جراب کا لفظ ہے۔

1 :اس سند کا پہلا راوی یحیٰ بن سعید ہے۔قال الذھبی کان یفتی برأی ابی حنیفۃ کذا فی الطبقات یعنی آپ جلیل القدر محدث اور امام الجرح والتعدیل ہونے کے باوجود خاص امام ابو حنیفہ کے مقلد تھے۔

2 : دوسرا راوی ثوبان بن یزید ہے۔اس کے متعلق نماز نبوی والے نے صرف اتنا لکھا ہے کہ ثقہ معروف ہے۔(ص 7)
لیکن آگے یہ بات نہیں بتائی کہ وہ تقدیر کا منکر اور بدعتی تھا۔ (تقریب، خلاصہ) امام احمد طلبہ کو بھی اس کے پاس جانے سے ڈراتے تھے کہ وہ "ثور" تمہیں سینگوں سے زخمی کر دے گا۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر آتا تو کہا کرتا تھا: لا احب رجلا میں اس شخص کو پسند نہیں کرتا کیونکہ علی نے جنگ صفین میں میرے دادا کو قتل کیا تھا۔ (حاشیہ خلاصہ تہذیب الکمال ص 50)

3 : تیسرا راوی راشد بن سعد ہے جس کو ثقہ ثابت کرنے کے لیے امام یحیٰ بن معین کا قول تو نقل کر دیا کہ ثقہ ہے لیکن ان کے اپنے امام المجدد ابن حزم اندلسی (ص 11) کی جرح کو ظاہر نہیں کیا کیونکہ اس نے اسے ضعیف کہا ہے ۔(میزان الاعتدال ص 35 ج 2)

سوتی موزے کو خفین نہیں کہا جاتا۔ اور غیر مقلد بزرگوں کے امام صفی الرحمٰن مبارک پوری نے خود بھی بلوغ المرام میں تساخین کا ترجمہ موزوں کے ساتھ کیا ہے لہٰذا اس لفظ کا ترجمہ جرابوں کے ساتھ کرکے مروجہ ہر قسم کے جرابوں پر مسح کو ثابت کرنا اہل حدیث بزرگوں کا نہیں بلکہ اہل ہوا کا کام ہو سکتا ہے۔ حضرت جناب مبارک پوری صاحب تساخین کا معنی بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تساخین ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جس سے پاؤں سردی سے بچ سکے موزہ ہو یا جراب یعنی تعین ہی نہیں ہے کہ موزہ ہے یا جراب۔ تساخین کا معنی جرابوں کے ساتھ خاص کرنا درست نہیں۔

اور مزید یہ کہ جرابوں پر مسح کرنے کے بارے میں اہل حدیث شیخ الکل مولانا نذیر حسین دہلوی اپنے: فتاوی نذیریہ[1] میں سائل کے سوال کے جوب میں فرماتے ہیں کہ اونی یا سوتی جرابوں پر مسح کرنا جائز ہے کہ نہیں؟ جواب میں شیخ الکل فرماتے ہیں: مذکورہ جرابوں پر مسح جائز نہیں ہے کیونکہ اس کی کوئی صحیح دلیل نہیں ہے اور مجوزین نے جن چیزوں سے استدلال کیا ہے اس میں خدشات ہیں استدلال تین چیزوں سے کیا گیا ہے حدیث مرفوع، فعل صحابہ اور قیاس۔۔۔ یہاں ایک اور خدشہ بھی ہے۔ کہ جراب سوتی بھی ہوتی او راونی بھی موٹی بھی باریک بھی او روہ بھی جس کے پیچھے چمڑا لگا ہوتا ہے تو جب تک کسی خاص لفظ سے پتہ نہ چلے کہ وہ جراب جس پر آنحضرت ﷺ نے مسح کیا وہ چمڑے والی نہ تھی تب تک مقصود مجوزین ثابت نہیں ہو سکتا۔

اور مزید یہ کہ قرآن کریم کی آیت اور جب تم نماز کے لئے اٹھو تو اپنے چہروں کو اور ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھولو سر کا مسح کرو اور پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھولو۔ { سورۃ مائدہ } یہاں اس آیت میں پوری وضاحت کے ساتھ پاؤں دھونے کا حکم ہے نہ کہ ان پر مسح کرنے کا۔ لہٰذا قرآن کریم کی اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ وضو میں ہمیشہ پاؤں دھوئے جائیں اور ان پر مسح کسی صورت میں جائز نہ ہو۔ البتہ موزوں پر مسح کا مسئلہ آنحضرت ﷺ سے ایسے تواتر کے ساتھ ثابت ہے جس کا انکار ممکن نہیں۔ اگر مسح علی الخفین جواز پر دو تین حدیثیں ہی ہوتیں تب بھی ان کے بنیاد پر قران کریم پر زیادتی یا اس کا نسخ

[1] اشاعت 2010 المطبعۃ العربیہ لاہور 1 / 326

درست نہ ہوتا۔ کیونکہ اخبار آحاد سے قرآن کریم پر زیادتی یا اس کا نسخ جائز نہیں ہے۔ اب اصولی طور پر پاؤں دھونے کے فریضہ کو چھوڑ کر خفین کے علاوہ کسی بھی طور پر مسح کرنے کا حکم اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس پر احادیث متواترہ موجود نہ ہو۔ خفین میں چونکہ ایسی احادیث موجود تھیں اس لئے وہاں مسح کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن جرابوں پر مسح کسی ایسی حدیث سے ثابت نہیں جو متفق علیہ طور پر صحیح ہو۔ قارئین کے اطلاع کے لئے عرض ہے کہ خالی پاؤں پر مسح کے قائل پوری دنیا میں صرف شیعہ ہیں۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

صحابہ کا جرابوں پر مسح کرنا:

حضرت عقبہ بن عمرو ابو مسعود انصاری نے اپنی جرابوں پر اپنی چپل کے تسموں سمیت مسح کیا {بیہقی 1/ 258} عمرو بن حریث فرماتے ہیں حضرت علی نے پیشاب کیا پھر وضو کرتے ہوئے آپ نے اپنے جرابوں پر جو جوتوں {چپلوں} میں تھیں مسح کیا۔ {ابن ابی شیبہ وابن المنذر} ابن حزم نے 12 صحابہ کرام رضی اللہ تعالی عنہم سے جرابوں پر مسح کرنا ذکر کیا ہے۔ جن میں عبد اللہ بن مسعود سعد بن ابی وقاص اور عمرو بن حریث رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں۔ اسی طرح سہل بن سعد جرابوں پر مسح کیا کرتے تھے۔ {ابن ابی شیبہ 1/ 173} ابو امامہ بھی جرابوں پر مسح کیا کرتے تھے۔ {ابن ابی شیبہ 1/ 173} نیز انس بن مالک نے وضو کرتے ہوئے اپنی ٹوپی اور سیاہ رنگ کے جرابوں پر مسح کیا اور نماز پڑھی۔ {بیہقی 1/ 285} ابن قدامہ کہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جرابوں پر مسح کے جواز پر اجماع ہے {مغنی لابن قدامہ 1/ 332 مسئلہ-426}۔

لغت عرب سے جورب کی معنی:

لغت عرب کے معتبر کتاب قاموس {1/ 46} میں ہے ہر وہ چیز جو پاؤں پر پہنی جائے جورب ہے۔ تاج العروس" میں ہے جو چیز لفافے کی طرح پاؤں پر پہن لیں وہ جورب ہے۔ علامہ عینی لکھتے ہیں جورب بنے ہوئے اون سے بنائی جاتی ہے اور پاؤں میں ٹخنے سے اوپر تک پہنی جاتی ہیں۔ عارضۃ

الاحوذی میں شارح حدیث امام ابو بکر ابن العربی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں جورب وہ چیز ہے جو پاؤں کو ڈھانپنے کے لئے اون کی بنائی جاتی ہے۔ عمدۃ الرعایہ میں ہے جورابیں ورئی یعنی سوت کی ہوتی ہیں او ربالوں کی بنتی ہیں۔ غایۃ المقصود میں ہے کہ جرابیں چمڑے کی، صوف کی اور سوت کی بھی ہوتی ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ جورب لفافے یا لباس کو کہتے ہیں وہ لباس خواہ چرمی ہو سوتی ہو یا اونی ہم اس پر مسح کر سکتے ہیں۔

﴿ اہل سنت فرماتے ہیں: ﴾

جمہور اہلسنت فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مسح علی الجوربین کے بارے میں مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے عقبہ بن عامر ابو مسعود انصاری اور حضرت علی کے حوالے دیئے ہیں ان روایات کی سند میں دو مدلسین اور عن سے روایت کر رہے ہیں ایک سفیان جن کو مرحوم علی زئی صاحب کئی مقامات پر مدلس کہہ چکے اور دوسرے امام اعمش جن کو حافظ زبیر مرحوم علی زئی صاحب {جزقرآءۃ ص:92اور جزرفع یدین ص:82 } پر مدلس کہا ہے لہٰذا یہ آثار صحابہ غیر مقلد بزرگوں کے اپنے ہی اصول کے مطابق ضعیف ہیں۔اور باقی عبد اللہ ابن مسعود سعد بن وقاص اور سیدنا عمرو بن حریث کے آثار مصنف ابن ابی شیبہ میں دیئے گئے حوالہ کے مطابق ہیں ہی نہیں۔

مزید یہ کہ حافظ زبیر علی زئی صاحب فرماتے ہیں مٹھی سے زائد داڑھی کاٹنا بالکل غلط ہے عبداللہ بن عمر کی جو روایت پیش کی جاتی ہے وہ ان کا اپنا عمل ہے اور ان کا عمل دین میں دلیل نہیں بنتا { ماہنامہ الحدیث 27/ص:55 } مزید فرماتے ہیں عبد اللہ بن مسعود مدرک رکوع کو مدرک رکعت سمجھتے تھے۔ { یعنی جو شخص امام کے ساتھ رکوع میں مل جائے تو اس کی یہ رکعت بغیر فاتحہ پڑھنے کے بھی مل گئی } اس کی سند صحیح ہے لیکن یہ صحابی کا فتوی ہے۔{ ماہنامہ الحدیث 30 ص: 15 }۔ لہٰذا غیر مقلد احباب ان آثار کو نہیں مانتے۔

مزید برآں نواب صدیق حسن بھوپالی کا ارشاد ہے " صحابی کا فعل حجت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا { بدور الاہلہ ص:193 } ان کے بیٹے نواب نورالحسن فرماتے ہیں یہ بات اصول طور پر طے ہو گئی کہ صحابی

کا قول حجت نہیں۔ قائین کرام آپ نے دیکھا کہ ان بزرگوں نے کتنی آسانی سے جید صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قول وفعل کو اس لئے رد کیا کہ وہ ان کے مسلک کے خلاف تھا اور اب یہی بزرگ پھر مذکورہ صحابہ کے عمل کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ فیاللعجب۔

فتاوی نذیریہ { 334 / 1 } پر ہے اگر صحابہ سے کوئی نقلی دلیل ہے تو کہا ہے کیسی ہے جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو جائے ہم قرآن اور متواتر حدیث کو کیسے چھوڑ دیں اور اگر صحابہ کے فعل کے استدلال کیا جائے تو اس کا جواب پہلے گزر چکا کہ اس میں اجتہاد کو دخل ہے اور پھر یہ بھی معلوم نہیں صحابہ کون سے جراب پر مسح کیا کرتے تھے جب تک ان تمام باتوں کی وضاحت نہ ہو جائے ہم کتاب اللہ کے مضمون کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔

قارئین کرام! آپ حضرات محترم نذیر حسین ہلوی غیر مقلد کی بات کو خوب سمجھ گئے ہوں گے کہ صحابہ کرام کے ان آثار میں کہیں بھی یہ صراحت نہیں کہ یہ جوربین کپڑے کے باریک موزے تھے۔ جب تک یہ صراحت نہ ہو اس وقت تک ان آثار سے باریک موزوں پر مسح کا جواز کیسے ثابت ہو سکتا ہے۔

اگر شیخ الکل کی بات سے تسلی نہیں ہوئی تو ہم اہل حدیث کے ایک اور امام علامہ شمس الحق عظیم آبادی کو دعوت دیتے ہیں چنانچہ وہ { عون المعبود 1/ 62 } میں فرماتے ہیں (ترجمہ) یعنی جوربین کھال بھی ہوتے ہیں اون کے بھی اور روئی کے بھی ہر ایک کو جورب کہا جاتا ہے۔ اور ہر قسم کے موزے پر مسح کی اجازت اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو کہ آپ ﷺ نے اون کے جرابوں پر مسح فرمایا بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ ثابت ہے کہ ان حضرات نے جن جوربین پر مسح فرمایا وہ یا تو چمڑے کے تھے یا اپنی موٹائی کی وجہ سے چمڑے کے موزوں کی طرح تھے { بحوالہ فقہی مقالات از مفتی تقی عثانی } مفتی عبد الجبار فرماتے ہیں" مطلق جرابوں پر مسح بھی جائز نہیں ہاں اگر جرابیں اون یا سوت کے ایسے سخت ہو کہ سختی میں چمڑے کے برابری کریں پس وہ چمڑے کا حکم رکھتی ہیں ان پر مسح جائز ہے۔ { فتاوی عبد الجبار باب مسح علی الجوربین بحوالہ اصلی صلوۃ الرسول } ثناء اللہ امرتسر

فرماتے ہیں" جرابوں پر مسح نہ قرآن سے ثابت ہوا نہ حدیث سے نہ اجماع سے نہ قیاس سے نہ چند صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین کے فعل سے اور غسل رجلین { پاؤں کا دھونا } نص قرانی سے ثابت ہے لہٰذا خف چرمی { چمڑے کا موزہ } کے سوا جراب پر مسح ثابت نہ ہوا { فتاوی ثنائیہ 1 /442 بحوالہ اصل صلوۃ الرسول } مولانا مبارک پوری صاحب فرماتے ہیں کہ جرابوں پر مسح کے لئے کوئی مرفوع صحیح حدیث نہیں ملتی۔ { تحفۃ الاحوذی بحولہ اصلی صلوۃ الرسول }

ڈاکٹر شفیق الرحمٰن زیدی "نماز نبوی" میں آگے فرمارہے ہیں کہ ہر وہ چیز جو پاؤں پر پہنی جائے ون جورب { جراب } ہے جرابیں چمڑے صوف اور سوت کی بھی ہوتی ہیں۔ آخر میں فرماتے ہیں کہ پس ثابت ہوا کہ جورب لفافے یا لباس خواہ چربی ہو سوتی ہو یا اونی ہم اس پر مسح کر سکتے ہیں۔ تو جناب آپ یہ بھی تو بتائیں کہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان میں سے کس پر مسح کرتے تھے ؟؟۔

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کے تحت فرماتے ہیں: ﴾

جرابوں پر مسح کرنے کا بیان:

اس اہم مسئلہ میں چونکہ عام لوگ غلطی میں مبتلا ہیں لہٰذا ذیل میں اس کی تفصیل ذکر جاتی ہے:

جرابوں پر مسح کے جواز میں چھ قسم کے دلائل پیش کئے جاتے ہیں:

1- عن مغيرة قال توضأ النبي ﷺ ومسح على الجوربين والنعلين. (ترمذی)

2- عن ابي موسى ان رسول الله توضأ ومسح على الجوربين والنعلين. (بیہقی، ابن ماجہ)

3- عن بلال كان رسول الله ﷺ يمسح على الخفين والجوربي. (طبرانی)

4- قال ابن حجر رواه الطبراني بسندين، رواة احدهما ثقات.

5- استدل ابن القيم بعمل بعض الصحابة.

6- عن ثوبان قال بعث رسول الله سرية فأصابهم البرد فلما قدموا على النبي ﷺ شكوا اليه ما اصابهم من البرد فأمرهم أن يمسحوا على العصائب والتساخين. (ابو داؤد)

ذیل میں ان دلائل کا ترتیب وار جائزہ بحوالہ تحفۃ الاحوذی پیش کیا جاتا ہے:

پہلی دلیل کا جائزہ:

عن مغیرة قال توضأ النبي ﷺ ومسح علی الجوربین والنعلین.

علما محدثین رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے قطعاً استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے وجوہات درج ذیل ہیں:

1- امام بیہقی اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ: یہ حدیث منکر ہے، سفیان وثوری، عبدالرحمٰن ابن مہدی، امام احمد بن حنبل، ابن المدینی اور امام مسلم جیسے جلیل القدر علمانے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔

امام مسلم فرماتے ہیں اس حدیث کے راوی ابو قیس اور ہذیل نے اس حدیث کے بقیہ تمام راویوں کی مخالفت کی ہے، چونکہ سب نے صرف موزوں پر مسح کو نقل کیا ہے، لہٰذا ابو قیس و ہذیل جیسے راویوں کی وجہ سے قرآن کو نہیں چھوڑا جاسکتا۔

2- علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ حفاظ حدیث اس روایت کے ضعیف ہونے پر متفق ہیں لہٰذا امام ترمذی کا یہ کہنا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے، لیکن امام مسلم بڑے درجے کے محدث کا فرمان قابل غور ہے۔

3- عبدالرحمٰن بن مہدی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث میرے نزدیک غیر مقبول ہے۔

4- امام نسائی فرماتے ہیں کہ کسی ایک راوی نے بھی ابو قیس کی طرح اس روایت کو نقل نہیں کیا حضرت مغیرہؓ سے صحیح طور پر صرف موزوں پر مسح کرنا منقول ہے۔

5- امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن مہدی اس حدیث بیان نہیں کیا کرتے تھے چونکہ حضرت مغیرہؓ سے جو مشہور روایت منقول ہے، اس میں نبی اکرم ﷺ کا موزوں پر مسح کرنا منقول ہے، اس میں جرابوں کا تذکرہ نہیں ہے۔

6- حضرت علی بن المدینی فرماتے ہیں کہ اس روایت کو حضرت مغیرہؓ سے اہل مدینہ، اہل کوفہ اور اہل بصرہ نے نقل کیا، لیکن جب ہذیل نے نقل کیا تو اس میں جرابوں پر مسح کا اضافہ کر دیا اور سب لوگوں مخالفت کی۔

7- علامہ مبارکپوریؒ فرماتے ہیں کہ ابو قیس نے تمام راویوں کی مخالفت کی ہے، نیز بہت سے علمائے حدیث نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے باوجودیکہ انہیں ثقہ راوی کی زیادتی والا مسئلہ معلوم تھا۔ لہٰذا میرے نزدیک ان کا ضعیف قرار دینا مقدم ہے ترمذی کے حسن صحیح کہنے پر۔ (تحفۃ الاحوذی)

دوسری دلیل کا جائزہ:

1- عن ابي موسى ان رسول الله توضأ ومسح على الجوربين والنعلين. (بیہقی، ابن ماجہ)

2- علامہ مبارکپوری فرماتے ہیں کہ عیسی بن سنان کو اختلاط ہو جایا کرتا تھا وہ ضعیف الحدیث ہے۔

3- امام بیہقی فرماتے ہیں اس روایت میں دو کمزوریاں ہیں: (1) امام احمد، ابن معین، ابوزرعہ اور نسائی نے عیسی سنان کو ضعیف قرار دیا ہے۔

4- نیز امام بیہقی فرماتے ہیں کہ ضحاک بن عبد الرحمٰن کا سماع ابو موسی سے ثابت نہیں، لہٰذا روایت منقطع ہے۔

5- امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ یہ روایت نہ تو متصل ہے نہ قوی ہے۔

تیسری دلیل کا جائزہ:

عن بلال كان رسول الله ﷺ يمسح على الخفين والجوربين. (طبرانی)

1- زیلعی فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں یزید بن ابی زیاد ہے اور وہ ضعیف ہے۔

2- حافظ ابن حجر تقریب میں فرماتے ہیں کہ ضعیف ہے۔ بڑھاپے میں اس کی حالت بدل گئی تھی اور وہ شیعہ ہی تھا۔

3- اس کی سند میں اعمش راوی مدلس ہے، اس نے عنعن سے رویت کی ہے اور اس کا سماع حکم سے ثابت نہیں ہے۔

چوتھی دلیل کا جائزہ:

قال ابن حجر رواہ الطبرانی بسندین رواۃ احدہما ثقات

1- علامہ مبارکپوریؒ فرماتے ہیں گو کہ اس روایت کی ایک سند کے راوی ثقہ ہیں، لیکن اس میں بھی اعمش راوی ہے جو کہ مدلس ہے اور اس نے عنعن سے روایت کی ہے اور مدلس راوی کا عنعنہ قبول نہیں ہے۔

2- تمام راوی ثقہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس روایت کا متن بھی صحیح ہو، چونکہ یہاں ثقہ راوی مدلس ہے اور وہ اپنے استاد سے عنعنہ کے ساتھ روایت کرتا ہے۔

پانچویں دلیل کا جائزہ:

استدل ابن القیم بعمل بعض الصحابة

1- علامہ مباکپوریؒ فرماتے ہیں کہ موزوں پر مسح کی بابت بہت سی احادیث منقول ہے، جن کے صحیح ہونے پر علما کا اجماع ہے، اس معیار کی احادیث کی وجہ سے ظاہر قرآن کو چھوڑ کر ان پر بھی عمل کیا گیا، جب کہ جرابوں پر مسح کی بابت جو روایات منقول ہیں ان پر جو تنقید ہوئی ہے وہ آپ دیکھ چکے ہیں پس اس قسم کی ضعیف روایت کی وجہ سے ظاہر قرآن کو کیونکر چھوڑا جا سکتا ہے۔

2- بعض حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم جو جرابیں استعمال فرماتے تھے، وہ اتنی باریک نہ ہوتی تھیں کہ پاؤں خود بخود ٹھہر نہ سکیں۔ اور ان کو پہن کر طویل مسافت پیدل طے نہ ہو سکے، بلکہ وہ موٹی اور سخت ہوا کرتی تھیں۔ جو موزوں کے حکم میں ہوا کرتی تھیں۔ لہٰذا وہ موزوں پر مسح والی احادیث کے ضمن میں شامل ہیں اور میرے نزدیک یہی بات واضح

ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا بھی یہی کہنا ہے کہ ان حضرات نے جن جرابوں پر مسح کیا وہ موزوں کی مانند تھیں۔

الغرض جب حضرات صحابہ کی جرابوں کی تفصیل معلوم ہو گئی تو اب موٹی باریک ہر قسم کی جراب پر مسح کو جائز کہنا صحیح نہیں رہا۔

چھٹی دلیل کا جائزہ:

عن ثوبان قال بعث رسول الله سرية فأصابهم البرد فلما قدموا على النبي ﷺ شكوا اليه ما اصابهم من البرد فأمرهم أن يمسحوا على العصائب والتساخين. (ابو داؤد)

بعض حضرات تساخین کے لفظ استدلال کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں۔

1- یہ حدیث منقطع ہے، ابن ابی الحاکم، کتاب المراسیل (ص: 22) میں امام احمد بن حنبل کا قول نقل کرتے ہیں کہ راشد بن سعد کا سماع ثوبان سے ثابت نہیں ہے۔ (تحفۃ الاحوذی، ج: 1/ ص: 34-33)

2- نیز لغۃ بھی تساخین کے تین معنی کئے گئے ہیں، لہٰذا صرف جرابوں کے مسح پر استدلال کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

3- ابن اثیر کتاب النہایہ میں فرماتے ہیں کہ تساخین سے مراد موزے ہیں۔

4- حمزہ اصفہانی فرماتے ہے کہ یہ ٹوپی کی ایک قسم ہے علما اسے پہنا کرتے تھے۔

5- دوسرے علمائے لغت کا کہنا کہ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس سے پاؤں کو گرمایا جائے چاہے وہ موزے ہو، جراب ہو یا کوئی اور چیز۔

6- بلوغ المرام میں اس روایت کے بعد خود راوی کی وضاحت موجود ہے کہ تساخین سے مراد موزے ہیں۔ (بلوغ المرام، مسح علی الخفین)

اسی لئے علاہ مبارکپوریؒ بھی فرماتے ہیں کہ: " خلاصہ کلام یہ ہے کہ جرابوں پر مسح کے بارے میں کوئی صحیح مرفوع حدیث موجود نہیں جو جرح و تنقید سے خالی ہو"۔ (تحفۃ الاحوذی، ج: 1/ص: 333)

اور خود غیر مقلد عالم دین مولانا ابو سعد شرف الدینؒ بھی معترف ہیں کہ یہ (جرابوں پر مسح) نہ قرآن سے ثابت ہوا نہ حدیث مرفوع صحیح سے نہ اجماع نہ قیاس صحیح سے نہ چند صحابہ کے فعل اور اس کے دلائل سے اور غسل رجلین (پاؤں کا دھونا) نص قرآنی سے ثابت ہے، لہٰذا خف چرمی (موزہ) کے سوا جراب پر مسح کرنا ثابت نہیں۔ (ثناء اللہ امرتسری، فتاوی ثنائیہ، ج: 1/ص: 423)

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کے تحت فرماتے ہیں: ﴾

جرابوں پر مسح کی حقیقت:

موزے تین قسم کے ہیں:

(1) چمڑے کے موزے جنہیں خفین کہا جاتا ہے۔ ان پر مسح باجماع جائز ہے۔

(2) وہ باریک موزے جو نہ چمڑے کے ہوں اور نہ ان میں چمڑے کے اوصاف پائے جاتے ہوں جیسے آج کل کے سوتی، اونی یا نائیلون کے موزے۔ ان کے بارے میں اجماع ہے کہ ان پر مسح جائز نہیں۔

(3) وہ موزے جو چمڑے کے تو نہیں ہیں، لیکن ان میں موٹے ہونے کی بنا پر اوصاف چمڑے ہی کے پائے جاتے ہیں۔ ان پر مسح کے جواز میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو موزے چمڑے جیسے نہ ہوں، ان پر مسح کے عدم جواز میں جمہور امت، فقہا اور مجتہدین امت کا کوئی اختلاف نہیں، اور اس کی وجہ یہی ہے کہ پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جا سکتا جب تک کہ مسح کا حکم ایسے تواتر سے ثابت نہ ہو جائے جس تواتر سے مسح علی الخفین کا جواز ثابت ہے۔ لہٰذا فقہاء کرام نے کپڑے کے موزوں پر مسح کے لئے جو شرطیں لگائیں ہیں وہ اپنی طرف سے نہیں لگائیں بلکہ ان موزوں میں چمڑے کے اوصاف کے تحقق کے لئے لگائی ہیں۔ اور اس میں بھی اختلاف رہا ہے کہ شرائط کے تحقق کے بعد بھی ان پر مسح جائز ہے یا نہیں۔ حقیقت مسئلہ کی اس وضاحت کے بعد اب ان روایات کو دیکھے، جن میں جوربین (جورابوں) پر مسح کا ذکر آیا ہے۔ سارے ذخیرہ حدیث میں یہ کل تین حدیثیں ہیں۔ ایک حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

ایک حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے اور ایک حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی حدیث معجم صغیر طبرانی میں ہے۔ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث ابن ماجہ اور بیہقی وغیرہ نے روایت کی ہے۔ لیکن حافظ زیلعی نے ان دونوں کے بارے میں ثابت کیا ہے کہ یہ دونوں سنداً ضعیف ہیں[1]۔

لہٰذا یہ دونوں حدیثیں تو خارج از بحث ہیں۔ اب صرف حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی حدیث رہ جاتی ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے درست صحیح فرماتے ہیں، لیکن دوسرے محدثین نے سخت تنقید کی ہے۔ مثلاً امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو روایت کرکے لکھتے ہیں: وکان عبد الرحمن بن مھدی لا یحدث بھذا الحدیث لان المعروف عن المغیرۃ ان النبی علیہ السلام مسح علی الخفین[2]۔ لیس بالقبول وال بالقوی[3]۔

اب صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ جن حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے منقول ہے کہ انھوں نے جوربین پر مسح کیا یا اس کی اجازت دی تو ان کے اس عمل کی کیا وجہ تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ان آثار میں کہیں بھی یہ نہیں ہے کہ جوربین کپڑے کے باریک موزے تھے اور جب تک یہ صراحت نہ ہو اس وقت تک ان آثار سے باریک موزوں پر مسح کا جواز کیسے ثابت ہو سکتا ہے؟ چنانچہ مشہور اہل حدیث عالم علامہ شمس الحق صاحب عظیم آبادی لکھتے ہیں:

---

[1] نصب الرایہ ج 1 ص 94 ,183

[2] بذ المجھول ج 1 ص 96

[3] بذل المجمھود، ج: 1/ص: 96

"ان الجورب یتخذ من الادیم الخ یعنی جوربین کھال کے بھی ہوتے ہیں، اون کے بھی اور روئی کے بھی اور ہر ایک کو جورب کہا جاتا ہے اور ہر قسم کے موزے پر مسح کی اجازت اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکتی جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اون کے جوربین پر مسح فرمایا الخ [1]

اس کے علاوہ جوربین اگر موٹے ہوں تو ان پر مسح کرنے کے تو بعض فقہاء قائل بھی ہیں۔ لیکن جوتوں پر مسح کرنا تو کسی بھی امام کے مذہب میں جائز نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جوتوں پر مسح کرنا اس وقت ثابت ہے جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے ہی با وضو ہوتے تھے۔ چنانچہ صحیح ابن خزیمہ میں روایت ہے: عن علی رضی اللہ عنہ انہ دعا بکوز من ماء الخ یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پانی کا ایک برتن منگوایا اور بہت مختصر وضو کیا اور اپنے جوتوں پر مسح کیا، پھر فرمایا طہارت کی حالت میں جب تک وضو نہ ٹوٹا ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح وضو فرمایا کرتے تھے" [2]۔

اس وضاحت کے بعد " جوتوں پر مسح" ثابت کرنے والی روایات سے بے وضو آدمی کے لیے جوتوں پر مسح کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا امت کے تمام مستند فقہاء و مجتہدین کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ باریک موزے جن سے پانی چھن جاتا ہو یا وہ کسی چیز سے باندھے بغیر پنڈلی پر کھڑے نہ رہتے ہوں یا ان میں میل دو میل مسلسل چلنا ممکن نہ ہو، ان پر مسح جائز نہیں ہے اور نہ جوتوں پر مسح درست ہے۔ اور چونکہ ہمارے زمانے میں جو سوتی، اونی، نائیلون کے موزے رائج ہیں وہ باریک ہوتے ہیں اور ان میں مذکورہ اوصاف نہیں پائے جاتے، اس لیے ان پر مسح کسی حال مین جائز نہیں ہے۔ اور جو شخص ایسا کرے گا تو اس کا وضو صحیح نہیں ہوگا اور اجماعا اس کے پیچھے نماز بھی جائز نہیں۔

[1] عون المعبود ج 1 ص 62

[2] ابن خزیمہ ج 1 ص 100

امام نسائی سنن کبری میں لکھتے ہیں: لا نعلم احدا تابع ابا قیس علی ھذہ الروایۃ، والصحیح عن المغیرۃ انہ علیہ السلام مسح علی الخفین [1] یہ روایت ابو قیس کے سوا کسی نے روایت نہیں کی اور ھمارے علم میں کوئی اور راوی اس کی تائید نہیں کرتا۔ البتہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے صحیح روایت مسح علی الخفین ہی کی ہے۔

اس کے علاوہ امام مسلم، امام بیہقی، سفیان ثوری، امام احمد، یحیٰی ابن معین، علی ابن المدینی اور دوسرے محدثین رحمۃ اللہ علیہم نے اس روایت کو ابو قیس اور ھزیل ابن شرجبیل دونوں کے ضعف کی بنا پر ضعیف قرار دیا ہے۔ اور علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ شارح صحیح مسلم لکھتے ہیں: کل واحد من ھولآء لو انفرد قدم علی الترمذی، مع ان الجرح مقدم علی التعدیل، واتفق الحفاظ علی تضعیفہ، فلا یقبل قول الترمذی انہ حسن صحیح [2]

جن حضرات نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اگر ان میں سے کوئی ایک تنہا ہوتے تب بھی وہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ پر مقدم ہوتے، اس کے علاوہ یہ قاعدہ ہے کہ جرح تعدیل پر مقدم ہوتی ہے، اور حفاظ حدیث اس کی تضعیف پر متفق ہیں۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں عقبہ، ابو مسعود انصاری اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کا عمل نقل کیا ہے کہ انہوں نے جرابوں پر مسح کیا۔

محلّی { ج: 1 / ص: 34 } میں ہے کہ 12 صحابہ رضی اللہ عنہم نے جرابوں پر مسح کیا ہے۔

مغنی ابن قدامہ میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا جرابوں پر مسح کرنے پر اجماع ہے [3]۔

---

[1] نصب الرایہ ج 1 ص 183

[2] نصب الریہ حوالہ بالا

[3] باب المسح علی الخفین: و لان الصحابۃ مسحوا علی الجوارب و لم یظھر لھم مخالف فی عھدھم فکان اجماعا. ج 1 ص220 دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان

یہ سب روایتیں جن میں صحابہ رضی اللہ عنہم کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے منقول ہے کہ انھوں نے جوربین پر مسح کیا یا اس کی اجازت دی ان آثار میں کہیں بھی یہ صراحت نہیں ہے کہ وہ جوربین کپڑے کے مروجہ باریک موزے تھے اور جب تک یہ صراحت نہ ہو اس وقت تک ان آثار سے باریک موزوں پر مسح کا جواز کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے؟ چنانچہ مشہور اہل حدیث عالم علامہ شمس الحق صاحب عظیم آبادی لکھتے ہیں :

ان الجورب يتخذ من الاديم و كذا من الصوف و كذا من القطن و يقال لكل من هذه انه جورب و من المعلوم ان هذه الرخصة بهذا العموم لا تثبت الا بعد ان يثبت ان الجوربين الذين مسح عليهما النبى صلى الله عليه و سلم كانا من صوف الخ (عون المعبود ج 1 ص 62)

یعنی جوربین کھال کے بھی ہوتے ہیں، اون کے بھی اور روئی کے بھی اور ہر ایک کو جورب کہا جاتا ہے اور ہر قسم کے موزے پر مسح کی اجازت اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکتی جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اون کے جوربین پر مسح فرمایا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ ثابت ہے کہ ان حضرات نے جن جوربین پر مسح فرمایا وہ یا تو چمڑے کے تھے یا اپنی موٹائی کی وجہ سے چمڑے کے موزوں کی طرح تھے اور ان میں چمڑے کے موزوں کی صفات پائی جاتی تھیں۔

چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ میں روایت ہے: "حضرت سعید ابن مسیب اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ جرابوں پر مسح جائز ہے بشرطیکہ وہ خوب موٹی ہوں"۔

واضح رہے کہ ثوب صفیق اس کپڑے کو کہتے ہیں جو خوب مضبوط اور دبیز ہو۔ ملاحظہ ہو قاموس اور مختار الصحاح وغیرہ۔ حضرت سعید ابن مسیب اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہما دونوں جلیل القدر تابعین میں سے ہیں اور انھوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل دیکھ کر ہی یہ فتوی دیا ہے۔ لہٰذا ان حضرات کے عمل اور فتوی سے جو بات ثابت ہوئی وہ اس سے زائد نہیں کہ جو موزے بہت موٹے ہونے کی بنا پر چمڑے کے اوصاف کے حامل ہوں ان پر مسح جائز ہے اور اس موٹائی کی وضاحت یہ ہے کہ ایک تو ان میں پانی نہ چھنے دوسرے وہ کسی چیز سے باندھے بغیر اپنی

موٹائی کی وجہ سے خود کھڑے رہیں اور تیسرے یہ کہ ان کو پہن کر میل دو میل چلنا ممکن ہو، ایسے موزے چمڑے کے اوصاف کے حامل ہوتے ہیں [1]۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

پگڑی پر مسح [2]:

حضرت عمرو بن امیہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے پگڑی پر مسح فرمایا[3]۔

اسی طرح بلال بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے پگڑی پر مسح کیا[4]۔

تبصرہ:

جواباً ہم کہتے ہیں کہ: قرآن کریم کی آیت "وامسحوا برءوسکم" قطعی الدلالت اور قطعی الثبوت ہے۔ اور مسح علی العمامہ کی احادیث اخبار آحاد ہیں جن سے قران کریم پر زیادتی ممکن نہیں۔ پیغمبر ﷺ کے سکھائے ہوئے اصول تو یہ ہیں کہ سب سے پہلے قرآن کریم اس میں مسئلہ نہ ملے تو پھر حدیث رسول ﷺ جیسا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث ہے۔

یہاں مسلم کی ایک روایت تو نقل کی گئی ہے لیکن اس روایت سے قبل اسی باب میں چار دوسری روایتوں سے صرف نظر کر گئے۔ جس میں صراحت کے ساتھ یہ الفاظ ہیں" اور اپنی پیشانی، عمامہ اور موزوں پر مسح فرمایا حدیث صراحت سے بتارہی ہے کہ مسح صرف عمامہ پر نہیں بلکہ عمامہ کے ساتھ پیشانی پر بھی فرمایا تھا یہ روایت چوتھائی سر کے مسح کے فرض ہونے اور باقی پر سنت ہونے کی دلیل ہے۔

---

[1] ملخص از فقہی مقالات

[2] پگڑی پر مسح درست نہیں اگر چوتھائی سر کا مسح ساتھ نہ ہوا ہو۔ جبکہ غیر مقلد حضرات فرماتے ہیں کہ جائز ہے اور مذکورہ دلائل دیتے ہیں۔ ہمارا تفصیلی مؤقف دلائل کے ساتھ اس کے بعد آرہا ہے۔

[3] بخاری باب المسح علی الخفین حدیث 205

[4] مسلم باب المسح علی الناصیة والعمامة حدیث 224

پگڑی پر مسح اور نماز میں ٹوپی پگڑی کا اہتمام:

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی مسلم میں روایت ہے: ان النبي ﷺ مسح بناصية وعلى العمامة وعلى خفيه.

یعنی حضور ﷺ نے پیشانی، عمامہ اور موزوں پر مسح فرمایا۔

کتاب الام میں امام شافعی رحمہ اللہ حضرت عطاء سے نقل کرتے ہیں کہ:

ان رسول الله ﷺ توضا فحسر العمامة عن رأسه.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے وضو فرمایا تو اپنا عمامہ سر سے اوپر کر کے مسح فرمایا۔

مسلم کی روایت میں ہے، عمرو بن حریث فرماتے ہیں

رايت رسول الله ﷺ على المنبر وعليه عمامة سوداء قد ارخي طرفيها بين كتفيه.

یعنی میں نے رسول اکرم ﷺ کو منبر پر دیکھا، آپ کے سر پر سیاہ عمامہ تھا اس کے دونوں کناروں کو آپ ﷺ نے دونوں شانوں کے درمیان لٹکا رکھا تھا۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ان رسول اللہ ﷺ دخل مکۃ وعلیہ عمامۃ سوداء (مسلم) یعنی رسول اللہ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے اور آپ کے سر مبارک پر سیاہ عمامہ تھا۔

علامہ ابن قیم فرماتے ہیں: كانت له العمامة تسمي السحاب كساها عليا وكان يلبسها ويلبس تحتها القلنسوة بغير عمامة ويلبس المعامة بغير قلنسوة. (زاد المعاد: 1/ص: 135)

یعنی نبی اکرم ﷺ کے ایک عمامہ کے نام "سحاب" تھا اس کو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پہنا دیا تھا، آپ ﷺ کا معمول تھا کہ آپ عمامہ پہنتے اور اس کے نیچے ٹوپی ہوتی، اور کبھی ٹوپی پہنتے بغیر عمامہ کے اور کبھی عمامہ پہنتے بلا ٹوپی۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ آپ کی عادت مبارکہ یہی تھی کہ آپ اپنے سر پر عمامہ رکھتے تھے، اگر عمامہ نہ ہوتا تو آپ کے سر مبارک پر ٹوپی ہوتی سر ننگا نہیں ہوتا۔ اسی طرح ان مذکورہ نصوص کی روشنی میں ننگے سر نماز پڑھنے سے منع بچنا چاہیئے۔

مسح عمامہ کے احادیث کی تحقیق:

عمامہ پر مسح کرنا درست نہیں جن احادیث میں اس کا ذکر آیا ہے ان کے بارے میں ائمہ محدثین کے اقوال ملاحظہ ہو:

(یہ ترجمہ ہے عربی عبارت حاشیہ میں دیکھیں[1]) سب سے پہلے باب کے اندر جو قولی احادیث ہیں ان کا جواب دیں گے۔ پھر اس کے بعد اس باب میں جو فعلی روایات ہیں ان کے جوابات دیں گے،

---

[1] فلنجب اولا عن الاحاديث القولية فى الباب, ثم نجيب بعد ذلك عما ورد فيه من الاحاديث الفعلية

فاقول : اما حديث ثوبان فليس فيه دلالة على المسح على العمامة صراحة لما فيه من لفظ " العصائب " و هو جمع " عصابة " يطلق على كل ما يعصب به سواء كان منديلا او خرقة او عمامة .

قال فى القاموس : العصابة ما عصب به كالعصاب و العمامة .

فيحتمل ان يراد به العمائم او الخرق المشدودة على الجروح . والمعنى على التقدير الثانى انه صلى الله عليه و سلم امرهم ان يمسحوا على العصائب المشدودة على الجروح, واطلاق العصابة بهذا المعنى شائع فى الفقه والحديث , فقد روى الطبرانى فى معجمه حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ دَاوُد الصَّوَّافُ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُبَيْدِ بْنِ عَقِيلٍ ثَنَا حَفْصُ بْنُ عُمَرَ عَنْ رَاشِدِ بْنِ سَعْدٍ، وَمَكْحُولٌ عَنْ أَبِي أُمَامَةَ عَنْ النَّبِيِّ صلى الله عليه وآله وسلم أَنَّهُ لَمَّا رَمَاهُ ابن قمة يَوْمَ أُحُدٍ رَأَيْت النَّبِيَّ صلى الله عليه وآله وسلم إِذَا تَوَضَّأَ حَلَّ عَنْ عِصَابَتِهِ وَمَسَحَ عَلَيْهَا بِالْوَضُوءِ اه كذا فى نصب الراية (ص 98 , ج 1)

و رواته كلهم ثقات اما اسحق بن داؤد فلانه لم يضعف فى الميزان و شيوخ الطبرانى الذين لم يضعفوا فيه ثقات صرح به الهيثمى فى مجمع الزوائد (ص 3 , ج 1) و محمد بن عبد الله , قال النسائى:" لا باس به " و قال مسلمة: "ثقة" كذا فى التهذيب (ص 164 , ج 9) و حفص بن عمر , هو المدنى , وثقه ابن ابى حاتم كذا فى التهذيب (ص 1410 , ج 2) و ضعفه آخرون , والباقون معروفون بالعدالة و لا يخفى ان المراد بالعصابة فى الحديث خرقة كانت مشدودة على جرحه صلى الله عليه وسلم فلا يبعد ان يراد ذلك فى حديث ثوبان ايضا , لان اصحاب السرية قلما يسلمون من الجروح فيشدونها

بالعصائب فامرهم رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يمسحوا عليها ولا يغسلوا مواضعها مخافة الضرر عليهم من البرد وإذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال .

و اما حديث نعيم ابن ضماد فهو في الحقيقة من مسند بلال لا من مسانيد نعيم ابن ضماد , فان هاشم بن القاسم ابا نصر البغدادى- و هشام بن سعيد الطالقاني و أبا سعيد مولى بني هاشم رووه عن محمد بن راشد عن مكحول عن نعيم بن ضماد عن بلال كما يظهر من مسند احمد (ص 12, 13, 14, ج 6)

ولذا ذكره الامام احمد في مسند بلال لا في مسند نعيم ابن ضماد , و حديث بلال في المسح على الخمار مضطرب الاسناد و المتن .

اما اضطراب سنده فقد روى مسلم بطريق الأعمش عن الحكم عن عبد الرحمن بن أبي ليلى عن كعب بن عجرة عن بلال رضي الله عنه: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم مسح على الخفين والخمار , فتكلم عليه الدارقطني في كتاب العلل وذكر الخلاف في طريقه والخلاف عن الأعمش فيه وأن بلالا سقط منه عند بعض الرواة واقتصر على كعب بن عجرة و أن بعضهم عكسه فأسقط كعبا واقتصر على بلال وأن بعضهم زاد البراء بين بلال وابن أبي ليلى وأكثر من رواه رووه كما هو في مسلم وقد رواه بعضهم عن علي بن أبي طالب رضي الله عنه عن بلال كذا في النووى شرح مسلم (ص 135, ج 1)

قلت و رواه بعضهم عن عبد الرحمن بن عوف عن بلال كما في مسند احمد (ص 12, 13 ج 6) و رواه محمد بن راشد بطريق مكحول عن نعيم بن ضماد عن بلال , وقد مر .

و أما اضطراب متنه فلان بلالا يقول مرة: "مسح رسول الله صلى الله عليه وسلم على الخفين والخمار" كما هو عند مسلم و يقرب منه قوله : " رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يمسح على الخفين والخمار" و مرة يقول: " مسح على خفيه و على خمار العمامة" كما هو عند احمد بطريق عبد الرحمن بن عوف (ص 12, ج 6) و مرة يقول: " كان يمسح على الخفين والخمار" كما هو عند احمد ايضا (ص 15, ج 6) و في هذه الروايات كلها مع اختلاف متونها حكاية عن الفعل ورواه محمد بن راشد بلفظ الامر فقال: "امسحوا على الخفين والخمار" وهذا اضطراب يقتضي ترك الاحتجاج به , ولعل المحفوظ من طرقه و متنه ما اختاره مسلم فاودعه في صحيحه . قال النووى : " واكثر من رواه رووه كما هو في مسلم" (ص 135 , ج 1) ولا خفى انه حديث فعلي لا عموم له بل يحتمل الوجوه كما سياتي .

وأما قول عمر بن الخطاب رضي الله عنه: "من لم يطهره المسح على العمامة فلا طهره الله" كما نقله الجوزجاني بدون ذكر سنده , فبعد تسليم صحته محمول على رد ما يفعله كثير من الموسوسين من نزع عمائمهم عند الوضوء ولا يرون ان مسح بعض الرأس مع ابقاء العمامة عليه يجزئهم. وهذا من التعمق المنهي عنه لما قد ثبت عنه صلى الله عليه وسلم أنه مسح

علی ناصیته مع ابقاء العمامة علی الرأس من غیر ان ینقضها و ینزعها و یؤید ما قلنا روایة ابن ابی شیبه فی مصنفه عن عمر رضی الله عنه قال: "إن شئت فامسح علی العمامة وإن شئت فانزعها" کذا فی کنز العمال (ص 112، ج 5) قابل المسح علی العمامة بنزعها وهو ظاهر فی ما قلنا و معناه إن شئت فامسح مع العمامة(علی بعض رأسك) وإن شئت فانزعها و امسح علی جمیع رأسك و استعمال لفظ "علی" بمعنی "مع" شائع فی الکلام. قال فی القاموس: و "علی" حرف و عن سیبویه اسم الاستعلاء والمصاحبة کمع و آتی المال علی حبه (ص 94، ج 2)

و اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال. (اعلاء السنن ج 1، ص 47 تا 52)

الاحادیث الفعلیة و الجواب عنها

و بعد ذلك فلنشرع فی سرد الاحادیث الواردة فی هذا الباب و الکلام علیها.

فمنها ما رواه احمد عن سلمان: رأی رجلا قد أحدث، وهو یرید أن ینزع خفیه، فأمره سلمان رضی الله عنه أن یمسح علی خفیه وعلی عمامته ویمسح بناصیته، وقال سلمان: " رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم یمسح علی خفیه وعلی خماره " قال فی النیل "حدیث سلمان اخرجه الترمذی ایضا فی العلل، لکنه قال مکان "وعلی خماره" "وعلی ناصیته" وفی اسناده ابو شریح. قال الترمذی: سألْتُ مُحَمَّدَ بن اسمعیل عَنْه ما اسْمُهُ؟ فقال: لا أدْرِي لا أعْرِفُ اسْمَهُ. وفی اسناده ابو مُسْلِم مَوْلَی زَیْدِ بْنِ صُوحَانَ وهو مجهول قال الترمذی: لَا أعْرِفُ اسْمَه وَلَا أعْرِفُ لَهُ غَیْرَ هٰذَا الْحَدِیثِ. (ص 161، ج 1) قلت ابو شریح روی عنه قتادة و محمد بن زید العبدی فارتفعت جهالة عینه وذکره ابن حبان فی الثقات کذا فی التهذیب (ص 126 ج 12) و ابو مُسْلِم ذکره ابن حبان فی الثقات ایضا کذا فی التهذیب (ص 236 ج 12) وفی التقریب وصفهما جمیعا بمقبول والمجهول لا یوصف بالثقة و القبول و حدیث سلمان فی مسند احمد بلفظ: فرأی رجلا قد أحدث، وهو یرید أن ینزع خفیه، فأمره سلمان رضی الله عنه أن یمسح علی خفیه وعلی عمامته ویمسح ناصیته (ص 439 ج 5) وهو مصرح بان سلمان لم یأمره بالاکتفاء بمسح العمامة بل امره به مع المسح علی الناصیة. و أما ما رواه من حکایة فعله صلی الله علیه وسلم فهو مختلف فیه، فعند احمد " انه رآه یمسح علی خفیه وعلی خماره" وفی روایة الترمذی " انه رآه یمسح علی خفیه وعلی ناصیته" فسقط الاحتجاج به ولو قلنا ان سلمان رضی الله عنه جمع بینهما وقال " رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم یمسح علی خفیه وعلی خماره وعلی ناصیته" لظاهر ... مرة فاختصر الروایة و اقتصر بعضهم علی ذکر الخمار و بعضهم علی ذکر الناصیة

و منها ما رواه احمد و البزار عن ثوبان قال: رأیت النبی صلی الله علیه وسلم توضأ و مسح

علی الخفین والخمار" و فیه عتبة ابن ابی امیة ذکره ابن حبان فی الثقات و قال : یروی المقاطیع کذا فی مجمع الزوائد (ص 104 ج1) قلت: رواه عتبة عن ابی سلام الاسود عن ثوبان و ابو سلام لم یسمع عن ثوبان ,قاله ابن معین و ابن المدینی و قال احمد : ما اراه سمع منه

کذا فی التهذیب (ص 296 ج 10) و لفظه عند احمد ".مسح علی الخفین و علی الخمار ثم العمامة"

و منها ما رواه الطبرانی فی الکبیر عن ابی امامة " :أن النبی صلی الله علیه وسلم کان یمسح علی الخفین و العمامة ثلاثا فی السفر و یوما و لیلة فی الحضر " و فیه ابو سلمة , قال الذهبی : مجهول کذا فی مجمع الزوائد (ص 106 ج1) قلت: احادیث التوقیت فی المسح علی الخفین متواترة , ولم یرد ذکر العمامة الا فی هذه الروایة , فهی- مع جهالة راویها - منکرة مخالفة لروایة الثقات فلا یعول علیها.

و منها ما رواه الطبرانی فی الاوسط عن ابی هریرة : قال " رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم توضأ و مسح علی عمامته و علی خفیه" و فیه عبد الحکیم بن میسرة وهو ضعیف (مجمع الزوائد ص 104 ج1) قلت: و قال الزیلعی ناقلا عن صاحب التلقیح : ان الدار قطنی قد ضعف فی علله کل ما روی عن ابی هریرة فی المسح (ص 88 ج 1)

و منها ما رواه الطبرانی فی الکبیر عن ابی ایوب قال:" رأیت النبی صلی الله علیه وسلم یمسح علی الخفین و الخمار " و فیه الصلت بن دینار وهو متروک " مجمع الزوائد " (ص 105 ج 1) قلت: و الصحیح عن ابی ایوب انه نزع خفیه فنظروا الیه فقال : أما اننی فقد رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم یمسح علیهما و لکن حبب الی الوضوء رواه احمد و الطبرانی فی الکبیر و رجاله موثقون " مجمع الزوائد " (ص 401 ج 1)فذکر الخمار فیه من بلایا صلت بن دینار (اعلاء السنن ج1 ص 56 تا59)

و قال ایضا صاحب اعلاء السنن فی مقام اخر (ج1 ص 43) وما فی الحدیث من المسح علی العمامة فقال محمد فی موطئه بلغنا أن المسح علی العمامة کان فترک (ص 70) و فی فتح الباری (ج 1 ص 267) "وقد اختلف السلف فی معنی المسح علی العمامة فقیل إنه کمل علیها بعد مسح الناصیة وقد تقدمت روایة "مسلم" بما یدل علی ذلک وإلی عدم الاقتصار علی المسح علیها ذهب الجمهور وقال الخطابی: فرض الله مسح الرأس والحدیث فی مسح العمامة محتمل للتاویل فلا یترک المتیقن للمحتمل

قلت روایة "مسلم" ذکرها بلفظ : " و مسح بناصیته و علی عمامته و علی الخفین"

جہاں تک ثوبان کی حدیث ہے اس میں عمامہ پر مسح کرنے کی کوئی دلیل صراحت کے ساتھ موجود نہیں ہے، اس لئے کہ اس حدیث میں ایک لفظ "العصائب" جو عصابہ کی جمع ہے، اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جس سے باندھا جائے چاہے وہ رومال ہو یا دوپٹہ ہو یا پگڑی ہوں،

قاموس میں عصائب کا معنی جس سے باندھا جائے عصاب اور عمامہ کی طرح، ایک احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد عمامہ لیا جائے یا وہ پٹی جو زخم پر باندھی جائے معنی ثانی کے اعتبار سے جیسے کہ آپ ﷺ نے حدیث میں زخم پر باندھی ہوئی پٹی پر مسح کرنے کا حکم فرمایا ہے اس معنی کے اعتبار سے عصابہ کا اطلاق کتب فقہ اور حدیث میں بھی ملتا ہے کہ عصابہ پٹی کو کہتے ہیں اور پگڑی کو بھی۔

طبرانی نے اپنی معجم میں ایک روایت نقل کیا ہے کہ اسحاق ابن داؤد الصواف نے ہمیں حدیث بیان کیا ہے یہ کہتے ہیں ہمیں محمد بن عبد اللہ بن عبید بن عقیل نے حدیث بیان کیا ہے انہوں نے راشد بن سعد سے روایت لی ہے اور مکحول ابوامامہ سے اور ابوامامہ رسول اللہ ﷺ روایت کرتے ہیں کہ جب ابن قمہ نے آپ ﷺ پر احد کے دن تیر سے وار کیا تھا تو میں نبی ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ ﷺ وضو فرماتے تو اپنے عمامہ کو کھول دیتے اور اس پر مسح فرماتے۔

اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں، جہاں تک اسحاق ابن داؤد ہے میزان نے ان کو ضعیف قرار نہیں دیا ہے، اور طبرانی کے جو شیوخ ہیں ثقات نے ان میں ضعف بیان نہیں کیا ہے، ہیثمی نے مجمع الزوائد میں اس کی تصریح کی ہے (ج: 1/ص3)

اور محمد عبد اللہ نسائی فرماتے ہیں کہ "لا بأس بہ" مسلم نے ثقہ قرار دیا ہے، اس طرح تہذیب میں ہے (ص: 164/ج:1) اور حفص بن عمر مدنی ہے اور ثقہ ہے ابن ابی حاتم تہذیب میں اس طرح ہے (ص: 141/ج: 2) اور دوسرے حضرات نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے، اور باقی عدالت کے صفت کے ساتھ متصف ہیں، اور یہ بات بھی مخفی نہیں ہے کہ حدیث میں عصابہ سے مراد خرقہ (کپڑا) ہی مراد لیا جائے، کیونکہ اصحاب السریہ (لشکر والے) بہت کم زخموں سے محفوظ ہوتے تھے تو وہ پھر زخموں کو پٹی سے

باندھتے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ اس پر مسح کیا کریں اور زخم شدہ جگہوں کو ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے نقصان پہنچنے کے خوف سے نہ دھویا کریں، اور جب احتمال آگیا تو استدلال کرنا باطل ہو گیا۔

نعیم بن ضماد کی حدیث حقیقت میں وہ بلال کی سند سے ہے نعیم بن ضماد کے مسانید سے نہیں ہے، اس لئے کہ ہاشم بن القاسم ابو نضر بغدادی اور ہشام بن سعید قطانی اور ابو سعید جو بنو ہاشم کے مولی ہے انہوں نے محمد بن راشد سے وہ مکحول سے انہوں نے نعیم بن ضماد سے اور انہوں نے بلال سے روایت کیا ہے۔ جیسا کہ مسند احمد سے واضح ہوتا ہے۔ (ص: 12،13،14/ج: 6)

اس وجہ سے امام احمد نے بلال کے مسند میں اس کو ذکر کیا ہے نعیم بن ضماد کی مسند میں نہیں کیا ہے۔ اور حدیث بلال مسح علی الخمار کے بارے میں مضطرب ہے۔ جہاں تک اس کے سند کے اضطراب کا تعلق ہے تو مسلم نے اعمش سے روایت کیا ہے انہوں نے حکم سے انہوں نے عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے انہوں نے کعب بن عجرہ سے انہوں نے حضرت بلال سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے موزوں پر اور خمار پر مسح فرمایا ہے، اس پر دار قطنی نے کتاب العلل میں کلام کیا ہے اور اس کے بارے میں اختلاف ذکر کیا ہے اور اختلاف اس میں اعمش سے ہے، کہ بلال اس سے ساقط ہے بعض رواۃ کے نزدیک اور کعب بن عجرہ پر صرف اکتفاء کیا ہے۔ اور بعض رواۃ نے اس کا عکس بیان کیا ہے اور کعب کو ساقط کیا ہے اور بلال پر اکتفاء کیا ہے، اور بعض رواۃ نے بلال اور ابن ابی لیلیٰ کے درمیان براء کی زیادتی کی ہے، اور اکثر جو ان سے روایت کرتے ہیں جیسا کہ وہ مسلم میں ہے اور ان سے بعض علی بن ابی طالبؓ سے اور بلال سے اس طرح امام نووی نے شرح مسلم۔ (ص: 135/ج: 1)

میں کہتا ہوں اس کو روایت کیا ہے بعض نے عبد الرحمٰن بن عوف سے بلال سے روایت کرتے ہیں جیسا کہ مسند احمد (ص: 12،13/ج: 6) میں ہے، اور اس کو محمد بن راشد سے مکحول اور ان سے نعیم بن ضمار اور انہوں نے بلال سے روایت کیا ہے۔ اور جہاں تک اس کے متن میں اضطراب کا تعلق ہے اس لئے کہ کبھی تو بلال کہتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے موزوں پر اور اوڑھنی پر مسح کیا، جیسا کہ مسلم کے نزدیک ہے یا اس کے قریب ان کا قول ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو موزوں پر اور اوڑھنی پر مسح

کرتے ہوئے دیکھا، اور کبھی کہتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے موزوں پر اور عمامہ کے تیج پر مسح فرمایا، جیسا کہ احمد کے نزدیک ہے عبدالرحمٰن بن عوف کے روایت سے (ص: 15/ج: 6)اور کبھی کہتے ہے کہ آپ ﷺ موزوں پر او راوڑھنی پر مسح فرماتے تھے احمد میں بھی موجود ہے (ص: 15/ج: 6) ان تمام تر روایات میں مع متون کے اختلاف کے ساتھ فعل سے حکایت ہے، اور محمد بن راشد نے اس کو امر کے لفظ کے ساتھ روایت کیا ہے کہ "موزوں پر اوراڑھنی پر مسح کرو" اور یہ اس سے حجت ترک کرنے کا تقاضا کرتی ہے کہ فعل ہے یا امر ہے اور شاید اس کے طرق اور متن میں سے محفوظ وہ ہے جس کو مسلم نے اختیار کیا ہے اور اس کو اپنے صحیح میں ودیعت کر رکھا، امام نووی فرماتے ہیں: "اکثر جنہوں نے اس کو روایت کیا ہے وہ اس کو روایت کرتے ہیں جیسا کہ مسلم میں ہے"(ص: 135/ج:1)۔اور یہ بات مخفی نہیں کہ یہ حدیث فعلی ہوں اور اس کے لئے عموم نہ ہوں او روجوہ کا بھی احتمال رکھتے ہیں جیسا کہ عنقریب آئیں گے۔

اور جہاں تک عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قول ہے، جیسا کہ جوزجانی نے اس کے سند ذکر کئے بغیر نقل کیا ہے اس کے صحت کے تسلیم کرنے کے بعد محمول ہے،اس سے رد مقصود ہے وساوس میں پڑھنے والے لوگوں پر جو وضو کے وقت عمامہ کو اتارنے کے قائل ہیں، اور عمامہ کا سر پر باندھے ہوئے بعض سر پر مسح کو جائز نہیں سمجھتے ،اور یہ گہرائی ہے جس سے منع کیا گیا ہے، جب آپ ﷺ سے ثابت ہوا کہ آپ ﷺ نے عمامہ کو سر پر باقی رکھتے ہوئے بغیر خراب کئے ہوئے اور اتارے بغیرے پیشانی پر مسح کیا۔اور ابن ابی شیبہ کی روایت جو ان کے مصنف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ بھی ہماری بات کی تائید کرتی ہے کہ "اگر تم چاہوں تو عمامہ پر مسح کرو اور اگر چاہو تو اس کو اتاردو کنزالعمال میں اس طرح منقول ہے(ص: 112/ج:5) مسح عمامہ پر مقابل بنا اس کے اتارنے کے ساتھ اور جس کے بارے میں ہم نے کہا وہ ظاہر ہے، اور اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تم چاہوں تو سر کے بعض حصے پر عمامہ کے ساتھ مسح کرے اور اگر چاہو تو عمامہ اتار کر اپنے پورے سر کا مسح کرے، لفظ علی کا استعمال بمعنی مع کلام کے اندر بہت زیادہ ہوتا ہے، قاموس میں علی کو حرف واو قرار دیا گیا ہے ، اور امام سیبویہ کے نزدیک اسم ہے

استعلاء والمصاحبہ مع کی طرح وآتی المال علی حبہ (ص: 94/ج: 2) اور جب احتمال آتا ہے تو استدلال کرنا باطل ہو جاتا ہے۔(اعلاء السنن ج: 1/ص: 47تا52)

احادیث فعلیہ کی تحقیق:

او راس کے بعد مسلسل اس باب میں وارد ہونے والے فعلی احایث پر بات او ران پر کلام شروع کریں گے۔

ان میں سے احمد نے جو سلمان سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے ایک آدمی کو دیکھا جسے حدث لاحق ہوا اس نے اپنے موزے اتارنے کا ارادہ کیا حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے اسے موزوں، عمامہ اور پیشانی پر مسح کرنے کا حکم دیا اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو موزوں پر اور اوڑھنی پر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے، نیل میں ہے کہ سلمان رضی اللہ عنہ کی حدیث کی تخریج ترمذی نے اپنے علل میں بھی کی ہے لیکن انہوں نے علی خمارہ کی بجائے علی ناصیتہ کہا ہے، اور اکے سند میں ابو شریح ہے، امام ترمذی فرماتے ہیں کہ میں نے محمد بن اسمٰعیل سے اس کا نام دریافت کیا تو فرمایا کہ مجھے نہیں معلوم کہ اس کا نام کیا تھا، اور اس حدیث کے علاوہ اور احادیث کا اس سے مروی ہونے کا بھی خبر نہیں ہے۔(ص: 161/ص:1)

میں کہتا ہوں ابو شریح ان سے قتادہ اور محمد بن زید العبدی روایت کرتے ہیں تو اس سے جہالت رفع ہو گئی اور ابن حبان میں ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے، (ص: 12/126)اور تہذیب میں ابو مسلم کو ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے (ص: 236/ص:12) اور تقریب میں ان دونوں کو تمام نے قبول کے صفت کے ساتھ متصف کیا ہے اور مجہول راوی ثقہ اور قبول کے صفت کے ساتھ متصف نہیں کیا جاتا، اور مسند احمد میں سلمان رضی اللہ عنہ کی حدیث "فرای رجل قد احدث" کے لفظ سے ساتھ مذکور ہے، وہ آدمی اپنے موزے اتار رہا تھا تو سلمان رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا کہ اپنے موزوں پر اور عمامہ پر مسح کرے اور اپنے پیشانی پر مسح کرے۔(ص:439/ج: 5) اور وہ اس بات کی تصریح کرنے والے ہے کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے محض

عمامہ پر مسح کرنے کو کافی قرار دینے کا حکم نہیں فرمایا بلکہ اس کو پیشانی پر مسح کرنے کا حکم دیا۔ اور جو آپ ﷺ کے فعل کی حکایت روایت کیا ہے تو وہ مختلف فیہ ہے، امام احمد کے نزدیک، کہ انہوں نے آپ ﷺ کو موزے پر اور اوڑھنی پر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے، امام ترمذی کی روایت کہ انہوں نے آپ ﷺ کو موزوں پر اور پیشانی پر مسح کرتے دیکھا ہے، تو اس سے حجت پکڑنا ساقط ہو گیا۔ اور ظاہر ہے کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے دونوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو موزوں پر اوڑھنی پر اور پیشانی پر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے، تاکہ ان کی روایت ان کی امر کے مطابق ہو جائے۔ تو روایت مختصر ہوئی اور بعض حضرات نے خمار ذکر کرنے پر اکتفاء کیا اور بعض نے پیشانی کو ذکر کیا ہے۔

اور ان میں جو احمد اور بزار نے ثوبان سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے نبی کریم ﷺ کو وضو کرتے ہوئے دیکھا موزوں پر اور اوڑھنی پر مسح کیا، اس روایت میں عتبہ بن ابی امیہ راوی ہے جن ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے۔ (ص: 104/ج:1) اور مجمع الزوائد میں ان کو مقاطع سے روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: عتبہ نے اس کو روایت کیا ہے ابو سلام الاسود سے ثوبان سے اور ابو سلام کی ثوبان سے سماع نہیں ہے، اس طرح ابن معین اور ابن المدنی نے بھی کہا ہے، اور امام احمد فرمایا کہ میں یہ نہیں سمجھتا کہ اس سے سماع ثابت ہوں، تہذیب میں اس طرح ہے (ص:296/ج: 10) اور امام احمد کے الفاظ اس طرح ہے کہ "موزوں پر مسح کیا اوڑھنی پھر عمامہ پر۔

اور ان روایات میں جو طبرانی نے ابو اسامہ سے کبیر میں روایت کی ہے، کہ نبی کریم ﷺ موزوں پر عمامہ پر سفر میں تین اور حضر میں ایک دن ایک رات مسح فرماتے تھے جیسے پگڑی پر مسح کا تذکرہ ہے بغیر پیشانی کے مسح کے لیکن اس میں ابو سلمہ ایک راوی ہے، ذہبی نے ان کو مجہول قرار دیا ہے۔ (مجمع الزوائد ص: 106/ص:1)

میں کہتا ہوں: موزوں پر مسح کرنے کے حوالے سے جو وقت کے احادیث ہیں وہ متواتر ہیں اور عمامہ کا ذکر اس روایت کے علاوہ اور روایات میں وارد نہیں ہے، پس دو روایات راوی کے مجہول ہونے کے ساتھ منکر ہے، ثقہ روایات کے مخالف ہے، پس ان سے قرآن پر زیادتی نہیں کی جائے گی۔

ان روایات میں جو طبرانی نے حضرت ابو ہریرہ کے طرق سے اوسط میں نقل کی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا آپ ﷺ نے وضو فرمایا اور اپنے پیشانی اور موزوں پر مسح کیا، اس روایت میں عبدالحکیم بن مسیرہ ایک راوی ہے جو ضعیف ہے۔ (مجمع الزوائد ص: 104/ج: 1)

میں کہتا ہوں: زیلعی صاحب التلقیح سے نقل کرتا ہے کہ دار قطنی نے اپنے علل میں ہر اس راوی کو جو حضرت ابو ہریرہ ؓ سے مسح کے بارے میں روایت کرتا ہے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔(ص:88/ج:1)

ان روایات میں سے جو طبرانی نے کبیر میں حضرت ابو ایوب ؓ کی روایت نقل کی ہے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو موزوں پر اور اوڑھنی پر مسح کرتے دیکھا، اس روایت میں صلت بن دینار ایک راوی ہے جو متروک ہے۔ (مجمع الزائد ص: 105/ج:1)

میں کہتا ہوں: صحیح یہ ہے کہ حضرت ابو ایوب ؓ سے روایت ہے کہ آپ ؓ نے اپنے موزے اتارے تو صحابہ نے آپ کو دیکھا تو آپ نے فرمایا: تحقیق میں نے رسول اللہ ﷺ کو دونوں پر مسح کرتے دیکھا ہے لیکن وضو کے وقت اتارنا زیادہ پسندیدہ ہے۔ احمد اور طبرانی نے کبیر سے یہ روایت نقل کی ہے اس کے رجال کی توثیق کی گئی ہے۔ (مجمع الزوائد ص: 401/ج:1) خمار کا تذکرہ اس میں بلال یا صلت بن دینار سے مروی ہے۔ (اعلاء السنن ج:1/ص:56تا59)

صاحب اعلاء السنن نے ایک دوسرے مقام پر فرمایا (ج:1/ص:43) عمامہ پر مسح کرنے کی بات جو حدیث میں ہے امام محمد اپنے موطا میں فرماتے ہیں: کہ ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ مسح علی العمامہ پہلے تھا پھر ترک کیا گیا (ص:70) فتح الباری میں ہے (ج:1/ص:267)" مسح علی العمامہ کے معنی میں سلف نے اختلاف کیا ہے ایک قول ہے کہ پیشانی پر مسح کرنے کے بعد عمامہ پر مسح کرنے بعد مکمل ہوگا، اور مسلم میں ایک روایت ہے، اور خطابی فرماتے ہیں" اللہ تعالی نے سر پر مسح کرنے کو فرض کیا ہے، اور عمامہ پر مسح کرنے والی حدیث تاویل کا احتمال رکھتی ہے تو محتمل کی وجہ سے متیقن کو نہیں چھوڑا جائے گا۔

میں کہتا ہوں: مسلم کی روایت اس لفظ کے ساتھ مذکور ہے "کہ آپ ﷺ نے پیشانی پر اپنے عمامہ پر اور موزوں پر مسح فرمایا"۔

اور سلف میں اختلاف ہوا ہے پگڑی پر مسح کے بارے میں تو بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقدار ناصیہ کی مسح کے بعد پگڑی پر اس کی تکمیل کی یعنی مسح کی اور روایت مسلم اس پر دال ہے۔ اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ صرف پگڑی کے مسح پر اکتفاء کرنا درست نہیں ہے۔ اور امام خطابی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی نے سر کا مسح فرض کیا ہے اور پگڑی پر مسح والی حدیث میں تاویل کا احتمال ہے تو محتمل کی وجہ سے متیقن کو نہیں چھوڑا جائے گا۔ فقط واللہ اعلم وعلمه اتم و اکبر

نواقض وضو:

ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لاتقبل صلوة بغير طهور

وضو کے بغیر نماز قبول نہیں کی جاتی۔[1]

سیدنا ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کا وضو ٹوٹ جائے جبتک وہ وضو نہ کرے اللہ تعالیٰ اس کی نماز قبول نہیں کرتا[2]۔

مذی خارج ہونے سے وضو:

مقدادؓ نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا کہ مذی خارج ہونے سے غسل واجب ہوتا ہے یا نہیں؟ تو آپ نے مذی کے خارج ہونے پر غسل واجب قرار نہ دیا بلکہ فرمایا: اگر مذی خارج ہو تو ذکر (آلہ تناسل) کو دھو لو اور وضو کرو[3]۔

---

1 مسلم باب وجوب الطهارة للصلوة حديث 224

2 بخاری باب لاتقبل صلوة بغير طهور حديث 135 مسلم باب وجوب الطهارة للصلوة حديث 225

3 بخاری باب من استحی فامر غيره بالسوال حديث 132 والوضوء 178'269 مسلم باب المذی حديث 303

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

شرمگاہ کو ہاتھ لگانے سے وضو :

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص شرمگاہ کو ہاتھ لگائے، پس وہ وضو کرے[1]۔

تبصرہ:

ہمارا تبصرہ یہ ہے کہ : اس کے مقابلے میں امام ترمذی وضو نہ ٹوٹنے والی روایت کو اصح او راحسن کہتے ہیں۔ اور آپ کے امام صفی الرحمٰن مبارک پوری {بلوغ المرام 77/1} پر امام علی بن مدینی کا قول نقل کرتے ہیں کہ بسرہ کی حدیث {وضو ٹوٹنے والی} سے یہ حدیث { وضو نہ ٹوٹنے والی} بہتر ہے۔

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کے تحت فرماتے ہیں : ﴾

شرمگاہ کے چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا:

طلق بن علی سے مروی ہے کہ ایک شخص نے آکر حضور سے دریافت کیا کہ اگر میں نماز میں اپنے عضو تناسل کو چھوؤں یا کوئی شخص اپنا عضو تناسل چھوئے تو کیا اسے وضو کرنا پڑے گا ؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ تمہارے جسم کا ایک ٹکڑا ہی تو ہے (یعنی جس طرح جسم کے کسی اور حصے کے چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا اسی طرح اس کے چھونے سے بھی وضو نہیں ٹوٹتا)[2]۔

اس روایت کے برخلاف حضرت بسرہ کی روایت ہے جس میں مس ذکر (عضو تناسل) چھونے سے وضو ٹوٹنے کا ذکر ہے۔ ان دونوں روایتوں کے درمیان فیصلہ کن نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے

---

[1] موطاامام مالک باب الوضوء من مس الفرج 1 /42 ابوداؤدباب الوضوء من مس الذکر حدیث 181 اسے امام ترمذی باب الوضوء من مس الذکر حدیت 82 نے حسن صحیح کہا ہے

[2] ابوداؤد دج:1/ ص:36 , ترمذي ج :1 / ص: 13 .ابن ماجه ص:37 صححه ابن حبان وقال ابن المديني هو أحسن من حديث بسرة بلفظ" من مس ذكره فليتوضأ" (بلوغ المرام ج:1/ص:13) وصححه الترمذي ايضا وقال البخاري هو اصح شئ في هذ الباب، وصححه عمرو بن علي الفلاح وقال هو عندنا أثبت من حديث بسرة .

علامہ نیموی فرماتے ہیں: " اس روایت {طلق بن علی کی} کو پانچوں (ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، اور امام احمد) نے بیان کیا ہے اور ابن حبان، طبرانی اور ابن حزم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور ابن المدینی نے کہا ہے کہ طلق بن علی کی روایت بسرہ کی روایت سے زیادہ عمدہ ہے "[1]۔

مزید برآں عبداللہ ابن مسعود، عبد اللہ ابن عباس، حضرت علی، حذیفہ بن یمان، سعد بن ابی وقاص، اور حضرت ابودردا بھی مس ذکر سے وضو ٹوٹنے کے قائل نہیں تھے، خواہ درمیان میں کپڑا حائل ہو یا نہیں[2]۔

نیند سے وضو:

سیدنا صفوان بن عسال سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم سفر میں اپنے موزے تین دن رات نہ اتاریں لیکن پیشاب، پاخانے اور نیند میں ہم انہیں پہنے رکھیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نیند سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

سیدنا ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص سو جائے اس پر وضو واجب ہے[3]۔

سیدنا انسؓ فرماتے ہیں: اصحاب رسول ﷺ نماز عشاء کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے اونگھتے تھے اور وضو کئے بغیر نماز ادا کر لیتے تھے[4]۔

ہوا خارج ہونے سے وضو:

---

[1] آثار السنن الجز الاول ص:36

[2] شرح معانی الآثار ج:1 / ص: 40، موطا امام محمد ص:50. والاسانید بذلک صحاح عن نقل الثقات، زاد فی الاستذکار لم یختلف ہولا، فی ذلک... الخ (اعلاء السنن، 191/1)

[3] مسند علی بن جعد / اس کی سند حسن ہے

[4] مسلم باب الدلیل علی ان نوم الجالس لاینقض الوضوء حدیث 376

رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک ایسے شخص کی حالت بیان کی گئی جسے خیال آیا کہ نماز میں اس کی ہوا خارج ہوئی ہے تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: نماز اس وقت تک نہ توڑے جب تک ہوا نکلنے کی آواز نہ سن لے یا اسے بدبو محسوس نہ ہو۔[1]

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

قے، نکسیر اور وضو[2]:

قے یا نکسیر آنے سے وضو ٹوٹ جانے والی روایت کو، جو بلوغ المرام اور ابن ماجہ حدیث: ۱۲۲۱ میں ہے، امام احمد اور دیگر محدثین نے ضعیف کہا ہے بلکہ اس سلسلے کی تمام روایات سخت ضعیف ہیں ۔لہٰذا برائت اصلیہ پر عمل کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ خون نکلنے سے وضو فاسد نہیں ہوتا۔اس کی تائید اس واقعے سے بھی ہوتی ہے جو غزوہ ذات الرقاع میں پیش آیا، جب ایک انصاری صحابی رات کو نماز پڑھ رہے تھے کہ کسی دشمن نے ان پر تین تیر چلائے جن کی وجہ سے وہ سخت زخمی ہو گئے اور ان کے جسم سے خون بہنے لگا مگر اس کے باوجود وہ اپنی نماز میں مشغول رہے[3]۔

یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ رسول اللہ ﷺ کو اس واقعے کا علم نہ ہوا ہو یا آپ کو علم ہوا اور آپ نے انہیں نماز لوٹانے یا خون بہنے سے وضو ٹوٹ جانے کا مسئلہ بتایا مگر ہم تک یہ خبر نہ پہنچی ہو۔ اسی طرح جب سیدنا عمرؓ زخمی کئے گئے تو آپ اسی حالت میں نماز پڑھتے رہے حالانکہ آپ کے جسم سے خون جاری تھا[4]۔اس سے معلوم ہوا کہ شرمگاہ کے سوا خون کا بہنا ناقض وضو نہیں ہے ۔

---

[1] بخاری باب لایتوضا من الشک حتی یستقین حدیث 137 ۔اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب تک ہوا خارج ہونے کا مکمل یقین نہ ہو جائے وضو نہیں ٹوٹتا لہٰذا جسے پیشاب کی قطروں یا وہم کی بیاری ہو اسے بھی جان لینا چاہیئے کہ وضو ایک حقیقت ہے ایک یقین ہے یہ یقین سے ہی ٹوٹتا ہے شک یا وہم سے نہیں

[2] جمہور اہلسنت فرماتے ہیے کہ خون سے وضو ٹوٹ جاتا ہے جبکہ غیر مقلد اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ خون سے وضو نہیں ٹوٹتا، ہمارا موقف دلائل کے ساتھ بعد میں آرہا ہے۔

[3] ابوداؤد باب الوضوء من الدم حدیث 198 اسے امام حاکم 1/ 156 اور ذہبی نے صحیح کہا ہے ۔

[4] موطا امام مالک باب العمل فی من غلب الدم من جرح او رعاف 1 / 156 اور ذہبی نے صحیح کہا ہے ۔

تبصرہ:

ہمارا تبصرہ یہ ہے کہ نماز نبوی والے نے عنوان قائم کیا ہے قے اور نکسیر کا اور فتوی دیا کہ قے اور نکسیر ناک خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا لیکن دلیل قے اور نکسیر کے بجائے مطلق خون کے لائے جو کہ زخم کی وجہ سے جاری ہوا ہو۔ دلیل میں ایک صحابی کے اثر کو نقل کیا ہے اور آپ حضرات کا اپنا اصول ہے کہ قول اور فعل صحابی حجت نہیں۔

قے، نکسیر اور بہتا خون ناقض وضو ہے:

قے، نکسیر اور دم سائل (بہنے والا خون) یعنی وہ خون جو بدن سے نکلے اور ایسی جگہ جسے وضو یا غسل میں دھویا جاتا ہے ناقض وضو ہے۔ خون خواہ ناک سے بہے جسے نکسیر کہتے ہیں یا بدن کے کسی دوسرے حصے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جسے (نماز میں) قے ہو گئی یا نکسیر پھوٹی یا قے کا غلبہ ہو یا مذی کا خروج ہوا ہو، وہ لوٹے وضو کرے اور پھر اپنی نماز پر بنا کرے (یعنی جتنی نماز پڑھ چکا ہے وہیں سے آگے شروع کرے) بشرطیکہ اس نے بات چیت نہ کی ہو۔

نافع سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر کی جب (نماز میں) نکسیر پھوٹتی تو واپس جاتے، وضو کرتے پھر لوٹتے اور بناء کرتے اور کسی سے بات نہ کرتے [1]۔

---

[1] عن عائشة رضي الله عنها قالت قال رسول الله ﷺ: من اصابه قئ او رعاف او قلس او مذي فلينصرف فليتوضأ ثم ليبن علي صلوته وهو في ذلك لا يتكلم.(ابن ماجه ص:87 ،بلوغ المرام ص:141 قد ضعفه البعض لاجل اسماعيل بن عياش لكن ازيلعي اعتمد في تصحيح هذا الحديث على قول من وثقه مطلقا،قال في "جوهر النقي" واسماعيل وثقه ابن المعين وغيره،وقال يعقوب بن سفيان: ثقة عدل، وقال يزيد بن هاورن: ما رأيت احفظ منه، (هامش البيهقي ج:1/ص:142) فالحق ان كلام الزيلعي لا يمكن رده بعد تسليم كون ابن عياش ثقة مطلقا، والله اعلم)

معدان بن ابی طلحہ سے مروی ہے انہوں نے ابودرداء سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قے کی، پس وضو کیا (راوی کہتے ہیں کہ) میں نے دمشق کی مسجد میں حضرت ثوبان سے ملاقات کی اور اس بات کا ذکر کیا، انہوں نے کہا ابودرداء نے سچ کہا، میں نے ہی حضور کے وضو کے لئے پانی ڈالا تھا[2]۔

روایات مذکورہ سے ثابت ہوا کہ قے، نکسیر اور بہتے خون سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر نماز میں وضو ٹوٹ جائے تو ناک پر ہاتھ رکھ کر (باہر کی طرف) لوٹو (وضو کرو اور پھر نماز پڑھو)[3]

قال الترمذی وقد رائ غیر واحد من أھل االعلم م اصحاب النبي ﷺ وغیرھم من التابعین الوضوء من القیئ والرعاف[4] .

حضرت ابودرداءؓ فرماتے ہیں کہ: نبی اکرم ﷺ کو قے آ گئی تو آپ نے وضو فرمایا۔

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اکثر حضرات صحابہ اور تابعین کا مسلک یہی ہے کہ قے اور نکسیر سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ اگر نماز میں کسی نکسیر آ جائے تو وہ نماز توڑ دے پھر خون دھو کر وضو کرے اور نئے سرے سے نماز پڑھے۔ (معجم طبرانی)

---

[1] عن نافع ان عبد اللہ بن عمر کان اذا رعف انصرف فتوضأ ثم رجع فبني ولم يتكلم.(موطا امام مالك ص:14 .موطا امام محمد ص: 62 و كذالك أثر ابن عمر ﷺ في "آثار السنن" انه كان اذا رعف رجع فتوضأ ولم يتكلم ثم رجع و بنى علي ما قد صلي"رواه البيهقي وآخرون إسناده صحيح (آثار السنن ص: 55)

[2] عن معدان بن ابي طلحة عن ابي الدرداء ان رسو ل الله ﷺ قاء فتوضأ فلقيت ثوبان في مسجد دمشق فذكرت له فقال صدق انا صببت له وضوئه. (ترمذي ج:1 / ص:143 رواه الترمذي وقال قد جود حسين المعلم هذا الحديث و حديث حسين اصح شيئ في هذا الباب (ج:1/ص:13) وفي "نصب الرايه" راوه الحاكم في "المستدرك وقال صحيح على شرط الشيخين.)

[3] ابوداؤد باب استیذان المحدث الامام حدیث 1114 اسے حاکم اور ذہبی نے صحیح کہا ہے

[4] ترمذی، باب الوضوء من القیئ والرعاف۔

تیمم کا بیان:

پانی نہ ملنے کی صورت میں طہارت کی نیت سے پاک مٹی کا قصد کرکے اسے ہاتھوں اور چہرے پر ملنا تیمّم کہلاتا ہے۔

پانی نہ ملنے کی کئی صورتیں ہیں۔مثلا: مسافر کو سفر میں پانی نہ ملے یا پانی کے مقام تک پہنچنے پر نماز کے فوت ہو جانے کا خطرہ ہو یا وضو کرنے سے مریض کو مرض کی زیادتی کا خوف ہو یا پانی حاصل کرنے میں جان کا ڈر ہو ،مثلا: گھر میں پانی نہیں ہے، باہر کرفیو نافذ ہے یا پانی لانے میں کسی دشمن یا درندے سے جان کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں ہم تیم کر سکتے ہیں،خواہ یہ موانع برسوں قائم رہیں، تیمّم بھی بدستور جائز رہے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الصعید الطیب وضوء المسلم ولو الی عشر سنین[1]

پاک مٹی مسلمان کا وضو ہے اگرچہ دس برس پانی نہ پائے۔

تبصرہ:

ہمارا تبصرہ یہ ہے کہ یہ روایت ترمذی ابوداؤد اور نسائی کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔ترمذی کی روایت کے سند میں ایک راوی سفیان ہے جس کو مرحوم علی زئی صاحب مدلس قرار دے چکے ہیں۔ ابوداؤد کی روایت میں ایک راوی عمرو بن بجدان مجھول الحال ہے جبکہ نسائی کا حوالہ نبوی قدیم میں تھا اور اب نبوی جدید سے حذف کر دیا گیا ہے ایسا کیوں کیا گیا؟۔

جنابت کی حالت میں تیمم:

سیدنا عمرانؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے۔آپ نے لوگوں کو نماز پڑھائی۔جب نماز مکمل کر لی تو اچانک آپ کی نظر ایک آدمی پر پڑی جو لوگوں سے الگ بیٹھا ہوا تھا

---

[1] ابوداؤد باب الجنب یتمم حدیث 332, 333 نسائی 1 /171 ترمذی باب التیمم للجنب اذا لم یجد الماء حدیث 124 اسے امام ترمذی امام حاکم 1 / 176 , 177 اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے

اور اس نے لوگوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھی تھی۔رسول اللہ ﷺ نے اس سے پوچھا:اے فلاں!لوگوں کے ساتھ نماز پڑھنے سے تجھے کس چیز نے روکا؟اس نے کہا: مجھے جنابت پہنچی اور پانی نہ مل سکا۔آپ نے فرمایا: تجھ پر مٹی (سے تیمّم کرنا) لازم ہے، پس وہ تیرے لئے کافی ہے[1]۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سردی کا موسم تھا،ایک آدمی کو غسل جنابت کی ضرورت پیش آئی، اس نے اس بارے میں دریافت کیا تو اسے غسل کرنے کو کہا گیا۔اس نے غسل کیا جس سے اس کی موت واقع ہو گئی۔جب اس واقعہ کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ان لوگوں نے اسے مار ڈالا۔اللہ انہیں مارے۔بیشک اللہ تعالیٰ نے مٹی کو پاک کرنے والا بنایا ہے (وہ تیمّم کر لیتا)[2]۔

عبد اللہ بن عمرؓ نے فرمایا: اگر زخم پر پٹی بندھی ہوئی ہو تو وضو کرتے وقت پٹی پر مسح کر لے اور ارد گرد کو دھولے[3]۔

معلوم ہوا کہ اگر کسی کمزور یا بیمار آدمی کو احتلام ہو جائے اور غسل کرنا اس کے لئے ہلاکت یا بیماری کا موجب ہو تو اسے تیمّم کر کے نماز پڑھ لینی چاہئے، نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ زخموں اور پھوڑوں وغیرہ کی پٹی پر مسح کر لینا درست ہے اور محتلم، حیض اور نفاس سے فارغ ہونے والی عورتیں بھی بوقت ضرورت تیمّم کر کے نماز پڑھ سکتی ہیں، اس لئے کہ تیمّم عذر کی حالت میں وضو اور غسل دونوں کا قائم مقام ہے۔

تیمّم کا طریقہ :

سیدنا عمارؓ بیان کرتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے کسی کام کے لئے بھیجا میں (سفر کی حالت میں) جنبی ہو گیا اور پانی نہ ملنے کی وجہ سے جانور کی طرح خاک پر لوٹ پوٹ ہو اور نماز پڑھ لی۔پھر (سفر سے) آکر یہ حال رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیان کیا تو آپ نے فرمایا: تیرے لئے صرف یہی کافی تھا کہ تو یوں کر لیتا (پھر آپ نے اسے عملی طور پر یوں کرکے دکھایا)۔

---

[1] بخاری باب الصعید الطیب وضوء المسلم حدیث 344 مسلم باب قضاء الصلوۃ الفائتۃ حدیث 682

[2] ابن خزیمہ 1 / 138 حدیث 273 ابن حبان حدیث 2001 اسے حاکم 1 / 165 اور حافظ ذہبی نے صحیح کہا ہے

[3] بیھقی 1 / 228 بیہقی نے اسے صحیح کہا ہے

وضرب بیدیہ الی الارض فنفض یدیہ فمسح وجھہ و کفیہ

اور نبی اکرم ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے، پھر انہیں جھاڑا، پھر ان کے ساتھ اپنے منہ اور دونوں ہاتھوں (کی پشت) پر مسح کیا [1]۔ یعنی الٹے ہاتھ سے سیدھے ہاتھ سے الٹے ہاتھ پر مسح کیا، پھر دونوں ہاتھوں سے چہرے کا مسح کیا۔

تیمّم کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فتیمموا صعیدا طیبا [2]

پاک مٹی سے تیمّم کرو۔

اس آیت کی رو سے تیمّم، پاک مٹی سے کرنا چاہئے ۔

تیمّم جیسے مٹی سے جائز ہے، اسیطرح شور والی زمین کی سطح سے اور ریت سے بھی جائز ہے ۔

وضو کی طرح ایک تیمّم سے کئی نمازیں پڑھ سکتے ہیں کیونکہ تیمّم وضو کا قائم مقام ہے۔

جن چیزوں سے وضو ٹوٹتا ہے، انہی چیزوں سے تیمّم بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

تیمّم کے ساتھ نماز پڑھ لینے کے بعد اگر نماز کے وقت ہی میں پانی مل جائے تو اسے باوضو ہو کر نماز دہرانے یا نہ دہرانے میں اختیار ہے[3]۔ البتہ دہرانا بہتر ہے بلکہ اس میں دوہرا (دو نمازوں کا) اجر ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

نمازی کا لباس :

لا یصلی احدکم فی الثوب الواحد لیس علی عاتقیہ شیء [4]

---

[1] بخاری باب التیمم ھل ینفخ فیھما ؟ حدیث 338 مسلم باب التیمم حدیث 368 ابوداؤد باب التیمم حدیث 321

[2] النساء 4 / 43

[3] محدثین فقہاء فرماتے ہیں کہ نماز دوبارہ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

[4] بخاری باب اذا صلی فی الثوب الواحد فلیجعل علی عاتقہ 359 مسلم باب الصلوۃ فی الثوب واحد وصفۃ [illegible] حدیث 516۔

کوئی شخص ایک کپڑے میں اس طرح نماز نہ پڑھے کہ اس کے کندھے ننگے ہوں۔

اس پر ہمارا تبصرہ یہ ہے:

(الف) مذکورہ حدیث سے حاشیہ نگار نماز میں سر کو نہ ڈھانپنا ثابت کرتے ہیں جبکہ حدیث میں سر کا کوئی تذکرہ ہی نہیں ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ نماز کے لئے تو عمامہ اور ٹوپی سے گریز کیا جاتا ہے لیکن وضو کے دوران عمامہ پر مسح ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے یہ فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیتے ہیں۔

(ب) دوسری بات یہ ہے کہ حکم قرآن تو یہ ہے۔ خذوا زینتکم عند کل مسجد یعنی نماز میں زینت اختیار کرو۔ اور انسان کی زینت لباس میں ہے اور آپ لباس کے عنوان میں یہ مسئلہ ذکر کرکے خود ثابت کر چکے کہ ٹوپی اور عمامہ بھی لباس میں شامل ہے۔ اب آپ اپنی عبارت پر غور کریں کہ نماز کے ساتھ بطور تخصیص اس کا ذکر کرنا درست ہے یا نہیں؟۔

(ج) تیسری بات یہ ہے کہ شیخ الکل مولوی نذیر حسین دہلوی اپنے فتاوی میں یوں فرماتے ہیں یابنی آدم خذوا زینتکم عند کل مسجد اس آیت کریمہ سے ثابت ہوا کہ ٹوپی و عمامہ سے نماز پڑھنا اولی ہے کیونکہ لباس زینت ہے اگر عمامہ یا ٹوپی رکھتے ہوئے تکاسلا برہنہ سر نماز پڑھے تو مکروہ ہے۔ { فتاوی نذیریہ 1 / 240 } مولانا محمد داؤد غزنوی فرماتے ہیں" ابتدائے عہد اسلام کو چھوڑ کر اس عاجز کی نظر سے کوئی ایسی روایت نہیں گزری جس میں بصراحت یہ ذکر ہو نبی کریم ﷺ یا صحابہ کرام رضی اللہ تعال عنہم نے مسجد میں اور وہ بھی نماز باجماعت میں ننگے سر نماز پڑھی ہو چہ جائے کہ اسے معمول بنالیا ہو اس بدرسم کو جو پھیل رہی ہے { غیر مقلد احباب میں } بند کرنا چاہیئے۔ اگر فیشن کی وجہ سے ننگے سر نماز پڑھی جائے تو نماز مکروہ ہوگی۔ اگر خشوع و خضوع اور عاجزی کے خیال سے تو یہ نصاری کے ساتھ تشبہ ہوگا اور اگر کسل یا سستی کی وجہ سے ہے تو یہ منافقوں کی ایک عادت سے تشبہ ہوگی غرض ہر لحاظ سے یہ ناپسندیدہ فعل ہے { فتاوی علمائے اہل حدیث 4 /291 بحوالہ اصلی صلوۃ الرسول } مولانا محمد اسماعیل سلفی فرماتے ہیں" نبی کریم ﷺ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین اور اہل علم کا طریق وہی

ہے جواب مساجد میں متوارث اور معمول رہا ہے کوئی مرفوع حدیث صحیح میری نظر سے نہیں گزری جس سے اس عادت { ٹوپی نہ پہننے } کا جواز ہو کپڑا موجود ہو تو ننگے سر نماز پڑھنا ضد سے ہو گا یا قلت عقل سے۔ { فتاوی علمائے اہل حدیث 4 /386 بحوالہ اصلی صلوۃ الرسول }

نماز میں سر ڈھکنا یعنی ٹوپی، پگڑی وغیرہ کا اہتمام:

نماز میں سر ڈھکنا سنت ہے چنانچہ بخاری میں ہے کہ "وکانو یسجدون علی القلانس والعمائم فی شدۃ الحر" کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سخت گرمی میں ٹوپی اور پگڑیوں پر سجدہ لگاتے اور باب باندھا ہے " باب السجود علی القلانس والعمائم فی شدۃ الحر بخاری شریف میں ہے کہ حضور ﷺ نے ایک کپڑے میں نماز پڑھی لیکن بعد میں فراخی اور مالداری کے زمانے میں جس نے ایک کپڑے میں نماز پڑھی تو اس پر غصہ فرمایا "اولکم ثوبان" کیا تمہارے لئے دو کپڑے ہیں؟ لہٰذا ایک جملے کو نہیں دیکھنا چاہیئے بلکہ پورے باب کو دیکھنا چاہیئے۔

آپ ﷺ کا ایک عمامہ تھا، جسے "سحاب" کہا جاتا تھا، آپ نے (بعد میں) وہ عمامہ سیدنا علی کو پہنایا تھا، آپ ﷺ کبھی عمامہ کے نیچے ٹوپی پہنتے تھے اور کبھی بغیر عمامہ کے صرف ٹوپی پہن لیتے تھے اور کبھی بغیر ٹوپی کے صرف عمامہ باندھا کرتے تھے [1]۔

کان رسول اللہ ﷺ یکثر القناع [2].

آپ اکثر اوقات سر ڈھک کر رکھتے تھے۔

وقال الحسن: کان القوم یسجدون علی العمامة والقلنسوة ویداه في کمه. [3]

---

[1] زاد المعاد: 135/1 فصل فی ملابسہ

[2] شمائل ترمذی، حدیث: 120، باب ما جاء فی تقنع رسول اللہ ﷺ

[3] صحیح البخاری، باب السجود علی الثوب فی شدۃ الحر کتاب الصلاۃ، حدیث: 385 سے قبل

اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ (صحابہ کرام کی) جماعت (کبھی گرمی کی شدت کی وجہ سے) عمامہ اور ٹوپی (کے کناروں پر جو حصہ پیشانی سے لگا ہوتا ہے اس) پر سجدہ کرتی تھی اور ان کے دونوں ہاتھ آستینوں میں چھپے ہوتے تھے۔

قرآن مجید نے ہدایت کی ہے کہ نماز کے وقت لباسِ زینت اختیار کرنا چاہئے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ[1]

ٹوپی بھی لباسِ زینت ہے اس لئے عمامہ باندھ کر یا ٹوپی پہن کر ہی نماز ادا کرنی چاہئے، بلا عذر ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ ہے، رسول اللہ اکا معمول مبارک بھی سر ڈھک کر نماز پڑھنے کا تھا، البتہ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف تہبند میں بھی نماز پڑھنا ثابت ہے، اصل میں آپ ابعض اوقات جائز لیکن خلاف اولی کام اس لئے کر جاتے تھے کہ امت کے لئے آسانی وسہولت پیدا ہو، اس حدیث کا (جس میں ایک کپڑا میں نماز پڑھنے کا ذکر ہے اس کا) مقصد بھی یہی ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اگر ناف سے گھٹنے تک کا ساتر لباس موجود ہو تو یہ لباس بھی نماز کی ادائیگی کے لئے کافی ہے، نہ یہ کہ ایسے ہی لباس میں نماز پڑھنا بہتر ہے، اگر اسی ایک موقع کے عمل کی پیروی مقصود ہو، پھر تو ٹوپی کے علاوہ کرتا اور قمیص اتار کر بھی نماز پڑھنی پڑے گی، علماء کرام کی تحریروں کا ماحصل بھی یہی ہے کہ اگر ٹوپی یا عمامہ یا سر کو ڈھکنے کی چیز میسر ہو، تو کھلے سر نماز نہیں پڑھنی چاہئے، البتہ اگر اللہ کے سامنے انکساری اور غلامی کا اظہار مقصود ہو تو گناہ نہ ہوگا اور ننگے سر نماز پڑھنا جائز رہے گا، جیسا کہ نماز استسقاء کی کیفیت میں فقہاء کرام نے صراحت کی ہے، نماز میں تو ظاہر ہے کہ وہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ معمول مبارک رہا ہو نہ کہ جو عمل آپ نے اتفاقاً کسی مصلحت کے لئے کیا ہو، لیکن پھر بھی بعض لوگ آپ ﷺ کے اس دائمی عمل کو چھوڑ کر غیر اتفاقی عمل کو اپنا شعار بناتے ہیں اور یہ ان کی کم علمی کی علامت ہے یا سستی کی۔

---

[1] الأعراف: 31

عمر بن سلمہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ام سلمہؓ کے گھر میں ایک ہی کپڑے میں لپیٹے ہوئے نماز پڑھتے دیکھا کہ آپ نے اس کی دونوں طرفیں اپنے کندھوں پر رکھی ہوئی تھیں۔[1]

صحابہ کرامؓ نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور وہ اپنے تہبندوں کو چھوٹے ہونے کے سبب اپنی گردنوں پر باندھے ہوئے ہوتے تھے اور عورتوں سے کہہ دیا گیا تھا کہ جب تک مرد سیدھے ہو کر بیٹھ نہ جائیں اس وقت تک تم اپنے سر سجدے سے نہ اٹھانا۔[2]

محمد بن منکدرؒ بیان کرتے ہیں کہ میں جابر بن عبد اللہؓ کے پاس آیا تو وہ ایک کپڑے میں لپیٹے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے اور ان کی چادر ایک طرف رکھی ہوئی تھی۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو ہم نے ان سے کہا: اے عبد اللہ! آپ کی چادر پڑی رہتی ہے۔ اور آپ نماز پڑھ لیتے ہیں تو انہوں نے فرمایا: ہاں، میں نے نبی کریم ﷺ کو اسی طرح نماز پڑھتے دیکھا ہے اور میں نے یہ چاہا کہ (ایسا ہی کروں تاکہ) تمہارے جیسے جاہل مجھے اس طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیں[3]۔

ابن ابی شیبہ (۲/۲۵۹، حدیث: ۶۴۸۳) نے صحیح سند کے ساتھ سیدنا ابن عمرؓ سے روایت کیا کہ وہ نماز میں سدل کرنے کو یہود کی مخالفت میں مکروہ سمجھتے تھے اور فرماتے کہ یہودی سدل کرتے ہیں۔

ابن ابی شیبہ (: حدیث: ۶۴۸۰) نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ سیدنا علیؓ نے کچھ لوگوں کو نماز میں سدل کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: گویا یہ یہودی ہیں جو اپنے عبادت خانے سے باہر آئے ہیں۔

معلوم ہوا کہ نماز میں یہودیوں کی طرح گردن پر کپڑا لٹکانا (سدل کرنا) جائز نہیں ہے۔

سدل یہ ہے کہ (سر، یا) کندھوں پر اس طرح کپڑا ڈالا جائے کہ وہ دونوں طرف لٹکتا رہے۔[4]

---

[1] بخاری باب الصلوۃ فی الثوب الوحد ملتحفا به حدیث 354، 355،356 مسلم باب الصلوۃ فی الثوب واحد وصفہ لبسہ حدیث 517

[2] بخاری باب اذا کان الثوب ضیقا حدیث 362

[3] بخاری باب الصلاۃ بغیر رداء حدیث 370

[4] ابو داؤد باب السدل فی الصلاۃ حدیث 643، اہل سنت کے نزدیک سدل کی تعریف یہ ہے کہ یا کندھوں پر کپڑا اس طرح ڈالا جائے کہ اس کے دونوں کنارے لٹکتے رہے اور دوسرا یہ کہ وہ معاشرہ میں برا لگے۔

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عورتیں نماز فجر ادا کرتیں تو وہ اپنی چادروں میں لپٹی ہوا کرتی تھیں۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بالغہ عورت کی نماز اوڑھنی کے بغیر نہیں ہوتی[2]۔[3]

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تجھے علم نہیں کہ ران قابل ستر چیز (شرمگاہ) ہے؟[4]۔[5]

رسول اللہ ﷺ کبھی نماز میں ننگے پاؤں کھڑے ہوتے اور کبھی آپ نے جوتا پہن رکھا ہوتا تھا[6]۔
تھا[6]۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جب تم نماز ادا کرو تو اپنا جوتا پہن لو یا اسے اتار کر اپنے قدموں کے درمیان رکھو۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: یہودیوں کی مخالفت کرو، وہ جوتے اور موزے پہن کر نماز ادا نہیں کرتے۔

---

[1] بخاری باب فی کم تصلی المرأةفي الثياب ؟حدیث372 مسلم باب استحباب التكبير بالصبح في اول وقتها حديث 645

[2] ابو داؤد باب المرأة تصلي بغير خمار حدیث 641 اسے ابن خزیمہ اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے

[3] **تبصرہ:** ابوداؤد، ابن خزیمہ اور ابن حبان کی اس روایت میں ایک راوی قتادہ ہے اور یہ بتصریح علی زئی اور بدیع الدین صاحب { غیر مقلد } کے مدلس ہے { الفتح المبین ص: 58، مقالات علی زئی ج. 1 ص: 260 جزء منظوم لبدیع الدین ص 90 } ۔ علی زئی خود ہی فرماتے ہیں کہ یہ عام طالب علموں کو بھی معلوم ہیں کہ غیر صحیحین میں مدلس کی عن والی روایت ضعیف ہوتی ہے {الحدیث شمارہ 32 ص: 15 } ۔لہٰذا آپ کے مسلمہ اصول کے مطابق یہ حدیث ضعیف ہے۔

[4] ابو داؤد باب النهي عن التعری حدیث 4015 ابن ماجة باب ماجاء فی غسل المیت 1420

[5] **تبصرہ:** ابوداؤد اور ابن ماجہ کی اس روایت میں ایک راوی ابن جریج ہے اور دوسرا حبیب بن ابی ثابت ہے اور یہ بتصریح علی زئی اور بدیع الدین صاحب کے مدلس ہے { الفتح المبین ص: 55 ،الحدیث شمارہ 32 ص: 15 ،جزء منظوم لبدیع الدین ص 90 ,95 } ۔اور مرحوم علی زئی صاحب کی تصریح کے مطابق مدلس کی عن والی روایت صیحین کے علاوہ میں ضعیف ہوتی ہے { الحدیث شمارہ 32 ص: 15 } اور مزید لکھتے ہیں کہ مدلس کا عنعنہ صحت حدیث کے منافی ہوتا ہے { نورالعینین ص: 14 } ۔ لہٰذا ان کے مسلمہ اصول کے مطابق یہ حدیث ضعیف ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ابن خزیمہ اور ابن حبان سے اس حدیث کی تصحیح نقل کی ہے جبکہ اس سند سے یہ روایت ابن خزیمہ اور ابن حبان میں موجود نہیں ہے تو پھر صحیح کہا کا کیا مطلب ؟۔

[6] ابو داؤد باب الصلاة فی النعل حدیث 653 ابن ماجة باب الصلاة فی النعال حدیث 1038

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جب تم مسجد میں آؤ تو جوتوں کو اچھی طرح (غور سے) دیکھ لو، اگر ان میں گندگی یا نجاست نظر آئے تو انہیں زمین پر اچھی طرح رگڑ دو، پھر ان میں نماز ادا کرو[1]۔

نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں: جب تم نماز ادا کرو تو جوتوں کو دائیں یا بائیں نہ رکھو بلکہ قدموں کے درمیان رکھو کیونکہ تمہارا بایاں دوسرے نمازی کا دایاں ہوگا۔ ہاں اگر بائیں جانب کوئی نمازی نہ ہو تو بائیں جانب رکھ سکتے ہو[2]۔

عبد اللہ بن عباسؓ نے عبد اللہ بن حارثؓ کو دیکھا کہ وہ پیچھے سے بالوں کا جوڑا باندھ کر نماز پڑھ رہے تھے۔ عبد اللہ بن عباسؓ اٹھے اور ان کا جوڑا کھول دیا۔ جب ابن حارثؓ نماز سے فارغ ہو گئے تو ابن عباسؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے: میرے سر سے تمہیں کیا سروکار تھا۔ ابن عباسؓ نے کہا: میں نے رسول کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: بیشک اس طرح کے آدمی کی مثال اس شخص کی سی ہے جو مشکیں بندھی ہوئی حالت میں نماز ادا کرے۔[3]

عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دھاری دار چادر میں نماز پڑھی۔ آپ کی نگاہ اس کی دھاریوں پر چلی گئی، جب فارغ ہوئے تو فرمایا: میری یہ چادر ابو جہم کے پاس لے جاؤ اور اس کی سادہ چادر میرے پاس لے آؤ۔ اس (چادر کے دھاریوں) نے تو ابھی ابھی مجھے نماز میں (خشوع سے) غافل کر دیا تھا۔[4]

عائشہؓ نے گھر میں ایک جانب ایک پردہ لٹکا رکھا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہم سے اپنا یہ پردہ ہٹا دو۔ اس کی تصویریں نماز میں میرے سامنے آتی رہتی ہیں۔[5]

معلوم ہوا نقش و نگار والے مصلے پر نماز پڑھنے سے احتراز کرنا چاہیے۔

---

[1] ابو داؤد باب الصلاۃ فی النعل حدیث 650

[2] ابو داؤد باب المصلی اذا خلع نعلیه این یضعها حدیث 654 , 655

[3] مسلم باب اعضاء السجود والنھی عن کف الشعر حدیث 492

[4] بخاری باب اذا صلی فی ثوب لھا اعلام حدیث 373 مسلم باب کراھۃ الصلاۃ فی ثوب لھا اعلام حدیث 556

[5] بخاری باب ان صلی فی ثوب مصلب او تصاویر حدیث 374، 5959

صحابہ کرامؓ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے ہوئے گرمی کی شدت سے (بچنے کی خاطر) سجدے کی جگہ پر کپڑے کا کنارہ بچھا لیتے تھے۔[1]

نوٹ: بات ایسی نہیں جو نماز نبوی والے نے نقل کی ہے در اصل بات اس طرح ہے کہ صحابہ ﷺ شدت گرمی میں ٹوپیوں اور پگڑیوں میں پر سجدہ کرتے تھے، لیکن ٹوپی اور پگڑی کا لفظ اس لئے استعمال نہیں لکھا گیا کہ یہ لوگ ٹوپی کا اہتمام نہیں کرتے اور پگڑی کا تو بالکل نہیں۔

مساجد کے احکام

مسجد کی فضیلت :

سیدنا عثمانؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من بنى مسجدا ، يبتغى به وجه الله ، بنى الله له مثله فى الجنة[2]

جو شخص مسجد بنائے (اور) اس کے ذریعے سے اللہ کی رضا چاہے تو اللہ اس کے لئے بہشت میں اس (مسجد) جیسا گھر بناتا ہے۔

سیدنا ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کو مسجدیں بہت زیادہ محبوب ہیں اور بازار انتہائی ناپسندیدہ ہیں۔[3]

مطلب یہ ہے کہ مسجدیں دنیا کی جگہوں سے اللہ کو زیادہ محبوب اور پیاری ہیں کیونکہ ان میں اللہ کی عبادت ہوتی ہے اور بازار تمام جگہوں سے اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں کیونکہ وہاں حرص، طمع، جھوٹ، مکر اور لین دین میں فریب وغیرہ کا دور دورہ ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ کسی دینی یا دنیوی ضرورت کے بغیر بازار میں کبھی نہ جائیں اور مسجدوں سے بہت محبت کریں۔

---

[1] بخاری باب الصلاة على الثوب فى شدة الحرة حديث 385، 542

[2] بخاری باب من بنى مسجدا حديث 450 مسلم باب فضل بناء المساجد والحث عليها حديث 533

[3] مسلم باب فضل الجلوس فى مصلاه بعد الصبح وفضل المساجد حديث 671

سیدنا ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو کوئی دن کے اول حصے میں یا دن کے آخری حصے میں مسجد کی طرف جائے، اللہ اس کے لئے بہشت میں مہمانی تیار کرتا ہے۔[1]

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص وضو کرے اور بہت اچھے طریقے سے وضو کرے اور پھر مسجد کا قصد کرے تو ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں نہ ڈالے کیونکہ بیشک وہ اس وقت نماز ہی میں ہوتا ہے۔[2]

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: مسجد میں ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں نہ ڈالو[3]۔

تبصرہ:

یہ ایک ہی حدیث ہے جس کو دو شمار کی گئیں ہیں خود حاشیہ نگار نے نماز نبوی جدید میں دونوں کا ایک ہی نمبر لگایا ہے۔ اس حدیث کا ایک راوی ابو ثمامہ الحنال مجہول الحال ہے { تقریب التہذیب } اور مجہول الحال راویوں کی حدیث آپ ہی اصول کے مطابق ضعیف ہوتی ہے { جزء قرآءۃ ص: 81، 88 } آپ نے کتاب کے سرورق پر فرمایا ہے کہ اس کتاب میں ضعیف حدیث نظر نہیں آئے گی۔ لیکن آپ کے اپنے ہی اصول کے مطابق آپ کے پیش کردہ تمام احادیث ضعیف ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں ﴾

بعض مساجد میں نمازوں کا ثواب:

مسجد اقصیٰ میں ایک نماز ہزار نمازوں کے برابر ہے[4]۔

---

[1] بخاری باب فضل من غدا الی المسجد و من راح حدیث 662 مسلم باب المشی الی الصلاۃ تمحی به الخطایا و ترفع به الدرجات حدیث 669

[2] ابو داؤد باب ماجاء فی الہدی فی المشی الی الصلاۃ حدیث 562

[3] مسند احمد 4 /42, 43'241

[4] ابن ماجة باب ماجاء فی الصلوۃ فی مسجد بیت المقدس 1407

تبصرہ:

ہم (اہل سنت) جواباً عرض کرتے ہیں کہ اس حدیث کو خود زبیر مرحوم علی زئی صاحب نے {ابن ماجہ مترجم 402/2} میں ضعیف کہا ہے اور ساتھ میں امام ذہبی کا قول نقل کیا وہذا حدیث منکر اجدا حدیث کے صحیح ہونے کے لئے اس قول اور اپنے ضعف کے فتوے سے چشم پوشی اختیار کی گئی ہے۔ قارئین آپ ہی بتائیں کہ امام محمد رحمہ اللہ کو کذاب کہنے والے خود کہاں تک قابل اعتماد ہے۔

مسجد حرام میں ایک نماز دوسری مساجد کی ایک لاکھ نمازوں سے افضل ہے[1]۔

مسجد نبوی میں ایک نماز ہزار نمازوں سے بہتر ہے[2]۔

سیدنا عبد اللہ بن سعدؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ نفل نماز گھر میں پڑھنا افضل ہے یا مسجد میں، آپ نے فرمایا: کیا تم نہیں دیکھتے کہ میرا گھر مسجد کے کس قدر قریب ہے، اس کے باوجود فرض نماز کے علاوہ مجھے گھر میں نماز پڑھنا زیادہ پسند ہے۔[3]

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جب تم مسجد میں نماز پڑھو تو نماز کچھ حصہ (نوافل، سنتیں) اپنے گھروں میں پڑھو، اللہ اس نماز کے سبب گھر میں بھلائی دے گا۔[4]

تحیۃ المسجد (مسجد کا تحفہ):

سیدنا ابو قتادہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت (تحیۃ المسجد کے طور پر) پڑھا کرو[1]۔

---

[1] ابن ماجة باب ماجاء فی فضل الصلوۃ فی المسجد الحرام و مسجدالنبی صلی اللہ علیہ وسلم حدیث 1402

[2] بخاری باب فضل الصلاۃ فی مسجد مکۃ والمدینۃ حدیث 1190 مسلم باب فضل الصلاۃ بمسجد مکۃ والمدینۃ حدیث 1394

[3] ابن ماجة باب ماجاء فی التطوع فی البیت حدیث 1378

[4] مسلم باب استحباب صلوۃ النافلۃ فی بیتہ حدیث 778

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

پیاز اور لہسن کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت:

رسول اللہ ﷺ نے پیاز اور لہسن سے منع کیا اور فرمایا: جو کوئی ان دونوں کو کھائے تو مسجد کے قریب نہ آئے۔ اور فرمایا: اگر تم نے انہیں کھانا ہی ہے تو انہیں پکا کر ان کی بو مار لو[2]۔

کیونکہ اس سے فرشتوں کو بھی ایذا پہنچتی ہے[3]۔[4]

شیخ البانیؒ فرماتے ہیں: کیا کسی کے تصور میں یہ بات آسکتی ہے کہ سگریٹ پینے والا پیاز و لہسن کے حکم میں داخل نہیں؟ سب کو معلوم ہے کہ سگریٹ کی بدبو پیاز و لہسن کی بو سے کہیں زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔ ان دونوں کے کھانے میں کوئی ضرر بھی نہیں جب کہ سگریٹ پینے کے بہت سے نقصانات ہیں اور کوئی فائدہ نہیں[5]۔

---

[1] بخاری باب اذا دخل المسجد فلیر کع رکعتین حدیث444، 1163 مسلم باب استحباب تحیۃ المسجد برکعتین حدیث 714

[2] ابو داؤد باب فی اکل الثوم حدیث 3827

[3] مسلم باب نہی من اکل الثوما او بصلا حدیث 564

[4] تبصرہ الف: ابوداؤد کے اسی حدیث کو مرحوم حافظ زبیر علی زئی صاحب نے {تسہیل الوصول ص: 135} پر ضعیف کہا ہے۔ ایک کتاب میں ایک حدیث کو ضعیف اور دوسری کتاب میں اسی حدیث کو صحیح کہنا اس کو کیا کہا جا سکتا ہے؟۔

تبصرہ ب: نماز نبوی جدید میں اس حدیث کو ناصر الدین البانی کے حوالے سے صحیح کہا جبکہ {نماز نبوی قدیم ص: 23 اور جدید ص: 37 } پر ڈاکٹر شفیق الرحمٰن زیدی صاحب ناصر الدین البانی کے بارے میں یوں فرماتے ہیں" محدث شام ناصر الدین البانی سے ایک عجیب سہوہ ہوا ہے، انہوں نے {صفۃ الصلاۃ النبی ﷺ ص: 80} میں ایک ضعیف اور غیر صریح روایت کی بنیاد پر جہری نمازوں میں قرات فاتحہ کو منسوخ قرار دیا ہے۔ لیکن یہاں پر، بزرگ صاحبان ناصر البانی کی تقلید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

[5] تبصرہ: نماز نبوی کے اصول کے مطابق مسئلہ اور فتوی وہی صحیح اور قابل عمل ہے جو قرآن و حدیث سے مدلل ہو {نماز نبوی جدید ص: 40} صحابہ رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین، تابعین اور تبع تابعین کے اجتہادات کو تقلید کا نام دے کر رد کرنا اور مقلدین کو بدعتی، گمراہ اور مشرک کہنا آپ کا شیوہ ہے اور اب یہاں البانی کا قیاس اور تمہارا ان کی تقلید کرنا قرآن و حدیث میں شامل ہو گیا؟؟۔

اگر کسی کو مرض کی بنا پر لہسن یا پیاز استعمال کرنا پڑتا ہو تو وہ ان کے استعمال کے بعد مسجد آ سکتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا مغیرہ ابن شعبہؓ کو، جو سینے کے ایک مرض کی بنا پر لہسن کھا کر مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے آئے تھے، معذور قرار دیا تھا[1]۔[2]

مسجد میں تھوکنا:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھ پر میری امت کے اچھے اور برے اعمال پیش کئے گئے۔ میں نے دیکھا کہ نیک اعمال میں راستے سے تکلیف دہ چیز کو دور کرنا بھی ہے اور برے اعمال میں مسجد میں تھوکنا بھی ہے جس پر مٹی نہ ڈالی گئی ہو[3]۔

تبصرہ:

ہم تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اس حدیث کے حاشیہ میں عبد الصمد رفیقی صاحب فرماتے ہیں آج کل مساجد سے تھوک کو پانی یا کپڑے وغیرہ سے پاک کیا جائے گا۔مذکورہ بالا دونوں احادیث میں تھوک پر مٹی ڈالنے کا حکم ہے جبکہ یہاں حدیث کے مقابلے میں اپنا اجتہاد پیش کیا جارہا ہیں۔ اور جبکہ آپ کا موقف ہے کہ " رسول اکرم ﷺ مقابل بزرگوں اور ائمہ کرام کے اقوال پیش کرے تو آپ اس کی نادانی سے اجتناب کرتے ہوئے عمل بالقرآن بالحدیث پر کاربند رہیں" {نور العینین ص:25} ۔اسی طرح ڈاکٹر ابو جابر عبد اللہ دامانوی فرماتے ہیں" اور پھر رسول اللہ ﷺ کے مقابلے میں کسی امام کے قول کو پیش کرنا تو سخت ترین گمراہی ہے"۔ لیکن ذرا اس بات کی وضاحت مطلوب ہے کہ جن حضرات کے اقوال آپ حدیث کے مقابلے میں پیش کرتے ہیں تو کیا وہ ان

---

[1] ابوداؤد باب فی اکل الثوم حدیث 3826

[2] تبصرہ: اس حدیث میں ایک راوی ابو ہلال محمد بن سلیم البصری کو خود مرحوم علی زئی صاحب نے { جزء رفع یدین ص:55 } پر ضعیف کہا ہے۔ لہٰذا یہ حدیث ان کے اپنے اصول کے مطابق ضعیف ہے۔

[3] مسلم باب النھی عن البصاق فی المسجد حدیث 353 آج کل مساجد سے تھوک کو پانی یا کپڑے وغیرہ سے پاک کیا جائے گا۔ {ع ر}

اصول سے مستثنی ہیں ؟۔ جبکہ مرحوم زبیر علی زئی صاحب کا یہ بھی اصول ہے فرماتے ہیں" معلوم ہوا کہ صحیح حدیث چاہے صحیح بخاری یا صحیح مسلم میں ہو یا سنن اربعہ اور مسند احمد وغیرہ میں یا دنیا کی کسی معتبر و مستند کتابوں میں صحیح سند سے موجود ہو تو اس پر ایمان لانا اور عمل کرنا فرض ہے { مترجم موطا امام مالک ص: 46 } لہذا عصر حاضر کے تمام مجتہدین حضرات کے لئے اس حدیث پر عمل کرنا فرض ہے اور تھوک کو کپڑے سے صاف کرنے کی بجائے اس پر مٹی ڈالنا فرض ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ اس پر مٹی ڈال کر دفن کرنا ہے[1]۔

مسجد میں سونا :

عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی مسجد میں سو جایا کرتے تھے حالانکہ وہ غیر شادی شدہ نوجوان تھے[2]۔

مسجد میں خرید و فروخت :

سیدنا ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم کسی شخص کو مسجد میں کچھ بیچتا یا خریدتا دیکھو تو کہو: لاارنج اللہ تجارتک۔ اللہ تیری سوداگری میں نفع نہ دے۔ اور جس وقت تم کسی شخص کو مسجد میں کسی گم شدہ چیز کا اعلان کرتے ہوئے دیکھو تو تم کہو۔ لا ردها الله علیک اللہ تجھے وہ چیز نہ لوٹائے۔ کیونکہ مسجدیں قطعاً اس مقصد کے لئے نہیں بنائی گئیں۔[3]

مسجد میں جانے کی فضیلت :

---

[1] بخاری باب کفارة البزاق فی المسجد حدیث 415 مسلم باب النهی عن البصاق فی المسجد حدیث 553

[2] بخاری باب نوم الرجال فی المسجد حدیث 440, 1121, 1156

[3] ترمذي باب النهی عن البیع فی المسجد حدیث 1324

سیدنا ابوامامہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اپنے گھر سے باوضو ہو کر فرض نماز ادا کرنے کے لئے مسجد کی طرف نکلتا ہے تو اسے حج کا احرام باندھنے والے کی مانند ثواب ملتا ہے[1]۔

یاد رہے کہ جن پر بیت اللہ کا حج فرض ہو چکا ہو، جب تک وہ وہاں جا کر حج نہ کریں ان سے فرضیت ساقط نہ ہو گی، خواہ ساری عمر باوضو ہو کر پانچوں نمازیں مسجد میں جا کر پڑھتے رہیں، اس لئے اللہ کی بخشش اور اجر و ثواب کی فراوانی سے کسی قسم کی غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا ثواب اپنے گھر یا بازار میں تنہا نماز پڑھنے سے (کم از کم) پچیس درجے زیادہ ہے، لہذا جب انسان اچھی طرح وضو کر کے مسجد جائے تو اس کے ہر قدم سے اس کا درجہ بلند ہوتا ہے اور گناہ معاف ہوتے ہیں۔ جب وہ نماز پڑھتا ہے تو فرشتے اس کے لئے اس وقت تک دعا کرتے رہتے ہیں جب تک وہ نماز کی جگہ پر بیٹھا رہتا ہے۔ فرشتے کہتے ہیں: اے اللہ! اس پر رحمت کر۔ اے اللہ! اس پر رحم کر۔ جب تک نمازی نماز کا انتظار کرتا ہے وہ نماز ہی میں ہوتا ہے[2]۔

سیدنا جابرؓ سے روایت ہے کہ مسجد نبوی کے گرد کچھ مکان خالی ہوئے۔ بنو سلمہ نے مسجد کے قریب منتقل ہونے کا ارادہ کیا تو آپ نے دو دفعہ فرمایا: اے بنو سلمہ! اپنے موجودہ گھروں میں ٹھہرے رہو (مسجد کی طرف آتے وقت) تمہارے قدم لکھے جاتے ہیں۔[3]

مسجد سے دل لگانے والے کے لئے عظیم خوشخبری:

سیدنا ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سات شخص ایسے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اس دن (حشر میں) اپنے (عرش کے) سائے میں رکھے گا جس دن سوائے اس کے سائے کے کوئی سایہ نہیں ہوگا:

---

[1] ابو داؤد باب فضل المشی الی الصلاۃ حدیث 558

[2] بخاری باب ماذکر فی الاسواق حدیث 2119 مسلم باب فضل صلوۃ الجماعۃ وانتظار الصلاۃ حدیث 649

[3] مسلم باب فضل کثرۃ الخطاالی المساجد حدیث 665

۱۔ عادل حاکم۔

۲۔ وہ نوجوان جو اللہ کی عبادت میں جوانی گزارے۔

۳۔ وہ شخص کہ اس کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہو، جس وقت نماز پڑھ کر نکلتا ہے تو اس کیطرف دوبارہ آنے کے لئے بے تاب رہتا ہے۔

۴۔ وہ دو شخص جو (صرف) اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے آپس میں محبت رکھتے ہیں جب ملتے ہیں تو اسی کی محبت میں اور جدا ہوتے ہیں تو اسی کی محبت میں۔

۵۔ وہ شخص جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرتا ہے اور افراط محبت یا خشیت سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑتے ہیں۔

۶۔ وہ شخص جسے کسی خاندانی، خوبصورت عورت نے برائی کے لئے بلایا دعوت گناہ دی تو اس شخص نے کہا کہ مُں اللہ سے ڈرتا ہوں۔

۷۔ وہ شخص جس نے اللہ کے نام پر کچھ دیا تو اسے اتنا مخفی رکھا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو علم نہ ہوا کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا (خیرات کو بالکل مخفی رکھتا ہے)۔[1]

مساجد میں خوشبو کا اہتمام کرنا:

عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا: محلوں میں مسجدیں بناؤ۔ (جہاں نیا محلّہ آباد ہو، وہاں مسجد بھی بناؤ) اور انہیں پاک صاف رکھو اور خوشبو لگاؤ[2]۔[3]

---

[1] بخاری باب من جلس فی المسجد ینتظر الصلاة وفضل المساجد حدیث 660 مسلم باب فضل اخفاء الصدقة حدیث 1031

[2] ابو داؤد باب اتخاذ المساجد فی الدور حدیث 455 ابن ماجة باب تطہیر المساجد وتطییبها حدیث 758، 759

[3] تبصرہ: یہ روایت ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن خزیمہ اور ابن حبان کی ہے اور اس کی سند میں ایک راوی ہشام بن عمرو ہے۔ اور یہ ائمہ محدثین اور بدیع الدین کے تصریح کے مطابق مدلس ہے {جامع التحصیل للعلائی ص: 111، طبقات المدلسین لابن حجر ص: 46، جزء منظوم لبدیع الدین ص: 88}۔ اور مرحوم علی زئی صاحب کے اصول کے مطابق مدلس کی عن والی روایت غیر صحیحین میں ضعیف ہوتی ہے {الحدیث شمارہ 32 ص: 15۔ لہٰذا ان کے مسلمہ اصول کے مطابق یہ روایت ضعیف ہے۔

مسجدیں سادگی کا نمونہ ہونی چاہئیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے یہ حکم نہیں دیا گیا کہ میں مسجدوں کو مزین کروں[1]۔[2]

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ لوگ مسجدوں پر فخر کریں[3]۔

مسجد کے نمازیوں کے لئے خوشخبری:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اندھیروں میں نماز کے لئے مسجد کی طرف چل کر آنے والوں کو قیامت کے دن پورے نور کی خوشخبری سنادو[4]۔

مسجد میں مشرک داخل ہو سکتا ہے کیونکہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے بنی حنیفہ کے ایک شخص سیدنا ثمامہ ابن اثالؓ (ابھی وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے) کو مسجد کے ستون سے باندھ دیا تھا[5]۔

مسجد کی خبر گیری کرنے والا مومن ہے:

حضرت ابو سعید خدری نے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم کسی شخص کو مسجد کی خبر گیری کرتے ہوئے دیکھو تو اس کے ایمان کی گواہی دو[1]۔[2]

---

[1] ابو داؤد باب فی بناء المساجد حدیث 448 ۔اسے امام ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے۔

[2] تبصرہ: حدیث مذکور کی سند میں دو راوی سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہ ان دونوں کو مرحوم زبیر علی صاحب نے {جزء قراءۃ ص:74, 80,254 اور جزء رفع یدین ص:25,58 } پر بالترتیب مدلس کہا ہے اور روایت مذکورہ عنعنہ ہے یہاں اپنے اصول توڑتے ہوئے ابن حبان سے تصحیح نقل کرتے ہیں { وہ بھی بلا حوالہ جو کہ علمی دیانت نہیں ہے } اور حدیث کو صحیح ثابت کرنا چاہتے ہیں لیکن نماز نبوی جدید میں اس حدیث کو حذف کیا گیا ہے۔

[3] ابو داؤد باب فی بناء المساجد حدیث 448

[4] ابن ماجۃ باب المشی الی الصلاۃ حدیث 449

[5] بخاری باب الاغتسال اذا اسلم و ربط الاسیر ایضا فی المسجد حدیث 462, 469

مسلمان بہن بھائیو! مسجدوں کی خبر گیری کیا کرو۔ انہیں صاف ستھرا رکھو۔ روشنی اور پانی کا انتظام کرو۔ مرمت کا خیال رکھو اور سب سے بڑی اور اصل خبر گیری اور مسجد کی آبادی یہ ہے کہ وہاں جا کر پانچوں وقت با جماعت نماز پڑھو۔ مساجد میں قرآن و حدیث کے درس کا اہتمام کرو۔ مسنون نماز پڑھانے والے ائمہ کا تقرر اور پانچوں وقت اذان دینے کے لئے تنخواہ نہ لینے والے مؤذن کا انتظام کرو[3]۔

قبرستان اور حمام میں نماز پڑھنے کی ممانعت :

سیدنا ابو سعیدؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمام روئے زمین مسجد ہے سب جگہ نماز جائز ہے سوائے قبرستان اور حمام کے[4]۔

جب نبی کریم ﷺ قبرستان میں نماز پڑھنا جائز نہیں فرماتے تو قبرستان میں مسجدیں بنانا بھی جائز نہ ہوا۔ مسجد کے معنی ہیں سجدے کی جگہ، نماز کی جگہ۔ جب قبرستان میں سجدہ اور نماز منع ہے تو نماز اور سجدے کے لئے مسجد (سجدے کی جگہ) بنانا بھی منع ہوئی۔

---

[1] ترمذی باب ماجاء فی حرمة الصلاة حدیث 2622 وابن خزیمهالمساجد باب لزوم المساجد وانتظار الصلاة حدیث 802 امام ابن خزیمہ حدیث 1502 او رامام ابن حبان حدیث 310 نے اسے صحیح کہا ہے

[2] **تبصرہ:** اس حدیث کو خود مرحوم علی زئی صاحب نے { سنن ابن ماجہ 632/2 اور تسہیل الوصول ص: 138 } میں ضعیف کہا ہے۔ اور یہاں ابن خزیمہ اور ابن حبان سے اس کی تصحیح نقل کی جبکہ کتاب کے سرورق پر جو دعوی کیا تھا کہ اس کتاب میں کوئی ضعیف حدیث نظر نہیں آئیگی تو جس حدیث کو خود ہی ضعیف کہا تھا اسی کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش ہے۔ قارئین کرام یہ بات ذہن نشین رہے کہ امام ابن حبان اور ابن خزیمہ نے اپنے کتب میں احادیث پر تصحیح کا حکم نہیں لگایا ہے صرف اپنے کتاب کا نام صحیح رکھا ہے۔ جناب مرحوم علی زئی صاحب مترجم امام مالک صفحہ 55 پر امام ترمذی اور ابن حبان کو متساہل محدثین کہتے ہیں اور دوسری طرف پوری کتاب میں ان کی تصحیح پر اعتماد کرتے ہیں یہ کہاں کا انصاف ہے۔ مزید برآں اس حدیث کو نبوی جدید سے حذف کیا گیا ہے جبکہ عنوان کو برقرار رکھا گیا ہے۔ حالانکہ عنوان بھی آپ کے اصول کے مطابق قرآن و حدیث سے مدلل نہیں ہے اسے بھی بدلنا چاہیئے۔

[3] **تبصرہ:** یہ تمام امور آپ کے اصول کے مطابق قرآن و حدیث سے ثابت کیئے بغیر مردود ہوں گے۔ آپ کی مایہ ناز مسلکی تفسیر {احسن البیان سورۃ النور آیت 37} کی تفسیر میں لکھا ہے کہ عورت کے لئے گھر کے اندر نماز پڑھنا مسجد میں پڑھنے سے افضل ہے۔ نیز مؤذن بغیر تنخواہ کے تو امام با تنخواہ کیوں؟ کہیں آپ خود کسی مسجد کے امام تو نہیں؟۔

[4] ابوداؤد باب فی المواضع التی لاتجوز فیها الصلاة حدیث 492 ترمذی باب ماجاء ان الارض کلها مسجد الا المقبرة والحمام حدیث 317

مسجد میں داخل ہوتے وقت کی دعا :

مسجد میں داخل ہوتے وقت رسول اللہ ﷺ پر (مسنون الفاظ کے ساتھ) سلام کہنا چاہئے [1]۔ [2]

پھر یہ دعائیہ کلمات کہنے چاہئیں: اللھم افتح لی ابواب رحمتک [3]

اے اللہ میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے۔

اگر نمازی مسجد میں داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھ لے تو باقی دن شیطان سے محفوظ رہیگا:

اعوذباللہ العظیم وبوجھه الکریم وسلطانه القدیم من الشیطان الرجیم [4]

میں عظمت والے اللہ، اس کے عزت والے چہرے اور اس کی قدیم بادشاہت کی پناہ چاہتا ہوں ، شیطان مردود سے۔

مسجد سے نکلنے کی دعا:

سیدنا ابو سیدؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم مسجد سے نکلو تو یہ پڑھو:

اللھم انی اسئلک من فضلک [5]

اے اللہ ! بیشک میں تجھ سے تیرا فضل مانگتا ہوں۔

---

[1] ابن ماجة باب الدعاء عند دخول المسجد حدیث 773، 772

[2] تبصرہ: ابن ماجہ اور ترمذی کی اس روایت کی سند میں فاطمہ بنت حسین ہے۔ان کی بی بی فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ سے ملاقات اور سماع ثابت نہیں۔امام ترمذی اس کے بارے میں فرماتے ہے فاطمۃ بنت حسین لم تدرک فاطمۃ الکبری {ترمذی ص: 315} پھر فرمایا ولیس اسنادہ بمتصل {ترمذی ص: 86}۔جبکہ مرحوم علی زئی صاحب خود اس کے بارے میں تجزیہ کرتے ہیں "المنقطع ضعیف بالاتفاق { الحدیث شمارہ: 5 ص: 7 }۔لہٰذا ان ہی نزدیک یہ حدیث ضعیف ہے۔

[3] مسلم باب مایقول اذا دخل المسجد حدیث 713

[4] ابو داؤد باب مایقول الرجل عند دخولها المسجد حدیث 466

[5] مسلم باب مایقول اذا دخل المسجد حدیث 713

مسجد میں بلند آواز سے باتیں کرنا منع ہے:

سیدنا عمرؓ نے طائف کے رہنے والے دو آدمیوں سے کہا: جو مسجد نبوی میں اونچی آواز سے باتیں کر رہے تھے) اگر مدینہ کے رہنے والے ہوتے تو میں تمہیں سزا دیتا۔ تو رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں اپنی آوازیں بلند کرتے ہو[1]۔[2]

نیت کرنا:

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: تم لوگ خیر اور بھلائی کے کاموں کی عادت ڈالو اس لئے کہ بھلائی کے کام عادت کی بناء پر ہونے چاہییں اور نماز میں اپنی نیت کی حفاظت کرو[3]۔

إِنَّمَا الأعمال بالنيات[4].

بے شک اعمال کا دار ومدار نیت پر ہے۔

نیت کا تعلق اصل میں دل سے ہے یعنی نیت دل کے ارادہ کا نام ہے نہ کہ زبان کے بول کا نام، زبان سے جو الفاظ کہے جاتے ہیں وہ تو محض نیت کو نقل کرنا ہے اور زبان سے محض اس لئے نیت کے

---

[1] بخاری باب رفع الصوت فی المساجد حدیث 470

[2] تبصرہ: یہ حضرت عمرؓ کا قول ہے ہم اس سے استدلال کر سکتے ہیں لیکن آپ کا اصول ہے کہ قول صحابی دلیل نہیں تو یہاں اس سے استدلال کیسے؟ دوسری بات یہ ہے کہ حدیث میں صرف مسجد نبوی کا ذکر اور آپ کا دعوی { عنوان میں } عام ہے آپ کا دعوی تو پھر بھی ثابت ہوا اور یہ بھی بتائیں کہ کیا آہستہ آواز سے باتیں کرنا تو منع نہیں ہے؟۔

[3] المعجم الكبير للطبراني: 151/9، حديث: 8755، مجمع الزوائد : 101/2، كتاب الصلاة، باب 174 النية والخروج من الصلاة، حديث: 2578وقال رواهالطبرانی فی الکبیر و رجالهر جال الصحیح) اس روایت کو محدث کبیر طبرانی نے معجم کبیر میں نقل کیا ہے نیز مجمع الزوائد میں علامہ ہیثمی نے لکھا ہے کہ اس کو طبرانی نے معجم کبیر میں روایت کیا ہے اور اس کے تمام راوی صحیح کے راوی ہیں۔

[4] صحيح البخاري، كتاب بدء الوحي، باب 1 كيف كان بدء الوحي الى رسول الله ﷺ، حديث: 1و صحيح مسلم، كتاب الامارة، باب 45 قوله ﷺ انما الأعمال بالنيات، حديث: 1907)

الفاظ دُہرانے کی اجازت دی گئی ہے کہ استحضار قلبی میں اضافہ ہو جائے البتہ نماز کے لئے دل میں کی گئی نیت بھی کافی ہے اسے زبان سے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

فضیلت نماز:

اسلام کے پانچ اہم بنیادی ارکان ہیں، جن میں کلمۂ شہادت کے بعد دوسرا نمبر صلاۃ یعنی نماز کا ہے، متفق علیہ حدیث میں اسلام کے پانچ اہم اور بنیادی ارکان کا ذکر ہے، رسول اللہ انے ارشاد فرمایا:

رسول اللہ انے ارشاد فرمایا کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، نمبر ایک اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، اور یہ کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، دوسرے نماز پڑھنا، تیسرے زکوۃ دینا اور چوتھے حج کرنا، پانچویں رمضان کے مہینہ کے روزے رکھنا[1]۔

قرآن پاک میں نماز کا ذکر کثرت سے آتا ہے اور ایمان واسلام کے بعد جس عمل کا ذکر خصوصی اہتمام سے ہوتا ہے، وہ یہی نماز والا عمل ہے، قرآن پاک کا آغاز مصحف والی ترتیب میں سورۃ الفاتحہ سے ہو رہا ہے، اور یہ وہ سورت ہے جو نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے، دن اور رات کی پانچوں نمازوں میں اس سورت کو بار بار پڑھا جاتا ہے، تاکہ نمازی بار بار اس سورتِ مبارکہ کے معانی ومفہوم پر غور کرے اور اللہ تعالیٰ کی حقیقی توحید اور حقیقی عظمت وکبریائی کو سمجھے، سورۃ الفاتحہ کے بعد دوسری اہم سورت، سورۃ البقرہ ہے اس سورت کے آغاز ہی میں اللہ تعالیٰ نے تین گروہوں کا ذکر فرمایا ہے: اہل ایمان، اہل کفر اور منافقین، یہ ذکر پہلی آیت سے شروع ہو کر آیت: 20 تک پھیلا ہوا ہے، ایمان والوں کی پہلی دو اہم نشانیاں یہ ہیں:

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلاۃَ.

---

[1] بني الاسلام على خمس : شهادة أن لا اله الا الله وأن محمدا رسول الله ، واقام الصلاة وايتاء الزكاة والحج وصوم رمضان

صحيح البخاری، کتاب الایمان، باب: 2 دعاؤكم ایمانكم، حدیث: 8 وصحيح مسلم، کتاب الایمان، باب: 5 اركان الاسلام ودعائمه، حدیث: 16

یہ وہ لوگ ہیں جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں[1]۔

یہاں قرآن پاک کے آغاز سے یہ سلسلہ شروع ہوا تو آپ پورا قرآن پاک پڑھ لیں، ہر ایک مقام اور ہر ایک سورت میں آپ کو جا بجا توحید کا ذکر ملے گا اور ساتھ ہی ساتھ صلاۃ یعنی نماز کا ذکر بھی ملے گا، بلکہ قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی فلاح پانے والوں، کامیابی والوں، جنت والوں اور اللہ کے محبوب بندوں کا ذکر ہوگا، وہاں یہ بھی مذکور ہوگا کہ یہ وہ بندے اور بندیاں ہیں جو اپنی نمازوں کے قائم کرنے والے ہیں۔

نماز یعنی "صلاۃ" کا اصل معنیٰ دعاء ہے، اور نماز میں نمازی اپنے مولا اور اپنے آقا کے حضور اپنی دعاء ہی پیش کرتا ہے کہ شروع تا آخر اپنے ربّ کریم کی حمد وثنا اور اس کی تعریف اور خوبیاں بیان کرتا ہے، جس پر اللہ تعالیٰ کو بے پناہ پیار آتا ہے اور پھر وہ شفقت کا اظہار فرما کر اپنے اس بندے پر رحم وکرم فرماتا ہے۔

نماز کی تاریخ ایک طویل وقدیم تاریخ ہے، آدم ں کو جب پیدا کیا گیا تو سارے فرشتوں وجنات سے کہا گیا کہ وہ اللہ کے حکم سے آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں سب نے سجدہ کیا لیکن ابلیس نے اس ایک سجدہ کا انکار کیا، یہاں ہم سب مسلمانوں کیلئے ایک لمحۂ فکریہ ہے کہ ابلیس ایک سجدہ کے انکار سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو گیا، اُسے مردود ورجیم اور ملعون قرار دیا گیا، اور اس کا نام ہی شر اور بُرائی کی علامت بن گیا، اب سوال یہ ہے کہ ابلیس ایک سجدہ کے انکار سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ملعون وجہنمی بن گیا اور دوسری طرف کتنے ایسے انسان ہیں، کتنے ایسے مسلمان ہیں جو روزانہ پانچوں وقت کی نمازوں کا انکار کر رہے ہیں؟ ان پانچوں فرض نمازوں اور ان کے ساتھ پڑھی جانے والی سنت موکدہ میں کل 68 سجدے ہیں، ایک دن میں 68 سجدے، ایک ماہ میں 2040 سجدے بنتے ہیں اور ایک سال میں 24820 سجدے بنتے ہیں، اب جو مسلمان بندہ اور مسلمان بندی ایک دن کی پانچ نمازیں ادا

---

[1] سورۃ البقرہ، آیت: 3

نہ کرے گا، تو اس نے 68 سجدوں میں سستی کی، جو ایک ماہ نمازیں نہ پڑھے، اس نے 2040 سجدوں میں سستی کی، اور جو شخص ایک سال مسلسل نمازیں نہ پڑھے اس نے 24820 سجدوں میں سستی کی۔

بہت سے ایسے مسلمان بھی ہیں جو پورا ہفتہ نمازیں نہیں پڑھتے لیکن جمعہ کے دن آ کر نمازِ جمعہ پڑھ لیتے ہیں، گویا کہ یہ لوگ چھ دن کے 408 سجدوں میں سستی کرکے صرف جمعہ کی نماز ادا کر لیتے ہیں، کیا اس طرح سے ہم اللہ کو راضی کر سکتے ہیں؟ ہر گز نہیں! کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں عدل وانصاف ہے، وہ کسی کے ساتھ بھی ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا، جو شخص عمداً و قصداً یعنی جان بوجھ کر اسلام کے اس اہم ترین بنیادی رُکن سے منہ پھیرتا ہے اور اس کا (عملی) انکار کرتا ہے، اُسے یقیناً اپنے اس جرم عظیم اور گناہ بدترین کی سزا ملے گی، البتہ اگر کوئی شخص سچے دِل سے توبہ کرلے اور اپنی استطاعت وہمت کے مطابق اپنی عمر کی ان نمازوں کو بھی ادا کرنا شروع کردے جو اس نے ضائع کی ہیں تو اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، اور اپنی مخلوق پر بے حد مہربان ہے، رسول کریم ا کو نماز والے اس مبارک عمل سے ایسی عجیب محبت اور لگاؤ تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ جب بھی انہوں نے دیکھا تو سجدہ ور کوع اور قیام وذکر والی حالت ہی میں دیکھا۔

پانچوں نمازوں کی ادائیگی ایمان واسلام کے بعد افضل ترین عمل ہے، اسی لئے رسول اللہ ا نے فرمایا: سب سے افضل عمل وقت پر نماز پڑھنا ہے [1]۔

اسی طرح دوسری حدیث میں اس عمل کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ پسندیدہ عمل ہے، تو فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پسندیدہ عمل، وقت پر نماز پڑھنا ہے [2]۔

پانچوں نمازوں کی پابندی سے ادائیگی کرنے والے مسلمان بندے کا اللہ تعالیٰ پر حق (اور ذمہ) بن جاتا ہے کہ وہ اپنے اس بندے کو اپنے فضل وکرم سے جنت میں داخل فرمادے، ارشاد فرمایا:

---

[1] صحیح، البخاری، کتاب مواقیت الصلاۃ، باب: 5فضل الصلاۃ لوقتھا، حدیث: 527، وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب: 36بان کون الایمان باللهتعالیٰ أفضل الأعمال، حدیث: 85، صحیح الجامع، حدیث: 1094

[2] صحیح الجامع، حدیث: 164، صحیح البخاری، حدیث: 527، صحیح مسلم، حدیث: 85

پانچ نمازیں اللہ تعالیٰ نے بندوں پر فرض کی ہیں، جو شخص انہیں ادا کرے گا، اور ان میں سے کسی کو بھی کم تر سمجھ کر نہ چھوڑے گا، تو اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری ہے کہ اس شخص کو جنت میں داخل کرے[1]۔

جب کہ ابوداود، نسائی، ابن ماجہ اور موطا کی ایک روایت میں ہے کہ ایسے بندے کیلئے اللہ کے ہاں عہد ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمادے[2]۔

رسول کریم ﷺ نے نمازوں اور نمازوں کے رکوع و سجود اور ان کے اوقات کی حفاظت اور صحیح ادائیگی کرنے والوں کیلئے کئی احادیث میں جنت کی بشارت بھی ارشاد فرمائی ہے، مثلاً یہ کہ:

جو شخص پانچوں نمازوں کی، ان کے رکوع اور سجدوں کی، ان کے وضو اور ان کے اوقات کی پابندی کرے، اور یہ سمجھے کہ یہ نمازیں اللہ کی طرف سے بندوں پر واجب حق ہیں، وہ جنت میں داخل ہو جائے گا، یا یہ فرمایا کہ اس کے لئے جنت واجب ہو جائے گی[3]۔

پانچوں نمازوں کی اپنے اپنے اوقات میں صحیح ادائیگی پر یہ فضیلت بھی حاصل ہو جاتی ہے کہ ہر دو نمازوں کے درمیان کئے گئے سارے گناہ معاف کردے جاتے ہیں (بشرطیکہ یہ گناہ حقوق العباد سے متعلق نہ ہوں اور کبائر نہ ہوں، کیوں کہ حقوق العباد تو بندوں کا معاملہ ہے، جبکہ کبیرہ گناہ کیلئے توبہ ضروری ہے) ارشاد فرمایا کہ:

"جس نے میری طرح وضو کیا پھر کھڑا ہوا اور ظہر کی نماز ادا کی تو صبح کی نماز سے ظہر کی نماز تک ہونے والے گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں، پھر عصر کی نماز ادا کی تو ظہر سے عصر تک کے درمیان ہونے والے گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں، پھر مغرب کی نماز ادا کی تو عصر اور مغرب کے درمیان ہونے

---

[1] الموطا: 123/1، کتاب صلاة اللیل، باب: 3 الأمر بالوتر، حدیث: 270، وسنن ابی داود، کتاب الوتر، باب:2 فیمن لم یوتر، حدیث: 1420، سنن النسائی، کتاب الصلاة، باب: 6 المحافظة علی الصلوات الخمس، حدیث: 461، سنن ابن ماجة، کتاب اقامة الصلاة، باب: 194، ماجاء في فرض الصلوات الخمس والمحافظة علیها، حدیث: 1401

[2] سنن ابی داود، کتاب الصلاة، باب: 9 المحافظة علی الصلوات، حدیث: 425

[3] مسند الامام أحمد: 267/4، مسند الکوفیین، حدیث حنظلة الکاتب الأسیدي، حدیث: 18535

والے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں، پھر عشاء کی نماز ادا کی تو مغرب اور عشاء کے درمیان ہونے والے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں، پھر وہ رات گذارنے کے لئے لیٹ گیا، پھر صبح میں اُٹھ کر وضو کیا اور صبح کی نماز ادا کی تو عشاء اور فجر کی نماز کے درمیان کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں، اور یہی مطلب ہے: الحسنات یذھبن السیئات (نیکیاں گناہوں کو مٹادیتی ہیں) کا [1]۔

رسول کریم ﷺ نے نمازوں کی پابندی کرنے والوں کی فضیلت اس طرح بیان فرمائی کہ جو شخص فجر کی نماز ادا کرے تو وہ اللہ کی نگہبانی و حفاظت میں چلا جاتا ہے [2]۔ لہٰذا خبردار! کوئی شخص ایسے نمازی کو نہ چھیڑے اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی زیادتی کرے ورنہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو سخت سزا دے گا، اور جہنم میں پھینک دے گا۔

نمازوں کی ادائیگی اور نمازوں کی حفاظت اور نمازوں کی پابندی، یہ ایک ایسی سدا بہار نیکی ہے جو مسلمان کو شہید ہونے والے مجاہد کے مقام سے بھی اونچا مقام دلا سکتی ہے، ایک صحابی ص شہید ہوئے اور دوسرے ساتھی ان کی شہادت کے ایک سال بعد اپنی طبعی موت مر گئے، طلحہ بن عبید اللہ ص نے خواب میں دیکھا کہ بعد میں اپنی موت مرنے والے صحابی کو شہید ہونے والے صحابی سے پہلے جنت میں داخلہ مل گیا، تو رسول کریم اسے اپنے اس خواب کو بیان کیا، آپ انے فرمایا کہ بعد میں مرنے والے صحابی نے ایک سال کے روزے بھی رکھے اور کئی ہزار رکعات نمازیں بھی ادا کیں، (اور فلاں فلاں نیکیاں بھی کیں) اور ایک سال کی نمازیں بھی ادا کیں [3]۔

یہ حدیث تو مشہور و معروف ہے، اور تقریباً ہر مسلمان اس حدیث سے واقف ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے نماز کا حساب لیا جائے گا، اور نمازیں مکمل اور درست ہوئیں تو دوسری نیکیاں بھی

---

[1] مسند الامام احمد: 71/1، مسند عثمان بن عفان ص حدیث: 515

[2] صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب: 46 صلاۃ العشاء والصبح في جماعة، حدیث: 657

[3] مسند الامام احمد: 333/2، مسند المکثرین، مسند أبي هريرة حديث: 8380

قبول کرلی جائیں گی، اور اگر نماز میں کمی ہوئی یا نمازیں نہ ہوئیں تو دوسری تمام نیکیاں ضائع کردی جائیں گی[1]۔

قبر کے عذاب سے نجات دلانے والی نیکی اور قبر میں کام آنے والی نیکی بھی یہی نماز ہے:

جب میت کو قبر میں دفنادیا جاتا ہے اور لوگ دفنانے کے بعد واپس لوٹتے ہیں تو یہ میت ان لوگوں کے واپس جانے کے بعد ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے، اور پھر اگر یہ مؤمن ہے تو نماز اس کے سرہانے آکھڑی ہوتی ہے اور روزہ اس کے دائیں طرف آجاتا ہے، اور زکواۃ بائیں طرف آجاتی ہے، اور دوسری نیکیاں جیسے صدقہ، صلہ رحمی، کوئی بھی نیک کام، دوسرے لوگوں کے ساتھ کی گئی کوئی بھی نیکی (یا حسن سلوک یا دوسروں کی مدد وخدمت کرنے والی نیکی) اس کے پیروں کی طرف آکھڑی ہوتی ہے، اگر قبر کا عذاب سر کی طرف سے آنا چاہتا ہے تو اُسے نماز روک دیتی ہے اور اسی طرح یہ ساری نیکیاں اس کو قبر کے عذاب سے محفوظ رکھتی ہیں[2]۔

نماز وہ اہم نیکی ہے بلکہ ایسی سدا بہار نیکی ہے کہ نمازوں کی پابندی اور نمازوں کی صحیح ادائیگی کرنے والے کے چہرے پر نمازوں کا نور نظر آتا ہے، نمازی کا چہرہ رَونق اور رَوشن ومنور چہرہ ہوتا ہے، نمازوں کی پابندی، نمازی کیلئے اس کے دن بھر کے کام کاج کو خیر وبرکت والا بنادیتی ہیں، نماز پڑھ کر ہر نمازی ایک عجیب سکون، آرام اور راحت محسوس کرتا ہے، نمازوں کی پابندی سے نمازی کو آفات وبلیات اور مصائب وآلام سے بچالیا جاتا ہے، نماز، نمازی کو بے حیائی اور بُرے کاموں سے روکتی ہے، نماز، نمازی کو ایک اچھا انسان بنادیتی ہے، نمازوں کی وجہ سے اس نمازی کیلئے آسمان کے فرشتے بھی مغفرت کی

---

[1] مجمع الزوائد: 292/1، کتاب الصلاة، باب: 1 فرض الصلاة، حدیث: 1608، المعجم الاوسط: 240/2، حدیث: 1859

[2] صحیح ابن حبان: 380/7، فصل: 15 في أحوال الميت في قبره، حدیث: 3113، المستدرک للحاکم: 379/1، کتاب الجنائز، حدیث: 1403، مجمع الزوائد: 51/3، کتاب الجنائز، باب: 108، السؤال في القبر، حدیث: 4269، الترغیب والترهیب للمنذری: 276/4، فصل في عذاب القبر، حدیث: 5225

دعائیں کرتے ہیں، نماز دنیا وآخرت کے ہر کام کو بحسن وخوبی پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا سبب وذریعہ بھی ہے، نمازی کو نماز کی برکت سے ہر آزمائش وامتحان میں صبر کرنے اور برداشت کرنے کی ہمت وتوفیق بھی مل جاتی ہے، نمازی کو نماز کی وجہ سے دن اور رات کے تمام اوقات میں اللہ کا ذکر کرنے کی توفیق ملتی رہتی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نمازی کو مرتے ہوئے کلمہ بھی نصیب ہو جاتا ہے، اور کتنے ایسے خوش نصیب مسلمانوں کے بارے میں آپ نے اور ہم نے سنا کہ فلاں شخص یا فلاں عورت کا انتقال اس حال میں ہوا کہ وہ سجدے میں تھے، اور وہ نماز پڑھ رہے تھے، جو مسلمان اپنی زندگی میں نمازوں کو اہتمام سے اور خوب ذوق وشوق اور خشوع وخضوع سے ادا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اُسے یہ بلند مقام بھی عطا فرما دیتا ہے کہ اُسے مرتے ہوئے حالت نماز میں اپنے پاس بلا لیتا ہے۔

اے اللہ! ہم سب کو شہادت کی موت عطا فرما، اور اے اللہ ہمیں نماز کے قیام اور رکوع وسجود کی حالت میں موت عطا فرما، آمین۔

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا شَهَادَةً فِيْ سَبِيْلِكَ وَارْزُقْنَا حُسْنَ الْخِتَامِ وَاجْعَلْ خَيْرَ أَعْمَارِنَا آخِرَهَا وَخَيْرَ أَيَّامِنَا يَوْمَ نَلْقَاكَ وَأَنْتَ رَاضٍ عَنَّا يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ وَيَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ. اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا عِيْشَةَ السُّعَدَاءِ وَمِيْتَةَ الشُّهَدَاءِ وَمُرَافَقَةَ الْأَنْبِيَاءِ. بِرَحْمَتِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

اے اللہ! تو اپنے راستے میں ہمیں شہادت نصیب فرما، اور حسن خاتمہ نصیب فرما، اور ہماری زندگی کے آخری حصے کو بہتر کر دے، اور ہمارا سب سے اچھا دن وہ ہو جس دن ہم آپ سے ملیں اس حال میں کہ آپ ہم سے راضی ہوں، اے ارحم الراحمین۔

"اے اللہ! آپ اپنے فضل وکرم سے ہمیں نیک اور صالحین کی زندگی عطا فرما، شہیدوں کی موت عطا فرما اور آخرت میں انبیاء کرام علیہم السلام کی مرافقت وصحبت نصیب فرما، اے ارحم الراحمین۔

نماز کا خشوع و خضوع :

نمازوں میں خشوع و خضوع وہ بڑی نیکی اور عجیب حیرت انگیز عمل ہے کہ دنیا و آخرت کی ہر فلاح و نجات کا ذریعہ ہے، اور بلند و بالا مقامات کے حصول کا سبب ہے، امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بعض تابعین و مفسرین کے اس قول کو نقل کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے جنت کو اور جنتِ عدن کو بنایا تو اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے دستِ مبارک سے درخت بھی لگائے، پھر اس (رحمت والی) جنت کو نگاہ کرم سے دیکھا اور جنت سے کہا کہ کچھ کہو، تو جنت نے جو پہلا جملہ کہا وہ یہ تھا کہ:

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ[1]

فلاح پا گئے ایمان والے۔

سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات 9 ہیں، جن میں فلاح پانے والوں کی سب سے اعلیٰ اور سب سے پہلی صفت یہ ہے کہ:

اَلَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ.

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی نمازوں میں خشوع و خضوع کرنے والے ہیں

اس آیت کی تفسیر میں علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

خشوع کے معنی ہیں کسی کے سامنے خوف و ہیبت کے ساتھ ساکن اور پست ہونا، چنانچہ (سیدنا) ابن عباس رضی اللہ عنہما نے "خَاشِعُوْنَ" کی تفسیر "خائفون ساکنون" سے کی ہے، اور آیت "تَرَى الْأَرْضَ خَاشِعَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ" بھی دلالت کرتی ہے کہ "خشوع" میں ایک طرح کا سکون و تذلل معتبر ہے، قرآن کریم میں "خشوع" کو وجوہ، ابصار، اصوات وغیرہ کی صفت قرار دیا ہے، اور ایک جگہ آیت "أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللهِ" میں قلب کی یہ صفت بتلائی گئی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اصل خشوع قلب کا ہے، اور اعضائے بدن کا خشوع اُس کے تابع ہے،

---

1 سورۃ المؤمنون، آیت:

جب نماز میں قلب خاشع وخائف اور ساکن وپست ہوگا تو خیالات اِدھر اُدھر بھٹکتے نہیں پھریں گے، ایک ہی مقصود پر جم جائیں گے، پھر خوف وہیبت اور سکون وخضوع کے آثار بدن پر بھی ظاہر ہوں گے، مثلاً بازو اور سر جھکانا، نگاہ پست رکھنا، ادب سے دست بستہ کھڑا ہونا، اِدھر اُدھر نہ تاکنا، کپڑے یا ڈاڑھی وغیرہ سے نہ کھیلنا، انگلیاں نہ چٹخانا، اور اسی قسم کے بہت سے افعال واحوال لوازم خشوع میں سے ہیں، احادیث میں سیدنا عبداللہ بن زبیر اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نماز میں ایسے ساکن ہوتے تھے جیسے ایک بے جان لکڑی اور کہا جاتا تھا کہ یہ نماز کا خشوع ہے، فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ آیا نماز بدون خشوع کے صحیح ومقبول ہوتی ہے یا نہیں، صاحب رُوح المعانی نے لکھا ہے کہ خشوع اجزائے (صحت) صلوٰۃ کے لئے شرط نہیں، ہاں قبول صلوٰۃ کے لئے شرط ہے، میرے نزدیک یوں کہنا بہتر ہوگا کہ حُسنِ قبول کیلئے شرط ہے، واللہ اعلم (تفسیر عثمانی)۔

سورۃ المعارج میں اپنی نمازوں پر دوام کرنے والوں کی تعریف کی گئی ہے۔ دوام کا معنیٰ ہے اپنی نمازوں کو خوب اہتمام سے اور مکمل پابندی سے ادا کرنا۔

إِلَّا الْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ[1]

سوائے ان نمازیوں کے جو اپنی نماز کو دوام کے ساتھ ادا کرنے والے ہیں۔

مؤمنین کی اہم صفات کو جہاں بھی بیان کیا گیا ہے، ایمان کے بعد نماز کا ذکر ضرور ملتا ہے، یہاں سورۃ المؤمنون میں بھی دنیا وآخرت کی سب سے بڑی کامیابی کیلئے لفظ "فلاح" استعمال ہوا ہے، یہ وہ لفظ ہے کہ اس سے زیادہ ذو معنیٰ لفظ دوسرا کوئی نہیں ہے، گویا کہ دنیا وآخرت کی تمام کامیابیوں کے حصول کا نام "فلاح" ہے۔

اذان میں بھی اسی "فلاح" کی طرف بلایا جاتا ہے، اور اس فلاح کے پانے والوں کی پہلی صفت یہ ہے کہ یہ اپنی نمازوں کو مکمل عاجزی سے ادا کرتے ہیں، خشوع وخضوع کا ظاہری معنیٰ اور ظاہری صورت بدن کی عاجزی وسکون ہے، جب کہ حقیقی معنیٰ دِل کا جھکنا ہے کہ ربّ کے سامنے آدمی کی کمر اور اس کا سر

---

[1] سورۃ المعارج، آیت: 22-23

ہی نہ جھکے بلکہ اس کا دِل بھی جھک جائے کہ نماز کے بعد اپنی زندگی کے شب و روز میں یہ نمازی اپنے رب کے ہر حکم کے سامنے اپنے آپ کو جھکا دے، یہ نہ ہو کہ مسجد میں جا کر سر کو جھکائے اور باہر نکل کر اپنی زندگی کو شریعت کے خلاف گذارے۔

دِل اگر واقعی حاضر ہے اور دِل میں یقین ہے کہ میں اپنے مولا اور اپنے ربّ کریم کے سامنے کھڑا ہوں اور میرا ربّ میری طرف متوجہ ہے اور میرا ربّ مجھے دیکھ رہا ہے، اگر یہ یقین بن جائے تو پھر اس دِل کے خشوع کا پورے بدن پر اثر پڑتا ہے اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ:

لو خشع قلب هذا خشعت جوارحه[1]

اگر اس نمازی کے دِل میں خشوع ہوتا تو اس کا پورا بدن بھی خشوع والا ہوتا۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ حدیث مرفوع ہے، لیکن اکثر اہل علم نے اسے مشہور تابعی سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کا قول قرار دیا ہے۔

صحابہ اور سلف صالحین کے بے شمار واقعات موجود ہیں کہ ان کی نمازوں میں حقیقی خشوع تھا کہ جوں ہی نماز کی نیت باندھتے تھے، دوسری دنیا میں چلے جاتے تھے، جی ہاں! یہ عالم لذتِ مناجات والا عالم ہے کہ متقین صالحین اور محبّین کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دِل کا سرور اگر کسی عبادت میں ہے تو وہ نماز ہے، خشوع و خضوع والی نماز وہ معراج ہے جو عروج کے سارے مراحل طے کر لیتی ہے، اور نمازی کو اللہ تعالیٰ کے بالکل قریب تر لے جاتی ہے۔ (اللہ تعالیٰ ہم سب کو حقیقی خشوع والی نمازیں پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین)۔

نماز میں خشوع خضوع پیدا کرنے کا سب سے اہم طریقہ اور سب سے کامیاب ذریعہ یہ ہے کہ نمازی، نماز کے دَوران نماز میں پڑھی جانے والی دعاؤں، کلمات، جملوں اور الفاظ کے ترجمہ اور مفہوم پر غور کرے، نماز کا ترجمہ یاد کر کے ان پر خوب غور کرے، مثلاً جب اللہ اکبر کہا جائے تو ترجمہ سامنے لائے کہ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے، اللہ تعالیٰ کی کبریائی، اس کی بڑائی، اس کی عظمت اور اس کی قدرت کا

---

[1] فیض القدیر شرح الجامع الصغیر للمناوی: 319/5، حدیث: 7447

تصور کرے، پھر جب ثنا "سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ الخ" پڑھے تو ذہن میں ترجمے کو لے آئے کہ اے اللہ تیری ذات پاک ہے، اور اس طرح نماز کے ہر جملہ کا معنیٰ اپنے سامنے لا کر اس پر خوب غور کرے، اس طرح دِلوں کی نرمی، دل کا حاضر رہنا اور نماز کا خشوع وخضوع آجائے گا، اور یہ سب کچھ ایک دِن میں نہیں ہوگا، بلکہ اس پر کئی دِن اور کچھ عرصہ محنت کرنا پڑے گی، اور آہستہ آہستہ آپ اس محنت کی برکت سے ایسی نماز پڑھنے لگیں گے کہ آپ کو خود اپنی نماز میں لذت وحلاوت محسوس ہوگی اور نماز جاندار بن جائے گی، نماز کی رُوح اس کا خشوع وخضوع ہے اور خشوع وخضوع کا اصل مرکز دِل ہے، اور پھر اس دِل کی وجہ سے دوسرے اعضائے بدن بھی اس کے تابع ہیں، اگر دِل میں خشوع وخضوع پیدا ہو جائے تو پورا بدن خشوع وخضوع والا بدن بن جاتا ہے، اور اگر دِل ہی خراب ہو تو سارا بدن خراب رہتا ہے۔

نماز میں بندہ اپنے رب کے سامنے اپنی مناجات، اپنی دعائیں اور اپنی طرف سے کی گئی حمد وثنا پیش کرتا ہے، لہٰذا بندے کو چاہئے کہ وہ اپنی ان دعاؤں اور اپنی ان مناجات کو خوب اچھے طریقہ سے، ادب وعاجزی سے اور سوچ سمجھ کر بیان کرے، حدیث میں ہے:

آپ انے ایک دِن ظہر کی نماز پڑھائی اور سلام پھیرنے کے بعد آخری صف میں سے ایک نمازی کو بلایا اور فرمایا کہ اے فلاں! کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتے؟ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تم کیسی نماز پڑھتے ہو؟ تم میں سے کوئی شخص جب نماز پڑھنے کیلئے کھڑا ہوتا ہے تو وہ اس یقین کے ساتھ کھڑا ہو کہ وہ اپنے رب سے اپنی مناجات (اپنی گفتگو) کیلئے کھڑا ہو رہا ہے، اسے چاہئے کہ سوچے اور غور کرے کہ اسے اپنی مناجات (اپنی نماز) کس طرح سے اپنے رب کے حضور پیش کرنا ہے (اور ہاں یہ بھی سن لو) تم لوگ شاید یہ سمجھتے ہو کہ میں اپنے پیچھے تم لوگوں کو دیکھ نہیں سکتا، اللہ کی قسم میں تو (اللہ کے فضل وکرم اور اس کے حکم سے) جس طرح اپنے سامنے دیکھ سکتا ہوں بالکل اسی طرح مجھے پیچھے والی چیزیں بھی نظر آتی ہیں[1]۔

---

[1] صحیح ابن خزیمہ: 241/1، کتاب الصلاۃ، باب: 58 الأمر بالخشوع في الصلاۃ، حدیث: 474

ثنا کے بعد نمازی سورۃ الفاتحہ شروع کرتا ہے یہ وہ عظیم سورت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نماز قرار دیا ہے، حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں نے صلاۃ یعنی سورۃ الفاتحہ کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کر دیا ہے، اور میرا بندہ جو کچھ چاہے وہ مانگ لے، اُسے ضرور ملے گا، جب بندہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْن کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری تعریف بیان کی، پھر جب بندہ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری ثنا بیان کی، پھر جب بندہ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری بزرگی اور بڑائی بیان کی (اور یہ بھی فرمایا کہ میرے بندے نے اپنا سب کچھ میرے حوالہ کر دیا) پھر جب اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ سورت اب میرے اور میرے بندے کے درمیان (آدھی ہو گئی) ہے، اور میرا بندہ جو چاہے مانگ لے، پھر جب "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ" کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے بندے کے لئے ہے، اور میرے بندے کے لئے وہی ہے جو اس نے مانگا[1]۔

سورۃ الفاتحہ کی سات اہم آیات جو پورے قرآن پاک کا خلاصہ ہیں، ان آیات پر خوب غور اور تدبر کرنے سے ایمان و تقویٰ کا کمال اور ایمان کی حلاوت حاصل کی جا سکتی ہے، سورۃ الفاتحہ اللہ تعالیٰ کو اتنی پسند ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورتِ مبارکہ کے حوالے سے تین بار فرمایا کہ میرے بندے کو وہ سب کچھ ملے گا جو وہ مانگے گا "ولعبدی ماسأل" اس جملہ پر بار بار غور کیجئے کہ دَوران نماز بھی آپ سورۂ فاتحہ پڑھتے ہوئے اور سورۂ فاتحہ کے معانی و مفہوم پر غور و فکر اور تدبر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی کبریائی

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب: 11 وجوب الفاتحة في كل ركعة حديث: 395، سنن ابی داود، کتاب الصلاۃ، باب: 130-131 القرأة في الفجر، حدیث: 821، سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب: 2 ومن سورة الفاتحة، حدیث: 2953، سنن النسائی، کتاب الافتتاح، باب: 23 ترک قرأة بسم اللهالرحمن الرحيم في فاتحة الكتاب، حدیث: 909، سنن ابن ماجه، کتاب الأدب، باب: 52 ثواب القرآن، حدیث: 3748

وعظمت کو اپنے دِل میں بٹھایئے اور ساتھ ہی ساتھ دِل ہی دِل میں اپنی ہر ضرورت کو اللہ تعالیٰ سے مانگ لیجئے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ تین بار فرمارہا ہے کہ میرے بندے کیلئے وہی ہے جو بھی اس نے مانگا، نماز کے علاوہ عام حالات میں اپنی ہر ضرورت اور ہر حاجت اور ہر دعاء کے قبول کرانے کا آسان طریقہ بھی یہی ہے کہ آپ سورۂ فاتحہ پڑھیے اور سورۂ فاتحہ شروع کرنے سے قبل اپنی ضرورت اور اپنی دعاء مانگ لیجئے، پھر جب آپ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡن پر پہنچیں تو ایک بار پھر دعاء کر لیجئے اور تیسری بار جب سورت ختم ہو تو پھر دعاء مانگ لیجئے، پھر دیکھئے کہ لمحوں میں آپ کی دعاء کی قبولت اور آپ کی حاجات وضروریات کا پورا ہونا کیسے سامنے آتا ہے۔

نمازیوں کیلئے اہم آداب اور اصولوں کا خیال رکھنا ضروری ہے، اس میں ایک نمازوں کے دَوران تمام ارکان وواجبات کا صحیح ادا کرنا بھی ہے، جو لوگ جلدی جلدی نماز پڑھتے ہیں اور نماز کے ارکان، واجبات اور رکوع، سجود، قومہ جلسہ وقعدہ بلا اطمینان کے یونہی پڑھتے ہیں، ان کی نماز مقبول ہونے کے بجائے ان کے منہ پر ماردی جاتی ہے، نماز چونکہ بندے اور اللہ کے درمیان کا ایک اہم رابطہ ہے، نماز پر بندہ اپنی دنیا وآخرت سنوار بھی سکتا ہے، اور بگاڑ بھی سکتا ہے، نماز ہی فلاح ونجات کا ذریعہ ہے، نماز ہی کا حساب سب سے مقدم اور سب سے اہم ہے، لہٰذا نماز کا صحیح ادا کرنا ضروری ہے، ورنہ ساری محنت رائیگاں چلی جاتی ہے، اور نمازی کو اس نماز کا فائدہ نہیں ہوتا، رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

"ایک شخص ساٹھ سال تک نمازیں ادا کرتا ہے، لیکن اس کی ایک نماز بھی قبول نہیں کی جاتی، کیوں کہ اس نے اگر رکوع مکمل صحیح ادا کیا تو سجدہ صحیح ادا نہیں کیا، اور اگر سجدے صحیح کئے اور رکوع غلط ادا کیا[1]"

امام الھیثمی نے مجمع الزوائد میں اور امام المنذری نے الترغیب میں نقل کیا ہے:

[1] الترغیب والترھیب، للامام الاصفھانی، حدیث: 1895، والترغیب والترھیب المنذری: 1/405، الترغیب فی عدم اتمام الرکوع والسجود، حدیث: 739

"جس نے بے وقت نماز ادا کی، اور اس کے لئے اچھی طرح وضو نہیں کیا، اور نہ ہی اس کے خشوع وخضوع کو پورا کیا اور نہ اس کے رکوع و سجود کو اچھی طرح ادا کیا، تو وہ نماز بالکل سیاہ شکل میں یہ کہتے ہوئے نکلتی ہے کہ جس طرح تو نے مجھے ضائع کیا اسی طرح اللہ تجھے ضائع کرے، یہاں تک کہ وہ نماز وہاں چلی جاتی ہے جہاں اللہ تعالیٰ چاہتا ہے، جس طرح پُرانے کپڑے کو لپیٹا جاتا ہے اسی طرح اس نماز کو لپیٹ کر اس نمازی کے منہ پر مار دیا جاتا ہے "[1]۔

نماز کے آداب ہی کے سلسلہ میں فرمایا:

"نماز دو دو رکعت ہے، ہر دو رکعت کے بعد تشہد ہے، نماز میں خشوع، عاجزی و مسکنت ہونی چاہئے اور اپنے دونوں ہاتھوں کو تو اپنے رب کے سامنے اٹھائے اس حال میں کہ ہتھیلیاں تیرے چہرہ کے بالمقابل ہوں۔ اور تو کہے یا رب یا رب، جو اس طرح نہ کرے اس کی نماز ایسی ہے، ویسی ہے، یعنی ناتمام اور ناقص ہے[2]"۔

نماز اور نمازیوں کے اوصاف کے بارے میں رسول اللہ ا نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کہ میں اس بندہ کی نماز قبول کرتا ہوں جو میری عظمت و کبریائی کی وجہ سے نماز میں تواضع وانکساری اختیار کرتا ہے، اور میری مخلوق میں سے کسی پر ظلم وزیادتی نہیں کرتا ہو، میری معصیت ونافرمانی پر اصرار نہ کرتا ہو، میری یاد میں دن گذارتا ہو، مسکینوں، مسافروں اور ضرورت مندوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور صلہ رحمی کرتا ہو، اور مصیبت زدہ کے ساتھ صلہ رحمی کرتا ہو، اس بندہ کا نور، آفتاب کے نور کی طرح ہے، میری عزت وجلال کی قسم میں اس کی حفاظت کرتا ہوں اور میرے

---

[1] مجمع الزوائد: 302/1، كتاب الصلاة، باب: 5 المحافظة على الصلاة لوقتها، حديث: 1677، الترغيب والترهيب للمنذري: 334/1، الترغيب في الصلاة في أول وقتها، حديث: 572

[2] سنن الترمذى، كتاب الصلاة، باب: 283 ماجاء في التخشع في الصلاة، حديث: 385، وسنن ابى داود، كتاب التطوع، باب: 13 صلاة النهار، حديث: 1296 وسنن ابن ماجه، كتاب الصلاة، باب: 172 ماجاء في صلاة الليل والنهار مثنى مثنى، حديث: 1325 و السنن الكبرىٰ للنسائي، كتاب السهو، حديث: 618-619

فرشتے اس کی حفاظت کرتے ہیں، میں اس کو تاریکی میں نور، نادانی میں حلم و بردباری عطا کرتا ہوں، اور میری مخلوق میں اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ساری جنت میں جنت الفردوس کی[1]۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ نماز کے دَوران آپ کا خیال اِدھر اُدھر نہ جائے اور دِل حاضر ہو تو اس کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ نماز پڑھنے سے پہلے یہ سمجھ لیں اور یقین کرلیں کہ یہ آپ کی زندگی کی آخری نماز ہے، یہ سمجھیں کہ شاید میں اس نماز کے بعد دوسری نماز نہ پڑھ سکوں، یہ میری آخری نماز ہے، للذا مجھے اس نماز میں عاجزی اور اہتمام اور محنت کی انتہا کردینی چاہئے، جب آپ ہر نماز سے پہلے یہ تصور اور یہ یقین بنالیں گے تو آپ کی ہر نماز صحیح نماز بن جائے گی، سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ ایک شخص سرکارِ دوعالم ﷺ سے کوئی اہم ترین نصیحت کے بارے میں عرض کیا تو ارشاد فرمایا:

تم جب نماز پڑھو تو آخری نماز (سمجھ کر) پڑھو، اس لئے کہ اگر تم اللہ کو نہیں دیکھ رہے ہو، تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے، لوگوں کے پاس جو کچھ بھی ہے، اس کے بارے میں ان سے (یا کسی سے بھی) کوئی امید نہ رکھو (اگر ایسا کروگے تو) تم غنی بن جاؤگے، اور خبردار! ایسا کوئی کام نہ کرنا جس کے بارے میں بعد میں معذرت کرنا پڑے[2]۔

نمازوں کو مکمل خشوع خضوع، مکمل آداب اور حُسن طریقے سے ادا کرنا چاہئے، قیام، رکوع و سجدہ اور دوسرے تمام ارکان کو مکمل سکون واطمینان سے ادا کرنا چاہئے تاکہ نمازی کو اس کی اس محنت کا پورا پورا ثواب ملے اور اس کی نماز ضائع نہ ہو، نماز پڑھنے والوں میں ایسے نمازی بھی ہیں جن کو ان کی نماز کا آدھا حصہ ملتا ہے، بعض کو رُبع ملتا ہے، بعض کو اس سے بھی کم اور بعض کو کچھ زیادہ، اور بعض وہ خوش نصیب بھی ہیں جن کو ان کی نمازوں کا پورا پورا (100%) اجر وثواب ملتا ہے، اللہ تعالیٰ

---

[1] مجمع الزوائد: 147/2، كتاب الصلاة، باب: 203 علامة قبول الصلاة، حديث: 2889،

[2] مجمع الزوائد: 229/10، والترغيب والترهيب: 143/4، الترغيب في ذكر الموت، حديث: 4908

ہمیں اور آپ کو اور سارے ایمان والوں کو ان خوش نصیبوں میں سے بنادے جن پر اللہ تعالیٰ فضل و کرم فرماتا ہے، اور ان کی نمازوں اور عبادات کو قبولیت کے شرف سے نوازتا ہے، آمین۔

تم میں سے بعض نمازی وہ ہیں جو کامل و مکمل نماز پڑھتے ہیں، اور بعض آدھی نماز پڑھتے ہیں، بعض ایک تہائی، بعض ایک چوتھائی، بعض لوگ نماز کا پانچواں حصہ ادا کرتے ہیں، یہاں تک کہ بعض کے حصہ میں نماز کا دسواں حصہ آتا ہے [1]۔

یعنی نماز کے فرائض، واجبات، سنن، مستحبات، آداب، خشوع و خضوع کے اعتبار سے نماز کے ثواب میں کمی وزیادتی ہوتی رہتی ہے، جو نمازی ان تمام امور کی پوری پوری رعایت کرتے ہوئے نماز کی ادائیگی کا اہتمام کرتے ہیں، انہیں نماز کا سو فیصد ثواب ملتا ہے، لیکن جو حضرات مذکورہ امور میں سے کسی بھی قسم کی کمی و کوتاہی کرتے ہیں، ان کی نماز کا ثواب اسی حساب سے کم ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض نمازی کو نماز کا دسواں حصہ بلکہ اس سے بھی کم ثواب ملتا ہے، اسی وجہ سے دوسرے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک ایک شخص نماز پڑھ کر فارغ ہوتا ہے، اور اس کے حصہ میں اس کی نماز کا دسواں حصہ، نواں حصہ، آٹھواں حصہ، ساتواں حصہ، چھٹا حصہ، پانچواں حصہ، چوتھائی حصہ، تہائی حصہ، یا نصف حصہ آتا ہے [2]۔

ایک اور حدیث میں ارشاد نبوی ہے: نماز کے تین حصے ہیں، ایک حصہ طہارت و پاکی ہے، دوسرا حصہ رکوع ہے، اور تیسرا حصہ سجدہ ہے، اب جو شخص تمام حقوق و آداب کی رعایت کے ساتھ نماز ادا

---

[1] السنن الكبرىٰ للنسائي: 100/1، كتاب السهو، ذكر اختلاف عمرو بن الحارث، حديث: 616 والسنن الكبرىٰ للبيهقي: 281/2، ومسند الامام احمد: 427/3، مسند المكيين، حديث ابي اليسر الانصاري، حديث: 15607، قال المنذري في الترغيب رواه النسائي باسناده حسن، واسم ابي اليسر كعب بن عمرو اسلمي شهد بدرا (1هـ). (فضائل اعمال، بابِ سوم، فضائل نماز، ص: 363، كتب خانه فيضي)

[2] سنن ابي داود، كتاب الصلاة، باب ماجاء في نقصان الصلاة حديث: 796، نیز دیکھئے: صحيح ابن حبان: 210/5، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، حديث: 1889

کرے گا تو اس کی نماز بھی مقبول ہو گی اور اس کے تمام اعمال بھی شرفِ قبولیت سے نوازے جائیں گے، اور جس کی نماز ناقابل قبول ہو گی، اس کے تمام اعمال بھی مردود ہو جائیں گے [1]۔

نماز کی رُوح خشوع و خضوع ہے خشوع و خضوع کا اُردو میں آسان ترجمہ یہ ہے کہ نمازی نماز کے دَوران اپنے دِل و دماغ کو حاضر کرکے اور اس یقین کے ساتھ نماز پڑھے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے، نماز کے دَوران اس نمازی پر اور اس کی ہر حرکت کرنے پر اللہ تعالیٰ کی نظر ہے، اس کے ساتھ ساتھ نمازی اپنی نماز میں عاجزی کرے تو اسی کا نام خشوع خضوع ہے، نماز کے دَوران اگر نمازی کا خیال اور اس کا دھیان اِدھر اُدھر جاتا ہے تو یہ نماز جاندار نماز نہیں ہے۔

میں جو سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دِل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

نماز میں اپنا خیال نماز ہی پر رکھنے یعنی دِل کے حضور کیلئے آسان نسخہ، جیسا کہ خود رسول کریم انے فرمایا کہ احسان والا درجہ ہے، فرمایا کہ تم جب عبادت کرو تو اس یقین کے ساتھ عبادت کرو کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، اگر یہ کیفیت حاصل نہ ہو سکے تو اللہ تعالیٰ تو تمہیں ضرور دیکھ رہا ہے [2]۔

امام ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے خشوع و خضوع کے بارے میں فرمایا:

تمہاری حالت اس شخص کی طرح ہونی چاہئے جو اللہ کی طرف خوف وحیاء، خضوع و خشوع، ادب و صفا، اور وفاء کے ساتھ دیکھ رہا ہو، بندۂ مؤمن جب اپنے مولا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے اس عمل (عبادات یا نماز) کو مکمل اخلاص واحسان سے انجام دے، ایسی حالت میں یہ بندہ اللہ کے سوا کسی اور کا خیال نہیں کرتا، اور یہ وہ حالت ہے جسے یوں بیان کیا گیا ہے کہ

---

[1] مسند البزار، حدیث: 349، ومجمع الزوائد: 147/2، کتاب الصلاۃ، باب 203 علامۃ قبول الصلاۃ، حدیث: 2890

[2] أن تعبد اللہ کأنک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک (صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب: 37 سوال جبریل النبي ﷺ، حدیث: 50، وکتاب التفسیر، سورۃ لقمان، حدیث: 4777 وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الایمان والاسلام والاحسان، حدیث: 8- 9)

اللہ کو دیکھے بغیر بھی اس کی صحیح عبادت کیجئے (فان لم تکن تراہ) کا مطلب یہ ہے کہ عبادت کی ادائیگی کے وقت ایسی کیفیت اور ایسا معاملہ اختیار کرو جیسا کہ نگرانی کرنے والے کسی ذمہ دار شخص کے ساتھ تم کرتے ہو، یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے تمام اعمال وافعال اور عبادات کو بحسن وخوبی انجام دو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہا ہے، اور تمہاری نگرانی کر رہا ہے، خلاصہ کلام یہ کہ اگر تمہیں حقیقی اور معنوی رویت (دیدار) نہ بھی حاصل ہو (جو یقینا دنیا میں ان آنکھوں سے حاصل نہیں ہو سکتی) تو بھی عبادت اور ارکانِ عبادت میں ذرہ برابر بھی غفلت، سستی اور کاہلی کا مظاہرہ نہ کرو، کیوں کہ بہر حال اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہا ہے، مذکورہ تمام اقوال کا خلاصہ اور لب لباب اس بات کی طرح توجہ دلانی اور تنبیہ کرنی ہے کہ اعمال میں اخلاص پیدا کریں، اور یہ کہ تمام احوال میں بندہ اپنے ربّ کے سامنے ہوتا ہے [1] ۔

احسان کے بارے میں علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

عبادت میں اخلاص، خشوع، حالت عبادت میں ہر طرف سے یکسو ہو کر معبود کی طرف دھیان لگانا عبادت کا احسان ہے (جبریل ں کے احسان سے متعلق سوال کرنے پر آپ علیہ السلام نے جو جواب ارشاد فرمایا اس) جواب میں دو حالتوں کی جانب اشارہ ہے۔ ان دونوں حالتوں میں اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ بندۂ مؤمن کے قلب میں اللہ تعالیٰ کا ایسا مشاہدہ غالب ہو کہ گویا وہ اپنی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کا دیدار کر رہا ہے۔ اور یہی آپ ا کے ارشاد " کأنک تراہ" کا مطلب ہے کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ یعنی جس طرح وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ دوسری حالت یہ ہے کہ بندۂ مؤمن اس بات کا استحضار و دھیان رکھے کہ اللہ تعالیٰ اس کے تمام حالات سے واقف ہیں اور اس کے تمام اعمال کو دیکھ رہے ہیں، اور یہ دونوں حالتیں اللہ تعالیٰ کی معرفت اور خشیت کا ثمرہ ہیں۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ (عبادت میں) تم مذکورہ آداب کی رعایت اسی وقت کر سکتے ہو جب کہ تم اسے دیکھو گے اور وہ تمہیں دیکھے گا، اس لئے کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے، اس لئے نہیں کہ تم اسے دیکھ رہے ہو وہ تو ہر حال میں تمہیں دیکھ رہا ہے۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے آگے فرمایا کہ حدیث پاک سے ثابت

---

[1] مرقاۃ شرح المشکاۃ: 61/1، کتاب الایمان، الفصل الاول، حدیث: 2کے تحت

ہونے والی یہ مقدار اصول دین میں سے ایک عظیم اصل وبنیاد ہے، اور قواعد اسلام کا ایک اہم قاعدہ ہے۔اور یہ صدیقین کا سرمایہ، سالکین کا مقصود، عارفین کا خزانہ اور صالحین کا شعار ہے۔ یہ حدیث ان جامع کلموں (جوامع الکلم) میں سے ایک ہے جو جنابِ نبی کریم ﷺ کو عطا کئے گئے ہیں۔ اہل علم و تحقیق نے صالحین کی صحبت و ہم نشینی کو مستحسن و مستحب قرار دیا ہے۔ تاکہ صالحین کے احترام اور ان سے حیاء و شرم کی وجہ سے کسی بھی قسم کے نقص اور گناہ کے ارتکاب سے احتراز کر سکے، (جب صالحین اور نیک لوگوں سے شرم وحیاء کرتے ہوئے ایک انسان برائی سے بچ سکتا ہے تو) پھر اس شخص کا کیا کہنا جس کے ظاہر و باطن ہر حال سے اللہ تعالیٰ ہمیشہ مطلع ہے[1]۔

یہی وہ نماز ہے جو رسول کریم ﷺ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اور ہر اہم معاملہ اور مسئلہ میں آپ ﷺ نماز کی طرف رجوع فرماتے تھے، جب بھی کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوتا، فوراً دو رکعت نماز کی نیت باندھ کر اللہ تعالیٰ سے مانگتے اور خوب حمد وثنا بیان فرماتے۔

جب کوئی معاملہ درپیش ہوتا تو نماز پڑھتے[2]۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت بھی اسی ایمانی انداز سے فرمائی کہ اپنے ہر معاملہ میں، چھوٹے سے لے کر بڑے تک، چھوٹا کام ہو یا اہم ترین مشکل مرحلہ، ہر معاملہ میں فوراً اللہ کی طرف رجوع کیا جائے اور دو رکعت نفل پڑھ کر اللہ سے مانگا جائے، ہلکی پھلکی دو رکعت ایمان ویقین سے ادا کی جائیں تو فوراً اس کا اثر اور اس کا نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کس طرح فضل و کرم فرماتا ہے، اور خیر وبرکت کے ایسے دروازے کھلتے دکھائی دیتے ہیں جن کے بارے میں بندہ نے کبھی سوچا تک نہ تھا، دو رکعت نفل پڑھنے پر بمشکل چند منٹ لگتے ہیں، آپ دِن میں ظہر سے پہلے، ظہر کے بعد، مغرب

---

[1] فتح الباری، کتاب الایمان: 120/1، باب سوال جبریل

[2] سنن ابی داود، کتاب التطوع، باب 22 قیام النبي ﷺ من اللیل، حدیث: 1319 امام احمد اور ابو داؤد نے اس روایت کو نقل کیا ہے، شیخ عزیزی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے امام ابوداؤد اس پر ساکت ہے حافظ ابن حجر نے "فتح الباری میں ابوداؤد کی طرف منسوب کرکے باسناد حسن کہا ہے۔

کے بعد، عشاء کے بعد یا کسی بھی وقت یونہی بیٹھے ہیں، فوراً اٹھئے وضو کرکے (بشرطیکہ یہ وقت اوقاتِ مکروہہ میں سے نہ ہو) دو رکعت نفل پڑھ لیجئے، رسول کریم ﷺ ایک بار قبرستان سے گذرے، ایک قبر کے بارے میں پوچھا اور فرمایا: رکعتان أحب الی هذا من بقية دنياكم[1]

"یہ قبر والا دو رکعت کو تم لوگوں کی دنیا (اور دنیا میں جو کچھ بھی ہے، ان سب) سے بہتر اور افضل سمجھتا ہے"۔

یعنی اگر اس قبر والے سے پوچھا جائے تو یہ پکار پکار کر کہے گا کہ لوگو! دو رکعت نماز ساری دنیا اور دنیا کی ساری نعمتوں سے افضل ہے، کیوں کہ اس قبر والے نے علم الیقین، حق الیقین اور عین الیقین سے برزخ کی زندگی کو دیکھ لیا اور یہ بھی دیکھ لیا کہ دنیا کی زندگی میں کی جانے والی یہ آسان اور ہلکی پھلکی نیکی (دو رکعت نفل نماز) کی یہاں کیا قدر و قیمت ہے۔

مگر افسوس کہ دنیا میں رہنے والے لوگ اس حقیقت سے اپنے آپ کو غافل کئے ہوئے ہیں اور یہ لوگ اپنے شب و روز کو نمازوں میں گذارنے کے بجائے کھیل کود اور فضول کاموں میں استعمال کررہے ہیں، نماز وہ اہم نیکی ہے، جس کی برکت سے ایمان پر خاتمہ ہوتا ہے، اور یہ وہ نیکی ہے جو قبر کے عذاب سے بچاتی ہے اور یہی وہ نیکی ہے جو کل قیامت کے پچاس ہزار سال کے برابر والے دن کام آئے گی، آج کے یہ سجدے اور رکوع آج کی یہ نوافل اور آج کی یہ نمازیں قیامت کے دن نور بن کر نمازیوں کی قیادت کرتے ہوئے انہیں جنت لے جائیں گی۔

نماز میں مؤمن کیلئے راحت ہے بلکہ نماز مؤمن کی راحتِ جاں ہے، مؤمن جب ہاتھ باندھ کر اپنے مولا کے سامنے قیام کرتا ہے اور قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے، مؤمن جب طویل قیام، طویل رکوع اور طویل سجدے کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا ایسا قرب پالیتا ہے جو صرف مخصوص مقربین و محبین کا

---

[1] مجمع الزوائد: 2/249، کتاب الصلاۃ، باب 282 أفضل الصلاۃ، حدیث: 3506 و المعجم الاوسط للطبرانی: 1/282، باب الألف من اسمه احمد، حدیث: 920 اس کو مجمع الزوائد نے طبرانی کے حوالہ سے نقل کیا ہے اور فرمایا کہ اس کے رجال ثقات ہیں۔

مقام ہے، نماز، نمازی کے بدن کی زکاۃ ہے کہ بدن صحیح وسالم اور بابرکت بن جاتا ہے، غرضیکہ نماز وہ عمل ہے جو کسی بھی بندے اور کسی بھی بندی کیلئے دنیا وآخرت کی فلاح ونجات کے حصول میں سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

نماز جب جاندار ہوتی ہے تو پھر یہ وہی نماز بن جاتی ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے کہ:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ [1]

بے شک نماز بے حیائی اور بُرائی سے روکتی ہے۔

ہمیں ہماری نمازیں ظلم وزیادتی سے، ناجائز وحرام کمائی سے، گھر والوں کے حقوق، رشتہ داروں کے حقوق، مسلمانوں کے حقوق اور دیگر انسانوں کے حقوق یعنی حقوق العباد کی پامالی سے اور دوسرے مختلف گناہوں سے کیوں نہیں روکتیں؟ اس لئے کہ ہماری نمازیں بے جان ہیں، ہم نماز میں کیا پڑھتے ہیں، اور جو کچھ پڑھتے ہیں اس کا ترجمہ کیا ہے؟ ہم جب کہتے ہیں کہ "سبحان ربی العظیم" تو اس کا کیا معنی ہے؟ جب نمازی نماز کے ہر ہر لفظ کا معنی سمجھے گا اور پھر اس پر خوب غور وفکر کرے گا اور نماز کو مسنون طریقہ پر مکمل عاجزی سے ادا کرے گا تو یہ وہ نماز ہوگی جو نمازی کی حفاظت بھی کرے گی اور نمازی کو گناہوں سے محفوظ بھی رکھے گی، امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث نقل فرمائی ہے جس میں رسول کریم اکا یہ ارشاد ہے کہ:

من لم تنهه صلاته عن الفحشاء والمنكر لم يزدد من الله الا بعدًا [2]

جس شخص کو اس کی نماز بے حیائی اور بُرائیوں سے نہ روکے تو یہ نماز اس کو اللہ سے مزید دور ہی کر سکتی ہے۔

---

[1] سورۃ العنکبوت، آیت: 4

[2] المعجم الكبير للطبراني :46/11 طاوس عن ابن عباس حديث 11025 مجمع الزوائد :2 /258 ' كتاب الصلاة 'باب :289 في من لم تنهه صلاتة عن الفحشاء حديث :3557 ورجاله رجال الصحيح (مجمع الزوائد ج: 2/ص:440)

من لم تنهه صلاته عن الفحشاء والمنكر فلا صلاة له [1]

جس کسی کو اس کی نماز بے حیائی اور بُرائی سے منع نہ کرے اس کی نماز (حقیقی) نماز نہیں ہے

نمازی کو اس کی نماز اس وقت بے حیائی اور بُرائی سے روکتی ہے جب یہ نماز سنت کے مطابق، مکمل خشوع و خضوع سے اور حضور قلب سے پڑھی جاتی ہے، اور نماز کو اہتمام و محبت اور شوق و ذوق سے ادا کیا جاتا ہے نماز سے محبت اور نماز کی پابندی حقیقت میں اسی بلند و بالا مقام کی طرف لے جاتی ہے جو فلاح کے حصول کا ذریعہ ہے۔

مسنون نماز کا طریقہ

فرضیت نماز :

عبادہ بن صامت ص فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ا کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں [2]۔

ابو امامہ ص کہتے ہیں کہ میں نے حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ا کو خطبہ دیتے ہوئے سنا، اس خطبہ کے دوران آپ ا نے ارشاد فرمایا کہ (لوگو!) اس اللہ سے ڈرو جو تم سب کا رب ہے اور اپنے پانچ اوقات کی نمازیں پڑھو، اپنے (رمضان کے) مہینہ کا روزہ رکھو، اپنے مال کی زکاۃ ادا کرو اور اپنے ولی امر (حاکم و سرپرست) کا کہا مانو (جب تم ایسا کروگے تو) تم اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے [3]۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر، سورة العنكبوت، آیت: 45 علامہ ابن کثیر نے اس پر کوئی کلام نہیں کیا ہے اس پر خاموشی اختیار کی ہے۔

[2] سنن ابي داؤد، كتاب الوتر، باب: 2في من لم يوتر حديث:1420، سنن النسائی:230/1، كتاب الصلاة، باب6 المحافظة على الصلوات الخمس، حديث :461، سنن ابن ماجه، كتاب اقامة الصلاة، باب: 194 ماجاء في فرض الصلوات الخمس والمحافظة عليها، حديث:1401

[3] جامع الترمذي، أبواب السفر، باب434 في فضلهاالصلاة، حديث:616، مسند الامام احمد:251/5، مسند الأنصار: حديث أبي أمامة الباهلي الصدي، حديث: 22514، المستدرک :9/1كتاب الايمان، حديث: 19، قال

"رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، نمبر ایک اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، اور یہ کہ محمد (ا) اللہ کے رسول ہیں، دوسرے نماز پڑھنا، تیسرے زکاۃ دینا، چوتھے حج کرنا اور پانچویں رمضان کے مہینہ کے روزے رکھنا[1]"۔

مذکورہ تینوں احادیث مختلف کتب میں مروی ہیں جیسا کہ حوالوں سے معلوم ہوا، دوسری حدیث جو امام ترمذی نے نقل کی ہے اس کے بارے میں حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے مسلم کی شرط کے مطابق ہے، اس میں کسی قسم کا سقم نہیں تاہم شیخین امام بخاری اور امام مسلم نے اسے نقل نہیں کیا ہے۔

نماز کی فرضیت کے سلسلہ میں اور بھی بہت سی احادیث مروی ہیں، عبادتوں میں نماز سب سے اہم عبادت ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ایک موقع پر رسول اللہ انے ارشاد فرمایا کہ:

" قیامت کے دن لوگوں کے اعمال میں سے سب سے پہلے نماز ہی کا حساب ہوگا[2] "

اسی طرح نبی کریم نے فرمایا کہ:

وعمودہ الصلاۃ[3] الخ

" نماز دین کا ستون ہے[1]۔

الحاکم: هٰذا حدیث صحیح علی شرط مسلم ولا نعرف لهعلة ولم يخرجاه.قال ابو عيسى هذا حديث حسن صحيح (ص:130)

[1] صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب 2 دعائکم ایمانکم، حدیث: 8 و کتاب التفسیر، باب 30 قوله: وقاتلوهم الخ، حدیث: 4514، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب 5 بیان أرکان الاسلام، حدیث: 16

[2] سنن ابي داود، كتاب الصلاة، باب144-145 قول النبي ﷺ كل صلاة لا يتمها صاحبها تتم من تطوعه، حديث: 864، وهكذا في سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب: 304 ماجاء في الاجتهاد في الصلاة، حديث: 413، وسنن النسائي، كتاب الصلاة، باب 9 المحاسبة على الصلاة، حديث: 465، وسنن ابن ماجة، كتاب الصلاة، باب: 202 ماجاء في أول ما يحاسب بهالعبد الصلاة، حديث: 1425 قال ابو عيسى هذا حديث حسن غريب من هذاا لوجه

[3] سنن الترمذي، كتاب الايمان، باب 8 ماجاء في حرمة الصلاة، حديث: 2616

ایک دوسری روایت میں ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ نے آگ پر اس بات کو حرام کر دیا ہے کہ سجدہ کی جگہوں کو کھائے، یعنی وہاں آگ کا کچھ اثر نہیں ہوگا[2] "

اسی طرح نماز ترک کرنے کو ایمان کے منافی اور کافرانہ عمل قرار دیا گیا ہے:

"بے شک انسان اور شرک وکفر کے درمیان حد فاصل نماز کا چھوڑنا ہے[3] "

نماز کی حقیقت کے بارے میں مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: " نماز کی حقیقت تین اجزاء سے مرکب ہے: ایک اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی کا تفکر واستحضار، دوسرے چند ایسی دعائیں اور ایسے اذکار جن سے یہ بات ظاہر ہو کہ بندہ کی بندگی اور اس کے اعمال خالص اللہ کے لئے ہیں، اور وہ اپنا رخ یکسوئی کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف کر چکا ہے اور اپنی حاجات میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کی مدد چاہتا ہے اور تیسرے چند تعظیمی افعال جیسے رکوع وسجدہ وغیرہ[4]۔

اور آگے نماز کی چند خصوصیات اور تاثیرات بیان کی ہیں: " اول یہ کہ نماز اہل ایمان کی معراج ہے اور آخرت میں تجلیات الٰہی کے جو نظارے اہل ایمان کو نصیب ہونے والے ہیں ان کی استعداد اور صلاحیت پیدا کرنے کا وہ خاص ذریعہ ہے، دوم یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے حصول کا ذریعہ اور وسیلہ ہے، سوم یہ کہ نماز کی حقیقت جب کسی بندہ کو حاصل ہو جاتی ہے اور اس کی روح پر کیفیت کا غلبہ ہو جاتا ہے تو وہ بندہ گناہوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے، چہارم یہ کہ نماز جب حضورِ قلب اور صدقِ نیت سے پڑھی جائے تو غفلت اور بُرے خیالات ووساوس کے ازالہ کی وہ بہتر اور بے مثل دوا ہے، پنجم

---

[1] شعب الایمان للبیهقي: 1077/3، باب 21 في الصلاة، حدیث: 2807

[2] صحیح البخاری، کتاب الأذان، باب: 129 فضل السجود، حدیث: 806 و 6573 و 7437، وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب 81 معرفة طریق الرؤیة، حدیث: 182

[3] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب 35 بیان اطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلاة، حدیث: 82

[4] حجة اللهالبالغة ،باب: 45 اسرار الصلاة

یہ کہ نماز کو جب پوری امت مسلمہ کے لئے ایک معروف و مقرر رسم اور عمومی وظیفہ بنادیا گیا تو اس کی وجہ سے کفر و شرک اور فسق و گمراہی کی بہت سی تباہ کن رسوم سے حفاظت کا فائدہ بھی حاصل ہوگیا اور مسلمانوں کا وہ ایک ایسا امتیازی شعار اور دینی نشان بن گیا جس سے کافر اور مسلم کو پہچانا جاسکتا ہے۔ ششم یہ کہ طبیعت کو عقل کی رہنمائی کا پابند اور اس کے تابع فرمان بنانے کی مشق کا بہترین ذریعہ یہی نماز کا نظام ہے[1]۔

بے نمازی کا حکم:

نماز نہ پڑھنے والا کافر ہے، یہ اکثر اہل حدیث علمائے کرام کا موقف ہے، جبکہ تمام اہل سنت اور دیگر اہل حدیث حضرات فرماتے ہیں کہ قرآن وحدیث کی رو سے بے نماز مؤمن ہے، کافر نہیں ہے، غیر مقلد احباب کے بڑے عالم شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری صاحب بے نماز کے مؤمن ہونے پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس دعوی کے ثبوت میں بہت سی آیات پیش ہوسکتی ہے مگر ہم ایک آیت پیش کرتے ہیں:

قل لعبادی الذین آمنوا یقیموا الصلوۃ (الآیۃ، پ:13، ع: 17)

اس آیت میں ایماندار قرار دے کر ان کو نماز کا حکم دیا ہے معلوم ہوا کہ نماز ایمان میں داخل نہیں، فرع ہے" (فتاوی ثنائیہ، 465/1)

---

[1] حجۃ اللہ البالغۃ، باب: 45 اسرار الصلاۃ

اسی طرح بہت سے احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بے نماز مؤمن ہے، کافر نہیں۔ چنانچہ غیر مقلد احباب کے فتاوی میں چار احادیث ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: "وغیرہ ذلک من الاحادیث سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تارک الصلوۃ کافر نہیں ہے بلکہ وہ مغفرت الہی وشفاعت نبوی ودخول جنت کا مستحق ہے۔" (فتاوی نذیریہ، 463/1)

باقی رہیں وہ حدیثیں جن میں ترک صلوۃ کو کفر کہا گیا ہے، وہ تہدید شدید پر محمول ہیں۔

مذکورہ بحث سے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ نے جو کچھ لکھا ہے وہ درست ہے، اس پر اعتراض فضول ہے۔

اور یہ بھی ذہن میں رہے کہ جمہور سلف وخلف کا مؤقف بھی یہی ہے کہ بے نماز مؤمن ہی ہے۔ غیر مقلد احباب کے مسلم پیشوا قاضی شوکانی کہتے ہیں: "جو شخص نماز کے وجوب کا عقیدہ رکھ کر بسبب کاہلی اور غفلت کے نماز کو ترک کرے جیسا کہ بہت سے لوگوں کا حال ہے سو ایسے تارک الصلوۃ کے کافر ہونے اور نہ ہونے میں لوگوں کا اختلاف ہے پس امام مالک اور امام شافعی اور جماہیر سلف وخلف کا مذہب یہ ہے کہ ایسا شخص کافر نہیں ہے بلکہ فاسق ہے[1]۔"

نماز معذور:

بخاری شریف میں ہے کہ کھڑے ہو کر اگر نماز پڑھنے کی اگر طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھو، اور حدیث میں ہے کہ بیٹھ کر اگر طاقت نہ ہو تو لیٹ کر اور اگر لیٹ کر بھی نہ طاقت نہ ہو تو اشاروں سے نماز پڑھو۔

---

[1] نیل الاوطار، بحوالہ فتاوی ثنائیہ، 462/1

لیکن اگر باوجود رخصت کوئی شخص عزیمت پر عمل کرے یہ بھی جائز ہے جس طرح ابن عباسؓ نے آنکھوں کی بیماری کی حالت میں سجدہ کیا اور نماز کی خاطر ابن عباسؓ نے اپنی آنکھیں نہ بنوئی، یہ روایت سنن کبری، بیہقی، مستدرک اور حاکم میں باسند موجود ہے، لہٰذا کوئی اشکال کی بات نہیں ہے[1]۔

﴿ غیر مقلد احباب عناوین ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

اوقات نماز

نماز پنجگانہ کے اوقات:

حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی اکرم ﷺ سے نماز کے اوقات پوچھے، آپ نے فرمایا: ان دونوں میں ہمارے ساتھ نماز پڑھو۔ جب سورج کا زوال ہوا تو آپ نے سیدنا بلالؓ کو ظہر کی اذان کہنے کا حکم دیا، پھر اقامت کا حکم دیا اور انہوں نے ظہر کی اقامت کہہ دی۔ پھر عصر کی نماز کا حکم دیا جب سورج بلند، سفید اور صاف تھا، مغرب کی نماز کا حکم دیا جب سورج غروب ہوا۔ عشاء کی نماز کا حکم دیا جب سرخی غائب ہوئی اور فجر کی نماز کا حکم دیا جب فجر طلوع ہوئی (پانچوں نمازوں کو ان کے اول وقتوں میں پڑھایا۔) دوسرے دن سیدنا بلالؓ کو حکم دیا کہ ظہر کی نماز اچھی طرح ٹھنڈی کرو اور عصر کی نماز پڑھی جبکہ سورج بلند تھا اور اس اول وقت سے تاخیر کی جو اس کے لئے پہلے دن تھا۔ مغرب کی نماز شفق سورج کی سرخی غائب ہونے سے پہلے پڑھی اور عشاء کی نماز ایک تہائی رات گزرنے پر پڑھی۔ فجر کی نماز (صبح) روشن کرکے پڑھی (نمازوں کو ان کے آخری اوقات میں پڑھایا) اور پوچھا کہ

---

[1] خون پینا: نبی کریم ﷺ کا مولانا محب اللہ شاہ راشدی اہل حدیث عالم دین تفصیل سے لکھا ہے۔ (مقالات راشدیہ، ج: 1/ص: 211) اور حضرت فرماتے ہیں کہ ابو سعیدؓ کی روایت پر اعتراض غلط ہے اور حسن الاسناد ہے۔

اسی طرح بیہقی شریف اور سنن کبری (67/7) میں عبد اللہ ابن زبیر کی روایت حضرت آسماء بنت ابی بکر اور سلمان فارسی موجود ہے۔ حافظ نور الدین ہیثمی میں بھی موجود ہے کہ رواہ الطبرانی والبزاز ورجال البزاز رجال الصحیح غیر ہنید بن قاسم وہو ثقۃ۔
حافظ شمس الدین ذہبی نے بھی یہی بات ارشاد فرمائی ہے۔

اوقات نماز کا سوال کرنے والا شخص کہاں ہے؟ اس نے عرض کیا کہ میں حاضر ہوں اے اللہ کے رسول ! تو آپ نے فرمایا: تمہاری نمازوں کے اوقات ان دو وقتوں کے درمیان ہیں جس کو تم نے دیکھا[1]۔ [2]

سیدنا عبداللہ بن عمروؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"نماز ظہر کا وقت سورج ڈھلنے سے شروع ہوتا ہے اور اس وقت تک رہتا ہے جب تک آدمی کا سایہ اس کے قد کے برابر نہ ہو جائے (عصر کے وقت تک) اور نماز عصر کا وقت اس وقت تک ہے جب تک آفتاب زرد نہ ہو جائے۔ نماز مغرب کا وقت اس وقت تک ہے جب تک شفق غائب نہ ہو جائے۔ نماز عشاء کا وقت ٹھیک آدھی رات تک ہے۔ اور نماز فجر کا وقت طلوع فجر سے لے کر اس وقت تک ہے جب تک آفتاب طلوع نہ ہو"[3]۔

تبصرہ:

اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم (اہل سنت) غیر مقلد احباب سے ایک سوال کرتے ہیں کہ اس حدیث سے اہلحدیث بزرگوں نے جو مطلب لیا ہے وہ ظاہر ہے کہ انسان کا سایہ جب تک انسان کے برابر نہ ہو جائے تو ظہر کا وقت باقی رہتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ انسان کا سایہ زوال آفتاب کے وقت مختلف علاقوں میں چھوٹا بڑا ہوتا ہے اور مختلف موسموں میں ایک ہی علاقے میں بھی چھوٹا بڑا ہوتا ہے رہتا ہے مثلاً جو علاقے خط استوا پر واقع ہیں ان میں سایہ سارا سال بہت چھوٹا رہتا ہے اور جوں جوں قطبین کی طرف بڑھتے چلے جائیں سایہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک قطبین کے بعض مقامات ایسے ہیں جہاں عین نصف النہار کے وقت بھی ایک تو کیا دو قد کے برابر ہوتا ہے۔ یہ سایہ موسم کے حساب سے بھی تبدیل ہوتا ہے مثال کے طور اگر ماہ جون میں عین نصف النہار کے وقت سایہ چوتھائی قد سے

---

[1] مسلم باب اوقات الصلوات الخمس حدیث 613

[2] غیر مقلد احباب پر لازم ہے کہ وہ سوچیں کہ اس روایت میں اس بات کا ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دونوں وقتوں میں نماز ادا فرمائی جبکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے کوئی نماز آخری وقت میں نہیں پڑھی اس تعارض کو ختم فرمائیں۔

[3] مسلم باب اوقات الصلوات الخمس حدیث 612

کم تھا تو ماہ دسمبر میں یہ سایہ ایک قد یا اس سے زیادہ ہوگا۔ تو پھر اس حدیث سے لئے گئے مطلب کے مطابق ان علاقوں میں ظہر کا وقت کیسے آئے گا؟ یا نماز ظہر وہاں فرض ہی نہیں ہوگی؟۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

نماز فجر اندھیرے میں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز فجر پڑھتے تھے عورتیں {مسجد سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ کر} اپنی چادروں میں لپٹی ہوئی لوٹتیں تو اندھیرے کی وجہ سے پہچانی نہ جاتی تھیں[1]۔

معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اندھیرے میں اول نماز پڑھا کرتے تھے۔ اگرچہ نماز کا وقت صبح صادق سے سورج طلوع ہونے تک ہے لیکن اول پر پڑھنا افضل ہے۔

تبصرہ:

ہم (اہل سنت) کہتے ہیں کہ اس حدیث میں تو صراحت ہیں کہ چادروں میں لپٹی ہوئی ہوتیں۔ جب چادروں میں لپٹی ہوئی ہوتیں تو کیسے پہچانی جاتیں؟۔ اگر آپ حدیث سے یہی مطلب لے رہے ہیں یعنی اندھیرا تو پھر بخاری شریف کے ان احادیث کا کیا کریں گے؟" جب صبح طلوع ہوئی تو آپ {عبد اللہ بن مسعود} نے فرمایا نبی کریم ﷺ اس نماز {نما فجر} کو اس مقام اور اس دن کے سوا کبھی اس وقت {اندھیرے میں} نہیں پڑھتے تھے اور فرمایا یہ دو نمازیں {آج کے دن} اپنے وقت سے ہٹادی جاتی ہے {بخاری کتاب المناسک باب من اذن واقام لکل واحدۃ منہ ما} اسی طرح بخاری میں ابو برزہ اسلمی کی روایت ہے" اور ہم صبح کے نماز سے اس وقت فارغ ہو جاتے تھے۔ جب آدمی اپنے قریب بیٹھے ہوئے دوسرے شخص کو پہچان سکتا" {بخاری باب مواقیت الصلاۃ باب وقت العصر} بلوغ المرام میں رافع بن خدیج کی حدیث ہے" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نماز فجر کو خوب روشن

---

[1] صحیح البخاری الاذان باب انتظار الناس قیام الامام العالم حدیث 867 وصحیح المسلم المساجد باب استحباب التکبیر بالصبح فی اول وقتها حدیث 645

ہونے پر پڑھا کرو یہ تمہارے اجر میں اضافہ کا موجب ہو گی { بلوغ المرام حدیث 134 } ۔ اصحاب سنن خمسہ نے اس کو روایت کیا ہے ترمذی, ابن حبان, ابن حجر اور تمہارے مبارک پوری نے اسے صحیح تسلیم کیا ہے۔

مدرجہ بالا تین احادیث صحیحہ تمہارے دلیل یعنی حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا سے اندھیرا میں لینے کی صورت میں متعارض ہے غیر مقلد احباب اس تعارض کو قرآن و حدیث کی روشنی میں حل فرمائیں۔ مزید برآں کیا بلوغ المرام والی قولی حدیث اس تعارض کو رفع کرنے کے لئے راجح نہیں ہو گی ؟۔

دوسرا تبصرہ یہ ہے کہ { موطا امام مالک مترجم ص: 46 } پر حافظ زبیر مرحوم علی زئی صاحب فرماتے ہیں" معلوم ہوا کہ صحیح حدیث چاہے بخاری و مسلم میں ہو یا سنن رابعہ ومسند احمد وغیرہ میں یا دنیا کی کسی معتبر و مستند کتاب میں صحیح سند سے ہو تو اس پر ایمان لانا اور عمل کرنا فرض ہے۔ اسے ظنی, خبر واحد, مشکوک, اپنے عقل کے خلاف یا خلاف قرآن وغیرہ کہہ کر رد کر دینا باطل مردود اور گمراہی ہے۔ تو ان تین احادیث کو رد کرکے اپنے اصول کی خلاف ورزی درست نہ ہو گی۔

﴿ غیر مقلد احباب دوسری حدیث ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں : ﴾

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نماز اس کے آخری وقت میں نہیں پڑھی یہاں تک کہ اللہ نے آپ کو وفات دیدی[1]۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ نماز اول وقت ادا کرتے تھے۔ البتہ بعض مواقع پر { شرعی عذر کی بنا پر } نماز تاخیر سے بھی ادا کی ہے۔

تبصرہ:

تو ہم (اہل سنت) کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہے کہ کوئی نماز آخری وقت میں نہیں پڑھی یہاں تک کہ اللہ نے آپ کو وفات دیدی اور زیدی صاحب فرماتے ہیں بعض مواقع پر تاخیر

---

[1] بیھقی 1 /435 مستدرک حاکم 190/1 اس کو حاکم اور ذہبی نے صحیح کہا ہے

سے ادا کی ہے۔ حالانکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بات کسی حالت میں جھوٹی نہیں ہو سکتی تو لہذا ان حضرات ہی اپنی بات پر غور فرمائیں۔

﴾ غیر مقلد احباب مزید فرماتے ہیں: ﴿

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اول وقت نماز پڑھنا افضل عمل ہے[1]۔

گرم اور سرد موسموں میں نماز ظہر کے اوقات:

ایک مرتبہ سفر میں گرمی میں سیدنا بلالؓ نے ظہر کی اذان دینی چاہی تو آپ نے فرمایا ٹھنڈا ہو جانے دو ٹھہر جاؤ۔ گرمی کی شدت جہنم کے جوش سے ہے، جب گرمی کی شدت ہو تو نماز ٹھنڈی کر کے پڑھو، وہ کہتے ہیں کہ ہم اس وقت تک ٹھہرے رہے کہ ٹیلوں کے سائے نظر آنے لگے۔[2]

سیدنا ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب گرمی سخت ہو تو نماز ظہر ٹھنڈے وقت میں پڑھو کیونکہ گرمی کی شدت، جہنم کی حرارت اور جوش کے باعث ہے[3]۔

تبصرہ:

ہم (اہل سنت) جوابا عرض کرتے ہیں کہ مسئلہ یہ ہے کہ جب نماز اول وقت میں پڑھنا افضل ہے تو پھر سخت گرمی میں تاخیر کیوں اور اگر بقول آپ کے سفر کے حالت کو ہی تسلیم کر لیا جائے تو رسول اللہ ﷺ کے حیات مبارک کا کافی حصہ سفر میں گزرا جن میں غزوات، عمرہ اور حج کے اسفار شامل ہیں۔ اب سفر میں آپ ہمیشہ نماز ظہر میں تاخیر فرماتے تھے یا نہیں اگر فرماتے تھے تو پھر اول وقت میں نماز پڑھنے والی حدیث کے ساتھ تعارض آ گیا اور اگر اول وقت میں پڑھتے تو آپ کا قول { گرمی میں سفر میں نماز ظہر میں تاخیر کرنا } باطل ہو گیا۔ اگر آپ کے استدلال کے مطابق نماز ظہر میں تاخیر گرمی میں سفر کے ساتھ خاص ہے تو پھر یہ بھی بتائیں کہ آیا آپ کا یہ معمول تھا یا اتفاقا ہوا؟

---

[1] بیہقی 1/ 334 اسے حاکم ابن خزیمہ ابن حبان اور ذہبی نے صحیح کہا ہے

[2] بخاری باب الابراد بالظهر فی السفر حدیث 539، 629

[3] بخاری باب الابراد بالظهر فی شدة الحر حدیث 533 مسلم باب استحباب الابراد بالظهر فی ... حدیث 615

۔اگر معمول تھا تو دوسرے اسفار میں قران وحدیث کی روشنی میں ثابت کریں اور اگر اتفاقا ہوا پھر آپ نے حکم عام کیوں دیا؟۔

﴿ غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں : ﴾

ٹھنڈے وقت کا یہ مطلب نہیں کہ عصر کی نماز کے وقت میں پڑھو بلکہ مراد یہ ہے کہ شدت کی گرمی میں سورج ڈھلتے ہی فورا نہ پڑھو، تھوڑی دیر کرلو۔

تنبیہ : گرمی میں نماز ظہر ٹھنڈی کرکے پڑھو کا تعلق سفر کے ساتھ ہے جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث اور امام بخاری کی تبویب سے ثابت ہوتا ہے[1]۔

تبصرہ:

---

[1] 1اور دوسرا تبصرہ یہ کہ بغیر سفر کے ظہر میں تاخیر ہوئی ہے۔

عن ابی سعید، قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ابردوا بالظھر، فإن شدة الحر من فیح جھنم

حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالی عنہ کا کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ظہر کو ٹھنڈا کر کے پڑھا کرو۔ کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کے جوش کی وجہ سے ہوتی ہے۔

2. انس بن مالک رضی اللہ تعالی عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گرمی میں نماز کو ٹھنڈا کرکے پڑھتے اور سردی میں جلدی کرتے۔

اس حدیث کی صحت کا بیان۔اس کی سندیوں ہے ہمیں خبر دی ہے عبد اللہ بن سعید نے فرمایا کہ ہمیں حدیث بیان کی ابو سعید بنی ہاشم کے غلام نے (جس کا نام عبد الرحمن بن عبد اللہ بصری ہے) فرمایا ہم سے حدیث بیان کی خالد بن دینار نے انہوں نے ابو خلدہ سے انہوں نے فرمایا کہ میں حضرت انس بن مالک سے یہ حدیث سنی۔

عبید اللہ بن سعید وہ یحی بن برد الیشکری کا بیٹا ہے امام نسائی فرماتے ہیں کہ یہ ثقہ ہے مامون ہے بہت کم ہیں وہ لوگ جو اس کی طرح ثقہ ہوں اور اس سے ہم نے حدیث لی ہو اور ابراہیم بن طالب نے کہا ہمارے پاس اس سے زائد اثبت اور اتقن کوئی نہیں آیا (تہذیب ج: 7/ص: 17)

اور عبد الرحمن بن عبد اللہ بن عبید البصری ابو سعید بنی ہاشم کا غلام بخاری کے رجال میں سے ہے اور امام احمد، ابن معین، ابو القاسم طبرانی، بغوی اور دار قطنی نے اس کی توثیق کی ہے، اور ابن شاہین نے اس کو ثقات میں ذکر کیا ہے (تہذیب ج:6/ص:209) اور خالد بن دینار ابو خلدہ البصری بخاری کے رجال میں سے ہے، ابن عبد البر نے کتاب "الکنی" میں فرمایا کہ یہ سب کے ہاں ثقہ ہیں (تہذیب ج: 3/ص: 88)

ہم (اہل سنت) جواباً عرض کرتے ہیں کہ حدیث کو بدلنے کے بجائے خود بدلنا زیادہ بہتر ہے۔ امام بخاری اسی باب سے پہلے عام باب باندھتے ہیں کہ " گرمی کی شدت میں ظہر کو ٹھنڈے وقت میں پڑھنا"۔ اور پھر اس کے بعد باب باندھا" سفر میں ظہر کو ٹھنڈے وقت میں پڑھنا" امام بخاری اپنے ابواب سے سمجھانا چاہتے ہیں کہ یہ حکم جس طرح حضر میں ہے تو اسی طرح سفر میں بھی ہے۔

سیدنا انسؓ سے روایت ہے کہ جب سردی ہوتی تو رسول اللہ ﷺ نماز ظہر پڑھنے میں جلدی کرتے [1] (سورج ڈھلتے ہی پڑھ لیتے)۔

نماز جمعہ کا وقت:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے رویت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی نماز اس وقت پڑھتے جب سورج ڈھل جاتا [2]۔

حضرت سہل بن سعد سے رویت ہے کہ ہم جمعہ پڑھنے کے بعد کھانا کھاتے اور دوپہر کا آرام {قیلولہ} کرتے [3]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ جمعہ کی نماز سردیوں میں جلد پڑھتے اور سخت گرمی میں دیر کرتے [4]

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

نماز عصر کا وقت

---

[1] بخاری باب الابراد بالظھر فی شدۃ الحر حدیث 533 مسلم باب استحباب الابراد بالظھر لمن حدیث 615

[2] بخاری باب وقت الجمعۃ حدیث 904

[3] بخاری الجمعۃ باب قولہتعالی {فاذا قضیت الصلوۃ} الجمعۃ 62 /10 حدیث 939 ومسلم الجمعۃ باب صلوۃ الجمعۃ حین نزول الشمس حدیث 859

[4] بخاری الجمعۃ باب اذا اشتد الحر یوم الجمعۃ حدیث 906

حضرت بریدہ رضی للہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عصر قائم کی حالانکہ آفتاب بلند سفید اور صاف تھا[1]۔

تبصرہ:

ہم (اہل سنت) تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اس حدیث سے جو مطلب لیا جاتا ہے اس کو ترمذی شریف کی یہ حدیث " رسول اللہ ﷺ نماز ظہر میں تم لوگوں سے زیادہ جلدی کیا کرتے تھے اور تم لوگ نماز عصر میں آپ ﷺ سے زیادہ جلدی کرتے ہو" {کتاب الصلوة باب ماجاء فی تاخیر الصلاة العصر} رد کر رہی ہے۔ مزید برآں بخاری شریف کی حدیث" سالم بن عبد اللہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں آپ نے رسول اللہ ﷺ سے سنا فرماتے تھے کہ تم سے پہلے امتوں کے مقابلے میں تمہاری زندگی ہے جتنا عصر سے سورج غروب ہونے کا وقت ہوتا ہے تورات والوں (یہودیوں) کو رات دی گئی تو انہوں نے اس پر عمل کیا ان لوگوں کو ان کے اعمال کا بدلہ ایک قیراط دیا گیا، پھر انجیل والوں کو انجیل دی گئی انہوں نے عصر تک عمل کیا اور عاجز آگئے انہیں بھی ایک قیراط کا بدلہ دیا گیا پھر {عصر کے وقت} ہمیں قرآن دیا گیا ہم نے اس پر سورج غروب ہونے تک عمل کیا ہمیں دو قیراط ملے {کتاب الصلوة باب ماجاء فی تاخیر الصلاۃ العصر} قارئین کرام گرمی کے موسم میں ان اہل حدیث بزرگوں کا عصر سے مغرب کا وقت ظہر سے عصر تک کے وقت سے بڑھ جاتا ہے اس صورت حال میں یہ بزرگان دین اس روایت کا نہ جانے کیا حشر کریں گے اس روایت میں صبح سے زوال تک کے وقت کو سب سے لمبا وقت اور پھر عصر سے مغرب کو سب سے کم کہا گیا ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں: ﴾

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی علیہ وسلم نماز عصر پڑھتے تھے اور آفتاب بلند {زردی کے بغیر روشن} ہوتا تھا اگر کوئی شخص نماز عصر کے بعد مدینہ شہر سے عوالی

[1] مسلم المساجد باب اوقات الصلوات الخمس حدیث 613

{ مدینے کی نواحی بستیاں } جاتا تو جب ان کے پاس پہنچتا تو سورج ابھی بلند ہوتا[1] ۔ { بعض عوالی مدینے سے چار کوس کے فاصلہ پر واقع ہیں }

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علی وسلم نے فرمایا: منافق کا نماز عصر یہ ہے کہ وہ بیٹھا آفتاب { کے زرد ہونے } کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ زرد ہو جاتا ہے۔ اور شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہو جاتا ہے۔ تو وہ نماز کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے اور چار ٹھونگیں مارتا ہے اور اس میں اللہ کو نہیں یاد کرتا مگر تھوڑا[2]

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

نماز مغرب کا وقت:

حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ آفتاب غروب ہوتے ہی مغرب کی نماز ادا کرلیا کرتے تھے[3]۔[4]

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

نماز عشاء کا وقت:

---

[1] بخاری مواقیت الصلاۃ باب وقت العصر حدیث 550 ومسلم المساجد باب استحباب التکبیر بالعصر حدیث 621

[2] صحیح مسلم المساجد باب استحباب التکبیر بالعصر حدیث 622

[3] بخاری مواقیت الصلوۃ باب وقت المغرب حدیث 461

[4] **تبصرہ:** اسی کتاب { نماز نبوی قدیم ص: 216 } پر تین احادیث دی ہیں جن سے یہ ثابت کیا ہے کہ مغرب سے پہلے دو رکعت نماز نفل اور عنوان یوں قائم کیا ہے" مغرب سے پہلے دو رکعتیں" اب مسئلہ یہ ہے کہ اگر اذان کے بعد دو رکعت پڑھیں گے تو پہلی حدیث پر عمل نہیں ہو سکتا کیونکہ وہاں فورا کی بات ہے اور اگر فورا مغرب کی نماز پڑھیں تو دو نفل نہیں پڑھے جا سکتے اس تعارض کو بزرگان دین کیسے حل کریں گے اور ان نفلوں کا حکم بھی نہیں لکھا ہے بخاری میں تو ہے کہ مکروہ ہے کہ کوئی مغرب سے پہلے نفل کو سنت پکڑے "کراھیة ان تتخذھا الناس سنة "۔

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک رات ہم رسول اللہ ﷺ کا نماز عشاء کے لئے انتظار کرتے رہے۔جب تہائی رات یا اس سے کچھ زیادہ گزر گئی تو آپ تشریف لائے اور فرمایا؛تم ایسی نماز کا انتظار کر رہے ہو جس کا تمہارے سوا کسی مذہب والے انتظار نہیں کر رہے ہیں،اگر میری امت پر گراں نہ ہوتا تو میں ہمیشہ اسی وقت عشاء کی نماز پڑھاتا۔پھر آپ نے موذن کو حکم دیا تو اس نے تکبیر کہی اور آپ نے نماز پڑھائی۔[1]

رسول اللہ ﷺ نماز عشاء سے پہلے سونا اور نماز عشاء کے بعد گفتگو کرنا ناپسند فرماتے تھے۔[2]

نبی اکرم ﷺ عشاء میں کبھی تاخیر فرماتے اور کبھی اسے اول وقت پڑھتے،جب لوگ اول وقت جمع ہوتے تو جلد پڑھتے اور اگر لوگ دیر سے آتے تو آپ دیر کرتے[3]۔

تبصرہ:

ہم (اہل سنت) تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اس سے پہلے {نماز نبوی قدیم ص:93} پر حدیث لائے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے کوئی نماز اپنے آخری وقت میں نہیں پڑھی یہاں تک کہ آپ کو اللہ تعالی نے وفات دیدی۔اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے غیر مقلد بزرگوں نے اول وقت نماز پڑھنے کا فتوی دیا تھا۔اب یہاں آدھی رات یعنی آخری وقت اور لوگوں کے انتظار میں دیر کرنے کے احادیث لائے جو کہ حدث عائشہ {آپ کے استدلال کے مطابق} سے متعارض ہیں۔حدیث عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا موجبہ کلیہ ہے اور عنوان عشاء کے تحت دی گئی احادیث سالبہ جزئیہ ہیں اور قانون یہ ہے کہ موجبہ کلیہ کا توڑ جس سالبہ کلیہ سے ہوتا ہے اسی طرح سالبہ جزئیہ سے بھی ہوتا ہے اس لئے اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے دوسری پر عمل نہیں ہوسکتا۔

---

[1] مسلم باب وقت العشاء وتاخیر ھا حدیث 639

[2] بخاری باب مایکرہ من النوم قبل العشاء حدیث 568

[3] مسلم باب استحباب التکبیر بالصبح حدیث 646

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

ائمہ مساجد کو نماز اول وقت میں پڑھانی چاہئے :

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : تیرا کیا حال ہوگا جس وقت تجھ پر ایسے امام { حاکم } ہوں گے جو نماز میں دیر کریں گے یا اس کے وقت سے قضا کریں گے ؟ میں نے کہا کہ آپ مجھے اس حال میں کیا حکم فرماتے ہیں ؟ آپ نے فرمایا : نماز کو اس کے وقت پر پڑھ پھر اگر تو اس نماز { کی جماعت } کو ان کے ساتھ پالے تو { ان کے ساتھ } دوبارہ نماز پڑھ لے تحقیق یہ نماز تیرے لئے نفل ہوگی۔

تبصرہ :

ہم تبصرہ کرتے ہیں کہ اس عنوان "ائمہ مساجد کو نماز اول وقت میں پڑھانی چاہیئے " کے مذکورہ احادیث کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں ہے کیونکہ دونوں حدیثوں میں وقت سے تاخیر کی بات ہو رہی ہے یہ حضرات خوامخواہ اس سے اول وقت میں نماز پڑھنے والی بات کو کشید کرنا چاہتے ہیں۔ دونوں حدیثوں میں نماز کو وقت سے مؤخر کرنے یا قضا کرنے کی قباحت کو بیان کیا گیا ہے۔ اور نماز کو اپنے وقت کے اندر پڑھنا قباحت نہیں ہے۔ گویا ان حضرات کے ہاں نماز کو اپنے وقت کے اندر اول وقت سے کچھ بھی تاخیر کرکے پڑھنا ایک قبیح عمل ہے۔ یہ بات نہ صرف ان احادیث مبارکہ بلکہ پورے ذخیرۂ حدیث کے خلاف ہے۔ ائمہ مجتہدین پر الزامات لگا کر خود محقق بننے کے نتائج ہیں۔ ظہر اور عشاء میں تاخیر کو تو خود اسی باب میں ثابت کر چکے ہیں۔

﴿ غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں : ﴾

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : تحقیق تم پر میرے بعد ایسے امام ہوں گے جن کو بعض چیزیں وقت پر نماز پڑھنے سے باز رکھیں گیں۔ یہاں تک کہ اس کا وقت جاتا رہے گا پس نماز وقت پر پڑھو { اگرچہ تنہا پڑھنی پڑے } پھر ایک

شخص بولا۔ اے اللہ کے رسول {صلی اللہ علیہ وسلم} میں ان کے ساتھ بھی نماز پڑھوں؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔

﴿ اہل سنت عناوین ذیل کے تحت فرماتے ہیں: ﴾

اوقات نماز

فجر کا وقت:

نماز فجر کا وقت طلوع صبح صادق سے طلوع آفتاب تک ہے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد فرماتے ہیں:

عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ ﷺ: ووقت صلوۃ الصبح من طلوع الفجر مالم تطلع الشمس [1]

نماز صبح کا وقت طلوع صبح صادق سے اس وقت تک ہے جب تک سورج طلوع نہ ہو۔

دوسری حدیث میں حضور ﷺ فرماتے ہیں:

ولا الفجر المستطیل ولکن الفجر المستطیر فی الافق [2]

صبح کاذب تمہیں دھوکہ میں نہ ڈال دے صبح صادق تو افق میں ہوتی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا نماز فجر کا وقت طلوع صبح صادق سے شروع ہوتا ہے نہ کہ طلوع صبح کاذب سے۔ صبح کاذب کا اجالا طول میں پھیلا ہوا ہوتا ہے اس کے بعد اندھیرا چھا جاتا ہے پھر صبح صادق نمودار ہوتی ہے اور اس کا اجالا افق کی جانب عرض میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔

ظہر کا وقت:

---

[1] مسلم ج: 1 / ص: 223

[2] ترمذی ج: 1/ ص: 88 , مسلم ج: 1/ ص: 350 .

ظہر کے وقت کی ابتدا زوال کے بعد سے ہوتی ہے اور اس کا آخری وقت عصر تک ہے۔ اور عصر کے وقت کی ابتدا اس وقت ہوتی ہے جب ہر چیز کا سایہ (سایہ اصلی کے علاوہ [1]) دو مثل ہو جائے۔

عن عبد اللہ عمر قال قال رسول اللہ ﷺ: وقت الظھر اذا زالت الشمس و کان الظل الرجل کطولہ مالم یحضر العصر [2].

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ظہر کا وقت اس وقت سے ہے جب سورج ڈھل جائے اور آدمی کا سایہ اس کے قد کے برابر ہو جائے جب تک عصر کا وقت نہ آئے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ظہر کا وقت زوال کے بعد شروع ہوتا ہے مگر زوال کے فورا بعد پڑھنی بہتر نہیں ہے بلکہ مؤخر کرکے پڑھنی ہے کیونکہ حدیث میں صراحت ہے کہ زوال کے بعد جب آدمی کا سایہ اس کے قد کے برابر ہو جائے اور سایہ قد کے برابر زوال کے فورا بعد نہیں ہوتا۔

عبد اللہ بن رافع جو کہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ کے غلام ہیں، اس نے حضرت ابوہریرہ سے نماز کے وقت کے بارے میں سوال کیا، ابوہریرہ نے جواب دیا، سنو! ظہر کی نماز اس وقت پڑھو جب تمہارا سایہ تمہارے مثل ہو جائے اور عصر اس وقت پڑھو جب تمہارا سایہ تمہارے دو مثل ہو جائے [3]۔

حضرت ابوذر غفاری سے مروی ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے، مؤذن نے ارادہ کیا کہ ظہر کی اذان دے، حضور ﷺ نے فرمایا ٹھنڈ ہونے دو (کچھ دیر بعد) پھر اذان کا ارادہ کیا، حضور ﷺ نے پھر فرمایا ٹھنڈ ہونے دو یہاں تک ہمیں ٹیلوں کے سائے نظر آنے لگے

---

[1] سایہ اصلی کے علاوہ کی قید اس لئے لگائی ہے کہ جہاں کہیں بھی ایک مثل یا دو مثل کا ذکر ہوتا ہے، وہاں سایہ اصلی کی قید بہر حال موجود ہوتی ہے کیونکہ سایہ زوال کے بعد بڑھنا شروع ہوتا ہے اور زوال کے وقت جو سایہ ہوتا ہے وہی سایہ اصلی کہلاتا ہے [1] {نووی علی المسلم ج: 1/ ص: 224}۔

[2] مسلم ج ص. 223، اعلاء السنن 118/220

[3] موطا امام م... ص: 4 و اسنادہ صحیح (آثار السنن ج: 2/ ص: 11)

، حضور ﷺ نے فرمایا گرمی کی شدت جہنم کی سانس لینے کی وجہ سے ہے، جب گرمی سخت ہو تو نماز ٹھنڈے وقت میں پڑھا کرو[1]۔

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب دن گرم ہو تو نماز کو ٹھنڈے وقت میں پڑھو اس لئے کہ گرمی کی شدت جہنم کی سانس لینے کی وجہ سے ہے[2]۔

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب گرمی ہو تو نماز ٹھنڈے وقت میں پڑھو، اس لئے کہ گرمی کی شدت جہنم کے سانس لینے سے ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ جہنم نے اپنے پروردگار سے شکایت کی تو اسے سال میں دو مرتبہ سانس لینے کی اجازت دی گئی ایک جاڑے میں ایک گرمی میں[3]۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جہنم نے کہا اے میرے پروردگار! میرے بعض حصوں نے بعض کو کھالیا ہے، مجھے سانس لینے کی اجازت مرحمت فرما۔ چنانچہ اسے دو مرتبہ سانس لینے کی اجازت دی گئی۔ ایک سانس جاڑے میں ایک سانس گرمی میں۔ پس تم جو سردی اور گرمی محسوس کرتے ہو وہ جہنم کی سانس لینے کی وجہ سے اور گرمی کی تپش محسوس کرتے ہو وہ بھی جہنم کے سانس لینے سے ہے[4]۔

یہ احادیث بخاری و مسلم بلکہ صحاح ستہ کے دیگر کتب ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کے علاوہ بہت سی کتب حدیث میں موجود ہیں۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ گرمی کے موسم میں ظہر کو ٹھنڈے وقت میں پڑھنے کا حکم دیا جارہا ہے، دوسری طرف موسم گرما میں یہ ٹھنڈا وقت وای وقت آتا ہے جب کہ ہر چیز کا سایہ ایک مثل ہو جائے، خاص طور پر عرب جیسے گرم علاقے میں۔

---

[1] بخاری ج:1 / ص:87، مسلم ج:1/ص:224.

[2] مسلم ج:1/ص:4؛ ؛

[3] مسلم ج:1 / ص:224

[4] مسلم ج:1 / ص:224

اس کے علاوہ موطا امام مالک { ص: 4 } کی روایت میں حضرت ابوہریرہؓ نے عبد اللہ بن رافعؒ سے کہا تھا: صل الظهر اذا كان ظلك مثلك والعصر اذا كان ظلك مثليك[1].

ظہر اس قت پڑھو جب آپ کا سایہ آپ کے مثل ہو جائے اور عصر پڑھو جب آپ کا سایہ آپ کے دو مثل ہو جائے۔

یہاں بھی حضرت ابوہریرہ جس وقت میں نماز ظہر پڑھنے کا حکم دے رہے ہیں وہ مثل واحد کے قائلین کے نزدیک اختتام ظہر ہے نہ کہ وقت ظہر۔

ترمذی میں امام جبریل علیہ السلام والی روایت میں ہے کہ دوسرے دن جبریل علیہ السلام نے ظہر کی نماز ہر چیز کا سایہ ایک مثل ہو جانے کے بعد پڑھائی :

وصلى المرة الثانية الظهر حين كان ظل كل شئ مثله[2].

ظاہر ہے کہ دوسری دن کی نماز ظہر مثل ثانی میں ہوئی. اس سے صاف پتہ چلا کہ ظہر کا وقت ایک مثل پر ختم نہیں ہوتا بلکہ ایک ختم ہو جانے کے بعد بھی رہتا ہے۔ اور اس وقت تک رہتا ہے جب تک ہر چیز کا سایہ دو مثل نہ ہو جائے جیسا کہ موطا امام مالک کی مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوا۔

بہر حال ان احادیث کا بدیہی تقاضا ہے کہ مثل واحد پر وقت ظہر کو ختم نہ کہا جائے بلکہ مثلین تک مانا جائے۔ بہتر یہ ہے کہ نماز ظہر مثل واحد تک پڑھ لی جائے اور نماز عصر مثلین سے قبل نہ پڑھی جائے تاکہ دونوں نمازوں میں احتیاط کے پہلو پر عمل ہو جائے۔

عصر کا وقت :

ظہر کا وقت ختم ہوتے ہی عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے اور غروب آفتاب تک رہتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے :

---

[1] رواہ مالک فی "الموطا" واسنادہ صحیح آثار السنن (ج: 1/ص: 42)

[2] ترمذی ج: 1 / ص: 21

من ادرك ركعة من العصر قبل ان تغرب الشمس فقد ادرك العصر [1].

جس نے عصر کی ایک رکعت سورج غروب ہونے سے پہلے پالی اس نے عصر پالی۔

حضرت علی سے مروی ہے:

غزوہ احزاب کے دن رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ کفار کے قبروں اور گھروں کو آگ سے بھر دے جیسے انہوں نے ہمیں صلوۃ وسطی نہیں پڑھنے دی، یہاں تک سورج غروب ہو گیا۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ انہوں نے ہمیں صلوۃ الوسطی یعنی نماز عصر نہیں پڑھنے دی[2]۔

مغرب کا وقت:

نماز مغرب کا وقت سورج ڈوبنے سے شروع ہوتا ہے اور شفق ابیض کے غائب ہونے تک رہتا ہے۔

ووقت صلوة المغرب مالم يغب الشفق [3].

مغرب کا وقت اس وقت تک ہے جب تک شفق غائب نہ ہو۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک باعتبار ظاہر الروایہ شفق سے مراد شفق ابیض ہے یعنی وہ سفیدی جو سرخی کے بعد نمایاں ہوتی ہے، پس سفیدی کے بعد جب تک سیاہی نہ آجائے اس وقت مغرب کا وقت باقی رہے گا اور عشاء کی نماز جائز نہ ہو گی، صحابہ میں سے حضرت ابو بکرؓ، حضرت انسؓ، حضرت معاذؓ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، اور حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کا یہی مذہب ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہؓ وابن عباسؓ سے بھی ایک روایت یہی ہے، نیز عمر بن عبد العزیز، امام اوزاعی، امام زفر، امام مزنی، ابن المنذر، خطابی، محمد بن یحی اور داؤد رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔ اہل لغت کی ایک

---

[1] بخاری ج:1/ص:82، مسلم ج:1/ص:221

[2] بخاری ج:2/ص:590، مسلم ج:1/ص:226

[3] مسلم ج:1/ ص:223 عن ابن عمر

جماعت جس میں امام فراء، مبرد اور مازنی بھی ہیں اس کو اختیار کیا ہے۔ شیخ بن نجیم مصری فرماتے ہیں کہ شفق کا لفظ بیاض کے زیادہ مناسب ہے کیونکہ شفق رقت سے عبارت، کہا جاتا ہے "ثوب شفیق بمعنی جامہ رقیق، اسی سے شفقۃ بمعنی رقت القلب ہے۔

اصل دلائل یہ ہیں (1) حدیث ابو داؤد کہ " حضرت جبرئیل علیہ السلام نے نزول کیا اور فرمایا کہ عشاء کی نماز کا وقت وہ ہے جب شفق سیاہ ہو جائے " اس حدیث کو ابن حبان نے بھی اپنے صحیح میں روایت کیا ہے۔ (2) حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "رسول اللہ ﷺ عشاء کی نماز اس وقت پڑھتے تھے جب تیسری تاریخ کا چاند ساقط ہو جاتا تھا" (ابو داؤد، نسائی، احمد) (3) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا "متی اصلی العشاء؟ کہ میں عشاء کی نماز کب پڑھوں تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا متی اسود الافق کہ جب افق سیاہ ہو جائے " ظاہر ہے کہ افق کا سیاہ ہونا سفیدی کے بعد ہی ہوتا ہے۔ (4) صحیح روایت سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے نماز مغرب میں سورہ اعراف پڑھی، ظاہر ہے کہ اتنی بڑی سورت اگر قراءت مسنونہ کے مطابق پڑھی جائے تو نماز سفیدی تک ہی ختم ہو سکتی ہے۔ (5) امام مسلم کی روایت ہے کہ "وقت صلوۃ المغرب مالم یسقط نور الشفق" اس حدیث بھی یہی ثابت ہوتا ہے کیونکہ نور کا اطلاق بیاض پر ہی ہوتا ہے نہ کہ سرخی پر۔

شیخ ابن نجیم مصری فرماتے ہیں کہ صحیح اور مفتی بہ قول امام اعظم ابو حنیفہؒ کا ہی ہے، محقق ابن الہمام نے بھی فتح القدیر میں امام صاحب ہی کے قول کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ شفق کو حمرۃ کہنا نہ امام صاحب کی روایت سے ثابت ہے نہ درایت سے، اول تو اس لئے کہ یہ امام صاحب سے ظاہر الروایۃ کے خلاف ہے، اور ثانی اس لئے کہ محمد بن فضیل کی روایت کے ذیل میں گزر چکا ہے کہ مغرب کا آخری وقت افق غائب ہونے تک ہے، اور ظاہر ہے کہ افق کا غائب ہونا سفیدی چلے جانے کے بعد ہی ہوگا، شیخ کے شاگرد قاسم بن قطلوبغا نے بھی تصحیح القدوری میں امام صاحب ہی کے قول کو ترجیح دی اور اسی کو اصح کہا ہے نوح آفندی کہتے ہیں کہ امام صاحب کے قول کو اختیار کرنا ہی احوط ہے۔

عن سلمة بن اکوع ان رسول الله ﷺ کان یصلي المغرب اذا غربت الشمس وتوارت بالحجاب[1].

سلمہ بن اکوع سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز مغرب اس وقت ادار کرتے جب سورج ڈوب جاتا اور پردے میں چھپ جاتا۔

عبد اللہ بن مسعود ؓ کی روایت میں ہے:

یصلی المغرب حین تسقط الشمس ویصلی العشاء یسود الافق وربما یؤخرھا حتی یجتمع الناس[2]

نماز پڑھتے جب سورج ڈوب جاتا اور عشاء پڑھتے جب افق پر سیاہی پھیل جاتی اور کبھی اس کو مؤخر بھی کرتے یہاں تک لوگ جمع ہو جاتے۔

بالاتفاق عشاء کا وقت مغرب کے وقت ختم ہونے سے شروع ہوتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ افق کا سیاہ ہو جانا شفق ابیض کے بعد ہی ہوتا ہے کیونکہ شفق احمر کے بعد شفق ابیض طلوع ہوتی ہے اور شفق ابیض کے بعد رات کی سیاہی پھیلنے لگتی ہے۔

عشاء کا وقت:

مغرب کا وقت ختم ہوتے ہی عشاء کا وقت آ جاتا ہے اور طلوع صبح صادق تک رہتا ہے۔ امامت جبریل علیہ السلام والی حدیث میں ہے:

وصلي بي العشاء حين غاب الشفق[3].

مجھے عشاء پڑھائی جب شفق غائب ہو گئی۔

نافع بن جبیر سے مروی ہے کہ حضرت عمر ؓ نے ابو موسی اشعری ؓ کی جانب خط لکھا اور اس میں فرمایا: وصل العشاء ای اللیل شئت ولا تغفلھا[1]۔

---

[1] بخاری ج: 1 /ص: 79 مسلم ج: 1/ص: 228

[2] ابوداؤد ج: 1/ص: 72

[3] ابوداؤد ج: 1/ص: 71

عشاء پڑھو رات کے جس حصے میں چاہو اور اس سے غافل مت رہو۔

عبید بن جریج سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت ابوہریرہ ؓ سے پوچھا کہ ماافراط صلوۃ العشاء ؟ کہ عشاء کا آخری وقت کیا ہے ؟ حضرت ابوہریرہ ؓ نے جواب دیا طلوع الفجر صبح صادق کا طلوع [2].

وتر کا آخری وقت :

عشاء کی نماز کے بعد وتر پڑھی جاتی ہے۔ وتر کے متعلق خارجہ بن حذافہ فرماتے ہیں :

قال خرج علینا رسول الله ﷺ فقال : ان الله امرکم بصلوة هي خير لكم من حمر النعم وهي الوتر فجعلها لكم في مابين العشاء الي طلوع الفجر [3].

فرمایا رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا اللہ نے تم لوگوں کو ایک ایسی نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے، جو سرخ اونٹوں سے بہتر ہے اور وہ وتر ہے، پس اسے بنایا ہے، تمہارے لئے عشاء اور طلوع صبح صادق کے درمیان۔

مستحب اوقات

یہاں تک نماز پنجگانہ کے ابتدائی اور انتہائی اوقات بیان کیے گئے۔ اب یہاں سے اہل سنت محدثین فقہاء کے نزدیک ان اوقات کو بیان کیا جارہا ہے جن میں نماز پڑھنا مستحب اور افضل ہے۔

فجر کا مستحب وقت :

---

[1] شرح معانی الآثار ج : 1/ص : 78 نافع بن جبیر ثقة فاضل حاشیہ طحاوی (ص : 93)، رواہ الطحاوی، ورجالہ ثقات (آثار السنن، 44/1) اعلاء السنن، 19/2)

[2] شرح معانی الآثار ج : 1/ص : 78، رواہ الطحاوی، واسنادہ صحیح (آثار السنن، ص : 71)

[3] ابوداؤد ج : 1 /ص : 218. ترمذی ج : 1 /ص : 40 ، ابن ماجہ ص : 83، هذا حديث صحيح الاسناد ولم يخرجاه، رواته مدنيون ومصريون ولم يتركاه الا لما قدمت ذكره من تفود التابعي عن الصحابي (مستدرک، ج : 1/ص : 416)

نماز فجر کا مستحب وقت یہ ہے کہ اسفار کرکے پڑھی جائے۔ یعنی ایسے وقت میں شروع ہو کہ روشنی خوب پھیل جائے۔ لیکن اتنا وقت ضرور ہو کہ اگر خدا نخواستہ نماز کو دہرانا پڑ جائے تو طلوع آفتاب سے پہلے مستحب طریقے سے دہرایا جاسکے۔

عن رافع بن خدیج قال سمعت رسول الله ﷺ یقول: اسفروا بالفجر فانہ اعظم الاجر[1].

رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: فجر میں خوب اجالا کرو اس لئے کہ وہ اجر کے اعتبار سے بڑھا ہوا ہے۔

نسائی شریف میں ہے: مااسفرتم بالصبح فانہ اعظم الاجر[2].

تم صبح کی نماز میں جس قدر اسفار کروگے وہ اجر کے اعتبار سے بڑا ہے۔

ابن ماجہ اور ابوداؤد میں ہے: اصبحوا بالصبح فانہ اعظم لاجورکم اولاجرکم[3].

صبح کی نماز خوب صبح کرکے پڑھو کیونکہ یہ چیز تمہارے لئے اجر و ثواب کے اعتبار سے بڑی ہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

نور بصلاۃ الصبح حتی یبصر القوم مواقع نبلھم من الاسفار.

صبح کی نماز روشنی میں پڑھو یہاں تک کہ لوگ اجالے کی وجہ سے تیر اندازی کے نشانہ کو دیکھ لیں[4].

ظہر کا مستحب وقت:

---

[1] ترمذي ج:1/ص:22 وقال هذ حديث حسن صحيح واللفظ لابن حبان في صحيحه . ورواه البزار ورجاله ثقات (اعلاء السنن ج: 2/ص:22)

[2] ج:1 /ص:94 باب الاسفار وسكت عنه ، وصحح سند الحافظ الزيلعي (علاء السنن ج: 2/ص:25)

[3] ابن ماجه ص:49 ,ابوداؤد ج:1 /ص:76 ورواه ابن ابي حاتم ابن عدي والطيالسي واسحاق وابن ابي شيبة والطبراني واسناده حسن (اعلاء السنن ج:2/ص:27)

[4] ج:1/ص:321، ورواه ابن ابي حاتم، وابن عدی، والطیالسی واسحاق والطبرانی واسناده حسن ، آثار السنن 27 /2،147/10

گرمی کے موسم میں نماز ظہر میں تاخیر اور سردی کی موسم میں تعجیل افضل ہے. جیسا کہ گرمی میں نماز ظہر پڑھنے کے متعلق بخاری و مسلم کے روایات گزر چکی ہے۔

فاذا اشتد الحر فابردوا بالصلوۃ[1].

جب گرمی سخت ہو تو نماز ٹھنڈے وقت میں پڑھو۔

اسی طرح مسلم کی روایت: اذا کان الیوم الحار فابردوا بالصلوۃ فان شدۃ الحر من فیح جھنم[2].

جب گرم دن ہو تو نماز ٹھنڈے وقت میں پڑھو اس لئے کہ گرمی کی شدت جہنم کے سانس لینے سے ہے۔

اور سردی کے موسم میں نماز ظہر جلدی پڑھنے کے متعلق حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

عن انس قال: کان رسول اللہ ﷺ اذا کان الحر ابرد بالصلوۃ واذا کان البرد عجل[3].

حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ گرمی کے موسم میں نماز ٹھنڈے وقت میں پڑھتے اور سردی میں جلدی پڑھتے۔

عصر کا مستحب وقت:

عصر میں تاخیر مستحب ہے۔

حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں: کہ رسول اللہ ﷺ آپ سے ظہر میں زیادہ جلدی کرنے والے تھے، اور تم ان سے عصر میں زیادہ جلدی کرنے والے ہو[4]۔

ابراہیم نخعیؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ جو تم سے پہلے تھے وہ ظہر میں زیادہ جلدی کرتے تھے اور عصر میں زیادہ تاخیر کرتے تھے[1]۔

---

[1] بخاری ج: 1 / ص: 77 ، مسلم ج: 1 / ص: 224

[2] مسلم ج: 1 / ص: 224

[3] نسائی ج: 1 / ص: 87 ، بخاری ج: 1 / ص: 124 ورجالہ ثقات من رجال الصحیح. (اعلاء السنن ج: 2 / ص: 40)

[4] رواہ احمد والترمذي ,اسنادہ صحیح {آثار السنن ج:1 /ص:44 ,الجوهر النقي ج:1 /ص:112 }رجالہ علی شرط الصحیح {إعلاء السنن ج 2 /ص:42}

عبدالرحمٰن بن یزید سے روایت ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ عصر کو مؤخر کرتے تھے [2]۔

تنبیہ: لیکن اتنی تاخیر نہ ہو کے اصفرار شمس {سورج زرد} ہو جائے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ منافق کی نماز یہ ہے کہ وہ بیٹھا انتظار کرتا رہتا ہے یہاں تک سورج پیلا پڑنے لگتا ہے، اور غروب کے قریب ہوتا ہے، تو اٹھ کر جلدی جلدی چار چونچیں مار لیتا ہے اور نہیں یاد کرتا اللہ کو اس میں مگر بہت کم [3]۔

مغرب کا مستحب وقت:

نماز مغرب کا مستحب وقت سورج ڈوبنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔

عن ابي ايوب قال: قال رسول الله ﷺ: لايزال امتي بخير او قال علي الفطرة مالم يؤخروا المغرب الي ان تشتبك النجوم [4].

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ میری امت برابر بھلائی پر رہے گی یا حضور ﷺ نے فرمایا فطرت اسلام پر رہے گی جب تک وہ لوگ مغرب کو اس وقت تک مؤخر نہیں کریں گے کہ ستارے نکل آئیں۔

عشاء کا مستحب وقت:

نماز عشاء کو آدھی رات یا تہائی رات تک مؤخر کرنا افضل ہے [1]۔

---

1 الجوهر النقي ج:1 ص:114 }قلت ورجاله ثقات اثبات {إعلاء السنن ج:2 /ص:43

2 الجوهر النقي ج:1 /ص:114، قلت :رجاله ثقات، إعلاء السنن ج:2 /ص:45

3 مسلم ج:1 /ص: 225

4 ابوداؤد ج:1 /ص:75 ،ابن ماجه ص:50 عن ابن عباس ، مشكوة ج:1 /ص:21 واخرجه الحاكم في المستدرك ج 1/ص:191) وقال هذا حديث حسن صحيح على شرط المسلم.

عن ابي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: لولا ان اشق على امتي لامرتهم ان يؤخروا العشاء الى ثلث الليل او نصفه[2].

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ اگر میں اپنی امت پر شاق نہ سمجھتا تو انہیں ضرور حکم دیتا کہ وہ عشاء کو تہائی رات یا آدھی رات تک مؤخر کریں۔

لیکن اگر اتنی تاخیر کرنے سے یہ خطرہ ہو کہ لوگ جماعت میں زیادہ شریک نہ ہوں گے اور جماعت کم ہو جائے گی تو اتنی تاخیر نہیں کرنی چاہیئے، اور عشاء کا وقت ہو جانے کے بعد ایسے وقت میں نماز پڑھ لینی چاہیئے، جس میں زیادہ لوگوں کے آنے کا امکان ہو۔

چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نماز عشاء کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارک یوں بیان فرماتے ہیں: والعشاء اذا كثر الناس عجل واذا قلوا اخر[3].

اور عشاء جب لوگ زیادہ ہوتے تو جلدی پڑھاتے اور کم ہوتے تو مؤخر کرتے۔ (اس خیال سے کہ جو لوگ نہیں آسکے ہیں وہ آجائیں اور جماعت بڑی ہو جائے)

اس سے معلوم ہوا کہ جماعت میں لوگوں کے کثرت تعداد کا اعتبار کیا جائے گا۔ جس وقت میں لوگوں کی زیادہ شرکت یقینی ہو، اس وقت میں جماعت ہونی چاہیئے اور جس وقت کے بارے میں یہ اندیشہ ہو کہ کم تعداد میں لوگ شریک ہوں گے، وہ وقت جماعت کے لئے متعین نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ تکثیر جماعت اور تقلیل جماعت سے بھی نماز کے ثواب میں کمی بیشی ہوتی ہے۔

وتر کا مستحب وقت:

---

[1] بخاری ج:1 / ص:77، 81

[2] ترمذی ج:1/ص:33، ابن ماجہ ص:50 وقال ابو عیسی حسن صحیح (ج:1/ص:33)

[3] بخاری ج:1/ص:80، ابوداؤد ج:1/ص:73

جو آدمی اپنے اوپر یہ اعتماد رکھتا ہو کہ صبح صادق سے پہلے بیدار ہو سکتا ہے۔اس کے لئے افضل یہ ہے کہ عشاء کی نماز پڑھ کر سو جائے. وتر نہ پڑھے اور صبح صادق سے پہلے بیدار ہو کر پڑھے۔

حضرت جابر ﷜ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جسے یہ خوف ہو کہ وہ رات کے اخری حصہ میں اٹھ نہیں پائے گا اسے اول شب میں ہی وتر پڑھ لینی چاہیئے اور جسے رات کی آخر پہر میں اٹھ جانے کی امید ہو وہ آخر شب میں وتر پڑھے اس لئے کہ آخر شب کی نماز میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور یہ افضل ہے[1]۔

اول وقت سے کیا مراد ہے؟:

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ ہر نماز ہمیشہ اول وقت میں پڑھنا ہی مستحب و مسنون نہیں ہے بلکہ کبھی کسی نماز کی تاخیر مسنون و مستحب ہوتی ہے کبھی تعجیل۔ مثلا نماز عشاء کے متعلق حضور ﷺ کے دونوں عمل (تعجیل وتاخیر) بخاری و مسلم کے حوالہ سے گزر چکے ہیں۔اسی طرح عصر کی نماز بادل کے موسم میں جلدی پڑھنے کا حکم ہے [2]۔ گرمی میں ظہر ٹھنڈے وقت میں اور سردی میں تعجیل کے ساتھ پڑھنے کے بھی احادیث گزر چکے ہیں۔اسی طرح نماز فجر تکثیر جماعت کے خاطر اسفار میں پڑھنے کا حکم اور وتر جو شخص خود سے بیدار ہو سکے اس کے لئے صبح صادق سے قبل وتر پڑھنا افضل و مستحب ہے۔

یہ تمام احادیث اس بات کی صریح دلیل ہیں کہ تمام نمازوں کو اول وقت میں ہی پڑھنے کو افضل و مستحب قرار دینا احادیث سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔رہیں وہ احادیث جن میں اول وقت میں نماز پڑھنے کی تاکید اور فضیلت آئی ہے. تو اس سے مراد مستحب وقت کا اول ہے نہ کہ نماز کے پورے وقت کا اول. گویا مستحب وقت کے شروع میں نماز پڑھ لینی چاہیئے اس میں تاخیر نہیں کرنی چاہیئے۔

---

[1] مسلم ج:1/ص:258. مشکوۃ ج:1/ص:111

[2] بخاری ج:1/ص:83

خلاصہ یہ وہ تمام احادیث جو نماز کو اول وقت میں پڑھنے کے متعلق ہے اگر ان میں "اول وقت" سے "وقت مستحب" کا اول وقت مراد نہ لیا جائے تو ان احادیث کا اور سابقہ مذکورہ احادیث میں صریح تعارض پیدا ہو جائے گا جب کہ سابقہ احادیث کی صحت میں کسی کو بھی کلام نہیں۔ لہٰذا جمع بین الاحادیث ضروری ہے کہ ان احادیث میں اول وقت سے مستحب وقت کا اول مراد ہو نہ کہ کسی نماز کے پورے وقت کا اول۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے صحیح ابن خزیمہ ج:1/ص:169 جس میں صراحۃ امام ابن خزیمہ نے لکھا ہے کہ اول وقت اپنے لفظی عموم کے باوجود احادیث مذکورہ کے پیش نظر عام نہیں)

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

نماز کے ممنوعہ اوقات:

سیدنا ابن عباسؓ سیدنا عمرؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ سے روایت کرتے ہیں

نبی اکرم ﷺ نے صبح کی نماز کے بعد نفل نماز پڑھنے سے منع فرمایا حتی کہ سورج ظاہر ہو جائے اور نماز عصر کے بعد نفل نماز پڑھنے سے منع فرمایا حتی کہ سورج غائب ہو جائے (کیونکہ سورج شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان سے نکلتا ہے)[1]۔

ٹھیک دوپہر کے وقت بھی نماز پڑھنا منع ہے۔[2]

سیدنا علیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عصر کے بعد نماز پڑھنے سے منع فرمایا۔ الا یہ کہ سورج بلند ہو۔[3]

---

[1] بخاری باب الصلاۃ بعد الفجر حتی ترتفع الشمس حدیث 581 مسلم باب الاوقات التی نھی من الصلاۃ فیھا حدیث 828 825

[2] مسلم باب الاوقات التی نھی من الصلاۃ فیھا حدیث 831

[3] ابوداؤد باب من رخص فیھما اذا کانت الشمس مرتفعۃ حدیث 1274 نسائی حدیث 574

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ عصر کے بعد نماز کی ممانعت مطلق نہیں ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھیں، آپ سے اس کی وجہ دریافت کی گئی تو فرمایا: بات یہ ہے کہ میرے پاس قبیلہ عبدالقیس کے لوگ (احکام دین سیکھنے کے لئے آئے تھے، انہوں نے (ان کے ساتھ میری مصروفیت نے) مجھے ظہر کے بعد کی دو سنتوں سے باز رکھا، پس یہ وہی دو رکعتیں تھیں (جو میں نے عصر کے بعد پڑھی ہیں)[1]۔

تبصرہ:

ہم جواباً عرض ہے کہ مذکورہ مؤقف درست نہیں ہے کیونکہ پہلی حدیث سے صراحت کے ساتھ معلوم ہوا کہ نماز عصر کے بعد نفل نماز پڑھنا ممنوع ہے۔ عصر کے بعد نفل نماز ممانعت والی احادیث تقریباً تواتر کی حد تک ہیں جن پر عمل کرنا بقول حافظ مرحوم زبیر علی صاحب کے فرض ہے۔ رہی حضرت علی کی حدیث میں یہ استثناء تو بعد العصر سے مراد یہاں بعد دخول الوقت العصر ہے۔ (آپ حضرات احادیث میں ذرا غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ جن احادیث میں اجازت معلوم ہو رہی ہے وہاں لفظ بعد العصر ہے اور جن میں صراحت کے ساتھ ممانعت ہے وہاں بعد صلوۃ العصر ہے) یہ تشریح ذہن نشین کرنا ضروری ہے ورنہ تو پہلی حدیث پر عمل نہیں رہے گا اور آپ کے اصول کے مطابق یہ حرام ہے کیونکہ ترک فرض حرام ہے۔ اگر اس استثناء کو لیا جائے اور عصر کی نماز کے بعد نفل پڑھی جائے تو منع والی احادیث کا کیا کریں گے؟۔ ابوداؤد کی ایک حدیث کو اپنے مقصد کے لئے موڑ کر کتنی احادیث کے تارک بنے ہیں آپ ذرا گنتی کریں جو تمام نماز عصر کے بعد نفل نماز پڑھنے سے صراحت کے ساتھ منع کر رہی ہیں۔

اور تیسری بات یہ ہے کہ ابن حبان کی موارد الظمآن کی حدیث نمبر 623 میں ہے " ام سلمہ رضی اللہ عنہا پوچھتی ہیں یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم بھی یہ دو رکعت پڑھیں؟ تو فرمایا: نہیں "۔ یہ

[1] بخاری باب اذا کلم وهو یصلی فاشار بیدہ واستمع حدیث 1233، 4370 مسلم باب معرفة الرکعتین اللتین کان یصلیهما النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعد العصر حدیث 834

حدیث آپ حضرات کے اصول کے مطابق صحیح بھی ہے, کیونکہ ابن حبان نے اس کو اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔اور اس حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ آپ ﷺ کی خصوصیت تھی۔ نیز ترمذی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت " رسول اللہ ﷺ نے عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھیں اس لئے کہ ان کے پاس کچھ مال آگیا تھا جس میں مشغولیت کی وجہ سے آپ ﷺ ظہر کے بعد کی دو رکعتیں نہ پڑھ سکے تھے اس کے بعد دوبارہ کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا اور فرمایا کہ اس پر اکثر علما کا اجماع ہے۔ تو کیا اکثر علما آپ کے اسلاف ہیں یا کوئی اور ؟ یہ حدیث مسند احمد اور طحاوی میں بھی ہے اور ابن الحجر نے تلخیص الحبیر میں نقل کرکے اس پر سکوت فرمایا ہے, جس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث صحیح ہے۔اسی طرح ابو داؤد (الصلوۃ باب من رخص فیہما اذا کانت الشمس مرتفعۃ) سے بھی صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہ آپ ﷺ کی خصوصیت ہے تو ان احادیث پر بھی آپ کے اصول کے مطابق عمل فرض ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں: ﴾

ابن قدامہؒ نے عصر کے بعد سنتوں کی قضا کے جواز پر یہ دلیل بھی دی ہے کہ عصر کے بعد کی ممانعت خفیف (ہلکی) ہے کیونکہ اس کے مقابلے میں سنتوں کی قضا کے جواز کی حدیث بھی آئی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ اس بارے میں اختلاف بھی پیش آیا ہے۔ جبکہ ابن حزم نے ۲۳ صحابہ کرامؓ سے عصر کے بعد ۲ رکعت پڑھنا ذکر کیا ہے۔

تبصرہ:

ہم جواباً عرض کرتے ہیں کہ امام ابن قدامہ امام احمد کے مقلد ہے اور تقلید آپ کے اصول کے مطابق بدعت اور گمراہی ہے تو کیا آپ کے ہاں بدعتی اور گمراہ کی تقلید جائز ہے ؟۔ یہ ایک غیر معصوم امتی کا قول ہے اور نقل بھی بلا حوالہ کیا گیا ہے۔ جبکہ حدیث میں صراحت ہے کہ حضرت عمر ایسے لوگوں کو پتھر مارتے تھے۔ لیکن یہاں کمال دیکھیں کہ وہ تقلید جو گمراہی اور بدعت ہے اس کو حدیث کے مقابلے میں اپنایا جا رہا ہیں۔ نیز بریکٹ میں بند جملہ انتہائی خیانت پر مبنی ہے کیونکہ اسی عنوان میں

بخاری کی جس حدیث یعنی حدیث نمبر 1233 کا حوال دیا ہے (اس سے دو رکعت کا جواز ثابت کر رہے ہیں) اس میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم یعنی میں اور عمر ابن خطاب نے بہت سے لوگوں کو مارا جو عصر کے بعد نماز پڑتے تھے۔ کیا عمر ابن خطاب خلفائے اربعہ میں شامل نہیں ؟۔

ابن حزم کے اس قول سے معلوم ہوا کہ 23 صحابہ رضی اللہ عنہم پڑھتے تھے یعنی باقی نہیں پڑھتے تھے۔ یہاں ہم آپ کو آپ ہی کی ایک نصیحت یاد دلاتے ہیں "اگر نمونے کے مطابق آپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر کوئی نکتہ چینی کرے۔ یا احادیث رسول اللہ ﷺ کے مقابل بزرگوں اور امام کے اقوال پیش کرے تو آپ اس کی نادانی سے اجتناب کرتے ہوئے عمل بالحدیث پر کاربند رہیں"۔

﴿ غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں: ﴾

فجر کے بعد ممانعت کا آغاز طلوع فجر سے ہوتا ہے۔ جب فجر طلوع ہو گئی تو فجر کی سنتوں کے علاوہ باقی نوافل ممنوع ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے طلوع آفتاب (کے آغاز) سے پہلے نماز فجر کی ایک رکعت پڑھ لی (وہ اپنی نماز پوری کرے) اس نے فجر کی نماز پالی اور جس نے غروب آفتاب سے پہلے نماز عصر کی ایک رکعت پڑھ لی (وہ اپنی نماز پوری کرے) اس نے عصر کی نماز پالی۔[1]

یہاں سے اہل سنت، محدثین فقہاء کے نزدیک نمازوں کے اوقات ممنوعہ کا ذکر کیا جا رہا ہے:

اوقات ممنوعہ

طلوع، غروب، زوال:

درج ذیل تین اوقات میں نماز پڑھنے کی ممانعت ہے:

(1) سورج نکلتے وقت (2) زوال کے وقت (3) سورج ڈوبتے وقت۔

---

[1] بحاری باب من ادرکم من الفجر رکعة حدیث 579 مسلم باب من ادرک رکعة من الصلاه فقد ادرک [illegible] حدیث 608

حضرت عقبہ بن عامر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم لوگوں کو تین اوقات میں نماز پڑھنے یا مردوں کو دفن کرنے (مراد نماز جنازہ پڑھنے) سے منع فرمایا ہے, جب سورج نکل رہا ہو یہاں تک کہ نکل کر بلند ہو جائے, اور جب زوال کا وقت ہو یہاں تک کہ سورج ڈھل جائے اور جب سورج غروب کے قریب ہو یہاں تک غروب ہو جائے[1]۔

ان اوقات میں نماز جنازہ بھی جائز نہیں کیونکہ الفاظ حدیث "او نقبر فیہن موتانا" سے مراد بالاجماع نماز جنازہ ہی ہے ورنہ اوقات مذکورہ میں تدفین میت کسی کے نزدیک بھی ممنوع نہیں .... اسی طرح سجدہ تلاوت بھی جائز نہیں کیونکہ احکام کے اعتبار سے وہ بھی نماز کے معنی میں ہے ۔(لیکن اگر جنازہ اسی وقت تیار ہوا ہو یا آیت سجدہ اسی وقت تلاوت کی ہو تو نماز جنازہ اور سجدہ تلاوت دونوں جائز ہیں وقت ناقص کا اعتبار کرتے ہوئے)

البتہ اسی دن کی عصر کی نماز سورج ڈوبتے ہوئے جائز ہے۔ لیکن نماز فجر سورج نکلتے ہوئے جائز نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ فجر کا وقت سورج نکلتے ہی ختم ہو جاتا ہے اور عصر کا وقت سورج ڈوبنے سے ختم نہیں ہو جاتا جب تک کہ بالکل نہ ڈوب جائے, ہاں ڈوبتے وقت, ہاں ڈوبتے وقت عصر کا وقت کامل نہیں ہوتا ناقص ہوتا ہے اور وجوب ادا وقت کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ لہٰذا ناقص وقت میں وجوب بھی ناقص, تولہٰذا ادائیگی بھی ناقص ہوگی۔ اور فجر کے وقت میں سورج نکلنا شروع ہونے تک وقت کامل تھا لہٰذا وجوب بھی کامل اور سورج نکلنا شروع ہوتے ہی وقت ختم ہوگیا لہٰذا کامل وجوب کو ناقص طریقے سے ادا کرنا درست نہیں۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے: اذا ادرك احدکم سجدۃ من صلوۃ العصر قبل ان تغرب الشمس فلیتم صلوتہ[2].

جو شخص سورج غروب ہونے سے پہلے عصر کی ایک رکعت بھی پالے اسے چاہیئے کہ اپنی نماز مکمل کرے]

---

[1] مسلم ج:1 /ص:276 , بلوغ المرام ص:13

[2] بخاری ج:1 /ص:79

نماز فجر اور نماز عصر کے بعد:

نماز فجر کے بعد سورج نکلنے تک، اور نماز عصر کے سورج ڈوبنے تک کوئی نفل یا سنت نماز جائز نہیں۔

حضرت ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: نماز صبح کے بعد کوئی نماز نہیں یہاں تک سورج بلند ہو جائے، اور نماز عصر کے بعد کوئی نماز نہیں یہاں تک کہ سورج غائب ہو جائے[2]۔

حضرت عمر بن خطاب و عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ابو ہریرہ سے بھی ان دونوں اوقات میں نماز پڑھنے کی ممانعت کی احادیث منقول ہیں[3]۔

حضرت معاویہ (اپنے زمانے کے کچھ لوگوں کو مخاطب کرکے) کہتے ہیں کہ تم لوگ (عصر کے بعد بھی) نماز پڑھتے ہو حالانکہ ہم لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت اختیار کی ہے۔ ہم نے حضور ﷺ کو یہ دو رکعتیں پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا، یعنی نماز عصر کے بعد دو رکعتیں[4]۔

فجر کی نماز کے بعد سورج طلوع ہونے سے پہلے سنت فجر بھی جائز نہیں، جیسا کہ مذکورہ بالا روایت سے صاف ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ حضرت ابو ہریرہ کی یہ روایت بھی ملاحظہ کیجئے:

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے فجر کی دو رکعتیں نہیں پڑھی ہو، وہ انہیں سورج طلوع ہونے کے بعد پڑھے[1]۔

---

[1] کوئی کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ یہی حکم حدیث سے نماز فجر کے متعلق بھی ثابت ہوتا ہے، پھر سورج نکلتے ہوئے نماز فجر ادا کرنے کی اجازت کیوں نہیں؟۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عقبہ بن عامر کی مذکورہ روایت اور اس روایت میں تعارض پیدا ہوا۔ وہ یہ کہ اس حدیث سے سورج ڈوبتے وقت اور نکلتے وقت نماز کی ممانعت ثابت ہوئی ہے، اور اس حدیث سے جواز، لہٰذا اصولاً اس بات کی طرف نظر کی گئی کہ سورج نکلتے ہی فجر کا وقت ختم ہو جاتا ہے اور سورج ڈوبتے ہی عصر کا وقت عصر کا وقت ختم نہیں ہو جاتا جب تک سورج مکمل ڈوب نہ جائے۔ لہٰذا عصر کے وقت میں ناقص وقت کا اعتبار کرنے کی گنجائش نے نماز عصر کے متعلق حدیث کے جزء کو ترجیح دی۔ اور نماز فجر کے لئے کوئی وجہ ترجیح نہیں بلکہ تعارض پورا پورا موجود ہے {مزید تفصیل کے لئے دیکھئے طحاوی شریف ج: 1 / ص: 194}

[2] بخاری ج: 1 / ص: 82، مسلم ج: 1 / ص: 275

[3] بخاری ج: 1 / ص: 82، مسلم ج: 1 / ص: 275

[4] بخاری ج: 1 / ص: 83

جن روایتوں سے نماز فجر کے بعد ہی سنت پڑھنے کی اجازت ظاہر ہوتی ہے وہ ضعیف ہیں [2]
جس شخص کی سنت کے ساتھ نماز فجر بھی چھوٹ گئی ہو وہ سورج کے طلوع ہونے کے بعد دونوں کے ایک ساتھ قضا کرے۔ پہلے سنت پڑھے پھر فرض جیسا کہ لیلۃ التعریس میں رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا[3]۔

عصر کے بعد دو رکعت نفل:

ابن تیمیہ رحمہ اللہ علم کے پہاڑ تھے مگر وہ بھی فرماتے ہیں کہ: "جو سنت، حدیث، اقوال صحابہ، اور اقوال تابعین وغیرہ سے باخبر نہ ہوگا وہ دین کو صحیح نہیں سمجھ سکتا، اس وجہ سے کہ سلف نے قرآن کی کی تفسیر کی ہے اور خالص سنت کیا ہے اس کا علم انہیں وجوہ سے ہوگا۔ (منہاج السنۃ ج: 3/ص: 71)

بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضور ﷺ دو رکعت فجر سے پہلے اور دو رکعت عصر کے بعد کبھی نہیں چھوڑتے تھے، اگر صرف حدیث ہی کو دیکھ کر کسی کو دین سیکھنا ہے تو وہ عصر کے بعد دو رکعت پڑھے۔ مگر امت میں کوئی اس کا قائل نہیں ہے، اس لئے کہ ہمیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے معلو

---

[1] ترمذی ج: 1 /ص: 57، واسنادہ صحیح (آثار السنن ص: 208) حدیث الباب قوی صححہ الحاکم فی المستدرک (جامع ترمذی ج: 1/ص: 217 مکتبہ الطاف)

[2] دیکھئے ترمذی ج: 1 /ص: 57، آثار السنن الجزا الثانی ص: 34 تا 37 مع حاشیہ

[3] لیلۃ التعریس کا مفہوم ہے رات کے آخری حصہ میں قیام۔ لیلۃ التعریس کا واقعہ یوں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ مع اصحاب رات میں سفر کر رہے تھے۔ رات کے آخری حصہ میں طلوع صبح صادق سے قبل ایک جگہ پڑاؤ ڈالا۔ اور حضرت بلال کو حکم دیا کہ وہ جاگتے رہیں۔ طلوع صبح صادق پر اذان اور سب لوگوں کو جگائیں۔ اس کے بعد حضور ﷺ اور تمام صحابہ کرام سو گئے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ اپنے اونٹ کے پالان کو ٹیک لگا کر مشرق کی طرف رخ کرکے بیٹھ گئے کہ اسی طرف سے صبح صادق طلوع ہوتی ہے۔ مگر سب لوگوں کی طرح وہ بھی تھکے ہوئے تھے، اس طرح ٹیک لگا کر بیٹھنے سے انہیں بھی نیند آ گئی، اب سب لوگ سو گئے کسی کی آنکھ نہیں کھلی یہاں تک سورج نکل آیا، سب سے پہلے جس کی آنکھ کھلی وہ حضور ﷺ تھے۔ آپ ﷺ نے جلدی جلدی سب کو جگایا او رحضرت بلال سے فرمایا: کیوں بلال! یہ کیا ہوا؟ حضرت بلال نے جواب دیا اے اللہ کے رسول ﷺ! جس ذات نے آپ کو سلایا اسی نے مجھے بھی سلایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہاں سے چلو یہ جگہ شیطانوں کا بسیرا ہے۔ چنانچہ سب لوگ وہاں سے چل پڑے اور کچھ دور جا کر پھر رکے فجر کی اذان ہوئی، حضور ﷺ اور سب صحابہ کرام نے پہلے فجر کی دو رکعت سنت پڑھی پھر جماعت کے ساتھ نماز ہوئی۔ {مسلم ج: 1 /ص: 238، ابوداؤد ج 1 ص/ 79، نسائی ج: 1 /ص: 135}

م ہوا کہ یہ آنحضرت ﷺ کی خصوصیت تھی اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جو لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں تھے انہوں نے جب عصر کے بعد ان دو رکعتوں کا معمول بنایا تو حضرت عمر ؓ کو ان کے ساتھ سختی کرنی پڑی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں :

"حضرت عمرؓ عصر کے بعد نماز پڑھنے پر سزا دیتے تھے، حالانکہ ایک جماعت کا اس پر عمل رہا، ان کی دلیل تھی کہ نبی اکرم ﷺ عصر کے بعد (دو رکعت) نماز پر مداومت کی ہے، لیکن چونکہ یہ آنحضرت ﷺ کی خصوصیت تھی اور آپ نے فجر اور عصر کے بعد نماز پڑھنے سے منع فرمایا تھا تو حضرت عمرؓ جو عصر کے بعد نماز پڑھتا تھا اس کو سزا دیتے تھے "۔(فتاویٰ ج: 20/ص:168)

حضور اکرم ﷺ سے کہیں یہ منقول نہیں ہے کہ آپ نے عصر کے بعد دو رکعتوں کی اپنی خصوصیت فرمایا ہو۔ مگر صحابہ کرام کو خصوصا جو آنحضرت ﷺ سے بہت قریب تھے ان کو یہ معلوم رہا کرتا تھا کہ آپ کا کون سا کام محض اپنے لئے ہے اور کون سا کام تمام امت کے لئے ہے۔اس لئے ان صحابہ کرام کی رہنمائی کے بغیر صحیح سنت کا علم ہو ہی نہیں سکتا۔

ایک دوسری مثال لیجئے بخاری و مسلم کی صحیح روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ :

ليس على المسلم في فرسه ولا عبده صدقة.

یعنی مسلمان کے گھوڑے اور اس کے غلام میں زکوۃ نہیں ہے۔

اس حدیث کا ظاہر مفہوم ہے کہ مسلمان کے پاس کسی طرح کے گھوڑے اور غلام ہو اس میں زکواۃ واجب نہ ہوگی ۔ اگر کوئی صرف حدیث کو دیکھے گا تو اس کا یہی مذہب ہونا چاہیئے، مگر جماعت ظاہر یہ کے علاوہ کسی نے حدیث کا یہ مطلب نہیں لیا ہے بلکہ جمہور اہلسنت کا مذہب یہ ہے کہ اگر یہ گھوڑے اور غلام تجارت کے لئے ہوں گے تو اس میں زکواۃ واجب ہوگی ، غیر مقلد عالم مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری فرماتے ہیں کہ : ان زكوة التجارة ثابتة بالاجماع ..... فيخص به عموم هذا الحديث .(تحفہ ج: 2/ص:7)

یعنی گھوڑے اور غلام اگر تجارت کے لئے ہو تو ان کی زکوۃ اجماع سے ثابت ہے، پس اجماع سے حدیث عام کا مفہوم خاص کیا جائے گا۔

دیکھا آپ نے حدیث عام تھی مگر اس کو اجماع سے خاص کرنا پڑا، اجماع نہ کتاب اللہ ہے اور نہ سنت یہ صحابہ کرام اور تابعین وغیرہم کے قول و عمل کے اتفاق کا نام ہے۔

اگر صحابہ کرام کا دین میں اور دین کی تشریح و توضیح میں کوئی مقام نہیں ہے صرف کتاب و سنت ہر شخص کے لئے کافی ہیں تو آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد معاذ اللہ لغو ہے، آپ ﷺ فرماتے ہیں: اقتدوا بالذین بعدی ابی بکر و عمر یعنی میرے بعد جو دو آنے والے ہیں حضرت ابوبکر ؓ اور عمر ؓ تم لوگ ان کی پیروی کرو ن حضرت ابوبکر ؓ اور حضرت عمر ؓ کو آپ مستقل امت کا مقتدی امام اور پیشوا بنا کر ان کی پیری واقتدا کا حکم فرمارہے ہیں علیکم بسنتی و سنتی خلفائے راشدین فرما کر آپ نے تمام خلفائے راشدین کی سنت کو مستقل دین بتلا کر ان کو لازم پکڑنے کا حکم فرمایا ہے، اگر خلفائے راشدین کا دین میں کوئی مقام نہیں تو آپ کا یہ ارشاد کیوں؟

صبح صادق کے بعد:

صبح صادق طلوع ہونے کے بعد فجر کی دو رکعت سنت کے علاوہ کوئی اور سنت یا نفل پڑھنا مکروہ ہے۔ کیونکہ نماز و عبادت میں اس قدر رغبت و خواہش رکھنے کے باوجود حضور ﷺ طلوع فجر کے بعد دو رکعت سنت ہی پڑھتے تھے اس کے علاوہ کوئی اور نفل یا سنت نہیں پڑھتے تھے۔

عبداللہ بن عمر اپنی بہن ام المؤمنین حضرت رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ طلوع صبح صادق کے بعد سوائے دو ہلکی پھلکی رکعتوں کے کوئی اور (نفل یا سنت) نہیں پڑھتے تھے[1]۔

فجر کی نماز میں اگر سورج طلوع ہو جائے اور عصر میں اگر سورج غروب ہو جائے دونوں کا حکم:

---

[1] بخاري ج:1 /ص:157 ,مسلم ج:1 /ص:250 وللفظ له وترمذي ج:1/ص:56

بخاری مسلم کی حدیث کے مطابق اگر کسی کو ایک رکعت فجر کی مل گئی اور دوسری رکعت میں سورج طلوع ہو گیا یا عصر میں غروب ہو گیا و فجر اور عصر دونوں نمازیں ادا ہو گئیں، جبکہ فقہائے احناف فرماتے ہیں کہ عصر میں ہو جائے گی اور فجر نہیں ہوتی وہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا پہلا ٹکڑا منسوخ ہے، لیکن محققین احناف یہ بھی فرماتے ہیں اور قول رکھتے ہیں کہ دونوں صورتوں میں نماز ہو جائے گی، چنانچہ حدیث کے امام اور حافظ شاہ انور شاہ کشمیریؒ اور فقہ اور حدیث کے امام مفتی رشید احمد گنگوہیؒ اور شارح مسلم شریف علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اسی طرح صاحب بحر الرائق اور امام ابو یوسفؒ کی ایک یہی ہے کہ فجر میں بھی پہلی رکعت کے بعد اگر سورج طلوع ہو جائے تو نماز فجر ٹھیک ہو گئی نہیں ٹوٹے گی۔

خطبہ کے وقت :

خطبہ جمعہ کے وقت بھی کوئی نماز جائز نہیں۔ خاموشی کے ساتھ خطبہ کی طرف ہی متوجہ رہنا چاہئیے۔

سلمان فارسی کی روایت میں ہے: ثم یصلی ما کتب لہ ثم ینصت اذا تکلم الامام

پھر نماز پڑھے جو مقرر کی گئی ہے اور جب امام خطبہ دے تو خاموش رہے [1] ۔

حضرت عروہ بن زبیر سے مروی ہے: جب امام ممبر پر بیٹھ جائے پس کوئی نماز جائز نہیں [2] ۔

عبد اللہ عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں کوئی مسجد میں داخل ہو، اور امام منبر پر ہو تو نہ کوئی نماز جائز ہے نہ بات چیت یہاں تک کہ امام فارغ ہو جائے [3] ۔

فجر کی سنتوں کے بعد لیٹنا:

---

[1] بخاری ج: 1 /ص: 121, 124

[2] مصنف ابن ابی شیبہ، ج: 2 /ص: 111

[3] مجمع الزوائد ج: 2 /ص: 184 رواہ الطبرانی فی الکبیر وفیہ ایوب بن نہیک وھو متروك ضعفہ جماعۃ وذکر ابن حبان فی الثقات وقال یخطئ (مجمع الزوائد ج: 1/ص: 215)قلت والاختلاف لایضر والحدیث حسن انشاء اللہ تعالی ولہ شواھد (اعلاء السنن ج: 2/ص: 77)

یعنی آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب کوئی فجر کی دو رکعت سنت پڑھ لے تو داہنے پہلو لیٹ جائے۔ (ترمذی)

مگر یہ حدیث بقول ابن تیمیہ باطل ہے حافظ ابن قیم فرماتے ہیں: "یعنی میں نے ابن تیمیہ سے سنا کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث باطل ہے صحیح نہیں ہے"۔(زاد المعاد ج: 1/ ص: 319)

چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہے: کہ نبی اکرم ﷺ سنت کی وجہ سے نہیں لیٹتے تھے، چونکہ آپ رات بھر نماز میں لگے رہتے اس وجہ سے (لیٹ کر) آرام حاصل کرتے۔(ایضاً ج: 1/ ص: 319)

اہل علم جانتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا حال یہ تھا کہ اگر کوئی شخص فجر کی سنت کے بعد لیٹا ہوتا اور آپ اس کو دیکھ لیتے تو کنکر مار کر اٹھاتے اور صاف صاف یہ کہتے کہ یہ بدعت ہے۔ زاد المعاد میں ہے: ابن عمر رضی اللہ عنہ جب دیکھتے کہ لوگ لیٹے ہوئے ہیں تو ان کو کنکر مارتے۔ (ایضاً)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لوٹ کر ان کے پاس جاؤ اور بتلاؤ کہ یہ سنت نہیں ہے بدعت ہے۔ (ایضاً)

مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری صاف صاف فرماتے ہیں: نبی اکرم ﷺ فجر کی سنت گھر میں پڑھتے تھے[1]۔(تحفہ ج: 1/ ص: 323)

وقت پر نماز کی ادائیگی:

---

[1] مولانا مبارکپوری صاحب کی پہلی صحیح حدیث کا حال ہے، مولانا مبارک پوری کو اس کے صحیح ہونے کا اتنا یقین ہے کہ انہوں نے حاشیہ میں اس کے راویوں کا حال بھی ذکر کیا ہے۔

مولانا نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے، مگر اس کا ایک راوی محمد بن وضاح ہے، اس کو کسی نے صراحۃ ثقہ نہیں کہا ہے، اس کا حال یہ تھا کہ بہت سی ثابت حدیثوں کو رد کر دیتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ نبی کا کلام نہیں ہے، بہت خطاکار تھا اس سے غلطیاں بہت واقع ہوئی تھیں، صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح کرتا تھا نہ اسے عربیت کا علم تھا اور نہ فقہ کی جانکاری تھی۔ سیر اعلام النبلاء ج: 2/ ص: 445، میزان الاعتدال ج: 2/ ص: 59

مولانا مبارک پوری نے ان تمام باتوں کا تذکرہ نہیں فرمایا اور اس کو ثقہ قرار دیا، بھلا ایسا راوی جس حدیث میں ہو وہ حدیث بھی قابل احتجاج قرار پائے تعجب ہے۔ اور قارئین دیکھ رہے ہیں کہ یہ حدیث مدعا بھی کو ثابت نہیں کرتی۔

/ا

عبد اللہ ابن مسعودؓ کی حدیث وقت پر نماز کی ادائیگی کے بارے میں محدثین فقہائے اہل سنت والجماعت فرماتے ہیں: " سیدنا عبد اللہ (بن مسعودؓ) فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کون سا عمل اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسندیدہ ہے؟ تو آپ انے فرمایا کہ نماز کے وقت میں (ٹھیک وقت پر) نماز پڑھنا، انہوں نے عرض کیا اس کے بعد کون سا عمل زیادہ محبوب ہے؟ آپ انے فرمایا: ماں باپ کی خدمت کرنا، انہوں نے پھر عرض کیا کہ اس کے بعد کون سال عمل زیادہ محبوب ہے؟ آپ انے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرنا"[1]۔

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے والدین کی خدمت و حسنِ سلوک اور جہاد سے بھی افضل اور محبوب ترین عمل " اپنے وقت پر " نماز پڑھنے کو قرار دیا ہے اور بلا شبہ صحیح وقت پر نماز پڑھنے کا مقام یہی ہے بعض لوگ اس حدیث سے اول وقت میں ہر نماز کے پڑھنے کو مستحب قرار دینے پر استدلال کرتے ہیں، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے بلکہ مختلف نمازوں کے مستحب اوقات موسم اور زمانہ کے لحاظ سے مختلف ہیں، اس حدیث میں ان لوگوں کیلئے تنبیہ ہے جو نماز قضا کر دیتے ہیں۔ علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ابن دقیق العید کا قول نقل کیا ہے:

"اس حدیث میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جو نماز کا ابتدائی یا آخری وقت بتاتا ہو بلکہ اس سے مقصود نماز قضاء کرنے سے احتراز ہے[2]"

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

---

[1] صحيح البخاري، كتاب مواقيت الصلاة، باب 5 فضل الصلاة، لوقتها، حديث: 527، و كتاب الجهاد والسير، باب 1 فضل الجهاد والسير، حديث: 782م و كتاب الأدب، باب 1 البر والصلة، حديث: 5970، و كتاب التوحيد، باب 48 وسمي النبي ﷺ الصلاة، عملًا، حديث: 7534، و صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب 36 بيان كون الايمان بالله تعالى افضل الأعمال، حديث: 85

[2] فتح الباری 9/2 باب: 5 کتاب الصلوۃ حدیث 527 کے تحت

فوت شدہ نمازوں کا حکم:

سیدنا انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من نسی صلاۃ فلیصل اذا ذکر ،لا کفارۃ لھا الا ذلک[1]

جو شخص نماز جائے (یا سو جائے) تو اس کا کفارہ اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ جس وقت اسے یاد آئے (یا بیدار ہو) اس نماز کو پڑھ لے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھنی بھول جائے اور اس کا وقت گزر جائے تو جس وقت یاد آئے، وہ اسی وقت اپنی نماز پڑھ لے اور اسی طرح اگر کوئی شخص سو جائے اور نماز کا وقت گزر جائے، مثلاً: صبح آنکھ ہی ایسے وقت کھلے کہ سورج طلوع ہو چکا ہو تو جاگنے والے کو اسی وقت پوری نماز پڑھ لینی چاہیئے اور اس پر کسی قسم کا کفارہ نہیں ہے۔

قضائے عمری والے مسئلے کی شریعت میں کوئی اصل نہیں، وہ حدیث موضوع ہے جس طرح کے ملا علی قاری اور مولانا عبدالحیٔ لکھنوی نے اس کو موضوع لکھا ہے۔(تذکرۃ الموضوعات)

سیدنا ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک سفر میں فرمایا: آج رات کون ہماری حفاظت کرے گا۔ایسا نہ ہو کہ ہم فجر کی نماز کے لئے نہ جاگیں۔ بلال نے کہا کہ میں خیال رکھوں گا۔ پھر انہون نے اپنی سواری کے ساتھ ٹیک لگا کر مشرق کی طرف منہ کیا اور کچھ دیر بعد سیدنا بلالؓ بھی نیند سے مغلوب ہو کر سو گئے۔جب آفتاب گرم ہوا تو سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ پھر صحابہ جاگے۔آپ نے سیدنا بلالؓ سے ان کا عذر سن کر فرمایا؛اونٹ کی نکیل پکڑ کر چلو کیونکہ یہ شیطان کی جگہ ہے۔ پھر نئی جگہ پہنچ کر رسول اللہ ﷺ نے وضو کیا اور سیدنا بلالؓ کو اذان کا حکم دیا۔ سیدنا بلالؓ نے اذان دی۔ نبی اکرم

[1] بخاری باب من نسی صلاۃ فلیصلھا اذا ذکرھا حدیث 597 مسلم باب قضاء الصلاۃ الفائتۃ واستحباب تعجیل قضائھا حدیث 684

ﷺ نے دو رکعتیں پڑھیں، باقی لوگوں نے بھی دو دو سنتیں پڑھیں) پھر رسول اللہ ﷺ نے فجر کی نماز پڑھائی اور فرمایا: جو شخص نماز بھول جائے، اسے چاہئے کہ جب یاد آئے تو نماز پڑھ لے [1]۔

کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں کہ فوت شدہ نماز کو دوسرے دن اس کے وقت پر پڑھا جائے بلکہ نبی اکرم ﷺ کے فعل سے بالکل واضح ہے کہ نیند سے بیدار ہونے پر فورا نماز ادا کی جائے، لہٰذا قضا نماز کی ادائیگی کے لئے اس کے بعد والی نماز کی وقت یا اگلے دن اسی نماز کے وقت کا انتظار کرنا چاہئے۔ بلکہ اسی وقت ادا کرکے مزید توبہ واستغفار اور نیکی کے میں سبقت لے جانے کا اہتمام کرنا چاہئے [2]۔

تبصرہ:

ہم (اہل سنت) جوابا عرض کرتے ہیں کہ جس اجماعی مسئلہ کا انکار بہت جلدی قبول کیا گیا وہ قضائے عمری کی عدم ادائیگی ہے۔ اور جو دلیل اس پر پیش کی گئی وہ انتہائی بودی دلیل ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کرامؓ سے یہ چیز ثابت نہیں۔ جو صحابہ رضی اللہ عنہمؓ کا قول وفعل حجت نہیں مانتے، اس مسئلے پر صحابہ رضی اللہ عنہم کرامؓ کے عمل سے دلیل پکڑتے ہیں۔

پہلی بات تو سمجھنے کی یہ ہے کہ حالتِ کفر میں کئے گئے اعمال اسلام لانے کے بعد صرف توبہ سے معاف کردیئے جاتے ہیں۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم کرامؓ تو حالتِ کفر سے اسلام کی طرف پلٹے تھے۔ (انکو زمانہ کفر کی نمازیں ادا نہیں کرنا تھیں)۔

دوسری بات یہ کہ اسلام لانے کے بعد کسی صحابیؓ کی زندگی میں یہ بات نظر نہیں آئے گی کہ انکی کئی کئی دن، ماہ یا سالوں کی نمازیں قضا ہوئیں ہوں بلکہ آپ ﷺ کے زمانے میں اسلام کے غلبے کے بعد یہ حال تھا کہ منافقین کو بھی معلوم تھا کہ اگرچہ زبانی کلامی اسلام کا دعوی کیا ہے نماز تو ہر حالت میں پڑھنی ہو گی۔ لہٰذا منافقین تک مساجد میں نماز کے اوقات میں حاضری دیتے۔ اگر کبھی کسی

---

[1] بخاری باب الاذان بعد ذهاب الوقت حدیث 595 مسلم باب قضاء الصلاة الفائتة واستحباب تعجیل قضائها حدیث 680

[2] بخاری باب من نسی صلاة فلیصل اذا ذکر ولا یعید الا تلک الصلاة حدیث 597 مسلم باب 684

صحابیؓ کی ایک نماز قضا تو کیا صرف تاخیر بھی ہوتی تو وہ اسکا اسقدر افسوس کرتے کہ دوسرے صحابہؓ انکی تعزیت کو آتے۔ پیدائشی مسلمانوں پر اللہ تبارک و تعالیٰ کا ایک بڑا احسان تو یہی تھا کہ ان کو مسلمانوں کے گھرانوں میں پیدا فرمایا۔ اب اگر حالتِ اسلام میں اللہ کی اطاعت نہ کی جائے تو پھر اسکا تاوان ہے۔ بے شک گناہوں کو اللہ توبہ سے معاف فرماتے ہیں لیکن توبہ کی شرائط ہیں اللہ کے حقوق میں کمی کوتاہی کیلئے قضا ضروری ہے جسطرح جو فرض روزے زندگی میں چھوٹے، فرض زکوۃ میں کمی بیشی ہوئی، انسانوں کے حقوق میں جو کمی کوتاہی ہوئی وہ ادا کرنی ضروری ہے اس طرح قضا نمازوں کی ادائیگی بھی لازم ہے۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے "اللہ کا فرض ادا کرو وہ ادائیگی کا زیادہ حقدار ہے (نسائی، ج 2 ص 4,3) آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص نماز پڑھنا بھول جائے یا سوتا رہ جائے تو اسکا کفارہ یہ ہے کہ جب یاد آئے تو پڑھ لے" (بخاری، مسلم) یہ دلیل اس کے بارے میں ہے جب وہ قاصد نہ ہو غلطی ہو جائے۔ اور اگر کوئی کسی عذر کی بناء پر قصداً نماز چھوڑ دے تب بھی اس پر قضاء لازم ہے چنانچہ بخاری شریف میں ہے کہ نبی ﷺ سے غزوہ خندق کے روز چار نمازیں ایسی فوت ہوئیں کہ نہ نبی ﷺ بھول گئے تھے اور نہ سو گئے تھے بلکہ قاصد تھے پھر بھی حضور ﷺ نے ان نمازوں کو ترتیب سے قضاء فرمالیافقضا ھن مرتبۃً اور قضا نمازیں ترتیب سے ادا ہونگی یہ تمام کتب احادیث میں موجود ہے۔ اور نمازوں کو مکمل کرنے سے پہلے مر گیا تو سچے ارادے سے اللہ تعالیٰ اس کو معاف کر دے گا جس طرح کہ سو آدمیوں کا قاتل صرف توبہ سے نہیں بلکہ سچے ارادے اور اس پر عمل کیلئے روانہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے معاف فرمادیا (مسلم شریف) اس مسئلہ میں توبہ کیساتھ عملِ قضاء بھی ضروری ہے اس لئے کہ حدیث میں اسی طرح ہے تاہم ایسے گناہ ہیں جو محض توبہ سے معاف ہو جاتے ہیں۔ اس نظریےئے سے جتنی جلدی تائب ہو اجائے اتنا بہتر ہے کہ قضائے عمری کی ادائیگی ضروری نہیں اسکو پھیلانے والے جتنے لوگوں کو ااسپر قائل کریں گے اتنے لوگوں کی قضا نماز کی ادائیگی کے معاملے میں وہ اللہ کے سامنے جوابدہ ہونگے۔ کیا یہ مقام فکر نہیں؟

فوت شدہ نمازوں کی قضا لازم:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص نماز پڑھنا بھول جائے یا سو تا رہ جائے تو اس کا کفارہ صرف یہ ہے کہ جب یاد آئے تو پڑھ لے [1]۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی سو تا رہ جائے یا غفلت کی وجہ سے نماز رہ جائے تو اسے چاہیے کہ جب یاد آئے پڑھ لے کیونکہ اللہ عزوجل فرماتے ہیں کہ نماز قائم کر میری یاد کے لئے [2]۔

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ غزوہ خندق کے موقع پر جس دن خندق کھودی جارہی تھی سورج غروب ہونے کے بعد آئے اور کفار قریش کو برا بھلا کہنے لگے، عرض کرنے لگے یا رسول اللہ ﷺ میں عصر کی نماز نہیں پڑھ سکا یہاں تک کہ سورج غروب ہونے کے قریب ہو گیا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا میں نے بھی عصر نہیں پڑھی ہم مقام بطحان میں پہنچ کر ٹھہرے آپ ﷺ نے وضو فرمایا ہم نے بھی اس نماز کے لئے وضو کیا آپ نے عصر کی نماز سورج غروب ہونے کے بعد پڑھی پھر مغرب اس کے بعد ادا فرمائی [3]۔

حضرت ابو عبیدۃ رحمتہ اللہ اپنے والد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا غزوہ خندق کے دن مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو چار نمازیں پڑھنے سے روکے رکھا یہاں تک کہ رات کا اتنا حصہ چلا گیا جتنا اللہ نے چاہا پھر آپ ﷺ نے بلال (رضی اللہ عنہ) کو حکم دیا تو انہوں نے اذان دی پھر اقامت کہی پس ظہر پڑھی پھر اقامت کہی تو عصر پڑھی پھر اقامت کہی تو مغرب پڑھی پھر اقامت کہی تو عشاء پڑھی [4]۔

---

[1] بخاری ج۱ ص ۸۴، مسلم ج۱ ص۲۴۱ واللفظ مسلم۔

[2] مسلم ج۱ ص۲۴۱

[3] بخاری ج۱ ص ۸۳، مسلم ج۱ ص ۲۲۷

[4] ترمذی ج ۱ ص ۴۳ وفی الباب عن ابي سعيد وجابر قال ابو عيسي :حديث عبدالله ليس باسناده باس (ترمذی ج: 1/ص: 96 مکتبہ الطاف)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے آپ فرمایا کرتے تھے جو شخص نماز پڑھنا بھول جائے پھر امام کے ہمراہ دوسری نماز پڑھتے ہوئے اسے یاد آئے تو جب امام سلام پھیرے تو اسے چاہیے کہ پہلے وہ بھولی ہوئی نماز پڑھے پھر اس کے بعد دوسری نماز پڑھے [1] ۔

مذکورہ احادیث مبارکہ سے دو چیزیں ثابت ہو رہی ہیں ایک تو یہ کہ جو نمازیں قضا ہو جائیں جان کر یا بھول کر یا سوتے رہ جانے کی وجہ سے تو وہ ذمہ سے ساقط نہیں ہوتیں بلکہ ان کی ادائیگی ضروری ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ سوتے رہ جانے یا بھول جانے کی وجہ سے قضا ہو جانے والی نماز ادا کرنے کا حکم دے رہے ہیں اس بناء پر ان کی ادائیگی ضروری ہوئی اسی سے معلوم ہوا کہ جو نمازیں ان اعذار کے بغیر قضا ہو جائیں ان کا ادا کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ جب عذر (سوتے رہ جانے یا بھول جانے) کی وجہ سے قضا ہو جانے والی نمازوں کی ادائیگی ضروری ہوئی تو بغیر کسی عذر کے جان بوجھ کر قضا ہو جانے والی نمازوں کی ادائیگی بطریق اولیٰ ضروری ہو گی۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد" اقیموا الصلوٰۃ" نماز قائم کرو، ان صورتوں کو بھی شامل ہے جب نماز کا وقت آ جائے اور ان صورتوں کو بھی شامل ہے جب کہ نماز کسی بھی وجہ سے قضا ہو جائے نماز بہر حال پڑھنی پڑے گی چاہے ادا پڑھے یا قضا پڑھے، اگر ادا نہیں پڑھی تو قضا پڑھے، کیونکہ نماز نہ پڑھنے کی صورت میں بندہ پر اللہ کا ایک قرض باقی رہے گا اور ظاہر ہے کہ قرضہ ادائیگی کے بغیر ذمہ سے ساقط نہیں ہوتا لہٰذا نماز بھی جب تک پڑھ نہ لے ذمہ سے ساقط نہیں ہو گی اداً پڑھے یا قضاً حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں: فاقرضوا اللہ فھوا احق بالوفاء [2]

اللہ کا قرض ادا کرو وہ ادائیگی کا زیادہ حق دار ہے۔

مزید ارشاد فرماتے ہیں" فدین اللہ احق ان یقضی [3] "

---

[1] موطاء امام مالک ص ۱۵۵ واسنادہ صحیح (آثار السنن ص: 225)

[2] نسائی ج ۲ ص ۲

[3] بخاری ج ۱ ص ۲۶۲

اللہ تعالیٰ کا قرض زیادہ حق رکھتا ہے کہ اسے ادا کیا جائے امام نووی رحمتہ اللہ اس حدیث کی تشریح میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ جو فرض نماز فوت ہو جائے اس کی قضا ضروری ہے خواہ وہ نماز کسی عذر کی وجہ سے رہ گئی ہو مثلاً سو گیا یا بھول گیا یا بغیر عذر کے اور حدیث میں جو بھول جانے کی قید ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حدیث اسی سبب سے بیان ہوئی ہے اور اس لئے بھی کہ جب عذر والے شخص پر قضا واجب ہے تو وہ شخص جس کا کوئی عذر بھی نہیں اس پر بطریق اولیٰ واجب ہو گی۔ یہ ادنی سے اعلیٰ پر تنبیہ کے باب سے ہے آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا کہ " اسے چاہیے کہ جب یاد آئے تو پڑھ لے" یہ استحباب پر محمول ہے کیونکہ فوت شدہ نماز کو کسی عذر کی وجہ سے موخر کرکے پڑھنا بھی جائز ہے صحیح قول کے مطابق اس کا بیان اور اس کی دلیل گزر چکی اور بعض اہل ظاہر نے شذوذ کیا ہے جو یہ کہا ہے کہ بغیر عذر کے فوت ہو جانے والی نماز کی قضا واجب نہیں ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ فوت شدہ نماز اس سے بڑی ہے کہ آدمی اسے قضا کرکے اس کی معصیت سے نکلے یہ اس قائل کی غلطی اور جہالت ہے[1]۔"

فوت شدہ نماز کی قضاء کے ضروری ہونے پر اجماع امت بھی ہے چنانچہ علامہ محمد بن عبدالرحمٰن شافعیؒ لکھے ہیں: "واتفقو اعلیٰ وجوب قضاء الفوائت[2] "

فقہاء نے فوت شدہ نمازوں کی قضاء کے واجب ہونے پر اتفاق کیا ہے۔

دوسری چیز یہ کہ اگر کسی وقت کی نمازیں قضا ہو جائیں تو ترتیب کے ساتھ ادا کرنی چاہئیں جیسا کہ غزوہ خندق کے موقع پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے اصحاب کی تین نمازیں لگاتار قضا ہو گئیں یعنی ظہر، عصر، مغرب اور آپ نے عشاء کی نماز کے وقت ان کی قضاء شروع کی تو ان نمازوں کو ترتیب سے پڑھا پہلے ظہر کی نماز کو پھر عصر کی نماز کو پھر مغرب کی نماز کو پھر عشاء کی نماز کو ایسا نہیں کیا کہ عشاء کا وقت ہونے کی وجہ سے پہلے عشاء پڑھ لی ہو پھر قضاء نمازیں پڑھی ہوں آپ کے اس عمل سے

---

[1] نووی ج ا ص ۲۳۸

[2] رحمۃ الامۃ ص: ۳۶

یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر قضا نمازیں کم ہوں یعنی پانچ یا پانچ کے اندر اندر تو قضاء نمازوں کی ادائیگی کی ترتیب میں وقتیہ نماز پر قضاء نماز کو اولیت حاصل ہو گی یعنی پہلے قضاء نماز ادا کی جائے گی پھر وقتیہ لہٰذا اگر کوئی فوت شدہ نماز کو قضاء پڑھے بغیر وقتیہ نماز پڑھے گا تو اس کی نماز نہیں ہو گی اسے چاہیے کہ پہلے قضا نماز پڑھے پھر وقتیہ کو دہرائے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما یہی فتویٰ دیتے تھے جیسا کہ حدیث نمبر٦ سے ظاہر ہے (البتہ یہ بات ضروری ہے کہ فوت شدہ اور وقتیہ نماز میں یہ ختر تیب صاحب ترتیب کے لئے ہے۔ لیکن ان تمام احادیث اور اجماع امت کے برعکس یہ تقلید نہ کرنے والے بزرگ علمائے کرام فرماتے ہیں کہ فوت شدہ نمازوں کے بارے صرف توبہ واستغفار کو کافی سمجھتے ہیں۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

سفر میں اذان دے کر نماز پڑھنا :

سیدنا عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہارا پروردگار بکریاں چرانے والے سے تعجب کرتا ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر رہ کر اذان دیتا اور نماز پڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے کو دیکھو جو نماز کے لئے اذان دیتا اور اقامت کہتا ہے اور مجھ سے ڈرتا ہے میں نے اس کو بخش دیا اور جنت میں داخل کیا[1]۔

معلوم ہوا کہ جو شخص سفر میں اذان اور اقامت کہہ کر (امام کی طرح) نماز پڑھے تو اس کے لئے زیادہ اجر اور ثواب ہے۔

تبصرہ:

ہم تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ : کہاں سے معلوم ہوا جی ! اس حدیث میں سفر کا بالکل ذکر ہی نہیں ہے لیکن امام ابوداؤد نے چونکہ اس حدیث کو سفر کے باب میں ذکر کیا ہے لہٰذا امام ابوداؤد کے تقلید کرکے اس کو سفر کے لئے ذکر کیا جبکہ امام نسائی نے اس حدیث پر باب باندھا ہے اکیلے نماز کا تو

---

[1] ابو داؤد باب الاذان فی السفر حدیث 1203 نسائی باب الاذان لمن یصلی وحده

امام ابوداؤد کے تقلید کرنے کے بجائے امام نسائی کی تقلید زیادہ بہتر رہے گا کیونکہ ایک تو امام ابوداؤد سے امام نسائی کا رتبہ بڑا ہے اور دوسرا امام نسائی کی بات حدیث کے ساتھ مطابقت بھی رکھتی ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

نمازیں مجبوراً فوت ہو جائیں تو کیسے پڑھیں؟

سیدنا ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ہم (غزوہ احزاب میں) رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے ہمیں کافروں نے ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں پڑھنے کی مہلت نہ دی (اور ان نمازوں کا وقت گزر گیا) جب فرصت ملی تو رسول اللہ ﷺ نے سیدنا بلالؓ کو حکم دیا، انہوں نے پہلے اذان کہی پھر اقامت کہی تو آپ نے ظہر کی نماز پڑھائی، پھر انہوں نے اقامت کہی تو آپ نے عصر کی نماز پڑھائی، پھر انہوں نے اقامت کہی تو نبی اکرم ﷺ نے مغرب کی نماز پڑھائی۔ انہوں نے پھر اقامت کہی تو نبی اکرم ﷺ نے عشاء کی نماز پڑھائی[1]۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر اس طرح کی کسی سخت مجبوری کے باعث نمازیں فوت ہو جائیں تو انہیں بالترتیب ادا کرنا مسنون ہے لیکن نمازیں عمداً قضا نہیں کرنی چاہئیں۔

﴿ اہل سنت فرماتے ہیں: ﴾

اہل سنت والجماعت کے نزدیک نمازیں عمداً قضاء کرنا بڑا سنگین گناہ ہے اور اگر کبھی کسی عذر شرعی کی وجہ سے فوت ہو جائے تو اس کی قضاء واجب ہے، پھر اگر پانچ نمازیں قضاء ہو گئی ہو یا پانچ سے کم تو اس میں ترتیب کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے اور گر پانچ سے زیادہ ہو تو پھر قضاء تو لازم ہے لیکن ترتیب ضروری نہیں۔

[1] مسند احمد 3/ 25، 49، 67، 68 نسائی 2/ 17

اذان واقامت

اذان کی ابتداء :

رسول اللہ ﷺ اور دیگر مسلمان جب مدینہ منورہ تشریف لائے، اس وقت اذان مشروع نہیں ہوئی تھی تو مسلمان نماز کی ادائیگی کے لئے وقت مقرر کرکے اس پر جمع ہوتے تھے، ایک دن اس بارے میں بات ہوئی کہ نماز کے اوقات کا اعلان کیسے کیا جائے؟ کچھ لوگوں نے یہ تجویز دی کہ نماز کے وقت ناقوس بجایا جائے، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تو نصاری کا کام ہے۔ کسی نے تجویز دی کہ بگل بجایا جائے ۔آپ نے فرمایا: یہ یہود کا کام ہے۔ کسی نے کہا کہ بلند مقام پر آگ روشن کی جائے۔آپ نے فرمایا : یہ مجوس کا کام ہے۔ سیدنا انسؓ بیان کرتے ہیں کہ (اذان کی مشروعیت نازل ہونے کے بعد) :

فأمر بلال أن يشفع الاذان وأن يوتر الاقامة

پھر سیدنا بلالؓ کو حکم دیا گیا کہ اذان کے کلمات جفت کہیں اور تکبیر (اقامت) کے کلمات طاق کہیں (اور بعض روایات میں ہے: سوائے قد قامت الصلاۃ کے)[1].

اذان کے جفت کلمات :

اللہ اکبر ، اللہ اکبر ، اللہ اکبر ، اللہ اکبر ، اشھد ان لا الہ الا اللہ ، اشھد ان لا الہ الا اللہ

اشھد ان محمدا رسول اللہ ، اشھد ان محمدا رسول اللہ ، حی علی الصلاۃ ، حی علی الصلاۃ

حی علی الفلاح ، حی علی الفلاح ، اللہ اکبر ، اللہ اکبر ، لا الہ الا اللہ

اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ۔میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے

[1] صحیح البخاری ،الاذان ،باب بدء الاذان ،حدیث: ۶۰۳،۶۰۴ وصحیح مسلم ،الصلاۃ،باب الامر بشفع الاذان وایتار الاقامۃ ـــ ،حدیث: ۳۷۸،وفتح الباری : ۱۰۵/۲،تحت الحدیث: ۶۰۳۔

رسول ہیں۔ نماز کی طرف آؤ۔ نماز کی طرف آؤ۔ نجات کی طرف آؤ۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں [1]۔ [2]

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

فجر کی اذان میں :

سیدنا ابو محذورہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں اذان کی تعلیم دی اور فرمایا:
فجر کی اذان، میں حی علی الفلاح کے بعد دو بار یہ کلمات زیادہ کہیں :

الصلاۃ خیر من النوم الصلاۃ خیر من النوم

نماز نیند سے بہتر ہے نماز نیند سے بہتر ہے [3]۔

صحیح روایات میں اذان کی طرح اقامت کا بھی ذکر ہے۔

[1] حسن سنن ابی داؤد، الصلاۃ، باب کیف الاذان؟ حدیث: ۴۹۹، وسندہ حسن، سنن ابن ماجہ، الاذان والسنۃ فیہا، باب بدء الاذان، حدیث: 706۔ امام ابن حبان نے الموارد، حدیث: 287 میں، (غیر مقلد بزرگ فرماتے ہیں کہ) امام ترمذی نے حدیث: 189 میں اور نووی نے المجموع: 3:76 میں اسے صحیح کہا ہے۔

[2] جبکہ ہمارا تبصرہ یہ ہے کہ: اس روایت میں محمد بن اسحاق ہیں جو عن سے روایت کر رہے ہیں جس کو مرحوم علی زئی صاحب نے خود {جزء رفع یدین ص: 49، جزء قراءۃ ص: 112، تسہیل الوصول ص: 377} پر مدلس کہا ہے لہذا یہ حدیث آپ ہی کے اصول کے مطابق ضعیف ہے۔

[3] حسن سنن ابی داؤد، الصلاۃ، باب کیف الاذان، حدیث: ۵۰۱ وھو حدیث حسن، وسنن النسائی، الاذان، باب الاذان فی السفر، حدیث: ۶۳۴، ابن خزیمہ نے حدیث: ۳۷۵ میں، ابن حبان نے الموارد، حدیث: ۲۸۹ میں اور نووی نے المجموع: ۳/۹۰ میں اسے صحیح کہا ہے۔

تبصرہ: ہم تبصرہ کرتے ہوئے جواباً عرض کرتے ہیں کہ ان احادیث سے صرف ایک بات لی گئی ہے باقی ان تمام احادیث میں صراحت کے ساتھ ہے کہ آپ ﷺ نے مجھے اقامت بھی دو دو مرتبہ سکھائی اور اقامت کے ڈبل ڈبل الفاظ حدیث کے اندر موجود بھی ہیں۔ اقامت کو نہ لینا اور الصلوۃ خیر من النوم، الصلوۃ خیر من النوم کو لے لینا اس کا فیصلہ آپ خود ہی کریں { کہیں مسلک کی بات تو نہیں }۔

﴿ غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں : ﴾

سیدنا انسؓ فرماتے ہیں کہ صبح کی اذان میں حی علی الفلاح کے بعد الصلاۃ خیر من النوم دو دفعہ کہنا سنت ہے[1]۔

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں فجر کی پہلی آذان میں الصلوۃ خیر من النوم دو مرتبہ کہا جائے[2].

سیدنا ابن عباسؓ نے بارش کے دن اپنے مؤذن سے کہا کہ حی علی الصلاۃ کی بجائے الصلاۃ فی الرحال یا صلوا فی بیوتکم اپنے گھروں میں نماز ادا کرو۔ کہے اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہی کیا تھا، جمعہ اگرچہ فرض ہے مگر مجھے پسند نہیں کہ تم کیچڑ اور مٹی میں (مسجد کی طرف) چلو[3]۔

تبصرہ:

ہم جواباً عرض کرتے ہیں کہ اس حدیث کو آپ نے صحیح کہا ہے اور آپ کے اصول ہیں کے صحیح حدیث پر عمل فرض کرنا فرض ہے { موطا امام مالک ص: 26 } جبکہ ہمارا عملی مشاہدہ ہے کہ آپ کے مساجد میں اس پر عمل نہیں ہوتا۔ تو مستقل تارک فرض کا حکم تو آپ کو معلوم ہوگا ؟۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

اقامت کے طاق کلمات :

اللہ اکبر . اللہ اکبر . اشهد ان لا الہ الا اللہ . اشهد ان محمدا رسول اللہ . حی علی الصلاۃ . حی علی الفلاح . قد قامت الصلوۃ . قد قامت الصلوۃ . اللہ اکبر . اللہ اکبر . لا الہ الا اللہ

---

[1] صحیح ابن خزیمہ ،الاذان و الاقامة ،باب التثویب فی اذان الصبح ،حدیث: ۳۸۶،و سندہ صحیح ،والسنن الکبری للبیھقی ،الصلاۃ ،باب التثویب فی اذان الصبح :۱/۴۲۳،حدیث: ۱۹۸۴، امام ابن خزیمہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

[2] بیھقی 423/1 اسے ابن حجر نے صحیح کہا ہے

[3] صحیح البخاری ،الاذان ،باب ھل یصلی الامام بمن حضر؟حدیث: ۶۹۹۔اس سے معلوم ہوا کہ اذان کے کلمات میں الصلاۃ خیر من النوم کہنا یا بارش وغیرہ کی صورت میں الصلاۃ فی الرحال وغیرہ کہنا اذان میں اپنی طرف سے اضافہ نہیں ہے بلکہ عہد نبوت کی سنت ہے، لہٰذا اسے اذان کے اندر من پسند اضافوں کی دلیل بنانا درست نہیں ہے۔ (ع،ر)

اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہے۔ نماز کی طرف آؤ کامیابی کی طرف آؤ۔ نماز کھڑی ہو گئی، نماز کھڑی ہو گئی۔ اللہ سب سے بڑا، اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں[1]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اذان کے کلمات دو دو بار اور تکبیر ایک ایک بار کہیں[2]۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اذان کے کلمات دو دو بار اور تکبیر کے کلمات ایک ایک بار تھے سوائے اس کے کہ مؤذن { قد قامت الصلوۃ } دو بار کہتا تھا[3]۔

تبصرہ:

ہم(اہل سنت) تبصرہ کرتے ہوئے جواباً عرض کرتے ہیں کہ ان احادیث سے یہ ثابت کیا جارہاہیں کہ اقامت طاق ہے جبکہ ابوداؤد کی حدیث 501 ,نسائی حدیث 634 ابن خزیمہ حدیث 375 ان تمام احادیث کو آپ خود { نماز نبوی قدیم ص:106 جدید ص:136 } پر صحیح تسلیم کرچکے ہیں ان تمام احادیث میں اقامت دودو مرتبہ ہیں۔اور ابو محذورہ خود فرماتے ہیں کہ مجھے اقامت دودو مرتبہ سکھائی گئی ان احادیث پر آپ کے اصول" کہ جب حدیث صحیح ہو تو اس پر عمل فرض ہے تو ان احادیث پر عمل کی فرضیت کب لاگو ہوگی ؟۔ جبکہ لطیفہ یہ ہے کہ اس سے پہلے اذان کے 15 کلمات کو جفت کہا اور اب 11 کلمات کو طاق۔ کیا جفت اور طاق میں کوئی فرق نہیں ؟۔

---

[1] ابوداؤد باب فی الاکلمۃ حدیث 510، 511 ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے

[2] بخاری باب بدء الاذان حدیث 607،605،603 مسلم باب الأمر بشفع الاذان وایتار الاقامۃ حدیث 378

[3] ابوداود باب في الاقامة حديث 511،510 نسائي 2/21،20 دارمي 1/270 حاكم 1 /197، 198 ذہبی اور نووی نے اسے صحیح کہا ہے

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

دوہری آذان:

آذان میں شہادت کے چاروں کلمات دھیمی آواز سے کہنا اور پھر دوبارہ بلند آواز سے کہنا ترجیع کہلاتا ہے۔ حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بذات خود مجھے آذان سکھائی پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آذان اس طرح کہو:

اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر[1] اشھد ان لا الہ الا اللہ، اشھد ان لا الہ الا اللہ، اشھد ان محمدا رسول اللہ، اشھد ان محمدا رسول اللہ، { پھر دوبارہ کہو }، اشھد ان لا الہ الا اللہ، اشھد ان لا

---

[1] **اذان میں اضافہ:**

ہمارا ایمان ہے کہ ہماری نجات اللہ اور اللہ کے رسول کے اطاعت اور اولیاء واسلاف اور فقہائے امت کی مکمل اتباع میں ہے۔ اہل سنت والجماعت کا مسلک یہی ہے، لہٰذا ہمیں صرف وہی اذان دینی چاہیئے جو مسنون و منقول ہے، بعض شیعہ نے اذان کے واسط میں اور بعض حضرات نے اذان کے شروع میں جو اضافہ کیا ہے وہ قرآن و سنت کے رو سے صحیح نہیں ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ اظہار محبت کے لئے بعض لوگوں نے اذان میں "اشھد ان امیر المؤمنین وامام المتقین علیا ولی اللہ الخ وغیرہ کلمات کا اضاف کیا ہے، ذخیرہ احادیث میں کہیں ان الفاظ کا پتہ نہیں ملتا۔ نیز داخلی شہادت کے طور پر پتہ چلتا ہے کہ یہ الفاظ دور نبوی میں موجود نہ تھے۔ اس کے بعد خلیفہ اول ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں موجود نہ تھے، خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں موجود نہ تھے، خلیفہ سوم حضرت عثمان غنی ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے زمانے میں موجود نہ تھے۔

خلیفہ چہارم علی کرم اللہ وجہہ کے دور میں موجود نہ تھے، نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کا تقاضا ہے کہ وہی اذان دی جائے جو ان کے دور خلافت میں دی جاتی تھی۔

لہٰذا ایسے الفاظ جو خیر والقرون میں نہیں تھے، یقینا سیاسی یا مذہبی گروہ بندی کا نتیجہ ہیں اور اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ مشہور شیعہ محقق شیخ طوسی نے کتاب الاستبصار کے باب عد الفصول فی الاذان والاقامۃ (کلمات اذان واقامت) کی حدیث نمبر 2،3،4،5 میں کلمات اذان واقامت کا ذکر کیا ہے لیکن مندرجہ بالا کلمات شہادت کا ذکر نہیں۔ (محمد بن حسن طوسی الاستبصار، ج: 1/ص: 5)

بلکہ شیعہ رئیس المحدثین ابو جعفر محمد علی الصدوق المتوفی 381ھ نے من لا یحضرہ الفقیہ باب الاذان والاقامۃ کی حدیث نمبر 35 میں پوری اذان درج کی ہے جس میں حی علی الفلاح کے بعد صرف حی علی خیر العمل کا اضافہ ہے، اس بعد وہ لکھتے ہیں: "اس کتاب کے مصنف فرماتے ہیں کہ یہی وہ صحیح اذان ہے جس میں کمی بیشی جائز نہیں ہے، اللہ تعالی شیعہ کے فرقہ مفوضہ پر لعنت بھیجے کہ انہوں نے احادیث گھڑی ہیں اور اذان میں "محمد وآل محمد خیر البریۃ "کا اضافہ کیا ہے اور بعض نے "اشھد ان محمدا رسول اللہ

کے بعد اشہد ان علیا ولی اللہ" کا جملہ دو دفعہ بڑھایا ہے، جب کہ بعض نے اشہد ان علیا امیر المؤمنین حقا کا جملہ دو دفعہ بڑھایا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ علی اللہ کے ولی ہیں اور وہ برحق امیر المؤمنین ہیں اور محمد ﷺ اور ان کے آل مخلوق میں بہتر ہیں، لیکن یہ کلمات اذان کا حصہ بالکل نہیں۔۔۔(ابو جعفر الصدوق: نقیہ من لایحضرہ الفقیہ، ج: 1/ص: 188)

الغرض سابقہ تحقیق سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ شہادت علی کے مروجہ کلمات اذان کا حصہ نہیں بلکہ شیعہ محدث نے تو ایسا کرنے والوں پر لعنت بھیجی ہے۔ اب اہل تشیع کے اذان کے رد عمل میں اگر کوئی شخص حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تعریف و منقبت کے طور پر اذان میں اضافہ کرے تو یقینا یہ اضافہ بھی بدعت اور غیر مسنون شمار ہوگا، چونکہ اسلام نے سنت و بدعت کا جو معیار قائم کیا ہے وہ مسلک و مشرب اور شخصیات کی جکڑ بندیوں سے بالاتر ہے یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی سنی بھی اسلامی عبادات میں اضافہ کرے گا تو یہ اضافہ بدعت اور خلاف سنت شمار ہوگا۔

حضرت عثمانؓ کی اذان کا اضافہ:

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنے کتاب منہاج السنۃ ج ثالث صفحہ 204 اور 205 میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ شیعہ رافضی کا یہ کہنا کہ جمعہ کی اذان عثمانی بدعت ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ بدعت تھی تو حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں اس بدعت کو ختم کیوں نہیں کر دیا، اگر یہ اذان بدعت تھی تو کسی صحابی نے اس پر انکار کیوں نہیں کیا؟

اگر شیعہ اور رافضی یہ کہتے ہیں کہ یہ اس لئے بدعت ہے کہ اس کی کوئی شرعی دلیل نہیں ہے، حضرت عثمان نے اس کو بلا دلیل شرعی جاری کیا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو یہ کہا سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمان اس کو بلا دلیل شرعی جاری کیا؟ اگر تمہیں اس کی دلیل شرعی نہیں معلوم تو کیا ضروری ہے کہ حضرت عثمان کو بھی اس کی دلیل شرعی نہ معلوم ہو۔

آذان سے پہلے درود:

پاک و ہند میں بعض حضرات نے اذان سے قبل درود شریف کا اضافہ کیا اور کہا کہ یہ جائز ہے۔

از روئے قرآن: ارشاد ربانی ہے: ان اللہ ملائکتہ یصلون علی النبي یاأیها الذین آمنوا صلوا علیه وسلموا تسلیما. (الاحزاب)

اللہ تعالی اور اس کی فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والوں تم بھی ان پر درود وسلام پڑھا کرو۔

لیکن جواب یہ ہے کہ یہ آیت خود رسول اللہ ﷺ سے پر نازل ہوئی تو اور کون ہے جو آپ سے زیادہ بڑھ کر اس کے مفہوم و مراد سے واقف ہو۔ آپ نے حسب عادت یہ آیت بھی حضرات صحابہ کو سمجھائی صحابہ نے آپ کی تعلیمات کے مطابق اس پر عمل کیا۔ اگر اس آیت کے مفہوم میں اذان سے قبل درود شریف پڑھنا بھی ہوتا تو یقینا آپ ضرور و بتلاتے اور حضرات صحابہ اضرور اس پر عمل پیرا ہوتے، لیکن آپ کی حیات طیبہ اور ہزار سال سے زائد میں اذان سے قبل درود شریف نہیں پڑھا گیا ہے۔

آنحضور ﷺ کے بعد حضرات صحابہ قرآنی مفاہیم سے بخوبی واقف تھے جن میں ابن عباسؓ جیسے سید المفسرین بھی موجود تھے۔ اس کے باوجود حضرات صحابہ نے اذان سے قبل درود شریف نہ پڑھا معلوم ہوا کہ اذان قبل درود شریف قرآنی نقطہ نظر سے

صحیح نہیں،اب اگر اس دور میں کوئی شخص اس درود کو آیت کے مفہوم میں داخل کرے تو بارگاہ الٰہی کی گستاخی ہوگی، کہ اللہ تعالی کی طرف سے اذان کے جو کلمات عطا ہوئے۔ ان میں ایک چیز کی کمی تھی جسے اب پورا کیا گیا۔ نیز اس سے بارگاہ رسالت کی گستاخی ہوگی کہ یا تو اللہ کے رسول ﷺ کو آیت کا مکمل مفہوم معلوم نہ تھا یا معلوم تھا مگر آپ نے امت کو نہیں بتلایا نیز یہ کہ آپ کے حیات طیبہ میں جو اذان دی جاتی تھی وہ قدرے قابل اصلاح تھی اور درود شریف کے اضافے کی متقاضی تھی۔ نیز اس سے شان صحابہ میں گستاخی ہوگی کہ وہ حضرات قرآنی مراد سے ناواقف تھے یا واقف ہونے کے باوجود انہوں نے اس محبوب عمل کو چھوڑے رکھا۔ (نعوذ باللہ من ذلک)

اور ناجائز از روئے سنت بھی ہے اس لئے کہ مسنون اذان کی تمام تفصیلات آنحضور ﷺ نے بتلادی تھی، مؤذن کا انتخاب، اذان کے دوران جواب، اذان کے بعد کی دعاء وغیرہ اگر اذان سے قبل درود شریف مسنون و مستحب ہوتا تو آپ امت کو یہ بھی بتادیتے لیکن ذخیرہ احادیث میں کہیں بھی اس کا پتہ نہیں ملتا۔ اللہ کی رسول ﷺ کی محبت کا تقاضا ہے کہ ہمیں بھی وہی اذان پسند ہو جو خود آپ کو پسند تھی ہم وہی مسنون اذان دیں جو آپ کی حیات طیبہ میں حرمین شریفین ودیگر مساجد کی مقدس فضاؤں میں گونجتی رہی۔ عشق و محبت کے زبانی داعی نہیں بلکہ کردار و عمل کے غازی اپنے تن من دھن کو قربان کردینے والے سچے محب اور عاشق رسول ﷺ تمام حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے، اگر اذان میں یہ اضافہ کسی درجہ میں بھی حضور ﷺ کے قرب کا سبب ہوتا تو سب سے پہلے یہ کام حضرات صحابہؓ کرتے حضوصا بارگاہ رسالت کے مؤذنین جن میں حضرت بلالؓ، حضرت عبد اللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ، سلمۃ بن الاکوع رضی اللہ عنہ، حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ چونکہ وہ بارگاہ رسالت کے مزاج آشنا تھے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ سچی محبت کے تقاضوں کو پورا کیا کہ وہی مسنون اذان دیتے رہے جو اللہ کے رسول ﷺ کو پسند تھی۔ الغرض اذان میں اس اضافہ کو محبت کا لبادہ اڑھانے کی کوشش نہیں جاسکتی۔ رحمۃ للعالمین ﷺ کے عہد مبارک میں اذان سے پہلے اور بعد میں یہ اضافہ نہیں تھا، اسی طرح خلافت راشدہ، خلافت بنو امیہ، خلافت عباسیہ اور پھر قریب زمانہ میں خلافت عثمانیہ تک اذان اپنی اصلی حالت میں باقی رہی اس دوران آٹھویں صدی میں بعض لوگوں نے اذان میں اضافہ کیا تو علمائے امت نے ان کو سختی سے روک دیا اور ان کے بدعت ہونے فتوی دیا، ملاحظہ ہو علامہ ابن حجر مکی ہیثمی لکھتے ہیں: "اس قسم کی اور احادیث بھی ہیں لیکن کسی بھی حدیث میں اذان سے قبل درود شریف اور اذان کے بعد محمد رسول اللہ کہنے ذکر تک نہیں، نیز ہمارے ائمہ کے کلام میں بھی اس مسئلہ کا نشان نہیں ملتا اس طرح یہ دونوں چیزیں اذان میں مسنون نہیں ہیں، لہٰذا جو شخص بھی اس مقام پر یہ عمل سنت سمجھ کر کرے گا، اسے روکا جائے گا، چونکہ یہ تو بلادلیل ایک مسئلہ کو شریعت کی طرف منسوب کرنا ہے اور ایسا کرنے والے کو سختی کے ساتھ روک دیا جائے گا"۔ (الفتاوی الکبری، الفقہیۃ، ج: 1/ص: 131)

.بریلوی بزرگ علامہ مفتی محمد حسین نعمی فرماتے ہیں: اذان کے کلمات مقرر ہیں، اس میں کمی بیشی کرنا یا ان کے آگے پیچھے درود شریف یا قرآن کریم کی آیات بلا فصل ملانا بدعت ہے اور عبادت میں خلل ڈالنے کے مترادف ہے۔ اذان کے ساتھ اول درود شریف کو لازم قرار دینا یا اہل سنت کا شعار بنانا بھی بدعت ہے اور عبادت معہودہ میں تحریف کرنے کی کوشش ہے۔ (ملخص) فتوی مفتی محمد حسین نعیمی، جامعہ نعیمیہ لاہور۔

انوار الصوفیہ میں ہیں: قرون اولی میں بلکہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے پہلے کہیں بھی اذان سے پہلے بلند آواز سے تسمیہ یا صلاۃ وسلام پڑھنا مشروع نہیں ہے، دراصل یہ زوائد وہابیوں، دیوبندیوں کی ضد سے یا نعت خواں قسم کے موذنین نے پیدا کئے ہیں، یہ رسم جو اسلام میں معہود نہیں تھی جسلا بڑھاتے چلے جارہے ہیں اور علمائے کرام خاموش ہیں، پتہ نہیں کیا وجہ ہے۔ (ملخص)
(انوار الصوفیہ، ترجمان استانہ علی پور شریف، جنوری 1978ء)

دار العلوم حزب الاحناف کا فتوی: "فجر ہونے سے پہلے لاؤڈ سپیکر پر بلند آواز سے درود شریف پڑھنا جائز نہیں۔ (فتوی دار العلوم حزب الاحناف، لاہور، 2، اکتوبر: 1978ء)

الغرض اذان سے پہلے یا بعد درود شریف وغیرہ کا اضافہ قرآن وسنت واقوال صحابہؓ سے ثابت نہیں ہے اور خود بریلوی مکتب فکر کے علمائے کرام نے بھی اس کو بدعت اور ناجائز قرار دیا ہے کیا ہی اچھا ہو کہ تمام بریلوی حضرات گروہی رجحانات کو بالائے طاق رکھ کر ان حقیقت پسندانہ تعلیمات پر عمل کریں۔

(انگوٹھے چومنے کے متعلق)

اسی قسم کا قصہ حضرت خضر علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ اذان میں پاک نبی ﷺ کا نام سن کر انگوٹھے چومنے چاہیے جس کی بابت خود علامہؒ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اور اسی طرح وہ قصہ بھی غلط ہے جس کو ابو العباس یمنی صوفی نے اپنی کتاب " موجبات الرحمۃ وعزائم المغفرۃ" میں درج کیا ہے، چونکہ اس کی سند میں بہت سے نامعلوم (مجہول) لوگ ہیں، ساتھ ہی ساتھ یہ کہ حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ سرے سے راوی کی ملاقات ہی ثابت نہیں"۔ (مقاصد الجنتہ، باب المیم)

انگوٹھے چومنے کے متعلق ایک اور قصہ طاؤس کی طرف منسوب ہے کہ انہوں نے شمس بن نصر سے سنا کہ جس نے آپ ﷺ کے نام نامی پر انگوٹھے چومے وہ اندھا نہیں ہوگا۔ خود علامہ سخاویؒ اس کو نقل کرکے فرماتے ہیں کہ "ولا یصح فی المرفوع من ہذا شیء" ان باتوں میں سے ایک بھی مرفوعا ثابت نہیں۔

جناب مولانا احمد رضا خان بریلوی صاحب فرماتے ہیں: " اذان میں وقت استماع نام پاک صاحب لولاک ﷺ انگوٹھوں سے ناخن چومنا آنکھوں پر رکھنا کسی حدیث صحیح سے ثابت نہیں، یہ جو کچھ اس میں روایت کیا جاتا ہے کلام سے خالی نہیں ہے پس جو اس کے لئے ایسا ثبوت مانے یا اسے مؤکد جانے یا نفس ترک کو باعث زجر وملامت کہے، وہ بے شک غلطی پر ہے۔ ہاں بعض احادیث ضعیفہ مجروحہ میں تقبیل ابہامین وارد ہے" (احمد رضا خان، مجموعہ رسائل، ج: 2/ ص: 155)

واضح رہے کہ یہاں بعض علما کو ایک غلطی لگی کہ " یہ باتیں ضعیف ہیں اور فضائل میں ضعیف کمزور روایتوں پر بھی عمل کر لیا جاتا ہے" لیکن اگر ان باتوں کے ثبوت کا ضعیف احتمال بھی ہو تو شاید ان کا کہنا درست ہوگا، جب کہ یہ باتیں سرے سے من گھڑت اور موضوع روایات ہیں تو کسی درجہ میں بھی عمل کی بنیاد نہیں بن سکتیں، ملاحظہ ہو:

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں: "کہ دوران اذان کلمہ شہادت میں نبی کریم ﷺ کے نام نامی پر انگوٹھے چومنے کی تمام روایات من گھڑت (موضوع) ہیں۔(تسیر القال)

اله الا الله ، اشهد ان محمد ا رسول الله ، اشهد ان محمد ا رسول الله ، حی علی الصلوة ، حی علی الصلوة ، حی علی الفلاح ، حی علی الفلاح ، الله اکبر ، الله اکبر ، لا اله الا الله ،

تبصرہ:

ہم مذکورہ روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اذان کے جو الفاظ بحوالہ مسلم کے لائے ہیں ان میں اللہ اکبر دو دفعہ ہے اور یہاں چار دفعہ نقل کیا گیا ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں: ﴾

حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں آذان کے انیس اور اقامت کے سترہ کلمات سکھائے[1]۔

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

اذان و اقامت کے الفاظ:

" سیدنا عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اذان و اقامت کے کلمات دو دو بار کہے جاتے تھے[2] "۔

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: " بعض اہل علم کا کہنا ہے اذان و اقامت کے کلمات دو دو بار کہے جائیں گے[3] "۔

اور علامہ سخاوی ابن حجر سے نقل کرتے ہیں کہ: "کہ فضائل اور ترغیب وترہیب میں ضعیف روایت پر عمل کرنا جائز اور مستحسن ہے 8، بشرطیکہ من گھڑت نہ ہو، چونکہ من گھڑت (موضوع) بات پر عمل کرنا کسی حال میں جائز نہیں۔ (القول البدیع، ص: 195-196)

[1] ابو داؤد باب کیف الاذان حدیث 502 وللفظ له مسلم باب صفة الاذان حدیث 379 ترمذي باب ماجاء في الترجيع في الاذان دحدیث 192 امام البانی نے اسے صحیح کہا ہے

[2] سنن ترمذی ، کتاب الصلاة باب 142 ما جاء ان الاقامة مثنى مثنى، حديث: 194

[3] حوالہ سابق وایضا رواه ابن ابي شيبة واسناده صحيح قال ابن حزم في "المحلي" ج: 3/ص: 58 هذا أسناده في غاية الصحة.

عن أبي محذورة حدثه . . . والاقامة: أَللهُ أَكْبَرُ اللهُ أَكْبَرُ . اَللهُ أَكْبَرُ اللهُ أَكْبَرُ . أَشْهَدُ أَنْ لاَّ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ ، أَشْهَدُ أَنْ لاَّ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ ، أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ ، أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ ، حَيَّ عَلَى الصَّلاَةِ ، حَيَّ عَلَى الصَّلاَةِ ، حَيَّ عَلَى الْفَلاَحِ ، حَيَّ عَلَى الْفَلاَحِ ، قَدْ قَامَتِ الصَّلاَةُ ، قَدْ قَامَتِ الصَّلاَةُ ، اَللهُ أَكْبَرُ اَللهُ أَكْبَرُ ، لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ [1]

" سیدنا ابو محذورہؓ سے مروی ہے (کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں اذان واقامت دونوں سکھائے) اقامت یہ ہے : اللہ اکبر اللہ اکبر......الخ"۔

"امام ابوداود رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسدد کی روایت کردہ حدیث زیادہ واضح ہے، کیوں کہ اس میں صحابی ابو محذورہؓ فرمارہے ہیں کہ مجھے خود رسول اللہ ﷺ نے اقامت کے ہر کلمہ کو دودو بار کہنے کی تعلیم دی[2]"۔

انہیں اوران جیسی دیگر روایات کی بناء پر علماء احناف کہتے ہیں کہ اذان واقامت کی کیفیت میں کوئی فرق نہیں ہے، حنفیہ کے نزدیک کلمات اقامت کل سترہ (17) ہیں اور شہادتین، حیعلتین اور اقامت تینوں دودو مرتبہ اور شروع میں تکبیر چار مرتبہ کہی جائے گی، گویا اذان کے پندرہ کلمات میں صرف دو مرتبہ "قد قامت الصلاۃ" کا اضافہ حیعلتین کے بعد کیا جائے گا۔

طحاوی اور مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ میں متعدد روایات سے ثابت ہے کہ سیدنا عبد اللہ بن زید کو خواب میں اذان کے ساتھ ساتھ اقامت بھی سکھائی گئی تھی اور وہ اذان کی طرح تشفیع (یعنی دو دو بار کہنے) پر مشتمل تھی، اس سلسلہ میں سب سے زیادہ صحیح اور صریح روایت مصنف بن ابی شیبہ

---

[1] سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب 28 كيف الأذان، حديث: 501 و 502 ،و ابن ماجة، كتاب الأذان والسنة فيه، باب 3 الترجيع في الأذان، حديث: 709، وقال الالبانی حسن صحيح وسنن النسائي، كتاب الأذان، باب 6 الأذان في السفر، حديث: 633، آثار السنن (ص: 66) حاشية 86، قال الترمذی حديث حسن (ص: 65،)

[2] سنن ابی داود، کتاب الصلاۃ، باب 28 کیف الأذان، حدیث: 501 کے تحت اس حدیث کی تائید دیگر احادیث سے ہوتی ہے جو کہ اسناد کے لحاظ سے صحیح ہے، ملاحظہ ہو "آثار السنن" (ص: 65، 66،67،68)

میں مروی ہے: "عبداللہ بن زید انصاری ص نبی کریم اکے پاس آئے اور کہا: یارسول ﷺ اللہ! میں نے خواب میں ایک شخص کو جس کے جسم پر دو سبز رنگ کی چادریں تھیں، دیوار کے اوپر دیکھا، اس نے اذان اور اقامت کے الفاظ دو دو بار کہے اور اذان و اقامت کے درمیان ایک مرتبہ بیٹھا، آپ انے ارشاد فرمایا: سارے الفاظ بلال کو سنا دو، پھر سیدنا بلال نے اذان کے الفاظ بھی دو دو بار کہے اور اقامت کے الفاظ بھی دو دو بار کہے اور درمیان میں ایک مرتبہ بیٹھ[1] "۔

سوید بن غفلہ کی روایت ہے: سمعت بلالا یؤذن مثنی و یقیم مثنی[2].

"میں نے سیدنا بلالؓ کو سنا کہ وہ اذان کے الفاظ بھی دو دو بار کہتے اور اقامت کے الفاظ بھی دو دو بار کہتے"۔

مصنف عبد الرزاق میں خود سیدنا بلالؓ کی روایت ہے: قال کان أذانه واقامته مرتین مرتین[3].

"وہ فرماتے ہیں کہ ان کی اذان اور اقامت کے الفاظ دو دو بار ہوتے تھے"۔

اذان و اقامت کے درمیانی وقت میں دعاؤں کا قبول ہونا:

اذان کے بعد سے لے کر جماعت کے قائم ہونے اور اقامت کہنے تک کا جو وقفہ ہے یہ نہایت ہی مبارک وقت ہے، یہ وقت دعاؤں کی قبولیت کا وقت ہے، اور یقینی طور پر دعائیں قبول کی جاتی ہیں، ہمارے ہاں اس بارے میں بالکل اہتمام نہیں کیا جاتا اور شاید ہی کوئی نمازی ہو جو سنتوں کے پڑھنے کے

---

[1] نصب الرایہ: 267/1، روایت: 1144، الحدیث الرابع کے تحت) اور اس روایت کے بارے میں علامہ ابن حزم نے لکھا ہے: وهذا اسناد في غاية الصحة اس حدیث کو علامہ زیلعی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کرکے اسے صحیح قرار دیا ہے: وهذا رجال الصحيحين

۔ (المحلی: 191/2، کتاب الصلاة، مسألة: 331 ماورد في أصل الأذان

[2] شرح معانی الآثار، کتاب الصلاة باب الأقامة كيف هي؟ 134/1، قدیم اسناده حسن (آثار السنن ص: 67)

[3] مصنف عبد الرزاق: 463/1، باب بدء الأذان، حدیث: 1791 ۔ اس حدیث کو حافظ ماردینی علاء الدین بن الترکمانی نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: هذا سند جيد ۔ حاشیہ مصنف عبد الرزاق: 463/1، باب بدء الأذان

بعد (اقامت سے قبل) دعاء کرتا ہو، حالاں کہ دعاؤں کی قبولیت کا یہ ایک اہم اور مبارک وقت ہے، ہر نمازی کو چاہئے کہ وہ جب بھی سنتوں کی ادائیگی سے فارغ ہو تو جماعت کھڑی ہونے سے قبل خوب دعائیں کرے اور یہ سارا وقت دعاؤں میں لگادے کہ یہ قبولیت کا وقت ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اذان واقامت کے درمیان کی جانے والی دعارد نہیں کی جاتی[1]۔

ترمذی کی ایک دوسری روایت میں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس وقت دعاء کرو اور دعاء میں اللہ تعالیٰ سے دنیاوآخرت کی عافیت مانگو[2]۔

صحیح ابن حبان کی روایت میں ہے کہ آپ انے فرمایا: "اذان واقامت کے درمیان میں کی جانے والی دعاء قبول کی جاتی ہے، للذا تم دعاء کیا کرو[3]"

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کے تحت فرماتے ہیں: ﴾

اذان کی طرح اقامت کے الفاظ بھی دوھرے ہیں:

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا گیا کہ اذان کے کلمات دوہرے اور اقامت کے کلمات اکہرے کہا کرے۔ لہٰذا حضرت بلالؓ ابتدائی ایام میں اقامت کے کلمات ایک ایک دفعہ کہتے تھے، لیکن جب یہ حکم منسوخ ہوا تو آپ آخری عمر تک اقامۃ کے کلمات دو دفعہ کہا کرتے تھے۔ (مسلم، الامر بشفع الاذان)

امام طحاوی فرماتے ہیں: "پھر حضرت بلالؓ کا مستقل عمل اقامت دوہری کہنے کا رہا جس پر روایات متواترہ دلالت کرتی ہیں اس سے معلوم ہوا کہ حضرت بلالؓ کو اسی کا حکم دیا گیا تھا۔ (طحاوی، الاقامۃ کیف ہی؟)

---

[1] سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ماجاء في أن الدعاء لا يرد بين الأذان والاقامة، حديث: 212، وسنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب ماجاء في الدعاء بين الأذان والاقامة، حديث: 52

[2] سنن الترمذي، كتاب الدعوات، باب في العفو والعافية، حديث: 3594

[3] صحيح ابن حبان، كتاب الصلاة، باب ذكر استحباب الاكثار من الدعاء بين الأذان والاقامة، حديث: 1696

خود علامہ شوکانیؒ حضرت ابو محذورۃ رضی اللہ عنہ کی روایت کو بنیاد بناتے ہوئے حضرت بلالؓ کے ابتدائی عمل کو منسوخ قرار دیتے ہیں، ملاحظہ ہو:

"حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ والی روایت حضرت بلالؓ کی اس روایت سی مؤخر ہے جس میں حضرت بلالؓ کو اکہری اقامت کہنے کا حکم دیا گیا تھا، چونکہ حضرت ابو محذورہؓ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے اور حضرت بلال کو اکہری اقامت کہنے کا حکم شروع شروع میں دیا گیا تھا۔ لہٰذا حضرت ابو محذورہ والی روایت نے سابقہ حکم کو منسوخ کردیا، بلکہ ابو شیخ نے نقل کیا ہے کہ جب حضرت بلالؓ نے منی میں اذان دی تو آنحضور ﷺ بھی وہاں موجود تھے، تو وہ اذان و اقامت ایک جیسی تھی اور اس میں دو دو دفعہ کلمات کو دہرایا گیا ہے۔ جب تمہیں یہ تفصیل معلوم ہو گئی تو واضح ہو گیا کہ جن احادیث میں دھری اقامت کا ذکر ہے وہ دلیل بن سکتی ہیں اور اکہری اقامت والی احادیث طرق مختلفہ اور صحیحین میں وارد ہونے کی وجہ سے گو کہ زیادہ صحیح ہیں لیکن دھری اقامت والی احادیث میں ایک زیادہ چیز کا تذکرہ ہے، لہٰذا ان کی طرف رجوع کرنا لازم ہے خاص طور پر اس لئے بھی کہ ان میں آخری زمانہ کا تذکرہ ہے جیسے کہ ہم بتا چکے ہیں[1] ۔

تکبیر کہنے والے کے ساتھ انہی کلمات کو دہراتے جانا مسنون ہے:

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت بلالؓ نے اقامت شروع کی جب وہ "قدقامت الصلوۃ" پر پہنچے تو نبی کریم ﷺ نے جواب میں فرمایا" اقامھا اللہ وادمھا اللہ " اور باقی کا جواب اذان کی طرح دیا جیسا کہ حضرت عمرؓ کی حدیث میں ذکر ہے۔ (ابو داؤد: مایقول اذا سمع الاذان)

---

[1] شوکانی، نیل الاوطار، ج: 2/ص: 24، باب صفۃ الاذان

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

اذان اور مؤذن کے فضائل :

سیدنا ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: موذن کی آواز جنات ،انسان اور جو جو چیز سنتی ہے، وہ قیامت کے دن اس کے لئے گواہی دے گی[1]۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مؤذن کے لئے ثواب ہے اس شخص کے ثواب کے برابر جس نے آذان سن کر نماز پڑھی[2]۔

مفہوم یہ ہوا کہ مؤذن کی آواز سن کر جتنے آدمی مسجد آکر نماز پڑھیں گے ان سب کو اپنی اپنی نماز کا پورا ثواب تو ملے گا ہی مگر مؤذن تمام نمازیوں کے ثواب کے برابر مزید اجر پائے گا۔ کیونکہ اس نے ان کو نماز طرف بلایا تھا۔

تبصرہ:

ہم جوابا عرض کرتے ہیں کہ حدیث مذکورہ نہ تو دیئے ہوئے حوالہ کے مطابق ملی اور نہ ہی کتاب الاذان ملی۔ یہ حدیث نماز نبوی جدید سے اب منذری کے تصحیح کے ساتھ حذف کر دی گئی کیوں؟۔

﴿ غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں : ﴾

سیدنا معاویہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا: قیامت کے دن اذان دینے والوں کی گردنیں تمام لوگوں سے لمبی ہوں گی (اللہ کا نام بلند کرنے کی وجہ سے وہ نمایاں ہوں گے)[3]

سیدنا ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب نماز کے لئے اذان دی جاتی ہے تو شیطان پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتا ہے۔ اور اس حالت میں بھاگتا ہے کہ اس کی ہوا آواز سمیت خارج ہو رہی ہوتی ہے، اتنا دور بھاگ جاتا ہے کہ اذان کی آواز اس کے کانوں میں نہیں پڑتی۔ جب اذان

---

[1] بخاری باب رفع الصوت بالنداء حدیث 609

[2] نسائی 2 /13 اسے منذری نے جید کہا ہے

[3] مسلم باب فضل الاذان حدیث 387

ختم ہو جاتی ہے تو وہ آ جاتا ہے۔جب تکبیر کہی جاتی ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگتا ہے۔جب تکبیر ختم ہوتی ہے تو پھر آ جاتا ہے اور نمازی کے دل میں وسوسے ڈالتا ہے کہ فلاں بات یاد کر، فلاں بات یاد کر، یہاں تک کہ آدمی کو پتہ نہیں چلتا کہ اس نے کس قدر نماز پڑھی[1]۔

اذان کا جواب دینا :

سیدنا عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب موذن کہے: اللہ اکبر . اللہ اکبر پس تم بھی کہو: اللہ اکبر . اللہ اکبر پھر جب موذن پھر جب موذن کہے: اشھد ان لا الہ الا اللہ تم بھی کہو: اشھد ان لا الہ الا اللہ پھر جب موذن کہے: اشھد ان محمد ا رسول اللہ تم بھی کہو: اشھد ان محمد الرسول اللہ پھر جب موذن کہے: حی علی الصلاۃ تو تم کہو: لاحول ولا قوۃ الا باللہ پھر جب موذن کہے: حی علی الفلاح تو تم کہو: لاحول ولا قوۃ الا باللہ پھر جب موذن کہے: اللہ اکبر . اللہ اکبر تو تم کہو: اللہ اکبر . اللہ اکبر پھر جب موذن کہے: لا الہ الا اللہ تو تم بھی کہو: لا الہ الا اللہ جو شخص صدق دل سے موذن کے کلمات کا جواب دے گا تو جواب کی برکت سے بہشت میں داخل ہو جائے گا[2]۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: الصلاۃ خیر من النوم کے جواب میں صدقت وبررت کے الفاظ کی کوئی اصل نہیں [3]۔

لہٰذا فجر کی اذان میں الصلاۃ خیر من النوم کے جواب میں بھی یہی کلمہ، یعنی الصلاۃ خیر من النوم ہی کہنا چاہئے۔ قد قامت الصلاۃ کے جواب میں اقامہا اللہ وادامھا کہنے والی ابوداؤد کی روایت ۵۲۸ کو نوویؒ نے ضعیف کہا ہے[1]۔

---

[1] بخاری باب فضل الاذان حدیث 608 مسلم باب فضل الاذان وھرب الشیطان عند سماعہ حدیث 389

[2] مسلم باب استحباب القول مثل قول المؤذن لمن سمعہ حدیث 385

[3] اہل سنت کے نزدیک جائز ہے سنت نہیں۔

اذان کے بعد کی دعائیں:

سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم موذن (کی آواز) سنو تو تم موذن کے جواب میں اسی طرح کہو جیسے وہ کہتا ہے اور (جب اذان ختم ہو جائے تو) پھر مجھ پر درود بھیجو، پس تحقیق جو مجھ پر ایک بار درود بھیجتا ہے اللہ اس پر دس بار رحمت بھیجتا ہے [2]

پس سب مسلمان مردوں اور عورتوں کو چاہئے کہ جب موذن اذان ختم کرے تو ایک بار یہ درود شریف پڑھیں:

اللھم صل علی محمد وعلی ال محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلی ال ابراھیم انک حمید مجید۔ اللھم بارک علی محمد وعلی ال محمد کما بارکت علی ابراھیم وعلی ال ابراھیم انک حمید مجید.

یاالٰہی! رحمت بھیج محمد ﷺ اور آل محمد پر جیسے تو نے رحمت بھیجی ابراہیم علیہ السلام اور آل ابراہیم پر، بیشک تو تعریف کیا گیا، بزرگی والا ہے۔

یاالٰہی! برکت بھیج محمد ﷺ پر اور آل محمد پر جیسے تو نے برکت بھیجی ابراہیم علیہ السلام پر اور آل ابراہیم پر بیشک تو تعریف کیا گیا بزرگی والا ہے[3]۔

سیدنا جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اذان سن کر جواب دے اور پھر اذان ختم ہونے پر یہ دعا پڑھے، اس کے لئے قیامت کے دن میری شفاعت واجب ہو جاتی ہے:

---

[1] اسے حافظ ابن حجر رحمہ نے بھی ضعیف کہا ہے لہٰذا قد قامت الصلوٰۃ کے جواب میں قد قامت الصلوٰۃ کے الفاظ ہی کہے جائیں باقی کلمات کا جواب { حدیث فقولوا مثل مایقول الموذن کے عموم پر عمل کرتے ہوئے } آذان کی جواب کی طرح دیا جائے گا کیونکہ اقامت کو بھی آذان کہا گیا ہے۔ { بخاری باب بین کل اذانین صلوۃ حدیث 627

اہل سنت والجماعت کے نزدیک فضیلت عمل میں ضعیف حدیث پر عمل جائز ہے، جس پر ہمارا (اہل سنت والجماعت کا) تفصیلی بحث "ضعیف حدیث پر عمل" کے عنوان کے تحت آرہا ہے۔

[2] مسلم باب استحباب القول الموذن حدیث 384

[3] بخاری باب 10 حدیث 3370

اللھم رب ھذہ الدعوۃ التامۃ والصلاۃ القائمۃ ات محمد ا الوسیلۃ والفضیلۃ

وابعثہ مقاما محمودا الذی وعدتہ

اے اللہ ! اس پکار کے رب قیامت تک قائم رہنے والی نماز کے رب ! محمد ﷺ کو وسیلہ اور بزرگی عطا فرما اور انہیں اس مقام محمود میں پہنچا جس کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے[1] ۔

وسیلے کی تشریح :

وسیلے کے متعلق خود رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: بیشک وسیلہ بہشت میں ایک درجہ ہے جو بندگان الٰہی میں سے صرف ایک بندے کے لائق ہے اور امید رکھتا ہوں کہ وہ بندہ میں ہی ہوں ، لہٰذا جس نے (اذان کی دعا پڑھ کر) اللہ سے میرے لئے وسیلہ مانگا، اس کے لئے (میری) شفاعت واجب ہو گئی[2] ۔

نبی اکرم ﷺ کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ وسیلہ بہشت کے ایک بلند و بالا درجے کا نام ہے۔

دعائے اذان میں خود ساختہ کلمات کے اضافے کی حقیقت :

مسنون دعائے اذان میں بعض لوگوں نے چند الفاظ بڑھا رکھے ہیں اور وہ الفاظ مروجہ کتب نماز میں بھی موجود ہیں۔ دعائے مسنون کے الفاظ والفضیلۃ کے بعد "[3]والدرجۃ الرفیعۃ "کی زیادتی

---

[1] بخاری باب الدعا عند النداء حدیث 614

[2] مسلم باب استحباب القول مثل ما قول المؤذن حدیث 384

[3] تبصرہ: ہم (اہل سنت) تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ "والدرجۃ الرفیعۃ" کے الفاظ ثابت ہیں " عن جابر بن عبد اللہ مرفوعا " (عمل الیوم واللیل، ج: 1/ ص: 87، حدیث: 95، لمطبع جدہ، واتحاف الزائر، ابن عساکر، (ج: 1/ ص: 47، والامام لابن الدقیق العید، ج: 1/ ص: 143، واحیاء علوم الدین لابن غزالی، ج: 1/ ص: 146، 309

کرتے ہیں اور آگے وعدتہ کے خالص دودھ میں "وارزقنا شفاعته يوم القيمة [1]"کا پانی ملا رکھا ہے اور پھر اخیر میں مسنون دعا کے اندر یاارحم الراحمین کی آمیزش ہے۔ افسوس! کیا نبی اکرم ﷺ کی فرمودہ دعا میں یہ خامی رہ گئی تھی جو بعد کے لوگوں نے اپنے اضافے سے پوری کی؟ مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کے فرمان پاک میں کمی بیشی کرنے کے تصور سے کانپ اٹھنا چاہئے۔

نبی اکرم ﷺ نے رات کو باوضو ہو کر سونے سے پہلے پڑھنے کے لئے ایک دعا بتائی۔ سیدنا براء بن عازبؓ نے پڑھ کر سنائی تو بنبیک کی جگہ برسولک یعنی نبی کی جگہ رسول کہا۔ تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: میرے بتائے ہوئے لفظ نبی کو رسول سے مت بدلو بلکہ بنبیک ہی کہو[2]۔

سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص مؤذن کی اذان سن کر یہ دعا پڑھے تو اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ دعا یہ ہے:

اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريک له وان محمد اعبده ورسوله رضيت بالله ربا وبمحمد رسولا وبالاسلام دينا.

"میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور تحقیق محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ میں اللہ کے رب ہونے اور محمد ﷺ کے رسول ہونے اور اسلام کے دین ہونے پر راضی ہوں [3]"۔

---

[1] تبصرہ: " ورزقنا" کے بجائے "وجعلنا فی شفاعته يوم القيامة " کے الفاظ ثابت ہے، دیکھئے المعجم الوسیط للطبرانی، ج: 4/ ص: 78، رقم: 3662، وشرح ابن ماجہ للمغلطائی، ص: 115، والترغیب للمنذری، ج: 1/ ص: 110، رقم 3988

[2] بخاری باب فضل من بات علی الوضوء حدیث 6311'247 مسلم باب مایقول عند النوم واخذ المضجع حدیث 2710

[3] مسلم باب استحباب القول مثل قول المؤذن حدیث 382

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

اذان و اقامت کے دیگر مسائل:

ہر نماز کے وقت اذان دینی لازم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب نماز کا وقت آئے تو تم میں سے کوئی ایک اذان کہے [1]۔

سیدنا بلال ؓ سے مذکور ہے کہ وہ اذان کہتے ہوئے کانوں میں انگلیاں ڈالتے تھے [2]۔

تبصرہ:

ہم تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ بخاری میں حضرت بلال کے اثر کے ساتھ حضرت ابن عمر کا اثر بھی ہے کہ وہ کانوں میں **انگلیاں** نہیں ڈالتے تھے۔ ترمذی میں یہ حدیث سفیان کی روایت ہے اور معنعن ہے اور سفیان کو متعدد مقامات پر مرحوم علی زئی صاحب مدلس کہہ چکے ہیں۔

﴿ غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں : ﴾

"حی علی الصلاۃ" کہتے وقت منہ دائیں طرف پھیریں اور " حی علی الفلاح " کہتے وقت بائیں طرف۔

سیدنا عثمان بن ابو العاص ؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے انہیں ان کی قوم کا امام مقرر کیا اور فرمایا: واتخذ مؤذنا لا یأخذ علی أذانه أجرا [3] "مؤذن وہ مقرر کرو جو اپنی اذان پر مزدوری نہ لے"۔

تبصرہ:

ہم جوابا عرض کرتے ہیں کہ امام ترمذی اور حاکم دونوں کو نماز نبوی والے متساہل بھی کہتے ہیں اور دونوں کی تصحیح سے کتاب کو بھی سجاتے ہیں۔ ترمذی کے اس روایت کے سند میں ایک راوی اشعث بن سوار ہیں جن کو آپ نے {جز قراءۃ ص:106} پر ضعیف قرار دیا ہے۔

---

[1] بخاری باب من قال لیؤذن فی السفر مؤذن وحد حدیث 628، 631، 819 مسلم باب من احق بالامامۃ حدیث 674

[2] بخاری باب ھل یتتبع المؤذن فاھھا ھنا وھا ھنا ترمذی باب ماجاء فی ادخال الاصبع الاذن عند الاذان حدیث 197

[3] بخاری باب ھل یتتبع المؤذن فاہ... حدیث 634 مسلم باب سترۃ المصلی حدیث 503

اور نیز یہ کہ اذان پر اجرت کے بارے میں آپ کے امام صفی الرحمن مبارک پوری {شرح بلوغ المرام 144/1 تحت حدیث 154} میں فرماتے ہیں جس کا حاصل کلام ہے" مؤذن کا اذان کی اجرت لینا جائز ہے یا ناجائز اس میں اختلاف ہے۔اس حدیث سے معاوضہ کی حرمت ثابت نہیں ہوتی البتہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بغیر معاوضہ اذان دینا مندوب و مستحب ہے۔

﴿غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں:﴾

مؤذن وہ مقرر کرنا چاہئے جو بلند آواز والا ہو۔سیدنا عبداللہ بن زیدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا: بلال کو آذان سکھاؤ کیونکہ وہ تم سے بلند آواز والا ہے[1]۔[2]

ایک صحابیہؓ فرماتی ہیں کہ مسجد کے قریب تمام گھروں سے میرا مکان اونچا تھا اور سیدنا بلالؓ اس مکان پر چڑھ کر فجر کی اذان دیتے تھے[3]۔[4]

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو فرمایا: جیسے مؤذن کہتا ہے تو بھی اسی طرح جواب دے، پھر جب تو جواب سے فارغ ہو جائے تو (دعا) مانگ! تو دیا جائے گا (تیری دعا قبول کی جائے گی)[5]۔[6]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اذان اور تکبیر کے درمیان اللہ تعالیٰ دعا رد نہیں فرماتا[1]۔[2]

---

1 ابو داؤد باب کیف الاذان حدیث 499 ترمذی باب ماجاء فی بدء الاذان حدیث 1899 اسے امام نووی نے صحیح کہا ہے

2 تبصرہ: اس حدیث کے سند میں محمد بن اسحاق راوی ہے جو عن سے روایت کر رہے ہیں اور ان کو مرحوم علی زئی صاحب نے مدلس کہا ہے۔

3 ابو داؤد باب الاذان فوق المنارۃ حدیث 519 ابن حجر نے صحیح کہا ہے

4 تبصرہ: اس حدیث کے سند میں محمد بن اسحاق راوی ہے جو عن سے روایت کر رہے ہیں اور ان کو مرحوم علی زئی صاحب نے {جزء رفع یدین ص:49 اور تسہیل الوصول ص:357,370} پر مدلس کہتے ہیں۔لہذا ان حضرات کے اصول کے مطابق روایت ضعیف ہے۔

5 ابوداؤد باب مایقول اذا سمع المؤذن حدیث 524 اسے امام ابن حبان نے صحیح کہا ہے

6 تبصرہ: اس حدیث کے سند میں محمد بن اسحاق راوی ہے جو عن سے روایت کر رہے ہیں اور ان کو مرحوم علی زئی صاحب نے {جزء رفع یدین ص:49 اور تسہیل الوصول ص:357,370} پر مدلس کہتے ہیں۔لہذا آپ کے اصول کے مطابق روایت ضعیف ہے۔

بعض علاقوں میں بیماریوں اور وبا کے موقع پر لوگ گھر گھر اذانیں دیتے ہیں، یہ سنت سے ثابت نہیں کیونکہ اس سلسلے میں پیش کی جانے والی تمام روایات ضعیف ہیں[3]۔

الصلاۃ خیر من النوم کے الفاظ سوائے اذان فجر کے کسی اور اذان میں نہ کہے جائیں۔

اقامت، اذان کے فورا بعد نہیں ہونی چاہئے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اذان اور تکبیر کے درمیان نفل نماز کا وقفہ ہوتا ہے[4]۔

صبح صادق سے کچھ دیر پہلے والی اذان جائز ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تمہیں بلال کی اذان سحری کھانے سے نہ روکے کیونکہ وہ رات کو اذان دیتا ہے تاکہ تہجد پڑھنے والا {آرام کی طرف} لوٹ آئے اور سونے والا {نماز فجر کے لئے} خبردار ہو جائے[5]۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جب اقامت ہو جائے تو فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں ہوتی[6]۔

رسول اللہ ﷺ نے میدان عرفات میں دو نمازیں اکٹھی پڑھیں۔ آپ نے اذان ایک مرتبہ دلوائی اور ہر نماز کی اقامت الگ الگ کہلوائی[7]۔

---

1 مسند احمد 225/3 ابن خزیمہ حدیث 426، 427 اسے امام ابن حبان نے صحیح کہا ہے

2 **تبصرہ:** مسند احمد کی اس روایت کی سند میں سفیان ثوری ہے اور ان کو جناب مرحوم علی زئی صاحب اور بدیع الدین {غیر مقلد} مدلس کہتے ہیں {الفتح المبین لعلی زئی ص:36 ، جزء منظوم لبدیع الدین ص:89۔ اور دوسرا اس کی سند میں زید العمی ہے جو عند الجمہور ضعیف ہے {تہذیب الکمال ج:2 ص:238}۔ اور احمد اور ابن خزیمہ کی سند میں ابو اسحاق اور یونس موجود ہے اور یہ دونوں بتصریح علی زئی اور بدیع الدین صاحب کے مدلس ہے {الفتح المبین ص:58 ،48 ،جزء منظوم لبدیع الدین ص:89 ،91} اور اسی طرح ابن حبان کی سند میں بھی ابو اسحاق مدلس ہے اور ان کے نزدیک مدلس کی غیر صحیحین والی روایت ضعیف ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے۔

3 جوابا عرض ہے کہ یہ مجرب عمل ہے بعض صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے۔

4 بخاری باب کم بین الاذان ولاقامة ومن ینتظر الاقامة؟ حدیث 624 مسلم باب بین کل اذانین صلاۃ حدیث 8

5 بخاری باب الاذان قبل الفجر حدیث 621

6 مسلم باب کراھیة الشروع فی النافلة بعد شروع المؤذن حدیث 710

7 مسلم باب حجة النبی صلی اللهعلیهو سلم حدیث 1218

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب اقامت کہی جائے تو صف میں شامل ہونے کے لئے نہ بھاگو بلکہ وقار کے ساتھ چلتے ہوئے آؤ جو نماز تم امام کے ساتھ پالو وہ ٹھیک ہے اور جو رہ جائے، اسے بعد میں پورا کرو[1]۔

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک بلال رات کے وقت اذان دیتے ہیں، پس تم کھاؤ اور پیو (بلال کی اذان سن کر سحری کھانا نہ چھوڑو) [2]۔

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث میں اس پہلی اذان کی حکمت یہ ہے کہ سیدنا بلالؓ کی اذان اس لئے ہوتی تاکہ نماز تہجد ادا کرنے والا (آرام کے لئے یا سحری کھانے کے لئے) واپس ہو جائے اور جو سویا ہوا ہو وہ (نماز فجر کے لئے یا سحری کھانے کے لئے) بیدار ہو جائے[3]۔

اس اذان اور نماز فجر کی اذان میں اتنا وقفہ نہیں ہوتا تھا جتنا کہ آج کل گھنٹہ، آدھا گھنٹہ کیا جاتا ہے۔ سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ دونوں موذنوں کے درمیان صرف اسقدر وقفہ ہوتا تھا کہ ایک اذان دے کر اترتا اور دوسرا اذان کے لئے چڑھ جاتا[4]۔

ایک شخص اذان سن کر مسجد سے باہر نکل گیا تو سیدنا ابوہریرہؓ نے فرمایا: بیشک اس شخص نے سیدنا ابوالقاسم ﷺ کی نافرمانی کی[5]۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو نماز کا ارادہ کر کے آتا ہے تو وہ نماز ہی میں ہوتا ہے[6]۔

---

[1] بخاری باب لایسعی الی الصلوۃ حدیث 636، 908 مسلم باب استحباب اتیان الصلوۃ بوقار وسکینۃ حدیث 602

[2] بخاری باب الاذان قبل الفجر حدیث 622 ' 623 ' 1919 مسلم باب ان الدل فی الصوم یحصل بطلوع الفجر 1092

[3] بخاری باب الاذان قبل الفجر حدیث 621 مسلم ان الدل فی الصوم یحصل بطلوع الفجر 1093

[4] مسلم حوالہمذکورہحدیث 1092

[5] مسلم باب النھی عن الخروج من المسجد اذا اذن المؤذن حدیث 655

[6] مسلم باب استحباب اتیان الصلواۃ بوفار وسکینۃ حدیث 602

حمید روایت کرتے ہیں میں نے ثابت بنانی سے پوچھا کیا نماز کی اقامت ہو جانے کے بعد امام باتیں کر سکتا ہے؟ تو انہوں نے مجھے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی ایک مرتبہ نماز کی اقامت ہو چکی تھی۔ اتنے میں ایک شخص آیا اور اقامت ہو جانے کے بعد نبی ﷺ سے باتیں کرتا رہا[1]۔

سیدنا ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ نماز کی اقامت کہہ دی گئی اور کھڑے ہو کر صفیں درست کی گئیں، اتنے میں رسول اللہ ﷺ ہماری طرف نکل آئے۔ جب نماز کی جگہ میں کھڑے ہوئے، آپ کو یاد آیا کہ آپ جنبی ہیں تو آپ نے لوگوں سے کہا: اپنی جگہ کھڑے رہو۔ پھر آپ نے گھر جا کر غسل فرمایا اور جب آپ واپس تشریف لائے تو آپ کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا، پھر آپ نے تکبیر کہہ کر نماز پڑھائی[2]۔

قبلہ اور سترہ

احکام قبلہ:

رسول اللہ ﷺ سواری پر (نفل یا وتر) نماز ادا کرنے کا ارادہ کرتے تو جدھر سواری کا منہ ہوتا، اسی طرف نبی اکرم ﷺ کا رخ ہوتا:

نبی اکرم ﷺ دوران سفر رات کی نماز، اپنی سواری پر اشارے سے پڑھتے تھے، سواری کا منہ چاہے جدھر بھی ہوتا، فرضوں کو سواری پر نہ پڑھتے، البتہ وتر سواری پر ہی پڑھتے تھے[3]۔[4]

---

[1] بخاری باب الکلام اذا اقیمت الصلوۃ حدیث 643

[2] بخاری باب اذا قال الامام مکانکم حدیث 640

[3] بخاری باب الوتر فی السفر حدیث 1000 مسلم باب جواز صلوۃ النافلۃ علی الدابۃ فی السفر حیث توجہت حدیث 700

[4] **تبصرہ:** اس بات کی ذرا وضاحت ہو جائے کہ ترجمہ میں لفظ ''ہی'' {برائے حصر} حدیث کے کس لفظ کا ترجمہ ہے؟ کیا یہ تحریف تحریف معنوی نہیں ہے؟۔ ترجمہ میں لفظ ''ہی'' برائے حصر ہے۔ مثال کے طور پر ہم کہتے ہیں ایاک نعبد یعنی ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ ''ہی'' برائے حصر ہوا کہ کسی اور کی عبادت نہیں کرتے۔ حصر میں دو قضیے ہوتے ہیں ایک قضیہ ایجابیہ اور قضیہ سلبیہ جیسا کے مثال میں واضح ہوا کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں یہ قضیہ ایجابیہ ہوا تیرے علاوہ کسی کی عبادت نہیں کرتے یہ قضیہ سلبیہ

اور کبھی نبی اکرم ﷺ کا یہ معمول بھی دیکھنے میں آتا کہ جب اونٹنی پر نوافل ادا کرنے کا ارادہ فرماتے تو اونٹنی کا منہ قبلہ رخ کرتے اور تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز شروع فرمادیتے، اس کے بعد نوافل ادا فرماتے رہتے سواری کا رخ جس طرف بھی ہوتا[1]۔

اس صورت میں آپ رکوع اور سجدہ سر کے اشارے سے کرتے، البتہ سجدے کی حالت میں رکوع کی نسبت سر کو زیادہ جھکا لیتے[2]۔

جب فرض نماز ادا کرنا مقصود ہوتا تو سواری سے اترتے اور قبلہ رخ کھڑے ہو جاتے[3]۔

قبلے کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔ مشرق و مغرب کے درمیان والی تمام سمت قبلہ ہے[4]۔

یہ حکم اہل مدینہ اور ان لوگوں کے لئے ہے جن کا قبلہ مشرق و مغرب کے درمیان یعنی شمال یا جنوب والی سمت میں ہے۔ رہے برصغیر پاک و ہند کے لوگ یا تمام وہ لوگ جن کا قبلہ مغرب یا مشرق کی طرف ہے تو ان کے لئے شمال و جنوب کے درمیان والی تمام سمت قبلہ ہے[5]۔

ہو۔ اب آپ کے ترجمہ کا مطلب ہوگا وتر سواری پر ہی پڑھتے تھے۔ یہ قضیہ ایجابیہ ہوا تو اس کا قضیہ سلبیہ یہ ہوا کہ سواری کے علاوہ نہیں پڑھتے تھے۔ ائمہ کرام کا دامن چھوڑیں گے تو ایسا ہی ہوگا حدیث کا ترجمہ بھی دشوار ہو جائے گا۔ اس روایت کے سند میں ایک راوی سفیان ہیں جو عن کے ساتھ روایت کر رہے ہیں اور ان کو محقق مرحوم علی زئی صاحب مدلس کہتے ہیں۔

[1] ابوداؤد باب التطوع علی الراحلة والوتر حدیث 1225 اسے ابن سکن اور ابن ملقن وغیرہ نے صحیح اور منذری نے حسن کہا ہے

[2] ترمذی باب ماجاء فی الصلوة علی الدابة حیثما توجهت بهحدیث 351 اسے امام ترمذی نے صحیح کہا ہے

[3] بخاری باب ینزل للمکتوبة حدیث 1099

[4] ترمذی باب ماجاء ان بین المشرق والمغرب قبلة حدیث342، 344 اس حدیث کو امام ترمذی نے حسن کہا ہے

[5] تبصرہ: نماز نبوی جدید میں ترجمہ ہے " مشرق اور مغرب والی تمام سمت قبلہ ہے " ان دونوں میں کون سا ترجمہ صحیح ہے جدید یا قدیم؟۔ محققین حضرات ابھی تک " مابین المشرق والمغرب " کا صحیح مطلب نہ سمجھ سکیں۔ محققین حضرات کل نصف دائرہ کو قبلہ کہتے ہیں جبکہ کل نصف دائرہ کو کوئی بھی قبلہ نہیں کہتا۔ قرآن کریم نے بڑے آسان انداز میں سمجھایا کہ جہاں کہیں بھی تم نماز پڑھو تو مسجد حرام کی طرف منہ کرو۔ آپ ﷺ نے اس حدیث میں مدینہ والوں کی سمت قبلہ بتا رہے ہیں کہ تمہارا قبلہ مشرق اور مغرب کے درمیان آرہا ہے۔

نمازی کے قبلے کی جانب قبر ہونے کی صورت میں لازم ہے کہ وہاں سے ہٹ کر نماز ادا کرے۔آپ ﷺ نے فرمایا: قبروں کی جانب منہ کرکے نماز ادا نہ کرو اور نہ قبروں پر بیٹھو[1]۔

سترے کا بیان:

یہاں سترے سے مراد وہ چیز ہے جسے نمازی اپنے آگے کھڑا کرکے نماز پڑھتا ہے تاکہ اس کے آگے سے گزرنے والا (سترے کی دوسری طرف سے گزر جائے اور) گناہ گار نہ ہو۔لاٹھی، برچھی، دیوار، ستون اور درخت وغیرہ کو سترہ بنایا جاسکتا ہے اور امام کا سترہ سب مقتدیوں کے لئے کافی ہوتا ہے۔

سیدنا طلحہ بن عبید اللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

جب تم میں سے کوئی شخص اپنے سامنے پالان کی پچھلی لکڑی کے برابر (کوئی چیز) رکھ لے تو نماز جاری رکھے اور جو کوئی اس کی باہر والی طرف سے گزرے اس کی پرواہ نہ کرے[2]۔

عطاء بن ابی رباح (تابعیؒ) فرماتے ہیں کہ پالان کے پچھلے حصے کی لکڑی ایک ہاتھ یا اس سے کچھ زیادہ (لمبی) ہوتی ہے[3]۔

معلوم ہوا کہ کم از کم ایک ہاتھ لمبی لکڑی یا کوئی اور چیز سترہ بن سکتی ہے[4]۔

---

[1] مسلم باب النهي عن الجلوس على القبر والصلوة عليه حديث 972

[2] مسلم باب ستر المصلي حديث 499

[3] ابوداؤد باب مایستر المصلی حدیث 686 اسے ابن خزیمہ حدیث 807 نے صحیح کہا ہے

[4] **تبصرہ الف:** اس قول کے سند میں ایک راوی ابن جریج ہیں اور عن سے روایت کر رہے ہیں جن کو مرحوم علی زئی صاحب مدلس کہتے ہیں اور دوسرے راوی عبد الرزاق بھی عن سے روایت کر رہے ہیں جن کو مرحوم علی زئی صاحب {جزء قراءت ص:164} پر مدلس کہتے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ جزء قرات کے اسی صفحہ پر ابوداؤد کی یہی سند ہے یعنی عبد الرزاق عن ابن جریج عن عطاء اور اس سند کو مرحوم علی زئی صاحب نے ضعیف کہا اور یہی سند نماز نبوی میں صحیح ہو گی کیسے ؟۔{یہ قوم شعیب کے پیمانے تو نہیں}
تبصرہ ب: ڈاڑھی کے ایک مشت کے تعین کو ابن عمر کا قول کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے اور یہاں قول تابعی سے استدلال کر رہے ہیں۔

سیدنا ابو جحیفہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بطحاء میں لوگوں کو نماز پڑھائی اور آپ ﷺ کے سامنے ایک برچھی نصب تھی۔ آپ نے دو رکعت ظہر کی نماز پڑھائی اور دو رکعت عصر کی۔ اس وقت برچھی کی دوسری طرف سے عورتیں اور گدھے چلے جا رہے تھے[1]۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

نمازی کے آگے سے گزرنے کا گناہ:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر نمازی کے سامنے سے گزرنے والے کو گزرنے کی سزا معلوم ہو جائے تو اسے اس کے آگے سے گزرنے کی بجائے چالیس (دن، ماہ یا سال) تک وہیں کھڑے رہنا زیادہ بہتر ہو[2]۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم نماز ادا کرتے وقت آگے سترہ کھڑا کرو اور کوئی شخص سترے کے اندر (نمازی اور سترے کے درمیان) سے گزرنا چاہتے تو اس کے ساتھ مزاحمت کرو اور اسے آگے سے نہ گزرنے دو۔ اگر وہ نہ مانے تو اس سے لڑائی کرو۔ بیشک وہ شیطان ہے[3]۔

ایک روایت میں ہے کہ دو بار تو اسے ہاتھ سے روکو اگر وہ نہ رکے تو اس سے ہاتھا پائی سے بھی گریز نہ کیا جائے کیونکہ وہ شیطان ہے[4]۔[5]

نبی اکرم ﷺ سترے اور اپنے درمیان میں سے کسی چیز کو گزرنے نہ دیتے تھے۔ ایک دفعہ آپ نماز ادا فرما رہے تھے کہ ایک بکری دوڑتی ہوئی آئی۔ وہ آپ کے آگے سے گزرنا چاہتی تھی اور آپ

---

[1] بخاری، باب سترۃ الامام سترۃ من خلفہ، حدیث 495، مسلم باب سترۃ المصلی حدیث 503

[2] بخاری باب اثم المار بین یدی المصلی، حدیث 510، مسلم باب منع المار بین یدی المصلی حدیث 507

[3] بخاری باب یرد المصلی من مر بین یدیہ حدیث 509 مسلم باب منع المار بین یدی المصلی حدیث 505

[4] ابن خزیمہ حدیث 818 اور انہوں نے اسے صحیح کہا ہے

[5] **تبصرہ:** اس روایت کی سند میں ایک راوی ابو صالح باذام ہے جس کو خود مرحوم علی زئی صاحب {نور العینین ص: 245} پر ضعیف کہتا ہے۔

گزرنے نہیں دینا چاہتے تھے۔آپ نے اپنا بطن مبارک سترے کے ساتھ لگادیا (تو بکری کو سترے کے پیچھے سے گزرنا پڑا)[1]۔ [2]

رسول اللہ ﷺ کی جائے نماز (کھڑے ہونے کی جگہ) اور دیوار کے درمیان ایک بکری کے گزرنے کا فاصلہ ہوتا تھا[3]۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر نمازی کے آگے اونٹ کے پالان کی پچھلی لکڑی جتنا لمبا سترہ نہ ہو اور بالغ عورت، گدھا یا سیاہ کتا آگے سے گزر جائے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے اور سیاہ کتا شیطان ہے[4]۔

سیدہ عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے آگے سوتی تھی۔ میرے پاؤں آپ کے سامنے ہوتے تھے۔جب آپ سجدہ کرتے تو مجھے ہاتھ لگاتے، میں اپنے پاؤں سمیٹ لیتی اور جس وقت آپ کھڑے ہوتے تو پاؤں پھیلا دیتی۔ان دنوں گھروں میں چراغ نہیں ہوتے تھے [5]

معلوم ہوا کہ نمازی کے آگے سے گزرنا منع ہے۔اگر آگے کوئی لیٹا ہو تو کوئی حرج نہیں،اسی طرح عورت کے گزرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے اگر وہ سامنے لیٹی ہو تو کوئی حرج نہیں[6]۔

---

[1] ابن خزیمہ حدیث 827 امام حاکم اور ذہبی نے صحیح کہا ہے

[2] **تبصرہ:** اس روایت کی سند میں ایک راوی جریر بن حازم ہے جو عن سے روایت کر رہے ہیں اور مدلس ہیں { طبقات المدلسین ابن حجر} لہٰذا حدیث آپ کے اصول کے مطابق ضعیف ٹھہری۔

[3] بخاری باب قدر کم ینبغی ان یکون بین المصلی والسترة حدیث 496

[4] مسلم باب قدر ما یستر المصلی حدیث 510

[5] بخاری باب التطوع خلف المرأة حدیث 513،مسلم باب الاعتراض بین یدي المصلي 512

[6] **تبصرہ:** اکثر صحابہ کرام اور تابعین علما اور جمہور امت اس حدیث کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ نماز میں دل کا خشوع اور خضوع قطع ہوتا ہے نماز نہیں ٹوٹتی۔اس پر دلائل احادیث اور اقوال ائمہ کا انبار ہے جبکہ دوسری طرف یہ محققین اکیلے ہیں اپنے مؤقف میں کس کی بات مانی جائے۔فیصلہ قارئین خود کریں۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

رفع الیدین:

رفع الیدین یعنی ہاتھوں کا اٹھانا نماز میں چار جگہ ثابت ہے :

(1) شروع نماز میں تکبیر تحریمہ کے وقت (2) رکوع سے قبل (3) رکوع کے بعد (4) اور تیسری رکعت کے ابتدا میں۔

تبصرہ:

ہم (اہل سنت) تبصرہ کرتے ہوئے جواباً عرض کرتے ہیں کہ رفع یدین صرف چار نہیں بلکہ چار رکعتی نماز میں چھبیس { 26 } مقامات پر ثابت ہے۔ امام نسائی نے باب باندھا ہے { باب رفع الیدین للسجود } آنحضرت ﷺ جب سجدہ فرماتے تو رفع یدین کرتے اور جب سجدوں سے سر اٹھاتے تو بھی رفع یدین فرماتے " اور اس باب میں نسائی اسی کے ثبوت کے لئے تین احادیث لائے ہیں۔ ایک اور باب باندھا ہے {باب رفع الیدین بین السجدتین تلقاء الوجه} عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں ---" جب آپ ﷺ سجدہ فرماتے اور جب سجدہ سے سر مبارک اٹھاتے تو رفع یدین فرماتے ---"اور حرف آخر یہ ہے کہ ان محققین کے امام محدث شاہ ناصرالدین البانی خود ان حضرات سے شکوہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ سجدوں کے درمیان رفع یدین کرنا یہ بھی صحیح سند سے ثابت ہے لیکن ہمارے حضرات اس پر عمل نہیں کرتے { تعلیق علامہ البانی علی مشکوۃ } ۔اور مزے کی بات یہ ہے کہ صرف بین السجدتین نہیں بلکہ ہر تکبیر کے ساتھ رفع یدین کرنا ثابت ہے۔ابن ماجہ رفع یدین کے باب میں دو احادیث لائے ہیں " آپ ﷺ ہر تکبیر کے ساتھ رفع یدین کرتے تھے ۔ دوسری حدیث ابن عباس کی ہے " آپ ﷺ ہر تکبیر کے ساتھ رفع یدین فرماتے تھے۔ نیز فتح الباری اور تلخیص الحبیر میں حافظ ابن حجر, عبید اللہ بن زبیر اور ابو ہریرہ کے روایات بھی لائے ہیں کہ " آپ ﷺ ہر تکبیر کے ساتھ رفع یدین کرتے تھے ۔اسی طرح نصب الرایہ میں ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ ہر اٹھک بیٹھک میں آپ ﷺ رفع یدین کرتے تھے { 1/ 487 دار الکتب العلمیہ بیروت }۔ حضرت نافع فرماتے ہیں کہ حضرت ابن

عمر جب کسی کو دیکھتے کہ وہ ہر اٹھک بیٹھک میں رفع یدین نہ کرتا تو اس کو کنکریاں مارتے { سنن دار قطنی حدیث 1103 }۔ مسند احمد میں حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ ان سے بیعت رضوان میں صحابہؓ کے تعداد کے بارے میں معلوم کیا گیا تو فرمایا کہ ہم 1400 تھے پھر فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ ہر تکبیر پر رفع یدین فرمایا کرتے تھے۔ { مغنی ابن قدامہ 192/2 } میں ہے کہ امام احمد کے شاگرد عبد الملک میمونی نے رفع یدین کے بارے میں پوچھا تو احمد نے فرمایا کہ رفع یدین ہر اٹھک بیٹھک میں صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ امام علامہ ابن حزم فرماتے ہیں جب یہ بات صحیح طور پر ثابت ہے کہ تکبیر احرام کے بعد آپ ﷺ ہر اٹھک بیٹھک میں رفع کرتے تھے اور یہ بھی ثابت ہے کہ نہیں کرتے تھے ۔لہٰذا دونوں صورتیں مباح ہوں گے ... الخ۔ محققین نے جو مسلک اپنایا اور ان کی جو روش ہے یہ وہی ابن حزم والی ہے اور پھر خصوصا اس نماز نبوی میں جابجا تصحیح احادیث میں ان کی تقلید کی ہے اور خاص کر عصر کی نماز کے بعد نفل پڑھنے کے بارے میں ان محققین نے بخاری کی حدیث چھوڑ کر ان کی تقلید کی تھی تفصیل گزر چکی۔ تو اب ان کی بات ماننے میں کیا حرج تھا؟۔ اگر ابن حزم کی بات نہیں مانی تو پھر اپنے دوسرے ائمہ علامہ احمد شاکر کی { تحقیق علی الترمذی } تحقیق کو مان لو ان کو بھی نہیں ماننا تو پھر اکم از کم اپنے امام محدث شام ناصر الدین البانی کی بات تو مانی چاہیئے وہ فرماتے ہیں "ہر تکبیر کے ساتھ صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی جماعت سے رفع کرنا ثابت ہے اور صحیح ہے { صفۃالصلاۃ النبی } مزید فرماتے ہیں کہ میں تفصیل سے اس بارے میں بتا چکا ہوں ۔۔۔ الخ { تعلیق البانی علی مشکوۃ باب صفۃ الصلاۃ النبی ﷺ فصل اول } ۔ ان مقامات پر رفع یدین کرنا صحت کے ساتھ ثابت ہے یہ کل 26 مقامات بنتے ہیں جبکہ غیر مقلد بزرگ صرف 10 مقامات پر اس کے اثبات کے قائل ہیں اور باقی 16 میں نفی کے اس کی وجہ کیا ہے ؟۔

﴿ غیر مقلد احباب مزید فرماتے ہیں : ﴾

ان مقامات پر رفع الیدین کرنے کے دلائل درجہ ذیل ہیں :

1 : حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

"میں نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی وہ نماز کے شروع میں اور رکوع سے پہلے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو اپنے دونوں ہاتھ { کندھوں تک } اٹھاتے تھے اور کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نماز کے شروع میں رکوع سے پہلے اور رکوع سے سر اٹھانے کے بعد { اسی طرح } رفع الیدین کرتے تھے"[1]۔

تبصرہ:

ہم (اہل سنت) تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اس حدیث میں کندھوں تک ہاتھ اٹھانے کا کوئی اشارہ تک موجود نہیں یہ اپنی طرف سے اضافہ ہے۔ یہ اضافہ کس قرینہ کے تحت کیا گیا ؟۔اس حدیث کی سند میں ایک راوی ابو اسماعیل ہے جس کو امام ابو حاتم ضعیف کہتے ہیں۔ نیز اس کی سند منقطع ہے متصل نہیں کیونکہ صفار راوی کا سماع سلمی سے ثابت نہیں { حاشیہ بیہقی } علاوہ ازیں محمد بن فضل کا حافظہ بگڑ گیا تھا۔ امام بخاری اور ابن حبان نے بھی یہی کہا ہے کہ ان کا حافظہ بگڑ گیا تھا { حاشیہ بیہقی اور تہذیب الکمال } ۔اس حدیث میں ایک کے بجائے تین علتیں جمع ہو گئیں یعنی ایک راوی ضعیف اور دوسرے کا حافظہ خراب اور تیسرے منقطع اس کے باوجود اس حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں: ﴾

2 : حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ لوگوں کے نماز کا طریقہ بتانے کا ارادہ کیا تو قبلہ رخ ہو کر کھڑے ہو گئے اور دونوں ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھایا پھر اللہ اکبر کہا پھر رکوع کیا اور اسی طرح ہاتھوں کو بلند کیا اور رکوع سے سر اٹھا کر رفع الیدین کیا[2]۔

[1] رواہ بیہقی 2/ 73 وقال رواتہ ثقات 'قلت وسندہ صحیح

[2] بیہقی 'فی الخلافیات ورجال اسنادہ معروفون نصب الرایۃ 1/415'416

تبصرہ:

ہم (اہل سنت) اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں علامہ زیلعی {نصب الرایہ 1 490} پر حضرت عمر کا یہ اثر لانے کے بعد فرماتے ہیں وفیہ من یستضعف اس روایت کے سند میں وہ راوی بھی ہے جو ضعیف ہے۔اب اس روایت کو صحیح کہنا خیانت ہوگی کیونکہ علامہ زیلعی خود اس کی تضعیف کرچکے ہے۔علامہ زیلعی کی یہ بات درست ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ امام ابن شیبہ حضرت عمر کا اثر لائے ہیں " حضرت اسود فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب کے ساتھ نماز پڑھی تو حضرت عمر نے تکبیر افتتاح {تکبیر تحریمہ }کے سوا کہیں بھی رفع یدین نہیں کرتے تھے[1] ۔اب اس حدیث استدلال درست نہیں جبکہ یہ آپ کے اصول کے مطابق ایک صحابی عمل بھی ہے۔

﴿غیر مقلد احباب مزید فرماتے ہیں:﴾

3: حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے شروع میں رکوع میں جانے سے پہلے اور رکوع سے سر اٹھانے کے بعد اور دو رکعتیں پڑھ کر کھڑے ہوتے وقت رفع الیدین کرتے تھے[2]۔

تبصرہ:

ہم (اہل سنت)جوابا عرض کرتے ہیں کہ اس روایت کی سند میں ایک راوی عبد الرحمٰن بن ابی الزناد ہیں ۔ان کو جمہور محدثین نے ضعیف کہا ہے۔اور خود مرحوم علی زئی صاحب کے بنائے اصول ہے کہ جس راوی کو جمہور ضعیف کہیں تو وہ ضعیف ہوتا ہے {مترجم موطا امام مالک }۔نیز حضرت علی کا اپنا عمل ترک رفع یدین کا ہے حضرت علی تکبیر افتتاح کے علاوہ اور کسی مقام پر رفع یدین نہیں کرتے تھے[3].

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ باب من کان یرفع یدیہ في اول تکبیر الصلاۃ ثم لایعود

[2] ابو داؤد باب افتتاح الصلاۃ حدیث 744 اسے امام البانی نے حسن کہا ہے

[3] مصنف ابن ابی شیبہ باب من کان یرفع یدیہ فی اول تکبیرۃ ثم لایعود ، وبیہقی حدیث 34،25

﴿ غیر مقلد احباب مزید فرماتے ہیں : ﴾

4 : حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شروع نماز میں رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد اپنے دونوں ہاتھ کندھوں تک اٹھایا کرتے تھے [1]۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ { خود بھی } شروع نماز میں 'رکوع سے پہلے' رکوع کے بعد اور دو رکعتیں پڑھ کر کھڑے ہوتے وقت رفع الیدین کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح کرتے تھے [2]۔

تبصرہ:

ہم (اہل سنت) پیش کردہ مستدل پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اس روایت کی سند میں اضطراب ہے کہ یہ مرفوع ہے یا موقوف امام بخاری اس حدیث کو مرفوعا روایت کرتے ہیں۔ یعنی سالم بن عبداللہ اس کو مرفوعا روایت کرتے ہیں جبکہ لیث بن سعد، مالک، ایوب، ابن جریج، اور نافع روایت کو موقوفا بیان کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ ابن عمر کا قول ہے مرفوع روایت نہیں۔ حافظ اصیلی اور زرقانی دونوں فرماتے ہیں کہ امام مالک نے اس روایت کو اسی وجہ سے نہیں لیا کہ یہ موقوف ہے {زرقانی 1 / 143}۔ اور اس روایت کی متن میں بھی شدید اضطراب ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں : ﴾

امام بخاری کے استاد علی بن مدینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ کی بنا پر رفع الیدین کرنا ضروری ہے [3]

---

[1] بخاری باب رفع الیدین فی التکبیر الاولی مع الافتتاح سواءحدیث735'736'738'مسلم باب استحباب رفع الیدین حذو المنکبین حدیث390

[2] بخاری باب فع الیدین اذاقام من الرکعتین حدیث739

[3] التلخیص الحبیر ج1ص218طبع جدید

5 : حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ شروع نماز میں رفع الیدین کرتے پھر جب رکوع کرتے تو رفع الیدین کرتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو رفع الیدین کرتے اور یہ فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح کیا کرتے تھے[1]۔

تبصرہ:

ہم جواباً عرض کرتے ہیں کہ یہی روایت نسائی میں بھی ہے اس میں چار مقامات پر رفع یدین کا ذکر ہے" رکوع میں جاتے, رکوع سے اٹھتے, سجدے میں جاتے اور سجدے سے اٹھتے وقت۔ اور نسائی کی دوسری روایت میں پانچوں مقامات پر رفع یدین کا ذکر ہے چار تو مذکورہ بالا اور پانچویں دونوں سجدوں کے درمیان۔ نیز مالک بن حویرث کے اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ رفع یدین کرتے وقت دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھاتے تھے { نسائی باب رفع الیدین للسجود } تو کیا یہ انصاف ہے کہ ایک ہی حدیث سے اپنی مرضی کی چیزیں اٹھاؤ اور باقی حدیث قابل اعتناء بھی نہ سمجھو کیا یہ دین میں اپنی طرف مداخلت نہیں ؟۔ ثبوت رفع یدین کا امت میں کوئی بھی منکر نہیں۔ لیکن آخر عمر تک رفع یدن کا ثبوت اور وجوبیت اور فرضیت کے لئے مستقل (الگ الگ) دلیل ناطق کی ضرورت ہے جو تا قیامت محققین کے ذمہ فرض اور قرض ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں : ﴾

حضرت وائل ین حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں : میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جب آپ نماز شروع کرتے تو اللہ اکبر کہتے

اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے ۔ پھر اپنے ہاتھ کپڑے میں ڈانک لیتے پھر دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھتے ۔جب رکوع کرنے لگتے تو کپڑے سے ہاتھ باہر نکالتے اللہ اکبر کہتے اور رفع الیدین کرتے جب رکوع سے اٹھتے سمع اللہ لمن حمد کہتے اور رفع الیدین کرتے[2]۔ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ 9

---

[1] بخاری باب رفع الیدین اذا کبر واذا رکع واذا فع حدیث 737 مسلم باب استحباب رفع الیدین حدیث 391

[2] مسلم باب وضع یدھالیمنی علی الیسری حدیث 401

ہجری اور 10 ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے ۔ لہذا ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم 10 ہجری تک رفع الیدین کرتے تھے' 11 ہجری میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی لہذا آخر عمر تک رفع الیدین کرنا ثابت ہوا۔

تبصرہ:

ہم غیر مقلد احباب کی پیش کردہ مستدل پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ سیدنا وائل بن حجر آپ ﷺ کی خدمت میں دو مرتبہ حاضر ہوئے۔ جب پہلی دفعہ حاضر ہوئے تو رکوع میں آنے اور رکوع میں جانے کے بعد رفع یدین کا ذکر فرمایا۔ لیکن ابوداؤد کی روایت میں اس پہلی دفعہ مشاہدہ میں وائل بن حجر سجدہ سے سر اٹھاتے وقت بھی رفع یدین کا ذکر فرماتے ہیں ۔ لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ رکوع میں آتے اور رکوع سے جاتے وقت تو رفع یدین پر عمل کیا جاتا ہے اور سجدے سے اٹھتے وقت کے رفع کے یدین کو ترک کیا جاتا ہے ؟۔یہی سیدنا وئل بن حجر جب دوسری مرتبہ تشریف لائے تو پھر اپنے مشاہدہ میں صرف تکبیرے تحریمہ والی رفع یدین کے ذکر پر اکتفا فرماتے ہیں۔ مسلم شریف کی اس روایت کو آپ ﷺ کا آخری عمل قرار دیا لیکن اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ اپنے دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھاتے تو پھر یہ بھی یہ آپ ﷺ کا آخری عمل ہوا ۔ لیکن اس آخر عمل پر آپ کے اقرار کے باوجود کہ یہ آپ ﷺ کا آخری عمل ہے اس پر ترک عمل کو معول بنایا ہے حالانکہ حدیث ایک ہی ہے۔

دوسری خاص بات یہ ہے کہ آپ اس کو آپ ﷺ کا آخری عمل ثابت کرنا چاہتے ہیں جبکہ آپ ﷺ تو اس کے بعد ایک سال تک بقید حیات رہے۔ اب اس کے بعد عرصہ میں آپ حضرات یہ عمل ثابت کریں۔

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں : ﴾

7 : حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کے ایک مجمع میں بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرتے اور جب رکوع میں جاتے جب رکوع سے سر اٹھاتے اور جب

دو رکعتیں پڑھ کر کھڑے ہوتے تو رفع الیدین کرتے تھے۔ تمام صحابہ نے کہا تم سچ بیان کرتے ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح نماز پڑھتے تھے[1]۔

تبصرہ:

ہم جواباً عرض کرتے ہیں کہ یہاں ابو حمید الساعدی کی حدیث لائے ہیں۔ اس حدیث پر بحث "گیارہ صحابہ کی شہادت" کے عنوان کے تحت ہو چکی ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں: ﴾

امام ابن خزیمہ اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ میں نے محمد بن یحی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جو شخص حدیث ابو حمید سننے کے باوجود رکوع میں جاتے اور اس سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین نہیں کرتا تو اس کی نماز ناقص ہو گی[2]۔

تبصرہ:

ہم (اہل سنت) پیش کردہ مستدل پر تبصرہ کرتے ہوئے جواباً عرض کرتے ہیں کہ امام محمد بن یحی کا یہ قول پوری امت کے خلاف ہے۔ کیونکہ امت میں کوئی اس بات کا قائل نہیں کہ رفع یدین نہ کرنے سے نماز ناقص ہوتی ہے سوائے ان حضرات کے۔ اختلاف صرف افضیلت اور عدم افضیلت کا ہے۔ ابو حمید الساعدی کی جس حدیث کے بارے میں امام ابن خزیمہ نے یہ قول نقل کیا ہے اس میں رفع یدین کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے پہلے جو روایات لائے ہیں اس میں صرف رکوع میں جاتے وقت رفع یدین کا ذکر ہے۔ نیز محمد بن یحی کے قول پر اصحاب عبداللہ بن مسعود اصحاب علی ,امام مجاہد ,ابراہیم نخعی ,امام اعظم ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہم اللہ تعالی کے اقوال مقدم ہیں۔ نیز اس حدیث کے بارے میں تفصیل گزر چکی ہے۔

---

[1] ابو داؤد باب افتتاح الصلاۃ حدیث 730

[2] صحیح ابن خزیمہ 298/1 حدیث 588

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں : ﴾

8 : حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے { ایک دن لوگوں سے } فرمایا کیا میں تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز نہ بتاؤں ؟ یہ کہہ کر انہوں نے نماز پڑھی جب تکبیر تحریمہ کہی تو رفع الیدین کیا پھر جب رکوع کیا رفع الیدین کیا اور تکبیر کہی پھر سمع اللہ لمن حمدہ کہہ کر دونوں ہاتھ { کندھوں تک } اٹھائے پھر فرمایا اسی طرح کیا کرو [1]۔

تبصرہ :

اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم عرض کرتے ہیں کہ پہلی بات یہ ہے کہ اس حدیث کی سند میں حماد بن سلمہ ہے جن کا آخری عمر میں حافظہ خراب ہو گیا تھا۔ چنانچہ اہل حدیث عالم دین شارح ترمذی مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری صاحب نے اس بات کی تصریح کی ہے۔" اس اثر کی سند میں حماد بن سلمہ واقع ہے اور آخر میں ان کا حافظہ متغیر ہو گیا تھا۔ حافظ ابن حجر تقریب میں لکھتے ہیں" تغیر باخرہ انتہی { تحقیق الکلام ج:1 ص:103 }۔ حماد بن سلمہ کی وفات 167ھ میں ہوئی اور اس روایت کو ان سے روایت کرنے والے شاگرد نضر بن شمیل ہے۔ جن کی وفات 203ھ میں ہوئی ہے۔ جو کہ متاخر سماع والا ہے اور نضر بن شمیل نے یہ روایت حماد بن سلمہ سے ان کے حافظہ خراب ہونے کے بعد سنی ہے۔ لہٰذا اس روایت سے استدلال درست نہیں۔ علامہ امیر یمانی { غیر مقلد } اس کی شرح میں بہت سے محدثین سے حماد بن سلمہ کی روایت کے غیر محفوظ اور خطا ہونے کے فتوے نقل کرتے ہیں ان کی اصل عبارت یہ ہے : هذا الحديث لم يروه عن ايوب الا حماد بن سلمة وقال المنذري قال ترمذي هذا حديث غير محفوظ . وقا ل علي بن المديني حديث حماد بن سلمة هو غير محفوظ واخطأ فيه حمادبن سلمه [2]۔

---

[1] داری قطنی 692/1۔التلخیص 219/1

[2] سبل السلام ج:1 ص:77 باب الاذان. بحوالہ نور الصباح ج:1 ص:235

دوسری بات یہ ہے کہ اس روایت سند میں ایک راوی اسحاق بن راہویہ ہے۔اور یہ نضر بن شمیل کا شاگرد ہے۔اگرچہ یہ ثقہ راوی ہے لیکن اس کا بھی آخر عمر میں حافظہ متغیر ہوگیاتھا { تہذیب التہذیب ج:1 ص:218 }۔اس روایت کی ایک راوی دعلج بن احمد بھی ہے۔اس پر کذاب اور وضاع قسم کے راویوں نے موضوع رواتیں داخل کرکے اس کی حدیثوں میں ملادی ہیں۔جس کی وجہ سے یہ دعلج راوی قابل اعتماد نہ رہاچنانچہ علامہ ذہبی فرماتے ہیں :علی بن حسن بن جعفر بن کریب عن الباغندي متہم بالوضع والکذب وکان ذا حفظ وعلم وہ و ابو الحسین العطار المخرمي حدث عن حامد بن شعیب والباغندي ادخل علی دعلج احادیث قاله الدار قطني[1].

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں : ﴾

9 : حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شروع نماز میں رکوع سے پہلے اردر کوع کے بعد اپنے دونوں ہاتھ { کندھوں تک } اٹھایا کرتے تھے[2]۔

تبصرہ:

ہم غیر مقلد احباب کے پیش کردہ روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ جس روایت کو آپ حضرات خود ضعیف کہتے ہیں پھر استدلال بھی اس سے خود کرتے ہیں۔اس حدیث کی سند میں ایک راوی ابن جریج اور دوسرے راوی ابن شہاب اور یہ دونوں عن کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔اور آپ ہی کی اصول کی مطابق مدلس کی عنعنہ روایت ضعیف ہوتی ہے۔ابن جریج کو مرحوم علی زئی صاحب {جزء قرات ص:164،100 } تسلیم کرچکے ہے اور ابن شہاب زہری کو { جزء قرات ص:43 } پر مدلس قرار دے چکے ہے۔

---

[1] میزن الاعتدال ج:3 ص:120

[2] ابو داؤد باب افتتاح الصلاۃ حدیث 738

﴿غیر مقلد احباب فرماتے ہیں: ﴾

10 : حضرت جابر رضی اللہ عنہ جب نماز شروع کرتے جب رکوع کرتے اور رکوع سے سر اٹھاتے تو رفع الیدین کرتے اور فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح کرتے تھے[1]۔

تبصرہ:

ہم پیش کردہ روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اس روایت کی سند میں ابو زبیر راوی ہے جس کو مرحوم علی زئی صاحب {جزء رفع یدین ص:76} پر مدلس تسلیم کر دیا ہے۔ جبکہ آپ ہی اصول کے مطابق مدلس جب تصریح نہ کرے ت اس کی وہ روایت ضعیف ہو گی۔ لیکن اس کے باوجود بغیر تصریح کے مدلس کے عنعنہ روایت کو صحیح کہنا انصاف کا خون نہیں ہے؟۔

﴿غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

رفع الیدین نہ کرنے ولوں کے دلائل کا تجزیہ :

جن احادیث سے رفع الیدین نہ کرنے کی دلیل لی جاتی ہے ان کا مختصر تجزیہ ملاحظہ فرمائیں:

پہلی حدیث : حضرت بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : کیا بات ہے کہ میں تم کو اس طرح ہاتھ اٹھاتے دیکھتا ہوں گویا کہ وہ سرکش گھوڑوں کے دمیں ہیں۔ نماز میں سکون اختیار کرو[2]۔

تجزیہ : اس حدیث میں اس مقام کا ذکر نہیں جس پر صحابہ رضی اللہ عنہم ہاتھ اٹھارہے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں منع فرمایا جابر بن سمرہ ہی سے صحیح مسلم میں اسی حدیث سے متصل دو روایات اور بھی ہیں جو بات کو پوری طرح واضح کر رہی ہیں۔

---

[1] مسند السراج ' ابن ماجۃ باب رفع الیدین اذا رکع حدیث 868

[2] مسلم باب الامر بالسکون فی الصلاۃ حدیث 430

1 : حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جب ہم نماز پڑھتے تو نماز کے خاتمہ پر دائیں بائیں السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ بھی کرتے یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا: تم اپنے ہاتھ سے اس طرح اشارے کرتے ہو جیسے شریر گھوڑوں کی دمیں ہلتی ہیں۔ تمہیں یہی کافی ہے کہ تم قعدہ میں اپنی رانوں پر ہاتھ رکھے ہوئے دائیں اور بائیں منہ موڑ کر السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہو[1]۔

2 : حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز کے خاتمہ پر السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ بھی کرتے یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا تمہیں کیا ہو گیا ہے تم اپنے ہاتھوں سے اس طرح اشارہ کرتے ہو گویا وہ شریر گھوڑوں کی دمیں ہیں۔ تم نماز کی خاتمہ پر صرف زبان سے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہو اور ہاتھ سے اشارہ نہ کرو[2]۔

پہلی بات یہ ہے کہ امام بخاری اور امام ابن عبد البر وغیرہما کی زندگی میں بعض اہل علم فقہا و محدثین اہلسنۃ والجماعۃ الحنفیہ ومالکیہ نے اس کو رکوع و سجود کی رفع یدین سمجھ کر منع رفع یدین پر احتجاج استدلال کیا ہے۔ جیسا کہ امام بخاری اور امام ابن عبد البر نے اس کی طرف واضح اشارہ کیا ہے،[3] اور دوسری بات یہ ہے کہ امام فقیہ المحدث ابوبکر الکاسانی اور فقیہ محدث محمد البخاری نے عند الرکوع کا مقام بیان فرمایا اور امام فقیہ و محدث الزیلعی اور امام فقیہ و محدیث العینی نے حالت رکوع و سجود رفع یدین کا مقام بیان فرمایا ہے[4]۔ اور یاد رہے کہ ایک مقام پر امام ترمذی نے وکذالک قال الفقہاء وہم اعلم

---

[1] مسلم باب الامر بالسکون فی الصلاۃ حدیث 431

[2] مسلم باب الامر بالسکون فی الصلاۃ حدیث 431

[3] جزء رفع الیدین للبخاری ص: 31, التمہید لابن عبد البر ج9 ص: 221

[4] بدائع الصنائع ج: 1 / ص: 207 , المحیط البرہانی ج: 1 / ص: 376 , نصب الرایہ ج: 1 / ص: 394 , شرح سنن ابی داؤد ج: 3 / ص: 297

بمعانی الحدیث {ترمذی ص:240 } یعنی معانی حدیث کو فقہا بنسبت محدثین کے زیادہ جانتے ہیں۔ لہٰذا رکوع و سجود کی رفع یدین منع ہے۔ فتدبر

امام نووی رحمہ اللہ المجموع میں فرماتے ہیں جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت رفع الیدین نہ کرنے کی دلیل لینا عجیب بات اور سنت سے جہالت کی قبیح قسم ہے۔ کیونکہ یہ حدیث رکوع کو جاتے اور اٹھتے وقت کے رفع الیدین کے بارے میں نہیں بلکہ تشہد میں سلام کے وقت دونوں جانب ہاتھ سے اشارہ کرنے کی ممانعت کے بارے میں ہے۔ محدثین اور جن کو محدثین کے ساتھ تھوڑا سا بھی تعلق ہے ان کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس کے بعد امام نووی امام بخاری کا قول نقل کرتے ہیں کہ اس حدیث سے بعض جاہل لوگوں کا دلیل پکڑنا صحیح نہیں کیونکہ یہ سلام کے وقت ہاتھ اٹھانے کے بارے میں ہے۔ اور جو عالم ہے وہ اس طرح کی دلیل نہیں پکڑتا کیونکہ یہ معروف و مشہور بات ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں اور اگر بات صحیح ہوتی تو ابتدائے نماز اور عید کا رفع الیدین بھی منع ہو جاتا مگر اس میں خاص رفع الیدین کو بیان نہیں کیا گیا۔ امام بخاری فرماتے ہیں پس ان لوگوں کو اس بات سے ڈرنا چاہیئے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ بات کہہ رہے ہیں جو آپ نے نہیں کہی کیونکہ اللہ فرماتا ہے۔

فلیحذر الذین یخالفون عن امر ان تصیبہم فتنۃاو یصیبہم عذاب الیم [1]

پس ان لوگوں کو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتے ہیں اس بات سے ڈرنا چاہیئے کہ انہیں {دنیا میں} کوئی فتنہ یا {آخرت میں} دردناک عذاب پہنچے۔

﴿اہل سنت فرماتے ہیں:﴾

ہم (اہل سنت) جوابا تجزیہ نگار کے تجزیے پر تبصرہ کرتے ہیں:

---

[1]. الفرقان 24/ 63 .4

(الف) تجزیہ نگار صاحب نے مسلم شریف کی مذکور احادیث کے ابتدائی الفاظ ذکر نہیں کئے کیونکہ اگر ذکر کرتے تو ان کی تعمیر کردہ پوری عمارت زمین بوس ہو جاتی۔ مسلم شریف کی دونوں احادیث ملاحظہ ہو:

ابو بکر بن ابی شیبہ، وابو کریب، ابو معاویہ، اعمش، مسیب بن رافع، تمیم بن طرفہ، حضرت جابر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: کیا وجہ ہے کہ میں تم کو ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھتا ہوں جیسا کہ سرکش گھوڑوں کی دمیں ہیں۔ نماز میں سکون رکھا کرو۔ نسائی میں یہ الفاظ ہیں: رسول اللہ ﷺ { اپنے حجرے سے باہر } ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم دوران نماز رفع یدین کر رہے تھے۔

2 : دوسری سند:

ابو بکر بن ابی شیبہ، وکیع، مسعر، عبید اللہ بن قطبیہ، جابر بن سمرۃ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے۔ ہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتے اور اپنے دونوں ہاتھوں سے دونوں طرف اشارہ کرتے تھے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم اس طرح اشارہ کرتے ہو جیسا کہ سرکش گھوڑے کی دم ... الخ۔ ان دونوں حدیثوں میں رفع یدین پر نکیر فرماتے ہوئے آپ ﷺ نے ہاتھوں کے اٹھانے کو شریر گھوڑے کی دم سے تشبیہ دی ہے۔ دونوں روایتوں میں قدر مشترک بس یہی تشبیہ کا جملہ ہے۔ جس کی بنا پر یہ حضرات کہتے ہیں کہ ان دونوں حدیثوں میں مذکورہ رفع یدین پر نکیر کا نماز کے اختتام پر سلام کے ہاتھ اٹھانے سے۔ یہ دونوں الگ الگ روایتیں ہیں درج ذیل وجوہات کی بنا پر دونوں روایات کو ایک قرار دینا ناکام کوشش ہو گی۔

1 : دونوں احادیث کی سندیں الگ الگ ہیں۔ اور خود حضرات محدثین دونوں طریق کو جدا جدا نقل کرکے صراحت سے بتا رہے ہیں کہ دونوں واقعات مختلف اوقات میں میں صادر ہوئے ہیں۔

2 : تمیم بن طرفہ کی روایت میں آپ ﷺ کا اشارہ "نماز میں سکون اختیار کرو" کا تعلق اس رفع یدین سے ہے جو دوران نماز کیا جا رہا تھا۔ جبکہ عبید اللہ بن قبطیہ کی روایت میں آنحضرت ﷺ کی نکیر

اس رفع یدین پر ہے جو آخر نماز میں سلام پھیرنے کے وقت کیا جارہا تھا۔ اور یہ بات بالکل ظاہر و روشن ہے کہ سلام کا وقت نماز سے نکلنے کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت کسی عمل کو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ نماز میں سکون اختیار کرو۔ یہ اس آدمی سے کہا جائے گا جو نماز کے اندر ہو اور رفع یدین کرے اسکنوا فی الصلوۃ سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہ دوران نماز کی بات ہو رہی ہے نہ کہ خروج نماز کے وقت یعنی سلام پھیرنے کے وقت۔

3 : تمیم بن طرفہ کی رویت میں صاف مذکور ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اپنی انفرادی نماز {نفلوں} میں رفع یدین کر رہے تھے۔ اسی وقت آپ ﷺ بھی حجرہ مبارک سے باہر تشریف لائے۔ یعنی آپ ﷺ ان کے ساتھ نماز میں شریک نہیں تھے۔ جبکہ عبید اللہ بن قبطیہ کے روایت میں بصراحت مذکور ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کے ساتھ نماز پڑھنے میں سلام پھیرتے وقت رفع یدین کیا تھا۔

4 : تمیم بن طرفہ کی نقل کردروایت میں رفع یدین سے ممانعت کے الفاظ اسکنوا فی الصلوۃ ہے نماز پنج گانہ کے اندر کسی خاص ہیئت سے اس کا تعلق نہیں ہے {یعنی نماز میں ہر رفع یدین کو یہ عام ہے}۔

5: دونوں روایات کے الفاظ میں بھی فرق ہے تمیم بن طرفہ ولی روایت کے الفاظ یوں ہیں مالی ارا کم رافعی ایدیکم جبکہ عبید اللہ بن قبطیہ کی روایت کے الفاظ یوں ہیں واشار بیدبیدہ الي الجانبین فقال رسول الله ﷺ علام تئومنو بایدیکم.

6 : تمیم بن طرفہ کی روایت میں صراحت ہے کہ ہم نماز پڑھ رہے تھے کہ اسی دوران آپ ﷺ حجرہ مبارک سے باہر تشریف لائے۔۔۔ الخ۔ جبکہ عبید اللہ بن قبطیہ کی روایت میں بھی صراحت ہے کہ ہم آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے۔ دونوں روایات میں اتنے فرق کے باوجود ان کو ایک قرار دینا یہ کسی طرح انصاف اور دیانت کی بات نہیں ہے۔

حاصل تفصیل:

مذکورہ بالا تفصیل یہ معلوم ہوا کہ مندرجہ بالا دونوں روایات الگ الگ ہیں۔ لیکن بالفرض والتقدیر ان حضرات {جو یہاں امام بخاری اور امام نووی کی تقلید کر رہے ہیں} کی بات درست مان لی جائے کہ ان روایات کا تعلق سلام کے ساتھ ہیں تب بھی اس سے ثابت ہے کہ رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت وغیرہ بطریقہ اولی اسی روایت کے حکم سے ممنوع ہے۔ کیونکہ نماز کے اختتام پر ہاتھ کے اشارہ کو بھی بالکل ممنوع قرار دیا جارہاہے تو اسی علت کی وجہ سے نماز کے اندر رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت تو بدرجہ اولی ممنوع قرار دیا جائے گا۔ کیونکہ جب نماز سے خروج کے وقت سکون کا حکم ہے کہ سکون اختیار کرو رفع یدین نہیں کرو کہ یہ خلاف سکون ہے تو نماز کے اندر تو یہ حکم بطریقہ اولی جاری ہوگا۔ علامہ زیلعی نے نصب الرایہ میں ثابت کیا ہے کہ یہ دونوں الگ الگ روایات ہیں۔ اور علامہ ابن حبان نے بھی اس روایت کو ترک رفع یدین رکوع میں جاتے اٹھتے وقت پر استدلال کے طور پر لائے ہیں۔ {حدیث 1878}

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں: ﴾

دوسری حدیث: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا میں تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز بتاؤ؟ پھر انہوں نے نماز پڑھی اور ہاتھ نہ اٹھائے مگر پہلی مرتبہ [1]۔

تجزیہ: امام ابوداؤد اس حدیث کے بعد فرماتے ہیں: لیس هو بصحیح علی هذا اللفظ

یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ صحیح نہیں ہے [2]

جبکہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن مبارک کا قول نقل کیا ہے:

لم یثبت حدیث بن مسعود [1]

---

[1]. ابوداؤد باب من لم یذکر الرفع عند لرکوع حدیث 748 ترمذی باب ماجاءفی رفع عند الرکوع حدیث 257

[2] ابوداؤد حوالہ مذکورہ

یعنی عبد اللہ بن مسعود کے ترک رفع الیدین کی حدیث ثابت نہیں ہے۔

﴿ اہل سنت فرماتے ہیں : ﴾

ہم تجزیہ نگار کے تجزیے پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ : حبر الامۃ : صاحب النعلین والسواک والوسادۃ. سیدنا عبد اللہ بن مسعود کی حدیث لائے ہیں اور عادت کے مطابق اس کو ضعیف ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ امام ابوداؤد کے طرف نسبت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام ابو داؤد اس حدیث کے بعد فرماتے ہیں : لیس ہو بصحیح علی ہذا اللفظ یہ امام ابوداؤد کی طرف بالکل غلط بات کی نسبت ہے۔ ابو داؤد میں عبد اللہ بن مسعود کی مذکورہ روایت کے بعد یہ الفاظ ہیں ہی نہیں۔

دوسری بات عبداللہ بن مسعود کی روایت کو ضعیف ثابت کرنے کے لئے عبد اللہ بن مبارک کا قول پیش کیا گیا۔ و قال عبد اللہ لم یثبت حدیث ابن مسعود ... الخ۔ اس بات کو جاننے کے لئے ذرا غور فرمائیں سیدنا عبداللہ بن مسعود کے ترک رفع یدین کے بارے میں دو روایات ہیں۔

1 : ایک روایت میں عبد اللہ بن مسعود آنحضرت ﷺ کی نماز کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے پہلی مرتبہ تکبیر تحریمہ کے بعد رفع یدین نہیں کیا۔

2 : دوسری روایت میں خود عبد اللہ بن مسعود نماز پڑھ کر آپ ﷺ کی نماز کا طریقہ سکھاتے ہیں۔ اس طریقہ کے بارے میں حضرت علقمہ فرماتے ہیں کہ عبد اللہ ین مسعود نے { آپ ﷺ کی نماز کا طریقہ سکھاتے ہوئے } تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع یدین نہیں کیا۔ عبد اللہ بن مبارک اس میں پہلی روایت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ ثابت نہیں نہ کہ دوسری روایت کے بارے میں۔ اس بات کی چند وجوہات درجہ ذیل ہیں۔

1 : دوسری روایت خود عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ بھی روایت کرتے ہیں اپنی سند سے { نسائی باب ترک ذلک } میں یہی دوسری روایت عبد للہ بن مبارک روایت کرتے ہیں۔

---

[1] ترمذی حوالہ مذکورہ حدیث 255

2 : طریقہ یہ ہے کہ پہلے حدیث لائی جاتی ہے پھر اس پر جرح کی جاتی ہے۔ امام ترمذی عبداللہ بن مبارک کا قول پہلے لائے ہیں اور پھر اس کے بعد عبد اللہ بن مسعود کی یہ دوسری روایت لا کر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے اور پھر فرماتے ہیں کہ صحابہ رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین وتابعین رحمہم اللہ میں سے اہل علم کا یہی قول تھا یعنی ترک رفع یدین کا {ترمذی رفع یدین باب عند الرکوع} اگر عبد اللہ بن مباک کا مقصد دوسری رویت کو رد کرنا ہوتا تو امام ترمذی یہ قول حدیث کے بعد لاتے نہ کہ پہلے۔

3 : اگر عبد اللہ بن مبارک کا قول بقول ان حضرات کے عبد اللہ بن مسعود کے اس دوسری روایت کے بارے میں ہو تو پھر امام ترمذی یہ کیسے فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے اور صحابہ اور تابعین میں سے اہل علم کا یہی قول ہے۔ ان سب کے باجود عبد اللہ بن مبارک کا قول عبد اللہ بن مسعود کی دوسری روایت کے بارے میں فٹ کرنا سوء باطن ہو سکتا ہے۔

تنبیہ : مولوی نور حسین گھرجاکھی اپنے رسالہ قرۃ العینین ص 92 میں لکھتے ہیں کہ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں " لم یثبت عندی حدیث ابن مسعود (سنن بیہقی ج 2 ص 79) لیکن گھرجاکھی کا یہ وہم ہے کیونکہ امام بیہقی نے یہ الفاظ جرح کے حضرت ابن المبارک سے نقل کئے ہیں نہ یہ کہ خود جرح کی ہے۔ گھرجاکھی صاحب کی یا تو فہم کمزور ہے یا ان میں تعصب کا زور ہے۔ امام ترمذیؒ نے باب باندھا تھا ترک رفع یدین کا اور اس حدیث کو صحیح حسن کہا تھا لیکن متعصب لوگوں نے اس باب کا عنوان اور صحیح کے الفاظ اڑا دیئے۔ حالانکہ دلائل سے ثابت ہے کہ باب کا عنوان اور صحیح کے الفاظ موجود تھے۔

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں : ﴾

امام ابن حبان رحمہ اللہ نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اس میں بہت سی علتیں ہیں جو اسے باطل بنا رہی ہیں { مثلا اس میں سفیان ثوری مدلس ہیں اور عن سے روایت کرتے ہیں } مدلس کی عن والی روایت تفرد کی صورت میں ضعیف ہوتی ہے [1]۔

---

[1] تنبیہ : امام ابن حزم اور امام جزائری وغیرہما کے نزدیک سفیان ثوری کی تدلیس مضر نہیں { الاحکام لابن حزم ج : 1/ص : 102 اور ایک نسخہ کے مطابق ج : 1/ص : 141,142 ، توجیہ النظر للجزائری ص : 251 ایک نسخہ کے مطابق ج : 2/ص : 576 }۔

امام علائی فرماتے ہیں " وقد اتفق الناس علی احتجاج بهم ولم یقدح التدلیس فیهم کقتادة والاعمش والسفیانین الثوری وابن عیینة وہیثم بن بشیر وخلق کثیر { جامع التحصیل للعلائی ص: 98,99 } یعنی ائمہ کا اس اتفاق واجماع ہیں کہ سفیان ثوری وغیرہ کی عن والی حدیث قابل استدلال ہے تدلیس قادح نہیں ہے۔ لہٰذا تدلیس کا اعتراض بالتحقیق باطل اور بالیقین حدیث صحیح ہے۔

حدیث ابن مسعود کو مندرجہ ذیل فقہاء و محدثین نے صحیح کہا ہیں:

1 : امام ابوداؤد قال: الصحیح ویشبہ ویقاربہ صحیح اور صحیح کے مشابہ اور صحیح کے قریب ہے۔

2 : امام ترمذی قال: حسن صحیح { ترمذی مع الشرح لاحمد شاکر ج: 2 / ص: 41 والبنایہ للعینی }

3 : امام نسائی قال: صحیح { النکت لابن حجر وزہر الربی علی النسائی ج: 1 / ص 3 }

4 : امام ابو علی الطوسی قال: حدیث حسن { مختصر الاحکام لطوسی وشرح ابن ماجہ لمغلطائی ج: 5 / ص: 1467 }

5 : امام ابو علی النیسابوری قال: صحیح لروایۃ النسائی { النکت لابن حجر وزہر الربی ص: 3 }

6 : امام ابواحمد ابن عدی قال: صحیح لروایۃ النسائی { حوالہ بالا }

7 : امام ابوالحسن الدارقطنی قال: اسنادہ صحیح و قال: صحیح لروایۃ النسائی { علل دارقطنی وزہر الربی ص: 3 }

8 : امام ابن مفدۃ قال: صحیح لروایۃ النسائی { النکت لابن حجر وزہر الربی لسیوطی ص: 3 }

9 : امام حاکم ابو عبداللہ قال: صحیح لروایۃ النسائی { حوالہ بالا }

10 : امام عبدالغنی قال: صحیح لروایۃ النسائی { حوالہ بالا }

11 : امام ابو یعلی الخلیلی قال: صحیح لروایۃ النسائی { حوالہ بالا }

12 : امام ابو محمد ابن حزم قال: صحیح { المحلی بالارشاد ج: 3 ص: 4 }

13 : امام ابو بکر الخطیب قال: صحیح لروایۃ النسائی { النکت لابن حجر وزہر الربی لسیوطی ص: 3 }

14 : امام ابوطاہر السلفی قال: صحیح لروایۃ النسائی والترمذی وابوداؤد { حوالہ بالا }

15 : امام ابن القطان قال: والحدیث عندی لعدالت رواتہ اقرب الی الصحۃ { بیان الوہم لابن القطان ج: 3 / ص: 367 }

16 : امام محمد العینی قال: قد صح وعن الترمذی حسن صحیح { شرح ابی داؤد لعینی ج: 3 / ص: 341 }

17 : امام ابن الہمام نقل عن الترمذی حدیث حسن واحتج لہ فهو صحیح عندہ بما یؤید صحتہ { فتح القدیر لابن الہمام ج: 1 / ص: 310,307 }

18 : امام زیلعی قال: والرجوع الی صحۃ الحدیث لورودہ عن الثقات { نصب الرایہ ج: 1 : ص: 474 }

19 : امام ابو بکر الکاسانی احتج بحدیث ابن مسعود فهو صحیح عندہ { بدائع الصنائع ج: 1 / ص 207 }

20 : علامہ محمد ناصر الدین البانی { غیر مقلد } قال: والحق انہ حدیث صحیح علی شرط مسلم { مشکوٰۃ المصابیح لتحقیق الا البانی ج: 1 / ص: 256 }

تنبیہ: امام ابو الحسن المالکی ، امام ابن حجر عسقلانی الشافعی ، امام ابن الہمام ، ابو بکر السیوطی الشافعی ، امام ابو عبد اللہ الزرکشی الشافعی ، امام جمال الدین القاسمی ، امام ابو طاہر الجزائری ، امام ظفر احمد العثمانی الحنفی ، اور علامہ احمد سلفی رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ جس حدیث سے فقیہ اور محدث استدلال اور احتجاج کرے تو وہ حدیث ان کے نزدیک صحیح ہوتی ہے {ترتیب المدارک علی موطا مالک ، النکت لابن صلاح الزرکشی ج: 1/ ص: 106 ، 107 تلخیص الحبیر لابن حجر ج: 2 / ص: 143}

جن ائمہ و محدثین نے بخاری و مسلم کے علاوہ سفیان عن عاصم بن کلیب کے طریق سے مروی احادیث کو صحیح کہا ہے:

1 : امام ابوداؤد قال صحیح {ابوداؤد ج: 2 / ص: 276 ، رقم 3255 }

2 : امام ترمذی قال ہذا حدیث حسن صحیح {ترمذی ج: 4 / ص: 246 ، رقم 1786}

3 : امام ابن ماجہ احتج بحدیث فہو صحیح عندہ {ابن ماجہ ج: 2 / ص: 120 ، رقم 3636}

4 : امام نسائی قال صحیح {نسائی ج: 3 / ص/36 ، رقم 1264}

5 : ابن ابی شیبہ احتج بحدیث فہو صحیح عندہ {ابن ابی شیبہ ج: 1 / ص: 267 }

6 : امام احمد بن حنبل احتج بحدیث فہو صحیح عندہ {مسند احمد ج 3 / ص: 139 ، رقم 18845}

7 : امام احمد البزار احتج بحدیث فہو صحیح عندہ {مسند البزار ج: 1 / ص: 350 ، رقم 4482}

8 : امام احمد ابو یعلی { احتج بحدیث فہو صحیح عندہ {مسند ابی یعلی ج: 1 / ص: 242 ، رقم 281 }

9 : امام ابن خزیمہ قال صحیح {ابن خزیمہ ج: 4 / ص: 210 ، رقم 2274 }

10 : امام طبرانی احتج بحدیث فہو صحیح عندہ {الدعاء للطبرانی ج: 1 / ص: 559 ، رقم 2013 }

11 : امام حاکم النیسابوری قال ہذا حدیث صحیح علی شرط مسلم ولم یخرجاہ {مستدرک للحاکم ج: 1 / ص: 557 ، رقم 1455}

12 : امام ابو بکر البیہقی احتج بحدیث فہو صحیح عندہ {السنن الکبری للبیہقی ج: 2 / ص: 160 ، رقم 2692 }

13 : امام ابو محمد البغوی احتج بحدیث فہو صحیح عندہ {شرح السنۃ للبغوی ج: 3 / ص: 142 ، رقم 640}

14 : امام ابن حجر عسقلانی نقل عن الحاکم ہذا حدیث صحیح {اتحاف المہرۃ لابن حجر ج: 13 / ص: 141 ، رقم 16489}

رفع یدین:

وہم 24: حضرت عبادہ بن عبد اللہ بن زبیر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ابتدائے نماز میں رفع یدین کرتے تھے پھر کہیں رفع یدین نہ کرتے حتی کہ نماز سے فارغ ہو جاتے ۔ یہ روایت مرسل ہے مگر جید اور صحیح ہے اس کی سند نصب الرایہ (ص: 404) میں خلافیات بیہقی کے حوالہ سے موجود ہے ، حافظ ابن حجرؒ نے یہاں ایک بات کی ہے کہ اس کی سند دیکھی جائے (الدرایہ) حالانکہ اس کی سند صحیح ہے مبارک پوری صاحب نے یہاں اچھا نہیں فرمایا "فان منہ من لایعرف حالہ من کتب الرجال (تحفۃ الاحوذی ، ج: 1/ ص: 223) پس اس کی سند میں ایسے راوی ہے جن کے حالات اسماء الرجال کی کتابوں سے معلوم نہیں ہو سکے ۔

﴿ اہل سنت فرماتے ہیں : ﴾

(الف) یہ امام ابن حبان کی طرف غلط نسبت ہے۔ابن حبان میں یہ بات ہے ہی نہیں اس لئے تو محقق صاحب نے یہ قول بلا حوالہ دیا ہے۔ہم ان حضرات کے تسلی کے لئے یہ حدیث ایک ایسی سند سے لائیں گے جسے سلسلۃ الذہب {سونے کی کڑیاں} کہتے ہیں۔امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا امام اوزاعی رحمہ اللہ سے ساتھ مکہ مکرمہ میں مناظرہ ہوا تھا رفع یدین کے مسئلہ پر امام اوزاعی نے حضرت ابن عمر کی حدیث پیش کی جس کے مقابلے میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اس سند سے ابن مسعود کی حدیث پیش کی۔حدثنا حماد عن ابراہیم عن علقمہ عن ابن مسعود . اس پر امام اوزاعی رحمہ اللہ خاموش ہو گئے {جامع المسانید ,المبسوط سرخسی ,فتح القدیر , موفق مکی مناقب , معارف السنن }۔امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی اس سند میں تمام فقہا ہیں اور اس بارے میں علی بن خشرم رحمہ اللہ فرماتے ہیں وحدیث یتداولہ الفقہاء خیر من حدیث یتداولہ الشیوخ .یعنی فقہا کی سند محدثین کی سند سے بہتر ہوتی ہے۔ {معرفۃ العلوم الحدیث امام حاکم}

(ب) محترم قارئین کرام اس سے پہلے آپ متعدد مقامات پر اس کتاب یعنی نماز نبوی میں سفیان ثوری سے مروی کافی روایات کو ملاحظہ کر چکے ہو کہ ان سے استدلال کی گئی ہے اور ان روایات کو ان حضرات نے صحیح کہا ہے۔ لیکن یہاں پر اس روایت میں وہی سفیان ثوری جن کی مرویات ابھی تک قابل حجت تھے اب ان کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ "ابن حبان نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اس میں بہت سی علتیں ہیں جو اسے باطل بنا رہی ہے مثلا اس میں سفیان ثوری مدلس ہیں اور عن سے روایت کرتے ہیں۔مدلس کی عن والی روایت تفرد کی صورت میں ضعیف ہوتی ہے" ۔ محققین

الجواب: اس سند کے تمام راوی ثقہ ہیں (دیکھئے: نور الصباح، ص: 80تا81) خود مبارک پوری صاحب اسی قسم کے سند کی بارے میں رواۃ ثقات (تحفۃالاحوذی، ج:1/ص: 223 و ص:245) میں طبرانی کے حوالہ سے نقل کر چکے ہیں۔(کفی بنفسک الیوم علیک حسیبا)

حضرات اس روایت کے باطل ہونے کے علتوں میں سے سب سے بڑی علت بطور دلیل کے سفیان ثور کی تدلیس کی ذکر کر رہے ہیں۔

تعجب کی بات ہے جب سفیان ثوریؒ ان کی کسی روایت میں آجاتے ہیں تو وہ احفظ الناس اور افقہ الناس ہو جاتے ہیں اور ان کے مد مقابل جو راوی ہو وہ وہمی بن جاتا ہے۔ جیسے کہ آمین کے مسئلے میں سفیان ثوریؒ کو ثقہ، حجہ اور حافظ کہا جاتا ہے اور شعبہ پر کئی الزام لگا کر اس کو غلط ثابت کیا جاتا ہے۔ چنانچہ روہڑی صاحب کہتے ہیں کہ محدثین کا اصول ہے کہ زیادہ حافظہ والے کو ترجیح ہوتی ہے اور سفیانؒ حافظہ میں شعبہؒ سے زیادہ ہیں۔ جب سفیان ثوریؒ کا اتنا زبردست حافظہ ہے کہ امام المحدثین حضرت شعبہؒ بھی ان کے مقابلے میں کچھ نہیں تو اب اس روایت میں وہی سفیان ثوریؒ وھمی کیوں بن جاتے ہیں؟ اور عبداللہ بن ادریس جو حافظہ اور فقاہت میں سفیان کا مقابلہ نہیں کر سکتے وہ افقہ الناس اور احفظ الناس کیوں بن جاتے ہیں؟

جب سفیان ثوریؒ بالاتفاق ثقہ ہیں تو ثقہ کی زیادت تمام محدثین کے ہاں حجت ہے جس کا قبول کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ امام بخاریؒ صحیح بخاری ج 1 ص 201 میں لکھتے ہیں۔ والزیادۃ مقبولۃ اذا رواہ اہل الثبت الخ یعنی ثقہ کی زیادت مقبول ہے۔

خیر والقرون کی تدلیس اہلسنۃ والجاعۃ الحنفیہ کے نزدیک صحت حدیث کی منافی نہیں ہے {قواعد فی علوم الحدیث ص: 109} ۔ اور بتصریح ائمہ شوافع وغیرہ امام سفیان ثوری طبقہ ثانیہ کا مدلس ہے او ریہ عام طالب علموں کو بھی معلوم ہے کہ طبقہ ثانیہ والوں کی تدلیس صحت حدیث کے منافی نہیں ہوتی {الجامع التحصیل للعلائی ص: 113 ,التبیین لاسماء المدلسین لابن العجمی ص: 65 , طبقات المدلسین لابن حجر ص: 64} ۔ لہٰذا علی زئی صاحب کا اعتراض تدلیس بالتحقیق مردود و باطل ہے اور بالیقین یہ حدیث منکرین پر حجت ہے۔

(ج) اگر امام ابن حبان کی یہ جرح تسلیم بھی کیا جائے تو یہ جرح کئی وجوہات سے مردود ہے۔

1 : اولا تو اس لیئے کہ حضرت ابن مسعودؓ سے کئی سندوں سے یہ روایت مروی ہے۔ پتہ نہیں اس کا کس سند پر اعتراض ہے۔ اور پھر یہ جرح غیر مفسر بھی ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

2 : ثانیا علامہ احمد محمد شاکر شرح ترمذی ج 3 ص 41 میں اور علامہ شعیب الارنوؤط اور علامہ محمد زھیر الشادیش دونوں تعلیقات شرح السنۃ ج 2 ص 24 میں فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ وما قالوہ فی تعلیلہ لیس بعلہ

(یعنی بعض نے جو علتیں اس میں نکالی ہیں وہ کچھ نہیں ہیں کیونکہ اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فتح الملہم ج 2 ص 13 میں فرماتے ہیں کہ ہمیں تو ان علتوں کے بارے میں کوئی علم نہ ہو سکا۔ شاید یہ علت ہو کہ یہ حدیث ان کے مذہب کے خلاف ہے۔

3 : ثالثا، ابن حبان متشدد ہیں۔ چنانچہ علامہ ذھبی میزان الاعتدال ج 1 ص 135 میں ایوب بن عبد السلام کے ترجمہ میں ابن حبان کی جرح جو ایوب کے بارے میں ہے، جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایوب ثقہ ہیں۔

نوٹ: حضرت ابن مسعودؓ پر یہ بھی اشکال کیا جاتا ہے کہ رفع یدین بھول گئے ہوں گے جس طرح تطبیق بھول گئے تھے، جبکہ یہ اشکال غلط ہے تو اس کا جواب یہ ہے:

حضرت ابن مسعودؓ کا تطبیق کرنا حدیث کی بنیاد پر تھا، بعد میں تطبیق منسوخ ہوئی، پھر دوبارہ تطبیق کا حکم ہوا پھر منسوخ ہوئی دیکھئے صحیح ابو عوانہ (ج: 2/ ص: 166) ۔

تطبیق کو حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ لازم وضروری نہیں جانتے تھے بلکہ گھنٹوں پر ہاتھ رکھنے کی بھی اجازت دیتے تھے، چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ (ج: 1/ ص: 251) میں رکوع اور سجدے کے متعلق مرقوم ہے " عن ابن مسعودؓ قال اذا امکن الرجل یدیہ من رکبتیہ والارض عن جبہتہ فقد اجزاءہ۔ یعنی حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب مرد اپنے گھٹنوں کو اپنے ہاتھوں سے پکڑے اور پیشانی کو زمین پر لگالے پس یہ اس شخص کو رکوع وسجود سے کفایت کرتا ہے۔

اور تطبیق کی اجازت حضرت علیؓ سے منقول ہے (دیکھئے: ابن ابی شیبہ و نور الایضاح فی ترک رفع الیدین بعد الافتتاح) پس مولانا موصوف کا حضرت ابن مسعودؓ کی طرف تشکیک کی نسبت کرنا درست نہیں۔

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں: ﴾

تیسری حدیث: حضرت براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ جب نماز شروع کرتے تو دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھاتے { ثم لا یعود } پھر نہیں اٹھاتے تھے[1]۔

تجزیہ: امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ اسے سفیان بن عیینہ امام شافعی امام بخاری کے استاد امام حمیدی اور امام احمد بن حنبل جیسے ائمۃ الحدیث رحمہم اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ کیونکہ یزید بن ابی زیاد پہلے { لا یعود } نہیں کہتا تھا اہل کوفہ کے پڑھانے پر اس نے یہ الفاظ بڑھا دیئے۔ مزید برآں یزید بن ابی زیاد ضعیف اور شیعہ بھی تھا۔ آخری عمر میں حافظہ خراب ہو گیا تھا { تقریب } نیز مدلس تھا۔

﴿ اہل سنت فرماتے ہیں: ﴾

(الف) اس حدیث کو بھی ضعیف ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

1 : ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ یزید بن ابی زیاد ضعیف مختلط شیعہ تھا۔

2 : دوسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ یزید بن زیاد پہلے مکہ میں "لا یعود" نہیں کہتا تھا اہل کوفہ کے پڑھانے پر یہ الفاظ بڑھا دیئے۔

---

[1] بوداؤد باب من لم یذکر الرفع عند لرکوع حدیث 749

یہ دونوں اعتراضات غلط ہیں یزید بن ابی زیاد کو یوں علی الاطلاق ضعیف کہنا انصاف کاخون اور دیانت کا سودا ہے۔ کیونکہ یزید بن ابی زیاد کو امام مسلم رحمہ اللہ ان راویوں میں شمار کرتے ہیں جو سچے اور عدالت اور مروت کے منافی امور سے بری ہے۔امام مسلم جیسے نقاد نے ان کا دفاع کیا ہے { مقدمہ مسلم } ۔امام احمد بن صالح فرماتے ہیں : ثقہ ہے اور جو لوگ ان میں کلام کرتے ہیں وہ مجھے پسند نہیں { یعنی کلام باطل ہے } { تاریخ اسماء الثقات لابن شاہین بحوالہ مجموعہ مقالات } ۔ امام شعبہ اس کو قابل احتجاج سمجھتے ہیں { میزان الاعتدال } ۔امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ ان کے حدیثیں کسی نے ترک کردی ہو { تہذیب التہذیب } ۔سفیان بن یعقوب فرماتے ہیں : اگرچہ لوگوں اس میں کلام کیا ہے پھر بھی ثقہ وعادل ہے { بحوالہ مجموعہ مقالات } ۔امام عجلی نے ان کو جائز الحدیث کہاہے { تہذیب الکمال } ابن حبان فرماتے ہیں کہ صدوق ہے۔ امام بخاری نے ان بخاری میں تعلیقا روایت لی ہے اور ادب مفرد میں بھی ان سے روایت لی ہے۔ عبد اللہ بن مبارک نے بھی ان پر اعتماد کیاہے { تہذیب الکمال } حرف آخر یہ کہ ان محققین کے ایک امام علامہ احمد شاکر نے بھی ان کو ثقہ کہاہے { جامع ترمذی تحقیق احمد شاکر } ۔

نیز یہ حضرات کہتے ہیں کہ یہ شیعہ تھا۔ اگر شیعہ ہونا جرح ہے تو پھر امام حاکم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو نامی گرامی شیعہ ہے۔ جن کے حوالے آپ حضرات بڑے شوق سے پیش کرتے ہیں۔ اگر شیعہ ہونا جرح ہے تو پھر قدری ہونا اعلی ترین جرح ہوگی پھر تو آپ کی مستدل حدیث ابوحمید الساعدی میں حمید بن جعفر قدری کی وجہ سے آپ ہی کے اصول کے مطابق نا قابل استدلال ہوگئی۔

اگر شیعہ ہو نا جرح ہے تو پھر آپ نماز نبوی کیا پوری بخاری ہی چلی گئی ۔ کیونکہ آپ ہی کے امام حکیم فیض عالم نے بخاری کے مرکزی راوی ابن شہاب زہری کے بارے میں فرماتے ہیں : ابن شہاب منافقین وکذابین کے دانستہ نہ سہی غیر دانستہ ہی مستقل ایجنٹ تھے ۔ اکثر گمراہ کن خبیث اور مکذوبہ روایات انہی کی طرف منسوب ہے۔ مزید لکھتے ہیں ابن شہاب کے متعلق یہ بھی منقول ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے بھی بلواسطہ کرتا تھا جو اس کے ولادت سے پہلے مرچکے تھے۔ مشہور شیعہ مؤلف شیخ عباس

قمی کہتے ہیں کہ ابن شہاب پہلے سنی تھا پھر شیعہ ہوگیا { صدیقہ کائنات ص: 107,108 بحوالہ کچھ دیر غیر مقلد احباب کے ساتھ }۔2 : دوسرا اعتراض کہ یزید بن ابی زیاد نے اہل کوفہ کے پڑھانے پر ثم لا یعود کے الفاظ بڑھائے ہیں ۔ یہ بات بالکل بے بنیاد ہے کہ اس لفظ کو صرف آخیر عمر کے تلامذہ روایت کرتے ہیں ۔اور پھر یہ بات کرنا کہ یہ الفاظ کوفہ والوں کے کہنے پر بڑھادیئے گئے انتہائی غلط ہے۔ یہ الفاظ سنن بیہقی میں سفیان بن عیینہ سے منقول ہے قارئین اس کی حقیقت تاریخ کی آئینہ میں ملاحظہ ہو۔

(ب) امام دار قطنی کے ہاں جب یہ حدیث صحیح ہے تو پھر "لا یعود" کی زیادت بطریق اولیٰ صحیح ہے۔ یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟اور اگر امام دار قطنی لا یعود کی زیادت اس لئے صحیح تسلیم نہیں کرتے کہ یہ ان کے مذہب کے مخالف ہے تو پھر عدم تسلیم کوئی قابل اعتبار نہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ امام وکیع کے شاگرد لا یعود کی زیادت نقل نہیں کرتے تو یہ غلط ہے کیونکہ ان سے ان کے شاگرد لا یعود یا لا یعود کے ہم معنیٰ الفاظ نقل کرتے ہیں۔

1۔ زھیر بن حرب "لا یعود" کے الفاظ نقل کرتے ہیں۔ محلّی ابن حزم ج 3 ص 235

امام وکیع جب ثقہ ہیں تو ثقہ کی زیادت قابل اعتبار ہے۔ حضرت ابن المبارک ثم لم یعد کے الفاظ نقل کرتے ہیں ۔ اور یہی الفاظ وکیع نے سفیان ثوری سے نقل کئے ہیں۔ چنانچہ درایہ تخریج ہدایہ میں حافظ ابن حجر نے بحوالہ نسائی کے ذکر کیا ہے اور علامہ زیلعی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے تو معلوم ہوا کہ وکیع کی بات درست ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں : ﴾

علاوہ ازیں رفع الیدین کے احادیث اولی ہیں کیونکہ وہ مثبت ہیں اور نافی پر مثبت کو ترجیح حاصل ہے۔

تبصرہ:

ہم جواباً عرض کرتے ہیں اس اصول پر تقریباً تمام غیر مقلد احباب کا عمل نہیں ہے۔ کیونکہ سیدنا ابن عمر و سیدنا انس ، مالک بن الحویرث اور سیدنا وائل بن حجر سے سجدوں کے رفع یدین کے روایات

مرفوعا سندا صحیح ثابت ہے { مصنف ابن ابی شیبہ ج:1 ،شرح مشکل الآثار للطحاوی ، والمجتبی للنسائی وصحیح ابی عوانہ ج:1 وابوداؤد والمحلی لابن حزم }۔یہ سارے روایات مثبت ہے۔لہٰذا آپ رکوع کے ساتھ سجدوں میں رفع یدین شروع کریں تاکہ مثبت کو نافی پر ترجیح ہو جائے اور ان تمام روایات پر عمل بھی ہو جائے۔لیکن یہ بات تحقیقی لحاظ سے ثابت ہے کہ رکوع اور سجدوں دونوں میں رفع یدین منسوخ و متروک ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں: ﴾

بعض لوگ دلیل دیتے ہیں کہ منافقین آستینوں اور بغلوں میں بت رکھ کر لاتے تھے بتوں کو گرانے کے لئے رفع الیدین کیا گیا بعد میں چھوڑ دیا گیا۔ لیکن کتب حادیث میں اس کا کہیں کوئی ثبوت نہیں ہے۔البتہ یہ قول جہلاء کی زبانوں پر گھومتا رہتا ہے۔

﴿ اہل سنت فرماتے ہیں: ﴾

(الف) یہ بات کتب احادیث میں نہیں ہے لیکن تاریخی روایات میں ہیں ۔جیسا کہ شکیب ارسلان نے تاریخ میں ذکر کی ہے اور انہی کے حوالہ سے شیخ الحدیث الثقہ وصدوق محمد ذکریا المدنی نے موطا مالک کی شرح اوجز المسالک ج:1 میں ذکر کی ہے۔

(ب) اس سے پہلے تفصیل سے گزرا ہے کہ 4 رکعتی نماز میں 26 مقامات پر رفع یدین کرنا ثابت ہے۔آپ حضرات ان میں سے 10 مقامات پر تو عمل کرتے ہیں لیکن باقی 16 مقامات پر عمل نہ کرنے کی کیا وجہ ہے؟۔دوسری بات یہ ہے کہ یہ قاعدہ جو آپ نے پیش کیا ہے یہ قرآن وحدیث میں کہاں مذکور ہے؟ جبکہ آپ کے اصول مطابق مسئلہ مدلل نہ ہو تو مردود ہے۔اور اگر تقلید ہے تو اس کو یہ حضرات گمراہی اور شرک کہتے ہیں۔

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں : ﴾

یہ بھی دلیل دی جاتی ہے کہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رفع الیدین کیا تھا اور بعد میں چھوڑ دیا تھا[1]۔[2]

اسی طرح اس سلسلے میں ایک اور روایت بھی پیش کی جاتی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابوبکر وعمر رضی اللہ تعالی عنہما کے ساتھ نماز پڑھی یہ لوگ شروع نماز کے علاوہ ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔

امام بیہقی (2 / 79۔80) اور امام درقطنی لکھتے ہیں کہ اس کا راوی محمد بن جابر ضعیف ہے۔ بلکہ بعض علما { ابن جوزی' ابن تیمیہ وغیرہما } نے اسے موضوع کہا ہے۔ { یعنی یہ روایت ابن مسعود کی بیان

---

[1] نصب الرایۃ 1 /404

[2] تبصرہ: سیدنا عباد بن زبیر المدنی کے اس روایت کے تمام راوی ثقہ صدوق اور اکثر راوی بخاری ؛ مسلم کے ہیں مثلا:

1 : امام ابوبکر البیہقی { سیر اعلام النبلاء ج: 13 / ص:529 تا533 ,تذکرۃ الحفاظ ج:3 /ص:219 }

2 : امام الحاکم { سیر اعلام النبلاء ج:3 /ص:97 ,تذکرۃ الحفاظ ج:3 /ص:53}

3 : امام ابوالعباس { سیر اعلام النبلاء ج: 12 /ص:106 ,تذکرۃ الحفاظ ج:3 /ص:52 }

4 : امام محمد ابن اسحاق صحیح مسلم اور سنن اربعہ کے راوی ہے ائمہ نے ان کو ثقہ ثبت قرار دیا ہے { تقریب ج:1 }

5 : امام الحسن بن ربیع یہ صحیح بخاری صحیح مسلم اور سنن اربعہ کے ثقہ بالاجماع راوی ہے { تقریب ج:1 /ص:116}

6 : امام حفص بن غیاث صحیح بخاری, صحیح مسلم اور سنن اربعہ کے راوی ہے ائمہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے {تذکرۃ الحفاظ ج:1 /ص:217 , تہذیب لابن حجر ج: 1/ص:568}

7 : محمد بن ابی یحی یہ ابوداؤد ,ترمذی اور نسائی کا راوی ہے ائمہ نے ان کو مدنی ثقہ صدوق قرار دیا ہے {تاریخ الثقات ص:416 ,الثقات لابن حبان ج:7 /ص:436 , تقریب لابن حجر ج:2 /ص:562 }

8 : سیدنا عباد بن زبیر المدنی یہ صحیح بخاری, صحیح مسلم اور سنن اربعہ کے راوی ہے ائمہ نے ان کو مدنی ,تابعی , ثقہ ,الامام الکبیر ,القاضی, عظیم المنزلۃ ہو ثقہ قرار دیا ہے {تاریخ الثقات ص:247 , الثقات لابن حبان ص : 326 , سیر اعلام النبلاء ج: 5 /ص:214 , تقریب لابن حجر ج: 1 /ص: 273}۔

لہٰذا با تحقیق حدیث ابن زبیر کے تمام رواۃ ثقہ وصدوق ہیں اور بالیقین یہ حدیث صحیح اور منکرین پر حجت ہے۔

کردہ نہیں ہے بلکہ کسی نے خود تراش کر ان کی طرف منسوب کر دی ہے } لہٰذا ایسی روایات پیش کرنا جائز نہیں ہے۔

تبصرہ:

اس پر ہم تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اس روایت کو محمد بن جابر کی وجہ سے ضعیف کہا ہے کہ یہ ضعیف راوی ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ اس کو ابن حبان نے ثقات میں شمار کیا ہے۔ امام احمد بن عدی فرماتے ہیں: اسحاق کے پاس محمد بن جابر کی اچھی اور صالح احادیث ہیں { تہذیب الکمال }۔ اور یہاں یہی ابن اسحاق ان سے روایت کر رہے ہیں۔ اسحاق بن اسرائیل تو بہت بڑے ائمہ پر ان کو ترجیح دیتے تھے۔ نیز بڑے بڑے ائمہ کرام نے محمد بن جابر سے روایات لی ہیں جیسے ابن عون، ہشام، ثوری، شعبہ وغیرہ۔ امام اسحاق فرماتے ہیں کہ یہ ضعیف ہوتے تو اتنے بڑے ائمہ ان سے روایات نہ لیتے { تہذیب لکمال }۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس راوی کو ضعیف کہنا انصاف سے دور بات ہے۔ یہ کم از کم حسن درجے کے راوی پھر بھی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بیہقی کا اس کو ضعیف کہنا معتبر نہیں۔ کیونکہ امام بیہقی کے بارے میں امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں "امام بیہقی تعصب سے کام لیتے ہیں { بغیۃ الالمعی 8/2 بحوالہ مجموعہ مقالات }۔ اور آپ کے امام عبد الرحمٰن مبارک پوری فرماتے ہیں "امام بیہقی اگرچہ محدث سے مشہور ہے مگر ان کا کوئی قول بلا دلیل معتبر نہیں ہو سکتا { تحقیق الکلام 132/2 بحوالہ مجموعہ مقالات }۔

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں: ﴾

خلاصہ: رفع الیدین کی احادیث بکثرت اور صحیح ترین اسناد سے مروی ہیں۔ عدم رفع الیدین کے احادیث معنی یا سنداً ثابت نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اہل علم کے نزدیک کسی ایک صحابی سے بھی عدم رفع الیدین ثابت نہیں ہے[1]۔

---

[1] ان حضرات کے ایک محقق رفیقی صاحب لکھتے ہیں کہ چاوراں ائمہ میں تین رفع الیدین کے قائل ہیں۔ حضرت کے اطلاع کے لئے عرض ہے کہ چار ائمہ میں سے ائمہ کبار امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ دونوں ترک رفع الیدین عند الرکوع والسجو:

﴿ اہل سنت فرماتے ہیں : ﴾

قارئین کرام ! آپ رفع یدین اور عدم رفع یدن کی احادیث پر بحث تفصیل سے ملاحظہ کر چکے آپ کو اس کا بخوبی اندازہ ہو چکا ہوگا۔ یہاں پر امام بخاری کے قول کو پیش کیا گیا ہے۔ جبکہ آپ خود کہتے ہیں کہ غیر معصوم امتی کے عمل کو سنت نبوی پر ترجیح درست نہیں۔ تو کیاامام بخاری معصوم ہے جو ان کے قول کو یو لیا جارہا ہے ورنہ تو امام بخاری کی ابوبکر صدیق, عمر فاورق, حضرت علی , عبد اللہ ابن مسعود, براابن عازب ,ابرہیم نخعی ,امام مالک ,اور رامام اعظم ابو حنیفہ رحمہم اللہ تعالی کے بنسبت کیا حیثیت ہے۔ کیا یہ صحابہ اور تابعین اہل علم نہیں تھے ؟۔ نیز خود امام بخاری کے جزء رفع یدین سے ثابت ہے کہ صحابہ اور تابعین رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ بلکہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین کی اکثر ازواج رفع یدین نہیں کرتی تھیں۔

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

رفع یدین:

ان حضرات نے رفع یدین جو ایک سنت عمل تھا، اس کو واجب کا درجہ دے دیا ہے بلکہ آگے بڑھ کر اب یہ کہا جانے لگا ہے کہ رفع یدین چھوڑنے سے نماز ہی باطل ہو جاتی ہے۔ (قرۃ العینین ص: 69)

اکابر علمائے غیر مقلد احباب کے یہاں اس مسئلہ میں وہ شدت نہیں تھی جو آج دیکھی جارہی ہے[1]۔ مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی فتای نذیریہ میں فرماتے ہیں کہ رفع یدین میں جھگڑا کرنا تعصب اور جہالت کی بات ہے، کیونکہ آنحضور ﷺ سے دونوں ثابت ہیں دلائل دونوں طرف ہیں۔ (ج: 1/ ص: 141)

کے قائل ہے {کتاب الحجۃ لامام محمد و موطاامام لامام محمد , سنن طحاوی ج: 1 , المدونۃ الکبری لامام مالک ج: 1 / ص: 71 , التمہید لابن عبد البر ج: 9 والتذکار لابن عبد البر ج: 4 } ۔امام مالک کا یہ مشہور مذہب امام اصیلی اور امام دار قطنی نے بھی نقل کیا ہے {الدلائل لااصیلی بحوالہ شرح زرقانی ج: 1 / ص: 143 , العلل لدار قطنی ج: 13 / ص: 113 } ۔بتصریح امام قرطبی امام ابن رشد نے تصریح کی ہے کہ وہو مشہور لمذہب مالک {بدایۃ المجتہد ج: 1 / ص: 76 } ۔

[1] رفع یدین:

"فمازالت والی جو روایت ہے کہ ہمیشہ ﷺ کی یہی رفع الیدین والی نماز ہی رہی ہے، تو اس روایت میں عصمہ انصاری اور ابن قریش دونوں وضاع اور کذاب ہیں۔ نور العینین (ص: 327) اور شیخ سید ھو فرماتے ہیں کہ اس میں دو راوی متہم ہے (القول المقبول)
حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جس کو قے آئے یا نکسیر پھوٹے وہ ٹھہر جائے اس روایت کو اما شافعی، احمد، الزحلی، ابو حاتم ابو زرعہ، ابن عدی، دار قطنی اور بیہقی نے اس روایت کو مرسلا صحیح کہا ہے۔ (القول المقبول، ص: 196)
تمہارے ایام میں افضل جمعہ کے دن مجھ پر زیادہ درود بھیجو تمہارا درود مجھ پر پیش ہوتا ہے" (ابو داؤد) امام نوویؒ فرماتے ہیں باسناد صحیح علامہ البانیؒ فرماتے ہیں، حسن انشاء اللہ (السلسلۃ الصحیحۃ، 45/4)
اور حدیث میں ہے کہ اللہ کے فرشتے زمین میں پھرتے ہیں اور مجھے اپنی امت کا سلام پہنچاتے ہیں (نسائی) علی زئی صاحب فرماتے ہے کہ اس کی سند صحیح ہے (فضائل درود وسلام، ص: 64)
اور حدیث شریف میں ہے کہ صلوا علی فان صلوتکم تبلغونی حیث کنتم، مرحوم علی زئی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ روایت حسن ہے۔ (تخریج ریاض الصالحین، 316/2)
علامہ شوکانیؒ غیر مقلد ہونے کے باوجود اس حقیقت کے معترف ہیں کہ پچاس صحابہ کرامؓ سے جو رفع یدین منقول ہے، وہ ابتدائے نماز سے متعلق ہے۔

علامہ عراقی نے نماز کے شروع میں رفع یدین کی روایات نقل کرنے والے صحابہؓ کو شمار کیا تو ان کی تعداد پچاس تک پہنچ گئی، انہیں میں عشرہ مبشرہ بھی ہیں جس کا تعلق پہلے رفع یدین کے ساتھ ہے اختلافی رفع یدین کے ساتھ نہیں ہے۔ (نیل الاوطار، ج: 2/ص: 191)

نیز علامہ صنعانی نے غیر مقلد عالم دین ہونے کے باوجود سبل السلام شرح بلوغ المرام میں اسی حقیقت کا اعتراف فرمایا ہے: " (شارح بخاری) ابن حجر فرماتے ہیں نماز کے شروع میں رفع یدین کی روایت کو پچاس صحابہؓ نے نقل کیا ہے جن میں عشرہ مبشرہ بھی ہیں، اور علامہ بیہقی نے حاکم کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ نماز کے شروع میں رفع یدین کا عمل ایسا ہے کہ اس کے نقل کرنے میں خلفائے راشدین، عشرہ مبشرہ اور دیگر بہت صحابہؓ متفق ہیں باوجودیکہ وہ مختلف شہروں میں پھیل چکے تھے۔ (سبل السلام، ج: 1/ص: 274)
نیز علامہ نیمویؒ کا ارشاد ہے گزر چکا ہے کہ حضرات خلفائے راشدین سے ابتدائے نماز کے علاوہ رفع یدین کا عمل ثابت نہیں ہے۔ (آثار السنن، ج: 1/ص: 111)

الغرض معلوم ہوا کہ پچاس صحابہؓ سے جو رفع یدین منقول ہے وہ ابتدائے نماز سے متعلق ہے، اور انہی میں سے خلفائے راشدین اور عشرہ مبشرہ بھی ہیں، اب پچاس صحابہؓ سے رفع یدین کا ذکر کرنا اور اس کے مقام و محل کو چھپا کر یہ تاثر دینا کہ یہ رفع یدین رکوع کرتے، اٹھتے وقت اور تیسری رکعت کے شروع میں تھا۔ ایک واضح علمی خیانت اور امانت و دیانت کا خون کرنے کے مترادف ہے۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب بھوپالی غیر مقلد بڑے اونچے عالم ہیں ان کی کتاب "روضۃ الندیہ" غیر مقلد احباب کے یہاں بہت معتبر کتاب ہے، نواب صاحب اس کتاب میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

رفع یدین اور عدم رفع یدین نماز کے ان افعال میں سے ہے جن کو آنحضور ﷺ نے کبھی کیا ہے اور کبھی نہیں کیا ہے، اور سب سنت ہے، دونوں باتوں کی دلیل ہے حق میرے نزدیک یہ ہے کہ دونوں سنت ہیں۔ (ص: 148)

اور اسی کتاب میں حضرت سید شاہ اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں: "رفع یدین کو چھوڑنے والے کو ملامت نہیں کی جائے گی اگرچہ پوری زندگی وہ رفع یدین نہ کرے۔" (ص: 150)

حدیث کی مشہور کتاب مصنف ابن ابی شیبہ ہے اور بمبئی سے غیر مقلد احباب کے ادارے نے اس کو شائع کیا ہے، اس کتاب میں صحیح سند سے یہ اثر منقول ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر کو ﷺ کو صرف ابتدائے نماز میں دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے دیکھا ہے، حضرت مجاہد عبد

دلیل نمبر9: اہل مدینہ اور رفع یدین: "استاذ المحدثین امام مالکؒ 93 ہجری میں پیدا ہوئے مرکز علم مدینہ منورۃ میں مقیم ہوئے، حضرات صحابہؓ وتابعین کا عمل اور احادیث کا عظیم ذخیرہ ان کے سامنے تھا، وہ مسائل میں اہل مدینہ کے عمل کو بنیادی اہمیت دیتے تھے، امام مالک کے مشہور شاگرد ابن قاسمؒ رفع یدین کی بابت ان کا تجزیہ نقل کرتے ہیں، ملاحظہ ہو: قال مالک لا اعرف رفع الیدین فی شیء من تکبیرۃ الصلوۃ لا فی خفض ولا فی رفع إلا فی افتتاح لصلوۃ قال بن قاسم وکان رفع الیدین عند مالک ضعیفا (المدنۃ الکبری، ج: 1/ص: 71)

تلخیص الجبیر (ج: 1/ ص: 222) میں حافظ ابن حجرؒ نے ابن عمرؓ سے ایک مرفوع روایت کے بارے میں یہ الفاظ لکھے ہیں ملاحظہ ہو: اور اس باب میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ابتدائے نماز میں رفع یدین کرتے تھے پھر نہ لوٹتے تھے، بیہقی نے اس کو خلافیات میں روایت کیا ہے اور یہ مقلوب وموضوع ہے۔

اور امام طحاویؒ نے عاصم بن کلیب عن ابیہ کے طریق سے حضرت علیؓ سے روایت کی کہ حضرت علیؓ ابتدائے نماز میں رفع یدین کرتے تھے پھر نہ لوٹتے تھے، اس اثر کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ (الدرایہ، ج: 1/ ص: 152)

تسلی دے رہے ہیں دل کے بہلانے کی باتیں ہیں
نگاہیں صاف کہتی ہے مکر جانے کی باتیں ہیں

اللہ بن عمر کے مخصوص شاگرد ہیں اور ان کی صحبت میں کئی سال رہے ہیں، ان کا یہ فرمانا بہت بڑی سند ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا خود یہ معمول تھا کہ وہ صرف ایک بار رفع یدین کرتے تھے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں وہ نماز نہ پڑھاؤں جو آنحضرت ﷺ کی نماز تھی، پھر آپ نے نماز پڑھائی اور صرف شروع میں ایک مرتبہ رفع یدین کیا،

امام ترمذی اس روایت کو حسن کہتے ہیں اور ایک نسخہ میں صحیح کا لفظ بھی ہے، ابن حزم بھی اس کو صحیح کہتے ہیں، غیر مقلد احباب کے محدث دوراں شیخ البانی بھی اس روایت کو صحیح کہتے ہیں، اور پاکستانی غیر مقلد عالم مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب بھی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ثابت ہے۔ غرض یہ کہ محدثین کے تحقیق کے مطابق اس حدیث کا انکار جائز نہیں ہے، یہ حدیث بالکل صحیح ہے۔

علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی بقول مشہور غیر مقلد عالم مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری اپنے وقت کے سب سے بڑے محدث تھے، ان کے زمانہ میں علم حدیث ان پر ختم تھا۔ (مقدمہ تحفۃ الاحوذی) وہ اپنی مشہور زمانہ کتاب فتح الباری میں ایک حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

ولم يختلف على راويها في ذلك فكان عليها الاعتماد (ج: 2/ ص: 38)

یعنی اس روایت کے راوی سے ایک ہی طرح کی روایت ہے اس لئے اسی پر اعتماد ہوگا (اس روایت پر اعتماد ہوگا جو راوی سے کئی طرح سے مروی ہے)۔

یہ ہے محدثین کا اصول، اب آپ اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے دیکھیں کہ اہل سنت نے عدم رفع یدین کے بارے میں اس کا کتنا لحاظ رکھا ہے۔

آپ نے ابھی معلوم کیا کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے رفع یدین کے سلسلہ میں کئی طرح کی بات منقول ہے، خود بخاری میں ان سے دو طرح کی روایت ہے، دوسری حدیث کی کتابوں میں کئی جگہ ان سے رفع یدین منقول ہے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود صرف شروع ہی میں رفع یدین کرتے تھے، ان مختلف احادیث میں سے غیر مقلد احباب نے بھی سب کو چھوڑ کر صرف تین جگہ والی روایت لی۔

بخلاف ترمذی کے جو حضرت عبد اللہ بن مسعود ؓ والی روایت ہے ان سے بس ایک ہی طرح سے مروی ہے، یعنی عدم رفع یدین کا عمل، اس لئے محدثین کے قاعدہ اور اصول کے مطابق ترجیح اس روایت کو حاصل ہوگی جس کا راوی صرف ایک طرح کی بات نقل کرتا ہے اور وہ راوی جس سے ایک ہی مسئلہ میں کئی طرح کی بات منقول ہے، اس کی روایت مرجوح ہوگی خواہ وہ روایت کہیں بھی ہو۔

ایک بہت بڑا جھوٹ یہ ہے کہ امام مالک کا بھی مذہب یہ بتلاتا ہے ہ وہ رفع یدین کے قائل تھے، جبکہ امام مالک سے مشہور روایت عدم رفع یدین کی ہے، مالکیہ کی مشہور کتاب المدونۃ میں ہے:

امام مالک فرماتے ہیں کہ نماز کے شروع کے علاوہ کسی اور موقع پر رفع یدین کرنے کو نہیں جانتا۔ (المدونۃ ج: 1/ ص: 71)

ابن قاسم کا یہ مقولہ: قال ابن القاسم و کان رفع الیدین عن مالک ضعیفا

یعنی ابن قاسم کہتے ہیں کہ امام مالک کے نزدیک رفع یدین ضعیف تھا۔

ابن رشد مالکی "بدایۃ المجتھد "میں فرماتے ہیں:

کچھ فقہاء نے رفع یدین کرنے کو صرف تکبیر تحریمہ کے وقت منحصر کیا ہے۔

ابن رشد کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ عموما اہل مدینہ کا عمل ترک رفع یدین ہی پر تھا اور یہی مذہب امام مالک کا بھی رہا ہے، الفقہ علی مذاہب الاربعۃ کا بیان بھی ملاحظہ ہو:

مالکیہ کا قول ہے کہ تکبیر تحریمہ کے وقت تو رفع یدین مستحب ہے، اور اس کے سوا بقیہ جگہوں پر مکروہ ہے۔(ج: 1/ص: 250)

اور حافظ ابن عبد البر رکوع میں جاتے ہوئے رفع یدین کے بارے میں فرماتے ہیں:

اگر اس وقت دونوں ہاتھ اٹھائے تو بہتر اور اگر نہ اٹھائے تو کوئی حرج نہیں۔ (الکافی ص: 206)

اور رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے رفع یدین کے بارے میں فرماتے ہیں: اگر چاہے تو اس وقت رفع یدین کرے اور چاہے تو نہ کرے۔(الکافی ص: 207) یہ ہے امام مالک کی مذہب کی تفصیل۔

امام طحاوی اور محدث ابن ابی شیبہ نے حضرت عمرؓ کا یہ اثر نقل کیا ہے: حضرت اسود فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ شروع تکبیر میں دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے پھر نہیں [1]۔

امام طحاوی، محدث ابن ابی شیبہ اور محدث بیہقی نے حضرت علی کا یہ اثر نقل کیا ہے: عاصم بن کلیب اپنے والد سے روایت کرتے ہیں حضرت علیؓ شروع نماز میں رفع یدین کرتے تھے پھر نہیں [2]۔

اس کے بارے میں مبارک پوری صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت علی کا یہ اثر صحیح نہیں ہے عاصم بن کلیب ثقہ محدث ہیں مگر امام ترمذی کہتے ہیں کہ یہ مرجیٔ تھے، اس طرح اس ثقہ کو ضعیف قرار دیا حالانکہ مبارک پور صاحب کو خود اعتراف ہے کہ ان کو یحی بن معین جیسے محدث نے ثقہ کہا ہے، اور ایک جگہ حافظ ابن حجر نے ایک راوی کے بارے میں کہا کہ وہ مرجی تھا تو مبارک پوری نے صاحب فرماتے ہیں کہ رمی بالارجاء لیس بعلة قادحة .

یعنی ارجاء سے مہتم ہونا کوئی علة قادحہ نہیں ہے. (ابکار ص: 488)

حضرت امام طحاوی محدث ابن ابی شیبہ اور محدث بیہقی نے حضرت عبد اللہ بن عمر کا یہ اثر نقل کیا ہے: "حضرت مجاہد تابعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز پڑھی وانہوں نے صرف نماز کی تکبیر اولی میں رفع یدین کیا"۔

مبارک پوری صاحب اس کو رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ابن عمر کا یہ ضعیف ہے اس اثر کی سند ابو بکر عن حصین سے شروع ہوتی ہے، یہاں مبارک پوری صاحب امام وکیع کا مقام بتلاتے ہوئے فرماتے ہیں: "فن حدیث کے امام یحی بن معین فرماتے ہیں کہ وہم ہے اس کی کوئی اصل نہیں، اور انہیں یحی بن معین نے اوپر والی سند کو صحیح کہا تھا اور عاصم بن کلیب کی توثیق کی تھی اور ان کو ثقہ کہا تھا تو وہاں اس امام ہذالشان کا کلام مبارک پوری صاحب نے رد کردیا، تسلیم نہیں کیا، یہ علمی دیانت کے خلاف ہے"۔

---

[1] حدیث صحیح، نصب الرایہ، کتاب الصلاۃ، ج: 1/ ص: 45

[2] ہو اثر صحیح، نصب الرایہ، ج: 1/ص: 406

مصنف ابن ابی شیبہ میں صحیح سند سے روایت ہے: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاگرد صرف شروع نماز ہی میں رفع یدین کرتے تھے۔

نسائی شریف میں حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث ہے: حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نماز میں رکوع میں جاتے وقت بھی کانوں کے لو تک رفع یدین کرتے تھے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت بھی اور سجدہ سے سر اٹھاتے وقت بھی۔

اس حدیث کا ایک ایک راوی صحیح ہے مگر چونکہ یہ صحیح حدیث مولانا مبارک پوری کے مذہب کے خلاف ہے اس وجہ سے اس صحیح حدیث کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ اس کی سند میں قتادہ مدلس ہیں۔ اور قتادہ وہ راوی اور محدث ہیں جن کی روایتوں سے مسلم اور بخاری کی کتابیں بھری پڑی ہیں مسلم و بخاری جن کا اعتبار کریں وہ محدث مبارک پوری صاحب کے نزدیک ساقط الاعتبار ہے، منکرین حدیث انہیں باتوں سے فائدہ اٹھا کر حدیث کا بالکلیہ انکار کر دیتے ہیں۔

صحیح سند سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ رکوع اور سجدہ میں دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے حدیث جس کو طبرانی نے روایت کیا ہے: نبی کریم ﷺ رکوع کے وقت تکبیر کہتے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے اور سجدہ کے تکبیر کے وقت رفع یدین کرتے تھے۔

محدث ہیثمی نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے، مگر مبارک پوری صاحب کہتے ہیں کہ ہمیں ہیثمی پر اعتماد نہیں ہے، فرماتے ہیں: "محدث ہیثمی جو اس حدیث کے سند کو صحیح کہا ہے تو ان کی تصحیح پر قلب کو اطمنان نہیں ہوتا ہے۔"

مبارک پوری صاحب وہ امام شعبہ کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: شعبہ ثقہ حافظ اور پختہ کار محدث ہیں، سفیان ثوری فرماتے تھے کہ وہ علم حدیث کے فن میں امیر المؤمنین (سارے مسلمانوں کے امیر) ہیں، امام شعبہ ہی ہے جنہوں نے عراق میں پہلے رجال حدیث یعنی سندوں کی

چھانٹ پھٹک کی، انہوں نے سنت کا دفاع کیا اور اس کی ہر طرح حفاظت کی، یہ بہت عبادت گزار بھی تھے، امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ فن حدیث میں امام شعبہ ایک امت ہیں یعنی رجال حدیث اور حدیث کی ان کو خوب معرفت وبصیرت حاصل ہے، امام شافع فرماتے تھے کہ اگر عراق میں شعبہ جیسا محدث نہ ہوتا تو عراق میں حدیث کا فن غیر معروف رہتا۔ (تحفہ ج: 1/ ص: 14)

مولانا مبارک پوری کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ محدثین میں امام شعبہ کا کتنا عظیم ورفیع مقام تھا اور فن حدیث میں ان کا پایہ کتنا بلند تھا، امام احمد بن حنبل جیسا آدمی یہ کہتا ہے کہ وہ علم حدیث میں تنہا ایک امت کے قائم مقام تھے، امام شعبہ کی روایتوں سے صحاح ستہ کی کتابیں بھری ہیں، بخاری ومسلم کے لئے شعبہ کی روایتیں قابل فخر ہیں۔

اور یہی امام شعبہ جن کا ابھی ابھی آپ نے مولانا مبارک پوری کے کلام سے حدیث میں مقام اور رفعت اور عظمت کا اندازہ لگایا، جب سورۃ فاتحہ کے بعد آہستہ آمین کہنے کی روایت ذکر کرتے ہیں تو مولانا مبارک پوری صاحب کا ان کے بارے میں انداز بدل گیا اور ان کو حدیث اور رجال حدیث میں ناقابل اعتبار قرار دینے پر پورا زور صرف کردیا، اب اس امام شعبہ کے بارے میں مولانا مبارک پوری دوسروں کی تقلید میں فرماتے ہیں:

ان شعبه كان يخطي في الرجال كثيرا .

کہ شعبہ تو سند میں بہت غلطی کرتے تھے۔

ان شعبة كان شاكا يشك كثيرا في الاسانيد والمتون .

یعنی شعبہ شکی تھے اور احادیث کے متن اور ان کے سندوں میں بہت زیادہ شک کرتے تھے۔

سفيان احفظ من شعبة

یعنی شعبہ سے زیادہ سفیان حافظ تھے۔

قد تقر ان شعبة اذا خالف سفيان فالقول قول سفيان

معلوم ہو چکا ہے کہ اگر شعبہ سفیان کی مخالفت کرے تو سفیان کا قول معتبر ہوگا

حديث سفيان ثلاثون الف وحديث شعبة عشرة الاف

سفیان کی حدیثیں تیس ہزار ہیں اور شعبہ کی حدیثیں دس ہزار ہیں۔

مشہور غیر مقلد عالم دین مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری امام ترمذی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: "الترمذی من ائمة هذالشان " یعنی امام ترمذی فن حدیث کے اماموں میں سے ہیں ایک جگہ اس بات کو اس طرح کہتے ہیں" انه من ائمة الفن " غرض یہ کہ مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری کو علم حدیث میں امام ترمذی کی امامت اور جلالت قدر وشان کا پورا پورا اعتراف ہے اور رفع یدین اور عدم رفع یدین کا مسئلہ بھی چونکہ حدیث ہی سے تعلق رکھتا ہے اس وجہ سے امام ترمذی کا اس بارہ میں جو فیصلہ ہے اس پر کسی قسم کا تبصرہ نہیں کیا جاسکتا۔

مبارکپوری صاحب کو امام ترمذی کے اس خاص حدیث عدم رفع یدین کو حسن کہنے پر اعتماد نہیں ہے مطلقاً کہہ دیا کہ "اما تحسين الترمذی فلا اعتماد عليه" (تحفہ ج: 1/ ص: 220) یعنی ترمذی کے حسن کہنے پر ہمیں اعتماد نہیں ہے۔ یعنی اب ان کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہوا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی اس کتاب میں جس جس حدیث کو حسن قرار دیا ہے وہ سب نا قابل اعتبار ہے۔

مبارکپوری صاحب خلیفہ راشد عمر بن عبد العزیز کے کردار پر حملہ کرتے ہوئے یہ صاحب فرماتے ہیں: "بعض خلفائے بنو امیہ کی تو خصوصاً یہ عادت ہو چکی تھی کہ وہ اوقات نماز کی چنداں پرواہ نہیں کیا کرتے تھے، ان کی دیکھ دیکھی حضرت عمر بن عبد العزیز بھی انہی کے نہج پر چلنے لگے۔"

حافظ ابن عبد البر نے کہا کہ عبارت کا ظاہری سیاق یہ بتلاتا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز سے ایک دن تاخیر ہو گئی تھی نہ یہ کہ یہ ان کی عادت تھی۔ (ص95)

بھلا بتلایئے کہ اصل بات کیا ہے اور محدث مبارکپوری صاحب نے اس کو کیسا غلط بنا کر کے حضرت عمر بن عبد العزیز جیسی اسلام کی قابل فخر و نادرہ روزگار شخصیت کو مطعون کرنے کی کوشش کی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

غور کرو کہ حدیث میں سجدہ سے پہلے چار جگہ رفع یدین کا ذکر ہے اور انہوں نے اپنے ترجمہ میں اس کو تین جگہ کرکے اس حدیث کو اپنے مطلب کے موافق بنالیا ہے:

ابن جریج اخبرنی نافع ان ابن عمر رضی اللہ عنہما کان یکبر بیدیہ حین یستفتح وحین یرکع وحین یقول سمع اللہ لمن حمدہ وحین یرفع رأسہ من الرکوع وحین یستوی قائما ۔

اس حدیث میں سجدہ سے پہلے پانچ جگہ رفع یدین کا ذکر ہے (1) نماز کے شروع کے وقت (حین یستفتح) (2) رکوع کے وقت (حین یرکع) (3) سمع اللہ لمن حمدہ کہتے وقت (حین یقول سمع اللہ لمن حمدہ (4) رکوع سے سر اٹھاتے وقت (حین یرفع راسہ من الرکوع) (5) اور رکوع کے بعد بالکل سیدھا کھڑے ہونے پر (حین یستوی قائما) ۔

حضرت امام بخاری جلیل االقدر محدث تھے علم حدیث کی معرفت میں ان کا مقام بہت بلند تھا، ان کے معاصرین میں ان کے ہمسر بہت کم تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مسائل شرعیہ میں امت نے ہمیشہ فقہاپر اعتماد کیا ہے محدثین اس راہ کی آدمی نہیں تھے کہ وہ مسائل کا استخراج واستنباط کریں، ان کا کام صرف احادیث کو جمع کردینا تھا، جو محتاط محدثین تھے وہ احادیث کے بارے میں زیادہ چھانٹ پھٹک کرتے تھے، امام بخاری کی صحیح بخاری میں امام بخاری کا یہی امتیاز نظر آتا ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بخاری کے احادیث کو سامنے رکھ کر شرعی وفقہی مسائل میں از خود کسی عامی کے لئے فیصلہ کرنا جائز ہوگا،اس بارے میں بخاری میں کیا ہے یہ نہیں دیکھا جائے گا بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ فلاں مسئلہ میں فقہا کی کیا رائے ہیں اور انہیں کی اتباع اور پیروی کی جائے گی۔

اوراس کی وجہ یہ ہے کہ احادیث ایک مسئلہ میں الگ الگ بھی مروی ہیں بلکہ ایک ہی کتاب میں ایک ہی مسئلہ کے بالکل متضاد اور مختلف قسم کے احادیث ہیں اس وجہ سے اگر صرف ان احادیث کو دیکھا جائے گا فقہی مسائل میں کوئی حکم معلوم کرنا بہت مشکل ہوگا اور یہ عین ممکن ہے کہ انسان احادیث او رمحدثین سے بدگمان ہوکر ان کا منکر ہو جائے اور ایسا ہو چکا ہے، منکرین حدیث کا ایک طبقہ اسی طرح پیدا ہوا ہے اس کو احادیث میں تضاد نظر آیا تو اس نے احادیث اور محدثین کے بارے میں غلط نظریہ قائم کرلیا۔

مسئلہ رفع یدین کے بارے میں اگر آپ صرف بخاری شریف پر یا صرف امام بخاری کی روایت کردہ احادیث پر نگاہ رکھیں گے اور انہیں سے رفع یدین کی مشرعیت کی حقیقت جاننا چاہیں گے تو خدا نہ کرے آپ کا بھی یہی حال ہو سکتا ہے، اور اس کا امکان ہے کہ آپ احادیث رسول سے برگشتہ ہو جائیں اور امام بخاری سے بھی بد گمان ہو جائیں اس لئے شریعت میں جس کا جو مقام ہے اس کو اس کی جگہ پر رکھئے، محدثین کا مقام اپنی جگہ پر ہے اور فقہا کا اپنی جگہ پر فقہا کا کام محدثین سے مت لیجئے خواہ امام بخاری ہو، خواہ امام مسلم ہو یا کوئی اور محدث۔

آپ اسی مسئلہ رفع یدین میں دیکھئے کہ امام بخاری کی روایت کردہ حدیثیں کس قدر مختلف ہیں تو بھلا ایسی مختلف احادیث سے رفع یدین کا مسئلہ کیسے منقح ہو سکتا ہے۔

امام بخاری نے بخاری شریف میں رفع یدین کے سلسلہ کی مندرجہ ذیل راویتیں ذکر کی ہیں:

1- عبد اللہ بن مسلمہ امام مالک سے اور امام مالک ابن شہاب زہری سے اور وہ سالم بن عبد اللہ سے اور سالم اپنے والد یعنی حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ اپنے دونوں شانوں تک اپنے دونوں ہاتھ اس وقت اٹھاتے جب نماز شروع کرتے اور اسی طرح اس وقت بھی اٹھاتے جب رکوع میں جاتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے او راس وقت سمع اللہ لمن حمدہ ربنا لک الحمد کہتے اور رفع یدین سجدہ میں نہ کرتے۔

اس روایت میں صرف تین جگہوں پر رفع یدین کا ذکر ہے اور سجدہ میں نفی کا ذکر ہے۔

2- بخاری کہتے ہیں کہ ہم سے محمد بن مقاتل نے بیان اور مقاتل نے کہا کہ ہمیں عبد اللہ نے خبر دی، عبد اللہ کہتے ہیں کہ ہم سے یونس نے بیان کیا اور یونس زہری سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ مجھے سالم بن عبد اللہ نے خبر دی اور انہوں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ جب نماز میں کھڑے ہوتے تھے اور اپنے دونوں ہاتھ اپنے شانوں کے مقابل

اٹھاتے اور آپ ایسا ہی کرتے، جب رکوع کے لئے تکبیر کہتے اور رفع یدین کرتے جب رکوع سے سر اٹھاتے اور سمع اللہ لمن حمدہ کہتے اور سجدہ میں رفع یدین نہ کرتے۔

3- ابو قلابہ کہتے کہ انہوں نے مالک بن حویرث کو دیکھا کہ جب وہ نماز پڑھتے تو تکبیر کہتے اور دونوں ہاتھ اٹھاتے اور جب رکوع کا ارادہ کرتے تو اپنے ہاتھ اٹھاتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو رفع یدین کرتے اور انہوں بیان کیا حضور اکرم ﷺ نے ایسا کیا تھا۔

4- ابو الیمان کہتے ہیں کہ ہم کو شعیب نے خبر دی، وہ زہری سے روایت کرتے ہیں زہری نے کہا کہ ہم کو سالم بن عبد اللہ نے خبر دی کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے نماز شروع کی تو تکبیر کے وقت دونوں ہاتھوں کو اٹھایا اور ان کو شانہ کے مقابل کیا اور جب رکوع کے لئے تکبیر کہی تو بھی ایسا ہی کیا اور جب سمع اللہ لمن حمدہ کہا تو بھی ایسا ہی کیا اور آپ نے ربنا لک الحمد کہا اور آپ رفع یدین نہیں کرتے تھے جب سجدہ کرتے اور جب سجدہ سے سر اٹھاتے۔

5- امام بخاری فرماتے ہیں کہ ہم سے عیاش نے بیان کیا، عیاش کہتے ہیں کہ ہم سے عبد الاعلی نے بیان کیا، عبد الاعلی کہتے ہیں کہ ہم سے عبید اللہ نے بیان کیا اور نہ نافع سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمر جب نماز میں داخل ہوتے تو تکبیر کہتے اور رفع یدین کرتے اور جب رکوع کرتے تب بھی رفع یدین کرتے اور جب سمع اللہ لمن حمدہ کہتے تب بھی رفع یدین کرتے اور جب دو رکعت سے کھڑے ہوتے تب بھی رفع یدین کرتے اور ابن عمر نے اس کو نبی ﷺ کی طرف مرفوع کیا۔

6- امام بخاری نے رفع یدین کے سلسلہ میں یہی پانچ احادیثیں ذکر کی ہیں، یہ حدیثیں عدد کے اعتبار تو پانچ ہی ہیں مگر فی الاصل صرف تین ہے ایک وہ جو حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور ایک مالک بن حویرث سے اور ایک وہ جو آخر والی ہے جس میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ عمل نافع نقل کر رہے ہیں۔ یہ روایت موقوف ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے مرفوع رایت کو دیکھئے حضرت ابن عمر اپنی پہلی دوسرے اور تیسری روایت میں حضور ﷺ کا جو عمل نقل کرتے ہیں، اس میں آپ صرف تین جگہ رفع یدین ذکر کرتے ہیں دو رکعت سے اٹھنے کے بعد رفع یدین کا ذکر نہیں کرتے، مالک بن حویرث والی روایت میں بھی آپ غور کریں اس میں بھی دو رکعت سے اٹھنے کے بعد رفع یدین کا ذکر نہیں ہے، مگر جب نافع حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا اپنا فعل نقل کرتے ہیں تو اس میں یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ عمر دو رکعت سے اٹھنے کے بعد بھی رفع یدین کرتے تھے۔ یعنی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فعل یعنی دو رکعت سے اٹھ کر بھی رفع یدین کرنا خود ان کی روایت کردہ حدیث کے خلاف ہے، مالک بن حویرث کے حدیث کے بھی خلاف ہے، نافع کا یہ کہنا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اس کو حضور ﷺ کی طرف مرفوع روایت کرتے تو وہ مرفوع اگر قابل اعتماد تھی تو امام بخاری نے اس کو کیوں ذکر نہیں کیا مرفوع کو چھوڑ کر موقوف راویت کا ذکر کرنا یہ خود بتلارہا ہے کہ امام بخاری کے نزدیک اس مرفوع روایت جس میں دو رکعت کے بعد بھی رفع یدین کا ذکر ہے اس کی حقیقت کیا ہے، امام شافعی بھی رفع یدین کے قائل تھے مگر وہ اس چوتھی جگہ رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

غرض امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی جو روایتیں ذکر کی ہیں ان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ صحیح کیا ہے تین جگہ رفع یدین کرنا یا چار جگہ رفع یدین کرنا دونوں باتیں صحیح نہیں ہو سکتی تین جگہ رفع یدین ہوگا یا چار جگہ، اب بخاری کی ان دونوں روایتوں میں سے آپ کون سی اختیار کریں گے تو ایک کو چھوڑنا لازم آئے گا اگر دو رکعت سے کھڑے ہونے پر ہی آپ رفع یدین کو اختیار کریں گے تو بخاری میں مذکور چاروں مرفوع روایات کو چھوڑنا لازم آئے گا کیا اسی کا نام بخاری کی احادیث پر عمل کرنا ہے؟ یا تین اور چار کا عدد الگ الگ نہیں ایک ہی ہے؟

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایتوں میں صاف مذکور ہے کہ حضور اکرم ﷺ سجدہ میں رفع یدین نہیں کرتے تھے بلکہ مالک بن حویرث کی روایت میں اس کا ذکر بلکہ اشارہ تک نہیں ہے اب معلوم نہیں کہ مالک بن حویرث کی حدیث صحیح ہے یا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی، یہ دونوں حدیثیں بخاری

کی آپ کے سامنے ہیں امام بخاری تو بخاری شریف میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے یہ تصریح نقل کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ سجدہ میں رفع یدین نہیں کرتے تھے، اور رفع یدین کے موضوع پر جو امام بخاری کی مستقل تصنیف ہے جس کو جزرفع یدین کے نام سے جانا جاتا ہے اس میں خود ابن عمر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بھی نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ دو سجدوں سے فارغ ہو کر کھڑے ہوتے تو بھی رفع یدین کرتے تھے، روایت کے الفاظ یہ ہے "واذا قام من السجدتين " یعنی جب دونوں سجدوں سے کھڑے ہوتے تو اس وقت بھی نافع کے بیان کے مطابق حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ رفع یدیت کرتے تھے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا یہ عمل خود ان کے روایت کردہ بخاری کی حدیثوں کے خلاف ہے۔

اس رسالہ میں امام بخاری نے سالم بن عبداللہ کی بھی حدیث نقل کی ہے جس میں صاف ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سجدوں سے سر اٹھاتے وقت بھی رفع یدیت کرتے تھے پوری روایت جز رفع یدین کی یہ ہے" عن العلاء انه سمع سالم بن عبد الله ان اباه كان اذا رفع رأسه من السجود واذا اراد ان يقوم رفع يديه " یعنی حضرت علاء فرماتے ہیں کہ انہوں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے لڑکے سالم سے سنا کہ وہ فرماتے تھے کہ والد حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جب سجدہ سے سر اٹھاتے او رجب کھڑے ہونے کا ارادہ کرتے تو رفع یدین کرتے امام بخاری جزرفع یدین کی یہ روایت صحیح بخاری کی اس روایت کی بالکل ضد ہے جس کو امام بخاری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ سجدوں میں رفع یدین نہیں کرتے تھے یہ دونوں روایتیں امام بخاری ہی اپنی الگ الگ دو کتابوں میں ذکر کر رہے ہیں اور دونوں روایتیں صحیح ہیں اگر جزرفع یدین والی روایت صحیح نہ ہوتی تو بخاری اس کو بتلاتے جیسا کہ ان کا اس رسالہ میں یہ دستور ہے کہ جو روایتیں کمزور ہیں ان کو امام بخاری نے بتلادیا ہے، مگر سالم کی اس روایت کے بارے میں امام بخاری خاموش ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ امام کے نزدیک یہ روایت صحیح ہے۔

ذرا آپ غور فرمائیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی ان روایتوں میں سے جو ایک دوسرے کے بالکل خلاف ہیں کس کو اختیار کیا جائے اور کیا وجہ ہے کہ امام بخاری کی روایت کردہ ان متضاد روایتوں میں سے ایک کو اختیار کیا جائے اور دوسرے کو اختیار نہ کیا جائے، جزقرات میں حضرت نافع سے بھی ایک روایت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ دونوں سجدوں سے اٹھتے وقت بھی رفع یدین کرتے تھے حدیث کے الفاظ یہ ہے" نافع ان عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کان اذا استقبل الصلوة یرفع یدیه واذا رکع واذا قام من السجدتین کبر ورفع یدیه (ص: 31)

اس حدیث کا ایک غیر مقلد عالم دین صاحب نے یہ ترجمہ کیا ہے" نافع نے بتایا کہ عبد اللہ جب نماز کی طرف متوجہ ہوتے تو رفع یدین کرتے اور رکوع سے سر اٹھاتے اور جب دو سجدوں سے اٹھتے تو رفع یدین کرتے، امام بخاری کی روایت کردہ یہ حدیث بھی ابن عمر رضی اللہ عنہ کی بخاری شریف میں ان روایتوں کے خلاف ہے جن میں یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ سجدہ میں رفع یدین نہیں کرتے تھے گویا خود ابن عمر رضی اللہ عنہ کا اپنا عمل اپنی روایت کردہ حدیث کے خلاف ہے۔

ایک طرف بخاری شریف کی روایت ہے کہ سجدوں میں رفع یدین نہیں ہے، یعنی صرف ابتدائے صلوۃ کے وقت اور رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت ۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کو رفع کرتے دیکھا تھا اور دوسری طرف امام بخاری یہ تصریح کر رہے ہیں کہ بہت سے تابعین جب سجدہ کرتے تھے تب بھی رفع کرتے تھے۔ جزرفع یدین میں امام بخاری فرماتے ہیں:

قال وکیع عن الربیع رأیت الحسن ومجاھدا وعطاء وطاوسا وقیس بن سعد والحسن بن مسلم یرفعون ایدیھم اذا رکعوا واذا سجدوا .(ص: 35)

غیر مقلد مترجم اس کا ترجمہ کرتے ہیں" وکیع نے ربیع سے روایت کی ہے اس نے کہا کہ میں نے حسن، مجاہد، عطا، طاؤس، قیس بن سعد، اور حسن بن مسلم کو دیکھا کہ وہ رفع یدین کرتے تھے جب رکوع کرتے اور جب سجدہ کرتے" یہ تمام تابعین سجدہ کے وقت بھی رفع کرتے تھے، جو بخاری شریف کی روایتوں کے خلاف ہے اور یہ خود امام بخاری ذکر کر رہے ہیں کوئی دوسرا نہیں گویا ان تابعین کو

بخاری والی روایت تسلیم نہیں یا یہ کہ ابن عمر کا یہ کہنا کہ حضور ﷺ صرف تین جگہ رفع یدین کرتے تھے ان تابعین کے نزدیک قابل اعتبار نہیں ہے۔

امام بخاری نے جزرفع یدین میں یحیٰ بن ابی اسحاق کی روایت ذکر کی ہے، اس میں ہے، میں نے حضرت انس بن مالک کو دیکھا کہ دونوں سجدوں کے درمیان بھی رفع یدین کرتے تھے۔ حضرت انس کا یہ عمل ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث جو بخاری میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ سجدہ میں رفع یدین نہیں کرتے تھے اس کے بالکل خلاف ہے۔ معلوم ہوا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں جو بات ہے کہ حضور اکرم ﷺ سجدہ میں رفع یدین نہیں کرتے تھے صحابہ کرام کے نزدیک وہ صحیح نہیں تھی۔ اگر حضور ﷺ کا یہی عمل دائمی ہوتا اور یہی سنت ہوتی تو حضرت انس رضی اللہ عنہ اس کے خلاف کیوں کرتے۔ صحابہ کرام کا عمل خصوصا عبادت کے سلسلہ میں خودساختہ نہیں ہوتا تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور اکرم ﷺ کو جو کرتے دیکھتے وہی کرتے اس لئے حضرت انس کے اس عمل پر امام بخاری کا یہ تبصرہ کہ وہ حدیث النبی ﷺ اولی کہ حضور اکرم ﷺ کی حدیث حضرت انس کی عمل سے اولی ہے یہ اس وقت صحیح ہوتا جب امام بخاری دلائل سے ثابت کردیتے کہ حضرت انس کا یہ عمل اللہ کے رسول ﷺ کے حدیث کے روشنی میں نہیں تھا، اگر حضرت انس کا یہ عمل خلاف حدیث تھا تو امام بخاری نے اس کو ذکر ہی کیوں نہیں کیا۔

غرض اگر امام بخاری کی روایتوں کو دیکھا جائے تو ان کی ذکر کردہ بخاری شریف اور جزرفع یدین کی روایتوں میں اتنا تضاد ہے کہ ان کی روشنی میں رفع یدین کے بارے میں کوئی واضح بات سمجھ ہی نہیں آتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جیسا کہ بخاری میں ہے کہ سجدہ میں رفع یدین کی نفی ہے، امام بخاری نے مالک بن حویرث کی جو حدیث ذکر کی ہے اس میں اس جگہ رفع کے اثبات یا نفی کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ مگر نسائی میں صحیح سند سے مالک بن الحویرث کی حدیث میں سجدہ کے وقت بھی رفع یدین کا ذکر ہے۔

مالک بن الحویرث فرماتے ہیں کہ انہوں نے نبی ﷺ کو نماز میں دیکھا کہ دونوں ہاتھ اٹھاتے، جب آپ رکو کرتے یا رکوع سے سر اٹھاتے یا جب آپ سجدہ کرتے یا جب آپ سجدہ سے سر اٹھاتے تو آپ ﷺ اپنے دونوں ہاتھ کانوں کے لو کے برابر کرتے، اس روایت کی سند مسلم کی سند ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: وقد واخرج مسلم بهذا الاسناد طرفه الاخير یعنی امام مسلم نے اس کا آخری حصہ (حتی یحاذی بهما فروع اذنيه) اسی سند سے ذکر کیا ہے معلوم ہوا کہ صحیح سند حضور اکرم ﷺ کا یہ عمل بھی ثابت ہے کہ حضور اکرم ﷺ سجدہ میں جاتے اور سجدہ سے سر اٹھاتے وقت بھی رفع یدین کرتے تھے، حضرت انس بن مالک کا عمل بھی جس کا تذکرہ اوپر ہوا، اس کی شہادت دے رہا ہے کہ حضور اکرم ﷺ سے رفع یدین کا عمل سجدہ میں بھی ثابت ہے۔

حضرت امام بخاری کی بخاری میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے جو روایتیں ہیں جن میں یہ ہے کہ آپ ﷺ سجدہ میں رفع یدین نہیں کرتے تھے اس کو خود سلفی بزرگوں نے تسلیم نہیں کیا ہے۔ علامہ محمد ناصر الدین البانی جو سلفیوں کے بہت بڑے محدث سمجھے جاتے ہیں، اپنی کتاب "صفۃ صلوۃ النبی" میں لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ سجدہ کرتے وقت بھی رفع یدین کرتے تھے اور حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ اس کو نسائی اور دار قطنی نے صحیح سند سے نقل کیا ہے اور پھر لکھتے ہیں:

"اس جگہ رفع یدین دس صحابہ کرام سے مروی ہے اور اس کی مشروعیت کی سلف کی ایک جماعت قائل ہے انہیں میں سے حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس، حسن بصری، طاؤس، اور ان کے لڑکے عبد اللہ مولی ابن عمر نافع، ابن عمر کے لڑکے سالم، قاسم بن محمد، عبد اللہ بن دینار اور عطا ہیں عبد الرحمن بن مہدی فرماتے تھے کہ سجدہ میں جاتے وقت رفع یدین کرنا سنت ہے امام اہل السنہ امام احمد بن حنبل کا اسی پر عمل ہے اور یہی ایک قول امام مالک اور امام شافعی کا بھی ہے"۔ (صفۃ صلوۃ النبی ص: 107)

اندازہ لگایئے کہ امام بخاری کی حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی وہ روایتیں جن میں صرف تین یا چار جگہ رفع یدین کا ذکر ہے اور ان میں یہ بھی صاف صاف مذکور ہے کہ آپ سجدہ میں رفع یدین نہیں کرتے تھے، ان کے شیخ البانی نے کتنے کھلے طور پر رد کر دیا ہے۔

شیخ ناصر الدین البانیؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح سجدہ کرتے وقت رفع یدین مسنون ہے اسی طرح سجدہ سے سر اٹھاتے وقت بھی رفع یدین مسنون ہے، فرماتے ہیں: حضور ﷺ سجدہ سے سر اٹھا کرکے برابر بیٹھ جاتے تھے اور اس تکبیر کے ساتھ بھی رفع یدین کرتے تھے۔

شیخ البانیؒ فرماتے ہیں کہ ابوداؤد نے اس کو صحیح سند سے ذکر کیا ہے بلکہ شیخ البانی کا تو مذہب یہ ہے کہ ہر تکبیر کے وقت رفع یدین مسنون ہے، وہ فرماتے ہیں: اس جگہ مصنف ابن ابی شیبہ میں صحیح سندوں سے ان حضرات نے رفع یدین مروی ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ، نافع، طاؤس، حسن بصری، ابن سیرین، ایوب سختیانی[1]۔

معلوم ہوا کہ سلفی بزرگوں نے بخاری کی روایتوں کو جن میں یہ ہے کہ رفع یدین تین یا چار جگہ ہے تسلیم نہیں کیا ہے۔ خواہ وہ ابن عمر کی روایتیں ہو، خواہ مالک بن حویرث کی سب کو شیخ البانی نے رد کر دیا بلکہ شیخ البانی اور امام بخاری کا جزء رفع یدین میں جو انداز ہے وہ بتلا رہا ہے کہ خود ابن عمر رضی اللہ عنہ کا ان اپنی روایتوں پر عمل نہیں تھا جن میں یہ ہے کہ حضور ﷺ سجدہ میں رفع یدین نہیں کرتے تھے تو جب راوی کا خود عمل اپنی روایت پر نہیں ہے تو دوسروں سے اس پر عمل کا مطالبہ کیسے کیا جا سکتا ہے، بہر حال امام بخاری نے جو روایتیں بخاری میں ذکر کی ہیں ان کی سند بلاشبہ صحیح ہیں مگر ان پر عمل کرنا اس لئے مشکل ہے کہ خود امام بخاری نے رفع کے بارے میں مختلف قسم کی روایتیں بخاری اور اپنے رسالہ جزء رفع یدین میں ذکر کرکے رفع دین کے مسئلہ کو بڑا پیچیدہ بنا دیا ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ امام بخاری صرف محدث تھے فقیہ نہیں تھے۔ محدث اپنا فرض انجام دیتا ہے اس کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ اس کے اس طرز عمل سے شرعی مسئلہ میں کتنا الجھاؤ پیدا ہو رہا ہے اس وجہ سے کہ اس کے علم میں یہ بات ہوتی ہے کہ اس الجھاؤ کو سلجھانے کے لئے اللہ نے ایک دوسری جماعت پیدا کیا ہے اور وہ جماعت فقہائے کرام کی ہے۔

[1] ج:1/ص: 106، باسانید صحیحة منهم ص: 117

ہم چونکہ حنفی ہیں اور امام اعظم ابو حنیفہ کے مقلد ہیں اس وجہ سے ہم ائمہ تابعین میں صرف امام اعظم رحمہ اللہ کی بات کرتے ہیں کہ انہوں نے اس مسئلہ کو کس سلجھایا ہے کہ چونکہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ سے رفع یدین کے سلسلہ میں مختلف اور متضاد قسم کی روایتیں ہیں اس وجہ سے انہوں نے دیکھا کہ کیا کوئی ایسا صحابی بھی ہے جو صرف ایک ہی بات بیان کرتا ہو اور اس کی احادیث میں تضاد نہ ہو تو انہوں نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو جو کہ بدری صحابی ہیں اور مہاجرین اولین میں سے ہیں جن کی اتباع کا قران میں بطور خاص حکم ہے اور اس پر اجر عظیم کا وعدہ ہے۔ رفع یدین کے سلسلہ کے صرف ایک ہی بات بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کی نماز میں صرف ایک دفعہ یعنی ابتدائے صلوۃ کے وقت رفع یدین ہوا کرتا تھا اور یہ بھی دیکھا کہ جن لوگوں رفع یدین کی احادیث ذکر کی ہیں ان میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مقام سب سے بلند ہے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے یہ بھی دیکھا کہ ابتدائے صلوۃ میں رفع کرنا تمام امت کا اتفاقی مسئلہ ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سب سے صحیح بات ابن المنذر کی ہے کہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ حضور اکرم ﷺ جب نماز شروع کرتے تھے تو رفع یدین کرتے تھے۔ (فتح الباری ج: 2/ص: 219)

اور امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں: اجتمعت الامۃ علی استحباب رفع الیدین عند التکبیرۃ الاحرام امت کا اجماع ہے کہ تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین مستحب ہے۔ (فتح الباری ج: 2/ص: 218)

غرض امام اعظم ابو حنیفہ نے جب دیکھا کہ تکبیر تحریمہ ہی وقت رفع یدین کرنے پر بلا اختلاف امت کا عمل ہے، تو انہوں نے تمام راویتوں کو چھوڑ کر اس اتفاقی رفع یدین کو جس کی تائید حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ہو رہی ہے اختیا کیا تا کہ امت اس مسئلہ میں کسی انتشار ذہنی کا شکار نہ ہو اور بقیہ حدیثوں کو اس پر محمول کیا کہ یہ اس وقت کی باتیں ہیں جب حضور ﷺ کا اسکنو فی الصلوۃ نماز میں سکون اختیار کرو کا حکم جاری نہیں ہوا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب

اب آخر میں ایک بات اور قارئین کے لئے عرض ہے کہ خود امام بخاری رحمہ اللہ نے بخاری شریف میں اپنی صحیح سند سے وہ روایت ذکر کی ہے جس میں صرف ایک جگہ یعنی شروع نماز میں رفع یدین کا ذکر ہے اور وہ روایت یہ ہے:

عن محمد بن عمرو بن عطاء انه كان جالسا مع نفر من اصحاب النبی ﷺ فذكرنا الصلوة النبی ﷺ فقال ابو حميد الساعدی انا كنت احفظكم الصلوة رسول اللہ رايته اذا كبر جعل يديه حذو منكبيه واذا ركع امكن يديه من ركبتيه ثم هصر ظهره فاذا رفع رأسه استوي حتي يعود كل فقار مكانه فاذا سجد وضع يديه غير مفترش والا قابضها الخ

محمد بن عمرو عطاء سے روایت ہے کہ وہ صحابہ کرام کے ایک جماعت کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اس مجلس میں حضور ﷺ کے نماز کا تذکرہ ہوا تو ابو حمید ساعدی کا کہا کہ میں تم سب سے زیادہ حضور ﷺ کی نماز کو یاد رکھنے والا ہوں میں آپ ﷺ کو دیکھا جب آپ ﷺ نے نماز شروع کرنے کے لئے تکبیر کہی تو آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو مونڈوں کے سامنے کیا اور جب آپ نے رکوع کیا تو پورے طور سے پر اپنے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھا، پھر اپنی پیٹھ کو سیدھا کیا پھر آپ نے جب رکوع سے سر اٹھایا تو سیدھے کھڑے ہوگئے یہاں تک جوڑوں کی ہڈیاں اپنی اپنی جگہ پر ہوگئیں پھر جب آپ نے سجدہ کیا تو اپنے دونوں ہاتھ اس طرح رکھے کہ نہ وہ پھیلے ہوئے تھے نہ سمٹے ہوئے تھے الی آخر الحدیث۔

ناظرین غور فرمائیں اس حدیث میں جو امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح سند سے صحیح بخاری میں نقل کیا ہے، ابو حمید ساعدی نے صرف ایک جگہ نماز شروع کرتے وقت رفع یدین کا ذکر کیا ہے امام بخاری نے اس حدیث کو رفع یدین کے باب میں ذکر کرنے کے بجائے "باب سنة الجلوس والتشهد" میں ذکر کیا ہے۔

ابو حمید ساعدی کی یہ روایت بتلارہی ہے کہ نماز میں حضور اکرم ﷺ کا معمول صرف ایک جگہ رفع یدین کرنا تھا۔

غرض بخاری شریف میں رفع یدین کرنے والی روایتوں کو دیکھا جائے تو اس میں بڑا تضاد ہے کہیں تین جگہ ذکر کہیں چار جگہ ذکر ہے کہیں ایک جگہ کا ذکر ہے اور اگر امام بخاری رحمہ اللہ کا رسالہ جزء رفع کو بھی سامنے رکھا جائے تو روایتوں کا یہ تضاد اور اختلاف اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔

اس سے اندازہ لگائیے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کی اہمیت کتنی زیادہ ہے جس میں صرف ایک ہی بات کہی جارہی ہے کہ رفع یدین صرف شروع نماز میں ایک جگہ ہے اور اے اللہ کے بندو! جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے رفع یدین منقول ہے ان میں عشرہ مبشرہ بھی ہیں وہ شروع نماز کا رفع یدین ہے، (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے)۔

چنانچہ نواب صدیق حسن خان صاحب امام غیر مقلد احباب کا یہ اعتراف وارشاد ملاحظہ فرمائیں نواب صاحب فرماتے ہیں: "رفع یدین شروع نماز میں تکبیر کو وقت تو اس کو صحابہ کرام میں سے تقریبا پچاس صحابہ کران نے حضور ﷺ سے نقل کیا ہے، ان میں دس صحابہ وہ بھی ہیں جن کو جنت کی بشارت سنائی گئی تھی"۔

صرف ابتدائے نماز میں رفع یدین کرنا اجتماعی مسئلہ ہے اور دوسرے جگہوں میں رفع یدین کرنے کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے اس سے بھی احناف کے قول کی قوت واضح ہے۔ نواب صاحب شروع مسلم سے امام نووی کا قول نقل کرتے ہیں: "تکبر تحریمہ کے وقت رفع یدین کرنے پر امت کا اتفاق ہے اور دوسری جگہوں میں رفع یدین کرنے میں لوگوں کا اخلاف ہے"۔

تحریمہ:

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ انے ارشاد فرمایا کہ نماز کی کنجی طہارت و پاکی (وضو) ہے اور نماز کا تحریمہ تکبیر ہے، اور اس کی تحلیل (نماز سے نکلنا) سلام پھیرنا ہے[1]۔

یعنی جب تکبیر تحریمہ کہا جاتا ہے تو جو کام نماز کے منافی تھا وہ حرام ہو گیا، اسی لئے اس تکبیر کو تکبیر تحریمہ کہتے ہیں، بغیر تکبیر تحریمہ کے کوئی شخص نماز میں داخل نہیں ہو سکتا، اس تکبیر کو تکبیر اولیٰ بھی کہتے ہیں کیوں یہ نماز کی پہلی تکبیر ہے اور اسی سے نماز شروع ہوتی ہے۔

امام بخاری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کو چھ لاکھ حدیثیں یاد تھیں امام بخاری کا رفع یدین کے سلسلہ میں ایک الگ رسالہ ہے، مگر ان چھ لاکھ میں امام المحدثین امام بخاری نے اس رسالہ میں صرف سترہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں فرمایا: یروي عن سبعة عشر نفسا من اصحاب النبي ﷺ انهم كانوا يرفعون ايديهم عند الركوع وعند الرفع منه.

یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے سترہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رفع یدین کرتے تھے اسی سے چار سو صحابہ رضی اللہ عنہم والی حدیث کے افسانہ کا آپ اندازہ لگالیں۔ میرا دعوی ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرام میں سے (جیسا کہ عوام میں عام طور پر مشہور ہے کہ حضور ﷺ کا انتقال کے وقت صحابہ کرامؓ کی یہ تعداد تھی) 25 صحابہ کرامؓ سے بھی صحیح سند سے بزرگ احباب اپنا اختلافی رفع یدین کی روایت ٹھیک ٹھیک نہیں پیش کر سکتے لیکن اگر نسخہ جاہل مدعی محقق کا استعمال کیا جائے تو چار سو نہیں چار ہزار احادیث کا بھی دعوی کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] سنن ابیداؤد، کتاب الطهارة، باب 31 فرض الوضوء، حديث 61 وكتاب الصلاة، باب 73 الامام يحدث بعد ما يرفع رأسهمن آخر ركعة، حديث: 618، وسنن الترمذي، ابواب الطهارة، باب 3 ماجاء في أن مفتاح الصلاة الطهور. حديث: 3، و كتاب الصلاة، باب 176 ماجاء في تحريم الصلاة، حديث: 238 و سنن ابن ماجة، كتاب الطهارة، باب 3 مفتاح الصلاة الطهور، حديث: 275 و 276

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جن کی روایت رفع یدین کے سلسلہ کی امام بخاری نے ذکر کی ہے خود امام بخاری جزء رفع یدین میں ان کا عمل ان کے شاگرد مجاہد سے نقل کرتے ہیں۔

حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو تکبیر اولی کے سوا نماز میں کہیں او رفع یدین کرتے نہیں دیکھا یہ حضرت مجاہد وہ ہیں جن کو حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ دس سال تک رہنے کا موقع ملا تھا۔

نیز حضرت امام بخاری اپنے رسالہ جزء رفع یدین ہی میں امام اوزاعی کا فتوی نقل کرتے ہیں کہ رفع یدین کا مسئلہ شروع زمانہ اسلام کا تھا۔ ہذ بن سلیمان فرماتے ہیں کہ میں نے امام اوزاعی سے پوچھا کہ نماز میں کھڑے ہونے کے حالت میں ہر تکبیر کے ساتھ رفع یدین کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ یہ شروع زمانہ کی بات تھی۔

یہی وجہ ہے کہ مدینہ منورہ میں جہاں کے ذرہ ذرہ پر اسلام کا آفتاب طلوع تھا وہاں حضرت امام مالک کے زمانہ تک اس رفع یدین کا مساجد میں اور خصوصا مسجد نبوی میں چلن نہیں تھا، ورنہ امام مالک کا مذہب رفع یدین ہوتا، حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ ان سے تو رفع یدین کا نہ جاننا اور مکروہ ہونا منقول ہے۔

اب اگر آپ کسی سے اس قسم کی بات کہو تو اس سے پوچھیں کہ بھائی رفع یدین کے بارے میں تمہارا مذہب کیا ہے وہ چار جگہ رفع کرنے کو بتلائے گا۔ آپ اس سے کہیں کہ تم صرف بخاری شریف میں چار سو نہیں صرف چار حدیثیں چار جگہ رفع یدین والی دکھلادو، آپ حیران ہو جائیں گے کہ وہ دیکھتا ہی رہ جائے گا۔

اسکنوا فی الصلوۃ پر دوبارہ تحقیقی بحث:

نسائی شریف میں امام نسائی نے باب فی السلام قائم کیا ہے اور اس میں اسکنو فی الصلوۃ والی حدیث ذکر نہیں کی ہے بلکہ یہ ذکر کی ہے:

عن عبيد الله وهو ابن القبطيه عن جابر بن سمرة قال :صليت مع رسول الله ﷺ فكنا اذا سلمنا قلنا بايدينا السلام عليكم ، السلام عليكم قال: فنظر الينا رسول الله ﷺ فقال ما بالكم تشيرون بايديكم كانها ذاناب خيل شمس اذا سلم احدكم فليلتفت الي صاحبه ولا يومئ بيده .(نسائي شريف باب السلام باليدين)

حضرت عبید اللہ قبطیہ حضرت جابر بن سمرۃ ؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی ہم جب سلام پھیرتے تو اپنے ہاتھ ہلاہلا کر السلام علیکم ،السلام علیکم کہتے ،تو اللہ کے رسول ﷺ نے ہماری طرف دیکھا اور فرمایا کہ کیا ہوگیا ہے تم کو کہ تم اپنے ہاتھ سے اس طرح اشارہ کرتے ہو گویا یہ ہاتھ یہ سرکش گھوڑے کی دم ہیں جب تم میں سے کوئی سلام کرے تو اپنے بغل والے کی طرف متوجہ ہو اور ہاتھ سے اشارہ نہ کرے۔

اس حدیث میں توجہ سے غور فرمایئے ،آپ کو کہیں اسکنو فی الصلوۃ نماز میں سکون اختیار کرو کا جملہ نظر نہیں آئے گا،اور نہ اس میں رفع یدین کا ذکر نظر آئے گا، معلوم ہوا کہ اسکنو فی الصلوۃ یعنی ترک رفع یدین والی حدیث الگ ہے اور یہ حدیث الگ اسکنو فی الصلوۃ والی حدیث میں صحابہ کرام کو حضور ﷺ نے رفع یدین کرتے دیکھا تھا اس سے منع فرمایا اور اس حدیث میں ہے کہ صحابہ کرام سلام پھیرتے وقت ہاتھ ہلاتے تھے آپ ﷺ نے اس حدیث میں سلام پھیرتے وقت ہاتھ ہلانے سے منع فرمایا اس باب میں نسائی نے اسکنو فی الصلوۃ والی حدیث ذکر ہی نہیں کی ہے،اس لئے بعض ساتھیوں کا یہ کہنا کہ تمام محدثین اس حدیث کو سلام کے بارے میں ذکر کرتے ہے حقیقت کے بالکل خلاف ہے اور بالکل سفید جھوٹی بات ہے۔

اب آیئے مسلم شریف کی طرف جس میں اسکنو فی الصلوۃ والی حدیث بھی ہے اور اصل صورت حال سے واقفیت حاصل کیجئے۔

مسلم شریف میں یہ باب قائم کیا گیا ہے" باب الامر بالسکون فی الصلوۃ والنھي عن الاشارۃ بالید ورفقھا عندالسلام واتمام الصفوف الاول والتراض فیھا والامر بالاجماع "

یعنی اس باب کے تحت جو حدیثیں ہوں گی ان سے مندجہ ذیل مسائل کا اثبات کیا جائے گا:

(1) نماز میں سکون اختیار کونا (2) سلام کے وقت ہاتھ سے اشارہ کرنے اور ہاتھ اٹھانے منع کرنا (3) پہلی صفوں کو پورا کرنا اور ان کو ملا ہوا ہونا (4) اور مل جل کر کھڑا ہونا ادھر ادھر کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھنا۔

امام مسلم نے اس باب کے تحت جو حدیثیں ذکر کی ہیں ان سے انہیں مسائل کو ثابت کیا ہے اور یہ سارے مسائل کسی ایک حدیث سے ثابت نہیں ہو رہے ہیں بلکہ ان کے لئے الگ الگ حدیثیں ہیں، مثلا ایک حدیث میں ایک تو یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ نماز میں رفع یدین نہ کرو، سکون اختیار کرو، دوسرا مسئلہ اسی حدیث سے یہ بیان کیا گیا ہے ہے کہ پہلی صفوں کو پور کرو، تیسرا مسئلہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ صفوں کو خوب جما کرکے قائم کرو، چوتھا مسئلہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ بکھر نہیں اجتماعی شکل میں نماز پڑھنا چاہیئے۔

ان تمام مسائل کو امام مسلم نے اس حدیث سے ثابت کیا ہے جو اس باب کی پہلی حدیث ہے:

عن تمیم بن طرفه عن جابر بن سمرة قال: خرج علینا رسو ل الله ﷺ فقال مالي اراكم رافعي ايديكم كانهاذاناب خيل شمس ؟ اسكنو في الصلوة قال ثم خرج علينا فرآنا حلقا فقال مالي اراكم عزين ؟ قال ثم خرج علينا فقا ل الا تصفون كما تصف الملائكة عند ربها فقلنا رسول الله ﷺ كيف تصف الملائكة عند ربها ، قال يتمون الصفوف الاول ويتراصون في الصف .

حضرت تمیم بن طرفہ حضرت جابر بن سمرۃ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ ہمارے اوپر رسول اللہ ﷺ نکلے اور ہم ہاتھ اٹھا کر نماز پڑھ رہے تھے تو آپ ﷺ نے (ناگواری کے طور پر) فرمایا، مجھے کیا ہوگیا ہے کہ میں تم کو رفع یدین کرنے والا دیکھ رہا ہوں گویا یہ ہاتھ سرکش گھوڑے کی دم ہیں، نماز میں سکون اختیار کرو۔ اتنے حصہ کے ترجمہ میں غور

کریں، اس حصہ میں رفع یدین کرنے پر ناگواری کا اظہار کرنا ہے، اور نماز میں سکون اختیار کرنے اور ہاتھ نہ اٹھانے والے مسئلہ کو بتلانا ہے، اب حدیث کے دوسرے حصہ کا ترجمہ دیکھئے، حضرت جابر فرماتے ہیں :

پھر ایک دفعہ رسول اکرم ﷺ ہمارے اوپر نکلے تو آپ نے ہم کو دیکھا کہ ہم مختلف حلقوں میں بٹ کر نماز پڑھ رہے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں تم کو بکھرا ہوا الگ حلقوں میں دیکھ رہا ہوں۔

حدیث پاک کے اس حصہ میں آپ ﷺ نے الگ الگ حلقوں میں بٹ کر نماز پڑھنے پر ناگواری کا اظہار فرمایا ہے یعنی اجتماعی شکل میں نماز پڑھنے کا مسئلہ بیان ہوا۔

حدیث پاک کا تیسرا حصہ ملاحظہ ہو، جس کا ترجمہ یہ ہے :

پھر ایک دفعہ اور آپ ﷺ ہمارے اوپر نکلے تو آپ نے فرمایا کہ تم لوگ اس طرح صف کیوں نہیں بناتے ہو جس طرح ملائکہ کی صفیں ان کے رب کی پاس ہوتی ہیں، ہم نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ملائکہ اپنے رب کے پاس کس طرح صف بناتے ہیں ؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ : وہ پہلی صفوں کو پوری کرتے ہیں اور صف میں جم کر کھڑے ہوتے ہیں۔

حدیث پاک کے اس تیسرے حصہ میں پہلی صفوں کو پورا کرنے اور صفوں میں جم کر کھڑے ہونے کا مسئلہ بیان ہوا۔

یعنی باب میں جن چار مسئلوں کا ذکر تھا کہ ان کو حدیث سے ثابت کیا جائے گا اس پہلی حدیث میں ان میں سے تین کا ذکر ہے، سلام کے وقت اشارہ کرنے سے منع کرنے والا مسئلہ اس حدیث میں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے لئے امام مسلم نے دوسری حدیث ذکر کی ہے، اس دوسرے حدیث کے راوی بھی حضرت جابر بن سمرۃ ہیں، مگر چونکہ وہ حدیث دوسری ہے اس لئے کہ اس کی سند اور اس کی الفاظ بھی الگ ہیں، یہ دوسری حدیث اصل الفاظ کے ساتھ ملاحظہ ہو۔

عبيد ابن القبطيه عن جابر بن سمرة قال كنا اذا صلينا مع رسول الله ﷺ، قلنا : السلام عليكم ورحمة الله اشاره بيده الي الجانبين فقال رسول الله ﷺ : علام تومون بايديكم كانها اذناب خيل شمس؟ انما يكفيكم احدكم ان يضع يده علي فخذه ثم يسلم علي اخيه من علي يمينه وشماله .

عبید ابن قبطیہ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے تو ہم السلام علیکم ورحمہ اللہ، السلام علیکم ورحمہ اللہ کہتے تھے اور اپنے ہاتھوں سے دونوں جانب دائیں اور بائیں اشارہ بھی کرتے تھے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ اپنے ہاتھوں سے کس وجہ سے اشارہ کرتے ہوں گویا وہ سرکش گھوڑے کی دم ہیں بس تمہارے لئے اتنا کافی ہے کہ تم میں ہر شخص اپنی ران پر ہاتھ رکھے پھر دائیں بائیں اپنے بھائی کی طرف رخ کرکے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہے۔ دیکھئے اس حدیث پاک میں صرف ایک مسئلہ کا ذکر ہے یعنی سلام کے وقت اشارہ کرنے سے منع کیا گیا ہے اور سلام کس طرح سے پھیرا جائے اس کا طریقہ بتایا گیا ہے کہ سلام پھیرتے وقت ہاتھ سے اشارہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہاتھ ران پر ہو اور دائیں بائیں رخ کرکے سلام پھیرا جائے۔

اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ نے ایک دوسرے سند سے ان الفاظ کے ساتھ بھی ذکر کیا ہے جس سے مسئلہ اور صاف ہو جاتا ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

صليت مع رسول الله ﷺ فكنا اذا سلمنا قلنا بايدينا السلام عليكم ، السلام عليكم، فنظر الينا رسو ل الله ﷺ فقال : ماشأنكم ؟ تشيرون بايديكم كانها اذناب خيل شمس ؟ اذا سلم احدكم فليلتفت الي صاحبه ولا يومي بيده .

یعنی میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تو ہم جب سلام پھیرتے تھے تو اپنا ہلا کر السلام علیکم، السلام علیکم کہتے تھے تو آپ ﷺ نے ہم سے کہا کہ کیا بات ہے؟ تم اپنے ہاتھوں

سے کیوں اشارہ کر رہے ہو گویا وہ سرکش گھوڑے کی دم ہیں، جب تم میں سے کوئی سلام پھیرے تو اپنے بغل والے کے طرف متوجہ ہو اور اپنے ہاتھ سے اشارہ نہ کرو۔

یہ حدیث بھی سلام کے وقت صرف اشارہ ہی کو منع کرنے کے لئے امام مسلم نے ذکر کی ہے اس میں کسی دوسرے مسئلہ کا ذکر نہیں ہے۔

آپ دونوں مسئلوں والی حدیثوں کو غور سے پڑھیں یعنی جس میں نماز میں رفع یدین سے منع کرنے اور سکون اختیار کرنے کا حکم مذکور ہے اس کو غور سے پڑھیں اور بعد والی ان دونوں حدیثوں کو غور سے پڑھیں جن میں صرف سلام کے وقت اشارہ کرنے سے منع کیا گیا ہے، آپ کو ان دونوں حدیثوں میں واضح فرق نظر آئے گا، پہلی حدیث میں کئی مسئلوں کا بیان ہے جب کہ دوسری حدیث میں نماز میں اشارہ کرنے کا ذکر ہے اور اس سے منع کرنے کا بیان ہے، تو پھر دونوں حدیثیں ایک کیسے ہو گئیں؟ رفع یدین والی پوری حدیث میں سلام کرتے وقت اشارہ کرنے کا کہیں ذکر ہی نہیں ہے تو اس کو سلام کے وقت اشارہ سے منع کرنے والی حدیث قرار دینا آنکھ میں دھول جھونکنا ہے اور حدیث رسول کو اپنے خواہش کی مطابق بھینٹ چڑھانا ہے، میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ جس نے دونوں حدیثوں کو ایک قرار دے کر دونوں کا تعلق سلام کے وقت اشارہ کرنے کے مسئلہ سے جوڑا ہے، وہ سخت غلط فہمی کا شکار ہوا ہے اس دونوں حدیثوں کے مضمونوں میں غور ہی نہیں کیا ہے، یا غور کیا ہے تو اس نے ان دونوں حدیثوں کو سمجھا ہی نہیں ہے اور اگر سمجھا ہے تو تجاہل برتا ہے۔

یعنی جان بوجھ کر جاہل بنا ہے اور سخت قسم کے عصبیت کا شکار ہوا ہے اور حق پر پردہ ڈالنے کی نارروا کوشش کی ہے۔

"تحفۃ الحوذی" میں مشہور غیر مقلد عالم دین مولانا عبد الرحمن مبارکپوری نے دونوں حدیثو کو ایک بتلانے میں امام بخاری ہی کا اصل سہارا لیا ہے اور اپنی عقل کو دعوت غور و فکر کردینے کی زحمت نہیں دی۔

امام بخاری بہت بڑے محدث ہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت سے مسائل میں ان کی تحقیق بہت کمزور ہوتی ہے اب یہیں دیکھئے کہ دونوں حدیثوں کو اشارہ عند السلام سے متعلق قرار دینا امام بخاری کی نری زبردستی ہے، جبکہ دونوں حدیثوں میں واضح فرق ہے، اور ایک نہیں کئی فرق ہے آپ ان فرقوں کو ملاحظہ فرمائیں۔

پہلا فرق یہ ہے کہ رکوع سے منع والی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ ایک دفعہ باہر تشریف لائے تو ایک چیز سے منع کیا اور دوسری مرتبہ تشریف لائے تو دوسری چیز سے منع کیا، تیسری مرتبہ تشریف لائے تو تیسری چیز سے منع کا حکم فرمایا گویا آنا جانا کم از کم تین بار ہوا جب کہ دوسری حدیث میں آنے جانے کا کہیں ذکر بھی نہیں ہے اور یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ آپ کا بار بار آنا ایک ہی اور ایک وقت میں ہوا ہو غالبا گمان یہ ہے کہ آپ کا یہ آنا جانا اور منع فرمانا الگ الگ دنوں یا الگ وقتوں میں ہوا تھا جیسا کہ لفظ "ثم" کا تقاضا ہے اور یو بھی عقل میں یہ بات نہیں آتی ہے کہ آپ ﷺ ایک دفعہ میں کئی ایسی چیزوں کو جن سے آپ کو منع فرمانا ہے دیکھیں اور آپ بار بار گھر سے نکلیں اگر آپ ﷺ ان ساری باتوں کو جن سے آپ نے منع فرمایا ہے پہلی ہی مرتبہ میں دیکھتے تو ضرور اسی وقت آپ سب سے منع فرمادیتے اس لئے بلاشبہ اس حدیث پاک میں الگ الگ وقتوں کا ذکر ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ رفع یدین سے منع کرنے والی حدیث میں ہے کہ صحابہ کرام اپنی الگ الگ نماز حلقہ بنا کرکے پڑھ رہے تھے...... حضور ﷺ کے نماز پڑھانے اور صحابہ کرام کا آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنے کا کوئی ذکر نہیں ہے جبکہ اشارہ عند السلام والی حدیث میں آپ ﷺ کے نماز پڑھانے اور صحابہ کرام کا آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنے کا ذکر ہے۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ آپ ﷺ نے پہلی حدیث میں "مالی اراکم رافعی ایدیکم" فرمایا یعنی مجھے کیا ہو گیا ہے کہ تم کو نماز میں ہاتھ اٹھانے والا دیکھ رہا ہوں جب کہ دوسری حدیث میں رفع یدین کا اشارہ تک نہیں ہے۔

چوتھا فرق یہ ہے کہ رفع یدین کرنے سے آپ نے اسکنو فی الصلوۃ یعنی نماز میں سکون اختیار کرو، یہ کہہ کر روکا جب کہ دوسری حدیث میں آپ نے یہ فرمایا "علام تومون بایدیکم کانہا اذناب خیل شمس" یعنی تم لوگ ہاتھ سے اس طرح اشارہ کیوں کر رہے ہو گویا وہ سرکش گھوڑے کی دم ہیں، کبھی آپ نے فرمایا "ماشانکم تشیرون بایدیکم" تمہارا کیا حال ہے تم ہاتھ سے اشارہ کرتے ہیں یعنی سکون اختیار کرنے کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔

پانچواں فرق یہ ہے کہ اشارہ عند السلام والی حدیث میں آپ نے اشارہ کرنے سے منع فرما کر نماز میں سلام پھیرنے کا طریقہ بتلایا کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ نماز پڑھنے والا اپنا ہاتھ اپنی ران پر رکھے رہے اور دائیں بائیں بغیر ہاتھ ہلائے سلام پھیر دے جبکہ رفع یدین والی حدیث میں اس کا دور دور ذکر تو کیا اشارہ تک نہیں ہے۔

چھٹا فرق یہ ہے کہ رفع کرنے والی حدیث میں حضرت جابر سے روایت کرنے والا تمیم بن طرفہ ہیں اور ان سے روایت کرنے والے مسیب بن رافع ہیں اور ان سے روایت کرنے والے اعمش ہیں او راعمش روایت کرنے والے ابو معاویہ ہیں اور ابو معایہ سے روایت کرنے والے دو ہیں ابو کریب اور ابو بکر بن ابی شیبہ ہیں اور ان دونوں سے اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور اشارہ ولی حدیث جو امام مسلم نے ذکر کی ہے اس کو حضرت جابر سے روایت کرنے والے دوسرے صاحب عبید اللہ بن قبطیہ ہیں اور ان سے روایت کرنے والے مسعر ہیں اور مسعر سے روایت کرنے والے ابن ابی زائدہ ہیں اور ان سے روایت کرنے والے ابو کریب ہیں اور ان سے روایت کرنے والے امام مسلم ہیں۔

آپ غور فرمائیں کہ ابو کریب کے بعد دونوں حدیثوں کی سند بالکل الگ الگ ہو جاتی ہیں، جب دونوں حدیثوں کی سند بالکل الگ الگ ہے اور دونوں کا مضمون الگ الگ ہے، تو دونوں حدیثوں کو ایک قرار دینا کسی قدر زبردستی کی بات ہے، دونوں حدیثوں میں ان واضح اختلافات اور فرق کے باوجود محض امام بخاری یا کسی اور محدث کی تقلید میں ایک قرار دینا کیا دیانت اور انصاف کی بات ہو گی۔ اور جس کے سامنے دونوں حدیثیں اپنے متن اور سند کے ساتھ ہوں گی کیا وہ اس کو تسلیم کرلے گا۔

امام بخاری تو ایک بہت ہی عجیب بات ان دونوں حدیثوں کے سلسلہ فرماگئے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ رفع یدین کا ذکر جس حدیث میں ہے اس کا تعلق تشہد کے حالت میں ایک دوسرے کو سلام کرنے سے ہے چنانچہ "اسکنو فی الصلوۃ" والی حدیث میں امام بخاری فرماتے ہیں:

قائما كان هذا في التشهد لا في القيام كان يسلم بعضهم علي بعض فنهي النبي ﷺ عن رفع الايدي في التشهد (جزء رفع یدین)

یعنی نماز میں سکون کا حکم جس حدیث میں ہے وہ تشہد کی سلسلہ میں وارد ہوئی ہے حالت قیام سے اس کا تعلق نہیں ہے، صحابہ کرام تشہد کی حالت میں ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے تو نبی ﷺ نے تشہد میں ہاتھ اٹھانے سے منع فرمادیا۔

امام بخاری کی اس بات میں کتنا وزن ہے اس کا فیصلہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جس کے سامنے دونوں حدیثیں ہو۔ رفع یدین سے منع کرنے والی بھی اور سلام پھیرتے وقت اشارہ کرنے والی بھی رفع یدین سے منع کرنے والی حدیث امام مسلم کی کتاب سے میں نے شروع مضمون میں پور نقل کی ہے آپ اس میں غور فرمائیں امام بخاری نے جو یہ فرمایا ہے کہ اس کا تعلق تشہد میں ایک دوسرے سے سلام کرنے سے ہے اس کی کسی طرح بھی گنجائش اس حدیث سے نکلتی ہے؟

تکبیر کے وقت رفع یدین:

"... مجھ سے سیدنا عبدالجبار بن وائل نے حدیث بیان کی، وہ سیدنا علقمہ بن وائل اور ان کے ایک آزاد کردہ غلام سے، اور وہ دونوں علقمہ کے والد سیدنا وائل بن حجر ص سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے (یعنی سیدنا وائل بن حجر ص نے) جناب رسول اللہ ا کو دیکھا کہ جب آپ ا نماز میں داخل ہوئے (یعنی نماز شروع کی) تو ہاتھ اٹھا کر تکبیر کہی، (راوی حدیث سیدنا) ہمام نے بیان کیا کہ آپ ا نے دونوں ہاتھوں کو کانوں تک اٹھایا"[1]۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب 15 وضع یدها الیمنٰی علی الیسریٰ، حدیث: 401

بلند آواز سے تکبیر کہنا :

سیدنا سعید بن حارث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیمار ہو گئے یا کہیں چلے گئے تو ان کی عدم موجودگی میں سیدنا ابوسعید خدری ص نے نماز پڑھائی، انہوں نے نماز شروع کرتے وقت تکبیر بلند آواز سے کہی اور رکوع کی تکبیر بلند آواز سے کہی اور سمع اللہ لمن حمدہ کو بلند آواز سے کہا اور جب سجدے سے سر اٹھایا تو بلند آواز سے تکبیر کہی، پھر سجدہ میں جاتے وقت اور اس سے اٹھتے وقت اور دو رکعتوں کے بعد قیام کرتے وقت بلند آواز سے تکبیر کہی، یہاں تک کہ اسی طرح نماز مکمل فرمائی، جب نماز سے فارغ ہوئے تو عرض کیا گیا کہ آپ کی نماز سے لوگوں کو کچھ الجھن ہوئی تو آپ ص نکل کر منبر پر کھڑے ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! اللہ کی قسم مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ تمہاری نماز کے طریقے جداگانہ ہوں یا یکساں ہوں یا نہ ہو، میں نے رسول اللہ ا کو اسی طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے[1]۔

اس روایت کو امام بیہقی نے نقل کیا ہے، نیز حاکم نے مستدرک میں نقل کرنے کے بعد کہا کہ یہ روایت شیخین کی شرط کے مطابق صحیح ہے تاہم ان دونوں نے ان الفاظ سے اسے روایت نہیں کیا ہے

تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھوں کی انگلیوں کی حالت:

"سعید بن سمعان رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہمارے پاس مسجد بنی زریق میں . داخل ہوئے اور فرمایا کہ تین چیزیں جنہیں رسول اللہ ا کیا کرتے تھے، لوگوں نے ترک کر رکھا ہے، آپ ا جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو اس طرح کہتے (سند کے ایک راوی) ابو عامر نے اس حدیث کی

[1] المستدرک للحاکم: 123/1 ، کتاب الصلاۃ، باب التامین، حدیث : 813 و مسند الامام أحمد: 18/3 مسند المکثرین، مسند أبي سعید الخدري، حدیث: 11157

تشریح کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا اور انگلیوں کو نہ بالکل کھول کر رکھا اور نہ بالکل سمیٹ کر[1] "۔

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: ہذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاہ (حوالہ سابق) "اس حدیث کی سند صحیح ہے تاہم شیخین امام بخاری اور امام مسلم نے اسے نقل نہیں کیا"۔

اس مذکورہ حدیث کی مزید وضاحت مندرجہ ذیل حدیث سے بھی ہوتی ہے:

"سیدنا ابوہریرہ ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نماز میں اپنی انگلیوں کو تھوڑا کھول کر رکھتے تھے[2] "۔

اسی لئے علماء کرام نے فرمایا ہے کہ تکبیر تحریمہ کے لئے ہاتھ اٹھاتے وقت انگلیوں کو نہ بالکل ایک دوسرے سے ملا کر رکھے اور نہ ہی بالکل کھول کر، بلکہ عام حالت میں عادت کے مطابق جس طرح انگلیاں رہتی ہیں اسی طرح رکھے۔

پاؤں کی انگلیوں کی حالت:

"سیدنا ابو حمید ساعدی جناب نبی کریم ﷺ کے حوالہ سے بیان فرماتے ہیں کہ پاؤں کے اطراف (انگلیوں) کو قبلہ رُخ رکھے[3] "

کانوں تک ہاتھ اٹھانا:

"براء بن عازب ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب تکبیر کہتے تو ہاتھ اٹھاتے، یہاں تک کہ ہم آپ ا کے انگوٹھوں کو آپ ا کے کانوں کے قریب دیکھتے تھے[4] "۔

---

[1] مستدرک الحاکم: 1/234، کتاب الصلاۃ، باب التامین حدیث: 856

[2] مستدرک الحاکم: 1/235، کتاب الصلاۃ، باب التامین، حدیث: 857

[3] صحیح البخاری، کتاب الصلاۃ، باب 28 فضل استقبال القبلۃ، قبیل الحدیث: 391، وایضا: کتاب الأذان، باب 131 یستقبل بأطراف رجلیہ القبلۃ، قبیل الحدیث: 808

[4] مسند الامام احمد: 4/303، مسند الکوفیین، حدیث البراء بن عازب حدیث: 18906

"انس فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ اکو دیکھا کہ آپ تکبیر کہتے ہوئے اپنے انگوٹھوں کو دونوں کانوں کے برابر تک لے جاتے[1]"۔

ہاتھ کہاں تک اُٹھائے جائیں:

حضرت عبد الجبار بن وائل اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ نماز شروع فرماتے تو اپنے ہاتھ کانوں تک اتنا اٹھاتے تھے کہ آپ کے دونوں انگوٹھے آپ کے دونوں کانوں کی لَو کے برابر ہو جاتے۔(نسائی:882)

ہاتھ کیسے اُٹھائے جائیں:

حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی تکبیر کہے تو اُسے چاہیے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھائے اور اُن کا اندرونی حصہ (یعنی ہتھیلیوں کا رُخ) قبلہ کی طرف کرے۔(طبرانی اوسط:7801)

تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانے کی جو مختلف کیفیت احادیث میں مروی ہے اس کے پیش نظر علماء کرام نے بیان کیا ہے کہ تحریمہ کے لئے ہاتھ اٹھانے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ انگوٹھا کانوں کی لو کے مقابل ہو اور انگلیاں کان کے اوپری حصہ کے مقابل، اور ہتھیلی کا نچلا حصہ مونڈھوں کے مقابل، اس طرح ہاتھ اٹھانے سے تمام احادیث پر عمل ہو جاتا ہے، چونکہ یہ طریقہ سنت کے مطابق ہے اس لئے اگر اس عمل کا استخفاف اور اس کو غیر اہم قرار دینا مقصود نہ ہو تو اس کے برخلاف عمل کرنا مکروہ نہیں البتہ بہتر طریقہ کے خلاف ضرور ہے، ہاتھ اٹھاتے وقت سر کو نہیں جھکانا چاہئے نیز ہتھیلیوں کا رخ قبلہ

---

[1] المستدرک : 226/1، کتاب الصلاة، باب التامين، حديث: 822، و الدارقطني: 338/1، باب ذكر الركوع والسجود، حديث:1293، والبيهقي: 99/2، باب وضع اليدين قبل الركوع ، ومجمع الزوائد، كتاب الصلاة، باب 175 رفع اليدين في الصلاة، حديث:2582

کی طرف ہونا چاہئے نہ کہ کان کی طرف، اور ہاتھ اٹھاتے وقت انگلیوں سے کان چھونے کی بھی کوئی دلیل نہیں اس لئے کانوں کو نہ چھونا چاہئے۔

رکوع میں جاتے اور اٹھتے ہوئے رفع یدین نہ کرنا:

اِس مسئلہ میں بھی بعض لوگ بڑی شدّت اور غُلو سے کام لیتے ہیں اور رفعِ یدین نہ کرنے والوں کی نماز کو فاسد اور ناقص قرار دیتے ہیں، اِس لئے اِس مسئلہ کو قدرے تفصیل سے ذکر کیا جارہا ہے تاکہ حقیقت کو اچھی طرح سمجھا جاسکے: نماز میں تکبیرِ تحریمہ کے علاوہ رکوع میں جاتے ہوئے یا رکوع سے اُٹھتے ہوئے ہاتھوں کو کانوں تک نہیں اُٹھایا جاتا اور اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

"عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کیا میں تم لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کی نماز پڑھ کر نہ دکھاؤں؟ راوی کہتے ہیں کہ پھر انہوں نے نماز پڑھی تو صرف ایک مرتبہ (شروع نماز میں تکبیر تحریمہ کے وقت) ہاتھ اٹھایا[1]"۔

حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز شروع کرتے تو دونوں ہاتھوں کو کانوں کے قریب تک اٹھاتے پھر دوبارہ (یعنی دوسری تکبیرات میں) نہیں اٹھاتے[2]۔

ابوداؤد ہی میں حضرت براء بن عازب کی ایک اور روایت ہے:

---

[1] سنن ابي داؤد، كتاب الصلاة، باب 116-117 من لم يذكر الرفع عند الركوع، حديث:748، و سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 191 ماجاء أن النبي ﷺ لم يرفع الا في أول مرة، حديث:257، وصحيح سنن الترمذي للألباني، باب رفع اليدين عند الركوع، حديث: 257-211 و سنن النسائي، كتاب الافتتاح، باب 87 ترک ذلک، حديث:1026، وصحيح سنن النسائي للألباني، باب الرخصة في ترک ذلک، حديث: 1013 رجاله رجال مسلم كذا في الجوهر النقي وصححه ابن حزم كذا في التلخيص الحبير {آثار السنن ص:205 ،حديث :402 ،قال النيموي :رواه الثلاثة وهو حديث صحيح {إعلاء السنن ج:3 /ص:57 حديث 813}

[2] ابوداؤد ج:1 / ص:118، قال ابوداؤد روي هذالحديث هيثم وخالد وابن ادريس .

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا آپ نے نماز شروع کرتے وقت ہاتھ اٹھائے، نماز ختم ہونے تک دوبارہ ہاتھ نہیں اٹھائے[1]۔

اور مصنف ابن ابی شیبہ میں الفاظ ہیں: پھر نماز سے فارغ ہونے تک دوبارہ (ہاتھ) نہیں اٹھائے[2]۔

اور مصنف عبدالرزاق میں الفاظ ہیں: مرة واحدة ثم لاتعد لرفعهما في تلك الصلوة[3]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز پڑھی ہے، یہ سب شروع نماز کے علاوہ رفع یدین نہیں کرتے تھے[4]۔

حضرت مغیرہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابراہیم نخعی سے وائل کا ذکر کیا کہ انہوں نے نبی ﷺ کو نماز شروع کرتے وقت اور رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع کرتے ہوئے دیکھا ہے تو انہوں نے فرمایا: اگر وائل نے آپ ﷺ کو ایک بار رفع یدین کرتے ہوئے دیکھا ہے تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پچاس بار رفع یدین نہ کرتے ہوئے دیکھا ہے[5]۔

مجاہد فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو شروع کی تکبیر (یعنی تکبیر تحریمہ) کے علاوہ کبھی رفع یدین کرتے ہوئے نہیں دیکھا[6]۔

---

[1] حوالہ بالا

[2] مصنف ابن ابي شيبة ج:1 /ص:267

[3] ج:2 / ص: 71

[4] سنن الكبري للبيهقي ج:2/ص: 180 اسناده جيد كذا في الجوهر النقي، إعلاء السنن ج:3/ص:67، حديث 821

[5] شرح معانى الآثار ج:1 /ص:146 {قلت : سند حسن رجاله كلهم ثقات الا مؤمل بن اسماعيل مختلف فيه وثقة بعضهم وتكلم فيه آخرون ، إعلاء السنن ج:3 / ص:86، حديث 829}

[6] مصنف ابن ابي شيبه ج:1/ص:268. {وسنده صحيح كذا في لآثار، إعلاء السنن ج :3 /ص:64، حديث 818}

حضرت اسود ؓ فرماتے ہیں : میں نے حضرت عمر ؓ کے ساتھ نماز پڑھی، انہوں شروع نماز کے علاوہ پوری نماز ہاتھ نہیں اٹھایا۔ عبد الملک فرماتے ہیں کہ میں نے شعبی او رابراہیم اور اور ابو اسحاق کو دیکھا کہ وہ سب شروع تکبیر کے علاوہ ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے[1]۔

ابو اسحاق فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کے اصحاب او رحضرت علی ؓ کے اصحاب شروع صرف نماز کے شروع میں ہاتھ اٹھاتے تھے[2] ۔

"حضرت علقمہؒ سیدنا عبد اللہ بن مسعود ؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ کیا میں رسول اللہ ا کی نماز کے بارے میں مطلع نہ کروں؟ چنانچہ کھڑے ہوئے اور ایک ہی مرتبہ ہاتھ اٹھائے پھر (پوری نماز میں دوبارہ) ایسانہ کیا"[3]۔

"سیدنا عبداللہ ؓ رسول اللہ اسے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم اتکبیر اولی کے وقت رفع یدین کرتے پھر (پوری نماز میں) کہیں ایسانہ کرتے[4]"۔

سیدنا عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود ؓ کی حدیث کے بارے میں کہا ہے کہ "لم یثبت" یعنی یہ حدیث ثابت نہیں، اس سلسلہ میں مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے جامع ترمذی کی مشہور و معروف شرح الکوکب الدری میں لکھا ہے:

"عبداللہ بن مبارک کا یہ کہنا کہ عبداللہ بن مسعود ؓ کی حدیث ثابت نہیں ہے، یہ قول بغیر کسی دلیل وبرہان کے محض تخمین وگمان ہے، اور آپ کو معلوم ہے کہ جرح مبہم یعنی بغیر کسی دلیل کے جرح والزام قابل قبول نہیں، جب کہ امام ترمذی نے سیدنا عبداللہ بن مسعود ص کی حدیث کو حسن قرار دیا

---

[1] مصنف ابن ابي شيبه ج:1 /ص:268{سنده صحيح علي شرط مسلم ،إعلاء السنن ج:3 /ص:62،حديث 816}

[2] مصنف ابن ابي شيبه ج: 1 /ص:267{قال النيموي رواه ابن ابي شيبة واسناده صحيح ، إعلاء السنن ج:3 / ص:214 حديث 407}

[3] سنن النسائي: 182/2، كتاب الافتتاح، باب 87 ترک ذلک،حديث :1026

[4] طحاوي:224/1 ، باب التكبير للركوع

ہے، اور سیدنا عبد اللہ بن مسعود ص کی حدیث کے تمام راوی ثقہ اور معتبر ہیں، البتہ بعض لوگوں نے ایک راوی عاصم بن کلیب کو متکلم فیہ یعنی ضعیف قرار دیا ہے، لیکن اکثر محدثین نے اس کو قبول نہیں کیا، اور کیوں کر وہ ضعیف ہو سکتے ہیں جب کہ امام بخاری نے ان سے مروی حدیث کو جزء القراءۃ میں اور امام مسلم نے اپنی صحیح میں، اور ابوداود، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے اپنی اپنی سنن میں نقل کیا ہے، لہٰذا اگر تھوڑا سا ہم نیچے بھی اتریں تو ہم کہیں گے (یعنی کم سے کم اتنا ضرور کہیں گے) کہ یہ حدیث "حسن" ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بغیر کسی شک وشبہ کے یہ حدیث، حدیث صحیح، ہے[1]"۔

نیز محدث کبیر علامہ شیخ محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے قول "لم یثبت" کے بارے میں علامہ نیموی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

" نیموی رحمۃ اللہ علیہ نے تحقیق کی ہے کہ اس سلسلہ میں سیدنا عبد اللہ بن مسعود ﷛ کی دو حدیثیں ہیں۔ایک تو یہی جو ان کے فعل کے بارے میں ہے اور دوسری حدیث مرفوع ہے۔اور سیدنا عبد اللہ بن مبارک کا انکار دوسری حدیث یعنی مرفوع کے بارے میں ہے نہ کہ اس حدیث کے بارے میں جو سیدنا عبد اللہ بن مسعود ص کا فعل ہے، اور ابن دقیق العید کا کہنا ہے کہ عبد اللہ بن مبارک کے نزدیک کسی حدیث کا ثابت نہ ہونا اس حدیث کے غیر معتبر ہونے کے لئے کافی نہیں، دراصل مسئلہ کا دارمدار ایک راوی عاصم بن کلیب پر ہے لیکن امام جرح وتعدیل ابن معین نے انہیں ثقہ قرار دیا ہے[2]"۔

عاصم بن کلیب راوی کو اکثر محدثین نے ثقہ ومعتبر قرار دیا ہے، جیسا کہ اوپر کی عبارتوں سے معلوم ہوا بلکہ محدثین کے جم غفیر کا ان کی ثقاہت پر گویا اجماع ہے، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

---

[1] الكوكب الدري على سنن الترمذي: 272/1، باب رفع اليدين عند الركوع والسجود

[2] حاشية الكوكب الدرى على سنن الترمذى: 272/1، حاشية: 1، باب الرفع عند الركوع والسجود

"امام نسائی اور ابن معین نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، امام ابوداود کہتے ہیں کہ اہل کوفہ میں (اپنے ہمعصروں میں) سب سے افضل تھے، اور ابن سعد نے کہا کہ یہ ثقہ ہیں اور ان کی روایت قابل استدلال ہے، اسی طرح بہت سارے اہل فن یعنی ائمۂ جرح وتعدیل نے انہیں ثقہ اور معتبر مانا ہے[1]"۔

لہٰذا سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کی بناء پر ماننا پڑے گا کہ سیدنا عبداللہ بن عمر وغیرہ نے رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کا جو ذکر کیا ہے[2] وہ بھی رسول اللہ کا دائمی یا اکثری معمول نہ تھا، اگر ایسا ہوتا تو سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جو آپ کے قریب صف میں کھڑے ہونے والوں میں سے تھے، اس سے یقینا واقف ہوتے اور تعلیم کے اس موقع پر رفع یدین ہرگز ترک نہ کرتے، واضح رہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی مذکورہ تمام روایات کو شیخ ناصر البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی صحیح قرار دیا ہے، امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

"اور اس باب میں براء بن عازب کی بھی روایت ہے ابو عیسی ترمذی کہتے ہیں کہ ابن مسعود کی حدیث، حدیث "حسن" ہے اور اصحاب نبی کریم ﷺ اور تابعین میں سے متعدد اہل علم اسی کے قائل ہیں، اور یہی قول سفیان ثوری اور کوفہ والوں کا ہے[3]"۔

الغرض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت (جس میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں) نے اپنے غور وفکر، اپنے دینی وجدان وادراک اور رسول اللہ ﷺ کے معمولات کے مسلسل مطالعہ، مشاہدہ اور تجزیہ کی بناء پر سمجھا کہ نماز میں اصل ترکِ رفعِ یدین ہے اور رفع یدین کرنا وقتی اور عارضی عمل تھا،

---

[1] حاشية الكوكب الدري على سنن الترمذي: 272/1، حاشية: 2، باب رفع اليدين عند الركوع والسجود

[2] صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب 84 رفع اليدين اذا كبر واذا ركع واذا رفع، حديث: 736

[3] سنن الترمذي، باب ماجاء أن النبي ﷺ لم يرفع الا في أول مرة حديث: 257

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہی سمجھا اور امام ابو حنیفہ امام مالک اور سفیان ثوری رحمہم اللہ وغیرہ نے اسی کو اختیار کیا۔

واضح رہے کہ رفع یدین کی روایت سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور رفع یدین نہ کرنے کی روایت سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور جب کسی مسئلہ میں ان دونوں حضرات کا اختلاف ہو جائے تو علماء جرح وتعدیل کا کہنا ہے کہ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کو ترجیح حاصل ہو گی، چنانچہ محدث کبیر احمد محمد شاکر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے:

"امام علی بن مدینی نے امام یحییٰ بن معین سے کہا کہ جب عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت پر عمل کرنا زیادہ بہتر اور اولی ہے اس پر امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ جی ہاں! [1]"۔

نیز خود سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جن سے رفع یدین کی حدیث مروی ہے، رفع یدین نہیں کرتے تھے، چنانچہ ابن ابی شیبہ نے نقل کیا ہے:

"مجاہد کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ صرف ابتداء نماز میں رفع یدین کرتے تھے[2]"۔

ترکِ رفع یدین کے مسئلہ میں خلفاءِ راشدین اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل:

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ، حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر کے ساتھ نماز پڑھی، انہوں نے سوائے تکبیر تحریمہ کے کہیں بھی اپنے ہاتھوں کو نہیں اٹھایا[1]۔

---

[1] شرح العلامة أحمد محمد شاكر على سنن النسائي: 128/1، حديث: 82 باب الوضوء من مس الذكر

[2] مصنف ابن ابی شیبہ: 214/1، باب 5 من كان يرفع يديه في اول تكبير ثم لا يعود، روايت: 2452

حضرت اسودؒ فرماتے ہیں: میں نے سیدنا حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ نماز پڑھی، اُنہوں نے نماز کے شروع میں تکبیر کے علاوہ کسی اور جگہ ہاتھ نہیں اُٹھایا[2]۔

حضرت عاصم بن کلیبؒ اپنے والد سے نقل فرماتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ جب نماز شروع کرتے تو ہاتھ اُٹھاتے تھے پھر (آخر تک) دوبارہ نہیں اُٹھاتے[3]۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مجھے حضرت نُعیم مُجمر اور ابو جعفر قاریؒ نے خبر دی ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اُنہیں نماز پڑھاتے تھے تو ہر اُٹھتے اور جھکتے ہوئے تکبیر (یعنی اللہ اکبر) کہتے تھے۔

حضرت ابو جعفر قاریؒ فرماتے ہیں: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ صرف نماز کے شروع میں تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اُٹھایا کرتے تھے[4]۔

حضرت ابراہیم نخعیؒ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرماتے ہیں: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نماز کے شروع میں (تکبیرِ تحریمہ کہتے ہوئے) ہاتھ اُٹھاتے تھے پھر (آخر تک) نہیں اُٹھاتے[5]۔

---

[1] رواه الطحاوی وابو بکر بن ابی شیبة والبیهقي في المعرفة وسناده صحیح (اعلاء السنن ج:3/ص:64) کذا اخرجه البیهقي واسناده جید کذا في الجوهر النقي (ج:1/ص:138) (اعلاء السنن ،ج:3/ص:62،63) أخرجه ابن ابي شیبة في المصنف وسنده صحیح علی شرط مسلم

[2] أخرجه ابن ابي شیبة في المصنف وسنده صحیح علی شرط مسلم .(اعلاء السنن ج: 3/ص: 62،63)

[3] مصنّف ابن ابي شیبہ: 2442 ورواه الطحاوي (ج:1/ص:132) وقال الزیلعي (ج:1/ص:211) وهو اثر صحیح وفي روایة (ص: 85) رجاله ثقات وفي التعلیق الحسن (ج:1/ص:107) قال العیني في عمدة القاري واسناد حدیث عاصم بن کلیب صحیح علی شرط مسلم (اعلاء السنن ج:3/ص:63)

[4] مؤطا امام محمد: 88

[5] مصنّف ابن ابی شیبه: 2443 وهذا سند صحیح کذا في "الجوهر النقي (ج: 1/ص: 139)ولکن مرسله عنه في حکم الموصول کما مر غیر مرة ،قال الطحاوي (ج: 1/ص: 133) کان ابراهیم اذا ارسل لم یرسلة الا بعد صحته عنده وتواتر الروایة عن عبد الله .

حضرت مُجاہدؒ فرماتے ہیں: " میں نے حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ کو صرف نماز کے شروع میں ہاتھ اُٹھاتے ہوئے دیکھا[1]۔

حضرت مُجاہدؒ فرماتے ہیں: میں نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی، اُنہوں نے نماز کی صرف تکبیرِ تحریمہ کہتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو اُٹھایا[2]۔

ترکِ رفع یدین کے مسئلہ میں کبار تابعینؒ کا عمل:

حضرت اسودؒ فرماتے ہیں: میں نے حضرت عمر کو دیکھا کہ وہ پہلی تکبیر (تکبیرِ تحریمہ) میں اپنے ہاتھ اُٹھاتے پھر دوبارہ (آخر تک) نہیں اُٹھاتے، راوی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابراہیم نخعی اور حضرت شعبی کو بھی دیکھا کہ وہ بھی اِسی طرح کرتے تھے[3]۔

حضرت شعبیؒ کے بارے میں منقول ہے: وہ صرف پہلی تکبیر (یعنی تکبیرِ تحریمہ) میں ہاتھ اُٹھاتے تھے پھر (آخر تک) نہیں اُٹھاتے[4]۔

حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں: حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں: نماز کے شروع کے علاوہ کسی جگہ ہاتھ نہیں اٹھاؤ[5]۔

حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں: جب تم نماز کے شروع میں تکبیر کہو تو اپنے ہاتھوں کو اُٹھاؤ پھر بقیہ پوری نماز میں ہاتھوں کو نہ اُٹھاؤ[6]۔

---

[1] مصنّف ابن ابی شیبة:2452

[2] اخرجه الطحاوي كتاب الصلوة باب التكبيرات (1240)وابن ابي شيبه كتاب الصلوة باب من كان يرفع يديه (2442)

[3] راوه الطحاوي وقال هو حديث صحيح وفي الرواية (ص:85)رجاله ثقات (اعلاء السنن ،ج: 3/ص:62)

[4] مصنّف ابن ابی شیبه:2444 قال عبد الملك ورأيت الشعبي وابراهيم واسحاق لايرفعون أيديهم الا حين يفتحون الصلاة ، رجاله رجال الصحيحين او احدهما (آثار السنن ،ص: 155 حاشيه :1)

[5] رواه ابن ابي شيبة قال محمد بن علي النيموي في حاشية آثارالسنن (ص:158) رواته كلهم ثقات .

[6] مصنّف ابن ابی شیبه:2445

حضرت اسودؒ اور حضرت علقمہؒ کے بارے میں آتا ہے: وہ دونوں نماز کے شروع میں ہاتھ اُٹھایا کرتے تھے پھر دوبارہ نہیں اُٹھاتے[1]۔

حضرت ابواسحاقؒ فرماتے ہیں: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت علیؓ کے شاگرد صرف نماز کے شروع میں (تکبیر تحریمہ کہتے ہوئے) ہاتھ اُٹھایا کرتے تھے۔ حضرت وکیعؒ فرماتے ہیں کہ پھر وہ دوبارہ نماز کے آخر تک دوبارہ ہاتھ نہیں اُٹھاتے تھے[2]۔

اِمام مالکؒ فرماتے ہیں: کہ میں تکبیر تحریمہ کے علاوہ (نماز کے اندر) کسی چیز میں رفعِ یدین نہیں جانتا، نہ ہی جھکنے میں اور نہ اُٹھنے میں۔

اِمام مالکؒ کے شاگرد حضرت عبد الرحمان بن قاسم فرماتے ہیں: تکبیرِ تحریمہ کے علاوہ رفعِ یدین کرنا اِمام مالکؒ کے نزدیک ضعیف مسلک تھا[3]۔

اِمام مالکؒ نے ترکِ رفعِ یدین کا مسلک اِس لئے اختیار کیا کیونکہ اُن کے نزدیک اہلِ مدینہ کا عمل ایک حجت اور دلیل کی حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ علّامہ ابن قیم الجوزیؒ فرماتے ہیں: اِمام مالکؒ کے اُصول میں سے ہے کہ وہ اہلِ مدینہ کے عمل کی اتباع کرتے ہیں اگرچہ وہ حدیث کے خلاف ہی کیوں نہ ہو[4]۔

پس اِس سے معلوم ہوا کہ مدینہ منوّرہ جوکہ اہلِ علم اور عالَمِ اِسلام کا عظیم مرکز ہے، نبی کریم ﷺ کا جائے سکونت ہے، وہاں کے رہنے والے بھی تکبیرِ تحریمہ کے علاوہ کہیں رفعِ یدین نہیں کیا کرتے تھے، نیز اِسی سے یہ بھی واضح ہوا کہ آپ ﷺ کا آخری عمل "ترکِ رفعِ یدین" کا تھا، اِسی وجہ سے خلفاء راشدین صحابہ رضی اللہ عنہم کرام اور تابعین کی ایک بڑی جماعت نے اِسی کو اختیار کیا ہے۔

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ: 2453

[2] مصنّف ابن ابی شیبہ باب من کان یرفع یدیہ: 2446 واسنادہ صحیح جلیل (الجوھر النقي (ج: 1/ص: 139)

[3] المدوّنۃ الکبریٰ: 165/1 موطا امام مالك (ص: 63 حاشیہ 4) قال النووي ھو اشھر الروایات عن مالك ،قال الباجي وروي عنہ في "المدونۃ" كان یرفع الیدن ضعیفا الا في افتتاح الصلاۃ.

[4] بدائع الفوائد للجوزی: 32/4

علم و عمل کا عظیم مرکز جسے دنیا "کوفہ" کے نام سے جانتی ہے، اور جہاں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کرام و تابعین کی ایک بڑی جماعت رہی ہے، وہاں کے رہنے والوں کا بھی مسلک "ترکِ رفعِ یدین" ہی کا تھا، چنانچہ اِمام ترمذیؒ فرماتے ہیں: "بہت سے اہلِ علم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کرامؓ اور تابعینؒ اسی کے قائل ہیں اور یہی حضرت سفیان ثوریؒ اور اہلِ کوفہ کا قول ہے۔ (یعنی نماز میں صرف تکبیرِ تحریمہ کے وقت رفعِ یدین کیا جائے گا) [1]۔"

فقہِ حنفی کے سب سے بڑے ناقل حضرت اِمام محمدؒ اپنی شہرہ آفاق کتاب "موَطاء اِمام محمد" میں لکھتے ہیں: اور بہرحال نماز میں رفعِ یدین کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ صرف ایک مرتبہ نماز کی اِبتداء میں ہاتھوں کو کانوں تک اُٹھائے، پھر اس کے بعد نماز میں کسی بھی جگہ ہاتھ نہ اُٹھائے۔ اور یہ سب حضرت اِمام ابو حنیفہ کا قول ہے [2]۔

رفعِ یدین کی روایات قابلِ عمل کیوں نہیں:

ائمّہ اربعہ میں دو بڑے اور مشہور اِمام یعنی اِمام اعظم ابو حنیفہؒ اور حضرت اِمام مالکؒ رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے کھڑے ہوتے ہوئے رفعِ یدین کے قائل نہیں، اور اُنہوں نے رفعِ یدین کی روایات کو اِس لئے ترجیح نہیں دی کیونکہ وہ احادیث متن کے اعتبار سے مضطرب (مختلف) ہونے کی وجہ سے قابلِ اِستدلال نہیں، چنانچہ رفعِ یدین کی "اِصح مافی الباب" یعنی سب سے زیادہ صحیح روایت جس کو رفعِ یدین کے بارے میں سب سے مضبوط اور ٹھوس دلیل قرار دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اُسے "حجۃ اللہ علی الخلق" کا درجہ دیا گیا ہے، وہ حضرت عبد اللہ بن عمر کی ایک روایت ہے، جسے اِمام بخاریؒ نے نقل کیا ہے کہ:

---

[1] ترمذی، رقم الحدیث: 257

[2] موطا اِمام محمد: 90، 91، میزان وفي ذلك آثار كثيرة عن جماعة من الصحابة منهم ابن عمر ﷺ وعلي ﷺ وابن مسعود ﷺ.

حضرت عبد اللہ بن عمر نبی کریم ﷺ کی نماز کا یہ طریقہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نماز کے شروع میں تکبیر کہتے ہوئے، رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے سر اُٹھا کر رفع یدین کیا کرتے تھے[1]۔

لیکن یہ حدیث متن کے اعتبار سے مضطرب (یعنی مختلف) ہے، یعنی اِس کے الفاظ کے اندر بڑی کثرت سے اختلاف پایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے یہ حدیث قابلِ اِستدلال نہیں، اور اِس کے اضطراب کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر کی روایت میں بکثرت یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ نماز میں رفعِ یدین یعنی ہاتھوں کے اُٹھانے کا عمل کتنی مرتبہ اور کہاں کہاں کیا جائے گا، چنانچہ:

☆...ایک روایت میں صرف رکوع سے اُٹھ کر رفعِ یدین کا ذکر ہے[2]۔

☆...ایک روایت میں دو رکعتوں کے بعد تیسری رکعت کیلئے کھڑے ہونے کے بعد بھی رفعِ یدین کا ذکر ہے[3]۔

☆...صرف سجدہ میں جاتے ہوئے بھی رفعِ یدین کا ذکر ہے[4]۔

☆...ایک اور روایت میں ہر خفض و رفع یعنی نماز میں ہر اونچ نیچ کے وقت رفعِ یدین کا ذکر ہے[5]۔

☆...ایک روایت میں صرف نماز کے شروع میں تکبیرِ تحریمہ کہتے ہوئے رفعِ یدین کا ذکر ہے[6]۔

مذکورہ بالا تمام احادیث حضرت عبد اللہ بن عمر سے ؓ ہی مَروی ہیں، اور ان سب میں دیکھ لیجئے کہ کس قدر شدید متن کا اختلاف و اضطراب پایا جاتا ہے، نیز خود حضرت عبد اللہ بن عمر ؓ جو کہ اِس "اِصح مافی الباب" روایت کے راوی ہیں، خود اُن کا عمل بھی رفعِ یدین کا نہیں تھا، چنانچہ مشہور اور

---

1 بخاری: 735

2 مؤطا مالک: 210 و موطا امام محمد (ص: 89، قدیمی)

3 بخاری: 739

4 طبرانی اوسط: 16

5 شرح مشکل الآثار: 5831 و موطا امام مالك (ص: 64)

6 نصب الرّایۃ: 1/404/مستخرج ابی عوانہ: 1572 و موطا امام محمد (ص: 93،94 ،قدیمی)، ورواہ الطحاوی وابوبکر بن ابی شیبة والبیھقی فی المعرفة وسندہ صحیح(آثار السنن، ص: 157)

جلیل القدر تابعی حضرت مُجاہدؒ جنہوں نے ایک طویل زمانہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ گزارا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو صرف نماز کے شروع میں ہاتھ اُٹھاتے ہوئے دیکھا[1]۔

جبکہ ترکِ رفعِ یدین کی روایات غیر مضطرب ہیں جن میں سند اور متن کا کوئی اختلاف اور اضطراب بھی نہیں پایا جاتا، اور نہ ہی اُن کے راوی کا عمل اپنی روایت کردہ حدیث کے خلاف ہے پس ایسے میں اُنہیں کیوں اختیار نہ کیا جائے اور وہ کیوں قابلِ ترجیح نہ ہوں۔اور پھر اُس پر مزید یہ کہ وہ روایات قرآن کریم کے مُوافق اور تعاملِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے مطابق بھی ہیں، چنانچہ قرآن کریم کی آیات: (قُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ) اور (الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُون) سے اِسی کی تائید ہوتی ہے، نیز خلفاء راشدین سمیت کئی صحابہ رضی اللہ عنہم کرام اور تابعین کا عمل بھی اِسی کے مطابق رہا ہے اور اِسی وجہ سے اہلِ علم کے دو بڑے مرکز مدینہ منوّرہ اور کوفہ کے فقہاء کرام نے اِسی کو اختیار کیا تھا۔

نماز باجماعت

اہمیت :

سیدنا ابن مسعودؓ نے فرمایا:

بیشک رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ہدایت کے طریقے سکھائے، ان ہدایت کے طریقوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اس مسجد میں نماز ادا کی جائے جس میں اذان دی جاتی ہے۔۔۔اور ایک روایت میں ہے (انہوں نے فرمایا) اگر تم نماز اپنے اپنے گھروں میں پڑھو گے، جیسے (جماعت سے) پیچھے رہنے والا یہ شخص اپنے گھر میں پڑھ لیتا ہے تو تم اپنے نبی اکرم ﷺ کی سنت چھوڑ دوگے اور اگر نبی کی سنت چھوڑ دوگے تو گمراہ ہو جاؤگے اور (یہ بات بھی شامل ہے کہ) جب کوئی شخص اچھا وضو کر کے مسجد جائے تو

[1] مصنّف ابن ابی شیبۃ:2452/طحاوی:1357 قال وهو حديث صحيح وفي الرواية (ص:85) رجاله ثقات (اعلاء السنن ج: 3/ص:62) وفي آثار السنن ايضا عن الاسود (ص:154) رواه الطحاوي وابو بكر بن ابي شيبة وهو اثر صحيح

اللہ تعالیٰ ہر قدم کے بدلے ایک نیکی لکھتا ہے، ایک درجہ بلند کرتا ہے اور ایک برائی مٹا دیتا ہے۔ میں نے صحابہ کرامؓ کو دیکھا (اسوقت) جماعت سے سوائے کھلے منافق کے کوئی پیچھے نہیں رہتا تھا اور بیمار کو بھی دو آدمیوں کے سہارے نماز کے لئے لایا جاتا اور صف میں کھڑا کر دیا جاتا تھا[1]۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اکیلے شخص کی نماز سے، جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا ستائیس درجے زیادہ (باعث ثواب) ہے[2]۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میری جان ہے البتہ میں نے ارادہ کیا کہ میں لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دوں۔ پھر نماز کا حکم دوں اور اس کے لئے اذان کہی جائے، پھر کسی شخص کو لوگوں کی امامت کے لئے کہوں، پھر ان لوگوں کے گھر جلا دوں جو نماز (جماعت) میں حاضر نہیں ہوتے[3]۔

سیدنا عبد اللہ بن ام مکتومؓ نابینے تھے، انہوں نے اپنے نابینے ہونے کا عذر پیش کر کے اپنے گھر پر نماز پڑھنے کی اجازت چاہی تو نبی اکرم ﷺ نے پہلے تو انہیں اجازت دے دی لیکن پھر فرمایا: اذان سنتے ہو؟ سیدنا عبد اللہؓ نے کہا: جی ہاں! آپ نے فرمایا: تو پھر نماز میں حاضر ہو جایا کرو[4]

بھائیو سوچو! نابینے شخص کو گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت نہ مل سکی اور آنکھوں والے جو اذان سن کر مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے نہیں جاتے وہ کتنے بڑے جرم اور گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

---

[1] مسلم باب صلوۃ الجماعۃ من سنن الھدي حدیث 654

[2] بخاری باب فضل صلوۃ الجماعۃ حدیث 645 مسلم باب فضل صلاۃ الجماعۃ حدیث 650

[3] بخاری باب وجوب صلوۃ الجماعۃ حدیث 644 مسلم باب فضل صلوۃ الجماعۃ حدیث 651

[4] مسلم باب یجب اتیان المسجد علي من سمع النداء حدیث 653

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

عورتوں کو مسجد میں آنے کی اجازت :

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تمہاری عورت مسجد جانے کی اجازت مانگے تو اسے ہر گز منع نہ کرو[1]۔

ہم غیر مقلد احباب کے پیش کردہ حدیث کے ترجمہ پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ میں "لایمنعہ" کا لفظ ہے جس کا ترجمہ ہے "اس کو منع نہ کرے" جبکہ آپ نے معنی میں "ہر گز" کا لفظ اپنی طرف سے بڑھایا ہے۔

سیدنا ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تم اپنی عورتوں کو نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں آنے سے منع نہ کرو، اگرچہ ان کے گھر ان کے لئے بہتر ہیں[2]۔

تبصرہ:

ہم تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں اس حدیث کو حافظ مرحوم علی زئی صاحب نے حاکم خزیمہ اور امام ذہبی کے حوالے سے صحیح کہا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ ابن خزیمہ کے حاشیہ پر اس حدیث کو ان کے امام ناصر الدین البانی نے بھی صحیح کہا ہے ۔اور محقق صاحب کے شریک کار صلاح الدین صاحب نے بھی اس کو صحیح کہا ہے { تفسیر احسن البیان سورۃ النور پارہ 18 آیت 37 } لیکن اسی حدیث کو خود محقق مرحوم علی زئی صاحب { تسہیل الوصول ص:58 } پر ضعیف کہتے ہیں۔ایک ہی حدیث ایک کتاب میں ضعیف اور دوسرے میں صحیح۔

﴿ غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں : ﴾

---

[1] بخاری باب الاستئذان المرأۃ زوجها بالخروج الي المسجد حديث 873 مسلم باب خروج النساء الي المساجد اذا لم يترتب عليه فتنة حديث 442

[2] ابود اؤد باب في خروج النساء الي المسجد حديث 567 امام حاکم 1 /209 امام ابن خزیمہ حدیث 1284 اور امام ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عورت کا کمرے میں نماز پڑھنا صحن میں نماز پڑھنے سے زیادہ بہتر ہے۔ اور اس کا کوٹھڑی میں نماز پڑھنا کھلے آسمان میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے [1]۔

تبصرہ:

ہم پیش کردہ روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اس روایت کی سند میں ایک راوی حبیب بن ابی ثابت ہے جو عن سے روایت کر رہے ہیں جس کو {نماز نبوی جدید ص: 235} پر خود مرحوم علی زئی صاحب مدلس کہتا ہے، اور آپ کے اپنے اصول کے مطابق مدلس راوی کی روایت سے استدلال درست نہیں۔

عورتوں کو خوشبو لگا کر مسجد جانے کی ممانعت ہے [2]۔

عورتوں کا گھر میں نماز ادا کرنا مسنون ہے:

غیر مقلد محدث عالم مولانا مبارک پوریؒ فرماتے ہیں:

"تم جانو کہ عورتوں کا گھر میں نماز پڑھنا مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے، اور اس کے باوجود بھی اگر کوئی عورت مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت حاصل کرے (یعنی شوہر سے) تو اس کو روکنا نہیں چاہیئے بلکہ (شوہر کی طرف سے) اس کو اجازت دی جانی چاہیئے، لیکن اس کے لئے چند شرطیں ہیں جن کا بیان احادیث میں آیا ہے، ان کا لحاظ ضروری ہے"۔

اس کے بعد مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری صاحب نے امام نووی کے حوالہ سے ان شرطوں کا ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہیں:

---

[1] ابوداؤد باب التشدید فی ذلک حدیث 570 اسے امام حاکم 209 ابن خزیمہ 1690، 1688 اور امام ذہبی نے صحیح کہا ہے

[2] مسلم باب خروج النساء الی المساجد حدیث 443

(1) جو عورت نماز کے لئے مسجد جائے وہ خوشبو نہ لگائے (2) بن سنو کر نہ جائے (3) پاؤں میں آواز والا پازیب نہ پہنے (4) اچھے کپڑے پہن کر نہ جائے (5) مردوں سے ملے جلے نہیں (6) نوجوان نہ ہو یا نوجوان کی طرح نہ ہو (7) راستہ میں عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کا فتنہ نہ ہو۔

فتاوی نذیریہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فہم پر عدم اعتماد کا برملا اظہار کیا ہے اور اسی فتاوی نذیریہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو "ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الهدا ویتبع غیر سبیل المؤمنین" کا مصداق ٹھہرایا گیا ہے۔

خود امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں یہ باب قائم کیا ہے "باب خروج النساء الی المساجد باللیل ولغلس" یعنی یہ باب اس مسئلہ کے بیان کرنے میں ہے کہ عورتوں کو مسجدوں میں رات کو وقت اور صبح کے اندھیرے میں حاضر ہونا چاہیئے۔

اس حدیث کی شرح جو حافظ ابن حجر فرمارہے ہیں اس کو بھی آپ سن لیں فرماتے ہیں:

وکان اختصاص اللیل بذالک لکونہ استر (فتح الباری ج: 2/ص: 347)

یعنی حدیث میں رات کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ رات کا وقت عورتوں کے لئے زیادہ ساتر ہوتا ہے۔

اور اس کے بعد فرماتے ہیں: ولا یخفی ان محل ذلک اذا امنت المفسدة منهن وعلیهن

یعنی رات میں بھی اس وقت عورتوں کو مسجد میں جانے کی اجازت ہے جب ان کی جانب سے یا ان پر دوسروں کے جانب سے کسی طرح کا مفسدہ اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔ (ایضا)

اور اسی سلسلہ کی حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث بھی ذکر کی ہے:

عن عائشة رضي الله عنها قالت لو درك رسو ل الله ﷺ ما احدث الناس لمنعهن كما منعت نساء بني اسرائيل

یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں کہ اللہ کے رسول ﷺ ان احوال کو دیکھتے جو لوگوں کے آج ہو گئے ہیں تو آپ ﷺ عورتوں کو مسجد میں آنے سے اس طرح منع کر دیتے جس طرح سے بنی اسرائیل کی عورتوں کو روک دیا گیا تھا۔

اور ان کا آنا اور جانا کس طرح ہوتا تھا بخاری کی روایت ہے:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز پڑھ کر جب فارغ ہوتے تو عورتیں چادر میں اپنے کو بالکل چھپا کر نماز سے واپس ہوتی تھیں، اندھیرے کی وجہ سے ان کو کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ عورتیں فجر کی نماز میں بھی حاضر ہوتی تھیں تو بالکل چادر سے لپٹی ہوئی اور اندھیرا اتنا ہوتا تھا کہ انہیں کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔

قارئین یہی سے اس حکمت کو بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ فجر کی نماز اندھیرے میں کیوں پڑھتے تھے چونکہ آپ کے زمانہ میں فجر کی نماز میں عورتیں بھی شریک ہو جایا کرتی تھیں اس وجہ سے ان کی ستر پوشی اسی میں تھی کہ نماز فجر اندھیرے میں ادا کی جائے، ورنہ نماز فجر کے لئے آپ ﷺ کا ارشاد موجود ہے کہ اجالے میں نماز پڑھو اس لئے کہ اس میں اجر زیادہ ہے اس وقت نمازی بڑی تعداد میں شریک ہو سکتے ہیں اور جماعت جتنی بڑی ہوگی اس کا اجر بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔

اور خود اللہ کے رسول ﷺ اور آپ کے اصحاب اپنی اپنی جگہوں پر نماز سے فارغ ہو کر بیٹھتے رہتے تا آنکہ عورتیں چلی جاتیں، بخاری ہی کی حدیث ہے حضرت ام سلمہ فرماتی ہے:

عورتیں اللہ کے رسول ﷺ کے زمانہ میں جب فرض نماز سے سلام پھیر لیتیں تو اٹھ کر چلی جاتیں اور آپ ﷺ اور آپ کے اصحاب اپنی جگہ پر بیٹھے رہتے پھر جب اللہ کے رسول ﷺ جانے کے لئے کھڑے ہوتے تو مرد بھی واپس ہوتے۔

قارئیں غور فرمائیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نماز میں حاضر ہونے والی عورتوں کی وجہ سے کتنی احتیاط فرماتے کیا آج کے اس دور میں اس احتیاط کا کسی درجہ میں بھی تصور ہو سکتا ہے۔

اسی سے ملتی جلتی مگر اس سے اور واضح بخاری کی ایک دوسری روایت ہے وہ بھی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ فرماتیں ہیں:

رسول اکرم ﷺ جب نماز سے سلام پھیرتے تو آپ کے سلام پھیرتے ہی عورتیں اٹھ کر چلی جاتیں اور آپ ﷺ اپنی جگہ پر تھوڑی دیر ٹھہرے رہتے اس روایت کے راوی امام زہری فرماتے ہیں کہ ہمارا خیال یہ ہے کہ آپ ﷺ ایسا اس لئے کرتے تھے قبل اس کے کہ حاضرین میں سے کوئی ان کو پالے وہ مسجد سے نکل جائیں (اور اپنے اپنے گھروں کو پہنچ جائیں)

بخاری کی ان روایات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگرچہ حضور ﷺ کے زمانہ عورتوں کو مسجد میں جانے کی اجازت بطور رخصت تھی مگر آپ ﷺ ان کی حاضری کی وجہ سے ان کے حسب حال اس کا پورا اہتمام فرماتے تھے کہ ان کی عصمت آبروں کی پوری حفاظت ہو، عورتوں کے صفوں کو بھی آپ ﷺ سب سے پیچھے رکھتے تھے حتی کے بچوں کے بھی پیچھے ان کی صفیں ہوا کرتی تھیں تاکہ نماز سے سلام پھیرنے کے فورا بعد وہ مسجد سے نکل جائیں اور اس میں کسی کا کوئی تاخیر نہ آئیں اسماعیل بن امیہ سے مروی ہے: سئل النبی ﷺ عن خروج النساء فقال یخرجن تفلات

یعنی آپ ﷺ سے عورتوں کے مسجد کے آنے کے بارے میں پوچھا گیا، تو آپ ﷺ فرمایا کہ وہ مسجد میں آسکتی ہیں مگر پرانے کپڑے اور بغیر زیب وزینت کے۔ (منصف عبدالرزاق ج: 3/ص: 151)

ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا: کہ وہ مسجد میں نہ آئیں مگر اس میں کہ وہ پرانے کپڑے میں ہو اور زیب وزینت انہوں نے نہ اختیار کیا ہو۔

امام للیث لیخرجن تفلات کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ: اس کی بدن پر پرانے کپڑے ہو اور بلا تیل وخوشبو لگائے مسجد میں جائیں۔ (مصنف ج: 3/ص: 144)

مسلم کی ایک روایت میں کہ: اگر کوئی عورت مسجد جائیں تو خوشبو ہرگز نہ لگائیں۔
(فتح الباری ج: 2/ص: 250)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں : خوشبو ہی کے حکم میں وہ تمام چیزیں داخل ہیں جن سے شہوت بھڑکتی ہو جیسے اچھے کپڑے پہن کر مسجد میں جانا زیور کو ظاہر کرکے پہننا خوب زیب وزینت کے ساتھ جانا مردوں سے اختلاط کرنا۔(ایضا)

حضرت عمرؓ کی بیوی حضرت عاتکہ رضی اللہ عنہا مسجد میں نماز کے لئے جاتی تھیں تو ان سے حضرت عمرؓ نے فرماتے : واللہ انك لتعرفن ما احب هذا

خدا قسم تم خوب جانتی ہو کہ مجھے تمہارا مسجد جانا پسند نہیں ہے۔(مصنف ج: 1/ ص: 148)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد ہیں: عورت کی نماز اس کی کوٹھڑی میں دوسری جگہوں کے نماز پڑھنے سے افضل ہے اس لئے کہ یہ جب نکلتی ہے تو شیطان اس کی تانک جھانک میں لگا رہتا ہے۔ (مصنف ج: 3/ص: 150)

بسااوقات تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بڑی سخت قسم کھا کر فرماتے :

ما من مصلي لامراة خير من بيتها الا في حج او رعمرة الا امرأة قد يئست من البعولة فهي في منقلها.

یعنی عورتوں کی نماز کی جگہ اس کی کوٹھڑی سے بہتر کوئی نہیں الا یہ کہ وہ حج وعمرہ کو جائے البتہ وہ عورت (مسجد میں حاضر ہو سکتی ہے) جو اتنی بوڑھی ہو چکی ہے کہ اب اسے شادی نہیں کرنی ہے اور بڑھاپے سے اس کے قدم بھی مشکل سے اٹھتے ہیں۔ (مصنف ج: 2/ص:150)

قارئین کے سامنے عورتوں کے مسجد میں جانے کی رخصت کی سلسلہ میں جو تفصیل اب تک آچکی ہے اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ عورتوں کا مسجد میں جانا شریعت کے نگاہ میں بہت مستحسن فعل اور محمود امر نہیں تھا اور اگر ان کو اجازت بھی دی گئی تھی تو بہت سے قیدوں کے ساتھ ان کو جکڑ بھی دیا گیا تھا، اور یہی وجہ ہے کہ کبار صحابہ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جیسے لوگ اپنے اپنے زمانہ ہی میں عورتوں کے مسجد جانے کو اچھی نگاہ سے

نہیں دیکھتے تھے، جبکہ ان کا زمانہ بھی زمانہ نبوت سے بہت قریب تر تھا، اور عورتوں میں بے حیائی و بے شرمی کے ان مظاہروں کا دور دور تک تصور نہیں تھا جن کے نمونے آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

اب شر و فساد کے زمانہ میں اگر اپنی عورتوں کو حضور ﷺ کے اس صریح ارشاد کے باوجود بیوتھن خیر لھن مسجد لے جانے ہی مصر ہیں تو وہ ضرور لے جائیں مگر ان قیود شرائط کا بھی اپنی عورتوں سے پاس والحاظ کرائیں جن کا ذکر احادیث میں مذکور ہے یعنی عورتیں صرف رات میں اور اندھیرے کے وقت جائیں چادر میں بالکل لپٹ کر جائیں، بوسیدہ کپڑوں میں جائیں، زیب وزینت سے بالکل عاری ہوں، بدن پر خوشبو نہ ہو، اور امام کے سلام پھیرتے ہی وہ مسجد سے باہر آ جائیں، مردوں سے قطعا خلط ملط نہ ہوں، کم از کم ان شرائط کا تو وہ اپنی عورتوں کو پابند بنالیں اور یہ شرائط وہ ہیں جو خود حضور ﷺ اور صحابہ کرام کے عہد مبارک میں جو سب سے زیادہ خیر وصلاح کا زمانہ تھا عورتوں کو مسجد میں جانے کے لئے تھیں اللہ کے رسول ﷺ نے اگر آج کا زمانہ پایا ہوتا تو نہ معلوم آپ ﷺ عورتوں کو مسجد میں جانے کے لئے اور کتنی قیود و شرائط لگاتے یا پھر جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا خیال تھا بالکل ان کو مسجد میں آنے سے ہی منع ہی فرما دیتے۔

نماز باجماعت کے متفرق مسائل

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اذا اقیمت الصلاۃ و وجد احدکم الخلاء فلیبدأ بالخلاء[1]

جب جماعت کے لئے اقامت کہہ دی جائے اور کسی شخص کو پیشاب وغیرہ کی حاجت ہو تو پہلے اس سے فراغت حاصل کرے[2] (پھر نماز پڑھے)

[1] ترمذی باب ماجاء اذا اقیمت الصلوۃ ووجد احدکم الخلاء حدیث 142 ابوداؤد باب ایصلی رجل وھو حاقن حدیث 88 اور اس میں ثم یصلی کے الفاظ نہیں ہیں امام ترمذی حاکم اور ذہبی نے صحیح کہا ہے

[2] تبصرہ: اس روایت کو مرحوم علی زئی صاحب نے صحیح کہا ہے جبکہ ترمذی کی سند میں ابو معاویہ عن سے روایت کر رہے ہیں جن کو مرحوم علی زئی صاحب {جزء قرآءت ص: 92} پر مدلس کہتا ہے۔

نبی رحمت ﷺ نے فرمایا: جو شخص اذان سن کر مسجد میں جماعت کیلئے نہ پہنچے (اور گھر میں نماز پڑھ لے) اس سے نماز قبول نہیں کی جاتی الا یہ کہ کوئی عذر ہو[1]۔[2]

جس جگہ تین آدمی ہوں اور وہ جماعت سے نماز نہ پڑھیں تو ان پر شیطان غالب ہوتا ہے[3]۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر شام کا کھانا سامنے لگا دیا جائے اور نماز کی اقامت ہو جائے تو پہلے کھانا کھاؤ اور کھانا کھانے میں جلدی نہ کرو یہاں تک کہ اس سے فارغ ہو جاؤ۔ سیدنا عبد اللہ بن عمرؓ کے سامنے کھانا رکھ دیا جاتا اور جماعت بھی کھڑی ہو جاتی تو وہ اس وقت تک نماز کے لئے نہ آتے جب تک کھانے سے فارغ نہ ہو جاتے، حالانکہ وہ امام کی قرات بھی سن رہے ہوتے تھے[4]۔

نہایت شدید سردی اور بارش کی رات میں رسول اللہ ﷺ نے گھروں میں نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے[5]۔

﴿غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں:﴾

صفوں میں مل کر کھڑا ہونے کا حکم:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

سووا صفوفکم فان تسویة الصفوف من اقامة الصلوة[6]۔

اپنی صفوں کو برابر کرو۔ بلاشبہ صفوں کا برابر کرنا نماز کے قائم کرنے میں سے ہے

---

[1] ابن ماجة باب التغليظ فى اللف عن الجماعة حديث 793 اسے امام ابن حبان حاکم اور ذہبی نے صحیح کہا ہے

[2] **تبصرہ**: ابن ماجہ کی اس رویت میں ہیشم ہیں جو عن کے ساتھ روایت کر رہے ہیں اور مدلس ہے { طبقات المدلسین ابن حجر } لہذا یہ روایت بھی آپ کے اصول کے مطابق ضعیف ہے۔

[3] ابوداؤد باب فى التشديد فى ترك الجماعة حديث 547 نسائى 2 /106 '107 اسے امام حاکم 1 /246 ابن خزیمہ ابن حبان ذہبی اور امام نووی نے صحیح کہا ہے

[4] بخاری باب اذا حضر الطعام واقيمت الصلاة حديث 673 '5464 مسلم باب كرهة الصلاة بحضرة الطعام حديث 559

[5] بخاری باب الرخصة فى المطر والعلةان يصلى فى رحلهحديث 666 مسلم باب الصلاة فى الرحال فى المطر حديث 697

[6] بخاری باب اقامة الصف من تمام الصلوة حديث 723 مسلم باب تسوية الصفوف حديث 433

اقیموا الصلوۃ [1].

یعنی ارکان اور سنن کی تعدیل اور رعایت سے نماز پڑھو [2]۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: **صفوں کا سیدھا** کرنا بھی نماز کے قائم کرنے میں داخل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صفوں کا ٹیڑھا ہونا **نقصان کا** موجب ہے۔

رسول **اللہ صلی اللہ** علیہ وسلم نے فرمایا: صفوں کو سیدھا کرو کیونکہ صف کو سیدھا کرنا نماز کے حسن میں سے ہے [3]۔

حضرت **نعمان** بن بشیر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری **صفوں کو {ایسا}** برابر کرتے گویا ان کے ساتھ تیروں کو برابر کرتے ہوں۔ یہاں تک کہ ہم نے نبی **صلی اللہ علیہ وسلم** سے صفوں کا سیدھا کرنا سمجھ لیا۔ ایک دن آپ {جماعت کے لئے} کھڑے ہوئے اور تکبیر کہنے کو تھے کہ ایک شخص کو دیکھا اس کا سینہ صف سے باہر نکلا ہوا تھا۔ پس فرمایا: اپنی صفوں **کو برابر اور سیدھا کرو** ورنہ اللہ تم میں اختلاف ڈال دے گا [4]

مذکورہ حدیث کے رو سے صفوں کا سیدھا کرنا نہایت ضروری ہے۔ اقامت ہو چکنے کے بعد جب **صفیں سیدھی** درست اور برابر ہو جائے تو پھر امام کو تکبیر اولی کہنی چاہئے۔

خبردار **صفیں** ٹیڑی نہ ہو کہ صفوں کا ٹیڑا پن باہمی پوٹ دلوں کے اختلاف اور کدورت کا موجب ہے

حضرت **انس** رضی اللہ عنہ رویت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی **صفیں ملی ہوئی رکھو** {یعنی کندھے سے کندھا اور قدم سے قدم ملا کر کھڑے ہو} اور صفوں کے

---

[1] البقرۃ 2/ 43

[2] **تبصرہ: ابتدائیہ میں** نماز کے ارکان، آداب اور سنن وغیرہ کے علم ہونے کو رد کرتے ہوئے کہا تھا" تنبیہ عرض ہے کہ واجبات وآداب وغیرہ **کا علم ہونا** ضروری نہیں۔ اور یہاں فرماتے ہیں ارکان اور سنن کی تعدیل اہتمام اور رعایت سے نماز پڑھو" اب ان دو باتوں میں سے کون کی صحیح ہے؟۔

[3] بخاری باب اقامة الصف من تمام الصلوة حدیث 722 مسلم باب تسویة الصفوف حدیث 435

[4] مسلم باب تسویة الصفوف، حدیث 436

درمیان نزدیکی کرو[یعنی دو صفوں کے درمیان اتنا فاصلہ نہ چھوڑو کے وہاں ایک اور صف کھڑے ہوسکے] اور گردنیں برابر رکھو (یعنی سب برابر جگہ پر کھڑے ہو کہ گردنیں برابر ہو) قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تحقیق میں شیطان دیکھتا ہوں جو صف کے شگافوں میں داخل ہوتا ہے گویا کہ وہ بکری کا سیاہ بچہ ہے [1]۔

تبصرہ:

ہم اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اس روایت کی سند میں ایک راوی قتادہ ہے جو عن سے روایت کر رہے ہیں مرحوم علی زئی صاحب جو یہاں پر حدیث کو صحیح کہتے ہیں اور { جزء قرات ص: 59 اور 93 } پر اسی راوی حضرت قتادہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس کا راوی قتادہ مدلس ہے اور قتادہ کی تدلیس کی وجہ سے یہ حدیث ضعیف ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں: ﴾

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں طرف منہ کرکے فرمایا: لوگو اپنی صفیں سیدھی کرو۔ لوگو اپنی صفیں درست کرو۔ لوگو اپنی صفیں برابر کرو۔

سنو اگر تم نے صفیں سیدھی نہ کیں تو اللہ تعالی تمہارے دلوں میں اختلاف اور پھوٹ ڈال دے گا۔ پھر تو یہ حالت ہو گئی کہ ہر شخص اپنے ساتھی کے ٹخنے سے ٹخنا اور گھٹنے سے گھٹنا اور کندھے سے کندھا چپکا دیتا تھا [2]۔

تبصرہ:

ہم جوابا عرض کرتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی ذکریا بن ابی زائدہ ہے جو عن سے روایت کر رہے ہیں ذکریا ابن ابی زائدہ مدلس راوی ہے امام ابو زرعہ نے اس کو مدلس کہا ہے امام ابو

---

[1] ابو داؤد باب تسویۃ الصفوف ' حدیث 227 اسے امام ابن حبان 387 اور ابن خزیمہ 1545 نے صحیح کہا ہے

[2] ابو داؤد باب تسویۃ الصفوف حدیث 226 ابن حبان 396 نے اسے صحیح کہا ہے

حاتم نے بھی مدلس کہا ہے اسی طرح علامہ ابن حجر نے طبقات المدلسین اور علامہ سیوطی نے اسماء المدلسین میں اس کو مدلس کہا ہے۔ لہٰذا یہ روایت بھی اصول محققین کے مطابق ضعیف ٹھہری۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صفوں کو سیدھا کیا کرو کیونکہ میں تمہیں پس پشت دیکھتا ہوں { یہ آپ کا معجزہ تھا } انس رضی اللہ عنہ کہتا ہے کہ ہم میں سے ہر شخص { صفوں میں } اپنا کندھا دوسرے کے کندھے سے اور اپنا قدم دوسرے قدم ملا دیتا تھا[1]۔

﴿ غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں: ﴾

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے رویت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صف کے اندر آتے ہمارے سینوں اور کندھوں کو برابر کرتے اور فرماتے تھے آگے پیچھے مت ہو۔ { ورنہ } تمہارے دل بھی مختلف ہو جائیں گے۔ اور فرماتے تھے تحقیق اللہ تعالی پہلی صف پر اپنی رحمت بھیجتا ہے اور فرشتے ان کے لئے { رحمت کی } دعا کرتے ہیں[2]

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب ہم نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے صفوں کو برابر کرتے تھے۔ جب صفیں برابر ہو جاتیں تو { پھر } آپ ﷺ اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کرتے[3]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صفوں کو قائم کرو کندھے برابر کرو { صفوں کے اندر } ان جگہوں کو پر کرو جو خالی رہ جائیں۔ اپنے

---

[1] بخاري باب الزاق المنكب با لمنكب والقدم با لقدم فی الصف حدیث 718 و 725

[2] ابو داؤد باب تسویة الصفوف حدیث 224 ومستدرک حاکم 1/ 571 ، 572 ، 573 ، 575 امام ابن حبان 386 امام ابن خزیمہ اور امام نووی نے اسے صحیح کہا ہے

[3] ابو داؤد حواله سابق حدیث 225 اس کی سند صحیح ہے

بھائیوں کے ہاتھوں میں نرم ہو جاؤ صفوں کے اندر شیطان کے لئے جگہ نہ چھوڑ و اور جو شخص صف ملائے گا اللہ بھی اسے {اپنی رحمت سے} ملائے گا[1]

اپنے بھائیوں کے ہاتھوں میں نرم ہو جانے کا یہ مطلب ہے کہ اگر صف درست کرنے کے لئے کوئی تم کو آگے یا پیچھے کرے تو بڑی نرمی اور محبت سے آگے یا پیچھے ہو جاؤ۔ اگر صف سے کوئی نکل کر چلا جائے تو اس کی جگہ لے کر صف کو ملاؤ اللہ تم پر رحم کرے گا صف کے اندر {جان بوجھ کر} ایک دوسرے سے دور دور کھڑے ہونا صف کو کاٹنا ہے۔ ایسے لوگوں کو اللہ اپنی رحمت سے دور کرے گا۔ {والعیاذ باللہ}

صفوں کی ترتیب:

سیدنا انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پہلے اول صف پوری کرو، پھر اسے جو پہلی کے نزدیک ہے[2]۔[3]

سیدنا ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مردوں کی صفوں میں (ثواب کے لحاظ سے) سب سے بہتر، پہلی صف ہے۔ اور سب سے بری آخری صف ہے اور عورتوں کی صفوں میں سب سے بری پہلی صف ہے اور سب سے بہتر آخری صف ہے[4]۔

سیدنا ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہمیشہ لوگ (پہلی صف سے) پیچھے ہٹتے رہیں گے یہاں تک کہ اللہ بھی انہیں (اپنی رحمت میں) پیچھے ڈال دیگا[1]

---

[1] ابو داؤد حوالہ سابق حدیث 666 اسے امام حاکم 1/213 امام ابن خزیمہ حدیث 1549 امام ذہبی اور نووی نے صحیح کہا ہے

[2] ابو داؤد باب تسویۃ الصفوف حدیث 671 امام ابن خزیمہ حدیث 1546، 1567 اور امام ابن حبان حدیث 390 نے اسے صحیح کہا ہے

[3] **تبصرہ:** ابوداؤد کی مذکورہ حدیث کی سند میں قتادہ عن کے ساتھ روایت کرتے ہیں اور پیچھے گزر چکا ہے کہ مرحوم علی زئی صاحب قتادہ کو مدلس کہتے ہیں۔

[4] مسلم باب تسویۃ الصفوف حدیث 440

ستونوں کے درمیان صف بنانا:

سیدنا انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے دور میں اس سے (ستونوں کے درمیان صفیں بنانے سے) بچتے تھے[2]۔[3]

صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھنا:

صف کے پیچھے اکیلے کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھنی چاہیئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو آپ نے اسے نماز لوٹانے کا حکم دیا[4]۔

اگر اگلی صف میں جگہ نہیں ہے تو ایک امام اور ایک مقتدی والے مسئلے سے استنباط کرتے ہوئے اگلی صف سے آدمی کھینچ کر صف بنا لینا جائز ہے اور اگر نہ کھینچا جائے اور اکیلے ہی نماز پڑھی جائے تو پھر یہ نماز دوہرائی پڑے گی۔

﴿غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں:﴾

صف بندی میں مراتب کا لحاظ رکھنا:

سیدنا ابو مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں اپنے ہاتھ ہمارے کندھوں پر رکھتے اور فرماتے: برابر ہو جاؤ اور اختلاف نہ کرو ورنہ تمہارے دل مختلف ہو جائیں گے۔ اور وہ

---

[1] مسلم باب تسویۃ الصفوف حدیث 438

[2] ابو داؤد باب الصفوف بین السواری حدیث 673 اسے امام ترمذی نے حسن جبکہ امام حاکم اور ذہبی نے صحیح کہا ہے

[3] **تبصرہ:** اس روایت کی سند میں سفیان عن کے ساتھ ہیں اور یہ حضرات متعدد مقامات بشمول {نماز نبوی جدید ص: 211} سفیان کی تدلیس کی وجہ سے حدیث کو ضعیف کہہ چکے ہیں۔

[4] ابو داؤد باب الرجل یصلی وحدہ خلف الصف حدیث 682 امام ابن حبان 575/5 '576 امام احمد اسحاق اور ابن حزم نے اسے صحیح کہا ہے

لوگ جو عقل مند و دانشمند ہیں، صف میں میرے قریب رہیں، پھر جو ان سے قریب ہیں، پھر جو ان سے قریب ہیں[1]۔

سیدنا ابو مالک اشعریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز کے لئے کھڑے ہوئے پہلے مردوں نے صفیں باندھیں، پھر بچوں نے، اس کے بعد آپ نے نماز پڑھائی۔ پھر فرمایا: میری امت کی نماز اسی طرح ہے[2]۔[3]

سیدنا انسؓ کی طویل حدیث میں ہے کہ میں نے اور ایک بچے نے اکٹھے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے صف بنائی اور میری والدہ ام سلیمؓ ہمارے پیچھے اکیلی ہی صف میں کھڑی ہو گئی [4]

علامہ سبکی فرماتے ہیں: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب بچہ اکیلا ہو تو مردوں کے ساتھ کھڑا ہو جائے۔ اگر بچے دو یا دو سے زیادہ ہوں تو وہ اپنی الگ صف بنائیں۔ اسی طرح اگر مرد اکیلا ہو اور بچے ایک یا ایک سے زائد ہوں تو اس صورت میں بھی ان کو مردوں کے ساتھ صف بنانا ہوگی [5]۔[6]

---

[1] مسلم باب تسوية الصفوف حديث 432

[2] ابو داؤد باب مقام الصبيان من الصف حديث 677 اس کی سند حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر کی شرط پر حسن ہے

[3] تبصرہ: اس روایت کے سند میں ایک راوی شہر بن خوشب ہیں ان پر امام مسلم نے مقدمہ مسلم میں کلام کیا ہے کہ یہ راوی مجروح ہے مزید برآں امام شعبہ فرماتے ہیں "ولقد لقیت شہرا فلم اعتدابہ یحی بن معین" ان سے روایت نہیں لیتے تھے ابن عون فرماتے ہیں ان شہرا نزکوہ ای طعنوہ۔ یحی بن بکیر اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے بلا اجازت بیت المال سے کپڑا اٹھایا تھا جس میں دراہم تھے۔ ابراہیم بن یعقوب الجوز جانی فرماتے ہیں احادیثہ لاتشبہ حدیث الناس موسی بن ہارون فرماتے ہیں ضعیف امام نسائی فرماتے ہیں لیس بالقوی امام ابو حاتم فرماتے ہیں لایحتج بہ {تہذیب الکمال} معلوم ہوا کہ شہر بن خوشب جمہور کے نزدیک ضعیف راوی ہے اور تمہارا اصول ہے کہ جمہور جب راوی کو ضعیف کہیں تو وہ ضعیف ہوگا۔ ائمہ محدثین ثقہ مشہور اور ماہر فن کی اکثریت کو ہمیشہ اور لامحالہ ترجیح ہو گی {نور العینین ص: 61}۔ دعوی ہے کہ اس کتاب میں ضعیف حدیث نہیں ہے۔

[4] مسلم باب تسوية الصفوف حديث 432

[5] بخاري باب المرأة وحدها تكون صفا حديث 727 , 380 مسلم باب جواز الجماعة في النافلة حديث 658

[6] تبصرہ:

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

صف میں کھڑے ہونے کے آداب:

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جیسے متبع سنت سے تو ان کا عمل اس کے (پاؤں پھیلا کر کھڑے ہونے کے) خلاف منقول ہے، مصنف عبدالرزاق میں حضرت نافع سے مروی ہے: حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ دونوں پاؤ پھیلا کر اور چیر کر نہیں کھڑے ہوتے تھے[1]۔

امام بخاری اپنی صحیح میں ایک باب قائم کیا ہے "باب الصاق المنکب والقدم بالقدم فی الصف" یعنی یہ باب اس مسئلہ کو بتلانے کے لئے ہے کہ نماز کے صف میں کندھے سے کندھا اور قدم سے قدم ملانا چاہیئے۔

اولا تو میں قارئین سے یہ گزارش کروں گا کہ حضرت امام بخاری کے اس کلام میں غور فرمائیں کہ انہوں نے صف میں کھڑے ہونے کے لئے نہ اس کا ذکر کیا ہے نہ پاؤں چیر کر اور خوف پھیلا کر کھڑے ہوں اور نہ یہ فرمایا ہے کہ پاؤں کی انگلی کو دوسرے پاؤں کے انگلی سے ملا کر کھڑے ہوں، امام بخاری رحمہ اللہ کے فرمان کا حاصل صرف یہ ہے کہ صف میں کندھے سے کندھا ملا کر اور قدم سے قدم ملا کر کھڑے ہونا چاہیئے۔

اب ذرا اس پر بھی آپ غور کر لیں کہ نماز میں پاؤں پھیلا کر اور پاؤں کی کانی انگلی کو دوسرے پاؤں کی کانی انگلی سے ملا کر کھڑے ہونے کی شکل میں کیا کندھے سے کندھا ملا سکتا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اس شکل میں کبھی کندھے سے کندھا نہیں مل ہی نہیں سکتا۔ ہم اپنی ان سطور کے پڑھنے والوں سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ تجربہ کرکے میری بات کی تصدیق کر لیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ تو کندھے کے علاوہ قدم سے قدم ملا کر کھڑے ہونے کو مسنون قرار دے رہے ہیں اور ہمارے برادران پاؤں کی چھوٹی انگلی (یا انگلیوں کو ملا کر کھڑے ہوتے ہیں پورا قدم ملا کر

جب کوئی اور تقلید کرے تو مجرم ٹھہرے اور ان کی تقلید جانور کے گلے کا پٹا بن جائے اور جب خود کرے تو ان کے گلے کا مالا بن جائے۔

[1] ج: 27/ص246

کھڑے ہونے کا منظر ان کی مساجد میں نظر نہیں آتا، یاد رہے کہ قدم کہتے ہیں پاؤں کے پورے نچلے حصہ کو۔

اس باب کے تحت امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

رایت الرجل یلصق منا یلزق کعبہ یکعب صاحبہ۔

یعنی میں نے دیکھا کہ ہم میں سے ایک آدمی اپنے ٹخنہ کو اپنے بغل والے ساتھی کے ٹخنہ سے ملا کر کھڑا ہوتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کا مشاہدہ یہ تھا کہ جب لوگ نماز میں صف باندھ کر کھڑے ہوتے تھے تو نمازی بغل والے نمازی کے ٹخنہ سے ٹخنہ ملا کر کھڑا ہوتا تھا، ٹخنہ کہتے ہیں اس ہڈی کو جو ایڑی کے اوپر اور پنڈلی کے نیچے ابھری ہوتی ہے۔

اب آپ جائیے بعض مساجد میں اور دیکھئے کہ کیا وہ جماعت میں اسی طرح کھڑے ہوتے ہیں، یعنی کیا ایک مصلی کا ٹخنہ دوسرے مصلی کے ٹخنہ سے ملا ہوا ہوتا ہے یا وہ پاؤں پھیلا کر اور چھوٹی انگلی ملا کر کھڑے ہوتے ہیں، آپ کو ایک مصلی بھی اس طرح کھڑا نظر نہیں آئے گا جو بغل والے مصلی کے ساتھ ٹخنہ ملا کر کھڑا ہو۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کو نقل کرنے کے بعد امام بخاری نے اس باب کے تحت جو حدیث ذکر کی ہے وہ یہ ہے:

عن انس عن النبي ﷺ قال: اقيموا صفوفكم فإني اراكم من وراء ظهري، وكان احدنا يلزق منكبه بمنكب صاحبه وقدم بقدمه.

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: لوگو اپنی صفوں کو سیدھا رکھو اس لئے کہ میں تم اپنے پیٹھ کے پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں (کہ تم اپنی صفوں کو سیدھا رکھتے ہو یا نہیں) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک

اپنے کندھے کو اپنے ساتھی کے کندھے اور اپنے قدم کو اپنے ساتھی کے قدم سے ملا کر کھڑا ہوتا تھا۔

اس حدیث میں ایک بات تو غور کرنے کی ہے نبی کریم ﷺ نے پاؤں کی انگلی سے انگلی ملا کر کھڑے ہون کی بات تو در کنار کندھے ملانے اور قدم ملانے کا بھی حکم نہیں دیا ہے، آپ کا صاف صاف تو حکم یہ ہے کہ اپنی صفوں کو سیدھی رکھو کندھے سے کندھا ملا کر یا قدم سے قدم ملا کر کھڑا ہونا یہ صحابہ کرام کا عمل تھا، اور بعض حضرات کے یہاں نہ صحابہ کرام کا عمل حجت ہے نہ ان کا قول حجت ہے، اس لئے صحابہ کرام کے عمل سے استدلال کرنا خود ان کے اصول کے خلاف ہے۔

اور ہمار کہنا یہ کہ اللہ کے رسول ﷺ کا مقصد صرف اتنا تھا کہ نماز میں صف بالکل سیدھ ہو، صحابہ کرام اسی کا لحاظ رکھتے تھے، جس کی تعبیر حضرت نعمان بن شیر رضی اللہ عنہ کے الفاظ میں یہ ہے کہ نمازی اپنے ٹخنوں سے ٹخنہ ملا کر کھڑا ہوتا اور اس کی تعبیر حضرت انس رضی اللہ عنہ کے الفاظ میں یہ ہے کہ نمازی اپنے ساتھی کے کندھے سے کندھا ملا اور قدم سے قدم ملا کر کھڑا ہوتا، حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت نعمان رضی اللہ عنہ دونوں کے فرمان کا حاصل یہ ہے کہ ہم لوگ نماز اپنی صفوں کو بالکل سیدھی رکھتے تھے، جو آنحضور ﷺ کی تعلیم وارشاد کا مقصود تھا۔

قارئین آپ دیکھ رہے ہیں کہ کندھے سے کندھے ملانے کا اور قدم سے قدم ملانے کا یا ٹخنہ سے ٹخنہ ملانے کا حکم حضور اکرم ﷺ نے نہیں فرمارہے ہیں، آپ کا اشاد تو صرف اتنا ہے کہ نماز میں صف کو سیدھی رکھو، اور چونکہ نماز میں صفوں کا سیدھی رکھنا اور مل کر کھڑا ہونا اور دو آدمیوں کے درمیان خلل کا نہ ہونا یہ نماز کا حسن اور شریعت کو مطلوب ہے اس وجہ سے آپ ﷺ صحابہ کرام کو ان امور کی بڑی تاکید فرماتے تھے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ابو داؤد میں ہے کہ رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ:

"صفوں کو سیدھا رکھو، کندھے کو کندھے کے مقابلے میں رکھو، صفوں کو درمیان خلل کو بند کرو اور شیطان کے لئے جگہ مت چھوڑو، جو صف کو جوڑ کر کھڑا ہوتا ہے اللہ اس کو جوڑے رکھتا ہے اور جو صف کو کاٹ کر کھڑا ہوتا ہے اللہ اس سے اپنا ناطہ توڑ لیتا ہے۔"

حضرت نعمان بن بشیر ﷛ کی ایک روایت ہے جس کو ابوداؤد نے ذکر کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اس کو صحیح بتلایا ہے، اس روایت کے الفاظ یہ ہے:

اقبل رسول الله ﷺ بوجهه فقال اقيموا صفوفكم ثلاثا والله لتقيمن صفوفكم او ليخالفن الله بين قلوبكم.

آنحضرت ﷺ نے اپنا چہرہ مبارک ہماری طرف کرتے ہوئے فرمایا: اپنی صفوں کو سیدھی رکھو، یہ تین بار فرمایا، اور پھر فرمایا خدا کی قسم تم اپنی صفوں کو ضرور سیدھی رکھو ورنہ اللہ تعالی تمہارے دلوں کے درمیان اختلاف پیدا کردے گا۔

غرض اللہ کے رسول ﷺ کا نمازیوں کو جو حکم تھا وہ یہ کہ ان کے صفیں بالکل سیدھی ہو اور دو آدمیوں کے بیچ جگہ چھوٹی ہوئی نہ ہو اور ایک نمازی کا کندھا دوسرے کے کندھے کے بالمقابل ہو۔

اللہ کے رسول ﷺ کے انہیں ارشادات پر عمل پیرا ہونے کی کیفیت کو بطور مبالغہ صحابہ کرام میں سے کسی نے یہ کہا کہ ہم لوگ اپنی صفوں کو اس طرح سیدھی رکھتے تھے کہ ہمارا کندھا کندھے سے ملا ہوا ہوتا تھا، کسی نے کہا کہ ہم کھڑے ہوتے تو ہمارا ٹخنہ سے ٹخنہ ملا ہوتا اور کسی نے یہ کہا کہ ہم قدم سے قدم ملا کر کھڑے ہوتے اور مقصود سب کا یہی تھا کہ نماز میں ہماری صفیں سیدھی ہوا کرتی تھیں۔

اب جو میں نے یہ عرض کیا کہ صحابہ کرام کے یہ ارشادات اقامت صف اور تسویہ صف کی کیفیت کا بطور مبالغہ اظہار اور بیان ہے نہ کہ یہی شریعت کا حکم ہے، اس کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ حدیث میں ٹخنہ سے ٹخنہ ملا کر کھڑے ہونے کا بھی ذکر ہے، اور ٹخنہ سے ٹخنہ ملا کر کھڑا ہونا یہ ممکن نہیں ہے، اسی طرح الزاق المنکب یعنی کندھے کندھا ملا کر کھڑے ہونے کا بھی امکان نہیں ہے، الزاق کا مطلب ہوتا ہے کہ کسی چیز کا کسی چیز کے ساتھ چپکانا اور سٹانا، کیا بلا تکلف کے یہ ممکن ہے کہ نماز میں قدم سے قدم بھی ملا ہو اور کندھے کندھا بھی چپکا ہو اس سے معلوم ہوا کہ یہ محض صف کو سیدھی رکھنے کی تاکید تھی نہ کہ الزاق کے حقیقی معنی پر عمل کرنے کا حکم تھا۔ مگر یہ حضرات جو الفاظ کے ظواہر کو دیکھتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے حقیقت اوجھل رہتی ہے اور شریعت کا مقصود گم ہوتا جاہے۔

میں یہ جو کہہ رہا ہوں کہ شریعت کا مقصود نماز میں صرف صفوں کو سیدھی رکھنے کی تاکید ہے او ر آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی تعبیر صحابہ کرام نے اپنے اپنے انداز میں بطور مبالغہ کی تھی یہی بات حافظ ابن حجر جو اپنے زمانہ کے علم حدیث کے سب سے بڑے تاجدار تھے وہ بھی فرمارہے ہیں۔ امام بخاری کے اس ارشاد الزاق المنکب بالمنکب والقدم بالقدم کی شرح میں وہ فرماتے ہیں:

المراد بذلك المبالغة في تعديل الصف وسد خلله [1].

یعنی اس سے مراد امام بخاری کی یہ ہے کہ آدمی کو صف سیدھی رکھنے اور بیچ کی جگہ نہ چھوڑنے میں اہتمام اور مبالغہ سے کام لینا چاہیئے۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

امامت کا بیان

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لوگوں کا امام وہ ہونا چاہئے جو ان میں سے سب سے زیادہ قرآن کو صحیح طریقے سے پڑھنے والا ہو۔ پھر اگر قرات میں سب سے برابر ہوں تو وہ امامت کرائے جو سنت کو سب سے زیادہ جانتا ہو (سب سے زیادہ احکام اور مسائل کی حدیثیں جانتا ہو) پھر اگر سنت کے علم میں بھی سب برابر ہوں تو پھر امامت وہ کرائے جس نے سب سے پہلے ہجرت کی ہو۔ اگر ہجرت میں بھی سب برابر ہوں تو پھر وہ امامت کرائے جو سب سے پہلے مسلمان ہوا ہو۔ اور بلا اجازت کوئی شخص، کسی کو سلطنت میں اس کی امامت نہ کرائے اور نہ کسی کے گھر میں صاحب خانہ کی مسند پر اس کی اجازت کے بغیر بیٹھے [2]۔

---

[1] فتح الباری ج:2/ص:211

[2] مسلم باب من احق بالامامة؟ حدیث 673

تبصرہ:

ہم جواباً عرض کرتے ہیں کہ { بخاری، کتاب الاذان باب اهل العلم والفضل احق بالامامة } میں حدیث ہے کہ " جب نبی کریم ﷺ بیمار ہوئے اور مرض نے شدت اختیار کی تو آپ ﷺ نے فرمایا حضرت ابوبکر سے کہو کہ وہ نماز پڑھائیں " ۔ حضرت ابوبکرؓ تمام صحابہ میں بڑے عالم تھے پھر حضرت عمرؓ ۔ اس پر اجماع ہے { جبکہ صحابہ میں سب سے بڑے قاری ابی بن کعبؓ تھے } او رآپ ﷺ کاآخری عمل بھی یہی ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں: ﴾

اگر کتاب اللہ کسی نابالغ بچے کو زیادہ یاد ہو تو اسے امام بنایا جاسکتا ہے۔ سیدنا عمرو بن سلمہؓ فرماتے ہیں کہ اپنے قبیلے میں سب سے زیادہ قرآن مجھے یاد تھا، لہٰذا مجھے امام بنایا گیا، حالانکہ میری عمر سات سال تھی[1]۔[2]

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

امامت کاحقدر رکون؟

قال النووی قال اصحابنا الافقه مقدم علی الاقراء[3].

یعنی امام نووی فرماتے ہیں کہ ہمارے اصحاب کا کہنا یہ ہے کہ عالم شریعت کو بڑے قاری پر مقدم کیا جائے گا۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب ہے الکافی مالکیہ کی مشہور کتاب ہے اس کی جلد اول صفحہ 210 میں اس کی تصریح ہے اور جو مذہب ان تینوں ائمہ کرام یعنی امام ابو حنیفہ امام مالک او

---

[1] بخاري باب 54 حديث 4302

[2] تبصرہ: { نماز نبوی ص: 145 } پر بخاری کی حدیث 628 مسلم کی حدیث 764 میں آپ ﷺ کا حکم تھا کہ تم میں سے { جو عمر کے لحاظ سے } سب سے بڑا ہو وہ امامت کریں۔ لیکن آپ حضرات نے اس بات کی صراحت نہیں کی ان دونوں حدیثوں میں سے کس پر عمل فرض ہے اور کون کی حدیث ناقابل عمل ہے۔ کیونکہ دونوں حدیثوں پر بیک وقت عمل ممکن نہیں۔

[3] فتح الباری ج: 2/ ص: 171

رامام شافع کا ہے یہ مذہب شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا بھی ہے ابن تیمیہ فرماتے ہیں: اگر دو آدمی ہوں اور دونوں دیندار ہوں تو ان میں سے کتاب وسنت کے واقف کار کو مقدم کرنا متعین طور پر واجب ہے[1]۔

اور جو مذہب ائمہ ثلاثہ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا ہے، وہی مذہب امام بخاری رحمہ اللہ کا بھی ہے،

امام بخاری بخاری شریف میں فرماتے ہیں: باب اهل العلم والفضل احق الامامة (بخاری)

یعنی اس کا بیان کہ علم وفضل والے امامت کے زیادہ حقدار ہیں۔

ابن تیمیہ مسلم شریف کی "اقرا" والی حدیث نقل کرکے "اقرا" کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں:

فامر النبي ﷺ بتقديم الافضل بالعلم بالكتاب[2].

یعنی اللہ کے رسول ﷺ نے یہ امر فرمایا کہ جو کتاب اللہ کا زیادہ عالم ہو اس کو امامت میں مقدم کیا جائے۔

اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: اجعلوا ائمتكم خياركم [3]

یعنی جو میں بہتر ہو ان کو امام بناؤ۔

ایک دوسری حدیث میں آپ کا ارشاد ہے: اذا ام الرجل القوم وفيهم من هو خير منه لم يزالوا في سفال (ايضا)

اگر ایسا ہو کہ لوگوں کی امامت بہتر کی موجودگی میں دوسرا کرے گا تو لوگ ہمیشہ پستی میں رہیں گے۔

---

[1] فتاوی ابن تیمیہ ج: 23/ص: 341

[2] فتاوی ج: 23/ص: 357

[3] فتاوی ابن تیمیہ ج: 23/ ص: 357

نابالغ کی امامت:

بچے کی امامت شروع اسلام میں تھی۔ بعد میں منسوخ ہوئی۔ منسوخ ہونے کی دلائل روایات صحیحہ سے:

عن ابن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ قال لا یؤم الغلام حتی تجب علیہ الحدود.

عن ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہا قال لا یؤم الغلام حتی یحتلم[1].

عن ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہا قال نہانا امیر المؤمنین عمر ان نؤم الناس فی المصحف و نہانا ان یؤمنا الا المحتلم[2].

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں: ﴾

نابینا کو امام بنانا جائز ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے سیدنا عبد اللہ بن ام مکتومؓ کو امام مقرر کیا تھا، حالانکہ وہ نابینے تھے[3]۔[4]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس امام کی نماز کانوں سے بلند، یعنی قبول نہیں ہوتی جس پر لوگ (بوجہ اس کی بدعات، جہالت و فسق وغیرہ کے) ناراض ہوں[5]۔

تبصرہ:

ہم غیر مقلد احباب کے ذکر کردہ روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی عبد الرحمٰن بن زیاد ہیں جن کی تضعیف پر جمہور محدثین متفق ہیں، اور محققین کا

---

[1] منتقی الاخبار مع شرحہ نیل الاوطار ج 3 ص 176

[2] کنز العمال ج 8 ص 263

[3] ابو داؤد باب امامۃ الاعمی حدیث 595 امام ابن حبان حدیث 370 نے اسے صحیح کہا ہے

[4] تبصرہ: اس رویت میں قتادہ عن کے ساتھ روایت کرتے ہیں اور قتادہ کو مرحوم علی زئی صاحب خود { جزء قرآت ص: 59,93 جزء رفع یدین ص: 39 } اپنے مذہب کے خلاف روایت کرنے کے جرم میں مدلس کہا ہے۔ لیکن تدلیس کے ساتھ روایت کو صحیح کہا گیا۔ { ممکن ہے مسلک کا مسئلہ ہو }

[5] ابو داؤد باب الرجل یؤم القوم وہم لہکارھون حدیث 493 امام ترمذی حدیث 360 نے اسے صحیح کہا ہے

اصول ہے کہ جب جرح وتعدیل میں اختلاف ہو تو محدثین کے اکثریت کو ہمیشہ ترجیح ہو گی (نورالعینین ص:61) اور ساتھ ساتھ یہ مدلس بھی ہے تہذیب الکمال، طبقات المدلسین ابن حجر، اسماء المدلسین از امام سیوطی لہٰذا یہ حدیث محققین کے اصول کے مطابق ضعیف ہے۔ایسے ضعیف راوی کے ہوتے ہوئے بھی تمام احادیث کے صحیح ہونے کے بلند بانگ دعوے کئے جاتے ہیں۔ محقیقن نے ترمذی کے حوالہ سے اس حدیث کو حسن کہا ہے لیکن ترمذی کے حوالہ میں حسن کے ساتھ غریب کے لفظ کو ذکر نہیں کیا اور محقق صاحب امام ترمذی کے بارے میں یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ امام ترمذی متساہل ہیں۔

زیادہ لمبی نماز پر نبی کریم ﷺ کا غصہ:

سیدنا انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی مثل ہلکی اور بہت کامل نماز میں نے کسی امام کے پیچھے نہیں پڑھی۔ جب آپ (عورتوں کی صف میں) بچے کے رونے کی آواز سنتے تو اس ڈر سے نماز ہلکی کر دیتے کہ اس کی ماں کو تکلیف ہو گی[1]

سیدنا ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نماز لمبی کرنے کے ارادے سے، نماز میں داخل ہوتا ہوں۔ پھر (عورتوں کی صفوں میں) بچوں کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو اپنی نماز مختصر کر دیتا ہوں (ہلکی پڑھاتا ہوں) کہ بچے کے رونے سے اس کی ماں کو تکلیف ہو گی[2]۔

سیدنا ابو مسعود انصاریؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کسی وعظ میں اتنے غصے میں نہیں دیکھا جتنا (لمبی نماز پڑھانے والوں پر) اس دن دیکھا۔آپ نے فرمایا: تم (لمبی نمازیں پڑھا کر) لوگوں کو نفرت دلانے والے ہو (سنو!) جب تم لوگوں کو نماز پڑھاؤ تو ہلکی پڑھاؤ، اس لئے کہ ان (مقتدیوں) میں ضعیف، بوڑھے اور حاجت مند بھی ہوتے ہیں[3]۔

---

[1] بخاري باب من اخف الصلوة عند بكاء الصبى حديث 708

[2] بخاري حوالهسابق حديث 707,868

[3] بخاري باب تخفيف الامام فى القيام واتمام الركوع والسجود حديث 702، 704، 90 مسلم باب امر الائمة بتخفيف الصلاة فى تمام حديث 466

سیدنا عثمان بن ابو العاصؓ روایت کرتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کی آخری وصیت یہ تھی: جب تم لوگوں کی امامت کرو تو انہیں نماز ہلکی پڑھاؤ کیونکہ تمہارے پیچھے بوڑھے، مریض، کمزور اور کام کاج والے لوگ ہوتے ہیں۔ اور جب اکیلے نماز پڑھو تو جس قدر چاہے لمبی پڑھو[1]۔

ہلکی نماز کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رکوع، سجود، قومے اور جلسے کو درہم برہم کرکے رکھ دیا جائے۔ واضح ہو کہ ارکان نماز کی تعدیل اور طمانیت کے بغیر نماز باطل ہوتی ہے[2] بلکہ ہلکی نماز کا مطلب یہ ہے کہ قراءت میں نسبتاً اختصار کیا جائے، مگر قیام زیادہ مختصر بھی نہ ہو، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: افضل نماز وہ ہے جس میں قیام لمبا ہو[3]۔

نماز میں سکون:

سیدنا ابو قتادہؓ روایت کرتے ہیں: اس دوران کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے، آپ نے لوگوں کی کھٹ پٹ سنی۔ آپ نے نماز کے بعد پوچھا: تم کیا کر رہے تھے؟ انہوں نے عرض کی کہ ہم نماز کی طرف جلدی آرہے تھے۔ آپ نے فرمایا: ایسا نہ کرو۔ جب تم نماز کے لئے آؤ تو آرام و سکون سے آؤ، جو نماز تمہیں مل جائے (جو تم پالو) پڑھ لو اور جو فوت ہو جائے اسے بعد میں پورا کرو[4]۔

سیدنا ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم نماز کا ارادہ کرکے آتے ہو تو نماز ہی میں ہوتے ہو (لہٰذا وقار اور سکون کے ساتھ آیا کرو۔)[5]

---

[1] مسلم حوالہ سابق حدیث 468

[2] اور یہ بھی مطلب نہیں ہے کہ الفاظ نماز کو نامناسب حد تک تیز پڑھا جائے اس طرح دربار الٰہی کا احترام جاتا رہتا ہے۔

[3] مسلم باب افضل الصلوۃ طول القنوت حدیث 756

[4] مسلم باب استحباب اتیان الصلوۃ بوقار وسکینۃ حدیث 603

[5] مسلم حوالہ سابق حدیث 602

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

اماموں کا وبال:

سیدنا ابوہریرہؓ سے روایت ہیکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر اماموں نے نماز اچھی طرح (ارکان کی تعدیل اور سنتوں کی رعایت کے ساتھ) پڑھائی تو تمہارے لئے بھی ثواب ہے اور ان کے لئے بھی ثواب ہے اور اگر نماز پڑھانے میں خطا کی (رکوع و سجود کی عدم طمانیت، قومے اور جلسے کے فقدان سے نماز پڑھائی) تو تمہارے (مقتدیوں کے) لئے تو ثواب ہے اور ان کے لئے وبال ہے [1]

امام بغویؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ اگر کوئی امام بے وضو یا بحالت جنابت نماز پڑھا دیتا ہے تو مقتدیوں کی نماز صحیح اور امام پر نماز کا اعادہ لازم ہے خواہ اس نے یہ فعل ارادتا کیا ہو یا لاعلمی کی بنا پر [2]۔

نماز پڑھا کر امام مقتدیوں کی طرف منہ پھیرے:

سیدنا سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں: جب رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ لیتے تو ہماری طرف متوجہ ہوتے [3]۔

سیدنا انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ زیادہ تر اپنے داہنی طرف سے مڑتے تھے [4]۔

سیدنا عبد اللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں: تم اپنی نماز میں سے صرف دائیں طرف سے پھر کر شیطان کا حصہ مقرر نہ کرو۔ یقینا میں نے رسول اللہ ﷺ کو بہت دفعہ دیکھا کہ وہ اپنے بائیں طرف سے بھی پھرتے تھے [1]۔

---

[1] بخاري باب اذا لم يتم الامام واتم من خلفهحديث 694

[2] **تبصرہ:** مجتہدین حضرات کی تقلید اور وہ بھی بلا حوالہ ان حضرات کے نزدیک جنبی ارادتا مسجد میں داخل ہو سکتا ہے اور نماز بھی پڑھا سکتا ہے۔ جبکہ یہ اجتہاد نصوص اور بے شمار احادیث کے خلاف ہے۔

[3] بخاري باب يستقبل الامام الناس اذاسلم حديث 845' 143' 1386

[4] مسلم باب جواز الانصراف من الصلاة عن اليمين والشمال حديث 708

معلوم ہوا کہ امام کو پھرنے کے لئے صرف ایک طرف مقرر نہیں کر لینی چاہئے بلکہ کبھی دائیں طرف سے پھرا کرے، کبھی بائیں طرف سے۔ مگر اکثر دائیں طرف سے مڑنا چاہئے۔

سیدنا براءؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے تو ہم آپ کے دائیں طرف کھڑا ہونا پسند کرتے تھے تاکہ آپ کا چہرہ ہماری طرف ہو[2]۔

امام کی اقتداء کے احکام:

سیدنا ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امام سے پہل نہ کرو! جب وہ تکبیر کہے، اس کے بعد تم تکبیر کہو۔ اور جب امام ولا الضالین کہے تو تم اس کے بعد آمین کہو۔ اور جب امام رکوع کرے، تم اس کے بعد رکوع اور جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم اللھم ربنا ولک الحمد کہو[3]۔

سیدنا براء بن عازبؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، پس جب آپ سمع اللہ لمن حمدہ کہتے تو (ہم آپ کے پیچھے قومے میں کھڑے ہو جاتے تھے اور پھر) ہم میں سے کوئی اپنی پیٹھ (سجدے میں جانے کے لئے) نہ جھکاتا تھا یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ اپنی پیشانی زمین پر رکھ دیتے، پھر ہم آپ کے بعد سجدے میں جاتے تھے[4]۔

قارئین کرام! غور کیا آپ نے! کہ جب تک رسول اللہ ﷺ قومے سے سجدے میں پہنچ کر اپنی پیشانی مبارک زمین پر نہ رکھ دیتے تھے، اس وقت تک تمام صحابہؓ کھڑے رہتے تھے۔ کوئی پیٹھ تک

---

[1] بخاري باب الانتفال والانصراف عن اليمين والشمال حديث 852 مسلم باب جواز الانصراف عن اليمين والشمال حديث 708

[2] مسلم باب استحباب يمين الامام حديث 709

[3] مسلم باب النهي عن مبادرة الامام بالتكبير وغيره حديث 415

[4] بخاري باب متي يسجد من خلف الامام حديث 811'747'690

نہ جھکاتا تھا اور ہمارا یہ حال ہے کہ امام قومے سے سجدے میں آنے کے لئے ابھی اللہ اکبر ہی کہتا ہے تو مقتدی امام کے سجدے میں پہنچنے سے پہلے ہی سجدے میں پہنچ گئے ہوتے ہیں۔

نبی رحمت ﷺ فرماتے ہیں امام سے پہلے رکوع کرو نہ سجدہ اور امام سے پہلے ہو نہ پہلے سلام پھیرو[1]۔

سیدنا ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا امام سے پہلے سر اٹھانے والا ڈرتا نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کا سر گدھے کے سر کی طرح کر دے یا اس کی شکل گدھے جیسی بنا دے[2]۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب نماز میں کوئی بات درپیش تو سبحان اللہ کہنا مردوں کے لئے ہے اور ہاتھ مارنا عورتوں کے لئے ہے[3]۔

امام کو لقمہ دینا:

سیدنا مسور بن یزیدؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ نبی اکرم ﷺ نے قراءت میں قرآن کا کچھ حصہ (سہوا) چھوڑ دیا۔ ایک آدمی نے کہا: آپ ﷺ نے فلاں فلاں آیت چھوڑ دی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا: تو نے مجھے یاد کیوں نہ کرایا؟[4]۔[5]

---

[1] مسلم باب تحریم سبق الامام برکوع او سجود ونحوهما حدیث 426

[2] بخاري باب اثم من رفع راسه قبل الامام حدیث 691 مسلم باب حواله سابق حدیث 427

[3] بخاري باب التصفيق للنساء حدیث 1203 '1204' 684 مسلم باب تسبیح الرجال وتصفيق النساء اذا نابهما شئ في الصلاة حدیث 422

[4] ابو داؤد باب الفتح علی الامام فی الصلاۃ حدیث 907 امام ابن خزیمہ اور امام ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے

[5] **تبصرہ**: اس روایت کی سند میں ایک راوی مروان بن معاویہ جو عن سے روایت کر رہے ہیں اور یہ مدلس راوی ہے {طبقات المدلسین لابن حجر، اسماء المدلسین لسیوطی، تہذیب الکمال} اور محققین کا اصول ایک دفعہ پھر یاد دلاتے ہیں" حکم یہ ہے کہ مدلس کی صرف وہی روایت قبول کی جائے گی جس میں وہ سماع کی تصریح کرے یہ بات امام شافعی نے ہر اس شخص پر جاری فرمائی ہے جو ایک دفعہ بھی تدلیس کرے امام یحیی بن معین نے کہا مدلس اپنی تدلیس سے حجت نہیں ہوتا" {نور العینین ص: 138} یاد رہے کہ یہی امام یحیی بن معین نے مروان بن معاویہ کو مدلس کہا ہے۔ لہٰذا یہ حدیث آپ کے اصول کے مطابق ضعیف ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

عورت کی امامت :

پہلی صف کی وسط میں { دوسری عورتوں کے ساتھ برابر } کھڑی ہو کر عورت عورتوں کی امامت کرا سکتی ہے۔

حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں : امرھا ان تؤم اھل دارھا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنی گھر والوں کی امامت کرائیں [1]

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا عورتوں کی امامت کراتی اور صف کی درمیان کھڑی ہوتی تھیں [2]۔ [3]

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

عورت کی امامت اور حدیث ام ورقہؓ :

مستقل عورتوں کا جماعت سے نماز پڑھنا اس طرح کہ عورت ہی امام ہو مکروہ تحریمی ہے۔ وجہ اس کی یہ بیان کی گئی ہے کہ عورتوں کی جماعت کی صورت میں دو ممنوع میں سے کسی ایک ممنوع کا ارتکاب لازم آتا ہے ، کیونکہ امام یا تو مقتدیوں کے آگے کھڑی ہوگی تو یہ کشف ستر کی زیادتی کی وجہ سے مکروہ ہے ، یا صف کے درمیان کھڑی ہوگی تو بھی موجب کراہت ہے ، کیونکہ امام کا مقتدیوں سے آگے کھڑا ہونا واجب ہے۔ پس ہر دو صورت میں ممنوع کا ارتکاب لازم آتا ہے۔ اس لیے عورتوں کے حق میں جماعت سرے سے مشروع ہی نہیں۔

---

[1] ابو داؤد باب امامۃ النساء حدیث 592 اسے ابن خزیمہ حدیث 1272 نے صحیح کہا ہے

[2] ابن ابی شیبۃ 2 /89 امام ابن حزم نے اسے صحیح کہا ہے

[3] **تبصرہ:** حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ حدیث کی ایک سند میں سفیان بن عیینہ عن سے روایت کرتے ہیں اور دوسری سند میں قتادہ عن کے ساتھ روایت کرتے ہیں اور دونوں کو مرحوم علی زئی صاحب مدلس کہتے ہیں اور ایسی راویت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ روایت مجہول ہے اور ایسی روایت کے بارے میں ابو داؤد میں ہے کہ "یذکر ولایحتج بہ" ایسی روایت سے دلیل نہیں پکڑی جائیگی۔

نیز احادیث میں اس کی ممانعت بھی وارد ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا سے عورتوں کی جماعت میں خیر نہ ہونے کی روایت منقول ہے۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے کہ عورت امام نہ بنے۔ باقی رہی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کی امامت کی حدیث تو اس میں یہ ممکن ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا نے عورتوں کو نماز کا طریقہ سکھانے کے لیے جماعت کروائی ہو جبکہ صاحب عنایہ نے عورتوں کی جماعت کو ابتداء اسلام پر محمول کر کے اس کی سنیت کو منسوخ لکھا ہے۔

باقی رہی حضرت ام ورقہ رضی اللہ تعالی عنہا کی حدیث تو اگر اس کی سند پر کلام سے قطع نظر اسے صحیح بھی مان لیا جائے تو ایک طرف تو دیگر احادیث اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجماع عمل سے عورتوں کی جماعت کی ممانعت کا حکم عام ثابت ہوتا ہے، جبکہ مذکورہ بالا حدیث ایک خاص عورت (حضرت ام ورقہ رضی اللہ تعالی عنہا) کے بارے میں ہے جس سے حکم خاص ثابت ہوتا ہے اور ظاہر ہے کسی خاص واقعے کے حکم کے مقابلے میں عام حکم پر عمل کرنا اولی ہے۔

نیز حضرت ام ورقہ رضی اللہ تعالی عنہا کی حدیث سے زیادہ سے زیادہ اباحت ثابت ہو گی جبکہ دوسری طرف کراہت کا ثبوت ہے اور ظاہر ہے ایسی صورت میں اباحت پر عمل نہ کرنے میں ہی احتیاط ہے۔ اور اگر بالفرض محض حضرت ام ورقہ رضی اللہ تعالی عنہا کی حدیث سے جماعۃ النساء کے استحباب کو مان بھی لیا جائے تب بھی قاعدہ یہی ہے کہ جب کسی حکم میں استحباب اور کراہت جمع ہو جائیں تو استحباب پر عمل نہ کرنا ہی راجح ہوتا ہے [1]۔

---

[1] رواہ احمد و الطبرانی فی الاوسط (اعلاء السنن ج 4 ص 242)و فی الدر المختار : (و) یکرہ تحریما (جماعۃ النساء) ولوفي التراويح (ج: 1 /ص: 565) قَالَ ابْنُ وَهْبٍ عَنْ ابْنِ أَبِي ذِئْبٍ عَنْ مَوْلًى لِبَنِي هَاشِمٍ أَخْبَرَهُ عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ أَنَّهُ قَالَ: لَا تَؤُمُّ الْمَرْأَةُ. (المدونۃ لمالك ج 1 ص 86)قلت: رجالہ کلھم ثقات و لا یضرہ عدم تسمیۃ الراوی عن علی فان کل من روی عنہ ابن ابی ذئب ثقۃ الا ابا جابر البیاضی کما فی التھذیب (ج 9 ص 304 ، 305) والبیاضی لیس من موالی بنی ھاشم فالسند صحیح

امامت کے چند مسائل:

سیدہ عائشہؓ سے روایت ہے

صلی رسول اللہ ﷺ فی حجرته والناس یأتمون به من وراء الحجرة[1]

رسول اللہ ﷺ نے اپنے (اعتکاف والے) حجرے میں نماز پڑھی اور لوگوں نے حجرے سے باہر آپ کی اقتدا میں نماز ادا کی

معلوم ہوا کہ امام اور مقتدیوں کے درمیان اگر کوئی دیوار وغیرہ حائل ہو تو نماز ہو جائے گی۔

عبد اللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں رات کی نماز میں نبی اکرم ﷺ کے بائیں طرف کھڑا ہوا۔ آپ ﷺ نے میرا ہاتھ اپنی پیٹھ کے پیچھے سے پکڑا اور مجھے اپنی دائیں طرف کر دیا[2]

سیدنا جابر کہتے ہیں کہ میں نماز میں نبی اکرم ﷺ کے پیچھے کھڑا ہو گیا تو آپ نے میرا کان پکڑ کر مجھے اپنے دائیں جانب کر لیا (یہ ایک سفر کا واقعہ ہے، اس میں رسول اللہ ﷺ نے ایک ہی چادر میں نماز پڑھی)[3]

اگر مقتدی ایک ہو تو وہ امام کے دائیں طرف اور اس کے برابر کھڑا ہو گا[4]

سیدنا بلالؓ رسول اللہ ﷺ کو دیکھ کر تکبیر کہتے اور آپ کے مصلے پر کھڑے ہونے سے پہلے تکبیر کہی جاتی اور لوگ صف بندی کر لیتے تھے[5]

---

[1] ابو داؤد باب الرجل یأتم بالامام وبینهما جدار حدیث1126

[2] بخاري باب اذا قام الرجل عن يسار الامام وحوله الامام الي يمينه تمت صلوته حديث 726 '698 '117 مسلم باب الدعاء في صلاة الليل حديث 763

[3] مسلم باب صلوة النبي صلي الله عليه وسلم ودعائه بالليل حديث 766

[4] بخاري باب يقوم عن يمين الامام بحذائه سواء اذا كانا اثنين حديث 697 '698 '699

[5] مسلم باب متي يقوم الناس للصلاة حديث 605 '606

سیدنا انسؓ کہتے ہیں کہ میں جماعت میں آپ ﷺ کے دائیں طرف کھڑا ہوا اور ایک عورت ہمارے پیچھے کھڑی ہوئی [1]

معلوم ہوا کہ اگر مقتدیوں میں سے ایک مرد ہو تو مرد امام کے دائیں طرف اور عورت (ایک ہو یا زیادہ) پیچھے الگ صف میں کھڑی ہو گی۔

رسول اللہ ﷺ کی بیماری کے ایام میں سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے امامت کرائی۔ایک دن آپ نے تکلیف میں تخفیف پائی تو آپ دو صحابہؓ کے کندھوں پر ہاتھ ٹیکتے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے۔جب سیدنا ابو بکرؓ نے آپ کی آمد محسوس کی تو پیچھے ہٹنا چاہا،آپ نے اشارہ کیا کہ پیچھے نہ ہٹو۔آپ ﷺ سیدنا ابو بکرؓ کی بائیں طرف بیٹھ گئے اور بیٹھ کر نماز ادا کی اور سیدنا ابو بکرؓ کھڑے تھے۔سیدنا ابو بکرؓ رسول اللہ ﷺ کی اقتدا کرتے اور لوگ سیدنا ابو بکرؓ کی اقتدا کرتے۔یہ ظہر کی نماز تھی [2]

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں: ﴾

سیدنا معاذؓ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے،پھر اپنی قوم کے پاس آتے اور انہیں نماز پڑھاتے [3]

معلوم ہوا فرض نماز پڑھ لینے کے بعد دوسروں کو وہی نماز پڑھا سکتے ہیں۔

سیدنا ابو سعیدؓ کہتے ہیں کہ ایک آدمی مسجد میں آیا،آپ نماز پڑھا چکے تھے،وہ آدمی اکیلا نماز پڑھنے لگا،نبی اکرم ﷺ نے پوچھا: کیا کوئی شخص ایسا نہیں جو اس پر صدقہ کرے اور اس آنے والے کے ساتھ باجماعت نماز پڑھے [1]۔

---

[1] مسلم باب جواز الجماعة في النافلة حديث 220

[2] بخاري باب الرجل يأتم بالاماموويأتم الناس بالماموم - حديث 713 '198 مسلم باب استخلاف الامام اذا عرض له عذرا حديث 418

[3] بخاري باب اذا طول الامام وكان للرجل حاجة فخرج وصلي حديث 700 '701 مسلم باب القراءة في العشاء حديث 465

تبصرہ:

قارئین کرام! غیر مقلد احباب نے جو حدیث پیش کی ہے یہ ایک حدیث نہیں بلکہ دو حدیثیں پہلے دونوں حدیثوں کو الگ الگ ملاحظہ فرمائیں:

حدیث ترمذی کا ترجمہ:

حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی نماز پڑھ لینے کے بعد آیا آپ ﷺ نے فرمایا اس شخص کے ساتھ کون تجارت کرے گا، ایک شخص کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ نماز پڑھ لی۔

حدیث ابوداؤد اور مستدرک حاکم کا ترجمہ:

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو تنہا نماز پڑھتے دیکھا تو فرمایا کہ کوئی شخص نہیں ہے جو اس پر صدقہ کرے یعنی اس کے ساتھ نماز پڑھے۔

یہاں ترجمہ میں جو خیانت کی گئی ہے وہ معمولی غور و فکر سے آسانی سے سمجھ آجاتی ہے کہ آدھا ترجمہ ترمذی کی حدیث کا ہے اور آدھا ابو داؤد اور مستدرک کی حدیث کا۔ حضور ﷺ کے حدیث مبارک من کذب علی متعمد فلیتبوا مقعدہ من النار کی وعید سے ڈرنا چاہیئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ غیر مقلد احباب پہلے یہ تعیین کرلیں کہ ان کا استدلال ترمذی کی روایت سے ہے یا ابوداؤد و مستدرک کی، اگر ترمذی کی روایت سے ہے تو اس ایک راوی سعید بن ابی عروبہ ہیں جن کے بارے میں مرحوم علی زئی صاحب خود (جزء قرات، ص:56) پر لکھتے ہیں کہ مشہور مدلس تھے اور یہ روایت سعید بن ابی عروبہ عن کے ساتھ روایت کر رہے ہیں، لہٰذا یہ روایت ان کے اپنے ہی اصول کے ساتھ ضعیف ٹھہری اور قابل استدلال نہ رہی اور اگر ابو داؤد و مستدرک کی روایت سے ہے تو اس میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں کہ آپ ﷺ نماز پڑھ چکے تھے۔ اور ابوداؤد اور مستدرک کی روایت میں نماز پڑھ لینے کا کوئی ذکر نہیں ہے، لہٰذا یہ آپ کی دلیل نہیں بن سکتی۔

---

[1] ابو داؤد باب الجمع في المسجد مرتين حديث 574 امام ترمذی امام حاکم اور امام ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے

دوبارہ جماعت کی نماز میں شرکت:

مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھ چکا ہو اور وہ پھر کسی مسجد میں آتا ہے جہاں نماز ہو رہی ہو تو وہ کیا کرے، آیا وہ نماز میں شریک ہو جائے یا شریک نہ ہو۔

اس بارے میں مؤطا امام مالک اور نسائی میں یہ حدیث ہے:

حضرت محجن رضی اللہ عنہ کے لڑکے بشر بن محجن فرماتے ہیں کہ ان کے والد رسول اکرم ﷺ کیساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ نماز کے لئے اذان کہی گئی رسول اکرم ﷺ نے نماز پڑھائی اور حضرت محجن نماز میں شریک نہیں ہوئے، نماز سے فراغت کے بعد حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم نے لوگوں کے ساتھ نماز کیوں نہیں پڑھی؟ تو حضرت محجن نے جواب دیا کہ میں گھر سے نماز پڑھ کر آیا ہوں، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسجد میں آؤ تو لوگوں کے ساتھ نماز میں شریک ہو جاؤ، اگرچہ تم نماز پڑھ چکے ہو۔

اس حدیث کی روشنی میں مسئلہ مذکور میں فقہاکے جو اختلاف ہیں اب آپ ان پر نظر فرمائیے اور ان کے دلائل دیکھئے:

(1) اگرچہ یہ حدیث مطلق ہے مگر جمہور فقہا فرماتے ہیں کہ یہ حکم اس شخص کے لئے ہے جو گھر میں تنہا نماز پڑھ کر آیا ہو اور جس نے باجماعت نماز پڑھ لی ہو اس کے لئے یہ حکم نہیں ہے، اس لئے کہ وہ جماعت کی فضیلت حاصل کر چکا ہے، ان حضرات کے پیش نظر حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد ہے: لا تعاد صلوۃ فی یوم مرتین یعنی ایک نماز کو دو مرتبہ نہیں پڑھا جائے گا، یعنی اگر کسی ایک دفعہ نماز باجماعت ادا کر لی ہے تو وہ اس نماز کو دوبارہ جماعت کے ساتھ نہیں پڑھے گا۔

فقہائے امت میں سے اس کے قائل امام مالک، امام ابو حنیفہ، اور امام شافعی اور ان ائمہ کرام کے اصحاب وتلامذہ ہیں۔

صحابہ کرام میں سے یہی مسلک حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا بھی ہے، حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے غلام سلیمان فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور دیکھا کہ لوگ نماز پڑھ رہے ہیں اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ شریک نہیں ہیں، تو میں نے ان سے پوچھا آپ ان کے

ساتھ نماز کیوں نہیں پڑھتے تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ تم لوگ ایک نماز کو دو بار مت پڑھا کرو، یہ روایت ابوداؤد، نسائی اور احادیث کے متعدد دوسری کتابوں میں ہیں۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

آداب تلاوت:

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: یقطع قراءته ایةایة

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کی ہر آیت پر توقف فرماتے [1] {بعد والی آیت کو پہلی آیت کے ساتھ نہیں ملاتے تھے} [2]۔

مذکورہ حدیث کثرت طرق کے ساتھ مروی ہے۔اس مسئلے میں اسے بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ائمہ سلف صالحین کی ایک جماعت ہر آیت پر توقف فرماتی تھی اگر مابعد آیت معنی کے لحاظ سے پہلی آیت کے ساتھ متعلق ہوتی تھی، پھر بھی قطع کرکے پڑھتے تھے۔تلاوت قرآن کا مسنون طریقہ یہی ہے لیکن آج عام قاری حضرات اس طرح تلاوت کرنے سے گریز کرتے ہیں [3]۔

---

1 **تبصرہ:** اس روایت کی سند میں ایک راوی ابن جریج ہیں۔ جن کو مرحوم علی زئی صاحب {جزء قرات للبخاری ص: 164، 100} پر مدلس کہتا ہے۔ جبکہ اب اسی ابن جریج کے عنعنہ والی روایت سے استدلال کیا جارہا ہے۔

2 ابوداؤد باب الحروف والقراءات حدیث 4001 وابواب الوتر باب استحباب الترتیل حدیث 1466 اسے امام حاکم اور ذہبی نے صحیح کہا ہے

3 **تبصرہ:** یہ عبارت بلاحوالہ ہے جو کہ آپ کے اصول کے مطابق نہیں۔کیا یہ ائمہ سلف کی تقلید نہیں؟۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نمازی اپنے رب کے ساتھ سرگوشی کرتا ہے۔اسے خیال کرنا چاہئے کہ وہ کس قسم کی سرگوشی کر رہا ہے اور تم حالت نماز میں قرآن مجید اونچی آواز کے ساتھ تلاوت کر کے اپنے ساتھیوں کو اضطراب میں نہ ڈالو[1]۔

رسول اللہ ﷺ ،اللہ کے حکم کے مطابق آہستہ آہستہ قرآن پاک کی تلاوت فرماتے بلکہ ایک ایک حرف الگ الگ پڑھتے ۔یوں معلوم ہوتا کہ چھوٹی سورت، لمبی سورت سے بھی زیادہ لمبی ہو گئی۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے: حافظ قرآن کو کہا جائے گا: تم قرآن پڑھتے جاؤ اور (جنت کی سیڑھیاں) چڑھتے جاؤ۔ جس طرح تم دنیا میں ترتیل وآہستگی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے، اس طرح پڑھتے چلو۔ تمہاری منزل وہاں ہے جہاں تم آخری آیت پڑھو گے[2]۔

رسول اللہ ﷺ قرآن کو اچھی آواز سے پڑھنے کا حکم فرماتے اس لئے کہ خوبصورت آواز کے ساتھ پڑھنے میں مزید حسن پیدا ہوتا ہے[3] [4]۔

سیدنا عقبہ بن عامرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی کتاب کا علم حاصل کرو۔اسے ذہن میں محفوظ کرو اور اسے خوبصورت آواز سے پڑھو۔ مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے !اونٹ کے گھٹنے کی رسی اگر کھول دی جائے تو وہ اتنی تیزی سے نہیں بھاگتا جتنا تیزی سے قرآن پاک حافظے سے نکل جاتا ہے[5]۔

---

[1] موطا امام مالک باب العمل فی الصلاۃ 1 / 80 ابوداؤد باب رفع الصوت بالقراءۃ فی صلاۃ اللیل حدیث 1332 اسے امام ابن خزیمہ نے صحیح کہا ہے

[2] ابو داؤد باب استحباب الترتیل فی القراءۃ حدیث ابن حبان اور ترمذی حدیث 2919 نے اسے صحیح کہا ہے

[3] ابو داؤد حوالہ سابق حدیث 1468 اسے امام ابن حبان اور ابن خزیمہ نے صحیح کہا ہے

[4] تبصرہ: ابوداؤد کی اس روایت کی سند میں ایک راوی امام اعمش ہے جو عن کے ساتھ روایت کرتے ہیں جن کو مرحوم علی زئی صاحب {جزء رفع یدین ص: 82 جزء قرات ص: 92} پر مدلس کہتا ہے۔

[5] دامی فی تعاھد القران حدیث 3352 و مسند احمد 146/4 و 150

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے کوئی چیز اتنی توجہ سے نہیں سنی جتنی توجہ سے اس نے نبی کریم ﷺ کا بہترین آواز کے ساتھ قرآن پڑھنا سنا ہے[1]۔

نماز کی مسنون قراءت:

منفرد نمازی سورہ فاتحہ کے بعد جہاں سے اور جتنا چاہے قرآن مجید پڑھ سکتا ہے، البتہ امام کو نماز پڑھاتے وقت مقتدیوں کے احوال و کوائف کے پیش نظر ضرور اختصار سے کام لینا چاہئے۔

نماز میں سورۃ فاتحہ کے بعد اگرچہ ہم جہاں سے چاہیں قرآن پڑھ سکتے ہیں لیکن یہاں ہم نبی کریم ﷺ کی قراءت کا ذکر کرتے ہیں کہ آپ کون کون سی سورت کس کس نماز میں پڑھتے تھے۔

﴿غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں:﴾

سورۃ اخلاص کی اہمیت:

ایک انصاری، مسجد قبا میں امامت کراتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ سورۃ فاتحہ کے بعد کوئی دوسری سورت پڑھنے سے پہلے قل ھو اللہ احد (سورۃ اخلاص) تلاوت فرماتے، ہر رکعت میں اسی طرح کرتے۔ مقتدیوں نے امام سے کہا کہ آپ پہلے قل ہو اللہ احد کی تلاوت کرتے ہیں، پھر بعد میں دوسری سورت ملاتے ہیں، کیا ایک سورت تلاوت کے لئے کافی نہیں ہے؟ یا صرف اسی کو پڑھا کریں اور اگر قل ھو اللہ احد کی تلاوت کافی نہیں تو اسے چھوڑ دیں اور دوسری سورت کی تلاوت کیا کریں۔ امام نے جواب دیا کہ میں قل ھو اللہ احد کی تلاوت نہیں چھوڑ سکتا۔ انہوں ے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مسئلہ پیش کیا تو نبی اکرم ﷺ نے امام سے کہا: تم مقتدیوں کی بات کیوں تسلیم نہیں کرتے، اس

[1] بخاری باب من لم یتغن بالقران حدیث 5023، 5024 مسلم استحباب تحسین الصوت بالقران حدیث 792

سورت کو ہر رکعت میں کیوں لازمی پڑھتے ہو؟ اس نے کہا: مجھے اس سورت کے ساتھ محبت ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اس سورت کے ساتھ تیری محبت تجھے جنت میں داخل کرے گی[1]۔

تبصرہ:

ہم اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اس حدیث کو امام بخاری تعلیقا لائے ہیں۔ اور عبیداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں جبکہ عبیداللہ بن عمر 147 ہجری میں فوت ہوئے او رامام بخاری 194 ہجری میں پیدا ہوئے۔ یعنی ان کے درمیان 47 سال کا فاصلہ ہے۔ حافظ زبیر علی زئی نے نے کہا ہے" یہ قول سفیان { بن عیینہ } سے ثابت نہیں ہے. سفیان 198 ہجری میں فوت ہوئے جبکہ امام ابوداؤد 202 ہجری میں پیدا ہوئے۔ لہٰذا یہ قول منقطع ہونے کی وجہ سے ثابت ہی نہیں ہے { جزء قرات للبخاری ص: 49 } اگر چار سال کی بات منقطع ہے تو پھر 47 سال بعد والی بات متصل ہو کر قابل استدلال کیسے؟۔ امام ترمذی اس حدیث کو متصل لائے ہے۔ لیکن وہاں ایک راوی اسماعیل بن ابی اویس جمہور محدثین کے ہاں ضعیف ہے۔ یہاں تک ان پر کذاب ہونے کا الزام بھی ہے اور حدیث میں چوری کرنے والا بھی کہا گیا ہے { تہذیب الکمال }۔ حاشیہ نگار فرماتے ہیں امام ترمذی نے اس کو حسن صحیح غریب کہا ہے۔ جبکہ حسن غریب کو تو صحیح نقل کیا ہے لیکن یہ صحیح کا لفظ ان کا اپنا پیداوار ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں: ﴾

ایک صحابی نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ میرا ایک پڑوسی رات کے قیام میں (سورۃ فاتحہ کے بعد) صرف قل ھو اللہ احد تلاوت کرتا ہے، دوسری کوئی آیت تلاوت نہیں کرتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! یہ سورت تہائی قرآن کے برابر ہے[2]۔

---

[1] بخاری باب الجمع بین السورتین فی رکعة تعلیقا امام ترمذی نے اسے حسن صحیح غریب کہا ہے دیکھئے ترمذی باب ما جاء فی سورۃ الاخلاص حدیث 2906

[2] بخاری باب فضل قل ھو اللہ احد حدیث 5015 مسلم باب فضل قراءۃ قل ھو اللہ احد حدیث 811-812

نماز جمعہ اور عیدین میں تلاوت:

سیدنا نعمان بن بشیرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دونوں عیدوں اور جمعہ کی نمازوں میں سبح اسم ربک الاعلی اور ھل اتٰک حدیث الغاشیہ پڑھتے تھے۔ سیدنا نعمان بن بشیرؓ نے کہا: جب عید اور جمعہ ایک دن میں جمع ہوتے تو پھر بھی نبی اکرم ﷺ یہ دونوں سورتیں دونوں نمازوں میں پڑھتے [1]۔

عبید اللہ بن ابی رافع سے روایت ہے کہ مروان نے سیدنا ابوہریرہؓ کو مدینے کا گورنر مقرر کیا اور خود مکہ چلا گیا۔ وہاں سیدنا ابوہریرہؓ نے جمعے کی نماز پڑھائی اور اس میں سورۃ جمعہ اور منافقون پڑھیں اور کہا کہ ان سورتوں کو جمعہ میں پڑھتے ہوئے میں نے رسول اللہ ﷺ نے سنا تھا[2]۔

رسول اللہ ﷺ عید قربان اور عید الفطر میں قٓ والقرآن المجید اور اقتربت الساعۃ پڑھتے تھے [3]۔

جمعے کے دن نماز فجر میں تلاوت:

سیدنا ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جمعے کے دن فجر کی نماز میں الم تنزیل پہلی رکعت میں اور ھل اتی علی الانسان دوسری رکعت میں پڑھتے تھے [4]۔

نماز فجر میں تلاوت

سیدنا جابر بن سمرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز فجر میں سورۃ قٓ والقرآن المجید اور اس کی مانند (کوئی اور سورت) پڑھتے تھے، پھر آپ بعد والی نماز میں تخفیف کرتے تھے [5]۔

---

[1] مسلم باب ما یقرا فی صلاۃ الجمعۃ حدیث 878

[2] مسلم باب ما یقرا فی صلاۃ الجمعۃ حدیث 877

[3] مسلم باب مایقرا فی صلاۃ العیدین حدیث 891

[4] بخاری باب مایقرا فی صلاۃ الفجر یوم الجمعۃ حدیث 891 مسلم باب مایقرا فی یوم الجمعۃ حدیث 879

[5] مسلم باب مایقرا فی الصبح حدیث 458

رسول اللہ ﷺ نے ہمیں مکہ فتح ہونے کے بعد فجر کی نماز پڑھائی، تو سورہ مومنون شروع کی یہاں تک کہ موسیٰ اور ہارون علیہ السلام یا عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر آیا تو نبی اکرم ﷺ کو کھانسی آ گئی اور آپ رکوع میں چلے چلے گئے[1]۔

سیدنا عمرو بن حریث رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز فجر میں والیل اذاعسعس پڑھتے سنا[2]۔

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں سفر میں رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی کی مہار پکڑے ہوئے چل رہا تھا۔ آپ (سفر میں) نماز صبح کے لئے اترے تو آپ نے صبح کی نماز میں قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھی[3]۔

سیدنا معاذ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے نماز فجر میں دونوں رکعتوں میں اذآزلزلت تلاوت فرمائی[4]۔

رسول اللہ ﷺ فجر کی دونوں سنتوں میں نہایت ہلکی قراءت فرماتے[5] یہاں تک کہ امی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: مجھے شبہ گزرتا کہ شاید نبی اکرم ﷺ نے سورۃ فاتحہ بھی نہیں پڑھی[6]۔

---

[1] مسلم باب مایقرا فی الصبح حدیث455

[2] مسلم باب مایقرا فی الصبح حدیث456

[3] نسائی 158/2، 253 و252/8 ابوداؤد باب فی معوذتین حدیث1462 اسے حاکم 240/1 ذہبی ابن خزیمہ اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے

[4] ابوداؤد باب الرجل یعید سورۃ واحدۃ في الرکعتین حدیث816 اسے امام نووی نے صحیح کہا ہے

[5] مسند احمد 183/6 اس کی سند صحیح ہے

[6] صحیح البخاری، التہجد، باب ما یقرأ فی رکعتی الفجر؟ حدیث: ۱۱۷۱، وصحیح مسلم، صلاۃ المسافرین، باب استحباب رکعتی سنۃ الفجر ۔۔، حدیث: (۹۲)۔۷۲۴۔

آپ ﷺ سنتوں کی پہلی رکعت میں قل یایھاالکفرون اور دوسری رکعت میں قل ھو اللہ احد پڑھتے[1]۔

ظہر وعصر کی نماز میں قرات:

سیدنا ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ظہر وعصر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ اور کوئی ایک سورت پڑھتے اور آخری دو رکعتوں میں صرف فاتحہ پڑھتے تھے اور کبھی کبھار ہمیں ایک آدھ آیت (بلند آواز سے پڑھ کر) سنا دیتے تھے[2]

سیدنا جابر بن سمرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ظہر مین واللیل اذا یغشیٰ پڑھتے تھے۔ایک اور روایت میں ہے کہ سبح اسم ربک الاعلیٰ اور عصر میں بھی اس کی مانند کوئی سورت پڑھتے تھے اور فجر میں لمبی سورتیں پڑھتے تھے[3]۔

سیدنا جابر بن سمرہؓ کی ایک روایت ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کا ظہر اور عصر میں والسماء ذات البروج اور والسماء والطارق پڑھنے کا ذکر ہے[4]۔

رسول اللہ ﷺ ظہر کی آخری دونوں رکعتوں میں پندرہ آیات کے برابر قراءت فرماتے[5]۔

---

[1] مسلم حوالہ سابق حدیث726

[2] صحیح البخاری ،الاذان،باب یقرأ فی الاخریین بفاتحۃ الکتاب ،حدیث:۷۷۶،وصحیح مسلم ،الصلاۃ،باب القرأۃ فی الظھر والعصر ،حدیث:۴۵۱۔

[3] مسلم باب القراءۃ في الصبح 459' 460

[4] حسن سنن ابی داؤد ،الصلاۃ ،باب قدرالقرأۃ فی صلاۃ الظھر والعصر ،حدیث:۸۰۵،وسندہ حسن ،امام ابن حبان نے الموارد ،حدیث:۴۶۵ میں اسے صحیح کہا ہے۔

[5] صحیح مسلم ،الصلاۃ،باب القرأۃ فی الظھر والعصر ،حدیث:456

معلوم ہوا کہ ظہر کی آخری دونوں رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے بعد قراءت مسنون ہے۔اور کبھی آپ آخری دو رکعتوں میں صرف فاتحہ کی قراءت فرماتے [1]۔

جبکہ نماز عصر کی پہلی دونوں رکعتوں میں ہر رکعت کے اندر ۱۵ آیات تلاوت فرماتے [2]۔

اور آخری دو رکعتوں میں صرف فاتحہ پڑھتے [3]۔

ابو معمرؒ نے سیدنا خبابؓ سے کہا: کیا رسول اللہ ﷺ ظہر و عصر میں قراءت کرتے تھے؟ سیدنا خبابؓ نے کہا: ہاں، ہم نے کہا کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا۔ سیدنا خبابؓ فرمانے لگے کہ آپ کی داڑھی کی جنبش سے [4]۔

معلوم ہوا کہ ظہر و عصر کی نمازوں میں آپ سری (بغیر آواز بلند کئے) قراءت کرتے تھے۔
کبھی آپ کی قراءت طویل ہوتی۔ بعض اوقات ظہر کی جماعت کی اقامت ہو جاتی اور کوئی شخص آتا اور وضو کرکے پھر مسجد میں آتا تو ابھی تک نبی اکرم ﷺ پہلی رکعت میں ہوتے [5]۔

صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ آپ پہلی رکعت کو اتنا لمبا اس لئے فرماتے تھے کہ نمازی پہلی رکعت ہی میں شریک ہو سکیں [6]۔

---

[1] صحیح البخاری ،الاذان،باب یقرأ فی الاخریین بفاتحۃ الکتاب ،حدیث:۷۷۶،وصحیح مسلم ،الصلاۃ،باب القرأۃ فی الظهر والعصر ،حدیث:۴۵۱۔

[2] صحیح مسلم ،الصلاۃ،باب القرأۃ فی الظهر والعصر ،حدیث:۴۵۲۔

[3] صحیح البخاری ،الاذان،باب یقرأ فی الاخریین بفاتحۃ الکتاب ،حدیث:۷۷۶،وصحیح مسلم ،الصلاۃ،باب القرأۃ فی الظهر والعصر ،حدیث:۴۵۱۔

[4] صحیح البخاری ،الاذان،باب من خافت القراءۃ فی الظهر والعصر ،حدیث:۷۷۷۔

[5] صحیح مسلم ،الصلاۃ، باب القراءۃ فی صلاۃ الظهر والعصر حدیث:454۔

[6] صحیح سنن ابی داؤد ، الصلاۃ ،باب القراۃ فی الظهر حدیث:۸۰۰،وهو حدیث صحیح ،اس حدیث کی اصل صحیح بخاری،حدیث:۷۷۹ اور صحیح مسلم ،حدیث:۴۵۱،میں موجود ہے۔

نماز مغرب میں قراءت:

سیدنا جبیر بن مطعمؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز مغرب میں سورۃ طور پڑھتے سنا[1]۔

ام فضلؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز مغرب میں سورۃ والمرسلات عرفا پڑھتے ہوئے سنا[2]۔

سیدہ عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز مغرب سورۃ اعراف کے ساتھ پڑھی اور سورت کو دونوں رکعتوں میں متفرق پڑھا[3]۔

نماز عشاء میں قراءت:

سیدنا براء بن عازبؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز عشاء میں والتین والزیتون پڑھتے ہوئے سنا اور میں نے نبی اکرم ﷺ سے زیادہ خوش آواز کسی کو نہیں سنا[4]۔

سیدنا معاذ بن جبلؓ نے عشاء کی نماز میں سورۃ بقرۃ پڑھی۔ مقتدیوں میں سے ایک کھیتی باڑی کا کام کرنے والے نے سلام پھیر دیا۔ پھر اس نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم لوگ اونٹوں والے ہیں دن بھر محنت مشقت کرتے ہیں۔ سیدنا معاذؓ نے پہلے آپ کے ساتھ نماز پڑھی، پھر ہمارے پاس آئے اور انہوں نے عشاء میں سورۃ بقرہ شروع کر دی۔ (مجھ

---

[1] صحیح البخاری، الاذان، باب الجھر فی المغرب، حدیث: ۷۶۵، وصحیح مسلم، الصلاۃ باب القراءۃ فی الصبح، حدیث: ۴۶۳۔

[2] صحیح البخاری، الاذان، باب القراۃ فی المغرب، حدیث: ۷۶۳، باب القراءۃ فی الصبح، حدیث: ۴۶۲۔

[3] صحیح سنن النسائی، الافتتاح، باب القرآۃ فی المغرب المص حدیث: ۹۹۲، وسندھصحیح، امام نووی نے المجموع: ۳۸۳/۴ میں اسے حسن کہا ہے۔

[4] حیح البخاری، الاذان، بابالقرآۃ فی العشاء، حدیث: ۷۶۹، وصحیح مسلم، الصلاۃ، باب القراءۃ فی العشاء، حدیث: ۴۶۴۔

دن بھر کے تھکے ہوئے کو لمبی قراءت سے ملال ہوا) ہادی عالم ﷺ نے سیدنا معاذؓ سے کہا: تو لوگوں کو نفرت دلاتا ہے اور فتنہ کھڑا کرتا ہے۔ آپ ﷺ نے تین مرتبہ یہ بات دہرائی۔ پھر فرمایا: جب تم جماعت کراؤ تو والشمس وضحھا اور واللیل اذا یغشیٰ اور سبح اسم ربک الاعلیٰ کی تلاوت کرو۔ اس لئے کہ تیرے پیچھے بوڑھے، کمزور اور ضرورت مند بھی نماز ادا کرتے ہیں [1]۔

اس حدیث سے عشاء کی نماز کی قراءت بھی معلوم ہوئی اور ساتھ ہی اس حدیث نے نماز کے اماموں کو بھی متنبہ کر دیا ہے کہ وہ نماز پڑھاتے وقت مقتدیوں کے حالات کے پیش نظر تخفیف کرنا رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔

مختلف آیات کا جواب:

ہمارے ہاں یہ رواج ہے کہ امام جب بعض مخصوص آیات کی تلاوت کرتا ہے تو وہ اور بعض مقتدی، نماز میں باآواز بلند ان کا جواب دیتے ہیں۔ یہ درست نہیں ہے کیونکہ اس بارے میں کوئی صحیح صریح روایت نہیں ہے۔ ہاں بعض آیات کی تلاوت کے بعد امام یا منفرد قاری اپنے طور پر ان کا جواب دے تو جائز ہے، چنانچہ سیدنا حذیفہؓ رسول اللہ ﷺ کی نماز تہجد کی کیفیت بیان کرتے ہیں کہ جب آپ تسبیح والی آیت پڑھتے تو تسبیح کرتے جب سوال والی آیت تلاوت کرتے تو سوال کرتے اور جب تعوذ والی آیت پڑھتے تو اللہ کی پناہ پکڑتے [2]۔

سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھنے والے کا اس کے بعد جواباً سبحان ربی الاعلیٰ کہنا صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے [3]۔

---

[1] صحیح البخاری، الاذان، باب من شکا امامہ اذا طول، حدیث: ۷۰۷، وصحیح مسلم، الصلاۃ، باب القراءۃ فی العشاء، حدیث: ۴۶۵۔

[2] صحیح مسلم، صلاۃ المسافرین، باب استحباب تطویل القراءۃ فی صلاۃ اللیل، حدیث: 772۔

[3] ابو داؤد مقدار الرکوع والسجود حدیث 58

سورۃ غاشیہ کے اختتام پر " اللهم حاسبنى حسابا يسيرا " کہنا ثابت نہیں۔

نماز میں شیطانی وسوسے کا علاج:

سیدنا عثمان بن ابو العاصؓ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول! شیطان میرے درمیان اور میری نماز اور قراءت کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور قراءت میں التباس پیدا کرتا ہے۔آپ نے فرمایا: اس شیطان کا نام خنزب ہے جب تو اسے محسوس کرے تو اعوذ باللہ کے پورے کلمات پڑھو اور بائیں جانب تین بار تھتکارو (تھوکو، یعنی تھو تھو کرو۔

سیدنا عثمان بن ابو العاصؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایسے ہی کیا تو اللہ نے اسے شیطان کو مجھ سے دور کر دیا[1]۔

دوران نماز میں کوئی سوچ آنے پر نماز باطل نہی ہوتی۔ سیدنا عقبہ بن حارثؓ فرماتے ہیں کہ میں نے مدینے میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز عصر پڑھی۔ نماز کے بعد آپ فورا کھڑے ہو گئے اور دگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے ازواج مطہرات میں سے کسی کے پاس تشریف لے گئے، لوگ پریشان ہو گئے، پھر واپس تشریف لائے، صحابہؓ کے چہروں پر تعجب کے آثار دیکھ کر فرمایا: مجھے نماز کے دوران میں یاد آیا کہ ہمارے گھر میں کچھ سونا رکھا ہوا ہے اور مجھے ایک دن یا ایک رات کے لئے بھی اپنے گھر میں سونا رکھنا پسند نہیں، لہٰذا میں نے اسے تقسیم کرنے کا حکم دیا[2]۔

نماز میں رونا:

سیدنا عبد اللہ بن شخیرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا۔ نماز میں رونے کی وجہ سے آپ کے سینے سے چکی کے چلنے کی سی آواز آ رہی تھی[3]۔

---

[1] صحیح مسلم، السلام، باب التعوذ من شیطان الوسوسۃ فی الصلاۃ، حدیث: 2203۔

[2] صحیح البخاری، الاذان، باب من صلی بالناس فذکر حاجتہفتخطاھم، حدیث: 851۔

صحیح سنن ابی داؤد، الصلاۃ، باب البکاء فی الصلاہ، حدیث: 904، وسندہ صحیح، وسنن النسائی، السھو، باب البکا فی الصلاۃ [3]، حدیث: 1215۔ امام ابن حبان نے الموارد، حدیث: 522 میں اسے صحیح قرار دیا ہے

رکوع کا بیان:

رکوع میں جاتے وقت اللہ اکبر کہہ کر دونوں ہاتھ کندھوں (یا کانوں) تک اٹھائیں۔

جیسا کہ سیدنا ابن عمرؓ کا فرمان ہے۔

کان یرفع یدیه حذو منکبیه اذا افتتح الصلاة و اذا کبر للرکوع

نبی اکرم ﷺ جب نماز شروع کرتے اور جب رکوع کے لئے تکبیر کہتے تو اپنے دونوں ہاتھ کاندھوں تک اٹھاتے تھے[1]۔[2]

رکوع میں پیٹھ بالکل سیدھی رکھیں اور سر کو پیٹھ کے برابر، یعنی سر نہ تو اونچا ہو اور نہ نیچا اور دونوں ہاتھوں کو ہتھیلیاں دونوں گھٹنوں پر رکھیں[3]۔

دونوں ہاتھ سے بازؤں کو تان کر رکھیں، ذرا سا خم نہ ہو، گھٹنوں کو مضبوط تھامیں[4]۔

رکوع کی حالت میں نبی اکرم ﷺ کی ہتھیلیاں آپ کے گھٹنوں پر یوں رکھی ہوتی تھیں۔ جیسا کہ آپ نے گھٹنوں کو پکڑا ہوا ہو[5]۔

رکوع کی حالت میں نبی اکرم ﷺ اپنی کہنیوں کو پہلوؤں سے دور رکھتے تھے[6]۔

---

[1] بخاری باب رفع الیدین فی التکبیر الاولی مع الافتتاح سواء حدیث 735'736'738' مسلم باب استحباب رفع الیدین حذو المنکبین حدیث 390

[2] (حاشیہ مسلم ج: 1/ص: 168) باقی اس حدیث پر بحث گزر چکی ہے۔

[3] مسلم باب الاعتدال فی السجود حدیث 498

[4] ابو داؤد افتتاح الصلاۃ حدیث 731

[5] حوالہ سابق حدیث 734

[6] ترمذی باب ماجاء انه یجافي یدیه عن جنبیه في الرکوع حدیث 260

رکوع کی دعائیں:

سیدنا حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رکوع میں فرماتے:

سبحان ربی العظیم

میرا رب عظیم ہر عیب سے پاک ہے[1]۔

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں: ﴾

نبی اکرم ﷺ رکوع میں یہ دعا بھی پڑھتے تھے۔

سبحانک وبحمدک لا الہ الا انت

اے اللہ! تیرے ہی لئے پاکی اور تعریف ہے، تیرے سوا کوئی سچا معبود نہیں ہے[2]۔[3]

سیدہ عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ اپنے رکوع میں اکثر کہتے تھے۔

سبحانک اللھم ربنا وبحمدک اللھم اغفرلی4

اے ہمارے پروردگار اللہ! تو پاک ہے، ہم تیری تعریف بیان کرتے ہیں۔ یاالٰہی! مجھے بخش دے[5]۔

سیدہ عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ اپنے رکوع اور سجدے میں کہتے تھے:

سبوح قدوس رب الملائکۃ والروح

فرشتوں اور روح جبریل کا پروردگار نہایت پاک ہے[6]۔

سبحان ذی الجبروت والملکوت والکبریاء والعظمۃ

---

[1] مسلم باب تطویل القراءت في صلاۃ اللیل حدیث772

[2] مسلم باب مایقال في الرکوع والسجود حدیث485

[3] **تبصرہ:** یہ دعا آپ ﷺ کی رات کی نفل نماز کی تھی اس کو کس دلیل سے عام قرار دے رہے ہیں؟۔

[4] **تبصرہ:** یہ الفاظ مسلم شریف میں ہم کو نہیں ملے جبکہ نماز نبوی والے نے حوالہ دیا ہے۔

[5] بخاري الدعا في الرکوع حدیث794'817'4293'4967'

[6] مسلم باب مایقال فی الورکوع والسجود حدیث487

قہر (غلبے) بادشاہی، بڑائی اور بزرگی کا مالک اللہ (نہایت ہی پاک ہے[1]۔
سیدنا علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رکوع میں پڑھتے۔

اللھم لک رکعت وبک امنت ولک اسلمت خشع سمعی وبصری ومخی وعظمی وعصبی

اے اللہ! میں تیرے آگے جھک گیا، تجھ پر ایمان لایا، تیرا فرمانبردار ہوا، میرا کان، میری آنکھ، میرا مغز، میری ہڈی اور میرے پٹھے تیرے آگے عاجز بن گئے[2]۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

اطمینان، نماز کا رکن ہے:

سیدنا ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا، رسول اللہ ﷺ مسجد کے ایک کونے میں تشریف فرما تھے۔ اس شخص نے نماز پڑھی اور رکوع، سجود، قومے اور جلسے کی رعایت نہ کی اور جلدی جلدی نماز پڑھ کر) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کو سلام کیا۔ آپ نے فرمایا: وعلیکم السلام واپس جا کر پھر نماز پڑھ، اس لئے کہ تو نے نماز نہیں پڑھی۔ وہ گیا، پھر نماز پڑھی (جس طرح پہلے بے قاعدہ پڑھی تھی)۔ پھر آیا اور سلام کیا، آپ نے پھر فرمایا: وعلیکم السلام جا، پھر نماز پڑھ کیونکہ تو نے نماز نہیں پڑھی۔ اس شخص نے تیسری یا چوتھی بار (بے قاعدہ) نماز پڑھنے کے بعد کہا: آپ مجھے (نماز پڑھنے کا صحیح طریقہ) سکھا دیں تو آپ نے فرمایا: جب تو نماز کے ارادے سے اٹھے تو پہلے خوب اچھی طرح وضو کر، پھر قبلہ رخ کھڑا ہو کر تکبیر تحریمہ کہہ، پھر قرآن مجید میں سے جو تیرے لئے آسان ہو پڑھ، پھر رکوع کر یہاں تک کہ اطمینان سے رکوع پورا کر، پھر رکوع سے سر اٹھا یا یہاں تک کہ قومے میں سیدھا کھڑا ہو جا، پھر سجدہ کر یہاں تک کہ اطمینان سے سجدہ مکمل کر، پھر اطمینان سے اپنا سر اٹھا اور

---

[1] ابو داؤد باب مایقول الرجل فی رکوعھو سجودھحدیث 873

[2] مسلم باب الدعاء فی اصلاۃاللیل وقیامھحدیث 771

جلسے میں بیٹھ جا، پھر سجدہ کر یہاں تک کہ اطمینان سے سجدہ پورا کر، پھر سجدے سے اپنا سر اٹھا اور دوسری رکعت کے لئے سیدھا کھڑا ہو جا، پھر اس طرح اپنی تمام نماز پوری کر[1]۔

تبصرہ:

ہم تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ قارئین کرام پہلے یہ سمجھیں کہ اس حدیث کی فرائض ,ارکان او رواجبات میں کیا حیثیت ہے۔ان حضرات کے امام علامہ شوکانی فرماتے ہیں" واجبات نماز کے سلسلے میں حدیث مسئ کا متعین ہونا ثابت شدہ امر ہے یعنی جو اس حدیث میں ہے وہی واجب ہے۔ فقہاکے نزدیک یہ ثابت شدہ امر ہے کہ جو کچھ اس حدیث میں ہے وہ واجب ہے اور جس کو آپ ﷺ نے بیان نہیں فرمایا وہ واجب نہیں { نیل الاوطار ابواب صفة الصلوة باب افتراض افتتاحها بالتكبير ,باب السجدة الثانية ولزوم الطمانية فى الركوع ,بحواله تحفة المناظر }۔ان ہی کے ایک اور امام علامہ امیر یمانی فرماتے ہیں" اس حدیث میں جس چیز کا ذکر نہیں وہ واجب بھی نہیں۔یہ استدلال اس لئے کرتے ہیں کہ یہ مقام نماز کی واجبات کے تعلیم کا مقام ہے۔ اگر بعض واجبات کو چھوڑا جاتا تو اس میں باجود حاجت کے بیان کو مؤخر کرنا لازم آتا ہے جو کہ بالاجماع جائز نہیں { سبل السلام باب صفة الصلوة بحواله تحفةالمناظر }۔ قارئین کرام ! یہ بات تو مسلم ہے کہ یہ مقام تعلیم واجبات کا ہے جیسا کہ غیر مقلد علما بھی اس کو تسلیم کیا ہے۔اس مقام پر آپ ﷺ نے نہ تو فع یدین سکھایا نہ امام کے پیچھے فاتحہ کو متعین کیا اور نہ ہی جلسہ استراحت { دونوں سجدوں سے اٹھنے کے بعد } سکھایا ہے۔اگر یہ فرض یا واجب ہوتے تو آپ ﷺ ضرور سکھاتے ورنہ تو نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ آپ ﷺ پر تبلیغ دین میں سستی اور مداہنت کا الزام لازم آئے گا جو کہ باطل ہے۔تو معلوم ہوا کہ رفع یدین ,سورۃ فاتحہ اور جلسہ استراحت فرض ولازم نہیں۔جو لوگ ان کو فرض یا واجب کہتے ہیں وہ نعوذ باللہ آپ ﷺ پر خفیہ پیرائے میں مذکورہ بالا الزام ڈالنا چاہتے ہیں۔

---

[1] بخاری باب امر النبی صلی اللهعليه وسلم الذي لايتم ركوعه باالاعادةحديث 793 مسلم باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة حديث 397

اس حدیث میں جس نمازی کا ذکر ہے وہ رکوع اور سجود بہت جلدی جلدی کرتا تھا، قومہ اور جلسہ اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر نہیں کرتا تھا، رسول اللہ ﷺ نے ہر بار اسے فرمایا کہ پھر نماز پڑھ کیونکہ تو نے نماز پڑھی ہی نہیں۔آپ نے ان ارکان کی ادائیگی میں عدم اطمینان کو نماز کے باطل ہونے کا سبب قرار دیا ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں: ﴾

سیدنا ابو مسعود انصاریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آدمی کی نماز قبول نہیں ہوتی جب تک رکوع اور سجدے میں اپنی پیٹھ درست نہ رکھے[1]۔

تبصرہ:

ہم غیر مقلد احباب کی ذکر کردہ روایت تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں ابو داؤد کی اس حدیث کی سند میں امام شعبہ ہے ،جس کو مرحوم علی زئی صاحب نے { تسہیل الوصول ص: 159 } وہم کا مریض کہہ کر اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔اور دوسرا حوالہ ترمذی کا دیا ہے اور اس کو بھی صحیح کہا ہے۔جبکہ ترمذی کے سند میں دو مدلسین ہیں اور دونوں عن سے روایت کرتے ہیں ایک امام اعمش اور دوسرے ابو معاویہ {جزء قرات ص: 92 }۔ان دونوں کو ایک ہی سانس میں مدلس قرار دیا ہیں اور ان کے عنعنہ کو ضعیف کہا ہے۔لیکن یہاں ان کی حدیث کو صحیح کہا گیا۔ { فیاللعجب }

﴿ غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں: ﴾

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ شرابی' زانی اور چور کے متعلق تمہارا کیا گمان ہے { یعنی ان گناہ کتنا ہے } صحابہ نے کہا اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ گناہ کبیرہ ہیں اور ان میں سزا بہت ہے۔اور { کان کھول کر } سنو بہت بری چوری

[1] صحيح ابى داؤد باب صلاة من لا يقيم صلبه في الركوع والسجود حديث 855 نسائي 3 /183 و 214 ترمذي من لا يقيم صلبه في الركوع والسجود حديث 265

اس آدمی کی ہے جو اپنی نماز میں چوری کرتا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا وہ کس طرح؟ فرمایا: جو نماز کا رکوع اور سجدہ پورا نہ کرے وہ نماز میں چور کرتا ہے[1]۔

اللہ اکبر! کس قدر خوف کا مقام ہے، آہ! ہماری غیر مسنون نمازوں کا کیا حشر ہو گا۔ ہمیں نماز کو تکبیر اولیٰ سے لے کر سلام پھیرے تک مسنون طریقے سے ادا کرنا چاہئے۔

سیدنا ابو بکرؓ ۃ سے روایت ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نماز میں شامل ہوئے، اسوقت آپ رکوع میں تھے۔ سیدنا ابو بکرؓ نے صف میں پہنچے سے پہلے ہی رکوع کر لیا اور اسی حالت میں چل کر صف میں پہنچے۔ نبی اکرم ﷺ کو یہ بات بتائی گئی تو آپ نے فرمایا: اللہ تیرا شوق زیادہ کرے، آئندہ ایسا نہ کرنا[2]۔[3]

قومے کا بیان:

رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے رفع الیدین کرتے ہوئے سیدھے کھڑے ہو جائیں۔

(بخاری و مسلم، اس کی تخریج تفصیل سے گزر چکی ہے)

اگر آپ امام یا منفرد ہیں تو رکوع سے قومے کے لئے کھڑے ہوتے وقت یہ پڑھیں:

سمع اللہ لمن حمدہ

اللہ نے اس کی سن لی جس نے اس کی تعریف کی[4]۔

اگر مقتدی ہیں تو یہ کہیں: ربنا ولک الحمد حمدا کثیرا طیبا مبارکا فیہ

اے ہمارے رب! تیرے ہی واسطے تعریف ہے، بہت زیادہ، پاکیزہ اور بابرکت تعریف[1]۔

---

[1] موطا امام مالک 167/1 باب العمل فی جامع الصلاۃ ابن حبان والسنن الکبری للبیہقی 209/8، 210

[2] بخاري باب اذا رکع دون الصف حدیث 783

[3] تبصرہ: رکوع میں جاتے ہوئے اور اٹھتے ہوئے رفع یدین نہیں کرنا ہے اس پر ہماری (اہل سنت والجماعت) طرف سے تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔

[4] بخاری باب فضل اللهم ربنا لک الحمد حدیث 796 مسلم باب ما یقول اذا رفع رأسہ من الرکوع حدیث 476

یہ قصہ سیدنا رفاعہ بن رافعؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پیچھے ایک دن نماز پڑھ رہے تھے، جب آپ نے رکوع سے سر اٹھایا تو فرمایا: سمع اللہ لمن حمدہ پس ایک مقتدی نے کہا: ربنا ولک الحمد حمدا کثیرا طیبا مبارکا فیہ پھر جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: بولنے والا کون تھا؟ کس نے یہ کلمے پڑھے ہیں؟) ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے تیس سے زائد فرشتے دیکھے جو ان کلمات کا ثواب لکھنے میں جلدی کر رہے تھے۔[1]

سیدنا عبد اللہ بن ابی اوفیٰؓ روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ رکوع سے اٹھتے تو قومے میں یہ دعا پڑھتے:

سمع اللہ لمن حمدہ۔ اللھم ربنا لک الحمد ملء السموات وملء الارض وما بینھما وملء ما شئت من شیء بعد

اللہ نے سن لی اس بندے کی بات جس نے اس کی تعریف کی، اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! تیرے ہی لئے ساری تعریف ہے آسمانوں کے بھراؤ کے برابر، زمین کے بھراؤ کے برابر اور ہر چیز کے بھراؤ کے برابر جو چاہے[2]۔

سیدنا ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب رکوع سے اپنا سر اٹھاتے تو یہ دعا پڑھتے:

ربنا لک الحمد ملء السموات وملء الارض وملء ما شئت من شیء بعد، اھل الثناء والمجد، احق ما قال العبد وکلنا لک عبد، اللھم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا ینفع ذا الجد منک الجد

اے ہمارے پروردگار! ہر قسم کی تعریف صرف تیرے لئے ہے آسمانوں کے بھراؤ کے برابر اور زمین کے بھراؤ کے برابر اور ہر اس چیز کے بھراؤ کے برابر جو

[1] بخاري باب 126 حدیث 799

[2] مسلم باب مایقول اذا رفع رأسه من الرکوع حدیث 476

تو چاہے اور اسے تعریف و بزرگی والے ! بندے نے جو تیری تعریف اور بزرگی کی وہ تیرے ہی لائق ہے اور ہم سب تیرے ہی بندے ہیں ، اے اللہ ! کوئی روکنے والا نہیں اس چیز کو جو تو نے دی اور کوئی دینے والا نہیں اس چیز کو جو تو نے روک دی اور دولت مند (حاجت نصیب) کو یہ نصیب اور دولت مندی تیرے عذاب سے نہیں بچا سکتی[1]۔

نیز رسول اللہ ﷺ قومے میں کبھی یہ دعا بھی فرماتے :

اللھم ربنا لک الحمد ملء السموات وملء الارض وملء ما شئت من شیء بعد اللھم طھرلی بالثلج والبرد والماء البارد اللھم طھر لی من الذنوب والخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الوسخ

اے اللہ ! تیرے ہی لئے ساری تعریف ہے آسمانوں کے بھراؤ کے برابر اور زمین کے بھراؤ کے برابر اور ہر اس چیز کے بھراؤ کے برابر جو تو چاہے ، اے اللہ ! مجھے برف ، اولے اور ٹھنڈے پانی کے ساتھ پاک کر دے ، اے اللہ ! مجھے گناہوں اور خطاؤں سے ایسے پاک کر دے جس طرح سفید کپڑا میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے[2]۔

بہت سے لوگوں کو قومے کا علم نہیں کہ یہ کیا ہے۔ واضح ہو کہ رکوع سے اٹھنے کے بعد اطمینان سے سیدھا کھڑا رہنے کو قومہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ رکوع سے سر اٹھا کر سیدھے کھڑے رہتے اور بڑے اطمینان سے قومے کی دعا پڑھتے تھے۔

---

[1] مسلم باب مایقول اذا رفع رأسه من الرکوع حدیث 477

[2] مسلم حوالہ سابقہ حدیث 476

سیدنا براءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا رکوع اور سجدہ اور دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا اور رکوع سے (اٹھ کر قومے میں کھڑا ہونا برابر ہوتا تھا، سوائے قیام کے اور تشہد بیٹھنے کے یہ چاروں چیزیں: رکوع، سجدہ، جلسہ اور قومہ طوالت میں تقریبا برابر ہوتی تھیں[1]۔)

بعض اوقات آپ ﷺ کا قومہ بڑا لمبا ہوتا تھا۔ انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ اس قدر لمبا قومہ کرتے کہ ہم کہتے کہ آپ بھول گئے ہیں[2]۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

سجدے کے احکام:

1 : ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اذا سجد احدکم فلا یبرک کما یبرک البعیر ولیضع یدیه قبل رکبتیه

1جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو اونٹ کی طرح نہ بیٹھے بلکہ اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں سے پہلے رکھے[3]۔

سیدنا ابن عمرؓ کی درج ذیل حدیث اس پر شاہد ہے:

نافعؒ روایت کرتے ہیں کہ سیدنا ابن عمرؓ اپنے ہاتھ گھٹنوں سے پہلے رکھتے اور فرماتے کہ رسول اللہ ﷺ ایسا ہی کرتے تھے[4]۔

---

[1] بخاري باب حد اتمام الركوع والاعتدال فيه حديث796 مسلم باب اعتدال اركان الصلاة وتخفيفهافي تمام حديث471

[2] مسلم باب اعتدال اركان الصلاة وتخفيفهافي تمام حديث473

[3] ابو داؤد كيف يضع ركبتيه قبل يديه حديث740

[4] ابن خزيمه /319 حديث 627 مستدرك 226/1

گھٹنوں سے پہلے ہاتھ رکھنے کو امام اوزاعی، مالک، احمد بن حنبل اور شیخ احمد شاکرؒ وغیرھم نے اختیار کیا ہے۔ ابن ابو داؤد نے بھی کہا: میرا رجحان حدیث سیدنا ابن عمرؓ کی طرف ہے کیونکہ اس بارے میں صحابہ اور تابعین سے بہت سی روایات ہیں۔

تبصرہ:

ہم (اہل سنت) تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ کی مذکورہ بالا روایت جس سے استدلال کیا گیا ہے۔ یہ چند وجوہ کی بناپر قابل استدلال نہیں۔

1 : حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کا اول آخر کے خلاف ہے۔ کیونکہ اول حصہ میں انٹ کی طرح بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔ اور یہ بات ہر کس وناکس جانتا ہے کہ اونٹ جب بیٹھتا ہے تو پہلے اپنے ہاتھوں {اگلے گھٹنوں} کو زمین پر رکھتا ہے جبکہ حدیث کے آخر میں ہاتھ پہلے رکھنے کا حکم ہے۔ یہ تعارض ہے اور اس تعارض کو دور کرنے کے لئے دوسری روایات کی طرف رجوع کریں گے۔ اور دوسری روایت میں وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ پہلے گھٹنے رکھے پھر ہاتھ رکھے۔

2 : اس روایت کے ایک روای محمد بن عبد اللہ بن حسن کا سماع ابوالزناد سے مشکوک ہے۔ اس روایت کے دوسرے طرق امام ترمذی بھی ضعیف کہا ہے۔

3 :علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ اس روایت میں کسی راوی سے قلب ہوا ہے اصل میں یہ تھا اونٹ کی طرح نہ بیٹھو۔ ولکن یضع رکبتیہ قبل یدیہ راوی سے قلب ہوا تو اس نے یو کہہ دیا ولکن یضع یدیه قبل رکبتیه .

4 : علامہ ابن قیم اس بات کی تائید اس حدیث بھی ہوتی ہے کہ حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں: کہ جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو گھٹنوں سے شروع کرے یعنی پہلے گھٹنے رکھے پھر ہاتھ {شرح معانی الاثار باب مایبدابوضعہ فی السجود الیدین اوالرکبتین } {مصنف ابن ابی شیبہ حدیث 2702}۔ نیز شرح معانی الاآثار کے اسی باب میں حضرت ابوہریرہ آپ ﷺ کا عمل نقل کرتے

ہوئے کہتے ہیں کہ آپ ﷺ پہلے گھٹنے رکھتے تھے۔ یہ دونوں احادیث اس بات کی وضح دلیل ہیں کہ ان حضرات کی نقل کردہ روایت میں کسی راوی سے ضرور قلب ہوا ہے۔

5 : علامہ خطابی، علامہ بغوی، ابن سید الناس وغیرہ ان محدثین نے کہا ہے کہ وائل بن حجر کی روایت { جس میں ہے کہ آپ ﷺ پہلے گھٹنے رکھتے تھے پھر ہاتھ } ابوہریرہ کی اس روایت سے { جس میں ہاتھوں کو پہلے رکھنے کا حکم ہے } زیادہ قوی اور صحیح ہے { بحوالہ شرح ترمذی معارف السنن للیوسف بنوری }۔

6 : اس سے پہلے رفع یدین کے مسئلے یہ حضرات خود تسلیم کرچکے ہیں کہ وائل بن حجر آنخضرت ﷺ کے آخری عمر میں آئے تھے۔ اور وائل بن حجر کی حدیث سے استدلال کیا تھا کہ آنخضرت ﷺ کا آخری عمل رفع یدین کا ہے۔ تو آپ ہی کے اصول کے مطابق آنخضرت ﷺ کا آخری عمل وضع الرکبتین قبل الیدین کا ہے۔ جبکہ وائل بن حجر کی روایت ابوہریرہ کی روایت کے مقابلے میں اصح بھی ہے (اس پہلے ہم ابوداوُد کے حوالے سے ذکر کرچکے ہیں کہ وائل بن حجرؓ دوبارہ بھی آئے تھے۔

7 : جمہور علمائے امت وئل بن حجر کی روایت کو ترجیح دی ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اکثر اہل علم نے اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔

تبصرہ ب:

محققین حضرات نے عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کی تصحیح ابن خزیمہ سے کی ہے جو کہ غلط ہے۔ کیونکہ ابن خزیمہ نے ابن عمر کی روایت کو منسوخ کہا ہے۔ امام ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر یہ حدیث منسوخ ہے اور بن عمر اس حدیث سے استدلال کرنے والے غلطی پر ہیں۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ حضرت ابن عمر کا اپنا عمل گھٹنوں کو ہاتھوں سے پہلے رکھنے کا ہے { مصنف ابن ابی شیبہ حدیث 2705 }۔ نیز سیدنا عبداللہ بن عمر سے ان کے والد خلیفہ راشد حضرت عمر فاروق کے طریقہ نماز کو زیادہ جاننے ولے تھے کہ وہ آپ ﷺ کے پیچھے بالکل برابر میں کھڑے ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے حضرت عمر کا اپنا عمل گھٹنوں کو ہاتھوں سے پہلے رکھنے کا ہے { مصنف ابن ابی شیبہ حدیث 2703,2704 }۔

﴿ غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں : ﴾

2 : سجدے میں پیشانی اور ناک زمین پر ٹکائیں[1]۔

3 : سجدے میں دونوں ہاتھ کندھوں کے برابر رکھیں[2]۔

4 : سجدے میں دونوں ہاتھ کانوں کے برابر رکھنا درست ہے[3]۔[4]

5 : سجدے میں دونوں ہتھیلیاں اور دونوں گھٹنے زمین پر خوب ٹکائیں[5]۔

6: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اس شخص کی نماز نہیں جس کی ناک پیشانی کی طرح زمین پر نہیں لگتی[6]۔[7]

لگتی[6]۔[7]

7 : پاؤں کی انگلیوں کے سرے قبلے کی طرف مڑے ہوئے رکھیں اور دونوں قدم بھی کھڑے رکھیں[8]۔

رکھیں[8]۔

8 : ایڑیوں کو ملائیں[9]۔

---

[1] بخاري باب السجود علي الانف حديث812مسلم باب اعضاء السجود والنهي عن كف الشعر حديث490

[2] ابو داؤد باب افتتاح الصلاة حديث 734

[3] ابو داؤد باب رفع اليدين في الصلاة حديث726

[4] تبصرہ: ابوداؤد میں ایسی کوئی حدیث اس مقام پر نہیں جس میں یہ مضمون ہے۔ یہ غلط نسبت ہے۔

[5] ابو داؤد باب صلاة من لا يقيم صلبه في الركوع والسجود حديث859

[6] دار قطني 348/1

[7] تبصرہ: یہ حدیث دار قطنی میں اس باب کی تیسری حدیث ہے۔ اس حدیث کے آخر میں امام دار قطنی لکھتے ہیں { جو کو مرحوم علی زئی صاحب کے نزدیک معتبر محدث ہے موطا ص: 55 } کہ والصوب عن عکرمۃ مرسلا یعنی صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے۔ اور مرسل ان حضرات کے نزدیک ضعیف ہے { نور العینین ص: 60 }۔

[8] بخاری باب سنۃ الجلوس فی التشهد حدیث828

[9] بیہقی 116/6

9 : سجدے میں سینہ، پیٹ اور رانیں زمین سے اونچی رکھیں، پیٹ کو رانوں سے اور رانوں کو پنڈلیوں سے جدا رکھیں اور دونوں رانیں بھی ایک دوسرے سے الگ الگ رکھیں[1]۔[2]

10 : سجدے میں کہنیاں نہ تو زمین پر ٹکائیں اور نہ کروٹوں سے ملائیں (بلکہ زمین سے اونچی، کروٹوں سے الگ، کشادہ رکھیں)[3]۔[4]

11 : سجدے کی حالت میں نبی اکرم ﷺ اپنے بازوؤں کو زمین پر نہیں لگاتے تھے بلکہ انہیں اٹھا کر رکھتے اور پہلوؤں سے دور رکھتے یہاں تک کہ پچھلی جانب سے دونوں بغلوں کی سفیدی نظر آتی تھی[5]۔

12 : رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سات ہڈیوں پر سجدہ کروں پیشانی، دونوں ہاتھوں، دونوں قدموں کے پنجوں پر اور یہ کہ ہم نماز میں اپنے کپڑوں اور بالون کو اکٹھا نہ کریں[6]۔

ہر مسلمان بہن بھائی کے لئے ضروری ہے کہ وہ سجدے میں ان سات اعضاء کو خوب اچھی طرح مکمل طور پر زمین پر ٹکا کر رکھے اور اطمینان سے سجدہ کرے۔

﴿ غیر مقلد احباب عناوین ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

نماز نبوی: تکبیر اولیٰ سے سلام تک

---

[1] ابو داؤد باب افتتاح الصلاۃ حدیث730 ترمذی باب ماجاء فی وصف الصلاۃ حدیث304

[2] **تبصرہ:** اس عبارت میں جتنے مسائل ہیں۔ ان مسائل میں سے مذکورہ حدیثوں کے اندر ایک مسئلہ بھی مذکور نہیں۔ ہاں ان احادیث میں جو مسئلہ مذکور ہے وہ صرف یہ ہے کہ "آپ ﷺ دونوں ہاتھوں کو پہلوؤں سے جدا رکھتے۔ یہ سب ابو داؤد اور ترمذی کی طرف نماز نبوی والوں کی غلط نسبت ہے۔

[3] بخاری باب سنة الجلوس فی التشھد حدیث 868

[4] **تبصرہ:** بالکل غلط بخاری کے مذکورہ باب میں ایسی کوئی حدیث نہیں ہے جس میں یہ مسئلہ مذکور ہو۔ البتہ تشہد میں بیٹھنے کا طریقہ کا طریقہ مذکور ہے۔

[5] بخاری باب لا یفترش ذراعیهفی السجود حدیث822 مسلم باب الاعتدال فی السجود حدیث493

[6] بخاری باب السجود علی الانف حدیث812 مسلم باب اعضاء السجود حدیث490

گیارہ صحابہ کرام کی شہادت:

سیدنا ابو حمید ساعدیؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے دس صحابہؓ کی جماعت میں کہا کہ میں تم سب سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ نماز جانتا ہوں۔ صحابہ کرامؓ نے کہا؛ وہ کیسے ،نہ تو تم آپ ﷺ کے پاس زیادہ آتے رہے ہو اور نہ ہم سے زیادہ آپ کی صحبت میں رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں (واقعی صورتحال تو یہی ہے)۔ یہ سن کر صحابہ کرامؓ نے ان سے کہا: پھر (ہمارے روبرو رسول اللہ ﷺ کی نماز بیان کرو۔ سیدنا ابو حمیدؓ نے کہا: جب رسول اللہ ﷺ نماز کھڑے ہوتے تو اپنے دونوں ہاتھ کندھوں کے برابر اٹھاتے، پھر تکبیر (تحریمہ) کہتے، پھر قرآن پڑھتے ، پھر (رکوع کے لئے) تکبیر کہتے اور اپنے دونوں ہاتھ کندھوں کے برابر اٹھاتے ، پھر رکوع کرتے اور اپنی ہتھیلیاں اپنے گھٹنوں پر رکھتے ، پھر (رکوع کے دوران) کمر سیدھی کرتے ، پس نہ اپنا سر جھکاتے اور نہ بلند کرتے۔ (پیٹھ اور سر ہموار رکھتے)۔ اور پھر اپنا سر رکوع سے اٹھاتے تو کہتے سمع اللہ لمن حمدہ ، پھر اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے یہاں تک انہیں اپنے کندھوں کے برابر کرتے اور (قومے میں اطمینان سے) سیدھے کھڑے ہو جاتے اور اللہ اکبر کہتے ، پھر زمین کی طرف سجدے کے لئے جھکتے ، پس اپنے دونوں ہاتھ (بازو) اور پہلو رانوں (اور زمین) سے دور رکھتے اور اپنے دونوں پاؤں کی انگلیاں کھولتے (اس طرح کہ انگلیوں کے سر قبلہ رخ ہوتے) پھر اپنا سر سجدے سے اٹھاتے اور اپنا بایاں پاؤں موڑتے (بچھا لیتے)، پھر اس پر بیٹھتے اور سیدھے ہوتے یہاں تک کہ ہر ہڈی اپنی جگہ پر آ جاتی (بڑے اطمینان سے جلسہ میں بیٹھتے) پھر دوسرا سجدہ کرتے ، پھر اللہ اکبر کہتے اور اٹھتے اور اپنا بایاں پاؤں موڑتے ، پھر اس پر بیٹھتے اور دل جمعی سے اعتدال کرتے یہاں تک کہ ہر ہڈی اپنے ٹھکانے پر آ جاتی (اطمینان سے جلسہ استراحت میں بیٹھتے)، پھر (دوسری رکعت کے لئے) کھڑے ہوتے ، پھر اسی طرح دوسری رکعت میں کرتے، پھر جب دو رکعت پڑھ کر کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہتے اور اپنے دونوں ہاتھ کندھوں کے برابر اٹھاتے ، جیسے نماز کے شروع میں تکبیر اولیٰ کے وقت کیا تھا، پھر اسی طرح اپنی باقی نماز میں کرتے یہاں تک کہ جب سجدہ ہوتا جس کے بعد سلام (آخری رکعت کا دوسرا سجدہ جس کے بعد

بیٹھ کر تشہد، درود اور دعا پڑھ کر سلام پھیرتے ہیں) تو اپنا بایاں پاؤں (دائیں پنڈلی کے نیچے سے) باہر نکالتے اور بائیں جانب کولہے (سرین) پر بیٹھتے پھر سلام پھیرتے۔ یہ سن کر ان صحابہ کرامؓ نے کہا: اے ابو حمید ساعدی! تو نے سچ کہا: رسول اللہ ﷺ اسی طرح نماز پڑھا کرتے تھے[1]۔

تبصرہ:

اس روایت کو دیکھنے پڑھنے کے بعد ہمارا تبصرہ بھی دیکھ لیجئے سیدنا ابو حمید الساعدی سے مروی یہ روایت ترمذی اور ابو دوٗد کے علاوہ { صحیح بخاری کتاب الصلاۃ باب سنۃ الجلوس فی التشہد } میں بھی ہے ۔ ترمذی اور ابوداؤد کی اس روایت میں ایک راوی عبد الحمید بن جعفر ہے جو وہم کا مریض ہے اور اس روایت میں اس کو شدید وہم ہوا ہے ۔ اس وہم کو جاننے سے پہلے آپ ترمذی، ابوداؤد اور بخاری کی روایت میں تقابل دیکھیں تاکہ وہم سمجھنے میں آسانی ہو اور اس وہم کی بیماری کو چھپانے کے لئے بعض محققین کی لاجواب خیانت آشکارہ ہو جائے۔

حدیث بخاری:

دو سندوں کو ذکر کرنے کے بعد محمد بن عمرو بن عطاء نے بیان کیا ہے کہ وہ چند صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ نبی کریم ﷺ کی نماز کا ذکر چلا تو ابو حمید الساعدی نے کہا کہ مجھے نبی کریم ﷺ نماز (کی تفصیل) تم میں سے سب سے زیادہ معلوم ہے۔ میں آپ ﷺ کو دیکھا کہ جب تکبیر کہتے تو اپنے ہاتھوں کو مونڈوں تک لے جاتے، جب رکوع کرتے گھٹنوں کو اپنے ہاتھوں سے پوری طرح تھام لیتے اور پیٹھ جھکا دیتے اور پھر جب رکوع سے سر اٹھاتے تو اس طرح سیدھے کھڑے ہو جاتے کہ تمام جوڑ درست ہو جاتے، جب سجدہ کرتے تو اپنے ہاتھ (زمیں پر) اس طرح رکھتے تھے کہ نہ بالکل پھیلا ہوا ہوتا اور نہ سمٹا ہوا، پاؤں کی انگلیاں قبلے کی طرف رکھتے، جب دو رکعتوں کے بعد

[1] ابو داؤد باب افتتاح الصلاۃ حدیث 730 ' 963 ترمذي باب ماجاء في وصف الصلاۃ حدیث 304 اسے ابن حبان ترمذی اور نووی نے صحیح کہا ہے

بیٹھتے تو بائیں پاؤں پر بیٹھتے اور دایا کھڑا رکھتے اور جب آخری مرتبہ بیٹھتے بائیں پاؤں کو کھڑا کر دیتے پھر مقعد پر بیٹھتے۔

حدیث ترمذی و مفہوم ابوداؤد:

محمد بن عمرو بن عطاء ابو حمید الساعدی سے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں: کہ میں نے ابو حمید الساعدی کے کہتے ہوئے سنا اس وقت وہ دس صحابہ رضی اللہ عنہم میں بیٹھے ہوئے تھے جن میں "ابو قتادہ بن ربعی" بھی شامل تھے، کہ میں رسول اللہ ﷺ کے نماز کے متعلق تم سب سے زیادہ جانتا ہوں، صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا: تم نہ حضور اکرم کی صحبت میں ہم سے پہلے آئے اور نہ ہی حضور اکرم ﷺ کے ہاں زیادہ آمد و رفت تھی۔ ابو حمید الساعدی نے فرمایا یہ تو صحیح ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا: بیان کرو۔ ابو حمید الساعدی نے فرمایا: کہ رسول اکرم ﷺ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو سیدھے کھڑے ہوتے اور دونوں ہاتھ کندھوں تک لے جاتے اور اللہ اکبر کہہ کر رکوع کرتے اور اعتدال کے ساتھ رکوع کرتے نہ سر کو جھکاتے اور نہ ہی سر کو اونچا کرتے اور دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھتے پھر سمع اللہ لمن حمدہ کہہ ہاتھوں کو اٹھاتے اور معتدل کھڑے ہوتے یہاں تک ہر ہڈی اپنی جگہ تک پہنچ جاتی، پھر سجدے کے لئے زمین کی طرف جھکتے اور اللہ اکبر کہتے اور بازوں کو بغلوں سے جدا رکھتے اور پاؤں کی انگلیاں نرمی کے ساتھ قبلہ رخ کر دیتے پھر بایاں پاؤں موڑ کر اس پر اعتدال کے ساتھ بیٹھ جاتے یہاں تک ہر ہڈی اپنی جگہ تک پہنچ جاتی، پھر سجدے کے لئے سر جھکاتے اور اللہ اکبر کہتے اور پھر کھڑے ہوتے، یہاں تک کہ دونوں سجدوں سے اٹھتے تو تکبیر کہتے اور دونوں ہاتھ کندھوں کے برابر اٹھاتے جیسے کے نماز کے شروع میں کیا تھا، پھر اسی طرح کرتے یہاں تک کہ ان کی نماز کی آخری رکعت آجاتی، چنانچہ بائیں پاؤں کو لٹاتے اور کولہے پر تورک کے ساتھ بیٹھ جاتے اور سلام پھیر دیتے۔ ابوداؤد میں اضافہ ہے کہ یہ سن کر صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا تم نے سچ کہا رسول اللہ ﷺ اسی طرح نماز پڑھتے تھے۔

غیر مقلد بزرگوں نے حدیث کا صرف ترجمہ کرکے اس میں سے ابو قتادہ ربعی صحابی کا نام حذف کر دیا ہے اور اس طریقے سے بعض حضرات نے عوام کو میٹھا زہر دینے کی کوشش کی ہے۔ اور عنوان میں کئے ہوئے دعوے کو (گیارہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی شہادت) کو خود ریت کی دیوار ثابت کیا ہے۔ کیونکہ ابو قتادہ کے بغیر دس صحابہ رضی اللہ عنہم رہ جائیں گے۔

قارئین کرام! بخاری اور ترمذی وابوداؤد کی روایت میں فرق کو غور سے دیکھیں اور وہم کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

وہم کی تفصیل:

1 : عبد الحمید بن جعفر کو وہم ہوتا تھا اور خطا بھی ہوتی تھی۔ حافظ ابن حجر ان کے بارے میں یو فیصلہ کرتے ہیں" صدوق راوی ہے قدری تھا اس کو وہم بھی ہوتا تھا { تقریب التہذیب 554/1 قدیمی کتب خانہ کراچی } یہی بات صفی الرحمٰن مبارک پوری { تحفۃ الاحوذی 3 / 175 بحوالہ قرۃ العینین } میں بھی کرتے ہیں۔ علامہ زیلعی فرماتے ہیں "ظاہر بات یہی ہے کہ ان کو روایت میں غلطی ہوئی ہے . والظاہر انہ غلط فی ہذا الحدیث { نصب الرایہ 1 / 344 }۔ نیز ابن حبان جیسے متساہل { بقول محققین کے } بھی فرماتے ہیں کہ اس نے اکثر اوقات خطا کی ہے { تہذیب التہذیب وکتاب الثقات بحوالہ قرۃ العینین } نیز کئی مدثین نے ان کو ضعیف بھی کہا ہے۔ بہر حال یہ بات یقینی ہوئی کہ ان کو وہم ہوتا تھا۔ اس حدیث میں ان کو وہم ہوا ہے اور اسی وہم کو چھپانے کے لئے ان محققین نے ابو قتادہ کا نام حذف کیا ہے۔

2 : نہایت خاص بات یہ ہے کہ ترمذی اور ابوداؤد کی حدیث میں ابو قتادہ ربعی کا بھی ذکر ہے جبکہ ابو قتادہ ربعی حضرت علی کے دور خلافت میں فوت ہوئے تھے اور حضرت علی نے ان کا نماز جنازہ پڑھایا تھا اور محمد بن عمرو بن عطاء کہتے ہیں کہ اس مجلس میں ابو قتادہ بھی تھے۔ جبکہ محمد بن عمرو بن عطاء تو خلافت علی کے بعد پیدا ہوئے تھے یہ کیسے کہتے ہیں کہ ابو قتادہ بھی وہاں تھے۔ شائد ابو قتادہ وفات کے کئی سال بعد قبر سے نکل کر مجلس رفع یدین میں حاضر ہوئے ہوں { طحاوی باب صفۃ الجلوس کیف ہو } ۔

امام ابن قطان العربی اور ابن دقیق العید نے بھی یہی کہا ہے۔ حافظ ابن حجر نے بھی تلخیص الحبیر میں اسی کو ثابت کیا ہے { بحوالہ العرف الشذی انور شاہ کشمیری } حضرت ابو قتادہ کی وفات خلافت علی میں ہوئی تھی اس کے لئے (مصنف ابن ابی شیبہ کتاب الجنائز باب من کان یکبر علی الجنازۃ سبعا سبعا) کی روایت میں اس کا ذکر ہے " موسیٰ بن عبد اللہ بن یزید کہتے ہیں کہ حضرت علی نے حضرت ابو قتادہ کا جنازہ پڑھایا اور سات تکبیریں کہیں تھیں "۔ (اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں، راوی کے وہم کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے)

3 : پوری امت کا اس پر اجماع ہے کہ حدیث کی کتابوں میں جو رتبہ بخاری شریف کا ہے وہ ابوداؤد اور ترمذی شریف کا نہیں ہے۔ بخاری شریف کی روایت کی سند میں حمید بن جعفر نہیں ہے اور واقعہ میں ابو قتادہ کا ذکر بھی نہیں ہے۔ پس پتہ چلا کہ ابوداؤد اور ترمذی شریف کی روایت میں حمید بن جعفر کو وہم ہوا ہے۔

4 : روایت بخاری اور روایت ترمذی وابوداؤد میں بہت فرق ہے، مثلاً بخاری کی روایت میں عند الرکوع رفع یدین کا ذکر نہیں ہے جبکہ ابوداؤد اور ترمذی میں اس کا ذکر ہے۔

5 : محققین حضرات کا یہ عقیدہ ہے کہ بخاری کی تمام روایات صحیح ہے اور یہ مقام اور مرتبہ ابوداؤد اور ترمذی کو حاصل نہیں ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ محققین یہاں بخاری کی صحیح اور مستند روایت کو چھوڑ کر ابوداؤد اور ترمذی کی وہم والی روایت کو لے رہے ہیں؟۔

نماز کی نیت

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

انما الاعمال بالنیات[1]

---

[1] بخاري باب كيف كان بدء الوحي الى رسو ل الله صلى الله عليه وسلم حديث 1، 54، 2529، 3898، 5070، 2520، 6689، 6953 مسلم باب قوله صلي الله عليه وسلم انما اعمال بالنية حديث 1907

عملوں کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔

اس لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے تمام جائز اعمال میں سب سے پہلے، خلوص نیت کر لیا کریں کیونکہ جیسی نیت ہو گی، ویسا ہی پھل ملے گا۔ سیدنا ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک شہید، اللہ کے سامنے قیامت کو لایا جائے گا۔ اللہ اس سے پوچھے گا کہ تو نے کیا عمل کیا؟ وہ کہے گا کہ میں تیری راہ میں لڑ کر شہید ہوا۔ اللہ فرمائے گا: تو جھوٹا ہے بلکہ تو اس لئے لڑا کہ تجھے بہادر کہا جائے اور وہ تجھے کہہ دیا گیا۔ تجھے تیرا صلہ مل گیا۔ اب مجھ سے کیا چاہتا ہے) پھر منہ کے بل گھسیٹ کر اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ اسی طرح ایک عالم جس نے علم، شہرت کی نیت سے پڑھا اور پڑھایا تھا۔ اللہ کے حضور پیش کر کے جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔ پھر ایک شہرت کی غرض سے سخاوت کرنے والے مالدار کا بھی یہی حشر ہو گا [1]۔

وضو کرتے وقت دل میں یہ نیت کریں کہ اللہ کے حضور نماز میں حاضر ہونے کے لئے طہارت وضو کرنے لگا ہوں اور پھر جب نماز پڑھنے لگیں تو دل میں یہ قصداً اور نیت کریں کہ صرف اپنے اللہ کی خوشنودی کے لئے اس کا حکم بجالاتا ہوں۔

نیت چونکہ دل سے تعلق رکھتی ہے، اس لئے زبان سے الفاظ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور نیت کا زبان سے ادا کرنا رسول اللہ ﷺ کی سنت اور صحابہؓ کے عمل سے ثابت نہیں [2]۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ الفاظ سے نیت کرنا علمائے مسلمین میں سے کسی کے نزدیک بھی مشروع نہیں۔ رسول اللہ ﷺ آپ کے خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کرامؓ نے اور نہ ہی اس امت

---

[1] مسلم باب من قاتل للرياء والسمعة ' استحق النار حديث 1905

[2] اہل سنت والجماعت کے نزدیک زبان سے نیت کرنا ضروری نہیں ہے فتاوی عالمگیریہ (ج: 1/ص: 1) میں لکھا ہے کہ " ولا عبرة بالذكر باللسان " کہ زبان نیت کا اعتبار نہیں ہے۔

کے سلف اور ائمہ میں سے کسی نے الفاظ سے نیت کی۔ عبادات میں، مثلاً: وضو، غسل، نماز، روزہ اور زکاۃ وغیرہ میں جو نیت واجب ہے، بالاتفاق تمام ائمہ مسلمین کے نزدیک اس کی جگہ دل ہے [1]۔

امام ابن ہمام اور حافظ ابن قیم اسے بدعت کہتے ہیں۔

قیام:

سیدنا عمران بن حصینؓ بیان فرماتے ہیں، مجھے بواسیر کی تکلیف تھی۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: کھڑے ہو کر نماز ادا کرو، اگر طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر، اگر بیٹھ کر ادا کرنے کی بھی طاقت نہ ہو تو لیٹ کر نماز ادا کرو [2]۔

نبی اکرم ﷺ نے دیکھا کہ کچھ لوگ بیٹھ کر نفل نمازیں ادا کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: بیٹھ کر نماز ادا کرنے والے کو کھڑے ہو کر نماز ادا کرنے والے کی نسبت نصف ثواب ملے گا [3]۔

جب نبی اکرم ﷺ کی عمر زیادہ ہو گئی اور جسم بھاری ہو گیا تو آپ نے جائے نماز کے قریب ایک ستون تیار کرایا جس پر آپ نماز کے دوران ٹیک لگاتے تھے [4]

نبی اکرم ﷺ رات کا بڑا حصہ کھڑے ہو کر نوافل ہو کر کرتے اور جب بیٹھ کر قرات فرماتے تو اسی حالت میں رکوع بھی فرماتے [5]۔

---

[1] الفتاوی الکبری

[2] بخاري باب اذا لم يطق قاعدا صلى على جنب حديث 117

[3] ابن ماجة باب صلاة القاعد على النصف من صلاة القائم حديث 1230 حافظ بوصیری نے اسے صحیح کہا ہے

[4] ابو داؤد باب الرجل يعتمد في الصلاة على عصا حديث 948 حاکم اور ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے، اہل سنت فرماتے ہیں کہ یہی حال جلسہ استراحت کا ہے، یہ پاک نبی ﷺ کا مستقل سنت نہیں تھا تفصیل گزر چکی ہے۔

[5] مسلم باب جواز النافلة قائما وقاعدا حديث 730

اور کبھی آپ ﷺ بیٹھ کر قرات فرماتے۔جب قرات سے تیس یا چالیس آیات باقی ہو تیں تو آپ ﷺ کھڑے ہو کر ان کی تلاوت فرماتے، پھر حالت قیام سے رکوع میں چلے جاتے، دوسری رکعت میں بھی آپ ﷺ کا یہی معمول ہوتا [1]

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

تکبیر اولیٰ:

قبلہ کی جانب منہ کر کے اللہ اکبر کہتے ہوئے رفع الیدین کریں، یعنی دونوں ہاتھ کندھوں تک اٹھائیں۔سیدنا عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں:

رایت النبی ﷺ افتتح التکبیر فی الصلاۃ فرفع یدیہ حین یکبر حتی یجعلھما حذو منکبیہ [2].

میں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا، آپ نے نماز کی پہلی تکبیر کہی اور اپنے دونوں ہاتھ کندھوں تک اٹھائے۔

ہاتھ اٹھاتے وقت انگلیاں نارمل طریقے پر کھلی رکھیں۔انگلیوں کے درمیان زیادہ فاصلہ کریں اور نہ انگلیاں ملائیں [3]۔

رسول اللہ ﷺ دونوں ہاتھ کندھوں تک اٹھاتے [4]۔

نبی اکرم ﷺ کبھی کبھی [5] ہاتھ کانوں تک بلند فرماتے [1]۔

---

[1] بخاري باب اذا صلی قاعدا ثم صح حدیث 119 مسلم باب جواز النافلة قائما وقاعدا حدیث 731

[2] بخاري باب الی این یرفع یدیه ؟ حدیث 738

[3] ابو داؤد باب من لم یذکر الرفع عند الرکوع حدیث 753 اسے امام حاکم اور ذہبی نے صحیح کہا ہے

[4] بخاري باب رفع الیدین فی التکبیرۃ الاولی مع الافتتاح سواء حدیث 735 مسلم باب استحباب رفع الیدین حذو المنکبین مع تکبیرۃ الاحرام والرکوع حدیث 390

[5] **تبصرہ:** ان دونوں احادیث کا مضمون ایک ہے جبکہ ایک میں " کبھی کبھی" کے الفاظ اپنی طرف سے اضافہ ہے۔یہاں ان الفاظ کے ڈالنے کا کوئی قرینہ نہیں سوائے اس کے کہ حدیث کو اپنے مسلک کے مطابق کیا جائے۔مسلم شریف کی یہی حدیث صفحہ

شیخ البانیؒ فرماتے ہیں: کہ رفع یدین کرتے وقت ہاتھوں سے کانوں کو چھونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ان کا چھونا بدعت ہے یا وسوسہ۔ مسنون طریقہ ہتھیلیاں کندھوں یاکانوں تک اٹھانا ہے۔ ہاتھ اٹھانےکے مقام میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔ ایسی کوئی صحیح حدیث موجود نہیں جس میں یہ تفریق ہو کہ مرد کانوں تک اور عورتیں کندھوں تک ہاتھ بلند کریں[2]۔

﴿ اہل سنت فرماتے ہیں: ﴾

تکبیر اولی کہتے وقت ہاتھ کہاں تک اٹھائے اس بارے ہم کہتے ہیں کہ مسلم شریف کی روایت اور مالک بن حویرث کی روایت ان تمام روایتوں کو دیکھنے کے بعد امام نووی رحمہ اللہ کافرماتے ہیں کہ ہمارا اور جمہور کامذہب یہ ہے اور یہ جمع بین الاحادیث امام شافعی نے کیا ہےاور خاص لوگوں نے اس کو اچھا سمجھا ہے امام نوویؒ کا قول ملاحظہ ہو : فالمشهور من مذهبنا ومذهب الجماهير انه يرفع يديديه حذو منكبيه بحيث يحاذي اطراف اصابعه فروع اذنيه اي اعلا اذنيه وابهاماه شحتي اذنيه

391 جس میں کانوں تک ہاتھ اٹھانے کا ذکر ہے اسی روایت میں رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت رفع یدین کا بھی ذکر ہے اور مسئلہ رفع یدین میں ان حضرات کا اسی پر عمل ہے اور یہی حدیث ان کی مرکزی دلیل بھی ہے۔اب سوال یہ ہے کہ آدھی حدیث پر عمل کرنا رفع یدین کی صورت میں اور آدھی پر عمل نہ کرنا یعنی کانوں تک ہاتھ اٹھانے میں کیاراز ہےاس میں ؟ ایک ہی حدیث میں یہ تفریق کیوں؟

تبصرہ ب: امام نوو فرماتے ہیں : فالمشهور من مذهبنا ومذهب الجماهير انه يرفع يديديه حذو منكبيه بحيث يحاذي اطراف اصابعه فروع اذنيه اي اعلا اذنيه وابهاماه شحتي اذنيه وراحتاه منكبيه فهذا معنى قولهم حذومنكبيه وبهذا اجمع الشافعي رحمه الله تعالى بين الروايات الاحاديث فاستحسن الناس ذالك منه . (حاشیہ مسلم ج: 1/ص: 168)

[1] مسلم باب استحباب رفع اليدين حذو المنكبين .... حديث 391

[2] تبصرہ: یہاں شیخ البانی صاحب کی تقلید کی جارہی ہے بغیر کسی حوالہ کے۔ جبکہ دوسرے لوگ اگر ائمہ کبار اور فن حدیث کی ماہرین کی تقلید کرے تو وہ ان کے ہاں مشرک اور گمراہ ٹھہرتے ہیں عورت آہستہ آمین کہے اس کی ان احباب کے پاس کوئی دلیل نہیں اور اسی طرح مرد اگر کھڑے ہو کر پیشاب کرسکتا ہے اور عورت؟ اور عورت اگر اکیلی نماز پڑھی گی تو دونوں پیروں کے درمیان کتنا فاصلہ رکھے گی؟ جواب قرآن وسنت سے۔

وراحتاه منكبيه فهذا معنى قولهم حذومنكبيه وبهذا اجمع الشافعي رحمه الله تعالى بين الروايات الاحاديث فاستحسن الناس ذالك منه .

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

سینے پر ہاتھ باندھنا:

حضر وائل بن حجر کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی تو آپ اپنے ہاتھ دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر سینے پر باندھے [1]۔

تبصرہ:

ہم اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں راوی سفیان ہیں جو عن کے ساتھ روایت کرتے ہیں جس کو خود مرحوم علی زئی صاحب ضعیف قرار دے چکے ہیں {تفصیل گزر چکی ہے} دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی روایت کی سند میں مؤمل بن اسماعیل کو امام ناصر الدین البانی اور مبارک پوری دونوں ضعیف کہہ چکے ہیں { ابکار المنن } جبکہ نماز نبوی جدید سے اس کو حذف کیا گیا۔ تو جس طرح مرد اور عورت کے آمین آہستہ یا اونچی آواز سے کہنے کی تفریق قرآن وسنت میں نہیں لیکن آواز کی ستر کی وجہ سے اس طرح تفریق کی گئی اسی طرح عورت کے ہاتھ باندھنے کا مسئلہ ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں: ﴾

حضرت ہلب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سینے پر ہاتھ رکھے ہوئے دیکھا [2]۔

---

[1] ابن خزیمہ 243/1 حدیث 479 اسے امام ابن خزیمہ نے صحیح کہا ہے

[2] حافظ ابن عبد البر اور علامہ عظیم آبادی نے اسے صحیح کہا ہے

تبصرہ:

ہم مذکورہ روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ مسند احمد کی مذکورہ روایت میں ید کالفظ نہیں ہے یہ اپنی طرف سے اضافہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس روایت کی سند میں سماک بن حرب راوی ہے جس کو جمہور محدثین ضعیف کہتے ہیں اور آپ کے اصول کے مطابق ایسی روایت ضعیف ہوتی ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں: ﴾

حضرت وائل بن حجر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا طریقہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ نے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی {کی پشت} اس کے جوڑ اور کلائی پر رکھا[1]۔

ہمیں بھی دایاں ہاتھ بائیں پر اس طرح رکھنا چاہیئے کہ دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کی پشت، جوڑ اور کلائی پر آجائے اور دونوں کو سینے پر باندھا جائے تاکہ تمام روایات پر عمل ہو سکے۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگوں کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ حکم دیا جاتا تھا نماز میں دایاں ہاتھ بائیں کلائی {ذراع} پر رکھیں[2]۔

رہی حضر علی رضی اللہ عنہ کی روایت کہ سنت یہ ہے کہ ہتھیلی کو ہتھیلی پر زیر ناف رکھا جائے تو اسے امام بیہقی اور حافظ ابن حجر نے ضعیف قرار دیا ہے اور امام نووی فرماتے ہیں کہ اس کے ضعف پر سب کا اتفاق ہے۔

تبصرہ:

ہم تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں اس روایت کو ضعیف ثابت کرنے کے لئے جن ائمہ کی بلاحوالہ تقلید کی گئی ہے یہ ان ہی کے اصول کے مطابق مکڑی کے جالے کے علاوہ کچھ نہیں۔

---

[1] نسائي باب في الامام اذا راي الرجل قد وضع شماله علي يمينه ' 490 اسے ابن حبان حدیث 485 ابن خزیمہ حدیث 480 نے صحیح کہا ہے

[2] بخاري باب وضع اليمنى على اليسرى حديث 740 وضع اليمنى على اليسرى حديث 740

﴿اہل سنت فرماتے ہیں:﴾

ہم جواباً عرض کرتے ہیں کہ بخاری میں ایسی کوئی روایت نہیں ملی جس میں وضاحت اور صراحت ہو کہ نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنا چاہیئے۔ بخاری شریف میں جو اس بارے میں روایت وہ یہ ہے:

عن ابي حازم عن سهل بن سعد قال: كان الناس يومرون ان يضع الرجل اليداليمني علي ذراعه اليسري في الصلوة

یعنی ابوحازم سہل بن سعد سے روایت ہے وہ فرماتے تھے کہ لوگوں کو حکم دیا جاتا تھا کہ نماز میں آدمی داہنا ہاتھ اپنے بائیں "ذراع" پر رکھے۔

بخاری شریف میں نماز میں ہاتھ باندھنے کی یہی ایک روایت ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

اس میں یہ بھی تصریح نہیں کہ حکم دینے والا کون تھا، لوگوں نے قیاس کیا ہے کہ صحابہ کرام کو حضور اکرم ﷺ ہی حکم دیتے تھے اس لئے حضور اکرم ﷺ ہی مراد ہوں گے۔ بہر حال اس میں نہ حکم دینے والے کی تصریح ہے اور نہ ہاتھ کہاں رکھا جائے اس کی کوئی ذکر ہے، بلکہ بخاری سے تو یہ بھی نہیں پتہ چلتا ہے کہ یہ حضور ﷺ کی حدیث ہے بھی کہ نہیں ہے، یعنی قطعیت کے ساتھ اس کو حضور اکرم ﷺ کا ارشاد کہنا بھی مشکل ہے اس لئے کہ خود ابو حازم جو حضرت سہل بن سعد سے اس کو روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں نہیں سمجھتا ہوں مگر یہ کہ حضرت سہل بن سعد اس کو حضور ﷺ کی طرف منسوب کرتے تھے، یعنی ابو حازم کو اس بات کی تحقیق ہونے میں کہ یہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے یا نہیں یقین کامل نہیں ہے، ورنہ وہ یہ نہ فرماتے امام بخاری نے ان کا قول جو نقل کیا ہے وہ یہ ہے:

قال ابو حازم لا اعلمه الا ينمي ذلك النبي ﷺ.

اس کا ترجمہ اوپر گزر چکا ہے اور امام بخاری نے اس کے بعد جو بات کہی ہے اس سے تو اس روایت کا مرفوع ہونا اور بھی مشکوک ہوتا ہے، یہ روایت مرسل ہو جاتی ہے، امام بخاری فرماتے ہیں:

قال اسمعيل ينمي ذلك ولم يقل ينمي

یعنی اسمٰعیل اس روایت کو بجائے ینمی (صیغہ معلوم) کے ینمی صیغہ مجہول روایت کرتے تھے۔
جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس بات کو حضور ﷺ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، یعنی منسوب کرنے والے کا پتہ بھی نہیں ہے کہ وہ کون ہے؟ اس لئے رویت مرفوع بھی نہیں رہی مرسل ہو گئی، ابن حجر فرماتے ہیں کہ اسماعیل کی روایت کی بناپر فیکون مرسلا لان ابا حازم لم یعین عن فمالہ یعنی یہ روایت مرسل ہو جائے گی اس لئے کہ ابو حازم نے یہ متعین نہیں کیا ہے کہ اس روایت کو حضور ﷺ کی منسوب کرنے والا کون ہے۔ یعنی اب یہ روایت احناف اور مالکیہ کے علاوہ عام طور پر محدثین کے نزدیک تن تنہا قابل احتجاج بھی نہیں رہے گی۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ بخاری کی جس روایت سے سینہ پر ہاتھ باندھنا بدناھنا چاہا ہے وہ ان کے اصول پر قابل حجت بھی نہیں قرار پائی ہے اس لئے کہ ان کا مذہب ہے کہ مرسل روایت قابل احتجاج نہیں ہوتی ہے۔
بہر حال اتنا تو آپ کو معلوم ہو چکا ہو گیا کہ اس روایت میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کا کہیں ذکر نہیں ہے اب جو لوگ کہتے ہیں کہ بخاری میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کی روایت ہے وہ لوگ کتنے سچے ہیں اس بارے میں زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے بعض غیر مقلد احباب نے بخاری کی اس حدیث سے سینہ پر ہاتھ باندھنے کو اس طرح ثابت کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ "لوگوں کو جیسا کہ بخاری کی حدیث میں ہے اس کا حکم دیا جاتا تھا کہ اپنا داہنا ہاتھ بائیں ذراع پر رکھیں اور ذراع کہتے کے بیچ کی انگلی کے سرے سے لے کر کہنی تک کے حصہ کو اور اس طرح اگر ہاتھ باندھا جائے تو سینہ ہی پر ہاتھ پہنچے گا ناف کے نیچے اس صورت میں نہیں جائے گا"۔
مگر یہ طرز استدلال بالکل درست نہیں ہے یہاں ذراع سے کہنی تک پورا حصہ مراد نہیں ہے بلکہ دوسری احادیث کی روشنی میں اس سے مراد کف کو کف پر رکھنا ہے چنانچہ حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث میں کہ آپ ﷺ داہنے ہاتھ کو بائیں ہتھیلی کی پشت پر رکھتے تھے اور بعض احادیث میں ہے کہ آپ ﷺ بائیں ہاتھ کے گٹے پر رکھتے تھے۔ ذراع بول کر یہاں یہی مراد لیا گیا ہے جیسے یمین کہتے ہیں پورے داہنے ہاتھ کو یا ید کہتے ہیں پورے ہاتھ کو مگر پورا ہاتھ کوئی نہیں مراد لیتا بلکہ سب یہی کہتے ہیں کہ کل

بول کر حدیث پاک میں جز یعنی ہاتھ کے شروع کا حصہ یعنی کلائی تک کا حصہ مراد لیا گیا ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

"بخاری شریف کی حدیث میں ذراع کی جگہ مبہم ہے کہ اس کے کون سے حصہ پر داہنا ہاتھ رکھا جاتا تھا تو اس کی شرح ابوداؤد اور نسائی کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ کے کلائی اور ہتھیلی کی پشت پر رکھتے تھے"۔(ج: 2/ص: 224)

اور اگر کسی کو یہی اصرار ہو کہ نہیں صاحب حدیث پاک میں ذراع سے مراد پورے ہاتھ کے کہنی تک کا حصہ ہے تو ہم اس سے سوال کریں گے کہ بعض احادیث میں آتا ہے کہ جب آپ ﷺ تشہد میں بیٹھتے تھے تو اپنا ذراع اپنے گھٹنے پر رکھتے تھے وہ حدیث یہ ہے:

عن مالك بن نمير الخزاعي عن ابيه قال رأيت النبي ﷺ واضعا ذراعه اليمني علي فخذه اليمني رافعا اصبعه السبابة حناها شيئا. (ابوداؤد)

یعنی مالک بن نمیر الخزاعی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے والد نے فرمایا کہ میں نے نبی ﷺ کو دیکھا کہ آپ اپنا داہنا ذراع اپنی ران پر رکھے ہوئے تھے اور اپنی سبابہ انگلی کو اٹھائے ہوئے تھے اور آپ اس کو تھوڑا سا جھکا کر رکھا تھا۔

دیکھئے اس حدیث میں صاف ہے آپ ﷺ نے اپنا داہنا ذراع اپنی ران پر رکھا تھا مگر کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ یہاں ذراع سے مراد پوری کہنی تک کا حصہ ہے پس جس طرح یہاں ذراع سے مراد صرف کف دست ہے اسی طرح سے بخاری والی روایت میں بھی ذراع سے مراد پورا کہنی تک حصہ نہیں بلکہ صرف کلائی تک کا حصہ ہے امید ہے کہ آپ حضرات کو اس بارے میں اب کوئی شبہ باقی نہ ہوگا اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بخاری میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کی روایت ہے اس کی حقیقت آپ نے جان لی ہوگی۔

تحقیق علما سے کرنا ضروری ہے صرف بخاری کا نام سن کرغلط فہمی میں مبتلا مت ہو اس کا خیال ضرور رکھا کریں۔

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

نماز میں ہاتھ کہاں باندھے ؟

ناف کے نیچے ہاتھ باندھے جائیں یا سینہ پر ؟ اس پر کوئی قطعی ویقینی نص موجود نہیں، البتہ دونوں طرف ایسی روایات موجود ہے جس پر علمائے سند نے کلام کیا ہے، تاہم ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کی روایات نسبتا زیادہ واضح اور ثابت ہیں، ذیل میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کے دلائل اور ان کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے :

دلائل:

1- عن وائل بن حجر قال صليت مع النبي ﷺ فوضع يده اليمنى على اليسرى على صدره .
(ابن خزیمہ)

2- عن هلب قال رأيت النبي ﷺ يضع يده على صدره (مسند احمد)

3- عن طاؤس قال كان النبي ﷺ يضع يده اليمنى الى يده اليسرى ثم يشد بينهما على صدره وهو الصلوة. (مراسیل ابی داؤد)

4- عن ابن عباس رضي الله عنهما قال ضع يدك اليمنى على الشمال عند النحر .

جائزہ:

دلیل نمبر 1: عن وائل بن حجر قال صليت..... الحدیث :

یہ حدیث تین طرح سے منقول ہے:

(ا) مصنف بن ابی شیبہ میں وائل بن حجر کی اسی روایت میں "علی صدرہ" (سینہ پر) کی بجائے "تحت سرۃ" (ناف کے نیچے باندھنے) کے الفاظ ہیں۔

(ب) ابن خزیمہ کی نقل کردہ روایت میں "علی صدرہ" کے الفاظ ہیں۔

ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ "اعلام الموقعین" (ج: 3/ص: 9) پر فرماتے ہیں: أنه لم يقل على صدره غير مؤمل بن اسماعيل. کہ اس حدیث کو نقل کرنے والوں مؤمل بن اسماعیل کے علاوہ کسی نے بھی" علی صدرہ" کے الفاظ نقل نہیں کئے۔ جس کی بابت امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں" منکر الحدیث" کہ اس کی روایت کردہ حدیثیں منکر ہیں۔

امام ابو زرعہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ آخر عمر میں بہت غلطیاں کیا کرتا تھا۔ نیز یہ کہ اس کی روایت کی سند میں سفیان ثوری بھی ہیں جن کا اپنا مسلک یہ ہے کہ ناف کے نیچے ہاتھ باندھے جائیں، اگر یہ روایت قابل عمل ہوتی تو حضرت سفیان ثوریؒ ضرور اس پر عمل پیرا ہوتے۔

(ج) وائل بن حجر کی روایت کو بزاز نے بھی نقل کیا ہے اس میں "علی صدرہ" کی بجائے "عند صدرہ" کے الفاظ ہیں۔

علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ اس میں ایک راوی محمد بن حجر ہے "له مناكير" کہ جو بہت سی منکر روایات کا راوی ہے۔

الغرض یہ روایت تین طرح سے منقول ہے، ایک تو ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کا ذکر ہے، دوسرے مؤمل بن اسماعیل اور تیسرے میں محمد بن حجر جیسے راوی ہے، پھر اس سے کیونکہ استدلال ممکن ہے؟

جائزہ دلیل نمبر 2: عن هلب قال رأيت:

(ا) تفرد به سماك بن حرب ولينه غير واحد وقال النسائي: اذا تفرد بأصل لم يكن حجة.

اس کی روایت میں سماک بن حرب ہے تفرد ااختیار کیا ہے اور اس کو بہت سے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ یہ سماک جب تفرد اختیار کرے تو اس کی روایت دلیل نہیں بن سکتی۔

(ب) اس کی روایت کی سند میں حضرت سفیان ثوری ہیں، اگر یہ روایت قابل استدلال و عمل ہوتی تو وہ خود بھی اس پر عمل کرتے، جب کہ وہ بھی ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کے قائل ہیں۔

جائزدلیل نمبر3: عن طاؤس قال کان....... الحدیث

(ا) علامہ نیموی رحمہ اللہ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔

(ب) روایت مرسل ہے جو ان کے ہاں حجت نہیں ہے۔(ملخص معارف السنن، ص: 435تا445)

جائزہ دلیل نمبر4: عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال وضع یدک الیمنی.....الخ

اس کی سند میں یحی بن ابی طالب ہے جس کی بابت موسی بن ہارونؒ فرماتے ہیں " اشهد انه یکذب " کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کی عادت جھوٹ بولنے کی تھی۔

" وخط ابو داؤد علی حدیثه " امام ابو داؤد نے اس سے نقل کردہ احادیث کو حذف کر دیا تھا۔
(میزان الاعتدال، ج: 3/ص: 263)

(ب) اس کی سند میں عمرو راوی ہے جس کی بابت علامہ ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " منکر الحدیث...." (جوہر النقی، ج: 2/ص: 30)

کہ اس کی بیان کردہ روایت منکر ہوتی ہے۔

(ج) اس کی سند میں "روح" راوی ہے جس کی بابت امام ابن حبان فرماتے ہیں " يروي الموضوعات ولاتحل الرواية عنه" .

ابن حبانؒ فرماتے ہیں کہ وہ من گھڑت روایتیں نقل کرتا ہے اس سے روایت نقل کرنا حلال نہیں۔

امام حاکم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لیس بالقوی۔ کہ وہ قوی نہیں ہے۔

بخاری کی حدیث پر تبصرہ:

یہ جو بخاری شریف کی حدیث ہے کہ "ہم کو حکم دیا جاتا تھا، کہ ہم ذراع کو پکڑلیں" تو اس سے یہ مطلب اخذ کیا جاتا ہے کہ ذراع کو تب ہی پکڑا جاسکتا ہے، کہ سینے پر ہاتھ باندھا جائے، اس کے علاوہ ذراع کو پکڑا نہیں جاسکتا، تو اس کا نہایت آسان جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ تشہد میں ذراع ران پر رکھتے تھے تو ذراع کا کون سا حصہ نبی پاک ﷺ ران مبارک پر رکھتے تھے ؟ تو دیکھو ذرا اور سوچو تو خود بخود جواب ذہن میں آجائے گا، اس لئے کہ ذراع ہاتھ کے درمیان والی انگلی کے سرے سے لیکر کہنی تک ہوتا ہے، تو کیا ضرورت کہے کہ آپ اپنے دماغ میں ذراع کا آخری حصہ ہی رکھیں؟ اس لئے کہ امام ترمذی نے نماز میں ہاتھ رکھنے کے اعتبار سے دو ہی مذاہب نقل فرمائے ہیں، ناف کے اوپر یا ناف کے نیچے اور فرمایا: "وکل ذلک واسع" سب کی گنجائش موجود ہے، ارو یہاں پرانی والی بات بھی ہے کہ یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے کہ تم کفر، شرک یا بدعت کا فتوی لگاؤ یا کسی کی تفسیق وتذلیل، دونوں طرف روایات ہے دونوں طرف پر عمل کرنا جائز ہے، ہمارے نزدیک ناف کے نیچے زیادہ افضل ہے۔

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا:

عن علي قال: ان من السنة في الصلاة وضع الأكف على الأكف تحت السرة[1]

"سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نماز میں (دائیں) ہتھیلی کو (بائیں) ہتھیلی کے اوپر ناف کے نیچے رکھنا سنت ہے"

مذکورہ روایت میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کو سنت قرار دیا گیا ہے، صحابی جب کسی عمل کو سنت قرار دیں تو علماء اصول حدیث کا بیان ہے کہ اس سے مراد سنت رسول ہوتی ہے اور وہ عمل مرفوع حدیث کے حکم میں ہوتا ہے، چنانچہ نصب الرایہ میں علامہ زیلعی نے نقل کیا ہے:

[1] مسند الامام احمد : 110/1، مسند الخلفاء الراشدين، مسند على بن أبي طالب ص، حديث: 875، و ابوداؤد، كتاب الصلاة، باب 117-118 وضع اليمنى على اليسرى في الصلاة، حديث: 756

" جان لیجئے کہ لفظِ سنت محدثین کے نزدیک مرفوع حدیث کے حکم میں ہوتا ہے، ابن عبد البر نے "تقصی" نامی کتاب میں لکھا ہے کہ صحابی جب کسی عمل کو سنت قرار دے تو اس سے مراد نبی کریم اکی سنت ہوتی ہے[1] "۔

"امام محمد فرماتے ہیں کہ ہم سے ربیع بن صبیح نے بیان کیا، وہ ابو معشر سے نقل کرتے ہیں، ابو معشر ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہما کا عمل نقل کرتے ہیں کہ وہ (ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ نماز میں) اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر ناف کے نیچے رکھتے تھے، امام محمد کہتے ہیں کہ اسی کو ہم اختیار کرتے ہیں، اور یہی امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے[2]"

"حجاج بن حسان کہتے ہیں کہ میں نے ابو مجلز سے سنا، یا یہ کہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ وہ حضرات نماز میں کیسے ہاتھ باندھتے تھے؟ تو انہوں نے بیان کیا کہ وہ حضرات دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کے اوپری حصہ پر رکھ کر (دونوں ہاتھ) ناف کے نیچے باندھتے تھے[3]"

"سیدنا ابوہریرہ ص فرماتے ہیں کہ نماز میں ہتھیلی کو ہتھیلی پر رکھ کر ناف کے نیچے باندھنا چاہئے[4]"

ہاتھ باندھنے کا مقصد اللہ تعالیٰ کے سامنے تواضع اور انکساری کا اظہار ہے اور ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے میں تواضع کی کیفیت زیادہ نمایاں ہے اسی لئے ہمارے علماء کرام نے اس طریقہ کو زیادہ بہتر قرار دیا ہے، جو لوگ اس طریقہ کا سرے سے انکار کرتے ہیں وہ اپنی ناواقفیت اور نادانی کا ثبوت دیتے

---

[1] نصب الرایۃ: 314/1 باب صفۃ الصلاۃ

[2] کتاب الآثار للامام محمد بن حسن الشیبانی: 182/1، کتاب الصلاۃ، قبیل باب الوتر، حدیث: 121

[3] مصنف ابن أبي شيبة: 343/1، کتاب الصلاۃ، باب 165 وضع الیمین علی الشمال، حدیث: 3942، قال العلامہ ابن ترکمانی: ومذهب ابي مجلز الوضع اسفل السرة حكاه عنه ابو عمر في تمهيده وجاء ذلك بسند جيد (اعلاء السنن، ج: 2/ص: 192)

[4] سنن ابی داود، کتاب الصلاۃ، باب 117-118 وضع الیمنی، حدیث: 758

ہیں، اس لئے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کی ایک بڑی جماعت اسی سنت پہ قائم تھی، چنانچہ امام ترمذی ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ کے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں سے اہل علم کا اس پر عمل ہے، ان حضرات کا نقطۂ نظر یہی تھا کہ آدمی نماز کی حالت میں اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھے، البتہ ان میں سے بعض حضرات ناف کے اوپر رکھنے کے قائل تھے، اور بعض حضرات ناف کے نیچے رکھتے تھے، ان حضرات کے نزدیک اس میں وسعت تھی[1]"

نہایت آسان بات سمجھنے کی یہ ہے کہ علامہ ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"امام ثوری، ابو حنیفہ اور اسحاق کا کہنا ہے کہ ناف کے نیچے ہاتھ باندھا جائے، اور یہی قول سیدنا علی، ابوہریرہ ؓ اور امام النخعی سے مروی ہے، اور امام احمد بن حنبل کا کہنا ہے کہ ناف کے اوپر ہاتھ باندھنا چاہئے، اور یہ سعید بن جبیر کا بھی قول ہے۔ امام احمد کہتے ہیں کہ اگر ناف کے نیچے ہاتھ باندھ لیا جائے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں[2]"

بلکہ حنابلہ کے مسلک کی ترجمانی کرتے ہوئے علامہ بہاء الدین عبد الرحمان بن ابراہیم المقدسی (م: 624ھ) نے لکھا ہے: "اور تکبیر تحریمہ کے وقت مونڈھوں تک یا کانوں کے قریب تک ہاتھ اٹھائے اور پھر ناف کے نیچے باندھ لے[3]"

محدثین کی یہ باتیں آپ اپنی نگاہ میں رکھیں اور پھر امام ترمذی کا جو فرمان ہے اس پر نظر کریں کہ صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کا عمل نماز میں ہاتھ باندھنے کے سلسلے میں صرف دو طرح کا تھا، اسلاف یا تو ناف کے نیچے ہاتھ باندھتے تھے یا ناف کے اوپر۔ سینہ پر کوئی ہاتھ نہیں باندھتا تھا، اور یہی وجہ ہے کہ امام ابن القیم نے اپنی کتاب بدائع الفوائد میں سینہ پر ہاتھ رکھنے کو مکروہ لکھا ہے۔

---

[1] سنن الترمذي، أبواب الصلاة، باب ماجاء في وضع اليمين على الشمال في الصلاة حديث 252

[2] التمهيد: 75/20، اختلاف الفقهاء في هذا الباب، أي وضع اليمين على الشمال في الصلاة من السنة

[3] العدة في شرح العمدة، ص: 74

امام شافعی سے ایک کمزور قول سینہ پر ہاتھ باندھنے کا ہے، مگر ان کا مشہور مذہب جس پر شوافع کا عمل ہے ناف کے اوپر ہاتھ باندھنے کا ہے۔ امام احمد جو ظاہر حدیث پر عام طور پر عمل کرتے ہیں اور جن کو امام السنۃ کہا جاتا ہے، ان کا مذہب بھی سینہ پر ہاتھ باندھنے کا نہیں ہے۔ امام مالک کا بھی یہ مذہب نہیں ہے، جو مدینہ پاک کے رہنے والے اور مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے والے تھے، امام شافعی کا بھی یہ مذہب نہیں ہے جو مکہ مکرمہ میں تھے اور کعبہ شریفہ میں نماز ادا کرتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ دور اول یعنی دور صحابہ وتابعین میں نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کا کوئی رواج نہیں تھا۔

دوبارہ سنئیے امام ترمذی رحمہ اللہ کی بات انہیں کے الفاظ میں :

والعمل علی هذا عند اهل العلم من اصحاب النبي ﷺ والتابعین ومن بعد هم یرون ان یضع الرجل یمینه علی شماله في الصلوة ورأي بعضهم ان یضعهما فوق السرة ورأي بعضهم ان یضعها تحت السرة وکل ذلك واسع عندهم.

یعنی صحابہ کرام وتابعین عظام اور ربعد کے اہل علم اصحاب کا اسی حدیث پر عمل ہے۔ یعنی یہ کہ نماز میں مصلی داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر باندھے گا اور ان اصحاب وتابعین اور ربعد کے لوگوں میں سے کچھ لوگوں کا یہ مذہب ہے کہ نمازی اپنے ہاتھوں کو ناف کے اوپر باندھے گا اور کچھ لوگوں کا یہ مذہب ہے کہ ناف کے نیچے باندھے گا اور یہ دونوں طریقے ان کے یہاں جائز ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ جیسا وسیع النظر محدث کا یہ فیصلہ آپ کے سامنے ہے، صرف یہی ایک بات اطمنان پیدا کرنے کے لئے کافی ہے کہ احناف کا مسلک وہ ہے جس پر صحابہ وتابعین اور ربعد کے ائمہ محدثین کا عمل رہا ہے، انہوں نے سینے پر ہاتھ باندھنے والی بات کو کوئی لائق ذکر بھی نہیں سمجھا، اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام اور تابعین اور محدثین میں سینہ پر ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنے کا کبھی معمول ہی نہیں رہا ہے۔

مگر ناف کے نیچے والی روایت ہی مشہور ہے اور اسی پر عام طور پر حنبلیوں کا عمل ہے [1]۔ باقی دلائل برائے تاکید ہے۔

نماز میں زیر ناف ہاتھ باندھنا جن کا مذہب ہے ان کی صریح صحیح دلیل یہ ہے جو مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے، حضرت وائل فرماتے ہیں: میں نے رسول اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نماز میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھتے تھے۔

یہ روایت بالکل صحیح سند سے ہے، مگر غیر مقلد علما اس کو صحیح نہیں مانتے، چنانچہ مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری اس صحیح سند والی روایت کے بارے میں فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں اس حدیث کی سند اگرچہ عمدہ ہے مگر تحت السرہ یعنی ناف کے نیچے والا کلمہ ثابت نہیں ہے۔ لكن في ثبوت لفظ تحت السرة في هذا الحديث نظرا قويا. (ص: 214)

دوسری دلیل احناف کی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان ہے جس کو ابو داؤد امام احمد ابن ابی شیبہ دار قطنی اور بیہقی نے نقل کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: السنة وضع الكف على الكف تحت السرة

یعنی سنت یہ ہے کہ نماز میں ناف کے نیچے ہاتھ رکھا جائے۔ (تحفہ ج: 1/ ص: 215)

اور جب صحابہ کرام کسی عمل کے بارے میں سنت کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ کا یہی معمول تھا اور آپ کا یہی فرمان تھا، مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری طیبی سے نقل کرتے ہیں:

اذا قال الصحابي من السنة كذ او السنة كذا فهو في الحكم كقوله قال رسو ل الله ﷺ هذا مذهب الجمهور من المحدثين والفقهاء فجعل بعضهم موقوفا وليس بشيء.

یعنی جب صحابی یہ کہے کہ سنت سے یہ ہے یا یہ سنت ہے تو اس کا مطلب او رحکم اسی طرح کا ہے جیسے صحابی یہ کہے کہ آنحضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے (یعنی

[1] تحفة الاحوذی ج: 2/ ص: 214،213

بات آنحضرت ﷺ سے ہی ثابت ہوگی اور اس کا حکم حدیث مرفوع کا ہے)
اور یہی عام طور پر فقہاء اور محدثین کا مذہب ہے، اور جس نے اس کو موقوف
قرار دیا ہے وہ کوئی چیز نہیں ہے۔ (ج: 1/ص: 240)

تیسری دلیل احناف کی یہ روایت ہے جو ابوداؤد میں ہے اور حضرت ابوہریرہؓ کی ہے، حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں: اخذ الکف علی الکف تحت السرۃ

یعنی نماز میں ہتھیلی کو ہتھیلی سے پکڑ کر ہاتھ باندھا جائے گا۔ (تحفہ ص: 215)

چوتھی دلیل احناف کی وہ روایت ہے جو حضرت انسؓ سے مروی ہے اور جس کو ابن حزم نے نقل کیا ہے، حضرت انسؓ نے فرمایا: تین چیزیں اخلاق نبوت میں سے ہیں، افطار میں جلدی کرنا، سحری میں تاخیر کرنا، اور داہنے کو بائیں ہاتھ کے اوپر زیر ناف رکھنا۔ (تحفہ)

مسند احمد میں ہے کہ قبیصہ اپنے والد ہلب طائی سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ نماز میں داہنے رخ اور بائیں رخ دونوں طرف نماز کے بعد منہ پھیرتے تھے اور اس کو اپنے سینے پر رکھتے تھے، مولانا مبارک پوری اس کو نقل کرکے فرماتے ہیں: ورواہ ہذا الحدیث کلہم ثقات وسنادہ متصل۔ یعنی اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں اور اس کی سند متصل ہے لیکن کیا حقیقت یہی ہے؟ تو سنیئے کہ اس کا ایک راوی سماک ہے اس کا حافظہ آخر میں خراب ہوگیا تھا، امام ذہبی فرماتے ہیں کہ امام احمد کل کہنا تھا کہ سماک مضطرب راوی ہے، شیبہ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن عمار کہتے ہیں کہ یہ غلطی کیا کرتا تھا، دمام عجلی کہتے ہیں وہ بسا اوقات منقطع حدیث کو متصل کردیتا تھا، امام ثوری اس کو ضعیف قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس کی روایت میں اضطراب ہوتا ہے او ریختہ کار محدثین میں سے نہیں تھا، اور صالح بھی اس کو ضعیف قرار دیتے ہیں، ابن خداش کہتے ہیں کہ اس میں کمزوری ہے۔

یہ ساری باتیں خود مبارک پوری صاحب نے لکھی ہیں اس کے باوجود وہ کہتے ہیں کہ اس کی سند کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

اب سنیئے کہ قبیصہ کی جو صحیح راویت ہے اس کو امام ترمذی نے ذکر فرمایا ہے اور اس میں ہاتھ کہاں رکھتے تھے اس کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔

اس کے بارے ابن قیم فرماتے ہیں: صحیح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بات ہے... واصحیح حدیث علی یعنی صحیح حضرت علی رضی اللہ عنہ والی حدیث ہی ہے۔(بدائع الفوائد ج: 1/ ص: 91)

شیخ عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب نجدی سلفی حنبلیؒ کا فتویٰ:

شیخ عبد اللہ بن محمد بن عبد الوہاب رحمۃ اللہ علیہم سے رفع یدین کے بارے میں سوال کیا گیا، تو انہوں نے جواب دیا کہ جب ہاتھ اٹھا لئے تو داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ کے گٹے پر رکھے اور ہاتھوں کو ناف کے نیچے باندھ لے، جیسا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے سنن ابی داود میں روایت مروی ہے[1] کہ نماز میں ہتھیلی کو دوسری ہتھیلی کی پشت پر رکھ کر ہاتھوں کو ناف کے نیچے باندھنا سنت ہے[2]"۔

ہاتھ باندھنے کا طریقہ:

"سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ لوگوں کو حکم دیا جاتا تھا کہ نماز میں دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھیں[3]"۔

"نبی کریم ﷺ نے نماز میں دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر گٹے کے پاس رکھا[4]"۔

"...پھر آپ ادائیں ہاتھ کو بائیں ہتھیلی کے پشت، گٹے اور کلائی پر رکھتے تھے[1]"۔

---

[1] حدیث: 756

[2] الدرر السنیة: 283/4، باب صفة الصلاة، مطابع العبیکان

[3] صحیح البخاری، کتاب الأذان، باب 87 وضع الیمنٰی علی الیسری، حدیث: 740

[4] المعجم الکبیر: 25/22 حدیث: 52 وتلخیص الحبیر: 368/1، باب 4 صفة الصلاة، حدیث: 332

"سیدنا ہلب ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہماری امامت فرمائی تو آپ ﷺ نے بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ سے پکڑا[2]"۔

ان احادیث اور ان جیسی دیگر احادیث کی بناء پر علماء کرام نے لکھا ہے کہ نماز میں ہاتھ اس طرح باندھا جائے کہ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی بائیں ہاتھ کے اوپری حصہ پر ہو، انگشت شہادت اور اس سے متصل دو انگلیاں یعنی کل تین انگلیاں بائیں ہاتھ کے گٹے پر ہوں اور انگوٹھا نیز چھوٹی انگلی سے بائیں ہاتھ کے گٹہ پر حلقہ بنالیا جائے، ہمارے ہاں چونکہ تمام حدیثوں پر عمل کرنے کا خصوصی اہتمام ہے، اسی لئے وہ کسی مسئلہ سے متعلق مختلف روایت کو جمع کرتے ہیں اور ایسی صورت اختیار کرتے ہیں جس میں تمام احادیث پر عمل ہو جائے۔ چنانچہ سیدنا سہل بن سعد ؓ کی مذکورہ روایت میں ہے کہ لوگوں کو حکم دیا جاتا تھا کہ وہ "دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھیں" اور مذکورہ دوسری روایت سے ظاہر ہے کہ " رسول اللہ ﷺ دائیں ہاتھ کو بائیں ہتھیلی کی پشت، گٹے اور کلائی پر رکھتے تھے "اور ترمذی کی مذکورہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ " آپ ﷺ بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ سے پکڑتے تھے" علماء کرام نے ان تینوں روایتوں پر عمل کرنے اور جمع کرنے کے لئے یہ کیفیت متعین فرمائی کہ ہتھیلی ہتھیلی کی پشت پر، تین انگلیاں گٹے اور کلائی پر ہوں اور دو انگلیوں سے حلقہ بنا کر بائیں ہاتھ کو پکڑا جائے، تاکہ ہر روایت پر عمل ہو جائے، احادیث کی توضیح و تشریح اور اس پر عمل کرنے میں علماء احناف کا یہی خاص منہج ہے، جس کے پس منظر میں تمام سنتوں کے اتباع کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

عورتوں اور مردوں کے نماز میں کوئی فرق نہیں:

---

[1] سنن ابوداود، کتاب الصلاۃ، باب 114-115 رفع الیدین فی الصلاۃ، حدیث: 727

[2] سنن الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب 187 وضع الیمین علی الشمال، حدیث: 252

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نماز اسی طرح پڑھوں جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو[1]

" ہو بہو میرے طریقے کے مطابق سب عورتیں اور سب مرد نماز پڑھیں۔ پھر اپنی طرف سے یہ حکم لگانا کہ عورتیں سینے پر ہاتھ باندھے اور مرد زیر ناف اور عورتیں سجدہ کرتے وقت زمیں پر کوئی او رہیئت اختیار کریں اور مرد کوئی اور یہ دین میں مداخلت ہے۔ یاد رکھیں کہ تکبیر تحریمہ سے شروع کرکے السلام علیکم ورحمۃ اللہ تک کہنے تک عورتوں اور مردوں کیلئے ایک ہیئت اور ایک ہی شکل کی نماز ہے۔ سب کا قیام، رکوع، قومہ، سجدہ، جلسہ استراحت، قعدہ اور ہر ہر مقام پر پڑھنے کی دعائیں یکساں ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد اور عورت کے نماز میں کوئی فرق نہیں بتایا۔

تبصرہ:

ہم تبصرہ کرتے ہوئے جوابا عرض کرتے ہیں کہ آپ جہاں چاہتے ہیں حدیث کو عام کردیتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں خاص کردیتے ہیں۔ یہ نصیحت آپ ﷺ نے حضرت مالک بن حویرث کے وفد کو بیس دن کے بعد رخصت کرتے وقت فرمائی تھی۔ اس وفد میں ایک بھی عورت موجود نہ تھی یہ وفد سارا مردوں پر مشتمل تھا۔ اس حدیث کو عام کردیا اور {نماز نبوی جدید ص: 59} پر حدیث "الماء طهور لاينجسه شئ" کو کنویں کے ساتھ خاص کردیا اسی طرح حدیث ابردوا بالظہر کو سفر کی ساتھ خاص کردیا۔ یہ حدیث جس کو یہ محققین مردوں اور عورتوں سب کے لئے عام کردیتے ہیں وہ یہ ہے"

حضرت مالک بن حویرث نے حدیث بیان کی ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کے خدمت میں حاضر ہوئے ہم سب جوان اور ہم عمر تھے ہم آپ ﷺ کے خدمت میں بیس دن ٹھہرے رہے آنحضرت ﷺ بہت شفیق تھے۔ جب آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ ہمارا دل اپنے گھر والوں کی طرف مشتاق ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے گھر چلے جاؤ اور ان کے ساتھ رہو اور انہیں {دین کی باتیں} سکھاؤ اور بتاؤ {اسلام کے اعمال} اور بہت سی باتیں آپ ﷺ نے فرمائی جن میں بعض مجھے یاد ہیں اور بعض

---

[1] بخاري باب الاذان للمسافرين اذا كانوا جماعة والاقامة حديث 231

مجھے یاد نہیں ہیں اور {فرمایا} جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا اسی طرح نماز پڑھو۔ پس جب نماز کا وقت آجائے تو تم سے ایک تمہارے لئے اذان دے اور جو سب سے بڑا ہو وہ امامت کرائے {بخاری کتاب اخبار الاحاد باب ماجاء فی اجازة خبر الواحد المصدوق}۔ قارئین کرام ۔۔ذرا غور فرمائیں اگر یہ حدیث مردوں اور عورتوں کے لئے عام ہے تو پھر اس حدیث میں یہ بھی تو ہے کہ تم میں سے کوئی اذان دے اور جو سب بڑا ہو وہ امامت کرائے تو پھر آپ کو چاہیئے بلکہ آپ کے اصول کے مطابق آپ پر فرض ہے کہ ان احکامات کو اپنے ہاں عورتوں پر بھی لازم کرائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بڑے کی امامت کا ذکر اس حدیث میں بھی ہے اور اس سے پہلے { نماز نبوی ص: 145 پر بخاری کی حدیث 628 } میں بھی یہ تھا کہ جو سب سے بڑا ہو وہ امامت کرائے جبکہ آپ کہتے ہیں کے بچے کو بھی امام بناؤ۔

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

مردوں اور عورتوں کی نماز میں فرق:

مرد اور عورت کی نماز میں فرق ہے لہٰذا عورت سینے پر ہاتھ رکھے مرد ناف کے نیچے ہاتھ باندھے یہ فرق کہاں ہے ؟اکثر سوال کیا جاتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ستر کی وجہ سے ہے صریح دلیل کوئی نہیں ہے جیسے عورت بیٹھ کر پیشاب کرے لیکن مرد بیٹھ کر اور کھڑے ہو کر دونوں طرح کر سکتا ہے اور بخاری شریف میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کا ذکر ہے، بیٹھ کر کا نہیں ہے، تو عورت بیٹھ کر پیشاب کرے اس کی وجہ ستر ہے، یا عورت آہستہ آواز سے امین کہے مرد اونچی اواز سے امین کہے یہ فرق قرآن وسنت میں صراحتا نہیں ہے لیکن وجہ ستر ہے۔ تو مرد و عورت کی نماز کی فرق کی وجہ بھی ستر ہی ہے، اور جو فرق نہیں مانتے وہ دو باتیں ارشاد فرماتے ہیں (1) "صلوا کما رائیتمونی اصلی" اور مرد کی نماز کو عورت کی نماز پر قیاس کرتے ہیں اور یہ بات بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ بخاری شریف میں ہے کہ فلاں خاتون مردوں کی طرح سجدہ کرتی ہے، جبکہ مرسل روایت ان کے ہاں حجت ہی نہیں

ہے،اور قیاس ان کے ہاں دلیل نہیں ہے، اور اگر صلوا عام ہے تو اس سے پہلے والا تکڑا " ولیوذن لکم احدکم" کیوں عام نہیں ؟ کہ عورت بھی اذان کہے۔

حضرت وائل بن حجرؓ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے وائل بن حجرؓ جب تم نماز پڑھو تو اپنے دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھاؤ اور عورت اپنے دونوں ہاتھ اپنی چھاتی کے برابر اٹھائے[1]

اور مسلم شریف میں تو مردوں کیلئے صریح حدیث موجود ہے کہ کانوں تک ہاتھ اٹھائے[2]

حضرت عبد ربہ بن سلیمان بن عمیرؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ام درداء رضی اللہ عنہا کو دیکھا کہ آپ نماز میں اپنے دونوں ہاتھ کندھوں کے برابر اٹھاتیں[3]۔

حضرت ابن جریجؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عطاءؒ سے کہا کہ کیا عورت تکبیر تحریمہ کہتے وقت مرد کی طرح اشارہ رفع یدین کرے گی۔آپ نے فرمایا عورت تکبیر کہتے وقت مرد کی طرح ہاتھ نہ اٹھائے آپ نے اشارہ کیا اور اپنے دونوں ہاتھ بہت ہی پست رکھے اور ان کو اپنے سے ملایا اور فرمایا عورت کی نماز میں ایک خاص ہیئت ہے جو مرد کی نہیں[4] ۔

حضرت یزید بن ابی حبیبؒ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ دو عورتوں کے پاس سے گزرے جو نماز پڑھ رہی تھیں آپ نے فرمایا جب تم سجدہ کرو تو اپنے جسم کا کچھ حصہ زمین سے ملا لو کیونکہ عورت (کا حکم سجدہ کی حالت میں) مرد کی طرح نہیں[5]۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب عورت نماز میں بیٹھے تو اپنی ایک ران دوسری ران پر رکھے اور جب سجدہ کرے تو اپنے پیٹ کو رانوں سے چپکا لے اس

---

1 معجم طبرانی کبیر ج ۲۲ ص ۱۸
2 مسلم ج: ۱ / ص: ۱۷۳
3 جزء رفع الیدین للامام البخاری ص ۷
4 مصنف ابن ابی شیبۃ ج ۱ ص ۲۳۹
5 مراسیل ابوداؤد ص ۸، سنن کبری بیہقی ج ۲ ص ۲۲۳

طرح کہ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ پردہ ہو جائے بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر (رحمت) فرما کر ارشاد فرماتے ہیں کہ اے فرشتو میں تمہیں گواہ بناتا ہوں اس بات پر کہ میں نے اسے بخش دیا ہے[1]۔

حضرت حارثؒ فرماتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے فرمایا کہ جب عورت سجدہ کرے تو خوب سمٹ کر کرے اور اپنی دونوں رانوں کو ملائے رکھے[2]۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے عورت کی نماز کے بارے میں سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کہ وہ اکٹھی ہو کر اور خوب سمٹ کر نماز پڑھے[3]۔

حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ عورت جب سجدہ کرے تو اپنا پیٹ اپنی رانوں سے چپکا لے اور اپنی سرین کو اوپر نہ اٹھائے اور اعضاء کو اس طرح دور نہ رکھے جیسے مرد دور رکھتا ہے[4]۔

حضرت مجاہدؒ اس بات کو مکروہ جانتے تھے کہ مرد جب سجدہ کرے تو اپنے پیٹ کو رانوں پر رکھے جیسا کہ عورت رکھتی ہے[5]۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سوال ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عورتیں کیسے نماز پڑھتی تھیں آپ نے فرمایا چہار زانوں بیٹھ کر پھر انہیں حکم دیا گیا کہ وہ خوب سمٹ کر بیٹھا کریں۔

حضرت ابوہریرۃ ؓ سے مروی ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اگر امام کو لقمہ دینا ہو تو سبحان اللہ کہنا مردوں کے لئے ہے اور تصفیق (ایک ہاتھ کی پشت پر دوسرے ہاتھ کی پشت سے مارنا) عورتوں کے لئے (اس لئے کہ عورتوں کے لئے پردے کا حکم ہے)[6]۔

---

[1] کنز العمال ج ۷ ص ۵۴۹

[2] مصنف ابن ابی شیبۃ ج ۱ ص ۲۷۹، سنن کبریٰ بیہقی ج ۲ ص ۲۲۲

[3] مصنف ابن ابی شیبۃ ج ۱ ص ۲۷۰

[4] مصنف ابن ابی شیبۃ ج ۱ ص ۲۷۰ بیہقی ج ۲ ص ۲۲۲

[5] مصنف ابن ابی شیبۃ ج ۱ ص ۲۷۰، قال صاحب اعلاء السنن: ہذا اسناد صحیح۔ (اعلاء السنن، ج 3/ص: 27)

[6] بخاری ج ۱ ص ۱۶۰، مسلم ج ۱ ص ۱۸۰، ترمذی ج ۱ ص ۸۵

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بالغہ عورت کی نماز اوڑھنی کے بغیر قبول نہیں ہوتی[1]۔ (اور مرد کے لئے دوپٹہ نہیں)

حضرت مولانا عبدالحئی لکھنویؒ فرماتے ہیں رہا ہاتھ باندھنے کا معاملہ) عورتوں کے حق میں تو تمام فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ ان کے لئے سنت سینے پر ہاتھ باندھنا ہے[2]۔

امام ابوزید قیروانی مالکیؒ فرماتے ہیں کہ عورت نماز کی ہیئت میں مرد ہی کی طرح ہے الا یہ کہ عورت اپنے آپ کو ملا کر رکھے گی اپنی رانیں اور بازو کھول کر نہیں رکھے گی پس عورت اپنے جلسہ اور سجدے دونوں میں خوب ملی ہوئی اور سمٹی ہوئی ہوگی[3]۔

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو یہ ادب سکھلایا ہے کہ وہ پردہ کریں اور یہی ادب اللہ کے رسول ﷺ نے بھی عورتوں کو سکھلایا ہے لہٰذا عورتوں کے لئے سجدہ میں پسندیدہ یہ ہے کہ وہ اپنے اعضاء کو ملا کر رکھیں اور پیٹ کو رانوں سے چپکالیں اور اس طرح سجدہ کریں کہ ان کے لئے زیادہ سے زیادہ پردہ ہوجائے اسی طرح ان کے لئے پسندیدہ ہے رکوع میں بھی اور جلسہ میں بھی بلکہ تمام نماز ہی میں کہ وہ اس طرح نماز پڑھیں کہ جس سے ان کے لئے زیادہ سے زیادہ پردہ ہوجائے[4]۔

امام خرقی حنبلیؒ فرماتے ہیں کہ مرد و عورت اس میں برابر ہیں سوائے اس کے کہ عورت رکوع و سجود میں اپنے آپ کو اکٹھا کرے (سکیڑے) پھر یا تو چہار زانو بیٹھے یا سدل کرے کہ دونوں پاؤں کو دائیں جانب نکال دے ابن قدامہ حنبلیؒ اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ اصل یہ ہے کہ عورت کے حق میں نماز کے وہی احکام ثابت ہیں جو مرد کے لئے ثابت ہیں کیونکہ خطاب دونوں کو شامل ہے بایں ہمہ عورت مرد کی مخالفت کرے گی ترک تجافی میں (یعنی عورت مرد کی طرح رانوں کو پیٹ سے دور نہیں

---

[1] ترمذ ج ۱ ص ۸۶، ابوداؤد ج ۱ ص ۹۴

[2] السعایہ ج ۲ ص ۱۵۶

[3] الرسالہ بحوالہ نصب العمود ص ۵۰

[4] کتاب الام ج ۱ ص ۱۱۵

رکھے گی بلکہ ملائے گی) کیونکہ عورت ستر کی چیز ہے لہٰذا اس کے لئے اپنے آپ کو سمیٹ کر رکھنا مستحب ہے تاکہ یہ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ ستر کا باعث بنے وجہ یہ ہے کہ عورت کے لئے رانوں کو پیٹ سے جدا رکھنے میں اس بات کا اندیشہ ہے کہ اس کا کوئی عضو کھل جائے----امام احمدؒ فرماتے ہیں مجھے عورت کے لئے سدل (بیٹھنے میں دونوں پاؤں کو بائیں جانب نکالنا) زیادہ پسند ہے اور اسی کو خلالؒ نے اختیار کیا ہے[1]۔

مندرجہ بالا احادیث و آثار، اجماع امت اور فقہاء کرام کے اقوال سے ثابت ہو رہا ہے کہ مرد و عورت کی نماز ایک جیسی نہیں دونوں میں فرق ہے (۱) مرد تکبیر کہتے وقت دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھائیں گے اور عورتیں کندھوں تک جیسا کہ حدیث نمبر 1، نمبر 2، نمبر 3 سے واضح ہے مراکز اسلام مدینہ طیبہ میں امام زہریؒ مکہ مکرمہ میں حضرت عطاءؒ اور کوفہ میں حضرت حمادؒ یہی فتویٰ دیتے تھے کہ عورت اپنے کندھوں تک ہاتھ اٹھائے تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں۔(مصنف ابن ابی شیبۃ ج ۱ ص ۲۳۹)

(۲) مرد دونوں ہاتھ ناف کے نیچے باندھیں گے اور عورتیں سینہ پر۔ مردوں کا ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا احادیث سے اور عورتوں کا سینے پر ہاتھ باندھنا اجماع امت سے ثابت ہے جیسا کہ مولانا عبدالحیؒ لکھنویؒ کے بیان سے واضح ہے۔

(۳) مرد سجدے میں پیٹ رانوں سے اور بازو بغل سے جدا رکھیں گے اور عورتیں ملا کر جیسا کہ احادیث نمبر 654 سے واضح ہے۔

(۴) مرد سجدے میں اپنے دونوں پاؤں پنجوں کے بل کھڑے اور دونوں بازو زمین سے جدا رکھیں گے اور عورتیں دونوں پاؤں دائیں طرف نکال کر اور بازو زمین سے لگا کر سجدہ کریں گی۔

(۵) مرد دونوں سجدوں کے درمیان نیز دونوں قعدوں میں دایاں پاؤں کھڑا کرکے اور بائیں پاؤں کو بچھا کر اس پر بیٹھیں گے اور عورتیں ان سب میں دونوں پاؤں دائیں طرف نکال کر کولھوں پر بیٹھیں گی۔

---

[1] المغنی لابن قدامۃ ج ۱ ص ۵۶۲

(۶) اگر عورتیں مردوں کے ساتھ جماعت میں شریک ہوں اور امام کو غلطی پر متنبہ کرنا پڑے تو مرد سبحان اللہ کہیں گے اور عورتیں ہاتھ کی پشت پر ہاتھ مار کر متنبہ کریں گی جیسا کہ حدیث نمبر ۱۱ سے واضح ہے۔

(۷) مرد کی نماز ننگے سر بھی ہو جائے گی اگرچہ مکروہ ہے۔ لیکن عورت کی نماز ننگے سر ہرگز نہیں ہوتی۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

سینے پر ہاتھ باندھ کر یہ دعا پڑھیں :

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر { اولی } اور قراءت کے درمیان کچھ دیر چپ رہتے۔ پس میں نے کہا : میرے ماں باپ آپ پر قربان اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ تکبیر اور قراءت کے درمیان خاموش رہ کر کیا پڑھتے ہیں ؟ آپ نے فرمایا میں یہ پڑھتا ہوں :

اللهم باعد بيني وبين خطاياي كما باعدت بين المشرق والمغرب اللهم نقني من الخطايا كما ينقي الثوب الابيض من الدنس اللهم اغسل خطاياي بالماء والثلج والبرد

یا اللہ میرے اور میرے گناہوں کے درمیان دوری ڈال دے جیسے تو نے مشرق اور مغرب کے درمیان دوری رکھی ہے۔ اے اللہ مجھے گناہوں سے اس طرح پاک کر جیساء کے سفید کپڑا میل سے پاک کیا جاتا ہے۔ اے اللہ میرے گناہ { اپنی بخشش کے } پانی برف اور اولوں سے دھو ڈال [1]۔

---

[1] بخاري باب مايقول بعد التكبير حديث 744 مسلم باب مايقال بين التكبيرة الاحرام والقرءة حديث 598

یا یہ دعا پڑھیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ایک شخص نے کہا:

اللہ اکبر کبیرا والحمد للہ کثیرا وسبحان اللہ بکرۃ واصیلا

اللہ سب سے بڑا ہے بہت بڑا۔ساری تعریف اس کی ہے وہ {ہر عیب سے} پاک ہے صبح اور شام ہم اس کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس شخص کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیے گئے ہیں۔

حضرت ابن عمر نے فرمایا: جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی ہے میں نے ان کلمات کو کبھی نہیں چھوڑا[1]۔

﴿غیر مقلد احباب فرماتے ہیں:﴾

یا یہ دعا پڑھیں: سبحانك اللهم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالى جدك ولا اله غيرك

اے اللہ تو پاک ہے {ہم} تیری تعریف کے ساتھ {تیری پاکی بیان کرتے ہیں} تیرا نام {بڑا ہی} بابرکت ہے تیری بزرگی بلند ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں[2]۔

پھر یہ پڑھیں: اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم من همزه ونفخه ونفثه

اللہ کی پناہ مانگتا ہوں جو {ہر آواز کو} سننے والا {اور ہر چیز کو} جاننے والا ہے مردود شیطان {کے شر} سے اس کے خطرے سے اس کی پھونکوں سے اور اس کے وسوسے سے[3]۔

تبصرہ:

---

[1] مسلم باب مایقال بین التکبیرۃ الاحرام والقرءۃ حدیث 601

[2] ترمذي باب مايقول عند افتتاح الصلاة حديث 243 ابو داؤد باب من راي الاستفتاح حديث 775، 776 ابن ماجہ باب افتتاح الصلاۃ حدیث 806 اسے حاکم 1 / 235 اور حافظ ذہبی نے صحیح کہا ہے

[3] ابو داؤد باب من رای الاستفتاح حدیث 775 اسے ابن خزیمہ حدیث 467 نے صحیح کہا ہے

ہم حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ پہلی دعا (سبحانک اللہ الخ) کے بارے میں حدیث میں صاف الفاظ ہیں اذا قام من اللیل یعنی جب نماز تہجد کے لئے کھڑے ہوتے ۔ یہ حدیث رات کے نماز کے ساتھ خاص ہے آپ نے اس کو عام کردیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ امام ترمذی اس حدیث کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ یحی بن سعید اس حدیث کے ایک راوی ہے اور علی بن علی اس حدیث کے دوسرے راوی ہے ان دونوں پر کلام کرتے ہیں امام احمد بن حنبل اس حدیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ صحیح نہیں۔ اس حدیث کی تصحیح تو ابن خزیمہ سے نقل کی گئی لیکن ابن خزیمہ نے اس کے بارے میں جو کہا ہے اس کو چھوڑا گیا ہے۔ امام ابن خزیمہ فرماتے ہیں" امام ابوبکر فرماتے ہیں ,یہ خبر دعا کے بارے میں نہ تو زمانہ قدیم میں سنی گئی اور نہ ہی زمانہ جدید میں ۔ دوسری دعا (اعوذ باللہ الخ) کی تصحیح کو بھی ابن خزیمہ کی منسوب کردی گئی ہے حالانکہ یہ حدیث 467 صرف پہلی دعا کے بارے میں ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم . الحمدلله رب العالمين . الرحمن الرحيم . مالك يوم الدين . اياك نعبد واياك نستعين . اهدنا الصراط المستقيم . صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين[1] .

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت رحم کرنے والا بے حد مہربان ہے۔ ساری تعریف اللہ کے لئے ہے جو تمام مخلوقات کا رب ہے۔ بے حد رحم کرنے والا بے حد مہربان ہے۔ بدلے کے دن کا مالک ہے۔ {اے اللہ} ہم تیری عبادت کرتے ہیں تجھ ہی مدد مانگتے ہیں ہمیں سیدھے راستے پر چلا ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو نے انعام کیا ہے۔ جن پر غضب نہیں کیا گیا جو گمراہ نہیں ہوئے۔ {آمین}

---

[1] الفاتحة 1/1۔7

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی للہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ تعالی عنہما قراۃ الحمد للہ رب العالمین سے شروع کرتے [1]۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی للہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ تعالی عنہما کے پیچھے نماز پڑھی وہ بلند آواز سے بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں پڑھتے تھے [2]۔

آپ بسم اللہ الرحمن الرحیم سراً آہستہ پڑھتے تھے [3]۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ للہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث کی معرفت رکھنے والے اس امر پر متفق ہیں کہ { امام کے لئے } بسم اللہ زور سے پڑھنے کی کوئی صریح روایت نہیں [4]۔

اگر نماز میں جمائی آجائے تو اسے حتی الوسع روکیں نہ رکے تو منہ پر ہاتھ رکھیں اور آواز بلند نہ کریں [5]۔

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

---

[1] بخاري باب مايقول بعد التكبير حديث 743 مسلم باب حجة من قال لا يجهر بالبسملة حديث 399

[2] مسلم حواله سابق حديث 399

[3] ابن خزيمة حديث 495

[4] تبصرہ: بسم اللہ کے زور سے پڑھنے اور آہستہ پڑھنے کے بارے میں محققین "نماز نبوی" کے ہاں نہایت ہی تذبذب پایا جا رہا ہے۔ ایک طرف فرماتے ہیں کہ بسم اللہ جہر سے پڑھنے کے بارے میں کوئی صحیح حدیث نہیں ہے، دلیل کے طور پر سیدنا انس کی مذکورہ بالا حدیث پیش کرتے ہیں جبکہ امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ حدیث کی معرفت رکھنے والے اس امر پر متفق ہیں کہ بسم اللہ زور سے پڑھنے کے بارے میں کوئی صریح حدیث نہیں ہے۔ جبکہ اب زبیر مرحوم علی زئی صاحب کا فتوی تسہیل الوصول میں ملاحظہ ہو " حضرت عبدالرحمٰن بن ابزی فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر کے پیچھے نماز پڑھی تو آپ نے بسم اللہ بالجہر { بلند آواز سے } پڑھی { بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ } ۔ محقق صاحب فرماتے ہیں کہ اس کی سند بالکل صحیح ہے دیکھئے میری کتاب ہدایۃ المسلمین فی جمع الاربعین ۔۔ جناب عبد اللہ بن عباس و عبد اللہ بن زبیر سے ہی بسم اللہ بالجہر ثابت ہے ۔۔ حکیم صادق اور دیگر علمائے حدیث کا یہ فیصلہ بالکل صحیح ہے کہ بسم اللہ آہستہ یا پکار کر پڑھنا دونوں ثابت ہے "۔ اب ہم پوچھنے میں حق بجانب ہے کہ دونوں میں سے کون سا فتوی صحیح ہے؟ نماز نبوی یا تسہیل الوصول والا؟۔

[5] ترمذي باب ماجاء في كراهية التثاوب في الصلاة حديث 370 امام ترمذی نے اسے صحیح کہے ہے

جہر بسم اللہ قبل الفاتحہ:

اس سلسلہ میں جو احادیث صحیحہ وارد ہیں ان میں جہر تسمیہ کی تصریح نہیں ہے اور جن روایات میں جہر تسمیہ کی تصریح ہے وہ صحیح نہیں ہیں۔

نیز امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: "اہل علم کا اتفاق ہے کہ سورہ فاتحہ سے پہلے تسمیہ اونچی پڑھنے کے بارے میں کوئی صحیح حدیث موجود نہیں، جسے اہل سنن نے نقل کیا ہو، البتہ اونچی بسم اللہ پڑھنے کا تذکرہ من گھڑت روایات میں ضرور ملتا ہے، ابن تیمیہ اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں نماز کے دوران اونچی تسمیہ کے مسئلہ میں جھوٹی روایتیں گھڑ کر اس دینی مسئلہ کو مشتبہ بنادیا یہی وجہ ہے کہ سفیان ثوری اور دیگر ائمہ اہل سنت نے فرمایا کہ موزوں پر مسح کرنا اور تسمیہ آہستہ پڑھنا اہل سنت ہونے کی پہچان ہے جیسا کہ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کو مقدم ماننا اہل سنت کی علامت ہے چونکہ ان کے برعکس دوسری چیز میں شیعہ کی نمایاں علامات ہیں۔" (مختصر فتاوی ابن تیمیہ، ص: 46 تا 48)

تسمیہ و تعوذ آہستہ کہنا:

"سیدنا انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ، ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی، لیکن ان میں سے کسی نے بھی بلند آواز سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں پڑھا[1]"۔

"ابو وائلؓ فرماتے ہیں کہ سیدنا علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ (نماز میں) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، تعوذ اور آمین بلند آواز سے نہیں کہتے تھے[2]"۔

اس روایت کی سند میں ابو سعد بقال مختلف فیہ راوی ہیں بعض حضرات نے اگرچہ ان کی تضعیف ہے لیکن بعض دوسرے علماء و محدثین مثلاً ابن جریج، حاکم اور ابوزرعہ نے ان کی توثیق بھی کی ہے اور

---

[1] سنن النسائي: 135/2، كتاب الصلاة، باب 22 ترك الجهر ببسم الله الرحمن الرحيم، حديث: 907 وصحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب 13 حجة من قال: لا يجهر بالبسملة، حديث: 399

[2] المعجم الكبير للطبراني: 263/9، حديث: 9304، مجمع الزوائد: 281/2، كتاب الصلاة، باب 180 في بسم الله الرحمن الرحيم، حديث: 2632، وفيه أبو سعد البقال وهو ثقة مدلس

علامہ ہیثمی نے مجمع الزوائد میں ان کے بارے میں لکھا ہے: ثقہ مدلس اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فتح الباری میں ایک ایسی حدیث کی تحسین کی ہے جس کا مدار ابو سعید بقال پر ہے، نیز امام ترمذی نے علل کبریٰ میں ان کے بارے میں امام بخاری کا قول نقل کیا ہے: "ھو مقارب الحدیث" اس سے معلوم ہوا کہ یہ امام بخاری کے نزدیک بھی ثقہ ہیں لہٰذا ان کی روایت درجۂ حسن سے کم نہیں[1]۔

"براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم آہستہ پڑھتے تھے[2]"۔

ہاتھ باندھنے کے بعد ثناء پڑھنا:

"ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز شروع کرتے تو یہ دعا پڑھتے: "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ" یعنی اے اللہ تو پاک ہے، (ہم) تیری تعریف کے ساتھ (تیری پاکی بیان کرتے ہیں) تیرا نام بابرکت ہے تیری بزرگی (مرتبہ) بلند ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں[3]"۔

"سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب تکبیر تحریمہ کہتے تو دونوں ہاتھوں کو کانوں تک اٹھاتے اور یہ پڑھتے: سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ[4]"

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: درس ترمذی: 1/524-25 باب ماجاء فی التامین تالیف: شیخ مفتی تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ

[2] جامع المسانيد للامام ابو المؤيد الخوارزمي: 1/347

[3] سنن ابي داود، كتاب الصلاة، باب 119-120 من رأى الاستفتاح ب سبحانك الخ، حديث: 776، سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 179 ما يقول عند افتتاح الصلاة، حديث: 243، سنن ابن ماجة، كتاب اقامة الصلاة، باب 1 افتتاح الصلاة، حديث: 804

[4] المعجم الاوسط للطبراني: 3/242 من اسمهأنس، حديث: 3039، مجمع الزوائد: 2/107، كتاب الصلاة، باب 179 ما يستفتح بهالصلاة، حديث: 2622 و قال رجالهم و ثقون اس حدیث کو امام طبرانی نے معجم اوسط میں روایت کیا ہے اور اس کے سارے راوی ثقہ ہیں

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھنا :

"اسود فرماتے ہیں کہ میں نے سیدنا عمر کو نماز شروع کرتے ہوئے سنا انہوں نے تکبیر کے بعد سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَا اِلٰہَ غَیْرُکَ پڑھا پھر اعوذ باللہ پڑھا[1]"۔

تعوذ اور تسمیہ کا تعلق قرآن مجید کی قراءت سے ہے، اس لئے جس کے ذمہ قرآن کی تلاوت ہو وہ تعوذ وتسمیہ پڑھے گا یعنی امام اور منفرد، لیکن مقتدی کے ذمہ چونکہ قرات نہیں اس لئے وہ تعوذ اور تسمیہ بھی نہیں پڑھے گا۔ علامہ ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

"بیشک تعوذ قراءت کی سنت میں سے ہے لہٰذا قرآن پڑھنے والا ہر شخص اسے پڑھے گا... البتہ مقتدی نہیں پڑھے گا[2]"۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا :

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا کرتے تھے[3]۔

"عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سب سے پہلی وحی جو جبریل علیہ السلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے، تو انہوں نے کہا کہ اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پڑھئے " أَسْتَعِیْذُ بِالسَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ " پھر کہئے : "بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ " پھر اپنے رب کے نام سے پڑھیے جس نے پیدا کیا"[4]۔

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ: 214/1، کتاب الصلاۃ، باب 6 في التعوذ، روایت: 2456

[2] البحر الرائق: 542/1، باب صفة الصلاة

[3] سنن الدار قطني : 302/1، حديث: 1142، باب وجوب قراءة بسم اللهالرحمن الرحيم. اس حدیث کے بارے میں محقق مجدی بن منصور بن سید الشوری رحمۃ اللہ علیہ نے غسانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے : هذا اسناد علوي لا بأس به۔" (حاشیہ سنن الدارقطنی: 302/1)اس کی سند میں سیدنا علی کے خاندان کے افراد ہیں اس سے استدلال درست ہے"۔اور یہی بات علامہ زیلعی نے خود امام علی بن عمر الدارقطنی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کی ہے: قال الدار قطني هذا اسناد علوي لا بأس به. (نصب الرایہ: 325/1،روایت: 1402کے تحت)

[4] تفسیر الطبري: 113/1 تفسیر البسمله، روایت: 137 وتفسیر ابن کثیر : 113/1، فصل معنی استعاذة

جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ تسمیہ کا تعلق بھی تلاوت قرآن مجید سے ہے لہٰذا جس کے ذمہ قراءت ہو وہ بسم اللہ پڑھے گا یعنی صرف امام یا تنہا نماز پڑھنے والا مقتدی بسم اللہ نہیں پڑھے گا۔

قراءت کرنا:

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بغیر قراءت کے نماز نہیں ہوتی [1]۔

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہمیں حکم دیا گیا تھا کہ ہم سورۃ فاتحہ اور اس کے بعد جو پڑھ سکتے ہوں، پڑھیں [2]۔

"رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ... کہ جب تم نماز پڑھنے لگو، اور اپنا چہرہ قبلہ کی طرف کرو، تو تکبیر کہو، پھر ام القرآن یعنی سورۂ فاتحہ پڑھو اور اس کے بعد اللہ کی توفیق سے جو پڑھ سکو، پڑھو [3]"۔

نماز میں قراءت کرنا رکن یعنی فرائض نماز میں سے ہے، قرآن کریم کی کم از کم تین چھوٹی آیات یا ایک بڑی آیت کا پڑھنا فرض ہے، قراءت کے بغیر نماز درست نہیں ہوتی، البتہ جو لوگ قراءت کرنے سے عاجز ہوں ان کی نماز بغیر قراءت کے درست ہو جائے گی کیوں کہ اللہ تعالی نے انسان کو اس کی طاقت وصلاحیت کے مطابق ہی مکلّف بنایا ہے۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا [4]

---

[1] صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب 11 وجوب قراءة الفاتحة، حديث: 396

[2] سنن ابي داؤد، كتاب الصلاة، باب 131-132 من ترك القراءة في صلاته بفاتحة الكتاب، حديث: 818

[3] سنن ابي داؤد، كتاب الصلاة، باب 143-144 صلاة من لا يقيم صلبه، حديث: 859 وهكذافي سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 226 ماجاء في وصف الصلاة، حديث: 302 وهكذا في سنن النسائي: 193/2، كتاب التطبيق، باب 15 الرخصة في ترك الذكر في الركوع، حديث: 1053 وصحيح ابن حبان، باب صفة الصلاة، حديث: 1787 و صححه الألباني

[4] سنن ابي داؤد، كتاب الصلاة، باب 143-144 صلاة من لا يقيم صلبه، حديث: 859 وهكذافي سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 226 ماجاء في وصف الصلاة، حديث: 302 وهكذا في سنن النسائي: 193/2، كتاب التطبيق،

فتاویٰ ہندیہ میں ہے: "فان عجز عن القراء ة يؤمي ايماء بغير قراء ة[1]".
اگر کوئی شخص قرآن نہ پڑھ سکتا ہو تو وہ بغیر قراءت کئے صرف اشارہ سے نماز پڑھ لے۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

عورتیں بازو نہ بچھائیں:

بہت سی عورتیں سجدے میں بازو بچھا لیتی ہیں اور پیٹ کو رونوں سے ملا کر رکھتی ہیں اور دونوں قدم بھی زمین پر کھڑے نہیں کرتیں۔ واضح ہو کہ یہ طریقہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان اور سنت پاک کے خلاف ہے۔ سنیے! رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: تم میں سے کوئی (مرد یا عورت) اپنے بازو سجدے میں اس طرح نہ بچھائے جس طرح کتا بچھاتا ہے[2]۔

تبصرہ:

ہم (اہل سنت) تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ: قارئین کرام بریکٹ میں بند الفاظ {مرد یا عورت} طرف سے دین میں مداخلت اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہاتھ صاف کرنے کی مترادف ہے۔ کیونکہ ان حضرات کے اپنے ہی اصول کے مطابق یہ حدیث عورتوں کے

باب 15 الرخصة في ترك الذكر في الركوع، حديث: 1053 وصحيح ابن حبان، باب صفة الصلاة، حديث: 1787 و صححه الألباني

سورة البقرة، آیت: 286

[1] سنن ابي داؤد، كتاب الصلاة، باب 143-144 صلاة من لا يقيم صلبه، حديث: 859 وهكذافي سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 226 ماجاء في وصف الصلاة، حديث: 302 وهكذا في سنن النسائي: 193/2، كتاب التطبيق، باب 15 الرخصة في ترك الذكر في الركوع، حديث: 1053 وصحيح ابن حبان، باب صفة الصلاة، حديث: 1787 و صححه الألباني

الفتاویٰ الهندية: 138/1، الباب الرابع عشر في صلاة المريض

[2] بخاري باب لايعرش ذراعيه في السجود حديث 822 مسلم باب الاعتدال في السجود حديث 493

بارے میں خاموش ہے۔ جب عورتوں کے لئے احادیث میں الگ طریقہ موجود ہے تو پھر عورتوں کو اس حدیث میں شامل کرنا { حالانکہ یہ خطاب صرف مردوں سے ہے } ۔ سیدنا علی سے روایت ہے کہ جب عورت سجدہ کرے تو خوب سمٹ کرے اور اپنی دونوں رانوں کو ملائے رکھے { مصنف ابن ابی شیبہ حدیث 2777 }۔ سیدنا ابن عباس سے عورت کی نماز کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ اکھٹی ہو کر اور خوب سمٹ کر نماز پڑھے۔ { مصنف ابن ابی شیبہ حدیث 2778 بیہقی حدیث 197 } بیہقی اور ابوداؤد میں روایت ہے آنحضرت ﷺ دو عورتوں کے پاس سے گزرے جو نماز پڑھ رہی تھیں آپ ﷺ نے فرمایا جب تم سجدہ کرو تو اپنے جسم کا کچھ حصہ زمین سے ملالیا کرو کیونکہ عورت اس حالت { سجدہ } میں مرد کی طرح نہیں ہے { سنن بیہقی حدیث 3201 مراسیل ابوداؤد } ۔ نیز ابراہیم النخعی تابعی فرماتے ہیں کہ عورت جب سجدہ کرے تو اپنا پیٹ اپنے رانوں سے چپکالے اور سرین کو اوپر نہ اٹھائے اور اعضا کو اس طرح دور دور نہ رکھیں جس طرح مرد رکھتا ہے { مصنف ابن ابی شیبہ حدیث 2779 }۔ بڑے مشہور تابعی امام مجاہد مرد کا اس طرح سجدہ کرنے کو مکروہ سمجھتے تھے کہ اپنے پیٹ کو رانوں پر رکھیں جیسا کہ عورت کرتی ہے { مصنف ابن ابی شیبہ حدیث 2780 } امام شافعی فرماتے ہیں کہ عورت اس طرح سجدہ کرے کہ اپنے اعضا کو ملا کر رکھے اور پیٹ کو رانوں سے چپکالے اور اس طرح سجدہ کرے کہ ان کے لئے زیادہ سے زیادہ پردہ ہو جائے { کتاب الام 115/1 بحوالہ حدیث اور اہل حدیث } ۔ امام احمد بن حنبل بھی یہی فرماتے ہیں { مغنی ابن قدامہ 562/1 بحوالہ حدیث اور اہل حدیث } ۔ مقام غور ہے کہ اگر یہ حکم عام ہے تو پھر خلیفہ راشد حضرت علی اور ترجمان السنۃ ابن عباس نے عورتوں کو کیوں اس حکم سے خاص کیا؟ نیز کیا حضرت علی اور ابن عباس نے عورتوں کو خلاف سنت طریقہ سکھایا؟ نیز اگر اس قسم کے احادیث عام ہو تو کیا آپ کے ہاں مردوں کا امام عورت بھی بن سکتی ہے کیونکہ حدیث تو عام ہے { یؤم القوم اقرءہم لکتاب اللہ } نیز کیا آپ کے ہاں عورت مؤذن بھی بن سکتی ہے؟ کیونکہ حدیث تو عام ہے آپ ﷺ نے فرمایا جب نماز کا وقت ہو تو تم سے کوئی ایک اذان کہے { بخاری } نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا: والیؤمکم اکبرکم { بخاری } یہ بھی عام ہے اگر کسی وقت مسجد میں بڑی عمر کی عورت موجود ہو تو

اس وقت کسی اور کا امام بننا یا بنانا جائز ہے؟ آپ کے اصول کے مطابق کے جب حدیث صحیح ہو تو اس پر عمل فرض ہے {حوالہ گزر چکا ہے} ۔

نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان سے صاف عیاں ہے کہ نمازی مرد یا عورت کو اپنے دونوں ہاتھ زمین پر رکھ کر دونوں کہنیاں زمین سے اٹھا کر رکھنی چاہئیں، نیز پیٹ بھی رانوں سے جدا رہے اور سینہ بھی زمین سے اونچا ہو۔

میری معزز مسلمان بہنو! اپنے پیارے رسول اکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق نماز پڑھو۔آپ مسلمان مردوں اور عورتوں کو یکساں ارشاد فرماتے ہیں: سجدے میں اپنے دونوں ہاتھ زمین پر رکھ اور اپنی دونوں کہنیاں بلند کر [1]۔

رسول اللہ ﷺ جب سجدہ کرتے تو اگر بکری کا بچہ ہاتھوں بانہوں کے نیچے سے گزرنا چاہتا تو گزر سکتا تھا [2]۔

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

عورتیں مردوں کی طرح رکوع سجدہ اور دیگر ارکان ادانہ کریں:

خواتین کے بارے میں شریعت کا عمومی مزاج یہ ہے کہ ہر کام میں حتی الامکان ستر وحجاب سے کام لیں، جن کاموں میں بے حجابی کا اندیشہ تھا وہاں عورتوں کے لئے استثنائی احکام رکھے گئے ہیں، مردوں پر جہاد فرض ہے، عورتوں پر جہاد فرض نہیں، بلکہ رسول اللہ ا نے تو حج ہی کو ان کا جہاد قرار دیا:

"ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ا) ہمارا خیال ہے کہ جہاد سب سے افضل عمل ہے تو کیا ہم جہاد نہ کریں؟ تو آپ ا نے فرمایا کہ نہیں، لیکن (تم عورتوں کے لئے) سب سے افضل جہاد حج مبرور ہے [1]"

---

[1] حوالہ سابق

[2] مسلم باب الاعتدال في السجود حديث 494

جمعہ وعیدین اور جماعت کے واجبات سے وہ مستثنیٰ ہیں، نہ وہ امام ہو سکتی ہیں نہ مؤذن، ان کے لئے گھر میں نماز پڑھنا مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے [2]

مسجد آ ہی جائیں تو ان کی صف سب سے آخر رکھی گئی، پہلے مرد پھر بچے اس کے بعد عورتیں، اس لئے فقہاء نے نماز کی کیفیت وہیئت میں بھی مرد وعورت میں کسی قدر فرق رکھا ہے، اور کوشش کی ہے کہ عورتیں ایسا طریقہ اختیار کریں کہ اس میں زیادہ ستر وحجاب کی رعایت ہو۔

یہی حضرات فقہاء اور محدثین کا مسلک ہے اور اکثر اہل علم اسی کے قائل ہیں، ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں [3]۔

علامہ دردیر مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے آدابِ مسجد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حالت سجدہ میں پیٹ رانوں، کہنیاں گھٹنوں اور بازو پہلو سے الگ رہنے چاہئیں۔ لیکن عورتیں ان سب کو ملا کر اور سمیٹ کر رکھیں، اسی طرح قعدہ میں مردوں کو رانیں کسی قدر علیحدہ رکھنی چاہئے۔ مگر عورتوں کو ملا کر ہی رکھنا چاہئے [4]۔ فقہاء شوافع وحنابلہ نے بھی مختلف کیفیات خصوصا رکوع وسجود اور قعدہ میں مرد وعورت کے طریقے مختلف رکھے ہیں، چنانچہ علامہ ابن قدامہ مقدسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"اس سلسلہ میں عورت اور مرد برابر ہیں البتہ عورتیں رکوع اور سجود میں اپنے آپ کو ملا کر اور سمیٹ کر رکھیں گی، اور چہار زانوں بیٹھیں گی، یا اپنے پیروں کو دائیں طرف نکال کر بیٹھیں گی"۔

---

[1] صحیح البخاري، کتاب الحج، باب 4 فضل الحج المبرور، حدیث: 1520 اور دیکھئے: حدیث: 1861 و 2784 و 2875 سنن النسائی، حدیث: 2626 و 2628

[2] بیہقی: 131/3 و فتح الباری: 350/2 حدیث: 869 کے تحت

[3] الشرح الصغیر: 329/1

[4] الشرح الصغیر: 330/1

چنانچہ شریعت کی اِسی روح کو سامنے رکھتے ہوئے سیدنا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے:
"اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو یہ ادب سکھلایا ہے کہ وہ پردہ کریں اور یہی ادب اللہ کے رسول انے بھی سکھلایا ہے، اور عورتوں کے لئے سجدہ میں بہتر ہے کہ وہ اپنے اعضاء ملا کر رکھیں، پیٹ کو رانوں سے چپکا لیں، اور اس طرح سجدہ کریں کہ ان کے لئے زیادہ سے زیادہ ستر ہو، اسی طرح ان کے لئے بہتر ہے کہ رکوع میں بھی اور جلسہ میں بھی بلکہ تمام ہی نماز وہ اس طرح پڑھیں کہ جس سے ان کے لئے زیادہ سے زیادہ پردہ ہو جائے[2]"۔

نیز محدث کبیر امام بیہقی نے عورتوں کے لئے رکوع وسجدہ کی ہیئت پر خصوصی باب قائم کرنے سے پہلے جو تمہید باندھی ہے وہ یوں ہے: نماز کے جن احکام میں مرد وعورت کے درمیان فرق ہے، وہ اصلی طور پر ستر کے اصول پر مبنی ہے، عورت اس طریقہ پر مامور ہے جس میں اس کے لئے زیادہ ستر ہو[3]۔

غرض احادیث، آثارِ صحابہ ث اور تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ کے فتاویٰ سے واضح ہے کہ مرد وعورت کی نماز کی کیفیت میں بعض امور میں فرق کیا جائے گا، یہ رائے شریعت کے اس مزاج سے بھی موافقت رکھتی ہے کہ خواتین کے لئے زیادہ سے زیادہ ستر کا لحاظ رکھا جانا چاہئے اور یہی سلف صالحین، ائمہ متبوعین، محدثین اور فقہاء مجتہدین رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین کی رائے ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

نماز اور سورۃ فاتحہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لاصلوۃ لمن لم یقراء بفاتحۃ الکتاب[4]

---

[1] دیکھئے: مصنف ابن ابی شیبہ: 1/242-43 ومصنف عبدالرزاق: 3/137-139

[2] الکتاب الأم للامام الشافعی، باب التجافی فی السجود کتاب الصلاۃ، ط: بیت الأفکار الدولیۃ

[3] سنن البیهقي: 2/222

[4] بخاري باب وجوب القراءة للامام والماموم في الصلوات كلها حديث 756 مسلم باب وجول قراءة الفاتحة في كل ركعة حديث 394

جس شخص نے { نماز میں } سورت فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم نماز فجر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے تھے آپ نے قرآن پڑھا پس آپ پر پڑھنا بھاری ہو گیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا شاید تم اپنے امام کے پیچھے پڑھا کرتے ہو؟ ہم نے کہا ہاں اے اللہ رسول آپ نے فرمایا سوائے فاتحہ کے اور کچھ نہ پڑھا کرو کیونکہ اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو سورت فاتحہ نہ پڑھے [1]۔

ایک روایت میں { یہ بھی } ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ : { میں اپنے دل میں کہتا تھا } کہ قرآن پڑھنا مجھ پر دشوار کیو { ہو رہا } ہے؟ پھر میں نے جان لیا کہ تمہارے پڑھنے کی وجہ سے دشوار ہوا۔ پس جب میں پکار کر پڑھوں { جہری نماز میں } تو قرآن سے سورۃ فاتحہ کے سوا کچھ نہ پڑھو [2]۔ [3]

---

[1] ابو داؤد باب من ترك القراءة في صلاته {بفاتحة الكتاب} حديث 823 ترمذي باب في القراءة خلف الامام حديث 311 اسے ابن خزیمہ 1581 ابن حبان 460، 461 بیہقی نے صحیح جبکہ امام ترمذی اور دار قطنی نے حسن کہا ہے

[2] ابو داؤد باب من ترک القراءۃ فی صلاتہ حدیث 824 درقطنی نے اسے حسن اور بیہقی نے صحیح کہا ہے

[3] **تبصرہ:** ہم اس کے جوابا عرض کرتے ہیں کہ آپ ہی کے اصول کے مطابق یہ حدیث مقتدی کی قرات فاتحہ کے لئے قابل استدلال نہیں ہے کیونکہ حافظ زبیر علی زئی کا اصول ہے "ہر خاص ہر عام دلیل پر مقدم ہوتی ہے۔ مثلا مردار عموما حرام ہے اور مچھلی خصوصا حلال ہے لہذا مردار کا عمومی حکم مچھلی کے خاص حکم پر نہیں لگتا { نور العینین ص: 58 } آپ کی نقل کردہ یہ حدیث آپ ہی قول کے مطابق عام ہے۔ جو ہر نماز اور نمازی پر مشتمل ہے۔ اس کے مقابلے میں خاص دلیل یہ ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ہمیں وعظ اور سنن کا بیان فرمایا نماز سکھائی اور فرمایا: جب نماز پڑھنے لگو تو صفوں کو سیدھا کرو، پھر تم میں سے کوئی امامت کرے، جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو، جب قراءت کرے تو خاموش ہو جاؤ { صحیح مسلم کتاب الصلاۃ باب التشہد فی الصلاۃ } آپ کی نقل کردہ حدیث عبادہ بن صامت عام ہے اور صحیح مسلم میں حدیث ابو موسیٰ شعری خاص ہے۔ لہذا ہر خاص دلیل یعنی حدیث ابو موسیٰ اشعری ہر عام یعنی حدیث عبادہ بن صامت پر مقدم ہو گی۔ لہذا آپ ہی کے اصول کے مطابق حدیث عبادہ بن صامت سے حدیث ابو موسیٰ اشعری کے مقابلے میں استدلال کرنا باطل ٹھہرا اور یہ ہم نہیں بلکہ آپ کے امام حافظ زبیر علی زئی ہی سمجھاتے ہیں۔

تبصرہ ب: حافظ زبیر علی زئی صاحب کے بنائے ہوئے اصول میں سے درج اصول ہیں :

1 : حدیث کے معانی کو علما جانتے ہیں { مترجم موطا امام مالک ص: 65 }۔

2 : کتاب وسنت کا وہی مفہوم معتبر و مستند ہے جو سلف صالحین سے بلا اختلاف ثابت ہے۔ اگر کسی بات میں ان کا اختلاف ہو تو راجح کو ترجیح دی جائے گی { مترجم موطا امام مالک }۔

قارئین کرام محقق صاحب کے اصول کو سامنے رکھ کر ذرا علمائے سلف کو دیکھتے ہیں کہ وہ اس حدیث کا کیا مطلب نکالتے ہیں۔

1 : خلیفہ راشد حضرت علی نے فرماتے ہیں" تمہارے لئے امام کی قراءت کافی ہے { مصنف ابن ابی شیبہ الصلوۃ باب من کرہ القراءۃ خلف الامام }۔

2 : خلیفہ راشد حضرت علی فرماتے ہیں جو شخص امام کے پیچھے قراءت کرتا ہو وہ فطرت پر نہیں ہے { طحاوی باب القراءۃ خلف الامام۔ مصنف ابن ابی شیبہ الصلاۃ باب من کرہ القراءۃ خلف الامام }

3 : حبر الامہ حضرت عبداللہ بن مسعود اس حدیث کو منفرد کے بارے میں ہی سمجھتے تھے" ابن مسعود نماز پڑھ رہے تھے لوگوں کو دیکھا کہ امام کے ساتھ خود بھی قراءت کر رہے ہیں۔ تو نماز ختم کرکے فرمایا تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ قرآن سنتے نہیں سمجھتے نہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے خاموش رہ کر سننے کی ہدایت فرمائی ہے { تفسیر ابن کثیر سورۃ الاعراف آیت 204 }۔

4 : سیدنا جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں" جس نے ایک بھی رکعت نماز پڑھی اور اس میں سورہ فاتحہ نہیں پڑھی تو اس نے نماز نہیں پڑھی { یعنی نماز نہیں ہوئی } مگر یہ کہ امام کے پیچھے ہو { یعنی امام کے پیچھے ہو تو پھر فاتحہ نہیں پڑھے } { موطا امام مالک کتاب الصلوۃ باب ماجاء فی ام القران }۔

5 : حضرت عبداللہ بن عمر نے پوچھا جاتا کہ { مقتدی } امام کے پیچھے پڑھے یا نہیں ؟ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے: جب تم میں سے کوئی امام کے پیچھے ہو { نماز باجماعت میں } تو اس کے لئے امام کی قراءت کافی ہے اور جب اکیلے نماز پڑھے تو پھر قراءت کرے { موطا امام مالک کتاب الصلاۃ باب ترک القراءۃ خلف الامام }۔

6 : ترجمان القرآن عبداللہ بن عباس کا قول ہے: قرآن پڑھا جانے لگے تو خاموشی سے سنو یعنی جب کہ صلوۃ مفروضہ میں پڑھا جا رہا ہو { تفسیر ابن کثیر سورہ اعراف آیت 204 }۔

7 : حضرت ابوسعید خدری فرماتے ہیں تمہارے لئے امام کی قراءت کافی ہے { منصف ابن ابی شیبہ الصلوۃ باب من کرہ القراءۃ خلف الامام }۔

8 : حضرت سعد فرماتے ہیں جو شخص امام کے پیچھے قراءت کرے میں چاہتا ہوں کہ اس کے منہ میں انگارہ ہو { منصف ابن ابی شیبہ الصلوۃ باب من کرہ القراءۃ خلف الامام }۔

9 : حضرت بن ثابت فرماتے ہیں جو شخص امام کے پیچھے قراءت کرے اس کی نماز ہی نہیں { منصف ابن ابی شیبہ الصلوۃ باب من کرہ القراءۃ خلف الامام }۔

10 : حضرت عبداللہ بن شداد فرماتے ہیں جب امام ہو تو امام کی قراءت مقتدی کی قراءت ہے یعنی مقتدی امام کے پیچھے قراءت نہ کرے بلکہ امام کی قراءت اس کے لئے کافی ہے { منصف ابن ابی شیبہ الصلوۃ باب من کرہ القراءۃ خلف الامام }۔ { تلک عشرۃ کاملۃ }

ایک چھوٹا سا سوال: کیا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین ہمارے سلف نہیں ہے ؟۔

ائمہ متبوعین کے اقوال:

1 : امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں : مقتدی امام کے پیچھے کسی صورت قراءت نہ کرے {کتاب الاثار باب قراۃ خلف الامام} ۔

2 :امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں :جب امام جہر نماز میں قراۃ کر رہا ہو تو مقتدی نہ پڑھے یہی مجھے پسند ہے { موطا امام مالک القراۃ خلف الامام فیما لایجہر فیہ }

3 : امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں :آپ کا یہ قول کے سورہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی اکیلے نماز پڑھنے والے پر محمول ہے۔ ان کا ستدلال حضرت جابر کی حدیث سے ہے کہ انہوں نے فرمایا : جس شخص نے کسی رکعت میں سورہ فاتحہ نہیں پڑھی گویا اس نے نماز نہیں پڑھی الا یہ کہ وہ امام کے اقتدا میں ہو یہ معنی حضور اکرم ﷺ کے صحابی {حضرت جابر} نے بیان فرمایا ہے کہ یہ حدیث منفرد کے نماز پر محمول ہے {ترمذی الصلوۃ باب ماجاء فی ترک القراءۃ خلف الامام } ۔

4 :امام سفیان فرماتے ہیں یہ { سورہ فاتحہ پڑھنے کا } حکم اس شخص کے لئے ہے جو تنہا نماز پڑھے {ابوداؤد من ترک القراۃ فی صلاتہ } ۔

5 :سعید ابن مسیب فرماتے ہیں : { جب تم امام کے پیچھے ہو تو} امام کے لئے خاموش رہا کرو { مصنف بن ابی شیبہ الصلوۃ باب من کرہ القراۃ خلف الامام } ۔

6 :امام ابراہیم نخعی فرماتے ہیں : مقتدی کو امام کے پیچھے قراۃ کرنا مکروہ ہے { مصنف بن ابی شیبہ الصلوۃ باب من کرہ القراۃ خلف الامام } ۔

7 : امام ضحاک فرماتے ہیں : { مقتدی } کو امام کے پیچھے قراۃ کرنے سے روکتے تھے { مصنف بن ابی شیبہ الصلوۃ باب من کرہ القراۃ خلف الامام } ۔

8 :سعید بن جبیر تابعی فرماتے ہیں : { مقتدی کے لئے } امام کے پیچھے کوئی قراۃ نہیں ہے { مصنف بن ابی شیبہ الصلوۃ باب من کرہ القراۃ خلف الامام } ۔

9 : سوید بن غفلہ فرماتے ہیں : { مقتدی تو } ظہر اور عصر میں بھی امام کے پیچھے قراۃ نہ کرے { مصنف بن ابی شیبہ الصلوۃ باب من کرہ القراۃ خلف الامام } ۔

10 :ابو وائل فرماتے ہیں : { اے مقتدی } تمہارے لئے امام کی قراۃ کافی ہے { مصنف بن ابی شیبہ الصلوۃ باب من کرہ القراۃ خلف الامام } ۔ { تلک عشرۃ کاملۃ }

کیا یہ ائمہ سلف صالحین میں شامل نہیں ہیں؟ الحمد للہ ہم تو ان کے فتاوی پر چلتے ہیں ۔

حرف آخر:

اللہ جل شانہ نے بھی یہی سمجھایا ہے کہ جب امام پڑھ رہا ہو تو تم خاموش ہو کر سن لیا کرو "واذا قرئ القران فاستمعوا له وانصتوا لعلكم ترحمون" ترجمان القران حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں "مومن کے لئے استماع قرآن میں وسعت ہے لیکن جب فرض نماز { نماز باجماعت } پڑھی جارہی ہو ، جمعہ کا خطبہ ہورہا ہو ، عیدین کا خطبہ ہورہا ہو تو اس صورت میں جب قراۃ قرآن ہورہی ہو تو پھر خاموش رہو اور سنو { بیہقی الصلاۃ } ۔امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ اس پر تو اجماع ہے کہ یہ آیت

نماز کے بارے میں نازل ہوئی { بحوالہ مجموعہ رسائل لکھنوی } علامہ ابن عبد البر بھی استذکار میں یہی فرماتے ہیں۔ سرور کونین ﷺ نے بھی یہی سمجھایا کہ جب مقتدی امام کے پیچھے ہو تو قراۃ نہ کرے بلکہ امام کی قراۃ مقتدی کے لئے کافی ہے { بیهقی الصلاۃ باب من قال لا یقراء خلف الامام علی الاطلاق }۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: سلف کی اکثریت کا قول یہ ہے کہ اگر مقتدی امام کی قراۃ سن رہا ہو تو نہ پڑھے { مجموع الفتاوی ابن تیمیہ بحوالہ احسن البیان سعودی نسخہ } اور دار الاسلام پاکستانی نسخہ میں ناجواب دیانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نماز نبوی کے ایک محقق صلاح الدین یوسف نے اس کو اڑا دیا ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ جسری نماز میں امام ناصر الدین البانی بھی { صفۃ الصلاۃ النبی ﷺ ص: 80 } پر فرماتے ہیں کہ جسری نماز میں قراۃ خلف الامام منسوخ ہے۔

تبصرہ ج: جس روایت سے محقق عام مراد لیتے ہیں ان سے گزارش ہے کہ انہوں نے کس دلیل کی بنیاد پر من کو عام کیا ہے یہ تو محض ظن ہے۔ اس حدیث سے نہ تو فرضیت یا وجوبیت ثابت ہوتی ہے اور نہ من عام ہے۔

پہلا قرینہ: پورے ذخیرہ احادیث میں ایسی ایک روایت بھی پیش نہیں کی جاسکتی جس میں پیغمبر پاک ﷺ نے ابتدائی طور پر صراحت کے ساتھ مقتدی کو قراۃ قرآن یا قراۃ فاتحہ کا حکم دیا ہو۔

دوسرا قرینہ: جب ابتدائی طور پر آپ ﷺ نے یہی فرمایا تو معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے یہ قراۃ کا عمل تمام مقتدیوں کا نہیں ہو سکتا۔ روایات میں سوال وجواب پر غور کرنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہ عمل چند معدودے مقتدیوں یا ایک ہی مقتدی کا ہے، جیسا کہ آپ ﷺ کے سوال میں ہے "هل قراء احد منکم " { ترمذی، ابوداؤد } اب جواب کو دیکھیں بعض روایات میں قال بعضہم نعم اور بعض رویات میں "فقال رجل نعم"۔

تیسرا قرینہ: آپ ﷺ نے جس انداز میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین کو سمجھایا نماز جیسی اہم عبادت میں یہ انداز خصوصا پھر صحابہ کرامؓ سے یہ بھی نہیں فرمایا کہ اس سے پہلے تم لوگوں نے فاتحہ کیوں نہیں پڑھی۔ اور اگر بقول آپ کے نماز اس کے بغیر مقتدی کی بھی نہیں ہوتی تو پھر آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو گزشتہ نمازیں لوٹانے کا حکم کیوں نہیں فرمایا؟ یا یہ کیوں نہ فرمایا کہ تم باقی لوگوں نے کیا سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی؟ کیا نماز جیسی اہم عبادت کے بارے میں عقیدہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے معاملہ میں { نعوذ باللہ } مداہنت سے کام لیا ہے؟ } ہرگز نہیں۔

خلاصہ کلام: قارئین کرام یہ تمام بحث اس وقت ہے جب عبادہ بن صامت کی یہ حدیث صحیح ثابت ہو جائے۔ لیکن یہاں مسئلہ یہ ہے کہ اس حدیث میں اتنا شدید اضطراب ہے کہ شائد ایسا کسی حدیث میں نہ ہو۔ چنانچہ اضطراب فی السند ملاحظہ کریں۔

1 : مکحول: عن عبادۃ { دار قطنی 1230 ابوداؤد 825 }

2 : مکحول: عن نافع بن محمود عن عبادۃ { ابوداؤد 824 }

3 : مکحول: عن محمود بن ربیع عن عبادۃ { ترمذی، ابوداؤد 823 }

4 : مکحول: عن محمود بن ربیع عن ابی نعیم انہ سمع عبادۃ { دار قطنی 1203 }

5 : مکحول: عن نافع عن محمود عن عبادۃ { دار قطنی 1205 }

6 : مکحول: عن عبداللہ بن عمرو { ماردینی بحوالہ اعدل الکلام }

حضرت ابوہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: جس شخص نے نماز پڑھی اور اس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی پس وہ {نماز} ناقص ہے ناقص ہے ناقص ہے پوری نہیں۔ ابوہریرہ سے پوچھا گیا ہم امام کے پیچھے ہوتے ہیں {پھر بھی پڑھیں} تو حضرت ابوہریرہ ؓ نے کہا {ہاں} تو اس کو دل میں پڑھ [1]۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو نماز پڑھائی۔ فارغ ہو کر ان کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا کیا تم اپنی نماز میں امام کے قراءت کے دوران میں

---

7 : مکحول: عن رجاء بن حیوۃ عن عبداللہ بن عمرو {ماردینی ایضا}

8 : مکحول: عن رجاء بن حیوۃ عن محمود موقوفا علی عبادۃ {ماردینی}

قارئین کرام! بنظر انصاف دیکھیں کہ حضرت مکحول کہیں تو سیدنا عبادۃ بن صامت سے روایت کرتے ہیں کہیں نافع سے کہیں محمود بن ربیع سے کہیں سیدنا عبداللہ بن عمرو سے اور کہیں رجاء بن حیوۃ سے۔ اس شدید اضطراب کی وجہ سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ حدیث مرفوع ہے، یا موقوف، متصل یا منقطع۔ نیز اس میں یہ معلوم کرنا بھی مشکل ہے سیدنا عبادۃ نے یہ روایت حضرت نافع کے سامنے بیان فرمائی تھی جو ان کے نواسے تھے یا حضرت ابو نعیم محمود بن ربیع جو ان کے داماد تھے۔ نیز اس میں یہ فیصلہ بھی مشکل ہے کہ حضرت ابو نعیم محمود بن ربیع کے علاوہ ان کے ہم عصر کوئی اور بھی ابو نعیم تھے جنہوں نے نماز پڑھائی جیسا کہ {مستدرک حاکم 1 / 364} سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود فرماتے تھے کہ میں سیدنا عبادۃ کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ نیز یہ بھی معلوم کرنا مشکل ہے کہ یہ واقعہ سیدنا عبادۃ کا ہے یا سیدنا عبداللہ بن عمرو کا؟ نیز یہ بھی معلوم نہیں ہو سکتا کہ واقعہ عہد نبوی ﷺ کا ہے یا وفات نبوی ﷺ کے بعد کا۔ نیز ابو نعیم کا تعین بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ کون ہے اتنے اضطراب کے ساتھ یہ حدیث کیسے قابل استدلال ہو سکتی۔ جبکہ تمام محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب تک اضطراب ختم نہ ہو حدیث سے استدلال نہیں ہوتی۔

قارئین کرام! بالکل اسی طرح اس حدیث کے متن میں بھی بہت زیادہ اضطراب ہے جس کو طوالت کی وجہ سے ذکر نہیں کیا گیا۔ غرض اس حدیث میں سنداو متنا اتنی شدید اضطراب کے باوجود محققین حضرات اس حدیث سے بڑے شد ومد سے استدلال کرتے ہیں اور نماز میں امام کے پیچھے فاتحہ کو لازم قرار دیتے ہیں کہ اس کے بغیر نماز ہوتی ہی نہیں ہے۔ یہاں تک اس کا پڑھنا نماز کے علاوہ نماز جنازہ میں بھی لازم قرار دیا جاتا ہے۔

[1] مسلم باب وجوب القراءۃ فی کل رکعۃ حدیث 395

پڑھتے ہو؟ سب خاموش رہے۔ تین بار آپ نے ان سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا ہاں ہم ایسا کرتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسا نہ کرو تم صرف سورت فاتحہ دل میں پڑھ لیا کرو[1]۔[2]

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

سورہ فاتحہ پڑھنااور سورۃ ملانا:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز شروع کرتے تھے اللہ اکبر سے اور قرات شروع کرتے الحمد للہ رب العالمین الخ سے { مسلم ج:1 /ص: 194 }۔ **معلوم ہوا** بخاری شریف کی روایت سے کہ سورۃ فاتحہ قراءت ہے اور مسلم شریف میں ہے کہ " اذا قرأ فأنصتوا " کہ جب امام قراءت کرے تو خاموش رہو۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس کی نماز نہیں جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی { بخاری ج: 1 / ص: 104 }۔

مسلم کی روایت میں ہے: لمن لم یقرأ بأم القرآن { مسلم ج:1 / ص: 129 }.

حضرت امام ترمذی رحمہ اللہ اپنی جامع ترمذی میں فرماتے ہیں:

حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حضور اکرم ﷺ کے فرمان "لا صلوۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب" کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس شخص کے لئے جو تنہا نماز پڑھنے والا ہو، اور حضرت امام احمد

---

[1] ابن حبان 5 /152' 162 بیهقي 2 /166 اس کی صحت کے متعلق مجمع الزوائد میں امام ہیثمی فرماتے ہیں: اس کے سب راوی ثقہ ہیں۔ابن حجر نے اسے حسن کہا ہے

[2] **تبصرہ:** اس حدیث کو نقل کرکے محققین نے اپنی ہی مؤقف کے خلاف روایت ذکر کردی۔ قارئین ذرا غور کریں کیا محققین کے مسلک اور اس حدیث میں کوئی مطابقت ہے؟۔اس روایت میں ہے کہ نماز پوری نہیں اور محققین کہتے ہیں نماز ہوتی ہی نہیں۔اور پھر خصوصا ابوہریرہ سے جب پوچھا جاتا ہے امام کے پیچھے ہو تو پھر کیا کرے؟ ابوہریرہ سمجھاتے ہیں کہ اس وقت دل میں پڑھ لیا کرو کیونکہ ابوہریرہ جانتے تھے کہ امام کے پیچھے زبان سے پڑھنا منع ہے۔مطلب یہ ہوا کہ اس میں غور کریں کیونکہ دل سے پڑھا نہیں جاتا بلکہ غور کیا جاتا ہے۔اور پھر حضرت انس کے روایت میں بھی یہی مفہوم ہے۔ جبکہ بعض حضرات تو زبان سے اتنے زور سے پڑھتے ہیں کہ ساتھ والے بھی سن لیتے ہیں تو کیا یہ حدیث پر عمل کرنا ہوا یا حدیث کی مخالفت؟۔

نے اس بارے میں حضرت جابر بن عبد اللہ ؓ کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے حضرت جابر ؓ فرماتے ہیں جو شخص ایک رکعت بھی پڑھے اور اس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے تو اس نے نماز نہیں پڑھی ۔ الا یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو، حضرت امام احمد نے کہا کہ حضور اکرم ﷺ کے صحابی ہیں انہو نے لاصلوۃ لمن لم یقرابفاتحۃ الکتاب کا یہ مطلب بتلایا ہے کہ یہ حدیث تنہا شخص کے لئے ہے امام کے پیچھے نماز پڑھنے والے کے لئے نہیں۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ جن کی تحقیقات ہمارے احباب بہت مانتے ہیں وہ حضرت عبد اللہ بن مسعود ؓ اور حضرت زید ؓ کا فتوی نقل کرکے فرماتے ہیں:

وابن مسعود وزيد بن ثابت هما فقيها اهل المدينة واهل الكوفة من الصحابة وفي كلامهما تنبيه على ان المانع انصاته لقرأة الامام

یعنی حضرت عبد اللہ بن مسعود ؓ اور زید بن ثابت ؓ ان صحابہ کرام میں سے ہیں کہ ان میں ایک اہل مدینہ کا فقیہ ہے اور ایک اہل کوفہ کا، ان دونوں کے کلام میں یہ تنبیہ ہے کہ قرات نہ کرنے کی وجہ اور اس سے مانع یہ ہے کہ امام کی قرات کو سننا اور خاموش رہنا مقتدی کا وظیفہ ہے۔ (فتوی ابن تیمیہ ج: 23/ص: 275)

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یہ بات معلوم ہے کہ حالت جہر میں قرات خلف الامام سے منع کرنا، صحابہ، تابعین اور بعد کے لوگوں سے متواتر ہے۔ (فتوی ابن تیمیہ ج: 23 / ص: 37)

اور یہی البانیؒ فرماتے ہیں:

واسقط عن المأموم سجودالسهو بصحة صلاة الامام وخلو ها من السهو وقرأةالفاتحة بتحمل الامام لها فهو يتحمل عن المأموم وسهو وقراته وسترته فقرأ الامام وسترته قراة لمن خلفه وسترته . (کتاب الروح ص: 222)

ہمارے احباب ان دو بڑے اماموں کو مانتے ہیں ایک حافظ ابن تیمیہ اور دوسرے ان کے شاگرد حافظ ابن قیم اور ان کے بارے تو قارئین نے معلوم کر لیا کہ ان کا مذہب خاص طور پر جہری نماز میں مقتدی کو کچھ نہ پڑھنے کا ہے یہی مؤقف علامہ البانی کا بھی ہے ابن قیم کا بھی مذہب معلوم کر لیں وہ اپنی کتاب "کتاب الروح" میں فرماتے ہیں کہ مقتدی سے سجدہ سہوہ ساقط ہے اگر امام کی نماز صحیح ہے او راس کو سہوہ لاحق نہ ہو اور اسی طرح مقتدی سے سورۃ فاتحہ پڑھنا بھی ساقط ہے اس لئے امام کی طرف سے اس کو پڑھنا ہے، پس امام ہی مقتدی کے سہوہ کی کفایت کرتا ہے اور اس کی قرات کی بھی اور اس کی سترہ کی بھی پس امام کی قرات اور اس کا سترہ مقتدی کی بھی ہے۔

یہ حدیث نسائی، ابوداؤد اور مسلم ہے نسائی کی حدیث ملاحظہ ہو:

اخبرنا سويد بن نصر قال اخبرنا عبد الله معمر عن الزهري عن محمود بن الربيع عن عبادة بن الصامت قال قال رسول الله ﷺ لاصلوة لمن لم يقرا بفاتحة الكتاب فصاعدا .

امام نسائی فرماتے ہیں کہ جو مجھے سوید بن نصر نے خبر دی ہے انہوں نے کہا ہے کہ مجھے عبداللہ بن مبارک نے خبر دی ہے عبد اللہ بن مبارک معمر سے روایت کرتے ہیں اور وہ زہری سے زہری محمود بن الربیع سے روایت کرتے ہیں وہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا جو اس شخص کی نماز نہیں ہے جو سورۃ فاتحہ اور کچھ مزید نہ پڑھے اس حدیث میں خط کشیدہ لفظ کو امام بخاری اور بعض دوسرے محدثین نے ذکر نہیں کیا اور یہی معاملہ الجھ گیا خط کشیدہ لفظ "فصاعدا" جس کا ترجمہ "کچھ مزید ہے"۔ اس کو ملا کر پوری حدیث نگاہ کے سامنے ہو تو پھر اس حدیث کا تعلق ان لوگوں کے نزدیک بھی مقتدی سے نہیں ہوگا جو قرات خلف الامام کے قائل ہیں، اس لئے کہ ان نزدیک صرف سورۃ فاتحہ مقتدی کو پڑھنی ضروری ہے فصاعدا یعنی کچھ اور نہیں۔ حضرت امام مسلم نے بھی اس لفظ کی طرف توجہ دلائی وہ فرماتے ہیں:

حدثنا اسحق بن ابراهيم وعبد الله بن حميد قالا اخبرنا عبد الرزاق قال اخبرنا معمر عن الزهري بهذا الاسناد مثله وزاد فصاعدا .

یعنی عبادہ بن صامت والی حدیث جو معمر کے طریق سے ہے اس میں فصاعدا کا بھی لفظ ہے۔

حضرت امام مسلم کا اس حدیث کو معمر کے طریق سے فصاعدا کے زیادتی کے ساتھ نقل کرنا اس کے صحیح ہونے کی سند ہے اور یہی حدیث ابوداؤد میں حضرت سفیان بن عیینہ کے طریق سے ہے ابن عیینہ بھی اس کو فصاعدا کے زیادتی کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، اور لطف یہ ہے کہ ابن عیینہ صاف فرماتے ہیں کہ یہ حدیث تنہا نماز پڑھنے والوں سے متعلق ہے، ابن عیینہ جو خود زبردست محدث ہیں اور اس حدیث کے راوی بھی ہیں اور محدثین کہتے ہیں کہ حدیث کا راوی حدیث کے مراد کو دوسروں سے زیادہ سمجھتا ہے تو جب ابن عیینہ جو اس حدیث کے خود اروی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ہذا لمن صلی وحدہ یہ تنہا نماز پڑھنے والوں کے لئے ہیں تو پھر کسی اور کو کیا حق ہے کہ وہ حدیث کو مقتدی کے لئے بھی کہے؟۔

بہر حال جو پوری حدیث فصاعدا کے زیادتی کے ساتھ ہے اور صحیح سند سے اس کا ثبوت ہے تو یہ حقیقت روزے روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ لا صلوۃ لمن لم یقرا بفاتحۃ الکتاب والی حدیث کا تعلق مقتدی سے نہیں ہے۔ اور جن لوگوں نے امام کے پیچھے قرات کو منع کیا ہے ان کے سامنے رسول اللہ ﷺ کی پوری حدیث ہے انہوں نے اس حدیث کو چھوڑا نہیں ہے، اس پر عمل کیا ہے البتہ اس کا مصداق منفرد اور امام کو بتلایا ہے مقتدی کو نہیں۔

مقتدی رکوع میں امام کو پائے تو مقتدی کی وہ رکعت شمار ہوگی یا نہیں؟:

اس بارے میں اہل سنت والجماعت محدثین فقہاء فرماتے ہیں کہ ائمہ اربعہ کا یہ اتفاقی مسئلہ ان کی ذاتی رائے نہیں ہے بلکہ متعدد احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے فقہ حنبلی کی مشہور کتاب "المغنی لابن قدامہ" میں یہ مسئلہ لکھا ہے "ومن ادرک الامام فی الرکوع فقد ادرک الرکوع" اگر کوئی شخص امام کو حالت رکوع میں پائے تو اس نے رکوع کو پالیا یعنی اس کی یہ رکعت کامل ہوگی، پھر اس مسئلہ کی تائید میں ابوداؤد کی یہ حدیث نقل کی ہے "لقول النبی ﷺ من ادرک الرکوع فقد

ادرک الرکعۃ " یعنی حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس نے امام کو حالت رکوع میں پالیا اس نے اس رکعت کو پالیا۔ (المغنی لابن قدامہ ج: 1/ص: 504)

اس حدیث پاک نے اس مسئلہ کو بالکل صاف کر دیا ہے کہ امام کو جس نے حالت رکوع میں پالیا اس کی وہ رکعت مکمل ہو گئی۔

بخاری شریف میں حضرت ابوبکرہ کی روایت ہے کہ مسجد میں پہنچے تو حضور ﷺ حالت رکوع میں تھے اور ابوبکرہ نے جلدی میں صف میں پہنچنے سے پہلے ہی رکوع کر لیا اور پھر اس کا ذکر حضور ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا "زاک اللہ حرصا ولاتعد" یعنی اللہ نماز کی سلسلہ میں تمہاری حرص اور بڑھادے مگر اب ایسا نہ کرنا حضور ﷺ نے ان کو صف سے کٹ کر رکوع کرنے سے منع فرمایا لیکن آپ ﷺ نے اس رکعت کو دہرانے کا حکم نہیں دیا اس سے معلوم ہوا کہ وہ رکعت آپ ﷺ کی نگاہ میں معتبر تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ ان سے یہ بھی فرماتے کہ نماز کو دوبارہ پڑھ لو تمہاری ایک رکعت چھوٹ گئی ہے۔

یہ حدیث بھی اس مسئلہ کی نص ہے کہ حالت رکوع میں امام کو پانے والا پوری رکعت کا پانے والا ہوتا ہے۔

اب اگر اس صحیح حدیث کو بھی غیر مقلد ساتھی نہ مانیں تو ان کے ساتھ کون زبردستی کرے۔

روایات میں آتا ہے کہ بہت سے صحابہ کرام مثلاً حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ان کے علاوہ دوسرے جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم امام کے ساتھ اگر وہ شروع نماز میں شریک نہ ہوتے تو رکوع میں امام کے ساتھ شامل ہونے کی کوشش کرتے تاکہ رکعت نہ چھوٹے اور ان کی شرکت امام کے ساتھ پوری جماعت میں ہو، صحابہ کرام کا یہ عمل بتلا رہا ہے کہ امام کے ساتھ رکوع میں شریک ہو جانے پر وہ رکعت شمار کی جائے گی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: اگر کسی سے رکوع چھوٹ جائے اور امام کو حالت سجدہ میں پائے تو اس کا یہ سجدہ شمار نہ ہوگا یعنی محض سجدہ کے پانے سے اس کی یہ رکعت شمار نہ

ہوگی معلوم ہوا کہ رکوع میں اگر کسی نے امام کو پالیا تو اس کی وہ رکعت شمار ہوگی اور یہی بات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔ (مصنف عبدالرزاق)

مصنف ابن عبد الرزاق ہی ہے: حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جس نے رکوع نہیں پایا اس کے سجدے کا شمار نہ ہوگا۔

اور زید ابن وہب کی یہ روایت بھی مصنف عبدالرزاق ہی میں ہے: زید ابن وہب فرماتے ہیں کہ میں اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نماز میں شامل ہوئے تو امام رکوع میں تھا ہم نے بھی رکوع میں شرکت کی پھر جب امام نماز پوری کر چکا تو میں نے کھڑے ہو کر اس رکعت کو پوری کرنا چاہا تو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے منع کیا اور فرمایا کہ تمہاری وہ رکعت پوری ہو چکی ہے اسے دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے[1]۔

صحیح ابن خزیمہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا قبل اس کے کہ امام رکوع سے کھڑا ہو اگر کسی نے امام کو رکوع میں پالیا تو اس نے رکعت کو پالیا[2]۔

یہ حدیث بھی اس مسئلہ میں نص صریح ہے جس میں کسی طرح کی تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث مؤطا امام محمد میں ہے: حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر تم سے رکوع فوت ہو گیا تو تمہارا سجدہ بھی فوت ہوا، یعنی رکوع کے چھوٹنے سے پوری رکعت فوت ہو گئی اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی سے رکوع نہیں چھوٹا تو اس کی وہ رکعت پوری شمار ہوگی۔

---

[1] ورواہ الطبرانی ورجالہ موثقون (مجمع الزوائد، ج: 2/ص: 182)

[2] واخرجہ ابن حبان فی صحیحہ وصححہ (اعلاء السنن، ج: 4/ص: 341)

حافظ ابن تیمیہ کا مسلک اس مسئلہ میں وہی ہے جو جمہور کا ہے بخاری شریف حضرت ابو بکرہ کی روایت میں جو یہ ہے کہ انہوں نے جماعت میں شامل ہونے سے پہلے ہی رکوع کر لیا جبکہ امام کے پیچھے تنہا نماز پڑھنے والی کی نماز نہیں ہوتی ہے تو حضرت ابو بکرہ کی وہ نماز کیسے صحیح ہو گی۔

اس کا جواب دیتے ہوئے حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

"حضرت ابو بکرہ کی حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انہوں نے صف کے پیچھے امام کے رکوع سے سر اٹھانے سے پہلے تنہا نماز ادا کی تھی انہوں نے صف میں شامل ہو کر امام کے ساتھ رکوع کی اتنی مقدار پالی تھی کہ جس سے مصلی پوری رکعت کا پانے والا قرار پاتا ہے"۔ (فتاوی ج: 22/ص: 397)

امام ابن تیمیہ کی یہ عبارت بھی بالکل واضح ہے کہ امام کو حالت رکوع میں پانے والا رکعت پانے والا ہوا کرتا ہے آگے ابن تیمیہ فرماتے ہیں: ولیس فیہ انہ امر باعادۃ الرکعۃ.

یعنی اس حدیث میں یہ نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت ابو بکرہ کو اس رکعت کے دوبارہ لوٹانے کا حکم فرمایا تھا یعنی حضور ﷺ نے اس رکعت کا تام شمار کیا اگر وہ رکعت تام نہ ہوتی تو آپ ﷺ رکعت کو دوبارہ لوٹواتے۔

مشہور غیر مقلد عالم دین مولانا شمس الحق عظیم آبادی "ابوداؤد" کی "شرح عون المعبود" میں فرماتے ہیں: "جمہور ائمہ سلف وخلف کا یہی مذہب ہے کہ فاتحہ پڑھے بغیر رکوع کو پانے والا پوری رکعت کا پانے والا شمار ہوتا ہے۔" (ج:1/ص: 335)

ابن قدامہ مالکی رحمہ اللہ اپنی کتاب میں ایک فصل باندھا ہیں اس میں لکھتے ہیں:

ومن ادرك الامام فی الرکوع فقد ادرك الرکوع. لقوله النبي ﷺ: "من ادرك الركوع فقد ادرك الركعة" رواه ابو داؤد، ولانه لم يفته من الاركان الا لقيام، وهو يأتي به مع تكبيرة الاحرام، ثم يدرك مع الامام بقية الركعة، وهذا اذا ادرك في طمانية الركوع او انتهي الي قدر الاجزاء من الركوع قبل ان يزول الامام عن قدر الاجزاء، فهذا يعتدله بالركعة، ويكون مدركا لها. فاما ان كان المأموم يركع والامام يرفع لم يجزه. وعليه ان يأتي بالتكبيرة منتصبا

، فان اتي بها بعد ان انتهي في الانحناء الي قدر الركوع او بعضها لم يجزه لأنه اتي في غير محلها الا في النافلة. ولأنه يفوته القيام وهو من اركان الصلاة. (المغني لابن قدامه، ص: 354/ج: 1)

رکوع مل گئی تو رکعت مل گئی:

امام بیہقیؒ کا استدلال: مشہور محدث امام بیہقیؒ نے حضرت ابو بکرۃؓ کی روایت اور حضرت زید بن ثابتؓ کے عمل سے بھی یوں استدلال کیا ہے: باب من ركع دون الصف وفي ذلك دليل على إدراك الركعة ولولاك ذلك لما تكلفوه. (سنن بیہقی، ج: 2/ص: 90)

یہ باب ان لوگوں کے بیان میں ہے جنہوں نے صف تک پہنچنے سے پہلے ہی رکوع کر لیا اور یہ عمل دلیل ہے کہ اس سے ان کا مقصد اس رکعت کو حاصل کرنا تھا ورنہ انہیں اس جدوجہد کی کیا ضرورت تھی؟۔

جمہور علمائے امت کا مسلک:

امام ابن تیمیہؒ نے فتاوی میں اور نواب صدیق حسن خان نے بدور الاہلۃ میں علامہ شمس الحق عظیم آبادی نے عون المعبود میں اور علامہ شوکانیؒ نے نیل الاوطار میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ جمہور علمائے امت کا مسلک یہی ہے کہ رکوع میں شامل ہونے والے کی وہ رکعت شمار ہوگی، امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: "جماعت میں تاخیر سے شامل ہونے والے شخص کو سورۃ فاتحہ پڑھنے کا وقت نہ ملے تو وہ امام کے ساتھ رکوع میں شامل ہو جائے اور فاتحہ نہ پڑھے، اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے اور اس سلسلہ میں اختلاف کی حیثیت شذوذ کے مترادف ہے۔" (مختصر فتاوی ابن تیمیہ، ص: 59)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص امام کی اقتداء میں نماز پڑھے اس کے لئے امام کی قراءت کافی ہے، امام بیہقی فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ کا یہی قول صحیح ہے۔
(سنن بیہقی، من قال لا یقرا خلف الامام)

علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ یہ بات قرآن وسنت سے ثابت ہے کہ امام کی قراءت مقتدی کو بھی شامل ہے" وقد ثبت بالكتاب والسنة وبالاجماع أن انصات المأموم لقراءة امامه يتضمن معنى القراءة معه وزيادہ . (فتاوی ابن تیمیہ، ج: 23/ص: 290)

حضرت ابی بن کعبؓ کا قول:

امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کے بارے میں حضرت ابی بن کعبؓ کا قول اور اس پر تجزیہ:

حضرت عبداللہ بن ہزیل کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابی بن کعب سے پوچھا کہ امام کے پیچھے پڑھ لیا کروں تو انہوں اثبات میں جواب دیا۔ (جزء القراءۃ)

تجزیہ:

اس میں ایک راوی عیسی بن ابی عیسی ابو جعفر الرازی ہے جو کہ ضعیف ہے ملاحظہ ہو:

امام احمد اور امام نسائی فرماتے ہیں کہ ابو جعفر الرازی قوی نہیں، امام فلاس فرماتے ہیں اس کا حافظہ خراب ہے، ابن حبان فرماتے ہیں کہ مشہور لوگوں کی طرف منکر روایتیں منسوب کرتا تھا، ابو زرعہ فرماتے ہیں کہ اس کو وہم بہت ہوتا تھا۔ (المیزان، ج: 3/ص: 319)

سورہ فاتحہ فرض ہے یا واجب:

نماز میں قرآن پڑھنا فرض ہے۔ مگر سوال یہ ہے قرآن کی کوئی متعین سورۃ پڑھنا فرض ہے یا بلا تعین قرآن کی کوئی سورۃ یا کوئی بھی حصہ پڑھنا فرض ہے۔

قرآن وحدیث کا بغور مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بلا کسی تعین کے کوئی بھی سورۃ پڑھ دی جائے فرضیت قرات ادا ہو جائے گی۔ ادائیگی فرضیت کسی مخصوص سورۃ کے پڑھنے پر موقوف نہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ نماز کے معاملے میں سورہ فاتحہ کو بہت اہمیت حاصل ہے مگر اس کے باوجود سورہ فاتحہ پڑھنا فرض نہیں ہے، واجب ہے۔ اگر کوئی شخص بھول کر سورہ فاتحہ نہ پڑھے، لیکن قرآن

کی کوئی سورہ یا چھوٹی آیات یا ایک بڑی آیت پڑھ لے تو قراءت کی فرضیت ادا ہو گئی۔ البتہ واجب چھوٹ گئی اس تدارک یو ہوگا کہ آخر میں سجدہ سہوہ کرلے، کیونکہ بھول کر واجب ترک کرنے کا یہی حکم ہے۔ اگر سورہ فاتحہ پڑھنا فرض سمجھ لیا جائے تو اس صورت میں بھول کر چھوڑ دینے سے نماز نہیں ہوگی، خواہ سجدہ کر بھی لیا ہو کیونکہ سجدہ سہوہ سے فرض کا تدارک نہیں ہوتا واجب کا تدارک ہوتا ہے۔

آیئے دیکھیں کہ سورۃ فاتحہ پڑھنا فرض ہے یا نہیں:

سورہ مزمل میں تہجد (صلوۃ الیل) کے احکام بیان کرتے ہوئے ارشاد باری ہے:

فاقرؤا ماتیسر من القرآن . { آیت 20/ پارہ 29 }

پس پڑھئے جو آسان ہو قرآن سے۔

اسی آیت میں آگے فرمایا: فاقرؤا ماتیسر منه۔ { سورہ مزمل }

ان دونوں آیتوں سے ثابت ہوا کہ نماز میں قرآن پڑھنا فرض ہے، اور وہ بھی وہ حصہ جو نماز پڑھنے والا بسہولت پڑھ سکے۔ کوئی لازمی نہیں کہ وہ سورہ فاتحہ ہی ہو کوئی بھی سورۃ جو نماز کو آسان لگے۔

بعض حضرات اس آیت سے تلاوت قرآن مراد لیتے ہیں کہ روزانہ جتنا بسہولت پڑھا جائے تلاوت ضرور کرنی چاہئے، لیکن یہ بات درج ذیل وجوہ سے باطل ہے۔

1 : ان دونوں آیتوں کے آگے پیچھے نماز (نماز تہجد) کا ذکر ہے اور اسی میں قرآن پڑھنے کا حکم بیان کیا جارہا ہے، اسی سے صاف ظاہر ہے کہ دونوں آیتوں کا تعلق نماز میں قرآن سے ہے۔

نماز تہجد کی فرضیت اگرچہ منسوخ ہو گئی مگر اس کا یہ مطلب یہ نہیں کہ اگر کوئی مخصوص نماز فرض نہ رہے تو نماز کے اندر جو چیز بطور رکن فرضیت ثابت ہو وہ بھی منسوخ ہو جائے۔

قیام اللیل (تہجد) کا وجوب منسوخ ہوا ہے نہ کہ نماز کے فرائض اور اس کے شرائط اور سارے احکام۔
{ عمدۃ القاری ج: 1/ ص: 11 }

رمضان المبارک کا روزہ فرض ہونے سے پہلے یوم عاشورہ (10 محرم الحرام) کا روزہ فرض تھا۔ بعد میں یہ روزہ نفل بن گیا (مسلم ج: 1 / ص: 358 } لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عاشورہ کا روزہ طلوع

صبح صادق سے غروب آفتاب تک تھا تو رمضان کے رزے کا کوئی اور حکم ہو جائے گا، اس میں کھانا، پینا، بیوی کے قریب جانا منع تھا تو رمضان میں اس کا حکم بدل جائے، کسی چیز کے منسوخی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر وہی چیز کسی اور موقع پر کرنے کا حکم ہو تو وہ بدل جائے، ارکان و شرائط میں تبدیلی ہو جائے۔

2 : دونوں آیتوں میں صیغہ امر کے ساتھ قرآن پڑھنے حکم ہے اور خارج نماز قرآن پڑھنا کسی کے نزدیک بھی فرض نہیں، مسنون ضرور ہے۔ قرآن پڑھنے کی فرضیت صرف نماز میں ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہوا کہ دونوں آیتیں نماز سے ہی متعلق ہیں۔

3 : اسی مفہوم سے ملتی جلتی رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث بھی ہے: کہ ایک صحابی خلاد بن رافع مسجد نبوی میں آئے اور آکر نماز پڑھنی شروع کر دی، مگر نماز صحیح طریقے کے مطابق ادا نہ کر سکے، حضور ﷺ کے حکم پر انہوں نے تین مرتبہ نماز دہرائی، پھر بھی صحیح نہ پڑھ سکے۔ آخر کار انہوں نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا علمنی یا رسول اللہ ﷺ اے اللہ کے رسول آپ ہی مجھے سکھا دیجئے۔ چنانچہ آپ نے انہیں نماز سکھائی اور اس میں فرمایا:

قبلہ کی طرف رخ کرکے کھڑے ہو، پھر اللہ اکبر کہہ کر نیت باندھ لو پھر پڑھو جو آسان ہو تمہارے ساتھ قرآن سے[1]۔

کچھ حضرات کہتے ہیں کہ ثم اقرأبما تیسر معك من القرأن سے سورہ فاتحہ کا پڑھنا مراد ہے کیونکہ سورہ فاتحہ کا پڑھنا آسان ہے، اس میں کسی سورہ کی تخصیص نہیں بلا دلیل ہے۔ دوم اس لئے کہ قرآن میں سے صرف سورہ فاتحہ ہی کا پڑھنا آسان نہیں بلکہ بہت سی سورتیں سورہ فاتحہ سے بھی چھوٹی ہیں او ران کا یاد کرنا اور پڑھنا سورہ فاتحہ سے بھی آسان ہے۔

4 : ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے نماز کی اصل حقیقت تسبیح، تکبیر اور قرآئت قرآن بتائی ہے:

---

[1] بخاری ج: 1 / ص: 105، مسلم ج: 1 / ص: 170

معاویہ بن حکم سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: صحیح نہیں ہے نماز میں کلام الناس میں سے کوئی چیز یہ صرف تسبیح، تکبیر اور قرائت قرآن کا نام ہے [1]۔

اس حدیث میں سورہ فاتحہ کے بجائے نماز کی اصل حقیقت " قرائت قرآن " بتائی گئی یعنی قرآن پڑھنا، خواہ کہیں سے پڑھا جائے، یہ فرض نہیں کہ وہ سورہ فاتحہ ہی ہو۔

مذکورہ بالا آیات وآحادیث کی روشنی میں مطلق قرات قرآن کی فرضیت تو ثابت ہوتی ہے لیکن خاص طور پر سورہ فاتحہ کی فرضیت ثابت نہیں ہوتی۔ لیکن ایک اور حدیث بھی ہے جس سے اس کے برعکس حکم ثابت ہوتا ہے:

عبادہ صامت سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس شخص کی نماز ہی نہیں جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی [2]۔

اس سے ثابت ہوا کہ جو نماز میں سورہ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ہی نہیں ہوگی۔ گویا سورہ فاتحہ کا پڑھنا نماز میں فرض ہے۔ لیکن آیئے! ذرا دیکھیں کہ اس حدیث سے سورہ فاتحہ کی فرضیت ثابت ہوتی ہے کہ نہیں؟

حدیث کے الفاظ "لا صلوۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب" (اس شخص کی نماز ہی نہیں جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی) اس میں دو احتمالات ہیں۔ ایک یہ کہ سورہ فاتحہ نہ پڑھنے کی سرے نماز ہی نہیں ہوتی۔ دوسرا یہ کہ کامل نماز نہیں ہوتی نماز تو ہو جاتی ہے مگر ناقص ہوتی ہے۔

ارشاد نبوی "لاصلوۃ لمن الخ" کے اندر یہ دونوں احتمالات بالکل یقینی اور شک وشبہ سے بالاتر ہیں۔ کیونکہ عربی زبان میں "لا" کا لفظ کبھی نفی وجود پر دلالت کرتا ہے اور کبھی نقص اور نفی کمال پر۔

"لا" نفی وجود کے معنی میں:

1: مثلا کلمہ توحید: لا الہ الا اللہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

---

[1] مسلم ج: 1 / ص: 203، بلوغ المرام ص: 16

[2] بخاری ج: 1 / ص: 104

2 : لاحول ولا قوۃ الا باللہ نہیں ہے کوئی طاقت اور نہ قوت مگر اللہ کی طرف سے۔

3 : لاتثریب علیکم الیوم (یوسف: 92) آج تم پر کوئی سرزنش نہیں۔

" لا" نفی کمال کے معنی میں:

عن أنس قال فلما خطبنا رسول اللہ ﷺ الا قال: لا ایمان لمن لا امانة له ولا دین لمن لا عهد له[1].

1 : حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ بہت کم ایسا ہوا کہ حضور ﷺ نے خطبہ دیا ہو اور یہ بات نہ کہی ہو کہ اس کا ایمان نہیں جس کے اندر امانت کی صفت نہیں، اس کا دین نہیں جو عہد کا پاس نہیں رکھتا۔

حدیث کے الفاظ " لاایمان " اور " لادین " سے مراد باتفاق محدثین ایمان اور دین کے وجود کی نفی نہیں بلکہ کمال ایمان اور کمال دین کی نفی مراد ہے۔

2 : لاصلوۃ لجار المسجد الا فی المسجد[2].

مسجد کی پڑوسی کی نماز نہیں ہوتی مگر مسجد میں۔

یہاں بھی نماز جائز نہیں ہونے کا مطلب کامل و مکمل نماز کی نفی ہے یہ نہیں کہ سرے سے نماز ہی نہیں ہوتی۔

3 : لاصلوۃ بحضرۃ الطعام نہیں ہے نماز کھانے کی موجودگی میں۔ {مسلم ج: 1/ص: 308}

اس حدیث میں بھی کمال کی نفی مراد ہے نہ کہ وجود کی۔ چنانچہ صحیح ابن حبان میں لایصل احدکم بحضرۃ الطعام (نہ نماز پڑھے تم میں سے کوئی کھانے کے موجودگی میں) کیونکہ بھوک لگی رہنے اور کھانا حاضر ہو جانے کی صورت میں نماز میں دل نہیں لگے گا۔

5 : لاصلوۃ للعبد الابق

نہیں ہے نماز بھاگے ہوئے غلام کی۔

---

[1] رواہ البیہقی فی شعب الایمان، مشکوۃ ج: 1 / ص: 15

[2] دار قطنی ج: 1/ص: 161

یہ تو احادیث نبویہ تھیں، قرآن مجید میں بھی "لا" عدم کمال کے معنی میں استعمال ہوا ہے، ارشاد ربانی ہے: فقاتلوا ائمة الکفر أنھم لا أیمان لھم (توبہ: 12)

پس قتال کرو کفر کے سرداروں سے بے شک ان کی کوئی قسم ہی نہیں۔

یہاں پر "لا ایمان لہم" (ان کی کوئی قسم ہی نہیں) سے ان کی قسموں کا کامل اور پختہ نہ ہونا مراد ہے نہ کہ ان کی قسموں کا وجود میں نہ ہونا۔ کیونکہ اس سے قبل یوں ارشاد ہوا: وان نکثوا ایمانھم من بعد عھدہم۔

اور اگر وہ توڑ دے اپنی قسمیں عہد کرنے کے بعد۔

اور بعد میں یوں ارشاد ہوا: الا تقاتلو قوما نکثوا ایمانھم وھموا باخراج الرسول (توبہ 13)

آپ کیوں نہیں لڑتے ایسے لوگوں سے جو توڑ دے اپنی قسمیں اور فکر میں رہیں کہ رسول کو نکال دیں۔

اگر ان کی قسموں کا وجود ہی نہ ہوتا تو قسموں کو توڑنے کا کیا معنی۔

"لا" نفی کمال کے لئے جس طرح قرآن وحدیث مستعمل ہے اسی کلام عرب میں استعمال ہوا ہے جیسے عربی کے ایک شاعر کا ایک مصرع ہے:

لا فتی إلا علی ولا سیف إلا ذو الفقار

کوئی جوان نہیں سوائے علی کے اور کوئی تلوار نہیں سوائے ذوالفقار کے۔

ظاہر ہے کہ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حضرت علی کے سوا کسی جوان کا وجود ہی نہیں، اور ذوالفقار کے سوا کسی تلوار کا وجود ہی نہیں۔

حدیث عبادہ سے نفی کمال مراد ہے:

رہی یہ بات کہ حضرت عبادہ بن صامت کی روایت: لا صلوۃ لمن لم یقرا بفاتحۃ الکتاب (اس کی نماز ہی نہیں جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی) میں جو "لا" استعمال ہوا ہے وہ "ذات صلوۃ" کی نفی

کے لئے ہے " کمال صلوۃ" کے نفی کے لئے ؟ تو دوسری احادیث کریمہ جو اسی معنی و مفہوم کی ہیں " لا" کو نفی کمال کے معنی میں متعین و مؤکد کرتی ہے۔

عن ابی هريرة قال : قال رسول الله ﷺ : من صلی صلوة لم يقرأ فيها بأم القرآن فهي خداج ثلاثا غير تام [1].

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے کوئی نماز پڑھی اور سورہ فاتحہ اس میں نہیں پڑھی تو وہ نماز ناقص ہے ناقص ہے، ناتمام ہے۔

اس میں لفظ "خداج" تین مرتبہ استعمال ہوا پھر اس کے بعد اس کی تشریح حدیث کے اندر ہی لفظ "غیر تام" (مکمل نہیں) سے آگئی، جس سے ثابت ہوگیا کہ سورہ فاتحہ کے بغیر نماز ناقص و نامکمل ہوتی ہے نہ یہ کہ سرے سے نماز ہی نہیں ہوئی۔

"خداج" کا ترجمہ "غیر تام" خود اسی حدیث سے ثابت ہے 1 اس کے علاوہ اس حدیث سے بھی: لغت میں بھی "خداج" کی معنی ناقص و ناتمام کے آتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے: خدجت الناقۃ اونٹی نے ناتماما بچہ گرایا [2].

عن الفضل بن عباس قال : قال رسول الله ﷺ : الصلوة مثني مثني تشهد في كل ركعتين وتخشع وتضرع وتمسكن وتقنع يديك يقول ترفعهما الي ربك مستقلا ببطونها وجهك ةتقول يارب يا رب ومن لم ذالك فهو كذا وكذا قال ابو عيسي وقال غير ابن المبارك في هذا لحديث من لم يفعل ذالك فهو خداج . (ترمذي ج: 1 /ص: 50} قال ابو عيسى سمعت محمد بن اسماعيل يقول روى شعبة هذا الحديث عن عبد ربه بن سعيد فأخطأ في مواضع فقال عن انس بن ابي انيس وهو عمران بن ابي انس وقال عن عبدالله بن الحارث وانما هو عبد الله بن نافع بن العمبا عن

---

1 مسلم ج: 1/ص: 169، ابوداؤد ج 1: /ص: 134، ترمذی ج: 1 /ص: 40 ابن خزیمہ ج: 1/ص: 287 مؤطا امام مالک ص: 40

2 کتب لغت نووی شرح مسلم ج: 1 / ص: 169

ربيعة بن الحارث .... قال محمد وحديث الليث بن سعد اصح من حديث شعبة .
(ترمذي، ج: 1/ص:87)

فضل بن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: نماز دو دو رکعت ہے، تشہد پڑھنا ہے ہر دو رکعت میں اور خشوع اور تضرع اختیار کرنا اور مسکینی ظاہر کرنا ہے اور نماز کے بعد اپنے دونوں ہاتھوں کو پھیلاؤ رحم طلب کرنے کے لئے یعنی انہیں اٹھاؤ اپنے پروردگار کی طرف (یعنی دعا مانگو) اس حال میں کے ہتھیلی کا رخ اپنے چہرے کی طرف رکھے اور کہو اے رب! اے رب! جو ایسا نہ کرے اس کی نماز ایسی ہے اور ایسی ہے، امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عبداللہ ابن مبارک رحمہ اللہ کے علاوہ دوسرے راویوں کے اسی حدیث میں کہ جو ایسا نہ کرے اس کی نماز خداج ناقص ہے۔

عن عائشة رضي الله عنها قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: كل صلوة لم يقرأ فيها بأم القرآن فهي خداج .

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: ہر وہ نماز جس میں سورہ فاتحہ نہیں پڑھی گئی ہو وہ ناتمام ہے[1]۔

عن عمرو بن شعب عن ابيه عن جده ان رسول الله ﷺ قال: كل صلوة لا يقرأ فيها بفاتحة الكتاب فيه خداج .

عمرو ابن شعب اپنے باپ وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر وہ نماز جس میں سورہ فاتحہ نہیں پڑھی گئی ہو وہ ناقص ہے، ناقص ہے۔ { حوالہ بالا)

صحیح ابن خزیمہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ نماز کافی نہیں جس میں سورہ فاتحہ نہیں پڑھی گئی۔ { ج:1/ص: 248}

---

[1] ابن ماجہ ص: 61} رواہ احمد و ابن ماجہ والطحاوی واسنادہ حسن (آثار السنن، ص: 117

نماز کا کافی نہ ہونا دوسری بات ہے، اور نماز ہی نہ ہونا دوسری بات، سورہ فاتحہ کے بغیر احناف کے یہاں بھی نماز ناکافی ہوتی ہے اور بھول کر نہ پڑھنے سے سجدہ سہوہ سے اس کی تلافی کا حکم ہوتا ہے اور بالقصد چھوڑنے پر اعادہ ہے نماز کا۔

عبادہ بن صامت کی بخاری والی روایت مسلم میں یوں آئی ہے:

لاصلوۃ لمن لم یقرأ بأم القرأن فصاعدا .

اس کی نماز نہیں جس نے سورہ فاتحہ اور اس سے زائد نہیں پڑھا۔

لہٰذا اگر حضرت عبادہؓ کی بخاری والی روایت سے سورہ فاتحہ کا پڑھنا فرض کیا جائے تو مسلم شریف کی اسی روایت سے سورہ فاتحہ کے علاوہ قرآن کی کوئی اور سورت یا آیات پڑھنا بھی فرض کہنا ہوگا۔ یعنی یا تو دونوں کو فرض کہیے یا دونوں کو واجب کیونکہ دونوں کے متعلق ایک ہی انداز سے حدیث موجود ہے، احناف تو دونوں کو واجب کہتے ہیں اور مطلق رقرات قرآن کو فرض لیکن مقام حیرت ہے کہ بخاری والی حضرت عبادہ کی روایت کو بنیاد بنا کر سورہ فاتحہ کو فرض کہتے ہیں لیکن اسی عبادہ کے مسلم والی روایت کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور سورہ فاتحہ سے ساتھ سورہ ملانے کو فرض نہیں کہتے [1]۔

امام کے پیچھے مقتدی قراءت نہ کریں:

ہمارے نزدیک امام کے پیچھے قرآن پڑھنا منع ہے، اور دوسرے بزرگ حضرات فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنالازم ہے، ان کا دعوی ہے کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ منہ سے پڑھنافرض ہے، یہ چاردعوے قرآن اور بخاری مسلم میں صراحتا نہیں ہے، ابوداوٗد کی جو روایت ہے اس میں اضطراب ہے تفصیل آپ حضرات خود ہی پڑھ لیں باقی امام بخاریؒ جس حدیث کو سب کے لئے عام فرماتے ہیں مقتدی، امام، منفرد سب کہتے ہیں سورہ فاتحہ لازم ہے، لیکن امام بخاری کے دو استاد فرماتے

[1] کچھ حضرات نے اس اعتراض کے جواب میں سورہ فاتحہ اور سورۃ ملانے میں فرق کرنے والی کچھ احادیث پیش کی ہیں مگر ان میں سے کوئی نہ حقیقۃ مرفوع ہے اور نہ حکما (بذل ج:2 ص: 49) اس کے برعکس دونوں کو ایک حیثیت عطا کرنے والی بکثرت احادیث مرفوعہ موجود ہیں جیساکہ یہی مسلم کی روایت اور اس کے علاوہ دیگر بہت سے روایتیں موجود ہیں۔

ہیں کہ اس حدیث میں " من" عام نہیں خاص ہے "ہذا لمن یصلی وحدہ لا صلا لمن لم یقرء بفاتحۃ الکتاب"اس کی نماز نہیں ہوتی جو سورہ فاتحہ نہیں پڑھے، تو یہ حدیث اکیلے نمازی کے لئے ہے نہ کہ سب کے لئے تفصیلی دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

" جس شخص کا کوئی امام ہو تو امام کی قراءت ہی اس کی قراءت ہے[1] "

فاتحہ خلف الامام کی صحیح حدیث کو ضعیف کہنا:

فاتحہ خلف الامام کے ایک صحیح حدیث محمد بن ابی عائشہ (ثقہ تابعی) عن رجل من اصحاب النبی ﷺ کے بارے میں نیموی صاحب لکھتے ہیں اور اس کی سند ضعیف ہے (آثار السنن، 356) دوسری طرف محمد بن اسحاق یسار کی محمد بن جعفر عن عروہ بن زبیر کی سند سے " عن امراءۃ بنی نجار" والی روایت کے بارے میں نیموی صاحب نے حافظ ابن حجر سے " اسنادہ حسن" نقل کیا ہے۔ (آثار السنن، 263/ الحدیث، 33/51)

جواب: علامہ نیموی نے محمد بن ابی عائشہ کی روایت کے ضعف کی دو وجہیں بیان کی ہیں:

(1) ابن ابی عائشہ جو کہ طبقہ رابعہ کے ہیں کہ جن کے اکثر روایتیں تابعین سے، انہوں نے اس روایت کو صحابہؓ میں سے ایک شخص سے " عن" سے روایت کیا ہے، اور اس سے سماع کی تصریح نہیں کی، اور نہ ہی اس شخص کا نام لیا، تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ انہوں نے اس شخص کا زمانہ پایا بھی ہے یا نہیں؟ اور راوی کا عن سے روایت کرنا صرف اسی صورت میں مقبول ہے جب وہ راوی غیر مدلس ہو اور اپنے معاصر سے روایت کر رہا ہو کیونکہ امام مسلم کے نزدیک ایسی روایت میں معاصرت ہونا، جب کہ امام بخاری کے ہاں ملاقات ہونا بھی شرط ہے، پس جب ابن ابی عائشہ کی (اپنے مروی عنہ) سے معاصرت ثابت نہیں ہے، نیز ان کی سند کو اتصال کا حکم کیسے دیا جاسکتا ہے جب کہ ان کی اکثر روایتیں تابعین سے مروی ہیں، اور صحابہؓ سے نہایت کم ہیں (التعلیق الحسن، ص: 168)

مولانا نذیر احمد رحمانیؒ غیر مقلد (جن کو مرحوم زبیر علی زئی غیر مقلد امام محقق اور فقیہ قرار دے چکے ہیں) کا موقف اس بارے میں علامہ نیمویؒ کے موقف سے بھی زیادہ سخت ہے، چنانچہ رحمانی صاحب لکھتے ہیں: " چوتھا طبقہ وہ ہے جو تابعین کے طبقہ وسطی کے قریب ہے جس کی اکثر روایتیں کبار تابعین سے لی گئی ہیں، صحابہ سے نہیں۔ (انوار المصابیح، ص: 180، بحوالہ تقریب التہذیب، ص: 3)

نیز روایت " معنعن سے متعلق حافظ ابن حجرؒ اور حافظ ابن الصلاحؒ وغیرہ کے حوالجات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "اور جب معاصرت ہی ثابت نہیں تو پھر ملاقات اور حدیث کا سماع اور روایت تو محض خواب وخیال کی باتیں ہیں، ہاں " عن" میں احتمال معاصرت اور امکان لقاء کی گنجائش ہے، مگر حافظ ابن حجر کے قول کے بموجب صرف احتمال اور امکان کافی نہیں بلکہ معاصرت کا ثبوت شرط ہے، اور حافظ ابن الصلاح کے قول کے بموجب تو ملاقات کا ثبوت بھی شرط ہے"۔ (ایضا، ص: 296،295)

ملاحظہ ہو کہ مولانا رحمانی کا " معنعن " روایت سے متعلق مؤقف تو علامہ نیموئیؒ کے مؤقف سے بھی زیادہ سخت ہے، علامہ نیموئیؒ تو صرف معاصرت کا ثبوت مانگ رہے ہیں، جب کہ مولانا رحمانی معاصرت کے ساتھ ساتھ راوی کی اپنے " مروی عنہ " سے ملاقات ہونے کے ثبوت کا بھی مطالبہ کر رہے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود مرحوم زبیر علی زئی صاحب علامہ نیموئیؒ پر اعتراض کرتے ہیں، جب کہ وہ مولانا رحمانی کو امام، محقق اور فقیہ کے القاب سے نواز رہے ہیں، یہ عجیب انصاف ہے۔

(2) علامہ نیموئیؒ نے ابن ابی عائشہ کی اس روایت کے ضعف کی دوسری وجہ یہ بیان کی ہے کہ یہ روایت محفوظ نہیں ہے، اس لئے کہ اس روایت میں خالد خذاء متفرد ہیں، انہوں نے اس روایت کو " عن ابی قلابۃ عن ابی عائشۃ عن رجل من اصحاب النبی ﷺ " کی سند سے نقل کیا ہے، جب کہ ابوایوب سختیانیؒ جو خالد خذاءؒ سے زیادہ ثقہ ہیں) انہوں اس روایت کو " عن ابی قلابۃ عن النبی ﷺ " سند سے (بغیر واسطہ صحابی) بیان کیا ہے، نیز " مصنف ابن ابی شیبہ " میں خالد خذاء نے بھی اس روایت کو مرسل ہی روایت کیا ہے، لہٰذا یہ مرسل روایت محفوظ ہے اور اس کے بالمقابل خالد خذاء کے واسطہ صحابی والی روایت شاذ ہے۔ (التعلیق الحسن، ص: 169)

امام دار قطنی نے بھی خالد خذاء کی اس متصل روایت کے مقابلے میں ایوب سختیانیؒ وغیرہ کی مرسل روایت کو ترجیح دی ہے، اور تصریح کی ہے کہ : المرسل الصحیح (کتاب العلل، ج: 4/ ص: 311، حدیث: 1645)

مرسل روایت ہی صحیح ہے۔

لہٰذا ثابت ہو گیا کہ علامہ نیموئیؒ کی اس روایت کو ضعیف قرار دینے کی دوسری وجہ بھی درست ہے۔

قارئین: یہ دو وجوہات ہیں جن کی بنا پر علامہ نیموئیؒ نے ابن ابی عائشہؒ کی روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔

اس کے بالمقابل انہوں نے عروہ بن زبیرؒ کی بنی نجار کی ایک عورت سے روایت کردہ حدیث کے متعلق جو حافظ ابن حجرؒ سے تحسین نقل کی ہے، اس میں ابن ابی عائشہؒ والی حدیث کی طرح کوئی ایسی علت نہیں ہے، اور عروہ بن زبیر بھی طبقہ ثالثہ کے ہیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے امام ابو زرعہ دمشقیؒ اور امام احمد بن علی قلقشندیؒ نے ان کو کبار واجلہ تابعین میں شمار کیا ہے۔ (تاریخ ابو زرعہ دمشقی، ص: 258، نہایۃ الادب فی معرفۃ انساب العرب، ص: 326) لہٰذا ابن ابی عائشہ کی روایت کو ان کی راویت پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

نیز امام محمد بن سعد (م: 230ھ) نے اپنے استاد محمد بن عمر واقدیؒ کے طریق سے ایک روایت نقل کی ہے، جس میں بنی نجار سے تعلق رکھنے والی اس عورت کے نام کی تصریح موجود ہے، جو کہ مشہور انصاری صحابی حضرت زید بن ثابتؓ کی والدہ حضرت نوارؓ ہیں (الطبقات الکبری، ج: 8/ ص: 309)

علامہ واقدی اگرچہ روایت حدیث میں کمزور ہیں، لیکن بتصریح مولانا مبارک پوریؒ "وہ راس فی المغازی والسیر والاخبار" (مغازی، سیرت اور تاریخ میں سرخیل) ہیں (ابکار المنن، ص: 17) اور ان کی یہ روایت بھی تاریخی امور سے متعلق ہے، لیکن اگر ان کی اس روایت کو ضعیف بھی تسلیم کر لیا جائے تو پھر بھی اس سے کم از کم حضرت عروہؓ کی روایت میں نامعلوم صحابیہ کے نام کی تعین ہو جاتی ہے، اور یہ بات خود غیر مقلد احباب کو بھی تسلیم ہے جیسا کہ ان کے نامور عالم مولانا محمد گوندلویؒ نے ایک

اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد شیخ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: " دار قطنی، ابن ماجہ، طحاوی اور احمد نے مختلف سندوں سے نقل کیا ہے جس میں سے بعض سند متصل ہیں اور بعض مرسل، اور شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ نے "فروع" میں اس روایت کو مضبوط قرار دیا ہے [1] "۔

عن أبي موسى الأشعري قال قال رسول الله ا اذا قرأ الامام فانصتوا [2]

سیدنا ابو موسیٰ اشعری ﷺ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب امام قراءت کرے تو تم لوگ خاموش رہو۔

سیدنا ابوہریرۃ ﷺ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ امام اس لئے ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے لہٰذا جب امام اللہ اکبر کہے تو تم بھی اللہ اکبر کہو اور امام قراءت کرنے لگے تو تم خاموش ہو جاؤ [3]۔

سیدنا جابر بن عبداللہ ﷺ کہتے ہیں کہ جس نے نماز پڑھی اور اس میں سورۃ الفاتحہ نہیں پڑھی تو اس کی نماز نہیں ہوئی الا یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو [4]۔

حدیث کے متعلق تصریح کی ہے کہ " حدیث اگرچہ ضعیف ہے، جیسے انصتو کی دوسری روایتیں ضعیف ہیں، مگر انصات کے محل کی تعیین میں اس سے وضاحت ہوتی ہے۔ (خیر الکلام، ص: 307)

[1] سنن ابن ماجة، كتاب الصلاة، باب 13 اذا قرأ الامام فأنصتوا حديث: 850حسن

[1] رواهابن أبي شيبة: 97/1/ صفة صلاة النبي اللألباني،ص: 71

[2] سنن ابن ماجة، كتاب الصلاة، باب 13 اذا قرأ الامام فأنصتوا، حديث: 847و صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب 16 التشهد في الصلاة، حديث: 404

[3] سنن ابن ماجة، كتاب اقامة الصلاة، باب 13 اذا قرأ الامام فأنصتوا، حديث: 846 و 847 وسنن النسائي: 141/2، كتاب الافتتاح، باب 30 تاويل قولهعز وجل: واذا قرئ القرآن فاستمعوا الخ، حديث: 921-922

[4] سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 233 ماجاء في ترك القراءة خلف الامام اذا جهر الامام، حديث: 313، امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: "هذا حديث حسن صحيح" یہ حدیث حسن صحیح ہے، جبکہ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح موقوف کہا ہے۔

کثیر بن مرہ حضرمی سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ میں نے انہیں کہتے سنا کہ (ایک مرتبہ) رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کیا ہر نماز میں قراءت کرنا ضروری ہے؟ آپ انے ارشاد فرمایا کہ جی ہاں! انصار میں سے ایک صحابی نے کہا کہ اب تو یہ (قراءت) واجب ہو گئی، پھر رسول اللہ ﷺ میری طرف متوجہ ہوئے، میں آپ اسے دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ قریب تھا، پھر آپ انے ارشاد فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ اگر کوئی امام جماعت سے نماز پڑھا رہا ہو تو اس امام کی قراءت ہی لوگوں کے لئے کافی ہو جائے گی[1]۔

سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ مرفوعاً روایت کرتے ہیں یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے سورۃ الفاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز درست نہ ہوئی، (اس حدیث کے راوی اور مشہور تابعی امام) سفیان فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس کے واسطے ہے جو تنہاء نماز پڑھے[2]

اس روایت کو شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح کہا ہے"

سوال یہ ہے کہ رسول اللہ اکے کسی قول یا حکم کے بارے میں زیادہ بہتر وہ لوگ جانتے تھے جو آپ ﷺ کے زمانہ مبارک سے سب سے قریب تھے، مثلاً صحابہؓ یا تابعین رحمہم اللہ، یا پھر وہ لوگ زیادہ جانتے ہیں جو چودہ سو سال بعد پیدا ہوئے ہیں؟ یہ امام سفیان ثوری تابعی ہیں اور صحابہ کرامؓ سے احادیث سننے اور پڑھنے والے ہیں، یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ جو رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس نے اپنی نماز میں (یا رکعت میں) سورۃ الفاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہیں ہوئی تو اس کا مطلب و مفہوم یہ ہے کہ جو شخص اکیلے اپنی نماز پڑھ رہا ہو اس کے لئے سورۃ الفاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے، البتہ امام کے پیچھے مقتدی پر سورۃ الفاتحہ کا پڑھنا ضروری نہیں، کیوں کہ امام کی قراءت مقتدیوں کی طرف سے بھی کافی ہے۔

---

[1] السنن الکبری للنسائي، کتاب المساجد، اکتفاء المأموم بقراءة الامام، حدیث: 997و سنن النسائي، کتاب الافتتاح، باب 31 اکتفاء المأموم بقراءة الامام، حدیث: 923، راوہ الدارقطنی والطحاوی واحمد واسنادہ حسن۔

[2] سنن ابی داود، کتاب الصلاۃ، باب 130-131 من ترک القراءة في صلاتهبفاتحة الکتاب، حدیث 822

شیخ الاسلام تقی الدین احمد بن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے موطأ میں وہب بن کیسان سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جس نے نماز پڑھی اور اس میں قراءت نہیں کی اس کی نماز نہ ہوئی، الا یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو، نیز امام مالک نے نافع سے نقل کیا ہے کہ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا گیا کہ کیا امام کے پیچھے مقتدی قراءت کرے؟ تو آپ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قراءت ہی اس کے لئے کافی ہو جائے گی، اور تنہا نماز پڑھے تو قراءت ضرور کرے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما امام کے پیچھے قراءت نہیں کرتے تھے، امام مسلم نے اپنی صحیح میں عطا بن یسار سے نقل کیا کہ انہوں نے خود سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے امام کے پیچھے مقتدی کے قرأت کرنے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ امام کے پیچھے کچھ بھی پڑھنے (قراءت کرنے) کی اجازت نہیں ہے، اور امام بیہقی نے ابو وائل ص سے روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص نے سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے امام کے پیچھے قراءت کرنے کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ قرآن کے لئے خاموش رہو یعنی جب امام قراءت کر رہا ہو تو تم خاموش رہو اس لئے کہ نماز خاص افعال کے مجموعہ کا نام ہے، امام کی قرأت ہی تمہارے لئے کافی ہو جائے گی، سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور زید بن ثابت ص اہل مدینہ اور اہل کوفہ میں فقیہ صحابی تھے[1] "۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمانا کہ عبداللہ بن مسعود اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہما اہل مدینہ اور اہل کوفہ میں فقیہ صحابی تھے، یہ بتا رہا ہے کہ ان دونوں نے امام کے پیچھے مقتدی کو کچھ بھی پڑھنے سے روکا ہے۔

آگے امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "وہب بن کیسان سے مروی ہے کہ انہوں نے جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جس نے نماز پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ کی قراءت نہ کی تو اس کی نماز نہیں ہوئی الا یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو، اس کو امام مالکؒ نے موطا میں نقل کیا ہے، سیدنا جابر

[1] مجموعة الفتاوىٰ: 157/12((144/23)) سئل عن القراءة خلف الامام، ط: العبيكان

بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ مدینہ میں صحابہ میں سب سے اخیر میں وفات پانے والے ہیں، اور یہ اس طبقہ کے سر برآوردہ لوگوں میں سے تھے، نیز امام مالکؒ نے سیدنا نافع سے اور انہوں نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو اس کے لئے امام کی قراء ت ہی کافی ہو جائے گی، اور جب کوئی شخص تنہا نماز پڑھے تو وہ قراء ت ضرور کرے، وہ فرماتے ہیں کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما خود امام کے پیچھے قرات نہیں کرتے تھے، جب کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما لوگوں میں سب سے زیادہ سنت کے عالم تھے اور سب سے زیادہ متبع سنت تھے[1] "

مشہور صحابی سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا فتویٰ:

سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ مشہور جلیل القدر صحابی ہیں، یہ ان خوش نصیب صحابہ میں سے ہیں جو نہ صرف قرآن پاک کے حافظ تھے بلکہ قرآن پاک جمع کرنے والے بھی تھے، سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں چار (صحابہ رضی اللہ عنہم) نے قرآن پاک کو جمع کیا (یعنی حفظ کیا اور تحریراً بھی محفوظ کیا) یہ چاروں انصار میں سے تھے، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، ابوزید رضی اللہ عنہ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ[2] "

قرآن پاک کی حفاظت ہی کے سلسلہ میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت میں جن معروف و مشہور جلیل القدر صحابہ کو قرآن پاک کے نسخے لکھنے کا حکم دیا ان میں بھی سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ شامل تھے۔

"سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے زید بن ثابت، سعید بن العاص، عبداللہ بن الزبیر اور عبد الرحمٰن بن الحارث بن ہشام (رضی اللہ عنہم) کو حکم دیا کہ وہ اس کو مصحف میں لکھ لیں[1] ۔

---

[1] مجموعة الفتاویٰ: 184/13، ((144/23)) کتاب الصلاة، فصل: الناس في القراءة خلف الامام

[2] صحيح البخاري، حديث: 3810 و 5003، وصحيح مسلم، حديث: 2465

قرآن کے ماہر اور جلیل القدر سیدنا زید ﷺ نے امام کے پیچھے سورۃ الفاتحہ کے بارے میں کیا فرمایا؟ آیئے امام مسلمؒ کی صحیح مسلم میں اِسے پڑھیں: "ابن قسیط عطاء بن یسار سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے زید بن ثابت ﷺ سے امام کے پیچھے پڑھنے کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ امام کے پیچھے کچھ بھی نہیں پڑھنا چاہیے [2] "

اس روایت میں لفظ "شیءٍ" نکرہ ہے اور لائے نفی کے تحت ہے اور نکرہ تحت النفی عام ہوتا ہے، لہٰذا یہ فرمان جہری اور سری تمام نمازوں کے لئے عام ہے، یعنی کسی بھی جہری یا سری نماز میں امام کے پیچھے قراءت کی گنجائش نہیں۔

جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ الفاتحہ نہ پڑھنے کے تو خود شیخ البانیؒ بھی قائل ہیں، اسی لئے انہوں نے اپنی کتاب "صفۃ صلاۃ النبی ا" میں اس عنوان سے باقاعدہ ایک باب قائم کیا ہے:

"جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قراءت کرنا (یعنی سورۃ الفاتحہ پڑھنا) منسوخ ہے [3] "

علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

وایضا فإنه اجماع، قال احمد : ماسمعنا احدا من أهل الاسلام يقول: ان الامام اذا جهر با لقرءة لاتجزيء صلاة من خلفه اذا لم يقرأ. وقال هذا النبي ﷺ واصحابه التابعون، وهذا مالك في اهل الحجاز، وهذا الثوري في اهل العراق، وهذا الأوزاعي في اهل الشام ، وهذا الليث في اهل المصر. ماقالوا الرجل صلي وقرا امامه ولم يقرأ هو صلاته باطلة، ولأنها قرأءة لاتجب على المسبوق فلم تجب علي غيره كالعورة [4] .

فاتحہ اور سورۃ کے بارے مزید تفصیل:

---

[1] صحیح البخاری، حدیث: 4984

[2] صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب سجود التلاوة، حدیث: 577

[3] ص: 70، ط: الرابعة عشر

[4] المغنی لابن قدامہ، ص: 393، ج: 1

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں: اُس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو فاتحہ اور اُس سے زائد نہ پڑھے۔ حدیث کے راوی حضرت سفیان فرماتے ہیں کہ یہ حکم اُس شخص کے لئے ہے جو اکیلے نماز پڑھ رہا ہو[1]۔

قرات کے وقت مقتدیوں کا خاموش رہنا:

اِس مسئلہ میں چونکہ بعض حضرات نے کافی اعتراضات اور بحث و تمحیص سے کام لیا ہے اس لئے یہاں بھی دلائل کو قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر کیے جارہے ہیں اِرشاد باری ہے:

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ

ترجمہ: اور جب قرآن پڑھا جائے تو اُس کو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

(الأعراف: 204، آسان ترجمہ قرآن)

حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ہم سے خطاب کرتے ہوئے ہمارے لئے سنّت کے اُمور کو واضح فرمایا اور ہمیں ہماری نماز (باجماعت) کا طریقہ بتلایا اور یہ فرمایا کہ: جب تم نماز پڑھنے لگو تو اپنی صفوں کو درست کرلو، پھر تم میں سے کوئی شخص تمہاری اِمامت کرے، اور جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ "غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ" کہے تو تم "آمین" کہو، اللہ تعالیٰ تمہاری دعاء قبول فرمائیں گے۔ حضرت سلیمان التیمی حضرت قتادہ سے (مذکورہ حدیث میں) یہ زیادتی نقل کرتے ہیں کہ: جب اِمام قراءت کرے تو تم خاموش رہو[2]۔

وضاحت: مذکورہ حدیث میں جماعت کے ساتھ ہونے والی نماز میں اِمام اور مقتدی کی ذمہ داریوں کو واضح کیا گیا ہے، یعنی: جب اِمام "اللہ اکبر" کہے تو تم بھی "اللہ اکبر" کہو، جب وہ قراءت کرے تو تم

---

[1] ابو داؤد: 822

[2] مسلم: 404

خاموش رہو اور جب وہ فاتحہ ختم کرے تو تم "آمین" کہو۔ اگر سورۃ الفاتحہ کا پڑھنا مقتدی کیلئے لازم ہوتا تو جیسے تکبیر میں کہا گیا ہے کہ اِمام کے تکبیر کہنے پر تم بھی تکبیر کہو اِسی طرح قراءت کے موقع پر بھی یہ کہا جاتا کہ جب اِمام قراءت کرے تو تم بھی قراءت کرو، لیکن اِس کے بالکل بر عکس یہ کہا گیا ہے کہ '':وَإِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوا'' یعنی جب اِمام قراءت کرے تو تم خاموش رہو۔

نوٹ: واضح رہے کہ حضرت سلیمان التیمی بخاری اور مسلم کے مشہور راوی ہیں اور بالاتفاق ثقہ اور متقن ہیں لہٰذا مذکورہ بالا حدیث میں ان کی ذکر کردہ یہ زیادتی بالکل مقبول ہے، یہی وجہ ہے اِمام مُسلم نے اپنی صحیح میں یہ زیادتی ذکر کرکے اُسے صحیح قرار دیا ہے۔علاوہ ازیں یہ زیادتی نقل کرنے میں حضرت سلیمان التیمی متفرّد بھی نہیں کہ ان پر تفرّد کا اِلزام لگایا جاسکے، بلکہ اور بھی کئی راویوں نے دوسری روایات میں اِسی زیادتی کو نقل کیا ہے، چنانچہ حضرت ابوعُبیدہ ﷜ کی روایت کیلئے دیکھئے (مستخرج ابی عَوانہ: 1698) حضرت عمر ابن عامر اور حضرت سعید بن ابی عَروبہ کی روایت دیکھئے (دار قطنی: 1249)

حضرت ابونُعیم وہب بن کیسان فرماتے ہیں کہ اُنہوں نے حضرت جابر بن عبد اللہ سے سنا، وہ یہ فرمارہے تھے: جس نے نماز پڑھی اور اُس میں سورۃ الفاتحہ نہیں پڑھی تو گویا اُس نے نماز ہی نہیں پڑھی، ہاں ! مگر یہ کہ وہ اِمام کے پیچھے ہو (تو نماز ہوجائے گی)[1] ۔یہ حدیث "حسن صحیح" ہے۔

وضاحت: حدیثِ مذکور جس کو اِمام ترمذی نے بھی صحیح قرار دیا ہے اس میں بڑی وضاحت اور صراحت کے ساتھ اِس حقیقت کو ذکر کیا گیا ہے کہ نماز سورۃ الفاتحہ کے بغیر نہیں ہوتی لیکن اگر کوئی شخص اِمام کے پیچھے جماعت میں شریک ہو تو اُس کی نماز ہوجائے گی، اِس لئے کہ حدیث کے مطابق اِمام کی قراءت کرنے سے مقتدی کی بھی قراءت ہوجاتی ہے، لہٰذا سورۃ الفاتحہ نہ پڑھنے کے باوجود بھی حکمی طور پر اُس کا پڑھنا معتبر ہوجاتا ہے۔

[1] ترمذی: 313

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: امام کو اس لئے مقرر کیا گیا ہے تاکہ اُس کی اقتداء کی جائے، پس جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ تلاوت کرے تو تم خاموش رہو[1]۔

خود غیر مقلد احباب نے صحیحین (بخاری و مسلم) کی کئی روایات کو مضطرب قرار دینے کے علاوہ ضعیف بھی کہا ہے۔ مثلا " صحیح مسلم" (حدیث: 835) میں مروی حضرت ابو موسیٰ اشعری کی مشہور حدیث " واذاقرأفانصتوا" (اور امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو) جس کے بارے میں خود زبیر علی زئی نے بھی تسلیم کیا ہے کہ امام مسلمؒ نے اپنی " صحیح" میں اس حدیث کی تخریج کی ہے (نصر الباری، ص: 283) کو مولانا ارشاد الحق اثری غیر مقلد (جو بقول زبیر علی زئی غیر مقلد، پاکستان کے مشہور محقق اور ایک حدیث کے نامور عالم ہیں۔ (الحدیث، ج: 4/ ص: 13) نے ضعیف قرار دیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ امام اثرمؒ نے ان (امام احمد) سے اس کا مضطرب ہونا نقل کیا ہے، (توضیح الکل، ص: 711) مولانا امیر یمانیؒ غیر مقلد نے بھی اس حدیث کو منقطع اور مضطرب قرار دیا ہے۔ (سبل السلام، ج: 2/ ص: 60)

علامہ نیمویؒ نے تو " صحیحین" کی روایت کو صرف مضطرب قرار دیا ہے، جب کہ زبیر علی زئی غیر مقلد کے اپنے علما" صحیح مسلم" کی حدیث کو مضطرب قرار دینے کے ساتھ ساتھ اس کو ضعیف اور منقطع کہنے سے بھی نہیں چونک رہے۔ نیز علامہ امیر یمانیؒ غیر مقلد نے " صحیح مسلم" کی ایک اور حدیث کو بھی منقطع قرار دیا ہے۔ (سبل السلام، ج: 3/ ص:60)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو امام کے پیچھے نماز پڑھے تو پس امام کی قراءت ہی اُس کی قراءت ہے[2]۔

---

[1] ابن ماجہ: 846

[2] دار قطنی: 1502 وهكذ في مسند ابي حنيفة قال حدثنا ابو الحسن موسى الخ ورواه الامام محمد في الموطا (ص 94) قال العيني طريق صحيح (عمدة القاري ج: 3/ص: 84) وقال محمد بن منيع و امام ابن همام: هذا الاسناد صحيح على شرط الشيخين (حاشية الطحطاوي ج: 1/ص: 128)

حضرت ابن عمرؓ سے جب امام کے پیچھے قرات کرنے کے بارے میں پوچھا جاتا تو فرماتے: جب تم میں سے کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو اُس کے لئے امام کی قراءت ہی کافی ہے، اور جب اکیلے نماز پڑھے تو اُسے قراءت کرنی چاہیے۔ حضرت نافعؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ ابن عمر امام کے پیچھے قرات نہیں کیا کرتے تھے[1]۔

ایک دفعہ نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھائی پھر اپنے رخ انور سے صحابہ کرامؓ کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا: کیا امام کے پڑھتے ہوئے تم لوگ بھی قراءت کرتے ہو؟ لوگ خاموش رہے، آپ ﷺ نے تین دفعہ یہی سوال کیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم کرام نے کہا: جی ہاں! ہم یہ کرتے ہیں، آپ ﷺ نے اِرشاد فرمایا: ایسامت کیا کرو[2]۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ ہمیں نبی کریم ﷺ نے نماز سکھائی اور فرمایا: جب تم نماز کیلئے کھڑے ہو تو تم میں سے کسی ایک کو تمہاری امامت کرنی چاہیئے اور جب امام تلاوت کرے تو تم خاموش رہو[3]۔

حضرت عبد اللہ بن شدادؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے عصر کی نماز میں اِمامت کی، ایک شخص نے آپ ﷺ کے پیچھے قراءت کی، اُس کے ساتھ میں کھڑے شخص نے اُس کو (قراءت سے منع کرنے کیلئے) چٹکی نوچی، جب نماز ہو گئی تو اُس شخص نے (چٹکی نوچنے والے سے) کہا: تم نے مجھے چٹکی کیوں نوچی تھی؟ تو اُس نے جواب دیا: نبی کریم ﷺ تمہارے آگے قراءت کر رہے تھے اِس لئے میں

---

[1] موطاء مالک: 251

[2] طحاوی: 1302 ورواه البخاري في جز القراءة .

[3] مسند احمد: 19723

نے یہ ناپسند کیا کہ تم حضور ﷺ کے پیچھے قراءت کرو، نبی کریم ﷺ نے یہ گفتگو سنی تو فرمایا: جس شخص کا امام ہو تو اُس امام کی قراءت ہی مقتدی کی قراءت ہے[1]۔

مقتدیوں کے خاموش رہنے کا حکم سری وجہری تمام نمازوں میں ہے:

حضرت ابن عباس ؓ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں: تمہارے لئے امام کی قراءت ہی کافی ہے، خواہ امام ہلکی آواز میں پڑھے یا بلند آواز میں[2]۔

حضرت عطاء خراسانی فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان نے حضرت معاویہ کو لکھا کہ جب تم نماز کیلئے کھڑے ہو تو اس کی طرف کان لگا کر سنو اور خاموش رہو، کیونکہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے، آپ اِرشاد فرما رہے تھے: جو شخص خاموش رہے اور اُسے سنائی نہ دے اس کیلئے ایسا ہی اجر ہے جیسا کہ اُس شخص کیلئے اجر ہے جو سنتے ہوئے خاموش رہے[3]۔

فائدہ: حضرت عثمان کی مذکورہ بات سے یہ اِشکال بھی دور ہو گیا جو بعض لوگ کرتے ہیں کہ جب سری نمازوں میں اِمام کے پیچھے سنائی ہی نہ دے رہا ہو تو خاموش کھڑے رہنے کا کیا فائدہ؟ کیا یہ فائدہ کم ہے کہ اُس کو سننے والے کے اجر ہی کی طرح اجر مل رہا ہے!

---

[1] موطاء امام محمد: 98، قال صاحب اعلاء السنن: اسرائیل من رجال الجماعة وبقية السند مثل السابق وهذا مرسل والارسال لايضر عندنا ......واخرجه محمد في الآثار عن ابي حنيفة عن موسى بن ابي عائشة عن عبدالله بن شداد عن جابر نحوه مرفوعا بدون ذكر العصر وهذا سند صحيح (اعلاء السنن: ج 4/ص: 81)

[2] دار قطني: 1252 وقال عاصم ليس بالقوي ودفعه وهم الخ قلت هو مختلف فيه روي عنه علي بن المديني واسحاق بن موسى الانصاري وابراهيم بن منذر وغيرهم، قال اسحاق بن موسى سالت عنه معين بن عيسى فقال: ثقة اكتب عنه واثنى عليه جيدا الخ كذا في التهذيب (ج: 5/ص: 46) فان لم يكن رجال الصحيح فهو من رجال الحسن حتما وقال الحافظ في شرح النخبة (ص: 67) وزيادة رواتها اي الحسن والصحيح مقبولة مالم تقع منافية لرواية من هو اوثق منه بحيث يلزم من قبولها رد الرواية الاخرى الخ ولا يخفى ان زيادة الرفع لاتنافي اصل الحديث، (اعلاء السنن ج 4/ص 94)

[3] القراءة خلف الامام للبيهقي. 137، صاحب اعلاء السنن نے اس روایت کی سند کو صحیح کہا ہے۔ (ج: 4/ ص: 81)

قراءت خلف الامام کے مسئلہ میں خلفاءِ راشدین اور دیگر صحابہ کرامؓ کا عمل:

امام کے پیچھے قراءت نہ کرنے پر بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کرام کا عمل تھا، حتیٰ کہ خلفاءِ راشدین جیسی عظیم اور جلیل القدر شخصیات بھی اِسی پر عمل پیرا تھیں۔ چنانچہ ذیل میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال اور اُن کا عمل ملاحظہ فرمائیں، جس سے مسئلہ کو بہت اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے، اِس لئے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ نبی کریم ﷺ کی دین شناسی اور حدیث فہمی کا کوئی دَعویدار نہیں ہوسکتا، لہٰذا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل اِس بارے میں مضبوط اور ٹھوس دلیل کی حیثیت رکھتا ہے جس سے اِرشاداتِ نبویہ علی صاحبہا التحیۃ والسلام کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

حضرت عبد الرحمٰن بن زید اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے امام کے پیچھے قراءت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ راوی حضرت عبد الرحمٰن فرماتے ہیں کہ ہمارے بہت سے مشائخ نے مجھے حضرت علیؓ کا یہ اِرشاد سنایا ہے کہ جس نے امام کے پیچھے قراءت کی اُس کی نماز ہی نہیں ہوگی، اور حضرت موسیٰ بن عقبہ نے مجھے خبر دی ہے کہ نبی کریم ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر اور حضرت عثمانؓ امام کے پیچھے قراءت کرنے سے منع کیا کرتے تھے[1]۔

"موطاء امام محمد" میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے: "لَيْتَ فِي فَمِ الذي يَقْرَأُ خَلْفَ الْإِمَامِ حجَرًا" کاش! کہ اُس شخص کے منہ میں پتھر ڈال دیے جائیں جو امام کے پیچھے قراءت کرتا ہے[2]۔

حضرت عُمرؓ فرماتے ہیں: تمہارے لئے اِمام کی قراءت ہی کافی ہے[3]۔

---

[1] مصنف عبد الرزاق:2810 هذا مرسل صحيح وموسى بن عقبه امام افي المغازي ثقة ثبت كثير الحديث كذا في التهذيب (ج: 1/ص: 361) (اعلاء السنن ج: 4/ص: 96)

[2] موطّاء امام محمد:98

[3] ابن ابی شیبہ:3884

حضرت عمر بن خطاب ؓ فرماتے ہیں: امام کے پیچھے قراءت نہیں کی جائے گی خواہ امام اونچی آواز سے تلاوت کرے یا نہ کرے[1]۔

حضرت علی کرّم اللہ وجہہ سے مَروی ہے، وہ فرماتے ہیں: جس نے اِمام کے پیچھے قراءت کی اُس نے فطرت کو کھودیا۔

حضرت مُحمّد بن عجلان فرماتے ہیں کہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے فرمایا: جس نے اِمام کے ساتھ قراءت کی وہ فطرت پر نہیں ہے[2]۔

حضرت ابووائل فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عبد اللہ بن مسعود ؓ کی خدمت میں آیا اور یہ دریافت کیا کہ کیا میں اِمام کے پیچھے قراءت کروں؟ حضرت عبد اللہ بن مسعود ؓ نے اُس سے فرمایا: بیشک نماز میں مشغولیت ہوتی ہے اور تمہارے لئے وہی اِمام کافی ہے[3]۔

حضرت علقمہ بن قیس ؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود ؓ امام کے پیچھے جہری اور سرّی کسی بھی نماز میں قراءت نہیں کیا کرتے تھے، نہ پہلی رکعتوں میں نہ آخری رکعتوں میں[4]۔

مصنّف عبد الرزاق میں اِمام کے پیچھے قراءت کرنے والے کے بارے میں حضرت عبد اللہ بن مسعود ؓ کا یہ اِرشاد نقل کیا گیا ہے "مُلِیَٔ فُوہُ تُرَابًا" اُس کا منہ مٹی سے بھر دیا جائے[5]۔

---

[1] القراءة خلف الامام للبيهقي:ص209 كان رجال ائمة يقراؤن وراء الامام ،اخرجه سفيان ثوري في جامعه (اعلاء السنن ج: 4/ص: 98)

[2] مصنّف عبد الرزاق:2806

[3] مصنّف ابن ابى شيبه:3780و رواه الطبراني في الكبير والاوسط رجاله موثقون (مجمع الزوائد ج: 1/ص.158) و راه الطحاوي واسناده صحيح (آثار السنن ج: 1/ص:89)رواه محمد في الموطا (ص:98) بسند رجاله رجال صحيح

[4] مؤطاء امام محمد:96 ورواه الطحاوي واسناده حسن (آثار السنن ج: 1/ص:85) رجاله كلهم موثقون الا محمد بن ابان القرشي قد ضعفه الجماعة ، وقال احمد اما انه لم يكن ممن يكذب وقال اب ابي حاتم سالت ابي عنه فقال هو يقوي في الحديث يكتب حديثه في المجاز ولا يحتاج به ،(اعلاو السنن ج:4/ص:92)

[5] مصنّف عبد الرزاق:2806 قلت اسناده صحيح رجاله رجال الجماعة (اعلاء السنن ج:4/ص:929

حضرت ابو اِسحاق فرماتے ہیں: حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے اَصحاب اِمام کے پیچھے قراءت نہیں کرتے تھے[1].

حضرت عطاء بن یَسار سے مَروی ہے کہ اُنہوں نے حضرت زید بن ثابت سے اِمام کے ساتھ قراءت کرنے کے بارے میں دریافت کیا تو اُنہوں نے فرمایا: اِمام کے ساتھ کسی بھی قسم کی قراءت نہیں[2]۔

حضرت زید بن ثابت فرماتے ہیں: اِمام کے پیچھے قراءت نہیں کی جائے گی[3].

حضرت موسیٰ بن سعید حضرت زید بن ثابت کا یہ اِرشاد نقل فرماتے ہیں: جو اِمام کے ساتھ قراءت کرے اُس کی نماز (کامل) نہیں ہوتی[4].

حضرت ابن ذکوان فرماتے ہیں کہ حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبد اللہ بن عمر دونوں اِمام کے پیچھے قراءت نہیں کیا کرتے تھے[5]۔

حضرت عُبید اللہ بن مِقسم فرماتے ہیں کہ اُنہوں نے حضرت عبد اللہ بن عُمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت جابر بن عبد اللہ سے (اِمام کے پیچھے قراءت کرنے کے بارے میں) دریافت کیا، تو اِن سب نے یہی فرمایا: اِمام کے پیچھے کسی بھی نماز میں مت پڑھو[6]۔

حضرت ابو حمزہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عباس سے دریافت کیا کہ کیا میں قراءت کرسکتا ہوں جبکہ اِمام میرے سامنے ہو؟ حضرت عبد اللہ بن عباس نے فرمایا: نہیں[7]۔

حضرت ابو درداء فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا ہر نماز میں قراءت

---

[1] مصنّف عبد الرزاق: 2806

[2] مسلم: 577

[3] ابن ابی شیبہ: 3783 هذا مرسل اخرجه دارقطني (ج: 1/ص: 125)

[4] مصنّف عبد الرزاق: 2802 واخرجه محمد في الموطا(ص: 120) وه هكذا في بعض النسخ المصححه.

[5] مصنّف عبد الرزاق: 2815

[6] شرح معانی الآثار للطحاوی: 1312 واسناده صحيح (آثار السنن ج: 1/ص: 89)

[7] شرح معانی الآثر للطحاوی: 1316

ہے،آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں ! (ہر نماز میں قراءت ضروری ہے)۔اَنصار میں سے ایک شخص نے کہا: یہ (قراءت) تو واجب ہو گئی۔حدیث کے راوی حضرت کثیر بن مُرّہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابودرداء) اِس حدیث کو سنانے کے بعد) میری جانب متوجّہ ہوئے اور میں لوگوں میں اُن کے سب سے زیادہ قریب تھا، پس اُنہوں نے فرمایا: اے کثیر ! میں تو صرف یہی سمجھتا ہوں کہ اِمام جب کسی قوم کی اِمامت کرے تو وہ (قراءت کرنے میں) سب کی طرف سے کافی ہے[1]۔

حضرت عبد اللہ بن عُمر سے مَروی ہے، وہ اِمام کے پیچھے قراءت کرنے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ تمہارے لئے اِمام کی قراءت ہی کافی ہے[2] ۔

حضرت عبد اللہ ابن عمر سے جب امام کے پیچھے قرِات کرنے کے بارے میں پوچھا جاتا تو فرماتے: جب تم میں سے کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو اُس کے لئے امام کی قرِات ہی کافی ہے، اور جب اکیلے نماز پڑھے تو اُسے قرِات کرنی چاہیے۔حضرت نافع فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ ابن عمر اِمام کے پیچھے قرِات نہیں کیا کرتے تھے[3]۔

حضرت زید بن اَسلم فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عُمر اِمام کے پیچھے قراءت کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے[4]۔

حضرت ابو نُعیم فرماتے ہیں کہ اُنہوں نے حضرت جابر بن عبد اللہ سے سنا، وہ یہ فرمارہے تھے: جس نے نماز پڑھی اور اُس میں سورۃ الفاتحہ نہیں پڑھی تو گویا اُس نے نماز ہی نہیں پڑھی، ہاں ! مگر یہ کہ وہ اِمام کے پیچھے ہو (تو نماز ہو جائے گی)[1] ۔

---

[1] دار قطنی: 1505 ورواہ الطبراني واسنادہ صحیح (اعلاء السنن ج: 4/ص: 82)

[2] دار قطنی: 1503

[3] مؤطاء مالک: 251 وسندہ من اصح الاسانید.

[4] مصنّف عبد الرزاق: 2814 قلت اسنادہ صحیح، وداؤد بن قیس الفراء من رجال مسلم ثقة وهو یروي عن زید بن اسلم کما في التهذیب (ج: 1/ص: 198) والصحیح المسلم (ج: 1/ حدیث 130211) (اعلاء السنن ج: 4/ص 98)

حضرت عُبید اللہ بن مِقسم فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر بن عبد اللہ سے دریافت کیا کہ کیا آپ ظہر اور عصر کی نماز (یعنی سری نمازوں) میں اِمام کے پیچھے قراءت کرتے ہیں؟ اُنہوں نے فرمایا: نہیں [2]۔

حضرت علقمہ بن قیس فرماتے ہیں: میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ شخص جو اِمام کے پیچھے قراءت کرتا ہے اُس کا منہ مٹی یا اَنگارہ سے بھر جائے [3].

اِمام شعبی فرماتے ہیں: میں نے 70 بدری صحابہ رضی اللہ عنہم کرام کو پایا ہے کہ وہ سب مقتدی کو اِمام کے پیچھے قراءت کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے [4].

حضرت سعد فرماتے ہیں کہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ وہ شخص جو اِمام کے پیچھے پڑھتا ہے اُس کے منہ میں انگارہ ہو [5]۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

آمین کا مسئلہ:

جب آپ اکیلے نماز پڑھ رہے ہوں تو آمین آہستہ کہے۔ جب ظہر اور عصر امام کے پیچھے پڑھیں تو پھر بھی آہستہ ہی کہیں۔ لیکن جب آپ جہری نماز میں امام کے پیچھے ہوں تو جس وقت امام و لا الضالین کہے تو آپ کو اونچی آواز سے آمین کہنی چاہیئے۔ بلکہ امام بھی سنت کے پیروی میں آمین پکار کر کہے۔ اور مقتدیوں کو امام کے آمین شروع کرنے کے بعد آمین کہنی چاہیئے۔

تبصرہ:

---

[1] ترمذی: 313 «هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ»

[2] مصنف عبد الرزاق: 2819

[3] مصنف عبد الرزاق: 2808، قلت سنده صحيح رجاله رجال الجماعة (اعلاء السنن ج: 4/ص: 205)

[4] تفسیر روح المعانی: 142/5

[5] مصنف ابن ابی شیبہ: 3782

جبکہ ہم کہتے ہیں کہ جو غیر مقلد کہتے ہیں ان سے التماس ہے کہ ان تمام باتوں کو قرآن و حدیث صحیح سے مزین کریں۔ کیونکہ آپ ہی کے بتائے ہوئے اصول ہے کہ مسئلہ وفتوی صرف وہی صحیح اور قابل عمل ہے جو قرآن وحدیث سے مدلل ہو۔ {نماز نبوی جدید ص: 40}

﴿ غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں: ﴾

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے سنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا غیر المغضوب علیہ م ولا الضالین پھر آپ نے بلند آواز سے آمین کہی [1]۔

تبصرہ:

جوابا عرض ہے کہ یہ روایت آپ کے اصول کے مطابق ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں سفیان ہے جس کو آپ مدلس کہہ چکے اور مدلس کی عنعنہ روایت ضعیف ہے۔ تفصیل گزر چکی ہے۔ بشرط صحت اس حدیث سے تو صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ امام آمین کہے۔ آپ ہی کے اصول کے مطابق یہ حدیث مقتدی کے بارے میں خاموش ہے۔ آپ کا دعوی امام اور مقتدی دونوں کے لئے ہیں جبکہ یہاں دعوی اور دلیل میں مطابقت نہیں۔

﴿ غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں: ﴾

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیر المغضوب علیہ م ولا الضالین پڑھتے تو آپ کہتے آمین { اس قدر اونچی آواز سے } کہ پہلی صف میں آپ کے ارد گرد کے لوگ سن لیتے [2]۔

---

[1] ترمذي باب ماجاء في التامين حديث 248 ابو داؤد باب التامين وراء الامام حديث 932 ترمذی نے حسن جبکہ ابن حجر اور امام دارقطنی نے صحیح کہا ہے

[2] بیهقي 2 /58 ابن خزيمه حديث 571 ابن حبان حديث 462 اسے امام حاکم اور ذہبی نے صحیح کہا ہے

تبصرہ:

جواباً عرض ہے کہ یہ حدیث ابوداؤد اور ابن ماجہ کی ہے لیکن حوالے یہاں بیہقی اور ابن خزیمہ کے دیئے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابوداؤد اور ابن ماجہ کی اسی روایت کو مرحوم علی زئی صاحب {تسہیل الوصول ص:160} پر ضعیف کہہ چکے ہیں۔ تو اب وہی حدیث اسی حوالے سے لانا کیسے ممکن تھا۔ محققین نے عجب کیا کہ احادیث ابوداؤد اور ابن ماجہ کے لے آئے اور اس کی ضعف کو چھپانے کے لئے حوالے بیہقی اور ابن خزیمہ کے دیدیئے۔ جبکہ نماز نبوی جدید میں اس سے بھی ایک قدم آگے مزید ترقی کرتے ہوئے اسی حدیث میں قطع وبرید کی مہارت سے کام لیتے ہوئے حدیث کا اول ٹکڑا وہی ابوداؤد اور ابن ماجہ کا لائے ہیں اور آخری حصہ بیہقی اور ابن خزیمہ کے حدیث کا جوڑ دیا ہے۔ {مہارت ہو تو ایسی}۔ لیکن یہ سب کرنے کے باجود نہ بچ سکے۔ بیہقی اور ابن خزیمہ کے جن احادیث کا حوالہ دیا ہے اس کی سند میں زہری راوی ہے جس کو مرحوم علی زئی صاحب جزء قرات للبخاری ص:43} پر مدلس کہتے ہیں زہری مدلس ہے لہٰذا یہ ان کی عنعنہ کی وجہ سے ضعیف ٹھری انہی کے اصول کے مطابق۔

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں: ﴾

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔ جس شخص کی آمین فرشتوں کی آمین کی موافق ہو گئی تو اس کے پہلے سب گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں[1]۔

امام ابن خزیمہ اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ امام اونچی آواز سے آمین کہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مقتدی کو امام کی آمین کے ساتھ آمین کہنے کا حکم اسی صورت میں دے سکتے ہیں جب مقتدی کو معلوم ہو کہ امام آمین کہ رہاہے۔ کوئی عالم تصور نہیں

[1] بخاري باب جهر الامام بالتامين حديث 780 مسلم باب التسميع والتحميد و التامين حديث 410

کر سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقتدی کو امام کی آمین کے ساتھ آمین کہنے کا حکم دیں جب کہ وہ اپنے امام کی آمین کو سن نہ سکے[1]۔

تبصرہ:

حدیث میں جہر کی کوئی بات نہیں بلکہ آہستہ کہنا ہی واضح ہے۔ حدیث میں یہ بات واضح ہے کہ امام جب ولا الضالین کہے تو مقتدی آمین کہے باقی باتیں محض ظن اور خیالات ہیں۔ نیز جب بات یہ ہے کہ امام بھی جہر سے آمین کہے تاکہ مقتدی بھی سن سکیں۔ اور مقتدی پھر فرشتوں کی موافقت میں جہر سے آمین کہیں۔ تو پھر یہ بات صرف 6 رکعات کے ساتھ خاص کرنا اور 11 رکعات کو چھوڑ دینا یہ تخصیص کس حدیث میں ہے؟۔ حدیث سے یہ بات ثابت کریں جس میں ہو کہ مقتدی جہر کے ساتھ آمین کہے گا اور وہ بھی صرف 6 رکعات میں باقی 11 رکعات میں آہستہ کہے گا۔ اور بخاری شریف کی حدیث ہے کہ جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم ربنا لک الحمد کہو تو ربنا لک الحمد اور آمین کے الفاظ ایک جیسے ہیں تو دونوں کا جہر ہے یا سر؟۔

نعیم مجمر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق نماز پڑھائی پھر نعیم اس طریقے کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہوں نے آمین کہی اور جو آپ کی اقتداء میں نماز ادا کر رہے تھے انہوں نے بھی آمین کہی[2]۔

تبصرہ:

قارئین کرام نسائی اور ابن خزیمہ کی اس حدیث میں یہ بھی ہے "نعیم مجمر فرماتے ہیں: میں نے ابوہریرہ کے پیچھے نماز پڑھی ابوہریرہ نے فقرأبسم الله الرحمن الرحيم . پس انہوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا. پھر ام القرآن پڑھا یہاں تک کہ ولا الضالین پر پہنچے پھر کہا آمین تو لوگوں نے بھی کہا آمین

---

[1] ابن خزیمہ 286

[2] نسائي باب 2 /134 ابن خزیمہ 1 /251 حدیث 499 ۔اسے حاکم ذہبی اور بیہقی نے صحیح کہا ہے

۔آپ حضرات بتائیں کہ آمین اگر جہری ہے تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کیوں جہری نہیں ؟ اگر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہری نہیں تو آمین کیوں جہری ہے ؟ ایک ہی حدیث میں یہ فرق کیوں ؟۔

﴿ غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں : ﴾

حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے مقتدی اتنی بلند آواز سے آمین کہا کرتے تھے کہ مسجد گونج اٹھتی تھی[1] ۔

تبصرہ:

ہم تبصرہ کرتے ہیں کہ : قارئین کرام! جن کے ہاں حبر الامۃ عبد اللہ بن مسعود کا قول مردود ہو مقتدی کا امام کے ساتھ رکوع میں شامل ہونے کے مسئلہ میں اور عبد اللہ بن عمر کا قول مردود ہو داڑھی کے مسئلہ میں اور تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین بمع تین خلفائے راشدین المہدین کا اجماعی قول مردود ہو بیس رکعت تراویح کے مسئلہ میں۔ پتا نہیں ان کو اچانک عبد اللہ بن زبیر کے عمل سے ایسی کیا محبت ہو گئی۔

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں : ﴾

عکرمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں : میں نے دیکھا کہ امام جب ولا الضالین کہتا تو لوگوں کے آمین کو وجہ سے مسجد گونج جاتی[2] ۔

عطا بن ابی رباح رحمہ اللہ فرماتے ہیں : میں نے دو سو 200 صحابہ کرامؓ کو دیکھا کہ بیت اللہ میں جب امام "ولا الضالین" کہتا تو سب بلند آواز سے آمین کہتے[3] ۔

---

[1] بخاري باب جهر الامام باالتامين مصنف عبد الرزاق 2 /96 امام بخاری رحمہ اللہ نے اسے بصیغہ جزم ذکر کیا ہے

[2] مصنف ابن ابی شیبۃ 2 /187

[3] بيهقي 2 /59 كتاب الثقات لابن حبان اس کی سند امام ابن حبان کی شرط پر صحیح ہے

عکرمہ اور عطاء بن ابی رباح یہ دونوں تابعین ہیں اور آپ کے اصول مطابق تابعی تو در کنار صحابی کا قول و عمل دلیل نہیں بن سکتا ہے تو آج کیسا ہوا جی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس قدر یہودی سلام اور آمین سے چڑتے ہیں اتنا کسی اور چیز سے نہیں چڑتے پس تم کثرت سے آمین کہنا[1]۔

تبصرہ:

حدیث میں مذکور آمین کا نماز سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ خواہ مخواہ کھینچا تانی ہے۔ اگر اس آمین کا تعلق نماز کے ساتھ ہے تو پھر سلام کا تعلق بھی نماز کے ساتھ ہوگا۔ تو پھر نماز میں سلام بھی جہر کے ساتھ پڑھنا چاہیئے اور وہ بھی کثرت کے ساتھ تاکہ یہودیوں کو خوب چڑ ہو۔ لیکن آپ تو آمین بھی رکعت میں صرف ایک بار پڑھتے ہو کثرت سے نہیں اور نہ سلام کرنے میں جہر کرتے ہو۔

حافظ بن ابی رباح رحمہ للہ نے ذکر کیا کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اس شخص پر سخت ناراض ہوتے جو بلند آواز سے آمین کہنے کو مکروہ سمجھتا کیونکہ یہودی آمین سے چڑتے ہیں۔

دعا، تعوذ، تسمیہ، اور سورۃ فاتحہ پڑھ کر آمین کہ چکنے کے بعد قرآن مجید میں سے جو کچھ یاد ہو اس میں سے کچھ پڑھیں[2]۔[3]

﴿اہل سنت عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

آمین آہستہ کہنا افضل اور مستحب ہے:

---

[1] ابن ماجۃ باب الجھر بامین حدیث 856 اسے امام ابن خزیمہ 1 /288 حدیث 574 ' 38/3 حدیث 1585 اور بوصیری نے صحیح کہا ہے

[2] ابو داؤد باب استحباب الترتیل حدیث 1466 الحروف والقراءت حدیث 4001 اسے امام حاکم اور ذہبی نے صحیح کہا ہے

[3] **تبصرہ:** جن حضرات کے اقوال آپ کے نزدیک دلیل ہی نہیں بن سکتے تو ان کو پیش کرنے کی کیا ضرورت۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ

ترجمہ: تم اپنے پروردگار کو عاجزی کے ساتھ چپکے چپکے پکارا کرو، یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (الأعراف: 55، آسان ترجمہ قرآن)

وضاحت: مذکورہ آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے آہستہ دُعاء کرنے کا حکم دیا ہے اور آمین کہنا بھی ایک دُعاء ہے، چنانچہ:

(1) حضرت عطاء فرماتے ہیں: آمین کہنا دُعاء ہے[1]۔

(2) حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعاء پر جو آمین کہا تھا اُس کو بھی قرآن کریم میں "دُعاء" قرار دیا گیا ہے[2]۔

(3) آمین کا معنیٰ ہی دُعاء کے ہیں، چنانچہ اس کے معنیٰ "اِسْمَعْ وَاسْتَجِبْ" کے ہیں، یعنی اے اللہ! سن لیجئے اور قبول فرمالیجئے۔

لہٰذا مذکورہ بالا وجوہات کی بنیاد آمین بھی قرآن کریم کے مطابق آہستہ اور خفیہ کہنا چاہیئے تاکہ دُعاء کے اَدب کا لحاظ اور اُس کی رِعایت کی جاسکے۔

لفظِ آمین کو اللہ کے ناموں میں سے ایک نام بھی کہا گیا ہے، چنانچہ کئی روایات میں ہے": آمِینَ: اسْمٌ مِنْ أَسْمَاءِ اللّٰہِ'' یعنی آمین اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے[3]۔ پس گویا آمین کہنے والا اللہ کا ذکر کرتا ہے اور ذکر میں اصل "اِخفاء" یعنی ہلکے ذکر کرنا ہے، چنانچہ مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے آہستہ ذکر کرنے کا حکم دیا ہے، پس اِس سے معلوم ہوا کہ آمین آہستہ کہنا چاہیئے تاکہ ذکر کے اَدب کا لحاظ اور اُس کی رِعایت کی جاسکے۔

---

1 بخاری: 156/1

2 سورہ یونس آیت: 89 تفسیر بغوی

3 مصنّف ابن ابی شیبہ: 7971

علّامہ فخر الدّین رازی رحمہ اللہ جو کہ شافعی المسلک ہیں ،انہوں نے آمین کے بارے میں اسی مذکورہ بالا تحقیق کو بڑے اچھے اور عُمدہ انداز میں پیش کیا ہے ،جواُن ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

فِي قَوْلِهِ: «آمِينَ» وَجْهَانِ: أَحَدُهُمَا: أَنَّهُ دُعَاءٌ. وَالثَّانِي: أَنَّهُ مِنْ أسماء اللهِ، فَإِنْ كَانَ دُعَاءً وَجَبَ إِخْفَاؤُهُ لِقَوْلِهِ تَعَالَى: ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَخُفْيَةً وَإِنْ كَانَ اسْمًا مِنْ أَسْمَاءِ اللهِ تَعَالَى وَجَبَ إِخْفَاؤُهُ لِقَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعاً وَخِيفَةً﴾ فَإِنْ لَمْ يَثْبُتِ الْوُجُوبُ فَلَا أَقَلَّ مِنَ النَّدْبِيَّةِ وَنَحْنُ بِهَذَا الْقَوْلِ نَقُولُ"[1]۔

آمین کے بارے میں دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ یہ دُعاء ہے اور دوسرا یہ کہ یہ اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے،پس اگر یہ دُعاء ہے تو اس کو ہلکی آواز میں پڑھنا واجب ہے اِس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا اِرشاد ہے: "تم اپنے پروردگار کو عاجزی کے ساتھ چپکے چپکے پکارا کرو"اور اگر یہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے تب بھی اس کو ہلکی آواز میں پڑھنا واجب ہے،اِس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "اور اپنے رب کو اپنے دل میں عاجزی کرتا ہوا اور ڈرتا ہوا یاد کرتا رہ"۔پس اگر (آمین کو آہستہ کہنے کا) وجوب ثابت نہ بھی ہو تب بھی یہ مستحب ہونے سے کم تو نہیں ہوگا،اور ہم بھی یہی کہتے ہیں۔

حضرت وائل بن حجر فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی اور جب سورہ فاتحہ ختم کی تو آہستہ آواز میں آمین کہی[2]۔

حضرت عمر اور علی تسمیہ ، تعوذ اور آمین بلند آواز میں نہیں کہا کرتے تھے [3]۔

---

[1] تفسیر کبیر للرازی:282/14

[2] مسند احمد:18854و راوہ ابو عوانہ في تعليق التعليق (اعلاء السنن ج: 4/ص:59)، رواہ احمد والترمذی وابو داؤد والطیالسی والدارقطنی والحاکم وآخرون واسنادہ صحیح وفی متنه اضطراب. (آثار السنن، ص: 143-144، مکتبہ بشری)

[3] شرح معانی الآثار:1208رواه الطحاوي وابن حجر واسناده حسن .(آثار السنن،ص: 146، مکتبہ بشری)

مشہور تابعی حضرت ابراہیم نخعی فرماتے ہیں: پانچ چیزیں آہستہ آواز میں کہیں گے: ثناء، تعوذ، تسمیہ، آمین اور تحمید[1]۔

حضرت شُعبہ سے مَروی ہے کہ سلمہ بن کُہیل فرماتے ہیں کہ میں نے حُجر ابوالعنبَس سے سنا ہے وہ فرمارہے تھے کہ میں نے علقمہ بن وائل سے سنا، وہ (اپنے والد) حضرت وائل بن حُجر رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں جبکہ (حضرت حُجر ابوالعنبَس کے قول کے مطابق) میں نے خود بھی حضرت وائل بن

[1] مصنف عبد الرزاق: 2597، واسناده صحيح (آثار السنن، ص: 146، مكتبہ بشرى)

غیر مقلد احباب کا یہاں ایک اعتراض ہے "الحدیث" نامی رسالہ میں زبیر علی زئی مرحوم فرماتے ہیں کہ سیدنا وائل بن حجرؓ سے ایک روایت میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے اونچی آواز سے آمین کہی، (سنن ابی داؤد، 932)

سفیان ثوری کی بیان کردہ درج بالا حدیث کے بارے میں امام ترمذیؒ نے فرمایا" حسن" مگر نیموی صاحب امام شعبہ کے اختلاف کی وجہ سے حدیث مضطرب (ضعف) لکھتے ہیں (آثار السنن، 377) آگے جاکر نیموی صاحب امام شعبہ کی روایت کے بارے میں تدلیس کے انداز میں لکھتے ہیں: "اور اس کی سند صحیح ہے اور اس کے متن میں اضطراب ہے۔ (آثار السنن: 384) عرض ہے کہ اگر متن میں اضطراب ہے تو سند صحیح نہیں ہے، اور اگر سند صحیح ہے تو متن میں اضطراب کہاں سے آگیا؟ (الحدیث، ج: 5/ ص: 33)

توہم جواباً عرض کرتے ہیں کہ علامہ نیمویؒ نے امام ثوریؒ اور امام شعبہؒ، دونوں کی روایات کی اسناد کو صحیح قرار دیا ہے۔ البتہ چونکہ ان دونوں جلیل القدر اماموں کی روایات کے مضامین باہم مختلف ہیں اس لئے اصول حدیث رو سے علامہ نیمویؒ نے ان دونوں روایات کے متعلق یہ فیصلہ دیا کہ:

(1) ان دونوں روایات کے باہم مختلف ہونے کی وجہ سے ان دونوں کو مضطرب قرار دیا جائے اور دونوں فریق ان روایات استدلال کرنے سے دستبردار ہوجائیں۔

(2) یا ان دونوں راویات میں تطبیق دی جاتے۔

(3) یا ان دونوں روایات میں سے ایک کو دوسری پر ترجیح دی جائے۔

مسئلہ آمین:

امام ثوریؒ نے سلمہ بن کہیل سے یہ الفاظ روایت کیے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے آمین آہستہ کہی۔

علامہ نیمویؒ نے جیسے امام شعبہ کے روایت کی سند کو صحیح قرار دیا ہے اسی طرح انہوں نے امام ثوریؒ کی روایت کی بھی تصحیح کی ہے، چنانچہ وہ ان کی روایت کے ذیل میں ان کی اور امام شعبہؒ کی روایات میں تقابل کرتے ہوئے لکھا ہے:

امام سفیان ثوری کی حدیث شعبہ کی حدیث سے زیادہ صحیح نہیں جیساکہ امام بخاری اور امام ابوزرعہ وغیرہ نے خیال کیا ہے، بلکہ یہ دونوں حدیثیں (صحت میں) برابر ہیں۔ (التعلیق الحسن مع آثار السنن، ص: 178)

حُجر ؓ سے سنا ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی، جب آپ ﷺ نے (سورۃ الفاتحہ کے اختتام پر) غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ پڑھا تو آہستہ آواز میں آمین کہا [1]۔

آمین بالجہر کی روایت پر بحث:

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ سورۃ فاتحہ سے فارغ ہوتے تو اپنی آواز بلند کرتے اور آمین کہتے۔

اس راویت کی سند میں ایک راوی یحی بن عثمان ہے، اور جس سے وہ یہ روایت کرتا ہے اس کا نام اسحاق زبیدی ہے، اور استاذ وشاگرد دونوں ہی ضعیف، متکلم فیہ اور مجروح ہیں، یحی بن عثمان کے بارے میں ذہبی فرماتے ہیں کہ اس کی روایتیں منکر بھی ہوتی ہیں اور اس کے استاذ کے بارے میں ابوداؤد فرماتے ہیں کہ یہ کوئی چیز نہیں ہے، نسائی فرماتے ہیں وہ ثقہ نہیں ہیں محمد بن عوف کہتے ہیں کہ وہ جھوٹا ہے۔ نسائی فرماتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے، اس سے روایت نہ بخاری نے کیا ہے اور نہ ہی مسلم نے نہ ابوادؤنہ ترمذی نہ نسائی اور نہ ابن ماجہ نے، الغرض صحاح ستہ میں اس روایت کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے، او رروایت ضعیف ہے، مگر اس ضعیف روایت کو اصحاب ستہ نے رد کردیا ہے، غیر مقلد احباب چند بزرگوں کے اقوال کی بنیاد پر صحیح قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کو قرآن کے حکم منصوص کے رد کرنے کی بنیاد بناتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ کی ایک دوسری حدیث ہے جس کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اس سے بھی غیر مقلد احباب استدلال فرماتے ہیں۔ وہ روایت یہ ہے:

---

[1] مسند احمد، وابوداؤد و الطیالسی: 1117والترمذي والدارقطني والحاكم وآخرون اسناده صحيح (آثار السنن ص: 113)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے آمین کو ترک کر دیا ہے حالانکہ اللہ کے رسول ﷺ جب "غیر المغضوب علیہم ولا الضالین" کہتے۔ تو آمین کہتے جس صف اول کے لوگ سن لیتے اور مسجد گونج جاتی۔ یہ حدیث بھی ضعیف ہے، اس لئے کہ اس کے سند میں ایک راوی بشر بن رافع ہے جس کے بارے میں امام بخاری فرماتے ہیں: اس کی حدیث کی متابعت نہیں کی جاتی، اور امام احمد فرماتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے، اور امام الجرح والتعدیل ابن معین فرماتے ہیں کہ: وہ منکر حدیثیں روایت کرتا تھا، اور نسائی فرماتے ہیں کہ قوی نہیں ہے، حافظ ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے اور محدثین کے نزدیک وہ منکر الحدیث ہے، ابن حبان فرماتے ہیں کہ وہ موضوع حدیثیں روایت کرتا تھا، حافظ ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ لوگوں کا اس پر اتفاق ہے کہ اس کی حدیثیں قبول نہیں کی جائے گی، غرض یہ حدیث سند کے لحاظ سے بالکل ضعیف ہے۔

مسند اسحاق بن رہویہ کی اس روایت سے بھی غیر مقلد احباب آمین بالجہر پر استدلال کرتے ہیں، حضرت ام حصین کی روایت ہے:

ام حصین رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز ادا کی تو جب آپ نے "ولا الضالین" کہا تو انہوں نے باوجودیکہ وہ عورتوں کی صف میں تھیں سنا کہ آپ ﷺ نے آمین کہا۔

مگر یہ روایت بھی ضعیف ہے، اس کی سند میں ایک راوی اسمٰعیل بن مسلم مکی ہے، عام محدثین اس کی روایت کو قبول نہیں کرتے ہیں امام احمد وغیرہ فرماتے ہیں کہ وہ منکر الحدیث ہے، امام نسائی فرماتے ہیں کہ وہ متروک ہے، ابن مدینی استاد امام بخاری فرماتے ہیں کہ وہ ایک حدیث کو تین تین طرح سے بیان کرتا تھا، یحیٰ بن معین فرماتے ہیں کہ وہ کوئی چیز نہیں ہے علی ابن مدینی کا اس کے بارے میں یہ قول بھی ہے کہ اس کی حدیث لکھی نہیں جائے گی، سعدی فرماتے ہیں کہ وہ بہت کمزور ہے۔

جی ہاں جو روایتیں بہت کمزور متروک اور منکر الحدیث راوی کی سند سے ہے وہ بھی آمین بالجہر کے سلسلہ میں بعض احباب کا اہم مستدل ہے، اور تعجب تو یہ ہے کہ یہ حضرات شاخ نازک پر آشیانہ قائم کرنے کے باوجود میدان میں اس دم خم سے کودیں گے کہ دنیا ان کی لن ترانیوں سے مرعوب ہو جائے۔

اس مسئلہ (آمین بالجہر) میں جو سب سے اہم مستدل ہے وہ ترمذی کی روایت ہے جو بطریق سفیان ثوری ہے۔

عن وائل بن حجر قال سمعت رسول اللہ ﷺ قرا غیر المغضول علیھم و لا الضالین وقال آمین ومد بھاصوتہ.

یعنی وائل بن حجرؓ فرماتے ہیں کہ میں سنا کہ نبی کریم ﷺ نے "غیر المضول علیہم ولا الضالین "پڑھا تو "آمین" کہا اور اپنی آواز کو کھینچا۔

یہ حضرات اس روایت کو آمین بالجہر کی سلسلہ میں صریح قرار دیتے ہیں مگر امام ترمذی نے انہیں وائل بن حجرؓ سے بطریق امام شعبہ ایک اور حدیث روایت کی ہے جس میں صراحۃ یہ لفظ موجود ہے وخفض بہا صوتہ یعنی آپ نے بلند آواز سے آمین نہیں کہا، حضرت وائل بن حجر کی دوسری روایت یہ ہے: "نبی کریم ﷺ نے "غیر المغضوب علیہم ولا الضالین" پڑھا اور آمین کہا تو جہرا اور بلند آواز سے آمین نہیں کہا۔"

اب ان دونوں حدیثوں کے بارے میں ایک طریقہ تو احناف کا ہے کہ انہوں نے کہا کہ یہ دونوں حدیثیں اگرچہ مختلف المعنی ہیں مگر دونوں صحیح ہیں اس لئے کہ خواہ امام سفیان ثوری ہو یا امام شعبہ دونوں کی جلالت قدر اس کا تقاضا کرتی ہے کہ نہ سفیان ثوری کی روایت رد کرے اور نہ امام شعبہ کی، او راسی بناء پر احناف نے دونوں روایتوں کو قبول کرلیا اور کہا کہ اگرچہ حضور ﷺ کی مستمرہ عادت مبارکہ یہی تھی کہ آپ آمین آہستہ آواز سے کہتے تھے مگر کبھی کبھی آپ ﷺ لوگوں کو تعلیم کی غرض سے بلند آواز سے بھی کہتے تھے، چنانچہ وائل بن حجر جو ملک یمن کے رہنے والے تھے اور حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں ان کی حاضری مسافرانہ تھی، ان سے روایت بلند کی بھی ہے اور آہستہ کی بھی، یہ تو اس صورت میں ہے کہ جب" مد بھا صوتہ :کا ترجمہ آواز بلند کرنا کیا جائے، اس کا ترجمہ آمین کو قصر کے ساتھ ادا نہیں بلکہ مد کے ساتھ ادا کیا ہو تو دونوں حدیث میں کسی طرح کا تعارض باقی نہیں رہے گا، اور مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ نے آمین کو آہستہ کہا اور بالمد اس کی ادائے گی فرمائی۔

احناف کی اس طرق پر نہ سفیان ثوری والی حدیث کا ترک لازم آتا ہے اور امام شعبہ کی حدیث کو متروک کہنا پڑتا ہے، اور دونوں حدیثیں قابل عمل رہتی ہیں اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں عام طور پر لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ کسی حدیث کو ترک کرنے سے احتراز کرتے تھے اور دو مختلف المعنی احادیث کے درمیان تطبیق دینے کو آپ زیادہ پسند فرماتے تھے، یہ حدیث کے بارے میں انتہائی درجہ تورع، تقوی اور احتیاط کی بات ہے۔

مگر بعض متشددین نے اس معقول طریقہ کو چھوڑ کر اپنی ساری توانائی اس پر صرف کر دی کہ شعبہ والی حدیث کو غلط قرار دیں اور اسی غیر معقول رویہ پر بھی وہ احناف کو تارک حدیث کہہ کر مطعون کریں گے اور اپنے کو حدیث پر عمل کرنے والے کہیں گے۔

اب رہی یہ بات کہ آپ ﷺ کا کبھی کبھی جہراً آمین کہنا بغرض تعلیم تھا، اس کی دلیل کیا ہے تو وائل بن حجر سے روایت ہے فرماتے ہیں:

میں نے رسول اکرم ﷺ کو نماز سے فارغ ہونے کے بعد دیکھا، میں آپ ﷺ کے رخسار کو دونوں جانب سے دیکھا، اور آپ ﷺ "غير المغضوب عليهم ولا الضالين" پڑھا تو اپنی آواز کو "آمین" کہہ کر کھینچا، اور میں کہتا ہوں کہ آپ ﷺ کا آمین کا مد کرنا ہمار تعلیم کے لئے تھا[1]۔

مستند و معتبر ممدوح حافظ ابن قیم بھی یہی فرما رہے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کا جہراً آمین کہنا بغرض تعلیم تھا، چنانچہ ابن قیم زاد المعاد میں قنوت النوازی کی بحث میں فرماتے ہیں:

اگر دعاء قنوت کو امام مقتدیوں کو تعلیم کے لئے جہراً پڑھے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لئے کہ مقتدیوں کی تعلیم کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ثناء کو جہراً پڑھا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جنازہ میں سورۃ فاتحہ جہراً پڑھا تھا تاکہ لوگوں کو بتلائیں کہ یہ سنت ہے، اور اسی طرح امام کا آمین کو بھی جہراً کہنے کا مسئلہ ہے (کہ یہ بھی بغرض تعلیم اور بتلانے کے لئے ہے کہ آمین بھی سنت ہے)۔

---

[1] اخرجه الحافظ ابو بشر الدولابي في كتاب الاسماء والكني اعلاء السنن

حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ کے زور سے آمین کہنے کی جو اصل وجہ تھی وہ ظاہر نہیں کی جاتی ہے۔ دیکھیں حضرت عطاء کا یہ قول بھی ہے، فرماتے ہیں کہ:

حضرت عطاء فرماتے ہیں کہ میں نے اس مسجد میں دو سو صحابہ کرام کو پایا جب امام ولا الضالین کہتا تو میں ان کی آمین کی گونج سنتا۔ (بیہقی)

مگر یہ حضرت عطاء کی مرسل روایت ہے اور غیر مقلد احباب کا اصول ہے کہ وہ مرسل روایت کا اعتبار نہیں کرتے، پھر یہ کہ محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت عطاء کی مرسل روایتیں مرسل روایتوں میں سب سے کمزور شمار کی گئی ہیں، امام بخاری نے بغیر سند اور بغیر تفصیل کے عطاء کے ارسال کو نقل فرمایا ہے، حافظ سیوطی نے تدریب میں اس کی تصریح کی ہے، اور دوسری سب سے بڑی علت جو اس روایت کو ناقابل اعتبار بنادیتی ہے وہ یہ کہ اس میں حضرت عطاء کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے یہ فرمایا کہ میں نے دو سو اصحاب رسول ﷺ کو اس مسجد میں پایا حالانکہ یہ بات قطعاً غلط ہے اور خلاف واقعہ ہے حضرت حسن بصری عطاء سے عمر میں بڑے تھے ان کی ملاقات صرف ایک سو بیس صحابہ سے ثابت ہے تو حضرت عطاء کی ملاقات دو سو صحابہ سے کیسے ثابت ہو جائے گی؟

آمین آہستہ کہو یہی افضل اور مسنون ہے:

(1) پہلی بات یہ ہے کہ آمین دعا ہے، اور قرآن کا ارشاد ہے دعا کے بارے میں کہ وہ آہستہ کہی جائے۔

(2) حدیث میں بھی دعا کا ادب یہی بتلایا گیا ہے کہ وہ چپکے چپکے ہو حضرت ابو موسیٰ اشعری ؓ کی روایت ہے:

لوگوں نے بلند آواز سے دعا مانگی تو آپ ﷺ نے فرمایا اربعوا علی انفسکم یعنی درمیانہ روی اختیار کرو تم کسی بہرے غائب کو نہیں پکار رہے ہو جس کو تم پکار رہے ہو وہ سننے والا قریب ہے[1]۔

---

1 تفسیر ابن کثیر ج: 2/ص: 220

(3) امام ترمذی نے حضرت وائل بن حجر کی امام سفیان کے طریق سے حدیث روایت کی ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اس میں یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ولا الضالین کے بعد آمین کو آواز کھینچ کر کہا تھا اس سے یہ حضرات جیسا کہ عرض کیا گیا اپنے مذہب پر استدلال کرتے ہیں اور اس کو آمین بالجہر کی صریح دلیل قرار دیتے ہیں۔ لیکن خود سفیان ثوری جو اس حدیث کے مرکزی راوی ہیں ان کا مذہب آمین بالجہر کا نہیں تھا بلکہ وہ سرا آمین کہنے کے قائل تھے، اور حضرت سفیان کا اس حدیث کے روایت کے باوجود اس پر عمل نہ کرنا یہ اس کی بہت بڑی دلیل ہے کہ آمین سرا کہی جائے گی جہرا نہیں۔ یا پھر ان کے نزدیک مد کا معنی جہرا نہیں ہے بلکہ آواز کھینچ کر آمین کہنا ہے۔

(4) ترمذی ہی میں وائل بن حجرؓ کی شعبہ کی طریق سے یہ حدیث بھی صحیح سند سے مذکور ہے۔ نبی کریم ﷺ نے "غیر المغضوب علیھم ولا الضالین "پڑھا اور جب آمین کہا تو آہستہ آواز سے کہا۔

یہ حنفیہؒ کے مذہب کی صریح دلیل ہے اور بعض حضرات کا بعض محدثین کی تقلید میں یہ کہنا کہ اس میں حضرت شعبہ امیر المؤمنین فی الحدیث سے غلطی ہو گئی ہے، یہ حضرت شعبہ کی جلالت قدر، عظمت شان، اور مقام بلند اور علم حدیث میں ان کے رسوخ اور امامت پر زبردست حملہ ہے۔

دوسری بڑی وجہ شعبہ کی حدیث کی ترجیح یہ ہے کہ شعبہ کی روایت قرآن کے حکم "ادعوا ربکم تضرعا وخفیة" کے مطابق ہے، اور جن روایات کی تائید خود قرآن سے ہوتی ہو اس کا راجح ہونا بالکل بدیہی امر ہے، قارئین خود انصاف فرمائیں کہ شعبہ کی روایت قرآن کے حکم کے عین مطابق ہے، سفیان ثوری نے اپنی روایت پر خود عمل نہیں کیا تو ایسی صورت میں شعبہ کی روایت کو ترجیح حاصل ہو گی یا سفیان والی روایت پر عمل کرنا راجح ہو گا؟

کاش یہ حضرات تقلیدی ذہنیت سے ہٹ کر تحقیق سے کام لیتے اور عقل کو کام میں لاتے تو خود ان کا فیصلہ بھی یہی ہوتا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا مستمر عمل اور عمومی عادت شریفہ آمین کو سرا ہی کہنے کی

تھی نہ کہ جہراً، اگر آپ نے آمین کبھی جہراً کہی بھی تو یہ ایک وقتی اور عارضی عمل تھا نہ کہ آپ ﷺ کی مستقل عادت شریفہ تھی۔

(5) ابو وائل کی روایت جس کو طبرانی نے صحیح سند سے نقل کیا ہے اس میں ہے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نہ جہراً بسم اللہ کہتے تھے اور نہ اعوذ باللہ اور نہ یہ دونوں حضرات آمین جہراً کہتے تھے۔

(6) ابو وائل کی روایت ہے جس کو طبری نے تہذیب الآثار میں صحیح سند سے نقل کیا ہے:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نہ جہراً بسم اللہ کہتے تھے اور نہ آمین۔

(7) محلّی ابن حزم میں ہے:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ امام تین چیزوں کو سراً کہے گا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، اعوذ باللہ اور آمین [1]۔

(8) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک اثر کنز العمال (ج: 4/ص: 249) میں ہے، جس کے الفاظ یہ ہے:

اربع یخفیهن الامام التعوذ وبسم الرحمن الرحیم وآمین واللهم ربنا لك الحمد.

یعنی چار چیزیں امام سراً کہے گا اعوذ باللہ، بسم اللہ، آمین اور اللھم ربنا لک الحمد

(9) مصنف عبد الرزاق (ج: 2/ص: 87) میں ایک باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے "باب ما یخفی الامام" یعنی ان چیزوں کا بیان کہ امام نماز میں کن چیزوں کو اخفاء (بلا آواز) کہے گا۔ اس میں پہلی روایت حماد عن ابراہیم کی سند سے ہے، جس کے الفاظ یہ ہے:

اربع یخفیهن الامام بسم الرحمن الرحیم والاستعاذة وآمین وذا قال الامام سمع الله لمن حمده قال ربنا لك الحمد.

[1] ج: 3/ص: 184

یعنی چار چیزوں کو امام آہستہ کہے گا، بسم اللہ، اعوذ باللہ، آمین اور ربنا لک الحمد۔ اور دوسری روایت عن الثوری عن منصور عن ابراہیم ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

خمس يخفيهن الامام سبحانك اللهم وبحمدك و التعوذ و بسم الله الرحمن الرحيم وآمين واللهم ربنا لك الحمد.

یعنی پانچ چیزوں کو امام آہستہ سے کہے گا ثناء، تعوذ، بسم اللہ، آمین اور ربنا لک الحمد۔

اس سے معلوم ہوا کہ ابراہیم نخعی جو جلیل القدر فقیہ و محدث تابعی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے علوم کے حامل تھے، ان کے زمانہ میں جہراً آمین کہنا کا کوئی معمول ہی نہیں تھا۔

اب تک کی ان گزارشات کی روشنی میں جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ:

(1) چونکہ آمین دعا ہے اور دعامیں اصل یہ ہے کہ اخفاء ہو جیسا کہ حکم ربانی ہے ادعوا ربکم تضرعا وخفیۃ (تم اپنے کو عاجزی کے ساتھ اور چپکے سے پکارو) اس وجہ سے آمین کو بھی چپکے کہنا افضل اور بہتر ہوگا۔

(2) قرآن سے ان کے پاس جہراً آمین کہنے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

(3) خلفائے راشدین سے جہراً آمین کہنا ثابت نہیں ہے۔

(4) حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد یہ تھا کہ آمین کو سراً کہا جائے گا۔

(5) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مذہب تھا کہ آمین کو سراً کہا جائے۔

(6) غیر مقلد احباب بخاری کی جس روایت سے استدلال کرتے ہیں اس سے آمین بالجہر ثابت نہیں ہوتا۔

(7) امام ترمذی کی جس روایت سے غیر مقلد احباب آمین بالجہر پر استدلال کرتے ہیں وہ اس اعتبار سے معلول ہے کہ اس روایت کے راوی حضرت سفیان ثوری کا خود اس پر عمل نہیں تھا۔ اس لئے وہ روایت آمین بالجہر کی دلیل نہیں بن سکتی۔

(8) وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی حضرت شعبہ کی طریق والی روایت سے صراحۃ ثابت ہوتا ہے کہ آمین کو سرا کہنا چاہیئے۔

(9) غیر مقلد احباب حضرات بقیہ جتنی روایات سے استدلال کرتے ہیں سب ضعیف ہیں۔

(10) حضور اکرم ﷺ سے کبھی کبھی جہرا آمین کہنا بھی تعلیم کی غرض سے ثابت ہے۔

(11) حضور ﷺ سے جہرا آمین کہنا بطور عادت مستمرہ کے ثابت نہیں ہے۔

(12) حضور اکرم ﷺ کا خود فرمان تھا کہ دعا میں اخفاء کرو۔

(13) حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب امام آمین کہتا ہے تو فرشتے بھی آمین کہتے ہیں اور جس کا آمین کہنا فرشتوں کے آمین کہنے کے موافق ہوتا ہے اس کے گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں اور آمین کہنے میں فرشتوں سے موافقت سرا کہنے میں ہوتی ہے نہ کہ جہرا کہنے میں، ان امور کے پیش نظر سرا آمین کہنا ہی اولی اور افضل ہوگا ہاں آمین میں بوقت مصلحت وضرورت جہر کی بھی اجازت ہے اور جن روایتوں کو غیر مقلد احباب آمین کو جہرا کہنے کے لئے پیش کرتے ہیں اگر ان کو کسی درجہ میں صحیح بھی مان لیا جائے تو ان کا محمل یہی مواقع ہیں۔

سفیان ثوریؒ اور شُعبہؒ کی روایت کا تعارض:

حضرت وائل بن حُجرؓ کی مذکورہ بالا روایت حدیث کی کئی معتبر کتابوں میں موجود ہے، اِس کو حضرت سُفیان ثوریؒ اور اِمام شُعبہؒ دونوں ہی نے نقل کیا ہے، حضرت شُعبہؒ کی روایت میں آمین آہستہ کہنے کا تذکرہ ہے جبکہ حضرت سُفیان ثوریؒ زور سے آمین کہنا نقل کرتے ہیں، اور دونوں ہی کی روایت کردہ حدیث صحیح ہے، اس میں صحت وضعف کا کوئی فرق نہیں، لہٰذا روایات کے اِس تعارض کو دور کرنے کیلئے ترجیح کے طریقے پر عمل کیا گیا ہے، آمین بالجہر کے قائلین نے حضرت سفیان ثوری کی روایت کو ترجیح دی ہے جبکہ آمین بالسّر کے مسلک کو اختیار کرنے والے اِمام شُعبہ کی روایت کو ترجیح دیتے ہیں۔

امام ترمذی نے جہراً آمین والی حدیث کو سند کے اعتبار سے سراً والی حدیث پر ترجیح دی ہے او رفرمایا کہ سند کے اعتبار سے جہر والی حدیث جو سفیان ثوری کی سند ہے وہ سراً والی حدیث جو شعبہ کی سند سے اصح ہے، صحت سند کے اعتبار سے سفیان والی کا پلہ بھاری ہے، امام ترمذی نے اصح کا لفظ استعمال کرکے شعبہ کی حدیث کو بھی صحیح بتلایا ہے۔

آمین بالسر کی روایت کے راجح ہونے کی وجوہات:

حضرت شُعبہؒ کی روایت جس میں آمین کا سراً ہونا مذکور ہے، اُس کے راجح ہونے کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں:

(1) آمین کے آہستہ کہنے کی روایت اَوفَق بالقرآن یعنی قرآن کریم کے زیادہ مطابق ہے، اِس لئے کہ "آمین" بالاتفاق ایک دُعائیہ کلمہ ہے اور دُعاء کے بارے میں قرآن کریم کا حکم یہ ہے کہ اُسے آہستہ مانگنا چاہیئے، پس اِسی لئے آمین کا کلمہ بھی آہستہ ہی کہنا چاہیئے۔

(2) آمین کے آہستہ کہنے پر بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کرام حتی کہ خلفاء راشدین اور حضرت عبد اللہ بن مسعود اور تابعین کا بھی عمل ہے جو خود ایک بہت بڑی وجہ ترجیح ہے جس سے حضرت شُعبہ کی آمین بالسر کی روایت کا راجح ہونا معلوم ہوتا ہے۔

(3) نبی کریم ﷺ کا زور سے آمین کہنا تعلیم و تلقین کیلئے یعنی سکھانے کیلئے تھا، مستقل عادتِ شریفہ نہیں تھی، چنانچہ خود صحابیِ رسول حضرت ابووائل بن حجر نے اس کی صراحت کی ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں: آپ ﷺ نے (سورۃ الفاتحہ کے بعد) بلند آواز سے آمین کہا، جس کے بارے میں میرا خیال یہی ہے کہ آپ ﷺ نے ہمیں سکھانے کیلئے زور سے آمین کہا تھا[1]۔

---

[1] الکنیٰ و الاسماء للدولابی:1090، ولفظ الترمذي " ومد بها صوته" وقال حديث حسن صحيح (نصب الرایۃ، ج: 1/ص: 370)

اِسی طرح حضرت وائل بن حُجر رضی اللہ عنہ ہی کی ایک روایت میں ہے کہ جب آپ ﷺ سورۃ الفاتحہ سے فارغ ہوئے تو تین مرتبہ آمین کہا[1]۔

غور کیجئے ! مذکورہ روایت کا اِس کے علاوہ کوئی مطلب نہیں کہ یہ تین مرتبہ آمین کہنا لوگوں کو تعلیم دینے اور اُنہیں سکھانے کیلئے تھا، پس جس طرح آپ ﷺ کا خلافِ معمول ایک سے زائد مرتبہ آمین کہنا لوگوں کو سکھانے کیلئے تھا اِسی طرح خلافِ معمول آواز سے آمین کہنا بھی تعلیم و تلقین کیلئے تھا، کوئی مستقل عادتِ شریفہ نہیں تھی، ورنہ ان روایاتِ جہریہ کے ہوتے ہوئے حضرت عُمر، حضرت علی اور حضرت عبد اللہ بن مسعود جیسے جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سراً آمین کہنے کا کیا مطلب ہوگا۔

(4) آمین کے زور سے کہنے کا مطلب بہت زیادہ اونچی آواز کے ساتھ آمین کہنا نہیں بلکہ اس سے "جہرِ خفیف" یعنی ہلکی آواز سے آمین کہنا مراد ہے جو سراً آمین کہنے کے خلاف نہیں، اور اس کی تائید کئی روایات سے ہوتی ہے، چنانچہ ابوداؤد شریف کی ایک روایت ہے جس میں نبی کریم ﷺ کے آمین کہنے کی کیفیت کو یوں بیان کیا گیا ہے "حَتّٰى يَسْمَعَ مَنْ يَلِيهِ مِنَ الصَّفِّ الْأَوَّلِ" یعنی آپ ﷺ نے سورۃ الفاتحہ کے اختتام پر اتنی آواز سے آمین کہا یہاں تک کہ آپ ﷺ سے متصل پہلی صف کے کچھ لوگوں نے سنا[2]۔

روایتِ مذکورہ میں "مِنْ" تبعیضیہ یعنی بعضیت کو بیان کرنے کیلئے ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ "پہلی صف کے کچھ لوگوں نے سنا" پوری صف کے لوگوں کا سننا مراد نہیں، کیونکہ اگر یہ تبعیض کیلئے نہ ہو اور مطلب یہ لیا جائے کہ پہلی صف کے تمام لوگوں نے سن لیا تو یہ درست نہ ہوگا کیونکہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ پہلی صف میں دور تک دائیں بائیں جانب کے تمام لوگوں نے تو سن لیا ہو لیکن اِمام کے بالکل پیچھے قریب کے دوسری صف میں کھڑے ہوئے لوگوں تک بھی آواز نہ پہنچی ہو۔ اِسی طرح

---

[1] طبرانی کبیر: 22/22، رواه الطبراني في الكبير ورجاله ثقات، (مجمع الزوائد، ج: 2/ص: 238)

[2] ابوداؤد: 934

ایک روایت میں ہے "حَتّٰى يُسْمِعَ مَنْ يَلِيهِ" یعنی آپ ﷺ اتنی آواز سے آمین کہتے کہ اپنے سے متصل لوگوں کو سنادیا کرتے تھے۔ (مصنّف عبد الرزاق: 2632) پس اِن روایات کی روشنی میں روایاتِ جہر یہ کا مطلب بھی "جہرِ خفیف" ہی لیا جائے گا اور یہ نبی کریم ﷺ کا یہ عمل بھی لوگوں کو تعلیم دینے اور سکھانے کیلئے تھا۔ پس اِس طرح روایات کا باہمی تضاد بھی باقی نہ رہے گا، حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کرام کے عمل کی اتباع بھی ہو جائے گی اور دُعاء کا جو اصل ادب ہے اُس کی رعایت بھی ہو سکے گی۔

مسئلہ آمین کی مزید وضاحت:

جمہور علماء کرام کا مسلک یہ ہے کہ آمین کہنا مقتدی اور امام نیز تنہاء نماز پڑھنے والے کا وظیفہ ہے، اور اس پر اتفاق ہے کہ آمین آہستہ اور بلند آواز دونوں طریقہ سے جائز ہے، صحابہ اور تابعین دونوں میں آمین بالجہر کہنے والے بھی تھے اور بالسر یعنی آہستہ کہنے والے بھی، علامہ ابن الترکمانی نے طبری کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

"اور حقیقت یہ ہے کہ آمین بالجھر اور آمین بالسر دونوں قسم کی روایتیں صحیح ہے اور آپ ﷺ کے دونوں فعل پر علماء کی ایک بڑی جماعت عمل پیرا رہی ہے[1]"۔

اور یہ بجائے خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دونوں طریقے ثابت ہیں اور آپ ﷺ کے زمانہ میں دونوں طرح عمل ہوا ہے، یہ ناممکن ہے کہ آپ کے بعض صحابہ جہر سے آمین کہنے لگے ہوں، اسی طرح یہ بھی قطعاً ناممکن ہے کہ آپ ﷺ کے دور میں اور آپ کے سامنے آمین بالسر پر کبھی عمل نہ ہوا ہو اور آپ ﷺ کے بعد بعض صحابہ ایسا کرنے لگے ہوں، الغرض صحابہ اور تابعین میں دونوں طرح کا عمل پایا جانا اس کی قطعی دلیل ہے کہ عہد نبوی میں دونوں طرح عمل ہوا ہے، بعد میں بعض ائمہ مجتہدین نے اپنے علم و تحقیق کی بناء پر یہ سمجھا کہ آمین میں اصل جہر ہے جبکہ اس کے بر عکس دوسرے بعض ائمہؒ کرام نے اپنی معلومات کی بناء پر یہ سمجھا کہ آمین جو قرآن کا لفظ

---

[1] الجوهر النقي: 132/1

بھی نہیں ہے، دراصل وہ بالسر یعنی آہستہ سے کہنے کی چیز ہے اور رسول اللہ ﷺ کے دور میں عام طور پر آہستہ ہی کہی جاتی تھی، اگرچہ کبھی کبھی تعلیم کی غرض سے آمین بالجہر بھی کہہ دی جاتی تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ امام "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ" کہے تو تم لوگ آمین کہو اس لئے کہ جس کا آمین کہنا فرشتوں کے آمین کہنے کے مطابق ہو جائے اس کے تمام پچھلے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں[1]۔

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد شیخ عبد الوہاب مشہدانی لکھتے ہیں: "اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بلند آواز سے آمین نہ کہے گا، اس لئے کہ اگر امام کے لئے بلند آواز سے آمین کہنا مشروع ہوتا تو رسول اللہ ﷺ مقتدیوں کی آمین کو امام کے "وَلَا الضَّآلِّيْنَ" کہنے پر معلق نہ فرماتے، بلکہ یوں کہتے کہ جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو، نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مقتدی قراءت نہیں کرے گا، اس لئے کہ اگر مقتدی کا قراءت کرنا مشروع ہوتا تو رسول اللہ ایوں فرماتے کہ جب تم میں سے کوئی شخص "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ" کہے تو وہ آمین کہے[2]"۔

وائل بن حجرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی، جب آپ ﷺ نے "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ" پڑھا تو آہستہ آواز سے آمین کہا[3]۔

---

[1] سنن ابیداؤد، کتاب الصلاة، باب 167-168 التامین وراء الامام، حدیث: 935و صحیح البخاري، كتاب الأذان، باب 111 جهر الامام بالتامين، حديث: 782

[2] كيفية صلاة النبي ﷺ على ضوء اجتهاد المذهب الحنفي، ص: 55

[3] مسند الامام احمد: 316/4، مسند الكوفيين، حديث وائل بن حجر، حديث: 19059 وسنن الدار قطني: 328/1، كتاب الصلاة، باب 34 التامين في الصلاة بعد فاتحة الكتاب والجهر بها، حديث: 1256، نیز دیکھئے: الفتح الرباني للساعاتي: 432/1 كتاب الصلاة، باب 11 صفة الصلاة، -14 التامين والجهر بهفي القراءة واخفاءه، حديث: 1596، وقال الساعاتي: وقد حسن الحديث الترمذي: قال ابن سيد الناس: ينبغي أن يكون صحيحا، أفادهالشوكاني، بلوغ الأماني من اسرار الفتح الرباني: 433/1، ط: بيت الأفكار رواه احمد والترمذي وابو داؤدالطيالسي والدارقطني والحاكم واخرون اسناده صحيح (اعلاء السنن ص: 157)

چنانچہ علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

"اور اگر امام دعاء قنوت بلند آواز سے اس غرض سے پڑھے کہ مقتدیوں کو معلوم ہو جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اسی لئے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے دعاء استفتاح یعنی ثناء بلند آواز سے پڑھی ہے تاکہ مقتدیوں کو معلوم ہو جائے، اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ بلند آواز سے تلاوت فرمائی تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ سنت ہے، اسی غرض سے امام کا آمین بلند آواز سے کہنا بھی ہے، اور یہ اختلاف مباح ہے اس سلسلہ میں بلند آواز سے آمین کہنے والے پر کوئی شدت نہیں کرنی چاہیئے اور نہ ہی آہستہ آواز سے آمین کہنے والے پر تشدد روا ہے، اسی طرح رفع یدین کرنے اور نہ کرنے کا اختلاف بھی اسی قسم کا ہے، نیز مختلف تشہدات اور اذان واقامت کا اختلاف بھی اسی نوعیت کا ہے[1] "۔

ابن منیر باب کے ساتھ حدیث کی مناسبت کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ آمین دعا ہے اور آمین تفصیل کے بعد اختصار کے مترادف ہے، امام اپنے مقاصد و مطالب کو تفصیل سے ذکر کیا اور اس پر آمین کہنے والا صرف یہ کلمہ کہتا ہے جو ساری دعاء کو شامل ہے۔ (فتح الباری شرح بخاری، ج: 2/ص: 263)

الغرض جن ائمہ کی تحقیق اور غور و فکر نے ان کو اس نتیجہ پر پہنچایا، ان کی رائے یہ ہوئی کہ اصل اور افضل آمین کو آہستہ کہنا ہے لیکن آمین بالجہر بھی جائز ہے، چنانچہ امام اعظم ابو حنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ جیسے جلیل القدر ائمہ کرام کے نزدیک آہستہ آواز سے آمین کہنا زیادہ بہتر اور افضل ہے اور امام مالک کا مسلک بھی حنفیہ کے مطابق ہے جیسا کہ کتاب "المدونۃ الکبریٰ" میں اس کی صراحت موجود ہے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا بھی کہنا ہے کہ آمین آہستہ آواز سے کہی جائے:

" چار چیزوں کو امام سے چھپا کر (یعنی آہستہ آواز سے) کہے، وہ چار چیزیں یہ ہیں: اعوذ باللہ، بسم اللہ، آمین اور ربنا و لک الحمد[2] "۔

---

[1] زاد المعاد: 275/1، فصل و کان ﷺ اذا قام في الصلاۃ الخ

[2] کنز العمال، کتاب الصلاۃ، أدب المأموم و مایتعلق بہ، روایت: 22893 ابن جریر

نیز سیدنا علی اور سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما بھی آہستہ سے آمین کہا کرتے تھے، نیز یہ کہ آمین دعا ہے، جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا عطار حمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے:

قال عطاء: آمین دعاء[1]

"عطاء کہتے ہیں کہ آمین دعاء ہے"۔

اور دعاء میں اصل بات یہی ہے کہ اسے آہستہ پڑھا جائے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: أدعوا ربکم تضرعا وخفیة انہ لا یحب المعتدین[2]۔

"اپنے رب سے دعاء کرو تضرع وانکساری کے ساتھ اور چپکے چپکے، بیشک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والے کو پسند نہیں کرتا"

اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ایک مرتبہ آہستہ آواز سے دعاء مانگنا بلند آواز سے مانگی جانی والی ستر دعاؤں کے برابر ہے[3]"۔

اور محدث کبیر ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ: خیر الذکر الخفي[4]

"بہترین ذِکر وہ ہے جو آہستہ آواز سے کیا جائے"۔

امام شافعی کی کتاب "کتاب الام" بہت مشہور ہے، اس میں لکھا ہے: "شافعی نے کہا کہ جب امام سورۃ فاتحہ سے فارغ ہو تو آمین بلند آواز سے کہہ دے تاکہ مقتدی بھی اس کی اقتداء میں آمین

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الاذان باب جهر الامام بالتامین، حدیث: 780 سے قبل

[2] سورۃ الأعراف، آیت: 55

[3] فیض القدیر: 527/3، حدیث: 4206، واعلاء السنن: 239/2، حدیث: 730 کے تحت، وأیضا: 115/6 باب اخفاء القنوت في الوتر، حدیث: 1745 وراه ابو الشیخ عن انس ﷺ مرفوعا بسند صحیح کما فی "العزیزي" (ج:2/ص:36)

[4] صحیح ابن حبان، کتاب الرقاق، باب 8 الأذکار، حدیث: 809، ورواه ابو عونة والبیهقي کذا في الترغیب وکذ في العزیزي الی مسند الامام احمد ایضا، وقال باسناد صحیح. (علاء السنن، ج: 6/ص: 111)

کہیں اور جب مقتدی آمین کہیں گے تو اپنے کو سنائیں گے مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ مقتدی زور سے آمین کہیں"۔ (ج: 1/ص: 95 طبع بولاق)

امام ابو القاسم عبد الکریم بن محمد الرافعی لکھتے ہیں: "امام شافعی کا مقتدی کے بارے میں قدیم قول یہ تھا کہ وہ آمین زور سے کہے گا اور جدید قول یہ ہے کہ وہ زور سے آمین نہیں کہے گا[1]۔"

حافظ ابن کثیر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: "اگر امام زور آمین کہے تو مقتدی زور سے آمین نہ کہیں گے یہ امام شافعی کا جدید قول ہے۔" (ج: 1/ص: 31)

ان حوالوں سے معلوم ہوا کہ امام شافعی مقتدی کے لئے زور سے آمین کہنے کو پسند نہیں فرماتے تھے اور پہلے قول سے رجوع کر لیا تھا۔

شافعیوں کی مشہور کتاب شرح مہذب میں صاف لکھا ہے: "شافعی مذہب کے مفتی اور اس پر عمل کرنے والے کے لئے جائز نہیں ہے کہ جس مسئلہ میں امام شافعی رحمہ اللہ کے دو قول ہو تو ان میں سے جس پر چاہے عمل کرے بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ دونوں قولوں میں سے آخر والے پر عمل کرے ورنہ اس پر جس کو امام شافعی نے ترجیح دی ہے"۔ (ج: 1/ص: 68)

امام شافعی کا آخری قول بھی مقتدی کے لئے عدم جہر کا ہے اور اسی آخری قول کو امام صاحب نے ترجیح بھی دی ہے۔ جیسا کہ پہلے کتاب الام والی عبارت میں ان کا قول ولا احب ان یجھر بہا (مجھے پسند نہیں ہے کہ مقتدی آمین کے ساتھ جہر کریں) گزر چکا ہے۔

امام مالک کا قول بھی امام ابو حنیفہ کی قول کی طرح ہے یعنی امام اور مقتدی آمین آہستہ کہیں گے۔ ابن العربی مالکی ترمذی کی شرح عارضۃ الاحوذی میں فرماتے ہیں: آمین کو نہ امام زور کہے گا اور نہ مقتدی۔

---

[1] فتح العزیز شرح الوجیز ج: 3/ص: 248

بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کہ امام مالک سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ امام آمین بالکل نہیں کہے گا، اور آمین صرف مقتدی کہیں گے اور آہستہ کہیں گے، بہر حال امام مالک امام یا مقتدی کے لئے جہراً آمین کے قائل نہیں ہیں ان کا مذہب سراً آمین کہنے کا ہے۔

تکبیرات انتقالیہ: ایک ہیئت سے دوسری ہیئت کی طرف منتقل ہوتے وقت تکبیر:

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو تکبیر کہتے یعنی تکبیر تحریمہ کہتے، پھر رکوع کے وقت تکبیر کہتے پھر جب رکوع سے سیدھے اٹھ کھڑے ہوتے تو سمع اللہ لمن حمدہ کہتے، پھر اسی حالت میں ربنا ولک الحمد کہتے، پھر سجدے میں جاتے ہوئے تکبیر کہتے، پھر سجدہ سے سر اٹھاتے ہوئے تکبیر کہتے، پھر دوسرے سجدہ میں جاتے ہوئے تکبیر کہتے، پھر دوسرے سجدہ سے سر اٹھاتے وقت تکبیر کہتے، پھر یہی عمل پوری نماز میں کرتے یہاں تک کہ نماز مکمل فرماتے، اور دو رکعت پر بیٹھنے کے بعد کھڑے ہوتے وقت بھی تکبیر کہتے[1]۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جھکتے، اٹھتے، قیام و قعود کے وقت تکبیر کہتے اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی ایسا ہی کرتے تھے[2]۔

ان تکبیرات کو تکبیرات انتقالیہ کہتے ہیں، اس سلسلہ میں یاد رکھنا چاہئے کہ جونہی اگلے رکن کی طرف منتقل ہونا شروع ہو، اللہ اکبر کہنا شروع کرے اور دوسرے رکن میں پہنچنے تک تکبیر ختم کرلے، جب قیام سے رکوع میں جائے تو جونہی جھکے تکبیر شروع کرلے اور رکوع کی کیفیت میں پہنچنے سے پہلے تکبیر ختم کردے، اسی طرح دوسرے ارکان میں بھی تکبیرات کہنی ہے۔

رکوع اور سجود کی کم سے کم مقدار:

---

[1] صحیح البخاري، کتاب الأذان، باب 117 التکبیر اذا قام من السجود، حدیث 789 وصحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب 10 اثبات التکبیر في کل خفض ورفع الخ، حدیث: 392

[2] سنن الترمذي، کتاب الصلاۃ، باب 188 ماجاء في التکبیر عند الرکوع والسجود، حدیث۔ 253

"سعدی اپنے والد یا اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں: وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی نماز کو غور سے دیکھا، آپ ﷺ کا رکوع اور سجدہ تین مرتبہ "سبحان اللہ وبحمدہ "کہنے کی مقدار ہوتا تھا[1] "۔

یہ رکوع کی کم سے کم مقدار ہے، آپ ﷺ جب امام ہوتے تو عام معمول اتنی ہی مقدار رکوع و سجدہ کرنے کا ہوتا تھا جس میں تین مرتبہ تسبیح پڑھنے پر اکتفا فرماتے تھے، چنانچہ ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"بیشک رسول اللہ ﷺ رکوع میں تین بار "سبحان ربی العظیم "کہتے اور سجدہ میں تین بار "سبحان ربی الاعلی "کہتے تھے[2] "۔

البتہ تہجد کی نماز میں تسبیحات کی مقدار زیادہ ہوا کرتی تھیں، کیوں کہ آپ ﷺ کا رکوع اور سجدہ بہت طویل ہوتا تھا، اور رکوع و سجدہ کی مقدار بھی قریب قریب قیام ہی کی ہوتی تھی۔

کیفیت رکوع:

سالم براد کہتے ہیں کہ ہم ابو مسعود عقبہ بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے عرض کیا کہ ہم کو رسول اللہ ﷺ کی نماز کے بارے میں بتائیے، وہ ہمارے سامنے مسجد میں کھڑے ہوئے اور تکبیر کہی، جب رکوع کیا تو دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھا اور انگلیوں کو اس سے نیچے رکھا اور کہنیوں کو پہلو سے جدا رکھا یہاں تک کہ ہر ایک عضو اپنے مقام پر جم گیا[3]۔

---

[1] سنن ابي داؤد، كتاب الصلاة، باب 149-150 مقدار الركوع والسجود، حديث: 885

[2] مجمع الزوائد: 128/2 ، كتاب الصلاة، باب 196 مايقول في ركوعه وسجوده حديث: 2777

[3] سنن ابيداود، كتاب الصلاة، باب 143-144 صلاة من لا يقيم صلبه في الركوع والسجود، حديث: 863، وسنن النسائي: 186/2، كتاب التطبيق، باب 4 مواضع أصابع اليدين في الركوع، حديث: 1037، ومسند الامام أحمد: 119/4، مسند الشاميين، بقية حديث أبي مسعود البدري، حديث: 17204

ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی کی نماز درست نہیں ہوتی جب تک کہ رکوع اور سجدے میں اپنی پیٹھ سیدھی نہ کرلے[1]۔

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ... پھر مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے میرے بچے! جب تم رکوع کرو تو اپنے ہاتھوں کو اپنے دونوں گھٹنوں پر رکھو اور انگلیوں کے درمیان کشادگی رکھو یعنی انگلیاں بالکل کھلی رکھو اور اپنے ہاتھوں کو اپنے پہلوؤں سے جدا رکھو، اور جب رکوع سے سر اٹھاؤ تو اس طرح کھڑے ہو جاؤ کہ ہر عضو اپنے اپنے مقام پر جم جائے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس شخص کی طرف نگاہ کرم نہیں فرمائے گا جو (رکوع و سجود میں) اپنی پیٹھ سیدھی نہ رکھتا ہو[2]۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ... رسول اللہ ﷺ جب رکوع کرتے تو نہ سر اونچا یعنی اٹھا کر رکھتے، اور نہ بالکل جھکا دیتے بلکہ اس کے درمیان میں یعنی پیٹھ اور سر بالکل سیدھا رکھتے تھے[3]۔

رکوع میں اعتدال:

انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اعتدال واطمینان سے رکوع کرو[4]۔

---

[1] سنن ابي داؤد، كتاب الصلاة، باب 143-144 صلاة من لا يقيم صلبه في الركوع و السجود، حديث: 855، وسنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 196 ماجاء في من لا يقيم صلبه في الركوع والسجود، حديث: 265، وسنن النسائي، كتاب الافتتاح، باب 88 اقامة الصلب في الركوع والسجود، حديث: 1027، وسنن ابن ماجة، كتاب اقامة الصلاة، باب 16 الركوع في الصلاة، حديث: 870

[2] المعجم الاوسط: 124/6 حديث: 5991

[3] صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب 46 ما يجمع صفة الصلاة الخ، حديث: 498

[4] سنن الدارمي: 348/1، كتاب الصلاة، باب 75 النهي عن الافتراش ونقرة الغراب، حديث: 1322، سنن النسائي كتاب الافتتاح، باب 89 الاعتدال في الركوع والسجود، حديث: 1028

نعمان بن مرہ ﷛ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ شرابی، زانی اور چور کے بارے میں تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟ یعنی ان کا گناہ کتنا بڑا ہے؟ یہ واقعہ ان تینوں کے احکام نازل ہونے سے پہلے کا ہے، صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ گناہ کبیرہ ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی سزا بھی ہے، اور بہت بُری چوری اس آدمی کی ہے جو اپنی نماز میں چوری کرتا ہے، صحابہ نے عرض کیا کہ کس طرح کوئی شخص اپنی نماز میں چوری کرتا ہے؟ فرمایا کہ جو نماز کا رکوع اور سجدہ پورا نہ کرے[1] (وہ بہت بُرا چور ہے)۔

سیدنا ابوہریرہ ﷛ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف لائے، پھر ایک شخص آیا اور نماز پڑھنے لگا، نماز سے فارغ ہو کر اس نے نبی کریم ﷺ کو سلام کیا آپ ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ واپس جا پھر نماز پڑھ، اس لئے کہ تو نے نماز نہیں پڑھی، اس نے نماز پڑھی پھر آ کر سلام کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ واپس جا پھر نماز پڑھ اس لئے کہ تو نے نماز نہیں پڑھی، ایسا تین مرتبہ ہوا، پھر اس شخص نے عرض کیا کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو نبی بنا کر بھیجا ہے اس سے زیادہ اچھی نماز مجھے پڑھنا نہیں آتی، آپ مجھے نماز پڑھنے کا صحیح طریقہ سکھا دیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تو نماز کے ارادہ سے اٹھے تو تکبیر تحریمہ کہہ، پھر قرآن مجید میں سے جو تیرے لئے آسان ہو پڑھ، پھر رکوع کر، یہاں تک کہ اطمینان سے رکوع پورا کر، پھر رکوع سے سر اٹھا یہاں تک کہ سیدھا کھڑا ہو جا، پھر سجدہ کر یہاں تک کہ اطمینان سے سجدہ مکمل کر، پھر سجدہ سے اٹھ یہاں تک کہ اطمینان سے بیٹھ جا، پھر اطمینان سے سجدہ کر، پھر ایسا ہی پوری نماز میں کر[2]۔

اس حدیث میں جس نمازی کا ذکر ہے اس نے اعتدال اور اطمینان وسکون سے رکوع و سجود نہ کیا تھا، اسی طرح قومہ وجلسہ ٹھہر ٹھہر کر نہیں کیا تھا، اسی لئے رسول اللہ ﷺ بار بار اسے نماز دہرانے کی

---

[1] موطا امام مالک، ص: 154، کتاب قصر الصلاة في السفر، باب 23 العمل فی جامع الصلاة، حدیث: 403/78

[2] صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب 122 أمر النبي ﷺ الذي لا يتم ركوعه بالاعادة،، حديث: 793، صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب 11 وجوب قرأة الفاتحة، حديث: 397

تلقین کرتے رہے اور آخر میں جو نماز سکھائی اس میں انہی باتوں کی تاکید کی کہ رکوع، سجدہ، قومہ اور جلسہ اطمینان و سکون سے کرو۔

رکوع و سجود کی تسبیح :

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تو آپ ﷺ نے رکوع میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ اور سجدوں میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى پڑھا[1]۔

ذخیرۂ احادیث کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے رسول اللہ ﷺ نے رکوع اور سجدے میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ اور سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى کہنے کی امت کو ہدایت و تلقین فرمائی ہے اور یہی آپ کا معمول مبارک بھی تھا، لیکن دوسری بعض احادیث میں رکوع و سجدہ ہی کی حالت میں تسبیح و تقدیس کے بعض دوسرے کلمات اور دعاؤں کا پڑھنا بھی جنابِ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، بعض قرائن کی بناء پر بعض علماء امت کا یہ خیال ہے کہ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ اور سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى کے علاوہ رکوع و سجود میں جو دعائیں آپ سے منقول ہیں وہ آپ زیادہ تر تہجد و نفل وغیرہ نمازوں میں پڑھتے تھے، ہمارے

---

[1] سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 194 التسبيح في الركوع والسجود، حديث: 262، وهكذا في صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب 27 استحباب تطويل القراءة في صلاة الليل، حديث: 772، وهكذا في سنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب 146-147 ما يقول الرجل في ركوعه وسجوده، حديث: 871، وهكذا في سنن النسائي، كتاب الافتتاح، باب 77 تعوذ القاري اذا مر بآية عذاب، حديث: 1008، وهكذا في سنن ابن ماجة، كتاب الصلاة، باب 20 التسبيح في الركوع والسجود، حديث: 888

احناف بزرگوں سے بھی ثابت ہے کہ کبھی کبھی فرض نمازوں میں بھی بعض دعاؤں کا پڑھنا ثابت ہے، اللہ تعالیٰ اگر توفیق دے اور ان مبارک دعاؤں کا مطلب آدمی سمجھتا ہو، تو رکوع و سجود میں تسبیح کے ساتھ کبھی کبھی یہ دعائیں بھی پڑھنی چاہئیں خاص کر نوافل میں، جن میں آدمی کو اختیار ہے جتنا لمبا چاہے رکوع و سجدہ کرے، ہاں فرض نمازوں میں امام کو اس کا لحاظ ضرور رکھنا چاہئے کہ مقتدیوں کو تکلیف اور گرانی نہ ہو، نہ تو ایسی جلدی اور عدم اعتدال جیسا کہ ہمارے ملکوں کے ائمہ حضرات و نمازیوں کا حال ہے، اور نہ ہی اتنی طوالت جیسا کہ بعض عرب ملکوں میں رواج ہے، بلکہ اعتدال اور میانہ روی رہے۔

قومہ میں ذکر مسنون :

سیدنا ابوہریرۃ ﷺ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ اجب سَمِعَ اللهُ لِمَنْ حَمِدَہٗ کہتے تو اس کے بعد اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ[1].

بعض راویت میں ربنا لک الحمد بغیر واو کے ہے۔

سیدنا ابوہریرہ ﷺ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ امام اس لئے ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے، لہٰذا امام سے (ارکان کی ادائیگی میں) اختلاف نہ کرو، وہ جب رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو اور جب وہ "سمع اللہ لمن حمدہ" کہے تو تم "ربنا لک الحمد" کہو[2]۔

سیدنا ابوہریرہ ﷺ سے روایت ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب امام (رکوع سے اٹھتے ہوئے) سَمِعَ اللهُ لِمَنْ حَمِدَہٗ (اللہ نے سنی اس بندہ کی جس نے اس کی حمد کی) کہے تو تم اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَكَ

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب 124 ما يقول الامام ومن خلفهاذا رفع رأسهمن الركوع، حديث: 795، صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب 10 اثبات التكبير في كل خفض ورفع الخ، حديث: 392

[2] صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب 74 اقامة الصف من تمام الصلاة، حديث: 722، وايضاً كتاب الأذان، باب 82 ايجاب التكبير وافتتاح الصلاة، حديث: 733

الْحَمْدُ (اے اللہ! ہمارے پروردگار تیرے ہی لئے ساری حمد وستائش ہے) کہو، کیوں کہ جس کا کہنا فرشتوں کے کہنے کے موافق ہوگا اس کے پچھلے گناہ معاف کردیئے جائیں گے [1]۔

نماز باجماعت میں جب امام رکوع سے اٹھتے ہوئے سمع اللہ لمن حمدہ کہتا ہے تو اللہ کے فرشتے بھی اللھم ربنا لک الحمد کہتے ہیں، اس حدیث میں رسول اللہ نے امام کے پیچھے نماز پڑھنے والوں کو حکم دیا ہے کہ اس موقع پر وہ بھی یہی کلمہ کہا کریں اور فرمایا کہ جن لوگوں کا یہ کلمہ فرشتوں کے کلمہ کے موافق اور مطابق ہوگا اس کلمہ کی برکت سے ان کے پچھلے قصور وگناہ معاف ہو جائیں گے، موافق ہونے کا مطلب بالکل واضح ہے کہ ان کے ساتھ ہو آگے پیچھے نہ ہو۔

سیدنا عبد اللہ بن ابی اوفی ﷛ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب رکوع سے اٹھتے تو فرماتے: ''سَمِعَ اللهُ لِمَنْ حَمِدَه. اَللّٰهُمَّ! رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ ملءِ السَّمَاوَاتِ وَمِلْءَ الْأَرْضِ . وَمِلْأَ مَاشِئْتَ مِنْ شَئٍ بَعْدُ'' یعنی اللہ تعالی نے سنی اس بندہ کی جس نے اس کی تعریف کی، اے اللہ ہمارے رب! تیرے ہی لئے ساری حمد وستائش ہے اتنی کہ جس سے آسمان وزمین کی ساری وسعتیں بھر جائیں اور زمین وآسمان سے آگے جو سلسلۂ وجود تیری مشیت میں ہے اس کی بھی وسعتیں بھر جائیں [2]۔

سیدنا رفاعہ بن رافع زرقی ﷛ فرماتے ہیں کہ ایک دن ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے، جب آپ ﷺ نے رکوع سے اٹھ کر سمع اللہ لمن حمدہ کہا تو مقتدیوں میں سے ایک شخص نے یہ پڑھا'' رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ، حَمْدًا کَثِيْرًا طَيِّبًا مُبَارَکًا فِيْهِ ''جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو دریافت

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب 125 فضل اللهم ربنا ولک الحمد، حديث: 796، وايضاً كتاب بدء الخلق، باب 7 اذا قال أحدكم آمين الخ، حديث: 3228، صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب 18 التسبيح والتحميد والتأمين، حديث: 309

[2] صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب 40 ما يقول اذا رفع رأسه من الركوع، حديث: 476، وهكذا في مسند الامام أحمد: 95/1، مسند الخلفاء الراشدين، مسند على بن أبي طالب، حديث: 729، وأيضاً 102/1، حديث: 729، وأيضًا 270/1، مسند آل عباس، مسند عبد الله بن عباس، حديث: 2440 و 2489 و 2505 و 3083

فرمایا کہ یہ الفاظ کس نے کہے ہیں؟ کہنے والے صحابی نے عرض کیا کہ میں نے یہ الفاظ کہے ہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے تیس سے زائد فرشتوں کو دیکھا کہ وہ ان الفاظ کو لکھنے کے لئے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں[1]۔

صحیح مسلم کی اسی حدیث کی دوسری روایت میں یہ دعاء بھی منقول ہے:

اَللّٰھُمَّ طَھِّرْنِیْ بِالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ وَالْمَاءِ الْبَارِدِ. اَللّٰھُمَّ طَھِّرْنِیْ مِنَ الذُّنُوْبِ وَالْخَطَایَا کَمَا یُنَقَّی الثَّوْبُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْوَسَخِ[2]

اے اللہ مجھے اولے کے پانی، برف اور ٹھنڈے پانی کے ذریعہ پاک وصاف فرما، اے اللہ مجھے گناہوں اور خطاؤں سے ایسا ہی پاک وصاف فرما جیسا کہ سفید کپڑوں کو میل کچیل سے پاک وصاف کیا جاتا ہے۔

نوٹ: صحیح مسلم کی دوسری روایت میں لفظ "وسخ" کی جگہ "دَنس" کا لفظ ہے، دونوں کا معنی ایک ہی ہے، یعنی میل کچیل اور گندگی۔

صحیح مسلم ہی میں سیدنا ابو سعید خدری ؓ اور سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے قومہ میں یہی دعاء کچھ اور اضافہ کے ساتھ مروی ہے، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ا سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد کبھی صرف ربنا لک الحمد اور اللھم ربنا لک الحمد کہتے تھے اور کبھی اس کے ساتھ اضافہ بھی کرتے تھے جو عبد اللہ بن ابی اوفی ؓ کی روایت سے معلوم ہوا اور کبھی اس پر مزید اضافہ بھی فرماتے تھے جس کی روایت سیدنا ابو سعید خدری اور سیدنا عبد اللہ بن عباس ؓ نے کی ہے، اور اسی

---

[1] صحیح البخاري، کتاب الأذان، باب 126، حدیث: 799وسنن ابی داود، کتاب الصلاۃ، باب 118-119،ما یستفتح بهالصلاةمن الدعاء، حدیث: 770، سنن الترمذي، کتاب الصلاۃ، باب 296 ماجاء في الرجل یعطس في الصلاۃ، حدیث: 404، سنن النسائي، کتاب الافتتاح، باب 36 قول الماموم اذا عطس خلف الامام، حدیث: 931

[2] صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب 4 مایقول اذا رفع رأسهمن الرکوع، حدیث: 476

واسطے کبھی کبھی آپ کا قومہ اتنا طویل ہو جاتا تھا کہ لوگوں کو سہو کا شبہہ ہونے لگتا تھا جیسا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ (کبھی ایسا ہوتا کہ) رسول اللہ ﷺ جب (رکوع سے اٹھ کر) سمع اللہ لمن حمدہ کہتے تو (اتنی دیر) کھڑے رہتے کہ ہم کو خیال ہوتا کہ شاید آپ کو سہو ہو گیا، پھر سجدہ میں جاتے اور دونوں سجدوں کے درمیان (اتنی دیر) بیٹھے رہتے کہ ہم خیال کرنے لگتے کہ شاید آپ کو سہو ہو گیا[1]۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ کبھی کبھی آپ کا قومہ وجلسہ اتنا طویل ہو جاتا تھا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو سہو اور بھول کا شبہ ہونے لگتا تھا وہیں اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایسا کبھی شاذ و نادر ہی ہوتا تھا، عام عادتِ شریفہ نہیں تھی، ورنہ اگر روز مرہ کا معمول یہی ہوتا یا بکثرت ایسا ہوا کرتا تو کسی کو سہو اور بھول کا شبہ نہ ہوتا۔

رکوع اور سجدہ کی طرح قومہ اور جلسہ میں بھی جو کلمات اور جو دعائیں رسول اللہ سے منقول وماثور ہیں ظاہر ہے وہ سب نہایت ہی مبارک اور مقبول ہیں، البتہ اگر نماز پڑھنے والا امام ہو تو نبی کریم ہی کی ہدایت: اذا أم أحدکم الناس فلیخفف[2]

"جب تم میں سے کوئی شخص لوگوں کی امامت کرے تو چاہئے کہ نماز ہلکی یعنی مختصر پڑھائے" کے مطابق اس کو اس بات کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ اس کا طرزِ عمل مقتدیوں کے لئے زحمت ومشقت کا باعث نہ بن جائے۔

قومہ اور جلسہ کا اطمینان:

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب 38 اعتدال أرکان الصلاۃ، حدیث: 473

[2] صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب 37 أمر الأئمة بتخفیف الصلاۃ، في تمام، حدیث: 467 عن ابی ہریرۃ، صحیح البخاري، کتاب الأذان، باب 62 اذا صلی لنفسہ فلیطول ماشاء، حدیث: 703

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (وہ ایک طویل حدیث بیان کرتے ہیں جس میں رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابی کو نماز کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ) پھر رکوع کر یہاں تک کہ اطمینان سے رکوع پورا کر، پھر رکوع سے سر اٹھا یہاں تک کہ سیدھا کھڑا ہو جا، پھر سجدہ کر یہاں تک کہ اطمینان سے سجدہ کر، پھر سجدہ سے اٹھ یہاں تک کہ اطمینان سے بیٹھ جا، پھر اطمینان سے سجدہ کر، پھر ایسا ہی پوری نماز میں کر[1]۔

ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ... رسول اللہ ﷺ جب رکوع سے اپنا سر مبارک اٹھاتے تو جب تک سیدھے کھڑے نہ ہو جاتے اس وقت تک سجدہ میں نہ جاتے، اور جب سجدہ سے اپنا سر مبارک اٹھاتے تو جب تک سیدھے بیٹھ نہ جاتے اس وقت تک دوسرا سجدہ نہ کرتے[2]۔

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے محمد رسول اللہ ﷺ کی نماز کو غور سے دیکھا تو پایا کہ آپ ﷺ کا قیام، رکوع، رکوع کے بعد قومہ کا اعتدال، سجدہ، دو سجدوں کے درمیان کا جلسہ، دوسرا سجدہ، پھر سلام اور فراغت نماز کے بعد اٹھنے کے درمیان کا جلسہ، سب تقریباً برابر تھے[3]۔

---

[1] صحیح البخاري، كتاب الأذان، باب 122 أمر النبي ﷺ الذي لا يتم ركوعهبالاعادة، حديث:793، وباب 95 وجوب القراءة، حديث: 757، وكتاب الاستيذان، باب 18 من رد فقال عليك السلام، حديث: 1251، وكتاب الأيمان والنذور، باب 15 اذا حنث ناسيا في الأيمان، حديث: 6667، وصحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب 11 وجوب قراءة الفاتحة الخ، حديث: 397 وسنن ابی داود، كتاب الصلاة، باب 143-144 صلاة من لا يقيم صلبهفي الركوع والسجود حديث: 856 وسنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 226 ماجاء في وصف الصلاة، حديث:302، وسنن النسائى، كتاب الافتتاح، باب 7 فرض التكبيرة الأولىٰ، حديث:884، وسنن ابن ماجة، كتاب الصلاة، باب 72 اتمام الصلاة، حديث: 1060

[2] صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب 46 مايجمع صفة الصلاة الخ،حديث: 498، و سنن ابي داود، كتاب الصلاة، باب 121-122، من لم ير الجهر ببسم اللهالرحمن الرحيم، حديث: 783

[3] صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب 38 اعتدال اركان الصلاة وتخفيفها في تمام، حديث: 471

اسی وجہ سے اہل علم نے فرمایا ہے کہ تعدیل ارکان یعنی تمام ارکان کو اطمینان و سکون سے ادا کرنا واجب ہے، خاص طور پر قومہ، رکوع، سجدہ اور جلسہ وغیرہ کو اطمینان سے ادا کرنا، یا جو دعائیں نماز میں پڑھی جاتی ہیں ان کو اطمینان سے دل لگا کر پڑھنا ضروری ہے اور ایسی ہی نماز مقبول ہوتی ہے، جلدی جلدی کرنے سے بہت سی چیزیں چھوٹ جاتی ہیں جن سے یا تو نماز ہی فاسد ہو جاتی ہے یا نماز میں نقص اور کمی واقع ہو جاتی ہے، خاص طور پر قومہ اور جلسہ میں بعض حضرات بہت جلدی کرتے ہیں، حالانکہ جیسا کہ اوپر کی روایتوں سے معلوم ہوا کہ دیگر ارکان وافعال کی طرح ان دونوں عمل میں بھی اطمینان وسکون مطلوب ہے۔

تعدیل ارکان یعنی نماز کے تمام افعال کو سکون واطمینان سے ادا کرنا امام ابویوسفؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک فرض ہے[1]

لہٰذا تعدیل ارکان میں کوتاہی کرنے والے کی نماز ان ائمہ کرام کے نزدیک ادا نہیں ہوگی بلکہ فاسد ہو جائے گی، محققین علماءِ احناف فرماتے ہیں کہ تعدیل ارکان واجبات نماز میں سے ہے، لہٰذا ترکِ تعدیل کی وجہ سے سجدۂ سہو لازم ہوگا، چنانچہ ابن ساعاتی لکھتے ہیں: "امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نماز میں تعدیل ارکان یعنی رکوع اور سجدوں کو اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر ادا کرنا، اور رکوع و سجدوں کے درمیان کے قیام (جسے قومہ کہتے ہیں) کو مکمل ادا کرنا نیز دو سجدوں کے درمیان اطمینان سے جلسہ کرنا فرائض نماز میں سے ہے، اس کے (یعنی تعدیل ارکان کے) ترک سے نماز باطل ہو جائے گی، اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے[2] "۔

نیز صدر الشریعہ عبید اللہ بن مسعود رحمۃ اللہ علیہ اپنی شہرۂ آفاق کتاب شرح الوقایہ میں واجبات کو شمار کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "تعدیل ارکان بھی واجبات میں سے ہے... اور تعدیل ارکان یہ ہے کہ

---

[1] شرح النقایۃ : 154/1و المجموع للنووی: 3/388-389 والمغنی: 1/360-365، فصول مھمۃ فی حصول المتمۃ للملا علی القاری، ص: 45

[2] شرح مجمع البحرین کتاب الصلاۃ، فصول مھمۃ فی حصول المتمۃ للملا علی القاری، ص: 45

اطمینان سے رکوع وسجدہ کیا جائے اور کم سے کم اتنی دیر ٹھہرنا چاہئے کہ جس میں اطمینان وسکون کے ساتھ کم از کم ایک مرتبہ سبحان ربی الاعلی کی تسبیح پڑھی جاتی ہے، اور اسی طرح رکوع وسجدہ کے درمیان (قومہ) اور دو سجدوں کے درمیان (جلسہ) میں بھی اطمینان وسکون واجب ہے[1] "۔

وقت کے عظیم محدث وفقیہ صاحب ہدایہ علامہ برہان الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "اور اسی طرح جرجانی رحمۃ اللہ علیہ کی تخریج وتحقیق کے مطابق طمانینت اور سکون یعنی تعدیل ارکان سنت (موکدہ) ہے، اور کرخی رحمۃ اللہ علیہ کی تخریج وتحقیق کے مطابق یہ واجب ہے، یہاں تک کہ بھول کر تعدیل ارکان چھوڑنے کی وجہ سے سجدۂ سہو لازم ہوگا[2] "

اور علامہ ابراہیم حلبی نے امام شمس الائمہ محمد رضی الدین سرخسیؒ کے حوالہ سے نقل کیا ہے: "جس نے نماز میں تعدیل ارکان چھوڑ دی تو اس پر اعتدال لازم ہے یعنی پھر دوبارہ اعتدال کے ساتھ نماز پڑھے[3] "۔

افسوس کہ ہمارے ہاں اعتدال وسکون واجبات نماز میں سے ہے، بلکہ امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اسے فرض قرار دیا ہے، آج ہم اپنی مسجدوں میں دیکھتے ہیں کہ ائمہ ونمازی دونوں نے اس اہم عمل کو ترک کردیا ہے کہ امام نہ تو قومہ سکون واطمینان سے کرتے ہیں اور نہ ہی سجدہ، اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اگر ائمہ حضرات خود بھی ان دعاؤں کی پابندی کریں جو قومہ وجلسہ میں پڑھی جاتی ہیں، اور سارے مقتدیوں کو بھی یہ دعائیں سکھادیں تو انشاء اللہ اس اہم رکن کا احیاء ہوجائے گا اور ہماری نمازوں کا ایک بڑا نقص دور ہوجائے گا۔

سجدہ قرب الٰہی کا باعث:

[1] شرح الوقاية: 43/1- 44، وفصول مهمة في حصول السنة، ص: 46

[2] هداية: 50/1 باب صفة الصلاة

[3] منية المصلي وغنية المبتدي، ص: 207 مسائل تلقب بالاثني عشرية

سیدنا ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دراصل بندہ سجدے کی حالت میں اپنے رب سے بہت نزدیک ہوتا ہے، لہٰذا سجدے میں بہت دعا کرو [1]۔

اللہ تعالیٰ تو بندے سے ہر حال میں نزدیک ہوتا ہے لیکن سجدے کی حالت میں بندہ اس کے بہت نزدیک ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی رحمت ﷺ سجدے میں بڑی عاجزی اور اخلاص سے دعائیں مانگتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ عام طور پر زمین پر سجدہ کرتے تھے، اس لئے کہ مسجد نبوی میں فرش نہ تھا۔ صحابہؓ سخت گرمی میں نماز ادا کرتے اور زمین کی گرمی کی وجہ سے اگر وہ زمین پر پیشانی نہ رکھ سکتے تو سجدے کی جگہ پر کپڑا رکھ لیتے اور اوپر سجدہ کرتے [2]۔

رمضان المبارک کی اکیسویں رات تھی۔ بارش برسی اور مسجد کی چھت ٹپک پڑی اور آپ ﷺ نے کیچڑ میں سجدہ کیا۔ آپ کی پیشانی اور ناک پر کیچڑ کا نشان تھا [3]۔

ایک دفعہ آپ ﷺ نے ہری چٹائی پر نماز ادا کی جو زیادہ عرصہ استعمال میں رہنے سے سیاہ ہو گئی تھی [4]۔

سجدہ، جنت میں داخلے کا باعث ہے:

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: جب آدم کا مومن بیٹا سجدے کی آیت پڑھتا ہے، پھر پڑھنے اور سننے والا سجدہ کرتا ہے تو شیطان روتا ہوا ایک طرف ہو کر کہتا ہے: ہائے میری ہلاکت، تباہی اور بربادی! آدم کے بیٹے کو سجدے کا حکم دیا گیا۔ اس نے سجدہ کیا، لہٰذا اس کے لئے بہشت ہے اور مجھے سجدے کا حکم دیا گیا۔ میں نے نافرمانی کی، چنانچہ میرے لئے آگ ہے [5]۔

---

[1] مسلم باب مایقال فی الرکوع والسجود حدیث482

[2] مسلم باب استحباب تقديم الظهر في اول الوقت في غير شدة الحر حديث 620

[3] بخاري باب من خرج من اعتكافه عند الصبح حديث 2040مسلم باب فضل ليلة القدر حديث1168

[4] بخاري باب الصلوى علي الحصير حديث380مسلم باب جواز الجماعة في النافلة حديث 658

[5] مسلم باب بيان اطلاق اسم الكفر علي من ترك الصلوة حديث 81

لمبا سجدہ کرنا:

عام طور پر رسول اللہ ﷺ کا سجدہ رکوع کے برابر لمبا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی کسی عارضے کی بنا پر زیادہ لمبا کرتے۔ ایک دفعہ آپ ظہر یا عصر کی نماز میں سیدنا حسن یا سیدنا حسینؓ کو اٹھائے ہوئے تشریف لائے۔ آپ نماز کی امامت کے لئے آگے بڑھے اور انہیں اپنے قدم مبارک کے قریب بٹھا لیا۔ پھر آپ نے نماز شروع کی اور لمبا سجدہ کیا۔ جب آپ نے نماز ختم کی تو لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے اس نماز میں ایک سجدہ بہت لمبا کیا یہاں تک کہ ہمیں خیال گزرا کہ کوئی واقعہ رونما ہو گیا ہے یا پھر وحی نازل ہو رہی ہے۔ آپ نے فرمایا: ایسی کوئی بات نہیں تھی، بس میرا بیٹا میری کمر پر سوار ہو گیا تو میں نے یہ بات پسند نہ کی کہ سجدے سے جلدی سر اٹھا کر اسے پریشانی میں مبتلا کروں[1]۔

کثرت سجود، بہشت میں رسول اللہ ﷺ کی رفاقت کا باعث:

ربیعہ بن کعبؓ روایت کرتے ہیں کہ مین رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رات گزارتا تھا۔ آپ کے لئے وضو کا پانی اور آپ کی دیگر ضرورت مسواک وغیرہ کا خیال رکھتا تھا۔ ایک رات خوش ہو کر آپ نے مجھے فرمایا: کچھ دین و دنیا کی بھلائی مانگ مجھ سے دعا کروا۔ میں نے کہا: بہشت میں آپ کی رفاقت چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: اس کے علاوہ کوئی اور چیز۔ میں نے کہا: بس یہی! پھر آپ نے فرمایا: پس اپنی ذات کے لئے سجدوں کی کثرت سے میری مدد کر[2]۔

نوٹ: اس حدیث میں یہ کہیں نہیں ہے کہ میں چونکہ کل مخلوق کا حاجت روا اور مشکل کشا ہوں، لہٰذا مجھ سے ہر قسم کی غیبی مدد مانگا کرو، اس کے برعکس نبی اکرم ﷺ جناب ربیعہؓ سے مدد مانگ رہے ہیں۔

جس طرح معالج مریض کو کہے کہ حصول شفا کے لئے میں تیرے لئے کوشش کرتا ہوں اور تو میری ہدایات کے مطابق دوائی اور پرہیز کرنے کے ساتھ میری مدد کر۔ اسی طرح آپ ربیعہؓ کو فرمایا

---

[1] نسائي بابَ 2 /229 '230 حدیث 1141 اسے امام حاکم 626,627/3 ابن خزیمہ حدیث 1037 ذہبی نے صحیح کہا ہے

[2] مسلم باب فضل السجود والحث علیه حدیث 489

کہ مین تیرے حصول مدعا کے لئے دعا سے کوشش کرتا ہوں اور تو سجدوں کی کثرت کے ساتھ میری کوشش میں میری مدد کر۔اس طرح تجھے بہشت میں میری رفاقت حاصل ہو گی۔

ثوبانؓ نے رسول اللہ ﷺ سے جنت میں لے جانے والا عمل پوچھا تو آپ نے فرمایا: اللہ کے لئے (پورے خلوص و حضور کے ساتھ) سجدوں کی کثرت لازم کر، پس تیرے ہر سجدے کے بدلے اللہ تعالیٰ تیرا درجہ بلند کریگا اور اس کے سبب سے گناہ بھی مٹائے گا[1] ۔

سجدے کی دعائیں:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خبردار! میں رکوع اور سجدے میں قرآن حکیم پڑھنے سے منع کیا گیا ہوں، چنانچہ تم رکوع میں اپنے رب کی عظمت بیان کرو اور سجدے میں خوب دعا مانگو۔ تمہاری دعا قبولیت کے لائق ہو گی[2]۔

سیدنا حذیفہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سجدے میں یہ دعا پڑھتے :سبحان ربی الاعلیٰ . میرا بلند پروردگار ہر عیب سے پاک ہے[3] ۔

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں : ﴾

حضرت مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے سجدے میں تین مرتبہ سبحان ربی الاعلی پڑھا اس نے سجدہ پورا کیا مگر یہ ادنی درجہ کم از کم تعداد ہے[4]۔

سبحان ربي الاعلي وبحمده

میرا بلند پروردگار پاک ہے میں اس کی تعریف کرتا ہوں

تبصرہ:

---

[1] مسلم باب فضل السجود والحث عليه حديث 488

[2] مسلم باب النهي عن قراءة القران في الركوع والسجود حديث 479

[3] مسلم باب استحباب تطويل القراءة في صلاة الليل حديث 776

[4] البزار والطبراني في الكبير /مجمع الزوائد 2/ 128 وفی نسخة 315 یہ روایت حسن ہے

ہم جواباً عرض کرتے ہیں کہ اس حدیث کو یہاں حسن کہا ہے۔ جبکہ {تسہیل الوصول ص:218} پر اسی حدیث کو ضعیف کہا ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں: ﴾

امی عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رکوع اور سجدے میں کثرت سے یہ دعا پڑھتے تھے[1]: سبحانک اللھم ربنا وبحمدک اللھم اغفر لی

اے ہمارے پروردگار اللہ تو ہر عیب سے پاک ہے ہم تیری تعریف اور پاکی بیان کرتے ہیں اے اللہ مجھے بخش دے۔

تبصرہ:

ہم تبصرہ کرتے ہوئے جواباً عرض کرتے ہیں کہ ابوداؤد سے حدیث کو نقل تو کر دیا لیکن اس حدیث پر امام ابو داؤد کے تبصرے کو پس پشت ڈال دیا۔ امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ ہم کو خوف ہے کہ یہ {بحمدہ} اضافہ محفوظ نہ ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ کہتے ہیں کہ ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ابن حبان نے اس کو کہاں پر "صحیح" کہاں ہے بلا حوالہ قول آپ کے اصول کے مطابق مردود ہے۔

سیدہ عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے رکوع اور سجدے میں یہ کہتے تھے[2]:

سبوح قدوس رب الملائکۃ والروح

فرشتوں اور روح جبریل کا پروردگار نہایت ہی پاک ہے[3]۔

ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے سجدے میں یہ کہتے تھے:

اللھم اغفر لی ذنبی کلہ دقہ وجلہ واولہ واخرہ وعلانیتہ وسرہ[1]

---

[1] ابو داؤد باب مایقول الرجل فی رکوعه و سجوده حدیث 870 ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے

[2] بخاري باب الدعاء في الركوع حديث 794 '817 مسلم باب مايقال في الركوع والسجود حديث 484

[3] مسلم حواله سابق حديث 487

اے اللہ! میرے چھوٹے اور بڑے، پہلے اور پچھلے، ظاہر اور پوشیدہ، تمام گناہ بخش دے۔

سبحانک وبحمدک لا الہ الا انت

اے اللہ! تیری ہی پاکیزگی اور تعریف ہے۔ تیرے سوا کوئی سچا معبود نہیں ہے[2]۔

رسول اللہ ﷺ سجدے میں فرماتے:

اللھم اجعل فی قلبی نورا وفی بصری نورا وفی سمعی نورا وعن یمینی نورا وعن یساری نورا وفوقی نورا وتحتی نورا وامامی نورا وخلفی نورا وعظم لی نورا

اے اللہ! میرے دل، میری بصارت اور سماعت کو ایمان کے نور سے منور فرما، میرے دائیں بائیں، اوپر نیچے، سامنے اور پیچھے ہر طرف نور پھیلا دے اور میری ہدایت کی روشنی کو بڑھا دے[3]۔

رسول اللہ ﷺ سجدے میں فرماتے:

اللھم انی اعوذ برضاک من سخطک وبمعافاتک من عقوبتک واعوذ بک منک لا احصی ثناء علی انت کما اثنیت علی نفسک[4]

اے اللہ! میں تیری رضامندی کے ذریعے تیرے غصے سے، تیری عافیت کے ذریعے تیری سزا سے اور تیری رحمت کے ذریعے تیرے عذاب سے پناہ چاہتا ہوں۔ میں تیری تعریف کو شمار نہیں کر سکتا۔ تو ویسا ہے جس طرح تو نے اپنی تعریف خود فرمائی ہے۔

علی بن ابو طالبؓ بیان کرتے ہی کہ رسول اللہ ﷺ جب سجدے میں جاتے تو یہ دعا پڑھتے۔

---

[1] مسلم الصلاۃ حوالہ سابقہ حدیث 483

[2] مسلم حولہ سابقہ حدیث 485

[3] مسلم باب الدعاء فی صلاۃ اللیل وقیامہ حدیث 763

[4] مسلم باب مایقال في الركوع والسجود حديث 486

اللهم لک سجدت وبک امنت ولک اسلمت ،سجد وجهی للذی خلقه وصورہ وشق سمعه وبصره تبارک الله احسن الخالقین

اے اللہ تیرے لئے میں نے سجدہ کیا۔ میں تجھ پر ایمان لایا۔ میں تیرا فرمانبردار ہوا۔ میرے چہرے نے اس ذات کو سجدہ کیا جس نے اسے پیدا کیا، اس کی اچھی صورت بنائی، اس کے کان اور آنکھ کو کھولا۔ بہترین تخلیق کرنے والا اللہ، بڑا ہی بابرکت ہے[1]۔

رسول اللہ ﷺ نے نماز عشاء میں سجدے کی آیت تلاوت کی تو سجدہ کیا[2]۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سحدہ کی آیت تلاوت کرتے اور سجدہ میں یہ پڑھتے :

سجدوجه للذي خلقه وشق سمعه وبصره بحوله وقوته فتبارك الله احسن الخالقين

میرے چہرے نے اس ہستی کو سجدہ کیا جس نے اپنی قدرت وطاقت سے اسے بنایا کان بنائیں آنکھیں بنائیں اللہ جو سب سے بہتر تخلیق کرنے والا ہے بہت بابرکت ہے[3]

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں : ﴾

سجدہ تلاوت واجب نہیں۔ زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کے سامنے سورۃ نجم تلاوت کی تو آپ نے سجدہ تلاوت نہیں کیا[4]۔

درمیان جلسہ (دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا)

ابو حمدی ساعدیؓ کی روایت ہے۔

---

[1] مسلم باب الدعاء في صلاة الليل وقيامه حديث 771

[2] بخاري باب من سجد لسجود القاري حديث1075

[3] ابو داؤد باب مايقول اذا سجد حديث 1414 اسے امام ترمذی حاکم اور ذہبی نے صحیح کہا ہے اور فتبارک الله احسن الخالقین کے الفاظ مستدرک حاکم 1/ 220 میں ہے

[4] بخاري باب من قرأ سجدة ولم يسجد حديث 1072 ' 1073. مسلم باب سجود التلاوت حديث 577

رسول اللہ ﷺ سجدے سے اپنا سر اٹھاتے اور اپنا بایاں پاؤں موڑتے بچھاتے پھر اس پر بیٹھتے اور سیدھے ہوتے یہاں تک کہ ہر ہڈی اپنے ٹھکانے پر آ جاتی پہلے سجدے سے سر اٹھا کر نہایت آرام و اطمینان سے بیٹھ جاتے اور دعائیں جو آگے آتی ہیں پڑھ کر پھر دوسرا سجدہ کرتے۔ [1]

تبصرہ:

ہم ذکر کردہ اس روایت پر ہم تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ پہلی بات یہ ہے کہ اس کی سند میں عبد الحمید بن جعفر ہے جو تقدیر کا منکر بدعتی راوی ہے ائمہ محدثین نے ان کو ضعیف کہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کے متن میں اذا قام من السجدتین کبر ورفع یدیہ کے الفاظ موجود ہے [2]۔ لہٰذا یہ روایت ضعیف متروک اور منسوخ ہے۔ فتدبر

آپ ﷺ کا معمول تھا کہ بیٹھتے وقت اپنا دایاں پاؤں کھڑا کر لیتے [3]۔

اور دونوں پاؤں کی انگلیاں قبلہ رخ کرتے [4]۔

اور کبھی کبھی آپ ﷺ اپنے قدموں اور اپنی ایڑیوں پر بیٹھتے [5]۔

نبی اکرم ﷺ خود بڑے اطمینان سے جلسے میں بیٹھے۔ علاوہ ازیں نہ بیٹھنے والے کی نماز کی نفی فرمائی۔ لیکن افسوس کہ عام لوگوں کو جلسے کا علم ہی نہیں کہ کیا ہے۔ جلسہ نماز میں فرض ہے اور اس میں طمانیت بھی فرض ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا جلسہ سجدے کے برابر ہوتا تھا [6]۔

کبھی کبھی زیادہ دیر تک بیٹھتے یہاں تک کہ بعض لوگ کہتے کہ آپ دوسرا سجدہ کرنا بھول گئے [1]۔

---

[1] ابو داؤد باب افتتاح الصلاة حديث 730 ترمذي باب ماجاء في وصف الصلاة حديث 304 ابن ماجة باب اتمام الصلاة حديث 1060۔ اسے امام نووی اور امام ترمذی نے صحیح کہا ہے

[2] نسائی 1/ص: 176 ، سنن دارمی ج/1 ص: 184 ، ابن خزیمہ 1 / 297 ، ترمذی 1 / 717 ، مسند احمد ، مسند بزار ج 9 / 187

[3] بخاري باب سنت الجلوس في التشهد حديث 828

[4] نسائي باب موضع اليدين عند الجلوس للتشهد الاول حديث 1158 اسے امام ابن خزیمہ اور امام ابن حبان نے صحیح کہا ہے

[5] مسلم باب جواز الاقعاء على العقبين حديث 536

[6] بخاري باب المكث بين السجدتين حديث 820' مسلم باب اعتدال اركان الصلاة وتخفيفها في تمام حديث 471

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

جلسے کی مسنون دعائیں:

سیدنا ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دونوں سجدوں کے درمیان یہ پڑھتے :

اللهم اغفرلي وارحمني وعافني واهدني وارزقني

اے اللہ! مجھے بخش دے، مجھ پر رحم فرما، مجھے ہدایت دے، مجھے عافیت سے رکھ اور مجھے روزی عطا کر [2]۔[3]

سیدنا حذیفہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دونوں سجدوں کے درمیان پڑھا کرتے تھے: رب اغفرلي، رب اغفرلي، اے میرے رب! مجھے معاف فرما، اے میرے رب! مجھے معاف فرما [4]۔[5]

دوسرا سجدہ:

جب آپ پورے اطمینان سے جلسے سے فارغ ہوں تو پھر دوسرا سجدہ کریں اور پہلے سجدے کی طرح اس میں بڑی خشوع و خضوع اور کامل اطمینان سے دعا یا دعائیں پڑھیں اور پھر اٹھیں۔

---

[1] بخاري حواله سابقه حديث 821 مسلم باب حديث 472 ' 473

[2] ابو داؤد باب الدعاء بين السجدتين حديث 850 . ترمذي باب مايقول بين السجدتين حديث 284 اسے حاکم ذہبی اور نووی نے صحیح کہا ہے

[3] **تبصرہ:** قارئین کرام اسی حدیث کو {تسہیل الوصول ص: 223} پر حاکم اور ذہبی کی تصحیح کے باوجود ضعیف کہا تھا اور یہاں پھر حاکم اور ذہبی کے تقلید میں اس کو صحیح کہہ دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا تسہیل الوصول میں حاکم اور ذہبی کے تقلید جائز نہیں تھی لیکن یہاں جائز ہو گئی۔

[4] ابو داؤد باب مايقول الرجل في ركوعه وسجوده حديث 874 دارمي حديث 1325 ابن ماجة حديث 897 اسے حاکم 271/1 اور ذہبی نے صحیح کہا ہے

[5] **تبصرہ:** یہ حدیث رات کے نماز کے بارے میں ہیں۔ اس کو آپ عام کیسے کرتے ہیں؟۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

جلسہ استراحت:

دوسرا سجدہ کرچکنے کے بعد ایک رکعت پوری ہو چکی ہے اب دوسری رکعت کے لئے آپ نے اٹھنا ہے لیکن اٹھنے سے پہلے جلسہ استراحت میں ذرا بیٹھ کر اٹھیں اس کی صورت یہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ اکبر کہتے ہوئے { دوسرے سجدے سے } اٹھتے اور اپنا بایاں پاؤں موڑتے ہوئے { بچھاتے اور } اس پر بیٹھتے پھر { دوسری رکعت کے لئے } کھڑے ہوتے۔

ہم اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قارئین کرام! یہ وہی ابو حمید الساعدی والی روایت ہے اس پر "گیارہ صحابہ کی شہادت" اس عنوان کے تحت بحث ہو گئی ہے وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں: ﴾

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز کی طاق { پہلی اور تیسری } رکعت کے بعد کھڑے ہونے سے قبل سیدھے بیٹھتے تھے۔ بخاري باب من استوی قاعدا حدیث 823

تبصرہ:

ہم جواباً کہتے ہیں قارئین کرام! جلسہ استراحت پر یہ واحد حدیث ہے۔ لیکن فن حدیث کے ماہرین محدثین نے کہا ہے کہ یہ آپ ﷺ کے آخیر عمر کی بات ہے جب آپ ﷺ کا جسم مبارک بھاری ہوگیا تھا۔ یعنی آپ ﷺ عذر کی بنا پر جلسہ استراحت فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام کا اس پر عمل نہیں تھا۔ حضرت علی جلسہ استراحت نہیں کرتے تھے عبد اللہ بن زبیر نہیں کرتے تھے عبد اللہ بن مسعود نہیں کرتے تھے حضرت عمر نہیں کرتے تھے عبداللہ ابن عمر نہیں کرتے تھے۔ امام شعبی فرماتے ہیں صحابہ کرام جلسہ استراحت نہیں کرتے تھے۔ نعمان بن عیاش تابعی فرماتے ہیں کہ میں نے کئی صحابہ کرام کو دیکھا کوئی بھی جلسہ استراحت نہیں کرتے تھے۔ { مصنف ابن ابی شیبہ } ۔ نیز امام مالک. امام اوزاعیؒ امام احمد اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالی بھی بغیر عذر کے جلسہ استراحت کے قائل نہیں تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کا یہ عمل عذر پر محمول ہے لہٰذا اس کو بلا عذر کے

عام معمول بنانا سنت طریقہ نہیں ہے۔ کیونکہ خود آپ ﷺ نے خلاد بن رافع کو جو نماز کا طریقہ سکھایا تھا اس میں جلسہ استراحت نہیں سکھایا تھا۔

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

جلسہ استراحت مسنون نہیں:

دوسرے سجدہ کے بعد جلسہ استراحت نہ کرے یعنی ایسا نہ ہو کہ دوسرے سجدہ سے فارغ ہونے کے بعد دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہونے سے پہلے بیٹھ جائے پھر اٹھے بلکہ دوسرے سجدہ سے فارغ ہوتے ہی کھڑے ہو جائے، اسی طرح تیسری رکعت پوری ہونے پر چوتھی کے لئے سیدا کھڑے ہو جائے جلسہ استراحت نہ کریں۔ حضور ﷺ کا معمول مبارک یہی تھا کہ آپ ﷺ سیدھے کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔

عن ابي هريرة قال: كان النبي ﷺ ينهض في الصلوة علي صدور قدميه [1]

عن انس مرفوعا :نهى رسول الله ﷺ عن الإقعاء والتورك في الصلوة [2] .

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں اپنے قدموں کے کناروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

---

3 ترمذي ج: 1 /ص: 39،وقال عليه العمل عند اهل العلم يختاورن أن ينهض الرجل في الصلوة على صدرو قدميه وخالد بن اياس الداوي في هذ السند ضعيف عند اهل الحديث،قلت :ولكن قال ابن عدي احاديثه كلها غرائب إفراد ومع ضعفه يكتب حديثه الخ،كذا في التهذيب (ج:3/ص:81) ولا يخف أن حديثه هذا له واخرجه عبد الرزاق عن ابن مسعود رضي الله عنه ابن عباس رضي الله عنه وابن عمر رضي الله عنه واخرجه البيهقي عن عبد الرحمن بن يزيد أنه ابن مسعود رضي الله عنه،فذكر ضعفاه فقد اتفق اكابر الصحابة الذين كانوا اقر الى رسول الله ﷺ والثر اقتفاء لأثره ، وألزم بصحبه من مالك بن الحويرث رضي الله عنه على ما قال، فوجب تقديمه ولذا كان العمل عليه عند اهل العلم كما سمعته من قول الترمذي (ج:1/ص:2289

4 أخرجه أحمد في مسنده وصححه السيوطي في الجامع الصغير (ج1 / ص: 188) أعلاء السنن ج: 5 / ص: 144 } .ورواه ابو داؤد (ج:1/ص:154) واسناده صحيح (آثار السنن ج: 1/ص:120)

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد امام ترمذی فرماتے ہیں : " اہل علم کی نزدیک حدیث ابوہریرۃ پر ہی عمل ہے وہ یہی پسند کرتے ہیں کہ نماز پڑھنے والا اپنے قدموں کے کناروں پر (پنجوں کے بل کھڑے ہو جائے "۔

ابو حمید الساعدی کی روایت (جس پر ہم نے تفصیلی کلام کیا ہے اور ان حضرات کا مضبوط دلیل ہے اس میں بھی جلسہ استراحت کا کوئی ذکر نہیں بلکہ اس میں حضور ﷺ کے دوسرے رکعت کے لئے کھڑے ہونے کو یو بتایا گیا :فقام ولم یتورک [1]

پس کھڑے ہو گئے اور بیٹھ کر سرین پر سہارا نہیں دیا۔

ابو مالک اشعری نے ایک مرتبہ اپنے قبیلہ کے لوگوں کو حضور ﷺ کی نماز پڑھائی اس میں بھی جلسہ استراحت نہیں بلکہ یوں ہے: ثم کبر فسجد ثم کبر فانتھض قائما [2].

پھر اللہ اکبر کہا پھر سجدہ کیا پھر اللہ اکبر کہا اور کھڑے ہو گئے۔

اسی طرح تمام اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم جو سفر وحضر میں زیادہ تر حضور ﷺ کے ساتھ رہا کرتے جلسہ استراحت کے نفی کرتے ہیں۔ان کا طریقہ بھی یہی تھا کہ پہلی اور تیسری رکعت میں دوسرے سجدہ سے فارغ ہوتے ہی بغیر بیٹھے سیدھے کھڑے ہو جاتے تھے۔

عبداللہ بن مسعود نماز میں اپنے قدموں کے کناروں پر کھڑے ہو جاتے تھے،اور بیٹھتے نہیں تھے [3]۔

مصنف ابن ابی شیبہ کے اسی صفحہ پر حضرت عمر، حضرت علی، عبداللہ ابن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ ابن زبیرؓ اور ابن ابی سے بھی اسی قسم کی احادیث وآثار موجود ہیں۔

امام شعبی فرماتے ہیں : "حضرت عمر، حضرت علی، او ر دیگر اصحاب رضی للہ عنہم رسول اللہ ﷺ اپنی نمازوں میں اپنے قدموں کے کناروں سے کھڑے ہو جاتے تھے [1]"۔

1 ابوداؤد ج: 1 / ص: 154 ، طحاوی ج: 1 :/ ص: 127

2 مسند احمد ج: 5 ص: 343 ،واسنادہ حسن (آثار السنن ج: 1/ص:120) مجمع الزوائد ج: 1 / ص: 194

3 مصنف ابن ابی شیبہ ج: 1/ ص: 394

لقمان بن ابی عیاش سے مروی ہے: "میں نے بہت سے صحابہ ؓ کو پایا ہے۔ اور ان کا طریقہ یہ تھا جب وہ پہلی رکعت کے دوسرے سجدے اور تیسری رکعت کے دوسرے سجدے سے سر اٹھاتے تو سیدھے کھڑے ہو جاتے اور بیٹھتے نہ تھے[2]"۔

حافظ ابن قیم حنبلی رحمہ اللہ زاد المعاد میں لکھتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ اپنے قدموں اور گھٹنوں کے کناروں سے کھڑے ہو جاتے تھے اپنی ران پر سہارا لیتے ہوئے جیسا کہ حضرت وائل بن حجر اور حضرت ابوہریرہ نے ذکر کیا ہے اور دونوں ہاتھوں کو زمین پر نہیں ٹیکتے تھے[3]"۔

چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں: "یوسف بن موسیٰ نے خبر دی ہے کہ حضرت ابو امامہ باہلیؓ (سجدوں کے بعد) اٹھنے کے متعلق سوال کیا گیا، انہوں نے فرمایا دونوں قدموں کے کناروں سے کھڑے ہو جائے حدیث رفاعہ کے مطابق اور ابن عجلان کی حدیث میں ہے کہ ابو امامہ اپنے قدموں کے کناروں پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور یہ بات بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کرام رضی اللہ عنہم نے روایت کی ہے۔ اور وہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم جنہوں نے حضور ﷺ کے نماز کا طریقہ بیان کیا ہے ان سب نے اس جلسہ استراحت کا ذکر نہیں کیا بلکہ اس تذکرہ صرف ابو حمید الساعدیؓ اور مالک بن الحویرث کی حدیث میں ہے۔ لیکن اگر حضور کی یہ مستقل عادت ہوتی تو وہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اسے ضرور نقل کرتے جنہوں نے حضور ﷺ کی نماز کا طریق نقل کیا ہے۔ اور محض (کسی وقت) حضور کا کر دینا اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ یہ نماز کی سنت میں سے ہے جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ حضور نے اس سنت کے خیال سے کیا تھا اور اس ارادے سے کہ اس طریقے کی اقتداء کی جائے لیکن اگر

---

4 حوالہ بالا

5 مصنف ابن ابي شيبه ج: 1/ ص: 395 واسناده حسن (آثار السنن ج: 1/ص: 121)

1 ج: 1 / ص: 61

یہ مان لیا جائے کہ حضور ﷺ نے اسے ضرورۃ کیا تھا تو وہ کسی طور پر دلالت نہیں کرتا کہ یہ نماز کی سنت میں سے ہے[1] "۔

البتہ اگر کوئی شخص بڑھاپے یا کسی اور مجبوری کے تحت فورا کھڑا نہ ہوسکے تو بیٹھ جائے اور پھر کھڑا ہو جائے۔ لیکن یہ سمجھنا کہ یہ بیٹھنا سنت ہے اور ضرور بیٹھنا چاہیے یہ غلط ہے سنت نہیں۔ جلسہ استراحت جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے آرام حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے اور نماز اس لئے نہیں کہ آرام کرتے ہوئے پڑھی جائے ہاں معذور و مجبور حضرات کا حکم الگ ہے۔

اجماع امت:

اسلاف امت کا اجماع واتفاق اس بات پر ہے کہ پہلی اور تیسری رکعت کے بعد بیٹھے بغیر سیدھا کھڑا ہو جانا چاہیئے۔

جلسہ استراحت کوئی مسنون عمل نہیں، ذخیرہ احادیث میں جن صحابہؓ نے آنحضور ﷺ کی نماز کی کیفیت بیان کی ان میں جلسہ استراحت کا ذکر نہیں ملتا۔ (جوہر النقی، ج: 2/ص: 126)

البتہ حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ جلسہ استراحت فرماتے تھے، جب کہ دوسری روایت میں ہے کہ جلسہ استراحت نہیں فرماتے تھے۔

امام طحاوی اس مضمون کے تمام احادیث کو پیش نظر رکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: کہ جب دونوں حدیثوں میں بظاہر اختلاف معلوم ہوتا ہے تو اس کا حل یہی ہے کہ آپ نے کی خاص ذاتی کیفیت کی وجہ سے یہ جلسہ فرمایا ہوگا نہ اس لئے کہ یہ نماز کی سنت ہے اور اگر یہ جلسہ نماز میں مطلوب ہوتا و خاص طور پر اس کا علیحدہ تذکرہ ضرور ہوتا۔

---

2 زاد المعاد ج: 1 / ص: 61

امام طحاویؒ کے اس فرمان کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں آپ نے خود یہ فرمایا کہ "بڑھاپے کے سبب اب میں جسیم ہو گیا ہوں" لہٰذا اسی دور میں اس خاص کیفیت کے پیش نظر پہلے بیٹھ کر پھر کھڑے ہوتے تھے۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ اس مضمون کی جملہ روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے فرماتے ہیں: "اگر آپ ﷺ کی عادت مبارکہ ہمیشہ جلسہ استراحت کی ہوتی تو یقیناً ہر وہ شخص اس کا ذکر کرتا جس نے آپ کی نماز کی کیفیت بیان کی ہے اور فقط کا آپ کا یہ عمل کر لینا اس پر دلالت نہیں کرتا کہ یہ نماز کی سنت ہے، الا یہ کہ جب معلوم ہو کہ آپ نے یہ عمل بطور سنت کیا ہے تاکہ لوگ بھی ایسا کریں۔ البتہ جب یہ معلوم ہو کہ آپ نے یہ عمل کسی ذاتی ضرورت علت بیماری کی کیفیت کے پیش نظر کیا ہے پھر تو اس سے قطعاً یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ نماز کی سنتوں میں سے ایک ہے"۔ (ملخص زاد المعارج، ج: 1 / ص: 24)

الغرض اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ذخیرہ احادیث میں جلسہ استراحت کا ذکر ایک مسنون عمل کی حیثیت سے نہیں ملتا، چونکہ آخری عمر میں جلسہ استراحت کرنا ایک ذاتی کیفیت بڑھاپے کی وجہ سے تھا، اس لئے امت کا اجماع ہے کہ یہ جلسہ سنت نہیں ہے۔

نماز میں گفتگو سے نماز ٹوٹ جاتی ہے:

آغاز اسلام میں دوران نماز ضرورت کی بات چیت کر لی جاتی تھی لیکن بعد میں اس کی اجازت نہ رہی، لہٰذا سجدہ سہوہ کی جن روایات میں نماز اور سجدہ سہوہ کے مابین بات چیت کا ذکر ملتا ہے وہ ابتدائی دور سے متعلق ہیں، اب اس کی بجائے صرف سبحان اللہ کہنے کی اجازت ہے، اب بھی کوئی شخص سلام پھیر کر سجدہ سہوہ کرنے سے پہلے بات چیت کرے تو اس کی نماز ٹوٹ جائے گی اور اس کو پھر نئے سرے نماز پڑھنا ہو گی جیسے کہ دوران نماز ٹوٹ جاتی ہے۔

حضرت زید بن ارقمؓ فرماتے ہیں ہم نماز میں بات کرلیا کرتے تھے، ایک آدمی اپنے پہلو میں کھڑے دوسرے آدمی سے بات کرلیتا تھا تاآنکہ یہ آیت نازل ہو گئی، اللہ تعالی کے حضور عاجزی کے ساتھ کھڑے ہوا کرو" تو ہمیں خاموشی کا حکم دیا گیا اور بات چیت سے روک دیا گیا ہے[1]۔

اور امام بخاریؒ نے" جزء القراءۃ " والی روایت میں "في حاجتہ " کا لفظ بھی نقل کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آیت کے نزول سے قبل ضرورت کی بات چیت جائز تھی ایسے عام بات چیت پہلے بھی جائز نہ تھی لیکن یہ آیت نازل ہونے کے بعد ضرورت کی گفتگو سے بھی ممانعت کردی گئی، لہذا اب نماز میں کسی قسم کی گفتگو کرنے سے نماز فاسد ہو جائے گی۔

نیز حضرت عمران بن حصین کی روایات سے بھی معلوم ہو رہا ہے کہ ایک دفعہ آنحضور ﷺ نے عصر کی تین رکعت پڑھ کر سلام پڑھ کر سلام پھیر دیا، نماز کے بعد حضرات صحابہؓ نے یاد دلایا تو آپ ﷺ نے مزید ایک رکعت پڑھی اور سلام پھیر دیا، گویا اس وقت دوران نماز گفتگو جائز تھی، لیکن پھر آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ اگر امام نماز میں بھول جائے تو مقتدی " سبحان اللہ " کہیں تا کہ امام کو اصل کیفیت یاد آجائے گویا اب مقتدی پہلے کی طرح خاموش نہیں رہیں گے کہ سلام کے بعد امام کو بتایا جائے بلکہ اب نماز میں گفتگو کی ممانعت ہے، البتہ ایسے موقع پر دوران نماز " سبحان اللہ " کہنے کی اجازت ہے۔

حضرت عبد اللہؓ فرماتے ہیں کہ شروع میں ہم نبی اکرم ﷺ کو نماز میں سلام عرض کیا کرتے تو آپ اس کا جواب دے دیتے تھے، لیکن جب ہم نجاشی کے پاس سے لوٹے تو ہم نے سلام کیا، آپ نے جواب نہ دیا اور پھر فرمایا کہ نماز میں اللہ تعالی کی طرف دھیان ہوتا ہے[2]۔

---

[1] مسلم، تحریم الکلام في الصلوۃ ، بخاري، ماينهي من الكلام في الصلوۃ

[2] بخاری، ماينهي عن الكلام في الصلوۃ

الغرض آج کل بعض لوگوں کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ اگر نماز میں بھول ہو جائے تو سلام پھیرنے کے بعد اسی موضوع پر گفتگو کرکے سجدہ سہوہ کرلینا کافی ہے اور اس گفتگو سے نماز نہیں ٹوٹے گی کیونکہ یہ نماز کی اصلاح کے لئے ہیں۔

واضح رہے کہ خود غیر مقلد عالم دین نواب صدیق حسن خانؒ بھی اس حقیقت کے معترف ہیں کہ ہر قسم کی گفتگو سے نماز فاسد ہو جاتی ہے گو کہ اس کا تعلق نماز کی اصلاح کے ساتھ ہو۔

ان هذه الصلوة لا يصلح فيها شيء من كلام الناس. . . . نواب صدیق حسن خان اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں : "پس حدیث دلالت کند بر آنکہ مخاطبۃ در نماز مبطل نماز است. برابر است کہ. برائے اصلاح نماز باشد یا غیر او۔ (مسک الختام، ج: 1/ ص: 309)

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نماز کے دوران گفتگو کرنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے چاہے وہ گفتگو نماز کی اصلاح کے لئے ہو یا کسی اور مقصد کے لئے ہو۔

نیز مشہور غیر مقلد بزرگ عالم دین مترجم مولانا وحید الزمان بھی یہی لکھتے ہیں کہ جس شخص کے ذمہ سجدہ سہوہ ہو اور وہ سجدہ کئے بغیر مسجد سے نکل جائے یا جان بوجھ کر کوئی بات کرے یا کچھ کھائے پیئے یا بے وضو ہو جائے تو اب اس کو پوری نماز لوٹانی ہو گی، صرف سجدہ سہوہ کرلینا کافی نہیں ہے[1]۔

دوسری رکعت:

رسول اللہ ﷺ جب دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہوتے تو سورۃ فاتحہ کی قراءت شروع کر دیتے اور سکتہ نہیں کرتے تھے[2]۔

پہلا تشہد:

اسے قعدہ اولیٰ بھی کہتے ہیں، دوسری رکعت کے بعد (دوسرے سجدے سے اٹھ کر) بایاں پاؤں بچھا کر اس پر بیٹھ جائیں اور دایاں پاؤں کھڑا رکھیں[1]۔

---

[1] نزول الابرار، ج: 1/ ص: 139

3مسلم باب مایقال بین التکبیرۃ الاحرام والقراءۃ حدیث 599

دایاں ہاتھ اپنے دائیں گھٹنے اور بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر رکھیں [2]۔

سیدنا عبد اللہ بن زبیرؓ کی روایت میں ہے: رسول اللہ ﷺ جب نماز میں بیٹھ کر دعا (تشہد، درود وغیرہ) پڑھتے تو اپنا دایاں ہاتھ اپنی دائیں ران اور بایاں ہاتھ بائیں ران پر رکھتے [3]۔

معلوم ہوا کہ نمازی کو رخصت ہے، چاہے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے، چاہے رانوں پر۔ اب آپ قعدہ اولیٰ میں تشہد پڑھیں۔ سیدنا عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پس جب تم نماز میں قعدے کے لئے بیٹھو تو یہ پڑھو۔

میری ساری قولی، بدنی اور مالی عبادت صرف اللہ کے لئے خاص ہے۔ اے نبی! آپ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت، سلامتی اور برکتیں ہوں اور ہم پر اور اللہ کے دوسرے نیک بندوں پر بھی سلامتی ہو، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

پھر آپ نے یہ بھی فرمایا: ان کلمات السلام علینا۔۔۔ الصالحین کے پڑھنے سے ہر نیک بندے کو، خواہ وہ زمین پر ہو یا آسمان میں، نمازی کا سلام پہنچ جاتا ہے [4]

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان موجود رہے ہم السلام علیک ایہا النبی کہتے رہے جب آپ فوت ہو گئے تو ہم نے خطاب کا صیغہ چھوڑ کر غائب کا صیغہ پڑھنا شروع کر دیا۔ یعنی پھر ہم السلام علی النبی پڑھتے تھے [5]

رسول اللہ ﷺ درمیانی تشہد میں، تشہد سے فارغ ہو کر کھڑے ہو جاتے تھے [6]۔

---

[1] بخاری باب سنة الجلوس فی التشهد حدیث 827' 828

[2] مسلم باب صفة الجلوس في الصلاة حديث 579

[3] مسلم باب صفة الجلوس في الصلاة حديث 579 کي ذيلي حديث

[4] بخاری باب التشهد في الاخرة حدیث 831' 835 مسلم باب التشهد في الصلاة حديث 406

[5] بخاری باب الاخذ باليدين حديث 6265

[6] مسند احمد 459/1 اس کی سند صحیح ہے

لہٰذا درمیانی تشہد میں صرف تشہد بھی کافی ہے۔
اور اگر کوئی شخص تشہد کے بعد دعا کرنا چاہے تو بھی جائز ہے۔

تبصرہ:

جبکہ جمہور امت اس کے بر خلاف ہے عبد اللہ بن مسعود کے یہ روایت نقل کرکے اس کی تصحیح بھی کر چکے ہیں۔ اس کے بعد نسائی کی جو روایت لائے ہیں یہ بھی عبد اللہ بن مسعود کی ہے ۔اس کے علاوہ نسائی کی اسی باب میں ایک نہیں بلکہ کئی روایات ہیں خصوصا عبد اللہ بن مسعود کی ان تمام روایات میں سوائے اس ایک روایت کے اور کسی روایت میں پہلی تشہد کے بعد دعا اور درود کا کوئی ذکر نہیں۔ ان رویات میں صرف تشہد کا ذکر ہے عبد اللہ بن مسعود کی رویات میں سے صرف ایک روایت میں دعا کا ذکر ہے جبکہ خود عبد اللہ بن مسعود پہلی تشہد میں تشہد کے بعد کچھ نہیں پڑھتے تھے۔ بلکہ عبد اللہ بن مسعود کی روایت ہے آپ ﷺ پہلے رکعتین کے تشہد سے اتنی جلدی اٹھتے تھے گویا کہ آپ ﷺ انگاروں پر بیٹھے ہو یعنی بہت جلدی اٹھتے تھے۔ ابو بکر صدیق کا بھی یہی عمل تھا اور ابن عمر تو حصر کے ساتھ فرماتے ہیں دو رکعتوں پر بیٹھنا صرف اور صرف تشہد کے لئے ہے حسن بصری بھی یہی فرماتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ رکعتین کی تشہد میں صرف التحیات پڑھتے تھے یہاں تک کہ امام شعبی فرماتے ہیں جو تشہد سے کچھ زیادہ پڑھے تو اس پر سجدہ سہو واجب ہو جاتا ہے { مصنف ابن ابی شیبہ باب قدر کم یقعد فی رکعتین الاولین }۔ اور یہی جمہور علمائے امت کا مسلک ہے۔ اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جس روایت میں دعا کی زیادتی کا ذکر ہے یا تو آخر تشہد پر محمول ہے اور یا یہ روایات ان روایات کثیرہ کے مقابلے میں متروک ہے۔ نیز جس روایت میں پہلی تشہد میں دعا کا ذکر ہے اس کی سند میں ایک راوی شعبہ ہے اور شعبہ کو خود مرحوم علی زئی صاحب { تسہیل الوصول ص: 159, 163 } پر وہم کا مریض ٹھرا چکے ہیں۔ اب نماز نبوی میں آکر ان کی بیماری ختم ہو گئی خاص کر جب عبد اللہ بن مسعود کی دوسری تمام روایات میں دعا کا ذکر نہیں سوائے شعبہ کی اس روایت کے۔

﴾ غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں : ﴿

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جب تم دو رکعت پر بیٹھو تو التحیۃ کے بعد جو دعا زیادہ پسند ہو وہ کرو[1]۔ اور دعا سے پہلے درود پڑھنا چاہیے ۔رسول اللہ ﷺ نے سنا: ایک آدمی نماز میں دعا کر رہا تھا۔آپ نے فرمایا: اس نے جلدی کی، نماز میں پہلے اللہ کی تعریف کرو، پھر نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجو پھر دعا کرو[2]۔

لہٰذا درمیانی تشہد میں، تشہد کے بعد درود اور دعا بھی کی جا سکتی ہے۔

﴾ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴿

مسئلہ رفع سبابہ:

تشہد میں انگلی کا اٹھانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی بابرکت اور عظمت والی سنت ہے اس کا ثبوت سنت رسول اللہ سے ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز {کے قعدہ} میں بیٹھتے تو اپنے دونوں ہاتھ اپنے دونوں گھٹنوں پر رکھتے اور اپنی داہنی انگلی جو انگوٹھے کے نزدیک ہے اٹھا لیتے' پس اس کے ساتھ دعا مانگتے[3]۔

حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب {نماز میں} تشہد پڑھنے بیٹھتے تو اپنا دایاں ہاتھ دائیں اور بایاں ہاتھ بائیں ران پر رکھتے اور شہادت کے انگلی کے ساتھ اشارہ کرتے اور اپنا انگوٹھا اپنی درمیانی انگلی پر رکھتے[4]۔

---

[1] نسائی باب کیف التشہد الاول حدیث 1163

[2] ابو داؤد باب الدعاء حدیث 1481 اسے اما حاکم اور ذہبی نے صحیح کہا ہے

[3] مسلم باب صفة الجلوس في الصلاة حديث 580

[4] مسلم حوالہ سابقہ حدیث 579

نبی صلی اللہ علیہ وسلم دائیں ہاتھ کے تمام انگلیوں کو بند کر لیتے انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی کو قبلہ رخ کرکے اس کے ساتھ اشارہ کرتے[1]۔

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم {دوسرے سجدے سے اٹھ کر قعدہ میں} بیٹھے دو انگلیوں کو بند کیا {انگوٹھے اور درمیان کی بڑی انگلی سے حلقہ بنایا} اور انگشت شہادت {کلمے کی انگلی} سے اشارہ کیا[2]۔

تبصرہ:

حضرت وئل بن حجر کے اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے رفع یدین کرتے وقت اپنے دونوں ہاتھ مبارک کانوں تک اٹھائے۔

﴿غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں:﴾

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگلی اٹھائی او راسے ہلاتے تھے[3]۔ صرف لاالہ الا اللہ کہنے پر انگلی اٹھانا اور کہنے کے بعد رکھ دینا کسی روایت سے ثابت نہیں ہے۔

تبصرہ:

یہاں احادیث کے مقابلے میں شیخ البانی صاحب کی تقلید کی جارہی ہے۔ جبکہ وہ احادیث خود نقل کرچکے ہیں۔ پہلی حدیث ابن عمر کی اس میں ہے کہ "اور اپنی داہنی انگلی جو انگوٹھے کے نزدیک ہے اٹھا لیتے"۔ اٹھانے اور حرکت دینے ان دونوں میں فرق ہے اس کے بعد دوسری حدیث عبداللہ بن زبیر

---

[1] مسلم حوالہ سابقہ حدیث580

[2] ابوداؤد باب رفع الیدین في الصلاۃ اسے ابن حبان حدیث 485 اور خزیمہ حدیث 713'714 نے صحیح کہا ہے

[3] نسائی باب موضع الیمین من الشمال فی الصلاۃ حدیث990 اسے ابن حبان 485 اور ابن خزیمہ 714 نے صحیح کہا ہے۔

کی "اور شہادت کی انگلی کے ساتھ اشارہ کرتے"۔ تیسری حدیث جو لائے ہے اس میں بھی یہی ہے "انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی سے اشارہ کرتے"۔ چوتھی حدیث وائل بن حجر کی اس میں بھی ہے" اور انگشت شہادت سے اشارہ کیا" ان تمام روایات سے معلوم ہوا کہ وائل بن حجر کی جس روایت میں "یحرک" {ہلاتے تھے} کالفظ ہے اس کا مطلب ہے اشارہ کرنا ورنہ تو جو مطلب اس سے محققین حضرات نے لی ہے اس صورت میں یہ حدیث ما قبل کے تمام احادیث سے معارض ہو جائے گی کیونکہ اٹھانے, اشارہ کرنے, اور حرکت دیتے رہنے میں بہت فرق ہیں۔

تشہد میں شہادت کی انگلی میں تھوڑا سا خم ہونا چاہیئے [1]۔ (رفع السبابۃ للامام ملا علی قاری)

﴿ اہل سنت عنوان: ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

تشہد میں انگلی کا اشارہ:

"سیدنا عبد اللہ بن زبیر ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب تشہد پڑھنے بیٹھتے تو دایاں ہاتھ دائیں ران پر اور بایاں ہاتھ بائیں ران پر رکھتے اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے اور انگوٹھے کو درمیان کی (بڑی) انگلی پر رکھتے اور بائیں ہتھیلی سے گھٹنہ پکڑتے [2] "

"عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب تشہد میں بیٹھتے تو بائیں ہاتھ کو بائیں گھٹنہ پر اور دائیں ہاتھ کو دائیں گھٹنہ پر رکھتے اور (دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے) ترپن (53) کا حلقہ بناتے اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے [3] "۔

قعدہ میں کلمۂ شہادت کے وقت انگشت شہادت کا اٹھانا اور اشارہ کرنا بلا شبہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اور اس کا مقصد بظاہر یہی ہے کہ جس وقت نمازی اِشہد اِن لا الٰہ الا اللہ کہہ کر اللہ تعالیٰ کے

---

[1] ابو داؤد باب حدیث 991 اسے ابن خزیمہ حدیث 716 اور ابن حبان حدیث 199 نے صحیح کہا ہے

[2] صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب 21 صفة الجلوس في الصلاة، حديث: 579

[3] صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب 21 صفة الجلوس في الصلاة وكيفية وضع اليدين على الفخذين، حديث: 580

وحدہ لا شریک لہ ہونے کی شہادت دے رہا ہو اس وقت اس کا دل بھی توحید کے تصور اور یقین سے لبریز ہو اور ہاتھ کی انگلی اٹھا کر جسم سے بھی اس کی شہادت دی جارہی ہو، بلکہ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی اسی حدیث کی بعض روایات میں یہ اضافہ بھی ہے کہ انگشت شہادت کے اس اشارہ کے وقت آپ ﷺ آنکھ سے بھی اشارہ فرماتے تھے: وأتبعها بصره[1]۔ نیز سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہی نے اس اشارہ کے متعلق رسول اللہ اکا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے: لهي أشد على الشيطان من الحديد يعني السبابة[2] "انگشت شہادت کا یہ اشارہ شیطان کے لئے لوہے (کی چوٹ اور اس کی دھار دار چھری اور تلوار) سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے"۔

اشارہ کے بعد انگلی سے حرکت نہ کرتے رہنا:

سیدنا عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ تشہد پڑھتے وقت رسول اللہ ﷺ انگلی سے اشارہ کرتے تھے اور اسے حرکت نہ دیتے تھے[3]۔

اس راویت کو امام بیہقی نے صحیح قرار دیا ہے[4] ،علامہ ابو الطیب محمد شمس الحق عظیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ نقل کرتے ہیں: ابن الملک کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب اشارہ کے لئے انگلی اٹھائی جائے تو اس کے بعد اسے حرکت نہ دیا جائے اور یہی مسلک ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کا ہے۔

اور بذل المجہود میں نقل کیا ہے: "ملا علی قاری کہتے ہیں کہ ابن الملک نے کہا کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انگلی کو حرکت نہ دی جائے جب اس سے اشارہ کیا جائے، میں کہتا ہوں کہ بیہقی نے وائل بن حجر ص کی حدیث نقل کی ہے، جس میں ہے کہ: پھر آپ انے انگلی اٹھائی تو میں

---

[1] مسند الامام احمد: 119/2، مسند المکثرین، مسند عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حدیث: 6000

[2] مسند الامام أحمد: 119/2، حديث: 6000

[3] سنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب 180-181 الاشارة في التشهد، حديث: 989

[3] دیکھئے: حاشیۃ بذل المجہود: 319/5، ط: قاہرۃ

[4] عون المعبود شرح سنن أبي داؤد: 281/3

نے انگلی کو حرکت دیتے ہوئے دیکھا آپ اس وقت التحیات پڑھ رہے تھے، پھر بیہقی نے کہا کہ اس بات کا احتمال ہے کہ حرکت سے مراد اشارہ ہو اس کو مستقل حرکت دینا مراد نہ ہو، تاکہ یہ روایت عبد اللہ بن زبیرؓ کی روایت کے مطابق ہو جائے[1] "۔

ہمارے علماء یہی کہتے ہیں کہ نماز میں زیادہ سے زیادہ سکون اور خشوع و خضوع کی تلقین اور تاکید احادیث میں آئی ہے اس لئے ممکن حد تک اس پر عمل کرنا چاہئے، اور انگلی کو حرکت نہ دینا روح نماز کے عین مطابق ہے، اور جس روایت میں حرکت دینے کا تذکرہ ہے اس سے مراد اشارہ کرنا ہے، جیسا کہ امام بیہقی کا قول اوپر ذکر کیا گیا، اور یقینا اشارہ کرتے وقت حرکت ہو جاتی ہے، خلاصہ یہ کہ دونوں احادیث میں کوئی تعارض اور تضاد نہیں ہے کیوں کہ جس میں حرکت دینے کی بات کہی گئی ہے اس سے مراد اشارہ کے وقت کی حرکت ہے اور جس میں حرکت نہ دینے کی بات وارد ہوئی ہے اس سے مراد اشارہ کے بعد انگلی کو حرکت نہ دینا بلکہ اس کو اپنی حالت پر ساکن چھوڑ دینا ہے۔

غیر مقلد احباب کی کتاب "صلوۃ الرسول" میں ہے کہ مشکوۃ شریف میں ابوداؤد اور دارمی شریف کے حوالہ سے حضرت وائل کی حدیث میں یحرکہا بھی آیا ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ انگلی ہلاتے تھے، اور حضرت عبد اللہ بن زبیر کے حدیث میں لایحرکہا ہے یعنی انگلی نہیں ہلاتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ ہلانا بھی درست ہے اور نہ ہلانا بھی درست ہے، اس لئے کبھی ہلانا بھی چاہیئے اور کبھی نہ ہلانا بھی چاہیئے تاکہ دونوں سنتوں پر عمل ہوتا رہے[2]

دلچسپ بات تو یہ ہے کہ صادق صاحب کو پتہ ہی نہ چلا کہ یہ حدیث ابوداؤد میں نہیں ہے چونکہ مشکواۃ والے سے غلطی ہو گئی تو صادق صاحب نے بھی ابوداؤد کا صاحب مشکوۃ پر بھروسہ کرکے حوا دیدیا۔ یہ حدیث نسائی اور دارمی میں ہے ابوداؤد میں نہیں۔

---

[1] بذل المجهود: 5 319

[2] محقق ایڈیشن طبع اول ص: 308

اور پھر صلوۃ الرسول کے محقق نے شیخ البانی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ لایحر کہا والی حدیث شاذ او رمنکر ہے۔ صحیح حدیث یحر کہا ولی ہی ہے یعنی ہلانا ہی ثابت ہے نہ ہلانا ثابت نہیں ہے، یعنی نہ ہلانے کا جو عمل صادق صاحب کے ہاں سنت تھا دوسرے غیر مقلدوں نے اس کو ناجائز اور غیر سنت بتلایا اور جو حدیث صادق صاحب کے ہاں ثابت تھی دوسرے غیر مقلدوں نے اس کو غیر ثابت بتلایا اب غیر مقلد احباب دونوں حدیثوں پر کیسے عمل کریں گے غیر مقلدوں کی کونسی بات تحقیقی ہے صادق صاحب والی یا البانی و محقق والی ز اس کا فیصلہ غیر مقلد احباب کرکے عوام کی صحیح رہنمائی فرمائیں۔

اب آیئے کتب صحاح ستہ میں تشہد کے سلسلہ کی جو روییتیں ہیں ان کو ملاحظہ فرمائیں آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کتابوں میں انگلی کو حرکت دینے کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

بخاری شریف میں تو اس بارے میں کچھ نہیں ہے۔ مسلم شریف سے شروع کرتے ہیں:

1- مسلم شریف کی پہلی روایت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی ہے اس میں ہے: آپ ﷺ نے تشہد میں داہنا داہنے گھٹنے پر اور بایاں ہاتھ بائیں ران پر رکھا اور اپنی انگلی سے اشارہ فرمایا۔

2- حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہی کی یہی روایت ایک دوسرے سند سے ہے اس کے الفاظ اس طرح ہیں" واشار باصبعہ السبابۃ"

یعنی آپ ﷺ نے سبابہ انگلی سے اشارہ فرمایا سبابہ بیچ کی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان والی انگلی کو کہتے ہیں جسے ہم لوگ شہادت کی انگلی کہتے ہیں۔

3- مسلم کی شریف کی تیسری روایت حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

جب اللہ کے رسول ﷺ جب نماز میں بیٹھتے تو اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھتے اور اپنی اس انگلی اٹھاتے جو انگوٹھے سے ملی ہوئی ہے اور اس سے دعا کرتے۔

4- اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی مسلم شریف کی یہی روایت ایک دوسرے سند سے ہے اس میں ہے کہ واشار بالسبابۃ یعنی آپ ﷺ نے شہادت کی انگلی سے اشارہ فرمایا۔

5- مسلم شریف میں حضرت ابن عمرؓ ہی کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ اپنی ساری انگلیوں کو سمیٹ لیتے اور اشار باصبعہ التی تلی الابہام یعنی انگوٹھے سے ملی انگلی سے اشارہ کرتے۔

مسلم شریف کی تشہد کے سلسلہ میں یہ کل پانچ رواتیں ہیں، اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان پانچوں روایتوں میں سے کسی ایک روایت میں بھی انگلی کو شروع تشہد سے لیکر آخر تک انگلی ہلانے کا ذکر تک نہیں بلکہ مطلقا انگلی کو حرکت دینے ہی کا ذکر نہیں ہے۔

اب ابوداؤد شریف میں تشہد کی روایتوں کو ملاحظہ فرمائیں:

1- حضرت وائل بن حجرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے جی میں کہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کی نماز دیکھوں گا کہ آپ کیسے نماز پڑھتے ہیں تو میں نے دیکھا کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ انگوٹھا اور بیچ کی انگلی کا حلقہ بنایا اور سبابہ سے اشارہ کیا۔

2- ابوداؤد نے بھی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ذکر کی ہے اس میں بھی صرف اشارہ کا ذکر ہے: آپ ﷺ جب تشہد میں بیٹھتے تو ساری انگلیوں کو سمیٹ لیتے اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے۔

3- ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ والی روایت بھی ذکر کی ہے ابوداؤد کی سند سے جو روایت ہے اس میں بھی صرف اشارہ ہی کا ذکر ہے "واشارہ باصبعہ "

4- ابودوٗد نے حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کی یہ روایت بھی ذکر کی ہے جس میں انگلی کو حرکت نہ دینے کا صاف ذکر ہے: حضرت عامر اپنے والد حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب تشہد کے لئے بیٹھتے تو اپنی انگلی سے اشارہ کرتے اور اس کو حرکت نہیں دیتے تھے۔

5- ابوداؤد میں ایک روایت مالک بن نمیر الخزاعی کی ہے وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا: آپ ﷺ نے اپنا داہنا ہاتھ اپنی داہنی ران پر رکھا تھا اور آپ ﷺ نے اپنی شہادت کی انگلی کو اٹھائے رکھا تھا اور اس کو جھکا رکھا تھا۔

اشارہ کے وقت نگاہ انگلی پر ہو:

"سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو نماز کی حالت میں ہاتھوں سے کنکری کو حرکت دیتے ہوئے دیکھا، تو نماز سے فراغت کے بعد اس شخص سے سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نماز کی حالت میں کنکری کو حرکت نہ دو، اس لئے کہ یہ شیطانی عمل ہے، بلکہ وہ عمل کرو جو رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے، اس شخص نے دریافت کیا کہ اس وقت آپ کا عمل کیا تھا؟ راوی کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دائیں ہاتھ کو دائیں ران پر رکھا اور انگوٹھے کے پاس والی انگلی (انگشت شہادت) سے قبلہ کی طرف اشارہ کیا اور اپنی نگاہ کو انگلی پر یا اس کے آس پاس رکھا، پھر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے[1] "

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

آخری قعدہ:

(تشہد) اس آخری قعدے میں رسول اللہ ﷺ یوں بیٹھتے تھے جیسا کہ ابو حمید ساعدیؓ بیان کرتے ہیں کہ جب وہ سجدہ آتا جس کے بعد سلام ہے (جب آخری رکعت کا دوسرا سجدہ کرکے فارغ ہوتے

[1] سنن النسائي: 237/2، كتاب التطبيق، باب 98 موضع البصر في التشهد، حديث: 1160

اور تشہد کے لئے بیٹھتے تو اپنا بایاں پاؤں دائیں پنڈلی کے نیچے سے باہر نکالتے اور اپنی بائیں جانب کو لھے پر بیٹھتے [1]۔

تبصرہ:

اس حدیث پر تفصیلی بحث عنوان" گیارہ صحابہ کرام کی شہادت" کے تحت گزر چکی ہے۔ نیز ان حضرات کے اصول کے مطابق یہ حدیث ضعیف اور ناقابل استدلال ہے۔ اس کے باوجود ان محققین نے اس حدیث سے بیسوں مقامات پر استدلال کیا ہے۔ ان کا اصول ہے کہ شیعہ ہونا جرح ہے اور جو راوی شیعہ ہو اس کی روایت ضعیف ہو گی {نماز نبوی قدیم ص:168 جدید ص:212}۔ اس روایت میں ایک راوی عبد الحمید بن جعفر قدری ہے اور راسی قدری ہونے کی وجہ سے سفیان ثوری نے اس کو ضعیف کہا ہے۔

﴿غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں:﴾

بائیں جاب کو لھے پر بیٹھنا تورک کہلاتا ہے۔ یہ سنت ہے۔ ہر مسلمان کو آخری قعدے میں تورک ضرور کرنا چاہئے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہماری عورتیں تو آخری تشہد میں تورک کریں اور مرد اس سنت رسول ﷺ سے محروم رہیں۔

تبصرہ:

یہاں پر کہا ہے کہ تورک سنت ہے اور پھر کہا کہ اس پر ہر مسلمان کو ضرور عمل کرنا چاہیئے۔ اس سے چند صفحے پہلے صفحہ 234 پر ان حضرات نے خود کہا تھا کہ آپ ﷺ کا معمول تھا کہ بیٹھتے وقت اپنا دیا پاؤں کھڑا کر لیتے {بخاری} اور اب آپ ﷺ کے معمول کے مقابلے میں عورتوں والے طریقے کو مردوں کے لئے ضروری اور لازمی قرار دیتے ہیں کیا سنت پر عمل ہے یا اس سے نفرت؟۔ بخاری کی حدیث بلاشک صحیح حدیث ہے جس میں دایاں قدم کھڑا کر کے بیٹھنے کا طریقہ مردوں کو سکھایا گیا ہے،

[1] ابو داؤد باب افتتاح الصلاۃ حدیث 730 امام ابن حبان 182/5، 184 اور اامام نووی نے اسے صحیح کہا ہے۔ {تہذیب الکمال}

رجس حدیث سے عورتوں کی طرح بیٹھنے کو مردوں کے لئے ضروری قرار دیا ہے وہ ابو داؤد کی حدیث ہے جو ان حضرات کے اپنے اصول کے مطابق ضعیف ہے۔

تبصرہ:

حضرت نافع کہتے ہیں کہ ام المؤمنین صفیہ رضی اللہ عنہا تورک کرکے بیٹھتی تھی حضرت ابن عمر کی بیویال تورک کرکے بیٹھتی تھی {مصنف ابن ابی شیبہ فی المراۃ کیف تجلس فی الصلاۃ} ۔ یہ بات جب معلوم ہوئی کہ تورک عورتوں کے طریقہ ہے ۔ فن حدیث کے ماہرین فرماتے ہیں کہ مردوں کا تورک کرکے بیٹھنا حالت عذر پر محمول ہے جیسا کہ {بخاری باب الجلوس فی التشہد} میں حدیث ہے کہ عبد اللہ بن عبداللہ نے حضرت ابن عمر کو ہمیشہ چارزانوں {تورک} بیٹھتے دیکھا تو اس نے بھی اسی طرح بیٹھنا شروع کیا۔ تو عبداللہ بن عمر نے اس کو اس طریقے پر بیٹھنے سے منع کیا اور فرمایا کہ سنت طریقہ یہ ہے کہ دایاں پاؤں کھڑا رکھو اور بایاں پاؤں پھیلادو۔ عبد اللہ بن عبد اللہ کہتے ہیں میں نے کہا کہ آپ جو اس طرح {تورک بنا کر} بیٹھتے ہیں ۔ عبداللہ بن عمر نے فرمایا کہ میرا پاؤں میرا بار نہیں اٹھا پاتے {میں معذور ہوں} قارئین کرام سیدنا عبداللہ بن عمر تو اس طریقے کو سنت کہتے ہیں جو مردوں کا طریقہ ہے یعنی دایاں پاؤں کھڑا کرکے بیٹھنا اور آنحضرت ﷺ کا معمول مبارک بھی یہی تھا جبکہ یہ حضرات عورتوں کے طریقے کو سنت کہتے ہیں ۔ ہمارا ایمان ہے کہ عبداللہ بن عمر ہدایت یافتہ سچے تھے اور آپ ﷺ کی نماز کو خوب جاننے والے تھے ۔

جلسہ تشہد:

قعدہ اولی اور قعدہ اخیرہ دونوں میں بیٹھنے کا طریقہ ایک ہی ہے اور وہ وہی ہے جو دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنے کا بتاگیا تھا۔ یعنی دایاں پیر کھڑا رہے اور بائیں پیر کو زمین پر بچایا جائے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کے التحیات پر بیٹھنے کا ایک عام طریقہ بیان کرہی ہے خواہ وہ التحیات قعدہ اولی میں ہو یا قعدہ اخیرہ میں حدیث یہ ہے:

" ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ... رسول اللہ ا (قعدہ میں) اپنے بائیں پاؤں کو نیچے بچھا لیتے اور داہنے پیر کو کھڑا کر لیتے اور شیطان کی طرح بیٹھنے سے منع فرماتے تھے [1]۔

حضرت وائل بن حجر ؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: میں رسول اللہ کے پیچھے نماز پڑھی پس آپ تشہد میں بیٹھے تو اپنے بائیں پاؤں کو زمیں پر بچھایا اور اسی پر بیٹھ گئیے روایت کیا اس حدیث کو سعید بن منصور اور طحاوی نے اور اس کی سند صحیح ہے [2]۔

" عباس بن سہل ساعدی سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ ابو حمید، ابو اسید، سہل بن سعد اور محمد بن مسلمہ جمع تھے، ان حضرات نے رسول اللہ ا کی نماز کا تذکرہ کیا، تو ابو حمید نے کہا کہ میں تم لوگوں کے مقابلہ میں رسول اللہ ا کی نماز سے زیادہ واقف ہوں، بیشک رسول اللہ ا تشہد کے لئے بیٹھے تو بایاں پیر بچھا دیا اور اپنے پیر کی انگلیوں کو قبلہ کی طرف کر دیا اور دائیں ہتھیلی کو دائیں گھٹنے پر اور بائیں ہتھیلی کو بائیں گھٹنے پر رکھا اور اپنی شہادت کی انگلی سے (اِشہد اِن لا الہ الا اللہ کے وقت) اشارہ کیا [3] "۔

" سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے فرزند عبد اللہ سے روایت ہے کہ وہ اپنے والد محترم (سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما) کو دیکھتے کہ وہ نماز میں چہار زانو بیٹھتے تھے، (کہتے ہیں کہ) میں بھی اسی طرح چہار زانو بیٹھنے لگا، حالانکہ میں اس وقت بالکل نو عمر تھا، تو والد ماجد سید نا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے مجھے اس طرح بیٹھنے سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ نماز میں بیٹھنے کا سنت طریقہ یہ ہے کہ اپنا داہنا پاؤں کھڑا کرو اور بایاں پاؤں موڑ کر بچھاؤ، میں نے عرض کیا: خود آپ تو چہار زانو بیٹھتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ میرے پیر اب میرا بوجھ برداشت نہیں کرتے [4] "۔

---

[1] صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب 46 ما يجمع صفة الصلاة، الخ، حديث: 498

[2] رواه سعيد بن منصور والطحاوي واسناده صحيح . (آثار السنن ج: 1 / ص: 23)

[3] سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 219 منه(الجلوس في التشهد) حديث: 293، وقال الترمذي: هذا حديث حسن صحيح وصححه الالباني، وسنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب 115-116 افتتاح الصلاة، حديث: 734

[4] صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب 145 سنة الجلوس في التشهد، حديث: 827

سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ایک صاحبزادے کا نام بھی عبد اللہ ہی تھا، یہ انہی کا واقعہ ہے، سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو اللہ تعالیٰ نے طویل عمر عطا فرمائی تھی، 84 سال اور ایک روایت کے مطابق 87 سال کی عمر میں ان کی وفات ہوئی [1] اخیر عمر میں ضعفِ پیری کی وجہ سے وہ نماز میں سنت کے مطابق اپنے پیروں پر نہیں بیٹھ سکتے تھے، اس وجہ سے مجبوراً چہار زانو بیٹھنا پڑتا تھا، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے پاؤں میں کوئی تکلیف تھی اس وجہ سے وہ قعدہ میں سنت کے مطابق بیٹھنے سے معذور تھے، بہر حال ان کے صاحبزادے عبد اللہ نے بھی صرف ان کی پیروی میں ان ہی کی طرح چہار زانو بیٹھنا شروع کر دیا، اگر چہ وہ اس وقت بقولِ خود بوڑھے نہیں تھے بلکہ نو عمر اور نوجوان تھے، سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ان کو ایسا کرتے دیکھا تو منع فرمایا اور بتایا کہ نماز میں بیٹھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ دایاں پاؤں کھڑا کیا جائے اور بایاں پاؤں موڑ کر اس پر بیٹھا جائے اور اپنے متعلق فرمایا کہ میں معذوری کی وجہ سے چہار زانو بیٹھتا ہوں میرے پاؤں میرے جسم کا بوجھ برداشت کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے آخری الفاظ "ان رجلَيّ لا تحملاني" (یعنی میرے دونوں پاؤں میرا بوجھ نہیں برداشت کر سکتے) سے یہ بات صاف سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے نزدیک قعدہ کا مسنون طریقہ وہ تھا جس میں آدمی کے جسم کا بوجھ اس کے دونوں پیروں پر رہتا ہے اور وہ وہی طریقہ ہے جس کو "افتراش" کہتے ہیں اور جو اہل سنت والجماعت کا معمول عام ہے۔

ائمہ وشارحینِ حدیث کا اس بارے میں خیال ہے کہ قعدہ میں رسول اللہ ﷺ کے بیٹھنے کا عام طریقہ وہی تھا جو سیدہ عائشہ صدیقہ، عبد اللہ بن عمر اور ابو حمیدؓ کی روایتوں سے معلوم ہوا، اور جس روایت میں "تورک، یعنی داہنے پاؤں کو کھڑا کرنے اور بائیں پاؤں کو اس کے نیچے سے آگے کی جانب نکالنے اور اپنی سرین پر بیٹھنے" کا تذکرہ ہے اس کے بارے میں خیال ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی کبھی سہولت کے لئے یا ضعفِ پیری کی وجہ سے یا بیانِ جواز کے لئے کیا ہو۔

---

[1] ملاحظہ ہو: موسوعۃ فقہ عبد اللہ بن عمر، ص: 8

"سیدنا وائل بن حجر ؓ کہتے ہیں کہ میں مدینہ منورہ پہنچا تو میں نے (دل میں) کہا کہ میں رسول ﷺ اللہ کی نماز کی کیفیت ضرور دیکھوں گا، چنانچہ جب آپ التشہد کے لئے بیٹھے تو اپنا بایاں پاؤں بچھا دیا اور بایاں ہاتھ بائیں ران پر رکھا اور داہنے پاؤں کو کھڑا رکھا[1] "۔

جب آپ اس قعدے میں بیٹھیں تو پہلے التحیات پڑھیں جس طرح دوسری رکعت پڑھ کر آپ نے قعدے میں پڑھی تھی۔ اور رفع سبابہ شہادت کی انگلی اٹھا کر اشارہ بھی کریں۔التحیات ختم کر کے مندرجہ ذیل درود شریف پڑھیں:

اللھم صل علی محمد وعلی ال محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلی ال ابراھیم انک حمید مجید اللھم بارک علی محمد وعلی ال محمد کما بارکت علی ابراھیم وعلی ال ابراھیم انک حمید مجید

یاالٰہی! رحمت بھیج محمد ﷺ اور آل محمد پر جیسے تو نے رحمت بھیجی ابراہیم علیہ السلام اور آل ابراہیم پر، بیشک تو تعریف کیا گیا، بزرگی والا ہے۔

یاالٰہی! برکت بھیج محمد ﷺ پر اور آل محمد پر جیسے تو نے برکت بھیجی ابراہیم علیہ السلام پر، اور آل ابراہیم پر، بیشک تو تعریف کیا گیا، بزرگی والا ہے[2]۔

یہ درود بھی پڑھ سکتے ہیں:

اللھم صل علی محمد وعلی ازواجه وذریته کما صلیت علی محمد وعلی ازواجه وذریته کما بارکت علی ال ابراھیم انک حمید مجید

---

[1] سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 218 ماجاء كيف الجلوس في التشهد، حديث: 292، وہكذا في سنن النسائي، كتاب التطبيق، باب 97 موضع اليدين عند الجلوس للتشهد الأول، حديث: 1159، یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اس پر اکثر اہل علم کا عمل ہے اور یہی سفیان ثوری، اہل کوفہ اور ابن المبارک کا قول ہے۔اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد امام ترمذی کہتے ہیں: هذا حديث حسن صحيح والعمل عليه عند أكثر أهل العلم وهو قول سفيان الثوري وأهل الكوفة وابن المبارك.

[2] بخاری باب 10 حدیث 3370

اے اللہ! محمد ﷺ، ان کی بیویوں اور ان کی اولاد پر رحمت فرما جیسا کہ تو نے آل ابراہیم پر رحمت فرمائی اور محمد ﷺ ان کی بیویوں اور ان کی اولاد پر برکت فرما جیسا کہ تو نے آل ابراہیم پر برکت فرمائی۔ بیشک تو تعریف والا اور بزرگی والا ہے[1]۔

نوٹ: صحیح روایت میں درود شریف میں سیدنا کے علاوہ مولانا کا لفظ موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ کو جو درود سکھایا تھا، جب اس میں یہ الفاظ گرچہ نہیں ہیں لیکن اس طرح کا اضافہ ممنوع بھی نہیں کرنا چاہیئے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ جو الفاظ رسول اللہ ﷺ سے منقول ہیں، ان کی پیروی راجح ہے، لیکن اضافہ سنت نہ سمجھ کر درست ہے، جس طرح مسلم شریف کی صحیح روایت میں ہے کہ ابن عمرؓ لبیک میں اضافہ فرماتے تھے اور صحیح سند کے ساتھ تو امام شافی اور دیگر اسلاف کے درود شریف موجود ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ درود کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ اللهم صل علی محمد وعلی ال محمد کے الفاظ کے ساتھ درود بھیجا جائے بیشک اور دیگر بھی جائز ہے۔

سیدنا ابو طلحہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ صحابہ کرامؓ میں تشریف لائے، آپ کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں تھے۔ آپ نے فرمایا: میرے پاس جبرئیل علیہ السلام آیا اور اس نے کہا تیرا پروردگار فرماتا ہے کہ اے محمد ﷺ! کیا تجھے یہ بات خوش نہیں کرتی کہ تیری امت میں سے جو شخص تجھ پر ایک بار درود بھیجتا ہے تو میں اس پر دس بار رحمت بھیجتا ہوں اور تیری امت مین سے جو شخص تجھ پر ایک بار سلام بھیجتا ہے تو میں اس پر دس بار سلام بھیجتا ہوں[2]۔

درود کے بعد کی دعائیں:

سیدہ عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں آخری قعدے مین یوں دعا فرماتے تھے:

اللهم انی اعوذبک من عذاب القبر واعوذبک من فتنة المسیح الدجال واعوذبک من فتنة المحیا والممات. اللهم انی اعوذبک من الماثم والمغرم

---

[1] بخاري حواله سابق حديث 3369 مسلم حواله سابق 407

[2] نسائي 3/ 50 حديث 1295 امام حاکم اور ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے

یاالٰہی! میں تیری پناہ میں آتا ہوں عذاب قبر سے اور تیری پناہ میں آتا ہوں مسیح دجال کے فتنے سے اور تیری پناہ میں آتا ہوں موت وحیات کے فتنے سے، یاالٰہی! میں گناہ سے اور قرض سے تیری پناہ مانگتا ہوں [1]۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: تشہد میں چار چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ ضرور طلب کرو۔

اللھم انی اعوذبک من عذاب جھنم ومن عذاب القبر ومن المحیا والممات ومن شر فتنة المسیح الدجال

اے اللہ! میں جہنم اور قبر کے عذاب سے، موت وحیات کے فتنے اور فتنہ مسیح دجال کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں[2]۔

نبی اکرم ﷺ یہ دعا صحابہؓ کو اس طرح سکھاتے جیسا کہ انہیں قرآن کی سورت سکھاتے تھے[3]۔ لہٰذا اسے ضرور پڑھنا چاہئے۔

سیدنا ابوبکر صدیقؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! نماز مین مانگنے کے لئے مجھے کوئی دعا سکھائیے کہ اسے التحیات اور درود کے بعد پڑھا کروں تو آپ نے فرمایا: تم پڑھا کر:

اللھم انی ظلمت نفسی ظلما کثیرا ولا یغفر الذنوب الا انت فاغفر لی مغفرة من عندک وارحمنی انک انت الغفور الرحیم

یاالٰہی! بلاشبہ میں نے اپنی جان پر بہت زیادہ ظلم کیا ہے۔اور تیرے سوا گناہوں کو کوئی نہیں بخش سکتا، پس اپنی جناب سے مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم کر، بے شک تو ہی بخشنے والا مہربان ہے[1]۔

---

[1] بخاری باب الدعاء قبل السلام حدیث 834 مسلم باب استحباب خفض الصوت بالذکر حدیث 2705

[2] مسلم حوالہ سابق حدیث 588

[3] مسلم حوالہ سابق حدیث 590

سیدنا علی ابن ابو طالبؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ تشہد کے بعد سلام پھیرنے سے قبل یہ دعا پڑھتے تھے:

اللهم اغفرلي ما قدمت وما اخرت وما اسررت وما اعلنت وما اسرفت وما انت اعلم به مني انت المقدم وانت المؤخر لا اله الا انت

اے اللہ! تو میرے اگلے پچھلے، پوشیدہ اور ظاہر تمام گناہ معاف فرما اور جو میں نے زیادتی کی اور وہ گناہ جو تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے وہ بھی معاف فرما تو ہی اپنی درگاہ عزت میں آگے کرنے والا اور اپنی بارگاہ جلال سے پیچھے کرنے والا ہے۔ تو ہی سچا معبود ہے[2]۔

نماز کا اختتام

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے دائیں طرف سلام پھیرتے تو کہتے: السلام علیکم ورحمۃ اللہ اور بائیں طرف سلام پھیرتے تو کہتے: السلام علیکم ورحمۃ اللہ[3]۔[4]

سیدنا وائل بن حجرؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کیساتھ پڑھی۔ آپ دائیں طرف سلام پھیرتے تو کہتے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ اور بائیں طرف سلام پھیرتے تو کہتے السلام علیکم ورحمۃ اللہ صرف دائیں طرف والے سلام میں وبرکتہ کا اضافہ کرتے[1]۔

---

[1] بخاري باب الدعاء قبل السلام حديث 834 مسلم باب استحباب خفض الصوت بالذكر حديث 2705

[2] مسلم باب اللدعاء في صلاة الليل وقيامه حديث 771

[3] ابو داؤد باب في السلام 996 تر... ب ماجاء في التسليم في الصلاة حديث 295 اسے ترمذی اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے

[4] تبصرہ: اس روایت کی سند میں ایک راوی سفیان ہیں اور روایت عن کے ساتھ کر رہے ہیں۔ جبکہ مرحوم علی زئی صاحب نے سفیان کو بیسوں مقامات پر مدلس کہہ چکے ہیں مثلاً {جزء قرات ص: 74،80 جزء رفع یدین ص: 25، 58 }۔ نیز ے اسی کتاب {نماز نبوی جدید ص: 211} میں رفع یدین کے مسئلے میں عبد اللہ بن مسعود کی ترک رفع یدین والی روایت کو سفیان ثوری کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف کہا تھا۔ اس پر بس نہیں بلکہ ابوداؤد میں اس سند کے مرکزی راوی ابواسحاق السبیعی کو اس محقق نے مشہور مدلس کہا ہے {جزء قرات ص: 68}۔ خلاصہ یہ کہ یہ سند مدلسین کا مجموعہ ہے اور یہ وہ مدلسین ہے جن کو یہ محقق خود مدلس کہتے چلے آرہے ہیں۔

چند مزید احکام:

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: نماز میں سانپ اور بچھو مار ڈالو[2]۔[3]

نماز میں بچے کو اٹھانے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔

سیدنا ابو قتادہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس حالت میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا کہ ابو العاصؓ کی بیٹی امامہ (آپ ﷺ کی نواسی) آپ کے کندھے پر تھی۔ آپ رکوع فرماتے تو امامہ کو اتار دیتے اور جب سجدے سے فارغ ہوتے تو پھر اسے اٹھا لیتے[4]۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: نماز میں ادھر ادھر دیکھنا، بندے کی نماز میں شیطان کا حصہ ہے[5]۔

نبی اکرم ﷺ نے نماز میں پہلو پر ہاتھ رکھنے سے منع فرمایا[6]۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جب کسی کو نماز میں جمائی آئے تو اسے حتی المقدور روکے کیونکہ اس وقت شیطان منہ میں داخل ہوتا ہے[7]۔

ایک روایت میں ہے۔ جمائی کے وقت ہا، ہا نہ کہو کیونکہ اس سے شیطان خوش ہوتا ہے[8]۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: لوگوں کو حالت نماز میں نگاہیں آسمان کی طرف اٹھانے سے باز آ جانا چاہئے ورنہ انکی نگاہیں اچک لی جائیں گی[1]۔

---

[1] ابو داؤد حوالہ سابق

[2] ابو داؤد باب العمل فی الصلاۃ حدیث 921

[3] **تبصرہ:** اس روایت میں ایک روای یحی بن ابی کثیر ہے جس کو مرحوم علی زئی صاحب نے {جزء قرات ص: 121} پر مدلس تسلیم کیا ہے۔ لہٰذا آپ ہی کے اصول کے مطابق روایت ضعیف ہے۔

[4] بخاری باب اذا حمل جاریۃ صغیرۃ علی عنقہفی الصلاۃ حدیث 516 '5996

[5] بخاری باب الالتفات فی الصلاۃ حدیث 751'2391

[6] بخاری باب الخصر فی الصلاۃ حدیث 1220 مسلم باب کراھۃ الاختصار في الصلاۃ حدیث 545

[7] مسلم باب تشمیت العاطس و کراھیۃ التثاوب حدیث 6995

[8] بخاري باب صفة ابليس و جنوده حدیث 3289 ' 6223 ' 6226

سیدنا سائبؓ نے سیدنا معاویہؓ کے ساتھ مقصورہ میں جمعہ پڑھا۔ جب امام نے سلام پھیرا تو سیدنا سائبؓ نے کھڑے ہو کر نماز شروع کر دی۔ سیدنا معاویہؓ کہنے لگے: آئندہ ایسا نہ کرنا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک نماز کو دوسری نماز کے ساتھ نہ ملاؤ حتی کہ ان کے درمیان کلام کر دیا جگہ تبدیل کرو[2]۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: نماز میں انسان اپنے رب سے مناجات سرگوشی کرتا ہے، اس لئے اسے چاہیئے کہ اپنے سامنے اور داہنی جانب نہ تھوکے بلکہ اپنے بائیں قدم کے نیچے تھوکے۔ اور دوسرے مقام پر ہے کہ یا چادر کے پلو میں تھوک کر مل دے[3]۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کو نمازی اونگھ آئے تو اسے چاہیئے کہ سو جائے یہاں تک کہ نیند چلی جائے۔ جو کوئی اونگھنے کی حالت میں نماز پڑھے گا تو اسے کچھ معلوم نہیں ہوگا شاید وہ استغفار کرتے ہوئے اپنے آپ کو گالی دے[4]۔

سیدنا زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ ہم نماز میں باتیں کیا کرتے تھے، پھر وقوموا للہ قنتین آیت نازل ہوئی تو ہمیں چپ چاپ رہنے کا حکم ہوا اور بات کرنا منع ہو گیا[5]۔

- اگر کوئی شخص سلام کہے تو نمازی زبان سے کچھ کہے بغیر دائیں ہاتھ کے اشارے سے سلام کا جواب دے گا[6]۔

﴿ غیر مقلد احباب عناوین ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

سجدہ سہو کا بیان

---

[1] مسلم باب النھي عن رفع البصر الي السماء حدیث 428، 429

[2] مسلم باب الصلاۃ بعد الجمعة حدیث 883

[3] بخاري باب الصلي يناجي ربه عزوجل حدیث 531 اس قت مسجدیں کچی ہوتی تھیں آج کل تھوکنا ہو تو چادر کے پلو میں تھوکر مل دے یہ بھی سنت ہے بخاری حک البزاق بالید من المسجد حدیث 405

[4] بخاری باب الوضوء من النوم حدیث 212 مسلم امر من النعس فی صلات حدیث 784

[5] بخاری باب ما ینھی من الکلام فی الصلاۃ حدیث 1200 مسلم باب تحریم الکلام فی الصلاۃ حدیث 539

[6] ابو داؤد باب رد السلام فی الصلاۃ حدیث 925، 927

تین یا چار رکعات کے شک پر سجدہ:

سیدنا ابو سید خدریؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اگر تم میں سے کسی کو رکعات کی تعداد کی بابت شک پڑ جائے اور اسے معلوم نہ ہو کے کہ تین پڑھی ہیں یا چار تو شک کو چھوڑ دے اور یقینی بات پر بنیاد رکھے، پھر سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کرے۔ اگر اس نے پانچ رکعات نماز پڑھی ہو گی تو یہ سجدے اس کی نماز کی رکعات کو جفت کر دیں گے اور اگر اس نے پوری چار رکعات نماز پڑھی ہو گی تو یہ سجدے شیطان کے لئے ذلت کا سبب ہوں گے [1]۔

جس شخص کو نماز میں یہ شک پڑ جائے کہ آیا اس نے ایک رکعت پڑھی ہے یا دو تو وہ اسے ایک رکعت یقین کرے۔ اور جسے یہ شک ہو کہ اس نے دو پڑھی ہیں یا تین تو وہ اسے دو رکعت یقین کرے۔ اور جسے یہ شک ہو کہ اس نے تین پڑھی ہیں یا چار تو وہ اسے تین رکعات یقین کرے۔ اور پھر آخری قعدے میں سلام پھیرنے سے پہلے سہو کے دو سجدے کرے [2]۔ [3]

سجدہ سہو کا طریقہ یہ ہے کہ آخری قعدے میں تشہد درود اور دعا پڑھنے کے بعد اللہ اکبر کہہ کر سجدے میں جائیں۔ پھر اٹھ کر جلسے میں بیٹھ کر دوسرا سجدہ کریں اور پھر اٹھ کر سلام پھیر کر نماز سے فارغ ہوں۔ حدیث مذکور میں سلام پھیرنے سے پہلے سجدہ سہو کا حکم ہے۔ اس لئے سہو کے دو سجدے سلام پھیرنے سے پہلے بھی ہو سکتے ہیں۔

---

[1] مسلم باب السہو فی الصلاۃ والسجود لھحدیث 571

[2] ترمذي باب ماجاء في الرجل يصلي فيشك في الزيادةوالنقصان حديث 398 وابن ماجة ماجاء في من شك في صلاته فرجع الي اليقين حديث 1209 امام ترمذی امام حاکم اور امام ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے

[3] **تبصرہ:** ترمذی کے روایت میں ۔یحی ابن ابی کثیر راوی ہے جس کو مرحوم علی زئی صاحب {جزء قرات ص: 121} پر مدلس تسلیم کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی ان کے عنعنہ روایت سے استدلال کی جارہی ہے۔ ابن ماجہ کی ورایت میں ایک کے بجائے دو مدلس ہیں ایک محمد بن اسحاق جس کو {جزء قرات ص: 112,182} پر مدلس تسلیم کیا ہے۔ اور دوسرے راوی مکحول ہیں جن کو ابن حبان اور ذہبی نے مدلس کہا ہے {طبقات المدلسین لابن حجر} ۔ یہ دونوں روایات محققین کے اصول کے مطابق ضعیف ہے۔ لیکن پھر بھی ان کو صحیح کہہ کر استدلال کیا جارہا ہے۔

قعدہ اولیٰ کے ترک پر سجدہ:

سیدنا عبداللہ بن بحینہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو ظہر کی نماز پڑھائی۔ آپ پہلی دو رکعتیں پڑھ کر کھڑے ہو گئے قعدے میں سہواً نہ بیٹھے تو لوگ بھی نبی اکرم ﷺ کے ساتھ کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ جب نماز پڑھ لی اور آخری قعدے میں سلام پھیرنے کا وقت آیا) اور لوگ سلام پھیرنے کے منتظر ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے بیٹھے بیٹھے تکبیر کہی اور سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کئے، پھر سلام پھیرا[1]۔

رسول اللہ ﷺ کے فعل مبارک سے ثابت ہوا کہ اس صورت میں سجدہ سہو سلام پھیرنے سے قبل کرنا چاہئے۔

سجدہ کا طریقہ:

ابو اسحاق کہتے ہیں کہ میں نے براء بن عازبؓ سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ جب سجدہ کرتے تو چہرہ کہاں رکھتے تھے؟ انہوں نے فرمایا کہ دونوں ہتھیلیوں کے درمیان[2] "۔

ابو اسحاق کہتے ہیں کہ ہم سے سیدنا براء بن عازبؓ نے سجدے کی کیفیت عملی طور پر بیان فرمائی، چنانچہ انہوں نے پہلے دونوں ہاتھوں کو زمین پر رکھا اور پھر دونوں گھٹنوں کو زمین پر جما کر رکھا اور پچھلا حصہ یعنی سرین کو اٹھائے رکھا اور فرمایا کہ اس طرح رسول اللہ سجدہ کیا کرتے تھے[3]۔

سیدنا عبداللہ بن مالک بن بحینہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز پڑھتے (اور سجدہ کرتے) تو ہاتھوں کو (پہلو سے) علیحدہ رکھتے یہاں تک کہ آپ کے بغل کی سفیدی ظاہر ہوتی[1]۔

---

[1] بخاری باب من لم یر التشهد الاول واجبا حدیث 869 '830'1224 '1225 '1220 مسلم باب السهو فی الصلاۃ حدیث 574

[2] سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 202 ماجاء أين يضع الرجل وجهها اذا سجد، حديث: 271

سنن ابي داود، كتاب الصلاة، باب 153-154 صفة السجود، حديث: 896، وقال النووي في الخلاصة: وراها ابن حبان وهو حديث حسن، [3] سنن النسائي، كتاب التطبيق، باب 51 صفة السجود، حديث: 1104

صحابی رسول ﷺ سیدنا احمر بن جزء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سجدہ کرتے تو دونوں بازوؤں کو اپنے پہلوؤں سے جدا رکھتے تھے، یہاں تک کہ ہم کو (آپ کی تکلیف و مشقت پر) رحم آ جاتا[2]۔

سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم نماز پڑھو تو (سجدہ کی حالت میں) درندوں کی طرح ہاتھوں کو زمین پر پھیلا کر نہ رکھو بلکہ ہتھیلیوں کو زمین پر مضبوطی سے رکھو اور اپنی دونوں کہنیوں کو بغل سے جدا رکھو[3]

ربیع کی روایت جو وہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں اس میں ہے کہ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے سات ہڈیوں (اعضاء) پر سجدہ کرنے کا حکم فرمایا اور اپنے بال اور کپڑوں کو پکڑ کر رکھنے سے منع فرمایا وہ سات ہڈیاں (اعضاء) یہ ہیں: دونوں ہتھیلیاں، دونوں گھٹنے، دونوں قدم اور پیشانی[4]۔

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الصلاة، باب 27 يبدي ضبعيه الخ، حديث:390 ، وكتاب الأذان، باب 130 يبدي ضبعيه الخ، حديث: 87، وكتاب المناقب، باب 23 صفة النبي ﷺ، حديث: 3565، و صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب 46 مايجمع صفة الصلاة، حديث: 495

[2] سنن ابيداود، كتاب الصلاة، باب 153-154 صفة السجود، حديث: 900، وسنن ابن ماجة، كتاب الصلاة، باب 19 السجود، حديث: 886

[3] مجمع الزوائد: 126/2 باب 194 السجود، كتاب الصلاة، حديث: 2767، وقال: رواه الطبراني في الكبير ورجاله ثقات، وصحيح ابن حبان: 242/5، كتاب الصلاة، باب 10 صفة الصلاة، حديث: 1914، وصحيح ابن خزيمة: 325/1، كتاب الصلاة، باب 185 الاعتدال في السجود الخ، حديث: 645

[4] صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب 44 أعضاء السجود والنهي عن كف الشعر والثوب و عقص الرأس في الصلاة، حديث:490، صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب 133 السجود على سبعة أعظم، حديث: 809 و 810 و باب 134 السجود على الأنف، حديث: 812 و باب 137 لا يكف شعرا، حديث: 815، وباب 138 لا يكف ثوبه في الصلاة، حديث: 816

ابو حمید الساعدی روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ جب سجدہ فرماتے تھے تو اپنی ناک اور اپنی پیشانی کو زمین پر جما کر رکھتے تھے[1]۔

سیدنا ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب سجدہ کے لئے زمین پر جھکتے تو دونوں ہاتھوں کو بغل سے الگ رکھتے اور اپنے دونوں پیروں کی انگلیاں کھلی رکھتے[2]۔

علقمہ بن وائل اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم اجب سجدہ کرتے تو (ہاتھ کی) انگلیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی رکھتے تھے[3]۔

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد اس پر حکم لگاتے ہوئے امام حاکم لکھتے ہیں: ہذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین ولم یخرجاہ۔ (حوالہ سابق) "یہ حدیث شیخین کی شرط کے مطابق صحیح ہے تاہم انہوں نے اسے نقل نہیں کیا ہے۔

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب رکوع کرتے تو اپنی پیٹھ پھیلا کر رکھتے اور جب سجدہ کرتے تو اپنی انگلیوں کو قبلہ رُخ رکھتے تھے[4]

ان تمام احادیث کی روشنی میں علماء کرام نے سجدہ کی جو کیفیت بیان کی ہے وہ یہ کہ پیشانی، ناک دونوں ہتھیلیاں، دونوں گھٹنے اور دونوں پیر (کی انگلیاں) زمین پر ہوں چہرہ دونوں ہتھیلیوں کے

---

[1] سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 201 ماجاء في السجود على الجبهة والأنف، حديث:270 و صحيح ابن حبان: 189/5، كتاب الصلاة، باب 10 صفة الصلاة، حديث: 1871

[2] سنن النسائی، كتاب التطبيق، باب 48 فتح أصابع الرجلين في السجود، حديث: 1101، وسنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 227، حديث: 304

[3] مستدرک الحاکم: 127/1، كتاب الصلاة، باب التامين، حديث: 826

[4] رواه ابو العباس محمد بن اسحاق السراج فی مسنده، نصب الرایة: 374/1، كتاب الصلاة، حديث بسط الظهر في الركوع، حديث: 1595

درمیان ہو، دونوں ہاتھ زمین سے اور دونوں پہلوؤں سے جدا ہوں اور ران پیٹ سے لگی نہ ہو نیز تمام انگلیوں کا رخ قبلہ کی طرف ہو۔

سجدہ میں جانے اور سجدہ سے اٹھنے کا طریقہ:

وائل بن حجر ؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ سجدہ میں گئے تو ہاتھوں کو زمین پر رکھنے سے پہلے دونوں گھٹنوں کو زمین پر رکھا اور جب سجدے سے اٹھے تو دونوں ہاتھوں کو پہلے اٹھایا اور گھٹنوں کو بعد میں [1]۔

سیدنا انس ص فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ا کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، آپ ا تکبیر کہتے ہوئے ہاتھ کے انگوٹھے دونوں کانوں تک لے گئے پھر رکوع کیا، یہاں تک کہ سارے جوڑ اپنی جگہ ٹھہر گئے تو ہاتھ سے پہلے گھٹنے زمین سے لگے [2]۔

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا: ہذا اسناد صحیح علی شرط الشیخین ولا اعرف لہ علۃ ولم یخرجاہ۔ (حوالہ سابق) "اس کی سند شیخین کی شرط کے مطابق صحیح ہے اس کی سند میں کسی قسم کا سُقم میرے علم کے مطابق نہیں ہے، تاہم شیخین نے اسے نقل نہیں کیا۔

سیدنا عمر بن خطاب ؓ سے جو روایت محفوظ کی گئی ہے اس میں ہے کہ آپ ص دونوں ہاتھوں کو زمین پر رکھنے سے پہلے دونوں گھٹنوں کو زمین پر رکھتے تھے، اس کو عبد الرزاق صنعانی نے ان سے

---

[1] سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 199 ماجاء في وضع الركبتين قبل اليدين في السجود، حديث: 268، سنن ابي داود، كتاب الصلاة، باب 136-137 كيف يضع ركبتيه قبل يديه، حديث: 838، سنن النسائي، كتاب التطبيق، باب 38 أول ما يصل الى الأرض من الانسان في سجوده، حديث: 1089، سنن ابن ماجة، كتاب اقامة الصلاة، باب 19 السجود، حديث: 882

[2] مستدرک الحاکم: 226/1، كتاب الصلاة، باب التامين، حديث: 822

روایت کیا ہے اور ابن منذر وغیرہ نے بھی روایت کیا ہے اور یہی طریقہ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے[1]۔

سجدہ میں جانے کا مسنون طریقہ یہی ہے کہ زمین سے جو عضو جتنا قریب ہو اسی ترتیب سے اعضاء سجدہ زمین پر رکھے جائیں یعنی پہلے گھٹنے پھر ہاتھ پھر پیشانی، اور سجدہ سے اٹھتے وقت پہلے پیشانی اٹھائی جائے پھر دونوں ہاتھ پھر دونوں گھٹنے۔

ترمذی کی مشہور و معروف شرح "الکوکب الدری" میں نقل کیا ہے: "ابن قدامہ کہتے کہ سب سے پہلے زمین پر نمازی کے دونوں گھٹنے پڑنے چاہئیں پھر دونوں ہاتھ پھر پیشانی اور اس کی ناک، امام احمد کے مشہور مذہب میں یہی طریقہ مستحب ہے، اور یہی سیدنا عمر ص سے بھی مروی ہے اور اسی کے قائل امام ابوحنیفہؒ، سفیان ثوری اور امام شافعی رحمہم اللہ ہیں... ہماری دلیل وائل ص کی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ا کو دیکھا کہ جب آپ نے سجدہ کیا تو دونوں گھٹنوں کو دونوں ہاتھوں سے پہلے زمین پر رکھا، اس روایت کو ابوداود، نسائی اور ترمذی نے نقل کیا ہے اور خطابی نے اس حدیث کو سیدنا ابوہریرہ ص کی حدیث کے مقابلہ میں (جس میں گھٹنوں سے پہلے ہاتھوں کے رکھنے کا تذکرہ ہے) سے زیادہ صحیح قرار دیا ہے[2]"۔

محدث کبیر امام ابوبکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ نیساپوری (223-311ھ) کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سجدہ میں جاتے ہوئے گھٹنے سے پہلے ہاتھ رکھنے کا عمل ابتدائی زمانہ کا ہے، جو منسوخ ہے اور اس کے مقابلہ

---

[1] المصنف: 236/1، كتاب الأذان والاقامة، باب 35 في الرجل اذا انحط، رواية:2703-2704) وابن المنذر وغيرهما وهو المروي عن ابن مسعود ص. زاد المعاد: 229/1 فصل فی کیفیة سجودهﷺ والقيام منه، رواه الطحاوی،اسناده صحيح (آثار السنن، ص: 149) المصنف: 236/1، كتاب الصلاة باب 35 في الرجل اذا انحط الى السجود، حديث :2703-2704

[2] الكوكب الدري: 277/1، أبواب الصلاة، باب وضع الركبتين، حاشيه: 1، ط:لكهنؤ، الهند

میں ہاتھوں سے پہلے گھٹنے رکھنے کا عمل بعد کا ہے جو پہلے والے عمل کے لئے ناسخ ہے، چنانچہ امام موصوف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح (ابن خزیمۃ) میں ایک باب باندھا ہے:

باب ذکر الدلیل علی أن الأمر بوضع الیدین قبل الرکبتین عند السجود منسوخ، وأن وضع الرکبتین قبل الیدین ناسخ اذ کان الأمر بوضع الیدین قبل الرکبتین مقدما و الأمر بوضع الرکبتین قبل الیدین مؤخرا فالمقدم منسوخ والمؤخر ناسخ

"یہ باب اس بات کی دلیل میں ہے کہ سجدہ کرتے ہوئے گھٹنوں سے پہلے ہاتھ رکھنے کا حکم منسوخ ہے اور ہاتھوں سے پہلے گھٹنوں کے رکھنے کا حکم ناسخ ہے، اس لئے کہ گھٹنوں سے پہلے ہاتھوں کے رکھنے کا حکم پہلے کا ہے اور ہاتھوں سے پہلے گھٹنوں کے رکھنے کا حکم بعد کا ہے، اور پہلے والا حکم منسوخ ہوا کرتا ہے اور بعد کا حکم ناسخ"

اس باب کے تحت امام ابن خزیمہ نے یہ روایت نقل کی ہے: "سیدنا سعد ؓ فرماتے ہیں کہ ہم گھٹنوں سے پہلے ہاتھ رکھا کرتے تھے تو (رسول اللہ ﷺ نے) ہمیں ہاتھوں سے پہلے گھٹنے رکھنے کا حکم دیا[1]"

سجدوں میں اعتدال:

"سیدنا انس ؓ رسول اللہ ﷺ کا قول نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ اعتدال واطمینان سے سجدے کرو اور کتے کی طرح بازوؤں کو زمین پر پھیلا کر مت رکھو[2]"۔

---

[1] صحیح ابن خزیمة: 319/1، باب: 172 حدیث: 628

[2] صحیح البخاري، کتاب مواقیت الصلاة، باب 8 المصلي یناجي ربه عزوجل، حدیث: 532 و کتاب الأذان، باب 141 لا یفترش ذراعیه في السجود، حدیث: 822، وصحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب 45 الاعتدال في السجود، حدیث: 493، وسنن ابي داود، کتاب الصلاة، باب 153-154 صفة السجود، حدیث: 897، وسنن الترمذي، کتاب الصلاة، باب 205 الاعتدال في السجود، حدیث: 276، وسنن ابن ماجة، کتاب اقامة الصلاة، باب 21 الاعتدال في السجود، حدیث: 892

"رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو بندہ رکوع اور سجدے میں اپنی پشت کو سیدھی (برابر) نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ اس کی نماز کی طرف دیکھتا بھی نہیں[1] "۔

نماز کی طرف نہ دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسی نماز اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابل قبول نہیں ورنہ ظاہر ہے زمین وآسمان کی کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ سے مخفی اور اس کی نظر سے غائب نہیں ہے، اس حدیث میں رسول اللہ انے تنبیہ فرمائی ہے کہ جو شخص رکوع وسجود کو قاعدے کے مطابق صحیح طور پر ادا نہیں کرے گا اس کی نماز قبول نہیں ہو گی۔

حالت سجدہ میں زمین پر ہتھیلیاں رکھنے کا طریقہ:

سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں جب مدینہ پہنچا تو میں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کی نماز کا مشاہدہ کروں (چنانچہ میں نے آپ اکی پوری نماز دیکھی جس میں آپ انے قیام، قراءت اور رکوع کیا) پھر آپ انے تکبیر کہی (اور سجدہ کیا) تو آپ کے دونوں ہاتھ دونوں کانوں کے قریب اس جگہ تھے جہاں تک آپ انے ابتداء نماز میں تکبیر تحریمہ کے وقت دونوں ہاتھ اٹھائے تھے[2] ۔

آپ ﷺ نے جب سجدہ کیا تو دونوں ہتھیلیوں کے درمیان سجدہ کیا[3]

حالت سجدہ میں دونوں قدم کھڑے ہو:

---

[1] مسند الامام احمد:22/4، أول مسند المدنيين، حديث طلق بن علي، حديث:16392-16393، وايضا 456/5، مسند الأنصار، بقية حديث علي بن شيبان الحنفي، حديث: 24292 و 24294

[2] سنن النسائي، كتاب التطبيق، باب 49 مكان اليدين في السجود، حديث:1102، وسنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب 114-115 رفع اليدين في الصلاة، حديث: 726

[3] صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب 15 وضع اليد اليمنى على اليسرى بعد تكبيرة الاحرام، حديث 401

ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک رات میں نے رسول اللہ ﷺ کو (اپنی جگہ) نہ پایا تو میں تلاش کرتے ہوئے (کمرہ ہی میں) ان تک پہنچی تو دیکھا کہ آپ سجدہ میں ہیں اور آپ کے دونوں قدم مبارک (زمین سے لگے ہوئے) کھڑے ہیں[1]۔

رسول اللہ ﷺ نے جن اعضاء پر سجدہ کرنے کا حکم فرمایا ہے ان میں سے ایک دونوں پاؤں بھی ہیں[2]۔

لہٰذا اگر کسی شخص نے سجدہ کیا اور بلا عذر پاؤں زمین پر نہیں رکھا تو اس کا سجدہ درست نہیں ہوگا، اگر ایک پاؤں زمین پر رکھا اور دوسرے کو اٹھائے رکھا تو سجدہ تو ہو جائے گا لیکن یہ صورت مکروہ ہے، پاؤں رکھنے سے مراد پاؤں کی انگلیوں کو زمین پر رکھنا ہے۔

عباس بن عبد المطلب ﷺ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب بندہ سجدہ کرتا ہے تو اس کے ساتھ اس کے جسم کے سات اعضاء بھی سجدہ کرتے ہیں: اس کا چہرہ، اس کی دونوں ہتھیلیاں، اس کے دونوں گھٹنے اور اس کے دونوں پیر[3]۔

دونوں سجدوں کے درمیان دعاء

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رات کی نماز میں دو سجدوں کے درمیان یہ دعاء پڑھتے تھے: "رَبِّ اغْفِرْ لِي وَارْحَمْنِي وَاجْبُرْنِي وَارْزُقْنِي وَارْفَعْنِي" اے اللہ! مجھے بخش

---

[1] سنن النسائي، كتاب التطبيق، باب 47 نصب القدمين في السجود، حديث: 1100، وصحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب 42 مايقال في الركوع والسجود، حديث: 486، وسنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب 147-148 الدعاء في الركوع والسجود، حديث: 879، وسنن ابن ماجة، كتاب الدعاء، باب 3 ما تعوذ منه رسول الله ﷺ، حديث: 3841

[2] سنن الترمذي، حديث: 272 و صحيح مسلم، حديث: 491

[3] صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب 44 أعضاء السجود الخ، حديث: 491، وسنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب 150-151 أعضاء السجود، حديث: 891، وسنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 203 ماجاء في السجود على سبعة أعضاء، حديث: 272، وسنن النسائي، كتاب التطبيق، باب 41 تفسير ذالک، حديث: 1094، وسنن ابن ماجة، كتاب الصلاة، باب 19 السجود، حديث: 885

دے، مجھ پر رحم فرما، میری مصیبت اور نقصان کی تلافی فرما، مجھے رزق عطا فرمااور مجھے اعلی مقام سے نواز[1]۔

جامع الترمذی کی روایت میں "وَاہدِنِیْ" کا اضافہ ہے یعنی مجھے ہدایت دے، اور ابوداود کی روایت میں وَاہدِنِیْ کے ساتھ "عَافِنِیْ" کا بھی اضافہ ہے، یعنی مجھے عافیت سے رکھ اب گویا تمام اضافوں کے ساتھ مکمل دعاء کے الفاظ اس طرح ہوں گے: رَبِّ اغْفِرْلِيْ وَارْحَمْنِيْ وَاجْبُرْنِيْ وَاهدِنِيْ وَارْزُقْنِيْ وَارْفَعْنِيْ وَعَافِنِيْي عنی اے اللہ! مجھے بخش دے، مجھ پر رحم فرما، میری مصیبت اور نقصان کی تلافی فرما، مجھے ہدایت دے، مجھے رزق عطا فرمااور مجھے اعلیٰ مقام سے نواز اور مجھے عافیت سے رکھ۔

سیدنا حذیفہ ﷛ سے روایت ہے کہ انہوں (حذیفہ ص) نے رسول اللہ ﷺ کو رات کی نماز (تہجد) پڑھتے دیکھا... آپ ادونوں سجدوں کے درمیان بھی اتنی ہی دیر بیٹھے جتنی دیر سجدہ کیا تھااور آپ اس جلسہ میں : رَبِّ اغْفِرْلِيْ رَبِّ اغْفِرْلِيْ. کہہ رہے تھے یعنی اے میرے رب میری مغفرت فرمادے ،اے میرے رب میری مغفرت فرمادے[2]۔

شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک دونوں سجدوں کے درمیان یہ ذکر فرائض ونوافل دونوں میں مسنون ہے جب کہ حنفیہؒ اور مالکیہ کے نزدیک فرائض میں کوئی ذکر مسنون نہیں، احناف ومالکیہ نے مذکورہ دعاء کو نوافل میں پڑھنے پر محمول کیا ہے جیسا کہ دونوں حدیثوں کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے، البتہ بعض حنفیہؒ نے فرائض میں بھی اس ذکر کو پڑھنا بہتر قرار دیا ہے، چنانچہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور ومعروف اور متداول کتاب "مالابد منہ" میں اسی کو بہتر قرار دیا ہے، نیز علامہ انور

---

[1] سنن ابن ماجة، كتاب اقامة الصلاة، باب 23 ما يقول بين السجدتين، حديث: 898 وسنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 211 مايقول بين السجدتين، حديث:284 وسنن ابي داود، كتاب الصلاة، باب 140-141 الدعاء بين السجدتين، حديث:850

[2] سنن ابي داود، كتاب الصلاة، باب 146-147 مايقول الرجل في ركوعهو سجوده، حديث: 874، وهكذا في سنن النسائي، كتاب التطبيق، باب 86 الدعاء بين السجدتين، حديث: 1145

شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میری رائے میں اختلاف سے بچنے کے لئے اس کا پڑھنا بہتر ہے ، کیوں کہ حنفیہّ کے نزدیک جائز تو ہے ہی صرف سنیت میں کلام ہے ، للذا دونوں سجدوں کے درمیان اعتدال اور اطمینان کا یقین حاصل کرنے کے لئے اس کا پڑھنا ہی مناسب ہے، خاص طور پر فی زمانہ جہاں لوگ قومہ و جلسہ میں اعتدال و اطمینان کا خاص اہتمام نہیں کرتے ہیں [1]۔

دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنے کی کیفیت:

سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نماز کی سنت میں سے یہ ہے کہ (بیٹھنے کی حالت میں) دایاں پیر کھڑا رکھا جائے، اس کی انگلیاں قبلہ کی طرف ہوں اور بائیں پر بیٹھا جائے [2]۔

سیدنا ابو حمید ساعدی ﷜ سے (رسول اللہ ﷺ کی نماز کے بارے میں) مروی ہے... کہ پھر آپ ا زمین کی طرف جھکتے تھے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو پہلوؤں سے جدا رکھتے تھے، پھر اپنا سر (سجدہ سے) اٹھاتے اور بائیں پیر کو موڑ کر (بچھا کر) اس پر بیٹھتے تھے اور سجدہ کے وقت انگلیوں کو کھلا رکھتے اور سجدہ کرتے، پھر اللہ اکبر کہہ کر سجدہ سے سر اٹھاتے اور بائیں پیر کو بچھا کر اس پر بیٹھتے اتنی دیر تک کہ ہر ایک ہڈی اپنے ٹھکانے پر آجاتی [3]۔

عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (نماز میں جب بیٹھتے تو) بائیں پیر کو بچھاتے اور دائیں پیر کو کھڑا رکھتے [4]۔

---

[1] ملاحظہو: درس ترمذی: 54/2، باب مایقول بین السجدتین

[2] سنن النسائي، كتاب التطبيق، باب 96 الاستقبال بأطراف أصابع القدم القبلة الخ، حديث: 1158

[3] سنن ابي داود، كتاب الصلاة، باب 115-116 افتتاح الصلاة، حديث: 730 وصحيح ابن حبان، كتاب الصلاة، باب 10 صفة الصلاة، حديث: 1870

[4] صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب 46 ما يجمع صفة الصلاة الخ، حديث: 498

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں کتے کی طرح بیٹھنے اور تورک (یعنی بائیں پیر کو دائیں پیر کے نیچے سے دائیں طرف نکال کر سرین پر بیٹھنے) سے منع فرمایا[1]۔

علامہ شیخ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس حدیث کو صحیح قرار دیتے ہوئے صحیح الجامع الصغیر میں نقل کیا ہے[2]۔

سجدہ سے اٹھنے کا طریقہ:

سیدنا ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں کھڑے ہوتے تھے دونوں قدموں کے سرے پر یعنی پیروں کی انگلیوں پر زور دے کر اٹھ کھڑے ہوتے (اور سجدہ کے بعد نہ بیٹھتے تھے)[3]۔

نعمان بن ابی عیاش رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے بہت سے صحابۂ کرام (ث) کو پایا کہ پہلی رکعت اور تیسری رکعت میں سیدھے کھڑے ہو جاتے تھے، بیٹھتے نہ تھے، یعنی جلسۂ استراحت نہیں کرتے تھے[4]۔

عبد الرحمان بن غنم سے روایت ہے کہ ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ نے اپنی قوم کو جمع کرکے فرمایا کہ اے اشعریو! تم سب اپنی عورتوں اور اپنی اولاد کے ساتھ جمع ہو جاؤ، میں تم سب کو رسول اللہ ﷺ کی اس نماز کی کیفیت بتاؤں گا جو آپ انے مدینہ منورہ میں پڑھائی... (پھر ابو مالک ص نے جو تفصیل بیان فرمائی اس میں تھا کہ) پھر آپ ﷺ نے سمع اللہ لمن حمدہ کہا اور سیدھے کھڑے ہو گئے، پھر تکبیر

---

[1] مسند الامام أحمد: 233/3، مسند المكثرين، مسند أنس بن مالك، حديث: 13471

[2] صحيح الجامع: 1158/2، حديث: 6865

[3] سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 214 منه (كيف النهوض من السجود) حديث: 288

[4] مصنف ابن أبي شيبة: 347/1، كتاب الصلوات، باب 170 من كان يقول: اذا رفعت من السجدة الثانية في الركعة الأولى فلا تجلس، رواية: 3989

کہتے ہوئے سجدہ میں چلے گئے، پھر تکبیر کہہ کر سجدہ سے سر اٹھایا، پھر تکبیر کہی اور دوسرا سجدہ کیا پھر تکبیر کہی اور سیدھے کھڑے ہوگئے[1]۔

دوسرے سجدہ کے بعد تھوڑی دیر بیٹھ کر پھر کھڑا ہونے کو جلسۂ استراحت کہتے ہیں، اصل مسنون طریقہ یہ ہے کہ بغیر بیٹھے ہوئے کھڑا ہو، کیوں کہ صحابۂ کرام جلسۂ استراحت نہیں کیا کرتے تھے، چنانچہ علامہ قاسم نے "أسوس في كيفية الجلوس" نامی کتاب میں علامہ محب الدین عبد السلام بن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے: "جلسۂ استراحت نہ کرنے پر صحابہ کرام ث کا اجماع ہے، لہٰذا بالیقین مالک ص کی روایت کردہ حدیث کو حالت عذر پر محمول کیا جائے گا[2] "۔

بیٹھ کر اٹھنے (جلسۂ استراحت) والی روایت کے بارے میں احناف کا خیال ہے کہ غالباً آپ ا بڑھاپے اور جسم کے بھاری ہونے کے بعد اس طرح اٹھا کرتے تھے، گویا یہ عذر کی بناء پر تھا، جیسا کہ اس حدیث سے بھی اشارہ ملتا ہے: "رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھ سے پہلے رکوع اور سجدہ مت کرو، جس قدر میں تم سے پہلے رکوع میں جاؤں گا اتنا تم پالوگے جب میں تم سے پہلے سر اٹھاؤں گا، کیوں کہ میرا جسم بھاری ہوگیا ہے[3] "۔

حنفیہؒ کی یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے، کہ جلسۂ استراحت کرنا بہتر نہیں ہے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ وغیرہ سے بھی منقول ہے کہ یہ حضرات جلسۂ استراحت نہیں کرتے تھے[4]۔

---

[1] مسند الامام أحمد: 343/5، مسند الأنصار، حديث أبي مالك الأشعري، حديث: 23294

[2] بذل المجهود شرح سنن أبي داود: 327/5، باب كراهية الاعتماد على اليد في الصلاة

[3] سنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب 74 ما يؤمر بهالماموم الخ، حديث: 619، وسنن ابن ماجة، كتاب اقامة الصلاة، باب 41 النهي أن يسبق الامام بالركوع والسجود، حديث: 963

[4] مصنف ابن أبي شيبة: 346/1، باب 169 من كان ينهض على صدور قدميهو مصنف عبد الرزاق: 178/2باب كيف النهوض من السجدةالآخرة

جلسۂ استراحت کے بارے میں امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یہ جو جلسۂ استراحت ہے، اسے سوائے دو صحابہ (ابی حمیدؓ اور مالک بن حویرثؓ) کے کسی اور صحابی نے ذکر نہیں فرمایا، اگر یہ عمل رسول اللہ ﷺ کا دائمی عمل تھا تو تمام وہ صحابہ جنہوں نے رسول کریم ﷺ کی نماز کی کیفیات کو بیان فرمایا ہے، ضرور اس جلسۂ استراحت کا ذکر فرماتے، رسول کریم اکا کسی عمل کو صرف ایک دو بار انجام دینے سے اس عمل کو مستقل سنت نہیں قرار دیا جاسکتا، پھر جب یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ آپ ا نے یہ عمل (اپنی ایک ذاتی) ضرورت کے تحت انجام دیا ہے تو اس کو نماز کی سنتوں میں سے ایک سنت قرار نہیں دیا جاسکتا، اس مسئلہ میں (ہماری یہ) تحقیق ایک جامع تحقیق ہے [1]۔

سجدہ سے اٹھتے وقت زمین کا سہارا:

"سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس بات سے منع فرمایا کہ آدمی نماز میں اٹھتے وقت اپنے ہاتھوں سے (زمین پر) ٹیک لگائے [2]"

---

[1] زاد المعاد: 241/1، فصل فی جلسة الاستراحة

[2] سنن أبي داود عن ابن عبد الملک، کتاب الصلاة، باب 181-182 کراهية الاعتماد علی الید في الصلاة، حدیث: 992

شیخ ناصر الالبانی رحمۃ اللہ علیہ نے عبد الملک کی اس روایت کو منکر اور مجہول قرار دیا ہے، جیسا کہ ابوداود کی اس روایت کے بعد مذکور ہے، لیکن مشہور محدث شیخ شمس الحق ابوالطیب عظیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے تقریب کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ ابن عبد الملک "صدوق" ہیں اور یہ ان راویوں میں سے ہیں جن کی حدیث "صحیح" ہوتی ہے، یا شواہد ومتابعت کی وجہ سے "حسن" ہوتی ہے:

ومحمد بن عبد الملک بن مروان الواسطي: قال فيه في التقريب: صدوق وهو ممن يصح حديثه أو يحسن بالمتابعة والشواهد.

شیخ عبدالوہاب مشہدانی فرماتے ہیں کہ بعض لوگ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی اس حدیث کو دو سبب سے ضعیف قرار دیتے ہیں: اول یہ کہ اس کے راوی محمد بن عبد الملک ہیں جو مجہول ہیں، دوسرے یہ کہ یہ روایت ثقہ راویوں کی روایت کے مخالف ہے، یعنی اس کے قبول کرنے پر ثقہ راویوں کی روایت کی مخالفت لازم آتی ہے، اور ثقہ کی مخالفت شاذ اور مردود ہوتی ہے۔

سجدہ سے اُٹھ کر قیام کی طرف جاتے ہوئے زمین پر ہاتھ ٹیک کر اُٹھنے اور بغیر ہاتھ ٹیکے اُٹھنے کے مسئلہ کی بابت مشہور حنبلی عالم امام موسیٰ بن احمد حجاوی صالحہ نے حنابلہ کا مسلک یوں لکھا ہے:

"پھر پہلے سجدہ کی طرح دوسرا سجدہ کرے، پھر اپنے قدموں کے بَل کھڑے ہوتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو گھٹنوں پر ٹیک کر اللہ اکبر کہتے ہوئے سر اُٹھائے، ہاں اگر دُشواری ہو تو زمین سے (بھی) سہارا لے سکتا ہے[1]"

شیخ ابن النجار قنوجی لکھتے ہیں: "(پھر) امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کے مطابق (گھٹنوں کے سہارے قدموں کے سروں پر کھڑے ہوتے ہوئے تکبیر کہتے ہوئے) دوسرے سجدہ سے اپنا سر (اٹھائے) امام احمد رحمہ اللہ نے اس کی صراحت کی ہے، اٹھتے وقت اپنے ہاتھوں سے سہارا نہ لے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کے بر عکس، کیوں کہ سیدنا وائل بن حجر ﷛ سے مروی ہے وہ فرماتے

اول کا جواب شیخ مشہدانی نے یہ دیا ہے کہ کچھ لوگوں کو محمد بن عبد الملک بن زنجویہ بغدادی ابو بکر الغزال اور محمد بن عبد الملک بن ابی محذورہ کے درمیان التباس ہو گیا ہے، محمد بن عبد الملک غزال ثقہ راوی ہیں، نسائی فرماتے ہیں کہ یہ ثقہ ہیں ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ ان سے میرے والد نے روایت نقل کی ہے اور یہ صدوق ہے، ابن حبان نے ان کو ثقات کی فہرست میں شمار کیا ہے، جب کہ محمد بن عبد الملک بن ابی محذورہ مجہول ہیں، جیسا کہ ابن القطان نے فرمایا: "محمد بن عبد الملک بن زنجویہ بغدادی ابو بکر غزال امام احمد کے پڑوسی تھے، ان سے چاروں سنن کے مصنفین نے وایتیں نقل کی ہیں، نسائی کا کہنا ہے کہ یہ ثقہ راوی ہیں، ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ ان سے میرے والد نے حدیث سنی ہے، اور یہ صدوق ہے، ابن حبان نے ان کو ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے، شاید کہ محمد بن عبد الملک بن ابی محذورہ سے التباس ہو گیا ہے جس کے بارے میں ابن قطان نے فرمایا ہے کہ یہ مجہول راوی ہے[2]"

دوسرے کا جواب شیخ مشہدانی نے یہ دیا ہے کہ ثقہ راویوں کی مخالفت اور روایت کا شاذ ہونا اس وقت ہوتا ہے جب کہ ثقہ راویوں کی صریح روایت کی مخالفت اس طرح لازم آتی ہو کہ اِسے قبول کرنے کی صورت میں دوسری روایت کا رَد لازم آئے اور یہاں ایسا نہیں ہے: "ثقات کی مخالفت اور روایت کا شاذ و مردود ہونا اس وقت ہے جب کہ وہ ثقات کی روایت کی صریح مخالف روایت نقل کرے، اس طور پر اس کے قبول کرنے کی وجہ سے دوسری روایت کی تردید ہوتی ہو، جیسا کہ حافظ بن حجر نے "نخبۃ الفکر" (ص 37) میں صراحت کی ہے، اور یہاں ایسی صورت نہیں ہے جیسا کہ مخالفین کہتے ہیں، کیوں کہ ابوداود نے اسے اپنے چار اساتذہ سے نقل کیا ہے، ابن رافع کہتے ہیں کہ رسول اللہ ا نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ آدمی اپنے ہاتھ پر ٹیک لگائے، اور ابن شبویہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ا نے اس بات سے منع کیا ہے کہ آدمی نماز میں اپنے ہاتھ پر ٹیک لگائے"[2]۔

[1] متن الاقناع مع شرحہ کشاف القناع: 1/426-427

ہیں کہ میں نے جنابِ رسول کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ اجب سجدہ میں جاتے تو ہاتھوں سے پہلے گھٹنے رکھتے اور جب سجدہ سے اٹھتے تو گھٹنوں سے پہلے ہاتھوں کو اٹھاتے، اسے امام نسائی اور اثرم نے روایت کیا ہے، اور ایک دوسری حدیث کے الفاظ میں ہے کہ آپ اجب سجدہ سے اٹھتے تو اپنے گھٹنوں کے بَل رانوں پر سہارا لیتے ہوئے اٹھتے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے نماز میں (سجدہ سے) اٹھتے وقت ہاتھوں پر سہارا لینے سے مرد کو منع فرمایا ہے، ان دونوں روایتوں کو امام ابوداود نے نقل کیا ہے، (اور اگر) گھٹنوں پر سہارا لینا (دشوار ہو تو زمین کا) سہارا لے، کیوں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فرض نماز کی پہلی دو رکعتوں میں مرد کے لئے اٹھتے وقت سنت یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں کو زمین پر نہ ٹیکے البتہ عمر دراز بوڑھا ہو (یا بدن بھاری ہو، یا کوئی اور شرعی یا جسمانی عذر ہو) جسے اس کی طاقت نہ ہو (تو وہ ہاتھوں کو زمین پر ٹیک سکتا ہے) اسے اثرم نے روایت کیا ہے، اور اسی پر سیدنا مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کی وہ روایت بھی محمول ہے جس میں جنابِ رسول اللہ ﷺ کی نماز کی کیفیت میں ارشاد ہے کہ آپ اجب دوسرے سجدہ سے سر اٹھاتے تو سیدھا بیٹھ جاتے، پھر زمین پر سہارا لیتے[1]، اسے امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے"

لہٰذا بہتر یہی ہے کہ آدمی جب سجدہ سے اٹھ کر قیام کی طرف جائے تو ہاتھ ٹیک کر نہ اٹھے، ہاں اگر کوئی عذر ہو یا بڑھاپا یا کمزوری ہو کہ بغیر ہاتھ ٹیکے اٹھنا دشوار ہو تو پھر ہاتھ ٹیک کر اٹھنے میں کوئی حرج نہیں اور جس روایت میں ہاتھ ٹیک کر اٹھنے کا تذکرہ ہے غالباً وہ بڑھاپے کی وجہ سے تھا۔

---

[1] معونة أولي النهى شرح المنتهى: 152/2، باب صفة الصلاة

التحیات پڑھنا:

عبد اللہ بن مسعود ﷜ فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے، ہم نے کہا: السلام علی اللہ من عبادہ السلام علی فلان وفلان یعنی اللہ پر سلام ہو اس کے بندوں کی طرف سے، سلام ہو فلاں اور فلاں پر، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "السلام علی اللہ" مت کہو، اس لئے کہ وہ تو خود سلام ہے (یعنی اللہ کا ایک نام السلام بھی ہے) البتہ یہ کہو: التحیات للہ والصلوات (پوری دعاء تشہد) یعنی ادب و تعظیم اور اظہار نیاز کے سارے کلمے اللہ ہی کے لئے ہیں اور تمام عبادات اور تمام صدقات اللہ ہی کے لئے ہیں (اور میں ان سب کا نذرانہ اللہ کے حضور پیش کرتا ہوں) اے نبی ﷺ! تم پر سلام ہو، اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں، سلام ہو ہم پر اور اللہ کے سب نیک بندوں پر، میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت اور بندگی کے لائق نہیں (صرف وہی معبود برحق ہے) اور میں اس بات کی بھی شہادت دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں[1]۔

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الأذان، باب 148 التشهد في الأولى، حديث: 831، وايضًا كتاب الصلاة، باب 150 ما يتخير من الدعاء بعد التشهد، حديث: 835، وايضًا كتاب العمل في الصلاة، باب 4 من سمى قومًا أو سلم في الصلاة، حديث: 1202، وايضًا كتاب الاستيذان، باب 3 السلام اسم من أسماء الله تعالى، حديث: 6230، وايضًا كتاب التوحيد، باب 5 قول الله تعالى: السلام المؤمن، حديث: 7381، و صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب 16 التشهد في الصلاة، حديث: 402، وسنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب 177-178 التشهد، حديث: 968، وسنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 215 ماجاء في التشهد، حديث: 289، وسنن النسائي، كتاب التطبيق، باب 100 كيف التشهد الأول، حديث: 1162 و 1163 و 1164 و 1166 و 1167 و 1168 و 1169 و 1170، وسنن ابن ماجة، كتاب اقامة الصلاة، باب 24 ماجاء في التشهد، حديث: 899، ومسند الامام أحمد: 382/1، مسند المكثرين، مسند عبد الله بن مسعود، حديث: 3622، وايضًا 413/1 ، مسند المكثرين، مسند عبد الله بن مسعود، حديث: 3919 و 3920، وايضًا 423/1، مسند المكثرين، مسند عبد الله بن مسعود، حديث: 4017 ، وايضًا 328/1، حديث 4064، وايضًا 431/1، حديث: 4101، وايضًا 439/1، حديث: 4177، وايضًا 440/1، حديث: 4189، وايضًا 464/1، حديث: 4422

"سید نا عبد اللہ بن مسعود ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے تشہد (التحیات) کی تعلیم دی اس حالت میں میری ہتھیلی آپ ﷺ کی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان تھی، (اور اس کی تعلیم اس طرح فرمائی) جس طرح آپ ﷺ قرآن مجید کی سورتیں تعلیم فرماتے تھے (آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی تشہد میں بیٹھے تو یہ کہے) التحیات للہ والصلوات... (پوری التحیات پڑھے) [1]"

رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام ؓ کو جو کچھ سکھاتے اور بتاتے تھے اس میں سب سے زیادہ اہتمام آپ قرآن مجید کی تعلیم کا فرماتے تھے، لیکن تشہد (التحیات) کی تعلیم و تلقین آپ نے اسی خاص الخاص اہتمام سے فرمائی جس اہتمام سے آپ قرآن مجید کی کسی سورت کی تعلیم دیتے تھے، سیدنا عبد اللہ بن مسعود ؓ کا ہاتھ اس وقت اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان پکڑنا بھی اسی سلسلہ کی ایک چیز تھی، اور طحاوی کی ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے عبداللہ بن مسعود ؓ کو یہ تشہد ایک ایک کلمہ کرکے تلقین فرمائی:

"سیدنا عبد اللہ بن مسعود ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے تشہد جنابِ رسول کریم ﷺ کے دہانِ مبارک سے حاصل کیا اور آپ ﷺ نے مجھے تشہد ایک ایک کلمہ کرکے تلقین فرمایا یعنی جس طرح بچوں یا اَن پڑھوں کو کوئی اہم چیز یاد کرائی جاتی ہے [2]"

سیدنا عبد اللہ بن مسعود ؓ فرماتے ہیں کہ جنابِ رسول اللہ ﷺ نے انہیں تشہد سکھایا اور لوگوں کو بھی انہیں تشہد سکھانے کا حکم دیا [3]۔

---

[1] صحیح البخاري، کتاب الاستیذان، باب 28 الأخذ بالیدین، حدیث: 831،6265، وصحیح مسلم، حدیث:402، وسنن أبي داود، کتاب التطبیق، باب 100 کیف التشہد الأول، حدیث: 1171، وسنن الترمذي، حدیث: 289و سنن النسائی، حدیث:1162و سنن ابن ماجة، حدیث:899 و مسند الامام احمد: 382/1،حدیث: 3622

[2] شرح معانی الآثار: 262/1، باب التشہد فی الصلاۃ، کیف ہو؟

[3] مسند الامام أحمد: 376/1، مسند المکثرین، مسند عبد اللہ بن مسعود، حدیث: 3562

اور مسند احمد کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو یہ تشہد تعلیم فرمائی اور ان کو حکم دیا کہ وہ دوسروں کو اس کی تعلیم دیں۔
سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جنابِ رسول اللہ ﷺ نے انہیں تشہد سکھایا اور لوگوں کو بھی انہیں تشہد سکھانے کا حکم دیا[1]۔

تشہد کے الفاظ چوبیس صحابہ کرامؓ سے مروی ہیں اور ان سب کے الفاظ میں تھوڑا فرق ہے، ہمارے علماء کرام نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی تشہد کے الفاظ کو ترجیح دی ہے، اس کی کئی وجوہات ہیں، مثلاً:

(1) یہ روایت اس باب میں اصح روایت ہے، چنانچہ امام ترمذی نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: "عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث مختلف سندوں سے مروی ہے اور تشہد کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ سے مروی احادیث میں سب سے زیادہ صحیح حدیث ہے اور نبی کریم ﷺ کے اصحابؓ اور ان کے بعد کے تابعین میں سے اکثر اہل علم کا اس پر عمل رہا ہے اور یہی قول سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک، احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہم کا ہے[2]"

(2) ابوبکر بزار رحمۃ اللہ علیہ سے جب تشہد کے بارے میں مروی احادیث کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ آپ کے نزدیک اس باب میں سب سے صحیح ترین حدیث کون سی ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: "میرے نزدیک سب سے زیادہ صحیح حدیث سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث ہے اور وہ بیس سے زائد طُرق سے مروی ہے، پھر انہوں نے اکثر سندوں کو بیان کیا اور فرمایا: تشہد کے باب میں اس سے زیادہ ثابت، اس سے زیادہ صحیح سندوں والی اور اس سے زیادہ مشہور راویوں والی کوئی حدیث میرے علم میں نہیں[3]"

---

[1] مسند الامام أحمد: 376/1، مسند المكثرين، مسند عبد الله بن مسعود، حديث: 3562

[2] سنن الترمذي، حديث: 289، كتاب الصلاة، باب ما جاء في التشهد

[3] فتح الباري: 315/2، حديث: 831 باب التشهد في الآخرة، كتاب الأذان

(3) محدث کبیر حافظ امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ کا قول اس الفاظ میں نقل کیا ہے: "تشہد کے سلسلہ میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مقابلہ میں زیادہ بہتر اور اچھی حدیث میں نے نہیں سنی[1] "۔

(4) یہ ان معدودے چند روایات میں سے ہے جو تمام صحاح ستہ میں مروی ہیں اور کمال یہ ہے کہ اس تشہد کے الفاظ میں کہیں سر مو اختلاف نہیں، جب کہ دوسرے تمام تشہد کے الفاظ میں اختلاف موجود ہے۔

(5) اس میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے تصریح کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے اس تشہد کی تعلیم میرا ہاتھ پکڑ کر دی تھی جو شدت اہتمام پر دال ہے، بلکہ علامہ بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی صراحت کے مطابق یہ روایت مسلسل باخذ الیدین بھی ہے (یعنی اس کی سند کے ہر راوی نے نبی کریم ا کے طریقہ کو نمونہ بنا کر اپنے شاگردوں کو ہاتھ پکڑ کر روایت سنائی ہے)۔

(6) امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ: " عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ اس میں کسی حرف کا اضافہ کیا جائے یا اس میں کسی حرف کی کمی کی جائے[2] "

اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس تشہد کو کتنے اہتمام سے یاد کیا تھا اور ان کی نظروں میں اس کی کتنی اہمیت تھی۔

(7) اس کا ثبوت صیغۂ امر کے ساتھ ہوا ہے، چنانچہ احادیث میں اس کے لئے "فلیقل[3] " "قولوا"[4] اور "فقولوا"[1] کے الفاظ آئے ہیں برخلاف دیگر تشہد کے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہ ترجیح موجود ہیں [2] ۔

---

[1] المعجم الکبیر: 39/10، روایت: 9883

[2] الموطا، ص: 67، باب 41 التشہد في الصلاۃ، حدیث: 148 کے تحت

[3] سنن أبیداود، حدیث: 968

[4] سنن النسائي، حدیث: 1167

التحیات آہستہ پڑھنا

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ تشہد کو آہستہ آواز سے پڑھنا سنت ہے [3]۔

قعدہ اولیٰ میں تشہد سے زیادہ کچھ نہ پڑھے:

عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ... پھر اگر آپ اور میان نماز (دو رکعت پر قعدہ اولیٰ) میں ہوتے تو جوں ہی تشہد سے فارغ ہوتے، کھڑے ہو جاتے اور اگر آخر نماز (قعدہ اخیرہ) میں ہوتے تو تشہد کے بعد حسب توفیق دعاء کرتے پھر سلام پھیرتے۔

ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ دو رکعت میں (جب بیٹھتے تو) تشہد سے زیادہ کچھ اور نہ پڑھتے [4]۔

عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب پہلی دو رکعتوں پر بیٹھتے تھے (یعنی قعدہ اولیٰ کرتے تھے تو اتنی جلدی کرتے تھے) جیسے آپ تپتے پتھروں پر بیٹھے ہوں، شعبہ کہتے ہیں کہ پھر (حدیث

---

[1] سنن النسائي، حديث: 1163

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: معارف السنن: 3/90-93، درسِ ترمذی: 2/58-59، تالیف: علامہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

[3] سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 217 ماجاء أنه يخفي التشهد، حديث: 291، وسنن أبيداود، كتاب الصلاة، باب 179-180 اخفاء التشهد، حديث: 986، ومستدرک الحاكم: 1/230، كتاب الصلاة، باب التامين، حديث 838، مسند الامام احمد: 1/459، مسند المكثرين، مسند عبد الله بن مسعود، حديث: 4382 اس روایت کو نقل کرنے کے بعد امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے "حسن" قرار دیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں: حديث ابن مسعود حديث حسن غريب والعمل عليه عند أہل العلم۔ "عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث حسن غریب ہے اور اِسی پر اہل علم کا عمل ہے۔ اور حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے: صحیح علی شرط الشیخین [3]۔ "یہ حدیث شیخین کی شرط کے مطابق صحیح ہے (مستدرک الحاكم: 1/230)

[4] مسند أبي يعلى الموصلي: 4/248، مسند عائشة رضی الله عنها، حديث: 4356

کے ایک راوی، شعبہ کے استاذ) سعد نے ہونٹوں کو حرکت دی، تو میں نے پوچھا کہ آپ ااس کے بعد کھڑے ہو جاتے تھے تو انہوں نے کہا کہ جی ہاں، آپ ا کھڑے ہو جاتے تھے [1]۔

رسول اللہ ﷺ کے اس دوامی عمل سے یہ سمجھا گیا ہے کہ قعدہ اولی میں صرف تشہد پڑھ کر جلدی سے کھڑا ہو جانا چاہئے۔

قعدۂ اخیرہ میں درود شریف:

"نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے (تو تشہد میں) اللہ کی حمد وستائش کرے پھر نبی کریم ﷺ پر درود پڑھے پھر اس کے بعد حسب توفیق دعاء مانگے [2]"

"ابو مسعود عقبہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص آ کر رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیٹھ گیا، ہم بھی آپ ا کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، اس شخص نے عرض کیا کہ: یارسول اللہ! سلام تو ہم جانتے ہیں لیکن جب ہم نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں تو آپ پر درود کیسے بھیجیں؟ راوی کہتے ہیں کہ آپ خاموش ہو گئے، ہم نے سوچا کہ کاش اس شخص نے سوال نہ کیا ہوتا، پھر آپ ا نے ارشاد فرمایا کہ جب تم مجھ پر درود بھیجنا چاہو تو یوں کہو:

---

[1] سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 270 ماجاء في مقدار القعود في الركعتين الأوليين، حديث: 366، وسنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب 182- 183 في تخفيف القعود، حديث: 995، وسنن النسائي، كتاب التطبيق، باب 105 التخفيف في التشهد الأول، حديث: 1176، اس روایت کو امام ترمذی نے "حسن" قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اسی پر اہل علم کا عمل ہے،

[2] سنن الترمذي، كتاب الدعوات، باب 66، حديث: 3477، وسنن أبي داود، كتاب الوتر، باب 23 الدعاء، حديث: 1481، ونيل الاوطار: 184/2، كتاب الصلاة، باب 114 ماجاء في الصلاة على الرسول ا، حديث 3/782، قال الترمذي: هذا حديث حسن صحيح،(ترمذي، ج:2/ص:184؛ طبع سعيد)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيْمَ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

اے اللہ اپنی خاص عنایت اور رحمت فرما نبی امی پر اور نبی کے گھر والوں پر جیسے تو نے عنایت فرمائی سیدنا ابراہیم (ں) پر اور ابراہیم (ں) کے گھر والوں پر اور خاص برکتیں نازل فرما نبی امی محمد (ا) پر اور محمد (ا) کے گھر والوں پر جیسے کہ تو نے خاص برکتیں نازل فرمائیں ابراہیم اور آل ابراہیم (ں) پر، بیشک تو حمد وستائش کے لائق اور عظمت وبزرگی والا ہے[1] ۔

”عبد الرحمان بن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ میری ملاقات سیدنا کعب بن عجرہ ص سے ہو گئی تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ کیا وہ ہدیہ پیش نہ کروں جو میں نے رسول اللہ ا سے سنا ہے؟ میں نے کہا کیوں نہیں؟ آپ وہ ہدیہ ضرور عطا کریں، تو انہوں نے بتایا کہ ہم نے رسول اللہ ا سے سوال کرتے ہوئے عرض کیا کہ: اللہ تعالیٰ نے تو ہم کو بتادیا کہ ہم آپ کی خدمت میں سلام کس طرح عرض کیا کریں (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ نے ہم کو بتادیا کہ ہم تشہد میں ” السلام علیک أیھا النبي ورحمة الله وبرکاته “ کہہ کر آپ پر سلام بھیجیں) اب آپ ہمیں یہ بھی بتادیجئے کہ ہم آپ پر اور اہل بیت پر صلاۃ یعنی درود کیسے بھیجیں؟ آپ نے فرمایا کہ یوں کہا کرو:

[1] صحیح ابن حزیمة: 352/1 ، حدث :711، باب 220 صفة الصلاة، على النبي في التشهد، كتاب الصلاة، قال علي: هذا اسناد حسن متصل، قال ابن التركماني: لا اعلم احدا روي هذا الحديث بهذا اللفظ إلا محمد بن اسحاق وقدقال البيهقي (في باب تحريم قتل ماله روح): الحفاظ يتوقون ماينفرد به. (سنن الكبرى،ج: 529/2، باب وجوب الصلوة على النبى)

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاہِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاہِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ، اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاہِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاہِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

اے اللہ اپنی خاص عنایت اور رحمت فرما سیدنا محمد ﷺ پر اور محمد ﷺ کے گھر والوں پر جیسے تو نے عنایت ورحمت فرمائی سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر اور ابراہیم علیہ السلام کے گھر والوں پر، تو حمد وستائش کے لائق اور عظمت وبزرگی والا ہے، اے اللہ! خاص برکتیں نازل فرما سیدنا محمد ﷺ پر اور محمد ﷺ کے گھر والوں پر، جیسے کہ تو نے خاص برکتیں نازل فرمائیں سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور آل ابراہیم پر، بیشک تو حمد وستائش کے لائق اور عظمت وبزرگی والا ہے [1]"۔

درود شریف نماز کے آخری قعدہ میں تشہد کے بعد پڑھا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ یہی اس کے لئے بہترین موقع ہو سکتا ہے، اللہ کے بندے کو رسول اللہ ﷺ کی ہدایت و تعلیم کے ذریعہ ایمان نصیب ہوا، اللہ تعالیٰ کو ان کے ذریعہ جانا پہچانا، اور نماز کی شکل میں اس کے دربار عالی کی حاضری اور حمد وتسبیح اور ذکر ومناجات کی دولت گویا ایک طرح کی معراج اسے نصیب ہوئی اور آخری قعدہ کے تشہد پر یہ نعمت گویا مکمل ہو گئی، اب اس کو حکم ہے کہ اللہ کے دربار سے رخصت ہونے سے پہلے اور اپنے لئے کچھ مانگنے سے بھی پہلے وہ بندہ، سیدنا محمد ا کے اس احسان کو محسوس کرتے ہوئے کہ انہی کی ہدایت کی وجہ سے اس دربار تک رسائی ہوئی اور یہ سب کچھ نصیب ہوا، اللہ تعالیٰ سے آپ کے لئے اور آپ کی زندگی کی شریک ازواج مطہرات اور آپ کی ذریت طیبہ کے لئے بہتر سے بہتر دعاء کرے، اس کے سوال اور اس سے بہتر کوئی

[1] صحيح البخاري، كتاب الأنبياء، باب 10، حديث: 3370، نیز دیکھئے: صحیح مسلم، كتاب الصلاة، باب 17 الصلاة على النبي ا بعد التشهد، حديث: 406

چیز اس کے پاس ہے ہی نہیں جس کو پیش کرکے وہ اپنے جذبہ ممنونیت کا اظہار اور احسان مندی کا حق ادا کرسکے، اسی لئے درود شریف کے یہ بہتر کلمے صحابہ کرام کو رسول اللہ انے تلقین فرمائی[1] ۔

درود شریف کے بعد کی دعاء:

"سیدنا ابو بکر صدیق ﷛ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے کوئی دعاء سکھا دیجئے جسے میں اپنی نماز میں پڑھا کروں، تو آپ انے ارشاد فرمایا کہ یہ دعاء کیا کرو:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا كَثِيْرًا وَّلَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّآ أَنْتَ فَاغْفِرْ لِيْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِيْ إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ

یا الٰہی! بیشک میں نے اپنی جان پر بہت ظلم کیا ہے اور تیرے سوا گناہوں کو کوئی نہیں بخشتا، پس اپنی طرف سے مجھ کو بخش دے اور مجھ پر رحم فرما، بیشک تو ہی بخشنے والا مہربان ہے[2] "

" ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عروہ بن زبیر ﷛ کو بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں یہ دعاء کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ أَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَأَعُوْذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَفِتْنَةِ الْمَمَاتِ. اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ أَعُوْذُبِكَ مِنَ الْمَأْثَمِ وَالْمَغْرَمِ

---

[1] ماخوذ از معاف الحدیث: 302/3

[2] صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب 149 الدعاء قبل السلام، حديث: 834، وايضا، كتاب الدعوات، باب 17 الدعاء في الصلاة، حديث: 6326، وايضا كتاب التوحيد، باب 9 قول الله تعالى: وكان الله سميعا بصيرا، حديث: 7388، و صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب 13 استحباب خفض الصوت بالذكر، حديث: 2705

اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں عذاب قبر سے، اور تیری پناہ چاہتا ہوں دجال کے فتنے سے اور تیری پناہ چاہتا ہوں موت وحیات کے فتنے سے، یاالٰہی میں گناہ سے اور قرض سے تیری پناہ مانگتا ہوں[1]"

"عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ (تحیات پڑھنے کے بعد) پھر نمازی کو اختیار ہے کہ جو دعاء اچھی لگے، مانگے[2]"۔

سلام:

سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ طہارت (وضو/ پاکی) نماز کی کنجی ہے اور اس کی تحریم، اللہ اکبر کہنا ہے اور (نماز میں داخل ہونے کے بعد عائد ہونے والی پابندیاں) ختم کرنے کا ذریعہ سلام ہے[3]۔

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دائیں اور بائیں طرف سلام پھیرتے وقت اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ. اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ کہتے تھے (اور چہرہ مبارک اس قدر دائیں بائیں طرف پھیرتے کہ) رخسار مبارک کی سفیدی دیکھی جاسکتی تھی[4]۔

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب 149 الدعاء قبل السلام، حديث: 832، نیز دیکھیے: صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب 25 ما يستعاذ منه في الصلاة، حديث: 588-589

[2] صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب 150 ما يتخير من الدعاء بعد التشهد، حديث: 835، و صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب 16 التشهد في الصلاة، حديث: 402

[3] سنن أبي داود، كتاب الطهارة، باب 31 فرض الوضوء، حديث: 61 و سنن الترمذي، ابواب الطهارة، باب 3 ما جاء أن مفتاح الصلاة الطهور، حديث: 3، و سنن ابن ماجة، كتاب الطهارة وسننها، باب 3 مفتاح الصلاة الطهور، حديث 275 صحيح

[4] سنن بن ماجة، كتاب اقامة الصلاة، باب 28 التسليم، حديث: 916 و سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 221 ماجاء في التسليم في الصلاة، حديث: 295 عن عبد الله بن مسعود ص صحيح، و سنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب

نماز کا اختتامی کلمہ جس کے کہنے کے بعد نماز والی ساری پابندیاں اور بندشیں ختم ہو جاتی ہیں اور جو جائز و مباح چیزیں تکبیر تحریمہ کہنے کے بعد اس کے لئے ناجائز اور حرام ہو گئی تھیں وہ سب حلال ہو جاتی ہیں، وہ کلمہ "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" ہے۔

آپ اکے قول و عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے نماز کے اختتام کے لئے السلام علیکم رحمۃ اللہ تلقین فرمائی، اور بلا شبہ نماز سے نکلنے کے لئے اس سے بہتر کوئی لفظ سوچا بھی نہیں جا سکتا، ہر شخص جانتا ہے کہ "سلام" اس وقت کہا جاتا ہے جب ایک دوسرے سے غائب ہونے اور الگ ہونے کے بعد پہلی ملاقات ہو، لہٰذا اختتام کے لئے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کی تعلیم میں واضح اشارہ ہے بلکہ گویا ہدایت ہے کہ بندہ اللہ اکبر کہہ کر جب نماز میں داخل ہو اور بارگاہ الٰہی میں عرض معروض شروع کرے تو چاہئے کہ وہ اس وقت اس عالم شہود سے حتی کہ اپنے ماحول اور اپنے دائیں بائیں والوں سے بھی غائب اور الگ ہو جائے، اور اللہ کے سوا کوئی بھی اس وقت اس کے دل کی نگاہ کے سامنے نہ رہے، پوری نماز میں اس کا حال یہی رہے، پھر جب قعدۂ اخیرہ میں تشہد اور درود شریف اور آخری دعاء اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کرکے اپنی نماز پوری کرلے تو اس کے باطن کا حال یہ ہو کہ گویا اب وہ کسی دوسرے عالم سے اس دنیا کے ماحول میں واپس آیا ہے، اور دائیں بائیں والے انسان یا فرشتوں سے اب اس کی نئی ملاقات ہو رہی ہے اس لئے اب وہ ان کی طرف رخ کرکے اور ان ہی کو مخاطب کرکے کہے: السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

سلام کرتے وقت کن کی نیت کی جائے؟

تم میں سے ہر ایک کے لئے کافی ہے کہ اپنا ہاتھ اپنی ران پر رکھے اور اپنے دائیں بائیں بھائیوں کو سلام کرے[1]۔

183-184 في السلام، حديث: 996، وسنن النسائي، كتاب السهو، باب 71 كيف السلام على الشمال، حديث 1324

[1] صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب 27 الأمر بالسكون في الصلاة، حديث: 431

سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ : رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم سلام کریں اپنے آپ کو اور ساتھ میں ایک دوسرے کی نیت کرلیں[1]، اس کو ابوداود رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے[2]، اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں روایت نقل کی ہے[3] کہ : ہم امام کے سلام کا جواب دیں، ایک دوسرے سے محبت کریں اور ایک دوسرے کو سلام کریں، اس کو ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے[4]، اور بزار رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ ہم اپنے امام کو سلام کریں اور ہم میں سے ہر ایک دوسرے کو سلام کرے، امام بزار کی روایت میں فی الصلاۃ کا اضافہ ہے یعنی نماز میں اور اس کی سند حسن ہے۔

نماز پوری کرنے کے بعد سلام پھیرنا مسنون ہے اور سلام میں دونوں طرف اتنا رُخ پھیرے کہ رخسار دکھائی دے، نمازی تین طرح کے ہوسکتے ہیں، اگر وہ تنہا نماز پڑھ رہا ہے جسے منفرد کہتے ہیں تو دونوں طرح سلام پھیرتے وقت اپنے اوپر سلام کی نیت کے ساتھ دائیں بائیں طرف کے فرشتوں کو سلام کرنے کی نیت کرلے، اور اگر مقتدی ہے تو اپنے اوپر سلام کرنے کی نیت کے ساتھ دائیں اور بائیں طرف کے فرشتوں، دیگر مقتدیوں اور امام کو سلام کرنے کی نیت کرے، اور اگر وہ امام ہے تو خود اپنے اوپر سلام کرنے کے ساتھ تمام مقتدیوں اور دائیں بائیں طرف کے فرشتوں کو سلام کرنے کی نیت کرلے، جیساکہ اوپر کی احادیث سے معلوم ہوا۔

---

[1] ابوداود حدیث:1001) والحاکم (270/1) بلفظ: أن نرد علی الامام وأن نتحاب وأن یسلم بعضنا علی بعض، رواہ ابن ماجہ (حدیث: 922) والبزار بلفظ: أن نسلم علی أئمتنا وأن یسلم بعضنا علی بعض، زاد البزار في الصلاۃ واسنادہ حسن. تلخیص الحبیر: 443/1، باب صفة الصلاۃ، حدیث: 421

[2] دیکھئے: حدیث: 1001

[3] دیکھئے: 270/1

[4] دیکھئے: حدیث: 922

مقتدی بھی امام کے ساتھ سلام پھیرے:

سیدنا عتبان (بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ہم نے جناب نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی، اور آپ ﷺ کے سلام پھیرنے کے وقت ہم نے (بھی) سلام پھیرا[1]۔

حدیث پاک کی شرح میں شارح بخاری علامہ بدر الدین العینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مقتدی امام کے ساتھ سلام پھیرے اس لئے کہ امام کے سلام کے وقت مقتدی کا سلام لا محالہ امام کے ساتھ ہی ہو گا[2]۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مقصود یہ ہے کہ مقتدی امام کے بعد سلام پھیرنے میں دعاء وغیرہ کی وجہ سے تاخیر نہ کرے، خواہ امام کے ساتھ سلام پھیرے یا امام کے فوراً بعد پھیرے، امام کے بعد ہی سلام پھیرنا شرط نہیں ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا قول (باب يسلم حين يسلم الامام) کہ امام کے سلام پھیرنے کے وقت مقتدی سلام پھیرے، علامہ زین الدین رحمۃ اللہ علیہ نے منیر میں لکھا ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کے لفظ سے باب کا عنوان قائم کیا ہے، جس میں دو احتمالات ہیں، ایک احتمال تو یہ ہو سکتا ہے کہ امام کی ابتداء کے بعد مقتدی سلام کی ابتداء کرے اور امام کے پورے سلام پھیرنے سے پہلے ہی سلام پھیرنے میں لگ جائے، دوسرا احتمال ہے بھی ہو سکتا ہے کہ مقتدی سلام کی ابتداء اس وقت کرے جب کہ امام پورا سلام پھیر لے، علامہ زین الدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چوں کہ لفظ حدیث میں دونوں صورتوں کا احتمال ہے لہٰذا معاملہ مجتہد کے حوالہ ہے، انتہیٰ۔ اور ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوسری صورت (یعنی امام کے پورا سلام پھیرنے کے وقت مقتدی سلام کی ابتداء کرے)

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب 153 يسلم حين يسلم الامام، حديث: 838، وايضا كتاب الأذان، باب 154 من لم يرد السلام على الامام، حديث: 840، وايضا أبواب التهجد، باب 36 صلاة النوافل جماعة، حديث 1186، وسنن النسائي، كتاب السهو، باب 73 تسليم المأموم حين يسلم الامام، حديث: 1327

[2] عمدة القاري في شرح البخاري: 193/5، كتاب الأذان، باب يسلم حين يسلم الامام

شرط نہیں ہے، کیوں کہ لفظ حدیث میں دونوں احتمالات ہیں، لہٰذا مقتدی دونوں صورتوں میں سے جو بھی اختیار کرے، سب درست ہے، نیز اس جانب بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد مقتدی دعاء وغیرہ کی مشغولیت کی وجہ سے سلام پھیرنے میں تاخیر نہ کرے اور یہی مندوب ومستحب ہے[1]۔

امام المحدثین سیدنا محمد بن اسماعیل البخاری رحمۃ اللہ علیہ، صحابی رسول سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں فرماتے ہیں: "سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما امام کے پیچھے رہنے والوں یعنی مقتدیوں کے لئے امام کے سلام کے ساتھ سلام پھیرنے کو مستحب سمجھتے تھے[2]"۔

فرض نماز کے بعد دعاء:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں صاف صاف ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے سلام پھیرنے کے بعد قبلہ رخ ہو کر دعا مانگی۔

حضرت اسود عامری اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی، تو آپ ﷺ نے سلام پھیرا اور تھوڑا سا رخ موڑا اور پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی[3]۔

ابن قیم ن زاد المعاد میں فرماتے ہیں کہ: "نماز سے سلام پھیرنے کے بعد امام یا مقتدی کا قبلہ رخ ہو کر (اونچی آواز سے آمین آمین کہکر) دعا کرنا آنحضرت ﷺ کا طریقہ نہیں تھا" لیکن ابن قیم کی اس بات کو حافظ ابن حجر نے رد کر دیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ابن قیم کا نماز کے بعد دعا کا مطلقا انکار کرنا مردود ہے، اس لئے کہ آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے حضرت معاذ سے فرمایا کہ معاذ میں تم سے محبت کرتا ہوں (میری یہ بات بطور خاص سنو) تم کسی نماز کے بعد یہ دعا پڑھنا کبھی نہ چھوڑنا

---

[1] فتح الباری فی شرح البخاری، حدیث: 838 کے تحت

[2] صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب 153 يسلم حين يسلم الامام، حديث: 838 سے پہلے

[3] تحفۃ الاحوذی ج: 1/ ص: 246،245 میں احادیث کے حوالے دیکھ لیے جائیں۔

اللہم اعنی علی ذکرک الخ مشہور غیر مقلد عالم دین مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب ہے کہ نماز کے بعد دعا امام اور مقتدی دونوں کے لئے سنت ہے۔ فرماتے ہیں: "میں کہتا ہوں کہ کوئی شک نہیں کہ فرض نماز سے فراغت کے بعد آنحضرت ﷺ سے قولاً وفعلاً دعا ثابت ہے اور اس کو خود ابن القیم نے زاد المعاد میں ذکر کیا ہے۔"

پھر ابن قیم کے نماز کے بعد دعا کے انکار پر تعجب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: پس ابن قیم کا یہ کہنا (جبکہ خود ان کے کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز کے بعد آپ ﷺ نے دعا فرمائی اور صحابہ کرامؓ کو بھی اس کی ترغیب دی) نماز کے بعد قبلہ رخ ہو کر امام یا مقتدی کا دعا کرنا آنحضور ﷺ کا طریقہ نہیں تھا مجھے نہیں معلوم کہ اس کا کیا مطلب ہے اور ابن قیم کی اس سے کیا مراد ہے۔

نماز کے بعد مسنون اذکار:

سیدنا ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کا تمام ہونا تکبیر اللہ اکبر کی آواز سے پہچان لیتا تھا[1]۔

یعنی نبی کریم ﷺ فرض نماز کا سلام پھیر کر اونچی آواز سے اللہ اکبر کہتے تھے اس سے ثابت ہوا کہ امام اور مقتدیوں کو نماز سے فارغ ہوتے ہی ایک بار بلند آواز سے اللہ اکبر کہنا چاہئے۔

سیدنا ثوبانؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب اپنی نماز ختم کرتے تو تین بار استغفار کرتے، یعنی استغفر اللہ، استغفر اللہ، استغفر اللہ کہتے، پھر یہ پڑھتے۔

اللھم انت السلام ومنک السلام تبارکت یاذالجلال والاکرام

یاالٰہی! تو صاحب سلامتی ہے اور تیری ہی طرف سے سلامتی ہے۔ اے ذوالجلال والاکرام! تو بڑا ہی بابرکت ہے[2]۔

---

[1] بخاري باب الذكر بعد الصلاة حديث 842'841 مسلم باب الذكر بعد الدعاء حديث 583

[2] مسلم باب اتحباب الذكر بعد الصلاة حديث 591

تنبیہ: دعائے رسول اللہ ﷺ میں اضافہ جس طرح دعائے اذان میں لوگوں نے اضافہ کر رکھا ہے، اسی طرح اس دعا میں بھی لوگوں نے زیادتی کی ہوئی ہے۔ "اللھم انت السلام ومنک السلام۔ رسول اللہ ﷺ" کے الفاظ ہیں۔آگے (والیک یرجع السلام حینا ربنا بالسلام وادخلنا دارالسلام کا اضافہ کر رکھا ہے۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ شروع اور اخیر میں رسول اللہ ﷺ کے الفاظ اور درمیان میں خود اپنی طرف سے سنت سمجھ کر دعائیہ جملے بڑھا کر جو نہ کرے تو اس سے لڑتے ہیں تو یہ حدیث رسول اللہ ﷺ میں زیادتی کی ہوئی ہے۔ معاذ اللہ! کیا آپ یہ جملے بھول گئے تھے یا دعا ناقص چھوڑ گئے تھے جس کی تکمیل امتیوں نے کی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ ان بڑھائے ہوئے جملوں میں کیا خرابی ہے ان کا ترجمہ بہت اچھا ہے، آخر دعا ہی ہے اور اللہ ہی کے آگے ہے۔ گزارش ہے کہ انسان اپنی مادری یا عربی زبان وغیرہ میں جو دعا چاہے اپنے مالک سے کرے، جون سے جملے چاہے دعا میں استعمال کرے، کوئی حرج نہیں۔ مگر حدیث رسول اللہ ﷺ میں اپنی طرف سے الفاظ یا جملے سنت سمجھ کر اور اس پر لڑ کر زیادہ کرتے ہیں ناجائز ہیں۔ ایسا کرنے سے دین کی اصل صورت قائم نہیں رہتی۔

سیدنا معاذ بن جبلؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: اے معاذ: اللہ کی قسم! میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ میں نے کہا: میں بھی آپ کو دوست رکھتا ہوں۔ پھر آپ نے فرمایا: جب تو مجھے دوست رکھتا ہے تو میں تجھے وصیت کرتا ہوں کہ ہر فرض نماز کے بعد یہ ذکر پڑھنا نہ چھوڑنا: رب اعنی علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک

اے میرے رب! ذکر، شکر اور اچھی عبادت کرنے میں میری مدد کر[1] ۔

سیدنا مغیرہ بن شعبہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر فرض نماز کے بعد کہتے تھے:

لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ،لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شیء قدیر

اللھم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا ینفع ذا الجد منک الجد

---

[1] نسائي السنن الكبري باب نوع اخر من الدعاء حديث 1226

اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں ہے، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اسی کے لئے بادشاہت ہے اور اسی کے لئے ساری تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یا اللہ! تیری عطا کو کوئی روکنے والا نہیں اور تیری روکی ہوئی چیز کوئی عطا کرنے والا نہیں اور دولت مند کو اس کی دولت تیرے عذاب سے نہیں بچا سکتی۔[1]

سیدنا عبد اللہ بن زبیرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز سے سلام پھیرنے کے بعد پڑھتے تھے:

لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ۔ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شیء قدیر ۔ لا الہ الا اللہ ولا نعبد الا ایاہ ۔ لہ النعمۃ ولہ الفضل ولہ الثناء الحسن لا الہ الا اللہ مخلصین لہ الدین ولو کرہ الکافرون

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اسی کے لئے بادشاہت ہے اور اسی کے لئے ساری تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ گناہوں سے رکنا اور عبادت پر قدرت پانا صرف اللہ کی توفیق سے ہے۔ اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں اور ہم صرف اسی کی عبادت کرتے ہیں۔ ہر نعمت کا مالک وہی ہے اور سارا فضل اسی کی ملکیت ہے (فضل اور نعمتیں صرف اسی کی طرف سے ہے) اسی کے لئے اچھی تعریف ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں، ہم صرف اسی کی عبادت کرتے ہیں، اگرچہ کافر برا منائیں۔[2]

رسول اللہ ﷺ نماز کے بعد ان کلمات کے ساتھ اللہ کی پناہ پکڑتے تھے انہیں پڑھتے تھے۔

---

[1] بخاري باب الذکر بعد الصلاۃ حدیث 844 مسلم باب استحباب الذکر بعد الصلاۃ حدیث 593

[2] مسلم باب استحباب الذکر بعد الصلاۃ حدیث 594

اللھم انی اعوذبک من الجبن واعوذ بک من البخل واعوذبک من البخل
وأعوذبک من ان ارد الی ارذل العمر واعوذبک من فتنۃ الدنیا وعذاب القبر
اے اللہ! میں بزدلی سے تیری پناہ میں آتا ہوں اور کنجوسی سے بھی تیری پناہ چاہتا ہوں اور اس بات سے بھی تیری پناہ چاہتا ہوں کہ مجھے رذیل عمر (زیادہ بڑھاپے) کی طرف پھیر دیا جائے اور اسی طرح میں دنیاوی فتنوں اور عذاب قبر سے بھی تیری پناہ چاہتا ہوں[1] ۔

سیدنا ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس شخص کے تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے، خواہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں جو ہر فرض نماز کے بعد یہ پڑھے سبحان اللہ ۳۳ بار، الحمد للہ ۳۳ بار، اللہ اکبر ۳۳ بار۔ یہ ۹۹ کلمات ہوگئے اور سو پورا کرنے کے لئے ایک بار کہے:

لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ، لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شیء قدیر

اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں ہے، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اسی کے لئے بادشاہت ہے اور اسی کے لئے ساری تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے[2] ۔

سیدنا کعب بن عجرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص فرض نماز کے بعد سبحان اللہ ۳۳ بار، الحمد للہ ۳۳ بار، اللہ اکبر ۳۴ بار کہے گا، وہ نامراد نہیں ہوگا۔[3]

سیدنا عقبہ بن عامرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم کیا کہ میں فرض نماز کے بعد معوذات پڑھا کروں[4] ۔

---

[1] بخاري باب الاستعاذ من الارذل العمر ومن فتنة النار حديث 6374

[2] مسلم باب استحباب الذكر بعد الصلاة حديث 597

[3] مسلم ايضا حديث 596

[4] ابو داؤد باب في الاستغفار حديث 1523

معوذات اللہ کی پناہ میں دینے والی سورتیں سورۃ اخلاص، فلق اور الناس یعنی قرآن مجید کی آخری تین سورتوں کو کہتے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

بسم الله الرحمن الرحيم

قل هو الله احد۔ الله الصمد۔ لم يلد والم يولد۔ ولم يكن له كفوا احد

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت رحم کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔اے نبی! آپ کہہ دیجئے: وہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے۔ اس نے کسی کو نہیں جنا اور نہ وہ خود جنا گیا۔ اور کوئی ایک بھی اس کا ہمسر نہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ . مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ . وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ . وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ . وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت رحم کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔ کہو میں پناہ حفاظت مانگتا ہوں صبح کے رب کی۔ ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہے۔ اور اندھیری رات کے شر سے جب کہ وہ چھا جائے۔ اور گرہوں میں پھونکنے والیون کے شر سے (جادو، ٹونا کرنے، کرانے والوں کے شر سے) اور حاسد کے شر سے جبکہ وہ حسد کرے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ . مَلِكِ النَّاسِ . اِلٰهِ النَّاسِ . مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ . الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ . مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت رحم کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔ کہو میں پناہ حفاظت مانگتا ہوں لوگوں کے رب کی۔ لوگوں کے مالک کی۔ لوگوں کے معبود کی۔ اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر

آتا ہے جو لوگوں کے سینوں دلوں میں وسوسے اور برے خیالات ڈالتا ہے۔خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔

سیدنا ابو امامہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

جو شخص ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھے تو اسے بہشت میں داخل ہونے سے سوائے موت کے کوئی چیز نہیں روکتی[1] ۔

مطلب یہ ہے کہ آیۃ الکرسی پڑھنے والا موت کے بعد سیدھا جنت میں جائے گا۔

آیۃ الکرسی:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ لَا تَاۡخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّ لَا نَوۡمٌ ط لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ط مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ ط یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡھِمۡ وَمَا خَلۡفَھُمۡ وَلَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِہٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ کُرۡسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَلَا یَئُوۡدُہٗ حِفۡظُھُمَا وَھُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت رحم کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔وہ زندہ ہے۔ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔وہ اونگھتا ہے نہ سوتا ہے۔اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔اس کی اجازت کے بغیر کون اس کے پاس (کسی کی) سفارش کر سکتا ہے؟ وہ جانتا ہے جو کچھ ان سے پہلے گزرا اور جو کچھ ان کے بعد ہو گا اور لوگ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے (معلوم نہیں کر سکتے) مگر جتنا وہ چاہتا ہے (اتنا علم جسے

---

[1] نسائي باب في عمل اليوم والليلة 100

چاہے دے دیتا ہے)اس کی کرسی نے آسمانوں اور زمین کو گھیر رکھا ہے اور ان دونوں کی حفاظت اسے تھکاتی نہیں۔وہ بلند و بالا، بڑی عظمتوں والاا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص رات کو سوتے وقت آیۃ الکرسی پڑھ لیتا ہے تو اللہ کی طرف سے اس کے لئے محافظ مقرر کر دیا جاتا ہے اور طلوع فجر تک شیطان اس کے قریب نہیں آتا[1] ۔

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں: ﴾

نماز کے بعد یہ دعا پڑھنا بھی ثابت ہے:

اللھم اصلح لی دینی الذی جعلته لی عصمة واصلح لی دنیاباللتی جعلته فیھا معاشی، اللھم انی اعوذ برضاک من سخطک، واعوذ بعفوک من نقمتک وَ أعُوْذبک منک لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا ینفع ذاالجد منک الجد

اے اللہ! میرے لئے میرا وہ دین سنوار دے جسے تو نے میرے حفاظت کا سبب بنایا ہے اور میری دنیا بھی سنوار دے جس میں تو نے میری روزی پیدا کی ہے۔اے اللہ! میں تیری خوشنودی کے ساتھ تیرے غصے سے اور تیری معافی کے ساتھ تیرے عذاب سے پناہ کا طالب ہوں اور تیرے کرم کے ساتھ تیری سزا سے پناہ مانگتا ہوں جو چیز تو عطا کرے،اسے کوئی روکنے والا نہیں ہے اور جو چیز تو روکے اسے کوئی عطا کرنے والا نہیں اور کسی دولت مند کو اس کی دولت تیرے عذاب سے نہیں بچا سکتی[2]۔

تبصرہ:

ہم اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اس روایت کی سند میں ایک راوی موسی بن عقبہ مدلس ہے اور عن کے ساتھ روایت کر رہے ہیں { طبقات المدلسین لابن حجر }۔اور

---

[1] نسائي باب في عمل اليوم والليلة 959

[2] نسائي 73/3 حديث 1345

خود مرحوم علی زئی صاحب { جزء رفع یدین ص: 25 } پر فرماتے ہیں کہ راوی کا مدلس ہونا ثابت ہو جائے اگرچہ ایک دفعہ ہی کیوں نہ ہو تو اس کا عنعنہ روایت ضعیف ہو گی۔ تو یہ روایت ان کے اپنے صول مطابق ٹھری۔

آپ ﷺ یہ دعا بھی فرمایا کرتے تھے:

رب اعنی ولا تعن علی وانصرنی ولا تنصر علی وامکر لی ولا تمکر علی . واھدنی ویسرلی الھدی وانصرنی علی من بغی علی رب اجعلنی لک مطواعا لک مخبتا الیک اواھا منیبا ، رب تقبل توبتی وغسل حوبتی واجب دعوتی وثبت حجتی وسدد لسانی واھد قلبی واسلل سخیمۃ صدری

اے میرے رب ! تو میری مدد کر اور میرے خلاف مدد نہ کر۔ مجھے غالب کر اور کسی کو مجھ پر غالب نہ کر۔ مجھے تدبیر بتا اور میرے دشمنوں کو میرے خلاف تدبیر نہ بتا۔ مجھے ہدایت دے۔ اور ہدایت میرے لئے آسان کر اور میرے اوپر ظلم کرنے والوں کے خلاف میری مدد کر۔ اے میرے رب ! مجھے اپنا شکر کرنے والا، اپنا ذکر کرنے والا، اپنے سے ڈرنے والا، اپنا حکم ماننے والا، اپنے سامنے گڑگڑانے والا اور اپنی طرف عاجزی سے رجوع کرنے والا بنا دے۔ اے میرے رب! میری توبہ قبول فرما اور میرے گناہ دھو ڈال، میری دعا قبل کر، میری دلیل ثابت رکھ، میری زبان سیدھی کر، میرے دل کو ہدایت سے نواز اور میرے سینے سے کینہ نکال دے[1] ۔

[1] ترمذي باب في دعاء النبي صلي الله عليه وسلم حديث 3551'3560 ابن ماجة باب دعاء رسول الله صلي الله عليه وسلم حديث 383

سلام کے بعد دعاء:

سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ! کون سی دعاء زیادہ سنی جاتی ہے؟ فرمایا کہ رات کے آخر حصہ میں کی جانے والی دعاء اور فرض نمازوں کے بعد مانگی جانے والی دعاء[1]۔

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے تو ہماری خواہش ہوتی کہ صف میں ہم آپ ﷺ کی دائیں جانب رہیں تاکہ (نماز سے فارغ ہونے کے بعد جب آپ صف کی طرف رخ کرکے بیٹھیں تو) آپ کا مکمل رخ مبارک ہماری طرف ہو، وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے آپ کو یہ دعاء مانگتے ہوئے سنا: ''رَبِّ قِنِي عَذَابَكَ يَوْمَ تَبْعَثُ أَوْ تَجْمَعُ عِبَادَكَ'' یعنی اے میرے رب! آپ مجھے اس دن کے عذاب سے بچا لیجئے جس دن آپ اپنے بندوں کو دوبارہ زندہ کریں گے یعنی قیامت کے دن[2]۔

"ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سلام پھیرنے کے بعد یہ دعاء پڑھنے کی مقدار بیٹھا کرتے:

اَللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ

اے اللہ! تو ہر عیب و نقص سے محفوظ و منزہ ہے اور سلامتی تیری طرف سے ہے تو برکت والا ہے، اے بزرگی اور برتری والے، تعظیم و اکرام والے۔

ابن نمیر کی روایت میں "یا" کے اضافہ کے ساتھ یاذا الجلال والاکرام ہے[3]"

---

[1] سنن الترمذي، كتاب الدعوات، باب 79، حديث: 3499، والسنن الكبرىٰ للامام النسائي 1553/3، كتاب عمل اليوم والليلة، باب ما يستحب من الدعاء دبر الصلوات المكتوبة، حديث: 9856

[2] صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب 8 استحباب يمين الامام، حديث: 709

[3] صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب 26 استحباب الذكر بعد الصلاة وبيان صفته، حديث: 592

"سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز سے فارغ ہوتے تو تین دفعہ کلمہ استغفار (استغفر اللہ) پڑھتے اور اس کے بعد کہتے[1]۔

اَللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ

"سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: اے معاذ! مجھے تجھ سے محبت ہے، میں نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں بھی آپ سے محبت کرتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو (اس محبت ہی کی بنا پر میں تجھ سے کہتا ہوں کہ) ہر نماز کے بعد اللہ تعالیٰ سے یہ دعا ضرور کیا کرو اور کبھی اسے نہ چھوڑو[2]: رَبِّ أَعِنِّي عَلَى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ

اے میرے رب! میری مدد فرما اور مجھے توفیق دے اپنے ذکر کی، اپنے شکر کی اور اپنی اچھی عبادت کی۔

"سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر فرض نماز کے بعد کہا کرتے تھے[3]:

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ.

اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ

---

[1] صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب 26 استحباب الذکر بعد الصلاۃ وبیان صفتہ، حدیث: 591
591

[2] سنن النسائي: 53/3، کتاب السہو، باب 60 نوع آخر من الدعاء، حدیث: 1303، سنن أبي داود: کتاب الوتر، باب 26 في الاستغفار، حدیث: 1522

[3] صحیح البخاري، کتاب الأذان، باب 155 الذکر بعد الصلاۃ، حدیث: 844، وأیضا کتاب الدعوات، باب 18 الدعاء بعد الصلاۃ، حدیث: 6330، وأیضا کتاب القدر، باب 12 لا مانع لما أعطى الله، حدیث: 6615، وأیضا کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب 3 ما یکرہ من کثرۃ السؤال، حدیث: 7292، وصحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب 26 استحباب الذکر بعد الصلاۃ وبیان صفتہ، حدیث: 593

چیز پر اس کی قدرت ہے، اے اللہ! جو کچھ تو کسی کو دیدے تو کوئی اس کو روک نہیں سکتا اور جس چیز کو نہ دینے کا تو فیصلہ کرے، کوئی اسے دے نہیں سکتا اور کسی کی عظمت و بڑائی اس کو تجھ سے مستغنی نہیں کر سکتی"۔

"کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ (نماز کے بعد) کچھ دعائیں ایسی ہیں کہ ہر نماز کے بعد انہیں پڑھنے والا (یا ان کا بجالانے والا) کبھی محروم نہیں ہوتا، وہ یہ ہے: 33 بار سبحان اللہ، 33 بار الحمد للہ، 34 بار اللہ اکبر کہنا[1] "

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو بندہ ہر نماز کے بعد 33 دفعہ سبحان اللہ، 33 دفعہ الحمد للہ اور 33 دفعہ اللہ اکبر کہے، یہ سب 99 کلمات ہو گئے اور اس کے بعد 100 کی گنتی پوری کرنے کے لئے ایک دفعہ[2]: " لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ. لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ کہے "تو اس کی سب خطائیں معاف کر دی جائیں گی اگرچہ وہ اپنی کثرت میں سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں۔

بعض روایتوں میں سلام پھیرنے کے بعد: "قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ" اور "قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" پڑھنے کی بھی تاکید آئی ہے:

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے مجھے ہر نماز کے بعد معوذتین (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) پڑھنے کا حکم دیا[3].

---

[1] صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب 26 استحباب الذكر وبيان صفته، حديث 596

[2] صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب 26 استحباب الذكر بعد الصلاة وبيان صفته، حديث: 597

[3] سنن الترمذي، كتاب فضائل القرآن، باب 12 ماجاء في المعوذتين، حديث: 2903، و سنن أبي داود، كتاب الوتر، باب 26 في الاستغفار، حديث: 1523، وسنن النسائي، كتاب السهو، باب 80 الأمر بقرأة المعوذات بعد التسليم من الصلاة، حديث: 1336، السنن الكبرىٰ للنسائي: 204/1، كتاب المساجد، الأمر بقرأة المعوذات بعد التسليم من الصلاة، حديث: 1260

اور بعض حدیث میں سلام کے بعد آیت الکرسی کے پڑھنے کی تلقین معلوم ہوتی ہے، چنانچہ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے:

سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ہر فرض نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھے تو اُسے موت کے علاوہ کوئی چیز جنت کے داخلہ سے نہیں روک سکتی[1]۔

سلام کے بعد ذکر ودعاء کے بارے میں جو حدیثیں اوپر ذکر مذکور ہوئیں ان سے یہ تو معلوم ہو چکا کہ نماز کے خاتمہ پر یعنی سلام کے بعد ذکر و دعاء رسول اللہ ا سے عملاً بھی ثابت ہے اور یہ جو ہمارے ملکوں میں رواج ہے کہ دعاء میں بھی مقتدی نماز ہی کی طرح امام کے پابند رہتے ہیں حتی کہ اگر کسی کو جلدی جانے کی ضرورت ہو تب بھی امام سے پہلے اس کا اٹھ جانا بُرا سمجھا جاتا ہے، یہ بالکل بے اصل ہے بلکہ قابل اصلاح ہے، امامت اور اقتداء کا رابطہ سلام کے پھیرنے پر ختم ہو جاتا ہے اس لئے سلام کے بعد دعاء میں امام کی اقتداء اور پابندی ضروری نہیں، چاہے تو مختصر دعاء کرکے امام سے پہلے اٹھ جائے اور چاہے تو اپنے ذوق اور کیف کے مطابق دیر تک دعاء کرتا رہے، البتہ اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ ماثور و منقول دعاؤں میں سنت سمجھ کر حذف واضافہ سے اجتناب کرے۔

اجتماعی دعاء:

اس سلسلہ میں اس عہد کے ممتاز عالم دین مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے اپنی کتاب " قاموس الفقہ " میں جو لکھا ہے وہ چشم کشا بھی ہے اور اعتدال پر مبنی بھی، چنانچہ ان کی یہ عبارت نقل کی جاتی ہے:

"تاہم دعاء کی یہ ہیئت کہ امام زور زور سے دعائیں پڑھتا جائے اور مقتدی اس پر "آمین" کہتے جائیں، خاص خاص مواقع کے علاوہ آپ ﷺ سے ثابت نہیں، اس سے دعاء کا انفرادی عمل "اجتماعی صورت" اختیار کرلیتا ہے، نہ دعاؤں کا اس درجہ اہتمام والتزام قرونِ خیر میں ثابت ہے جو فی زمانہ کیا جاتا ہے، اسی لئے بہت سے محقق اہل علم نے اس مروجہ طریقہ کو ناپسند کیا ہے، علامہ ابواسحٰق شاطبیؒ

[1] عمل اليوم والليلة للنسائي، ص: 49، ثواب من قرأ آية الكرسي دبر كل صلاة، حديث: 100

نے ایک سے زیادہ مقامات پر اس مسئلہ پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور اپنی تحقیق کا خلاصہ اس طرح ذکر کیا ہے: "حاصل یہ ہے کہ ہمیشہ اجتماعی طور پر دعاء کرنا نہ رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا، نہ آپ ﷺ کا قول اور نہ ایسا ہوا کہ آپ ﷺ کے سامنے ایسا کیا گیا ہو اور آپ ﷺ نے سکوت فرمایا ہو[1]"

حضرت علامہ مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ ماضی قریب کے ان علماء میں تھے جنہوں نے صحاح ستہ کی مشہور کتاب ترمذی کی عربی شرح لکھی، ان کا بیان ہے:

"بہت سے شہروں میں فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اُٹھا کر اجتماعی دُعاؤں کا رواج ہو گیا ہے، عہد نبوی ﷺ میں اس کا ثبوت نہیں ملتا، خاص کر مواظبت اور پابندی کے ساتھ، ہاں فرض نمازوں کے بعد بہت سی دُعائیں تواتر سے ثابت ہیں، لیکن بغیر ہاتھ اُٹھائے ہوئے اور انفرادی طریقہ پر نہ کہ اجتماعی[2]"

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں: "لیکن بحث و تحقیق کے بعد یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اگرچہ کبھی کبھی خصوصی مواقع پر نماز کے بعد دعاء کی گئی ہے، لیکن یہ آپ ﷺ کی یا صحابہ ؓ کی سنت مستمرہ نہیں تھی، اگر ایسا ہوتا تو ضرورت تھا کہ یہ بات تواتر کے ساتھ نقل کی گئی ہوتی[3]"

یہی رائے محدث کبیر علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی بھی تھی[4] فی زمانہ نمازوں کے بعد دعاؤں کا اہتمام والتزام اس درجہ ہے کہ بجائے خود یہ دعائیں نماز کا جزو بن گئی ہیں اور اگر کوئی امام کبھی دعاء نہ کرے تو اس کی خیر نہیں اور یہ اُصول اہل علم کے نزدیک مسلّمہ ہے کہ جو چیز واجب نہ ہو اس کو واجبات کا درجہ دے دینا اور اس کا اس درجہ اہتمام کرنا جو ثابت نہ ہو، اس کے بدعت ہونے کے لئے کافی ہے، پس ضرورت ہے کہ علماء وائمۂ مساجد اس پر توجہ دیں اور اس عمل کو اتنی تقویت نہ دیں کہ ان کا یہ فعل "بدعت" کے زمرہ میں داخل ہو جائے[5] ۔

---

[1] الاعتصام: 352/1

[2] معارف السنن: 409/3

[3] معارف السنن: 124/3

[4] حوالہ سابق: 124/3

[5] قاموس الفقہ: 3/414-415، دُعاء

فرض نماز کے بعد دعاء میں اونچی آواز:

بعض لوگ نماز باجماعت کے سلام پھیرنے کے بعد اونچی آواز سے اللہ اکبر اور استغفار پڑھتے ہیں، بعض لوگ اللھم انت السلام پڑھتے ہیں اور بعض اونچی آواز سے کلمہ طیبہ تین بار پڑھتے ہیں، یہ سب احادیث ہونے کے باوجود ہمیشہ کی سنت نہیں بلکہ ان اذکار کے آہستہ پڑھنے پر اجماع ہے۔

اس قسم کا سوال حضرت علامہ مولانا ابوالحسنات عبدالحیٔ لکھنوی نوراللہ مرقدہ کی خدمت میں بھی پیش ہوا تھا جس کا مفصل جواب مولانا مرحوم کے فتاویٰ میں منقول ہے، مختصراً کچھ یہاں بھی ذکر کیا جاتا ہے،

"نیز درمدخل بمقام دیگر نوشتہ؛ ولیحذرواجمیعا من الجھر بالذکر والدعاء عندالفراغ من الصلوۃ ان کان فی جماعۃ فانہ ذلک من البدع، انتھی وعلامہ بدرالدین العینی الحنفی دربنایہ شرح ھدایہ می نویسند ، قال ابوبکرالرازی قال مشایخنا التکبیر جھراً فی غیرایام التشریق والاضحیٰ لایسن الابازاء العدووالصوص وقیل وکذا فی الحریق والمخارف کلھا انتھی، وفی نصاب الاحتساب اذا کبرواعلی اثرالصلوٰہ جھراً یکرہ وانہ بدعۃ یعنی سوی الایام النحروالتشریق انتھی ۔ واللہ اعلم (ص ۲۳۳ ج ۴ مع الخلاصہ)

بعض لوگوں نے نماز کے بعد بلند آواز سے ذکر کرنے پر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے جس کو بخاری نے ان الفاظ سے روایت کیا ہے: ان رفع الصوت بالذکر حین ینصرف الناس من المکتوبۃ کان علیٰ عھد رسول اللہ ا وقال ابن عباس کنت اعلم اذا انصر فبذالک اذاسمعتہ۔ (ص۲۶۹ ج ۲، فتح الباری)

نماز فرض سے فراغت کے بعد بلند آواز سے ذکر کرنا رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں تھا، ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب میں ذکر کی آواز سنتا تھا اس وقت نماز کا ختم ہونا مجھے معلوم ہو جاتا تھا۔

فتح الباری میں اس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے: "علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو اس پر محمول کیا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک دوسرے کے ذکر کے الفاظ اور طریقہ سکھلانے کے واسطے کچھ دن جہر کیا ہے، ہمیشہ انہوں نے جہر نہیں کیا، اور مختار یہی ہے کہ ہمیشہ نماز کے اختتام کے بعد امام اور مقتدی آہستہ ذکر کریں، البتہ اگر تعلیم کی ضرورت ہو تو کبھی کبھی اونچی آواز سے ذکر یا دعاء کرانے میں مضائقہ نہیں"۔ (ص ۲۶۹ ج ۲)

علامہ عینیؒ عمدۃ القاری میں اس کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ابطالؒ فرماتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان ہے کہ حضور ا کے زمانہ میں ایسا ہوتا تھا اس بات کو بتلا رہا ہے کہ جس وقت ابن عباسؓ یہ حدیث بیان کر رہے ہیں اس وقت ایسا نہیں کیا جاتا تھا، ورنہ پھر اس قید کے کچھ معنی نہ ہوں گے، (تو اس سے امام شافعیؒ کے قول کی تائید ہوتی ہے کہ یہ جہر بالذکر لوگوں کی تعلیم کے لیے تھا، جب لوگوں نے دعاء اور ذکر کے الفاظ یاد کر لیے، پھر یہ جہر بھی متروک ہو گیا ۱۲) حاصل یہ ہے کہ نمازوں کے بعد تکبیر بالجہر پر حضور ﷺ نے مداومت نہیں فرمائی، اور صحابہؓ اس بات کو جانتے تھے کہ یہ جہر لازم تو ہے نہیں، تو انہوں نے اس اندیشہ کی وجہ سے اس کو ترک کر دیا کہ کوئی اس کو لازم نہ سمجھنے لگے اور یہ خیال نہ کرنے لگے کہ نماز اس کے بدون کامل ہی نہ ہو گی، اور اس اندیشہ کی وجہ سے فقہاء نے اس کو مکروہ سمجھا ہے، جس نے بھی مکروہ سمجھا ہے (کیونکہ مباح کے التزام و اہتمام سے ہمیشہ ایسے مفاسد مرتب ہونے لگتے ہیں کما ہو مشاہد)"۔ (ص ۱۹۴ ج ۱)

علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں ابن بطالؒ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے: ابن بطالؒ کہتے ہیں کہ وہ ائمہ جن کے مذاہب کا اتباع کیا جاتا ہے اور ان کے سوا دوسرے بھی اس پر متفق ہیں کہ تکبیر و ذکر کے ساتھ آواز کا بلند کرنا (نمازوں کے بعد) مستحب نہیں ہے، بجز ابن حزمؒ کے، فتح الباری میں یہ بھی مذکور ہے۔

طبری نے کہا ہے کہ حدیث ابن عباسؓ سے بعض امراء کے اس فعل کی صحت معلوم ہوتی ہے کہ وہ نماز کے بعد تکبیر (بلند آواز) سے کہا کرتے تھے، ابن بطال نے اس پر اعتراض کیا ہے، کہ

سلف میں سے کسی سے ہم کو یہ ثابت نہیں ہوا، بجز اس کے کہ ابن حبیب نے واضحہ میں نقل کیا ہے کہ لوگ لشکروں میں صبح اور عشاء کی نماز کے بعد تین مرتبہ بلند آواز سے تکبیر کہنے کو پسند کرتے تھے، ابن بطالؒ کہتے ہیں کہ عتبیہ میں مالک کا قول (اس کی نسبت) نقل کیا ہے کہ یہ طریقہ محدث ہے (نوایجاد ہے) (ص۲۶۹ج۲) اور عینی میں عبیدہ سے منقول ہے کہ یہ طریقہ بدعت ہے۔ (ص۱۹۴ج)

الغرض اس حدیث سے استدلال کرنا موجودہ تکبیر پر صحیح نہیں، کیونکہ تمام علماء مذاہب نے اس حدیث میں خود تاویل کی ہے، اور جن لوگوں نے لشکروں میں نماز صبح وعشاء کے بعد تین بار تکبیر کہنے کا رواج جاری کیا تھا، امام مالکؒ وغیرہ نے اس کے بدعت ہونے کی تصریح کی ہے،

امام شافعیؒ نے اس جہر بالذکر کو اس پر محمول کیا ہے کہ وہ اس لیے تھا کہ مقتدی سیکھ لیں کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ صلوٰۃ میں نہ جہر کرو، نہ بہت آہستگی کرو اور یہ آیت دعاء (وذکر) ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جیساکہ صحیحین میں ثابت ہے، بیہقی وغیرہ نے دعاء وذکر میں اخفاء کے مطلوب ہونے پر صحیحین کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں اس کی تصریح ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہ کو اس طریقہ سے منع فرمایا تھا، جو انہوں نے تہلیل و تکبیر بلند آواز سے کرنے میں اختیار کر رکھا تھا، اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکارتے ہو (جس کو تم پکارتے ہو) وہ تمہارے ساتھ ہے وہ سننے والا اور بہت نزدیک ہے اھ، استدلال کا حاصل یہ ہوا کہ ابن عباسؓ کی حدیث نص قرآنی کے خلاف وارد ہوئی ہے، اس لیے اس میں تاویل کرنا ضروری ہے، (کیونکہ نص میں دعاء وذکر بلند آواز سے کرنے کی ممانعت صریح ہے)۔ (ص۸۱ج۲)

علاوہ ازیں خود صحیحین میں دوسری حدیث میں ابن عباسؓ کی حدیث کے لیے ناسخ موجود ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ ذکر اور تکبیر میں آواز بلند کرتے تھے، اور حضور ﷺ نے ان کو اس سے منع فرمایا، پس صورت موجودہ پر حدیث ابن عباسؓ سے استدلال ہر گز صحیح نہیں، رہا قائل کا یہ کہنا کہ تکبیر اور خدا کا ذکر بدعت نہیں ہو سکتا، اس کا جواب یہ ہے کہ مذہب کی عبارات دیکھ لو وہ اس صورت سے ذکر کو بدعت ہی فرما رہے ہیں تو کیا تم کو ان پر بھی اعتراض ہے، دوسرے ہر شخص سمجھ

سکتا ہے کہ جو لوگ اس کو بدعت کہتے ہیں، وہ ذکر اور تکبیر کو بدعت نہیں کہتے بلکہ اس جہر اور اجتماع اور التزام واہتمام کو بدعت کہتے ہیں، اگر بطور خود کسی وقت میں اتفاقیہ کوئی شخص زور سے تکبیر کہہ دے اس کو کون حرام کہتا ہے، لیکن نمازوں کے بعد خاص طور پر جہر کے ساتھ نمازیوں کا مل کر تکبیر کے نعرے لگانا یہ صورت ضرور بدعت ہے۔ (امداد الاحکام)

دعاء کے لئے ہاتھ اٹھانا:

حضرت محمد بن ابی یحیٰ کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن زبیر نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز مکمل کرنے سے پہلے ہی ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہا ہے، جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو حضرت عبد اللہؓ نے فرمایا کہ رسول للہ ﷺ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ آپ نماز سے فارغ ہو کر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے تھے ،اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ (مجمع الزوائد، ج: 10/ص: 169)

حضرت سلمانؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب بھی کچھ لوگ اجتماعی طور پر اللہ تعالیٰ کے حضور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ضرور ان کے ہاتھوں میں وہ چیز ڈال دیتے ہیں جو انہوں نے مانگی ہے۔ (مجمع الزوائد، ج: 10/ص: 169)

حضرت ابو امامہؓ سے منقول ہے کہ آنحضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ رات کے آخری حصہ کی دعا اور فرض نمازوں کے بعد کی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔ (ترمذی، کتاب الدعوات، حسن)

پہلی حدیث سے معلوم ہوا کہ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا قبولیت کے زیادہ قریب ہے، دوسری حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے تھے، تیسری حدیث سے معلوم ہوا کہ اجتماعی دعا قبولیت کے زیادہ قریب ہے، چوتھی حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز کے بعد قبولیت دعا کا وقت ہے اسے ضائع نہ کرنا چاہیئے۔

نماز کے بعد قدوسی دعاء مانگئے:

نماز کے آخری قعدے میں درود شریف کے بعد مسنون دعاؤں کا ذکر احادیث میں موجود ہے خصوصاً یہ دعا:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْیَا وَالْمَمَاتِ، اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْمَأْثَمِ وَالْمَغْرَمِ [1]

اے اللہ! میں عذاب قبر سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور دجال کے فتنے سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور موت وحیات کے فتنے سے تیری پناہ مانگتا ہوں، اے اللہ! میں گناہ (اور ہر قسم کی زیادتی) اور قرض سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

اس دعاء کے بارے میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

رسول اکرم ﷺ صحابہ کرام ؓ کو یہ دعا ایسے سکھاتے تھے جیسے قرآن پاک کی کوئی سورت سکھاتے ہیں [2] "۔

اس حدیث کے بعد امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے مشہور تابعی طاوس رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے ایک بار اپنے بیٹے سے پوچھا کہ تم نے اپنی نماز میں یہ دعاء پڑھی ہے؟ بیٹے نے نفی میں جواب دیا تو انہوں نے اپنے بیٹے سے فرمایا: اَعِدْ صَلَاتَکَ۔ " تم اپنی نماز کو دہراؤ"۔

یہ تو نماز میں پڑھی جانے والی دعا کا تذکرہ تھا لیکن نماز سے فارغ ہونے کے بعد فرض نماز کے فوراً بعد خاموشی سے اپنی اپنی دعا مانگنا بھی مشروع و مسنون ہے، بلکہ خود باری تعالیٰ نے اپنے حبیب اکو نماز سے فارغ ہونے کے بعد دعا کرنے کا حکم دیا ہے جیسا کہ آگے اس کا تذکرہ آرہا ہے۔ امام البخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح البخاری میں، کتاب الدعوات میں باب: 18 میں "بَابُ الدُّعَاءِ بَعْدَ الصَّلَاةِ" نماز

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب 149 الدعاء قبل السلام ،حديث :832، وصحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب 25 ما يستعاذ منه في الصلاة، حديث:589

[2] صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب 25 ما يستعاذ منه في الصلاة، حديث:590

کے بعد دعاء کرنے کا بیان "کے نام سے ایک عنوان قائم کیا ہے، امام ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں اس موقع پر لکھا ہے:

اس عنوان کے قائم کرنے کا مقصد ان لوگوں پر رد کرنا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ نماز کے بعد دعا مانگنا شریعت سے ثابت نہیں ہے[1] "۔

امام الترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ابو امامہ الباہلی سے ایک روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے:

پوچھا گیا، اے اللہ کے رسول! (ا) کونسی دعاء سب سے زیادہ سُنی جاتی ہے؟ تو ارشاد فرمایا، رات کے آخری حصے میں اور فرض نمازوں کے بعد[2] ۔

مندرجہ ذیل حدیث مبارک ایک طویل حدیث ہے اور اس میں ایک مقام پر یہ الفاظ ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کریم ﷺ سے فرمایا ہے:

اے محمد! (ا) جب تم نماز سے فارغ ہو جاؤ تو یہ کہو (یعنی فرض نماز کے فوراً بعد یہ دعا پڑھو) کہ:
اے اللہ! میں تجھ سے ہر خیر کا سوال کرتا ہوں، اور ہر برائی کے چھوڑنے کی توفیق طلب کرتا ہوں، اور مساکین سے محبت کا سوال کرتا ہوں، اور یہ کہ تو میری مغفرت فرمادے، اور تو مجھ پر رحم فرما، اور تو میری توبہ کو قبول فرما، اور تو جب اپنے بندوں کے بارے میں فتنے کا فیصلہ فرمالے تو مجھے فتنے میں مبتلا کرنے سے قبل ہی اپنے پاس بلالے[3] "۔

---

[1] فتح الباری: 11/133، باب: 18، حدیث: 6330 کے تحت

[2] سنن الترمذي، كتاب الدعوات، باب 79 ، حديث : 3499، والسنن الكبرىٰ للامام النسائي: 1553/3، كتاب عمل اليوم والليلة، باب ما يستحب من الدعاء دبر الصلوات المكتوبة، حديث: 9856

[3] صحيح الجامع الصغير: 73/1، حديث: 59، فقال البخاري، هذا حديث حسن صحيح اخرجه بلفظه 423/36 برقم 22/9

اس حدیث کی شرح میں امام ملا علی قاری حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: "امام ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد یہ دعا پڑھی جائے[1] "۔

ان دونوں صحیح احادیث سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ فرض نمازوں کے بعد دعا مانگنا ثابت و مسنون ہے بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اس نے اپنے رسول کریم اکو خود یہ حکم دیا ہے کہ جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو دعا مانگو۔ امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ الم نشرح کی تفسیر کرتے ہوئے اس آیت: ''فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ'' کی تفسیر میں لکھا ہے: "سید نا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور سید نا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ جب تم نماز سے فارغ ہو جاؤ اور تم اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے ہو تو دعا مانگو[2] "۔

امام القرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے "فاذا فرغت" کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ یعنی جب تم نماز سے فارغ ہو جاؤ تو "فَانْصَبْ" یعنی خوب دعائیں مانگو[3] "۔

امام البغوی المتوفی 516ھ، جن کی تفسیر کو امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے مستند تفسیر قرار دیا ہے، انہوں نے اپنی تفسیر میں سورۂ الم نشرح کی ان آخری دو آیات کی تفسیر میں لکھا ہے: "ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ، ضحاک، مقاتل اور کلبی وغیرہم رحمہم اللہ، ان سب کا قول ہے کہ جب فرض نماز سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے رب کی طرف رجوع کر کے دعا مانگو اور خوب رغبت سے مانگو، وہ ضرور عطا فرمائے گا[4] "

---

[1] المرقاۃ شرح المشکاۃ: 610/2، کتاب الصلاۃ، باب 7 المساجد ومواضع الصلاۃ، الفصل الثانی، حدیث: 726 کے تحت

[2] تفسیر ابن کثیر، سورۃ الانشراح

[3] تفسیر القرطبي: 108/20، سورۃ الانشراح

[4] معالم التنزیل للبغوي، سورۃ الانشراح

فرض نمازوں کے بعد دعا کرنے کے بارے میں (یا عموماً اپنی کسی بھی نماز، خواہ وہ نفل ہو، نماز کے بعد دعا کرنے میں) کئی دوسری احادیث بھی موجود ہیں مثلاً سیدنا عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما کے بارے میں ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ دورانِ نماز اپنے ہاتھوں کو بلند کرکے دعا مانگ رہا ہے تو ارشاد فرمایا کہ، رسول کریم ﷺ تو اپنے ہاتھوں کو بلند کرکے دعا نہیں فرمایا کرتے تھے جب تک نماز سے فارغ نہیں ہو جاتے تھے[1] (یعنی رسول کریم ﷺ نماز سے فارغ ہو کر دونوں ہاتھ بلند کرکے دعا فرمایا کرتے تھے)۔

نماز کے فوراً بعد دعا کرنے (یعنی انفرادی طریقے پر دعا کرنے) کے بارے میں ایک اور حدیث امام الترمذی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہما نے بھی نقل کی ہے: "رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نماز دو رکعت ہے، ہر دو رکعت کے بعد تشہد ہے، نماز کو مکمل خشوع، خضوع اور عاجزی سے ادا کرو، پھر (نماز سے فارغ ہو کر) اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے رب کی بارگاہ میں بلند کرو کہ ہتھیلیاں تمہارے چہرے کی طرف ہوں، اور تم کہو: اے میرے رب، اے میرے رب، جو شخص اس طرح نہ کرے وہ ایسا ہے اور ایسا ہے، یعنی ایسا نہ کرنے والے کے لیے شدید وعید ہے[2] "۔ (علامہ احمد شاکر نے مسند امام احمد کی تحقیق میں اس حدیث کو صحیح کے قریب قرار دیا ہے)

مشہور محدث عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ نے سنن الترمذی کی شرح تحفۃ الاحوذی میں فرض نمازوں کے بعد دعا کرنے کے بارے میں کئی اہم احادیث کو نقل کیا ہے اور آخر میں اپنی رائے لکھی ہے: "میں کہتا ہوں کہ میرے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے، اگر کوئی یہ عمل کرے تو ان شاء اللہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے[3] "۔

---

[1] مجمع الزوائد: 266/10، کتاب الأدعیة، باب 30 ماجاء فی الاشارة فی الدعاء ورفع الیدین، حدیث 17345.

[2] سنن الترمذي، کتاب الصلاة، باب 283 ماجاء في التخشع في الصلاة، حديث :385، مسند الإمام أحمد 229/3 ، حديث: 17.9 ،تحقیق علامہ احمد شاکر، والسنن الکبریٰ للامام النسائي: 100/1، کتاب السہو، نقصان الصلاة، حديث: 618، وایضا 235/1، کتاب قیام اللیل وتطوع النہار، کیف الرفع، حدیث: 1444

[3] تحفة الاحوذي :202/2، کتاب الصلاة، باب 222 ما یقول اذا سلم، حدیث 299 کے تحت

یہ تمام اقوال تو فرض نمازوں کے فوراً بعد دعا مانگنے سے متعلق تھے کہ فرض نمازوں کے بعد مانگنا مسنون ہے لیکن دعا مانگتے ہوئے دونوں ہاتھوں کو بلند کرنا، کیا یہ عمل بھی مسنون ہے؟ اس سوال کا جواب بھی صحیح احادیث سے ثابت ہے، امام الحافظ جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ (التوفی 911 ھ) نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ: "فَضُّ الْوِعَاءِ فِيْ أَحَادِيْثِ رَفْعِ الْيَدَيْنِ فِي الدُّعَاءِ" کے نام سے لکھا ہے، اس رسالہ میں 40 سے زیادہ احادیث سے ثابت کیا ہے کہ دعا میں ہاتھوں کا بلند کرنا مسنون عمل ہے، رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ بہت زیادہ حیا والے اور کرم فرمانے والے ہیں، اللہ کو اس بات سے حیا آتی ہے کہ بندہ اس کی بارگاہ میں دونوں ہاتھ بلند کرے اور اللہ تعالیٰ ان ہاتھوں کو خالی واپس لوٹا دے[1] "

ان تمام روایات واقوال سے فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر انفرادی طور پر سری خاموشی سے اپنی اپنی دعا کرنا ثابت ہو گیا ہے لہٰذا ہر مسلمان کو اس دعا کا خصوصی اہتمام کرنا چاہیے، لیکن ایک اہم تنبیہ یاد رکھیں کہ یہ دعا انفرادی طور پر کرنی چاہئے۔ فرض نمازوں کے بعد نمازی انفرادی طور پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ سکتا ہے، لیکن امام اور مقتدیوں کا مل کر اجتماعی طریقے پر دعا مانگنا جیسا کہ ہمارے ملکوں میں عام رواج ہے، یہ غیر مسنون عمل ہے اور اسے لازم قرار دینا یا اسے مستحب سمجھنا بدعت ہے، مشہور مفتی جناب مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ: "رسول کریم روزانہ پانچ بار علانیہ باجماعت نماز ادا فرماتے تھے اگر آپ نے نماز کے بعد کبھی اجتماعی دعا فرمائی ہوتی تو اس کو کوئی تنفس تو نقل کرتا، مگر ذخیرۂ حدیث میں اس کا کہیں نشان نہیں ملتا، اگر اس کا استحباب تسلیم بھی کر لیا جائے تو التزام بہر صورت بدعت ہے[2] "۔

---

[1] سنن الترمذي، كتاب الدعوات، باب 105 ، حديث: 3556 ، سنن أبي داود، كتاب الوتر، باب 23 الدعاء، حديث: 1488، وسنن ابن ماجة، كتاب الدعاء، باب 13 رفع اليدين في الدعاء، حديث: 3865، وصحيح ابن حبان، باب 9 الأدعية، ذكر الاخبار عما يستحب للمرء عند ارادة الدعاء رفع اليدين، حديث: 876، وصحيح الجامع الصغير للألباني، حديث: 1757

[2] احسن الفتاوی: 68/3

ہم نے اس دعا کو قدّوسی دعا اسی لئے کہا ہے کہ یہ دعا اللہ تعالیٰ نے خود جنابِ رسول کریم ا کو سکھا ئی ہے گویا کہ اس دعا میں تقدیس و عظمت کا پہلو موجود ہے، دعا کے معنٰی و مفہوم پر خوب اچھی طرح سے غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے کس قدر جامع الفاظ والی دعا سکھائی ہے اس کے ذریعہ دنیا وآخرت کی ہر خیر طلب کی جارہی ہے اور ہر شر سے پناہ مانگی جارہی ہے، مساکین سے محبت کرنے والا جملہ بتارہا ہے کہ ہمیں مساکین وفقراء کی نہ صرف مدد وخدمت کرنی چاہیے بلکہ ان سے قلبی تعلق و محبت بھی رکھنی چاہیے، اس دعا میں اللہ تعالیٰ سے رحمت و مغفرت بھی طلب کی گئی ہے اور توبہ کرنے کی توفیق کا سوال بھی ہے، ساتھ ہی ساتھ یہ دعا بھی ہے کہ ہم کمزوروں کی توبہ قبول کرلی جائے، آخری جملہ نہایت ہی اہم جملہ ہے کہ عام فتنوں کے زمانے میں بچاؤ کی درخواست اور ایمان پر خاتمہ کی دعا بھی ہے کہ اے اللہ ! جب فتنے عام ہو جائیں تو ہمیں ان فتنوں میں مبتلا کیے بغیر تو اپنے پاس بلالے۔

نماز کی سنتوں کا بیان

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

موکدہ سنتیں اور ان کی فضیلت

سیدہ ام حبیبہ ؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

جو شخص دن اور رات میں فرضوں کے علاوہ بارہ رکعتیں پڑھے، اس کے لئے بہشت میں گھر بنایا جاتا ہے۔ان بارہ رکعتوں کی تفصیل یہ ہے: چار رکعت ظہر سے پہلے، دو رکعت اس کے بعد دو رکعت عشاء کے بعد اور دو رکعت نماز فجر سے پہلے[1]۔

تبصرہ:

ہم غیر مقلد احباب کی پیش کردہ مستدل روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اس روایت کی سند ایک راوی مؤمل بن اسماعیل ہیں جس کو ان حضرات کے کبار ائمہ شیخ ناصر الدین البانی

---

[1] ترمذی باب ماجاء فی صلی فی یوم ولیلة اثنی عشرة رکعة من السنة حدیث 415

اور علامہ مبارک پوری دونوں نے ضعیف کہاہے { ابکار المنن } ۔اس روایت کی سند میں دوسرے راوی سفیان ثوری ہیں جس کو مرحوم علی زئی صاحب کئی مقامات پر مدلس کہہ چکے ہیں لیکن اب سفیان ثوری کی تدلیس قابل استدلال کیسے بنی؟۔

﴿ غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں: ﴾

سیدنا ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ظہر سے پہلے دو رکعتیں سنت پڑھیں[1]۔

معلوم ہوا کہ ظہر سے پہلے چار کی بجائے دو رکعتیں پڑھنا بھی درست ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رات اور دن کی نفل نماز دو دو رکعت ہیں[2]۔

معلوم ہوا کہ چار رکعات سنت بھی دو دو کرکے ادا کرنا زیادہ فضیلت کا باعث ہے۔

تبصرہ:

ہم تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اس روایت میں ایک راوی شعبہ ہے جس کو ان حضرات نے { تسہیل الوصول ص:159 } پر وہم اور خطاکے مریض ٹھرا چکے ہیں۔ نیز صفحہ 163 پر بھی کہتے ہیں کہ " یہ امام شعبہ کے وہم کی وجہ سے ضعیف ہے۔

رسول اللہ ﷺ سنتیں گھر میں پڑھتے تھے:

عبد اللہ بن شقیقؒ روایت کرتے ہیں کہ میں نے سیدہ عائشہؓ سے رسول اللہ ﷺ کے نفلوں کا حال دریافت کیا تو سیدہ عائشہؓ نے کہا: رسول اللہ ﷺ میرے گھر میں ظہر سے پہلے چار رکعتیں پڑھتے تھے۔ پھر آپ نکلتے اور لوگوں کے ساتھ (ظہر کے) فرض پڑھتے، پھر گھر میں داخل ہوتے اور دو رکعتیں نماز پڑھتے۔آپ لوگوں کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھتے، پھر گھر میں داخل ہوتے اور دو رکعت سنت پڑھتے، پھر آپ ﷺ لوگوں کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھتے، پھر گھر میں داخل ہوتے اور

---

[1] بخاری باب التطوع بعد المکتوبة حدیث 1172'1180

[2] بوداؤد باب صلاۃ النہار حدیث 1195

دو رکعتیں نماز پڑھتے اور رات کو آپ ﷺ نو رکعات تہجد کی نماز پڑھتے ، ان میں وتر بھی ہوتا تھا اور جب صبح نمودار ہوتی تو نماز فجر سے پہلے دو رکعتیں سنت پڑھتے [1] ۔

غیر موکدہ سنتیں:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص عصر سے پہلے چار رکعات سنت پڑھے ، اللہ اس پر رحمت کرے [2] ۔

مغرب سے پہلے دو رکعتیں:

رسول اللہ ﷺ نے دو مرتبہ فرمایا: مغرب سے پہلے دو رکعتیں ادا کرو۔ تیسری بار فرمایا: جس کا دل چاہے یہ اس لئے فرمایا کہ کہیں لوگ اسے سنت موکدہ نہ بنالیں [3] ۔

سیدنا انسؓ سے روایت ہے کہ جب مدینے میں موذن مغرب کی اذان کہتا تو لوگ ستونوں کی طرف دوڑتے اور دو رکعتیں پڑھتے ۔لوگ اس کثرت سے دو رکعتیں پڑھتے کہ مسجد میں داخل ہونے والا اجنبی یہ گمان کرتا کہ مغرب کی جماعت ہو چکی ہے [4] ۔

مرثد بن عبد اللہؒ سیدنا عقبہؓ کے پاس آئے اور کہا؛ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ سیدنا ابو تمیمؒ مغرب کی نماز سے پہلے دو رکعت پڑھتے ہیں؟ عقبہؓ نے کہا کہ ہم بھی رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں پڑھتے تھے۔اس نے پوچھا: اب کیوں نہیں پڑھتے؟ کہنے لگے کہ مصروفیت ہے [5] ۔

---

[1] مسلم باب جواز النافلة قائما وقاعدا....حدیث730

[2] ترمذی باب ماجاء في الاربع قبل العصر حدیث430

[3] بخاری باب الصلاۃ قبل المغرب حدیث1183

[4] مسلم باب استحباب رکعتین قبل صلاۃ المغرب حدیث837

[5] بخاری باب الصلاۃ قبل المغرب حدیث 1184

جمعے کے بعد کی سنتیں

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی جمعے کے بعد نماز پڑھنے لگے تو چار رکعات ادا کرے[1] ۔

معلوم ہوا کہ جمعے کے بعد چار رکعات سنتیں پڑھنی چاہیں اور اگر کوئی دو رکعتیں بھی پڑھ لے تو جائز ہوگا۔

سیدنا ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جمعے کے بعد کچھ نماز نہیں پڑھتے تھے یہاں تک کہ اپنے گھر آتے اور دو رکعتیں پڑھتے[2] ۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز جمعہ کے بعد دو رکعت سنت پڑھنا بھی درست ہے جبکہ چار رکعت پڑھنا قولی حدیث کی وجہ سے زیادہ بہتر اور مزید فضیلت کا باعث ہے ۔

فجر کی سنتوں کی فضیلت:

سیدہ عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فجر کی دو سنتیں دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے، اس سے بہتر ہیں[3] ۔

سیدہ عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نوافل سنن میں سے کسی چیز پر اتنی محافظت اور مداومت نہیں کرتے تھے جس قدر فجر کی دو سنتوں پر کرتے تھے[4] ۔

رسول اللہ ﷺ جب فجر کی دو سنتیں پڑھتے تو دائیں پہلو پر لیٹتے تھے[5] ۔

---

[1] مسلم باب الصلاۃ بعد الجمعۃ حدیث 881

[2] بخاری باب الصلاۃ بعد الجمعۃ وقبلھا حدیث 937'1165'1172'1180

[3] مسلم باب استحباب رکعتي سنۃ الفجر حدیث 725

[4] بخاری باب تعاھد رکعتي الفجر حدیث 1169 مسلم استحباب رکعي سنۃ الفجر حدیث 724

[5] بخاری باب من انتظر الاقامۃ حدیث 994'1123'1160'1170

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

فجر کی سنتیں فرضوں کے بعد پڑھ سکتے ہیں :

اگر آپ ایسے وقت میں مسجد میں پہنچیں کہ جماعت کھڑی ہو گئی ہو اور آپ نے سنتیں نہیں پڑھی ہوں تو اس وقت سنتیں نہیں پڑھیں کیونکہ رسواللہ ﷺ نے فرمایا جب نماز کی اقامت { تکبیر } ہو جائے تو فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں ہوتی[1] ۔

ایسی صورت میں آپ جماعت میں شامل ہو جائیں اور فرض پڑھ کر سنتیں پڑھ لیں ۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو صبح کی فرض نماز کے بعد دو رکعتیں پڑھتے ہوئے دیکھ کر فرمایا: صبح کی { فرض } نماز دو رکعتیں ہیں تم نے مزید دو رکعتیں کیسی پڑھی ہیں ؟ اس شخص نے جواب دیا میں نے دو رکعتیں سنت { جو فرضوں سے پہلے ہیں } نہیں پڑھی تھیں ان کو اب پڑھا ہے۔ { یہ سن کر } رسول اللہ ﷺ خاموش ہو گئے[2] ۔

اور آپ ﷺ کی خاموشی رضامندی کی دلیل ہے { محدثین کی اصطلاح میں یہ تقریر حدیث کہلاتی ہے } ۔

تبصرہ:

قارئین کرام ! فجر کی فرض نماز کی متصل بعد دو رکعت سنت کی قضا والی روایت صرف دو طریقوں سے مروی ہے ۔ ان میں سے ایک طریقہ ضعیف ہے جس میں ایک راوی سعد ہے ۔ جس کے بارے میں ابن ترکمانی فرماتے ہیں کہ اس کو احمد بن حنبل ، ابن معین ، نسائی ، ابن حبان ، اور امام ترمذی نے ضعیف کہا ہے { حاشیہ بیہقی } ۔ نیز امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس رویت کی سند بھی

---

[1] مسلم باب كراهة الشروع في نافلة بعد شروع المؤذن في اقامة الصلاة حديث 710

[2] دار قطنی 384'383/1 بیہقی 283/2 ، اخرجه ابن حزم في المحلي، وقال العراقي اسناده حسن، (آثار السنن، ص: 269)

متصل نہیں کہ ابراہیم التیمی کا سماع قیس سے ثابت نہیں۔اب اس روایت کی ایک ہی سند محفوظ ہے۔ لیکن وہ اس قابل نہیں کہ بخاری و مسلم کی روایات کا مقابلہ کر سکے کیونکہ وہ معنا متواتر ہیں۔

ایک شخص مسجد میں آیا رسول اللہ ﷺ صبح کی فرض پڑھ رہے تھے۔اس نے مسجد کے ایک کونے میں دو رکعت سنت پڑھیں۔ پھر جماعت میں شامل ہو گیا۔جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا تو فرمایا: تو نے فرض نماز کس کو شمار کیا جو اکیلے پڑھی تھی اس کو یا جو ہمارے ساتھ جماعت سے پڑھی ہے[1]۔

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

فجر کی سنتوں کا حکم:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب فرض نماز (کی جماعت) کھڑی ہو جائے تو اس فرض نماز کے سوا اور نماز (پاس میں) نہیں ہوتی[2]۔

تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ ظہر، عصر، مغرب، عشاء کی سنتیں بوقت اقامت جماعت نہ پڑھیں کیونکہ سنتیں بعد فرائض کے وقت میں بھی پڑھیں جا سکتی ہیں ہاں فجر کی سنتیں جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین کے نزدیک دو شرطوں سے پڑھی جا سکتی ہیں

1۔ خارج مسجد ہو یا جماعت اور مصلی کے درمیان کوئی چیز حائل ہو۔

2۔ ایک رکعت امام کے ساتھ مل جانے کا غالبا گمان ہو۔

احادیث کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ فجر کی نماز کی سنتوں کی تاکید باقی سنتوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے[3]۔ نماز فجر کے بعد نوافل پڑھنا منع ہے[1]۔تو اگر یہ سنتیں پہلے نہ پڑھی جائیں تو وقت

---

[1] مسلم باب کراهة الشروع في نافلة حديث 712

[2] صحيح مسلم

[3] آثار السنن ج 2 ص 27،28

پڑھنے کا موقع ہی نہ رہا اس لیے محدثین نے دلائل میں تطبیق کی ایسی کوشش کی کہ تطبیق بھی ہو جائے اور تمام فضیلتیں بھی حاصل ہو جائیں۔

روایات :

1 : حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے بسند صحیح یہ روایت مروی ہے کہ :
فجر کی سنتیں ہر گز نہ چھوڑو اگرچہ تمہیں گھوڑے (میدان جنگ میں) روند ڈالیں[2]۔

2 : حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالی عنہما مسجد سے باہر سنتیں پڑھ لیتے تھے اور مسجد میں آکر جماعت میں مل جاتے تھے[3]۔

اور جو احادیث منع والی ہیں ان میں عہد نبوت میں سنتیں پڑھنے کا عام ذکر ملتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف ساتھ مل کر پڑھنے سے منع فرماتے تھے۔ ایک بھی حدیث موجود نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی اوٹ (کمرے وغیرہ) میں پڑھنے والے کو منع کیا ہو جو جماعت کا ثواب بھی پالے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہے کہ : رسول اللہ ﷺ کسی نفل کی اتنی زیادہ پابندی اور حفاظت نہیں کرتے تھے، جتنی فجر کی دو رکعتوں کی[4]۔ (متفق علیہ)

سنت فجر کی اہمیت کا پتہ اس بات سے بھی چلتا ہے کہ قضاء نمازوں کے پڑھتے وقت سنتوں کی قضاء نہیں ہوتی بلکہ صرف فرائض وواجبات کی قضاء ہوتی ہے۔ مگر حضور ﷺ نے لیلۃ التعریس میں نماز

---

[1] آثار السنن ج 2 ص 27، 28

[2] آثار السنن ج 1 ص 29، ورواہ احمد وابو داؤد واسنادہ صحیح (آثار السنن، ص: 259)

[3] آثار السنن ج 2 ص 228، ورواہ الطحاوی واسنادہ حسن (آثار السنن، ج: 2/ ص: 32)

[4] نیل الاوطار ج 2 ص 263، واخرجه البخاري و مسلم عن عائشة، اخرجاه عن عبيد بن عمير عنها واخرج البخاري (نصب الرایۃ، 161/2)

فجر کی قضاء پڑھتے وقت سنت کی بھی قضا کی[1]۔ اس کے علاوہ حضور ﷺ کو اس سنت کے پڑھنے کی جتنی جلدی ہوتی تھی کسی اور سنت کی اتنی جلدی نہیں ہوتی تھی[2]۔

اخرج احمد فی مسنده حدثنا أبو سعيد، وحسين بن محمد، قالا: حدثنا إسرائيل، عن أبي إسحاق، عن الحارث، عن علي، قال: " كان رسول الله صلى الله عليه وسلم: يصلي ركعتي الفجر عند الإقامة[3]"

و اخرج ابن ماجة فی باب ما جاء فی ركعتين قبل الفجر من طريق شريك عن أبي إسحاق عن الحارث عن علي قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم يصلي الركعتين عند الإقامة[4].

معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے عمل سے سنت فجر پڑھ کر نمونہ پیش فرما دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم حضور ﷺ کے زمانے میں پڑھتے تھے۔ آپ ﷺ صرف ساتھ مل کر پڑھنے سے روکتے تھے۔ اور خلافت راشدہ اور خیر القرون میں بلا نکیر اس پر عمل جاری تھا۔

غور کرنے کی بات ہے ایک طرف اوپر والی حدیث ہے جس میں کہا گیا کہ جب اقامت کہہ دی جائے تو فرض نماز کے سوا کوئی اور نماز جائز نہیں، دوسری طرف یہ احادیث ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ فجر کی سنت کو ہر حال میں پڑھنا ہے خواہ مصلی پر کچھ بھی گزر جائے۔ لہٰذا جمعا بین الاحادیث دوسرے سنتوں کے برخلاف سنت فجر کے لئے اتنی گنجائش دی گئی کہ جب تک جماعت کی فضیلت مل جانے کی

---

[1] مسلم ج: 1 /228، ابوداؤد ج: 1 / ص: 79، صحیح ابن خزیمہ ج: 2 / ص: 100

[2] مسلم ج: 1 / ص: 251 روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

[3] ج 1 ص 77

[4] ص 8 حارث الاعور میزان الاعتدال ج 1 ص 435) ترمذی کتاب الزکوۃ باب ما جاء فی زکوۃ الذھب و الورق ج 1 ص113

امید ہو اس سنت کو ترک نہ کرے اور صحیح وقت ہی میں اسے ادا کرے (یعنی فرض سے پہلے) لیکن اگر یہ خطرہ ہو کہ سنت میں مشغول ہونے پر جماعت کا ثواب ہی چلا جائے گا تو مجبوراً اسے مؤخر کرے۔ جماعت میں شریک ہو اور سورج نکلنے کے بعد اس کی قضا کرے (جماعت کے فوری بعد نہیں پڑھ سکتا کیونکہ فجر کے بعد سے طلوع آفتاب تک کسی نفل وغیرہ کے پڑھنے کی اجازت نہیں ہے جیسا کے اوقات ممنوعہ کے تفصیل میں گزرا)۔

صحابہ کرامؓ کا طرز عمل:

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین کے طرز عمل سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ فجر کی جماعت کھڑی ہو جانے کے باوجود سنت فجر پڑھی جا سکتی ہے۔ البتہ جماعت کی صفوں سے الگ ہو کر کسی گوشے وغیرہ میں پڑھی جائے۔

حضرت مالک بن مغول رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے نافع کو کہتے ہوئے سنا کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عمر کو نماز فجر کے لئے جگایا اور نماز کی اقامت کہی جا چکی تھی، پس کھڑے ہوے اور دو رکعتیں پڑھیں[1]۔

حضرت ابو درداء کے متعلق بھی اس قسم کی روایت موجود ہے:

حضرت ابودرداء مسجد میں داخل ہوتے اور لوگ نماز فجر میں صف بستہ ہوتے پس مسجد کے گوشے میں دو رکعت پڑھتے، پھر لوگوں کے ساتھ نماز میں شامل ہو جاتے[2]۔

حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین میں عبداللہ بن مسعود، ابو موسی اشعری، حذیفہ، عبداللہ بن عباس سے بھی یہی منقول ہے، اور حضرات تابعین میں ابو عثمان نہدی، مسروق اور حسن بصری رحمہم اللہ سے بھی[3]۔

---

[1] طحاوي شريف ج: 1 /ص/183، واسناده صحيح، (آثار السنن، ص: 263)

[2] حواله بالا، واسناده حسن، (آثار السنن، ص: 264)

[3] طحاوی ج: 1 /ص: 183، واسناده صحيح (آثار السنن ص: 266)، مصنف ابن ابی شيبه ج: 2 / ص: 250

نمازوں کی رکعات :

نماز فجر :اس سے پہلے دو سنتیں ہیں کل چار رکعتیں ہوئی۔

نماز ظہر: چار فرض،اس سے پہلے چار سنتیں اور بعد میں دو سنتیں کل دس رکعتیں ہوئی۔

نماز عصر: چار فرض

نماز مغرب: تین فرض ہیں،اس کے بعد دو سنتیں کل پانچ رکعتیں ہوئی۔

نماز عشاء: چار فرض ہیں اور نماز عشاء کے بعد دو سنتیں کل چھ رکعتیں ہوئی)۔

نماز وتر دراصل رات کی نماز ہے جو تہجد کے ساتھ ملا کر پڑھی جاتی ہے۔جو لوگ رات کے آخری حصے میں نہ اٹھ سکتے ہوں وہ وتر بھی نماز عشاء کے ساتھ ہی پڑھ لیا کریں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

جسے خوف ہو کہ رات کے آخری حصے میں نہیں اٹھ سکے گا وہ اول شب ہی میں وتر پڑھ لے[1] ۔

دن رات میں بارہ رکعات سنن موکدہ:

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص بارہ رکعات سنتوں کی پابندی کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں گھر بنائے گا، ظہر کی نماز سے پہلے چار رکعات، ظہر کی نماز کے بعد دو رکعات، مغرب کی نماز کے بعد دو رکعات، عشاء کی نماز کے بعد دو رکعات اور فجر کی نماز سے پہلے دو رکعات[2] ۔

---

[1] مسلم باب من خاف ان لا یقیم من اخر اللیل فلیوتر اولہ حدیث755

[2] سنن الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب 306 من صلی في یوم ولیلة ثنتي عشرة رکعة من السنة، حدیث: 414 و415 وصححہ الألباني، نیز دیکھئے : صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین وقصرہا، باب 16 جواز النافلة قائما وقاعدا، حدیث: 730، وسنن أبي داود، کتاب التطوع، باب 1 ، حدیث: 1251 ، وسنن النسائي، کتاب قیام اللیل وتطوع النہار، باب 66 ثواب من صلی في الیوم واللیلة ثنتي عشرة رکعة، حدیث: 1794-1795، وسنن ابن ماجة، کتاب اقامة الصلاۃ، باب 100 ماجاء في ثنتي عشرة رکعة من السنة، حدیث: 1140

نبی کریم ﷺ کی زوجہ محترمہ ام المؤمنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جو بندۂ مؤمن فرائض کے علاوہ ہر دن اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ بارہ رکعات پڑھے گا، اس کے لئے اللہ تعالیٰ جنت میں ایک گھر بنادیں گے، یا یہ فرمایا کہ اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنادیا جائے گا، سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس ارشاد مبارک سننے کے بعد سے میں مسلسل انہیں پڑھتی ہوں[1]۔

بندۂ مؤمن کو پنج وقتہ فرض نمازوں کے ساتھ ساتھ سنت موکدہ اور دیگر سنن ونوافل کا بھی جہاں تک ہوسکے زیادہ سے زیادہ اہتمام کرنا چاہئے کہ نماز اہم ترین عبادت ہے اور اس کا بے انتہا اجر و ثواب ہے، سنت موکدہ کُل بارہ رکعات ہیں جیسا کہ مذکورہ احادیث رسول ﷺ میں بیان ہوا، ان بارہ رکعات سنتوں کو موکدہ اس لئے کہتے ہیں کہ ان کی تاکید بار بار فرمائی گئی ہے اور خود رسول اللہ اان سنتوں کے پڑھنے کا اہتمام فرمایا کرتے تھے۔

سنت موکدہ یا خاص خاص موقعوں پر نماز کی جو فضیلت بیان ہوئی وہ تو ہے ہی، اس کے علاوہ سنن ونوافل کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ قیامت کے دن جب بندہ کی فرض نمازیں کم ہوں گی تو ان نوافل اور سنتوں کو فرض کا درجہ دیکر نمازوں کی تعداد اور کمی کو پورا کیا جائے گا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ”قیامت کے دن سب سے پہلے بندہ کے جس عمل کا حساب ہوگا وہ نماز ہے، اگر یہ ٹھیک رہی تو وہ کامیاب وبامراد ہوگا اور اگر یہ خراب رہی تو وہ نقصان وخسارہ میں رہے گا، پھر اگر اس کی فرض نماز میں کچھ کمی رہ جائے گی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا، دیکھو میرے بندے کے نامۂ اعمال میں کچھ نوافل بھی ہیں؟ چنانچہ فرائض میں جو کمی رہ جائے گی وہ نوافل سے پوری کردی جائے گی، (یعنی سنتوں اور نوافل کو فرض کے قائم مقام بنادیا جائے گا) پھر اسی طرح سارے اعمال کا حساب ہوگا[2] “

[1] صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین وقصرہا، باب 15 فضل السنن الراتبۃ قبل الفرائض وبعدہن، حدیث: 728

[2] سنن الترمذي، کتاب الصلاۃ، باب 305 ماجاء أن أول ما یحاسب بہ العبد یوم القیامۃ، حدیث: 413، وسنن النسائي، کتاب الصلاۃ، باب 9 المحاسبۃ علی الصلاۃ، حدیث: 465، نیز دیکھئے: سنن أبي داود، کتاب الصلاۃ،

ایک حدیث قدسی ہے: "میں نے بندوں پر جو چیزیں فرض کی ہیں، ان سے زیادہ مجھے کوئی چیز محبوب نہیں جس سے وہ میرا قرب حاصل کرے (یعنی فرائض کے ذریعہ سے میرا قرب حاصل کرنا مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے) اور میرا بندہ نوافل کے ذریعہ سے (بھی) قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں [1] "۔

اہل علم نے اس حدیث قدسی کی روشنی میں ارشاد فرمایا ہے کہ قربِ الٰہی کے دو اہم ذرائع ہیں، ایک فرائض کی ادائیگی اور دوسرے نوافل کی کثرت، کیونکہ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ قربِ الٰہی کے حصول میں فرائض سے بڑھ کر کوئی چیز اللہ کے نزدیک بہتر وپسندیدہ نہیں، پھر نوافل سے بندہ اللہ عزوجل کا قُرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس بندہ سے محبت کرنے لگتا ہے، کون مسلمان نہیں چاہے گا کہ اسے اپنے رب کریم کا قرب حاصل ہو اور اس کا شمار اللہ کے محبوب بندوں اور صالحین میں ہو؟ یقیناہر مسلمان کی یہ خواہش وآرزو ہوتی ہے، اگر واقعی ایسا ہے تو ہم سب کو چاہئے کہ اپنی زندگی کے روز وشب میں فرائض کی ادائیگی کا خاص خیال رکھیں اور ساتھ ہی سنت اور نفل عبادتوں کا بھی خوب اہتمام کریں، تمام فرائض کی ادائیگی کے ساتھ اگر سنن ونوافل کا بھی اہتمام ہو جائے تو یقینا یہ ایک سعادتمندی اور بڑی نعمت ہے۔

نمازِ فجر سے پہلے کی سنت:

باب 144-145 قول النبي ا كل صلاة لا يتمها صاحبها تتم من تطوعه، حديث: 864، وسنن ابن ماجة، كتاب اقامة الصلاة، باب 202 ماجاء في أول ما يحاسب به العبد الصلاة، حديث: 1425

[1] صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب 38 التواضع، حديث: 6502

"ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ ظہر سے پہلے چار رکعت اور فجر سے پہلے دو رکعت نہیں چھوڑتے تھے[1] "

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ فجر کی دو رکعات سنت نماز، دنیا اور دنیا کی ہر چیز سے بہتر ہے[2] "

"سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے مسلسل ایک ماہ تک غور سے نبی کریم ﷺ کی نماز کا مشاہدہ کیا، آپ الفجر کی دو رکعات سنت میں (پہلی رکعت میں) قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ اور دوسری رکعت میں قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ پڑھتے تھے[3] "۔

"ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ فجر کی اذان اور اقامت کے درمیان ہلکی پھلکی دو رکعات نماز ادا فرماتے تھے[4] "

---

[1] صحیح البخاري، أبواب التهجد، باب 34 الركعتين قبل الظهر، حديث: 1182، وسنن أبي داود، كتاب التطوع، باب 1 ، حديث: 1253، وسنن النسائي، كتاب قيام الليل وتطوع النهار، باب 56 المحافظة على الركعتين قبل الفجر، حديث: 1757-1758

[2] صحیح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب 14 استحباب ركعتي سنة الفجر والحث عليهما، حديث: 725، و سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 307 ماجاء في ركعتي الفجر من الفضل، حديث: 416، و سنن النسائي، كتاب قيام الليل، باب 56 المحافظة على الركعتين قبل الفجر، حديث: 1759 صحيح

[3] سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 308 ماجاء في تخفيف ركعتي الفجر ، حديث: 417، وسنن النسائي، كتاب الافتتاح، باب 68 القراءة في الركعتين بعد المغرب، حديث: 992، وسنن ابن ماجة، كتاب اقامة الصلاة، باب 102 ماجاء في ما يقرأ في الركعتين قبل الفجر، حديث: 1149، صحيح

[4] صحيح البخاري كتاب الأذان، باب 12 الأذان بعد الفجر، حديث : 619، نیز دیکھئے : صحیح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب 16 جواز النافلة قائمًا وقاعدًا، حديث: 724

"ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب فجر کی دو رکعات سنت پڑھ کر فارغ ہوتے تو اگر مجھ سے کچھ ضرورت ہوتی تو مجھ سے بات کرتے ورنہ فجر کی نماز کے لئے باہر تشریف لے جاتے[1] "

"سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ فجر کی دو رکعات سنت کو نہ چھوڑو اگرچہ تمہیں گھوڑے روند ڈالیں[2] "

اس حدیث کی سند میں ایک راوی "عبد الرحمٰن" ہیں جن کی وجہ سے بعض لوگوں نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے، جب کہ اس راوی کی توثیق کرنے والے علماءِ جرح و تعدیل کی تعداد زیادہ ہے، چنانچہ صاحب عون المعبود علامہ ابو الطیب محمد شمس الحق عظیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ، علامہ منذری رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"منذری کہتے ہیں اس روایت کی سند میں عبد الرحمٰن بن اسحاق مدنی ہے، جسے عباد بن اسحاق بھی کہا جاتا ہے، ان کے ذریعہ سے امام مسلم نے حدیث نقل کی ہے، اور امام بخاری نے بطور استشہاد کے ان کی روایت کو پیش کیا ہے، یحییٰ بن معین نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، ابو حاتم رازی کہتے ہیں کہ یہ قابل حجت تو نہیں لیکن حسن الحدیث ہیں اور قوی راوی نہیں، یحییٰ بن سعید قطان کہتے ہیں کہ میں نے ان کے بارے میں اہل مدینہ سے پوچھا تو ان لوگوں نے ان کی تعریف نہیں کی، بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اہل مدینہ نے ان کے مذہب کے تعلق سے تعریف نہیں کی اس لئے کہ ان کا تعلق قدریہ سے تھا تو

---

[1] سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 309 ماجاء في الكلام بعد ركعتي الفجر، حديث: 418 قال ابو عيسى هذا حديث حسن صحيح ، صحيح البخاري، أبواب التهجد، باب 24 من تحدث بعد الركعتين ولم يضطجع، حديث: 1161، وأيضا: باب 26 الحديث بعد ركعتي الفجر، حديث: 1168، وصحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب 17 صلاة الليل الخ، حديث: 743

[2] سنن أبي داود، كتاب التطوع، باب 3 في تخفيفهما، حديث: 1258

لوگوں نے ان کو مدینہ سے جلا وطن کر دیا تھا، جہاں تک ان کی روایت کا تعلق ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور امام بخاری کا کہنا ہے کہ وہ مقارب الحدیث ہے [1] "

لہٰذا یہ حدیث حسن کے درجہ کو پہنچتی ہے۔

بہر حال فجر کی نماز سے پہلے سنت کی ادائیگی کی تاکید اور فضیلت وارد ہوئی ہے لہٰذا حتی المقدور اس کی ادائیگی کی کوشش کرنی چاہئے اور اس سلسلہ میں سستی، کوتاہی اور لاپرواہی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے، اگر یہ دو رکعت سنت کسی وجہ سے چھوٹ جائیں تو سورج طلوع ہونے کے بعد ان کو پڑھ لینا چاہئے۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے فجر کی دو رکعتیں نہ پڑھی ہوں وہ سورج نکلنے کے بعد پڑھ لے [2]۔

مندرجہ بالا حدیث ابوہریرہؓ سے صراحتا معلوم ہو گیا کہ اگر فجر کی سنتیں چھوٹ جائیں تو سورج نکلنے کے بعد پڑھی جائیں، لیکن بعض لوگ فجر کی فرائض سے فارغ ہوتے ہی پڑھ لیتے ہیں اور دلیل میں جو حدیث پیش کرتے ہیں وہ مرسل ہے اور ان کے ہاں مرسل حجت نہیں ہے جبکہ اس کی سند ہی متصل نہیں ملاحظہ ہو:

"حضرت قیس کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز کے لئے تشریف لائے، میں نے آپ کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی، جب آپ ﷺ نے جانے لگے تو مجھے دیکھا کہ میں نماز پڑھنے لگا ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا: قیس ذرا ٹھہروں، کیا دو نمازیں اکٹھی پڑھنے لگے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ میری فجر کی دو رکعتیں رہ گئی تھیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: فلااذن، پھر کوئی حرج نہیں [3]"۔

(ا) واضح رہے کہ خود امام ترمذیؒ اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں: کہ یہ حدیث مرسل ہے اور اس کی سند ہی متصل نہیں، کیونکہ محمد بن ابراہیم نے قیس سے کچھ نہیں سنا۔

---

[1] عون المعبود شرح سنن أبي داود: 137/4، كتاب التطوع، باب في تخفيفها

[2] قال الحاکم صحیح علی شرط الشیخین (ترمذی، ماجاء فی اعادتہا بعد طلوع الشمس)

[3] ترمذی، ماجاء فیمن تفوتہ الرکعتان

اس دلیل میں دوسری کمزوری یہ ہے کہ اس میں فجر کے بعد سنتیں پڑھنے کا جواز صراحتا معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ ارشاد نبوی " فلا اذن " کا دوسرا مفہوم و معنی زیادہ واضح ہے کہ پھر بھی نہ پڑھو تو گویا یہ الفاظ سنتیں پڑھنے کے جواز اور عدم جواز دونوں کی دلیل بن سکتے ہیں، بلکہ دوسرا مفہوم اس لئے راجح ہے کہ وہ دیگر روایات کے مطابق ہے جیسا کہ روایت ابو ہریرہؓ میں صراحت ہے اور حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے نیز آنحضور ﷺ نے فجر کے بعد سورج نکلنے تک نماز پڑھنے سے روکا ہے۔

فجر کی جماعت قائم ہونے کے بعد سنت فجر پڑھنے کا حکم :

اذا أقيمت الصلاة فلا صلاة الا المكتوبة[1]

"جب جماعت کھڑی ہو جائے تو سوائے اس فرض نماز کے اور کوئی نماز نہیں پڑھنی چاہیئے"۔

ظہر، عصر، مغرب اور عشاء، چاروں نمازوں میں تو یہ حکم ہے کہ فرض نماز کی جماعت کھڑی ہونے کے بعد کوئی سنت یا نفل نہ پڑھی جائے، جیسا کہ مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا، البتہ فجر کی سنت کے بارے میں حنفیہؒ اور مالکیہ کا موقف یہ ہے کہ مذکورہ حکم سے فجر کی سنت مستثنیٰ ہے، ان حضرات کے نزدیک حکم یہ ہے کہ فجر کی جماعت کھڑی ہونے کے باوجود مسجد کے کنارے کسی گوشہ میں یا عام جماعت سے ہٹ کر مسجد کے صحن میں (اگر مسقف حصہ میں جماعت ہو رہی ہو) یا وضو خانہ کے پاس فجر کی سنت پڑھنا درست ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ فجر کی کم سے کم آخری رکعت کے ملنے کی

---

[1] صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصربها، باب 9 كراهة الشروع في نافلة بعد شروع المؤذن، حديث: 710، وسنن أبي داود، كتاب التطوع، باب 5 اذا أدرك الامام ولم يصل ركعتي الفجر، حديث: 1266، وسنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 312 ماجاء اذا أقيمت الصلاة فلا صلاة الا المكتوبة، حديث: 421، وسنن النسائي، كتاب الامامة، باب 60 مايكره من الصلاة عند الاقامة، حديث: 865، وسنن ابن ماجة، كتاب اقامة الصلاة، باب 103 ماجاء في اذا أقيمت الصلاة فلا صلاة الا المكتوبة، حديث: 1151

امید ہو، اگر کسی کو یہ خطرہ ہو کہ فجر کی نماز مکمل طور پر چھوٹ جائے گی تو ایسی صورت میں سنت فجر اس وقت نہیں پڑھیں گے بلکہ بعد میں سورج نکلنے کے بعد موقع ملے تو پڑھ لیں گے۔

ان حضرات کا یہ کہنا کہ فجر کی سنت کا حکم مستثنیٰ ہے، اس کی دلیل ہے کہ مختلف صحابہ اور تابعین سے یہ ثابت ہے کہ فجر کی جماعت شروع ہونے کے باوجود فجر کی سنت ادا کرتے تھے، حالانکہ یقینا "اذا أقيمت الصلاة فلا صلاة الا المكتوبة" حدیث انہیں معلوم ہو گی۔

نیز سنت فجر کی جتنی تاکید احادیث وآثار میں وارد ہوئی ہے، کسی اور سنت سے متعلق اتنی تاکید نہیں آئی ہے، چنانچہ مروی ہے: "ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دیگر نوافل کے مقابلہ میں نماز فجر کی سنت کا بہت زیادہ اہتمام فرماتے تھے[1]۔

ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیگر نوافل کے مقابلہ میں صبح کی نماز یعنی فجر کی سنت کی طرف بہت زیادہ سبقت کرتے ہوئے دیکھا[2]۔

ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ فجر کی دو رکعت سنت دنیا اور دنیا کی ہر چیز سے بہتر ہے[3]۔

ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فجر کی دو رکعت سنت کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ یقینا یہ دونوں رکعتیں مجھے دنیا کی تمام چیزوں سے محبوب ہیں[4]۔

---

[1] صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب 14 استحباب ركعتي الفجر الخ، حديث: 724،و صحيح البخاري، أبواب التهجد، باب 27 تعاهد ركعتي الفجر من سماها تطوعا، حديث: 1169، وسنن أبي داود، كتاب التطوع، باب 2 ركعتي الفجر، حديث: 1254

[2] صحيح مسلم، كتاب .. صلاة المسافرين وقصرها، باب 14 استحباب ركعتي الفجر الخ، حديث: 724

[3] صحيح مسلم، كتاب الصلاة المسافرين وقصرها، باب 14 استحباب ركعتي الفجر، حديث: 725

[4] صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب 14 استحباب ركعتي الفجر، حديث: 725

نیز سنت فجر کے غیر معمولی موکد ہونے کے بارے میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: فجر کی دو رکعت سنت کو کسی بھی حالت میں نہ چھوڑو چاہے تم کو گھوڑے روند ڈالیں[1] ۔

جیساکہ ہم نے اُوپر بیان کیا کہ بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ سے ثابت ہے کہ فجر کی جماعت شروع ہونے کے باوجود بھی سنت فجر ادا کرتے تھے، چنانچہ شرح معانی الآثار میں روایت نقل کی گئی ہے: "نافع کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو فجر کی نماز کیلئے اس وقت جگایا جب کہ فجر کی نماز شروع ہو چکی تھی، وہ اٹھے اور پہلے دو رکعت سنت ادا فرمائی[2] "۔

ابو اسحاق کہتے ہیں کہ مجھ سے عبد اللہ بن ابی موسیٰ نے اپنے والد سیدنا ابو موسیٰ کے حوالہ سے نقل کیا کہ جب لوگوں کو سعید بن العاص رضی اللہ عنہ نے بلایا تو ابو موسیٰ، حذیفہ اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کو بھی بلایا جب کہ ابھی نماز فجر انہوں نے نہیں پڑھی تھی، پھر تمام لوگ ان کے پاس سے چلے گئے، اور فجر کی نماز شروع ہو گئی، تو سیدنا عبد اللہ بن مسعود ص مسجد کے ایک پایہ کے پیچھے گئے اور دو رکعت سنت فجر ادا فرمائی پھر نماز فجر میں شامل ہو گئے[3] ۔

اس روایت کو محدث عبد الرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے یوں نقل فرمایا ہے: "ہمارے پاس عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تشریف لائے اس حال میں کہ امام صاحب فجر کی نماز پڑھا رہے تھے، تو انہوں نے پہلے ایک ستون کے پیچھے دو رکعت سنت فجر ادا فرمائی اس لئے کہ انہوں نے اس وقت تک فجر کی سنت نہیں پڑھی تھی[4] "۔

---

[1] سنن أبي داود، كتاب التطوع، باب 3 في تخفيفهما، حديث: 1258، ومسند الامام احمد: 405/2، حديث: 9242

[2] شرح معاني الآثار: 375/1، باب الرجل يدخل المسجد والامام فی صلاة الفجر ولم يكن ركع أيركع أو لا يركع؟، واسناده صحيح،(أثار السنن، ص:263)

[3] شرح معاني الآثار: 374/1، باب مذكور

[4] مصنف عبد الرزاق: 444/2، كتاب الصلاة، باب هل يصلي ركعتي الفجر اذا أقيمت الصلاة،روايت: 4021، والطبراني، قال صاحب آثار السنن: قال في معجم الكبير، قال الهيثمي في مجمع الزوائد: رجاله موثقون.

ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ نے حال ہی میں مشہور صحابہ کرام ﷡ کے فقہی موسوعات کو شائع کیا ہے، جس میں ایک عظیم موسوعہ فقہ عبد اللہ بن مسعود ؓ کے نام سے معروف ہے، اس کے مرتب و محقق دکتور محمد روّاس قلعہ جی نے بھی اس کتاب میں یہ روایت نقل کی ہے[1]

ابو عثمان انصاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تشریف لائے اس حال میں امام صاحب صبح (فجر) کی نماز پڑھا رہے تھے، چونکہ انہوں نے ابھی تک فجر کی سنت نہیں پڑھی تھی اس لئے امام کے پیچھے (صف سے ہٹ کر) دو رکعت سنت فجر ادا فرمائی پھر لوگوں کے ساتھ فجر کی جماعت میں شریک ہوگئے[2]۔

سیدنا ابوالدرداء ؓ کے بارے مروی ہے: "وہ جب مسجد میں اس حال میں کبھی آتے کہ لوگ نمازِ فجر کی جماعت کی صف میں ہوتے تو یہ مسجد کے کسی گوشہ میں سنت فجر پڑھ کر لوگوں کے ساتھ جماعت میں شریک ہوجاتے[3]۔

سیدنا ابوالدرداء ؓ ہی کے بارے میں سلیمان بن موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "سیدنا ابوالدرداء ؓ کے بارے میں ہمیں معلوم ہوا کہ وہ کہتے تھے کہ ہاں اللہ کی قسم! اگر میں اس حال میں مسجد میں داخل ہوں کہ لوگ نماز (فجر کی جماعت) میں ہوں، تو میں مسجد کے پایوں میں سے کسی پایہ کے پیچھے کھڑا ہوجاؤں اور سنت فجر کو خوب اچھی طرح ادا کروں، اس کی ادائیگی میں جلد بازی کا

---

[1] موسوعة فقه عبدالله بن مسعود ص، ص: 411، الصلاة، -19 صلاة التطوع، د- السنن الرواتب، -2 وكان أحرص ما يكون على سنة الفجر

[2] شرح معانی الآثار: 375/1، باب الرجل يدخل المسجد والامام في صلاة الفجر ولم يكن ركع أيركع أولا يركع؟واسناده صحيح(آثار السنن، ص: 265)

[3] شرح معانی الآثار: 375/1، باب الرجل يدخل المسجد والامام في صلاة الفجر ولم يكن ركع أيركع أولا يركع؟،واسناده حسن، (آثار السنن،ص:264)

مظاہرہ نہ کروں، (پھر سنت فجر کی ادائیگی کے بعد) میں چل کر لوگوں (کی صف) تک پہنچوں اور ان کے ساتھ نمازِ فجر ادا کروں[1]۔

ابو عثمان نہدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”فجر کی نماز سے پہلے ہم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آتے، اس حال میں کہ وہ نماز پڑھا رہے ہوتے، تو ہم پہلے مسجد کے کسی گوشہ میں فجر کی سنت ادا کرتے پھر لوگوں کے ساتھ ان کی نماز (کی جماعت) میں شریک ہو جاتے تھے[2]۔

سیدنا امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں معمر رحمۃ اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں: ”سیدنا حسن بھی اسی طرح کرتے تھے یعنی اگر سنت فجر پہلے نہ پڑھ چکے ہوتے تو جماعت شروع ہونے کے باوجود ادا کرتے تھے[3]۔

محدث کبیر علامہ عبد الرزاق صنعانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی سند سے سیدنا حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ یوں نقل فرماتے ہیں: ”سیدنا حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تم اس حال میں مسجد میں داخل ہو کہ امام نماز فجر شروع کر چکا ہو اور تم نے ابھی فجر کی دو رکعت سنت نہیں پڑھی ہے تو پہلے تم سنت پڑھو پھر امام کے ساتھ شریک ہو جاؤ[4]۔

---

[1] مصنف عبد الرزاق: 443/2، باب ہل يصلي ركعتي الفجر اذا أقيمت الصلاة، روایت: 4020، نیز ملاحظہ ہو: مصنف ابن أبي شيبة: 57/2، باب 520 في الرجل يدخل المسجد في الفجر، روایت: 6421

[2] شرح معاني الآثار: 376/1، باب الرجل يدخل المسجد والامام راكع في صلاة الفجر ولم يكن يركع، أيركع أولا يركع؟ نیز دیکھئے: مصنف ابن أبي شيبة: 57/2، باب 520 في الرجل يدخل المسجد في الفجر، روایت: 6414، وسناده حسن (آثار السنن، ص: 265)

[3] مصنف عبد الرزاق: 445/2، باب ہل يصلي ركعتي الفجر اذا أقيمت الصلاة، روایت: 4025، رواہ الطحاوی، اسنادہ صحیح. (اعلاء السنن، ج: 7/ص: 105، تابع الصلاة)

[4] مصنف عبد الرزاق: 445/2، باب ہل يصلي ركعتي الفجر اذا أقيمت الصلاة، روایت: 4025

امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا مسروق رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں نقل فرمایا ہے: "امام مسجد میں نماز پڑھا بھی رہا ہوتا تو وہ ان دو رکعت سنت فجر کو ادا کرتے تھے[1]۔

مسروق کے بارے میں منقول ہے کہ وہ مسجد میں داخل ہوئے اس حال میں لوگ فجر کی جماعت میں ہو تھے، اور انہوں نے اب تک سنت فجر نہ پڑھی تھی تو مسجد کے کسی گوشہ میں پہلے ان دونوں رکعتوں کو ادا فرمایا پھر لوگوں کے ساتھ جماعت میں شریک ہوئے[2]۔

سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے: "ایک مرتبہ وہ مسجد میں آئے اس حال میں امام صاحب فجر کی نماز پڑھا رہے تھے، تو مسجد میں داخل ہونے سے پہلے انہوں نے مسجد کے دروازہ کے پاس دو رکعت سنت فجر ادا فرمائی[3]۔

مفسر کبیر امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "جب تم اس حال میں مسجد میں جاؤ کہ لوگ فجر کی نماز پڑھ رہے ہوں، اور تم نے اب تک فجر کی دو رکعت سنت نہ پڑھی ہو تو پہلے ان کو ادا کرو، اگرچہ تم کو یہ اندیشہ ہو کہ پہلی رکعت تم سے چھوٹ جائے گی[4]۔

مذکورہ تمام آثار وروایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضراتِ صحابہ کرامؓ اور تابعین عظام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کا عمل یہ تھا کہ وہ جماعت کھڑی ہونے کے باوجود بھی فجر کی سنت پڑھ لیا کرتے تھے۔

نماز ظہر سے پہلے اور بعد کی سنتیں:

"اُم المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ ظہر سے پہلے چار رکعت اور فجر سے پہلے دو رکعت کبھی نہیں چھوڑتے تھے[1]"

---

[1] مصنف عبد الرزاق: 444/2، باب ہل یصلي رکعتي الفجر اذا أقیمت الصلاۃ، روایت: 4024

[2] مصنف ابن ابی شیبۃ: 56/2، روایت: 6412، باب 520 في الرجل یدخل المسجد فی الفجر

[3] مصنف ابن أبي شیبۃ: 56/2، باب 520 في الرجل یدخل المسجد في الفجر، روایت: 6413

[4] مصنف ابن أبي شیبۃ: 57/2، باب 520 في الرجل یدخل المسجد في الفجر، روایت: 6418

"سیدنا عبداللہ بن شقیق ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اُم المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی سنت نمازوں کے بارے میں دریافت کیا؟ تو اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ میرے گھر میں نمازِ ظہر سے پہلے چار رکعت ادا فرماتے تھے پھر لوگوں کو ظہر کی نماز پڑھاتے پھر اندر تشریف لاتے اور دو رکعت ادا فرماتے[2] "

"سیدنا علی ؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ظہر کی نماز سے پہلے چار رکعات پڑھتے تھے اور ظہر کی نماز کے بعد دو رکعات[3] "۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اور اسی پر اکثر اہل علم یعنی صحابہ کرام ث اور ان کے بعد کے لوگوں کا عمل رہا ہے، وہ یہ پسند کرتے تھے کہ آدمی ظہر کی نماز سے پہلے چار رکعات پڑھے، یہی سفیان ثوری، ابن المبارک، اسحاق اور کوفہ والوں کا قول ہے[4] "۔

"ام المؤمنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص نماز ظہر سے پہلے چار رکعات اور نماز ظہر کے بعد چار رکعات پڑھے (اور ایک روایت میں ہے کہ جو شخص نمازِ ظہر سے پہلے چار رکعات اور اس کے بعد چار رکعات پڑھنے کی پابندی کرے) اللہ تعالیٰ اس پر جہنم کی آگ کو حرام کردیتے ہیں[5] "۔

---

[1] صحیح البخاري، أبواب التہجد، باب 34 الرکعتین قبل الظہر، حدیث: 1182، وسنن أبي داود، کتاب التطوع، باب 1، حدیث: 1253 وسنن النسائي، کتاب قیام اللیل وتطوع النہار، باب 56 المحافظة علی الرکعتین قبل الفجر، حدیث: 1757-1758

[2] صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین وقصرہا، باب 16 جواز النافلة قائمًا وقاعدًا، حدیث: 730، وسنن أبي داود، کتاب التطوع، باب 1، حدیث: 1251

[3] سنن الترمذي، کتاب الصلاة، باب 315 ماجاء في الأربع قبل الظہر، حدیث: 424 صحیح

[4] حوالہ سابق

[5] سنن الترمذي، کتاب الصلاة، باب 317، حدیث: 427 و428وسنن أبي داود، کتاب التطوع، باب 7 الأربع قبل الظہر وبعدہا، حدیث:1269، وسنن النسائي، کتاب قیام اللیل وتطوع النہار، باب 67 الاختلاف علی اسماعیل بن

سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: "جب سے میں نے ان کی فضیلت سنی ہے انہیں نہیں چھوڑا ہے"[1]

"سیدنا عبد اللہ بن سائب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ زوال آفتاب کے بعد ظہر کی نماز سے پہلے رسول اللہ ﷺ چار رکعات نماز پڑھتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ یہ وہ گھڑی ہے جس میں آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، میں یہ چاہتا ہوں کہ اس گھڑی میں میرا کوئی عملِ صالح بارگاہِ الٰہی میں پہنچ جائے"[2]

بہر حال ظہر کی نماز سے قبل اور اس کے بعد کی سنتوں کا اہتمام کرنا اجر وثواب اور بلندیٔ درجات کا سبب ہے اور انہیں ترک کرنا شقاوت اور محرومی کا باعث ہے۔

ظہر سے پہلے سنت کی خصوصی اہمیت:

ظہر کی چار سنتوں کو اکٹھی ایک ہی سلام سے پڑھنا دن اور رات کی موکدہ سنتیں بارہ رکعت ہیں جو پانچوں نمازوں میں پڑھی جاتی ہیں، سرکارِ دوعالم ا نے ان بارہ رکعت کو ہمیشہ پڑھا ہے اس لیے انہیں موکدہ کہا جاتا ہے، لہٰذا ہر مسلمان مرد و عورت کو ان بارہ رکعات کی پابندی کرنی چاہئے۔ انہی موکدہ سنتوں میں ظہر سے قبل کی چار رکعات بھی ہیں، اور ان کے کئی فوائد وفضائل ہیں، سب سے پہلا عظیم فائدہ یہ ہے کہ ظہر کا وقت جو زوال کے بعد شروع ہوتا ہے، یہ ظہر کی ان چار رکعت سنت موکدہ کا مبارک وقت ہے، اور یہ چار رکعات سنتِ موکدہ تہجد کی نماز کی طرح ہیں۔

أبي خالد، حديث:1812تا1817، وسنن ابن ماجة، كتاب اقامة الصلاة، باب 108 ماجاء في من صلى قبل الظهر اربعًا وبعدها أربعًا، حديث:1160 (صحیح، سنن ابی داؤد، ج: 1/ص:348)

[1] سنن النسائي، كتاب قيام الليل وتطوع النهار، باب 67 الاختلاف على اسماعيل من أبي خالد، حديث: 1812، ومسند الامام أحمد:325/6، مسند النساء، حديث أم حبيبة بن أبي سفيان، حديث: 27300

[2] سنن الترمذي، كتاب الوتر، باب 347 ماجاء في الصلاة عند الزوال، حديث: 478

" ظہر (کی چار فرضوں) سے قبل چار رکعت ہیں جو زوال کے بعد پڑھی جاتی ہیں یہ چار رکعت تہجد کی نماز کی طرح ہیں پھر آپ ا نے "سورۃ النحل" کی یہ آیت پڑھی کہ یہ وہ وقت ہے جبکہ ہر چیز اللہ تعالی کی تسبیح بیان کرتی ہے[1]، الخ"۔

اس حدیث مبارکہ نے بتایا کہ ظہر کی چار رکعت سنتِ موکدہ تہجد کی نماز کی مانند ہیں اور یہ مبارک وقت ہے اور اس وقت ہر چیز اللہ تعالی کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوتی ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "دن کی کوئی بھی نماز رات کی نماز (تہجد) کے برابر نہیں ہے سوائے چار رکعت کے، جو ظہر سے قبل پڑھی جاتی ہیں[2] "

ان کی دوسری اہم فضیلت یہ ہے کہ یہ وہ مبارک وقت ہے جس میں آسمانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور اللہ تعالی اپنی مخلوق کی طرف نگاہِ رحمت سے متوجہ ہوتے ہیں۔ ایک اور اہم فضیلت یہ بیان کی گئی ہے کہ چار رکعت کی اس نماز کو سیدنا آدم، سیدنا نوح، سیدنا ابراہیم، سیدنا موسیٰ، اور سیدنا عیسیٰ علیہم السلام جمیعًا، نے بھی پڑھا ہے چنانچہ بزار کی روایت میں ہے: "رسول کریم ﷺ نصف النہار کے بعد (یعنی ظہر کے وقت) نماز پڑھنا پسند فرماتے تھے ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ میں دیکھتی ہوں کہ آپ کو اس وقت کی یہ نماز (چار رکعات سنت ظہر) پڑھنا نہایت ہی مرغوب ہے؟ تو ارشاد فرمایا، کہ یہ وہ وقت ہے جس میں آسمانوں کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور اللہ تعالی اس وقت اپنی مخلوق پر رحمت کی نگاہ ڈالتا ہے اور یہ (چار رکعت سنت موکدہ) وہ نماز ہے جسے آدم و نوح و ابراہیم و موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام ہمیشہ پڑھا کرتے تھے[3] "۔

---

[1] سنن الترمذي، كتاب تفسير القرآن، باب 17 ومن سورة النحل، حديث: 3128

[2] مجمع الزوائد: 221/2، كتاب الصلاة، باب 268 في ما يصلي قبل الظهر وبعدها، حديث: 3329

[3] رواه البزار فی کشف الاستار، حديث: 770

ان چار رکعت سنتِ موکدہ کی چوتھی اہم فضیلت یہ ہے کہ ان چار رکعت کو پڑھنے والے پر جہنم کی آگ حرام کر دی جاتی ہے چنانچہ رسول کریم ا نے فرمایا: "جس کسی نے ظہر سے قبل اور ظہر کے بعد چار چار رکعت سنت ادا کیں اس پر جہنم کو حرام کر دیا جاتا ہے[1] "

چار رکعت سنتِ ظہر کی پانچویں فضیلت یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ان چار رکعت کو ہمیشہ ادا فرمایا ہے۔ سیدنا ابوایوب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "جب سے آپ انے مدنیہ منورہ ہجرت فرمائی میں نے دیکھا کہ ظہر سے قبل والی چار رکعت ہمیشہ پڑھتے تھے[2] "۔

چار رکعت سنت موکدہ کی چھٹی اہم فضیلت یہ ہے کہ اس وقت آسمانوں کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں تاکہ لوگوں کے اعمال اللہ تعالی کی بارگاہ میں پیش کیے جائیں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس وقت آسمانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ اس وقت میرا اچھا عمل (اللہ کے سامنے پیش کرنے کے لیے) بلند کیا جائے[3] "۔

---

[1] مسندالامام أحمد: 325/6، مسند النساء، حديث أم حبيبة بنت أبي سفيان، حديث: 27300، وايضًا: 326/6، حديث: 27308، وايضًا:426/6، حديث: 27948، سنن أبي داود، كتاب التطوع، باب 7 الأربع قبل الظهر وبعدها، حديث:1269،وسنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 317 منه آخر، حديث: 427-428، و سنن النسائي:265/3، كتاب قيام الليل وتطوع النهار، باب 67 الاختلاف على اسماعيل بن أبي خالد، حديث: 1814و 1815 و 1816 و 1817، وسنن ابن ماجة، كتاب اقامة الصلاة، باب 108 ماجاء في من صلى قبل الظهر أربعًا وبعدها أربعًا، حديث: 1160

[2] مجمع الزوائد:219/2 ، كتاب الصلاة، باب 268 فيما يصلي قبل الظهر وبعدها، حديث: 3316، المعجم الكبير للطبراني: 169/4، قرثع الضبي عن أبي أيوب، حديث: 4035

[3] سنن الترمذي، كتاب الوتر، باب 347 ماجاء في الصلاة، عند الزوال، حديث:478، ومسندالامام أحمد:3/411، مسند المكيين، حديث عثمان بن طلحة، حديث: 15471

ایک دوسری جگہ رسول کریم اکا ارشاد گرامی ہے: "ظہر سے قبل کی چار رکعت جن کے درمیان میں سلام نہ پھیرا جائے، ان چار رکعت کے لیے آسمان کے سارے دروازے کھول دیے جاتے ہیں[1]"

اس حدیث مبارک نے بتایا کہ ظہر سے قبل کی چار رکعات کو دو دو کرکے نہیں پڑھنا چاہئے بلکہ ان چار رکعات کو اکٹھی ایک ہی سلام سے پڑھنا چاہئے، امام ابو عیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں نقل کیا ہے: "آپ ﷺ رات کے نوافل اور سنتوں کو دو دو کرکے پڑھا کرتے تھے جبکہ دن کی سنتوں اور نوافل کو چار چار رکعات کرکے پڑھا کرتے تھے[2]۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے مزید لکھا ہے کہ: "بعض اہل علم کے ہاں رات کے نوافل و سنتوں کو دو دو کرکے پڑھنے کی رائے ہے، لیکن دن کی نوافل و سنتوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ان کو چار چار کرکے پڑھا جائے جیسے ظہر سے قبل چار رکعات کو (ایک سلام سے) پڑھا جاتا ہے، یہ قول امام سفیان الثوری، امام عبداللہ بن مبارک اور امام اسحاق کا ہے[3]۔

اس سنت کی فضیلت کیلئے نبی اکا یہ عمل بھی پیش کرنا کافی ہے جو اُمّ المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: "وہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے ظہر کی چار رکعت سنت اگر چھوٹ جاتی تھی تو آپ ا اسے ظہر کے بعد کی دو رکعت سنتوں کے بعد پڑھتے تھے[4]۔

ظاہر ہے کہ فضیلت ہی کی بناء پر آپ ا بہر حال اسے پڑھتے تھے خواہ ظہر سے پہلے پڑھتے ہوں یا چھوٹ جانے کی صورت میں ظہر کے بعد پڑھتے ہوں، احادیث سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ ظہر کا وقت مبارک وقت ہے، یہ دعاؤں کی قبولیت کی گھڑی ہے، اعمال کے بلند کئے جانے کا لمحہ ہے، لہٰذا

---

[1] سنن أبي داود، كتاب التطوع، باب 7 الأربع قبل الظهر وبعدها، حديث:1270،وسنن ابن ماجة، كتاب اقامة الصلاة، باب 105 ماجاء في أربع ركعات قبل الظهر، حديث: 1157، صحيح الجامع الصغير، حديث: 885

[2] سنن الترمذي، ابواب السفر، باب 418 ماجاء أن صلاة الليل والنهار مثنى مثنى، حديث: 597

[3] حوالہ سابق

[4] سنن ابن ماجة، كتاب اقامة الصلاة، باب 106 من فاتته الأربع قبل الظهر، حديث: 1158

ہمیں اس وقت سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہئے، تمام مسلمان مساجد میں اور تمام مسلمان خواتین اپنے گھروں میں ظہر کے اس مبارک وقت سے خوب استفادہ کریں، تلاوت، استغفار، ذکر اور دعاء کے ذریعے اس وقت کو مزید قیمتی بنائیں اور خوب دعائیں کریں۔

عصر کی نماز سے قبل کی سنت

"سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو عصر کی نماز سے پہلے چار رکعات سنت پڑھتا ہے[1] "۔

"جو شخص عصر سے پہلے چار رکعات پابندی سے پڑھے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنادیتا ہے[2] "

"سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عصر سے قبل چار رکعات میں وقفہ (قعدہ اولیٰ) فرماتے تھے جس میں ملائکہ مقربین اور مسلمین و مؤمنین پر سلام بھیجتے تھے، امام ابو عیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو "حدیث حسن" قرار دیا ہے، امام اسحاق نے فرمایا کہ اس وقفہ سے مراد پہلا تشہد یعنی قعدہ اولیٰ ہے[3] "

یعنی عصر کی یہ چار رکعات سنت غیر موکدہ کو بھی ظہر سے قبل چار رکعات سنت موکدہ کی طرح ایک سلام سے پڑھا جائے۔

---

[1] سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 318 ماجاء في الأربع قبل العصر، حديث: 430 وسنن أبي داود، كتاب التطوع، باب 10 من رخص فيهما اذا كانت الشمس مرتفعة، حديث. 1271 وصحيح ابن خزيمة، كتاب الصلاة، باب 512 فضل صلاة التطوع قبل صلاة العصر، حديث: 1193

[2] مجمع الزوائد: 222/2، كتاب الصلاة، باب 269 الصلاة قبل العصر، حديث: 3332، مسند أبي يعلى: 334/6، مسند أم سلمة، حديث أم حبيبة بنت سفيان أم المؤمنين، حديث: 7101

[3] سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 318 ماجاء في الأربع قبل العصر، حديث: 429

مغرب کی نماز کے بعد کی سنت:

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے بیشمار مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ مغرب کے بعد کی دو رکعات سنت اور فجر سے پہلے کی دو رکعات میں قُلْ یَا اَیُّہَا الْکَافِرُوْنَ اور قُلْ ہُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ پڑھتے تھے [1]۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ آپ کے گھر میں مغرب کی نماز کے بعد دو رکعات پڑھی [2]۔

ہم مسلمانوں کو چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں اور صالحین کے زمرے میں شامل ہونے کے لئے اپنی زندگی کے لیل ونہار میں فرائض وواجبات کی ادائیگی کا بھرپور اہتمام کریں اور ساتھ ہی سنن ونوافل عبادتوں کا بھی خوب خیال رکھیں اور زیادہ سے زیادہ انہیں انجام دیں، اگر ہم نے فرائض کی ادائیگی کے ساتھ سنن ونوافل کی بھی پابندی کی تو یقینا ہماری دنیا بھی سنور جائے گی اور آخرت میں بھی ہم کامیاب و بامراد ہوں گے، اللہ ہم سب مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائے۔

عشاء کی نماز کے بعد کی سنت:

عبداللہ بن شقیق رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی (سنت) نمازوں کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ آپ اظہر سے پہلے دو رکعات، ظہر کے بعد دو رکعات، مغرب کے بعد دو رکعات، عشاء کے بعد دو رکعات اور فجر سے پہلے دو رکعات پڑھا کرتے تھے [3]۔

---

[1] سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 319 ماجاء في الركعتين بعد المغرب والقراءة فيهما، حديث: 431، وسنن ابن ماجة، كتاب اقامة الصلاة، باب 112 ما يقرأ في الركعتين بعد المغرب، حديث: 1166

[2] سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 320 ماجاء أنه يصليهما في البيت، حديث: 432

[3] سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 322 ماجاء في الركعتين بعد العشاء، حديث: 436

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حدیث عبد اللہ بن شقیق عن عائشۃ حدیث حسن صحیح۔
(حوالہ سابق) "عبداللہ بن شقیق کی ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث "حسن صحیح" ہے۔
سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز ظہر سے پہلے دو رکعات، ظہر کے بعد دو رکعات، مغرب کے بعد دو رکعات، عشاء کے بعد دو رکعات اور جمعہ کے بعد دو رکعات پڑھی، البتہ مغرب اور عشاء کی سنتیں آپ اکے گھر میں ادا کی[1]۔
ان روایتوں کے علاوہ اور کئی روایتیں ہیں جن میں دیگر فرض نمازوں کی طرح عشاء کی فرض نماز کے بعد سنت پڑھنے کا تذکرہ موجود ہے، سنتوں کے بارے میں سب سے اہم اور جامع روایت وہ ہے جس میں چوبیس گھنٹوں میں فرائض کے علاوہ بارہ رکعات سنن موکدہ ادا کرنے کا تذکرہ اور تلقین وتاکید آئی ہے، جسے ہم نے "دن رات میں بارہ رکعات سنن موکدہ" کے عنوان کے تحت بیان کیا ہے، بہرحال فرائض وواجبات کے ساتھ ہمیں سنن ونوافل کا بھی خوب اہتمام کرنا چاہئے۔

نماز جمعہ سے قبل کی سنتیں:

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص جمعہ کے دن غسل کرے اور جس قدر ہوسکے پاکی حاصل کرے اور اپنے پاس جو تیل میسر ہو، وہ تیل لگائے اور اپنے گھر سے عطر لگا کر مسجد میں حاضر ہو پھر مسجد پہنچ کر دو آدمیوں کے درمیان تفریق نہ کرے (یعنی جگہ نہ ہو تو زبردستی درمیان میں نہ بیٹھے یا گردن پھلانگتا ہوا آگے نہ بڑھے) پھر جتنی اس کے مقدر میں ہو نماز پڑھے، اور جب امام خطبہ شروع

---

[1] صحيح البخاري، أبواب التهجد، باب 29 التطوع بعد المكتوبة، حديث: 1172، وايضا أبواب التهجد، باب 25 ماجاء في التطوع مثنى مثنى، حديث: 1165، وايضا باب 34 الركعتين قبل الظهر، حديث: 1180، وصحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب 15 فضل السنن الراتبة، حديث: 729

کرے تو خاموش رہے، تو اس جمعہ اور اگلے جمعہ کے درمیان اس سے جو گناہ سرزد ہوں وہ بخش دیئے جائیں گے[1]۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے غسل کیا پھر جمعہ میں آیا (یعنی جمعہ کی نماز کے لئے مسجد پہنچا) اور جس قدر اس کے نصیب میں تھی نماز پڑھی پھر امام کے خطبہ سے فارغ ہونے تک خاموش رہا اور اس کے ساتھ نماز پڑھی تو اس جمعہ سے دوسرے جمعہ تک بلکہ اس سے تین دن اور زیادہ کے اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے[2]۔

جمعہ کی نماز سے پہلے سنتیں پڑھنی چاہیے، علامہ سید سابق لکھتے ہیں: "جمعہ سے پہلے نفل (وسنت نمازیں) پڑھنا مسنون ہے، جب تک کہ امام خطبہ کے لئے نہ آجائے[3]۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کرتے ہوئے علامہ سید سابق لکھتے ہیں: "بلکہ آپ اسے بغیر تعیین کے مسجد پہنچنے کے بعد نماز پڑھنے کی ترغیب وفضیلت معلوم ہوتی ہے... اور صحابہؓ کرامؓ سے بھی یہی منقول ہے کہ جب وہ جمعہ کے دن مسجد آتے تو مسجد میں داخل ہوتے ہی جتنا ہوسکے نماز پڑھتے تھے[4]۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں امام ترمذی رحمہ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ وہ نمازِ جمعہ سے پہلے اور نماز جمعہ کے بعد چار رکعات پڑھا کرتے تھے: "عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ جمعہ کی نماز سے پہلے چار رکعت اور جمعہ کی نماز کے بعد چار رکعت سنت پڑھتے تھے[5]۔

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الجمعة، باب 6 الدهن للجمعة، حديث: 883، وايضا باب 19 لا يفرق بين اثنين يوم الجمعة، حديث: 910

[2] صحيح مسلم، كتاب الجمعة، باب 8 فضل من استمع وأنصت في الخطبة، حديث: 857

[3] فقه السنة: 282/1، الجمعة -8- مشروعية التنفل قبلها

[4] فقه السنة: 297/1، الجمعة، التطوع قبل الجمعة وبعدها، ط: دار الريان للتراث مكتبة الخدمات الحديثية

[5] سنن الترمذي، كتاب الجمعة، باب 376 ماجاء في الصلاة قبل الجمعة وبعدها، حديث: 523

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے مزید لکھا ہے کہ عبد اللہ بن مبارک اور سفیان ثوری رحمہما اللہ تعالیٰ نے بھی سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس عمل کو اختیار کیا ہے۔

چنانچہ اکثر اہل علم کی رائے یہ ہے کہ جس طرح عام دنوں میں ظہر کی نماز سے پہلے چار رکعات سنت موکدہ ہیں اسی طرح جمعہ کے دن جمعہ کی نماز سے قبل جمعہ کا وقت شروع ہونے کے بعد خطبہ سے پہلے چار رکعات سنت پڑھنی چاہئے، ظہر کی نماز سے پہلے بعض روایات میں دو اور بعض میں چار رکعات سنت کا ذکر ملتا ہے، زیادہ تر روایات چار رکعات کی ہیں، لہٰذا اکثر اہل علم کے نزدیک ظہر سے پہلے کی چار رکعت سنت ہے، ترمذی کی روایت ہے، ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نقل کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "جو شخص دن رات میں بارہ رکعات نماز پڑھے اس کے لئے جنت میں گھر بنایا جاتا ہے، چار رکعات ظہر سے پہلے اور دو رکعات اس کے بعد، اور دو رکعات مغرب کے بعد اور دو رکعات عشاء کے بعد اور دو رکعات فجر سے پہلے[1] "۔

اسی طرح ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: "جو شخص ظہر سے پہلے چار رکعات اور اس کے بعد چار رکعات کی پابندی کرے تو اللہ تعالیٰ اس پر جہنم کی آگ حرام کر دیتا ہے[2]۔

صحیح بخاری کی ایک روایت میں ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا یہ فرماتی ہیں: "بلاشبہ نبی کریم ﷺ ظہر سے پہلے چار رکعات اور صبح سے پہلے دو رکعات ترک نہیں فرماتے تھے"[3] ۔

جب روزانہ عام دنوں میں ظہر سے پہلے سنت ثابت ہے تو چونکہ جمعہ کے دن جمعہ کی نماز، نماز ظہر کی جگہ اور اس کے بدلہ ہی میں ہے، لہٰذا قیاساً جمعہ سے پہلے بھی وہی سنت ہونی چاہئے جو ظہر سے پہلے

---

[1] سنن الترمذي، حديث: 414

[2] سنن ابی داود، حدیث: 1269 وجامع الترمذی، حدیث: 428 وسنن ابن ماجہ، حدیث: 1160 وسنن النسائی: 3/265، حدیث: 1814، ومسند امام احمد: 6/426، حدیث: 27948 وصحیح ابن خزیمہ: 2/205، حدیث: 1190

[3] صحيح البخاري، حديث: 1182، سنن أبي داود، كتاب التطوع، باب 1 ، حديث: 1253، وسنن النسائي، حديث: 1757-1758

ثابت ہے، چنانچہ نماز ظہر پر قیاس کرتے ہوئے جمعہ سے پہلے بھی بعض اہل علم کے نزدیک چار رکعات سنت موکدہ ہیں، بعض روایات سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے، جس میں نماز جمعہ سے قبل رسول اللہ ﷺ کا دو رکعات اور ایک روایت میں چار رکعات پڑھنے کا ذکر ہے، چنانچہ امام طبرانی نے سیدنا علیؓ سے نقل کیا ہے: "رسول اللہ ﷺ جمعہ کی نماز سے پہلے اور جمعہ کے بعد چار رکعات پڑھا کرتے تھے، اور آخر میں (چوتھی رکعت میں) سلام پھیرتے تھے[1]"۔

اس حدیث کے تمام راوی ثقہ اور مستند ہیں صرف محمد بن عبد الرحمٰن سہمی مختلف فیہ راوی ہے، جسے امام بخاری اور اثرم نے ضعیف قرار دیا ہے[2] لیکن ابن حبان نے ان کا شمار ثقات یعنی مستند راویوں میں کیا ہے، اور ابن عدی نے ان کے بارے میں فرمایا: عندي لا بأس به[3] ۔ بہرحال یہ روایت "حسن" درجہ کو پہنچتی ہے۔

اور جمعہ کی نماز سے قبل سنت کے بارے میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "صحیح اور جید سند سے منقول ہے، جیسا کہ حافظ عراقی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ا جمعہ سے پہلے چار رکعات پڑھا کرتے تھے، اور ترمذی نے نقل کیا ہے کہ سیدنا عبد اللہ بن مسعود ص جمعہ سے پہلے چار رکعات اور جمعہ کی نماز کے بعد چار رکعات پڑھتے تھے، اور ظاہر ہے کہ ان کا یہ عمل رسول اللہ ا کے عمل کے مشاہدہ کے بعد ہی ہوا ہوگا[4] "

---

[1] المعجم الأوسط: 172/2 روایت: 1617 ، اخرجه الطبراني في الاوسط وقال الحافظ في الفتح"وفيه محمد بن عبد الرحمن السهمي وهوضعيف عند البخاري وغيره، وقال الاثرم" انه حديث واه" قال صاحب إعلاء السنن محمد بن عبدالرحمن هذا قال فيه ابن عدي" عندي لابأس به"وذكر ه ابن حبان في الثقات كما في اللسان فالرجل مختلف فيه وحديث مثله حسن وبقية الرجال رجال ثقات ويشعر به سكوت الحافظ عنهم ايضا، وقال علي القاري في المرقاة وقدجاء باسناد جيد. (اعلاء السنن، ص: 7/ص:13)

[2] دیکھئے: فتح الباری: 426/2، حدیث: 937 کے تحت

[3] لسان المیزان: 245/5، راوی: 7634-849

[4] مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: 893/3، باب السنن وفضائلها ، الفصل الاول، حديث: 1166 کے تحت

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان بھی نماز ظہر پر قیاس کرتے ہوئے جمعہ سے پہلے بھی سنتوں کے ثبوت کا معلوم ہوتا ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک باب کا عنوان اس طرح قائم کیا ہے: **باب الصلاۃ بعد الجمعۃ وقبلها** (کتاب الجمعۃ، باب: 39) ”جمعہ کے بعد اور اس سے پہلے (سنت) نمازوں کا بیان“ پھر اس باب کے تحت وہ روایت ذکر کی جس میں رسول اللہ ا کے ظہر سے پہلے سنت پڑھنے کا ذکر ہوا ہے، چنانچہ بعض شارحینِ بخاری کی رائے میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس روایت سے ظہر پر قیاس کرتے ہوئے جمعہ سے پہلے بھی سنت کو ثابت کرنا چاہتے ہیں [1] ۔

جمعہ کی نماز سے پہلے سنت پڑھنے کا معمول صحابۂ کرام ث سے بھی صحیح سند سے ثابت ہے، سیدنا عبداللہ بن مسعود ﷛ جمعہ سے پہلے چار رکعات اور جمعہ کے بعد چار رکعات پڑھتے تھے، جیسا کہ جامع ترمذی کی اوپر ذکر کردہ روایت سے معلوم ہوا، نیز عبدالرحمٰن سُلَمی کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود ﷛ نہ یہ کہ خود انہیں پڑھا کرتے تھے بلکہ ان کے پڑھنے کا حکم بھی دیا کرتے تھے:

عبداللہ بن مسعود ﷛ ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم نماز جمعہ سے پہلے چار رکعات اور نماز جمعہ کے بعد چار رکعات پڑھیں [2] ۔

ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ (جو بڑے پایہ کے تابعی اور مشہور محدث وفقیہ ہیں) کا بیان ہے کہ صحابہ کرام ﷡ کا معمول مبارک بھی جمعہ سے پہلے چار رکعات سنت پڑھنے کا تھا:

عن ابراہیم قال: کانوا یصلون قبلها أربعا ۔

ابن سعد کی طبقات کبریٰ جلد: 8 صفحہ: 491 پر ایک خاتون راویہ ”صافیہ“ رحمۃ اللہ علیہا کا بیان ہے کہ ”میں نے سیدہ صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا کو دیکھا کہ انہوں نے امام کے نکلنے سے پہلے چار

---

[1] دیکھئے: فتح الباری: 426/2

[2] مصنف عبد الرزاق: 247/3، کتاب الجمعة، باب الصلاة قبل الجمعة وبعدها، روایت: 5525 و المعجم الکبیر: 310/9 روایت: 9551 و 9552 ، رواه عبد الرزاق في مصنفه كذا في نصب الراية وفي الدراية رجاله ثقات، وفي آثار السنن اسناده صحيح وهو موقوف في حكم المرفوع (اعلاء السنن، ج: 7/ص: 9-10)

رکعات نماز پڑھی اور امام کے ساتھ دو رکعات جمعہ ادا کی" شیخ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے[1]۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے بارے میں منقول ہے کہ یہ حضرات جمعہ سے پہلے کی سنت کے ادائیگی کے لئے زوال شمس کا انتظار فرمایا کرتے تھے، جیسے ہی زوال ہوتا تھا جمعہ سے قبل کی سنت ادا کرتے تھے، چنانچہ علامہ ابن قدامہ مقدسی رحمۃ اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں: "عمرو بن سعید بن العاص اپنے والد سعید بن العاص رحمہم اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ملاقات کرتا تھا، تو جب زوال شمس ہوتا یہ حضرات کھڑے ہوتے اور چار رکعات پڑھتے تھے، ابو بکر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں حبیب بن ابی ثابت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جمعہ کی نماز کے وقت حاضر تھا، وہ فرماتے تھے کہ اب تک زوال شمس ہوا یا نہیں؟ یا وہ خود ملاحظہ کرتے تھے، جب زوال شمس ہو جاتا تو وہ جمعہ سے پہلے کی چار رکعات سنت ادا کرتے تھے، ابو عبیدہ رحمۃ اللہ علیہ، عبد اللہ بن مسعود ص کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ جمعہ کی نماز سے پہلے چار رکعات پڑھا کرتے تھے، اور جمعہ کی نماز کے بعد بھی چار رکعات پڑھتے تھے[2]"۔

الغرض اس طرح کی اور بہت سی روایات کے پیش نظر فقہاء احناف، بعض شوافع وحنابلہ، امام اوزاعی، سفیان ثوری، عبد اللہ بن مبارک اور اہل علم کی ایک بڑی جماعت (رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین) جمعہ کی نماز سے پہلے چار رکعات سنت کی قائل ہے۔

---

[1] الأجوبة النافعة،ص: 25

[2] المغني لابن قدامة: 3/250 ،كتاب صلاة الجمعة، فصل فاما الصلاة قبل الجمعة ، مسئلہ: 297

نمازِ جمعہ کے بعد کی سنت:

"سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص نماز جمعہ پڑھ چکے تو اس کے بعد چار رکعات (سنت) پڑھے[1]"

"تم میں سے جو شخص جمعہ کے بعد نماز پڑھنے والا ہو، تو اسے چاہئے کہ چار رکعات پڑھے، امام ابو عیسی ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے[2]"

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم جمعہ کی نماز پڑھ لو تو اس کے بعد چار رکعات مزید پڑھو[3]"

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اکثر کتب حدیث میں یہ روایت ملتی ہے کہ آپ جمعہ کے بعد گھر آکر دو رکعات نماز پڑھتے تھے، سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں: "آپ نماز جمعہ کے بعد کچھ نہیں پڑھتے تھے، یہاں تک کہ گھر لوٹتے پھر دو رکعات نماز ادا فرماتے[4]"

یہ آپ ﷺ کا عمل مبارک تھا جبکہ قوی روایت میں آپ اسے نماز جمعہ کے بعد چار رکعات پڑھنے کا حکم ثابت ہے، جیسا کہ اوپر ذکر کردہ احادیث سے معلوم ہوا، چنانچہ اکثر اہل علم کے نزدیک جمعہ کی نماز کے بعد چار رکعات نماز سنت ہے، جب کہ بعض علماء فعلی روایت یعنی رسول اللہ ﷺ کے معمول

---

[1] صحيح مسلم، كتاب الجمعة، باب 18 الصلاة بعد الجمعة، حديث: 881، وسنن النسائي، كتاب الجمعة، باب 42 عدد الصلاة بعد الجمعة في المسجد، حديث: 1426

[2] سنن الترمذي، كتاب الجمعة، باب 376 ماجاء في الصلاة قبل الجمعة وبعدها، حديث: 523، والسنن الكبرى للنسائي: 82/1، كتاب الصلاة، عدد الصلاة بعد الجمعة، حديث: 501

[3] سنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب 236-237 الصلاة بعد الجمعة، حديث: 1131، وسنن ابن ماجة، كتاب اقامة الصلاة، باب 95 ماجاء في الصلاة بعد الجمعة، حديث: 1132

[4] صحيح البخاري، كتاب الجمعة، باب 39 الصلاة بعد الجمعة وقبلها، حديث: 937، وصحيح مسلم، كتاب الجمعة، باب 18 الصلاة بعد الجمعة، حديث: 882، نيز دیکھئے: صحيح البخاري، أبواب التهجد، باب 25 ماجاء في التطوع مثنى مثنى، حديث: 1165، وايضا باب 29 التطوع بعد المكتوبة، حديث: 1172، وصحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب 15 فضل السنن الراتبة، حديث: 729

مبارک کو دیکھتے ہوئے دو رکعات سنت پڑھنے کو بھی کافی سمجھتے ہیں، امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں: "اور بعض اہل علم کے نزدیک اسی پر عمل ہے اور اسی کے قائل امام شافعی واحمد رحمہما اللہ تعالیٰ ہیں[1] "

بعض اہل علم نے قولی و فعلی روایتوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ جو شخص جمعہ کے بعد مسجد میں سنتیں پڑھے تو اسے چاہئے کہ چار رکعات پڑھے اور اگر گھر جا کر سنت پڑھے تو دو رکعات پڑھے، چنانچہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں: "اسحاق کہتے ہیں کہ جمعہ کے دن اگر مسجد میں سنت پڑھے تو چار رکعات پڑھے اور اگر اپنے گھر میں سنت ادا کرے تو دو رکعات پڑھے[2] "

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی کہنا ہے، چنانچہ علامہ سید سابق نے علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے: "ابن القیم فرماتے ہیں کہ رسول اللہ اجب جمعہ کی نماز پڑھتے تو گھر میں داخل ہو کر دو رکعات پڑھتے تھے، اور آپ انے جمعہ پڑھنے والوں کو جمعہ کے بعد چار رکعات پڑھنے کا حکم فرمایا ہے، ہمارے شیخ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں اگر مسجد میں نماز پڑھے تو چار رکعات پڑھے اور اگر گھر آ کر پڑھے تو دو رکعات پڑھے[3] "

جنابِ رسول اللہ اکی قولی و فعلی روایتوں کو جمع کرتے ہوئے سیدنا امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ جمعہ کے بعد چھ رکعات سنتیں پڑھی جائیں۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ جمعہ کے بعد چھ رکعات پڑھے... امام ابویوسف کے قول کی وجہ جیسا ہم نے اوپر بیان کیا آپ اکے قول و فعل کو جمع کرنا ہے[4] ۔

---

[1] سنن الترمذی، حدیث: 521 کے تحت

[2] سنن الترمذي، حدیث: 523 کے تحت

[3] فقہ السنۃ: 296/1، باب الجمعۃ، ط: دار الریان للتراث، القاہرۃ

[4] بدائع الصنائع: 266/2، فصل فی الصلاۃ المسنونۃ، ط: دار الکتب العلمیۃ، بیروت

جمعہ کی نماز کے بعد چھ رکعات سنت پڑھنے کا معمول سیدنا علی ص سے بھی منقول ہے، چنانچہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نقل کرتے ہیں: "سیدنا علی ؓ حکم دیا کرتے تھے کہ جمعہ کے بعد دو رکعات پڑھے پھر چار رکعات پڑھے[1]۔

ترمذی ہی کی روایت میں عطار حمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ میں نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو جمعہ کے بعد دو رکعات پھر چار رکعات پڑھتے دیکھا[2]۔

اذان جمعہ:

امام ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے سائب بن یزید کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں جمعہ کے دن پہلی اذان اس وقت ہوتی تھی جب جمعہ کے دن امام منبر پر بیٹھ جاتا تھا، پھر جب سیدنا عثمان بن عفان ؓ کی خلافت کا زمانہ آیا اور مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تو انہوں نے جمعہ کے دن تیسری اذان کا حکم دیا (یہ تیسری اذان اس اعتبار سے ہے کہ جمعہ کی اصل اذان کے ساتھ اقامت کو بھی اذان ہی کے درجہ میں شمار کیا گیا ہے) چنانچہ یہ اذان زوراء کے مقام پر دی گئی اور اب تک یہ سلسلہ جاری وساری ہے[3]۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جمعہ کی ایک ہی اذان ہوا کرتی تھی، خلیفہ راشد سیدنا عثمان غنی ؓ نے اپنے عہد خلافت میں اکابر صحابہ ث کی موجودگی میں ایک اور اذان کا اضافہ فرمایا، جس کو

---

[1] سنن الترمذي، حديث: 523 کے تحت

[2] سنن الترمذي، كتاب الجمعة، باب 376 ماجاء في الصلاة قبل الجمعة وبعدها، حديث: 523م

[3] صحيح البخاري، كتاب الجمعة، باب 25 التأذين عند الخطبة، حديث: 916 اور دیکھئے: صحيح البخاري، كتاب الجمعة، باب 21 الأذان يوم الجمعة، حديث: 912، وسنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب 217-219 النداء يوم الجمعة، حديث: 1087، وسنن النسائي، كتاب الجمعة، باب 15 الأذان للجمعة، حديث: 1392، نیز دیکھئے: سنن الترمذي، كتاب الجمعة، باب 372 ماجاء في أذان الجمعة، حديث: 516، وسنن ابن ماجة، كتاب أوقات الصلاة، باب 97 ماجاء في الأذان يوم الجمعة، حديث: 1135

حدیث میں تیسری اذان شمار کیا گیا ہے، اور یہ منقول نہیں کہ صحابہ ث نے اس سے کوئی اختلاف کیا ہو پھر یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تو لازم پکڑو میری سنت کو اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کو اور اسے مضبوطی سے تھام لو[1] ۔

لہٰذا ایسے امور میں خلفاء راشدین کی اتباع بھی رسول اللہ ا کی اتباع ہے اسی لئے ائمہ سنت والجماعت جمعہ کی دو اذان پر متفق ہیں، صاحب فتح القدیر علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: " کسی مسلمان نے بھی اس اذان کا انکار نہیں کیا ہے[2] "۔

آج تک حرمین شریفین میں اور دنیائے اسلام کے تمام خطوں میں یہی معمول چلا آرہا ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "یہ حکم ثابت ہوگیا، اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس حکم کو لوگوں نے تمام ممالک و علاقوں میں اختیار کیا، کیوں کہ سیدنا عثمان بن عفان ﷺ اس وقت خلیفۃ المسلمین تھے، جن کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے[3] "۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی موافقت میں مملکت سعودی عرب کی افتاء کمیٹی "اللجنۃ الدائمۃ" نے بھی خلیفۂ ثالث امیر المؤمنین سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے صحابۂ کرام ﷺ کے موجودگی میں اس عمل اور جمعہ کی اذان اوّل کو سنت اور مشروع قرار دیتے ہوئے اسے اجماع سکوتی کہا ہے کہ اس پر نکیر اور انکار کی گنجائش نہیں[4] ۔ پس جمعہ کی دو اذانیں سنت کے مطابق ہیں۔

---

[1] سنن ابن ماجة، كتاب المقدمة، باب 6 اتباع سنة الخلفاء الراشدين المهديين، حديث: 42 صحيح، وسنن أبي داود، كتاب السنة، باب 5 في لزوم السنة، حديث: 4607، وسنن الترمذي، كتاب العلم، باب 16 ماجاء في الأخذ بالسنة واجتناب البدع، حديث: 2676

[2] فتح القدير: 38/2

[3] فتح الباري: 394/2، كتاب الجمعة، باب: 21 الأذان يوم الجمعة، حديث: 912 کے تحت

[4] اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء: 8/ 198-200، فتویٰ: 1647، سوال: 1 و فتویٰ: 2601، سوال: 1

دوسری اذان جمعہ:

مولانا اشرف الدین دہلوی غیر مقلد عالم دین فرماتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے دوسری اذان کی ابتداء کی اس کو گمراہی کہنا غلو ہے۔

تلاوت قرآن کا ثواب مردے کو ایصال:

تلاوت کلام پاک کا خواب میں مردے کو پہنچتا ہے چنانچہ اہل حدیث عالم دین محمد اسماعیل امیر یمانی فرماتے ہیں: "اور احمد اور حنفیہ اور علما کی ایک جماعت کہتی ہیں کہ قراءت قرآن بلکہ کوئی بھی عبادت مردے کو اس کا ثواب پہنچتا ہے، چنانچہ ابو داؤد میں حضرت معقلؓ سے روایت ہے کہ مردوں پر سورۃ یسین پڑھو" ۔(سبل السلام، 206/1)

فتاوی نذیریہ (719/1) یہی بات قاضی شوکانی نے نیل الاوطار میں لکھی ہے کہ قراءت قرآن کا ثواب میت کو پہنچتا ہے (نیل الاوطار 335/3) اور مولانا عبد الرحمٰن مبارک پور صاحب فرماتے ہیں کہ متاخرین علمائے اہل حدیث نے خصوصا محمد بن اسماعیل امیر نے سبل السلام میں حنفیہ کے مسلک کو دلیل کے اعتبار سے قوی فرمایا ہے۔اور لکھتے ہیں کہ علامہ ابن النحویؒ شرح منہاج میں فرماتے ہیں کہ مختار یہ ہے کہ قراءت قرآن کا ثواب میت کو پہنچتا ہے۔ یہی بات مولانا ثناء اللہ امر تسری اہل حدیث فرماتے ہیں چنانچہ امام نووی کتاب الاذکار میں لکھتے ہیں کہ مروزی مرحوم نے کہا کہ امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ فاتحہ اور تین قل قبرستان میں پڑھو مردوں کو اس کا ثواب پہنچتا ہے، امام سیوطیؒ نے اس کے لئے بڑں حوالے جمع فرمائے ہیں اور فرمایا کہ اس میں ضعف ہے، لیکن سب ملکر یہ روایت صحیح یا حسن کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ بلکہ ابن القیم کتاب الروح میں فرماتے ہیں کہ بغیر اجرت کے قرآن پڑھنے کا ثواب مردے تک پہنچتا ہے، یہی بات سبل السلام میں بھی ہے۔

امام بخاری تراویح پڑھنے کے بعد تہجد پڑھا کرتے تھے[1]۔ شیخ الکل فی الکل ثم قل اہل حدیث میاں نذیر حسین دہلوی صاحب تراویح کے بعد تہجد پڑ پا کرتے تھے ۔(الحیاۃ بعد المماۃ)

---

[1] سیرۃ البخاری، ص: 75، تیسیر الباری، ج: 1/ص: 49

زبیر علی زئی صاحب فرماتے ہیں وسندہ صحیح علی شرط مسلم (توفیق الباری، ص: 42)
ثابت عنانی قبر میں نماز پڑھتے تھے کیونکہ انہوں نے دعا کی تھی کہ یا اللہ میں چاہتا ہوں کہ مرنے کے بعد قبر میں بھی میں نماز پڑھوں۔ (طبقات ابن سعد، 233/7)
علی زئی صاحب فرماتے ہیں سندہ صحیح (توضیح الاحکام، 172/1)
جنت اور دوزخ کا کشف ہو سکتا ہے چنانچہ حضرت عائشہؓ اپنا گھر جنت میں دیکھتی [1]۔
حدیث "من صلی علی قبری سمعتہ" الصارم المنکی میں ہے یہ حدیث معنا صحیح ہے (ص: 131) حضور ﷺ صلاۃ ور سلام قبر کے قریب سے سنتے ہیں اور حافظ ابن تیمیہ فتاوی ابن تیمیہ (ج: 29/ ص: 110) میں لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں کمزوری ہے لیکن دیگر شواہد کی وجہ سے یہ مضبوط حدیث ہے۔ ابن جوزی نے ابن مروان کے طریق کی وجہ سے اس حدیث پر تنقید کی ہے لیکن ابو شیخ کے طریق سے بھی مروی ہے۔ ابن حجر اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں بسند جید اور علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں سندہ جید، نواب صاحب فرماتے ہیں اسنادہ جید (دلیل الطالب، ص: 844،) اس نظریے (کہ قبر کے قریب نبی پاک ﷺ درود سنتے ہیں) کو شیخ الکل فی الکل میاں نذیر صاحب فتاوی نذیریہ، (52/1) اور مفتی عبد الستار فتاوی ستاریہ میں (117/4) اور وحید الزمان صاحب رفع العجاجہ سنن ابن ماجہ (814/1)
الجلیلی صحیفہ اہل حدیث میں (ص: 18) یکم محرم 1384ھ اور مولانا عطاء اللہ حنیف اہل حدیث التعلیقات السلفیہ میں (ج:1/ص:237)

تہجد، قیام الیل، قیام رمضان اور وتر

فضیلت:

سیدنا ابو امامہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
تہجد ضرور پڑھا کرو کیونکہ وہ تم سے پہلے صالحین کی روش ہے اور تمہارے لئے اپنے رب کے قریب کا وسیلہ، گناہوں کے مٹانے کا ذریعہ اور مزید گناہوں سے بچنے کا سبب ہے [1]۔

[1] ابن کثیر 393/3، فوائد سلفیہ، ص: 670، کرامات اہل حدیث، ص: 28

سیدنا ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس شخص پر اللہ کی رحمت ہو جو رات کو اٹھا، پھر نماز تہجد پڑھی اور اپنی بیوی کو جگایا، پھر اس نے نماز پڑھی۔ پھر اگر بیوی غلبہ نیند کے باعث) نہ جاگی تو اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اس عورت پر بھی اللہ کی رحمت ہو جو رات کو اٹھی، پھر نماز تہجد پڑھی اور اپنے خاوند کو جگایا۔ (پھر اس نے بھی نماز پڑھی) پھر اگر خاوند (غلبہ نیند کے باعث) نہ جاگا تو اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے[2]۔

ہم غیر مقلد احباب کی ذکر کردہ روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اس روایت کی سند میں ایک راوی ابن عجلان ہے جو عن کے ساتھ روایت کر رہے ہیں اور اس روایت کو صحیح کہنے والا خود {جزء قرات ص: 160} پر اس کو مدلس تسلیم کرتا ہے اور {جزء رفع یدین ص: 77} میں بھی ابن عجلان کو مدلس کہتا ہے۔ نیز {تسہیل الوصول ص: 227} پر ابن عجلان کو ضعیف کہتا ہے یہاں روایت پھر کیسے صحیح ہو گئی؟۔

سیدنا ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فرض نماز کے بعد سب نمازوں سے افضل رات تہجد کی نماز ہے[3]۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب انسان سوتا ہے تو شیطان اس کے سر کی گدی پر تین گرہیں لگاتا ہے اور ہر گرہ کے ساتھ کہتا ہے کہ رات بڑی لمبی ہے تو سو یارہ، پھر اگر وہ بیدار ہو کر اللہ کا ذکر کرے تو ایک گرہ کھل جاتی ہے اور اگر وضو کرے تو دوسری گرہ کھل جاتی ہے اور اگر نماز پڑھے تو تیسری گرہ بھی کھل جاتی ہے۔ اور وہ شادمان اور پاک نفس ہو کر صبح کرتا ہے ورنہ اس کی صبح خبیث اور سست نفس کے ساتھ ہوتی ہے[4]

---

[1] ابن خزیمہ حدیث 1135

[2] ابو داؤد باب قیام اللیل حدیث 1308'1450

[3] مسلم باب فضل صوم المحرم حدیث 1163

[4] بخاري باب عقد الشيطان علي قفية الرأس اذا لم يصل بالليل حديث 142'3269

اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ہر رات جب ایک تہائی رات باقی رہ جاتی ہے آسمان دنیا پر نزول فرما کر فرماتا ہے: کوئی ہے جو مجھے پکارے، میں اس کی دعا قبول کروں؟ کوئی ہے جو مجھ سے مانگے، میں اسے دوں؟ کوئی ہے جو مجھ سے بخشش طلب کرے؟ میں اسے بخش دوں[1]

نبی رحمت ﷺ کا شکر کرنے کا اندازہ

سیدنا مغیرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رات کو تہجد میں اتنا لمبا قیام کرتے کہ آپ کے پاؤں سوج جاتے۔ آپ سے سوال ہوا: آپ اتنی مشقت کیوں کرتے ہیں۔ حالانکہ آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف ہیں؟ آپ نے فرمایا: کیا پھر جب اللہ تعالیٰ نے مجھے نبوت کے انعام، مغفرت کی دولت اور بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے) میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں[2] ۔

نیند سے بیدار ہونے کی دعائیں:

سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب رات کو بستر سے تہجد کے لئے اٹھتے تو یہ پڑھتے:

اللہ اکبر ، الحمد للہ ، سبحان اللہ وبحمدہ ، سبحان الملک القدوس ، استغفر اللہ

لا الہ الا اللہ اللھم انی اعوذبک من ضیق الدنیا وضیق یوم القیامۃ

اللہ سب سے بڑا ہے، ساری تعریف اللہ کے لئے ہے، اللہ اپنی تعریف سمیت ہر عیب سے پاک ہے، میں نہایت ہی پاکیزہ بادشاہ کی پاکی بیان کرتا ہوں، میں اللہ سے بخشش طلب کرتا ہوں۔ اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں ہے۔ اے اللہ! میں دنیا اور روز قیامت کی تنگیوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں[3] ۔

پھر کہتے:

---

[1] بخاري باب الدعاء والصلاة من اخر الليل حديث 1145 مسلم صلاة المسافرين باب الترغيب في الدعاء والذكر في اخر الليل حديث 758

[2] بخاري باب قيام النبي صلي الله عليه وسلم الليل حديث 1130'4836' مسلم باب اكثار الاعمال حديث 2819

[3] ابوداؤد باب مايقول اذا صبح حديث 5085

اللھم اغفر لی واھدنی وارزقنی وعافنی۔

اے اللہ! مجھے معاف فرمادے، مجھے ہدایت عطا کر، مجھے رزق دے اور عافیت سے نواز۔

ہم غیر مقلد حباب کے مستدل روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں اس حدیث میں ایک راوی بقیہ بن ولید ہے اور یہ وہ راوی ہے کہ محدثین تدلیس میں ان کی مثالیں دیا کرتے ہیں { طبقات المدلسین ص: 22 } ۔ یہ راوی ضعفا اور مجہولین سے کثرت کے ساتھ تدلیس کرنے میں مشہور ہیں { طبقات المدلسین ص: 76 }۔

پھر وضو وغیرہ کرکے تہجد شروع کرتے[1]۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص رات کو نیند سے جاگے اور کہے:

لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ . لہ الملک ولہ الحمد .وھو علی کل شیء قدیر

الحمد للہ وسبحان اللہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ایک ہے،اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کے لئے ساری بادشاہی اور اسی کے لئے ساری تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر خوب قدرت رکھنے والا ہے۔ساری تعریف اللہ کے لئے ہے،اللہ ہر عیب سے پاک ہے،اللہ سب سے بڑا ہے،بدی سے بچنے اور نیکی کرنے کی کوئی طاقت نہی ہے مگر اللہ کی توفیق ہے۔

اللھم اغفر لی

اے اللہ! مجھے بخش دے۔

یا کوئی اور دعا کرے تو قبول ہو گی۔اور اگر وضو کرکے نماز پڑھتے تو وہ بھی قبول کی جائے گی۔

رسول اللہ ﷺ تہجد کے لئے اٹھے تو آپ نے بیٹھنے کے بعد آسمان کی طرف نظر کرکے سورۃ آل عمران کی آخری گیارہ آیات ۱۹۰۔۲۰۰ پڑھیں[1]۔

---

[1] ابو داؤد باب مایستفتح بہ الصلاۃ من الدعاء حدیث 766

تہجد کی دعائے استفتاح:

سیدنا ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ رات کو تہجد کے لئے کھڑے ہوتے تو تکبیر تحریمہ کے بعد یہ پڑھتے:

اللھم لک الحمد انت قیم السموات والارض ومن فیھن .ولک الحمد لک ملک السموات والارض ومن فیھین .ولک الحمد انت نور السموات والارض .ولک الحمد انت ملک السموات والارض ولک الحمد، انت الحق ووعدک الحق ولقائک الحق وقولک الحق والجنة حق والنار حق والنبیون حق ومحمد حق والساعة حق، اللھم لک اسلمت وبک امنت وعلیک توکلت والیک انبت وبک خاصمت والیک حاکمت فاغفرلی ما قدمت وما أخرت وما اسررت وما اعلنت . انت المقدم وانت المؤخر لا الہ الا انت .

الٰہی! تیرے ہی لئے ساری تعریف ہے۔ زمین و آسمان اور جو کچھ ان میں ہے، سب کو تو ہی قائم رکھنے والا ہے۔ تیرے ہی لئے ساری تعریف ہے۔ زمین و آسمان اور جو کچھ انمیں ہے، اس سب کی بادشاہی تیرے ہی لئے ہے۔ تیرے ہی لئے ساری تعریف ہے۔ تو ہی روشن کرنے والا ہے زمین وآسمان کو۔ تیرے ہی لئے ساری تعریف ہے۔ تو ہی بادشاہ ہے زمین وآسمان کا۔ تیرے ہی لئے ساری تعریف ہے۔ تو حق ہے اور دنیا وآخرت کے متعلق) تیرا وعدہ حق ہے (آخرت مین) تیری ملاقات حق ہے۔ تیرا کلام حق ہے۔ جنت حق ہے۔ جہنم حق ہے۔ تمام انبیاء حق ہے۔ محمد ﷺ حق ہیں اور قیامت حق ہے۔ الٰہی! میں تیرے سامنے جھک گیا، میں صرف تیرے ساتھ ایمان لایا، میں نے صرف تجھی پر بھروسا کیا، میں نے صرف تیری طرف رجوع کیا۔ صرف تیری مدد سے (دشمنوں سے) جھگڑتا ہوں۔ میں نے صرف تجھے اپنا حاکم مانا، سو تو میرے اگلے پچھلے اور ظاہر و پوشیدہ اور جنہیں

---

[1] بخاري باب 17 ان في خلق السموات والارض وباب 18 الذين يذكرون الله قياما وقعودا حديث 4569'4570

تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے (سارے کے سارے) گناہ معاف کر دے۔ تو ہی آگے کرنے والا اور پیچھے ڈالنے والا ہے۔ تیرے سوا کوئی سچا معبود نہیں ہے[1]۔

رسول اللہ ﷺ کی نماز تہجد کی کیفیت:

رسول اللہ ﷺ کی نماز تہجد کا حسن اور طول بیان نہیں ہو سکتا[2]۔

سیدنا ابو ذرؓ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے تہجد میں قیام کیا اور اس آیات کو عجز والحاح سے بار بار پڑھتے صبح کر دی: وان تعذبھم فانھم عبادک وان تغفر لھم فانک انت العزیز الحکیم

اگر تو انہیں عذاب دے تو وہ تیرے ہی بندے ہیں اور اگر انہیں معاف کر دے تو یقینا تو غالب اور حکمت والا ہے[3]۔

سیدنا حذیفہؓ نے نبی اکرم ﷺ کو تہجد پڑھتے دیکھا۔ وہ کہتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ کے بعد آپ نے سورۃ بقرہ پڑھی، پھر رکوع کیا اور آپ کا رکوع آپ کے قیام کی مانند تھا (قیام کی طرح رکوع بھی کافی طویل کیا)، پھر آپ نے رکوع سے سر اٹھایا اور آپ کا قومہ آپ کے رکوع کی مانند تھا (رکوع کی طرح قومہ بھی کافی لمبا کیا)، پھر آپ نے سجدہ کیا اور آپ کا سجدہ آپ کے قومے کی مانند تھا (قومہ کی طرح سجدہ بھی کافی لمبا کیا)، پھر سجدے سے سر اٹھایا اور آپ کے قومے کی مانند تھا (قومہ کی طرح سجدہ بھی کافی لمبا کیا)، پھر سجدے سے سر اٹھایا اور آپ دونوں سجدوں کے درمیان (جلسے میں) اپنے سجدے کی مانند بیٹھے تھے (سجدے کی طرح جلسے میں بھی دیر لگائی اور خوب اطمینان کیا)۔ اس طرح آپ نے چار رکعتوں میں سورۃ بقرہ سورۃ آل عمران، سورۃ نساء اور سورۃ مائدہ پڑھیں[4]۔

---

[1] بخاري باب التهجد بالليل حديث 120 مسلم باب الدعاء في صلاة الليل وقيامه حديث 769

[2] بخاري باب قيام النبي صلي الله عليه وسلم بالليل في رمضان وغيره حديث 1147

[3] نسائي باب ترديد الاية 2 / 177 حديث1009

[4] ابوداؤد باب مايقول في ركوعه وسجوده حديث 874

سبحان اللہ! یہ تھی نبی رحمت ﷺ کی نماز تہجد۔ صرف چار رکعات میں سواسات پارے پڑھے، پھر رکوع، قومے، سجدے اور جلسے کی درازی اور ان میں تسبیحات اور دعاؤں کو کثرت سے پڑھنا آپ پر ختم تھا۔

سیدنا حذیفہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک رات نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نفلی نماز میں شریک ہوا۔ آپ نے سورۃ بقرہ شروع کی۔ میں نے سوچا کہ آپ سو آیات پڑھ کر رکوع میں جائیں گے، مگر آپ پڑھتے رہے۔ آپ نے سورۃ بقرۃ ختم کر کے سورۃ نساء شروع کر لی، پھر اسے ختم کر کے سورۃ آل عمران کو پڑھنا شروع کر دیا، اسے بھی ختم کر ڈالا۔ آپ نہایت آہستگی سے پڑھے جاتے تھے۔ جب ایسی آیت کی تلاوت کرتے جس میں تسبیح کا ذکر ہوتا تو سبحان اللہ کہتے۔ اگر کچھ مانگنے کا ذکر ہوتا تو سوال کرتے، اگر پناہ مانگنے کا ذکر ہوتا تو اعوذ باللہ پڑھتے۔ سورۃ آل عمران ختم کر کے آپ ﷺ نے رکوع کیا[1]۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تلاوت قرآن میں ترتیب کا خیال رکھنا ضروری نہیں کیونکہ آپ ﷺ نے آل عمران کی تلاوت النساء کے بعد کی، حالانکہ آل عمران ترتیب میں النساء سے پہلے ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے سیدنا عبد اللہ بن عمروؓ سے کہا: مجھے بتلایا گیا ہے کہ تم ساری رات نفل پڑھتے ہو اور دن کو روزہ رکھتے ہو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہاری آنکھ کمزور اور طبیعت سست ہو جائے گی۔ تمہاری جان اور تمہارے بال بچوں کا بھی تم پر حق ہے، اسلئے روزہ رکھو اور افطار بھی کرو۔ رات کو قیام کرو اور نیند بھی[2]۔

نبی اکرم ﷺ تین دن سے کم میں قرآن مجید ختم کرنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپ نے سیدنا عبد اللہ بن عمروؓ سے فرمایا: ایک ماہ میں قرآن پاک ختم کر لیا کرو۔ انہوں نے عرض کی کہ میں اس زیادہ تلاوت کرنے کی طاقت رکھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: تو بیس دن میں ختم کر لیا کرو۔ انہوں نے کہا: میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو دس دنوں میں ختم کر لیا کرو۔ انہوں

---

[1] مسلم باب استحباب تطویل القراءة في صلاة اللیل حدیث 772

[2] بخاري باب 20 حدیث 1153، 1974

نے کہا کہ میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ پھر آپ ﷺ نے انہیں قرآن پاک تین دن میں ختم کرنے کی اجازت دے دی اور فرمایا: قرآن پاک سے اس شخص کو پوری سمجھ حاصل نہیں ہو سکتی جو تین دن سے کم مدت میں قرآن پاک ختم کرتا ہے[1] ۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص رات کے نوافل میں دو سو آیات تلاوت کرتا ہے، وہ اطاعت گزار، مخلص لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔[2] نبی اکرم ﷺ ساری نوافل نہیں پڑھتے تھے۔[3]

آپ ﷺ کی تین دعائیں:

سیدنا خباب بن ارتؓ جو بدری صحابی ہیں، ایک رات نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھے۔ فرماتے ہیں کہ آپ تمام رات بیدار رہے۔ (۵) اور نوافل ادا کرتے رہے یہاں تک کہ صبح صادق ہو گئی۔ جب آپ نے نماز سے پھیرا تو سیدنا خبابؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان! آج رات جس طرح آپ نے نوافل پڑھے، اس سے پہلے میں نے کبھی آپ کو اس طرح نماز ادا کرتے نہیں دیکھا، آپ نے فرمایا: تم نے درست کہا۔ یہ وہ نماز تھی جس میں اللہ کے ساتھ اشتیاق بڑھایا گیا اور اس کے عذاب سے پناہ مانگی گئی، چنانچہ میں نے اللہ تعالیٰ سے تین سوال کئے جن میں سے دو قبول ہوئے:

ایک سوال یہ کہ اللہ میری امت کو سابقہ امتوں کی طرح تباہ وبرباد نہ کرے، اسے اللہ نے قبول فرما یا۔ دوسرا سوال یہ کہ میری ساری امت پر بیک وقت دشمنوں کو غلبہ حاصل نہ ہو، یہ بھی قبول کر لیا گیا،، پھر مین نے سوال کیا کہ امت محمدیہ میں اختلاف رونما نہ ہو، لیکن اسے قبول نہیں کیا گیا۔[4]

---

[1] بخاري باب صوم يوم وافطار يوم حديث 1978 وباب في كم يقرأ القران حديث 5054 مسلم باب النهي عن صوم الدهر حديث 1159 ترمذي باب 11 حديث 6954

[2] سنن دارمي باب من قرأ بمائة اية حديث 3451

[3] مسلم باب جامع صلاة الليل حديث 746

[4] نسائي باب احياء الليل 3/ 216 و 217 حديث 1637

رسول اللہ ﷺ رات کے نوافل میں کبھی سری آہستہ اور کبھی جہری بلند آواز سے قراء ت فرماتے ۔[1]

جب آپ گھر میں نوافل ادا کرتے تو حجرے میں آپ کی قراء ت سنائی دیتی تھی[2]۔

تبصرہ:

ہم تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اس روایت کی سند میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن ابی الزناد ہے جو ان حضرات کے اصول کے مطابق ضعیف ہے۔ تفصیل گزر چکی ہے لہٰذا یہ حدیث ان کے اپنے ہی اصول سے ضعیف ہے (جو حدیث ان حضرات (غیر مقلد احباب) کے اصول کے مطابق ضعیف ہو تو لازمی نہیں کہ وہ تمام محدثین کے نزدیک بھی ضعیف ہو)۔

آپ ﷺ ایک رات باہر نکلے تو آپ نے دیکھا کہ سیدنا ابو بکرؓ آہستہ قراء ت سے نوافل پڑھ رہے ہیں اور سیدنا عمرؓ نوافل میں اونچی آواز سے قراء ت کر رہے ہیں۔جب وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے سیدنا ابو بکرؓ سے فرمایا: اے ابو بکر! رات میں آپ کے پاس سے گزرا، آپ پست آواز سے نوافل پڑھ رہے تھے انہوں نے عرض کی: پھر آپ نے سیدنا عمرؓ سے کہا: رات میرا آپ کے پاس سے گزر ہوا، آپ اونچی آواز کے ساتھ نفل پڑھ رہے تھے۔ تو انہوں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول میں سوئے ہوؤں کو بیدار کرنا چاہتا تھا کہ وہ بھی تہجد پڑھیں اور شیطان کو بھگانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس پر آپ نے سیدنا ابو بکرؓ کو ذرا اونچی آواز سے اور سیدنا عمرؓ کو ذرا نیچی آواز سے پڑھنے کا حکم دیا[3] ۔ رسول اللہ ﷺ کی نماز شب کا معمول

سیدہ امی عائشہ صدیقہؓ نبی اکرم ﷺ کی نماز شب کا معمول بیان فرماتی ہیں:

---

[1] ترمذي باب ماجاء بالقراءة في قراءة الليل حديث 449 ابن ماجة باب ماجاء في القراءة في صلاة الليل حديث 1354

[2] ابو داؤد باب رفع الصوت بالقراءة في صلاة الليل حديث 1327

[3] ابو داؤد باب رفع الصوت بالقراءة في صلاة الليل حديث 1329

رمضان ہوتا یا غیر رمضان، رسول اللہ ﷺ رات کی نماز بالعموم گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ پہلے آپ چار رکعت پڑھتے، پس ان کی خوبی اور درازی نہ پوچھو، پھر آپ چار رکعت پڑھتے، پس ان کی خوبی اور درازی (بھی کچھ نہ پوچھو۔ پھر آخر میں آپ تین رکعت وتر پڑھتے [1] ۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

قیام اللیل کا طریقہ:

رسول اللہ ﷺ کا بالعموم وتر پڑھنے کا طریقہ، سیدہ عائشہؓ یوں بیان فرماتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نماز عشاء سے فجر تک گیارہ رکعتیں پڑھتے۔ ہر دو رکعتوں پر سلام پھیرتے اور ایک رکعت وتر پڑھتے [2] ۔

تبصرہ:

ہم (اہل سنت) جوابا عرض کرتے ہیں کہ اس دعوے کا دلیل کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے بالعموم وتر کا طریقہ جو خود حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں وہ مسلم کی اسی باب میں مذکور ہے۔ جس کو اس کتاب میں پہلے بعنوان "رسول اکرم ﷺ کی نماز شب کا معمول" میں لائے ہیں۔ سیدہ امی عائشہ رضی اللہ عنہا نبی اکرم ﷺ کی نماز شب کا معمول بیان فرماتی ہے کہ رمضان ہو یا غیر رمضان رسول اللہ ﷺ {رات کی نماز بالعموم} گیارہ رکعت سے زیا دہ نہیں پڑھتے تھے۔۔۔پھر آخر میں آپ ﷺ تین رکعت وتر پڑھتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کی وتر پڑھنے کا معمول تین رکعت بیان فرماتی ہے۔

﴿ غیر مقلد احباب آگے فرماتے ہیں: ﴾

رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بھی یہی تعلیم دی، چنانچہ سیدنا ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رات کی نماز دو، دو رکعتیں ہے۔ جب صبح صادق ہونے کا خطرہ ہو تو ایک رکعت پڑھ لو، یہ ایک رکعت، پہلی ساری نماز کو طاق بنا دے گی [1] ۔

---

[1] بخاري باب قيام النبي صلى الله عليه وسلم بالليل في رمضان وغيره حديث 1147'2013

[2] مسلم باب صلاة الليل وعدد ركعات النبي صلى الله عليه وسلم في الليل حديث 736

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وتر آخر رات میں ایک رکعت ہے[2]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم رات کو نوافل پڑھنا شروع کرو تو پہلے دو ہلکی رکعتیں ادا کرو[3]۔

آپ نے رات کا قیام کیا۔ پہلے دو ہلکی رکعتیں پڑھیں، پھر دو طویل رکعتیں پڑھیں، پھر ان سے ہلکی دو طویل رکعتیں پڑھیں، پھر ان سے ہلکی دو طویل رکعتیں، پھر ان سے ہلکی دو طویل رکعتیں، پھر ان سے ہلکی دو رکعتیں، پھر ایک رکعت وتر پڑھا، یہ تیرہ رکعتیں ہوئیں۔ آپ کی ہر دو رکعتیں پہلے والی دو رکعتوں سے ہلکی ہوتی تھیں[4]۔

سیدہ عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک رکعت وتر پڑھتے۔ (آخری) دو رکعتوں اور ایک رکعت کے درمیان سلام پھیر کر بات چیت بھی کرتے[5]۔

تبصرہ:

ہم عرض کرتے کہ یہ حدیث ان حضرات کے اصول کے مطابق ضعیف ہے۔ اس کی سند میں زہری ہے جو عن سے روایت کرتے ہیں جن کو {جزء قرات ص: 43} پر مدلس کہا ہے۔

سیدنا ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ وتر کی اور ایک رکعت میں سلام سے فصل جدائی کرتے[6]۔

سیدنا ابن عباسؓ سے کہا گیا کہ امیر المؤمنین سیدنا معاویہؓ نے ایک ہی وتر پڑھا ہے۔ سیدنا ابن عباسؓ نے فرمایا کہ انہوں نے درست کام کیا وہ فقیہ اور صحابی ہیں[1]۔

---

[1] بخارب باب ماجاء في الوتر حديث990'993مسلم باب صلاة الليل مثني مثني حديث749

[2] مسلم باب صلاة الليل مثني مثني حديث756

[3] مسلم باب الدعاء في صلاة الليل وقيامه حديث 768

[4] مسلم باب الدعاء في صلاة الليل وقيامه حديث 765

[5] ابن ابي شيبة 291/2'ابن ماجة حديث1177

[6] ابن حبان حديث678

امام مروزیؒ فرماتے ہیں کہ فصل (وتر کی دو رکعتوں کے بعد سلام پھیر کر ایک رکعت الگ پڑھنے) والی احادیث زیادہ ثابت ہیں۔

سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رات کو کبھی سات، کبھی نو اور کبھی گیارہ رکعتیں پڑھتے تھے[2]۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے قیام اللیل سات رکعات سے تیرہ رکعات تک فرمایا ہے۔

پانچ، تین اور ایک وتر:

سیدنا ابو ایوبؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وتر ہر مسلمان پر حق ہے، لہٰذا جو شخص پانچ رکعات وتر پڑھنا چاہئے تو پانچ رکعات پڑھے اور جو کوئی تین رکعات وتر پڑھنا چاہے تو تین رکعات پڑھتے اور جو کوئی ایک رکعت وتر پڑھنا چاہے تو ایک رکعت وتر پڑھے[3]۔

غیر مقلد احباب کے اس متدل کے جواب میں ہم عرض کرتے ہیں کہ اس روایت کی سند میں زہری ہے جن کو علی زئی صاحب مدلس کہتا ہے۔ پھر بھی زہری کی عنعنہ روایت سے استدلال کرنا، چہ معنی دارد۔

رسول اللہ ﷺ رات کو کل تیرہ رکعات پڑھتے اور ان میں پانچ رکعات وتر پڑھتے تھے اور ان پانچ وتروں میں کسی رکعت میں تشہد کے لئے نہ بیٹھے مگر آخر میں[4]۔

معلوم ہوا کہ وتروں کی پانچوں رکعتوں کے درمیان تشہد کے لئے کہیں نہیں بیٹھنا چاہئے بلکہ پانچوں رکعتیں پڑھ کر قعدہ میں التحیات، درود اور دعا پڑھ کر سلام پھیر دینا چاہئے۔

---

[1] بخاري باب ذكر معاوية حديث 3765'3764

[2] بخاري باب كيف صلاة النبي صلي الله عليه و سلم حديث 1139

[3] ابو داؤد باب كم الوتر حديث 1422 نسائي 239'238/3

[4] مسلم باب صلاة الليل وعدد ركعات النبي صلي الله عليه و سلم في الليل حديث 737

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

تین وتروں کی قراءت:

سیدہ عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ پہلی رکعت وتر میں سبح اسم ربک الاعلیٰ دوسری میں قل یایھا الکفرون اور تیسری میں قل ھو اللہ احد پڑھتے تھے[1]۔

تبصرہ:

ہم تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اس روایت کی سند میں ایک راوی یحی بن سعید انصاری ہے۔ جو کہ مدلس ہے {اسماء المدلسین لسیوطی}۔ نیز اس راوی پر دوسرے محدثین کی جرح {کہ یہ ضعیف ہے اور منکر روایات نقل کرتا ہے} کے علاوہ ان حضرات کے ہاں معتبر محدث دارقطنی {موطا ص:55} نے بھی اس کو ضعیف کہا ہے {تہذیب الکمال}۔ تو یہ حدیث انہی کے اصول کے مطابق ضعیف ٹھہری۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ایک رات میں دو بار وتر پڑھنا جائز نہیں[2]۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین وتر نہ پڑھو۔ پانچ یا سات وتر پڑھو اور مغرب کی مشابہت نہ کرو[3]۔

معلوم ہوا کہ وتر میں نماز مغرب کی مشابہت نہیں ہونی چاہئے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: رات کو اپنی آخری نماز وتر کو بناؤ۔[4]

اور فرمایا: وتر آخر رات میں ایک رکعت ہے۔[5]

---

[1] بیھقي 37/3حاکم 520/ 2'35/1

[2] ابو داؤد باب في نقض الوتر حدیث1439

[3] دار قطني 27'25/2

[4] مسلم باب صلاۃ اللیل مثني مثني والوتر رکعة من اخر اللیل حدیث 751

[5] مسلم باب صلاۃ اللیل مثني مثني حدیث752

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص آخر رات میں نہ اٹھ سکے تو وہ اول شب وتر پڑھ لے اور جو آخر رات اٹھ سکے، وہ آخر رات وتر پڑھے کیونکہ آخر رات کی نماز افضل ہے[1] ۔

سیدہ عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اول رات، رات کے وسط اور پچھلی رات ،یعنی رات کے ہر حصے میں وتر پڑھے[2] ۔

سعد بن ہشامؒ نے سیدہ عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا: اے مومنوں کی ماں! مجھے رسول اللہ ﷺ کے وتر کے بارے میں بتلائیں تو سیدہ عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا: میں آپ ﷺ کے لئے مسواک کرتے اور وضو کا پانی تیار رکھتی۔ پھر جب اللہ چاہتا آپ کو رات کے وقت اٹھاتا تو آپ مسواک کرتے اور وجو کرتے اور نو رکعات نماز وتر پڑھتے سات رکعتوں میں التحیات نہ بیٹھتے بلکہ) آٹھویں رکعت کے بعد قعدے میں بیٹھتے، پس اللہ کو یاد کرتے، اس کی تعریف کرتے اور دعا مانگتے، پھر سلام پھیرتے اور ہم کو سلام کی آواز سناتے، پھر بیٹھے بیٹھے دو رکعتیں پڑھتے۔ یوں آپ گیارہ رکعات ادا فرماتے۔ ام المؤمنینؓ فرماتی ہیں: بیٹا! جب رسول اللہ ﷺ بری عمر کو پہنچے اور جسم بھاری ہو گیا تو آپ سات رکعات وتر پڑھتے تھے اور بعد میں دو رکعتیں بھی پڑھتے، یوں نو رکعات ہو جاتیں۔ آپ اس بات کو پسند کرتے تھے کہ اپنی نماز پر ہمیشگی کریں۔ جب نیند یا بیماری کا غلبہ ہوتا اور رات کو قیام نہ کر سکتے تو دن میں بارہ رکعات نفل پڑھتے اور میں نہیں جانتی کہ آپ نے ایک رات میں پورا قرآن پڑھا ہو یا ساری رات نماز پڑھی ہو یا رمضان کے علاوہ کسی اور مہینے میں پورا مہینہ روزے رکھے ہوں[3] ۔

اس حدیث شریف سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک یہ کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک سلام کے ساتھ نو وتر پڑھے اور سات بھی۔ دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ آپ ہر دو رکعتوں کے بعد التحیات نہیں

---

[1] صحیح مسلم ،صلاۃ المسافرین ،باب من خاف ان لا یقوم من آخر اللیل فلیوتر اولہ،حدیث: 755۔

[2] صحیح البخاری ،الوتر ، باب ساعات الوتر ،حدیث؛996،وصحیح مسلم ،صلاۃ المسافرین ،باب صلاۃ اللیل ،وعدد رکعات النبی ﷺ ،حدیث: 745۔

[3] صحیح مسلم ،صلاۃ المسافرین ،باب جامع صلاۃ اللیل ومن نام عنہ اومرض ،حدیث: ٧٤٦۔

بیٹھتے تھے بلکہ صرف آٹھویں رکعت میں تشہد پڑھتے اور سلام پھیرے بغیر کھڑے ہو جاتے اور پھر آخری طاق رکعت کے آخر میں حسب معمول تشہد پڑھ کر سلام پھیر دیتے تھے۔

وتر تین رکعت:

ایک رکعت وتر کا ذکر احادیث کی کتابوں میں ملتا ہے، مگر حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ حکم پہلے تھا اب منسوخ ہو گیا ہے اور ان کی دلیل یہ حدیث ہے:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بیترا (دم بریدہ، دم کٹی) نماز سے منع فرمایا ہے، یعنی آدمی ایک رکعت نماز سے وتر پڑھے۔

احادیث اگر ایسی ہوں کہ ان میں سے بعض سے کسی چیز کا جواز معلوم ہوتا ہے اور بعض سے اس کی ممانعت معلوم ہوتی ہے تو فقہا عام طور پر (اگر دونوں طرح کی احادیث صحیح ہیں) ممانعت والی روایت کو اباحت والی روایت پر ترجیح دیتے ہیں، اسی میں احتیاط بھی ہے۔

بخاری شریف اور مسلم شریف ارو احادیث کی دیگر کتابوں میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مشہور حدیث جس میں ہے کہ "ثم یصلی ثلاثا[1]" یعنی حضور اکرم ﷺ (تہجد کی چار چار رکعت پڑھ کر) تین رکعت وتر پڑھتے تھے۔

نسائی شریف اور مؤطا امام مالک میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت ہے:

حضور ﷺ وتر کی پہلی دو رکعتوں میں جب بیٹھتے تو سلام نہیں پھیرتے تھے[2]۔

امام حاکم نے اسی روایت کو ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

حضور ﷺ وتر کی پہلی دو رکعتوں میں سلام نہیں پھیرتے تھے[3]۔

---

[1] رواہ بخاری، آثار السنن باب الوتر بثلاث رکعات، ص: 230

[2] رواہ النسائی وآخرون واسنادہ صحیح، (آثار السنن، ص: 231-232)

[3] عند الحاکم فی المستدرک وقال ہذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین ولم یخرجاہ (آثار السنن فی الحاشیۃ، ص: 232)

امام حاکم نے اسی روایت کو ایک اور سند سے نقل کیا ہے جس کے الفاظ اور بھی واضح ہے: کہ رسول اللہ ﷺ تین وتر پڑھتے تھے اور آخر میں سلام پھیرتے تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بھی اسی طرح وتر پڑھتے تھے اور انہیں سے اہل مدینہ نے بھی یہ وتر لیا۔

ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے حضور ﷺ وتر کی پہلی رکعت میں سبح اسم ربک الاعلی پڑھتے دوسری رکعت میں قل یا ایہا الکافرون اور تیسری رکعت میں قل ھو اللہ احد پڑھا کرتے تھے۔

مؤطا امام مالک میں حضر عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان منقول ہے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ مجھے سرخ سرخ اونٹ کے بدلے میں بھی پسند نہیں ہے کہ میں وتر کو تین رکعت سے ساتھ چھوڑوں۔

بعض روایتوں میں وتر کی نماز کو مغرب کی نماز کی طرح بتلایا گیا ہے اس تشبیہ سے متعین ہے کہ وتر کی نماز تین ہی رکعت ہے، مؤطا امام محمد میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ اثر منقول ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہے کہ وتر کی نماز تین رکعت ہے مغرب کی نماز کی طرح۔ اسی ایک اثر مؤطا امام محمد میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا بھی ہے وہ فرماتے ہیں کہ " الوتر کصلوۃ المغرب "یعنی وتر کی نمام مغرب کی نماز طرح ہے۔

مؤطا امام محمد میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان بھی منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ "ما اجزأت رکعة واحدة قط" یعنی ایک رکعت نماز کبھی کفایت نہیں کرے گی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو حضور ﷺ کی تہجد اور وتر کی نماز کی سب سے زیادہ واقف کار تھیں (اس لئے کہ حضور ﷺ یہ نمازیں گھر میں پڑھا کرتے تھے) وہ فرماتی ہے "ان رسول اللہ ﷺ لا یسلم فی رکعتی الوتر" یعنی حضور اکرم ﷺ دو رکعتوں میں سلام نہیں پھیرا کرتے تھے، اور میں پہلے بتلا چکا ہوں کہ جب جواز اور ممانعت دونوں کو بتلانے والی احادیث مین تعارض ہوگا تو ممانعت والی حدیث کو علما

ترجیح دیتے ہیں، مصنف ابن ابی شیبہ حضرت مکحول کا یہ اثر ہے فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وتر کی تین رکعتیں پڑھیں اور ان رکعتوں میں سلام سے فصل نہیں کیا۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں اسی طرح کی بات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے..... مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت حسن سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ:

مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ وتر کی نماز تین رکعتیں ہیں اور آخر میں سلام ہے۔

اختصار سے کام لیتے ہوئے یہ چند احادث اور آثار پیش کئے ہیں ورنہ تو اس موضوع پر ایک دفتر تیار ہو سکتا ہے.....جو حضرات ایک رکعت وتر پڑھتے ہیں وہ ثابت نہیں کر سکتے کہ حضور ﷺ نے اپنی زندگی میں کبھی وتر کو ایک رکعت پڑھا ہو، حافظ ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ امام مالک نے تین رکعت وتر کو اس لئے اختیار کیا تھا کہ حضور ﷺ سے ایک رکعت وتر کا پڑھنا ثابت نہیں ہے، اور حضور اکرم ﷺ کی ہی سنت زیادہ حقدار ہے کہ اس کی اتباع کی جائے۔

مالکیہ کی مشہور کتاب الکافی میں ہے کہ امام مالک نے جو تین رکعت وتر کا قول اختیار کیا ہے وہی بہتر ہے اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ سے ایک رکعت وتر ثابت نہیں ہے حضور اکرم ﷺ کی سنت کا حق زیادہ ہے کہ اسے اختیار کیا جائے[1]۔

حضور اکرم ﷺ کے متعدد اصحاب سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ انہوں نے وتر کی نماز کو مغرب کی نماز کے ساتھ تشبیہ دی ہے، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جس طرح مغرب کی نماز پڑھی جاتی ہے وتر کی نماز بھی اسی طرح ہے اور اسی کیفیت کے ساتھ ہے۔

ائمہ حرم کے عمل کو دینی شرعی عمل مسلک میں حجت نہیں بنایا جا سکتا، اگر ان کا عمل کتاب وسنت سے مؤید نہیں ہے تو اس کو بلا تکلف رد کیا جائے گا، ائمہ حرم کے وتر کی نماز میں بہت طویل دعائیں مانگنا، زور زور سے دعائیں مانگنا اس طرح کی دعا حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہرگز ثابت

---

[1] ج: 1/ص: 259

نہیں ہے، مگر ائمہ حرم خوب دعائیں بالجہر کرتے ہیں اور البانیؒ اور ابن بازؒ کا کوئی ساتھی کبھی کھڑا نہیں ہوا کہ اس عمل سے ان کو روکے۔

اسی طرح جمعہ کا خطبہ ان کا بہت طویل ہوتا ہے، نماز مختصر اور خطبہ طویل یہ حضور اکرم ﷺ کی سنت نہیں ہے مگر ائمہ حرم یہ خطبہ دیتے ہیں۔

ائمہ حرم میں سے بعض لوگ وہ بھی ہیں کہ جن کا عمل یہ ہے کہ وہ رکوع سے اٹھ کر گردن کے قریب ہاتھ باندھ لیتے ہیں یہ محترم جناب البانیؒ اور ابن باز مرحوم کا ذاتی عمل ہے یہ حضور اکرم ﷺ کی سنت نہیں ہے نہ کسی صحابی کا یہ عمل تھا اور ائمہ دین میں سے کوئی اس کا قائل ہے یہ ابن باز رحمہ اللہ کا ذاتی فتوی ہے فقط۔

وتر:

فتح الباری میں ہے کہ اول حصہ سے مراد عشاء کے نماز کے بعد کا وقت ہے۔

چونکہ آپ ﷺ پابندی سے نماز تہجد ادا کرتے تھے اس وجہ سے عموماً وتر تہجد کے بعد ہی پڑھا کرتے تھے اور افضل یہی ہے کہ جو پابند تہجد ہو وہ رات کے آخری حصہ میں تہجد کے بعد وتر پڑھے جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔

آپ ﷺ کا آخری رات میں وتر پڑھنا غالباً اس وجہ سے تھا کہ آپ ﷺ کی عادت مبارکہ رات کے بیشتر حصہ میں نماز پڑھنے کی تھی[1]۔

مسند احمد میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

حضور ﷺ نے فرمایا کہ میرے رب نے مجھے ایک مزید نماز عطا کی ہے اور یہ وتر کی نماز ہے اس کا وقت عشاء سے طلوع فجر تک ہے۔

---

[1] الفتح ج: 2/ص: 487

ان تمام روایات سے معلوم ہوا کہ وتر کی نماز کا وقت عشاء کے بعد سے شروع ہو جاتا ہے اور جس نے تہجد سے پہلے عشاء کے بعد یا تراویح کے بعد نماز وتر پڑھ لی اب اس کو دوبارہ وتر کی نماز نہیں پڑھنی چاہیئے اس لئے کہ ایک رات میں دو وتر نہیں ہے اور یہی جمہور فقہا و محدثین کا مذہب ہے کہ ایک رات میں دو دفعہ وتر نہیں پڑھی جائے گی۔ حدیث پاک میں ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا لا وتران فی لیلۃ یعنی دو وتر ایک رات میں نہیں ہے یعنی دو وتر کو ایک رات میں پڑھنا جائز نہیں ہے امام ترمذی فرماتے ہیں کہ:

بعض اہل علم صحابہ کرام ﷺ اور تابعین کا یہ مذہب ہے کہ جب آدمی شروع رات میں وتر پڑھ لے پھر سو جائے اور پھر تہجد کے لئے اٹھے تو جتنی رکعت چاہے پڑھے اور اپنی وتر کو توڑے نہیں۔

پہلی وتر توڑنے کا مطلب یہ ہے کہ سو کر جب اٹھے صرف رکعت پہلے پڑھے تا کہ جو اس نے اول رات میں تین رکعت یا ایک رکعت وتر پڑھی ہے وہ دو رکعت یا چار رکعت ہو جائے اور نہ نماز وتر باقی نہ رہے، یہ مذہب اسحاق کا ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی اس قسم کا عمل منقول ہے فقہ میں اس مسئلہ پر "نقض وتر" کے عنوان سے بحث ہوتی ہے۔

اور جو اس نے وتر پڑھ لی ہے اس کو اسی طرح چھوڑ دے یہی سفیان ثوری، مالک بن انس، امام احمد اور ابن المبارک کا مذہب ہے اور یہی زیادہ صحیح قول ہے اس لئے کہ آپ ﷺ سے متعدد سندوں سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے وتر کے بعد بھی نماز ادا کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے صاف صاف اس بارے میں ممانعت منقول ہے، مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور عائذ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

جب تو شروع رات میں وتر پڑھ لے تو آخر رات میں مت پڑھ اور اگر آخر رات میں وتر پڑھے تو شروع رات میں مت پڑھ، یعنی تجھ کو وتر صرف ایک بار پڑھنا ہے۔

پھر امام ترمذی نے اس بات کی تائید میں کہ حضور ﷺ نے وتر کی نماز کے بعد بھی نفل نماز ادا کی ہے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث ذکر کی ہے کہ: "حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ وتر کے بعد دو رکعت نفل پڑھتے تھے۔"

پھر امام ترمذی فرماتے ہیں: "اس طرح کی روایت کہ آپ ﷺ وتر کے بعد بھی نفل پڑھا کرتے تھے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے علاوہ متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے"۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت مسلم شریف، ابوداؤد اور نسائی میں ہے مسلم شریف میں اس طرح روایت ہے کہ: "آپ ﷺ وتر کی نماز کے بعد بیٹھ کر نفل ادا کرتے تھے۔"

حضرت ابی امامہ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ پہلی رکعت میں سورۃ الزلزال اور دوسری میں قل یا ایہاالکافرون پڑھا کرتے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مصنف ابن ابی شیبہ میں ایک روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

من اوتر اول اللیل ثم قام فلیصل رکعتین رکعتین.

یعنی اگر کوئی شروع رات میں وتر ادا کرلے تو پھر تہجد میں دو دو رکعت کرکے نماز ادا کرے۔

بہت سے تابعین کا بھی یہی مذہب ہے جس کی تفصیل مصنف ابن ابی شیبہ اور احادیث کی دوسری کتابوں میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔

ابن قیم اس حدیث کو نقل کرکے فرماتے ہیں: حضور ﷺ کے قول کہ تم رات کی آخری نماز وتر کو بناؤ لوگوں نے استحباب پر محمول کیا ہے [1]

لیکن یہ استحباب اس کے لئے ہے جو نیند سے جاگ کر نوافل پڑھنے کا عادی ہو اور اس کو وثوق ہو کہ اس کی وتر چھوٹے گی نہیں۔

---

[1] زاد المعاد ج:1/ص: 333

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ آپ کی کیا رائے ہے کہ اگر میں سونے سے پہلے وتر پڑھ لوں پھر اٹھ کر نوافل پڑھوں تا آنکہ طلوع صبح ہو جائے (یعنی کیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کوئی حرج نہیں ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے حضرت سعید بن حارث نے اسی مسئلہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ: اگر تم کو نیند کا خوف ہو یا صبح ہو جانے کا خوف ہو تو پہلے وتر ادا کرو۔ مصنف ہی میں ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا تم وتر کب پڑھتے ہو تو انہوں نے فرمایا کہ میں عشاء کی نماز کے بعد شروع رات ہی میں سونے سے قبل وتر پڑھ لیتا ہوں پھر آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا تم وتر کب پڑھتے ہو تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں تو رات کے آخری حصہ میں وتر پڑھتا ہوں تو آپ ﷺ نے حضرت ابو بکر سے فرمایا: اخذت بالحزم تمہارا عمل احتیاط پر ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تو نے مضبوطی کو اختیار کیا ہے۔

غرض ان تمام احادیث و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ سونے سے قبل وتر پڑھنے کا معمول صحابہ کرامؓ میں تھا اور خود حضور ﷺ سے بھی اس کا ثبوت ہے۔

پس معلوم ہوا کہ تراویح کے بعد جو وتر پڑھ لیا جائے تو تہجد کے وقت اس کا اعادہ نہیں کرنا ہے بلکہ اس کا پہلا وتر ہی کافی ہے۔ جو لوگ ایک رات میں دو وتر پڑھتے ہیں ان کا یہ عمل اس حدیث کے خلاف ہے۔

غیر مقلد بزرگوں کے سابق علمائے کرام کا مذہب بھی یہی ہے کہ وتر پڑھ لینے کے بعد دوبارہ وتر ادا نہیں کی جائے گی مولانا مبارکپور تحفۃ الاحوذی میں فرماتے ہیں: میری نزدیک بھی پسندیدہ بات یہی ہے کہ ایک رات میں دو وتر نہ ادا کئے جائیں اس لئے مجھے کوئی ایک حدیث بھی صحیح مرفوع نہ ملی جس سے پہلی وتر کا توڑنا ثابت ہوتا ہو[1]۔

---

[1] ج: 1/ص: 345

البتہ غیر مقلد بزرگوں کا مؤقف ہے کہ وہ تراویح کو وتر کے ساتھ پڑھ کر تہجد کی نماز سے بھی اپنی ذمہ کو فارغ کر لیتے ہیں آخر شب تہجد پڑھنے کی سعادت سے محروم ہو جاتے ہیں اور اخیر شب میں تہجد پڑھنے کی جو فضائل ہیں یہ حضرات ان تمام فضیلتوں اور ثوابوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔

حضرت سعد بن ہشامؓ کو حضرت عائشہؓ نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ وتر کی دو رکعتوں میں سلام نہیں پھیرتے تھے [1]۔

ابن حجرؒ نے حضرت ابی بن کعبؓ کی روایت نقل کی ہے اس میں ہے کہ آپ تین وتروں کے آخر میں سلام پھیرا کرتے تھے اور حضرت عمرؓ سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ وہ تین وتر پڑھتے تھے اور صرف آخر میں سلام پھیرتے تھے [2]۔

اور یہی منقول ہے حضرت ابن مسعودؓ، حضرت انسؓ حضرت ابن مبارکؒ اور حضرت ابو العالیہؒ سے کہ وہ مغرب کی نماز کی طرح تین وتر پڑھتے تھے۔

مروزیؒ نے ابو اسحاق سے نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ او رحضرت ابن مسعودؓ کے تمام ساتھی وشاگرد بھی نماز وتر میں دو رکعت کے بعد سلام نہیں پھیرتے تھے [3]۔

ایک رکعت وتر:

چنانچہ حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں: وتر کی احادیث بکثرت ہونے کے باوجود ہم نہیں جانتے کہ کس حدیث میں یہ وارد ہوا ہے کہ نبی ﷺ نے وتر کی صرف ایک رکعت پڑھی ہے [4]۔

اور جس حدیث میں نبی ﷺ کا ارشاد " صلی رکعة واحدة " وارد ہے، یہ بھی اس میں صریح نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف ایک رکعت وتر پڑھنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ جن لوگوں نے اس

---

[1] قال الحاکم صحیح علی شرط الشیخین، زیلعی۔ (نسائی، کیف الوتر بثلاث)

[2] ملخص فتح الباری، ج: 2/ص: 481، کتاب الوتر

[3] مروزی، قیام اللیل، ص: 211

[4] تلخیص الحبیر، ج: 2/ص: 15

حدیث سے صرف ایک رکعت وتر پڑھنے پر استدلال کیا ہے، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اس پر ان کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں "یہ استدلال مردود ہے کیونکہ یہ حدیث صرف ایک رکعت پڑھنے میں صریح نہیں ہے، اس لئے کہ احتمال ہے کہ آپ ﷺ کی مراد " صلی رکعۃ واحدۃ (وہ شخص ایک رکعت پڑھے) سے یہ ہو کہ وہ شخص وتر کی پہلی دو رکعتوں کے ساتھ ایک اور رکعت ملا کر (تین وتر) پڑھے "۔ لہٰذا اس کی یہ منفرد حدیث ضعیف ہے [1]۔

وتروں کے سلام کے بعد کی دعا:

سیدنا ابی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ وتروں سے سلام پھیر کر تین بار یہ پڑھتے اور آخری دفعہ آواز کو بھی بلند فرماتے:

سبحان الملک القدوس

پاک ہے بادشاہ، نہایت پاک [2]

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: اگر کوئی شخص وتر پڑھنے سے سویا رہے پچھلی رات اٹھ نہ سکے یا وتر پڑھنا بھول جائے تو اسے جب یاد آئے وہ وتر پڑھ لے [3] ۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص رات کا وظیفہ یا اس کا کچھ حصہ پڑھنے سے سویا رہا اور اٹھ نہ سکا، پھر اسے نماز فجر سے ظہر کے درمیان ادا کر لیا تو سے رات ہی کے وقت ادا کرنے کا ثواب مل گیا۔ [4]

---

[1] فتح الباری، ج: 2/ ص: 410

[2] صحیح سنن ابی داؤد ،الوتر ،باب فی الدعاء بعد الوتر ،حدیث:1430،وھو حدیث صحیح ،وسنن النسائی فیما اللیل ، باب ذکر الاختلاف علی شعبۃ فیہ ، حدیث:۱۷۳۳۔امام ابن حبا ن نے الموارد ،حدیث:677میں اسے صحیح کہا ہے۔ [2]

صحیح سنن ابی داؤد ،الوتر ،باب فی الدعاء بعد الوتر ،حدیث:1431،وسندہ صحیح ،امام حاکم نے المستدرک 302/1: میں اور حافظ ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے۔

[4] صحیح مسلم ،صلاۃ المسافرین ، باب جامع صلاۃ اللیل ومن نام عنہ اور مرض ،حدیث:۷۴۷۔

ہمیں اپنا وظیفہ پورا کرنا چاہئے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب ترین عمل وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے، خواہ تھوڑا ہی ہو[1]۔

نبی اکرم ﷺ نے سیدنا عبد اللہ بن عمرو ابن العاص ؓ سے فرمایا: اے عبد اللہ! تو فلاں شخص کی طرح نہ ہو جانا جو رات کا قیام کرتا تھا، پھر اس نے رات کا قیام چھوڑ دیا[2]۔

وتر کی تین رکعات کے درمیان میں قعدہ کا ثبوت:

نسائی شریف میں ہے "و فی کل رکعتین التحیة" اس کی تصحیح مسلم شریف کی ایک طویل حدیث میں ہے: "و کان یقول: فی کل رکعتین التحیة۔ آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ ہر دو رکعت پر التحیات ہے[3]۔

غیر مقلد احباب فرماتے ہیں کہ اگر تین رکعات پڑھو تو درمیانی قعدے میں نہ بیٹھو اس کے خلاف دلائل:

1۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا: رات کی نماز دو دو رکعت ہے۔ پھر جب دو رکعت کے بعد تو (التحیات پڑھ کر) سلام کا ارادہ کرے تو کھڑا ہو کر ایک رکعت ملا لے تو وتر ہو جائیں گے۔ قاسم بن محمد فرماتے ہیں میں نے تین وتر ہی لوگوں کو پڑھتے پایا ہے[4]۔

2۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک رات میں نے اپنی والدہ کو (جو آنحضرت ﷺ کی خادمہ تھیں) جناب رسول اقدس صلی اللہ علیہ و سلم کے گھر خاص اس مقصد

---

[1] صحیح البخاری، الرقاق، باب القصد والمداومة علی العمل، حدیث: 6464، 6465؛ وصحیح مسلم، صلاة المسافرین، باب فضیلة العمل الدائم من قیام اللیل وغیرہ ۔۔۔، حدیث: 786۔

[2] صحیح البخاری، التہجد، باب ما یکرہ من ترک قیام اللیل لمن کان یقومہ، حدیث: 1152۔

[3] صحیح مسلم جلد 2 ص 353 باب ما یجمع صفة الصلوة و ما یفتتح بہ و ما یختم بہ الخ مکتبة البشری۔

[4] صحیح بخاری جلد 1 ص 270 باب ما جاء فی الوتر الطاف اینڈ سنز کراچی۔

کے لیے بھیجا تاکہ وہ دیکھیں کہ آنحضرت ﷺ نے جب وتر ادا فرمائے تو پہلی رکعت میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى پڑھی۔ دوسری رکعت میں قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ پڑھی۔ اس کے بعد قعدہ اولی کیا۔ اس کے بعد کھڑے ہوئے اور ان دو رکعتوں کو سلام کے ساتھ تیسری رکعت سے جدا نہیں فرمایا۔ اس کے بعد تیسری رکعت میں (فاتحہ کے بعد) قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ پڑھی یہاں تک کہ جب اس سے فارغ ہوئے تو اللہ اکبر کہا اس کے بعد قنوت پڑھی اور پھر رکوع فرمایا۔ (رواہ ابن عبد البر فی الاستیعاب)

3۔ وہ تمام احادیث جن میں نماز وتر کو نماز مغرب جیسا قرار دیا گیا ہے وہ بھی درمیانی قعدہ کے لیے دلیل ہیں کیونکہ مغرب کے تین فرضوں کی دو رکعتوں کے بعد اگر التحیات نہ پڑھے یعنی قعدہ نہ کرے تو بالاتفاق سجدہ سہو واجب ہے۔

وتر کی نماز مغرب کی طرح ہے اس کی صحت:

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالی عنہما سے روایت ہے کہ مغرب کی نماز دن کے وتر ہیں۔ اسی طرح تم رات کی نماز کو وتر بنادو[1]۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

دعائے قنوت:

سیدنا ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں:

وأن رسول الله ﷺ كان يوتر بثلاث ركعات، ويقنت قبل الركوع

رسول اللہ ﷺ تین وتر پڑھتے اور دعائے قنوت رکوع سے پہلے پڑھتے تھے[2]۔

تبصرہ:

---

[1] ابن ابی شیبہ، احمد، علامہ عراقی فرماتے ہیں اس کی سند صحیح ہے۔ (زرقانی شرح موطا جلد 1 ص 223)

[2] صحیح سنن النسائی، قیام اللیل، باب ذکر اختلاف الفاظ الناقلین ۔۔۔، حدیث: ۱۷۰۰، وسنن ابن ماجہ، اقامۃ الصلوات، باب ما جاء فی القنوت قبل الرکوع وبعدہ، حدیث: ۱۱۸۲، وهو حدیث صحیح،

ہم تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اس روایت کی سند میں سفیان عن کے ساتھ روایت کررہے ہیں ان کے بارے میں محقق علی زئی صاحب کا تبصرہ دیکھئے۔"لہٰذا سفیان ثور جو کہ ضعفا اور مجاہیل سے تدلیس کرتے تھے کہ یہ معنعن {عن والی} روایت ضعیف ہے {نوا العینین ص:138}۔ قارئین کرام پوری کتاب میں آپ پڑھ چکے کہ کتنے مقامات پر سفیان کم معنعن {عن والی} روایات کو صحیح کہا ہے۔آپ خود ہی فیصلہ کریں۔

وتر میں رکوع کے بعد قنوت کی تمام روایات ضعیف ہیں اور جو روایات صحیح ہیں، ان میں صراحت نہیں کہ آپ ﷺ کا رکوع کے بعد والا قنوت، قنوت وتر تھا یا قنوت نازلہ، لہٰذا صحیح طریقہ یہ ہے کہ وتر میں قنوت، رکوع سے قبل کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے مسجد کے اندر دو ستونوں کے درمیان لٹکی ہوئی رسی دیکھی تو پوچھا: یہ کیا ہے؟لوگوں نے کہا: یہ سیدہ زینبؓ کی رسی ہے وہ رات کو نفل نماز پڑھتی رہتی ہیں، پھر جب سست ہو جاتی ہیں یا تھک جاتی ہیں تو اس رسی کو پکڑ لیتی ہیں۔آپ ﷺ نے فرمایا: اسے کھول دو، ہر شخص اپنی نشاط اور چستی کے موافق نماز پڑھے، پھر جب سست ہو جائے یا تھک جائے تو آرام کرے[1]۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اتنا عمل اختیار کرو جس قدر تمہیں طاقت ہو۔اللہ کی قسم ! اللہ ثواب دینے سے نہیں تھکتا لیکن تم عمل کرنے سے تھک جاؤ گے[2]۔

سیدنا حسن بن علیؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے کچھ کلمات سکھائے تاکہ میں انہیں قنوت وتر میں کہوں:

---

[1] صحیح مسلم التہجد، باب ما یکرہ من التشدید فی العبادۃ، حدیث: ۱۱۵۰

[2] مسلم باب امر من نعس في صلاته ....بان یرقد حدیث 785

اللهم اهدنی فیمن هدیت وعافنی فیمن عافیت وتولنی فیمن تولیت وبارک لی فیما اعطیت وقنی شر ما قضیت فانک تقضی ولا یقضی علیک انه لا یذل من والیت ولا یعز من عادیت تبارکت ربنا وتعالیت

اے اللہ! مجھے ہدایت دے کر ان لوگوں کے زمرے میں شامل فرما جنہیں تو نے رشد و ہدایت سے نوازا ہے اور مجھے عافیت دے کر ان لوگوں میں شامل فرما جنہیں تو نے عافیت بخشی ہے اور جن لوگوں کو تو نے اپنا دوست بنایا ہے، ان میں مجھے بھی شامل کر کے اپنا دوست بنا لے۔ جو کچھ تو نے مجھے عطا فرمایا ہے، اس میں میرے لئے برکت ڈال دے اور جس شر و برائی کا تو نے فیصلہ فرمایا ہے، اس سے مجھے محفوظ رکھ۔ یقینا تو ہی فیصلہ صادر فرماتا ہے، تیرے خلاف فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا اور جس کا تو والی بنا وہ کبھی ذلیل و خوار اور رسوا نہیں ہو سکتا اور وہ شخص عزت نہیں پا سکتا جسے تو دشمن کہے، ہمارے پروردگار! تو بڑا برکت والا اور بلند و بالا ہے[1] ۔[2]

[1] صحیح سنن ابی داؤد، الوتر، باب القنوت فی الوتر، حدیث: ۱۴۲۶، ۱۴۲۵، وھو حدیث، وجامع الترمذی، الوتر، ماجاء فی القنوت فی الوتر، حدیث: ۴۶۴۔ امام ترمذی نے اسے حسن اور امام ابن خزیمہ نے حدیث: ۱۰۹۵ میں صحیح کہا ہے

[2] تبصرہ: اس روایت کی سند میں ایک راوی ابو اسحاق السبیعی ہے اور عن سے رویت کرتے ہیں اور اس حدیث کو یہاں صحیح کہنے والے محقق علی زئی صاحب {جزء قرات ص: 68} پر فرماتے ہیں: اس کی سند میں ابو اسحاق السبیعی ہے جو کہ مشہور مدلس ہے۔ تو یہ روایت علی زئی صاحب کے اصول کے مطابق مشہور مدلس کی وجہ سے ضعیف ٹھہری۔

تنبیہات: دعائے قنوت وتر میں ہاتھ اٹھانے کے بارے میں کوئی مرفوع روایت نہیں ہے۔ البتہ مصنف ابن ابی شیبہ (۲/۱۰۱ فی رفع الیدین فی قنوت الوتر) میں بعض آثار ملتے ہیں۔ اس لئے ہاتھ اٹھا کر یا ہاتھ اٹھائے بغیر دونوں طریقوں سے قنوت وتر کی دعا پڑھنا صحیح ہے[1]۔

ربنا تعالیت کے بعد نستغفرک و نتوب الیک کے الفاظ رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں موجود نہیں ہیں بلکہ یہ بعض علماء کی طرف سے اضافہ ہے۔

سیدنا ابن عمرؓ کے سامنے ایک آدمی کو چھینک آئی تو اس نے الحمد للہ والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ کہا، یہ سن کر سیدنا ابن عمرؓ فرمانے لگے: میں بھی الحمد للہ والصلاہ والسلام علی رسول اللہ کہہ سکتا ہوں مگر رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر ہمیں یہ تعلیم نہیں دی بلکہ یہ فرمایا ہے: چھینک آنے پر الحمد للہ علی کل حال پڑھا جائے[2] [3]۔

سیدہ عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی بات شامل کی جو اس میں سے نہیں ہے تو وہ مردود ہے[4]"۔

معلوم ہو کہ مسنون اذکار اور دعاؤں میں اپنی طرف سے کسی قسم کی زیادتی نہیں کرنی چاہئے۔

---

[1] ہم غیر مقلد احباب کے ان ارشادات پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ یہ حضرات خود فرمارہے ہیں کہ اس بارے میں کوئی مرفوع روایت نہیں۔ اور پھر بعض آثار کی وجہ سے اس کو جائز کہتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ نبی ﷺ کے علاوہ سب غیر معصوم ہیں۔ اور غیر معصوم کے اقوال کو لینا تقلید ہے۔ اور آپ کے ہاں تقلید گمراہی ہے {نور العینین ص: 25}۔

[2] جامع الترمذی ،الادب ،باب ما یقول العاطس اذا عطس؟حدیث:۲۷۳۸،وسندہ حسن ،امام حاکم نے المستدرک: ۲۶۵،۲۶۶/۴ میں اور امام ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے

[3] تبصرہ: حدیث میں الصلوۃ کا لفظ نہیں ہے یہ اضافہ ہے صرف السلام کا لفظ ہے۔

[4] صحیح البخاری ،الصلح ،باب اذا اصطلحوا علی صلح جور فالصلح مردود،حدیث:۲۶۹۷،وصحیح مسلم الاقضیۃ ،باب نقض الاحکام الباطلۃ ورد محدثات الامور، حدیث ۱۷۱۸

صحیح ابن خزیمہ (حدیث: ۱۱۰۰) میں سیدنا ابی بن کعبؓ سے ثابت ہے کہ وہ سیدنا عمرؓ کے دور میں رمضان میں قیام اللیل کراتے اور قنوت میں نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجتے تھے۔ لہٰذا قنوت وتر کے آخر میں صلی اللہ علی النبی پڑھنا درست ہے۔

دعائے قنوت کا مقام:

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت عاصمؒ کی یہ روایت کتاب المغازی میں عبد العزیز کی روایت کے مطابق ہے جس میں ایک شخص نے حضرت انسؓ سے پوچھا کہ دعائے قنوت رکوع کے بعد ہے یا قراءۃ سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے فرمایا بلکہ قراءۃ سے فارغ ہونے کے بعد[1]۔

علامہ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ حضرت انسؓ کی تمام روایات کو پیش نظر رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دعائے قنوت کسی خاص وجہ سے (دعا وغیرہ کے لئے) پڑھی جائے تو بالاتفاق وہ رکوع کے بعد ہے اور جو قنوت عام حالات میں پڑھی جائے تو حضرت انسؓ سے صحیح طور پر یہی ثابت ہے کہ وہ رکوع سے پہلے ہے۔

حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ وتر پڑھتے اور دعائے قنوت رکوع سے پہلے پڑھتے تھے۔

عمل صحابہ رضی اللہ عنہم:

حضرت علقمہ فرماتے ہیں کہ ابن مسعود اور نبی کریم ﷺ کے دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم رکوع سے قبل دعائے قنوت پڑھتے تھے[2]۔

اور یہی منقول ہے حضرت ابن عباس، حضرت براء، حضرت ابو موسیٰ، حضرت انس اور حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہم سے۔

---

[1] فتح الباری، ص: 491، باب القنوت قبل الرکوع او بعدہ

[2] المغنی مسئلۃ القنوت

علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ فرماتے ہیں کہ دعائے قنوت کے لئے رفع الیدین منقول ہے حضرت ابن مسعودؓ حضرت عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے [1]۔

امام طحاویؒ فرماتے ہیں اور وتر میں دعائے قنوت کی تکبیر تو زائد تکبیر ہے اور تمام وہ حضرات جو رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے ہیں ان کا اجماع ہے کہ تکبیر قنوت کے ساتھ ہاتھ اٹھائے جائیں [2]۔

قنوت رکوع سے پہلے:

مولانا عبدالرؤف غیر مقلد ارقام فرماتے ہیں: "مصنف ابن ابی شیبہ (ج: 2/ص: 302) میں بسند حسن، علقمہ سے روایت ہے کہ ابن مسعودؓ اور رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ وتروں میں قبل از رکوع قنوت پڑھتے تھے [3]، ابن ترکمانی نے " جوہر النقی" (ج:3/ ص: 41) میں اورالبانی نے " ارواء الغلیل" (ج: 2/ص: 166) میں اس کی سند کو مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے اور حافظ ابن حجر نے " درایہ " (ج: 1/ص: 194) میں اس کو حسن کہا ہے، اس کی سند میں حسن ہونے کے ساتھ ساتھ مسلم کی شرط پر بھی ہے (القول المقبول، ص: 591)

---

[1] المغنی لابن قدامہ، مسئلۃ القنوت

[2] طحاوی، رفع الیدین عند رؤیۃ البیت

[3] سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ رکوع سے پہلے قنوت وتر پڑھتے تھے۔ جزء رفع الیدین للبخاری، ص: 99

اشکال: اس موقوف روایت کے بارے میں نیموی صاحبؒ لکھتے ہیں: واسنادہ صحیح (آثار السنن، ص: 635) حالانکہ اس روایت کی سند میں لیث بن ابی سلیم جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ (الحدیث، ص: 69،51)

جواب: لیث بن ابی سلیم کے بارے میں ابھی گزرا ہے کہ خود غیر مقلدزرگوں کے ہاں اس میں زیادہ ضعف نہیں ہے، بلکہ بعض محدثین تو اس کو قابل احتجاج گردانتے ہیں، لہٰذا اس کی روایت متابعت کی صورت میں صحیح قرار دی جاسکتی ہے۔ اور حضرت ابن مسعودؓ سے مروی لیثؒ کی یہ روایت بھی دیگر متعدد روایات سے مؤید ہے۔ چنانچہ اس حدیث کا مضمون کہ حضرت ابن مسعودؓ رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے تھے، حضرت ابن مسعودؓ اور دیگر صحابہؓ سے مصنف ابن ابی شیبہ میں بسند صحیح ثابت ہے۔

اس طرح لیث کے مذکورہ حدیث کا یہ مضمون کہ حضرت ابن مسعودؓ قنوت میں رفع یدین بھی کرتے تھے، عمل صحابہؓ اور اجماع امت سے مؤید ہے چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ کی طرح حضرت عمرؓ اور حضرت ابوہریرہ سے بھی مروی ہے کہ وہ بھی قنوت کے وقت رفع یدین کیا کرتے تھے [1]۔

نیز امام بیہقی نے بھی یہ تصریح کی ہے کہ: متعدد صحابہؓ قنوت میں رفع یدین کیا کرتے تھے [2]۔

بزرگ غیر مقلد عالم دین مولانا عبد الجبار غزنویؒ ارقام فرماتے ہیں: " دعائے قنوت میں رفع یدین کرنا صحابہ و تابعین سے ثابت ہے [3] "۔

مولانا محب اللہ راشدیؒ غیر مقلد عالم دین نے بھی لکھا ہے کہ بعض صحابہؓ سے وتر میں ہاتھ اٹھانے کے آثار ہیں [4]۔

مولانا احمد غیر مقلد عالم دین نے بھی تصریح کی ہے کہ " جزء رفع یدین (از) امام بخاری میں حضرت عمرؓ اور بن عمرؓ سے رفع یدین قنوت ثابت ہے [5]۔

علامہ زیلعی نے تصریح کی ہے کہ وتر میں قنوت کے وقت رفع یدین کرنا تواتر سے ثابت ہے [6]

امام طحاوی ارقام فرماتے ہیں: "وتر میں دعائے قنوت کی تکبیر اس نماز (وتر) کی زائد تکبیر ہے، اور وہ حضرات (صحابہ کرام ﷺ) جو رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے ہیں، ان سب کا اجماع ہے کہ تکبیر کے ساتھ ہاتھ بھی اٹھاتے جائیں [7] "۔

---

[1] السنن الکبری، ج: 2/ ص: 212، ج: 3/ ص: 41

[2] السنن الکبری، ج: 2/ ص: 211

[3] فتاوی غزنویہ، ص: 51، وفتاوی علمائے حدیث، ج: 4/ ص: 283

[4] مقالات راشدی، ج: 1/ ص: 413

[5] فتاوی علمائے حدیث، ج: 11/ ص: 97

[6] نصب الرایہ، ج: 1/ ص: 391

[7] شرح المعانی الآثار، ج: 1/ ص: 455

كفرة اهل الكتاب الذين يصدون عن سبيلك ويكذبون رسلك ويقاتلون اوليائك، اللهم خالف بين كلمتهم وزلزل اقدامهم وانزل بهم بأسك الذى لاترده عن القوم المجرمين

اے اللہ! ہمیں اور تمام مومن مردوں، مومن عورتوں، مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بخش دے اور ان کے دلوں میں الفت ڈال دے۔ ان کی باہمی اصلاح فرما دے۔ اپنے اور ان کے دشمنوں پر ان کی مدد فرما۔ الٰہی! اہل کتاب کے کافروں پر اپنی لعنت فرما جو تیری راہ سے روکتے، تیرے رسولوں کو جھٹلاتے اور تیرے دوستوں سے لڑتے ہیں۔ الٰہی! ان کے درمیان پھوٹ ڈال دے، ان کے قدم ڈگمگا دے اور ان پر اپنا عذاب اتار جسے تو مجرم قوم سے نہیں ٹالا کرتا[1]۔[2]

رسول اللہ ﷺ جب کافروں پر بددعا یا مسلمانوں کے لئے نیک دعا کا ارادہ فرماتے تو آخری رکعت کے رکوع کے بعد "سمع اللہ لمن حمدہ ربنا لک الحمد" کہنے کے بعد اونچی سے دعا فرماتے[3] ۔

قنوت نازلہ میں آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے[4] ۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک ماہ تک پانچوں نمازوں میں رکوع کے بعد قنوت نازلہ پڑھی اور صحابہؓ آپ کے پیچھے آمین کہتے تھے[1] ۔

---

[1] بیہقی 2/210'211' اور انہوں نے اسے صحیح کہا ہے

[2] **تبصرہ:** ہمارے ہاں یہ روایت درست ہے لیکن ان حضرات کے ہاں ابن جریج مدلس راوی ہے عن سے روایت کر رہے ہیں {جزء قرات ص: 100}۔ اور نہی کا اصول ہے کہ مدلس کی عنعنہ صحیحین کے علاوہ ضعیف ہو گی۔ لہٰذا جو حدیث ان کے اصول کے مطابق ضعیف ہے اسی کو صحیح کہہ کے استدلال کر رہے ہیں۔

[3] صحیح البخاری، التفسیر، باب لیس لک من الامر شیء، حدیث: ۴۵۶۰، ۴۵۵۹، و صحیح مسلم، المساجد، باب استحباب القنوت فی جمیع الصلوات، حدیث: ۶۷۵.

[4] صحیح مسند احمد: ۲/۱۲۷، حدیث: ۲۴۰۲ا۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم کی شرط پر صحیح ہے

قیام رمضان تراویح:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیئے بغیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قیام رمضان کی رغبت دلاتے اور فرماتے تھے۔ من قام رمضانا ایمان واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه

جس نے ایمان کے ساتھ اور ثواب کے نیت سے رمضان کا قیام کیا اللہ تعالی اس کے پچھلے تمام گناہ معاف فرمادیتے ہیں [2]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین رات قیام رمضان کیا:

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ {رمضان المبارک کے} روزے رکھے {شروع میں} آپ نے ہمارے ساتھ مہینے میں سے کچھ بھی قیام نہ کیا یہاں تک کہ 23 ویں رات کو آپ نے قیام رمضان کیا۔ پھر آپ نے 24 ویں رات چھوڑ کر 25 ویں رات کو پھر 26 ویں رات کو چھوڑ کر 27 ویں شب کو اپنے اہل خانہ اور اپنی عورتوں کو اور سب لوگو ں کو جمع کرکے قیام کیا اور فرمایا جو شخص امام کے ساتھ قیام رمضان کرتا ہے اس کے لئے پوری رات کا قیام لکھا جاتا ہے [3]۔[4]

---

[1] سنن ابی داؤد ،الوتر ،باب القنوت فی الصلاۃ حدیث: ۱۴۴۳۔امام حاکم نے المستدرک: ۲۲۶،۲۲۵۱ میں ،حافظ ذہبی نے اور امام ابن خزیمہ نے حدیث: ۶۱۸ میں اسے صحیح کہا ہے۔اس روایت کی سند حسن ہے۔زید نے ہلال بن خباب سے اس کے اختلاط سے پہلے سنا ہے۔

[2] بخاری باب فضل من قام رمضان حدیث 2008 مسلم باب الترغیب فی قیام رمضان وہو التراویح حدیث 759

[3] صحیح سنن ابی داؤد ،شهر رمضان ،باب فی قیام شهر رمضان ،حدیث:۱۳۷۵ ،وسنده صحیح ،وجامع الترمذی ،الترمذی ،الصوم ،باب ما جاء فی قیام شهر رمضان ،حدیث: ۸۰۶۔امام ترمذی نے امام ابن حبان نے الموارد ، حدیث: ۹۱۹ میں اور امام ابن خزیمہ نے حدیث: ۲۲۰۶ میں اسے صحیح کہا ہے۔

[4] تبصرہ: اس روایت کی سند میں ایک راوی جبیر بن نفیر ہے اور عن سے روایت کر رہے ہیں۔ علامہ ذہبی نے طبقاالحفاظ میں اس کو مدلس کہا ہے {طبقات المدلسین ص: 46}۔اور ان حضرات کا اصول تو گزر چکا ہے کہ " راوی کا مدلس ہونا ثابت ہو جائے چاہے ایک ہی دفعہ کیوں نہ ہو اس راوی کی عن والی روایت ضعیف ہو گی نور العینین ص: 137 }۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے [تین رات کے بعد } فرمایا: میں نے دیکھا ہے کہ تمہارا معمول برابر قائم ہے۔ تو مجھے خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں تم پر { یہ نماز تراویح } فرض نہ کر دی جائے { اس لئے میں گھر سے نہیں نکلا } پس تم اپنے اپنے گھروں میں { رمضان کی راتوں کا } قیام کیا کرو۔ آدمی کی نفل نماز گھر میں افضل ہوتی ہے [1] ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باجماعت قیام { دوبارہ } شروع کرایا مگر یہ بھی فرمایا کہ رات کا آخری حصہ { جس میں لوگ سوجاتے ہیں } رات کے ابتدائی حصہ سے { جس میں لوگ قیام کرتے ہیں } بہتر ہے [2] ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین شب قیام رمضان کرکے لوگوں سے فرمایا: تم اپنے گھروں میں پڑھا کرو گھروں وغیرہ میں فردا فردا پڑھنے کے متعلق امام زہری فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے وفات کے بعد بھی یہی طریقہ جاری رہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور میں بھی اسی پر عمل ہوتا رہا۔ پھر عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جماعت سے پڑھنے کا طریقہ مقرر فرمایا [3] ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں تہجد نہیں پڑھی:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے 27 ویں رمضان المبارک کو اتنا لمبا قیام کیا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں سحری فوت نہ ہو جائے [4] ۔

---

[1] صحیح البخاری ،الاذان ،باب صلاۃ اللیل ،حدیث:۷۳۱،وصحیح مسلم ، صلاۃ المسافرین ،باب استحباب صلاۃ النافلۃ فی بیتہ وجوازها فی المسجد ،حدیث:۷۸۱۔

[2] صحیح البخاری ،صلاۃ التراویح ،باب فضل من قام رمضان ،حدیث:۲۰۱۰

[3] صحیح البخاری ،صلاۃ التراویح ،باب فضل من قام رمضان ،حدیث:۲۰۰۹،صحیح مسلم ، صلاۃ المسافرین ،باب الترغیب فی قیام رمضان وهو التراویح ، حدیث:(۱۷۴)۔۷۵۹۔

[4] ترمذی باب ماجاءفی قیام شہر رمضان حدیث806

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

قیام رمضان گیارہ رکعت :

ابو سلمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رمضان المبارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رات والی نماز کیسی تھی؟ صدیقہ کبری رضی اللہ عنہا نے فرمایا: رمضان اور غیر رمضان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کی نماز { بالعموم } گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے[1] ۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں رمضان میں آٹھ رکعات قیام رمضان پڑھایا پھر وتر پڑھائے[2] ۔[3]

---

[1] بخاری باب قیام النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی رمضان وغیرہ حدیث 1147`2013

[2] ابن خزیمہ ,1070 ابن حبان 920 ابو یعلی الموصلی 1802 امام ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے

[3] **تبصرہ:** مسند ابی یعلی اور ابن حبان کی سند میں ایک راوی یعقوب قمی اور دوسرا عیسی بن جاریہ ہے۔ اور ابن خزیمہ کی سند میں ان دونوں کے علاوہ ایک تیسرا راوی عبید اللہ بن موسی ہے۔ ان تینوں راویوں کے بارے میں ائمہ محدثین کے اقوال ملاحظہ ہو۔

1 : عبید اللہ بن موسی العبسی الکوفی گو یہ عند المحدثین ثقہ ہے مگر یہ شیعہ بھی ہے۔ ان کے بارے میں محدثین کرام فرماتے ہیں:

1 : امام یحی بن معین قال احمد بن زہیر سمعت یحی بن معین وبلغہ ان احمد بن حنبل تکلم فی عبید اللہ بن موسی بسبب التشیع { سیر اعلام النبلا للذہبی ج: 8 / ص: 227 }۔

2 : امام احمد بن حنبل تکلم (احمد بن حنبل) فی عبید اللہ بسبب التشیع وقال الذہبی (کان احمد) یکرہ لبدعتہ ما فیہ { سیر اعلام النبلاء ج: 8 / ص: 227 , 217 , تہذیب الکمال ص: 2297 }۔

3 : امام ابو داؤد قال : کان (عبید اللہ بن موسی) محترق شیعیا { تہذیب الکمال للذہبی ج: 26 / ص: 297 تذکرۃ الحفاظ ج: 1 / ص: 259 . سیر اعلام النبلاء ج: 8 / ص: 227 }۔

4 : امام احمد بن زہیر قال سمعت یحی بن معین وبلغہ ان احمد بن حنبل تکلم فی عبید اللہ بن موسی بسبب التشیع { سیر اعلام النبلا للذہبی ج: 8 / ص: 227 , معجم البلدان للیاقوت الحموی ج: 3 / ص: 429 }۔

5 : امام ابن قتیبہ قال (عبید اللہ بن موسی) ویتشیع ویروی فی ذلک احادیث منکرۃ فضعف بذلک عند کثیر من الناس { المعارف لابن قتیبہ ج: 1 / ص: 519 }۔

6 : امام ابن حجر قال (عبید اللہ) ثقۃ کان یتشیع ..... تقریب لابن حجر ج: 1 / ص: 381 }۔

7 : امام ابو بکر السیوطی قال کان شیعیا { طبقات الحفاظ ج: 1 / ص: 155 }۔

وغیرہم من الحفاظ الائمہ . لہٰذا شیعہ کا مذہب تو وتر کا انکار ہے اور تہجد کی نماز کی وہ بھی قائل ہے اور یہ بات ان کے موافق ہے ..فتدبر۔

2 : دوسرا راوی یعقوب بن عبداللہ الاشعری القمی ان کو بعض ائمہ نے ثقہ بھی کہا ہے لیکن اکثر ائمہ نے ان پر کلام کیا ہے اور یہ بھی شیعہ تھے۔ان کے بارے میں محدثین کرام فرماتے ہیں:

1 : امام جریر بن عبد الحميد قال هذا (يعقوب القمی) مؤمن من أل فرعون قال الذهبي يعني لكثرة الرافضة بقم {طبقات المحدثين لابي الشيخ ج: 2 / ص: 34 , 35 ,تاريخ الاسلام الذهبي ج: 11 ص: 406 }۔

2 : امام ابو الحسن الدار قطني قال ليس بالقوي ضعيف {العلل للدارقطني ج :3 / ص:11 }۔

3 : امام جوزی قال ضعيف ونقل عن الدار قطني قال ليس بالقوي ....القمي من علماء العجم نقل جرير قال هذا مؤمن من أل فرعون يعني لكثرة الرافضة بقم {المغني في الضعفاء للذهبي ج: 2 / ص: 758 , تاريخ الاسلام للذهبي ج: 11 /ص:406 } ۔

4 : امام ابن كثير الدمشقی قال وہذا الحديث منكر جدا وفی اسناده ضعف ويقوب ہذا ہو القمی وفيہ تشيع ومثل ہذا لايقبل تفرد بہ {البدايہ ج:8 /ص :374 }۔

5 : امام ابن حجر نقل عن الدارقطني ليس بالقوي وعن جرير قال هذا مؤمن من أل فرعون {تهذيب لابن حجر ج: 11 / ص: 391 ,وفتح الباري لابن حجر ج: 10 / ص: 138 }۔

6 : امام الحافظ الهيثمي قال وفي اسناد ... يعقوب القمي ..فيه كلام {مجمع الزوائد ج: 4 /ص: 89 }۔

3 : عیسیٰ بن جاریہ الانصاری بعض ائمہ نے ان کو ثقہ اور بہت سے ائمہ نے ان کو مجروح قرار دیا ہے مثلاً.

1 : امام يحی بن معين الحنفی قال (عيسى) ليس بشئ وحديثه ليس بذاك ... عنده احاديث مناكير { سوالات ابن الجنيد عن ابن معين ج: 1 / ص: 302 وتاريخ ابن معين برواية الدوري ج: 4 / ص: 365 والضعفاء والمتروكين لابن جوزي ج: 2 / ص: 238}۔

2 : ابوداؤد قال (عيسى بن جاريه) منكر الحديث {تهذيب لابن حجر ج: 4 / ص: 448 }۔

3 : امام ابو عبد الرحمن النسائي قال منكر الحديث.. . متروك الحديث {الضعفاء والمتروكين للنسائي ج: 1 / ص: 76. الضعفاء والمتروكين للابن جوزي ج. 2 / ص: 238 }۔

4 : امام زكريا الساجي قال ضعيف (الضعفاء الساجي }

5 : امام ابن عدي الجرجاني ذكره في الضعفاء ونقل عن ابن معين قال وحديثه ليس بذاك وعنده احاديث مناكير بحدث عنه يعقوب القمي وعن النسائي قال عيسي منكر الحديث {الكامل لابن عدي ج: 6 / ص: 436 تا 438 } ۔

پس ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین رات جو نماز پڑھائی تھی وہ گیارہ رکعت ہی تھیں۔

حضرت سائب بن یزید سے روایت ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ لوگوں کو گیارہ رکعت قیام رمضان پڑھائیں [1]۔

تبصرہ:

ہم (اہل سنت) غیر مقلد احباب کے مستدل روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اس روایت میں رمضان کی تصریح نہیں ہے جبکہ خود امام مالک رحمہ اللہ سے موطا کے دوسرے نسخوں میں بیس رکعات ثابت ہے مثلا:

---

6 : امام ابن جوزي ذكره في الضعفاء ونقل عن ابن معين قال وحديثه ليس بذاك وعنده احاديث مناكير وعن النسائي قال متروك الحديث { الضعفاء والمتروكين لابن جوزي ج: 2 / ص: 238 }۔

7 : امام ابو عبد الرحمن الذهبي ذكره في الضعفاء ونقل عن ابن معين قال وحديثه ليس بذاك وعنده احاديث مناكيروعن ابي داؤد قال منكر الحديث مختلف فيه وعن النسائي قال متروك الحديث { الكاشف للذهبي ج: 2 / ص: 109 ,ميزان الاعتدال للذهبي ج: 3 /ص: 310 ,311 } ۔

8 : امام ابن حجر نقل عن الائمة ليس بذاك وعنده مناكير منكر الحديث ... وذكر ه الساجي والعقيلي في الضعفاء وقال ابن عدي احاديثه غير محفوظة { تهذيب لابن حجر ج: 8 /ص: 207 }۔

لہٰذا یہ آٹھ رکعات والی روایت سنداً ضعیف ومردود ہے اور اس سے استدلال باطل ہے۔اور اگر اس کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو تب بھی بتصریح حدیث ابی ذر (سنن اربعہ) پہلی رات کا عمل ہے جو بیس رکعات تراویح کے خلاف نہیں۔ اگر یہی آٹھ رکعات تراویح سنت نبوی ہوتی تو سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما 73ھ یا 77ھ یا 78ھ تک زندہ رہے یہ دور فاروقی 24ھ دور عثمانی 35ھ دور علی 40ھ اور دور حسن بن علی رضی اللہ عنہما ومعایہ 60ھ وغیرہم کو پایا جب کہ صحابہ وتابعین بالاجماع بیس رکعات تراویح پڑھتے اور پڑھاتے رہے لیکن آپ نے ایک دفعہ بھی آٹھ رکعات والی روایت کو بیس رکعات کے خلاف پیش نہیں کیا۔ کیونکہ آپ جانتے تھے کہ بیس رکعات سنت نبوی ہے جیساکہ اس کو خود روایت کیا {تاریخ جرجان ص: 142 طبع بیروت }۔ لہٰذا آٹھ رکعات کی روایت ضعیف ومتروک العمل ہے۔

[1] موطا امام مالک باب ماجاء فی قیام رمضان حدیث 115/1

شہادت 1 : قال الامام الحافظ ابن حجر وروي مالك من طريق يزيد ين حفيفة عن السائب بن يزيد عشرين ركعة . {فتح الباری ج:4/ ص:353}

شہادت 2 : قال العلامة الشوكاني {غير مقلد} وفي الموطا من طريق يزيد بن حفيفة عن السائب بن يزيد انها عشرون ركعة [1].

حضرت عمر فاروق نے اپنے دور خلافت میں پہلا حکم گیارہ اور دوسرا حکم بیس رکعات تراویح کا دیا ہے۔ پھر بیس رکعات تراویح پر صحابہ رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین اور تابعین رحمہم اللہ تعالی کا اجماع بلا نکیر ہوگیا۔ بیس رکعات تراویح کو یہی سیدنا سائب بن یزید روایت کرتے ہیں اور یہ روایت سندا صحیح اور عملا متواتر و متوارث ہے۔

عن السائب بن يزيد قال كانوا يقومون علي عهد عمر في شهر رمضان بعشرين ركعة [2].

وعنه قال كنا نقوم في زمان عمر بن خطاب بعشرين ركعة والوتر [3].

واسنادهما صحيحان علي شرط البخاري ومسلم

درجہ ذیل ائمہ محدثین نے بیس رکعات والی حدیث کو صحیح کہا ہے:

1 : قال الامام الحافظ المحدث النووی رواه البیهقی باسناد صحیح [4]

2 : قال الامام الحافظ المحدث الزيلعي وقال النوو في الخلاصة باسناد صحيح [5] .

3 : قال الامام الحافظ المحدث السبكي رواه بيهقي وغيره باسناد الصحيح [6] .

---

[1] نیل الاوطار ج:3/ ص: 65 باب صلاۃ التراویح

[2] مسند ابن الجعد ج: 1 / ص:413 , السنن الكبري للبيهقي ج: 2 / ص:496

[3] السنن الصغير للبيهقي ج : 1 /ص:237 , معرفة السنن للبيهقي ج: 4 / ص:43

[4] المجموع ج: 4 / ص: 32 , خلاصة الاحكام ج: 1 / ص: 576

[5] تبيين الحقائق ج:1 /ص:67

[6] شرح المنهاج بحواله الحاوي للفتاوي ج:1 /ص:417

4 : قال الامام الحافظ المحدث ابن الملقن وروا ه البيهقي باسناد صحيح[1] .

5 : قال الامام الحافظ المحدث الفقيه ابن الهمام قال النووي في الخلاصة اسناده صحيح[2] .

6 : قال الامام الحافظ المحدثالسوطي وفي سنن البيهقي باسناد صحيح[3] .

7 : قال الامام الحافظ المحدث العيني رواه بيهقي باسناد صحيح[4] .

﴿ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں : ﴾

ثابت ہوا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مدینے کے قاریوں کو گیارہ رکعات پڑھانے کا حکم دیا تھا۔ امیر المؤمنین عمر بن خطاب ' علی بن ابی طالب 'ابی بن کعب اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے 20 رکعات قیام للیل کی روایات ضعیف ہیں۔

تبصرہ:

ہم جواباً عرض کرتے ہیں :

(الف) کہ یہ حضرات گیارہ رکعات والی حدیث بیان کرتے ہیں لیکن بیس رکعات تراویح کے حکم و عمل کو نہیں بتلاتے یہ عادت اہل کتاب کی ہے۔ مثلاً حضرت عمر فاروق سید القراء سیدنا ابی بن کعب کو حکم دیا کہ "فصلى بهم عشرين ركعة "وہ بیس رکعات تراویح پڑھاتے تھے[5]۔ قاری مدینہ مدینہ سیدنا ابی بن کعب نے عمر فاروق کے حکم کے بعد لوگوں کو "عشرين ركعة "(بیس رکعات)ہی پڑھاتے تھے[6]۔

---

[1] البدر المنير ج: 4 / ص: 350

[2] فتح القدير ج: 1 /ص: 468

[3] الحاوي للفتاوي ج: 1 / ص: 415

[4] عمدة القاري ج: 5 /ص: 367 , البنايه ج: 2 /ص: 551

[5] مسند احمد بحوالہ اتحاف الخیرۃ ج: 2 / ص: 424 , الاحادیث المختارۃ ج: 3 / ص: 367

[6] ابوداؤد ج: 1 / ص: 203 , جامع المسانید لابن کثیر ج: 1 / ص: 86

(ب) سیدنا عمر فاروق کی روایت۔ جمع الناس علی ابی بن کعب فکان یصلی لہم عشرین رکعۃ {ابوداؤد ج:1 /ص: 202 } اس کی سند کی تمام راوی ثقہ صدوق ہے یہ صحیح علی شرط البخاری و مسلم ہے اسی طرح مسند ابن الجعد صفحہ 413 کی سند کے تمام راوی ثقہ وصدوق ہے یہ صحیح علی شرط البخاری و مسلم ہے ائمہ محدثین نے اس کی صحت کو برملا بیان فرمایا ہیں (تذکرہ تقدم)۔ اور سیدنا عبد اللہ بن مسعود کی روایت کان یصلی عشرین رکعۃ ویوتر بثلاث [1]۔ عمر فاروق اور ابن مسعود کے روایت کے تمام راوی بخاری و مسلم کے ہیں ان کو ضعیف کہنا انصاف کا خون اور باطل ہے۔

سحری اور نماز فجر کا درمیانی وقفہ: حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھائی پھر نماز فجر کے لئے کھڑے ہو گئے {اور نماز پڑھی} سحری سے فراغت اور نماز میں داخل ہونے کا وقف اتنا تھا جتنی دیر میں کوئی شخص قرآن حکیم کی پچاس یا ساٹھ آیتیں پڑھ لیتا ہے [2]۔

نماز وتر کا وجوب:

"سیدنا علیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ا نے ارشاد فرمایا کہ اے مسلمانو! وتر پڑھو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ بھی وتر ہے اور وتر کو پسند کرتا ہے [3]"

"سیدنا خارجہ بن حذافہ ؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ا ہمارے پاس تشریف لائے اور ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور نماز تمہیں مزید عطا فرمائی ہے، وہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے

---

[1] قیام اللیل لمروزی ج: 1 / ص: 221، عمدۃ القاری ج: 11 / ص: 127، منصف عبد الرزاق ج: 4 / ص: 263

[2] بخاری باب وقت الفجر حدیث 1134'576'575

[3] سنن أبي داود، كتاب الوتر، باب 1 استحباب الوتر، حديث: 1416 وسنن النسائي، كتاب قيام الليل وتطوع النهار، باب 27 الأمر بالوتر، حديث: 1675 وسنن ابن ماجة، كتاب اقامة الصلاة، باب 114 ماجاء في الوتر، حديث 1169، وسنن الترمذي، كتاب الوتر، باب 333 ماجاء أن الوتر ليس بحتم، حديث: 453

بھی بہتر ہے، وہ نماز وتر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو تمہارے لئے نماز عشاء کے بعد سے طلوع صبح صادق تک مقرر کیا ہے[1] "

"سیدنا ابو سعید خدری ص فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ا نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص وتر سے سوتا رہ جائے (نیند کی وجہ سے نماز وتر قضاء ہو جائے) یا بھول جائے تو جب یاد آئے (یا جب وہ جاگے) تو اسی وقت پڑھ لے[2] "۔

بعض روایتوں میں وتر نہ پڑھنے والے کے بارے میں تشدید اور تہدید کے الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں، مثلاً:

سیدنا بریدہ (اسلمی)ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ا سے سنا، آپ نے فرمایا کہ نماز وتر حق (واجب) ہے، جو وتر ادا نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں، نماز وتر حق (واجب) ہے، جو وتر ادا نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں، نماز وتر حق (واجب) ہے، جو وتر ادا نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں[3]۔ [1]

---

[1] سنن الترمذي، كتاب الوتر، باب 332 ماجاء في الوتر، حديث: 452 وسنن ابن ماجة، كتاب اقامة الصلاة، باب 114 ماجاء في الوتر، حديث: 1168، وسنن أبي داود، كتاب الوتر، باب 1 استحباب الوتر، حديث: 1418

[2] سنن أبي داود، كتاب الوتر، باب 6 في الدعاء بعد الوتر، حديث: 1431 وسنن الترمذي، كتاب الوتر، باب 342 ماجاء في الرجل ينام عن الوتر أو ينساه، حديث: 465 وسنن ابن ماجة، كتاب اقامة الصلاة، باب 122 ماجاء في من نام عن الوتر أو نسيه، حديث: 1188، واسناده حسن (آثار السنن، ص: 221،222)

[3] سنن أبيداود، كتاب الوتر، باب 2 في من لم يوتر، حديث: 1419، واسناده حسن آثار السنن، ص:221۔ کہا جاتا ہے کہ اس حدیث میں ایک راوی ابو منیب عبد اللہ بن عبد اللہ العتکی ضعیف ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ انہیں امام بخاری وغیرہ نے اگرچہ ضعیف قرار دیا ہے لیکن امام ابن معین انہیں ثقہ کہتے ہیں، امام ابو حاتم نے ان کو صالح الحدیث قرار دیا ہے اور امام بخاری پر تنقید کی ہے کہ انہوں نے ان کو ضعفاء میں کیسے شمار کر لیا؟ اور امام ابن عدی ان کے بارے میں فرماتے ہیں: ہو عندی لا بأس بہ کہ میری تحقیق کے مطابق ان میں کسی قسم کا ضعف نہیں ہے، بہر حال جارحین کے مقابلہ میں ان کی توثیق کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہے، لہٰذا حدیث قابل استدلال ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ امام ابوداود نے اس حدیث کو نقل کرنے بعد اس پر خاموشی اختیار کی ہے جو ان کے نزدیک حدیث کے "صحیح" یا کم از کم "حسن" ہونے کی دلیل ہے اور امام حاکم نے بھی اس کو صحیح علی شرط الشیخین قرار دیا ہے۔

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ "الوتر حق" کہنے سے وجوب ثابت نہیں ہوتا کیوں کہ حق کے معنی ثابت کے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ حق "واجب" کے معنی میں بکثرت استعمال ہوتا ہے، اور یہاں وہی معنی مراد ہیں، چنانچہ ابوایوب کی روایت میں یہ الفاظ مروی ہیں: قال الوتر حق أو واجب[2]

اسی وجہ سے سیدنا الامام الاعظم ابوحنیفہ النعمان رحمۃاللہ علیہ نے سمجھا کہ وتر صرف سنت نہیں ہے بلکہ واجب ہے یعنی اس کا درجہ فرض سے کم اور سنت موکدہ سے زیادہ ہے۔

ایک سلام سے تین رکعات وتر:

سعد بن ہشام سے روایت ہے کہ ان سے ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ وتر کی دو رکعت پر سلام نہیں پھیرتے تھے[3]۔

ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ وتر کی پہلی رکعت میں "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى" اور دوسری رکعت میں "قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ" اور تیسری رکعت میں "قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ" پڑھتے تھے اور تیسری رکعت کے اختتام پر سلام پھیرتے تھے[4]۔

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو: درس ترمذی: 208/2، باب ماجاء ان الوتر ليس بحتم، تالیف: علامہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

[2] مسند أبي داود الطيالسي: 485/1، حديث: 594، تحقيق الدكتور محمد بن عبد المحسن التركي، محقق نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے، نیز اس روایت کیلئے ملاحظہ ہو: مصنف ابن أبي شيبة: 92/2، باب575 من قال: الوتر واجب، حديث: 6859

[3] سنن النسائي، كتاب قيام الليل وتطوع النهار، باب 36 كيف الوتر بثلاث، حديث: 1698

[4] سنن النسائي، كتاب قيام الليل، باب 37 ذكر اختلاف ألفاظ الناقلين لخبر أبي بن كعب في الوتر، حديث: 1701 صحيح، وسنن أبي داود، كتاب الوتر، باب 4 ما يقرأ في الوتر، حديث: 1423، وسنن ابن ماجة، كتاب اقامة الصلاة، باب 125 ماجاء في ما يقرأ في الوتر، حديث: 1171، واسناده حسن، (آثار السنن، ص:231)

"اُم المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ ﷺ عشاء کی نماز کے بعد گھر میں تشریف لے آتے تھے، پھر دو رکعات پڑھتے تھے، پھر مزید دو رکعات پہلی دونوں رکعتوں سے لمبی پڑھتے تھے، پھر تین رکعات وتر پڑھتے تھے، اور درمیان میں (سلام) کے ذریعہ فصل نہیں کرتے تھے، یعنی یہ تینوں رکعات ایک ہی سلام سے پڑھتے تھے[1] "

مغرب کی نماز دن کی وتر ہے، پس رات میں بھی وتر پڑھو[2]۔

ظاہر ہے کہ مغرب کی نماز جسے دن کی وتر کہا گیا ہے، تین رکعات ایک سلام سے پڑھی جاتی ہے، لہٰذا رات کی وتر کو بھی ایک ہی سلام سے پڑھنا چاہئے، اسی لئے سیدنا ابن مسعودؓ سے مروی ہے:

سیدنا عبداللہ بن مسعود ؓ فرماتے ہیں کہ رات کی وتر دن کی وتر یعنی مغرب کی نماز کی طرح تین رکعات ہے[3]۔

ابو سلمہ بن عبدالرحمان نے بتایا کہ ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے انہوں نے دریافت کیا کہ رمضان میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کی کیفیت کیا ہوتی تھی؟ تو انہوں نے جواباً فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ گیارہ رکعات سے زیادہ نہ پڑھتے تھے، نہ رمضان میں اور نہ غیر رمضان میں، آپ پہلے چار رکعات

---

[1] مسند الامام أحمد: 156/6، مسند النساء، حديث السيدة عائشة، حديث : 25738، نیز ملاحظہ ہو: زاد المعاد 330/1 فصل فی سیاق صلاتہ ﷺ باللیل ووترہ، رواہ احمد باسناد بعتبر (آثار السنن، ص: 232)

[2] مسند الامام أحمد: 30/2، مسند المكثرين، مسند عبد الله بن مسعود، حديث: 4847 وايضاً: 41/2 عن عبد الله بن مسعود، حديث:4992، وصحيح الجامع الصغير للالباني: 712/2، حديث: 3834 والروض النضير: 523، المعجم الصغير للطبراني، كذا عن ابن عمر، قال الحافظ العراقي الحديث بسند صحيح، (فيض القدير شرح جامع الصغير، ج: 4، ص:232)

[3] المعجم الكبير للطبراني:282/9، حديث: 9419 ورجاله رجال الصحيح ، مجمع الزوائد: 503/2، كتاب الصلاة، باب 280 عدد الوتر، روایت : 3455

پڑھتے تھے، مت پوچھو ان کے حسن وخوبی اور طول کے بارے میں پھر آپ چار رکعات پڑھتے تھے، مت پوچھو ان کے حسن وخوبی اور طول کے بارے میں پھر تین رکعات (وتر) پڑھتے تھے[1]۔

عبد اللہ بن قیس کہتے ہیں کہ میں نے ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ رسول اللہ ﷺ کتنی رکعت وتر پڑھتے تھے، تو ام المؤمنین نے فرمایا کہ آپ اس طرح وتر پڑھتے تھے: چار رکعات اور تین رکعات، اور کبھی چھ رکعات اور تین رکعات، اور کبھی آٹھ رکعات اور تین رکعات، اور کبھی دس رکعات اور تین رکعات، آپ سات سے کم وتر نہیں پڑھتے تھے، اور نہ تیرہ رکعات سے زیادہ[2]۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات اور مواقع کی وجہ سے تہجد کی رکعات تو بدلتی رہتی تھیں، لیکن وتر کی تعداد میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی، بلکہ ان کی تعداد ہمیشہ تین ہی ہوتی تھی۔

سیدنا ابو سلمہ ص کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ رات کے آخری حصہ میں تین رکعات وتر پڑھا کرتے تھے[3]۔

سعید بن عبید بن سباق ثقفی نے اسماعیل بن محمد کو بتایا کہ سیدنا عمر ﷺ جب سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ کو دفن کرکے فارغ ہوئے تو تین رکعات وتر کی نماز پڑھی اور ان کے ساتھ دیگر مسلمانوں نے بھی وتر پڑھی، نماز عشاء پہلے ہی پڑھ چکے تھے[1]۔

---

[1] صحيح البخاري، أبواب التہجد، باب 16 قيام النبي ا بالليل في رمضان وغيره، حديث: 1147، وأيضا كتاب صلاة التراويح، باب 1 فضل من قام رمضان، حديث: 2013، وأيضًا كتاب المناقب، باب 24 كان النبي ا تنام عينه ولا ينام قلبه، حديث: 3569، وصحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب 17 صلاة الليل وعدد ركعات النبي ا في الليل، حديث: 738، وسنن أبي داود، كتاب التطوع، باب 26 في صلاة الليل، حديث: 1341، وسنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب 325 ماجاء في وصف صلاة النبي ا بالليل، حديث: 439، وسنن النسائي، كتاب قيام الليل وتطوع النہار، باب 36 كيف الوتر بثلاث، حديث: 1697

[2] سنن أبي داود، كتاب التطوع، باب 26 في صلاة الليل، حديث: 1362، وراه احمد وابوداؤد والطحاوي واسناده حسن (اعلاء السنن، ج: 6/ص:32)

[3] مصنف ابن أبي شيبة: 91/2، من كان يوتر بثلاث أو اكثر، روايت: 6843

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ تین رکعت وتر پڑھتے تھے، اور تیسری رکعت میں سلام پھیرتے تھے، مغرب کی نماز کی طرح[2]۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ تین رکعات وتر پڑھتے تھے[3]۔

ابو غالب کہتے ہیں کہ سیدنا ابوامامہ باہلیؓ تین رکعات وتر پڑھتے تھے[4]۔

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ مسلمانوں کا اجماع ہے کہ وتر تین رکعات ہے اور آخر میں ہی سلام پھیرا جائے گا[5]۔

ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کبھی گیارہ رکعات، کبھی نو رکعات، کبھی سات رکعات اور کبھی پانچ رکعات وتر پڑھتے تھے، اور یہ کہا جاتا تھا کہ تین سے کم وتر تو ہے ہی نہیں[6]۔

جابر بن زید رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ وتر کی تین رکعات ہیں[7]۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے تین رکعات وتر پڑھی اور صرف آخری رکعت میں سلام پھیرا[8]۔

---

[1] مصنف عبد الرزاق: 20/3، باب کم الوتر؟ روایت: 4639

[2] مصنف عبد الرزاق: 26/3، باب کیف التسلیم في الوتر، روایت: 4659

[3] مصنف ابن أبي شيبة: 89/2، من كان يوتر بثلاث أو أكثر، روايت: 6824، قال الحافظ في الدراية (ص 115)اسناده صحيح اخرجه الطحاوي في معاني الآثار (1:173) (اعلاء السنن، ج:6/ص:44)

[4] مصنف ابن أبي شيبة: 90/2، من كان يوتر بثلاث أو أكثر، روايت: 6826

مصنف ابن أبي شيبة: 90/2، من كان يوتر بثلاث أو أكثر، روايت: 6834، اس حدیث کی تصحیح گزر چکی ہے۔

[6] مصنف ابن أبي شيبة: 90/2، من كان يوتر بثلاث أو أكثر، روايت: 6833

[7] مصنف ابن أبي شيبة: 90/2، من كان يوتر بثلاث أو أكثر، روايت: 6829

[8] مصنف ابن أبيشيبة: 91/2، من كان يوتر بثلاث أو أكثر، روايت: 6840

دعائے قنوت رکوع سے پہلے:

ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تین رکعات وتر پڑھتے تھے، پہلی رکعت میں سبح اسم ربک الاعلی پڑھتے تھے اور دوسری رکعت میں قل یاایہاالکافرون پڑھتے اور تیسری رکعت میں قل ہو اللہ احد پڑھتے پھر رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے تھے[1]۔

ابی بن کعب ص فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ وتر میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے تھے[2]۔

اسود بن یزید سے روایت ہے کہ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وتر میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے تھے[3]۔

علقمہ سے روایت ہے کہ سیدنا عبد اللہ بن مسعود اور نبی کریم ﷺ کے بہت سے صحابہ ث وتر میں رکوع سے پہلے دعاء قنوت پڑھتے تھے[4]۔

عبد اللہ (بن مسعود رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ وتر میں رکوع سے پہلے دعاء قنوت پڑھتے تھے، کہتے ہیں کہ میں نے اپنی والدہ ام عبد کو رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات کے پاس بھیجا تاکہ ان کے پاس وہ رات میں رہیں (اور دیکھیں کہ وتر کے بارے میں آپ اکا معمول مبارک کیا ہے؟) انہوں نے (یعنی میری ماں نے) مجھے بتایا کہ آپ اوتر میں رکوع سے پہلے دعاء قنوت پڑھتے ہیں[5]۔

---

[1] سنن النسائی، کتاب قیام اللیل وتطوع النہار، باب 37 ذکر اختلاف الناقلین بخبر أبي بن کعب في الوتر، حدیث: 1699 ن رواه النسائی وفی تلخیص الحبیر وابو علي بن السکن فی صحیحہ وفیہ ایضا ما محصلہ أن العقیلي جعلہ حجة وأشار الی تصحیحہ وفي حاشیة البخاري قال العیني ورواہ ابن ماجة بسند صحیح (اعلاء السنن، ج: 6/ص: 70-71)

[2] سنن ابن ماجة، کتاب اقامة الصلاة، باب 120 ماجاء في القنوت قبل الرکوع وبعده، حدیث: 1182 والنسائي واسناده صحیح (آثار السنن، ص: 239)

[3] مصنف ابن أبي شیبة: 96/2، في القنوت قبل الرکوع أو بعده، روایت: 6900

[4] مصنف ابن أبي شیبة: 97/2، في القنوت قبل الرکوع أو بعده، روایت: 6911، وهذا سند صحیح علی شرط مسلم. ، الجوهرة النقي وفي الدراية اسناده حسن (اعلاء السنن، ج: 6/ص: 78)

[5] مصنف ابن أبي شیبة: 97/2، في القنوت قبل الرکوع أو بعده، روایت: 6912

سیدنا سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ وہ وتر میں رکوع سے پہلے دعاء قنوت پڑھتے تھے[1]۔

مذکورہ تمام روایتوں سے معلوم ہوا کہ ہمارے پاس اس مسئلہ میں مرفوع روایات بھی ہیں اور صحابہ کرام ؓ کا تعامل بھی، اسی وجہ سے سیدنا الامام الاعظم ابو حنیفہ النعمان، امام مالک، سفیان ثوری، عبد اللہ بن مبارک اور امام اسحاق رحمہم اللہ کا کہنا ہے کہ وتر میں رکوع سے پہلے دعاءِ قنوت پڑھنی چاہئے۔ یہ تمام حضرات مشہور ائمہ ہیں، اور تابعین بلکہ ثقہ تابعین میں سے ہیں، تابعین نے صحابہ کرام ؓ سے دین اور طریقہ عبادت سیکھا اور صحابہ ؓ نے رسول اللہ ﷺ سے دین سیکھا تھا، کیا کوئی صحابی (ؓ) یا تابعی (رحمہ اللہ) ایسا کوئی عمل خصوصاً عبادات میں اور خصوصیت کے ساتھ نماز میں اختیار کر سکتا ہے جو سنت کے خلاف ہو؟

دعائے قنوت سے پہلے رفع یدین:

اسود، عبد اللہ بن مسعود ؓ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ وتر کی آخری رکعت میں قل ہو اللہ احد پڑھتے تھے پھر دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے تھے اس کے بعد رکوع سے پہلے دعاء قنوت پڑھتے تھے[2]۔

ابو عثمان سے روایت ہے کہ سیدنا عمر ؓ دعاء قنوت کے وقت دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے تھے[3]۔

امام بخاری نے اپنی تالیف جزء رفع الیدین ص: 28 پر نقل کرنے کے بعد اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔

ابو عثمان کہتے ہیں، سیدنا عمر لوگوں کی امامت کرتے تھے، پھر ہمارے سامنے رکوع کے وقت قنوت پڑھتے جس میں ہاتھ اٹھاتے تھے یہاں تک کہ آپ کی دونوں ہتھیلیاں دیکھی جا سکتی تھیں اور اپنے دونوں بازو کھول دیتے تھے[4]۔

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة: 96/2، في القنوت قبل الركوع أو بعده، روايت: 6910

[2] جزء رفع اليدين، للامام البخاري، ص: 28، وقال صحيح، (اعلاء السنن، ج: 6/ص: 84)

[3] جزء رفع اليدين، للامام البخاري، ص: 28 و صححه

[4] حوالہ سابق

دعائے قنوت :

ابو عبد الرحمٰن کہتے ہیں کہ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ہمیں تعلیم دی کہ ہم قنوت میں یہ دعاء پڑھیں:

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْتَعِيْنُکَ وَنَسْتَغْفِرُکَ وَنُؤْمِنُ بِکَ وَنُثْنِيْ عَلَيْکَ الْخَيْرَ وَلَا نَكْفُرُکَ وَنَخْلَعُ وَنَتْرُکُ مَنْ يَّفْجُرُکَ ۔ اَللّٰهُمَّ اِيَّاکَ نَعْبُدُ وَلَکَ نُصَلِّيْ وَنَسْجُدُ وَاِلَيْکَ نَسْعٰى وَنَحْفِدُ نَرْجُوْ رَحْمَتَکَ وَنَخْشٰى عَذَابَکَ اِنَّ عَذَابَکَ الْجِدَّ بِالْكُفَّارِ مُلْحِقٌ [1]

اے اللہ! ہم تجھ سے مدد چاہتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں، ہم توبہ کرتے ہیں اور تیرے اوپر ایمان لاتے ہیں اور تیری اچھی تعریف کرتے ہیں، تیری ناشکری نہیں کرتے اور جو تیری ناشکری اور نافرمانی کرے اس کو ہم چھوڑتے ہیں اور اس سے کنارہ کش ہوتے ہیں، اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، اور تیری نماز پڑھتے ہیں، اور تجھ ہی کو سجدہ کرتے ہیں۔ تیری طرف دوڑ کر آتے ہیں، اور تیری عبادت میں جلد تیار ہو جاتے ہیں، ہم تیری رحمت کے امیدوار ہیں، تیرے عذاب سے ڈرتے ہیں، بیشک تیرا سچا عذاب کافروں پر نازل ہونے والا ہے۔

سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں مجھے (میرے نانا محترم جناب) رسول اللہ ﷺ نے مندرجہ ذیل کلمات کی تعلیم فرمائی تاکہ میں اسے وتر میں پڑھوں (سند کے ایک راوی) ابن جواس کہتے ہیں کہ وتر سے مراد قنوت وتر ہے، وہ کلمات یہ ہیں:

[1] مصنف ابن ابي شيبة: 95/2 روایت: 6893 باب في قنوت الوتر من الدعاء، والسنن الكبرىٰ للبيهقي 211/2

اَللّٰھُمَّ اہْدِنِيْ فِيْمَنْ ہَدَيْتَ وَعَافِنِيْ فِيْمَنْ عَافَيْتَ وَتَوَلَّنِيْ فِيْمَنْ تَوَلَّيْتَ وَبَارِكْ لِيْ فِيْمَا أَعْطَيْتَ وَقِنِيْ شَرَّ مَا قَضَيْتَ إِنَّكَ تَقْضِيْ وَلَا يُقْضٰى عَلَيْكَ وَإِنَّهُ لَا يَذِلُّ مَنْ وَالَيْتَ وَلَا يَعِزُّ مَنْ عَادَيْتَ تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ[1] .

اے اللہ ! مجھے ہدایت دے کر ان لوگوں کے زمرہ میں شامل فرما جنہیں تو نے ہدایت سے نوازا ہے، اور مجھے عافیت دے کر ان لوگوں میں شامل فرما جنہیں تو نے عافیت بخشی ہے، اور جن لوگوں کو تو نے اپنا دوست بنایا ان میں مجھے بھی شامل کرکے اپنا دوست بنالے، جو کچھ تو نے مجھے عطا فرمایا ہے اس میں میرے لئے برکت ڈال دے، اور جس مصیبت وآزمائش کا تو نے فیصلہ فرمایا ہے اس سے مجھے محفوظ رکھ اور بچالے، یقینا تو ہی فیصلہ صادر فرماتا ہے تیرے خلاف فیصلہ صادر نہیں کیا جاسکتا، اور جس کا تو دوست بنا وہ کبھی ذلیل وخوار اور رسوا نہیں ہوسکتا اور وہ شخص عزت نہیں پا سکتا جس سے تجھ کو عداوت ہو، ہمارے رب تو (بڑا) ہی برکت والا اور بلند ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ وتر کی قنوت میں یہ دعاء پڑھتے تھے:

لَكَ الْحَمْدُ مِلْءَ السَّمٰوَاتِ السَبْعِ وَمِلْءَ الْأَرَضِيْنَ السَّبْعِ وَمِلْءَ مَا بَيْنَهُمَا مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ. أَہْلُ الثَّنَاءِ وَالْمَجْدِ أَحَقُّ مَا قَالَ الْعَبْدُ وَكُلُّنَا لَكَ عَبْدٌ لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ[2] .

---

[1] سنن أبي داود، کتاب الوتر باب 5 القنوت في الوتر، حدیث: 1425 وسنن الترمذي، کتاب الوتر، باب 341 ماجاء في القنوت في الوتر، حدیث: 464 وسنن النسائی، کتاب قیام اللیل وتطوع النہار، باب 51 الدعاء في الوتر، حدیث: 1745 صحیح، سنن ابن ماجة، کتاب اقامة الصلاة، باب 117 ماجاء في القنوت في الوتر، حدیث: 1178 صحیح، ومصنف ابن أبي شیبة: 95/2، في قنوت الوتر من الدعاء، روایت: 6889 والبیہقی: 209/2

[2] مصنف ابن أبي شیبة: 95/2، في قنوت الوتر من الدعاء، روایت: 6890

تیرے لئے اتنی حمد وستائش ہے جس سے ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کی وسعتیں بھر جائیں اور ان دونوں کے درمیان جو بھی وسعتیں ہیں وہ بھر جائیں، تعریف اور بزرگی وعظمت والا اس سے زیادہ کا حقدار ہے جو بندہ عرض کرتا ہے، ہم سب تیرے ہی بندے ہیں، جو کچھ تو دینے کا ارادہ وفیصلہ فرمائے اس کو روکنے والا کوئی نہیں اور جس چیز کے نہ دینے کا تو فیصلہ کرے، کوئی اسے دنے والا نہیں اور کسی مال دار کو اس کا سرمایہ تجھ سے مستغنی نہیں کرسکتا"۔

سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے قنوت میں یہ دعاء پڑھنا بھی ثابت ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنَّکَ تَرٰی وَلَا تُرٰی وَأَنْتَ بِالْمَنْظَرِ الْاَعْلٰی وَاِنَّ اِلَیْکَ الرُّجْعٰی وَاِنَّ لَکَ الْآخِرَةَ وَالْاُوْلٰی اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُبِکَ مِنْ اَنْ نَذِلَّ وَنَخْزٰی [1]

اے اللہ! تو ہر کسی کو دیکھتا ہے لیکن تو کسی کو نظر نہیں آتا، تو منظر اعلی میں (یعنی ہماری نگاہوں سے پرے) ہے، اور بیشک تیرے ہی پاس سب کو لوٹ کر جانا ہے، اور تیرے ہی قبضہ قدرت میں دنیا وآخرت کی ساری چیزیں ہیں، اے اللہ! بیشک ہم ذلت ورسوائی سے تیری پناہ چاہتے ہیں۔

ان دعاؤں کے علاوہ بھی روایات میں دعائیں منقول وماثور ہیں، بندہ جتنی دعائیں کرنا چاہے کرلے، فائدہ اور ثواب سے خالی نہیں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ قنوت میں کوئی دعاء مخصوص ومتعین نہیں بلکہ جو دعاء بھی چاہے پڑھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ انسانی بات چیت کی حد تک نہ پہنچے۔

رسول اللہ ﷺ نے تین راتیں باجماعت قیام رمضان کیا:

سیدنا ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رمضان المبارک کے روزے رکھے شروع میں، آپ نے ہمارے ساتھ مہینے میں سے کچھ بھی قیام نہ کیا یہاں تک کہ ۲۳ویں رات کو

[1] مصنف ابن أبي شيبة: 95/2، في قنوت الوتر من الدعاء، روایت: 6891

آپ نے ہمیں قیام رمضان کرایا، پھر آپ نے ۲۴ ویں رات چھوڑ کر ۲۵ ویں رات کو، پھر ۲۶ ویں رات کو چھوڑ کر ۲۷ ویں رات کو چھوڑ کر ۲۷ شب کو اپنے اہل خانہ اور اپنی عورتوں کو اور سب لوگوں کو جمع کر کے قیام کیا اور فرمایا: جو شخص امام کے ساتھ نماز عشاء ادا کرتا ہے، اس کے لئے پوری رات کا قیام لکھا جاتا ہے[1] ۔

آپ ﷺ نے تین رات کے بعد فرمایا: میں نے دیکھا ہے کہ تمہارا معمول برابر قائم ہے تو مجھے خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں تم پر نماز فرض نہ کر دی جائے اس لئے میں گھر سے نہیں نکلا! چنانچہ تم اپنے اپنے گھروں میں رمضان کی راتوں کا قیام کرو۔ آدمی کی نفل نماز گھر میں افضل ہوتی ہے[2] ۔

سیدنا عمرؓ نے ایک ہی امام کے پیچھے باجماعت قیام رمضان دوبارہ شروع کرایا مگر یہ بھی فرمایا: رات کا آخری حصہ جس میں لوگ سو جاتے ہیں، رات کا ابتدائی حصے سے جس میں لوگ قیام کرتے ہیں، بہتر ہے[3]۔

رسول اللہ ﷺ نے تین شب قیام رمضان کرا کے لوگوں سے فرمایا: تم اپنے گھروں میں پڑھا کرو۔ امام زہری فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد بھی یہی طریقہ جاری رہا۔ سیدنا ابو بکر صدیقؓ کی خلافت اور سیدنا عمر فاروقؓ کے ابتدائی دور میں بھی اسی پر عمل ہوتا رہا، پھر سیدنا عمر فاروقؓ نے ایک امام کے پیچھے پڑھنے کا طریقہ جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت تھا اور بوجہ خوف فرضیت آپ ﷺ نے مکمل رمضان اختیار نہیں فرمایا تھا، پھر سے جاری فرمایا[4] ۔

---

[1] ابو داؤد باب فی قیام شہر رمضان حدیث 1375 ترمذی باب ماجاء فی قیام شہر رمضان حدیث 805

[2] بخاری باب صلاۃ اللیل حدیث 731 6113 مسلم باب استحباب صلاۃ النافلۃ فی بیتہ و جوازھا فی المسجد حدیث 781

[3] بخاری باب فضل من قام رمضان حدیث 2010

[4] بخاری باب فضل من قام رمضان حدیث 2009 مسلم باب الترغیب فی قیام شہر رمضان و ھو التراویح حدیث 759

تراویح:

خود علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: خلاصہ کلام یہ ہے کہ مسئلہ تروایح کے تمام روایات میں نماز تراویح، ان کا باجماعت یا تنہا پڑھنا تو ثابت ہے لیکن خاص نماز تراویح کی تعداد اور اس میں قراءۃ کی تعیین آنحضور ﷺ سے منقول نہیں۔ (نیل الاوطار، ج: 3/ص 64)

تراویح اور تہجد کی نماز میں فرق احادیث کی روشنی میں:

تہجد ابتدائے اسلام میں تمام امت پر فرض ہوئی اور ایک سال بعد تہجد کی فرضیت منسوخ ہو کر بطور نفل کے رمضان اور غیر رمضان میں باقی رہی۔

قال اللہ تعالیٰ یَا أَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ. قُمِ اللَّیْلَ

اے چادر اوڑھنے والے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) جاگ رات میں

اس حدیث شریف سے ثابت ہوا کہ تہجد قبل ہجرت ابتداء اسلام میں تطوعاً مشروع تھی اور رمضان و غیر رمضان میں صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اس پر عمل تھا۔ پھر بعد ہجرت اور بعد فرضیت صوم رمضان آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ میں ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس کے روزے فرض اور اس کا قیام نفل کر دیئے[1]۔ اس سے معلوم ہوا کہ قیام رمضان ہجرت کے بعد تنفلاً مقرر ہوا اور اس سے یہ سمجھنا کہ تہجد جو سابق سے تطوع تھا اس کا ذکر فرمایا ہے بعید ہے کیونکہ اگر یہ مقصود ہوتا تو اس طرح فرماتے کہ نماز تہجد اب بھی نفل ہی ہے یا مثل اس کے کچھ الفاظ فرماتے۔ ورنہ دوبارہ اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی جیسا کہ دیگر فرض نمازوں کا کچھ ذکر نہیں فرمایا[2]۔

اجماع اسلاف امت:

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمۃ اللہ علیہم و فقہائے امت رحمۃ اللہ علیہم کا اتفاق ہے کہ رمضان میں بیس تراویح سنت ہے۔ ابن قدامہ فرماتے ہیں: والمختار عند احمد فیہا عشرون رکعۃ وبہذا قال الثوری، واستدل بان عمر رضی اللہ عنہ لما جمع الناس علی ابی کان یصلی بہم عشرین رکعۃ، روایۃ مالک عن یزید بن رومان (کامر) وروایۃ علی (کامر) ویقول وہذا کالاجماع، وماکان علیہ اصحاب رسول اللہ ﷺ اولی واحق ان یتبع. (ملخص، المغنی، ج: 2/ص: 139، صلوۃ التراویح)

اور امام احمد رحمہ اللہ کے ہاں پسندیدہ عمل بیس رکعات کا ہے اور حضرت ثوری بھی یہی کہتے ہیں اور ان کی دلیل یہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے صحابہؓ کو حضرت ابی بن کعب کی اقتداء میں جمع کیا تو وہ بیس رکعات پڑھتے تھے، نیز حضرت امام احمد کا استدلال حضرت یزید و علیؓ کے روایات سے ہے، ابن قدامہ کہتے ہیں کہ یہ بمنزلہ اجماع کے ہے، نیز فرماتے ہیں کہ جس چیز پر حضور ﷺ کے صحابہ عمل پیرا رہے ہوں وہی اتباع کے لائق ہے۔

[1] مشکوۃ کتاب الصوم الفصل الثالث ص 190 سنن ابن ماجہ ص 94

[2] ابوداؤد شریف جلد 1 ص 197 مکتبہ حقانیہ ملتان

اور دوسری روایت سنن ابن ماجہ کی اس طرح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

شهر كتب الله عليكم صيامه، وسننت لكم قيامه[1]

اس روایت سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باذن اللہ قیام رمضان کو تطوعا مقرر فرمایا حالانکہ تہجد بحکم الہی اس سے پہلے نفل ہو چکی تھی۔ سو اس سے بھی معلوم ہوا کہ تہجد اور تراویح تشریعا دو نمازیں ہیں جو الگ الگ وقتوں میں مقرر ہوئیں۔

تہجد کی مشروعیت قرآن کریم سے ہوئی ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَكَ اور تراویح حدیث رسول سے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر روز تہجد آخر شب میں پڑھی ہے۔ چنانچہ بخاری و مسلم کی روایت ہے۔ میں نے (یعنی راوی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے) پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (رات کو) کس وقت اٹھتے تھے؟ انھوں نے فرمایا: جب مرغ کی (بانگ کی) آواز سنتے تو آپ علیہ السلام اٹھا کرتے تھے[2]۔ اور دیگر روایات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

اور تراویح کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اول لیل میں پڑھا ہے۔ مشکوۃ شریف میں ہے:

عن أبي ذر، قال: صمنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم رمضان، فلم يقم بنا شيئا من الشهر حتى بقي سبع، فقام بنا حتى ذهب ثلث الليل، فلما كانت السادسة لم يقم بنا، فلما كانت الخامسة قام بنا حتى ذهب شطر الليل، فقلت: يا رسول الله، لو نفلتنا قيام هذه الليلة، قال: فقال: إن الرجل إذا صلى مع الإمام حتى ينصرف حسب له قيام ليلة قال: فلما كانت الرابعة لم يقم فلما كانت الثالثة

---

[1] مشكوة المصابيح باب صيام شهر رمضان الفصل الثاني, ابن ماجه الجزء 1 ص 421 باب ما جاء في قيام شهر رمضان رقم 1328

[2] الصحيح للبخاري الجزء 8 ص 98 باب القصد و المداومة على العمل

جمع أهله ونساءه والناس فقام بنا حتى خشينا أن يفوتنا الفلاح قال: قلت: وما الفلاح؟ قال: السحور، ثم لم يقم بقية الشهر [1].

اس حدیث شریف میں پہلی اور دوسری دفعہ میں نصف اللیل تک فراغت پائی اور اور تیسرے دن اول سے لے کر اخیر شب تک ادا فرمایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دو صلوۃ جداگانہ ہیں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم تہجد کو ہمیشہ منفردا پڑھتے تھے کبھی تداعی جماعت نہیں فرمائی۔ بخلاف تراویح کے کہ اس کو چند بار تداعی کے ساتھ جماعت کرکے ادا فرمایا جیسا کہ اسی حدیث ابو ذر سے واضح ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر دو صلوۃ جداگانہ ہیں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم تہجد کے واسطے تمام رات کبھی نہیں جاگے چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان تہجد میں فرماتی ہیں۔

اور نہیں دیکھا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کو کہ پڑھا ہو سارا کلام اللہ ایک رات میں یا نماز پڑھی ہو ساری رات [2]۔

اور یہ ان کی تحدید صلوۃ تہجد میں ہے ورنہ صلوۃ تراویح میں صبح تک نماز پڑھنا روایت ابو ذر سے خود ثابت ہو چکا ہے ۔اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی اس کا علم ہے اس واسطے کہ آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے اپنے سب اہل و عیال کو بھی جمع کیا تھا۔ پھر باوجود اس امر کے جو آپ انکار احیاء تمام لیل کا فرماتی ہیں تو یہ کہنا کہ آپ کو خبر نہیں یا نسیان ہوا نہایت بے جا ہے۔ بلکہ یہ وجہ ہے کہ انکار احیاء تمام لیل کا صلوۃ تہجد میں وارد ہوا کیونکہ سعد بن ہشام راوی حدیث صلوۃ تہجد ہی کو پوچھتے تھے اور اسی کے جواب میں آپ نے یہ فرمایا تھا۔ چنانچہ مسلم شریف میں روایت موجود ہے ۔ نہ کہ تراویح میں کہ اس کا یہاں ذکر ہی نہیں تھا ۔ علی ہذا جو ام سلمہؓ نے قیام رمضان کو پوچھا ہے تو وہاں بھی مراد قیام

---

[1] رواہ ابو داؤد (و اللفظ لہ) ج: 1 /ص: 202 ، ترمذی ج: 1 /ص: 166, و النسائی و ابن ماجۃ .

[2] مسلم شریف جزء 1 ص513 باب جامع صلوۃ اللیل, و الاربعۃ

رمضان سے تہجد ماہ رمضان کا ہے۔ غرض ان کی یہ تھی کہ تہجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رمضان میں بنسبت اور مہینوں کے زیادہ ہوتا تھا یا نہیں؟

بخاری شریف میں ہے:

عن أبي سلمة بن عبد الرحمن، أنه أخبره: أنه سأل عائشة رضي الله عنها، كيف كانت صلاة رسول الله صلى الله عليه وسلم في رمضان؟ فقالت: ما كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يزيد في رمضان ولا في غيره على إحدى عشرة ركعة يصلي أربعا فلا تسل عن حسنهن وطولهن ثم يصلي أربعا فلا تسل عن حسنهن وطولهن ثم يصلي ثلاثا [1]

سحری اور نماز فجر کا درمیانی وقفہ:

سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سحری کھائی، پھر نماز فجر کے لئے کھڑے ہوگئے اور نماز پڑھی۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ دونوں سحری اور نماز میں کتنا وقفہ تھا؟ تو انہوں نے بتایا کہ سحری سے فراغت اور نماز میں داخل ہونے کا وقفہ اتنا تھا جتنی دیر میں کوئی شخص قرآن حکیم کی پچاس یا ساٹھ آیتیں پڑھ لیتا ہے [2]۔

نماز تراویح اور اس کے رکعات کی تعداد:

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ رمضان کی ایک رات (اپنے گھر سے نکلے اور آپ انے) لوگوں کو چوبیس رکعات (چار فرض، بیس تراویح) نماز پڑھائی اور تین رکعت وتر بھی پڑھائی [3]۔

---

[1] باب قیام النبی صلی اللہ علیہ و سلم جز 2 ص 53

[2] بخاري مواقيت الصلاة، باب وقت الفجر حديث 575، 576، 1134

[3] تاريخ الجرجان، ص: 275 لأبي قاسم حمزة بن يوسف السهمي المتوفى: 727ھ ومجموعہ رسائل صفدر: 10/4

اور حدیث کی ایک کتاب " مصنف ابن ابی شیبہ " میں ہے : "سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ رمضان میں بیس رکعات (تراویح) اور وتر پڑھتے تھے [1] ۔

اس روایت میں اگرچہ کچھ کلام ہے لیکن صحیح سند سے ثابت ہے کہ سیدنا عمر ؓ کے زمانہ میں بیس (20) رکعات تراویح کا اہتمام ہوتا تھا، چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں:

یزید بن رومان سے مروی ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب ؓ کے زمانہ میں لوگ 23 رکعات پڑھا کرتے تھے [2] ۔

23 رکعات سے مراد 20 رکعات تراویح اور 3 رکعات وتر کی نماز ہے، سیدنا عمر ؓ کے اس عمل پر کسی صحابی نے نکیر نہیں فرمائی، بلکہ دوسرے خلفاء راشدین کے عہد میں بھی اسی پر عمل رہا ہے، چنانچہ مروی ہے : ابو الحسنات سے روایت ہے کہ سیدنا علی بن ابی طالب ؓ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو پانچ ترویحوں کے ساتھ بیس رکعات پڑھائے [3] ۔

دوسری روایت ابن ابی شیبہ نے یوں نقل کی ہے : یحییٰ بن سعید سے مروی ہے کہ سیدنا عمر بن الخطاب ؓ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعات تراویح پڑھائے [4] ۔

نیز محدث کبیر عبد الرزاق صنعانی نے روایت نقل کی ہے : سائب بن یزید سے مروی ہے کہ سیدنا عمر ؓ نے لوگوں کو سیدنا ابی بن کعب اور تمیم داری کی اقتداء میں 21 رکعات تراویح پڑھنے پر

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة:164/2، روایت: 7692، کم یصلي في رمضان من رکعة، المعجم الكبير للطبراني 393/11، حديث: 12102

[2] المؤطا للامام مالک ،ص: 70، کتاب الصلاة في رمضان ، باب 2 ماجاء في قيام رمضان ، حديث: 254

[3] کنز العمال ، حديث :23474باب 13 صلاة التراويح، ومصنف ابن أبي شيبة: 163/2، کم يصلي في رمضان من رکعة؟ روایت: 7681

[4] المصنف :163/2، کم يصلي في رمضان من رکعة؟ روایت: 7682

جمع کر دیا، وہ حضرات سو سو آیتوں والی سورتیں پڑھا کرتے تھے، اور فجر کے قریب قریب اس نماز سے فارغ ہوتے تھے[1]۔

ابن ابی شیبہ نے مزید ایک اثر نقل کیا ہے: عبد العزیز بن رفیع کہتے ہیں کہ ابی بن کعب ص مدینہ منورہ میں لوگوں کو 20 رکعات تراویح پڑھاتے اس کے بعد تین رکعات وتر پڑھاتے تھے[2]۔

علی بن الجعد نے اپنی تالیف جو مسند کے نام سے مشہور ہے، میں لکھا ہے: سائب بن یزید کہتے ہیں کہ سیدنا عمر ص کے عہد خلافت میں لوگ رمضان کے مہینہ میں بیس رکعات تراویح پڑھا کرتے تھے[3]۔

بہر حال اس زمانہ میں 20 رکعات ہی تراویح پڑھنے کا معمول تھا اور اسی پر سیدنا عمر ص نے سب کو جمع کیا تھا، اس زمانہ میں اکابر واجلہ صحابہ ث موجود تھے۔

رسول اللہ ا نے ارشاد فرمایا کہ تم میرے طریقے اور خلفاء راشدین کے طریقے کو اختیار کرو:

تم پر میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت لازم ہے[4]۔

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء راشدین کی اس متفقہ سنت سے اعراض نہ ہونا چاہئے، آٹھ رکعت تراویح پڑھنے کا حدیث میں کہیں ذکر نہیں ہے، ہاں نماز تہجد میں آٹھ رکعت کا معمول ثابت ہے[5]۔

چنانچہ ائمہ اربعہ بیس رکعات تراویح پر متفق ہیں اور سلف صالحین کا عمل بیس رکعات تراویح پڑھنے کا رہا ہے، سیدنا عطاء (بن رباح) رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے:

---

[1] مصنف عبد الرزاق: 260/4، باب قيام رمضان، روایت: 7730 واسناده صحيح

[2] المصنف: 163/2، كم يصلي في رمضان من ركعة؟ روایت: 7684

[3] مسند علي بن الجعد، حديث: 2926

[4] سنن ابن ماجة، كتاب المقدمة، باب 6 اتباع سنة الخلفاء الراشدين المهديين، حديث: 42 صحيح، وسنن أبي داود، كتاب السنة، باب 5 في لزوم السنة، حديث: 4607 صحيح، وسنن الترمذي، كتاب العلم، باب 16 ماجاء في الأخذ بالسنة واجتناب البدع، حديث: 2676، صحيح

4 صحيح البخاري، أبواب التهجد، باب قيام النبي ا بالليل في رمضان وغيره، حديث: 1147

عطاء کہتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو وتر کی تین رکعات کے ساتھ بیس رکعات تراویح (کل 23رکعات) پڑھتے ہوئے پایا[1]۔

ابن ابی ملیکہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ بیس رکعات تراویح پڑھاتے تھے: نافع بن عمر کہتے ہیں کہ رمضان میں ابن ابی ملیکہ ہمیں بیس رکعات تراویح کی نماز پڑھایا کرتے تھے[2]۔

علی بن ربیعہ کے بارے میں مذکور ہے: وہ رمضان المبارک میں لوگوں کو پانچ ترویحات (ہر چار رکعات پر کچھ دیر آرام) کے ساتھ تراویح کی نماز پڑھاتے تھے اور پھر تین رکعات وتر بھی پڑھاتے تھے[3]۔

اسی طرح کا اثر "ابو البختری" رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے (حوالہ سابق) علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ نے بیس رکعات تراویح کے سنت ہونے پر صحابہ کرامؓ کا اجماع نقل کیا ہے، (ملاحظہ ہو: تقریر ترمذی: 24، شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ) اور علامہ ابن مسعود بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: "بہر حال اکثر اہل علم کی رائے بیس رکعات کی ہے، اسی طرح سیدنا عمر و علی رضی اللہ عنہما اور رسول اللہ اکے دیگر صحابہ کرام ث سے مروی ہے اور یہی قول سفیان ثوری، عبد اللہ بن مبارک، شافعی اور اصحاب الرائے (احناف) کا ہے، امام شافعی فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنے شہر مکہ مکرمہ میں لوگوں کو بیس رکعات تراویح پڑھتے ہوئے پایا"[4]۔

بڑے پایہ کے حنبلی عالم فقیہ ابن قدامہ مقدسی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: "ابو عبد اللہ (امام احمد بن حنبل) رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس میں یعنی تراویح کی نماز میں بیس رکعات پڑھنا ہی مختار و پسندیدہ ہے اور اسی کے قائل امام ثوری، ابو حنیفہ اور شافعی رحمۃ اللہ علیہم ہیں ...اور ہماری

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة: 163/2، كم يصلي في رمضان من ركعة؟ روایت: 7688

[2] مصنف ابن أبي شيبة: 163/2، كم يصلي في رمضان من ركعة؟ روایت: 7683

[3] مصنف ابن أبي شيبة: 163/2، كم يصلي في رمضان من ركعة؟ روایت: 7690

[4] شرح السنة: 123/4، باب قيام رمضان وفضله، حدیث: 990، کے تحت

(حنابلہ کے قول کی) دلیل یہ ہے کہ جب سیدنا عمر ص نے لوگوں کو سیدنا ابی بن کعب ص کی اقتداء میں نماز پڑھنے کے لئے جمع فرمایا تو سیدنا ابی بن کعب ص نے لوگوں کو بیس رکعات نماز پڑھائی [1]۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

یہ بات ثابت ہے کہ سیدنا ابی بن کعب رمضان المبارک میں لوگوں کو بیس رکعات اور وتر کی تین رکعات پڑھایا کرتے تھے، اسی وجہ سے بہت سے اہل علم نے اسے (20 رکعات تراویح کو) سنت قرار دیا ہے، اس لئے کہ انہوں نے ایسا عمل مہاجرین وانصار صحابہ کی موجودگی میں انجام دیا اور کسی نے بھی اس پر نکیر نہیں فرمائی [2]۔

گویا کہ تمام صحابۂ کرام ث کا جن میں خصوصیت سے مہاجرین وانصار صحابہ ث بھی شامل ہیں، ان سب کا بیس رکعات تراویح پر اجماع ہو گیا۔

مفتی اعظم ابن باز کے استاذ الشیخ محمد بن ابراہیم بن عبد اللطیف رحمۃ اللہ علیہ (سابق مفتی عام سعودی عرب) فرماتے ہیں: زمانۂ قریب کی معروف ومشہور اور مقبول ترین شخصیت شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز رحمۃ اللہ علیہ سابق مفتی عام مملکت سعودی عربیہ سے پہلے ان کے محترم استاذ سماحۃ الشیخ محمد بن ابراہیم بن عبد اللطیف رحمۃ اللہ علیہ (1311-1389ھ) مملکت سعودی عربیہ کے مفتی عام اور سپریم کورٹ کے صدر جج تھے، نماز تراویح کے بارے میں ان کی رائے بھی 20 رکعات کی تھی، چنانچہ محمد بن سعد الشویعر شیخ موصوف کے بارے میں لکھتے ہیں: "جمہور اہل علم کی جو رائے تھی اور جس پر جمہور کا عمل تھا، اس سے ہٹ کر شیخ کی رائے نہیں تھی، یعنی شیخ بھی 20 رکعات تراویح اور وتر کے قائل وعامل تھے، پھر ایک واقعہ شیخ ابراہیم بن عبد اللہ بن عتیق جو کہ شمالی علاقہ کے جج تھے، کے ساتھ پیش آیا وہ یہ کہ انہوں نے گیارہ رکعات تراویح پڑھادی تو شیخ محمد بن ابراہیم بن عبد اللطیف (جو کہ اس وقت مملکت کے مفتی عام تھے) کی طرف سے ان کے پاس تار پہنچا کہ وہ تراویح کی نماز اسی

---

[1] المغني: 604/2، فصل والمختار عند أبي عبد الله... مسئلہ: 247 وقيام شهر رمضان عشرون ركعة

[2] مجموع الفتاویٰ: 56/23، المجلد الرابع عشر، تنازع العلماء في مقدار القيام في رمضان

طرح اور اسی تعداد میں پڑھیں جس طرح اور جس تعداد میں لوگ پڑھتے چلے آرہے ہیں، چنانچہ انہوں نے اپنی رائے اور عمل سے رجوع کیا اور سماحۃ الشیخ کے حکم کے مطابق 20 رکعات تراویح پڑھی (اور پڑھائی)[1]۔"

ابھی ہم نے علامہ الشیخ محمد بن ابراہیم بن عبد اللطیف رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا کہ انہوں نے سعودی عرب کے شمالی علاقوں کے قاضی کو تار بھیجا کہ بیس رکعات تراویح ہی پڑھاؤ، یاد رہے کہ علامہ محمد بن ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ، شیخ عبد العزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ ہیں، خود شیخ بن باز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے دس سال تک ان (شیخ محمد بن ابراہیم) کے دروس میں شرکت کی اور میں نے تمام شرعی علوم ان سے سیکھے[2]۔

نجد اور ریاض کے علاقوں میں شیخ عبد العزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ کے مفتی عام بننے سے پہلے 20 رکعات تراویح پڑھنے کا عام معمول تھا، چنانچہ ایک جگہ محمد بن سعد الشویعر لکھتے ہیں:

نیز شیخ عبد العزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ نے ریاض کی جامع مسجد میں عملی طور پر گیارہ رکعات تراویح کو نافذ العمل کر دیا حالانکہ یہ عمل ریاض کی عام مساجد کے معمول کے خلاف تھا[3]۔

فضیلۃ الشیخ الدکتور محمد بن سعد الشویعر کی اس تحریر نے بتایا کہ ریاض اور گرد ونواح کے علاقوں میں صدیوں سے تمام مسلمان مستقل بیس رکعات تراویح پڑھتے چلے آرہے تھے حتی کہ شیخ، مجدد، محمد بن عبد الوہاب اور ان کی اولاد (رحمۃ اللہ علیہم) کے زمانوں میں بھی بیس رکعات تراویح ہی کا معمول تھا، لیکن شیخ بن باز رحمۃ اللہ علیہ نے پہلی بار عملی طور پر بیس رکعات کے بجائے گیارہ رکعات تراویح کو عام کیا۔

---

[1] مجلة البحوث الاسلامية، ص: 334، شمارہ نمبر: 51 ربیع الاول -- جمادی الآخرۃ 1418ھ، تصدر بهذه المجلة عن رياسة ادارة البحوث العلمية والافتاء، الرياض

[2] احكام الجمعة والجماعة للشيخ بن باز، ص: 6

[3] مجلة البحوث الاسلامية، ص: 333، شمارہ 51 ربیع الاول --جمادی الآخرۃ 1418ھ

الشیخ احمد بن عبدالعزیز الحمدان حفظہ اللہ(مدیر مرکز الدعوۃ والارشاد، جدہ)

سعودی عرب کے ایک نامور عالم دین، شیخ و مفتی علامہ، الشیخ احمد بن عبد العزیز الحمدان، مدیر مرکز الدعوۃ والارشاد، جدہ، نے ایک مختصر سا کتابچہ اور بڑا چارٹ (chart) تحریر فرمایا ہے، جس کا نام "المصابیح فی صلاۃ التراویح" ہے، فضیلۃ الشیخ احمد الحمدان نے اس کتابچہ میں تراویح کے بارے میں عناوین قائم فرمائے ہیں: (1) صلاۃ التراویح عبر التاریخ (2) عدد رکعات صلاۃ التراویح (3) اور تیسرا اہم عنوان ہے: مما جاء عن الصحابۃ والتابعین، اس باب میں لکھا ہے: "سائب بن یزیدؓ فرماتے ہیں کہ سیدنا عمرؓ نے اپنی خلافت میں ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کو امام بنا کر لوگوں کو اکیس رکعات تراویح و وتر پڑھنے کا حکم دیا تھا"۔

پھر فضیلۃ الشیخ نے ایک دوسری روایت بھی نقل فرمائی ہے کہ: سیدنا علیؓ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو رمضان میں بیس رکعات تراویح پڑھائیں۔

قاضی ابن عربی مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ رمضان کے قیام کیلئے رکعات کی تعداد مقرر نہیں ہے، لیکن جب صحابہ ث سے کوئی چیز ثابت ہو جائے تو اس کی مخالفت کرنے کا کوئی جواز بھی نہیں ہے۔

شیخ احمد الحمدان حفظہ اللہ نے اپنے رسالہ کے آخر میں "فتاویٰ ہےئۃ کبار العلماء" بھی نقل کیے ہیں، جن میں ایک فتویٰ یہاں سعودی عرب کی اللجنۃ الدائمۃ کا ہے،[1] جس میں لکھا گیا ہے کہ:

رسول کریم ا نے تراویح کی رکعات کو محدود و مقرر نہیں فرمایا لیکن عمرؓ نے اور دوسرے صحابہ ث نے بعض راتوں میں بیس رکعات تراویح پڑھی ہیں اور یہ لوگ ہی حقیقت میں سنت کو سب سے زیادہ جاننے اور سمجھنے والے تھے۔

پس جو لوگ ترواتح اور تہجد کو ایک قرار دیتے ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث اور اللہ کی کتاب دونوں کے فرمان کے نافرمان ہیں امام بخاری رحمہ اللہ نے بخاری شریف میں تراویح کا باب الگ

[1] فتاویٰ اللجنۃ الدائمۃ: 197/7

باندھا ہے اور تہجد کا باب الگ باندھا ہے، اگر دونوں کو ایک ہی کہا جائے تو امام بخاری کو الگ الگ باب باندھنے اور دونوں بابوں میں الگ الگ احادیث لانے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔

اور پورے رمضان میں تراویح میں صرف ایک قرآن ختم کرتے تھے جبکہ تہجد کی نماز میں امام بخاری تنہا پڑھتے تھے اور تہجد میں ہر تین رات میں ایک قرآن ختم کرتے تھے۔ (مقدم فتح الباری)

اسی بخاری میں یہ روایت بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ہے: اللہ کے رسول ﷺ تہجد کی نماز تیرہ رکعت پڑھتے تھے اور جب فجر کی آذان سنتے تو دو ہلکی رکعت ادا کرتے (یعنی فجر کی سنت)[1]۔

اب ذرا غور فرمائیں کہ گیارہ رکعت والی روایت بھی بخاری ہی کی ہے اور تیرہ رکعت والی روایت بھی بخاری ہی کی ہے اور دونوں روایتیں حضرت عائشہ ہی سے مروی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ غیر مقلدین تیرہ والی کو چھوڑ کر گیارہ والی روایت ہی کا نام لیتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس تیرہ رکعت واالی ورایت کو چھوڑنے کا کیا وجہ ہے؟۔

یہ روایت حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ہے اور طویل ہے میں یہاں اس کا ضروری حصہ نقل کرتا ہوں، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: آنحضور ﷺ نے وضو وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد نماز تہجد پہلے دو رکعت ادا کی، پھر دو رکعت ادا کی، پھر دو رکعت ادا کی، پھر دو رکعت ادا کی، پھر دو رکعت ادا کی، پھر دو رکعت ادا کی، پھر وتر پڑھی[2]۔

قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں اس حدیث میں واضح ہے کہ آپ ﷺ جب دو دو رکعت کرکے تہجد ادا کرتے تھے تو وتر کے سوا تہجد کی نماز کل بارہ رکعتیں ہوئی تھیں اور غیر مقلدین کے نزدیک تراویح تہجد ہی ہے وہ دو دو رکعت کرکے صرف آٹھ رکعت رمضان والی تہجد کی نماز پڑھتے ہیں، آنحضور ﷺ نے تو دو دو رکعت کرکے بارہ رکعتیں پڑھیں، اور یہ آٹھ رکعتیں پڑھیں، اللہ کے رسول کی سنت کی صریح خلاف ورزی کا نام عمل بالحدیث رکھا ہے؟۔

---

[1] باب مايقرأ في ركعة الفجر

[2] بخاري كتاب الوتر

شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ : " حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ وہ فعل تھا جس کو ساری امت نے بالاتفاق قبول کیا ہے، چاروں مذاہب والوں کا اس پر عمل ہے جیسا کہ تمام امت نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تراویح والے عمل کو ایک امام کے پیچھے با جماعت تراویح پڑھنا بالاتفاق قبول کرلیا ہے اور آج تک ساری امت اسی طرح تراویح پڑھتی ہے"۔

ابن تیمیہ مزید فرماتے ہیں : "ساری امت حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مسنون و جاری کردہ عمل کو بالاتفاق اتباع سمجھتی ہے۔"

حافظ ابن حجر بخاری کی شرح میں فرماتے ہیں : "اگر کوئی عمل زمانہ نبوت میں نہیں تھا، اور اس کو خلفائے راشدین نے جاری کیا تو وہ سنت ہے، اور اس کی اتباع ضروری ہے [1]۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں : کہ خلفائے راشدین کا عمل لغتہ بدعت تو کہلائے گا مگر شریعت میں وہ عمل مسنون ہوتا ہے، اور اس کی وجہ ہے کہ : " خلفائے راشدین اپنے زمانہ میں جس چیز کو جاری کیا وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم سے جاری کیا ہے اس لئے وہ سنت ہی ہے [2]۔

علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں : "پس یہ ثابت ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ رمضان میں لوگوں کو بیس رکعت تراویح اور تین رکعت وتر پڑھاتے تھے، اسی لئے علماء کی ایک بڑی تعداد نے اسی کو سنت قرار دیا ہے، اس لئے کہ حضرت ابی بن کعب نے یہ بیس تراویح اور تین وتر مہاجرین اور انصار کے درمیان پڑھائی اور ان میں سے کسی نے بھی اس پر انکار نہیں کیا [3]۔

امام ابن تیمیہ کے فرمان کا حاصل یہ ہے کہ اگر بیس رکعت تراویح کا عمل خلاف سنت ہوتا یا بدعت ہوتا جیسا کہ بعض حضرات کہتے ہیں تو یہ ناممکن تھا کہ مہاجرین وانصار کی آنکھوں کے سامنے مسجد نبوی میں یہ خلاف سنت اور بدعت کام ہوتا رہتا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو خاموشی سے دیکھتے رہتے۔

---

[1] فتح الباري ج:2/ص:400

[2] فتاوي ابن تيميه ج: 22/ ص:235

[3] فتاوي ابن تيميه ج: 23/ص:112

شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: "جس کا یہ خیال ہے کہ تراویح کے بارے میں آنحضور ﷺ سے کوئی متعین مقدار ثابت ہے کہ اس میں کمی زیادتی نہیں ہو سکتی تو اس نے غلطی کی۔"

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رمضان میں بیس رکعتیں تراویح پڑھاتے تھے اور وتر [1]۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ روایت ضعیف ہے، اور اس کا راوی ابراہیم بن عثمان ضعیف ہے، چلئے ہم نے تسلیم کر لیا کہ سندا روایت ضعیف ہے مگر سند میں کسی ضعیف راوی کے آجانے سے اصل متن کا ضعیف ہونا خصوصا جب کہ صحابہ کرامؓ کا اسی بیس رکعت پر اجماع بھی ثابت ہے کہاں سے ضروری ہو گیا کتنی روایتیں ہیں جن کی سند ضعیف ہیں مگر اس کا متن ثابت ہے اور اس پر اہل علم کا عمل ہے، مثلا دیکھئے حدیث میں ہے: لا وضوء لمن لم یذکر اسم اللہ علیہ۔ یعنی جو وضو کے شروع میں بسم اللہ نہ پڑھے اس کا وضو نہیں ہوتا، یہ حدیث ضعیف ہے، اور وضو پر بسم اللہ پڑھنے کی ایک حدیث بھی صحیح نہیں ہے، امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں: "میرے علم اس بارے میں ایک حدیث بھی ایسی نہیں ہے جس کی سند عمدا ہو۔

مشہور غیر مقلد عالم دین مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری فرماتے ہیں:" كل ماروي في هذ الباب ليس بقوي . یعنی اس بارے میں جتنی بھی حدیثیں ہیں ان میں سے ایک بھی قوی نہیں ہے [2] لیکن اس کے باوجود مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری فرماتے ہیں:

---

[1] مصنف ابن بي شيبه

[2] آٹھ رکعات تراویح کے قائلین حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، جو کہ علمائے حدیث کے نزدیک ضعیف ہے۔
عن جابر رضی اللہ عنہ قال صلی رسول اللہ ﷺ فی رمضان ثمان رکعات ۔ (ابن خزیمہ، ابن حبان)
حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان میں آٹھ رکعات پڑھیں۔
جائزہ:
(۱) یہ روایت اس قدر ضعیف و منکر ہے کہ اس سے استدلال کیا ہی نہیں جا سکتا، چونکہ اس میں ایک راوی عیسی بن جاریہ ہے جس کی بابت ابن حجر نے نقل کیا ہے:

میں کہتا ہوں کہ اس میں کوئی نہیں کہ یہ حدیث (جو کہ ضعیف ہے) اس بارے میں نص ہے کہ وضو میں بسم اللہ پڑھنا یا وضو کا رکن ہے یا شرط ہے[1]۔

مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری صاحب ضعیف حدیث سے وضو میں بسم اللہ پڑھنے کو رکن یا شرط بتلاتے ہیں۔

اسی وجہ سے محدثین کو یہ قاعدہ مقرر کرنا پڑا کہ " ان ضعف السند لایستلزم ضعف المتن " یعنی سند کے ضعیف ہونے سے متن کا ضعیف ہونا لازم نہیں آتا۔

مصنف ابن ابی شیبہ حدیث کی مشہور کتاب ہے، ابن ابی شیبہ امام بخاری سے مقدم اور ان کے استاد ہیں انہوں نے اپنی مصنف میں تراویح کی تعداد کو بتلاتے کے لئے یہ باب باندھا ہے " باب کم یصلی فی رمضان " یعنی اس کا بیان کہ تراویح کی کتنی رکعتیں پڑھی جائیں گے، بن ابی شیبہ نے اس میں تیرہ حدیثیں ذکر کی ہیں اور لطف یہ ہے کہ آٹھ رکعت والی کوئی حدیث ذکر نہیں کی ہے، دس حدیثیں وہ ذکر کی ہیں جن میں بیس رکعت تراویح کا بیان ہے، ایک حدیث میں چالیس رکعت اور سات وتر کا ذکر ہے، ایک حدیث میں چھتیس رکعت تراویح کا بیان ہے، اور ایک روایت میں اس کا ذکر ہے کہ سعید بن جبیر رمضان کی بیس راتوں میں چو بیس رکعت تراویح پڑھتے تھے، اور جب وہ رمضان میں اعتکاف کے لئے بیٹھتے تو اٹھائیس رکعت تراویح پڑھتے تھے، غرض کسی ایک روایت میں آٹھ رکعت تراویح کا

قال ابو داؤد: عندہ مناکیرہ۔
امام ابو داؤد کہتے ہیں کہ اس کے پاس منکر روایتیں ہیں۔
ذکرہ الساجی والعقیلی فی الضعفاء
ساجی اور عقیلی نے اس کو ضعیف راویوں میں شمار کیا ہے۔
قال ابن عدی احادیثہ غیر محفوظ
ابن کہتے ہیں کہ اس کی حدیثیں محفوظ نہیں (تہذیب التہذیب، حرف العین)
لہٰذا اس طرح کی روایت منکرہ موضوعہ کو دلیل بنانا صحیح نہیں۔

[1] تحفة ج: 1/ص: 38

ذکر نہیں۔اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ محدث ابن ابی شیبہ نے اس باب کا آغاز ہی بیس رکعت تراویح کے بیان سے کیا ہے، اور اس باب کو ختم کیا ہے تو بیس ہی رکعت کے بیان پر ختم کیا ہے۔

شیخ محمد بن عبد الوہاب رحمۃ اللہ علیہا کا فتویٰ:

شیخ محمد بن عبد الوہاب رحمۃ اللہ علیہ سے رکعاتِ تراویح کی تعداد کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ بیس رکعات تراویح پڑھنا ہی بہتر (اور سنت کے موافق) ہے[1]۔

عبداللہ بن محمد بن عبد الوہاب رحمۃ اللہ علیہم کا قول:

"محمد بن عبد الوہاب رحمۃ اللہ علیہا کے صاحبزادے شیخ عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اہل علم نے جو ذکر کیا ہے اس کے مطابق رکعاتِ تراویح کی تعداد بیس ہے[2] "۔

"سوال: حرمین شریفین میں بیس رکعت تراویح ہونے کی وجہ سے بعض نوجوان اور کچھ طلباء حرمین میں تراویح نہیں پڑھتے، اور کہتے ہیں کہ بیس رکعات تراویح بدعت ہے، ان لوگوں کے بارے میں آنجناب کی کیا رائے ہے[3] ؟

جواب: حرمین شریفین میں تراویح نہ پڑھنے والوں کو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سامنے رکھنا چاہئے (وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا[4]) "اور جو کوئی اس کے بعد کہ اس پر راہِ ہدایت کھل چکی، رسول کی مخالفت کرے گا اور مؤمنین

---

[1] الدرر السن الدرر السنية: 363/4، عدد التراويح

[2] الدرر السن الدرر السنية: 363/4، عدد التراويح، سماحة الشيخ عبد العزيز بن عبد اللهالشيخ المفتي العام للمملكة في حديث رمضاني خاص ل"جريدة المدينة"

[3] انٹرویو: محمد رابع سليمان، مكة المكرمہ

الخميس ١ رمضان ١٤٢٨ الموافق ١٣ سبتمبر ٢٠٠٧م (العدد ١٦٢١٣) السنة الثالثة والسبعون

[4] سورة النساء آیت: 115

کے راستے کے علاوہ کسی اور راستہ کی پیروی کرے گا، ہم اسے کرنے دیں گے جو کچھ وہ کرتا ہے اور پھر اسے ہم جہنم میں جھونک دیں گے" چنانچہ کسی کا یہ دعویٰ کرنا کہ تراویح کی رکعات کی تعداد گیارہ ہی ہے اپنے آپ کو لوگوں سے الگ کرنے اور مسلمانوں کے منہج سلیم سے خروج کے مترادف ہے. جی ہاں! گیارہ رکعات تراویح بھی پڑھی جا سکتی ہے، جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ (رسول اللہ ﷺ گیارہ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے، نہ رمضان میں اور نہ غیر رمضان میں) لیکن بیس رکعات تراویح پڑھنا بدعت نہیں بلکہ سنت ہے، اس لئے کہ قیامِ رمضان کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے کسی خاص تعداد کی تعیین نہیں فرمائی، آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: (مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ) "جو شخص ایمان ویقین کے ساتھ رمضان کی راتوں میں قیام کرے گا (یعنی نوافل پڑھے گا) اللہ تعالیٰ اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیں گے" اسی وجہ سے سلف صالحین سے تراویح کی رکعات کے بارے میں اختلاف منقول ہے، بعض گیارہ رکعات کے قائل ہیں، بعض تیرہ اور بعض تیئیس رکعات کے قائل ہیں، بلکہ بعض اہل علم سے تو چھتیس رکعات کی تعداد بھی منقول ہے، اگر تراویح کی رکعات سے متعلق کوئی نص قطعی ہوتی تو اسلاف میں اختلاف نہ ہوتا اور نص قطعی کی مخالفت نہ کرتے، چنانچہ لوگ حرمین شریفین میں بیس رکعات تراویح پڑھتے چلے آرہے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ زمانۂ قدیم سے یہی سنت متبعہ ہے اور آج تک اسی پر عمل ہو رہا ہے، اب کوئی شخص حرم میں عشاء کی نماز تو پڑھے اور تراویح کی نماز کے بارے میں کہے کہ اہل حرم کی یہ نماز بدعت ہے، میں ان کے ساتھ نہیں پڑھتا ایسے شخص سے کہیں گے کہ تو ہی مبتدع ہے اور مسلمانوں کے منہج سلیم سے خارج ہے، اہل حرم ائمۂ متقدمین اور زمانۂ ماضی کے معتبر و ثقہ علماء کی تقلید میں تراویح پڑھ رہے ہیں، کیا آپ کے پاس ان علماء وائمہ کرام کے مقابلہ میں زیادہ علم ہے؟ اور جب یہ کہے کہ حرم میں نماز نہیں پڑھوں گا کیوں کہ آپ لوگ بدعت نماز پڑھتے ہیں، تو ایسے شخص سے ہم کہیں گے کہ اللہ کی قسم! تو ہی بدعتی ہے، ایسے لوگوں کے بارے مجھے لگتا ہے کہ یہ لوگ تکبرِ نفسی میں مبتلا ہیں اور خود کو دھوکہ دے رہے ہیں کہ یہ لوگ اپنے آپ کو تمام مسلمانوں سے افضل اور کامل ترین سمجھ رہے ہیں، ان کا

قول و عمل، کم عقلی اور دین کے معاملہ میں کج فہمی کا نتیجہ ہے، حالانکہ شریعت میں مطلوب و پسندیدہ عمل یہ ہے کہ ایک مسلمان دیگر مسلمان بھائیوں کے ساتھ رہے، نماز تراویح سراسر خیر ہے، ہمارے لئے مناسب نہیں کہ ہم اس عمل کو باطل قرار دیں جس پر صدیوں سے مسلمانوں کا عمل چلا آرہا ہے[1]۔

خود علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: خلاصہ کلام یہ ہے کہ مسئلہ تردیح کے تمام روایات میں نماز تراویح، ان کا باجماعت یا تنہا پڑھنا تو ثابت ہے لیکن خاص نماز تراویح کی تعداد اور اس میں قراءۃ کی تعیین آنحضور ﷺ سے منقول نہیں۔ (نیل الاوطار، ج: 3/ص: 64)

اجماع اسلاف امت:

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمۃ اللہ علیہم وفقہائے امت رحمۃ اللہ علیہم کا اتفاق ہے کہ رمضان میں بیس تراویح سنت ہے۔ ابن قدامہ فرماتے ہیں:

اور امام احمد رحمہ اللہ کے ہاں پسندیدہ عمل بیس رکعات کا ہے اور حضرت ثوری بھی یہی کہتے ہیں اور ان کی دلیل یہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے صحابہؓ کو حضرت ابی بن کعب کی اقتداء میں جمع کیا تو وہ بیس رکعات پڑھتے تھے، نیز حضرت امام احمد کا استدلال حضرت یزید و علیؓ کے روایات سے ہے، ابن قدامہ کہتے ہیں کہ یہ بمنزلہ اجماع کے ہے، نیز فرماتے ہیں کہ جس چیز پر حضور ﷺ کے صحابہ عمل پیرا رہے ہوں وہی اتباع کے لائق ہے۔ (ملخص، المغنی، ج: 2/ص: 139، صلوۃ التراویح)

آٹھ رکعات تراویح کے قائلین حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، جو کہ علمائے حدیث کے نزدیک ضعیف ہے۔

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان میں آٹھ رکعات پڑھیں۔ (ابن خزیمہ، ابن حبان)

جائزہ:

(ا) یہ روایت اس قدر ضعیف و منکر ہے کہ اس سے استدلال کیا ہی نہیں جاسکتا، چونکہ اس میں ایک راوی عیسی بن جاریہ ہے جس کی بابت ابن حجر نے نقل کیا ہے:

---

[1] عربی اخبار: جریدۃ المدینہ، جمعرات 1/رمضان 1428ھ، مطابق: 13/ستمبر 2007ء، شمارہ: 16213، جلد: 73

قال ابو داؤد: عنده مناکیره

امام ابو داؤد کہتے ہیں کہ اس کے پاس منکر روایتیں ہیں۔

ذکره الساجی والعقیلی فی الضعفاء

ساجی اور عقیلی نے اس کو ضعیف راویوں میں شمار کیا ہے۔

قال ابن عدی احادیثه غیر محفوظ

ابن کہتے ہیں کہ اس کی حدیثیں محفوظ نہیں (تہذیب التہذیب، حرف العین)

لہٰذا اس طرح کی روایت منکرہ موضوعہ کو دلیل بنانا صحیح نہیں۔

نماز تراویح کی چودہ سو سالہ تاریخ:

رمضان المبارک کی خصوصی عبادات میں سے روزہ اور تراویح ہیں، آئندہ سطور میں تراویح کی تعداد کی بابت ایک تاریخی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

نماز تراویح عہد نبوی ﷺ میں:

صحیح مسلم میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (رمضان کی) ایک رات مسجد میں نماز تراویح پڑھی، لوگوں نے بھی آپ ﷺ کی اقتداء میں نماز پڑھی، پھر دوسری رات آپ ﷺ نے نماز پڑھی تو مقتدیوں کی تعداد بڑھ گئی، پھر تیسری یا چوتھی رات آپ ﷺ نماز تراویح کے لئے مسجد میں تشریف نہ لائے اور صبح آ کر فرمایا: میں نے تمہارا شوق دیکھ لیا اور میں اسی ڈر سے مسجد میں نہیں آیا کہ یہ نماز تراویح تم فرض کر دی جائے گی۔

ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک رات مسجد میں لوگوں کو نماز پڑھائی، پھر دوسرے دن بھی پڑھائی، چنانچہ لوگوں کی تعداد زیادہ ہو گئی، تیسری یا چوتھی رات میں سب ہی لوگ جمع ہو گئے، اس رات رسول اللہ ﷺ نماز پڑھانے کے لئے ان کے پاس نہیں پہنچے، جب

صبح ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگوں نے جو کیا وہ میں نے دیکھا، میں صرف اس لئے تمہارے پاس نہیں آیا کہ کہیں یہ نماز تم پر فرض نہ کر دی جائے، راوی کہتے ہیں کہ یہ واقعہ رمضان کا ہے[1]۔

معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی زندگی میں دو یا تین دفعہ نماز تراویح باجماعت پڑھائی، امام ابن تیمیہ اور علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ نماز تراویح کی بابت تمام احادیث کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تراویح کی تعداد مقرر نہیں کی۔

تراویح عہد صدیقی میں:

خلیفہ راشد سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انفرادی طور پر یا چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی صورت میں تراویح کا اہتمام کرتے۔

تراویح عہد فاروقی میں:

خلیفہ دوم سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے دوران ان سب کو ایک جماعت کے تحت منظم کر دیا، چونکہ اب تراویح کے فرض ہو جانے کا احتمال نہیں تھا، یوں پورا رمضان نماز عشاء کے بعد با جماعت بیس تراویح اور تین وتر تمام صحابہ کرام کا اجماع اور اتفاق ہو گیا[2]۔

---

[1] صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرہا، باب 25 الترغيب في قيام رمضان و ہو التراويح، حديث: 761، نیز دیکھئے: صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب 80 اذا كان بين الامام وبين القوم حائط، حديث: 729، وأيضًا كتاب الجمعة، باب 29 من قال في الخطبة بعد الثناء: أما بعد، حديث: 924، وأيضًا كتاب التهجد، باب 5 تحريض النبي ﷺ على صلاة الليل والنوافل، حديث: 1129، وأيضًا كتاب صلاة التراويح، باب 1 فضل من قام رمضان، حديث: 2012

[2] موطا امام مالک ، باب ماجاء فی قیام رمضان ، نصب الراية:154/2 ، وقال النووی فی الخلاصة اسناده صحيح (نصب الرایۃ ، ج: 2/ص:152)

آج کل بعض حضرات پورے رمضان میں باجماعت تراویح اور باجماعت وتر ادا کرتے ہیں، چونکہ سیدنا عمر ص کے دور میں حضرات صحابہ نے ایسا ہی کیا تھا، لیکن تراویح کی تعداد کے بارے میں انہیں اشکال ہو جاتا ہے، اس سلسلہ میں درج ذیل روایات پیش نظر رکھی جائیں تو اشکال بھی رفع ہو جائے گا:

میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ تقوی اختیار کرو، اور امیر کی اطاعت کرو چاہے وہ حبشی غلام ہو، تم میں سے جو میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت اختلاف دیکھے گا، پس تم میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑو، اس سے وابستہ رہو اور اپنی داڑھوں کے ساتھ مضبوط پکڑے رکھو[1]۔

اس حدیث میں نبی کریم ا نے اپنی امت کو تاکید کی ہے کہ میری سنت پر عمل کرنا تمہارے لئے ضروری ہے، اور میرے بعد میرے خلفاء راشدین کی سنت پر عمل کرنا بھی تمہارے لئے ضروری ہے ، اور اس اصول پر سختی سے کاربند رہو، یوں آپ انے خلفاء راشدین کے جس طریقے کو قابل عمل سنت قرار دیا ہے اسے ناقابل عمل بدعت کیوں کر کہا جا سکتا ہے؟ اور جس طریقے کو آپ انے مضبوط تھامے رکھنے کا حکم دیا ہے اسے چھوڑنے کی تلقین کیسے کی جا سکتی ہے؟ اور جس عمل پر حضرات صحابہؓ کرام کا اتفاق ہو گیا ہو اس میں اختلاف کی گنجائش کہاں رہتی ہے؟

الغرض تراویح کی بابت خلیفہؓ راشد سیدنا عمر ص کی یہ سنت اسی صحیح حدیث کا مصداق ہے، لہٰذا پورا رمضان عشاء کے بعد باجماعت بیس تراویح اور تین وتر پڑھنے چاہئیں۔

تراویح عہد عثمانی میں:

تیسرے خلیفہؓ راشد سیدنا عثمان ذوالنورین ص کے زمانہ میں بھی باجماعت بیس تراویح اور وتر کا معمول رہا[2]۔

---

[1] سنن الترمذي، كتاب العلم، باب 16 ماجاء في الأخذ بالسنة واجتناب البدع ، حديث:2676، وسنن أبي داود، كتاب السنة، باب 5 في لزوم السنة، حديث: 4607 صحيح، وسنن ابن ماجة، كتاب المقدمة، باب 6 اتباع الخلفاء الراشدين المهديين، حديث: 42، هذ حديث حسن صحيح (ترمذي، ج: 1/ص: 96)

[2] السنن الكبرىٰ للبيهقي ، باب عدد ركعات القيام فى رمضان

تراویح عہد علی میں :

چوتھے خلیفہ راشد سیدنا علی رض کے دور خلافت میں بھی باجماعت بیس رکعات تراویح اور تین وتر ادا کئے جاتے تھے [1] ۔

حرم مکی شریف میں تراویح :

چودہ سو سالہ دور گواہ ہے کہ حرم مکی شریف میں بیس تراویح پڑھی جاتی رہی ہیں اور اب بھی یہی معمول ہے، تاریخ اسلامی میں ایک دن بھی ایسا نہیں ملتا جب حرم مکی شریف میں آٹھ تراویح پڑھی گئی ہوں۔

مسجد نبوی شریف میں تراویح :

سعودی عرب کے نامور عالم، مشہور مفسر اور شیخ الحدیث مدینہ منورہ کے سابق قاضی اور مسجد نبوی کے مدرس شیخ عطیہ محمد سالم رحمۃ اللہ علیہ نے مسجد نبوی شریف میں تراویح کی چودہ سو سالہ تاریخ پر عربی زبان میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے : "اَلتَّرَاوِیحُ اَکْثَرَ مِنْ اَلْفِ عَامٍ فِیْ مَسْجِدِ النَّبِی علیہ الصلاۃ والسلام" جس میں انہوں نے تاریخی حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ ایک ہزار سال سے مسجد نبوی میں بیس تراویح ادا کی جارہی ہے [2]۔ وہ لکھتے ہیں کہ چودھویں صدی میں سعودی حکومت قائم ہو جانے کے بعد بھی حرم مکی اور حرم مدنی میں بیس تراویح اور تین وتر پڑھے جاتے ہیں اور آج تک اسی پر عمل ہو رہا ہے [3] ۔

حرمین شریفین میں نماز تراویح کی ادائیگی کا یہ روح پرور اور حسین منظر مواصلاتی سیارے کے توسط سے دنیا کے مختلف ممالک میں ٹی وی اور ریڈیو پر دیکھا اور سنا جاسکتا ہے۔

---

[1] السنن الکبریٰ للبیہقي ، باب عدد رکعات القیام فی رمضان

[2] ص: 41- 58

[3] ص: 65، العہد السعودي

سینکڑوں سالہ عمل :

ایک ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے کہ حرمین شریفین میں بیس رکعات تراویح پڑھی جارہی ہے۔

بہر حال ان سارے مباحث کا ماحصل اور خلاصہ یہی نکلا کہ رمضان المبارک میں تراویح کی 20 رکعات نماز پڑھنا ہی سنت ہے، اور اس پر عہد صحابہ ث سے لیکر آج تک اجماعِ امت ہو چکا ہے۔

نماز سفر

سفر میں ظہر، عصر اور عشاء کی چار چار فرض رکعتوں کو دو دو پڑھنا قصر کم کرنا کہلاتا ہے۔ فجر اور مغرب میں قصر نہیں ہے۔ جو شخص ارادہ سفر کے ساتھ اپنے گھر سے چلے اور اپنی آبادی سے نکل جائے تو وہ ازروئے شریعت مسافر ہے اور اپنی فرض نماز میں قصر کر سکتا ہے۔ چنانچہ سیدنا انسؓ سے روایت ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے مدینے میں ظہر کی نماز چار چار رکعتیں پڑھیں اور ذی الحلیفہ مین عصر کی نماز دو رکعتیں پڑھیں[1] ۔

ذوالحلیفہ ایک مقام کا نام ہے جو مدینہ منورہ سے تین شرعی میل کے فاصلے پر ہے۔ نبی اکرم ﷺ مکہ کے لئے روانہ ہوئے تو ذوالحلیفہ پہنچ کر نماز عصر کا وقت ہو گیا، تو آپ نے وہاں عصر میں قصر کر لی۔

رسول اللہ ﷺ جب تین شرعی میل یا تین فرسنگ کی مسافت پر نکلتے تو نماز دو رکعتیں پڑھتے[2] ۔

یعنی سفر لمبا ہوتا تھا تو آبادی سے نکل کر چاہے تین میل جائے بس سفری نماز شروع کرے۔

مسافر کو چاہئے کہ احتیاطا نو میل پر قصر کر لے۔ اپنی آبادی کی حدود سے نکلنے کے بعد اگر منزل مقصود نو میل یا اس سے زیادہ مسافت پر واقع ہو تو مسافر قصر کر سکتا ہے[1] ۔

---

[1] صحیح البخاری ، التقصیر ،باب یقصر اذا خرج من موضعہ ،حدیث: ۱۵۴۶،۱۰۸۹م۱۵۴۷،وصحیح مسلم ،صلاہ المسافرین ، باب صلاۃ المسافرین وقصرھا ،حدیث: ۶۹۰واللفظ لہ۔

[2] مسلم حوالہ سابقہ حدیث 691 ۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ قصر 48 میل یعنی 78 کلومیٹر پر ہوگا یعنی جب سفر کا ارادہ اتنا تو آبادی سے نکل کر سفر شروع کرے۔

سیدنا ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ، ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنیؓ کے ساتھ سفر میں رہا، یہ سب چار کی بجائے دو رکعتیں ہی پڑھا کرتے تھے۔[2]

سیدنا یعلیٰ بن امیہؓ سے روایت ہے کہ میں نے عمرؓ سے پوچھا کہ اللہ تو فرماتا ہے: تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز قصر ادا کرو اگر تمہیں ڈر ہو کہ کافر حملہ کرکے تمہیں فتنے میں ڈال دیں گے۔

آج ہم امن میں ہیں، نماز قصر کیوں کریں؟ سیدنا عمرؓ نے کہا کہ مجھے بھی یہی تعجب تھا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا: امن کی حالت میں قصر کی اجازت دینا اللہ کا تم پر احسان ہے اسے قبول کرو[3]۔

سیدنا حارثہ ابن وہبؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں منی میں قصر نماز پڑھائی، حالانکہ ہم تعداد میں بہت زیادہ اور نہایت امن کی حالت میں تھے[4]۔

---

[1] **تبصرہ**: تمام فقہائے امت میں سے کسی نے بھی یہ مطلب نہیں بتایا جو یہ حضرات بتارہے ہیں۔ خود ان کے امام مبارک پوری {مترجم بلوغ المرام 293/1} پر اعلان کرتے ہیں کہ "رہی یہ حدیث تو اس کے مطابق کسی فقیہ کا قول ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ فقہائے امت نے اس کا یہ مطلب بتایا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ صرف تین میل یا تین فرسخ کے سفر میں قصر فرماتے تھے بلکہ مطلب یہ ہے کہ سفر تو تین میل یا تین فرسخ سے زیادہ کا ہوتا تھا لیکن آپ ﷺ تین میل یا تین فرسخ ہی کے فاصلے پر قصر پڑھنا شروع کردیتے تھے۔ اور حدیث کا جو یہ مطلب فقہا نے بیان کیا ہے یہی صحیح ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس روایت کا راوی شعبہ ہے اور ان حضرات نے شعبہ کو وہم کا مریض ٹھہرایا ہے {تسہیل الوصول ص: 159,163}۔ اور خصوصا اس حدیث میں تو شک بھی ہے لہذا ان حضرات کے اصول کے مطابق یہ حدیث ناقابل استدلال ہے۔

[2] صحیح مسلم، صلاۃ المسافرین، باب صلاۃ المسافرین، وقصرها، حدیث:٦٨٩

[3] صحیح مسلم، صلاۃ المسافرین، باب صلاۃ المسافرین، وقصرها، حدیث 686

[4] صحیح البخاری، التقصیر، باب الصلاۃ بمنی، حدیث: 1083، 2156 مسلم، صلاۃ المسافرین، باب صلاۃ المسافرین، وقصر الصلاۃ بمنی، حدیث: 696۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

قصر کی حد:

اگر کوئی مسافر کسی علاقے میں متردد ٹھہرے کہ آج جاؤں گا یا کل تو نماز قصر کرتا رہے، خواہ کئی مہینے لگ جائیں۔

ابو حمزہ نصر بن عمرانؒ سے روایت ہے کہ میں نے سیدنا ابن عباسؓ سے سوال کیا کہ ہم غزوے کی غرض سے خراسان میں طویل قیام کرتے ہیں، کیا ہم پوری نماز پڑھیں؟ آپ نے فرمایا: دو رکعتیں ہی پڑھا کرو، خواہ تمہیں کسی جگہ متردد مسافر کی حیثیت سے دس سال قیام کرنا پڑے[1]۔[2]

اگر انیس دن تک ٹھہرنے کا ارادہ ہو تو نماز میں قصر کرے۔ اور اگر انیس روز سے زائد ٹھہرنے کا ارادہ ہو تو پھر پہلے ہی روز سے نماز پوری پڑھنی چاہئے۔

سیدنا ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں ۱۹ دن قیام کیا اور قصر کرتے رہے۔ سیدنا ابن عباسؓ نے فرمایا: اگر سفر میں کہیں ۱۹ دن اقامت کریں، ہم قصر کریں گے اور اگر انیس دن سے زیادہ اقامت کریں گے تو نماز پوری پڑھیں گے[3]۔[4]

---

[1] المصنف لابن ابی شیبۃ: 210/2، حدیث: 8202۔ دوسرا نسخہ، ج: ۲/453، 454، وسندہ صحیح۔

[2] تبصرہ: حضرت عبد اللہ بن مسعود مدرک رکوع کو مدرک رکعت سمجھتے تھے۔ یہ حضرات عبد اللہ بن مسعود کے اس قول کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے لیکن یہ صحابی کا فتوی ہے { ماہنامہ الحدیث 30 ص: 14 }۔ عبد اللہ بن مسعود کا فتوی ان حضرات کے لئے قابل استدلال نہیں تھا لیکن یہاں پر ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فتوی ان کے لئے قابل استدلال بن گیا ہے۔

[3] صحیح البخاری، التقصیر، باب ما جاء فی التقصیر و کم یقیم حتی یقصر؟ حدیث: 1080۔

[4] تبصرہ: یہ صحابی کا قول ہے اور اس بارے علی زئی صاحب کا فتوی گزر چکا کہ مقبول نہیں۔

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

مسافت قصر:

کم از کم کتنے لمبے سفر میں قصر کی اجازت ہے اس سلسلہ کے اکثر روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہی معلوم ہوتا ہے کہ "اگر اڑتالیس میل یا اس سے زیادہ سفر ہو تو قصر کرے ورنہ نہیں، کیونکہ اکثر روایات میں چار برد کا لفظ آتا ہے اور ایک برد بارہ میل کا ہوتا ہے۔ (مختار الصحاح للرازی)

48 = 4*12 اور واضح رہے کہ 48 میل کی مسافت تقریبا 1/2 کیلو میٹر کے برابر ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مجھے ابن عباسؓ کا یہ عمل معلوم ہوا کہ آپ مکہ و طائف، مکہ و عسفان، مکہ وجدہ جیسے سفر میں قصر کرتے تھے، امام مالک فرماتے ہیں کہ یہ مسافت چار برد کی ہے اور سب سے پسندیدہ مسافت سفر یہی ہے۔ نیز فرمایا کہ بستی کے آبادی سے نکل کر قصر شروع کرے اور واپسی پر بستی میں داخل ہونے پر نماز مکمل پڑھے[1]۔

مکہ مکرمہ سے جدہ کا فاصلہ 72 کیلو میٹر ہے اور مکہ سے طائف کا فاصلہ تقریبا 88 کیلو میٹر ہے جب کہ مکہ اور عسفان کی درمیانی مسافت 80 کیلو میٹر ہے۔

حضرت عبد اللہ ابن عمر اور حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہم چار برکے لمبے سفر میں نماز قصر پڑھتے اور روزہ افطار کرتے اور چار برد سولہ فرسخ کے برابر ہوتے ہیں، اور ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے، (4 برد = 16 فرسخ * 3 میل = 48 میل)۔ (بخاری فی کم یقصر الصلوۃ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ مکہ سے عرفات تک جاتے ہوئے نماز میں قصر کرلیں؟ آپ نے فرمایا " نہیں" البتہ مکہ سے عسفان، جدہ، اور طائف جیسے سفر میں قصر کر سکتے ہو[2]۔

---

[1] مؤطا امام مالک، ما یجب فیہ تقصیر الصلاۃ

[2] صححہ ابن حجر۔ تلخیص الحبیر، ج: 2/ص: 46، صلاۃ المسافرین

جمہور سلف و محدثین کا مسلک:

غیر مقلد عالم دین اور معروف مفتی مولانا ابو سعید شرف الدین مسافت قصر کی بات مختلف روایات کے ذکر و تجزیہ کے بعد فتاوی ثنائیہ میں لکھتے ہیں: "خلاصہ یہ ہے کہ مسافت قصر اڑتالیس میل ہی صحیح ہے نو میل غلط ہے۔

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں جمہور سلف و محدثین کا مسلک اڑتالیس میل کے سفر پر قصر ہے اس سے کم پر نہیں[1]۔

ان سب روایات سے معلوم ہوا کہ 48 میل یا اس سے زائد سفر میں نماز قصر پڑھ سکتے ہیں، اس سے کم مسافت میں نہیں، نیز یہ کہ بستی کے آبادی سے نکل کر قصر شروع ہو جاتا ہے اسی لئے آپ ﷺ جب کہ مکہ کے لئے رخت سفر باندھتے تو مدینہ سے باہر ذوالحلیفہ پہنچ کر قصر نماز پڑھتے۔

ایک اوسط مقدار پندرہ دن" متعین فرمادی، ملاحظہ ہو:

حضرت عبداللہ ابن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ جب کسی جگہ تمہارا پندرہ دن ٹھہرنے کا ارادہ ہو تو نماز مکمل پڑھو[2]۔

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرلے وہ پوری نماز پڑھے[3]۔

سفر کی مسافت 78 کلو میٹر ہے اس کی توثیق پر درجہ ذیل احادیث دالت کرتی ہے۔

چار برید: برید:- چار فرسخ یا بارہ میل کی مسافت کو کہا جاتا ہے اور فرسخ تین میل کا ہوتا ہے۔ لہٰذا مسافت سفر 48 میل ہوئی۔

---

[1] ثناء اللہ امرتسری، فتاوی ثنائیہ، ج: 1/ص: 462

[2] المغنی، ج: 2/ ص: 288، صلاۃ المسافر

[3] ترمذی، فی کم تقصر الصلاۃ

عَنْ عَطَاءِ بْنِ أَبِي رَبَاحٍ، " أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ، وَعَبْدَ اللهِ بْنَ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ كَانَا يُصَلِّيَانِ رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ، وَيُفْطِرَانِ فِي أَرْبَعَةِ بُرُدٍ فَمَا فَوْقَ ذَلِكَ[1] "

عن شريح بن هانئ، قال: أتيت عائشة أسألها عن المسح على الخفين، فقالت: عليك بابن أبي طالب، فسله فإنه كان يسافر مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فسألناه فقال: "جعل رسول الله صلى الله عليه وسلم ثلاثة أيام ولياليهن للمسافر، ويوما وليلة للمقيم2"

عن ابن عمر رضي الله عنهما: أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لا تسافر المرأة ثلاثة أيام إلا مع ذي محرم3.

عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللهِ، عَنْ أَبِيهِ؛ أَنَّهُ رَكِبَ إِلَى رِيمَ فَقَصَرَ الصَّلاَةَ فِي مَسِيرِهِ ذلِكَ قَالَ يَحْيَى قَالَ مَالِكٌ: وَذلِكَ نَحْوٌ مِنْ أَرْبَعَةِ برد4.

عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللهِ؛ أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ، رَكِبَ إِلَى ذَاتِ النُّصُبِ، فَقَصَرَ الصَّلاَةَ فِي مَسِيرِهِ ذلِكَ . قَالَ يَحْيَى، قَالَ مَالِكٌ: وَبَيْنَ ذَاتِ النُّصُبِ وَالْمَدِينَةِ أَرْبَعَةُ بُرُدٍ5.

وكان ابن عمر، وابن عباس رضي الله عنهم، يقصران، ويفطران في أربعة برد وهي ستة عشر فرسخا6:

---

[1] رواه البیہقی و ابن المنذر باسناد صحیح.

[2] مسلم جلد 1 ص 135

[3] بخاری جلد 1 ص 147

[4] موطا امام مالک جلد 1 ص 130

[5] موطا امام مالک جلد 1 ص 130

[6] بخاری جلد 1 ص 147

عَنْ عَطَاءِ بْنِ أَبِي رَبَاحٍ، قَالَ: قُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ: أَقْصُرُ إِلَى عَرَفَةَ؟ فَقَالَ: لَا، قُلْتُ: أَقْصُرُ إِلَى مَرٍّ؟ قَالَ: لَا، قُلْتُ: أَقْصُرُ إِلَى الطَّائِفِ وَإِلَى عُسْفَانَ؟ قَالَ: "نَعَمْ، وَذَلِكَ ثَمَانِيَةٌ وَأَرْبَعُونَ مِيلًا" وَعَقَدَ بِيَدِهِ[1]

عن عمر قال: "تقصر الصلاة في مسيرة ثلاث ليال[2]".

عن ابن عباس رضي الله عنهما، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يا أهل مكة لا تقصروا الصلاة في أدنى من أربع برد من مكة إلى عسفان[3].

أَخْبَرَنَا سَعِيدُ بْنُ عُبَيْدٍ الطَّائِيُّ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ رَبِيعَةَ الْوَالِبِيِّ قَالَ: سَأَلْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا إِلَى كَمْ تُقْصَرُ الصَّلَاةُ؟ فَقَالَ: " أَتَعْرِفُ السُّوَيْدَاءَ؟ قَالَ: قُلْتُ لَا، وَلَكِنِّي قَدْ سَمِعْتُ بِهَا، قَالَ: هِيَ ثَلَاثُ لَيَالٍ قَوَاصِدُ، فَإِذَا خَرَجْنَا إِلَيْهَا قَصَرْنَا الصَّلَاةَ[4] "

يمسح المسافر ثلاثة ايام سيق لبيان الرخصة للمسافر فيعم جميع المسافرين فلو ثبت حكم السفر فى اقل من ثلاثة ايام لم يعم الرخصة الجميع[5].

---

[1] مصنف ابن ابی شیبه جلد 2 ص 445 , و مسند امام شافعی جلد 1 ص 185،(کنز العمال ج 8 ص234)

[2] معجم الطبرانی کبیر الجزء 11 ص 96 رقم 11162 بحواله مجمع الزوائد ج 2 ص 747، کذا في کنز العمال (239/4)ولم اقف على سنده وذكرته تائبدا ,وروي ابرهيم بن عبد الله قال سمعت سويد بن غفلة الجعفي،يقول: اذا سافرت ثلاثا فاقصر، رواه محمد بن الحسن في الصحيح واسناده صحيح، كذا في آثار السنن (اعلاء السنن282/7)

[3] رواه الامام محمد بن الحسن فى الآثار له , و فى آثار السنن : اسناده صحيح. (آثار السنن ج 2 ص 62 و قلت رجاله ثقات من رجال الصحيحين)

[4] اعلاء السنن جلد 7 ص271-273، وفي آثار السنن (62/2)اسناده صحيح، قلت رجاله ثقات من رجال الصحيحين (اعلاء السنن، 273،274/7)

[5] اعلاء السنن ج7ص 274

مذکورہ احادیث اور آثار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مسافر کے لیے موزوں پر مسح کی مدت تین دن اور تین رات مقرر فرمانا (حدیث 1) اور عورت کو محرم کے بغیر تین دن کے سفر سے منع فرمانا (حدیث 2) یہ بتاتا ہے کہ سفر میں تین دن و رات کو ضرور دخل ہے اور مسافر کہلانے کا مستحق وہی ہے جو تین دن و رات کی مسافت کے ارادے سے گھر سے چلے۔ چنانچہ حدیث 7 اور 9 میں حضرت عمر اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے اس کی صراحت مذکور ہے۔ لیکن اونٹوں اور پیادہ قافلوں کے زمانے میں تو اس کا اندازہ لگانا آسان تھا۔ موجودہ دور میں تین دن و رات کی پیدل مسافت کا اندازہ لگانا مشکل ہے، لہٰذا احکام شرع میں سہولت کے پیش نظر اب میلوں کی تعین ضروری ہے۔ چنانچہ محققین علماء احناف نے 48 میل کو مسافت قصر قرار دیا ہے جیسا کہ ائمہ ثلاثہ حضرت امام مالک، امام احمد اور ایک روایت کے مطابق حضرت امام شافعی رحمہم اللہ کا بھی مسلک ہے اور مندرجہ بالا احادیث اور آثار بھی اس کے مؤید ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مسافت سفر کی تحدید چار برد = 16 فرسخ = 48 میل ثابت ہو رہی ہے۔ (حدیث 8، حدیث 3، 4 اور 5)

امام مالک، ابو بکر ابن ابی شیبہ، امام بخاری اور امام بیہقی رحمہم اللہ یہی نقل کر رہے ہیں کہ حضرت ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کا عمل اور فتوی اسی پر تھا کہ مسافت قصر اڑتالیس میل ہے۔

3 اور 9 میل پر تحقیق و تبصرہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ظہر کی نماز چار رکعتیں پڑھیں اور ذی الحلیفہ میں عصر کی نماز دو رکعتیں پڑھیں۔ جبکہ مدینہ اور ذی الحلیفہ کے درمیان تین شرعی میل کا فاصلہ ہے۔ تو امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اس کے تحت فرماتے ہیں[1]۔

[1] مسلم شریف ج 1 ص 242 باب صلاۃ المسافرین و قصرھا

یعنی نبی علیہ السلام حجۃالوداع کے موقع پر مکہ مکرمہ کے لیے روانہ ہوئے تو ذوالحلیفہ پہنچ کر عصر کا وقت ہو گیا تو آپ علیہ السلام نے وہاں عصر میں قصر کر لی نہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر صرف ذوالحلیفہ تک تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہیں سے واپس ہوئے[1]۔

بعض اہل ظاہر نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث جس کا متن حاشیہ[2] مذکور ہے اس سے استدلال کرتے ہوئے 3 میل کی مقدار مقرر کی ہے لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر تو تین میل سے زائد کا فرماتے تھے البتہ تین میل یا تین فرسخ کے فاصلہ ہی سے قصر شروع فرما دیتے تھے۔

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں: جمہور سلف اور محدثین کا مسلک اڑتالیس میل کے سفر پر قصر ہے اس سے کم پر نہیں[3]۔"

سفر میں اذان اور جماعت:

سیدنا مالک بن حویرثؓ کہتے ہیں کہ دو آدمی میں اور میرا چچازاد بھائی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا: جب تم سفر پر جاؤ تو اذان اور اقامت کہو، پھر تم میں جو بڑا ہو، وہ امامت کرائے[1]۔

---

[1] وأما هذا الحديث فلا دلالة فيه لأهل الظاهر لأن المراد أنه حين سافر صلى الله عليه وسلم إلى مكة في حجة الوداع صلى الظهر بالمدينة أربعا ثم سافر فأدركته العصر وهو مسافر بذي الحليفة فصلاها ركعتين وليس المراد أن ذا الحليفة كان غاية سفره فلا دلالة فيه قطعا وأما ابتداء القصر فيجوز من حين يفارق بنيان بلده أو خيام قومه إن كان من أهل الخيام هذا جملة القول فيه وتفصيله مشهور في كتب الفقه هذا مذهبنا ومذهب العلماء كافة الخ مسلم شريف ج 1 ص 242 .

[2] قال الامام النووى رحمه الله تحت هذا الحديث: هذا ليس على سبيل الاشتراط وإنما وقع بحسب الحاجة لأن الظاهر من أسفاره صلى الله عليه وسلم أنه ما كان يسافر سفرا طويلا فيخرج عند حضور فريضة مقصورة ويترك قصرها بقرب المدينة ويتمها وإنما كان يسافر بعيدا من وقت المقصورة فتدركه على ثلاثة أميال أو أكثر أو نحو ذلك فيصليها حينئذ والأحاديث المطلقة مع ظاهر القرآن متعاضدات على جواز القصر من حين يخرج من البلد فإنه حينئذ يسمى مسافرا

و حديث آخر لأنس بن مالك رضى الله عنه قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا خرج مسيرة ثلاثة أميال، أو ثلاثة فراسخ – شعبة الشاك – صلى ركعتين

[3] مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ فتاوی ثنائیہ جلد 1 ص 462

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

سفر میں نمازیں جمع کرنا:

سیدنا ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ دوران سفر میں ظہر اور عصر کو اور مغرب اور عشاء کو جمع کرتے تھے[2]۔[3]

ایک نماز کے وقت میں دوسری کو ملا کر پڑھنا، جمع کہلاتا ہے۔ جمع کی دو صورتیں ہیں:

جمع تقدیم: ظہر کے وقت میں نماز ظہر کے ساتھ نماز عصر اور مغرب کے وقت نماز مغرب کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھنا۔

جمع تاخیر: عصر کے وقت نماز عصر کے ساتھ نماز ظہر اور عشاء کے وقت نماز عشاء کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھنا۔

سیدنا معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ غزوہ تبوک کے موقع پر اگر رسول اللہ ﷺ سورج ڈھلنے سے پہلے سفر شروع کرتے تو ظہر کو مؤخر کرکے عصر کے وقت میں نماز عصر کے ساتھ جمع فرما لیتے اور اگر سورج ڈھلنے کے بعد سفر شروع کرتے تو ظہر اور عصر کو اسی وقت، یعنی ظہر کے وقت میں ادا فرماتے۔ اسی طرح اگر سورج غروب ہونے سے پہلے سفر شروع کرتے تو مغرب کو مؤخر کرکے عشاء

---

[1] صحیح البخاری، الاذان، باب الاذان للمسافرین اذا کانوا جماعۃ والاقامۃ، حدیث: 630۔

[2] صحیح البخاری، التقصیر، باب الجمع فی السفر بین المغرب والعشاء، حدیث: 1107، وصحیح مسلم، صلاۃ المسافرین، باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر، حدیث: (51)۔705

[3] **تبصرہ**: بخاری ہی میں عبد اللہ بن مسعود کی روایت ہے اور مسلم میں بھی ہے عبد اللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی آنحضرت ﷺ کو غیر وقت میں نماز پڑھتے نہیں دیکھا سوائے دو نمازوں کے {کتاب المناسک متی یصلی الفجر بجمع} او رقرآن بھی کہتا ہے ان الصلوۃ کانت علی المؤمنین کتابا موقوتا۔ ان حضرات سے التماس ہے کہ قرآن کی آیت اور عبد اللہ بن مسعود کی روایت کا ان کی نقل کردہ حدیث کے ساتھ جو تعارض ہے پہلے قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کو حل کریں۔

کے وقت میں نماز عشاء کے ساتھ پڑھ لیتے اور اگر سورج غروب ہونے کے بعد سفر شروع کرتے تو نماز مغرب اور عشاء کو اسی مغرب کے وقت پڑھ لیتے[1]۔[2]

---

[1] صحیح سنن ابی داؤد ،صلاۃ السفر ،باب الجمع بین الصلاتین ،حدیث:1220،وسندہ صحیح ،وجامع الترمذی ،الجمعة ،باب ماجاء فی الجمع بین الصلاتین،حدیث:553،554۔امام ابن حبان نے الموارد ،حدیث:549 میں اسے صحیح اور امام ترمذی نے حسن کہا ہے۔

[2] **تبصرہ الف:** اس روایت کی سند میں ایک راوی ابو الزبیر ہے اور عن سے روایت کر رہے ہیں ۔علی زئی صاحب {جزء قرات ص:204,جزء رفع یدین ص:76 } پر ان کو مدلس کہتا ہے اور تدلیس کی وجہ اس روایت کو ضعیف ٹھہراتا ہے۔

تبصرہ ب: حضرات غیر مقلد احباب کے اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اس مضمون (دو نمازوں کو جمع کرنے) کی جتنی روایات ہیں وہ سب ضعیف اور معلول ہیں۔ خصوصا ابوداؤد, ترمذی اور ابن حبان کی سندوں میں ایک راوی قتیبہ بن سعید ہے۔یہ گو ثقہ ہے مگر ان کی مذکورہ روایت عند المحدثین ضعیف, منکر بلکہ موضوع ہے۔اس کے بارے ائمہ کرام فرماتے ہیں:

1 : قال الامام ابوداؤد فی غیر سننه انه حدیث منکر ولیس في تقدیم الوقت حدیث قائم { الدرلمنیر لابن الملقن ج:4 / ص:562, 567 }

2 : قال الامام الترمذي عن معاذ حدیث غریب {ترمذي}

3 : قال الامام الحاکم وهو شاذ الاسناد والمتن .... فاذالحدیث موضوع {معرفت علوم الحدیث ص:119 }

4 : قال الامام ابن حزم هذا ساقط (یعني حدیث معاذ) {المحلي لابن حزم ج: 2 /ص:207 }

5 : قال الامام ابو بکر البیهقی انکروا هذا من روایة یزید { السنن الکبري للبیهیقي ج:3 /ص:232 }

6 : قال الامام السبکي عن االحاکم وهو شاذا لاسناد والمتن ... فاذا الحدیث موضوع وعن ابن یونس غلط {معجم الشیوخ السبکي ج:1 /ص:165 }

7 : قال الامام اذهبي عن الحاکم وهو شاذ الاسناد والمتن.... فاذ اهو موضوع وعن ابن یونس انه غلط قلت :(الذهبي) فیکون قد غلط في الاسناد واتي بلفظ منکر جدا ..... وکان یقبل التلقین ویروي مالم یسمع ....الغفلة وقعت فیه من قتیبة .... الخطاء في حدیث واحد ..... قلت : (الذهبي) حدیث قتیبة منکر تفردبه .{ سیر اعلام النبلاء ج:11 / ص:.21 تا 23 , تنقیح التحقیق لذهبي ج: 1 /ص: 274 } وغیرهم من الحفاظ الحدیث .

اس حدیث میں دوسرا راوی ہشام بن سعد ہے اس کو بعض نے ثقہ کہا ہے مگر اکثر ائمہ نے ان کو ضعیف کہا ہے مثلا ان کے بارے ائمہ کرام فرماتے ہیں: قال احمد :لم یکن با الحافظ لیس هو محکم الحدیث وکان یحی بن سعید لایروی عنه وقال حرب :لم یرضه احمد وقال ابن معین: ضعیف لیس بذاک ولیس بشئ وقال النسائي : ضعیف لیس بالقوي وقال ابو حاتم یکتب

سیدنا معاذ بن جبلؓ والی حدیث کی تائید سیدنا ابن عباسؓ کی حدیث سے ہوتی ہے جسے بیہقی نے روایت کیا اور اسے صحیح کہا ہے۔مزید اس بارے میں سیدنا ابن عمرؓ اور سیدنا انسؓ سے بھی روایات مروی ہیں[1]۔

﴿اہل سنت عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں:﴾

جمع بین صلاتین منع ہے:

حالت اقامت میں دو نمازوں کو اکھٹا پڑھنے کی ممانعت:

علامہ نیمویؒ نے لیث کی اس حدث کی علاوہ اس موضوع (حالت اقامت میں دو نمازوں کو اکھٹا پڑھنے کی ممانعت) سے متعلق تین صحیح الاسناد احادیث ذکر کی ہیں۔ (آثارالسنن،ص: 438) اور لیث میں باقرار غیر مقلدین اس قدر ضعف نہیں کہ اس کی یہ حدیث اپنے قوی مؤیدات کی وجہ سے بھی صحیح نہ بن سکے،چنانچہ مولانا ارشاد الحق اثری غیر مقلد بزرگ عالم دین نے لیث کے بارے میں امام سیوطیؒ

حديثه لا يحتج به قال ضعيف حديثه مختلط ابن سعد كان كثير الحديث يستضعف وكان متشيعا قال علي ابن المديني : ليس بالقوي وقال ابن عبد البر صعيف ممن يكتب حديثه وقال الخليلي : انكر الحفاظ حديثه وزكره العنسوي في الضعفاء ..... وذكره النسائي في الضعفاء وذكر ه ابن حبان في الضعفاء وذكره ابن عدي في الضعفاء وذكره الدارقطني في الضعفاء وذكر ه الزيلعي في الضعفاء وذكره العقيلي في الضعفاء وذكر ه ابو ذرعة في الضعفاء وذكره ابن جوزي في الضعفاء {تهذيب لابن حجر ج:6 /ص:29 ,30 الضعفاء والمتروكين لنسائي ج:1 /ص: 104 , المجروحين لابن حجر ج:3 /ص:89 , الكامل لابن عدي ج:8 /ص:409 , الضعفاء الكبير للعقيلي ج:4 /ص:341 , الضعفاء لابن زرعة ج:2 /ص: 391 ,الضعفاء والمتروكين لابن جوزي ج: 3 /ص:174 } . لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے۔

اس حدیث میں تیسرا راوی ابو زبیر المکی ہے یہ بتصریح زبیر علی زئی اور ان کے استاد بدیع الدین (غیر مقلد) کے مدلس ہے {الفتح المبین ص: 61 , وجزء منظوم لبدیع الدین ص:90} ۔ جبکہ خود علی زئی صاحب ہی کا فرمان ہے کہ عام طالب علموں کو بھی معلوم ہے کہ غیر صحیحین میں مدلس کی عن والی روایت ضعیف ہوتی ہے {الحدیث شمارہ: 32 /ص: 15} لہٰذا یہ روایت بالیقین ضعیف ہے۔ فتدبر۔

[1] صحیح البخاری ، التقصیر ،باب تصلی المغرب ثلاثا فی السفر ،حدیث:1091،1111،1112،وصحیح مسلم ،صلاۃ المسافرین ، باب جواز الجمع بین الصلاتین فی السفر ،حدیث:703،704

سے نقل کیا ہے کہ: اس سے مسلم اور سنن الاربعہ میں روایت ہے، اس میں سوء حفظ کی بناء پر کچھ ضعف ہے۔(اللآلی، ج:1/ ص: 20) بلکہ بعض (محدثین) نے اس سے احتجاج کیا ہے، (توضیح الکلام، ص: 445)

اسی طرح شیخ البانیؒ بھی لیث بن ابی سلیمؒ کو صدوق قرار دیا ہے، اور بحوالہ ذہبی لکھا ہے:

فیہ ضعف یسیر من سوء حفظہ .... وبعضھم احتج بہ [1].

اس میں سوء حفظ کی وجہ سے معمولی کمزوری ہے، اور بعض محدثین نے اس کو قابل حجت قرار دیا ہے۔

مرحوم زبیر علی زئی کے انتہائی ممدوح مولانا محمد گوندلویؒ فرماتے ہیں کہ لیث کو بعض نے ضعیف کہا ہے تو بعض نے ثقہ بھی کہا ہے، حافظ ابن حجر نے "تقریب" میں صدوق کہا ہے۔ (خیر الکلام، ص: 241)

خود مرحوم زبیر علی زئی صاحب نے بھی اس کی متعدد احادیث کو متابعت کی وجہ سے حسن قرار دیا ہے [2]۔

سفر میں سنتیں معاف ہیں:

اگر تھکاوٹ ہو یا کوئی مجبوری ہو تو سفر میں سنت معاف ہے، چنانچہ امام بخاری کے استاد ابو بکر بن ابی شیبہ نے "المصنف" میں باب باندھا ہے کہ "باب ترک السنن فی السفر" اور اگر سہولت کی حالت ہو تو سفر میں سنت پڑھنا افضل اور سنت ہے حضور ﷺ نے پڑھا ہے۔

حفص بن عاصمؒ سے روایت ہے کہ سیدنا عبد اللہ بن عمرؓ نے ان سے کہا: اے میرے بھتیجے! میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ سفر میں رہا مگر آپ نے دو رکعتوں سے زیادہ نماز نہ پڑھی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح قبض فرمالی۔ اور میں سیدنا ابو بکرؓ کے ہمراہ سفر میں رہا، پھر سیدنا عمرؓ کے ہمراہ سفر میں رہا اور پھر سیدنا عثمانؓ کے ہمراہ سفر میں رہا۔ ان سب نے سفر میں دو رکعتوں سے زیادہ نماز

---

[1] سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ 3368

[2] دیکھئے: حاشیہ جزء رفع الیدین، ص: 48، ص: 78، ص: 79، ص: 64

نہیں پڑھی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روح قبض فرمالی۔ اور اللہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ یقیناً رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں تمہارے لئے بہتر نمونہ ہے[1]۔

معلوم ہوا کہ سفر میں سنتیں، نفل سب معاف ہے۔ سیدنا ابن عمرؓ میدان منیٰ میں دو رکعتیں نماز قصر پڑھ کر اپنے بستر پر چلے جاتے تھے۔ حفصؒ کہتے ہیں: میں نے کہا: چچا جان!! اگر اس کے بعد آپ رکعتیں سنت پڑھ لیا کریں تو کیا حرج ہے؟ فرمایا: اگر مجھے یہ کرنا ہوتا تو فرض نماز ہی پوری پڑھ لیتا[2]۔

رسول اللہ ﷺ مزدلفہ تشریف لے گئے تو ایک اذان اور دو اقامتوں سے نماز مغرب اور عشاء جمع کیں اور درمیان میں سنتیں نہیں پڑھیں[3]۔

حضر میں دو نمازوں کا جمع کرنا:

سیدنا ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینے میں ظہر اور عصر کو جمع کر کے پڑھا، حالانکہ وہاں دشمن کا خوف تھا نہ سفر کی حالت تھی۔ راوی ابو زبیر کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن جبیرؒ سے پوچھا: آپ ﷺ نے ایسا کیوں کیا تھا؟ سعید نے جواب دیا: جس طرح تم نے مجھ سے دریافت کیا ہے، اسی طرح میں نے سیدنا ابن عباسؓ سے پوچھا تھا تو انہوں نے یہ جواب دیا تھا کہ آپ ﷺ اپنی امت کو دشواری میں نہیں رکھنا چاہتے تھے[4]۔

سیدنا ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دشمن کے خوف اور سفر کے بغیر ظہر اور عصر کو اور مغرب اور عشاء کو ملا کر پڑھا۔

---

[1] صحیح البخاری ،التقصیر ،باب من لم یرالتطوع فی السفر دبر الصلاۃ ،حدیث:1101، 1102،وصحیح مسلم ،صلاۃ المسافرین ،باب صلاۃ المسافرین وقصرھا،حدیث:689

[2] صحیح مسلم،صلاۃ المسافرین ،باب صلاۃ المسافرین ،وقصر الصلاۃ بمنی ،حدیث:(18)۔694

[3] صحیح مسلم،الحج ، باب حجۃ النبی ﷺ ،حدیث:1218۔

[4] صحیح مسلم،صلاۃ المسافرین ،باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر ،حدیث:(50)۔705

عبداللہ بن شقیقؒ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ سیدنا ابن عباسؓ نے بصرہ میں عصر کے بعد ہمیں خطبہ دینا شروع کیا یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا اور ستارے چمکنے لگے ۔ کسی نے کہا کہ نماز مغرب کا وقت ہو چکا ہے۔آپ نے فرمایا: مجھے سنت نہ سکھاؤ، میں نے رسول اللہ ﷺ کو ظہر و عصر اور مغرب و عشاء ملا کر پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ عبداللہ بن شقیقؒ کہتے ہیں کہ مجھے شبہ پیدا ہوا، میں نے سیدنا ابوہریرہؓ سے دریافت کیا تو انہوں نے ان کی تصدیق کی[1] ۔

جمع بین الصلوتین میں حضور صلی اللہ علیہ و سلم نے مغرب اور عشا کی نمازیں مغرب کے وقت میں پڑھ لیں اس پر تحقیقی بحث[2]:

1-حدیث معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ: اس کو مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے کئی طرق سے ذکر کیا ہے۔ یہ پہلا طریق "مالک عن ابی الزبیر" ہے۔اس میں صرف جمع تاخیر مذکور ہے۔اس کے بعد مستقلا یہی حدیث " سعد بن ہشام " کے طریق سے آرہی ہے۔ اس میں جمع تقدیم مذکور ہے۔ جواب یہ ہے کہ سعد راوی ضعیف اور متکلم فیہ ہے اسی طرح چند احادیث کے بعد یہی حدیث معاذ ایک اور طریق سے آرہی ہے "یزید بن ابی حبیب عن ابی الطفیل" اس میں بھی جمع تقدیم موجود ہے۔ لیکن اس روایت پر محدثین نے تنقید کی ہے۔ خود مصنف نے بھی" قال ابی داؤد: لم یروه ذا الحدیث الا قتيبة وحده" ان کے علاوہ کسی اور نے لیث سے اس میں جمع تقدیم کو ذکر نہیں کیا۔ یہی بات امام

---

[1] صحيح مسلم،صلاة المسافرين ،باب الحمع بين الصلاتين فى الحضر ،حديث:(57)۔705

[2] من جمع بين الصلاتين من غير عذر فقد أتى بابا من أبواب الكبائر . قلت: الحديث اخرجه الحاكم فى المستدرك عن حنش عن عكرمة عن ابن عباس ثم قال: حنش بن قيس الرحبي يقال له: أبو علي من أهل اليمن سكن الكوفة ثقة. و فى التهذيب بعد ذكر الكلام الطويل فيه : و زعم ابو محصن انه شيخ صدوق. و قال ابو بكر البزار: ليس الحديث (تهذيب ج 2 ص 36) على ان لما رواه شاهدا صحيحا موقوفا فقد صح عن عمر بن الخطاب رضى الله عنه انه كتب الى ابى موسى رضى الله عنه : "وَاعْلَمْ أَنَّ جَمْعًا بَيْنَ الصَّلَاتَيْنِ مِنْ غَيْرِ عُذْرٍ مِنَ الْكَبَائِرِ " رقم 2035 اخرجه عَبْدُ الرَّزَّاقِ، عَنْ مَعْمَرٍ، عَنْ قَتَادَةَ، عَنْ أَبِي الْعَالِيَةِ الرِّيَاحِيِّ . كذا فى اللآلى (ج 2 ص 13) و رجاله رجال الصحيح. و هو موقوف فى حكم المرفوع. (اعلاء السنن ج 2 ص 97, 98)

ترمذی نے بھی فرمائی ہے۔ قال الترمذی : حسن غریب تفرد به قتیبة والمعروف عند اهل العلم حدیث معاذ من طریق ابی الزبیر عن ابی الطفیل عن معاذ

بلکہ اس حدیث معاذ کو جس میں جمع تقدیم موجود ہے موضوع قرار دیا ہے۔

2-یہ اسماعیل بن عبد الرحمٰن راوی کا مقولہ ہے۔

حضرت اقدس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر میں یہ ہے کہ اگر کسی روایت میں صراحتا یہ بھی آجائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب اور عشاء کو غروب شفق کے بعد جمع کیا (جیسا کہ یہاں اس روایت میں ہے) یا یہ تصریح آجائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر اور عصر کو عصر کے وقت میں جمع فرمایا تب بھی اس سے جمع حقیقی ہونا لازم نہ آئے گا۔ ہاں اگر یہ آئے کہ ظہر اور عصر کو آپ نے عصر کے وقت میں ادا فرمایا (بجائے لفظ جمع کے لفظ ادا) تو بیشک اس کا مطلب جمع حقیقی ہوگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جمع بین الفعلین کا تحقق فعل ثانی کی ابتدا سے ہوگا نہ کہ فعل اول کی ابتدا سے۔ لہٰذا اگر ظہر کو اس کے آخر وقت میں پڑھ کر عصر کو عصر کے اول وقت میں شروع کیا جائے گا تو دیکھیے، جمع کا تحقق تو عصر ہی کے وقت میں ہوا حالانکہ ہر نماز اس کے وقت میں ادا کی گئی ہے۔ لہٰذا راوی کا یہ کہنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر اور عصر کو عصر کے وقت میں جمع فرمایا، درست ہے حنفیہ کے خلاف نہیں۔ سبحان اللہ! محدث گنگوہی نے کیسی عمدہ بات بیان فرمائی[1]۔

" تشنيف السمع بابطال ادلة الجمع "

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالی عنہما کی حدیث ہے" من جمع بين الصلاتين من غير عذر فقد أتى بابا من أبواب الكبائر[2]. " امام ترمذی فرماتے ہیں کہ حسین نے کہا کہ امام احمد نے اس حدیث کو ضعیف کہا اور آگے کہا کہ والعمل على هذا عند أهل العلم

---

[1] اللدرر المنضود جلد ثانی ص 345

[2] ترمذی ص 303

کہ اہل علم کا اس پر عمل ہے تو گویا اشارہ کیا کہ اہل علم کے عمل سے یہ حدیث قوی ہو گئی اور بہت سارے محدثین نے لکھا ہے کہ اہل علم اگر کسی حدیث پر عمل کریں تو وہ صحیح ہو جاتی ہے [1]

قرآن پاک کا ارشاد ہے: ان الصلوۃ کانت علی المؤمنین کتابا موقوتا.

یعنی نماز کو مؤمنین پر متعین اور محدود وقت کے ساتھ فرض کیا گیا ہے۔ موقوتا کی تفسیر میں صاحب تفسیر مظہری لکھتے ہیں: محدودا بالاقات لایجوز اخراجہا عنہا ما امکن. یعنی نماز کو اوقات کے ساتھ محدود کیا گیا ہے اور جہاں تک ممکن ہوگا ان کو ان کے اوقات سے نکالنا جائز نہ ہوگا۔ امام بخاری رحمہ اللہ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں: موقوتا وقتہ علیہم۔ یعنی اللہ نے نماز کو وقت ساتھ مسلمانوں پر فرض کیا ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے فرماتے ہیں اللہ کے رسول ﷺ نے دو نمازوں کے علاوہ کوئی اور نماز بلا وقت نہیں پڑھی۔ مزدلفہ میں آپ نے مغرب اور عشاء کو جمع کیا تھا اور صبح میں نماز فجر عام معتاد وقت سے پہلے پڑھی تھی۔

مزلفہ میں مسئلہ یہی کہ مغرب اور عشاء ایک ساتھ پڑھی جائیں، سفر میں بعض حضرات کے یہاں دو نمازوں کو جمع کرنا جائز ہے، مگر ہمیں کسی حدیث میں یہ نہیں ملتا کہ آپ ﷺ نے حضر اور حالت اور اقامت میں بھی دو نمازوں کو اس طرح جمع کیا ہو کہ ایک ہی وقت دو نمازوں کی ادائیگی کرلی ہو، یہ عمل کتاب وسنت کے صریح خلاف ہے، اگر کسی حدیث سے دو نمازوں کو جمع کرکے پڑھنے کا کسی کو پتہ چلتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دو نمازوں کو ایک وقت میں جمع کر دیا گیا ہے بلکہ نمازوں کو آگے پیچھے کرکے دونوں کو ان کے اوقات ہی میں پڑھنے کا ثبوت ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ دو نمازوں کو ایک وقت میں پڑھنا گناہ کبیرہ ہے، آپ نے اپنے عمال کو ایسا کرنے سے منع فرمایا تھا۔ (مؤطاامام محمد)

اگر دو نمازوں کو ایک وقت میں پڑھنا جائز ہوتا تو کم از کم حالت جنگ میں اس کا لحاظ ضرور کیا جاتا مگر یہ شریعت کا مسئلہ ہے کہ حالت جنگ میں بھی دو نمازوں کو ایک وقت یا کئی نمازوں کو ایک وقت

[1] تعقبات للسیوطی

میں پڑھنا منع ہے، صلوۃ خوف کا بیان خود قرآن میں ہے جس کی تفصیل عام نمازوں ہٹ کر پڑھنے کی ہے، مگر وقت میں تبدیلی کا یہاں بھی ذکر نہیں ہے۔

بہرحال شریعت میں نماز کا وقت مقرر ہے، نمازوں کو انہیں اقات میں ادا کیا جائے گا تو نماز ہو گی ورنہ نہیں۔

نماز جمعہ

جمعہ کے دن کی فضیلت

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بہترین دن جس پر سورج ہو کر چمکے، جمعے کا دن ہے۔ اسی دن آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے، اسی دن جنت میں داخل کیے گئے، اسی دن جنت سے نکالے گئے اور قیامت بھی جمعے کے دن قائم ہو گی[1]۔

جمعہ کی فرضیت:

یا یھا الذین امنوا اذا نودی الصلوۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ وذرو البیع

ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون

اے اہل ایمان! جب جمعے کے دن نماز جمعہ کے لئے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر خطبہ اور نماز کی طرف دوڑو اور اس وقت کاروبار چھوڑ دو۔ اگر تم سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہت بہتر ہے۔

سیدنا ابو الجعد ضمریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص سستی کی وجہ سے تین جمعے چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے[2]۔

---

[1] صحیح مسلم، الجمعۃ، باب فضل یوم الجمعۃ، حدیث: 854

[2] سنن ابی داؤد، الصلاۃ، باب التشدید فی ترک الجمعۃ، حدیث: 1052، وسندہ حسن، وجامع الترمذی، الجمعۃ، باب ما جاء فی ترک الجمعۃ، حدیث: ۵۰۰۔ امام ترمذی نے اسے حسن اور امام حاکم نے المستدرک: 280/1، ابن خزیمہ نے حدیث: 1857، 1858 میں ابن حبان نے الموارد، حدیث: 553، 554 میں اور امام ذہبی نے صحیح کہا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: لوگ جمعہ چھوڑنے سے باز آجائیں ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا، پھر وہ غافل ہو جائیں گے [1] ۔

سیدنا ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کے گھروں کو جو بلا عذر جمعے سے پیچھے رہتے ہیں، جلا دینے کا قصد کیا [2] ۔

معلوم ہوا کہ جمعہ چھوڑنا بہت بڑا گناہ ہے، اس پر شدید وعید ہے، لہٰذا ہر مسلمان پر جمعہ پڑھنا فرض ہے۔ اس میں ہرگز سستی نہیں کرنی چاہئے۔ جب خطیب منبر پر چڑھے اور اذان ہو جائے تو سارے کاروبار حرام ہو جاتے ہیں۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں : ﴾

جمعے کے متفرق مسائل:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کا اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان ہے، اس پر جمعہ فرض ہے۔ غلام، عورت، نابالغ بچہ اور مریض جمعے کی فرضیت سے مستثنیٰ ہیں۔ اگر چاہیں تو پڑھ لیں ورنہ ظہر کی نماز ادا کریں [3] ۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ دیہاتیوں پر بھی نماز جمعہ فرض ہے کیونکہ انہیں اس عام حکم سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا [4] ۔

---

[1] صحیح مسلم، الجمعة، باب التغليظ في ترك الجمعة، حديث: 865۔

[2] صحیح مسلم، المساجد، باب فضل صلاة الجماعة وبيان التشديد في التخلف عنها۔۔۔، حديث: 652۔

[3] صحیح سنن ابی داؤد، الصلاة، باب الجمعة للمملوك والمرأة، حديث: 1067، وسنده صحيح، امام نووی نے المجموع: 483/4 میں اسے صحیح کہا ہے۔

[4] **تبصرہ:** ہم ان حضرات سے عرض کرتے ہیں کہ تمہارے اس اصول کے مطابق مسافر پر بھی جمعہ فرض ہے۔ کیونکہ مسافر کو بھی اس عام حکم سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص جمعے کے دن خوب اچھی طرح نہا کر جلدی سے پیدل، مسجد جائے، سوار ہو کر نہ جائے، امام کے نزدیک بیٹھ کر دل جمعی سے خطبہ سنے اور کوئی لغو بات نہ کرے تو اسے ہر قدم پر ایک برس کے روزوں کا اور اس کی راتوں کے قیام کا ثواب ہوگا[1] ۔

سیدنا سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص جمعہ کے دن نہائے اور جس قدر پاکی حاصل ہو سکے کرے، مونچھیں کترائے، ناخن کٹائے، زیر ناف بال مونڈے اور بغلوں کے بال دور کرے پھر اپنا تیل یا اپنے گھر والی کی خوشبو سے خوشبو لگائے اور جمعے کے لئے مسجد جائے۔ وہاں دو آدمیوں کے درمیان تفریق نہ ڈالے بلکہ جہاں جگہ ملے اس پر اکتفا کرے پھر اپنی نماز پڑھے جتنی اس کی قسمت میں ہے، پھر دوران خطبہ میں خاموش رہے تو اس کے گزشتہ جمعے سے لے کر اس جمعے تک کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں[2] ۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: جو شخص غسل کر کے جمعے کے لئے آتا ہے اور خطبہ شروع ہونے تک جس قدر ہو سکے نوافل ادا کرے، پھر خطبہ جمعہ شروع سے آخر تک خاموشی کے ساتھ سنتا ہے تو اس کے گزشتہ جمعے سے لے کر اس جمعے تک اور مزید تین دن کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں[3] ۔

سیدنا عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: مسجد نبوی کے بعد جو سب سے پہلا جمعہ پڑھا گیا وہ بحرین کے گاؤں جواثی میں عبدالقیس کی مسجد میں تھا[4]۔[5]

---

[1] جامع الترمذی ،الجمعة ،باب ما جاء فی فضل الغسل یوم الجمعة ،حدیث: ۴۹۶،وسنن ابی داؤد الطهارة ،باب فی الغسل یوم الجمعة ،حدیث: ۳۴۵،وسنده صحیح ، امام ترمذی نے اسے حسن جبکہ ابن حبان نے حدیث: 559 میں ،امام حاکم نے: 281،282/ا میں اور حافظ ذہبی نے صحیح کہا ہے۔ صحیح البخاری ،الجمعة ،باب الدهن للجمعة،حدیث· 883۔

[2] بخاری باب الدہن للجمعة حدیث 910'883

[3] صحیح مسلم ، الجمعة ،باب فضل من استمع وانصت فی الخطبہ،حدیث: 857۔

[4] صحیح البخاری ،الجمعة ،باب الجمعة فی القرای والمدن ، حدیث: 896۔

[5] تبصرہ: قریہ جواثی شہر تھا گاؤں نہیں تھا قریہ کا لفظ قرآن حدیث میں متعدد مقامات پر شہر کے معنی میں ہی ہے۔ لہٰذا اس کا معنی گاؤں سے کرنا اور پھر اس سے گاؤں میں جمعہ کی وجوبیت کو ثابت کرنا درست نہیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ گاؤں میں بھی جمعہ پڑھنا ضروری ہے۔ اگر لوگ گاؤں میں جمعہ نہیں پڑھیں گے تو گناہ گار ہوں گے۔

سیدنا اسعد ابن زرارہؓ نے نقیع الخضمات کے علاقے میں بنو بیاضہ کی بستی ھزم النبیت جو مدینہ سے ایک میل کے فاصلے پر تھی میں جمعہ قائم کیا[1]۔

محدثین فقہائے چھوٹے دیہات میں جمعہ کے ادائیگی کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

چھوٹے دیہات میں جمعہ درست نہیں:

متعدد اہل لغت اور تاریخ سے منقول ہے کہ "جواثی" شہر تھا، علامہ عینی عمدۃ القاری میں لکھتے ہیں کہ اس میں چار ہزار سے زیادہ آدمی رہتے تھے کان یسکنہا فوق اربعۃ آلاف نفس۔ علامہ ابن کثیر نہایہ میں لکھتے ہیں "جواثی ہو اسم حصن بالبحرین (اور قلعے شہر میں ہوتے ہیں) علامہ جوہری کی صحاح، علامہ زمخشری کی بلدان اور سیوطی سے بھی ایسے ہی منقول ہے۔ ابو عبید بکری سے منقول ہے " انہامدینۃ بالبحرین (اعلاء السنن، ص: 14) قریہ سے شبہ نہ کیا جائے کیوں کہ قریہ کا اطلاق شہر پر بھی قرآن وحدیث اور لغت سے ثابت ہے " لولانزل ہذاالقرآن علی رجل من القریتین عظیم (الآیۃ)، جواثی میں جمعہ وفد عبد قیس آنے کے بعد پڑھاگیا اس پر مؤرخین کا اتفاق ہے کہ وفد عبد قیس فرضیت حج کے بعد آیا ہے، البتہ سن کی تعیین میں اختلاف ہے، واقدی نے سن 8 ہجری قبل فتح نقل کیا ہے اور ابن اسحاق نے 9 ہجری کہا ہے۔ (اعلاء السنن، ص: 14)

جواثی یہ بحرین کی فوجی چھاؤنی اور بڑا شہر تھا[2]۔ غیر مقلد احباب فرماتے ہیں کہ یہ چھوٹا گاؤں تھا یہ بات درست نہیں۔

---

[1] سنن ابی داؤد، الصلاۃ، باب الجمعۃ فی القرای، حدیث: 1029، وسندہ حسن، وسنن ابن ماجہ، حدیث: 1082، امام ابن خزیمہ، حدیث: 1724، حاکم: 281/1 اور حافظ ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے۔

[2] متعدد اہل لغت اور تاریخ سے منقول ہے کہ "جواثی" شہر تھا علامہ عینی عمدۃ القاری میں لکھتے ہیں کہ اس میں چار ہزار سے زیادہ آدمی رہتے تھے" کان یسکنہا فوق اربعۃ آلاف نفس" علامہ ابن اثیر نہایہ" میں لکھتے ہیں "جواثی ہو اسم حصن بالبحرین (ور قلعے شہر

میں ہوتے ہیں)، علامہ جوہری کی "صحاح" اور علامہ زمخشری کی "بلدان" اور سیوطی سے بھی ایسے ہی منقول ہے " انہا مدینۃ بالبحرین" . (اعلاء السنن، ص: 14)

دیہات میں جمعہ درست نہیں:

حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ جمعہ اور عیدین جائز نہیں مگر بڑے شہر میں۔

عدم جواز جمعہ فی القری کے بارے میں مجوزین کے شبہات اور ان کے جوابات ملاحظہ فرمائیں:

سوال: بعض اہل علم کہتے ہیں جمعہ کی فرضیت " فاسعوا الی ذکر اللہ (الآیۃ) سے ثابت ہو رہی ہے اور اس آیت کے حکم سے جب نماز جمعہ ہر جگہ فرض ہے تو اب چھوٹے گاؤں والے فقہاء کے قول سے اپنی بستی میں اگر جمعہ نہ پڑھیں گے تو گنہگار ہوں گے۔

جواب: آیت مذکورہ بالا جماع مخصوص منہ البعض ہے، کیونکہ جنگلات اور ایسی آبادیوں جن کے باشندے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے ہیں اتفاقا جمعہ جائز نہیں، تو آیت کریمہ میں عموم ممکن نہیں ہے، پس وجوب جمعہ مخصوص مقامات پر ہوگا، جس کی تعیین حنفیہ نے اپنے فعل سے نہیں بلکہ اہل بیت کے سردار " حدیث علیؓ " سے کی ہے جو کہ مرفوع حکمی ہے، پس آیت مذکورہ سے ہر مقام پر فرضیت جمعہ ثابت نہ ہوگی، لہٰذا احناف ترک جمعہ فی القری کی وجہ سے گنہگار نہیں، آیت کا خطاب صرف اہل مصر کو ہے۔

عرض یہ ہے کہ مبسوط و اشعۃ اللمعات دونوں معتبر کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جمعہ اول بعد از ہجرت مدینہ میں پڑھا اور اس سے پہلے کہیں جمعہ نہیں پڑھا، اور اہل سیر کی روایت اس کے خلاف ہے، اور بعض علما فرماتے ہیں کہ اول جمعہ قباء میں پڑھا، اب عرض یہ ہے کہ مذکورہ بالا روایات و عبارات سے کون سی مستند اور قابل وفائق ہے، اور آنحضرت ﷺ نے پہلے کہاں جمعہ پڑھا، قباء میں بنو سالم میں یا مدینہ میں جا کر پڑھا؟

جواب: آنحضرت ﷺ نے پہلا جمعہ بنو سالم میں ادا فرمایا ہے، بنو سالم مدینہ منورہ کا محلہ ہے (الگ چھوٹی بستی نہیں ہے) اس پر محدثین اور اہل سیر حضرات کا اتفاق ہے، جب بنو سالم مدینہ منورہ کا محلہ ہی ہے تو اشعۃ اللمعات، مبسوط اور اہل سیر کے عبارتوں میں کوئی اختلاف نہ رہا، اور آنحضرت ﷺ کا قباء میں جمعہ پڑھنا ثابت نہیں، (ومن ادعی فعلیہ البیان) اکابر محدثین کرام ہند نے بخاری شریف کی حدیث " فاقام فیہم اربع عشرۃ لیلۃ " سے بھی استدلال کیا ہے، کہ جمعہ کی فرضیت مکہ میں ہو چکی تھی اور بوقت ہجرت آنحضرت ﷺ نے قباء میں چودہ روز قیام کیا جس میں ایک جمعہ یقینا آیا ہوگا لیکن قباء میں جمعہ پڑھنا کسی روایت سے ثابت نہیں، بلکہ اس کے برخلاف اہل سیر کا اتفاق اس پر موجود ہے کہ پہلا جمعہ مدینہ منورہ (اس کے محلہ بن سالم) میں پڑھا گیا ہے، پس اس سے یہ ثابت ہو گیا قباء جیسی بستیوں میں جمعہ جائز نہیں، بلکہ اس کی صحت کے لئے شہر کا ہونا ضروری ہے، ورنہ قباء میں ترک جمعہ کی نوبت نہ آتی۔

روایت بالا موقوفا قطعاً صحیح ہے اور غیر مدرک بالرائے ہے، لہٰذا حکما مرفوع ہوئی، پس بلا شبہ قابل احتجاج ہوگی۔

وفی عمدۃ القاری (ج: 3/ص: 264) فإن قلت قال النووي حديث علي رضي الله عنه متفق على ضعفه وهو موقوف عليه بسند ضعيف منقطع قلت كانه لم يطلع الا على الاثر الذي فيه الحجاج بن ارطاة ولم يطلع على طريق جرير عن منصور فإنه

سند صحيح ولو اطلع لم يقل بما قاله وأما قوله متفق على ضعفه فزيادة من عنده ولا يدري من سلفه من ذلك .(بحواله اعلاء السنن)

علاوہ ازیں امام ابوزید دبوسی نے " اسرار " میں نقل کیا ہے کہ " ان محمد بن الحسن قال رواه مرفوعا معاذ وسراقة بن مالك رضي الله عنهما"

توامام محمد مجتہد ہے ان کا قول رفع حدیث کے بارے میں حجت بن سکتا ہے ، نیز امام خواہر زادہ نے مبسوط میں فرمایا کہ امام ابو یوسفؒ نے " امالی" میں حدیث ہذا کو مرفوعا مسندا بیان کیا ہے ، پس بہر تقدیر حدیث علیؓ قابل احتجاج ہے اور کسی کا اس کو ضعیف قرار دینا جہالت ہے۔

سوال: غیر مقلدین مذکورہ بالا حدیث کا ثانی جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث طبقہ ثالثہ سے ہے جو قرآن اور دیگر احادیث کے معارض نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ طبقہ اولی وثانیہ کی حدیثیں ہیں، شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے " عجالہ نافعہ " میں لکھا ہے کہ " وکتب آنہادر شہرت وقبول در طبقہ ثانیہ نرسیدہ"

یعنی طبقہ ثالثہ کے کتب مشہوری اور قبولیت میں طبقہ اولی وثانیہ کا مقابلہ نہیں کر سکتیں نیز یہ لکھا ہے کہ " اکثر آں احادیث معمول بہ نزد فقہانہ شدہ اند بلکہ اجماع بخلاف آں منعقد گشتہ "

یہ قول ہمارے دلائل قاطعہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اس کا جواب فرمائیے ؟

جواب: خوب سمجھئے کہ احتجاج کا مدار، صحت سند اور دیگر شرائط معتبرہ عند المحدثین پر ہے، خواہ کسی کتاب میں ہو، لہذا حدیث علیؓ کو صحت سند کے باوجود، صرف اس وجہ سے نا قابل اعتبار اور ساقط قرار دینا محض جہل اور ناانصافی ہے۔

حدیث علیؓ موقوفا بلاشبہ صحیح ہے اور قابل استناد ہے جیسا کہ محققین واہل فن نے اس کی تصریح کی ہے، چنانچہ علامہ عینیؒ کی تصحیح عمدۃ القاری سے ہو جواب نمبر تین میں نقل کر چکے ہیں کہ طریق جریر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ " فانہ سند صحیح) اور حافظ الدنیا علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے " درایہ " میں فرمایا ہے کہ " اسنادہ صحیح " یہ حدیث مذکورہ کی دوسری سند کے بارے میں ہے جس کی سند یہ ہے : رواه عبد الرزاق في مصنفه عن الثوري عن زبيد الايالي عن سعيد بن عبيدة عن ابي عبد الرحمن السلمي عن علي قال لاجمعة الخ،

لیجئے اس سند میں جریر اور طلحہ بھی نہیں جن کے بارے میں معترض کو تشویش ہے اور حافظ الدنیا اس کی تصحیح فرماتے ہیں، نیز علامہ ابن حزم نے بھی (محلی، ج: 5/ص: 53) میں حدیث ہذا کو صحیح تسلیم کیا۔

هذا نصه فقد صح عن علي ﷺ لاجمعة ولاتشريق الخ

پس محققین کا حدیث مذکورہ کو صحیح تسلیم کرنا ہمارے لیے حجت ہے، اب اگر معترض طلحہ کے تعیین کے بارے میں خلجان ہو رہا ہے تو محض تعصب کی بناء پر ہے، ان اعلام نے رواۃ کی معرفت اور پوری تحقیق وتفتیش کے بعد تصحیح فرمائی ہے۔

1۔ آنحضرت ﷺ نے قباء میں جمعہ ادا نہیں فرمایا حالانکہ آپ نے وہاں چودہ روز قیام فرمایا (کما مر عن صحیح البخاری) اور مدینہ منورہ میں تشریف لا کر جمعہ ادا فرمایا۔

2- باوجودیکہ مدینہ منورہ کے ارد گرد دور دور تک اسلام پھیل چکا تھا لیکن کسی جگہ مدینہ کے علاوہ جمعہ ادا نہیں کیا جاتا تھا، ایک مدت کے بعد " جواثی" میں جمعہ قائم کیا گیا۔

3- جب صحابہ نے ممالک کو فتح کیا تو صرف شہروں میں ہی جمعہ کی ادائیگی کا انتظام کیا گیا (کما صرح بہ غیر واحد)۔

اگر دیہات میں جمعہ فرض تھا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک خلیفہ راشد سیاسی مصالح کی بناء پر ایک فرض قطعی کی ادائیگی کو ممنوع قرار دے دے، حاشا وکلا یہ تو ایک فاسق وفاجر حاکم اور بادشاہ بھی نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور خیر القرون میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین کی اس کثرت کے باوجود اس امر شنیع کے وقوع کا امکان بھی ہے؟

سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں : " المصر الجامع مایعده الناس المصر عند ذکر الامصار المطلقة کبخارا وسمرقند، الخ (عمدة القاری، ج: 1/ص: 240)

تو ایسی بدیہی چیزوں کے بارے میں معترض مذکور کا یہ کہنا کہ اس کی تعیین اور اس کا فیصلہ نہ کرنے والا نہ عرب میں مل سکتا ہے نہ عجم میں محض بیہودہ اور لغو ہے۔

ابو حنیفہؒ سے شہر کی صرف ایک ہی تعریف منقول ہے : انه بلدة کبیرة فیها سکك واسواق ولها رساتیق وفیها والي یقدر علی انصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه او علم غیره یرجع الناس الیه فیما یقع من الحوادث وهذا هو الاصح الخ (نقله الشامي عن التحفة، ج: 1/ص: 748)

شہر اس کو کہتے ہیں کہ جس میں بہت زیادہ راستے اور بازار ہوں، مظلوم کو ظالم سے انصاف مل سکتا ہوں اور وہاں پر علمی سہولت موجود ہو۔

یہی ظاہر مذہب ہے۔

وبه اخذ ابو یوسف واختاره الکرخي والقدوري وعلیه اکثر الفقهاء الخ (هکذا في الطحاوي، ص: 279)

اور اس کو ابو یوسف نے لیا ہے اور امام کرخی اور امام قدوری نے اس کو لیا اور اس پر اکثر فقہا ہیں۔

صاحب ہدایہ وغیرہ نے اسی تعریف کو مختصرا نقل کیا ہے۔ باقی تعریفات مصر اقوال مشائخ ہیں، اگر تعریف مذکور کی طرف راجع نہ ہو سکیں تو بمقابلہ قول صاحب مذہب مرجوح قرار پائیں گی پس تعدد واختلاف مضر نہیں۔

حدیث "لاجمعة الخ" میں نفی تشریق سے مراد تکبیر تشریق کی نفی ہے نہ کہ قربانی یا نماز عید کی نفی، کیونکہ عید الاضحیٰ کی نفی بعد میں مصرح ہے (والاضحیٰ) پس اس حدیث سے نفی قربانی کا الزام درست نہیں۔

حدیث " ان اول ما نبدا من یومنا ہذا الخ" اور حدیث " من ذبح قبل الصلوة الخ" وغیرہ احادیث سے یہ استدلال کرنا جن پر نماز عید واجب ہے ان کے ذمہ قربانی بھی واجب ہے، بالکل بے محل اور غلط۔ احادیث کا مطلب تو یہ ہے کہ جن لوگوں پر عید وقربانی ہر دو واجب ہیں ان پر لازم ہے کہ پہلے نماز عید بعد میں قربانی کریں۔ اس ترتیب کے خلاف کرنے پر ان لوگوں کی قربانی ادا نہ ہو گی۔

جمعہ فی القریٰ:

وفد عبدالقیس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کب حاضر ہوا؟

بیہقی نے السنن الکبری میں حدیث نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد عبد القیس کو نماز، زکوۃ اور روزہ کے علاوہ بیت اللہ شریف کے حج کا بھی حکم دیا جس سے معلوم ہوا کہ یہ وفد حج کی فرضیت کے بعد آیا اور حج سن 6ھ میں فرض ہوا جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں حج کے باب میں لکھا ہے۔ تو گویا یہ وفد یقینا 6ھ کے بعد آیا۔ اب کس سال آیا اس میں اختلاف ہے۔ مؤرخ واقدی سن 8ھ بتاتے ہیں اور محمد ابن اسحاق سن 9ھ (ابن ہشام جلد 2 ص 366)

اب پہلا جمعہ تو مدینہ منورہ میں پڑھا جاتا تھا۔ اس کے بعد 8ھ یا 9ھ میں اسلام عرب کے کئی علاقوں میں پھیل چکا تھا وہ قرآن بھی پڑھتے تھے لیکن کسی گاؤں میں جمعہ نہیں پڑھتے تھے، نہ کسی نے آیت جمعہ سے گاؤں میں جمعہ پر استدلال کیا نہ حضور علیہ السلام نے ان کو جمعہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ آخر 8ھ یا 9ھ میں جواثی میں جمعہ پڑھا گیا۔ اگر جواثی گاؤں تھا تو اس کو دوسرے بہت سے دیہات پر کیا فضیلت تھی کہ وہاں تو جمعہ نہیں پڑھا گیا اور یہاں (جواثی) میں جمعہ پڑھا گیا۔

علامہ البانی غیر مقلد عالم دین نے سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ والموضوعہ میں امام احمد کا قول نقل کرکے اس حدیث کو رد کرتے ہوئے فرمایا: فالسند صحیح موقوفا وصححہ ابن حزم فی المحلی (ج: 5/ص: 53)

پس حضرت علیؓ کے اثر کی سند صحیح ہے اور ابن حزم نے محلیٰ میں اس کو صحیح کہا ہے، علامہ زیلعیؒ سے مولانا سلفی خود نقل کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ سے موقوفا یہ اثر ثابت ہے۔ (فتاوی سلفیہ، ص: 96، وفتاوی علمائے حدیث، ص: 43)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: اسنادہ صحیح۔ (الدرایہ، ص: 214)

علامہ ابن حزم فرماتے ہیں: فقد صح عن علیؓ (محلی، ج: 5/ ص: 53، محولہ حاشیہ نصب الرایہ، ج: 2/ص: 195)

علامہ نیمویؒ نے نعیم بن حماد کی (دیہات میں نماز عید کے جواز میں حضرت انسؓ سے مروی) جس روایت پر جرح کی ہے، اس کے ناقابل استدلال ہونے کی انہوں نے تین وجوہات بیان کی ہیں (1) عبد اللہ بن ابی بکر نا معلوم التوثیق ہونا (2) ہشیم کثیر التدلیس کا عن سے روایت کرنا (3) نعیم بن حماد کا متکلم فیہ ہونا۔

نیز اس روایت کی کسی معتبر متابعت کا نہ ہونا (التعلیق الحسن، ص: 489)

تحقیق سے پتہ چلا کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے قبل بھی تجارتی منڈی تھی جیسا کہ امرء القیس نے شعر میں ذکر کیا ہے[1]۔ صحابہ خلافت صدیق میں جواثی کے قلعہ میں محصور ہوئے[2]۔

قال ابو عبید البکری فی معجمہ ھی مدینة بالبحرین لعبد القیس[3]

بحوالہ معجم البلدان روایت ہے کہ جواثی شہر ہے۔ جوہری، زمخشری اور ابن اثیر نے کہا کہ جواثی قلعہ ہے[4]۔ معلوم ہوا کہ وہ شہر تھا۔

اب دور نبوی میں مسجد نبوی کے بعد کسی گاؤں میں جمعہ نہ پڑھا جانا اور جواثی میں پڑھا جانا واضح دلیل ہے کہ جمعہ صرف شہر میں ادا ہوتا تھا اور پورے دور نبوت میں کسی ایک شخص نے بھی آیت جمعہ یا کسی مرفوع حدیث سے گاؤں میں جمعہ پڑھنے پر نہ استدلال کیا اور نہ گاؤں میں جمعہ پڑھا۔ رہا فتاوی علماء حدیث کی یہ بات کہ حدیث میں آیا ہے کہ جواثی گاؤں تھا تو یہ بالکل درست نہیں۔ نہ تو حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ جواثی گاؤں ہے نہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نہ کسی تابعی اور تبع تابعی نے کہا کہ جواثی گاؤں ہے۔ یہ قول عثمان بن ابی شیبہ کا ہے جو خود ضعیف راوی ہے۔ (دیکھو میزان الاعتدال) پھر اس نے بھی قریہ کا لفظ بولا ہے جو شہر پر بھی بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں مکہ مکرمہ، طائف، مدینہ منورہ، مصر وغیرہ جیسے شہروں کو قریہ کہا گیا ہے۔ لہٰذا قریہ کے معنی جہاں بستی و آبادی کے ہیں وہاں اس کا اطلاق شہر پر بھی ہوتا ہے۔ (مفتاح اللغات ص 658) اس حدیث شریف سے تو بات صاف ہو گئی کہ پورے دور نبوت میں کسی گاؤں میں نماز جمعہ ادا نہیں ہوئی و ھو المطلوب نیز قریہ کے اطلاق سے جواثی کا گاؤں و بستی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

---

[1] آثار السنن جلد 2 ص 251 مکتبہ رحمانیہ
[2] آثار السنن جلد 2 ص 80
[3] آثار السنن ص 250
[4] حاشیہ بخاری جلد 1 ص 122 نمبر 8، فتاوی علماء اہل حدیث جلد 4 ص 139

جمعے کے دن بارش ہو رہی ہو تو نماز جمعہ کے متعلق بھی صلوفی بیوتکم گھروں میں نماز پڑھو۔ کہنااور نماز گروں میں پڑھنادرست ہے۔

سیدنا عبد اللہ بن زبیرؓ کے زمانے میں جمعے کے دن عید ہوئی تو انہوں نے کافی دیر سے نماز عید پڑھائی، جمعہ نہ پڑھایا۔اس واقعہ کی خبر سیدنا ابن عباسؓ کو ملی تو انہوں نے فرمایا: ان کا یہ عمل سنت کے مطابق ہے[1]۔

نبی اکرم ﷺ نے دوران خطبہ میں گوٹ مار کر بیٹھنے سے منع فرمایا[2]۔

گوٹ مارنا اس طرح بیٹھنے کو کہتے ہیں کہ ہاتھ یا کپڑے کیساتھ رانوں کو پیٹ سے ملا کر بیٹھیں ۔اس طرح بیٹھنے سے عموما نیند آجاتی ہے، پھر آدمی خطبہ نہیں سن سکتا، علاوہ ازیں اس حالت میں آدمی اکثر گر پڑتا ہے، نیز تہبند پہنے کی صورت میں شرمگاہ کے بے حجاب ہونے کا امکان ہوتا ہے۔

سیدنا جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو کر خطبہ دیتے اور دو خطبوں کے درمیان بیٹھتے۔جو شخص یہ کہے کہ آپ بیٹھ کر خطبہ دیتے تھے، اس نے غلط بیانی کی[3]۔

سیدنا کعب بن عجرہؓ سے روایت ہے کہ وہ مسجد میں داخل ہوئے اور عبد الرحمٰن بن ام الحکم بیٹھے ہوئے خطبہ دے رہا تھا۔سیدنا کعبؓ نے کہا: اس خبیث کی طرف دیکھو، بیٹھے ہوئے خطبہ دیتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: واذا راو تجارۃ او لھوا انفضوا الیھا وترکوک قائما

اور جب یہ لوگ کوئی سودا بکتا دیکھتے ہیں یا کوئی تماشا دیکھتے ہیں تو اس کی طرف بھاگ اٹھتے ہیں اور آپ کو خطبے میں کھڑا ہی چھوڑ دیتے ہیں[1]۔

---

[1] صحیح سنن النسائی ،صلاۃ العیدین ،باب الرخصۃ فی التخلف عن الجمعۃ لمن شھد العید ،حدیث:1593، و سندہ صحیح،امام ابن خزیمہ نے حدیث:1465 میں اسے صحیح کہا ہے۔

[2] جامع الترمذی ،الجمعۃ ،باب ما جاء فی کراھیۃ الاحتباء والامام یخطب ،حدیث:514۔امام ترمذی نے اسے حسن کہا ہے،و سندہ حسن۔

[3] صحیح مسلم ،الجمعۃ ،باب ذکر الخطبتین قبل الصلاۃ وما فیھما من الجلسۃ،حدیث:862۔

معلوم ہوا کہ بیٹھ کر خطبہ دینا خلاف سنت ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے جمعے کا خطبہ دیا۔ آپ کے سر پر سیاہ رنگ کی پگڑی تھی۔ اس کے دونوں سرے آپ نے کندھوں کے درمیان چھوڑے ہوئے تھے [2]۔

رسول اللہ ﷺ نے جمعے کے دن مسجد میں نماز جمعہ سے پہلے حلقہ بنانے سے منع فرمایا [3]۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ شدید سردی میں جمعے کی نماز جلدی پڑھتے تھے اور شدید گرمی میں دیر سے پڑھتے تھے [4]۔

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ خطبہ دے رہے ہوتے تو آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں، آواز بلند ہوتی اور غصہ ہو جاتا (جوش میں آجاتے تھے) گویا کہ آپ ہمیں کسی ایسے لشکر سے ڈرا رہیں جو صبح یا شام ہم پر حملہ کرنے والا ہو اور فرماتے۔ میں اور قیامت اس طرح ساتھ ساتھ بھیجے گئے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے آپ اپنی شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی ملاتے [5]۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: امام کے ساتھ جتنی نماز پالو، وہ پڑھو اور جو رہ جائے اسے پورا کرو [6]۔

لیکن جمعے کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اگر جمعے کی نماز میں سے ایک رکعت امام کے ساتھ ملے تو اس کے ساتھ ایک رکعت اور ملا کر نماز جمعہ پوری کر لے اور اگر دوسری رکعت بھی نہ پا سکا تو پھر چار رکعت پڑھے گا، اس کی دلیل سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا؛

---

[1] صحیح مسلم، الجمعة، باب فی قولہ تعالیٰ: واذا رأوا تجارة او لھوا انفضوا الیھا وترکوک قائما۔ حدیث: 864

[2] صحیح مسلم، الحج، باب جواز دخول مکة بغیر احرام، حدیث: 1359۔

[3] سنن ابی داؤد الصلاة، باب التحلق یوم الجمعة قبل الصلاة، حدیث: 1079، وسندہ حسن، وجامع الترمذی، الصلاة، باب ما جاء فی کراھیة البیع والشراء وانشاد الضالة والشعر فی المسجد، حدیث: 322۔ امام ترمذی نے اسے حسن جبکہ امام ابن خزیمہ نے حدیث: ۱۸۱۶ میں اسے صحیح کہا ہے۔ مسند احمد: 179/2، واطراف المسند: 32/4، حدیث: 517۔

[4] ابن خزیمہ حدیث 1816

[5] صحیح البخاری، الجمعة، باب اذا اشتد الحر یوم الجمعة، حدیث: 906۔

[6] صحیح مسلم، الجمعة، باب تخفیف الصلاة والخطبة، حدیث: 867۔

من ادرک من الجمعة رکعة فلیصل الیها اخری

جو شخص جمعے کی ایک رکعت پائے تو وہ اس کے ساتھ دوسری رکعت ملا لے ۔

اور سیدنا ابن عمرؓ فرماتے:

من ادرک رکعة من الجمعة فقد ادرکها الا انه یقضی ما فاته

جس نے جمعہ کی ایک رکعت پالی تو اس نے جمعہ پالیا لیکن فوت شدہ رکعت کی قضا دے گا ۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ ایک رکعت بھی نہ پانے والا دو رکعتیں نہیں پڑھے گا بلکہ چار رکعت ظہر کی پڑے گا ۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

دوران خطبہ میں دو رکعتیں پڑھ کر بیٹھنا:

رسول اللہ ﷺ جمعے کا خطبہ دے رہے تھے کہ ایک شخص سیدنا سلیک غطفانیؓ مسجد میں آئے اور دو رکعتیں پڑھے بغیر بیٹھ گئے ۔ نبی اکرم ﷺ نے پوچھا: کیا تم نے دو رکعتیں پڑھی ہیں؟ انہوں نے عرض کیا نہیں، اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ نے حکم دیا: کھڑے ہو جاؤ اور دو رکعتیں پڑھ کر بیٹھو[1] ۔

پھر آپ نے ساری امت کے لئے حکم دے دیا: جب تم میں سے کوئی ایسے وقت مسجد میں آئے کہ امام جمعے کا خطبہ دے رہا ہو تو اسے دو مختصر سی رکعتیں پڑھ لینی چاہئیں[2] ۔[3]

---

[1] صحیح البخاری ،الجمعة ،باب اذا رأی الامام رجلا جاء وھو یخطب ۔۔۔،حدیث:930، 931،وصحیح مسلم ،الجمعة ،باب التحیة والامام یخطب ،حدیث:875۔ 2۔

[2] صحیح مسلم ،الجمعة ،باب التحیة والامام یخطب ،حدیث:(59)۔875۔

[3] **تبصرہ:** نماز نبوی جدید صفحہ 312 پر آپ حضرات نے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ۔۔۔۔ پھر خطبہ جمعہ شروع سے آخر تک خاموشی کے ساتھ سنتا ہے ۔۔۔۔ نیز صفحہ 319 پر حدیث ۔۔۔۔ جمعے کے خطبے میں جب تو پاس بیٹھنے والے کو از راہ نصیحت کہے کہ چپ رہو تو بلا شبہ تو بھی لغو کام کیا ۔ ان دونوں احادیث کے ساتھ تعارض ہے ۔ برائے کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں اس تعارض کو حل فرمائیں۔

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

خطبہ کے دوران دو رکعتیں پڑھنا:

بخاری شریف جمعہ کے اندر باب ہے باب ما جاء في التطوع مثنی مثنی اور مسلم شریف میں ہے باب التحية و الامام يخطب کا جواب اور اذا خرج الامام فلا صلوة ولا كلام كى صحت

1۔ واقعہ سلیک رضی اللہ عنہ میں یہ احتمال ہے کہ یہ ان کے ساتھ خاص ہو کسی مصلحت کی وجہ سے جو شارع علیہ السلام دیکھ رہے تھے۔ اور وہ مصلحت کیا ہے تو اس کی طرف حدیث ابی سعید میں اشارہ موجود ہے۔ جو کہ "اصحاب السنن" نے روایت کی ہے۔" ایک آدمی جو کہ خستہ حال تھا مسجد آیا اس حال میں کہ نبی علیہ السلام خطبہ دے رہے تھے۔ تو نبی علیہ السلام نے اس سے پوچھا کیا آپ نے نماز پڑھی ہے؟ تو اس نے کہا نہیں تو آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا دو رکعت نماز پڑھ اور لوگوں کو اس پر صدقہ کرنے کے لیے برانگیختہ کیا۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نماز پڑھنے کا حکم اس لیے دیا تاکہ لوگ اسے دیکھیں اور اس پر صدقہ کریں اور اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو امام احمد نے روایت کی ہے۔

<u>روایت:</u> نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: کہ یہ آدمی مسجد میں داخل ہوا اس حال میں کہ خستہ حال تھا۔ تو میں نے حکم دیا کہ دو رکعت پڑھ اور مجھے امید تھی کہ شاید کوئی اس کی حالت دیکھ کر سمجھ جائے اور اس پر صدقہ کرے۔

2۔ واقعہ سلیک رضی اللہ عنہ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ واقعہ خطبے سے پہلے کا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ جمعہ کے خطبے کے لیے منبر پر تشریف فرما تھے لیکن ابھی خطبہ شروع نہیں فرمایا تھا کہ اتنے میں ایک صاحب جن کا نام سلیک بن ہدبہ الغطفانی تھا انتہائی بوسیدہ کپڑے پہنے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے فقر و فاقہ کی کیفیت دیکھ کر یہ مناسب سمجھا کہ تمام صحابہ ان کی حالت اچھی طرح دیکھ لیں اس لیے ان کو کھڑا کر کے نماز کا حکم دیا اور جتنی دیر وہ نماز پڑھتے رہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے { چنانچہ حضرت جابر

رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ الفاظ مروی ہیں فقال له النبي صلى الله عليه وسلم: صليت؟ قال: لا، قال: قم فاركع[1].

چنانچہ حضرت محمد بن قیس فرماتے ہیں: أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَيْثُ أَمَرَهُ أَنْ يُصَلِّيَ رَكْعَتَيْنِ، أَمْسَكَ عَنِ الْخُطْبَةِ حَتَّى فَرَغَ مِنْ رَكْعَتَيْهِ، ثُمَّ عَادَ إِلَى خُطْبَتِهِ[2] "

اور خطبہ شروع نہیں فرمایا۔ بعد میں آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ان پر صدقہ کرنے کی ترغیب دی۔ { چنانچہ ایک روایت میں یہ الفاظ مروی ہیں " وحث (النَّبِي صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) الناس على الصدقة، فألقوا ثيابا الخ[3]

چنانچہ اس موقع پر صحابہ کرامؓ نے انھیں خوب صدقہ دیا۔ اس سے واضح ہوا کہ اول تو یہ ایک خصوصی واقعہ تھا جس کو عمومی قواعد کلیہ کے خلاف پیش نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے یہ کہ حضرت سلیک رضی اللہ تعالی عنہ کے آنے کے وقت آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے خطبہ شروع نہیں فرمایا تھا۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ مروی ہیں۔ " جاء سليك الغطفاني يوم الجمعة، ورسول الله صلى الله عليه وسلم قاعد على المنبر" اور یہ معلوم ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ و سلم ہمیشہ کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے۔(عن ابن عمر رضي الله عنهما، قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم يخطب قائما، ثم يقعد، ثم يقوم كما تفعلون الآن[4].

---

[1] سنن نسائی ج 1 ص 208 باب مخاطبة الامام رعیته و هو علی المنبر

[2] مصنف ابن ابی شیبہ (جلد 12 ص 110) باب فی الرجل یجیئ یوم الجمعة و الامام یخطب یصلی رکعتین علامہ زیلعی رحمۃ اللہ علیہ نصب الرایۃ (جلد 2 ص 204 باب صلوۃ الجمعہ) میں لکھتے ہیں " و قد بوب النسائی فی سننه الکبری علی حدیث سلیك بالصلوۃ قبل الخطبة

[3] سنن نسائی جلد 1 ص 208 باب حث الامام علی الصدقة یوم الجمعة فی خطبته

[4] صحیح بخاری ج 1 ص 125 باب الخطبة قائما

لہٰذا بیٹھنے کا مطلب یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے ابھی خطبہ شروع نہیں فرمایا تھا اور یہ بات کہ حضرت سلیک رضی اللہ تعالی عنہ بہت بوسیدہ حالت میں تھے، ترمذی میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالی عنہ کی روایت سے ثابت ہے جس میں وہ فرماتے ہیں : " أن رجلا جاء يوم الجمعة في هيئة بذة (ای هيئة تدل على الفقر[1])

اور یہ بات کہ آپ صلی اللہ علیہ و سلم ان کی نماز کے دوران خطبہ سے رکے رہے دار قطنی کی روایت سے ثابت ہے۔ (جلد 2 ص 15 رقم 9، باب في الركعتين اذا جاء الرجل و الامام يخطب روایت کے الفاظ ہم پیچھے ذکر کر چکے ہیں۔) پھر اس روایت سے تحیۃ المسجد پر استدلال بھی مشکل ہے، اول تو اس لیے کہ " قم فاركع[2]" کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیک رضی اللہ عنہ آکر بیٹھ چکے تھے پھر آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے ان کو کھڑا کیا بلکہ صحیح مسلم [3] کی ایک روایت میں اس کی تصریح ہے۔ " فقعد سليك قبل أن يصلي، فقال له النبي صلى الله عليه وسلم: أركعت ركعتين؟ قال: لا، قال: قم فاركعهما " اور ظاہر ہے کہ بیٹھنے کے بعد تحیۃ المسجد فوت ہو جاتی ہے۔ دوسرے ابن ماجہ کی روایت میں مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے ان سے پوچھا: " أصليت ركعتين قبل أن تجيء؟ " انھوں نے کہا " لا " اسی پر آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا " فصل ركعتين وتجوز فيهما " اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے انھیں تحیۃ المسجد کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ سنن قبلیہ کا حکم دیا تھا۔ بہر حال یہ ایک مخصوص واقعہ تھا جس سے یہ عمومی حکم مستنبط کرنا غلط ہے کہ خطبہ کے دوران تحیۃ المسجد پڑھنا مستحب ہے۔

---

[1] جلد:1/ ص:93، باب في الركعتين اذا جاء الرجل و الامام يخطب , نیز دیکھیے سنن نسائی (جلد 1 ص208) باب حث الامام على الصدقة يوم الجمعة في خطبته

[2] صحيح مسلم ج 1 ص 287 كتاب الجمعة

[3] ج:1/ص:287 كتاب الجمعة

ہماری مذکورہ بالا تشریح سے حضرت سلیک رضی اللہ عنہ کے واقعہ کا تو جواب ہو جاتا ہے۔ البتہ اس مسئلہ میں شافعیہ اور حنابلہ کی ایک قوی دلیل صحیحین میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی ایک قولی روایت ہے: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو يخطب: إذا جاء أحدكم والإمام يخطب أو قد خرج، فليصل ركعتين (اللفظ للبخاری)

یہ حدیث قولی ہے اور اس میں حضرت سلیک رضی اللہ عنہ کے واقعہ کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ اس میں عمومی حکم دیا گیا ہے۔ اس حدیث شریف کا صحیح جواب یہ ہے کہ یہ آیت قرآنی " وَإِذا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا" اور ان احادیث کے معارض ہے جو حنفیہ نے اپنے استدلال میں ذکر کی ہیں۔ اب اگر تطبیق کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ "والامام یخطب" سے مراد "یرید الامام ان یخطب" یا "کاد الامام ان یخطب" ہے اور اگر ترجیح کا طریقہ اختیار کیا جائے تو روایات نہی کئی وجوہ سے راجح ہیں۔

1۔ محرم اور مبیح میں تعارض کے وقت محرم کو ترجیح ہوتی ہے۔

2۔ روایات نہی مؤید بالقرآن ہیں۔

3۔ روایات نہی مؤید بالاصول الکلیہ ہیں۔

4۔ وہ مؤید بتعامل الصحابہ والتابعین ہیں[1]۔

5۔ ان پر عمل کرنے میں احتیاط زیادہ ہے کیونکہ تحیۃ المسجد کسی کے نزدیک بھی واجب نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے ترک سے کسی کے نزدیک بھی گناہ کا احتمال نہیں جبکہ نہی عن الصلوۃ والکلام کی احادیث

---

[1] درس ترمذی جلد 2 ص 249 تا 253، ملخص از فتح الملہم جلد 4 ص 343 و درس ترمذی جلد 2 ص 249 تا 253 (ج 1 ص 87 ۓ) نیز دوسری روایات اور آثار کے لیے دیکھیے، مصنف ابن ابی شیبہ جلد 2 ص 111 من كان يقول اذا خطب الامام فلا تصل

کو ترک کرنے سے گناہ کا اندیشہ ہے، اس بنا پر حنفیہؒ نے احتیاط اس میں سمجھی کہ نہی کے دلائل پر عمل کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے خطبہ کے وقت ترک صلوۃ کو اختیار کیا ہے [1]۔

غیر مقلد بزرگ فرماتے ہیں کہ جمعے سے پہلے نوافل کی تعداد مقرر نہیں بلکہ نبی اکرم ﷺ نے اجازت دی ہے کہ جتنے باآسانی پڑھ سکتے ہیں۔ پڑھ لیں [2]۔

مگر کم از کم تعداد یعنی تحیۃ المسجد والی رکعتیں ہیں۔

تبصرہ : جبکہ اہل سنت فرماتے ہیں کہ جمعہ سے پہلے چار رکعات ہیں اور فرض نماز کے بعد چھ رکعات۔

گردنیں پھلانگنے کی ممانعت:

سیدنا عبد اللہ بن بسرؓ سے روایت ہے کہ جمعے کے دن رسول اللہ ﷺ خطبہ دے رہے تھے کہ ایک شخص لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہوا آنے لگا تو آپ نے دیکھ کر فرمایا: بیٹھ جاؤ تم نے اس عمل سے لوگوں کو ایذا دی ہے [3] ۔

معلوم ہوا کہ نماز جمعہ کے لئے آنے والوں کو چاہئے کہ جہاں جگہ ملے، وہیں بیٹھ جائیں۔

جمعے کے لئے پہلے آنے والوں کا ثواب:

سیدنا ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فرشتے جمعے کے دن مسجد کے دروازے پر ثواب لکھنے کے لئے ٹھہرتے ہیں اور سب سے پہلے آنے والے کا نام لکھ لیتے ہیں، پھر اس کے بعد آنے والے کا اسی طرح نمبر وار لکھتے جاتے ہیں۔ جو شخص نماز جمعہ کے لئے اول وقت مسجد میں جاتا ہے، اسے

---

[1] درس ترمذی جلد 2 ص 249 تا 253، ملخص از فتح الملہم جلد 4 ص 343 و درس ترمذی جلد 2 ص 249 تا 253

[2] صحیح مسلم، الجمعة، باب فضل من استمع وانصت فی الخطبہ، حدیث: 875

[3] صحیح سنن ابی داؤد، الصلاۃ، باب تخطی رقاب الناس یوم الجمعة، حدیث: 1118، وسندہ صحیح، امام حاکم نے المستدرک: 288/1 میں، امام ابن خزیمہ نے حدیث: 1811 میں ابن حبان نے الموارد، حدیث: 572 میں اور حافظ ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے۔

اتنا ثواب ملتا ہے جتنا حرم کی طرف قربانی کیلئے اونٹ بھیجنے والے کو ثواب ملتا ہے، پھر جو بعد میں آتا ہے، اسے اتنا ثواب ملتا ہے جتنا کعبہ کی طرف قربانی کے لئے گائے بھیجنے والے کو ثواب ملتا ہے، اس کے بعد آنے والے کو دنبہ بھیجنے والے کے برابر، اس کے بعد آنے والے کو مرغی اور اس کے بعد آنے والے کو انڈا صدقہ کرنے والے کی مانند اجر ملتا ہے۔ پھر جب امام، خطبہ دینے لئے نکلتا ہے تو فرشتے دفتر لکھے ہوئے اوراق لپیٹ لیتے ہیں اور خطبہ سننے لگتے ہیں[1] ۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جمعے کے دن ایک گھڑی ایسی ہے کہ جو مسلمان اس گھڑی میں نماز کی حالت میں کھڑا اللہ تعالیٰ سے بھلائی کا سوال کرے تو اللہ تعالیٰ اسے وہ بھلائی ضرور عطا فرماتا ہے[2] ۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جمعے کے دن قبولیت کی گھڑی امام کے منبر پر بیٹھنے سے لے کر نماز کے خاتمے تک کے درمیان ہے[3] .

خطبہ جمعہ کے مسائل:

رسول اللہ ﷺ دو خطبے ارشاد فرماتے، ان کے درمیان بیٹھتے، خطبے میں قرآن مجید پڑھتے اور لوگوں کو نصیحت کرتے۔

آپ ﷺ کی نماز بھی اوسط انداز کی اور خطبہ اوسط انداز کا ہوتا تھا[4]

---

[1] صحیح البخاری، الجمعة، باب الاستماع الی الخطبہ یوم الجمعة، حدیث: 929، وصحیح مسلم، باب فضل التھجیر یوم الجمعة، حدیث: (24)۔850۔ اس حدیث میں بالترتیب پانچ چیزوں کا ذکر ہے: اونٹ، گائے، دنبہ، مرغی اور انڈا ۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ جمعے کے دن طلوع آفتاب سے لے کر خطبہ جمعہ کے آغاز تک کے وقت کو پانچ برابر حصوں میں تقسیم کر دیا جائے جو جو شخص پہلے حصے میں مسجد پہنچا، اسے اونٹ کی قربانی کا ثواب ملے گا۔۔۔۔۔ موطا امام مالک میں "الساعۃ الاولی" کے الفاظ سے اس توجیہ کی تائید ہوئی ہے۔ واللہ اعلم۔

[2] صحیح البخاری، الجمعة، باب الساعۃ التی فی یوم الجمعة، حدیث: 935، وصحیح مسلم، الجمعة، باب فی الساعۃ التی فی یوم الجمعة، حدیث: 852۔

[3] مسلم حوالہ سابق حدیث 753؟

[4] صحیح مسلم، الجمعة، باب تخفیف الصلاۃ والخطبۃ، حدیث: 822۔

آپ ﷺ نے فرمایا: آدمی کی لمبی نماز اور مختصر خطبہ دانائی کی علامت ہے، لہٰذا نماز طویل کرو اور خطبہ مختصر کرو۔[1]

نبی اکرم ﷺ خطبہ جمعہ میں سورۃ ق کی تلاوت فرماتے تھے[2] ۔

سیدنا ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جمعے کے خطبے میں جب تو اپنے پاس بیٹھنے والے کو ازراہ نصیحت کہے۔ چپ رہو۔ تو بلاشبہ تو نے بھی لغو کام کیا[3] ۔

اس سے ثابت ہوا کہ دوران خطبہ میں سامعین کو آپس میں کسی قسم کی بات کرنی جائز نہیں ہے۔بڑی خاموشی سے خطبہ سننا چاہئے البتہ خطیب اور سامع ضرورت کے وقت ایک دوسرے سے مخاطب ہو سکتے ہیں۔

سیدنا ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ آدمی اپنے بھائی کو اٹھا کر اس کی جگہ پر بیٹھے۔ نافعؒ سے پوچھا گیا: کیا صرف جمعہ میں منع ہے؟فرمانے لگے: جمعہ میں اور اس کے علاوہ بھی[4] ۔

سیدنا عمارہ بن رویبہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے بشر بن مروان کو جمعے کے دن منبر پر دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: اللہ تعالیٰ ان دونوں ہاتھوں کو ہلاک کرے۔

نبی اکرم ﷺ خطبہ میں صرف ایک ہاتھ کی شہادت والی انگلی سے اشارہ کرتے تھے[5]

نبی اکرم ﷺ نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور آپ کے ہاتھ میں عصا یا کمان تھی[1] ۔

---

[1] صحیح مسلم،الجمعۃ ،با ب تخفیف الصلاۃ والخطبۃ ،حدیث:969۔

[2] صحیح مسلم،الجمعۃ ،با ب تخفیف الصلاۃ والخطبۃ ،حدیث:872'873۔

[3] صحیح البخاری ،الجمعۃ ،با ب الانصات یوم الجمعۃ ،والامام ،یخطب ،حدیث:934،وصحیح مسلم،الجمعۃ ،با ب فی الانصات یوم الجمعۃ فی الخطبۃ،حدیث: 851۔

[4] صحیح البخاری ،الجمعۃ ،با ب لا یقیم الرجل أخاہ یوم الجمعۃ یقعد مکانہ ، حدیث: 911۔

[5] صحیح مسلم ،الجمعۃ ،با ب تخفیف الصلاۃ والخطبۃ ،حدیث:۸۷۴۔ ۲۔حسن سنن ابی داؤد ،الصلاۃ ،باب رفع الیدین علی المنبر ،حدیث1104

نبی اکرم ﷺ دو خطبے دیتے اور ان کے درمیان بیٹھتے تھے [2] ۔

محض جمعہ کے دن روزہ رکھنا:

نبی اکرم ﷺ نے جمعے کا دن روزے کے لئے اور جمعے کی شب جمعرات اور جمعے کی درمیانی رات کو عبادت کے لئے خاص کرنے سے منع فرمایا[3]۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

جمعہ کی اذان:

سیدنا سائب بن یزیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ، ابو بکرؓ اور سیدنا عمرؓ کے زمانے میں جمعے کی اذان اس وقت ہوتی تھی جب امام خطبے کے لئے منبر پر بیٹھتا۔جب سیدنا عثمانؓ خلیفہ بنے اور لوگ زیادہ ہو گئے تو زوراء جگہ پر ایک ااور اذان دی جانے لگی۔امام بخاریؒ فرماتے ہیں: زوراء مدینہ کے بازار میں ایک مقام ہے [4] ۔

مسجد کے اندر مام کے خطبے سے پہلے صرف ایک اذان ہے۔عام طور پر مساجد کے خطبے کی اذان سے قبل دی جانے والی اذان کا ثبوت سیدنا عثمانؓ کے دور سے بھی نہیں ہے۔لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہیئے۔جمعہ کے دن اذان جمعہ منبر کے پاس ہونی چاہیئے۔

تبصرہ:

غیر مقلد احباب کے مذکورہ مستدلات اور ارشادات پر ہم تبصرہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اس پر پوری امت کا اجماع ہے۔خصوصا جن امام بخاری کی جابجا یہ حضرات تقلید کرتے چلے آرہے ہیں

---

[1] سنن ابی داؤد ،باب الرجل یخطب علی قوس حدیث1096

[2] صحیح البخاری ،الجمعة ،باب القعدة بین الخطبتین یوم الجمعة ،حدیث:928۔

[3] صحیح مسلم ،الصیام ،باب کراهة افراد یوم الجمعة بصوم لا یوافق عادته ،حدیث:1144

[4] صحیح البخاری ،الجمعة ،باب الاذان یوم الجمعة ،حدیث:912۔

مثلاً وجوب فاتحہ خلف الامام وغیرہ میں وہی امام بخاری فرماتے ہیں "حضرت عثمان کی خلافت جا جب دور آیا اور نمازیوں تعداد بڑھ گئی تو آپ نے ایک تیسری اذان کا حکم دیا { اقامت کے ساتھ } یہ اذان زوراء سے دی جاتی تھی اور بعد میں امت اسی پر عمل رہا { بخاری باب التاذین عند الخطبہ } ۔

نماز عیدین

احکام و مسائل:

سیدنا علیؓ فرماتے ہیں: جمعہ ، عرفہ ، قربانی اور عید الفطر کے دن غسل کرنا چاہیئے [1] ۔

سیدنا عبداللہ بن عمرب عید کے دن عیدگاہ کی طرف نکلنے سے پہلے غسل کرتے تھے [2] ۔

عید الفطر کی نماز کے لئے نکلنے سے پہلے صدقہ فطر ادا کرنا لازم ہے [3] ۔

اس سے معلوم ہوا کہ صدقہ فطر نماز عید کے لئے جانے سے پہلے ادا کرنا لازم ہے اور اس میں تاخیر کرنا جائز نہیں۔

عید اگر جمعے کے دن ہو تو نماز عید پڑھنے کے بعد جمعہ پڑھ لیں یا ظہر اختیار ہے [4] ۔

رسول اللہ ﷺ نے عیدین کی نماز، اذان اور تکبیر کے بغیر پڑھی [5] ۔

---

[1] صحیح السنن الکبری للبیہقی ،صلاۃ العیدین،باب غسل العیدین: 278/3،حدیث: 2124۔اس کی سند صحیح ہے

[2] صحیح الموطأ للامام مالک ، العیدین،باب العمل فی غسل العیدین والنداء فیہما والاقامۃ ،حدیث: 436۔اس کی سند صحیح بلکہ اصح الاسانید ہے

[3] صحیح البخاری ،الزکاۃ ،باب فرض صدقۃ الفطر ،حدیث: 1503،وصحیح مسلم ، الزکاۃ ،باب الامر باخراج زکاۃ الفطر قبل الصلاۃ ،حدیث: 986۔

[4] سنن ابی داؤد ،الصلاۃ ،باب اذا وافق یوم الجمعۃ یوم عید ،حدیث: 1070،وسندہ حسن ،سنن ابن ماجہ ،اقامۃ الصلوات ،باب ما جاء فیما اذا اجتمع العیدان فی یوم ، حدیث: 1310۔حاکم نے المستدرک 288/1 میں ،ابن خزیمہ نے حدیث: 1464 میں اور حافظ ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے۔

[5] مسلم العیدین حدیث 885

سیدنا جابرؓ بن عبد اللہ نے فرمایا: نماز عید کے لئے اذان ہے نہ تکبیر، پکارنا ہے نہ کوئی اور آواز[1]

آپ ﷺ نے عیدگاہ میں سوائے عید کی دو رکعتوں کے نہ پہلے نفل پڑھے اور نہ بعد میں[2] ۔

نبی اکرم ﷺ عید الفطر کے دن کچھ کھا کر نماز کے لئے نکلتے اور عید الاضحیٰ کے دن نماز پڑھ کر کھاتے[3] ۔

رسول اللہ ﷺ عیدالفطر کے روز طاق کھجوریں کھا کر عیدگاہ جایا کرتے تھے[4] ۔

سیدنا انسؓ بن مالک جب شہر جا کر عید کی نماز باجماعت ادانہ کر سکتے تو اپنے غلاموں اور اہل و عیال کو جمع کرتے اور اپنے غلام عبد اللہ بن ابو عتبہؒ کو شہر والوں کی نماز کی طرح نماز پڑھانے کا حکم دیتے[5]۔[6]

6 5

---

1 لم العیدین حدیث886

2 صحیح البخاری ،العیدین،باب ترک الصلاۃ قبل العید وبعد ھا فی المصلی ،حدیث: 989، صحیح مسلم ،صلاۃ العیدین ،باب ترک الصلاۃ قبل العید وبعد ھا فی المصلی ،حدیث:(13)۔884۔

3 جامع الترمذی ،العیدین ،باب ما جاء فی الاکل یوم الفطر قبل الخروج ،حدیث:542،وسندہ حسن ،وسنن ابن ماجہ ،الصیام ،باب فی الاکل یوم الفطر قبل أن یخرج ،حدیث:1756۔

4 صحیح البخاری ،العیدین،باب الاکل یوم الفطر قبل الخروج ،حدیث:953ابن حبان نے الموارد ،حدیث:593 میں، ابن خزیمہ نے حدیث:۱۴۲۶میں، حاکم نے المستدرک:294/1 میں اور حافظ ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے۔

5 صحیح البخاری، العیدین ،باب اذا فاتہ العید یصلی رکعتین،قبل الحدیث:987 معلقا والسنن الکبری للبیہقی ،صلاۃ العیدین ،باب صلاۃ العیدین سنۃ اھل الاسلام حیث کانوا:305/3،حدیث:6237۔اس کی سند صحیح ہے

6 تبصرہ: ہم اس روایت پر تبصرہ کرتے ہیں کہتے ہیں کہ امام بخاری اس کو تعلیقا لائے ہیں اس کی سند نہیں لائے ۔ہم علی زئی صاحب کے اصول یاد دلاتے ہیں" یہ قول سفیان بن عیینہ سے ثابت نہیں سفیان 198ھ میں فوت ہوئے جبکہ امام ابو داؤد 202ھ میں پیدا ہوئے۔ لہذا یہ قول منقطع ہونے کی وجہ سے ثابت نہیں ہے {جزء قرات للبخاری ص: 49} ۔ہم کہتے ہیں کہ امام بخاری اور انس بن مالک کے درمیان کم از کم 200 سال کا فاصلہ ہوگا۔ جب چار سال کی وجہ سے روایت قابل استدلال نہ تھی تو سینکڑوں سالوں کی انقطاع کیسے قابل استدلال بن گئی۔ نیز حدیث مرسل و منقطع آپ کے ہاں دلیل نہیں تو پھر تعلیقات سے استدلال کیسے ؟۔

رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شتر سوار قافلہ آیا، اس نے گواہی دی کہ انہوں نے کل چاند دیکھا تھا کہ آپ نے ہمیں روزہ افطار کرنے اور دوسرے دن عید کی نماز کے لئے نکلنے کا حکم دیا۔ کیونکہ رؤیت ہلال کی خبر اتنی دیر میں پہنچی کہ نماز عید کا وقت نکل چکا تھا[1] ۔

عید کے دن مسجد میں صحابہ نے جنگی کھیلوں کا مظاہرہ کیا[2] ۔

سیدنا عبد اللہ بن بسرؓ عید الفطر یا عید الاضحیٰ کے روز نماز کے لئے گئے۔ امام نے نماز میں تاخیر کر دی تو وہ فرمانے لگے: رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہم اس وقت نماز سے فارغ ہو چکے ہوتے تھے۔ راوی کہتا ہے کہ یہ چاشت کا وقت تھا[3]

عیدگاہ میں جس راستے سے جائیں، واپسی پر راستہ تبدیل کریں[4] ۔

عورتوں کے لئے عیدگاہ آنے کا حکم:

سیدہ ام عطیہؓ کہتی ہیں کہ ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم سب عورتوں کو حتی کہ حیض والیوں اور پردے والیوں کو بھی دونوں عیدوں میں گھر سے نکالیں تاکہ وہ سب مسلمانوں کی جماعت نماز اور ان کی دعا میں ضرور حاضر ہوں۔ اور فرمایا: حیض والیاں جائے نماز سے الگ رہیں۔ وہ نماز نہ پڑھیں لیکن مسلمانوں کی دعاؤں اور تکبیروں میں شامل رہیں تاکہ اللہ کی رحمت اور بخشش سے حصہ پائیں۔ ایک عورت نے

---

[1] صحیح سنن ابی داؤد ،الصلاۃ ،باب اذا لم یخرج الامام للعید من یومہ یخرج من الغد ،حدیث:1558۔ ابن حزم: 92/5 اور بیہقی: 316/3 نے اسے صحیح کہا ہے

[2] صحیح البخاری ،الصلاۃ ،باب اصحاب الحراب فی المسجد ،حدیث:454،455۔ وصحیح مسلم ،صلاۃ العیدین ،باب الرخصۃ فی اللعب ۔۔۔ ،حدیث:(17)۔892۔

[3] سنن ابی داؤد ،الصلاۃ ،باب وقت الخروج الی العید، حدیث:1135، وسندہ صحیح ،امام حاکم نے المستدرک: 295/1 میں اور ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے۔

[4] صحیح البخاری ،العیدین ،باب من خالف الطریق اذا رجع یوم العید ،حدیث:986۔

عرض کیا کہ اگر ہم میں سے کسی کے پاس چادر نہ ہو تو پھر وہ کیسے عیدگاہ میں جائے؟ فرمایا: اسے اس کی ساتھ والی عورت چادر اوڑھادے (کسی دوسری عورت سے چادر عاریتاً لے کر جائے)[1] ۔

رسول اللہ ﷺ صحابہ اور صحابیاتؓ کو حتیٰ کہ حیض والی عورتوں کو بھی ساتھ لے کر عیدگاہ کی طرف جاتے[2]۔

آپ کی عیدگاہ مسجد نبوی سے ہزار ہاتھ ذراع کے فاصلہ پر البقیع کی طرف تھی[3] ۔

رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر و عمر اور عثمانؓ عیدین کی نماز خطبے سے پہلے پڑھتے تھے[4] ۔

تکبیرات عید کا وقت:

حافظ ابن حجرؒ تکبیرات کے وقت ابتدا و انتہا کے بارے میں فرماتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں۔ صحابہؓ سے جو سب سے زیادہ روایت مروی ہے وہ سیدنا علیؓ کا قول ہے۔

سیدنا علیؓ عرفہ کے دن نو ذوالحجہ کی فجر سے لے کر تیرہ ذی الحجہ کی عصر تک تکبیرات کہتے[5]

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ عید الفطر کے دن گھر سے عیدگاہ تک باآواز بلند تکبیرات کہتے[1] ۔

---

[1] صحیح البخاری ،الحیض ،باب شھود الحائض العیدین ودعوۃ المسلمین۔۔،حدیث:324، 351، 971، 994، وصحیح مسلم ،صلاۃ العیدین،باب ذکر اباحۃ خروج النساء فی العیدین الی المصلی ۔۔۔،حدیث:890۔ 7۔فتح الباری :449/2،تحت الحدیث:956۔

[2] محدثین فقہائے اہل سنت فرماتے ہیں کہ عورتوں کا عید کی نماز میں جانا جائز ہے لیکن اگر نہ جائے تو بہتر ہے اس لئے کہ عورتوں کے ہر نماز کو گھر میں پڑھنے کو افضل کہا گیا ہے۔

[3] بخاري كتاب العيدين حديث976

[4] صحیح البخاری ،العیدین ، باب الخطبة بعد العید ،حدیث:962، 963،وصحیح مسلم ،صلاۃ العیدین ،باب :کتاب صلاۃ العیدین ،حدیث:884۔

[5] السنن الکبری للبیہقی ،صلاۃ العیدین،باب من استحب ان یبتدی بالتکبیر خلف صلاۃ الصبح:314/3، حدیث:2675۔امام حاکم نے المستدرک: 299/1 میں اور حافظ ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے۔اس کی سند صحیح ہے

امام زہری کہتے ہیں کہ لوگ عید کے دن اپنے گھروں سے عیدگاہ تک تکبیرات کہتے، پھر امام کے ساتھ تکبیرات کہتے[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس ؓ ۹ذوالحجہ نماز فجر سے لے کر ۱۳ذوالحجہ نماز عصر تک ان الفاظ میں تکبیر کہتے: اللہ اکبر کبیرا، اللہ اکبر کبیرا، اللہ اکبر اجل، اللہ اکبر وللہ الحمد

اللہ سب سے بڑا ہے، بہت بڑا، اللہ سب سے بڑا ہے، بہت بڑا، اللہ سب سے بڑا ہے اور سب سے زیادہ صاحب جلال ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لئے ساری تعریف ہے[3]۔

سلمان ؓ یوں تکبیرات کہتے: اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر کبیرا[4] .

مشہور تابعی ابراہیم ؒ سے روایت ہے کہ عرفات کے دن نماز کے بعد قبلہ رخ حالت میں ہی اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر وللہ الحمد پڑھتے تھے[5]۔[6]

---

[1] بیہقی 3 / 279 امام بیہقی فرماتے ہیں کہ حدیث ابن عمر موقوفا محفوظ ہے۔

[2] السنن الکبری للبیہقی ،صلاۃ العیدین ،باب التکبیر لیلۃ الفطر ویوم الفطر :2793،حدیث:2129۔امام بیہقی فرماتے ہیں کہ حدیث: سیدنا ابن عمرؓ موقوفا صحیح ہے۔اس کی سند حسن ہے۔

[3] المصنف لابن ابی شیبة : 488/1،حدیث:5628،وسندہ صحیح

[4] صحیح المصنف لابن ابی شیبۃ : 489/1،حدیث:5645،وسندہ صحیح،490/1،حدیث:5654۔وسندہ صحیح ،امام حاکم نے المستدرک: 299/1 میں اور حافظ ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے۔

[5] السنن الکبری للبیہقی ،صلاۃ العیدین ،باب کیف التکبیر؟316/3،حدیث:6282،وسندہ صحیح ،حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ اس بارے میں صحیح ترین قول سلمانؓ کا ہے۔فتح الباری :462/2۔

[6] تبصرہ: ہم ان حضرات کو خصوصا زبیر علی زئی صاحب کو ان کے اصول یاد دلاتے ہیں کہ آپ کے ہاں اقوال وافعال صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین دلیل نہیں ہے چہ جائیکہ قول یا عمل تابعی دلیل ہو۔ماہنامہ الحدیث کے حوالے سے یہ تفصیل گزر چکی ہے۔

نماز عید کا طریقہ:

رسول اللہ ﷺ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن عیدگاہ جاتے، سب سے پہلے نماز پڑھتے، پھر خطبہ دیتے جبکہ لوگ صفوں میں بیٹھے رہتے۔ خطبے میں لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے اور اگر کہیں لشکر بھیجنا ہوتا تو اس کی تیاری وغیرہ کا حکم دیتے، پھر واپس لوٹتے[1]۔

وضو کرکے قبلے کی طرف منہ کریں اور اللہ اکبر کہتے ہوئے رفع الیدین کریں[2]۔

پھر سینے پر ہاتھ باندھ کر دعائے استفتاح پڑھیں[3]۔

پھر دعائے استفتاح ختم کرکے قراءت سے پہلے ٹھہر ٹھہر کر سات تکبیر کہیں[4]۔

پھر امام اونچی آواز سے الحمد شریف پڑھیں، پھر امام اونچی آواز سے قراءت کرے اور مقتدی چپ چاپ سنیں۔

نبی اکرم ﷺ نے عید الاضحیٰ اور عید الفطر سورۃ ق والقرآن المجید اور اقتربت الساعۃ وانشق القمر پڑھیں اور ایک روایت میں سبح اسم ربک الاعلیٰ اور ھل اتک پڑھنے کا ذکر بھی آیا ہے[5]۔

بہتر ہے کہ سورۃ فاتحہ کے بعد مسنون قراءت کی جائے۔ جب پہلی رکعت پڑھ کر آپ دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہوں اور قیام کی تکبیر کہہ لیں تو قراءت شروع کرنے سے پہلے تین تکبیرات کہیں[1]۔ پھر دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیر دیں۔

---

[1] صحیح البخاری ،العیدین ، باب الخروج الی المصلی بغیر منبر ،حدیث:952،وصحیح مسلم ، صلاۃ العیدین ، باب : کتاب صلاۃ العیدین ،حدیث:889۔

[2] صحیح البخاری ،الاذان ،باب الی أین یرفع یدیہ؟حدیث:738۔

[3] تبصرہ: آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اس عبارت کے لئے دلیل کی ضرورت ہے۔ کیونکہ کتاب کے ابتدا میں آپ حضرات نے فرمایا تھا کہ "اور یہ بھی ثابت ہوا کہ مسئلہ اور فتوی صرف وہی صحیح اور قابل عمل ہے جو قرآن و حدیث سے مدلل ہو۔

[4] سنن ابی داؤد ،الصلاۃ،باب التکبیر فی العیدین،حدیث:1151،وسندہ حسن،امام احمد، علی بن مدینی نے اسے صحیح کہا ہے

[5] صحیح مسلم ،صلاۃ العیدین ، باب ما یقرأفی صلاۃ العیدین؟حدیث:891۔والجمعۃ ،باب ما یقرأفی صلاۃ الجمعۃ ؟حدیث:878

عید سے متعلقہ مسائل:

رسول اللہ ﷺ، ابوبکر، عمر اور عثمان ؓ پہلے نماز پڑھتے، پھر خطبہ دیتے تھے [2]۔

عیدین کا خطبہ منبر پر پڑھیں [3]۔ میں سیدنا ابوسعید خدری ؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عید گاہ میں منبر کا اہتمام مروان بن حکم کے عہد میں کیا گیا۔

سنن ابوداؤد اور سنن ابن ماجہ میں ہے کہ ایک شخص نے مروان کے اس فعل پر اعتراض کرتے ہوئے کہا: تم نے عید کے روز منبر لا کر سنت کی مخالفت کی کیونکہ اس روز اسے نہیں لایا جاتا تھا۔ اس کی اصل صحیح مسلم (العیدین، حدیث: ۹۸۹) میں ہے [4] [5]۔

سیدہ عائشہ ؓ کے پاس بچیاں (دف بجا کر اچھے) اشعار گا رہی تھیں۔ سیدنا ابوبکر ؓ نے انہیں منع کیا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اے ابوبکر! انہیں کچھ نہ کہہ، بیشک آج عید کا دن ہے۔ بلاشبہ ہر قوم کی ایک عید ہوتی ہے اور آج ہماری عید ہے [6]۔

عید الاضحیٰ کے دن نماز عید پڑھ کر قربانی کرنی چاہیے۔

---

[1] سنن ابی داؤد الصلاۃ، باب التکبیر فی العیدین، حدیث: ۱۱۵۱، وسندہ حسن، امام احمد نے اسے صحیح کہا ہے۔

[2] مسلم صلاۃ العیدین حدیث 884

[3] صحیح بخاری العیدین: حدیث: ۹۵۶) اور صحیح مسلم (صلاۃ العیدین: حدیث: ۸۸۹

[4] سنن ابی داؤد، الصلاۃ، باب الخطبہ یوم العید، حدیث: 1140، وسنن ابن ماجہ، اقامۃ الصلوات، باب ماجاء فی صلاۃ العیدین، حدیث: 1275۔

[5] تبصرہ: اس روایت کی سند میں دو راوی مدلس ہے ابومعاویہ اور امام اعمش دونوں عن سے روایت کر رہے ہیں۔ اور یہ آپ حضرات کے مسلمہ اصول ہے کہ مدلس کی عنعنہ ضعیف ہوگی {جزء منظوم لبدیع الدین ص: 89، الفتح المبین لعلی زئی ص: 42، مقالات علی زئی ج: 1 / ص: 267 }۔ لہذا یہ روایت آپ ہی کے اصول کے مطابق ضعیف ہے۔

[6] صحیح البخاری، العیدین، باب سنۃ العیدین لاھل الاسلام، حدیث: 952۔

سیدنا براءؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے نماز کے بعد قربانی کی اس کی قربانی بھی ہو گئی اور اس نے مسلمانون کا طریقہ بھی اپنا لیا اور جس نے نماز سے پہلے قربانی کی، اس کی قربانی نہیں ہو گی، وہ محض گوشت کی ایک بکری ہے جو اس نے اپنے گھر والوں کے لئے ذبح کی ہے[1]۔

آپ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے نماز عید سے پہلے قربانی کی، وہ نماز کے بعد دوسری قربانی کرے[2]۔

اگر جمعہ اور عید ایک دن آئے ؟:

حضرت عثمان ﷛ کے زمانہ میں بھی عید اور جمعہ دونوں اکھٹے ہو گئے تھے تو حضرت عثمان ﷛ نے عید کی نماز پڑھ کر یہ اعلان کیا تھا:

اے لوگو! آج ایسا دن ہے کہ مسلمانوں کی دو عیدیں اکٹھی ہو گئی ہیں پس جو یہاں اہل عوالی میں سے ہے (یعنی جس نے ہمارے ساتھ اہل عوالی میں سے عید کی نماز پڑھی ہے) ہماری طرف سے اس کو واپس جانے کی اجازت ہے (یعنی اس کو جمعہ کی نماز کے لئے رکنا ضروری نہیں ہے) اور جو جمعہ کے لئے رکنا چاہے وہ رکے[3]۔

بدایۃ المجتہد میں علامہ ابن رشد لکھتے ہیں: "ایک جماعت کا کہنا یہ ہے کہ یہ رخصت خاص طور پر ان دیہات والوں کے لئے تھی جو عید اور جمعہ کے لئے مدینہ تشریف لایا کرتے تھے، جیسا کہ حضرت عثمان ﷛ سے مروی ہے کہ انہوں نے اس روز خطبہ دیا جس دن عید اور جمعہ اکھٹے ہو گئے تھے، آپ نے فرمایا تھا دیہات سے آنے والوں میں سے جو جمعہ کی نماز پڑھنا چاہے وہ انتظار کریں اور جو واپس

---

[1] بخاری باب سنة العدین لاہل الاسلام حدیث 951'955'965'968مسلم باب وقتہا حدیث1960

[2] صحیح البخاری ،العیدین،باب کلام الامام والناس فی خطبة العید ـ ـ ـ ،حدیث: 985،وصحیح مسلم ،الاضاحی ،باب وقتھا ،حدیث: 1960۔

[3] ابن ابي شيبه ورواه مالك والبخاري في كتاب الاضاحي (آثار السنن، ص: 327)

جانا چاہے وہ واپس چلا جائے[1] (اس لئے کہ دیہات والوں پر جمعہ واجب نہیں ہے) حضرت عمر بن عبد العزیز (خلیفہ راشد) سے بھی اسی طرح کی بات منقول ہے، امام شافعی کا بھی یہی مذہب ہے"۔

علامہ ابن رشد فرماتے ہیں: "حضرت امام مالک اور حضرت امام ابو حنیفہ رحمہما اللہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر کسی سال عید اور جمعہ دونوں کا اجتماع ہو جائے تو جو مکلّف ہے یعنی جس پر شرعی احکام وعبادات کی ادائیگی واجب ہے اور ضروری ہے وہ ان دونوں کا مخاطب ہے، یعنی اسے عید کی نماز بھی پڑھنی ہے اس وجہ سے کہ وہ سنت ہے اور جمعہ بھی پڑھنا ہے اس وجہ سے کہ وہ فرض ہے، اور ایک نماز دوسری نماز کے قائم مقام نہیں ہو سکتی اور یہی اصل حکم ہے"۔

اس کی تائید حضرت امام شافعی کے اس بیان سے مزید ہوتی ہے وہ اپنی کتاب "کتاب الام" میں فرماتے ہیں: "(امام شافعی نے کہا) اور اگر عید الفطر کا دن جمعہ کا ہو تو امام جب نماز کا وقت ہو جائے تو عید کی نماز پڑھائے گا پھر ان کو جو شہر کے لوگ نہیں ہیں اجازت دے گا کہ اگر وہ چاہیں تو واپس ہو جائیں اور اپنے گھروں کو جائیں اور جمعہ پڑھنے دوبارہ نہ آئیں اور ان کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ ٹھہرے رہیں اور جمعہ پڑھ کر گھروں کو جائیں یا واپس جا کر دوبارہ آئیں اور جمعہ پڑھیں، اور یہ حکم ان کا ہے جو شہر کے لوگ نہیں ہے، غیر شہر والوں میں سے کسی کے لئے یہ حکم نہیں ہے کہ وہ جمعہ چھوڑیں اگرچہ وہ عید کا دن ہی کیوں نہ ہو الا یہ کہ ان کو کوئی عذر شرعی ہو اور یہی حکم عید الاضحیٰ کا بھی ہے[2]۔

ابن حزم اپنی مشہور کتاب محلّی میں فرماتے ہیں:

"اگر عید جمعہ کے روز پڑ جائے تو عید نماز ادا کر کے جمعہ کی نماز پڑھے گا اور یہ ضروری ہے اور کوئی حدیث اس کے خلاف صحیح سند سے ثابت نہیں ہے ابن حزم فرماتے ہیں کہ جمعہ فرض ہے اور عید کی نماز نفل ہے اور نفل فرض کو ساقط نہیں کرتا[3]"۔

---

[1] رواہ مالک فی الموطا روی نحوہ عن عمر بن عبد العزیز وبہ الشافعی

[2] کتاب الام ج: 1/ص: 239

[3] محلی ج: 3/ص: 93

لیجئے ابن حزم تو اعلان کر دیا کہ غیر مقلدین زمانہ جس اثر یا حدیث استدلال کرتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے۔

عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ میں تکبیرات:

سیدنا ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آپ عید الفطر اور عید الاضحیٰ میں نونو (9،9) تکبیریں کہتے تھے، پہلی میں چار اور رکوع والی تکبیر، دوسرے میں رکوع سمیت چار تکبیریں[1]۔

اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس روایت کے بارے میں نیموی صاحب لکھتے ہیں" اسے طبرانی نے " الکبیر" میں روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے[2]۔

اس روایت میں "کردوس" مجہول الحال ہے اور "عبد الملک بن عمیر" مدلس ہیں جو اسے عن کے ساتھ روایت کر رہے ہیں۔

اشکال ہوتا ہے کہ ہدایہ (ص 131) سے یہ عبارت نقل کی ہے " ان النبی علیہ السلام یصلی العید والشمس علی قید رمح او رمحین، نبی ﷺ عید کی نماز پڑھتے تھے جب سورج ایک نیزے یا دو نیزے کی بلندی پر ہوتا تھا" یہ کوئی حدیث نہیں۔

الجواب: حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں لم اجدہ[3] یہ حدیث مجھے نہیں ملی۔

علامہ زیلعی وعلامہ عینی فرماتے ہیں کہ غریب ہے[4]

یہ حدیث ان الفاظ میں مروی ہے خود حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: في كتاب الاضاحي للحسن بن احمد بن البنا من طريق وكيع عن المعلي بن هلال عن الاسود بن قيس عن جندبؓ قال كان النبي ﷺ يصلي بنا يوم الفطر والشمس على قيد رمحين والاضحى على قيد رمح[5]

---

[1] دیکھئے المعجم الکبیر، ج: 9/ص: 350

[2] آثار السنن، 999 عن کردوس

[3] الدرایہ، ج: 1/ص: 219

[4] نصب الرایہ، ج: 2/ص: 6، عینی، ص: 1065 الجز الثانی

[5] تلخیص، ج: 3/ص: 83

ابن حجر فرماتے ہیں " لم اجدہ " مجھے نہیں ملی۔ ابن ہمام فرماتے ہیں " وذکرہ المصنف وغیرہ واللہ اعلم بہ"[1] صاحب ہدایہ وغیرہ نے ابن مسعود سے ایسے ہی ذکر کیا ہے، واللہ اعلم بہ، علامہ زیلعی وعلامہ عینی فرماتے ہیں کہ غریب ہے[2]۔

لطیفہ: آثار السنن کا ایک نسخہ فیض احمد دیوبندی کی تحقیق سے مکتبہ امدایہ ملتان سے شائع ہوا جس کے صفحہ: 340 پر 756 کے حاشیہ کے تعلیق پر لکھا ہوا ہے " لکن عبد الملک بن عمر ربما دلس "۔

نیموی اصول کی رو سے ایک ہی راوی کبھی مدلس ہوتا ہے اور کبھی اس کی عن والی روایت بھی صحیح ہوتی ہے۔

اشکال: علامہ نیموی نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد اس حاشیہ میں " المعجم الکبیر " سے پوری سند ذکر کی ہے۔ اور اس کے بعد امام ہیثمیؒ سے نقل کیا ہے کہ " رجالہ ثقات " اس حدیث کے سارے راوی ثقہ ہیں[3]۔

اس عبارت میں صاف تصریح ہے کہ " کردوس " سمیت اس روایت کے سارے راوی ثقہ ہیں اور کوئی راوی مجہول نہیں ہے، زبیر علی زئی صاحب مرحوم نے علامہ نیمویؒ کی علامہ ہیثمیؒ سے نقل کردہ اس عبارت کو ذکر نہ کرکے اچھا نہیں کیا۔ جبکہ مرحوم زبیر علی زئی حاصب کے اپنے امام مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوریؒ نے بھی " کردوس " کو ثقہ قرار دیا ہے[4]۔

اسی طرح شیخ البانیؒ غیر مقلد عالم دین نے بھی اس کی روایت کو قابل احتجاج قرار دیا ہے[5]۔

دوسرا الزام علامہ نیمویؒ پر عائد کیا گیا ہے کہ اس روایت میں عبد الملک بن عمیر مدلس ہیں، اور انہوں نے اس روایت کو عن سے بیان کیا ہے، اس میں بھی لوگوں نے دجل وتلبیس کا مظاہر کیا

---

[1] فتح القدیر، ص: 335

[2] نصب الرایہ، عینی، ص: 1405

[3] التعلیق الحسن، ص: 50

[4] مقالات مبارکپوری، ص: 233

[5] سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ: 299

ہے،اس لئے کہ عبد الملک بن عمیر اس روایت میں متفرد ہیں، بلکہ ان کی متابعت متعدد ثقہ راویوں نے کی ہے، چنانچہ علامہ نیمویؒ نے بھی اس روایت کے علاوہ چار مزید روایتیں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے اسی مضمون کی نقل کی ہیں اور ان سب کے اسانید صحیح ہیں[1]۔ مرحوم زبیر علی زئی صاحب کا خود اپنا بیان نقل ہو چکا ہے کہ مدلس راوی کی ایک بھی صحیح متابعت ثابت ہو جائے تو اس کی روایت قوی ہو جاتی ہے۔ اور یہاں تو عبد الملک کی روایت کے لئے کم از کم چار متابعات قویہ موجود ہیں، لیکن اس کے باوجود بعض حضرات سوچ کر اعتراض نہیں کرتے۔

اور یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ ملا نا عبد الرحمٰن مبارکپوریؒ غیر مقلد نے بھی حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے عیدین کی نماز کی نو نو تکبیریں (پہلی رکعت میں رکوع سمیت پانچ اور دوسری میں رکوع سمیت چار) کہنے کو صحیح و ثابت تسلیم کیا ہے، اور اس کے ثبوت میں چار روایات بھی ذکر کی ہیں[2]۔ اسی طرح شیخ البانیؒ بھی ان روایات کو صحیح قرار دیتے ہیں[3]۔

سورج اور چاند گرہن کی نماز

نماز کسوف:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

سورج اور چاند کسی کے مرنے کی وجہ سے گرہن نہیں ہوتے۔ یہ تو قدرت الٰہی کی دو نشانیاں ہیں، جب انہیں گرہن ہوتے دیکھو تو نماز کے لئے کھڑے ہو جاؤ[4]۔

---

[1] دیکھئے: آثار السنن، ص: 497-500

[2] مقالات، ص: 232-237

[3] سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ: 2997

[4] صحیح البخاری ،الکسوف ،باب الصلاۃ فی کسوف الشمس ،حدیث 1041 وصحیح مسلم ، الکسوف ،باب صلاۃ الکسوف ،حدیث: 901 اہل جاہلیت کا عقیدہ تھا کہ سورج یا چاند اسی وقت گرہن ہوتے ہیں جب کوئی اہم شخصیت پیدا ہو یا وفات پائے یا دنیا میں کوئی اہم واقعہ رونما ہو، نبی اکرم ﷺ نے اسی باطل عقیدے کی نفی فرمائی۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: چاند اور سورج کا گرہن آثار قدرت ہیں یہ کسی کے مرنے، جینے یا کسی اور وجہ سے نمودار نہیں ہوتے بلکہ اللہ اپنے بندوں کو عبرت دلانے کے لئے ظاہر فرماتا ہے۔ اگر تو ایسے اثار دیکھو تو جلد از جلد یاد الٰہی، دعا اور استغفار کی طرف رجوع کرو۔[1]

سیدنا عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جب سورج گرہن ہوا تو آپ ﷺ نے ایک شخص کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا کہ "ان الصلاۃ جامعۃ" نماز تمہیں جمع کرنے والی ہے یعنی نماز کے لئے جمع ہو جاؤ[2]۔

سورج اور چاند گرہن کی نماز کا طریقہ:

سیدنا عبد اللہ عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں سورج گرہن لگا۔ آپ نے باجماعت دو رکعتیں نماز پڑھی۔ آپ نے سورۂ بورہ تلاور کرنے کی مقدار کے قریب لمبا رکوع کیا، پھر لمبا قیام کیا، پھر سر اٹھا کر پہلے قیام سے کم لمبا قیام کیا[3]۔ پھر پہلے رکوع سے کم لمبا رکوع کیا، پھر (قومہ کر کرکے) دو سجدے کیے، پھر کھڑے ہو کر پچھلے قیام سے کم لمبا قیام کیا، پھر پچھلے رکوع سے کم لمبا رکوع کیا، پھر پچھلے قیام سے کم لمبا قیام کیا، پھر پچھلے رکوع سے کم لمبا رکوع کیا، پھر دو سجدے کیے اور تشہد پڑھ کر سلام پھیرا م اتنی دیر میں سورج روشن ہو چکا تھا، پھر (خطبہ دیا جس میں اللہ کی تعریف اور ثنا کی اور)فرمایا: سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ کسی کے مرنے یا پیدا ہونے سے انھیں گرہن نہیں لگتا۔ جب تم گرہن دیکھو تو اللہ کا ذکر (کرو، اس سے دعا کرو، تکبیر کہو، نماز پڑھو اور

---

[1] صحیح البخاری، الکسوف، باب الذکر فی الکسوف: حدیث: 1059، وصحیح مسلم، الکسوف، باب ذکر النداء بصلاۃ الکسوف الصلاۃ جامعۃ ''حدیث: 912۔ یعنی سورج یا چاند کے گرہن ہونے کا تعلق کائنات کے واقعات سے نہیں بلکہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قدرت سے ہے اور اللہ جو تمہارے سامنے انہیں بے نور کر سکتا ہے، وہ قیامت کے قریب بھی انہیں بے نور کرکے لپیٹ دینے پر قادر ہے، لہٰذا اس سے ڈرتے رہو۔ واللہ اعلم۔

[2] صحیح البخاری، الکسوف، باب النداء ''الصلاۃ جامعۃ ''فی الکسوف، حدیث. 1045، وصحیح مسلم، الکسوف، باب ذکر النداء بصلاۃ الکسوف الصلاۃ جامعۃ حدیث: 910۔

[3] رکوع کے بعد قومہ کرنے کی بجائے دوبارہ قراءت شروع کر دینا ایک ہی رکعت کا تسلسل لہٰذا اس موقع پر نئے سرے سے فاتحہ نہیں پڑھی جائے گی۔ واللہ اعلم۔

صدقہ) کرو۔ نیز فرمایا: (دوران نماز میں) میں نے جنت دیکھی۔ اگر میں اس میں سے ایک انگور کا خوشہ لے لیتا تم رہتی دنیاتک اس میں سے کھاتے اور میں نے دوزخ سے بھی دیکھی، اس سے بڑھکر ہولناک منظر میں نے (کبھی) نہیں دیکھا۔ (اور) میں نے جہنم میں زیادہ تعداد عورتوں کی دیکھی کیونکہ وہ خاوندوں کی ناشکری کرتی ہیں۔ اگر توایک مدت تک ان کے ساتھ نیکی کریار ہے، پھران کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرے تو کہتی ہیں کہ میں نے تجھ سے کبھی بھلائی نہیں دیکھی[1]۔

سورج اور چاند کے گہنائے جانے پر آپ ﷺ گھبرا اٹھتے اور نماز پڑھتے۔ سیدہ اسماءؓ بیان کرتی ہیں کہ آپ کے زمانے میں (ایک دافعہ) سورج گرہن لگا۔ توآپ گھبرا گئے اور گھبرائٹ میں سے کسی کا کرتہ لے لیا، بعد میں آپ کو چادر مبارک پہچائی گئی۔ سیدہ اسماءؓ بھی مسجد میں گئیں اور عورتوں کی صف میں کھڑی ہو گئیں۔ آپ نے اتنا طول قیام کیا کہ ان کی نیت بیٹھنے کی ہو گئی لیکن انھوں نے ادھر ادھر اپنے سے کمزور عورتوں کو کھڑے دیکھا تو وہ بھی کھڑی رہیں[2] ۔

سیدنا جابرؓ کہتے ہیں نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں ایک سخت گرمی کے دن سورج گرہن لگا، آپ نے صحابہ کرامؓ کو ساتھ لے کر نماز پڑھی۔ آپ نے اتنا طویل قیام کیا کہ لوگ گرنے لگے[3] ۔

---

[1] صحیح البخاری ،الکسوف ،باب صلاۃ الکسوف جماعۃ ،حدیث:1052،وصحیح مسلم ،الکسوف ،باب ما عرض علی النبیﷺ فی صلاۃ الکسوف من امر الجنۃ والنار،حدیث:907۔اس سے معلوم ہوا کسی محسن کی احسان فراموشی کبیرہ گناہ ہے۔جب کسی بندے کی احسان فراموشی کبیرہ گناہ ہے تو جو خالق کی احسان فراموشی کرتا ہے،اس کا گناہ کس قدر خطرناک ہوگا۔اللہ ہم سب کو ہدایت دے۔آمین۔

[2] صحیح مسلم ،الکسوف ،باب ما عرض علی النبی ﷺ فی الکسوف من امر الجنۃ والنار ،حدیث:906۔آپ کا گھبرانا اللہ کے ڈر کی وجہ سے تھا۔جب آپ اللہ کے پیارے نبی ہو کر گھبرا اٹھتے تھے تو افسوس ہے ان امتیوں پر جو ہزار ہا گناہوں کے باوجود ایسے مواقع پر اللہ کی طرف رجوع نہیں کرتے۔

[3] مسلم حوالہ سابق حدیث 904

سیدہ اسماءؓ کہتی ہیں کہ (ایک دافعہ سورج گرہن کی نماز میں)آپ نے اتنا لمبا قیام کیا کہ مجھے (عورتوں کی صف میں کھڑے کھڑے) ضعف آگیا۔ میں نے برابر میں اپنی مشک سے پانی لے کر سر پر ڈالنا شروع کیا (پھر جلد ہی دوبارہ قیام نماز میں شامل ہو گئی) [1] ۔

غور فرمایا آپ نے نبی اکرم ﷺ کس قدر انہاک اور اہتمام سے سورج گرہن کی نماز پڑھتے تھے۔ لیکن ہم نے کبھی اس نماز کی طرف توجہ نہیں کی۔ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے عورتیں بھی سورج گرہن کی نماز پڑھتی تھیں۔ ہمیں بھی چاہے کہ ہم مسجد میں سورج گرہن کی نماز باجماعت کا اہتمام کریں اور ہماری عورتیں بھی ضرور مساجد میں جاکر نماز میں شامل ہوں۔

نماز استسقاء:

اگر قحط سالی ہو جائے، بارش نہ برسے تو اس وقت مسلمانوں کو چاہئے کہ ایک دن تجویز کرکے سورج نکلتے ہی پرانے کپڑے پہن کر عاجزی اور زاری کرتے ہوئے آبادی سے باہر کسی کھلی جگہ میں نکلیں اور منبر بھی رکھا جائے۔ سیدنا ابن عباسؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ پرانے کپڑے پہنے، خشوع اور آہستگی سے چلتے ہوئے، عاجزی اور زاری کرتے ہوئے نکلے اور نماز استسقاء کی جگہ پہنچے [2] ۔

سیدہ عائشہؓ سے روایت ہے کہ صحابہ کرامؓ نے آپ ﷺ سے قحط سالی کی شکایت کی تو آپ نے عیدگاہ میں منبر رکھنے کا حکم دیا۔ جب سورج کا کنارہ ظاہر ہوا تو آپ نکلے اور منبر پر بیٹھے، اللہ کی بڑائی اور حمد بیان کی، پھر فرمایا: تم نے اپنے علاقوں میں قحط سالی اور بروقت بارش نہ ہونے کی شکایت کی ہے

---

[1] صحیح البخاری ،الکسوف ،باب صلاۃ النساء مع الرجل فی الکسوف ،حدیث:1053،وصحیح مسلم ، الکسوف ،باب ما عرض علی النبی ﷺ فی صلاۃ الکسوف من امر الجنۃ والنار،حدیث:905

[2] سنن ابی داؤد ،صلاۃ الاستسقاء ،باب جماع ابواب صلاۃ الاستسقاء وتفریعھا،حدیث:1165،وسندہ حسن ،وجامع الترمذی ،الجمعۃ ،باب ما جاء فی صلاۃ الاستسقاء ،حدیث:558۔امام ترمذی نے ، امام ابن خزیمہ نے حدیث: 1405،1408،1419 میں ،امام ابن حبان نے الموارد ،حدیث: 603 میں ،امام حاکم نے المستدرک: 326/1 میں ، امام ذہبی نے اور امام نووی نے المجموع: 67/5 میں اسے صحیح کہا ہے۔

جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں حکم ہے کہ تم اسے پکارو اور اس نے تمہاری دعا قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ پھر فرمایا:

الحمد للہ رب العالمین، الرحمن الرحیم، مالک یوم الدین لا الہ الا اللہ یفعل ما یرید، اللھم انت اللہ لا الہ الا انت الغنی ونحن الفقراء، انزل علینا الغیث واجعل ما انزلت لنا قوۃ وبلاغا الی حین

سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، بہت رحم کرنے والا، نہایت مہربان ہے، روز جزا کا مالک ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں جو چاہتا ہے، وہ کرتا ہے۔ اے اللہ تو سچا معبود ہے، تیرے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں۔ تو ہی غنی اور بے پروا ہے اور ہم تیرے محتاج اور فقیر بندے ہیں، ہم پر بارش برسا اور جو بارش تو نازل فرمائے، اسے ہمارے لئے ایک مدت تک قوت اور مقاصد تک پہنچنے کا ذریعہ بنا[1] ۔

سیدنا انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز استسقاء کے علاوہ کسی دعا میں اپنے دونوں ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ آپ نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور انہیں دراز کیا حتی کہ آپ کی بغلیں دکھائی دیں[2] ۔

ہاتھوں کو سر سے اونچا نہ لے جائیں[1] ۔

---

[1] سنن ابی داؤد، صلاۃ الاستسقاء، باب رفع الیدین فی الاستسقاء، حدیث: 1773، سندہ حسن، امام حاکم نے المستدرک: 328/1 میں، ابن حبان نے الموارد، حدیث: 604 میں اور حافظ ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ سید المرسلین ﷺ اور ان کے پاکباز صحابہؓ بھی اپنا کارساز اور داتا صرف اللہ ہی کو سمجھتے تھے، وہ اسی کے در کے محتاج، اسی سے ڈرنے والے اور براہ راست اسی سے دعائیں مانگتے رہے۔ قرآن مجید نے بھی اسی عقیدے کی تعلیم دی ہے۔ (فاطر: 15: 14: 35) لہذا ہم گنہ گاروں کو بھی چاہئے کہ کتاب و سنت کے مطابق صرف اللہ ہی کو اپنا کارساز اور داتا مانیں اور اس سے براہ راست دعائیں مانگیں۔ یہی نبی اکرم ﷺ سے سچی محبت اور ان کی اطاعت کا تقاضا ہے

[2] صحیح البخاری، الاستسقاء، باب رفع الامام یدہ فی الاستسقاء، حدیث: 1031، وصحیح مسلم، صلاۃ الاستسقاء، باب رفع الیدین بالدعاء فی الاستسقاء، حدیث: 895، 896۔

آپ ﷺ کے ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف تھی[2] ۔

پھر امام لوگوں کی طرف پیٹھ کرکے قبلہ رخ ہو جائے۔اور ہاتھ اٹھائے رکھے اور مندرجہ ذیل دعائیں بڑی عاجزی سے رو رو کر پڑھے۔اور سب لوگ بھی بڑے خضوع سے آبدیدہ ہو کر ہاتھوں کو الٹا کرکے اٹھائیں اور دعا مانگیں۔دعائیں یہ ہیں: اللهم اسقنا . اللهم اسقنا . اللهم اسقنا

اے اللہ ! ہمیں پانی پلا، اے اللہ ! ہمیں پانی پلا، اے اللہ ! ہمیں پانی پلا[3] ۔

اللهم اسقنا غيثا مغيثا مريئا مريعا نافعا غير ضار عاجلا غير اجل

اے اللہ ! ہمیں پانی پلا، ہم پر ایسی خوشگوار بارش نازل فرما جو ہماری تشنگی بجھا دے۔ ہلکی پھواریں بن کر غلہ اگانے والی ہو، نفع دینے والی ہو نہ کہ نقصان پہنچانے والی، جلد آنے والی ہو نہ کہ دیر لگانے والی[4]۔

صلاۃ استسقاء میں ایک اہم مسئلہ چادر پلٹنا ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ استسقا کے لئے نکلے۔آپ نے اپنی پیٹھ لوگوں کی طرف کی اور قبلہ رخ ہو کر دعا کرنے لگے ،پھر اپنی چادر پلٹی[5] ۔

آپ ﷺ پر سیاہ چادر تھی،آپ نے اس کا نچلا حصہ اوپر لانا چاہا مگر مشکل پیش آئی تو آپ نے اسے اپنے کندھوں پر ہی الٹ دیا[1] ۔

---

[1] سنن ابی داؤد ، صلاۃ الاستسقاء ،باب رفع اليدين بالدعاء فی الاستسقاء ،حدیث:1168،وهو صحيح ، امام ابن حبان نے الموارد، حدیث: 601،602 میں اسے صحیح کہا ہے۔

[2] مسلم باب رفع اليدين بالدعاء في الاستسقاء حديث 895

[3] بخاري باب 5و8 حديث 1013

[4] سنن ابی داؤد ،صلاۃ الاستسقاء ،باب رفع اليدين بالدعاء فی الاستسقاء ،حدیث:1169،وسنده حسن،امام ابن خزیمہ نے حدیث: 1416 میں ،امام حاکم نے المستدرک: 327/1 میں اور ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے۔

[5] صحيح البخاری ،الاستسقاء ،باب كيف حول النبی ﷺ ظہره الی الناس؟حديث:1025 ،وصحيح مسلم ، صلاۃ الاستسقاء ،باب :كتاب صلاۃ الاستسقاء ،حديث:894۔

چادر پلٹنے وقت چادر کا اندر کا حصہ باہر کیا جائے اور دایاں کنارہ بائیں کندھے پر اور بایاں کنارہ دائیں کندھے پر ڈال لیا جائے ۔

امام کے ساتھ لوگ بھی اپنی چادر الٹیں[2] ۔

رسول اللہ ﷺ لوگوں کو لے کر بارش طلب کرنے کے لئے عیدگاہ کی طرف نکلے انہیں دو رکعتیں نماز پڑھائی اور اس میں بلند آواز سے قراءت کی[3] ۔

نبی اکرم ﷺ نے نماز عید کی طرح لوگوں کو دو رکعتیں نماز استسقاء پڑھائی[4] ۔

خطبہ نماز استسقاء سے پہلے ہے[5] ۔

جمہور کا عمل اسی پر ہے مگر خطبہ نماز سے پہلے بھی جائز ہے[6] ۔

سیدنا عبداللہ بن یزید انصاریؓ نے نماز استسقاء بغیر اذان اور اقامت کے پڑھائی[7]

ابن بطالؒ نے کہا کہ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ نماز استسقاء میں اذان اور اقامت نہیں ہے۔

---

[1] سنن ابی داؤد ،صلاۃ الاستسقاء ،باب جماع ابواب صلاۃ الاستسقاء ،وتفریعها ،حدیث:1164 ،وهو حدیث صحیح ،ومسند احمد :4/41۔امام ابن خزیمہ نے حدیث: 1415 میں اور امام ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے۔

[2] مسند احمد : ۴/۴۱ وسنده حسن ،ابن دقیق العید نے اسے صحیح کہا ہے۔الٹے ہاتھوں سے دعا کرنا اور چادر پلٹنا دراصل فعلی دعا ہے کہ اے مولا کریم ! اس چادر اور ہاتھوں کی طرح ہمارے حالات پلٹ دے اور قحط کو خوشحالی سے بدل دے، یقیناً اس ساری کائنات کے تمام تر حالات صرف تیرے ہی اختیار میں ہیں۔

[3] صحیح البخاری ،الاستسقاء ،باب الجهر بالقراءۃ فی الاستسقاء ،حدیث:1024۔

[4] جامع الترمذی،الجمعة ،باب ما جاء فی صلاۃ الاستسقاء ،حدیث:558،وسنن ابی داؤد ،صلاۃ الاستسقاء ،باب جماع ابواب صلاۃ الاستسقاء ،حدیث: 1165 ،وسنده حسن امام ترمذی نے ،امام ابن خزیمہ نے حدیث: 1405 میں اور امام نووی نے المجموع: 5/67 میں اسے صحیح کہا ہے۔

[5] مسند احمد 4/41

[6] صحیح ابن خزیمۃ ،جماع ابواب صلاۃ الاستسقاء،باب الخطبة قبل صلاۃ الاستسقاء ،حدیث: 1407۔امام ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے، وسنده صحیح۔

[7] صحیح البخاری ،الاستسقاء ،باب الدعاء فی الاستسقاء قائما ،حدیث: 1022۔

نماز اشراق:

ضحیٰ کے معنی ہیں: دن کا چڑھنا اور اشراق کے معنی ہیں: طلوعِ آفتاب۔ پس جب آفتاب طلوع ہو کر ایک نیزے کے برابر بلند ہو جائے تو اسوقت نوافل کا پڑھنا نماز اشراق کہلاتا ہے۔ سیدنا زید بن ارقم سے مروی حدیث میں اس نماز کو صلاۃالاوابین بھی کہا گیا ہے[1]۔

نوٹ: مغرب اور عشاء کے درمیان پڑھی جانے والی نماز کو جس روایت میں صلاۃ الاوابین کہا گیا ہے، وہ مرسل ہے۔

تبصرہ:

حدیث مرسل اہل سنت کے نزدیک حجت ہے اور اس کتاب میں مرسل احادیث سے کئی مواقع پر استدلال کیا گیا ہے، اور حدیث مرسل تفصیلی بحث بھی کی گئی ہے۔

سیدنا ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ہر صبح آدمی پر لازم ہے کہ اپنے جسم کے ہر بند جوڑ کے بدلے صدقہ خیرات کرے، پس ہر تسبیح صدقہ ہے، ہر تحمید صدقہ ہے، ہر تہلیل صدقہ ہے، ہر تکبیر صدقہ ہے، امر بالمعروف صدقہ ہے اور نہی عن المنکر بھی صدقہ ہے اور ان سب چیزوں سے ضحیٰ کی دو رکعتیں کفایت کرتی ہیں[2]۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہے کہ اے آدم کے بیٹے! خالص میرے لئے چار رکعتیں اشراق کی اول دن میں پڑھ میں تجھے اس دن کی شام تک کفایت کروں گا[1]۔[2]

---

[1] مسلم باب صلاۃ الاوابین حین ترمض الفصال حدیث 748

[1] مسلم، صلاۃ المسافرین، باب استحباب صلاۃ الضحی وان اقلھا رکعتان ۔۔۔، حدیث: 720۔ تسبیح سے مراد ہے: سبحان اللہ کہنا، تحمید: الحمد للہ کہنا، تہلیل: لا الہ الا اللہ کہنا، تکبیر: اللہ اکبر کہنا، امر بالمعروف: نیکی کا حکم یا ترغیب دینا، نہی عن المنکر: بدی سے روکنا یا نفرت دلانا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ چاشت (اشراق) کی نماز کم از کم تعداد دو رکعتیں ہے۔ واللہ اعلم

معاذ تابعیہؒ نے ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ سے دریافت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نماز ضحیٰ کتنی رکعتیں پڑھتے تھے۔ سیدہ امی عائشہؓ نے کہا: چار رکعتیں اور جس قدر اللہ تعالیٰ چاہتا آپ اس سے زیادہ بھی پڑھتے[3]۔

سیدہ ام ہانیؓ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن غسل کیا اور چاشت کے وقت آٹھ رکعات نماز پڑھی۔ (۵) معلوم ہوا کہ اشراق کی رکعتیں دو، چار یا آٹھ ہیں۔

سیدنا ابوہریرہؓ نے فرمایا: مجھے میرے پیارے محبوب نبی اکرم ﷺ نے تین چیزوں کی وصیت کی۔ جب تک میں زندہ رہوں گا انہیں نہیں چھوڑوں گا: ہر قمری مہینے میں ایام بیض: ۱۳، ۱۴ اور ۱۵ تاریخ کے تین روزے، چاشت کی نماز اور سونے سے پہلے وتر پڑھنا[4]۔

نماز استخارہ[5]:

---

[1] سنن ابی داؤد، التطوع، باب صلاۃ الضحی، حدیث: 1289، وھو حدیث: صحیح، وجامع الترمذی، الوتر، باب ماجاء فی صلاۃ الضحی، حدیث: 475۔ امام ترمذی اور حافظ ذہبی نے اسے حسن اور قوی الاسناد جبکہ امام ابن حبان نے الموارد، حدیث: 634 میں اسے صحیح کہا ہے۔

[2] **تبصرہ:** اس روایت کی سند میں ایک راوی مکحول ہے عن سے روایت کر رہے ہیں اور مدلس ہے {طبقات المدلسین لابن حجر}۔ ان حضرات کا اصول تو گزر چکا ہے کہ مدلس ہونا ثابت ہو جائے چاہے ایک دفعہ ہی کیوں نہ ہو وہ روایت ضعیف ہوگی {جزء رفع یدین ص: 25}

[3] صحیح مسلم، صلاہ المسافرین، باب استحباب صلاۃ الضحی۔۔۔، حدیث: 719۔

[4] صحیح البخاری، التھجد، باب صلاۃ الضحی فی السفر، حدیث: 1176، وصحیح مسلم، صلاۃ المسافرین، باب استحباب صلاۃ الضحی، وان اقلھا رکعتان۔۔۔، حدیث: (80)۔336۔

[5] استخارہ کا معنی ہے اللہ سے خیر طلب کرنا بس، اس سے یہ مراد نہیں کہ آپ کو اپنے کام کی خبر معلوم ہو جائیگی کہ یہ کام یہ رشتہ اچھا رہے گا یا برا عوام یہ سمجھتی ہے اور یہ غلط ہے۔ بعض بدعتی پیروں نے استخارے کے اڈے بنائے ہیں روڈوں پر استخارے کے لئے بڑے بڑے سائن بورڈ لگائے ہوتے ہیں اس کا شریعت مطہرہ میں کوئی ثبوت نہیں۔

جب کسی کو کوئی جائز امر در پیش ہو اور وہ اس میں متردد ہو کہ اسے کروں یا نہ کروں یا جب کسی کام کا ارادہ کرے تو اس موقع پر استخارہ کرنا سنت ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ دو رکعت نفل خشوع و خضوع اور حضور قلب سے پڑھے۔ رکوع و سجود اور قومہ و جلسہ بڑے اطمینان سے کرے۔ پھر فارغ ہو کر یہ دعا پڑھے:

اللھم انی استخیرک بعلمک واستقدرک بقدرتک واسئلک من فضلک العظیم فانک تقدر والا اقدر وتعلم ولا اعلم وانت علام الغیوب . اللھم ان کنت تعلم ان ھذا الامر خیر لی فی دینی ومعاشی وعاقبة امری فاقدرہ لی ویسرہ لی ثم بارک لی فیہ ، وان کنت تعلم ان ھذا الامر شر لی فی دینی ومعاشی وعاقبة امری فاصرفہ عنی واصرفنی عنہ واقدر لی الخیر حیث کان ثم ارضنی بہ

اے اللہ یقینا میں اس کام میں تجھ سے تیرے علم کی مدد سے خیر مانگتا ہوں اور حصول خیر کے لئے تجھ سے تیری قدرت کے ذریعے استطاعت مانگتا ہون اور میں تجھ سے تیرا فضل عظیم مانگتا ہوں، بیشک تو ہر یز پر قادر ہے اور کسی چیز پر قادر نہیں ۔تو ہر کام کا انجام جانتا ہے اور میں کچھ نہیں جانتا اور تو تمام غیبوں کو جاننے والا ہے۔ الہی ! اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام جس کا میں ارادہ رکھتا ہوں میرے لئے میرے دین ، میری زندگی اور میرے انجام کار کے لحاظ سے بہتر ہے تو اسے میرے لئے مقدر کر اور آسان کر ، پھر اس میں میرے لئے برکت پیدا فرما۔ اور اگر تیرے علم میں یہ کام لئے میرے دین ، میری زندگی اور میرے انجام کار کے لحاظ سے برا ہے تو اس کام کو مجھ سے اور مجھے اس سے پھیر دے اور میرے لئے بھلائی مہیا کر جہاں کہیں بھی ہو ۔ پھر مجھے اس کے

ساتھ راضی کر دے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ھذا الامر کی جگہ اپنی حاجت کا نام لو[1]۔

اگر عربی زبان میں اپنی حاجت کا نام لے سکو تو بہتر ہے ورنہ یہ دعا انہی الفاظ سے پڑھ کر بعد میں اپنی بولی میں اپنی حاجت کا اظہار کیجئے۔

جب آپ یہ مسنون استخارہ کرکے کوئی کام کریں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ضرور اس میں بہتری کی صورت پیدا کرے گا اور برے انجام سے بچائے گا۔ استخارہ رات یا دن کی جس گھڑی میں بھی آپ چاہیں کر سکتے ہیں، سوائے اوقات مکروہہ کے۔

استخارہ رات کو کرنا ضروری نہیں نہ کسی اور سے کرانا سنت کے خلاف ہے " باب التطوع مشکوۃ" میں ہے، استخارہ کا معنی ہے اللہ سے خیر طلب کرنا کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کل کو خبر معلوم ہو گی۔

نماز تسبیح:

سیدنا عبد اللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے سیدنا عباس بن عبد المطلبؓ سے فرمایا:

اے چچا جان عباس! کیا میں آپ کو کچھ عطا نہ کروں؟ کیا آپ کو کچھ عنایت نہ کروں؟ کیا میں آپ کو کوئی تحفہ پیش نہ کروں؟ کیا میں آپ کو درج ذیل کی وجہ سے دس اچھی خصلتوں والا بنا دوں؟ کہ جب آپ یہ عمل کریں تو اللہ ذوالجلال آپ کے اگلے پچھلے، نئے پرانے، انجانے میں ں اور جان بوجھ کر کئے گئے، تمام چھوٹے بڑے، پوشیدہ اور ظاہر گناہ معاف فرما دے۔ وہ دس خصلتیں یہ ہیں: آپ چار رکعات نفل اس طرح ادا کریں کہ ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ اور کوئی دوسری سورت پڑھیں۔ جب آپ اس قراء ت سے فارغ ہو جائیں تو قیام ہی کی حالت میں یہ کلمات پندرہ بار پڑھیں: سبحان اللہ، والحمد للہ، ولا الہ الا اللہ، واللہ اکبر پھر آپ رکوع میں جائیں تسبیحات

---

[1] صحیح البخاری، التہجد، باب ما جاء التطوع مثنی مثنی، حدیث: 1162، 6382۔

رکوع سے فارغ ہو کر رکوع میں انہی کلمات کو دس بار دہرائیں۔ پھر آپ رکوع سے اٹھ جائیں اور سمع اللہ لمن حمدہ وغیرہ سے فارغ ہو کر دس بار یہی کلمات پڑھیں۔ پھر سجدے میں جائیں اور سجدے کی تسبیحات اور دعائیں پڑھنے کے بعد یہی کلمات دس بار پڑھیں۔ پھر سجدے سے سر اٹھائیں اور اس جلسے میں جو دعائیں ہیں وہ پڑھ کر دس بار یہی کلمات دہرائیں، پھر دوسرے سجدے میں چلے جائیں۔ پہلے سجدے کی طرح دس بار پھر یہی تسبیح ادا کریں۔ پھر سجدے سے سر اٹھائیں۔اور جلسہ استراحت میں کچھ اور پڑھے بغیر دس بار اس تسبیح کو دہرائیں۔یوں ایک رکعت میں کل پچھتر ۷۵ تسبیحات ہو جائیں گی۔اسی طرح چاروں رکعات میں یہ عمل دہرائیں۔

اگر آپ طاقت رکھتے ہوں تو نماز تسبیح روزانہ ایک بار پڑھیں،اگر آپ ایسا نہ کر سکتے ہوں تو ہر جمعے میں ایک بار پڑھیں[1] ۔یہ بھی نہ کر سکتے ہوں تو ہر مہینے میں ایک بار پڑھیں۔یہ بھی نہ کر سکیں تو ہر سال میں ایک بار،اگر آپ سال میں بھی ایک بار ایسا نہ کر سکتے ہوں تو زندگی میں ایک بار ضرور پڑھیں[2] اور جماعت سے پڑھنا بدعت ہے۔

---

[1] اہل دنیا کو سات دنوں کو مدت معلوم ہے۔مسلمانوں کے ہاں جمعے سے،یہودیوں کے ہاں ہفتے سے اور عیسائیوں کے ہاں اتوار کے دن سے اس مدت کا آغاز ہوتا ہے۔جس طرح ہفتہ ایک خاص دن کا نام ہے اور اس سات دنوں کی مدت کو بھی ہفتہ کہتے ہیں،اسی طرح جمعہ بھی ایک خاص دن کا نام ہے اور اس سات دنوں کی مدت کو بھی جمعہ کہتے ہیں۔عربی میں اس مدت کو اسبوع بھی کہتے ہیں۔اس تفصیل کو سامنے رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ حدیث کا منشا یہ نہیں ہے کہ نماز تسبیح ہر جمعے کے دن پڑھو بلکہ مقصد یہ ہے کہ پورے سات دنوں کی مدت میں کسی وقت بھی پڑھ لو،چنانچہ صرف جمعے کا دن نماز تسبیح کے لئے خاص کرنا صحیح نہیں بلکہ بدعت ہے۔

[2] سنن ابی داؤد ،التطوع ،باب صلاۃ التسبیح ،حدیث:1297،وسندہ حسن،وسنن ابن ماجہ ،اقامۃ الصلوات ،باب ماجاء فی صلاۃ التسبیح ،حدیث:1386۔امام ابن خزیمہ نے حدیث:1216میں ،امام حاکم نے المستدرک 318/1میں اور امام ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے۔یاد رہے کہ اس حدیث شریف میں نماز تسبیح باجماعت ادا کرنے کا ذکر نہیں ہے،صرف انفرادی عمل کے طور پر نبی اکرم ﷺ نے اپنے چچا جان کو اس کی ترغیب دی ہے،لہٰذا جو مسلمان نماز تسبیح ادا کرنا چاہے،اسے چاہئے کہ پہلے نماز تسبیح کا

حافظ ابن حجرؒ الخصال المکفرۃ اور امالی الاذکار میں) فرماتے ہیں کہ یہ حدیث کثرت طرق کی بنا پر حسن درجے کی ہے، شیخ البانی فرماتے ہیں کہ امام حاکم اور حافظ ذہبی نے اس حدیث کی تقویت کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہ حق ہے کیونکہ اس کے بہت سے طرق ہیں۔ علامہ مبارکپوری نے مرعاۃ : حدیث : ۱۳۳۹ کی شرح میں اور شیخ احمد شاکر نے بھی اسے حسن کہا ہے۔ جبکہ خطیب بغدادی، امام نووی (نے تہذیب الاسماء واللغات میں) اور ابن صلاح نے اسے صحیح کہا ہے۔

نوٹ : نماز تسبیح میں تسبیحات، تشہد میں التحیات سے پہلے پڑھیں۔بخلاف دوسرے ارکان کے ۔ نماز تسبیح کے بعد پڑھی جانے والی دعا کی سند سخت ضعیف ہے۔اس کے راوی عبد القدوس بن حبیب کو حافظ ہیثمی نے متروک اور عبد اللہ بن مبارک نے کذاب کہا ہے۔

احکام الجنائز

بیمار پرسی :

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مسلمان کے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں: ۱۔جب ملے تو اسے سلام کہے یا اس کے سلام کا جواب دے۔

۲۔جب بیمار ہو تو اس کی عیادت کرے۔

۳۔جب مر جائے تو اس کا جنازہ پڑھے۔

۴۔جب دعوت دے تو اسے قبول کرے۔

طریقہ سیکھے، پھر اسے تنہائی میں اکیلا پڑھے۔اور یہ رویہ بھی انتہائی مہلک ہے کہ بندہ فرض نمازوں پر تو توجہ نہ دے مگر نماز تسبیح (باجماعت) ادا کرنے کے لئے ہمہ وقت بے تاب رہے، لہذا فرض نمازوں کے تارک کو پہلے سچی توبہ کرنی چاہئے اور فرض نمازوں کی مکمل حفاظت کرنی چاہئے، پھر وہ نماز تسبیح پڑھے تو اسے یقیناً فائدہ ہوگا۔ انشاءاللہ

۵۔ اگر چھینک پر الحمد للہ کہے، تو جواب میں یرحمک اللہ کہے[1]۔

سیدنا علیؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو مسلمان دوسرے مسلمان کی دن کے اول حصے میں دوپہر سے پہلے عیادت کرتا ہے تو ستر ہزار فرشتے اس کے لئے شام تک رحمت و مغفرت کی دعا کرتے ہیں اور جو مسلمان دن کے آخری حصے میں دوپہر کے بعد عیادت کرتا ہے تو ستر ہزار فرشتے اس کے لئے صبح تک رحمت اور مغفرت کی دعا کرتے ہیں، نیز اس کے لئے بہشت میں باغ ہے[2][3]۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: مسلمان جب اپنے مسلمان بھائی کی تیمارداری کے لئے جاتا ہے تو وہ واپس لوٹنے تک جنت کے میوے چنتا ہے[4]۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ جس شخص کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے، اسے بیماری میں مبتلا کر دیتا ہے[5]۔

آپ نے فرمایا: مسلمان کو جو رنج، دکھ، فکر اور غم پہنچتا ہے یہاں تک کہ اگر اسے کانٹا بھی لگتا ہے تو وہ تکلیف اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے[6]۔

---

[1] صحیح البخاری، الجنائز، باب الامر باتباع الجنائز، حدیث: 1240، وصحیح مسلم، السلام، باب من حق المسلم للمسلم رد السلام، حدیث: 2162

[2] سنن ابو داؤد، الجنائز، باب فی فضل العیادة علی وضوء، حدیث: 3098، وھو حدیث حسن، جامع الترمذی، الجنائز، باب ما جاء فی عیادة المریض، حدیث: 969 امام ترمذی نے اسے حسن جبکہ امام ابن حبان نے الموارد، حدیث: ۷۱۰ (وسندہ حسن) میں، حاکم نے: 341،342/1 میں اور حافظ ذہبی نے صحیح کہا ہے۔

[3] تبصرہ: حافظ زبیر علی زئی صاحب {تسہیل الوصول ص: 347} پر اسی روایت کو ضعیف کہتے ہیں اب نماز نبوی میں یہ حدیث صحیح کیسے بنی؟۔

[4] صحیح مسلم، البر و الصلہ، باب فضل عیادة المریض، حدیث: 2568

[5] صحیح البخاری، المرضی، باب ما جاء فی کفارة المرض، حدیث: 5645

[6] صحیح البخاری، المرضی، باب ما جاء فی کفارة المرض، حدیث: 5640-5645، وصحیح مسلم، البر و الصلة، باب ثواب المؤمن فیما یصیبہ من مرض او حزن ---، حدیث: 2572

مزید فرمایا: جب کسی مسلمان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کے گناہ اس طرح مٹاتا ہے جس طرح پت جھڑ میں درخت کے پتے جھڑتے ہیں[1] ۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: بخار ہو جائے تو اس کو برا نہ کہو کیونکہ بخار آدمی کے گناہ اس طرح دور کرتا ہے جس طرح بھٹی لوہے سے میل کو دور کرتی ہے[2] ۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ مسافر اور مریض کو ان اعمال کے برابر اجر دیتا ہے جو وہ گھر میں تندرستی کی حالت میں کیا کرتا تھا[3] ۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب میں کسی بندے کو اس کی دو محبوب چیزوں آنکھوں میں آزماتا ہوں اور اسے بینائی سے محروم کرتا ہوں پھر اگر وہ صبر کرے تو اس کے بدلے میں اسے جنت دوں گا[4] ۔

رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک کالی عورت آئی اور عرض کی کہ مجھے مرگی کا دورہ پڑتا ہے اور میرا ستر کھل جاتا ہے، آپ میرے لئے اللہ سے دعا کریں۔ آپ نے فرمایا: اگر تو صبر کرے گی تو تیرے لئے جنت ہے اور اگر چاہے تو دعا کئے دیتا ہوں کہ اللہ تجھے صحت سے نوازے۔ وہ کہنے لگی کہ میں صبر کروں گی۔ پھر کہنے لگی کہ میرا ستر کھل جاتا ہے، اللہ سے دعا کریں کہ وہ نہ کھلے تا کہ میں بے پردہ نہ ہوؤں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کے لئے دعا فرمائی[5] ۔

---

[1] صحیح البخاری ،المرض ،باب شدۃ المرض ،حدیث: 5647،وصحیح مسلم ،البر والصلۃ ،باب ثواب المؤمن فیما یصیبہ من مرض او حزن ۔۔۔،حدیث: 2571

[2] صحیح مسلم ،البر والصلۃ ،باب ثواب المؤمن فیما یصیبہ من مرض او حزن ۔۔۔،حدیث: 2575

[3] صحیح البخاری ،الجہاد والسیر ،باب یکتب للمسافر مثل ما کان یعمل فی الاقامۃ حدیث: 2996

[4] صحیح البخاری ،المرض ، باب فضل من ذھب بصرہ ،حدیث: 5653

[5] صحیح البخاری ،المرض ، باب فضل من یصرع من الریح ،حدیث: 5652،صحیح مسلم ،البر والصلۃ ،باب ثواب المؤمن فیما یصیبہ من مرض او حزن ۔۔۔،حدیث: 2576

عیادت کی دعائیں:

جب مریض کی عیادت کے لئے جائیں تو رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی مندرجہ ذیل دعائیں اس کے حق میں کریں۔

پہلی دعا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی تیمارداری کے لئے جاتا ہے اور اس کے سر کے پاس بیٹھ کر سات مرتبہ یہ کلمات پڑھتا ہے تو وہ شفایاب ہو جاتا ہے الا یہ کہ اس کی موت کا وقت ہی آ چکا ہو۔

أسأل الله العظيم رب العرش العظيم ان يشفيك

میں ! بزرگ و برتر اللہ، عرش عظیم کے رب سے سوال کرتا ہوں کہ تجھے شفا سے نوازے۔[1]

دوسری دعا: رسول اللہ ﷺ ایک اعرابی کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے اور اس سے یہ کلمات کہے: لا بأس طهور ان شاء الله

کوئی حرج نہیں غم نہ کر اگر اللہ نے چاہا تو یہی بیماری تجھے گناہوں سے پاک کرنے والی ہے[2] ۔

تیسری دعا: سیدہ امی عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ مریض کے جسم پر اپنا دایاں ہاتھ پھیرتے اور یہ دعا پڑھتے تھے:

أذهب البأس رب الناس واشف انت الشافي لا شفاء الا شفاءك شفاء لا يغادر سقما

اے انسانوں کے رب ! بیماری کو دور کر اور شفا دے۔ تو ہی شفا دینے والا ہے۔ تیری شفا کے سوا کوئی شفا نہیں، ایسی شفا دے جو کسی بیماری کو نہیں چھوڑتی[3] ۔

---

1 سنن ابی داؤد، الجنائز، باب الدعاء للمريض عند العيادة، حديث: 3106، وهو حديث صحيح، امام ابن حبان نے الموارد، حدیث: 714 میں، امام حاکم نے المستدرک: 1/ 342،4/ 416 میں اور امام نووی نے المجموع: 5/ 110 میں اسے صحیح کہا ہے۔

2 صحیح البخاری، المرض، باب عيادة الاعراب، حديث: 5656

3 بخاری باب دعاء العائد للمريض حديث 5675'5743'5750

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب کسی مسلمان کو تکلیف مصیبت یا نقصان پہنچے تو وہ یہ کہے:

انا للہ وانا الیہ راجعون اللھم اجرنی فی مصیبتی واخلف لی خیرا منھا

ہم سب اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔اے اللہ! مجھے میری مصیبت میں اجر اور نعم البدل عطا فرما۔تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں اس سے اچھی چیز عنایت فرمادیتا ہے[1]۔

چوتھی دعا: معوذات کا دم: سیدہ امی عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ بیمار ہوتے تو اپنے آپ پر معوذات قرآن کی آخری تین سورتوں سے دم کرتے اور اپنے جسم پر اپنا ہاتھ پھیرتے۔جب آپ کی تکلیف بڑھ گئی تو سیدہ عائشہؓ معوذات پڑھ کر رسول اللہ ﷺ پر بیماری کی حالت میں دم کرتی تھیں اور حصول برکت کے لئے آپ کے ہاتھوں میں پھونک کر ان کو آپ کے جسم مبارک پر پھیرتی تھیں[2]۔

پانچویں دعا؛ سیدنا عثمان بن ابو العاصؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے جسم کے درد کی شکایت کی۔آپ نے فرمایا: اپنا ہاتھ درد کی جگہ پر رکھ، پھر بسم اللہ کہو اور سات دفعہ یہ کلمات پڑھو: اعوذ بعزۃ اللہ وقدرتہ من شر ما اجد واحاذر

میں اللہ کے ساتھ اور اس کی قدرت کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں اس چیز کی برائی سے جو میں پاتا محسوس کرتا ہوں اور جس سے ڈرتا ہوں۔

سیدنا عثمانؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اسی طرح کیا تو اللہ تعالیٰ نے میری تکلیف دور کر دی[3]۔

چھٹی دعا: رسول اللہ ﷺ سیدنا حسن اور سیدنا حسینؓ کو ان الفاظ کے ساتھ دم کیا کرتے تھے:

اعیذ کما بکلمات اللہ التامات من کل شیطان وھامۃ ومن کل عین لامۃ

---

[1] مسلم باب مایقال عندالمصیبۃ حدیث 918

[2] صحیح البخاری ،الطب ، باب مسح الراقی الوجع بیدہ الیمنی،حدیث:5750،وصحیح مسلم ،السلام ،باب استحباب رقیۃ المریض،حدیث: 2191

[3] صحیح مسلم ،السلام ، باب استحباب وضع یدہ علی موضع الالم مع الدعاء ، حدیث: 2202

میں تم دونوں کو اللہ کے تمام کامل کلمات کے ساتھ اس کی پناہ میں دیتا ہوں ہر شیطان اور زہریلے جانور کی برائی سے اور ہر نظر بد سے۔

پھر فرمایا: تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام بھی ان کلمات کے ساتھ اسماعیل اور اسحاق علیہ السلام کے لئے اللہ کی پناہ طلب کیا کرتے تھے اور انہیں دم کرتے تھے[1]۔

ساتویں دعا: جبریل امین علیہ السلام کا دم: سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جبریل علیہ السلام نے آ کر کہا: اے محمد! کیا آپ بیمار ہیں۔ آپ نے فرمایا: ہاں تو جبریل علیہ السلام نے یہ پڑھا اور آپ پر دم کیا: بسم الله ارقيك من كل شيء يوذيك ،من شر كل نفس او عين حاسد . الله يشفيك بسم الله ارقيك

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کا نام لے کر میں آپ پر دم کرتا ہوں ہر اس چیز سے جو آپ کو تکلیف دے، ہر نفس اور ہر حاسد کی آنکھ کے شر سے، اللہ تعالیٰ آپ کو شفا دے۔ میں اللہ کا نام لے کر آپ پر دم کرتا ہوں[2]۔

تجہیز و تکفین

عالم نزع میں تلقین:

---

[1] صحيح البخاری ،أحاديث الانبياء ،باب :١٠،حديث: 3371،وسنن ابی داؤد ،السنة ،باب فی القرآن ،حديث: 4737،وجامع الترمذی ،الطب ،باب كيف يعوذ الصبيان ؟حديث: 2060 وللفظ لهما

[2] صحيح مسلم،السلام ،باب الطب والمرض والرقی ،حديث: 2186۔ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ۱۔اپنے آپ پر خود دم کرنا۔ ۲۔جو دم کروانے آئے اسے دم سکھانا کہ وہ خود ہی اپنے آپ پر دم کرے۔ ۳۔مریض کے مطالبے کے بغیر اسے دم کرنا۔ ۴۔یا مریض کا کسی سے دم کروانا سب جائز ہے، لیکن افسوس کہ مسلمان صرف آخری جائز (دم کروانا) پر ہی عمل کرتے ہیں۔اپنے آپ کو دم کرنے کی سنت تقریباً مفقود ہو چکی ہے کیونکہ اس میں ایک آدھ دعا یاد کرنی پڑتی ہے۔ یاد رکھئے! براہ راست اللہ تعالیٰ سے مانگنا انتہائی سعادت کی بات ہے، یہ عین عبادت ہے اور مریض کی دعا تو ویسے بھی بہت قبول ہوتی ہے، لہٰذا اسے چاہئے کہ نہ صرف خود دم کرے بلکہ استغفار کو معمول بنائے، اس سے تکلیف سے جلد نجات ملے گی اور درجات بڑھیں گے، نیز خوب دعائیں کرے اللہ قبول کرے گا۔ ان شاء اللہ۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ان لوگوں کو جو مرنے کے قریب ہوں لا الہ الا اللہ کی تلقین کرو[1]۔

آپ ﷺ نے فرمایا: جس کا آخری کلام لا الہ الا اللہ ہوا، وہ جنت میں داخل ہوگا[2]۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم بیمار یا میت کے پاس جاؤ تو بھلائی کی بات کہو کیونکہ اس وقت تم جو کچھ کہتے ہو فرشتے اس پر آمین کہتے ہیں[3]۔

مرنے والے کے پاس سورۃ یٰس پڑھنے والی روایت سنن ابی داؤد حدیث: ۳۱۲۱ کو علامہ نووی نے ضعیف کہا ہے اور امام دارقطنیؒ نے کہا کہ اس بارے میں نبی اکرم ﷺ سے کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں ہے[4]۔

موت کی آرزو کرنا:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: موت کی آرزو نہ کرو۔ اگر تم نیک ہو تو شاید زیادہ نیکی کرسکو اور اگر بد ہو تو، توبہ کرکے اللہ کو راضی کرسکو[1]۔

صحیح مسلم ، الجنائز ، باب تلقین الموتی: لا الہ الا اللہ ، حدیث: 916، 917 یعنی ان کے قریب لا الہ الا اللہ پڑھو تاکہ اسے سن کر وہ بھی پڑھیں۔ لیکن افسوس کہ آج کے جہلاء زندہ اور قریب المرگ کو تو اس کی تلقین نہیں کرتے، البتہ موت کے بعد چارپائی کو کندھا دیتے وقت کہتے جاتے ہیں۔ کلمہ شہادت حالانکہ خیر القرون کے مسلمانوں میں سے کسی نے بھی یہ کام نہیں کیا، پھر یہ آج ہمارے دین کا حصہ کیسے بن سکتا ہے؟ جبکہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ تین جگہوں پر آواز کو ناپسند اور خاموشی کو پسند فرماتے جنازہ، تلاوت اور قتال کے وقت اور فتاوی عالمگیریہ میں ہے کہ جنازے کے پیچھے چلنے والوں پر لازم ہے کہ خاموشی اختیار کریں اگر ذکر کرنا چاہے تو دل میں ذکر کریں (عالمگیری، مسائل شتی)

[2] سنن ابی داؤد ، الجنائز ، باب فی التلقین ، حدیث: 3116 وسندہ حسن ، امام حاکم نے المستدرک: ۱/۳۵۱، ۵۰۰ میں اور ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے۔ کیونکہ اس نے آثار موت دیکھ کر نہیں بلکہ اللہ سے ڈر کر لا الہ الا اللہ پڑھا لیکن چند ہی لمحوں بعد اللہ کی قضا آ گئی اور لا الہ الا اللہ اس کی زندگی کا آخری کلام بن گیا۔ اللہ تعالیٰ سب کو اس کی توفیق دے۔ آمین۔

[3] صحیح مسلم ، الجنائز ، باب ما یقال عند المریض او المیت ، حدیث: 919

[4] التلخیص الحبیر: 104/2

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: موت کی آمد سے پہلے اس کی آرزو نہ کرو نہ موت کی دعا کرو کیونکہ جب کوئی شخص مر جاتا ہے تو اس کی نیکی کرنے کی امید ختم ہو جاتی ہے اور مومن کی لمبی عمر اسے نیکیوں ہی میں آگے بڑھاتی ہے[2] ۔

سیدنا ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرا کندھا پکڑ کر فرمایا: دنیا میں اس طرح رہ گویا کہ تو مسافر بلکہ راہگیر ہے۔ اور سیدنا ابن عمرؓ فرمایا کرتے تھے۔ جب شام ہو تو صبح کا انتظار نہ کر۔ جب صبح ہو شام کا انتظار نہ کر۔ تندرستی اور زندگی کو موت سے پہلے غنیمت جان[3] ۔

خودکشی سخت گناہ ہے:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنے آپ کا گلا گھونٹ کر مارتا ہے، وہ جہنم میں اپنا گلا گھونٹتا رہے گا اور جو شخص نیزہ مار کر اپنی جان دیتا ہے، وہ جہنم میں اپنے آپ کو نیزہ مارتا رہے گا[4] ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے ہی شخص کے متعلق فرمایا: میرے بندے نے اپنی جان خود لی، اس لئے میں نے اس پر جنت حرام کر دی[5] ۔

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

خودکشی:

---

[1] صحیح البخاری، التمنی، باب ما یکرہ من التمنی، حدیث: 7235

[2] صحیح مسلم، الذکر والدعاء، باب کراهة تمنی الموت لضر نزل بہ، حدیث: 2682

[3] صحیح البخاری، الرقاق، باب قول النبی ﷺ کن فی الدنیا کانک غریب۔۔۔، حدیث: 6416

[4] صحیح البخاری، الجنائز، باب ما جاء فی قاتل النفس، حدیث: 1365

[5] صحیح البخاری، الجنائز، باب ما جاء فی قاتل النفس، حدیث: 1364 و صحیح مسلم، الجنائز، باب ترک الصلاة علی القاتل نفسہ، حدیث: 978، صحیح مسلم کی اس روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ نہیں پڑھی، لہٰذا معزز اہل علم اس کی نماز جنازہ میں شریک نہ ہوں تاکہ باقی لوگوں کو عبرت حاصل ہو۔

خود کشی گناہ کبیرہ ہے اللہ تعالی ہر انسان کو محفوظ فرمائے، لیکن عوام میں یہ غلط بات مشہور ہے کہ نہ ایسے آدمی کی بخشش ہے اور نہ اس کا جنازہ ہوتا ہے، اور نہ اس کے لئے دعا کرنا جائز ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ اگر ایسا آدمی شرک اور کفر سے پاک ہے تو اس کی مغفرت ہوگی عام لوگ اس کا جنازہ پڑھیں خاص نیک لوگ اس کا جنازہ نہیں پڑھیں۔

میت کو بوسہ دینا:

جس کو کوئی قریبی دوست یا عزیز فوت ہو جائے تو اس کا میت کو فرط محبت سے بوسہ دینا جائز ہے کیونکہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے رسول اللہ ﷺ کی وفات پر آپ کو بوسہ دیا تھا[1] ۔

میت کا غسل:

سیدہ ام عطیہؓ بیان کرتی ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی بیٹی کو نہلا رہے تھے تو آپ نے فرمایا: اسے تین، پانچ یا سات بار پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دو اور آخری بار پانی میں کچھ کافور بھی ملا لو۔ایک روایت میں ہے: غسل دائیں طرف اعضائے وضو سے شروع کرو۔ سیدہ ام عطیہؓ کہتی ہیں کہ ہم نے غسل کے بعد اس کے بالوں کی تین چوٹیاں گوندھیں اور انہیں پیچھے ڈال دیا[2] ۔

---

[1] صحیح البخاری ،الجنائز ،باب الدخول علی المیت بعد الموت اذا ادرج فی اکفانہ ، حدیث: 1241،1242

[2] صحیح البخاری ، الجنائز ،باب یجعل الکافور فی الاخیرہ ،حدیث: 1255۔1259 ،وصحیح مسلم ،الجنائز ،باب فی غسل المیت ،حدیث: 939۔اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت کو عورتیں ہی غسل دیں گی ،یاد رہے کہ غسل میت کا طریقہ درج ذیل ہے اور غسل کے دوران میں اکرام میت کا بہت خیال رکھنا چاہئے تفصیل یہ ہے:

وفات کے فوراً بعد میت کا منہ اور آنکھیں بند ہو جائیں، بازو، ٹانگیں اور ہاتھ پاؤں کی انگلیاں بھی سیدھی کر لی جائیں، نیز قمیص اور بنیان وغیرہ اتار کر چادر سے میت کا بدن ڈھانپ دیا جائے۔ پانی اور بیری کے پتے ابال لئے جائیں، پھر نیم گرم پانی ہی استعمال کیا جائے، نیز پانی کم از کم استعمال کیا جائے۔ لکڑی کا ایک تختہ ایسی جگہ رکھا جائے جہاں پانی کا نکاس اور گندگی کو ٹھکانے لگانا آسان ہو

میت کا کفن:

رسول اللہ ﷺ کو سفید رنگ کے تین سوتی کپڑوں میں کفن دیا گیا۔ان میں کرتہ تھا نہ عمامہ [1] ۔

میت کا سوگ:

سیدہ زینب بنت جحشؓ کا بھائی فوت ہو گیا۔تین دن بعد انھوں نے خوشبو منگوائی اور اسے ملا اور کہا: مجھے خوشبو کی ضرورت نہیں تھی مگر میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا جو عورت اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان رکھتی ہو ، اس کے لئے حلال نہیں کہ تین دن سے زیادہ کسی میت پر سوگ کرے ، سوائے شوہر کے جس کا سوگ چار ماہ دس دن ہے [2] ۔

،میت کو اس تختے پر لٹایا جائے۔ناف سے گھٹنوں تک کی جگہ کپڑے سے ڈھانپ دی جائے اور دوران غسل میت کی شرمگاہ پر نظر پڑے نہ کپڑے کے بغیر اسے ہاتھ لگے۔اگر جسم زخمی ہو اور اس پر پٹیاں بندھی ہوئی ہوں تو احتیاط سے پٹیاں کھول کر روئی اور نیم گرم پانی سے آہستہ آہستہ زخم دھوئے جائیں۔ہر کام کی ابتدا دائیں طرف سے کریں الا یہ کہ صرف بائیں جانب توجہ کی مستحق ہو۔ناف کی طرف ہاتھ سے میت کا پیٹ دو یا تین دفعہ دبایا جائے (تاکہ اندر کی ہوئی گندگی امکانی حد تک خارج ہو جائے) پھر بائیں ہاتھ پر کپڑے کا دستانہ وغیرہ (جو کفن کے ساتھ بنایا جاتا ہے) پہن کر پہلے مٹی کے تین ڈھیلوں، پھر پانی سے اس کا استنجاء کریں ۔ اگر زیر ناف بالوں کی صفائی باقی ہو کر لی جائے۔ ناک ،دانت، منہ کا خلال اور کانوں میں اچھی طرح گیلی روئی پھیر کر ان کی الگ سے صفائی کر لی جائے تاکہ بعد میں وضو کے دوران تین دفعہ سے زیادہ نہ دھونا پڑے۔بسم اللہ پڑھ کر میت کو مسنون وضو کرایا جائے۔(سر کا مسح اور پاؤں رہنے دیں) تین دفعہ اچھی طرح سر دھوئیں حسب ضرورت صابن استعمال کرتے ہوئے پورا جسم تین، پانچ یا سات مرتبہ اچھی طرح دھوئیں۔آخری دفعہ نہلاتے وقت پانی میں کچھ کافور ملا لیں۔سب سے آخر میں پاؤں دھوئیں۔

[1] صحیح البخاری، الجنائز، باب الثیاب البیض للکفن، حدیث: 1264

[2] صحیح البخاری ،الجنائز ،باب احداد المرأة علی غیر زوجها، حدیث: 1286

سیدہ ام عطیہؓ کا لڑکا فوت ہو گیا۔ تیسرے دن انہوں نے زردی منگوا کر بدن پر ملی اور کہا: ہمارے لئے شوہر کے علاوہ کسی اور کی وفات پر تین دن سے زیادہ سوگ کرنا ممنوع ہے [1] ۔

میت پر رونا:

اگر میت کو دیکھ کر رونا آئے اور آنسو جاری ہوں تو منع نہیں۔ اس لئے کہ یہ بے اختیار رونا جائز ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ آنکھوں کے رونے اور دل کے پریشان ہونے کی وجہ سے عذاب نہیں دیتا بلکہ زبان کے چلانے اور واویلا کرنے کی وجہ سے عذاب دیتا ہے [2] ۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ کے ہاں وہ صبر معتبر ہے جو صدمے کے شروع میں ہو [3] ۔

یعنی واویلا اور بین کرنے کے بعد صبر کرنا، صبر نہیں ہے۔ اصل صبر یہ ہے کہ مصیبت کے شروع ہی میں تسلیم و رضا کا مظاہرہ کیا جائے اور اظہار غم کے فطری طریقے کے علاوہ اور کچھ نہ کیا جائے۔

سیدنا عبد اللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ ہم میں سے نہیں ہے جو رخسار پیٹے، گریبان پھاڑے اور جاہلیت کی پکار پکارے نوحہ اور واویلا کرے [4] ۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: میں بیزار ہوں اس سے جو موت کی مصیبت میں سر کے بال نوچے، چلا کر روئے اور اپنے کپڑے پھاڑے [5] ۔

---

[1] حوالہ سابقہ حدیث 313'1278

[2] صحیح البخاری ،الجنائز ،باب البکاء عند المریض ،حدیث: 1304،وصحیح مسلم ،الجنائز ،باب البکاء علی المیت ،حدیث: 924۔ یعنی نوحہ، ماتم اور بین کرنا ممنوع اور باعث عذاب ہے۔

[3] صحیح البخاری ،الجنائز ،باب الصبر عند الصدمة الاولیٰ ،حدیث: 1302،وصحیح مسلم ،الجنائز ،باب فی الصبر علی المصیبة عند الصدمة الاولیٰ ،حدیث: 926

[4] صحیح البخاری ،الجنائز ،باب لیس منا من شق الجیوب ،حدیث: 1294،وصحیح مسلم ،الایمان ،باب تحریم ضرب الخدود و شق الجیوب ۔۔۔،حدیث: 103

[5] صحیح البخاری ،الجنائز ،باب ما ینھی من الحلق عند المصیبة ،حدیث: 1296،صحیح مسلم ،الایمان ،باب تحریم ضرب الخدود و شق الجیوب ۔۔۔،حدیث: 104

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہیکہ میرے اس مومن بندے کے لئے بہشت کے سوا کوئی بدلہ نہیں جس کے پیارے کو میں اہل دنیا سے قبض کرتا ہوں اردر وہ اس کی موت پر صبر کرتے ہوئے ثواب کی امید رکھتا ہے[1] ۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جاہلیت کے چار کام ایسے ہیں جنہیں میری امت کے لوگ نہیں چھوڑیں گے۔

۱۔اپنے حسب میں فخر کرنا ۲۔ کسی کے نسب میں طعن کرنا۔ ۳۔ ستاروں کے ذریعے پانی طلب کرنا۔ ۴۔نوحہ کرنا

اور یہ بھی فرمایا: اگر نوحہ کرنے والی عورت مرنے سے پہلے توبہ نہ کرے تو قیامت کے دن اس پر گندھک کی قمیص اور خارش کا کرتا ہوگا[2] ۔

رسول اللہ ﷺ کے بیٹے ابراہیم جب حالت نزع میں تھے تو آپ نے انہیں اٹھایا اور فرمایا: آنکھ آنسو بہا رہی ہے اور دل غمگین ہے مگر اس کے باوجود ہم کچھ نہیں کہیں گے، سوائے اس بات کے جس سے ہمارا رب راضی ہو اور اے ابراہیم! ہم تیری جدائی کے سبب غمگین ہیں[3] ۔

---

[1] صحیح البخاری ، الرقاق، باب العمل الذی یبتغی بہ وجہ اللہ ۔۔۔، حدیث: 6424

[2] صحیح مسلم ، الجنائز ، باب فی التشدید فی النیاحۃ، حدیث: 934،اہل جاہلیت کا عقیدہ تھا کہ ستاروں کی نقل و حرکت اور طلوع وغروب کا بارش اور دیگر زمینی واقعات وحوادث کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔آج کل علم نجوم بھی انہی شرکیہ خرافات سے عبارت ہے۔اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔آمین۔

[3] صحیح البخاری ،الجنائز ، باب قول النبی ﷺ :انا بک لمحزونون ،حدیث: 1303، وصحیح مسلم ، الفضائل ، باب رحمتہ ﷺ الصبیان والعیال ۔۔۔، حدیث: 2315۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ محبوب کی محبت میں آکر اپنے فیصلے نہیں بدلتا بلکہ جو چاہتا ہے، وہ کسی کی طاقت سے مرعوب ہوتا ہے نہ کسی کی محبت سے مغلوب۔

رسول اللہ ﷺ کا نواسہ فوت ہوا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ سیدنا سعد بن عبادہؓ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! یہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ وہ رحمت ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں پیدا کی ہے اور اللہ اپنے بندوں میں سے رحمت کرنے والوں ہی پر رحمت کرتا ہے[1]۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جس عورت کے تین بچے مر جائیں تو وہ اس کے لئے جہنم کی آگ سے آڑ بنیں گے۔ ایک عورت نے پوچھا کہ اگر دو بچے مر جائیں تو؟ آپ نے فرمایا: دو بچے بھی۔ سیدنا ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ اس سے مراد وہ بچے ہیں جو ابھی بالغ نہ ہوئے ہوں[2]۔

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ان بچپنے میں فوت ہونے والے بچوں پر اپنی رحمت اور فضل کے سبب ان کے مسلمان والدین کو جنت میں داخل کرے گا[3]۔

تعزیت کے مسنون الفاظ:

آپ نے اپنے نواسے کے متعلق جو حالت نزع میں تھے، اپنی بیٹی کو یہ کلمات تعزیت بھیجے:

ان للہ ما اخذ ولہ ما اعطی، وکل شیء عندہ باجل مسمی

یقینا اللہ کا مال ہے جو اس نے لے لیا اور اسی کا ہے جو اس نے دے رکھا ہے، اس کے ہاں ہر چیز کا وقت مقرر ہے۔ پھر آپ نے پیغام لے جانے والے سے کہا کہ اسے حکم دینا کہ صبر کر اس کے اجر و ثواب کی امید رکھے[4]۔

معلوم ہوا کہ اس دعا کے بعد لواحقین کو صبر کرنے اور ثواب کی امید رکھنے کی تلقین بھی کرنی چاہئے۔

---

[1] صحیح البخاری ،الجنائز ،باب قول النبی ﷺ :یعذب المیت ببعض بکاء اھلہ علیہ ۔۔۔،حدیث:1284، وصحیح مسلم ،الجنائز ،باب البکاء علی المیت ،حدیث:923

[2] صحیح البخاری ،الجنائز ،باب فضل من مات لہ ولد فاحتسب ، حدیث:1249،1250،وصحیح مسلم ، البر والصلۃ ،باب فضل من یموت لہ ولد،فیحتسبہ،حدیث:2633،2634

[3] صحیح البخاری ،الجنائز ،باب فضل من مات لہ ولد فاحتسب ، حدیث:1248

[4] بخاري باب قول النبي صلي الله عليه وسلم يعذب الميت ببكاء اهله عليه اذا كان النوح من سنته حديث 1284

نماز جنازہ:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس مسلمان کے جنازے میں ایسے چالیس آدمی شامل ہوں جو اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہراتے ہوں تو اللہ تعالیٰ اس میت کے حق میں ان کی سفارش قبول کرتا ہے[1]۔

نماز جنازہ پڑھنے کے لئے میت کی چارپائی اس طرح رکھیں کہ میت کا سر شمال کی سمت قبلے کی دائیں جانب اور پاؤں جنوب کی جانب ہوں، پھر باوضو ہو کر صفیں باندھیں۔ میت اگر مرد ہے تو امام اس کے سر کے سامنے کھڑے ہو اور اگر عورت ہے تو اس کے درمیان کھڑا ہو[2]۔

پھر دل میں نیت کر کے دونوں کندھوں یا کانوں تک اٹھائیں اور پہلی تکبیر کہہ کر سورۃ فاتحہ پڑھیں۔

﴿ اہل سنت عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

جنازے میں سورۃ فاتحہ:

سیدنا ابو امامہ بن سہلؓ سے روایت ہے کہ نماز جنازہ میں سنت طریقہ یہ ہے کہ پہلے تکبیر کہی جائے، پھر فاتحہ پڑھی جائے، پھر نبی اکرم ﷺ پر درود اور میت کے لئے دعا کی جائے اس کے بعد سلام پھیرا جائے[3]۔

طلحہ بن عبد اللہ بن عوفؒ کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا ابن عباسؓ کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی تو آپ نے سورۃ فاتحہ پڑھی اور فرمایا: میں نے یہ اس لئے کیا ہے تاکہ تم جان لو کہ یہ سنت ہے[4]۔[5]

---

[1] صحیح مسلم، الجنائز، باب من صلی علیہ اربعون شفعوا فیہ، حدیث: ۹۴۸

[2] جامع الترمذی، الجنائز، باب ما جاء أین یقوم الامام من الرجل والمرأۃ؟ حدیث: 1034، وسنن ابی داؤد، الجنائز، باب أین یقوم الامام من المیت اذا صلی علیہ؟ حدیث: 3194، وسندہ حسن، امام ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔

[3] المصنف لعبد الرزاق، الجنائز، باب القراءۃ والدعاء فی الصلاۃ علی المیت: 3/489، 490، حدیث: 6428۔ حافظ ابن حجر نے التلخیص الحبیر: 2/122 میں اسے صحیح کہا ہے۔

[4] صحیح البخاری، الجنائز، باب قراءۃ فاتحۃ الکتاب علی الجنازۃ، حدیث: 1335۔

[5] تبصرہ: آپ صحابہ ؓ کے اقوال وافعال کو دلیل تسلیم ہی نہیں کرتے تو اس سے استدلال کیسے؟۔ جبکہ یہ آپ کے اصول کے خلاف ہے۔

طلحہ بن عبداللہؒ کی ایک روایت میں فاتحہ کے بعد کوئی دوسری سورت پڑھنے کا بھی ذکر ہے[1] ۔
معلوم ہوا کہ تکبیر اولیٰ کے بعد سورۃ فاتحہ کا پڑھنا سنت ہے۔سورۃ فاتحہ اور کوئی دوسری سورت پڑھ کر امام کو دوسری تکبیر کہنی چاہئے اور پھر نماز والا درود شریف پڑھیں۔اس کے بعد تیسری تکبیر کہہ کر ان دعاؤں میں سے کوئی دعا پڑھیں:

اللھم اغفر لحینا ومیتنا وشاھدنا وغائبنا وصغیرنا وکبیرنا وذکرنا وانثانا ۔ اللھم من احییتہ منا فاحیہ علی الاسلام ومن توفیتہ منا فتوفہ علی الایمان ۔ اللھم لاتحرمنا اجرہ ولا تضلنا بعدہ

اے اللہ ! ہمارے زندہ اور مردے کو، چھوٹے اور بڑے کو، مرد اور عورت کو، حاضر اور غائب کو بخش دے۔اے اللہ ! ہم میں سے جسے تو زندہ رکھے ،اسے اسلام پر زندہ رکھ اور ہم میں سے جسے تو فوت کرے ،اسے ایمان پر فوت کر۔اے اللہ ! ہمیں اس میت کے اجر سے محروم نہ رکھ اور اس کے بعد ہمیں کسی گمراہی آزمائش میں نہ ڈال[2] ۔[3]

دوسری دعا:

اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ ووسع مدخلہ واغسلہ بالماء والثلج والبرد ونقہ من الخطایا کما نقیت الثوب الابیض من الدنس وابدلہ دارا خیرا من دارہ اھلا خیرا من اھلہ وزوجا خیرا من زوجہ وادخلہ الجنۃ واعذہ من عذاب القبر وعذاب النار

---

[1] سنن النسائی ،الجنائز باب الدعاء ،حدیث:1389 ،وسندہ صحیح

[2] سنن ابن ماجہ ،الجنائز ،باب ما جاء فی الدعاء فی الصلاۃ علی الجنازۃ ، حدیث:1498 ،وسنن ابی داؤد ، الجنائز ،باب الدعاء للمیت ،حدیث: 3201 ،وسندہ حسن ،امام ابن حبان نے الموارد ،حدیث: 757 میں اسے صحیح کہا ہے۔یحیٰ بن ابی کثیر نے سماع کی تصریح کر دی ہے۔والحمد للہ

[3] **تبصرہ:** اس روایت کی سند میں محمد بن اسحاق راوی ہے عن سے روایت کر رہے ہیں اور یہ راوی علی زئی صاحب کے نزدیک مدلس ہے {جزء قرات ص: 49 تسہیل الوصول ص: 377 } ۔اور ابن ماجہ کی سند میں ایک راوی ۔یحیٰ بن ابی کثیر مدلس عن سے روایت کر رہے ہیں اس کو بھی علی زئی صاحب {جزء قرات ص: 121 } پر مدلس کہا ہے۔لہٰذا یہ روایت دونوں سندوں کے اعتبار سے آپ کے اصول کے مطابق ضعیف ٹھہری۔

الٰہی! اسے معاف فرما، اس پر رحم فرما، اسے عافیت میں رکھ، اس سے در گزر فرما، اس کی بہترین مہمانی فرما، اس کی قبر فراخ فرما، اس کے گناہ پانی، برف اور اولوں سے دھو ڈال، اسے گناہوں سے اس طرح صاف کر دے جیسے تو نے سفید کپڑے کو میل سے صاف کیا ہے۔ اسے اس کے دنیا والے گھر سے بہتر گھر، دنیا کے لوگوں سے بہتر گھر والے اور اس کی بیوی سے بہتر جوڑا عطا فرما، اسے بہشت میں داخل فرما اور فتنہ قبر عذاب قبر اور عذاب جہنم سے بچا[1] ۔

تیسری دعا:

اللھم ان فلان بن فلان فی ذمتک وحبل جوارک فقہ من فتنۃ القبر وعذاب النار وانت اھل الوفاء والحق فاغفر لہ وارحمہ . انک انت الغفور الرحیم

الٰہی! یہ فلاں بن فلاں تیرے ذمے اور تیری رحمت کے سائے مین ہے۔ اسے فتنہ قبر اور آگ کے عذاب سے بچا، تو اپنے وعدے وفا کرنے والا اور حق والا ہے۔ الٰہی! اسے معاف کر دے اور اس پر رحم فرما، بلاشبہ تو بخشنے اور رحم کرنے والا ہے[2] ۔

﴿ غیر مقلد احباب عنوان ذیل کی تحت فرماتے ہیں: ﴾

جنازے کے مسائل:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو مومن ثواب کی نیت سے کسی مسلمان کے جنازہ کے ساتھ جاتا ہے اور جنازہ ہونے اور تدفین سے فارغ ہونے تک ساتھ رہتا ہے تو اس کے لئے دو قیراط ثواب ہے۔ ہر قیراط احد پہاڑ کے برابر ہے اور جو صرف جنازہ پڑھ کر واپس آ جاتا ہے تو اس کے لئے ایک قیراط ہے[1] ۔[2]

---

[1] صحیح مسلم ،الجنائز ،باب الدعاء للمیت فی الصلاۃ ،حدیث: 963

[2] سنن ابن ماجہ،الجنائز ،باب ما جاء فی الدعاء فی الصلاۃ علی الجنازۃ ،حدیث: 1499،وسنن ابی داؤد ،الجنائز ،باب الدعاء للمیت ،حدیث: 3202،وھو حدیث صحیح ، امام ابن حبان نے الموارد، حدیث: 758 میں اسے صحیح کہا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میت کو جلد دفن کرو۔ اگر وہ نیک ہے تو جس طرف تم اسے بھیج رہے ہو، وہ اس کے لئے فائدہ مند ہے اور اگر وہ برا ہے تو وہ بوجھ ہے جسے تم اپنی گردنوں سے اتار دو گے[3]۔

سنت یہ ہے کہ نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ اور دعائیں آہستہ پڑھی جائیں[4]۔

سیدنا عبداللہ بن عباسؓ نے جنازے میں تعلیما فاتحہ بلند آواز سے پڑھی[5]۔

لہٰذا جنازے میں امام تعلیما اونچی آواز سے قراءت کر سکتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جب تم جنازہ دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ اور جو شخص جنازے کے ساتھ جائے اس وقت تک نہ بیٹھے جب تک جنازہ نہ رکھا جائے[6]۔

نبی اکرم ﷺ نے شہداء کو خون سمیت دفنانے کا حکم دیا، ان پر نماز جنازہ پڑھی نہ انہیں غسل دیا[7]۔

---

[1] صحیح البخاری، الایمان، باب اتباع الجنائز من الایمان، حدیث: 47، 1325، وصحیح مسلم، الجنائز، باب فضل الصلاۃ علی الجنازۃ واتباعھا، حدیث: 945

[2] تبصرہ: یہ حدیث ہمارے نہیں غیر مقلدین کے احباب کے اصول کے مطابق ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں ابن شہاب زہری اور عن سے روایت کر رہے ہیں اس پر علی زئی کا تبصرہ خود سنئے "زہری مدلس ہیں یہ سند ان کی عنعنہ کی وجہ سے ضعیف ہے {جزء قرات ص: 43}۔

[3] صحیح البخاری، الجنائز، باب السرعۃ بالجنازۃ، حدیث: 1315، وصحیح مسلم، الجنائز، باب الاسراع بالجنازۃ، حدیث: 944

[4] سنن النسائی، الجنائز، باب الدعاء، حدیث: 1991، وھو حدیث صحیح، حافظ ابن حجر نے فتح الباری: 204/3 میں اسے صحیح کہا ہے۔

[5] سنن النسائی، الجنائز، باب الدعاء، حدیث: 1990، وسندہ صحیح، امام حاکم نے المستدرک: 358/1، 386 میں اور حافظ ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے،

[6] صحیح البخاری، الجنائز، باب من تبع جنازۃ فلا یقعد حتی توضع۔۔۔، حدیث: 1310۔ بعض علماء کے نزدیک یہ حکم استحباب کے طور پر ہے جبکہ بعض دوسرے اسے منسوخ قرار دیتے ہیں

[7] صحیح البخاری، الجنائز، باب الصلاۃ علی الشھید، حدیث: 1343، 1347

سیدنا ابوہریرہؓ نے نماز جنازہ کی چار تکبیریں روایت کیں [1] ۔

سیدنا زید ابن ارقمؓ نماز جنازہ پر چار تکبیرات کہتے ایک جنازے پر انہوں نے پانچ تکبیرات کہیں اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ اس طرح بھی کرتے تھے [2] ۔

رسول اللہ ﷺ نے سہیل اور ان کے بھائیؓ کی نماز جنازہ مسجد میں پڑھائی [3] ۔

سیدنا فاروق اعظمؓ کی نماز جنازہ صہیبؓ نے مسجد میں پڑھائی [4] ۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: چار مسلمان جس مسلمان کی تعریف کریں اور اچھی شہادت دیں، اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا۔ ہم نے عرض کیا اور تین؟ آپ نے فرمایا: تین بھی۔ ہم نے عرض کیا: اور دو؟ آپ نے فرمایا: دو بھی۔ پھر ایک کے متعلق ہم نے سوال نہ کیا [5] ۔

قبر پر نماز جنازہ:

سیدنا ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ سیاہ رنگ کی ایک خاتون مسجد نبوی میں جھاڑو دیا کرتی تھی۔ وہ نظر نہ آئی تو آپ ﷺ نے اس کے بارے میں پوچھا۔ صحابہؓ نے بتایا کہ وہ فوت ہو گئی ہے۔ آپ نے فرمایا: تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟ مجھے اس کی قبر بتاؤ۔ صحابہ نے آپ کو اس کی قبر بتائی۔ پھر آپ

---

[1] صحیح البخاری ، الجنائز ،باب التکبیر علی الجنازۃ اربعا،حدیث:1333،وصحیح مسلم ،الجنائز،باب التکبیر علی الجنازۃ ،حدیث:951

[2] صحیح مسلم ،الجنائز ،باب الصلاۃ علی القبر ،حدیث:957

[3] صحیح مسلم،الجنائز ،باب الصلاۃ علی الجنازۃ فی المسجد ،حدیث:973

[4] السنن الکبری للبیہقی ،52/4،وسندہ صحیح ،الجنائز ،باب الصلاۃ علی الجنازۃ فی المسجد

[5] صحیح البخاری ،الجنائز ،باب ثناء الناس علی المیت ،حدیث:1368، 2643

نے قبر پر نماز جنازہ پڑھی اور فرمایا: یہ قبریں تاریکی اور ظلمت سے بھری ہوتی ہیں۔ میری نماز کے سبب اللہ تعالیٰ انکو روشن کر دیتا ہے[1]۔

نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کا مسئلہ:

نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کے سلسلہ میں سب سے مضبوط دلیل بخاری شریف میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا اپنا عمل ہے۔ بخاری شریف میں ہیں:

حضرت طلحہ بن عبد اللہ بن عوف فرماتے ہیں کہ میں ایک جنازہ کی نماز حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے پڑھی تو آپ نے سورۃ فاتحہ پڑھی پھر فرمایا کہ میں نے سورۃ فاتحہ اس لئے پڑھی ہے کہ تم جان لو کہ یہ سنت ہے، لطف یہ ہے کہ یہی روایت سنن نسائی میں بھی ہے مگر وہاں اس کے الفاظ یہ ہے: "حضرت طلحہ بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے ایک جنازے کی نماز پڑھی تو آپ نے سورۃ فاتحہ پڑھی اور ایک سورۃ بھی اور بلند آواز سے

---

[1] صحیح البخاری ،الجنائز ،باب الصلاۃ علی القبر بعد ما یدفن ،حدیث:1337 ،وصحیح مسلم ،الجنائز ،باب الصلاۃ علی القبر ،حدیث:956۔اس سے معلوم ہوا کہ مسجد کی صفائی کرنے کی بڑی فضیلت ہے۔نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عالم الغیب نہیں تھے۔

قبروں کے پاس تلاوت:

مولانا وحید الزمان اپنی کتاب" نزل الابرار" میں فرماتے ہیں: "اس میں کوئی حرج نہیں کہ آدمی کسی قبر کے پاس سورۃ یسین، یا سورۃ اخلاص یا سورۃ ملک پڑھ کر اس کا ثواب اس قبر کے مردے کو بخش دے۔" (نزل الابرار، ج: 1/ص: 179)

اور ایک جگہ لکھتے ہیں: "علما کا اس میں اختلاف ہے کہ غسل کے لئے لیجانے سے پہلے مردے کے پاس قرآن شریف کی تلاوت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ ظاہر یہ ہے کہ جائز ہے، قبروں کے پاس تلاوت کا بھی یہی حکم ہے۔" (الیضاح: 1/ص: 181)

اور نواب صدیق حسن خان بھوپالی، موفق الدین ابن قدامہ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں: "ابن جوزی کے پوتے نے آپ کی ایک کرامت ذکر کی ہے، انہوں نے کہا کہ میں نے ایک مرتبہ دل میں کہا کہ میری استطاعت ہوتی تو میں موفق الدین کے لئے ایک مدرسہ بناتا اور ہر دن انہیں ہزار درہم دیتا، کہا کہ کچھ دنوں بعد میں ان کے پاس آیا اور سلام کیا تو آپ میری طرف دیکھ کر مسکرا دیئے، پھر فرمانے لگے جب آدمی کوئی نیت کر لیتا ہے تو نیت کا ثواب اس کے لئے لکھ دیا جاتا ہے۔" (التاج المکلل، ص: 230)

پڑھی یہاں تک ہم کو سنایا پھر جب آپ نماز پڑھا چکے تو میں نے ان کے ہاتھ کو پکڑا اور پھر اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ سنت اور حق ہے"۔

نسائی شریف میں یہی روایت ان الفاظ میں ہیں: "حضرت طلحہ بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے ایک جنازے کی نماز پڑھی تو میں نے سنا کہ وہ سورہ فاتحہ پڑھ رہے ہیں جب آپ نے سلام پھیرا تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا کہ آپ جنازہ میں قرات کرتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا کہ یہ حق اور سنت ہے"۔

نسائی شریف میں حضرت ابوامامہ کی بھی اس سلسلہ کی ایک روایت ہے جس میں یہ الفاظ ہیں:

حضرت ابوامامہ فرماتے ہے کہ جنازہ کی نماز میں سنت یہ ہے کہ پہلی تکبیر میں سورۃ فاتحہ آہستہ آواز سے پڑھی جائے پھر تین تکبیریں کہی جائیں اور خر میں سلام پھیرا جائے۔ترمذی شریف میں اسی سلسلہ کی حضور اکرم ﷺ کی طرف منسوب ایک روایت ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کہ حضور ﷺ نے جنازہ سورۃ فاتحہ پڑھی۔

مگر یہ راویت نا قابل اعتبار ہے خود امام ترمذی نے اس کا فیصلہ فرمادیا ہے فرماتے ہیں: "حدیث ابن عباس حدیث لیس اسنادہ بذالک القوی"

یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث قوی نہیں ہے۔

اور کیوں قوی نہیں ہے؟ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں ایک راوی ابراہی بن عثمان ہے وہ منکر حدیث ہے حافظ ابن حجر اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ متروک الحدیث ہے کہ اس کے حدیث کو لوگوں نے چھوڑ دیا ہے[1]۔

ابن ماجہ میں حضرت ام شریک سے حدیث ان کے الفاظ سے مروی ہے:

حضرت ام شریک رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ ہم جنازہ پر سورۃ فاتحہ پڑھیں۔

---

[1] تحفۃ الاحوذی ج: 2/ص: 142

لیکن یہ روایت بھی قوی نہیں مولانا مبارکپوری تحفۃ الاحوذی میں حافظ حجر سے نقل کر کے فرماتے ہیں فی اسنادہ ضعف یسیر یعنی اس کی سند میں کچھ ضعف ہے۔

یہ دو روایتیں جن کی بنیاد پر بعض احباب نے نماز جنازہ میں بطور تلاوت سورۃ فاتحہ پڑھنے کو واجب، فرض قرار دیا ہے یہ جمہور اہل اسلام کا مؤقف نہیں ہے قبل اس کے کہ ہم بخاری، نسائی او ر دیگر روایتوں پر تحقیقی نظر ڈالیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہ بتلا دیں کہ حضور اکرم ﷺ کی طرف منسوب اس بارے میں جو روایتیں ہیں سب کی سب ضعیف اور نا قابل اعتبار ہیں سنیئے اس بارے میں غیر مقلد احباب کے تسلیم شدہ شخصیت حافظ ابن قیم اور حافظ ابن تیمیہ کے شاگرد کا فیصلہ ابن قیم زاد المعاد میں فرماتے ہیں:

حضور اکرم ﷺ سے نقل کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا تھا (جن روایتوں میں یہ ہے) ان کی سند صحیح نہیں ہے، ابن قیم کا یہ بیان سو فی صد صحیح ہے کوئی شخص صحیح سند یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا تھا اس سلسلہ میں جو کچھ صحیح طور پر ثابت ہے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابو امامہ کا اپنا عمل اور قول ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ان دو کے علاوہ کسی اور سے صحیح سند سے یہ ثابت نہیں ہے کہ نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کو اس نے حضور اکرم ﷺ کی سنت بتلایا ہو حضور ﷺ کے بعد اس امت میں خلفائے راشدین کا جو مقام ہے اس سے کون ناواقف ہے مگر کسی ایک بھی خلیفہ راشد سے یہ ثابت نہیں ہے کہ اس نے نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھا ہو یا اس کو حضور اکرم ﷺ کی سنت بتلایا ہو بلکہ جیسا کہ آئندہ چل کر معلوم ہوگا کہ بعض خلفائے راشدین سے بطور صراحت ثابت ہے کہ وہ نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ نہیں پڑھا کرتے تھے۔

پورے ذخیرہ احادیث میں صرف حضرت ابن عباس اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہما ہی سے صحیح سند سے یہ مروی ہے کہ سورہ فاتحہ پڑھنا سنت ہے اس لئے ہم اپنی گفتگو کا مرکز انہیں دونوں

صحابہ کے دونوں حدیثوں کو بناتے ہیں اور ان حضرات کی حدیث سے فی الاصل کیا ثابت ہوتا ہے وہاں تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔

بخاری شریف میں امام بخاری نے حضرت عبد اللہ بن عوف سے جو کچھ نقل کیا ہے اسے آپ ایک بار اور پڑھ لیں اس حدیث کے الفاظ یہ ہے:

صليت خلف ابن عباس رضي الله عنهما على جنازة فقرأ بفاتحة الكتاب.

حضرت عبد اللہ بن عوف فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی تو آپ نے سورۃ فاتحہ پڑھی اور فرمایا کہ تاکہ تم لوگ جان لو کہ یہ سنت ہے۔

حضرت امام بخاری رحمہ اللہ ایسے جلیل القدر محدث ہیں کہ ان کے بارے میں زیادہ لب کشائی کرنے کی میں اپنے اندر جرات نہیں پاتا، تاہم اس حقیقت کا اظہار صورت واقعہ کو بیان کرنے اور اظہار حق اور مسئلہ کے شرعی حیثیت کو واضح کرنے کے لئے ضرور و ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کبھی حدیث کا ایسے اختصار کرتے ہیں کہ حدیث کا مفہوم کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے اور مسئلہ کی اصل حقیقت واضح نہیں ہو پاتی حدیث کا مفہوم کچھ ہوتا ہے اور امام بخاری کے اختصار سے اس کا مفہوم بالکل دوسرا ہو جاتا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کے حدیث میں اختصار کی ایک بہت ہی عجیب وغریب مثال مزید ملاحظہ فرمائیں: مسلم شریف میں حضرت زید بن ثابت ﷺ حضرت عطا کی روایت سے قرات خلف الامام کے سلسلہ کی یہ حدیث ہے: حضرت عطا فرماتے ہیں کہ میں حضرت زید بن ثابت ﷺ سے امام کے ساتھ مقتدی کا قرات کے کرنے کے بارے میں پوچھا تو حضرت زید نے کہا امام کے ساتھ کچھ پڑھنا نہیں ہے اور حضرت زید نے یہ بھی کہا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ پر سورۃ والنجم کی تلاوت کی تو اس میں انہوں نے سجدہ نہیں کیا۔ حضرت کی روایت اس بات میں صریح تھی کہ مقتدی کو امام کے پیچھے قرات کرنا صحیح نہیں ہے، چونکہ یہ بات امام بخاری کی مذہب کی خلاف تھی اس وجہ سے جب انہوں نے اس حدیث کو مسلم ہی والی سند سے اپنی کتاب بخاری میں ذکر کیا تو انہوں نے قرات خلف الامام

والی بات کو حدیث میں ذکر ہی نہیں کیا امام بخاری نے اس حدیث کو سجدہ تلاوت کے بیان میں ذکر کیا ہے اور ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے:

عن عطاء بن یسار انہ اخبرہ انہ سأل زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فزعم انہ قرأ علی النبی ﷺ والنجم فلم یسجد فیہا.

دیکھئے امام بخاری نے حضرت عطاء نے حضرت زید بن ثابت سے جس مسئلہ قرات خلف الامام کے بارے میں سوال کیا تھا اس کو بالکل حذف کر دیا اور جو بات حضرت عطا نے پوچھی نہیں تھی اس کو ذکر کیا امام بخاری کی حدیث پوری ذکر نہ فرمائی تو حدیث کی عبارت بھی کیا بن گئی دیکھ لو مسلم میں جو پوری روایت ہے اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں اور امام بخاری نے حدیث کی جو عبارت ذکر کی ہے اس کا ترجمہ ملاحظہ فرما کر آپ خود اندازہ لگالیں کہ حدیث کا کیا یہی مفہوم تھا ترجمہ یہ ہے " ابن قسیط عطا بن یسار سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عطا نے ان کو بتلایا کہ انہوں نے زید بن ثابت سے پوچھا تھا امام کے پیچھے قرات نہیں تو اس کا جو جواب تھا وہ امام بخاری نے نقل نہیں فرمائی امام مسلم نے نقل فرمایا زید بن ثابت نے کہا کہ انہوں نے حضور ﷺ پر سورۃ والنجم کی تلاوت کی تھی تو آپ نے سجدہ نہیں فرمایا تھا۔

حضرت عطا نے جس بات کے متعلق پوچھا تھا اس کو امام بخاری نے حذف کر کے حدیث کا مفہوم ہی کچھ سے کچھ ہو گیا۔

حافظ ابن حجر جو امام بخاری کے بڑے مداح ہیں وہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے حضرت زید بن ثابت کے اس حصہ کو جس سے ان کو غرض نہیں تھی حذف کر دیا اور اس وجہ سے بھی حذف کر دیا کہ امام بخاری حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے قرات خلف الامام کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں[1]۔
یہ ساری بات علامہ ابن حجر کی ہے کوئی راقم پر غصہ نہ فرمائے۔

---

[1] فتح الباری ج: 2/ص: 555

امام بخاری رحمہ اللہ نے جو حدیث ذکر کی ہے وہی حدیث نسائی میں پوری مذکور ہے مضمون کے شروع میں تیسری حدیث دیکھئے حضرت طلحہ بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے ایک جنازے کی نماز پڑھی تو میں نے سنا کہ وہ سورہ فاتحہ پڑھ رہے ہیں جب آپ نے سلام پھیرا تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا کہ آپ جنازہ میں قرات کرتے ہیں ؟ تو انہوں نے فرمایا کہ ہاں یہ حق اور سنت ہے۔

آپ غور فرمائیں کہ اس پوری اور مکمل حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس کا جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنا ایک اجنبی اور غیر معروف عمل تھا جنازہ میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا تمام صحابہ کرامؓ کا معمول نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ طلحہ بن عبد اللہ کو حضرت ابن عباس کا یہ عمل باعث تعجب معلوم ہوا اور ان کو اس بار میں سوال کرنا پڑا اگر صحابہ کرامؓ میں یہ سنت رائج ہوتی تو حضرت طلحہ کو اس پر تعجب کیوں ہوتا اور حضرت عبد اللہ بن عباس ؓ سے سوال کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی نیز یہ معلوم ہوا کہ خود حضرت طلحہ بن عبد اللہ نے وہاں کے عام رواج کے مطابق جنازہ کی نماز میں سورہ فاتحہ نہیں پڑھی تھی اگر انہوں نے سورۃ فاتحہ کو پڑھا ہوتا تو اس بارے میں حضرت ابن عباس سے سوال کیوں کرتے اور انہیں حضرت ابن عباس کے فاتحہ پڑھنے پر تعجب کیوں ہوتا؟

الغرض حضرت طلحہ والی حدیث خود ببانگ دہل یہ بتلارہی ہے کہ صحابہ کرامؓ کے زمانے میں نمازے جنازہ میں سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی جاتی تھی، اگر حضور کرم ﷺ کا یہ کوئی دائمی عمل ہوتا اور سورۃ فاتحہ پڑھنا بطور قرات مشروع ہوتا تو ناممکن تھا ناممکن تھا کہ عمر رسیدہ اور تمام صحابہ کرامؓ سے یہ سنت پوشیدہ رہتی اور حضرت ابن عباس کو یہ بتلانے کی ضرورت ہوتی کہ یہ سنت ہے جبکہ جنازے کا معاملہ کبھی کبھار کا معاملہ نہیں ہے وہ تو عموما پیش آنے والا معاملہ ہے اور جنازے کا سنت طریقہ ہے اور کیا کیا نہیں ہر خاص وعام کو معلوم ہوتا ہے خصوصا صحابہ کرامؓ کا زمانہ ایسا نہیں تھا کہ عموما پیش آنے والا جنازے کا صحیح طریقہ بھی انہیں معلوم نہ ہو بہر حال حضرت ابن عباس کا جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنا

خود اجنبی فعل تھا اور صحابہ میں یہ فعل غیر معمول بہ اور غیر معروف تھا، اور یہی وجہ ہے کہ امام مالک و یہ کہنا پڑا کہ لیس ذلک معمول بہ انما ہو الدعاء ادرکت اہل بلادنا علی ہذا[1]

یعنی جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے پر عمل نہیں ہے۔ جنازہ میں تو صرف میت کے لئے دعا ہے میں نے اہل مدینہ کو اسی پر پایا ہے۔

غرض اگر امام بخاری کی مختصر حدیث کو نہیں بلکہ نسائی میں جس طرح یہ پوری حدیث ہے اس کو سامنے رکھا جائے تو خود اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عہدہ صحابہ میں سورۃ فاتحہ کو بطور قرات کے نماز جنازہ میں پڑھنا متعارف عمل نہیں تھا، اور نہ اس پر عام صحابہ کرامؓ کا عمل تھا اور صحابہ کرامؓ کے درمیان جو چیز غیر متعارف ہو اس کو حضور ﷺ کی سنت نہیں قرار دیا جاسکتا ورنہ صحابہ کرامؓ پر الزام عائد ہوگا کہ انہوں نے حضور ﷺ کی سنت سے لاپرواہی برتی۔ میں بار بار بتلا چکا ہوں کہ حضور ﷺ کی متعارف سنت وہی عمل ہوگا جسے عام صحابہ کرامؓ نے اپنی زندگی کا دائمی یا اکثری معمول بنایا ہو، اور وہ عمل حضور ﷺ کا دائمی یا اکثری معمول بہ رہا ہو، گاہے گاہے عمل کو سنت مستمرہ کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔

اب سوال یہ ہے کہ جب اس مسئلہ کا صورت حال یہی ہے کہ حضور ﷺ سے یا خلفائے راشدین یا عام صحابہ کرامؓ سے نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ کا بطور قرات رواج نہیں ہے تو پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ یا حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے یہ کیوں فرمایا کہ نمازہ جنازہ میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا سنت ہے؟

تو گزارش ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ یا حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے سورہ فاتحہ پڑھنے کو بطور قرات پڑھنے کو سنت نہیں فرمایا بلکہ ان حضرات کا مقصود یہ تھا کہ جس طرح نماز جنازہ میں تکبیر اولی کے بعد ثنا اپنے مخصوص متعارف الفاظ کے ساتھ پڑھی اسی طرح یہ سنت ہے کہ سورہ فاتحہ کو بھی نماز جنازہ میں بطور ثناء اور دعا پڑھا جائے، حضور اکرم ﷺ سورہ فاتحہ کا بطور ثناء ودعا پڑھنا ثابت ہے مگر چونکہ یہ

---

[1] المدونة ج: 1/ص: 174

طریقہ عام طور پر صحابہ کرامؓ کا معمول بہ نہیں تھا اس لئے حضرت ابن عباس نے ایک دفعہ نماز جنازہ میں ثناء کی جگہ سورہ فاتحہ پڑھ کر بتلادیا کہ نمازہ جنازہ کاایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اللہ کی حمد وثناء سورۃ فاتحہ سے کی جائے حضرت ابوامامہ کی حدیث کا بھی یہی مطلب ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عباس ؓ یا حضرت ابوامامہ کی حدیث میں ثناء کاالگ سے کوئی ذکر نہیں ہے، اگر سورہ فاتحہ کا نماز جنازہ میں پڑھنا بطور تلاوت ہوتا جیساکہ عام نمازوں میں ہوتا ہے تو پھر سے الگ سے ثناء پڑھنے کاذکر بھی تکبیر اولی کے بعد ہونا چاہیئے تھا، مگر کسی حدیث میں اس کاذکر نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ سورۃ فاتحہ کو حضرت ابن عباس ؓ نے ثناء کی جگہ پڑھا تھا، اور چونکہ یہ مسلمانوں کے عام معمول کے خلاف تھا اس وجہ سے حضرت طلحہ کو اس پر تعجب ہوا اور انہوں نے اس پر اعتراض کیا، حضرت ابن عباس ؓ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ یہ بھی حضور ﷺ کاایک طریقہ تھا۔

سورۃ فاتحہ کاپڑھنا نمازہ جنازہ میں بطور تلاوت نہیں تھا بلکہ ثناء کی جگہ تھا اس کی وضاحت حضرت ابوامامہ والی روایت میں ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

"حضرت امامہؓ فرماتے ہیں کہ نماز جنازہ میں سنت یہ ہے کہ پہلی تکبیر میں سورۃ فاتحہ آہستہ سے پڑھی جائے پھر تین تکبیریں کہی جائے اور آخر میں سلام پھیرا جائے۔ اس حدیث میں غور فرمائیں کہ پہلی تکبیر کے بعد صرف سورۃ فاتحہ کاذکر ہے جو ثناء کی جگہ ہے پھر جو تین تکبیریں ہیں اس میں دوسری میں درود شریف پڑھی جاتی ہے تیسری تکبیر میں میت کے لئے دعاپڑھی جاتی ہے او رچوتھی تکبیر کہنے کے بعد سلام پھیر کر نماز ختم کردی جاتی ہے"۔

حضرت ابن عباس ؓ اور حضرت ابوامامہ کی حدیث کایہی مطلب ہے، اس مطلب کو اختیار کرنے پر کسی قسم کا کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا نہ جمہور مسلمین کی مخالفت کاالزام عائد ہوتا ہے۔ تمام مسلمانوں کے نزدیک سورۃ فاتحہ کو اگر ثناء کی جگہ پڑا جائے تو جائز ہے۔ اور یقینا یہ طریقہ بھی حضور ﷺ سے ثابت ہے ورنہ حضرت ابن عباس اور حضرت ابوامامہ جیسے اجلا صحابہ اس کو حضور ﷺ کی سنت نہ بتلاتے۔ اور جو میں نے کہا کہ سورۃ فاتحہ کا پڑھنا بطور تلاوت نہیں بلکہ بطور ثناء پڑھنا بعض صحابہ

کرامؓ کا معمول تھا اس کی تائید مزید حضرت حافظ ابن عبد البر کے اس بیان سے ہوتی ہے جس کو انہوں نے اپنی مشہور کتاب الکافی میں ذکر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: نماز جنازہ میں قرآن کا پڑھنا امام مالک اور ان کے اصحاب اور اہل مدینہ کی ایک جماعت کے نزدیک نہیں ہے، اور اہل مدینہ کے بڑوں کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ تکبیر اولی کے بعد سورۃ فاتحہ پڑھا جائے گا اور دوسری تکبیر کے بعد درود شریف اور تیسری تکبیر کے بعد میت کے لئے دعا کی جائے گی۔

دیکھئے حافظ ابن عبد البر کے اس بیان سے بھی معلوم ہوا کہ اہل مدینہ سے جن لوگو کے نزدیک سورہ فاتحہ کا پڑھنا مشروع ہے اس کی جگہ ثناء کی جگہ ہے نہ کہ سورہ فاتحہ کا پڑھنا بطور قرات مسنون ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے نزدیک سورۃ فاتحہ کو بطور دعا پڑھا جائے گا وہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں: نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا مسنون ہے اس وجہ سے کہ وہ بہترین اور جامع ترین دعا ہے[1]۔

یعنی شاہ صاحب بھی بطور تلاوت نہیں بلکہ سورۃ فاتحہ کو نماز جنازہ میں بطور دعا پڑھنے کو مسنون قرار دیتے ہیں، غالبا اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز جنازہ میں کوئی متعین دعا نہیں ہے کہ اسی کو پڑھا جائے گا دوسری دعا کو نہیں پڑھا جا سکتا۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود ﷛ فرماتے ہیں: حضور ﷺ نے ہمارے لئے نمازے جنازہ میں کوئی متعین دعا اور متعین قرآن کا پڑھنا مخصوص نہیں کیا ہے، اچھی سے اچھی جو دعا ہو اس کو پڑھو۔

اس سے معلوم ہوا کہ سورۃ فاتحہ کو بطور دعا بھی پڑھا جا سکتا ہے اس لئے کہ بقول حضرت شاہ صاحب یہ بہتری اور جامع ترین دعا ہے جس کو اللہ نے اپنے بندوں کو سکھلایا ہے۔

اب تک کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ غیر مقلد بزرگوں کا یہ دعوی کرنا کہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا بطور تلاوت مسنون ہے حقائق کی روشنی میں درست نہیں ہے اور بخاری شریف اور نسائی شریف کی اس بارے میں جن راویتوں کو انہوں نے اپنا مستدل قرار دیا ہے ان کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے جو

[1] ج: 2/ص: 36

انہوں نے سمجھا ہے اور حق اور صحیح بات یہی ہے کہ نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ کو نماز جنازہ میں بطور تلاوت کے پڑھنا حضور ﷺ یا خلفائے راشدین سے یا کبار صحابہ اور جمہور مسلمین سے ثابت نہیں ہے ،ہاں سورہ فاتحہ کو ثناء کی جگہ پر بطور حمد وثنا یاقرات بطور دعا پڑھا جاسکتا ہے اس کا کوئی منکر نہیں ہے اور یہی احناف کا مسلک ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس ﷺ کی روایت پر عمل میں ایک اشکال یہ بھی ہے کہ ان کے روایات میں الگ الگ بات ہے، بخاری کی روایت میں صرف سورہ فاتحہ کا ذکر ہے کسی اور سورہ کا ذکر نہیں ہے نیز اس میں جہر کا لفظ بھی نہیں ہے، نسائی شریف کی انہیں کی روایت میں سورہ فاتحہ کے ساتھ ایک مزید سورہ کا بھی ذکر ہے اور اس میں جہر وسمعنا کا لفظ بھی ہے کہ زور سے پڑھا اور ہم کو سنایا نسائی شریف کی دوسری روایت میں صرف سورۃ فاتحہ کا ذکر ہے اس میں جہر وسمنا کا لفظ بھی نہیں ہے، یہ سب روایتیں عبد اللہ بن عوف ہی کے طریق سے ہیں، اب واللہ اعلم اس میں کونسی روایت صحیح ہے اس کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا محدثین کی اصطلاح میں اس طرح کی روایت مضطرب کہلاتی ہے جو قابل حجت واستدلال نہیں ہوتی۔

اب ہم دیکھیں گے کہ حضرت امام ابو حنیفہ اور امام مالک کا جو یہ مسلک ہے کہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا بطور تلاوت مسنون نہیں ہے تو اس کے دلائل کیا ہیں، تو یہ معلوم کر لیجئے کہ نمازہ جنازہ عام نمازوں کی طرح سے کوئی نماز نہیں ہے کہ اس میں سورۃ فاتحہ پڑھنا مسنون یا واجب ہو، حافظ ابن قیم فرماتے ہیں کہ نماز جنازہ کا مقصود میت کے لئے دعا کرنا ہے۔ فرماتے ہیں: میت پر نماز اس لئے مشروع ہوئی ہے کہ اہل ایمان کے ایک جماعت کا میت کی شفاعت کے لئے جمع ہونا اللہ کی اس پر رحمت کے نازل ہونے کا بڑا موثر ذریعہ ہے [1]۔

غرض نماز جنازہ میت کی شفاعت کی دعا اور اس کی بخشش کی دعا کے لئے ہے، جب نماز پنجگانہ کا مقصود اللہ سے مناجات اور اس کے دربار میں پانچ وقت کی حاضری اپنی عبدیت کا اظہار ہے اور یہی

---

[1] زاد المعاد ج: 2/ص: 3

وجہ ہے کہ نمازہ پنجگانہ ہر عاقل بالغ مرد اور عورت پر فرض ہے اور مردوں کے لئے نماز باجماعت مسجد میں پڑھنے کی تاکید ہے جب کہ نمازہ جنازہ سب پر پڑھنا فرض نہیں ہے، یہ نماز فرض کفایہ ہے کچھ لوگوں نے پڑھ لیا تو سب کے ذمہ سے فرض ساقط ہو جاتا ہے اور چونکہ دونوں نمازیں الگ الگ اور ان کا مقصود بھی الگ الگ ہے اس وجہ سے ان کے احکام بھی الگ الگ ہے، نماز کس طرح سے پڑھی جائے گی تو اس بارے میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ملاحظہ ہو جس کو امام مالک نے اپنی کتاب مؤطا میں ذکر کیا ہے۔

حضرت سعید اپنے والد حضرت ابو سعید سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ نمازہ جنازہ کیسے پڑھتے ہیں تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بخدا میں تم کو اس کا طریقہ بتلاؤں گا میں گھر والوں کے ساتھ جنازہ میں شریک ہوتا ہوں، جب جنازہ نماز کے لئے رکھا جاتا ہے تو میں تکبیر کہتا ہوں اور اللہ کی حمد و ثناء کرتا ہوں پھر اللہ کے رسول ﷺ پر درود پڑھتا ہوں اللھم ان عبدک وابن عبدک الخ۔

اس روایت میں جو بالکل صحیح روایت ہے اور نمازہ جنازہ کا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے طریقہ بتلایا ہے ناظرین دیکھ لیں اور اس میں کہیں سورۃ فاتحہ کا ذکر نہیں ہے۔

مؤطا ہی میں حضرت عبد اللہ بن عمر کے بارے میں ان کے شاگرد حضرت نافع فرماتے ہیں: ان عبد اللہ کان لایقرا فی الصلوۃ علی الجنازۃ.

یعنی نمازے جنازہ میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ قرآن کی تلاوت نہیں کرتے تھے۔

بدائع الصنائع میں ہیں: عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ نماز جنازہ میں قرآن سے کچھ پڑھنا نہیں ہے [1]۔

---

[1] ج: 1/ص: 212

مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ جب نماز جنازہ پڑھتے تھے تو پہلے اللہ کی حمد وثناء کرتے تھے پھر حضور ﷺ پر درود پڑھتے اور پھر یہ دعا پڑھتے اللھم اغفر لاحیائنا الخ[1]۔

مالکلیہ کی اونچی کتاب "مدونۃ الکبری" میں ہے، حضرت عمر بن خطاب، رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عبید بن قضاعہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ، حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ، حضرت قاسم، حضرت سالم بن عبد اللہ، حضرت اب مسیب، حضرت ربیعہ، حضرت عطاء، حضرت یحی بن سعید رحمہم اللہ، یہ تمام اجلا وکبار صحابہ وتابعین لم یکونو یقرون فی الصلوۃ علی المیت نماز جنازہ میں قرآن نہیں پڑھا کرتے تھے[2]۔

حضرت امام شعبی جن کی ملاقات پانچ صحابہ سے ثابت ہے ان کے بارے میں مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ وہ نماز جنازہ کے بارے میں فرماتے تھے: پہلی تکبیر میں اللہ کی حمد وثناء کی جائے گی، اوردوسری میں درود شریف، اور تیسری میں تکبیر میں میت کے لئے دعا کی جائے گی اور چوتھی تکبیر سلام کے لئے ہوگی۔

حضرت ابرہیم نخعیؒ حضرت حمادؒ، حضرت عطاءؒ، حضرت طاؤسؒ، حضرت بکر بن عبد اللہؒ، حضرت ابوالعالیہؒ، وغیرہم جلیل القدر تابعین میں سے کوئی ایک بھی نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کا قائل نہیں تھا جس کی پوری تفصیل مضنف ابن ابی شیبہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اس تفصیل سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ اور تابعین کے زمانہ میں نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ یا قرآن کا کچھ حصہ پڑھنے کا عمومی رواج نہیں تھا اور نہ قرآن کا پڑھنا حضور اکرم ﷺ کی متعارف سنت تھی ورنہ غیر ممکن تھا کہ یہ سنت حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے اجلا صحابہ او

---

[1] ص: 295

[2] ج: 1/ص: 174

ر خلفائے راشدین سے مخفی رہتی اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ جیسا سنت کا شیدائی یہ کہتا ہے کہ نماز جنازہ میں قرآن کی قرات وتلاوت نہیں ہے۔

انہیں دلائل کی روشنی اور انہیں اکابر صحابہ وکبار تابعین کی اتباع میں حضرات مالکیہ رحمہم اللہ اور حضرات احناف رحمہم اللہ کا عمل یہ ہے کہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ یا قرآن کا کوئی اور حصہ بطور ثناء یا دعا کے پڑھا جاسکتا ہے جیسا کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی روایات کا تقاضا ہے۔ البتہ زرو سے نماز میں نہ دعا پڑھنا ثابت ہے اور نہ سورہ فاتحہ یہ بعض احباب کا بالکل شاذ عمل ہے اور شیعہ حضرات بھی ایسا کرتے ہیں تمام اہل سنت نمازہ جنازہ میں جو کچھ پڑھتے ہیں آہستہ پڑھتے ہیں اور اس کا ثبوت صحیح حدیث سے ہے نماز جنازہ زور سے پڑھنا یہ تو شیعہ کا مذہب ہے حضرت عبداللہ بن عباس نے نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ جو ایک دفعہ زور سے پڑھا تھا اس کی وجہ انہوں نے خود حدیث میں بتلادی تھی کہ " تعلموا انها سنة" تاکہ تم لوگ جان لو کہ سورہ فاتحہ کا بطور حمد وثناء پڑھنا بھی نماز جنازہ کا ایک طریقہ ہے نہ یہ کہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ یا دعا یا کوئی اور چیز کا زور سے پڑھنا مسنون ہے بطور تعلیم خود حضور ﷺ بعض ان چیزوں کا جن کا سراپڑھنا مسنون ہے کبھی ان کا جسرا پڑھنا بھی ثابت ہے اب اگر ان احادیث کے پیش نظر کوئی ان کو سرا کی جگہ جسرا ہی پڑھنا شروع کردے تو حدود شرع سے تجاوز کرنے والا ہوگا۔

تدفین وزیارت:

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے تین اوقات میں نماز پڑھنے اور مردوں پر نماز جنازہ پڑھنے سے منع فرمایا: طلوع آفتاب کے وقت حتی کہ بلند ہو جائے

۲۔ جب سورج دوپہر کے وقت عین سر پر ہو حتی کہ ڈھل جائے

۳۔ غروب آفتاب کے وقت حتی کہ غروب ہو جائے[1] ۔

---

[1] صحیح مسلم ،صلاۃ المسافرین ،باب الاوقات التی نہی عن الصلاۃ فیھا،حدیث: 831

سیدنا ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نماز فجر اور نماز عصر کے بعد نماز جنازہ ادا کی جا سکتی ہے[1] ۔

قبر گہری کھودیں، اسے ہموار اور صاف رکھیں[2] ۔

میت کو قبر کے پاؤں کی طرف سے قبر میں داخل کریں[3] ۔

میت کو قبر میں رکھتے ہوئے یہ دعا پڑھیں:

بسم اللّٰہ وعلی ملة رسول اللّٰہ

اللہ کے نام سے اور رسول اللہ ﷺ کے طریقے پر اسے دفن کرتے ہیں[4] ۔[5]

سیدنا سعد ابن ابی وقاصؓ نے وصیت کی کہ میرے لئے لحد بنانا اور اس پر کچی اینٹیں لگانا جیسے رسول اللہ ﷺ کے لئے کیا گیا تھا[6] ۔

---

[1] الموطأ للامام مالک، الجنائز، باب الصلاۃ علی الجنائز بعد الصبح الی الاسفار ۔۔، حدیث: 548۔اس کی سند صحیح بلکہ اصح الاسانید ہے۔

[2] سنن ابی داؤد، الجنائز، باب فی تعمیق القبر، حدیث: 3215، وسندہ صحیح، جامع الترمذی، الجھاد، باب ما جاء فی دفن الشھداء، حدیث: 1713۔امام ترمذی نے اسے حسن صحیح کہا ہے۔

[3] صحیح سنن ابی داؤد، الجنائز، باب کیف یدخل المیت قبرہ؟ حدیث: 3211، وسندہ صحیح، امام بیہقی نے: 54/4 میں اسے صحیح کہا ہے۔

[4] سنن ابی داؤد، الجنائز، باب فی الدعاء للمیت اذا وضع فی قبرہ، حدیث: 3213، وھو حدیث صحیح، امام حاکم نے المستدرک: 366/1 میں اور امام ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے۔

[5] **تبصرہ:** اس روایت کی سند میں ایک راوی قتادہ ہے جو علی زئی صاحب اور ان کے استاد بدیع الدین مدلس ہے {جزء منظوم ص: 90، الفتح المبین ص: 58، مقالات علی زئی ج: 1 /ص: 360}۔ یاد رہے کہ علی زئی صاحب کا فرمان ہے کہ یہ بات عام طالب علموں کو بھی معلوم ہے کہ غیر صحیحین میں مدلس کی عن والی روایت ضعیف ہوتی ہے {الحدیث شمارہ: 32 /ص: 15}۔ لہٰذا ان حضرات کے مسلمہ اصول کے مطابق یہ حدیث ضعیف ہے جبکہ ان حضرات نے کتاب کے سرورق پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس کتاب میں کوئی بھی حدیث ضعیف نہیں، اگر چہ چھان بین کیا جائے تو کم و بیش 50 سے زائد روایات کی ہم نے نشاندہی کی ہے کہ سند میں مدلس عن سے ابتداء کر رہے اور یہ حضرات اس کو صحیح، صحیح بتلا رہے ہیں۔ فیا للعجب

[6] صحیح مسلم، الجنائز، باب فی اللحد و نصب اللبن علی المیت، حدیث: 966

آپ ﷺ کی قبر اونٹ کی کوہان جیسی تھی[1] ۔
پھر قبر پر مٹی ڈال کر سب لوگ میت کے لئے بخشش اور ثابت قدمی کی دعا مانگیں[2] ۔
جنازے کے بعد قبرستان سے نکل کر اجتماعی طور پر اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں، لہٰذا یہ بدعت ہے[3] ۔

قبر کے سر اور پیر کے جانب سورہ بقرہ کا پہلا اور آخری رکوع پڑھنا مستحب ہے:

میت کی قبر پر سورہ بقرہ کے پہلی رکوع اور آخری رکوع پڑھی جاتی ہے اس پر یہ اشکال کیا جاتا ہے کہ یہ کہاں سے ثابت ہے؟ اس پر جو حدیث مستدل ہے وہ یہ ہے کہ حضرت علاءؒ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے ابو ابن لجلاجؓ نے فرمایا کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو میرے قبرے پر میرے میرے سرہانے پر سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی پہلی رکوع اور آخری رکوع پڑھو یہ حدیث دو طریق سے مروی ہے ایک طریق سے مرفوع ہے جو کہ امام طبرانی نے نقل کی ہے اور دوسرے سے موقوف جس کو ابن معین، امام لالکائی، امام بیہقی اور امام ابن عساکر نے نقل کی ہے، ان دونوں احادیث کی علامہ عبد اللہ غماری نے تطبیق نقل کی ہے یہ حضرت علاء تابعی ہے اور ابن عمرؓ کا شاگرد ہے۔ اور دوسری تطبیق یہ ہے کہ حضرت لجلاجؓ نے کبھی موقوف اور کبھی مرفوع نقل کیا ہے، اس حدیث کو علامہ نووی نے اذکار میں علامہ ابن حجر نے "امالی الاذکار" میں، ابن علان نے "الفتوحات الربانیہ" میں، علامہ شوکانی نے "تحفۃ الذاکرین" میں، علامہ

---

[1] صحیح البخاری ،الجنائز ،باب ما جاء فی قبر النبی ﷺ وابی بکر وعمر رضی اللہ عنہما ،حدیث. 1390

[2] سنن ابی داؤد ،الجنائز ،باب الاستغفار عند القبر للمیت ـــ،حدیث: 3221،وسندہ حسن ،امام حاکم نے المستدرک: 1/370 میں اور حافظ ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے۔

[3] نماز جنازہ کے فوراً بعد میت کی چارپائی کے پاس جمع ہو کر اور اسی طرح تدفین کے بعد چالیس قدموں کے فاصلے پر پہنچ کر میت کے لئے دعائے مغفرت کا خصوصی اہتمام ،التزام کرنا سراسر بدعت ہے۔

صدیق حسن خان نے "نزل الابرار" میں، علامہ عبد اللہ غماری نے "الرد المحکم المتین" نامی کتاب میں، علامہ نیموی نے "آثار السنن" میں، علامہ ظفر احمد عثمانی نے "اعلاء السنن" میں، سرفراز صفدر صاحب نے "سماع موتی" میں، علامہ وہبی سلیمان غاوجی نے "ارکان اسلام" میں، علامہ ہیثمی نے "مجمع الزوائد" میں علامہ صالح شامی نے "سبل الہدیٰ" میں اور محترم جناب مبارکپوری صاحب نے "المرعات شرح مشکوۃ" میں اس کے تمام کے راویوں کو ان حضرات نے ثقہ اور اس روایت کو بعض حضرات نے حسن اور بعض نے صحیح کہا ہے، علامہ منذری نے "الترہیب والترغیب" میں فرمایا لا بأس بہ، "تحفۃ الاحوذی" میں بھی اس روایت کو حسن کہا گیا ہے۔

دوسری روایت کو ابن عمرؓ سے امام خلال، امام طبرانی اور امام بیہقی نے نقل کیا ہے شعب الایمان للبیہقی (ج:11/ص:482) اور موقوفا اور مرفوعا مروی ہے حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ اس کی سند جید ہے البتہ ہیثمی نے مجمع الزوائد میں اس کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے، اس کے سند کے دو روایوں پر جرح منقول ہے ایک یحی بن عبداللہ بابلوی اور دوسرے ایوب بن نوہیک لیکن ان کے بارے میں جرح زیادہ سخت نہیں لہٰذا روایت اگرچہ صحیح نہیں لیکن حسن کے درجہ تک پہنچ سکتی ہے اور ابن لجلاجؒ کی حدیث بھی ابن عمر کی اس روایت کے شاہد ہے، یہ دونوں روایتیں درست ہیں لہٰذا قبر پر سورہ فاتحہ اور بقرہ کے ابتدائی اور آخری آیتوں کے پڑھنے کا استحباب اس سے ثابت ہو سکتا ہے۔

قبروں کو پختہ بنانے کی ممانعت:

قبروں کو اونچا کرنا، پختہ کرنا، ان پر گنبد اور قبے بنانا حرام ہے۔

سیدنا جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے پختہ قبریں اور ان پر عمارت گنبد وغیرہ بنانے سے منع کیا، نیز آپ نے قبروں پر بیٹھنے اور ان کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے سے بھی منع فرمایا ہے چاہے کوئی شخص مجاور بن کر بیٹھے یا چلہ کشی کے لئے، سب ناجائز ہے[1]۔

[1] صحیح مسلم، الجنائز، باب النهی عن تجصیص القبر والبناء علیه، حدیث: 970، وباب النهی عن الجلوس علی القبر والصلاة علیه، حدیث: 972

رسول اللہ ﷺ نے قبروں پر کتبہ لگانے لکھنے سے بھی منع فرمایا ہے[1] ۔

سیدنا علیؓ بیان کرتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ میں ہر تصویر مٹادوں اور ہر اونچی قبر برابر کردوں[2] ۔

امہات المومنین سیدہ ام حبیبہ اور سیدہ ام سلمہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے ملک حبشہ کے ایک گرجے کا ذکر کیا کہ اس میں تصویریں لگی تھیں۔ آپ نے فرمایا: جب ان لوگوں کا کوئی نیک شخص مرجاتا تو وہ اس کی قبر پر مسجد بناتے اور وہاں تصویریں بناتے۔ قیامت کے دن یہ اللہ کے سامنے بدترین مخلوق ہوں گے[3] ۔[4]

رسول اللہ ﷺ نے آخری بیماری مرض الموت میں فرمایا: اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے جنھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عملاً مسجدیں بنالیا۔ سیدہ عائشہؓ نے فرمایا: اگر اس بات کا ڈر نہ ہوتا کہ لوگ آپ ﷺ کی قبر کو مسجد بنالیں گے تو آپ کی قبر کھلی جگہ میں ہوتی[5] ۔

قبروں کی زیارت :

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا۔ اب تم ان کی زیارت کیا کرو[1] ۔

---

[1] سنن ابی داؤد ،الجنائز ،باب فی البناء علی القبر ،حدیث:3226،وھو حدیث صحیح ،حاکم نے المستدرک: 380/1 میں اور ذہبی نے اسے صحیح کہاہے ۔

[2] صحیح مسلم ، الجنائز ،باب الامر بتسویۃ القبر ،حدیث:969

[3] صحیح مسلم ، المساجد ،باب النھی عن بناء المسجد علی القبور۔۔۔ ،حدیث:528

[4] فقہ حنفی میں غیر جاندار کی تصویر جائز ہے ،اور جاندار کی بت اور پرنٹ تصویر حرام ہے، لیکن جاندار کی ایسی تصویر جس کا ختم کرنا آپ کے اختیار میں نہ ہو تو اس کا گناہ آپ پر نہیں ہے، جیسا کہ کاپی، کتاب، بوتل، آئی ڈی کارڈ اور پاسپورٹ کی تصویر وغیرہ، اور ڈیجٹل تصویر کے بارے میں بڑے اونچے علمائے کرام کا اختلاف ہے لہٰذا اگر نامحرم کی نہیں ہو اور اسی طرح فحش تصویر نہ ہو تو جائز ہے لیکن بچنا اولی ہے۔ واللہ اعلم (راقم الحروف)

[5] صحیح البخاری ،الجنائز ،باب ما جاء فی قبر النبی ﷺ۔۔۔ ،حدیث:529

ایک روایت میں آپ ﷺ نے قبروں کی زیارت کا مقصد وفائدہ بیان فرمایا ہیکہ یہ موت یاد دلاتی ہے۔[2]

شیخ البانیؒ فرماتے ہیں: نبی اکرم ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت کی مگر اس کے بعد آپ نے اجازت دے دی تو اس میں مرد، عورت دونوں شامل ہیں۔آپ ﷺ ایک ایسی عورت پر گزرے جو قبر پر بیٹھی رو رہی تھی،آپ نے اسے اللہ سے ڈرنے اور صبر کرنے کا حکم دیا[3]۔

اگر عورتوں کا قبرستان جانا ناجائز ہوتا تو آپ سے قبرستان میں آنے سے بھی منع کر دیتے۔

سیدہ امی عائشہؓ اپنے بھائی سیدنا عبد الرحمٰنؓ کی قبر کی زیارت کے لئے گئیں،ان سے پوچھا گیا: کیا نبی اکرم ﷺ نے عورتوں کو اس سے منع نہیں کیا تھا؟ تو امی نے فرمایا: پہلے منع کیا تھا، پھر اجازت دے دی تھی[4] ۔

سیدہ امی عائشہؓ فرماتی ہیں۔ میں نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا کہ جب میں قبرستان میں جاؤں تو کون سی دعا پڑھوں۔آپ نے دعا سکھائی جو چند سطروں کے بعد ذکر کی جا رہی ہے[5] ۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ عورتوں کو قبرستان جانا جائز ہے۔

سیدنا ابوہریرہؓ سے روایت ہے: رسول اللہ ﷺ نے کثرت سے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے[1] ۔

---

[1] صحیح مسلم، الجنائز ،باب استئذان النبی ﷺ ربہ عزوجل فی زیارۃ قبر امہ ،حدیت:977

[2] صحیح مسلم، الجنائز ،باب استئذان النبی ﷺ ربہ عزوجل فی زیارۃ قبر امہ ،حدیت:(108)۔976

[3] صحیح البخاری ،الجنائز ،باب قول الرجل للمرأۃ عند القبر :اصبری ،حدیث:1252 وصحیح مسلم،الجنائز ،باب فی الصبر علی المصیبة عند الصدمة الاولیٰ ،حدیث:(15)۔926

[4] صحیح المستدرک للحاکم،الجنائز :376/1،حدیث:1392،وسندہ صحیح ،حافظ ذہبی نے اسے صحیح اور حافظ عراقی نے جید کہا ہے۔

[5] صحیح مسلم ،الجنائز ،باب ما یقال عند دخول القبور ،والدعاء لاهلها؟حدیث:(103)۔974

معلوم ہوا کہ عورتوں کے لئے بکثرت زیارت تو بہتر نہیں مگر کبھی کبھار اپنے اقرباء کی قبروں کی زیارت کیلئے جانا جائز ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مردوں کو برا نہ کہو جو اعمال انہوں نے کئے تھے وہ انہیں مل گئے[2]۔

زیارت قبور کی دعائیں:

جو شخص قبروں کی زیارت کرنے جائے وہ یہ دعا پڑھے:

السلام علی اهل الدیار من المومنین والمسلمین ویرحم الله المستقدمین منا والمستأخرین وانا ان شاء الله بکم للاحقون أسأل الله لنا ولکم العافیة

مومن اور مسلمان گھر والوں پر سلامتی ہو۔ ہم میں سے آگے جانے والوں اور پیچھے رہنے والوں پر اللہ رحم فرمائے اور اگر اللہ نے چاہا تو ہم بھی عنقریب تم سے ملنے والے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے اپنے اور تمہارے لئے عافیت کی دعا کرتا ہوں[3]۔

دفن میت کے بعد دعاء:

سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب نبی کریم ﷺ میت کی تدفین سے فارغ ہو جاتے تو وہاں کھڑے رہتے، پھر فرماتے: اپنے بھائی کے لئے دعائے استغفار کرو اور اس کے لئے (اللہ سے) ثابت قدمی کا سوال کرو، کیونکہ

---

[1] جامع الترمذی، الجنائز، باب ما جاء فی کراهیة زیارة القبور للنساء، حدیث: 1056، وسندہ حسن، امام ترمذی نے اسے حسن صحیح کہا ہے۔

[2] صحیح البخاری، الجنائز، باب ما ینهی من سب الاموات، حدیث: 1393

[3] صحیح مسلم، الجنائز، باب ما یقال عند دخول القبور والدعاء لاهلها؟ حدیث: 103 (974، 975)۔

اب اس سے سوال وجواب ہوں گے۔ (سنن ابی داؤد: 3221) لیکن انفرادی، سری، قبلہ کی طرف منہ کرکے دعا کرنی ہے۔

مولانا عبداللہ روپڑی صاحب غیر مقلد بزرگ نے مذکورہ حدیث کے بعد لکھا ہے: "اس طرح قبر پر اختیار ہے ہاتھ اٹھا کر دعا کرے یا بغیر ہاتھ اٹھائے، ہاں ہاتھ اٹھانا آداب دعا سے ہے، اس لئے اٹھانا بہتر ہے۔ (فتاویٰ اہل حدیث: 131/2)

مرحوم حافظ زبیر علی زئی صاحب غیر مقلد عالم دین نے مذکورہ بالا حدیث کو نقل کر کے " سندہ صحیح" کہا، پھر لکھا :"اس حدیث سے دو مسئلے ثابت ہیں: (1) دفن کے بعد قبر کے پاس دعا (2) اجتماعی دعا۔ (توضیح الاحکام: 125/3)

آثار صحابہ وغیرہ سے بھی قبر پہ دعا مانگنے کا ثبوت ملتا ہے، چنانچہ ابن ابی ملیکہؒ نے فرمایا: میں نے دیکھا (جب (سیدنا) عبد اللہ بن عباسؓ عبداللہ بن السائبؓ کی قبر سے فارغ ہوئے تو لوگ ان کے پاس کھڑے ہو گئے (اور) ابن عباسؓ (نے بھی) کھڑے ہو کر ان (عبداللہ السائبؓ) کے لئے دعا فرمائی۔ (السنن الکبری للبیہقی)

مرحوم علی زئی صاحب اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "اس روایت (اثر) کی سند صحیح ہے۔" (توضیح الاحکام: 126/3)

مصنف عبد الرزاق میں ہے: (محمد) بن المنکدرؒ قبر (یعنی دفن) سے فارغ ہوئے تو فرمایا: اے اللہ! اسے ثابت قدم رکھ، اس سے اب سوال وجواب ہوں گے۔ (ج: 3/ص: 509، ح: 6504)

مرحوم علی زئی صاحب نے اسے نقل کرکے لکھا: "اس کی سند صحیح ہے۔" (توضیح الاحکام: 126/3)

مصنف ابن ابی شیبہ میں عبد اللہ بن ابی بکر (بن محمد بن عمرو بن حزمؒ) سے روایت ہے کہ (سیدنا) انس بن مالکؓ قبر پر مٹی ڈالے جانے کے بعد کھڑے ہو جاتے، پھر میت کے لئے دعا کرتے تھے۔ (330/3، ح:11705)

احنف بن قیس رحمہ اللہ نے بھی قبر پر کھڑے ہو کر دعا کی۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: 331/3، ح 11710)

مرحوم علی زئی صاحب نے سندنا انس بن مالکؓ اور حضرت ابو ایوب سختیانیؒ والے آثار کی سند کو صحیح اور احنفؒ کے اثر کو حسن قرار دیا ہے۔ بلکہ انہیں نقل کرنے کے بعد لکھا: "یہ آثار اور حدیث مرفوع اس بات کی دلیل ہے کہ قبر پر دفن کے بعد اجتماعی اور انفرادی دونوں طرح سے دعاء کرنا درست ہے۔" (توضیح الاحکام: 3/ 127)

قراءت القرآن میت کے لئے:

میت کے لئے انفرادی طور پر قرآن پڑھ کے اس کا ثواب میت کو پہنچانا چاہیئے، اتفاقیہ طور پر اگر کچھ لوگ جمع ہو جائیں تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے مگر اس کو رسم ورواج نہیں بنانا چاہیئے، امام احمد اور امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے کہ میت کو قرآن پڑھنے کا ثواب پہنچتا ہے، امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

میت کے طرف سے قرآن پڑھنے کے بارے میں دو قول ہے، ایک قول یہ ہے کہ میت کو اس سے فائدہ ہوتا ہے اور یہی امام احمد اور امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے[1]۔

نیز فرماتے ہیں: اگر میت کو روزہ نماز یا قرآن کی تلاوت کا ثواب ہدیہ کرے تو یہ جائز ہے۔ (ص: 322)

آج کل دستور یہ ہو گیا ہے کہ میت کے تدفین کے تیسرے روز بطور خاص اس کے لئے لوگ جمع ہوتے ہیں، بلکہ بعض جگہ تو پیسے دے کر اور کھانے پینے کا انتظام کر کے کچھ لوگوں کو بلایا جاتا ہے جو قرآن پڑھتے ہیں اور میت کو ثواب پہنچاتے ہیں، یہ عمل سراسر بدعت، خلاف شریعت اور ناجائز ہے اس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

---

[1] فتاوی ص: 315

امام دار قطنی رحمہ اللہ نے یہ حدیث روایت کی ہے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ رمضان میں عمرہ کیا تو آپ نے تو روزہ نہیں رکھا اور میں نے روزہ رکھا، اور آپ ﷺ نے نماز قصر ادا کی اور میں نے پوری نماز پڑھی قصر ادا نہیں کی۔

اس حدیث کے بارے میں امام دار قطنی فرماتے ہیں اسنادہ حسن یعنی اس کی سند حسن ہے گویا سند کے اعتبار سے یہ حدیث محدث امام دار قطنی کے نزدیک قابل قبول ہے۔

مگر اس حدیث میں جب شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ نے غور کیا تو اس کے باطل ہونے کا فیصلہ فرمایا۔ اس لئے کہ حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ رمضان کے مہینہ میں عمرہ کیا جب کہ رمضان کے زمانہ میں آنحضرت ﷺ کا عمرہ کرنا ثابت نہیں ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اس حدیث کو متعدد وجوہ سے باطل قرار دیا۔

دوسرے وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: حدیث کے صحیح نہ ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ انہوں نے رمضان میں میں آپ ﷺ کے ساتھ رمضان کا عمرہ کیا اور وہ روزہ سے تھیں، اور یہ بات اہل علم کے متفقہ فیصلہ کے مطابق جھوٹ ہے اس لئے کہ نبی اکرم ﷺ نے رمضان میں کبھی عمرہ کیا ہی نہیں، آپ کا عمرہ شوال میں ہوا کرتا تھا، او رجب رمضان میں آپ ﷺ سے عمرہ ثابت نہیں اور عمرہ میں آپ ﷺ پر روزہ فرض ہی نہیں تھا تو یہ حدیث باطل ہے[1]۔

آپ نے غور فرمایا کہ امام دار قطنی جس حدیث کو سند کی بنیاد پر ثابت مان رہے ہیں اس حدیث کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ باطل اور جھوٹ بتلا رہے ہیں، اس لئے اہل اصول کا یہ فیصلہ ہے کہ سند کی صحیح ہونے سے حدیث کا صحیح ہونا لازم نہیں آتا، اور نہ سند کے ضعیف ہونے سے حدیث کا ضعیف ہونا ضروری ہے۔

---

[1] فتاوي ج. 22/ص: 80

شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: جو بلا علم جہالت سے گفتگو کرے یا ایسی بات کرے جو ائمہ کے اقوال کے مخالف ہو تو اس کو اس سے روکا جائے[1]۔

دیگر مسنون نفلی بابرکت نمازیں

نماز توبہ:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص گناہ کرتا ہے، پھر وضو کرکے نماز ادا کرتا ہے اور توبہ استغفار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے[2]۔

لیلۃ القدر کے نوافل:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے لیلۃ القدر میں ایمان کی حالت میں اور ثواب کی نیت سے قیام کیا، اس کے گزشتہ تمام گناہ معاف کر دئے جائیں گے[3]۔

لیلۃ القدر رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں سے کوئی ایک رات ہے۔

پندرھویں شعبان کے نوافل:

پندرھویں شعبان کی رات شب براءت کے نوافل کے لئے قیام کرنے اور جاگنے کا اہتمام کرنا اکثر احادیث سے ثابت ہے۔ اسی طرح صرف پندرہ شعبان کو روزہ رکھنے والی روایت بھی (جو سنن ابن

---

[1] فتاوی ج: 22/ص: 227

[2] جامع الترمذی، الصلاة، باب ما جاء فی الصلاة عند التوبة، حدیث: 406، وسندہ حسن، وسنن ابن ماجہ، اقامة الصلوات، باب ما جاء فی ان الصلاة کفارة، حدیث: 1395۔ امام ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔ اور یہ کسی بھی گناہ سے توبہ کرنے کی افضل ترین صورت ہے۔

[3] صحیح البخاری، الایمان، باب قیام لیلة القدر من الایمان، حدیث: 35، 2014، وصحیح مسلم، صلاة المسافرین، باب الترغیب فی قیام رمضان وھو التراویح، حدیث: 760

ماجہ حدیث : ۱۳۸۸ میں ہے) ضعیف ہے، اس لئے روزہ اس کا مسنون نہیں مستحب ہے۔ اور اس کے جتنے بھی شواہد ہیں سب کے سب آپس میں ملکر حسن لغیرہ بن جاتے ہیں، لہٰذا ان پر عمل مستحب ہے ۔

حج میں رمی، نحر اور حلق میں ترتیب واجب ہے:

صحیح مسلم میں امام مسلم نے باب باندھا ہے "باب جواز تقديم الذبح على الرمي والحلق على الذبح وعلى الرمي وتقديم الطواف عليها كلها . اس باب کی ضمن میں کئی حدیثیں لائے ہیں ہم صرف ایک حدیث پر اکتفا کریں گے اور پھر بعض حضرات یہ حدیث ذکر کرتے ہیں کہ : حضرت عبد اللہ بن عباس بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے قربانی حلق اور رمی میں تقدیم وتاخیر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کوئی حرج نہیں ہے اس حدیث سے جامعہ سلفیہ کے مفتی صاحب یہ مسئلہ مستنبط کر رہے ہیں کہ حج کے اعمال میں ترتیب نہ واجب ہے نہ مسنون اور اگر حج کے مناسک کو مقدم و مؤخر کرے تو اس پر کسی طرح کا کوئی دم نہیں۔

اس قسم کا فتوی بعض مقررین دیتے ہیں جن کی نگاہ میں یہ ایک دو حدیثیں ہوتی ہے اور افتاء کے عمل اور اس کے اہمیت سے بے خبر ہوتے ہیں مگر اللہ تعالی جس کو تفقہ کی دولت سے بہرور کرتا ہے او رجس کو شرعی مسائل میں گفتگوں کرنے کی اہمیت اور زمہ داری کا احساس ہوتا ہے وہ متعلقہ مسئلہ کے سلسلہ کے ہر گوشہ پر نگاہ ڈالتا ہے اور اس کی نگاہ صرف امام مسلم کی کتاب کی دو ایک حدیث پر نہیں ہوتی ہے بلکہ موضوع سے متعلق تمام ارشادات نبویہ اور ارشادات صحابہ ان کا عمل اور اسلاف کا فیصلہ اس کی نگاہ میں ہوتا ہے اور وہ ان تمام چیزوں میں غور کرکے جو آدمی کے لئے محتاط بات ہو سکتی ہے اور جس کو شرعی نصوص سے تقویت ملتی ہے اس کو وہ اختیار کرتا ہے۔

مؤطا امام مالک میں کعب بن عجرہ فرماتے ہیں کہ وہ حالت احرام میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ تھے ان کے سر میں جوئیں پیدا ہو گئیں جس کی وجہ وہ بہت پریشان تھے تو حضور ﷺ نے ان کو سر کے بال اتارنے کا حکم دیا اور فرمایا تین روز اس کی جگہ روزہ رکھو یا دو دو وقت کرکے چھ مسکینوں کا کھانا دو یا ایک بکری ذبح کرو ان تینوں کاموں میں سے جو بھی کروگے نسک کی ادائیگی میں تمہارے منڈوانے سے جو نقصان پیدا ہو گیا اس کی تلافی ہو جائے گی۔

امام مالک نے انہیں کی دوسری سند سے یہ حدیث بھی ذکر کی ہے میں اس کو الفاظ کے ساتھ نقل کرتا ہوں۔

حضرت کعب بن عجرہ ؓ فرماتے ہیں کہ ان سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شاید تم کو جوئیں پریشان کر رہی ہیں میں نے عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ ﷺ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنا سر منڈوالو اور اس کی جگہ تین روز روزہ رکھو یا چھ مساکین کو کھانا کھلاؤ یا ایک بکرے کی قربانی کرو۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے ان احادیث پر جو باب باندھا ہے اس کا عنوان یہ ہے: "فدية من حلق قبل ان ینحر" یعنی جس نے قربانی کرنے سے پہلے سر منڈوایا اس کا فدیہ کیا ہوگا۔

امام مسلم نے بھی حضرت کعب کی اس حدیث کو اپنی صحیح میں متعدد سندوں سے ذکر کیا ہے۔

امام مالک ان احادیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: محرم کے لئے جائز نہیں ہے کہ ارکان پورا کرنے سے پہلے اپنے بال میں سے کچھ نوچے نہ سر کا حلق جائز ہے اور نہ قصر جائز ہے الا یہ کہ اسے جوؤں وغیرہ سے پریشانی ہو تو اس صورت میں سر منڈوا سکتا ہے لیکن اس کے عوض اس پر اللہ کے حکم کے مطابق فدیہ واجب ہوگا۔

مؤطا امام مالک کے ان احادیث اور حضرت امام مالک کے اس فرمان سے معلوم ہوا کہ اگر کسی نے قصداً اور عمداً جانور ذبح کرنے سے پہلے حلق کرالیا تو اس پر دم اور فدیہ واجب ہے امام مالک نے قرآن کی جس آیت کی طرف اشارہ کیا ہے: ولا تحلقوا رؤوسكم حتى يبلغ الهدى محله فمن كان منكم مريضا او به اذى من رأسه ففدية من صيام او صدقة او نسك.

یعنی اے محرمو! اگر تم میں سے کوئی بیمار ہے یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہے تو اس کو روزہ رکھنا ہے یا صدقہ دینا ہے یا ایک بکری ذبح کرنی ہے۔

یہ آیت نص ہے کہ ارکان حج میں ترتیب واجب ہے اگر قصداً اس کے خلاف عمل ہوا تو فدیہ دینا ہوگا۔

امام طحاوی رحمہ اللہ نے حضرت مجاہد جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے مخصوص شاگرد ہیں انکی روایت سے حضرت ابن عباس یہ اثر نقل کیا ہے: "حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول یہ تھا کہ کسی نے گر اپنے حج کے کسی رکن کو مقدم یا مؤخر کیا تو اس کی جگہ اس کو ایک جانور ذبح کرنا ہوگا"۔

اگر لاحرج کا وہی مطلب ہوتا جو بعض حضرات کے ذہن میں ہے تو پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا جو خود اس لاحرج والی حدیث کے راوی ہیں اس کے خلاف قول کیوں ہوتا اور وہ اکان کی تقدیم و تاخیر کی صورت میں دم کے واجب ہونے کا فتوی کیوں دیتے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا فتوی صاف بتلا رہا ہے کہ لاحرج والی حدیثوں میں حرج کا مطلب وہ نہیں ہے جو بعض حضرات سمجھ رہے ہیں۔

احادیث میں جو لاحرج ہے اس کا تعلق ان لوگوں سے ہیں جو جہالت کی وجہ سے یا بھول کر ارکان میں تقدیم و تاخیر کرے یہ حکم عام نہیں ہے اور نہ یہ ان لوگوں کے لئے ہیں جو قصداً اور جان بوجھ کر حج کے ارکان کو مقدم و مؤخر کریں اگر جان بوجھ کر ایسا کیا گیا تو صحیح بات یہ ہے کہ جہاں دم واجب ہونے کی صورت بنے گی وہاں دم واجب ہوگا جیسا کا امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔

ابن حجر فرماتے ہیں: مجھے بہت تلاش کے بعد بھی اس قصہ میں خضور ﷺ سے پوچھنے والوں میں سے کسی کا نام نہیں معلوم ہو سکا البتہ طحاوی میں اسامہ بن شریک کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ دیہاتی تھے۔"

دیہاتی لوگوں کو عام طور پر مسئلے مسائل کا علم نہیں ہوتا اور پھر حج کے مسائل جن میں بڑے بڑے لوگ اور اچھے خاصے اہل علم پریشان رہتے ہیں ان دیہاتیوں کی گرفت سے اگر باہر ہو تو کون سے تعجب کی بات ہے جب کہ خود پوچھنے والے صاف صاف اپنی عدم واقفیت کا اظہار کر رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان احادیث پر امام بخاری نے جو باب باندھا ہے اس کا عنوان یہ ہے : "باب اذا رمی بعد ما امسی او رحلق قبل ان تذبح ناسیا او جاھلا "

یعنی یہ باب اس مسئلہ کو بیان کرنے کے لئے ہے کہ آدمی اگر مسئلہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے یہ بھول کر زوال کے بعد رمی کرے یا قربانی کرنے سے پہلے حلق کرائے تو اس کا حکم کیا ہے۔

اور پھر امام بخاری نے اس باب کے تحت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی وہی حدیث ذکر کی ہے اور انہیں الفاظ کے ساتھ ذکر کی ہے جو مسلم شریف میں ہے دیکھئے بخاری شریف کی حدیث یہ ہے :

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ عن النبي ﷺ قيل له في الذبح والحلق والرمي والتقديم والتاخير فقال لا حرج .

اس حدیث سے امام بخاری جیسا محدث تو یہ سمجھ رہا ہے کہ اس میں جو حکم ہے وہ بھول جانے والے اور مسائل سے ناواقف شخص کے بارے میں ہے یہ حکم عام اور سب کے لئے نہیں ہے۔

بہر حال بخاری و مسلم کی ان احادیث کی روشنی میں معلوم ہوا کہ ارکان میں تقدیم وتاخیر اگر بھول اور ناواقفیت کی بناء پر ہوئی تب تو دم واجب نہیں ہے لیکن اگر کسی نے قصدا اور عمدا ایسا کیا ہے تو ان احادیث کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر دم ہے چنانچہ یہی بات موفق ابن قدامہ نے المغنی میں ذکر کی ہے فرماتے ہیں : اثرم نے امام احمد سے یہ نقل کیا ہے اگر حاجی ارکان میں تقدیم وتاخیر بھول کر کر ڈالے یا ناواقفیت کی وجہ سے اس سے تقدیم وتاخیر ہو گئی ہے تب تو اس پر کچھ واجب نہیں ہوگا لیکن اگر اس نے جان بوجھ کر ارکان کو مقدم یا مؤخر کیا ہے تو اس پر اس صورت میں فدیہ ساقط نہیں ہوگا اسے دم دینا ہوگا اس لئے کہ حدیث میں لم اشعر کا جو لفظ ہے اس کا یہ تقاضا ہے اور یہی بات امام طحاوی نے معانی الآثار میں بیان کی ہے اور حدیث میں جو لا حرج کا کلمہ ہے اس کی پوری وضاحت کی ہے اور دلائل کی روشنی میں یہ بتلایا ہے کہ یہ عدم حرج والی بات سب کو عام نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق جاہل اور ناسی کے ساتھ ہے۔

امام طحاوی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ذکر کی ہے جس سے اس مسئلہ پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: اے اللہ کے بندو اللہ نے تم سے حرج او رتنگی کو ختم کردیا ہے تم لوگ ارکان حج کو سیکھو اس لئے کہ اس کا تعلق دین سے ہے۔

امام طحاوی فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے جو لاحرج فرمایا ہے اس کی وجہ اس پوچھنے والے دیہاتیوں کا جاہل ہونا اور مناسک حج سے بے خبر تھا اس لئے آپ ﷺ نے ان کو بطور خاص مناسک حج سیکھنے کا حکم فرمایا۔

اب آپ قرآن میں دیکھئے اللہ کا کیا ارشاد ہے، اللہ فرماتے ہیں: ولاتحلقوا رؤسكم حتي يبلغ الهدي محله.

اس آیت پاک میں صاف حکم موجود ہے کہ قربانی سے پہلے سر کا منڈوانا جائز نہیں ہے۔ آیت کریمہ کا ترجمہ ہے: اے حاجیوں تم اپنے سروں کو مت منڈواؤ جب تک جانور قربانی گاہ تک نہ پہنچ جائیں (اوران کی قرابانی بھی ہو جائے)۔

دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا:

واضح رہے کہ ید اسم جنس ہے ایک اور زیادہ سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جیسے لفظ انسان ہے۔

دوسری روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ہے، مولانا نے اس کا ترجمہ کیا ہے:

"انس بن مالک سے روایت ہے کہ میں نے اپنے ایک ہتھیلی سے مصافحہ کیا ہے رسول اللہ ﷺ کے ہتھیلی سے پس میں نے رسول اللہ ﷺ کے ہتھیلی سے زیادہ نرم نہ کسی خز کو اور نہ کسی ریشمی کپڑے کو مس کیا۔

حضرت ابو لبابہ کعب بن مالک اوران دونوں کے ساتھیوں نے اس وقت آنحضرت ﷺ کے ہاتھ کا بوسہ لیا جب اللہ نے ان کی توبہ کو قبول کیا[1]۔

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کا بوسہ لیا جب مدینہ تشریف لائے۔

---

[1] فتح الباري ج: 1/ ص: 56

حضرت اسامہ بن شریک کی حدیث میں ہے: قمنا الي النبي ﷺ فقبلنا يده
یعنی ہم آنحضرت کی طرف بڑھے اور ہم نے آپ کے ہاتھ کا بوسہ لیا۔ (ایضا)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق آتا ہے: انہوں نے حضرت علی کے ہاتھ اور پیر کا بوسہ لیا۔ (ایضا)

اس باب کے بعد امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک دوسرا باب باندھا ہے جس کا عنوان " باب الاخذ بالیدین " یعنی اس کا بیان کہ (مصافحہ میں) دونوں ہاتھ پکڑے جائیں گے۔ اس باب میں حدیث تو وہی عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ والی مفصل ذکر کی، مگر یہ بتلانے کے لئے کہ محدثین کے مابین اس زمانے میں دونوں ہاتھ ہی سے مصافحہ مروج تھا، فرماتے ہیں:

وصافح حماد بن زيد ابن المبارك بيديه.

یعنی حماد بن زید نے عبد اللہ بن مبارک سے دونوں ہاتھ سے مصافحہ کیا۔ (بخاری)

حماد بن زید اور عبد اللہ بن مبارک کا ترجمہ امام ذہبی کے تذکرۃ الحفاظ میں دیکھ لیا جائے، یہ دونوں اپنے وقت کے عظیم القدر و جلیل الشان محدث تھے، ان کے عظمت کا اندازہ اسی سے لگایئے کہ امام بخاری جیسا محدث بھی ان کے عمل سے دونوں ہاتھ سے مصافحہ کی مشروعیت پر دلیل لا رہا ہے۔

ختم قرآن پاک کتنے دنوں میں؟

ایک اور مثال: بخاری شریف میں ہے کہ سات راتوں میں صرف ایک مرتبہ قرآن مجید ختم کرو (بخاری، ج: 2/ ص: 756) امام بخاریؒ نے تین، پانچ، سات مختلف روایتوں کی طرف اشارہ کرکے ترجیح سات والی کو دیتے ہیں۔ ترمذی شریف وغیرہ میں تین کی روایت بھی موجود ہے مگر اس کے باوجود صحابہ کرامؓ وتابعین عظامؒ وغیرہم سے ایک رات میں مکمل قرآن مجید ختم کرنے کا ذکر موجود ہے، مثلا:

1- حضرت عثمانؓ سے مروی کہ ایک رکعت میں سارا قرآن مجید ختم کیا[1]۔

---

[1] ترمذی، ج: 2/ ص: 123، ابوب القراءت، وحلیۃ الاولیاء، ج: 1/ ص: 57

2-حضرت تمیم داریؓ بھی ایک رکعت میں سارا قرآن مجید ختم کر دیتے تھے[1]۔

3-حضرت عبداللہ بن زبیر[2]۔

4-سعید بن جبیر رمضان کے مہینے میں مغرب اور عشاء کے درمیان سارا قرآن ختم کر دیتے تھے[3]۔

نیز ترمذی شریف (ج: 2/ ص: 122) و تہذیب (لابن عساکر) میں ہے کہ کعبۃ اللہ میں سعید بن جبیر نے ایک رکعت میں سارا قرآن مکمل ختم کیا۔

5-امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے بھی کعبۃ اللہ میں ایک رات کے اندر سارا قرآن ختم کیا، چنانچہ تہذیب ابن عساکر (ج: 3/ ص: 356) میں ہے: خطیب بغدادی نے روایت کیا ہے کہ مصعبؒ فرمایا کرتے تھے کہ کعبۃ اللہ میں چاروں اماموں نے قرآن ختم کیا ہے، حضرت عثمانؓ، حضرت تمیم داریؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، اور امام اعظمؒ نے۔

6_امام شافعیؒ صرف رمضان المبارک کے مہینہ میں ساٹھ مرتبہ قرآن ختم کر دیا تھا[4]۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک مسئلہ کی تلاش میں روزانہ تین مرتبہ اور تین دنوں میں نو مرتبہ قرآن مجید ختم کیا تھا[5]۔

7-امام المحدثین حضرت یحییٰ بن سعید القطانؒ دن رات میں ایک مرتبہ قرآن ختم کرتے تھے[6]۔

امام بخاری نے خود سات سے کم میں قرآن ختم کیا ہے جب امام بخاری خود صحیح بخاری کی روایت خلاف عمل کرتے ہیں[7]۔

---

[1] کتاب الثقات لابن حبان، ج: 3/ ص: 40، تہذیب تاریخ ابن عساکر. ج: 3/ ص: 356، طحاوی، ج 1/ ص: 205.
تہذیب التہذیب، ج: 1/ص: 511

[2] طحاوی، ج: 1/ ص: 205، وقیام اللیل، ص: 63

[3] کتاب الثقات لابن حبان، ج: 4/ ص: 276

[4] تذکرۃ الحفاظ للذہبی، ج: 1/ص: 320

[5] مفتاح الجنۃ للسیوطی، ص: 21

[6] تاریخ بغداد، ج: 2/ ص: 12 وطبقات الشافعیہ الکبری، ج: 3/ ص: 9

[7] حاشیہ بخاری، ج: 2/ ص: 756

شعبان کی فضیلت:

مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوری فرماتے ہیں: "تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ نصف شعبان کے بارے میں متعدد حدیثیں وارد ہوئی ہیں ان سب کے مجموعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان احادیث کی کوئی نہ کوئی اصل ہے[1]۔"

اس کے بعد مولانا مبارکپوری نے ترمذی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث کے سوا متعدد حدیثیں نقل کی ہیں جن نصف شعبان کی فضیلت کا پتہ چلتا ہے۔

اور ان حدیثوں کو نقل کرکے فرماتے ہیں: "یہ تمام حدیثیں ان لوگوں پر حجت ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ نصف شعبان کی فضیلت کے بارے میں کوئی حدیث نہیں ہے[2]۔"

امام ابن تیمیہ کا یہ پورا کلام آپ غور سے پڑھیں:

سئل عن صلوة نصف شعبان فاجاب اذا صلي الانسان ليلة النصف وحده او في جماعة خاصة كما كان يفعل طواف من السلف فهو احسن[3].

یعنی امام ابن تیمیہ سے نصف رات کی نماز کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ اگر اس رات میں کوئی تنہا یا مخصوص جماعت کے ساتھ نماز پڑھے جیسا کے اسلاف کے بہت سے لوگوں کا یہ معمول تھا، تو یہ اچھا عمل ہے۔

---

[1] تحفہ ج: 2/ص:652

[2] تحفہ ج: 2/ص:53

[3] فتوي شيخ الاسلام ج: 23/ ص: 131

ضمیمہ

بسم الرحمٰن الرحیم

صحیح طریقے سے نماز پڑھنے کے حوالے سے کتاب تو ہم نے لکھ لی، لیکن جو دوسری طریق پر نماز پڑھنے کا قائل ہو (وہ نماز ہی درست اور حدیث سے ثابت ہے)۔ تو اس کے ذہن میں صرف یہ خدشہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذہن میں بیانات سن کر، کتابیں پڑھ کر غیر شعوری طور پر یہ ڈل جاتا ہے کہ دوسرے حضرات کی صرف نماز سنت کے خلاف نہیں بلکہ یہ تقلید شخصی کے شرک میں بھی مبتلا ہیں۔ تو جواباً عرض ہے کہ اگر کہو کہ تقلید شخصی دنیا میں ہے ہی نہیں اور نہ رہی تو یہ بھی ٹھیک ہے، اور اگر کہو کہ تقلید شخصی سب کر رہے ہیں سب اس میں مبتلا ہیں جیسا کہ ہمارے اہل حدیث بزرگ اس پر متفق ہیں کہ تراویح آٹھ رکعات ہیں، امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ فرض ہے، رفع الیدین کرنا چاہیئے، اور امین اونچی آواز سے کہنی چاہیئے، کیا ان تمام مسائل میں ان کا صرف ایک مؤقف نہیں ہے تو کیا یہ تقلید شخصی نہیں ہے؟ اگر کوئی کہے کہ اس مؤقف پر احادیث ہیں تو جو دوسرے حضرات کر رہے ہیں وہ بھی تو احادیث میں ہے، اور دو اختلافی مؤقف اور دلیل میں ایک کو متعین کرنا یہ مجتہد کا کام ہے اور اس کی بات ماننا یہ تقلید شخصی ہے اور اگر کہا جائے کہ ہم تو دلیل کو مانتے ہیں۔ تو جواباً عرض ہے کہ عامی کو دلیل کی تفصیل کا پتہ ہی نہیں ہے، کسی پر اعتماد کر کے آگے چلتا ہے اور یہی تقلید ہے، اور یہی تقلید شخصی ہے، اس لئے کہ آپ تو دو کی بات نہیں مان سکتے، ایک ہی کی بات مانیں گے تو اسی ایک مسئلہ میں تقلید شخصی ہو گئی اور اگر آپ کہے کہ ہم صحیح حدیث کو مانتے ہیں تو صحیح حدیث آپ جانتے نہیں ہے اس لئے کہ آپ عامی ہے۔

اور اگر کہو کہ تقلید شخصی دنیا میں ہے ہی نہیں تو ٹھیک ہے اس لئے کہ "شخصی" سے مراد یہاں شخص حقیقی نہیں بلکہ شخص حکمی ہے (اس لئے کہ شخص حقیقی میں ایک شخص کی شروع تا آخر مانا جاتا ہے جبکہ شخص حکمی ہی ایک مسئلہ میں تقلید شخصی ہوتی ہے، لیکن مختلف مسائل میں مختلف مجتہد بھی ہوتے ہیں تو تقلید حقیقی شخصی نہ رہی) (چنانچہ امام ابو حنیفہؒ کے فقہ میں گیارہ جگہیں ایسی ہیں کہ وہاں امام زفرؒ کے قول پر فتوی ہے نہ کہ امام ابو حنیفہ کے قول پر اسی طرح شہادات اور ذوی الارحام میں امام محمد کے قول پر فتوی ہے اور عدالت کے مسائل میں امام ابو یوسف کے قول پر فتوی ہے، اسی طرح آج کل جدید بیوعات اور بینکنگ کے مسائل میں امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے فقہ سے مدد لی جاتی ہے تو تقلید شخصی حقیقی نہ رہی لیکن بعض حضرات فرماتے ہیں کہ تابعین و تبع تابعین کی تقلید چھوڑ کر ہماری بات مانو تو ہم کہتے ہیں کہ ہم مجتہدین کے پیچھے چلیں گے جو کہ تابعین تبع تابعین ہیں نہ کہ آپ کے پیچھے اس وقت مجتہدین موجود تھے آج ماہرین موجود ہیں اجتہاد کا دروازہ عقلا بند ہے نہ شرعا[1]۔

---

[1] تقلید شخصی:

حضرات ائمہ سے پہلے تقلید شخصی کا وجود تھا، حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں: ثم انہم تفرقوا فی البلاد وصار کل واحد مقتدا ناحیۃ من النواحی. یعنی صحابہ کرام (حضور ﷺ کے بعد) مختلف شہروں میں چلے گئے اور ان میں ہر شخص جہاں وہ پہنچا مقتدی بن گیا۔ حضرت شاہ صاحب کی اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو صحابی جہاں پہنچا اس کی وہاں تقلید کی جاتی تھی۔ حجۃ اللہ البالغہ ہی میں حضرت ابن عباس ؓ کے بارے میں شاہ صاحب کا یہ کلام ہے۔ وکان ابن عباس بعد عصر الاولین فناقضھم فی کثیر من الاحکام وتبعہ فی ذلک اصحابہ من اہل مکہ. یعنی حضرت ابن عباس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دور اول گزر جانے کے بعد (مکہ میں موجود) تھے، انہوں نے بہت سے احکام میں پہلوں کی مخالفت کی اور مکہ میں ان کے شاگردوں نے ابن عباس ہی کی پیروی کی۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ مکہ میں بہت سے لوگ حضرت عبد اللہ بن عباس کے مقلد تھے، اور ان کی تقلید شخصی کرتے تھے۔

سوال: اگر دین بھی مکمل نازل ہوا اور نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کو مکمل دین سکھلایا، تو اس میں چاروں ائمہ کی تقلید کا حکم دیا ہے کہ نہیں؟

جواب: اللہ کے رسول پر دین مکمل بھی نازل ہوا اور صحابہ کرام کو آپ ﷺ نے مکمل دین سکھلایا اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت معاذ ؓ سے فرمایا تھا جو حکم کتاب وسنت میں نہ ملے تو تم اجتہاد سے کام لینا، یہ دین کا حکم تھا لیکن بعض حضرات اس کو نہیں مانتے اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام کو دین یہ بتلایا تھا کہ تم خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑنا مگر بعض لوگوں کو خلفائے راشدین کی

سنتوں کو نہیں سمجھتے، اللہ کے رسول ﷺ نے دین کی بات یہ بتلائی تھی کہ میرے صحابہ کو برا بھلا مت کہنا، جبکہ ان حضرات کا صحابہ کے بارے میں یہ عقیدہ ہے کہ وہ خلاف کتاب وسنت کام کرتے تھے بلکہ صحابہ کی ایک جماعت فاسق تھی، صحابہ کرام کے بارے میں دین کی بات یہ تھی کہ ان کی اقتداء اور پیروی کی جائے، مگر یہ حضرات کہتے ہیں کہ نہ صحابہ کرام کی فہم حجت ہے نہ قول حجت ہے نہ فعل حجت ہے اس طرح ان کی پیروی واقتداء سے انکار کردیا۔

قرآن کریم میں صاف حکم ہے کہ: فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون ۔ کہ اگر تم دین کی بات نہیں جانتے ہو تو جاننے والوں سے معلوم کرو، اس آیت سے فقہاوعلما کی تقلید کا حکم نکلتا ہے مگر یہ حضرات اصلا تقلید ہی کے منکر ہیں، وجوب کی بات تو دور کی ہے قرآن میں یا ایها الذین امنو أطيعوا الله واطيعوا الرسول واولي الامر منكم ۔ یعنی اے ایمان والوں اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور اولی الامر یعنی علما فقہا کی اطاعت کرو، اطاعت کہتے بات ماننے کو۔ اس آیت میں اللہ ورسول ﷺ کے ساتھ ساتھ اولی الامر یعنی علما فقہا کا بھی ذکر ہے کہ ان کی بھی بات مانی جائے گی۔ اس سے بھی تقلید کا حکم ثابت ہو رہا ہے مگر غیر مقلد احباب علماوفقہا کی تقلید کا انکار کرکے اس آیت کو نہیں سوچتے ہیں، حضرت جابر ؓ سے مروی ہے کہ اولی الامر سے مراد اہل فقہ اور ارباب خیر ہیں (مستدرک حاکم ص: 143)۔ حضرت عبد اللہ بن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ اولی الامر سے مراد اہل فقہ ہیں (ایضا) لیکن غیر مقلد احباب صحابہ کرام کی تفسیر کو نہیں دیکھتے، جب آیت کریمہ میں اہل فقہ بھی مراد ہیں تو فقہائے کرام کی بات ماننا بھی ضروری ہے، ان فقہائے کرام میں چاروں ائمہ بھی داخل ہیں اس لئے کہ ان کے اہل فقہ ہونے کا انکار کرنا دوپہر میں سورج کے وجود کا انکار کرنا ہے، اس لئے ان فقہائے کرام کی تقلید شرعا ثابت لازم اور واجب ہے اور اس کا انکار قرآن کا انکار ہے، یہ بھی یاد رکھیئے کہ فقہائے کرام کے بارے یہ تصور گمراہ کن ہے کہ وہ کتاب وسنت کے خلاف فتوی دیں گے جس طرح کے صحابہ کرام کے بارے یہ تصور گمراہ کن ہے کہ وہ خلاف کتاب وسنت فیصلہ کریں گے، مگر افسوس بعض احباب اس حقیقت سے باخبر ہو کر بھی بے خبر بنتے ہیں۔ فقہائے مجتہدین کی بات تو الگ رہی وہ صحابہ کرام کے بارے میں بھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ خلاف کتاب وسنت فتوی دیا کرتے تھے۔ ایک محقق صاحب حضرت عمر ؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کے بارے میں فرماتے ہیں:

" ان دونوں جلیل القدر صحابہ نے نصوص شرعیہ کے خلاف مؤقف مذکور اختیار کرلیا تھا"[1]۔

حضرت عمر ؓ کے بارے میں مزید فرماتے ہیں کہ انہوں نے نصوص کتاب وسنت کے خلاف طلاق کے مسئلہ میں قانون شریعت بنایا تھا۔ (ص: 499 ایضا)

انہیں محقق صاحب کا یہ بھی ارشاد ہے: " پوری امت کا اس اصول پر اجماع ہے کہ صحابہ کرام کے وہ فتاوے حجت نہیں بنائے جاسکتے جو نصوص کتاب وسنت کے خلاف ہو" ۔ (ص: 515 ایضا)

اسی کتاب میں فرماتے ہیں کہ حضرت علی ؓ نے غصہ میں خلاف شریعت فتوی دیا تھا، غرض صحابہ کرام کے بارے میں جن کو اللہ کے رسول ﷺ نے مقتدی بنایا، اور ان کی پیروی کا تاکیدی حکم فرمایا، ان لوگوں کا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین کے بارے میں یہ عقیدہ تھا ہم کس کا رونا روئیں؟ اور ظاہر بات ہے کہ یہ دین وشریعت کے خلاف عقیدہ ہے۔

جب اللہ علما و فقہا کی اطاعت کو بھی واجب قرار دیا اور نہ جاننے والوں کو جاننے والوں سے پوچھنے اور ان کی اطاعت کو لازم بتلایا تو اب خواہ کوئی ایک سے پوچھے یا دو چار پوچھے، دوسرے لفظوں میں خواہ ایک کی تقلید کرے خواہ دو چار کی تقلید کرے یہ سب امر شرعی ہیں، ان کو خلاف شریعت کہنا کتاب و سنت کا انکار ہے۔

سوال: اگر بالفرض چاروں مسلک برحق مانے جائیں تو کسی ایک امام کی تقلید کرکے اس کو پورا اسلام مل جائے گا۔

جواب: کیوں نہیں ملے گا۔ قرآن سات لہجوں میں نازل ہوا ہے اور آپ اور ہم صرف ایک لہجہ قاری حفص میں پڑھتے ہیں تو کیا آپ کو اور ہم کو پورا قرآن پڑھنا حاصل نہیں ہوتا، کیا آپ اور ہم نماز میں ساتوں قرات پڑھتے ہیں؟ چاروں مسلک اصول میں متحد ہیں، چاروں ائمہ اہل سنت والجماعت کے مذہب و عقیدہ پر تھے تو ان کے مقلدین کا بھی یہی حکم ہے قرآن و حدیث میں یہ کہاں لکھا ہے کہ کسی ایک امام کی تقلید مت کرو۔

اگر کوئی عامی مسلمان پوری زندگی صرف مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری سے فتویٰ پوچھ پوچھ کر عمل کرتا اور اسی پر مرجاتا تو کیا وہ مذہب سے باہر قرار پاتا کیا ہر عامی اپنے تمام تقلید نہ کرنے والے علما سے فتویٰ پوچھتا ہے، یا ایک سے فتویٰ معلوم کرکے اس پر عمل کرنا بھی وہ اپنے لئے جائز سمجھتا ہے؟۔

واضح رہے کہ مشہور اہلحدیث بزرگ فرماتے ہیں: "آنحضرت ﷺ کی پیروی کو اور مجتہدین کی اتباع کو تقلید کہنا مجوز (جائز) ہے مشہور غیر مقلد عالم دین مولانا نواب صدیق حسن بھوپالی فرماتے ہیں: مصر والے مالکی تھے جب امام شافعی مصر تشریف لے گئے تو لوگ شافع مسلک والے بن گئے، اس حوالہ سے معلوم ہوا کہ ائمہ کے زمانہ میں تقلید شخصی تھی۔ (الجنتہ)

چوتھی صدی ہجری تک تقلیدی مذاہب نہیں تھے یہ غلط پروپگنڈہ ہے، غیر مقلد عالم نواب صاحب بھوپالی فرماتے ہیں: "ابن شریح نے تقلید کی بنیاد ڈالی۔" اگر چوتھی صدی سے پہلے تقلید نہیں تھی تو دوسری کے مجدد ابن شریح کو تقلید کے قواعد و ضوابط مرتب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ابن شریح دوسری صدی کے آدمی ہیں۔ نواب صاحب فرماتے ہیں: ولذلک یعد من المجددین علی راس المائتین. یعنی اسی وجہ سے (یعنی تقلید کے قواعد و ضوابط کرتب کرنے کی وجہ سے) وہ دوسری صدی کے مجددین میں شمار ہوتے ہیں۔

خود امام بخاریؒ مقلد تھے: امام بخاری رحمہ اللہ کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ مقلد نہیں تھے یہ غلط فہمی ہے نواب صدیق حسن خان صاحب نے خود امام بخاری کو شافعی بتلایا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی ان کو شافعی قرار دیا ہے[1]۔ طبقات الشافعیہ میں بھی امام سبکی نے ان کو شافعی لکھا ہے۔

کچھ لوگ امام بخاری کو حنبلی قرار دیتے ہیں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا یہی رجحان ہے فرماتے ہیں: ائمہ حدیث جیسے بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی اور ان کے علاوہ کچھ دوسرے محدثین بھی امام احمد اور امام اسحاق بن راہویہ کے متبعین ہیں ان کا شمار بھی انہیں لوگوں میں سے ہے جنہوں نے دونوں فقہ اور حدیث کا علم حاصل کیا۔

امام ابن قیم نے بھی امام بخاری کو حنبلی بتلایا ہے، اور جو لوگ امام بخاری کو غیر مقلد قرار دینے پر تلے ہیں تو وہ بطور لطیفہ سن لیجئے کہ اگر ان کو غیر مقلد قرار دیا جائے تو وہ اس زمانے والے غیر مقلد نہیں تھے، اس لئے کہ اس زمانے کے غیر مقلدوں کا مذہب یہ ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق ایک ہوگی اور امام بخاری کے یہاں ایک مجلس کے تین طلاق تین ہی شمار ہوگی، آج کے بزرگوں کا مذہب یہ ہے کہ

حالت حیض میں جو طلاق دی جائے گی وہ واقع نہ ہوگی جبکہ امام بخاری نزدیک واقع ہو جائے گی، آج کل کے غیر مقلد بزرگ ایک ہاتھ سے مصافحہ کرتے ہیں اور امام بخاری دونوں ہاتھ سے مصافحہ کے قائل تھے، آج کل کے غیر مقلد احباب تہجد اور تراویح کو ایک بتلاتے ہیں اور امام بخاری کے یہاں تہجد الگ اور تراویح الگ نماز تھی، آج کل کے غیر مقلد بزرگ آٹھ رکعت تراویح پڑھتے ہیں امام بخاری آٹھ رکعت تراویح پڑھنے کے قائل نہیں تھے، آج کل کے غیر مقلدین قبروں سے تبرک حاصل کرنے کو حرام کہتے ہیں اور امام بخاری قبروں سے تبرک حاصل کرنے کے قائل تھے چنانچہ انہوں نے اپنی تاریخ لکھنے کی ابتدا حضور اکرم ﷺ کی قبر کے پاس بیٹھ کر کی امام بخاری خود فرماتے ہیں: میں نے اپنی تاریخ کی تصنیف کی ابتدا مدینہ منورہ میں حضور ﷺ کی قبر کے پاس کی۔

آج کل کے غیر مقلد احباب بزرگوں کے تبرکات سے فائدہ اٹھانے کو حرام سمجھتے ہیں امام بخاری کے یہاں بزرگوں کے تبرکات سے برکت حاصل کرنا جائز تھا۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: امام بخاری کے پاس حضور ﷺ کے کچھ بال مبارک تھے وہ اسے اپنے لباس میں رکھتے تھے۔

غرض امام بخاری رحمہ اللہ غیر مقلد بھی ہوں گے تو وہ آج والے غیر مقلد نہیں تھے ان کا مذہب آج کے غیر مقلدوں سے بالکل الگ تھا۔

حافظ ابن تیمیہ اور غیر مقلد احباب کا مسلک:

حافظ ابن حجر فتح الباری میں فرماتے ہیں: امام ابن تیمیہ سے (جو شاذ مسائل) منقول ہیں ان میں یہ قبیح ترین مسئلہ ہے، پھر حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: حضور اکرم ﷺ کی روضہ اقدس کی زیارت افضل اعمال میں سے ہے اور عظیم تر ثواب کا کام ہے یہ وہ عمل ہے کہ جو اللہ تعالی تک بندوں کے پہنچانے کا ذریعہ ہے قبر مبارک کے زیارت کا مسئلہ بلا کسی اختلاف کے اجماعی ہے۔ (ایضا)

بہر حال عرض یہ کرنا ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ عموما فقہی و شرعی مسائل میں ائمہ اربعہ کے دائرے سے باہر نہیں نکلتے تھے اور انہیں کے اقوال میں سے کسی قول کو اختیار کرتے تھے اور اسی پر فتوی دیتے تھے، اور جب انہوں نے کبھی خود اجتہاد کرنے کی جرات کی تو وہ راہ صواب سے دور ہو گئے اور امت نے ان کے قول کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور غیر مقلد بزرگوں کے مسلک و عقیدہ میں فرق:

(1) شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے نزدیک جمعہ میں اذان عثمانی سنت ہے، اور اس کا منکر سنت صحابہ کا منکر ہے اور یہ اذان ان کے مذہب میں شرعی اور مسنون اذان نہیں ہے۔

(2) شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے نزدیک بیس رکعت تراویح بھی مسنون بلکہ حضرت عمر ﷺ کے زمانے سے وہی مسنون ہے، اس لئے کہ بیس رکعت پر صحابہ کا اجماع ہو گیا تھا جبکہ غیر مقلد بزرگ بیس رکعت تراویح کے قائل اور فاعل نہیں ہے

(3) شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے نزدیک مقتدی پر جہر نماز میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا جائز نہیں بلکہ خاموش رہنا اور کان لگا کر امام کی قرات کو سننا واجب ہے اور ان کے مذہب میں جہری نماز میں بھی مقتدی پر سورہ فاتحہ واجب ہے۔

(4) شیخ الاسلام نزدیک ضرورۃ نفل پڑھنے کے والے کے پیچھے فرض پڑھنے والوں کی نماز ہوگی اور غیر مقلدین مطلقا اس کو جائز کہتے ہیں۔

(5) شیخ الاسلام کے نزدیک امامت کا حقدار اعلم ہے اور ان کے نزدیک ہر حال میں امامت کا حقدار قرآن زیادہ پڑھنے والا قاری صاحب ہی ہے۔

(6) شیخ الاسلام کے نزدیک خلفائے راشدین کا عمل مسنون ہے جبکہ یہ حضرات اس کے منکر ہیں۔

(7) غیر مقلدین کا مذہب ہے کہ شادی کے بعد صرف خلوت صحیحہ سے مہر واجب نہ ہوگی اور ابن تیمیہ کا مذہب ہے کہ شوہر پر پوری مہر واجب ہو جائے گی۔

(8) ان حضرات کا مذہب ہے کہ ہر شخص کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی جائے گی، اور ابن تیمیہ کا مذہب کے صرف اس کا نماز جنازہ پڑھی جائے گی جس کے بارے میں معلوم ہو کہ اس کو بلا نماز جنازہ دفن کیا گیا ہے۔

(9) ان کا مذہب ہے کہ صرف دو آدمی سے ہی (ایک امام ایک مقتدی ہو تو) جمعہ ہو جائے گا جبکہ شیخ الاسلام کا مذہب اس کے خلاف ہے۔

(10) ان کی کتاب "عرف الجادی" میں لکھا ہے کہ شراب کا سرکہ اگر خود بن گیا ہو تو جائز ہے شیخ الاسلام ابن تیمیہ اس کو جائز نہیں کہتے۔

تلک عشرۃ کاملۃ کے طور پر یہ دس مثالیں دی ہیں ان سے اندازہ لگا لیجئے کہ غیر مقلد زرگوں کا یہ دعوی کس حد تک درست ہے کہ ان کا عقیدہ اور مذہب وہی ہے جو شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا ہے۔

ان دس مثالوں کو مع حوالوں کے ملاحظہ فرمائیں:

(1) ابن تیمیہ فرماتے ہیں جب حضرت عثمان نے اس اذان کو بطور سنت جاری کیا اور سارے مسلمانوں نے اتفاق کر لیا تو یہ آذان شرعی ہو گئی[1]۔

(2) شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں لوگوں کا رمضان میں تراویح کے عدد کے بارے میں اختلاف ہے سو یہ بات ثابت ہے کہ سو یہ بات ثابت ہے کہ حضرت ابی بن کعب ؓ لوگوں کو بیس رکعت تروایح پڑھاتے تھے اور تین رکعت وتر تو بہت سے علما نے اسی کو سنت قرار دیا ہے، اس لئے کہ ابی بن کعب ؓ نے بیس رکعت تراویح مہاجرین اور انصار کی بیچ پڑھائی اور اس پر کسی نے انکار نہیں کیا۔ فتاوی ج: 23/ص:113

(3) قرآن کی قطعی دلیل قائم ہے کہ نماز میں مقتدی کو کان لگا کر سننا اور خاموش رہنا واجب ہے۔ (فتاوی ج: 23/ص: 272)

(4) دیکھیں فتاوی شیخ الاسلام جلد 23 صفحہ 248۔

(5) شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ اگر دو آدمی ہو اور دونوں دیندار ہو تو ان میں سے جو کتاب و سنت کا واقف کار زیادہ ہوگا امت کے لئے متعین طور پر اسی کو امامت کے لئے مقدم کیا جائے گا۔ (فتاوی ج: 23/ص: 241)

(6) ابن تیمیہ فرماتے ہیں: فسنة الخلفاء الراشدين هي منا امر الله به ورسوله عليه ادله شرعية كثيرة. (فتاوی ج 23/ص: 107)

یعنی خلفائے راشدین کی سنت وہ چیز ہے جس کا حکم خدا اور رسول نے دیا ہے اور اس پر بہت سے شرعی دلائل قائم ہیں۔

(7) نواب صاحب بھوپالی فرماتے ہیں : نیست دلیل بر وجوب مہر کامل بمجرد خلوت۔ وتمسک بغیر دلیل حلال نیست (عرف الجاری ص: 106)

یعنی اس پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ محض خلوت کی وجہ سے کامل مہر واجب ہوگی اور بلا دلیل بات سے استدلال کرنا اور تمسک کرنا یہ حلال نہیں ہے۔

اور ابن تیمیہ فرماتے ہیں : شوہر پر کامل مہر واجب ہوگی جیسا کہ خلفائے راشدین اور ائمہ نے اسی پر فیصلہ کیا ہے۔ (فتاوی ج: 23/ص: 197)

(8) ابن قیم شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے نقل کرتے ہیں سچ بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایسے شہر میں فوت ہو جہاں اس کا جنازہ نہیں پڑھا گیا تو اس کی غائبانہ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔ (زاد المعاد ج: 1/ص: 520)

(9) دیکھیں فتاوی ابن تیمیہ جلد 24 صفحہ 178۔

(10) عرف الجاری میں ہے "سرکہ ساختن خمر ناروا است اگر از خود سرکہ گرد جائز باشد (ص: 10) یعنی شراب کا سرکہ بنانا جائز نہیں لیکن اگر شراب خود سرکہ ہو جائے تو جائز ہوگا۔

اور ابن تیمیہ فرماتے ہیں: قیل لا یجوز بحال ھذا وھذا ھو الصحیح. (فتاوی ج: 21/ص: 483)

یعنی شراب کی سرکہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ کسی صورت میں جائز نہیں اور یہی صحیح ہے۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ کا ارشاد: "جمہور علمائے امت کا یہی مذہب ہے کہ اجتہاد اور تقلید اپنی اپنی جگہ جائز ہے ہر شخص پر اجتہاد واجب اور تقلید حرام نہیں، بلکہ جو شخص اجتہاد کا اہل ہے اس کے لئے اجتہاد جائز ہے اور جو شخص اجتہاد کا اہل نہیں اس کے لئے تقلید جائز ہے، اب یہ کہ جو شخص اجتہاد کا اہل ہے وہ تقلید کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس میں علما کا اختلاف ہے، صحیح مسلک یہی ہے کہ اس کے لئے بھی تقلید جائز ہے چونکہ عملاً اس نے اجتہاد نہیں کیا، یا تو اس لئے کہ متعلقہ مسئلہ میں وارد شدہ دلائل برابر ہیں یا قلت وقت کی وجہ سے وہ اجتہاد نہ کر سکا یا اس کو ایک مسئلہ میں خالص دلیل نہیں ملی، بہر حال جب وہ عملاً اجتہاد سے عاجز ہو تو جو چیز اس پر واجب تھی (اجتہاد) وہ ساقط ہو گئی اور اب وہ اس کے متبادل پر عمل کرے گا اور وہ تقلید ہے، جیسے کہ کوئی شخص پانی کے ساتھ وضو کرنے سے عاجز ہو جائے تو تیمم کرے"۔ (فتاوی ابن تیمیہ، ج: 20/ص: 2،3، مکتبہ المعارف المغرب)

اب میں چند مثالیں لکھتا ہوں آپ کسی غیر مقلد بزرگ سے معلوم کریں کہ بخاری کی ان احادیث پر عمل کیوں نہیں ہے؟

1- بخاری شریف کی روایت ہے "الغسل یوم الجمعۃ واجب علی کل محتلم" یعنی جمعہ کے روز ہر بالغ پر غسل کرنا واجب ہے (حدیث میں جمعہ کے لئے نہیں بلکہ جمعہ کے دن ہر بالغ پر خواہ مرد ہو یا عورت غسل واجب ہونا مذکور ہے۔

کیا غیر مقلدین کا اس حدیث پر عمل ہے اور ان کا یہی مذہب ہے کہ جمعہ کے روز ہر بالغ پر غسل ضروری ہے خواہ مرد ہو خواہ عورت۔

-2 بخاری شریف کی روایت ہے "اذا اشتد الحر فابردو بالصلوۃ" یعنی جب سخت گرمی کا زمانہ ہو تو ظہر کی نماز ٹھنڈی کرکے پڑھو، حضور ﷺ کا فرمان تو یہ ہے اور ان حضرات کا عمل یہ ہے کہ وہ مئی جون میں بھی زوال کے فورا بعد نماز بعد پڑھتے ہیں۔

-3 بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے:

رکعتان لم یکن رسول اللہ ﷺ یدعھما سرا و لا علانیۃ رکعتان قبل الصبح و رکعتان بعد العصر .

یعنی اللہ کے رسول ﷺ دو رکعتیں کسی حال میں بھی نہیں چھوڑتے تھے، صبح کی نماز سے پہلے کی دو رکعت او رعصر کے نماز کے بعد دو رکعت۔

کیا ان حضرات کا اس حدیث پر عمل ہے؟

-4 بخاری شریف میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ عشاء کی نماز سے پہلے سونے کو اور عشاء کی نماز کے بعد بات کرنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔

کان یکرہ النوم قبلھا والحدیث بعدھا .

کیا بخاری کی اس حدیث پر کسی غیر مقلد کا عمل ہے اور عشاء کے بعد بات کرنا اس کے نزدیک حرام ہے؟

-5 بخاری شریف کی حدیث ہے روایت کرنے والے مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ ہیں فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کا حکم تھا کہ " اذا حضرت الصلوۃ فاذنا واقیما ثم لیؤمکما اکبرکما" یعنی جب نماز کا وقت آئے (اور دو آدمی ہو) تو تم دونوں آذان کہو تم دونوں اقامت کہو پھر جو بڑا ہو وہ امامت کرے۔

کیا غیر مقلدین کا یہی مذہب ہے کہ دو مصلی ہونے کی صورت میں دونوں آذان کہے دونوں اقامت بھی کہیں گے اور امام عمر جو بڑا ہوگا وہی ہوگا۔

-6 بخاری شریف میں ہے "اذا قمت الی الصلوۃ فکبر ثم اقرا ما تیسر امعک من القرآن" یعنی جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو تکبیر کہو پھر قرآن میں سے جو تمہیں یاد ہو پڑھو۔

حضور ﷺ تو فرمائیں کہ تمہیں جو قرآن یاد ہو وہ پڑھو اور یہ کہتے ہیں کہ نہیں سورہ فاتحہ کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی کیا اسی کا نام بخاری کی حدیث پر عمل ہے۔

-7 بخاری شریف کی روایت ہے: ان النبی ﷺ کان یقرأ فی الظھر فی الاولین بام الکتاب و سورتین .

یعنی نبی کریم ﷺ ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ اور دو سورتیں پڑھتے تھے اور یہ کہتے ہیں کہ سورہ فاتحہ پڑھنا تو فرض ہے مگر دونوں سورتوں کا پڑھنا فرض نہیں ہے بخاری اس حدیث میں جب یہ تفصیل نہیں ہے، تو انہوں نے اپنی طرف سے یہ تفصیل کیوں کی؟۔

-8 بخاری شریف میں ہے " باب المصافحہ بالیدین " یعنی مصافحہ دونوں ہاتھ سے کرنا ہے اور امام بخاری نے دونوں ہاتھ والی حدیث پیش بھی کی ہے، مگر یہ کہتے ہیں کہ نہیں مصافحہ ایک ہاتھ سے ہوگا۔

خدشہ 2:

اور دوسرا خدشہ یہ ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ تابعی نہ تھے یا علم حدیث کے فن میں کمزور تھے یا مرجیٔ تھے یا ان کے نیک اعمال اتنے بڑھا چڑھا کے پیش کیے جاتے ہیں کہ وہ سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سفیان ثوری نے امام ابو حنیفہؒ کے خلاف تھے، اور خطیب بغدادی بھی ان کے خلاف تھے، یا امام ابو حنیفہ خلق قرآن کے قائل تھے، یا امام ابو حنیفہ اصحاب الرائے میں سے ہیں اور امام ابو حنیفہ رائے کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں، اور عقیلی، اور نعیم بن حماد امام بخاری کے استاد بھی ابو حنیفہ کے خلاف تھے اور ابن حزم بھی خلاف تھے، لہٰذا امام ابو حنیفہ نعوذ باللہ صحیح آدمی نہیں تھے[1]۔

9- بخاری شریف میں ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق تین ہی ہوگی اور اس مسئلہ کو بخاری نے متعدد حدیثوں سے ثابت کیا ہے، مگر یہ بخاری شریف کی ان تمام راویتوں کو نہیں مانتے پھر بھی دعوی ہے کہ ہم بخاری والے ہیں۔

10- امام بخاری نے باب قائم کیا ہے "باب وجوب القراۃ للامام والماموم" یعنی اس کا بیان کہ مقتدی اور امام کو قرات کرنی ضروری ہے اور پھر حدیث ذکر کرتے ہیں: "لا صلوۃ لمن لم یقرا بفاتحۃ الکتاب" یعنی اس کی نماز نہیں ہوتی جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی۔

امام بخاری اس حدیث سے مطلقاً قرات کی فرضیت ثابت کرتے ہیں اور یہ حضرات کہتے ہیں کہ نہیں اس حدیث سے صرف سورہ فاتحہ کی فرضیت ثابت ہوتی ہے، یہ امام بخاری سے ان کی موافقت ہے یا مخالفت۔

[1] **امام ابو حنیفہؒ نعمان بن ثابت:**

حیات اور کارنامے:

حضرت امام اعظم کا اسم گرامی "نعمان" اور کنیت "ابو حنیفہ" ہے۔ ولادت ۸۰ ھ میں عراق کے کوفہ شہر میں ہوئی۔ والد کا نام ثابت تھا اور آپ کے دادا نعمان بن مرزبان کابل کے اعیان واشراف میں بڑی فہم وفراست کے مالک تھے۔ آپ کے پردادا مرزبان فارس کے ایک علاقہ کے حاکم تھے۔ آپ کے والد حضرت ثابتؒ بچپن میں حضرت علیؓ کی خدمت میں لائے گئے تو حضرت علیؓ نے آپ اور آپ کی اولاد کے لیے برکت کی دعا فرمائی اور دعا اس طرح قبول ہوئی کہ امام ابو حنیفہؒ جیسے عظیم محدث وفقیہ اور عابد وزاہد شخصیت پیدا ہوئی۔

آپ نے زندگی کے ابتدائی ایام میں ضروری علم کی تحصیل کے بعد تجارت شروع کی؛ لیکن آپ کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے علم حدیث کی معروف شخصیت شیخ عامر شعبی کوفی (۱۷ھ - ۱۰۴ھ) -

جنہیں پانچ سو سے زیادہ اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہے۔ نے آپ کو تجارت چھوڑ کر مزید علمی کمال حاصل کرنے کا مشورہ دیا؛ چنانچہ آپ نے امام شعبیؒ کے مشورہ پر علم کلام، علم حدیث اور علم فقہ کی طرف توجہ فرمائی اور ایسا کمال پیدا کیا کہ علمی و عملی دنیا میں "امام اعظم" کہلائے۔ آپ نے کوفہ، بصرہ اور بغداد کے بے شمار شیوخ سے علمی استفادہ کیا اور حصول علم کے لیے مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور شام کے متعدد اسفار کیے۔

ایک وقت ایسا آیا کہ عباسی خلیفہ ابو جعفر منصورؒ نے حضرت امام ابو حنیفہؒ کو عہدہ قضا پیش کیا؛ لیکن آپ نے معذرت چاہی تو وہ اپنے مشورہ پر اصرار کرنے لگا؛ چنانچہ آپ نے صراحۃً انکار کر دیا اور قسم کھائی کہ وہ یہ عہدہ قبول نہیں کر سکتے، جس کی وجہ سے ۱۴۶ ہجری میں آپ کو قید کر دیا گیا۔ امام صاحب کی علمی شہرت کی وجہ سے قید خانہ میں بھی تعلیمی سلسلہ جاری رہا اور امام محمدؒ جیسے محدث وفقیہ نے جیل میں ہی امام ابو حنیفہؒ سے تعلیم حاصل کی۔ امام ابو حنیفہؒ کی مقبولیت سے خوفزدہ خلیفۂ وقت نے امام صاحبؒ کو زہر دلوادیا۔ جب امام صاحبؒ کو زہر کا اثر محسوس ہوا تو سجدہ کیا اور اسی حالت میں وفات پا گئے۔ تقریباً پچاس ہزار افراد نے نمازِ جنازہ پڑھی، بغداد کے خیزران قبرستان میں دفن کیے گئے۔ ۳۷۵ھ میں اس قبرستان کے قریب ایک بڑی مسجد "جامع الامام الاعظم" تعمیر کی گئی جو آج بھی موجود ہے۔ غرض ۱۵۰ھ میں صحابہؓ و بڑے بڑے تابعینؒ سے روایت کرنے والا ایک عظیم محدث وفقیہ دنیا سے رخصت ہو گیا اور اس طرح صرف اور صرف اللہ تعالی کے خوف سے قاضی کے عہدہ کو قبول نہ کرنے والے نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا؛ تاکہ خلیفۂ وقت اپنی مرضی کے مطابق کوئی ایسا فیصلہ نہ کرا سکے جس سے مالکِ حقیقی ناراض ہوں۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت:

مفسر قرآن شیخ جلال الدین سیوطی شافعی مصریؒ (۸۴۹ھ-۹۱۱ھ) نے اپنی کتاب "تبییض الصحیفة فی مناقب الامام ابی حنیفہ رحمة اللہ" میں بخاری ومسلم ودیگر کتب حدیث میں وارد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات: اگر ایمان ثریا ستارے کے قریب بھی ہوگا تو اہل فارس میں سے بعض لوگ اس کو حاصل کر لیں گے۔ (بخاری) اگر ایمان ثریا ستارے کے پاس بھی ہوگا تو اہل فارس میں سے ایک شخص اس میں سے اپنا حصہ حاصل کر لے گا۔ (مسلم) اگر علم ثریا ستارے پر بھی ہوگا تو اہل فارس میں سے ایک شخص اس کو حاصل کر لے گا۔ (طبرانی) اگر دین ثریا

ستارہ پر بھی معلق ہوگا تو اہل فارس میں سے کچھ لوگ اس کو حاصل کر لیں گے۔ (طبرانی) ذکر کرنے کے بعد تحریر فرمایا ہے کہ میں کہتا ہوں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امام ابو حنیفہؒ (شیخ نعمان بن ثابتؒ) کے بارے میں ان احادیث میں بشارت دی ہے اور یہ احادیث امام صاحب کی بشارت وفضیلت کے بارے میں ایسی صریح ہیں کہ ان پر مکمل اعتماد کیا جاتا ہے۔ شیخ ابن حجر الہیتمی المکی الشافعی نے اپنی مشہور ومعروف کتاب "الخیرات الحِسان فی مناقبِ امام أبی حنیفہ" میں تحریر کیا ہے کہ شیخ جلال الدین سیوطیؒ کے بعض تلامذہ نے فرمایا اور جس پر ہمارے مشائخ نے بھی اعتماد کیا ہے کہ ان احادیث کی مراد بلاشبہ امام ابو حنیفہؒ ہیں؛ اس لیے کہ اہلِ فارس میں ان کے معاصرین میں سے کوئی بھی علم کے اس درجہ کو نہیں پہنچا جس پر امام صاحب فائز تھے۔

حافظ جلال لدین سیوطی مشہور شافعی محدث عالم ہیں انہوں حضرت امام ابو حنیفہ کے مناقب میں ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام تبییض الصحیفۃ" ہے اس کے صفحہ نمبر 30 پر رقمطراز ہیں:

امام ابو حنیفہ پہلے وہ شخص ہے جنہوں نے شریعت کو مدون کیا اور اس کو باب، باب کرکے مرتب کیا پھر اس کے بعد امام مالک نے حضرت امام ابو حنیفہ کی اتباع کی اور مؤطا کو باب باب کرکے مرتب کیا لیکن امام ابو حنیفہ سے پہلے یہ کسی نے نہیں کیا تھا۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کتاب الشرائط اور کتاب الفرائض کی داغ بیل ڈالی اسی وجہ سے حضرت امام شافعی فرماتے تھے لوگ فقہ کے بارے میں امام ابو حنیفہ کے محتاج ہیں۔

یہ کسی حنفی کا نہیں ایک جلیل القدر شافعی محدث اور محقق کا بیان ہے اس بیان سے فقہ حنفی کی عظمت اور جلالت اس کی قیمت کا اندازہ ہر شخص لگا سکتا ہے بشر طیکہ وہ حق پسند ہو معاند اور تعصب کا مارانہ ہو۔

بنو عباس کا مشہور خلیفہ واثق باللہ کے زمانہ کا واقعہ سنو وہ اس کی زبانی یہ واقعہ مجدد غیر مقلدیت نواب صدیق حسن بھوپالی صاحب کی زبانی سنو وہ اپنی کتاب "ریاض المرتاض" میں لکھتے ہیں:

در کتاب مسالک وممالک نوشتہ واثق عباسی خوست تا بر حقیقت سد آگاہی یابد در 238 در صد بست وہشت سلام نام ترجمان را با پنجاہ نفر بازاد وراحلہ بتفحص آں فرستاد.... بجھے رسیدند نزدیک کوہے کہ سد یاجوج در شعب آنجا است اگر چہ بلادش اندک بود اما صحرا وا ماکن بسیار داشت محافظان سد کہ در آنجا بودند ہمہ دین اسلام داشتند ومذہب حنفی زبان عربی وفارسی می گفتند۔ (ص: 316)

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ کتاب "مسالک الممالک" میں لکھا ہے کہ واثق باللہ عباسی خلیفہ نے چاہا کہ سد سکندری کا حال معلوم کرے تو اس نے سلام نامی ایک شخص کے ساتھ پچاس لوگوں کو کر دیا اور ان کی زاد راہ اور سواری کا انتظام کیا، اور ان کو سد سکندری کا پتہ لگانے کے لئے بھیجا لوگ مختلف ملکوں اور شہروں سے ہوتے ہوئے ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں ایک قلعہ تھا وہیں گھاٹی میں سد یاجوج تھی وہ ملک اگر چہ چھوٹا تھا مگر جنگلات اور کھلیں جگہیں بہت تھیں سد سکندری کے جو محافظ تھے سب کے سب مسلمان تھے اور حنفی المذہب تھے عربی اور فارسی میں گفتگو کرتے تھے۔

آپ اندازہ لگائیں کہ سد سکندری کے پاس نہ واثق کی حکومت تھی اور نہ ابویوسف قاضی کا وہاں کوئی اثر ورسوخ تھا وہ جنگلات او رپہاڑوں سے گھرا دور دراز کا ایک علاقہ تھا مگر اسلام کی شعاع سے وہ خطہ درخشاں تھا اسی طرح حنفی مذہب وہاں پہنچ چکا تھا۔ یہیں سے حضرت سفیان ابن عیینہ رحمہ اللہ کے اس قول کی صداقت کا ظہور ہوتا ہے فرماتے ہیں: میرا خیال تھا کہ امام حمزہ کی قرات او رابو حنیفہ کی فقہ دجلہ کا پل بھی پار نہیں کرسکیں گے مگر وہ تو کوفہ سے نکل کر اطراف عالم میں پھیل گئی۔ (تاریخ بغداد)

اہل اللہ نے اس فقہ کے بارے میں جو اپنا مکاشفہ بیان کیا ہے اس کو سن لیں، حضرت مجدد الف ثانی کی ذات گرامی محتاج تعارف نہیں ہے وہ فرماتے ہیں:

بے شائبہ تکلف وتعصب گفتہ میں شود کہ نورانیت ایں مذہب حنفی بنظر کشفی دورنگ دریائے عظیم من نماید وسائر مذاہب در رنگ حیاض جداول بنظر می آیند وبنظر ہر ہمہ کہ ملاحظہ نمودہ می آید سواد اعظم از اہل اسلام متابعان ابی حنیفہ علیہم الرضوان

یعنی بلا تکلف اور بلا ادنی تعصب یہ کہا جارہا ہے کہ نظر کشفی میں امام اعظم کے مذہب کی نورانیت کی مثال ایک بڑے دریاں کی نظر آتی ہے اور دوسرے مذہب اس مذہب کے مقابلے میں نہروں اور حوض جیسے نظر آتے ہیں اور ظاہر میں بھی دیکھو تو حضرت امام ابو حنیفہ کے ماننے والے دوسرے مذاہب سے زیادہ ہیں۔

وضاحت: ان احادیث کی مراد میں اختلاف رائے ہوسکتا ہے؛ مگر عصرِ قدیم سے عصرِ حاضر تک ہر زمانہ کے محدثین وفقہاء وعلماء کی ایک جماعت نے تحریر کیا ہے کہ ان احادیث سے مراد حضرت امام حنیفہ ہیں۔ علماء شوافع نے خاص طور پر اس قول کو مدلل کیا ہے، جیسا کہ شافعی مکتبۂ فکر کے دو مشہور جید علماء کے اقوال ذکر کیے گئے۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کی تابعیت:

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (جو فنِ حدیث کے امام شمار کیے جاتے ہیں) سے جب امام ابو حنیفہؒ کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ امام ابو حنیفہؒ نے صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کو پایا، اس لیے کہ وہ ۸۰ ہجری میں کوفہ میں پیدا ہوئے، وہاں صحابہ کرامؓ میں سے حضرت عبداللہ بن اوفیؓ موجود تھے، ان کا انتقال اس کے بعد ہوا ہے۔ بصرہ میں حضرت انس بن مالکؓ تھے اور ان کا انتقال ۹۰ یا ۹۳ ہجری میں ہوا ہے۔ ابن سعدؒ نے اپنی سند سے بیان کیا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ کہا جائے کہ امام ابو حنیفہؒ نے حضرت انس بن مالکؓ کو دیکھا ہے اور وہ طبقہ تابعین میں سے ہیں۔ نیز حضرت انس بن مالکؓ کے علاوہ بھی اس شہر میں دیگر صحابہ کرامؓ اس وقت حیات تھے۔

شیخ محمد بن یوسف صالحی دمشقی شافعیؒ نے "عقود الجمان فی مناقب الامام ابی حنیفہؒ " کے نویں باب میں ذکر کیا ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اس زمانہ میں پیدا ہوئے جس میں صحابہ کرامؓ کی کثرت تھی۔

اکثر محدثین (جن میں امام خطیب بغدادیؒ، علامہ نوویؒ، علامہ ابن حجرؒ، علامہ ذہبیؒ، علامہ زین العابدین سخاویؒ، حافظ ابو نعیم اصبہانیؒ، امام دار قطنیؒ، حافظ ابن عبد البرؒ اور علامہ ابن الجوزیؒ کے نام قابل ذکر ہیں) کا یہی فیصلہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے حضرت انس بن مالکؓ کو دیکھا ہے۔

محدثین و محققین کی تشریح کے مطابق صحابی کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنا ضروری نہیں ہے؛ بلکہ دیکھنا بھی کافی ہے، اسی طرح تابعیت کا معاملہ بھی ہے کہ تابعی کہلانے کے لیے صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنا ضروری نہیں ہے؛ بلکہ صحابی کا دیکھنا بھی کافی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے تو صحابۂ کرامؓ کی ایک جماعت کو دیکھنے کے علاوہ بعض صحابۂ کرامؓ خاص کر حضرت انس بن مالکؓ سے احادیث روایت بھی کی ہیں۔

غرضے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ تابعی ہیں اور آپ کا زمانہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کا زمانہ ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جس دور کی امانت ودیانت اور تقویٰ کا ذکر اللہ تعالی نے قرآنِ کریم (سورۂ التوبہ آیت نمبر ۱۰۰) میں فرمایا ہے۔ نیز نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق یہ بہترین زمانوں میں سے ایک ہے۔ علاوہ ازیں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات میں ہی حضرت امام ابوحنیفہؒ کے متعلق بشارت دی تھی، جیسا کہ بیان کیا جا چکا، جس سے حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی تابعیت اور فضیلت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

صحابہ کرام سے امام ابوحنیفہؒ کی روایات:

امام ابو معشر عبد الکریم بن عبد الصمد طبری مقری شافعیؒ (متوفی ۴۷۸ھ) نے ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے جس میں انہوں نے امام ابوحنیفہؒ کی مختلف صحابۂ کرامؓ سے روایات نقل کی ہیں۔
(۱) حضرت انس بن مالکؓ (۲) حضرت عبد اللہ بن جزاء الزبیدیؓ (۳) حضرت جابر بن عبد اللہؓ (۴) حضرت معقل بن یسارؓ (۵) حضرت واثلہ بن الاسقعؓ (۶) حضرت عائشہ بنت عجرؓ۔

وضاحت: محدثین کی ایک جماعت نے ۸ صحابہ کرامؓ سے امام ابو حنیفہؒ کا روایت کرنا ثابت کیا ہے؛ البتہ بعض محدثین نے اس سے اختلاف کیا ہے؛ مگر امام ابو حنیفہؒ کے تابعی ہونے پر جمہور محدثین کا اتفاق ہے

فقہاء و محدثین کی بستی۔ شہر کوفہ:

حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں ملک عراق فتح ہونے کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے آپ کی اجازت سے ۱۷ ہجری میں کوفہ شہر بسایا، قبائل عرب میں سے فصحاء کو آباد کیا گیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابی کو وہاں بھیجا؛ تاکہ وہ قرآن وسنت کی روشنی میں لوگوں کی رہنمائی فرمائیں۔ صحابہ کرامؓ کے درمیان حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی علمی حیثیت مسلم تھی، خود صحابہ کرامؓ بھی مسائلِ شرعیہ میں ان سے رجوع فرماتے تھے۔ ان کے متعلق حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کتبِ حدیث میں موجود ہیں: ابن ام عبد (یعنی عبداللہ بن مسعودؓ) کے طریق کو لازم پکڑو.... جو قرآن پاک کو اس انداز میں پڑھنا چاہیے، جیسا نازل ہوا تھا تو اُس کو چاہیے کہ ابن ام عبد (یعنی عبداللہ بن مسعودؓ) کی قرات کے مطابق پڑھے.... حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں فرمایا کہ وہ علم سے بھرا ہوا ایک ظرف ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ کے عہدِ خلافت میں اہل کوفہ کو قرآن وسنت کی تعلیم دی۔ حضرت علی مرتضیٰؓ کے عہدِ خلافت میں جب دار الخلافہ کوفہ منتقل کر دیا گیا تو کوفہ علم کا گہوارہ بن گیا۔ صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کی ایک جماعت خاص کر حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور ان کے شاگردوں نے اس بستی کو علم وعمل سے بھر دیا۔ صحابہ کرامؓ کے درمیان فقیہ کی حیثیت رکھنے والے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا علمی ورثہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے مشہور استاذ شیخ حمادؒ اور مشہور تابعی شیخ ابراہیم نخعیؒ و شیخ علقمہؒ کے ذریعہ امام ابو حنیفہؒ تک پہونچا۔ شیخ حمادؒ صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت انس بن مالکؓ کے بھی سب سے قریب اور معتمد شاگرد ہیں۔ شیخ حمادؒ کی صحبت میں امام ابو حنیفہؒ تقریباً ۱۸ سال رہے اور شیخ حمادؒ کے انتقال کے بعد کوفہ میں ان کی مسند پر امام ابو حنیفہؒ کو ہی بٹھایا گیا۔ غرضے کہ امام ابو حنیفہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے علمی ورثہ کے

وارث بنے۔ اسی وجہ سے امام ابو حنیفہ ؒ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایات اور ان کے فیصلہ کو ترجیح دیتے ہیں، مثلاً کتبِ احادیث میں وارد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایات کی بناء پر امام ابو حنیفہ ؒ نے نماز میں رکوع سے قبل وبعد رفع یدین نہ کرنے کو سنت قرار دیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہدِ خلافت میں تدوینِ حدیث اور امام ابو حنیفہؒ:

خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیز ؒ (۶۱ھ-۱۰۱ھ) کے خاص اہتمام سے وقت کے دو جید محدّث شیخ ابو بکر بن الحزمؒ (متوفی ۱۲۰ھ) اور محمد بن شہاب زُہریؒ (متوفی ۱۲۵ھ) کی زیر نگرانی احادیثِ رسول کو کتابی شکل میں جمع کیا گیا؛ اب تک یہ احادیث منتشر حالتوں میں سینوں میں محفوظ چلی آرہی تھیں۔ اسلامی تاریخ میں ان ہی دونوں محدث کو حدیث کا مدوّنِ اوّل کہا جاتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ میں عمومی طور پر احادیث لکھنے سے منع فرمادیا تھا؛ تاکہ قرآن وحدیث ایک دوسرے سے مل نہ جائیں؛ البتہ بعض فقہاءِ صحابہ (جنہیں قرآن وحدیث کی عبارتوں کے درمیان فرق معلوم تھا) کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں بھی احادیث لکھنے کی محدود اجازت تھی۔ خلفاءِ راشدین کے عہد میں جب قرآن کریم تدوین کے مختلف مراحل سے گزر کر ایک کتابی شکل میں امتِ مسلمہ کے ہر فرد کے پاس پہونچ گیا تو ضرورت تھی کہ قرآنِ کریم کے اصل مفسر وخاتم النبیین وسید المرسلین حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو بھی مدون کیا جائے؛ چنانچہ احادیثِ رسول کا مکمل ذخیرہ جو منتشر اوراق اور زبانوں پر جاری تھا، انتہائی احتیاط کے ساتھ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی عہدِ خلافت (۹۹ھ-۱۰۱ھ) میں مرتب کیا گیا۔ احادیثِ نبویہ کے اس ذخیرہ کی سند میں عموماً دو راوی تھے ایک صحابی اور تابعی، بعض احادیث صرف ایک سند یعنی صحابی سے مروی تھیں۔ ان احادیث کے ذخیرہ میں ضعیف یا موضوع ہونے کا احتمال بھی نہیں تھا۔ نیز یہ وہ مبارک دور تھا، جس میں اسماء الرجال کا علم باضابطہ وجود میں نہیں آیا تھا اور نہ اس کی ضرورت تھی؛ کیونکہ حدیثِ رسول بیان کرنے والے صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ یا پھر تبع تابعین حضرات تھے اور ان کی امانت ودیانت اور تقویٰ کا ذکر اللہ تعالی نے قرآن کریم (سورۃالتوبہ آیت نمبر ۱۰۰) میں فرمایا ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہ ؒ کو انھیں احادیث کا ذخیرہ ملا تھا؛ چنانچہ انہوں نے قرآنِ کریم اور احادیث کے اس ذخیرہ سے استفادہ فرما کر امتِ مسلمہ کو اس طرح مسائلِ شرعیہ سے واقف

کرایا کہ ۱۳۰۰ سال گزر جانے کے بعد بھی تقریباً ۷۵ فیصد امت مسلمہ اس پر عمل پیرا ہے اور ایک ہزار سال سے امتِ مسلمہ کی اکثریت امام ابو حنیفہؒ کی تفسیر و تشریح اور وضاحت و بیان پر ہی عمل کرتی چلی آ رہی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کو احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم صرف دو واسطوں (صحابی اور تابعی) سے ملی ہیں؛ بلکہ بعض احادیث امام ابو حنیفہؒ نے صحابہ کرامؓ سے براہ راست بھی روایت کی ہیں۔ دو واسطوں سے ملی احادیث کو احادیث ثنائی کہا جاتا ہے، جو سند کے اعتبار سے حدیث کی اعلیٰ قسم شمار ہوتی ہے۔ بخاری و دیگر کتبِ حدیث میں ۲ واسطوں کی کوئی بھی حدیث موجود نہیں ہے، ۳ واسطوں والی یعنی احادیث ثلاثیات بخاری میں صرف ۲۲ ہیں، ان میں سے ۲۰ احادیث امام بخاریؒ نے امام ابو حنیفہؒ کے شاگردوں سے روایت کی ہیں۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کے اساتذہ:

امام ابو حنیفہؒ نے تقریباً چار ہزار مشائخ سے علم حاصل کیا، خود امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے کہ میں نے کوفہ و بصرہ کا کوئی ایسا محدث نہیں چھوڑا جس سے میں نے علمی استفادہ نہ کیا ہو، تفصیلات کے لیے سوانح امام ابو حنیفہؒ کا مطالعہ کریں، امام ابو حنیفہؒ کے چند اہم اساتذہ حسب ذیل ہیں:

"شیخ حماد بن ابی سلیمانؒ (متوفی ۱۲۰ھ): شہر کوفہ کے امام و فقیہ شیخ حمادؒ حضرت انس بن مالکؓ کے سب سے قریب اور معتمد شاگرد ہیں، امام ابو حنیفہؒ ان کی صحبت میں ۱۸ سال رہے۔ ۱۲۰ ہجری میں شیخ حمادؒ کے انتقال کے بعد امام ابو حنیفہؒ ہی ان کی مسند پر فائز ہوئے۔ شیخ حمادؒ مشہور و معروف محدث و تابعی شیخ ابراہیم نخعیؒ کے بھی خصوصی شاگرد ہیں۔ علاوہ ازیں شیخ حمادؒ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے علمی وارث اور نائب بھی شمار کیے جاتے ہیں"۔

امام ابو حنیفہؒ کی دوسری بڑی درس گاہ "شہر بصرہ" تھی جو امام المحدثین شیخ حسن بصریؒ (متوفی ۱۱۰ھ) کے علومِ حدیث سے مالا مال تھی؛ یہاں بھی امام ابو حنیفہؒ نے علمِ حدیث کا بھرپور حصہ پایا۔

شیخ عطا بن ابی رباحؒ (متوفی ۱۱۴ھ): مکہ مکرمہ میں مقیم شیخ عطا بن ابی رباحؒ سے بھی امام ابو حنیفہؒ نے بھرپور استفادہ کیا۔ شیخ عطا بن ابی رباحؒ نے بے شمار صحابہ کرامؓ خاص کر حضرت عائشہؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ،

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے استفادہ کیا تھا۔ شیخ عطاء بن ابی رباحؒ صحابی رسول حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے خصوصی شاگرد ہیں۔

شیخ عکرمہ بربریؒ (متوفی ۱۰۴ھ): یہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے خصوصی شاگرد ہیں۔ کم وبیش ۷۰ مشہور تابعین ان کے شاگرد ہیں، امام ابوحنیفہؒ بھی ان میں شامل ہیں۔ مکہ مکرمہ میں امام ابوحنیفہؒ نے ان سے علمی استفادہ کیا۔

مدینہ منورہ کے فقہاءِ سبعہ میں سے حضرت سلیمانؒ اور حضرت سالم بن عبداللہ بن عمرؒ سے امام ابوحنیفہؒ نے احادیث کی سماعت کی ہے۔ یہ ساتوں فقہاء مشہور ومعروف تابعین تھے۔ حضرت سلیمانؒ ام المؤمنین حضرت میمونہؓ کے پروردہ غلام ہیں جب کہ حضرت سالمؒ حضرت عمر فاروقؓ کے پوتے ہیں، جنہوں نے اپنے والد صحابیِ رسول حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے تعلیم حاصل کی تھی۔

ملک شام میں امام اوزاعیؒ اور امام مکحولؒ سے بھی امام ابوحنیفہؒ نے اکتسابِ علم کیا ہے۔

دیگر محدثین کے طرز پر امام ابوحنیفہؒ نے احادیث کی سماعت کے لیے حج کے اسفار کا بھرپور استعمال کیا؛ چنانچہ آپ نے تقریباً ۵۵ حج ادا کیے۔ حج کی ادائیگی سے قبل وبعد مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں قیام فرماکر قرآن وسنت کو سمجھنے اور سمجھانے میں وافر وقت لگایا۔ بنوامیہ کے آخری عہد میں جب امام ابوحنیفہؒ کا حکمرانوں سے اختلاف ہوگیا تھا تو امام ابوحنیفہؒ نے تقریباً ۷ سال مکہ مکرمہ میں مقیم رہ کر تعلیم وتعلم کے سلسلہ کو جاری رکھا۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے تلامذہ:

"سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کے مصنف اول "علامہ شبلی نعمانیؒ" نے اپنی مشہور ومعروف کتاب "سیرۃ النعمان" میں لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے درس کا حلقہ اتنا وسیع تھا کہ خلیفۂ وقت کی حدودِ حکومت اس سے زیادہ وسیع نہ تھیں۔ سیکڑوں علماء ومحدثین نے امام ابوحنیفہؒ سے علمی استفادہ کیا۔ امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص علم فقہ میں کمال حاصل کرنا چاہے اس کو امام ابوحنیفہؒ کے فقہ کا رخ کرنا چاہیے، اور یہ بھی فرمایا کہ اگر امام محمدؒ (امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد) مجھے نہ ملتے تو شافعیؒ، شافعیؒ نہ ہوتا؛ بلکہ کچھ اور ہوتا۔ امام ابوحنیفہؒ کے چند مشہور شاگردوں کے نام حسب ذیل ہیں جنہوں نے اپنے استاذ کے مسلک کے مطابق درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔

قاضی ابویوسف ؒ، امام محمد بن حسن الشیبانیؒ، امام زفر بن ہذیلؒ، امام یحییٰ بن سعید القطانؒ، امام یحییٰ بن زکریاؒ، محدث عبداللہ بن مبارکؒ، امام وکیع بن الجراحؒ، اور امام داؤد الطائی وغیرہ۔

قاضی ابویوسف ؒ (متوفی ۱۸۲ھ): آپ کا نام یعقوب بن ابراہیم انصاری ہے۔ ۱۱۳ھ یا ۱۱۷ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔ امام ابویوسف کو معاشی تنگی کی وجہ سے تعلیمی سلسلہ جاری رکھنا مشکل ہو گیا تھا؛ مگر امام ابوحنیفہؒ نے امام یوسفؒ اور ان کے گھر کے تمام اخراجات برداشت کر کے ان کو تعلیم دی۔ ذہانت، تعلیمی شوق اور امام ابوحنیفہؒ کی خصوصی توجہ کی وجہ سے قاضی ابویوسفؒ ایک بڑے محدث وفقیہ بن کر سامنے آئے۔ فقہ حنفی کی تدوین میں قاضی ابویوسفؒ کا اہم کردار ہے۔ عباسی دورِ حکومت میں قاضی القضاۃ کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب کسی کو قاضی القضاۃ کے عہدہ پر فائز کیا گیا۔ امام ابوحنیفہؒ سے بعض مسائل میں اختلاف بھی کیا؛ لیکن پوری زندگی خاص کر قاضی القضاۃ کے عہدہ پر فائز ہونے کے بعد فقہ حنفی کو ہی نشر کیا۔ مسلکِ امام ابوحنیفہؒ پر اصولِ فقہ کی اوّلین کتاب تحریر فرمائی۔ ۱۸۲ھ میں وفات ہوئی۔

امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ (متوفی ۱۸۹ھ): آپ ۱۳۱ھ میں دِمشق میں پیدا ہوئے، پھر فقہاء ومحدثین کے شہر کوفہ چلے گئے، وہاں بڑے بڑے محدثین اور فقہاء کی صحبت پائی۔ امام ابوحنیفہؒ سے تقریباً دو سال جیل میں تعلیم حاصل کی۔ امام ابوحنیفہؒ کی وفات کے بعد قاضی ابویوسفؒ سے تعلیم مکمل کی، پھر مدینہ منورہ جا کر امام مالکؒ سے حدیث پڑھی۔ صرف بیس سال کی عمر میں مسندِ حدیث پر بیٹھ گئے۔ یہ فقہ حنفی کے دوسرے اہم بازو شمار کیے جاتے ہیں، اسی لیے امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کو صاحبین کہا جاتا ہے۔ امام محمدؒ کے بے شمار شاگرد ہیں؛ لیکن امام شافعیؒ کا نام خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ امام محمدؒ کی حدیث کی مشہور کتاب "موطا امام محمد" آج بھی ہر جگہ موجود ہے۔ امام محمدؒ کی تصنیفات بہت ہیں، فقہ حنفی کا مدار انھیں کتابوں پر ہے، ان کی درج ذیل کتابیں مشہور ومعروف ہیں جو فتاویٰ حنفیہ کا مآخذ ہیں: المبسوط۔ الجامع الصغیر۔ الجامع الکبیر۔ الزیادات۔ السیر الصغیر۔ السیر الکبیر۔

امام زفرؒ (متوفی ۱۵۸ھ): امام زفر بن ہذیلؒ ۱۱۰ ہجری میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عمر میں علم حدیث سے خاص شغف وتعلق تھا، علامہ نوویؒ نے ان کو اصحاب الحدیث میں شمار کیا ہے، پھر علم فقہ کی جانب توجہ کی اور اخیر عمر تک یہی مشغلہ رہا۔ بصرہ میں قاضی کے عہدہ پر بھی فائز رہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے خاص شاگردوں میں سے ہیں، آپ فقہ حنفی کے اہم ستون ہیں۔

امام یحییٰ بن سعید القطانؒ (متوفی ۱۹۸ھ): آپ ۱۲۰ ہجری میں پیدا ہوئے۔ علامہ ذہبیؒ نے تحریر کیا ہے کہ فن اسماءالرجال (سند حدیث پر بحث کا علم) سب سے پہلے انہوں نے ہی شروع کیا ہے۔ پھر اس کے بعد دیگر حضرات، مثلاً امام یحییٰ بن معینؒ نے اس علم کو باقاعدہ فن کی شکل دی۔ امام یحییٰ بن سعید القطانؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے علمی استفادہ کیا ہے۔

امام عبداللہ بن مبارکؒ (متوفی ۱۸۱ھ): یہ بھی امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ علم حدیث میں بڑی مہارت حاصل کی، یہاں تک کہ امیر المؤمنین فی الحدیث کا لقب ملا۔ ۱۱۸ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۸۱ ہجری میں وفات پائی۔ امام عبداللہ بن مبارکؒ کا قول ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ابوحنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کے ذریعہ میری مدد نہ فرماتے تو میں ایک عام انسان سے بڑھ کر کچھ نہ ہوتا۔

امام ابوحنیفہؒ کی کتابیں:

امام ابوحنیفہؒ نے دورانِ درس جو احادیث بیان کی ہیں انھیں شاگردوں نے "حَدَّثَنَا" اور "اَخْبَرَنَا" وغیرہ الفاظ کے ساتھ جمع کر دیا۔ امام ابوحنیفہؒ کے درسی افادات کا نام "کتاب الآثار" ہے، جو دوسری صدی ہجری میں مرتب ہوئی، اس زمانہ تک کتابوں کی تالیف بہت زیادہ عام نہیں تھی۔ "کتاب الآثار" اس دور کی پہلی کتاب ہے جس نے بعد کے آنے والے محدثین کے لیے ترتیب و تبویب کے راہ نما اصول فراہم کیے۔ علامہ شبلی نعمانیؒ نے "کتاب الآثار" کے متعدد نسخوں کی نشاندہی کی ہے؛ لیکن عام شہرت چار نسخوں کو حاصل ہے۔ ان نسخوں میں سے امام محمدؒ کی روایت کردہ کتاب کو سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔

مشہور محقق عالم مولانا عبدالرشید نعمانیؒ نے "کتاب الآثار" کے مقدمہ میں قوی روایتوں کی روشنی میں لکھا ہے کہ کتاب الآثار براہِ راست امام ابوحنیفہؒ کی تالیف ہے، امام محمد، امام ابویوسف، امام زفر وغیرہ اس کے راوی ہیں۔ (مرتب)

"کتاب الآثار"، "بہ روایت امام محمدؒ"، "کتاب الآثار"، "بہ روایت قاضی ابویوسفؒ"

"کتاب الآثار"، "بہ روایت امام زفرؒ"، "کتاب الآثار"، "بہ روایت امام حسن بن زیادؒ"

مسانید امام ابوحنیفہؒ:

علماء کرام نے امام ابو حنیفہؒ کی پندرہ مسانید شمار کی ہیں جن میں ائمہ دین اور حفاظِ حدیث نے آپ کی روایات کو جمع کر کے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا، ان میں سے مسند امام اعظمؒ علمی دنیا میں مشہور ہے، جس کی متعدد شروحات بھی تحریر کی گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑا کام ملک شام کے امام ابوالموئد خوارزمیؒ (متوفی ۶۶۵ھ) نے کیا ہے جنہوں نے تمام مسانید کو بڑی ضخیم کتاب "جامع المسانید" کے نام سے جمع کیا ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کے مشہور شاگرد امام محمدؒ کی مشہور و معروف کتابیں بھی فقہ حنفی کے اہم مآخذ ہیں:

المبسوط۔ الجامع الصغیر۔ الجامع الکبیر۔ الزیادات۔ السیر الصغیر۔ السیر الکبیر۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کی شان میں بعض علماء امت کے اقوال:

* امام علی بن صالحؒ (متوفی ۱۵۱ھ) نے امام ابو حنیفہؒ کی وفات پر فرمایا: عراق کا مفتی اور فقیہ گزر گیا۔

(مناقب ذہبی ص ۱۸)

* امام مسعر بن کدامؒ (متوفی ۱۵۳ھ) فرماتے تھے کہ کوفہ کے دو کے سوا کسی اور پر رشک نہیں آتا۔ امام ابو حنیفہؒ اور اور ان کا فقہ، دوسرے شیخ حسن بن صالحؒ اور ان کا زہد وقناعت۔ (تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۳۲۸)

* ملک شام کے فقیہ ومحدث امام اوزاعیؒ (متوفی ۱۵۷ ھ)فرماتے تھے کہ امام ابو حنیفہؒ پیچیدہ مسائل کو سب اہل علم سے زیادہ جاننے والے تھے۔ (مناقب کردی ص ۹۰)

* امام داؤد الطائیؒ (متوفی ۱۶۰ھ) فرماتے تھے کہ امام ابو حنیفہؒ کے پاس وہ علم تھا جس کو اہل ایمان کے دل قبول کرتے ہیں۔ (الخیرات الحسان ص ۳۲)۔

* امام سفیان ثوریؒ (متوفی ۱۶۷ھ) کے پاس ایک شخص امام ابو حنیفہؒ سے ملاقات کر کے آیا۔ امام سفیان ثوریؒ نے فرمایا تم روئے زمین کے سب سے بڑے فقیہ کے پاس سے آرہے ہو۔ (الخیرات الحسان ص ۳۲)

* امام مالک بن انسؒ (متوفی ۱۷۹ھ) فرماتے ہیں کہ میں نے ابو حنیفہؒ جیسا انسان نہیں دیکھا۔ (الخیرات الحسان ص ۲۸)

* امام وکیع بن الجراحؒ (متوفی ۱۹۵ ھ) فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ سے بڑا فقیہ اور کسی کو نہیں دیکھا۔

* امام یحییٰ بن معین ؒ (متوفی ۲۳۳ھ) امام ابو حنیفہ ؒ کے قول پر فتویٰ دیا کرتے تھے اور ان کی احادیث کے حافظ بھی تھے۔ انہوں نے امام ابو حنیفہ ؒ کی بہت ساری احادیث سنی ہیں۔ (جامع بیان العلم، علامہ ابن عبد البر، ج ۲ ص ۱۴۹)

* امام سفیان بن عینیہ ؒ (متوفی ۱۹۸ھ) فرماتے تھے کہ میری آنکھوں نے ابو حنیفہ ؒ جیسا انسان نہیں دیکھا۔ دو چیزوں کے بارے میں خیال تھا کہ وہ شہر کوفہ سے باہر نہ جائیں گی؛ مگر وہ زمین کے آخری کناروں تک پہنچ گئیں۔ ایک امام حمزہ ؒ کی قرأت اور دوسری ابو حنیفہ ؒ کا فقہ۔ (تاریخ بغداد۔ ج۱۳ ص ۳۴۷)

* امام شافعیؒ (متوفی ۲۰۴ھ) فرماتے ہیں کہ ہم سب علم فقہ میں امام ابو حنیفہ ؒ کے محتاج ہیں۔ جو شخص علم فقہ میں مہارت حاصل کرنا چاہے وہ امام ابو حنیفہ ؒ کا محتاج ہوگا۔ (تاریخ بغداد ج ۲۳ ص ۱۶۱)

* امام بخاریؒ کے استاذ امام مکی بن ابراہیمؒ فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ ؒ پرہیزگار، عالم آخرت کے راغب اور اپنے معاصرین میں سب سے بڑے حافظ حدیث تھے۔ (مناقب الامام ابی حنیفہ ؒ ۔ شیخ موفق بن احمد مکیؒ)

* امام موفق بن احمد مکیؒ ' امام بکر بن محمد زرنجریؒ (متوفی ۱۵۲ھ) کے حوالہ سے تحریر کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ ؒ نے کتاب الآثار کا انتخاب چالیس ہزار احادیث سے کیا ہے۔ (مناقب امام ابی حنیفہ ؒ)

امام ابو حنیفہ:

(بحوالہ تذکرہ الحفاظ جلد دوم)

ابو حنیفہ امام اعظم، عراق کے فقیہ، نعمان بن ثابت بن زوطا التیمی، ولادت 80 ہجری، حضرت انس بن مالکؓ کو ان کے کوفہ آنے پر کئی مرتبہ دیکھا۔

انہوں نے عطاء، نافع، عبدالرحمٰن بن ہرمز الاعرج، عدی بن ثابت، سلمہ بن کہیل، ابو جعفر محمد بن علی، قتادہ، عمر بن دینار، ابو اسحاق اور دوسرے بہت سے محدثین سے روایت کی۔

ان سے فقہ حاصل کرنے میں زفر بن ہذیل، داوٗد الطائی، قاضی ابویوسف، محمد بن حسن، اسد بن عمرو، حسن بن زیاد لولوئی اور نوح الجامع اور دوسرے حضرات ہیں۔ان سے روایت کرنے والوں میں وکیع، یزید بن ہارون، سعد بن صلت، ابوعاصم، عبدالرزاق اور عبیداللہ بن موسیٰ اور ابونعیم اور ابوعبدالرحمٰن المقری اور بہت سارے لوگ ہیں۔

آپ امام، صاحب ورع، عالم، عامل، عبادت گزار اور بڑی شان والے تھے۔شاہی عطایا کو قبول نہیں کرتے ہیں بلکہ تجارت کرکے اپنے گزر بسر کا سامان کرتے تھے۔ضرار بن صرد سے روایت ہے کہ یزید بن ہارون سے پوچھا گیا کہ سفیان ثوری اور ابوحنیفہ میں زیادہ فقیہ کون ہے۔ توانہوں نے جواب دیا کہ زیادہ فقیہ تو ابوحنیفہ ہیں البتہ حفظ حدیث میں سفیان ثوری زیادہ ہیں۔ابن مبارک کہتے ہیں ابوحنیفہ تمام لوگوں نے میں سب سے زیادہ فقیہ ہیں۔امام شافعی کا قول ہے کہ لوگ فقہ میں ابوحنیفہ کے محتاج ہیں۔ احمد بن محمد بن قاسم بن محرز نے یحییٰ بن معین سے امام ابوحنیفہ کے بارے میں نقل کیا ہے۔لاباس بہ اور وہ متہم نہیں تھے۔ان کو یزید بن عمر بن ہبیرہ نے عہدہ قضاء قبول کرنے پر مجبور کرنا چاہا لیکن انہوں نے انکار کردیا۔ابوداوٗد(صاحب سنن ابوداوٗد) کہتے ہیں بیشک ابوحنیفہ امام تھے۔بشر بن ولید امام ابویوسف سے نقل کرتے ہیں کہ میں ابوحنیفہ کے ساتھ چل رہا تھا اسی درمیان کسی شخص نے کہا کہ ابوحنیفہ ہیں جو ساری رات سوتے نہیں ہیں(مراد پوری رات عبادت میں گزارتے ہیں)امام ابوحنیفہ نے فرمایا خدا کی قسم ایسا نہیں ہوگا کہ لوگ میرے بارے میں ایسی باتیں کریں جو میں نہیں کرتا اس کے بعد پورے رات نماز، دعا اور خدا کے حضور میں گریہ وزاری میں گزارنے لگے۔میں(حافظ ذہبی) کہتا ہوں میں نے اس امام کے مناقب کو ایک جزء میں الگ سے ذکر کیا ہے۔ان کی وفات رجب کے مہینہ میں 150 ہجری میں ہوئی۔ انبانا ابن قدامہ اخبرنا بن طبرزاد انا ابوغالب بن البناء انا ابومحمد الجوھری انا ابوبکر القطیعی نا بشر بن موسیٰ انا ابوعبدالرحمن المقری عن ابی حنیفۃ عن عطاء عن جابر ان راہ یصلی فی قمیص خفیف لیس علیہ ازار ولا رداء قال: ولااظنہ صلی فیہ الا لیرینا انہ لاباس بالصلاۃ فی الثوب الواحد.

امام ابوحنیفہؒ کو مشہور محدث عقیلی نے بھی اپنی کتاب ضعفاء میں ذکر کیا ہے۔لیکن خود عقیلی نے صرف امام ابوحنیفہ کو ہی نہیں بلکہ کئی اور مشہور محدثین کا اپنی ضعفاء میں ذکر کیا ہے اور بسا اوقات ضعف کی وجہ صرف یہ بیان کی ہے کہ ان کی بیان کردہ حدیث کی متابعت نہیں ہوئی ہے۔اس پر حافظ ذہبی نے علی بن المدینی کے تذکرہ میں عقیلی پر سخت تنقید کرتے ہوئے لکھاہے عقیلی کیا تمہیں عقل نہیں ہے کہ تم کس کے بارے میں بول رہے ہو،ہم نے تمہارے طریقہ کار کی پیروی صرف اسلئے کی ہے تاکہ ان پر لگائے گئے الزامات کو دفع کرسکیں اور اس کھوٹ کو واضح کریں جو ان کے بارے میں کہا گیا ہے۔گویا تم نہیں جانتے کہ ان میں سے ہر ایک (علی بن مدینی، اس کے شاگرد محمد بن اسمٰعیل بخاری، اوان کے شیخ عبدالرزاق، عثمان بن شیبہ، ابراہیم بن سعد، عفان، ابان بن عطار، اسرائیل، ازہر سمان، بھز بن اسد ثابت بنانی جریر بن عبدالحمید) تم سے کئی گنا زیادہ ثقہ ہے۔بلکہ ان ثقات سے بھی کہیں زیادہ ثقہ ہے جن کا ذکر تم نے اپنی کتاب میں نہیں کیا ہے۔اس کے بعد حافظ ذہبی نے اس پر بحث کی ہے کہ اگر کسی راوی کی روایت پر متابعت نہیں ہوتی ہے تو یہ اس کے ضعف کی علامت نہیں بلکہ اس کے زیادتی علم کی دلیل ہے۔

الرفع والتکمیل میں امام لکنوی نے ایک باب اس پر باندھا ہے کہ جرح کا منشا اگر تعصب، نفرت یا معاصرت وغیرہ ہے تو اس کو قبول نہیں کیا جائے گا۔اور اس بارے میں امام مالک کی مثال دی گئی ہے کہ ان کی جرح محمد بن اسحاق پر کہ وہ دجالوں میں سے ایک

دجال ہیں قبول نہیں کیا گیا کیونکہ انہوں نے یہ جرح تب کی تھی جب محمد بن اسحاق نے ان کے نسب کے بارے میں کچھ کہا تھا۔ اسی طرح امام نسائی کی جرح احمد بن صالح مصری اور سفیان ثوری کی جرح امام ابو حنیفہ کے بارے میں قبول نہیں کی گئی۔ اور نہ ہی ابن معین کی امام شافعی کے بارے میں اور امام احمد بن حنبل کی جرح حارث محاسبی کے بارے میں اور ابن مندہ کی جرح ابو نعیم الاصبہانی کے بارے میں قبول کی گئی ہے۔ امام ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں سمین مفسر ابو عبداللہ محمد بن حاتم البغدادی کے بارے میں ابو حفص فلاس کی جرح لیس بشیء ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ یہ معاصر کا کلام ہے جس کی جانب توجہ نہیں دینی چاہئے۔ ابو عبداللہ کی ثقاہت ثابت ہے اور وہ حجت ہیں۔ امام ذہبی نے اسی طرح بہت سارے معاصرین کے کلام کو ایک دوسرے کے بارے میں ذکر کرکے رد کیا ہے جس کو تفصیل چاہئے وہ الرفع والتکمیل کا مطالعہ کرے۔

تاج سبکی نے طبقات الشافعیہ میں لکھا ہے: "اے راہ راست کے متلاشی تمہیں چاہئے کہ تم ان ائمہ علم وفن کے ساتھ جو گزر چکے ادب اور تکریم کا طریقہ اختیار کرو اور ان میں سے بعض نے بعض پر جو تنقید کی ہے اس کی جانب دھیان مت دو۔ مگر اسی وقت جب کہ جرح واضح دلیل کے ساتھ ہو، اس کے باوجود اگر تمہارے پاس اس بارے میں کوئی بہتر تاویل اور حسن ظن ہو سکتی ہے تو وہ کرو، اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اسکی جانب دھیان نہ دے کر اسے چھوڑ دو کیونکہ تم اس کیلئے پیدا نہیں کئے گئے ہو، اور خبردار تم اس جانب دھیان دو جو کہ ابو حنیفہ اور سفیان ثوری کے درمیان واقع ہوا یا امام مالک اور ابن ابی ذئب کے درمیان جو واقعہ ہوا، یا احمد بن صالح اور امام نسائی کے درمیان یا احمد بن حنبل اور حارث محاسبی کے درمیان اسی طرح یہاں تک کہ ساتویں صدی ہجری میں عز بن عبدالسلام اور تقی بن صلاح (ابن صلاح) کے درمیان جو حادثہ ہوا اگر تم ان واقعات میں دھیان دوگے تو اندیشہ ہے کہ ہلاک ہو جاؤ۔ یہ نابغہ روزگار شخصیتیں تھیں اور ان کے اقوال کے عمدہ محامل ہیں تو ہمیں چاہئے کہ ہم اس بارے میں سکوت اختیار کریں جیسا کہ مشاجرات صحابہ کے بارے میں ہم کرتے ہیں۔

تاج سبکی نے ایک دوسرے مقام پر یہ بھی لکھا ہے: کہ اس سے مکمل پرہیز کرو اور یہ مت سمجھو کہ اصول حدیث کا یہ قاعدہ کہ جرح مقدم ہوتی ہے تعدیل پر، اپنے اطلاق پر ہے بلکہ اس بارے میں درست رائے یہ ہے کہ جس کی امامت وعدالت ثابت ہو چکی ہو، اور اس کی تعدیل کرنے والے زیادہ اور جرح کرنے والے کم ہوں اور کوئی ایسا قرینہ بھی ہو جس سے پتہ چل رہا ہو کہ جرح کا منشاء تعصب یا کچھ دوسری چیز ہے تو ایسی جرح کی جانب دھیان نہیں دیا جائے گا۔

تاج سبکی نے ہی ایک اور جگہ لکھا ہے: یہ تم جان چکے کہ جرح اگرچہ مفسر ہو لیکن اس شخص کے حق میں قبول نہیں ہوگی جس کی نیکیاں گناہوں سے زیادہ ہوں، اور اس کی تعریف کرنے والے اس کی برائی بیان کرنے والوں سے زیادہ ہوں۔ اور اس کی تعدیل کرنے والے جرح کرنے والے زیادہ ہوں اور جرح پر ایسے قرائن بھی ہو جس سے پتہ چل رہا کہ اس جرح کا منشا مذہبی تعصب (اس دور میں مذہبی تعصب اصحاب رائے یعنی فقہ والے اور محدثین کے درمیان پائے جانے والے اختلافات مراد ہیں) یا کوئی دنیوی امر ہے جیسا کہ معاصرین اور دوسروں میں ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں سفیان ثوری کی جرح امام ابو حنیفہ پر، ابن ابی ذئب کی امام مالک پر، ابن معین کی امام شافعی پر، امام نسائی کی احمد بن صالح پر قبول نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ اگر ہم جرح کو تعدیل پر مقدم رکھنے کا اصول علی الاطلاق مان لیں تو پھر کوئی بھی امام ایسا نہیں ہوگا جس پر کسی نے تنقید نہ کی ہو۔

ابن حجر مکی نے خیرات الحسان فی مناقب النعمان کی 39 ویں فصل میں امام ابو حنیفہ کے جو مثالب خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں ذکر کیا ہے: اس کو مسترد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جان لو کہ خطیب بغدادی کا ارادہ صرف مورخین کے طرز پر یہ تھا کہ جو کچھ امام ابو حنیفہ کے بارے میں کہا گیا ہے اس کو نقل کر دیا جائے۔ اس سے ان کا ارادہ ہر گز یہ نہیں تھا کہ امام ابو حنیفہ کی تنقیص کی جائے یا ان کے مرتبہ کو گرایا جائے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے پہلے ان لوگوں کے اقوال ذکر کئے ہیں جنہوں نے امام ابو حنیفہ کے علم و فضل کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی تعریف کی ہے اور ایسے اقوال زیادہ ہیں بہ نسبت ان اقوال کے جو ان کے مثالب میں مذکور ہیں۔ اس کی ایک اور دلیل یہ بھی ہے کہ وہ اقوال جو امام ابو حنیفہ کے مثالب میں ہیں ان کی کوئی سند ایسی نہیں ہے جس میں کوئی راوی متکلم فیہ یا مجہول نہ ہو۔ ایسی سند کے اقوال سے تو ایک عام مسلمان کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا چہ جائے کہ مسلمانوں کے اماموں میں سے ایک امام کے بارے میں ایسی سند سے کلام کیا جائے۔ اور اگر مان بھی لیا جائے کہ خطیب نے مثالب میں جو اقوال ذکر کئے ہیں وہ صحیح ہیں تو وہ اس لئے قابل قبول نہیں ہے کہ اگر بعد والوں کے ہیں تو انہوں نے اپنے پیش روؤں کی تقلید کرتے ہوئے اسے نقل کیا ہے جو ان کے معاصرین یا ان سے نفرت کرنے والوں نے لکھا ہے اور یہ بات واضح ہے کہ معاصر کا قول اپنے معاصر کے بارے میں مقبول نہیں ہے۔

حافظ ذہبی اپنی مشہور عالم تصنیف تذکرۃ الحفاظ میں امام ابو حنیفہ کے ترجمہ میں لکھتے ہیں :ابو حنیفة الامام الاعظم ،فقیه العراق،نعمان بن ثابت بن زوطاالتیمی تذکرة الحفاظ/جلد 2

مشہور محدث محمد بن رستم بن قباد الحارثی البدخشی نے تراجم الحفاظ میں امام ابو حنیفہ کے بارے میں لکھا ہے۔ النعمان بن ثابت الکوفی الامام الاعظم احمد الائمة الاربعة المتبوعین.

محمد علی بن محمد علان بن ابراہیم الصدیقی العلوی الشافعی اپنی کتاب الفتوحات الربانیہ علی الاذکار النوویہ میں امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔ الامام ابو حنیفہ ہو الامام الاعظم والعلم المفرد المکرم امام الائمۃ عبدالوہاب شعرانی اپنی کتاب میزان الکبریٰ میں امام ابو حنیفہ سے مخالفین کے پھیلائے گئے شبہات کا رد کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

فاولهم تبريا من كل راى يخالف ظاهر الشريعة الامام الاعظم ابو حنيفه النعمان بن ثابت رضي الله عنه ،خلاف مايضيفه اليه بعض المتعصبين ويافضحة يوم القيامة من الامام

ایسا نہیں ہے کہ صرف امام ابو حنیفہ کو ہی لوگوں نے امام اعظم کے لقب سے پکارا ہو۔
ابن قیم نے امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کے تعلق سے " قصیدہ نونیہ " میں کہا ہے۔

هذا الذي نصت عليه أئمه ال اسلام اہل العلم والعرفان

وہو الذی قصد البخاری الرضی لکن تقاصر قاصر الاذہان

عن فهمه كتقاصر الافہام عن قول الامام الاعظم الشيباني

اب پتہ نہیں امام اعظم کے لقب پر یہ سوچنے والے کہ امام اعظم تو رسول پاک ہیں اس بارے میں کیا کہیں گے۔ ہمیں بھی جواب کا انتظار رہے گا۔

امام اعظم کے لقب سے ملقب ہونے کی وجہ:

اس بارے میں یہ بات سب جانتے ہیں کہ فقہ میں کوئی امام ابو حنیفہ کا مشارک اور ہم رتبہ نہیں ہے۔امام شافعی نے بھی کہا ہے کہ الناس عیال علی فقہ ابی حنیفہ ۔انہی سے یہ دوسرا قول بھی منقول ہے کہ جو فقہ میں رسوخ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ ابو حنیفہ کی فقہ کی جانب توجہ کرے۔ویسے دیکھا جائے تو ائمہ اربعہ میں سے امام شافعی امام محمد کے شاگرد ہونے کی وجہ اور امام احمد بن حنبل کے امام شافعی اور امام ابو یوسف کے شاگرد ہونے کی وجہ سے یہ بات محقق ہے کہ ائمہ اربعہ میں سے دو امام امام ابو حنیفہ کے شاگردوں میں سے ہیں۔جیسا کہ علی طنطاوی نے ذکریات میں ذکر کیا ہے:قال الشیخ علي الطنطاوي رحمه الله في کتابه الذکریات الجزء السابع ص: 118

الشافعي قرا علی محمد (یقصد ابن الحسن) کتبه الفقهیة فکان شبه تلمیذ له واحمد تلمیذ الشافعي فمن هنا کان ابو حنیفه الامام الاعظم انتهی کلامه رحمه الله

لیکن اس کے علاوہ بھی امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے امام اعظم سے متصف ہونے کی دوسری وجوہات بھی ہیں جن کو علماء نے ذکر کیا ہے۔ان میں سے ایک توجیہ تو یہ ہے کہ حنیفہ نے صاحبین یعنی امام ابو یوسف اور امام محمد بن حسن سے امام ابو حنیفہ کو ممتاز اور جداگانہ تشخص کیلئے ان کو امام اعظم کا لقب دیا۔جیسا کہ علماء احناف پر لکھی گئی کتابوں سے واضح ہوتا ہے۔

امام الاعظم ابی حنیفہ رحمہ اللہ اور خطیب بغدادی کی کتاب (تاریخ بغداد) پر ایک تحقیقی نظر

حافظ ابی بکر احمد بن علی الخطیب البغدادی کی کتاب تاریخ بغداد چودہ جلدوں میں ہے،اس کتاب میں فقہاء ومحدثین وارباب علوم وائمہ دین ودیگر مشاہیر زمانہ کے تقریبا (7831) تراجم وسوانح واحوال بیان کیئے گئے ہیں،اور یہ کتاب خطیب البغدادی کی اہم اور بڑی مشہور کتاب ہے،کتاب میں تمام علماء بغداد کی تاریخ بیان کرتے ہیں،مقدمۃ الکتاب میں وضاحت فرماتے ہیں کہ یہ تاریخ ان لوگوں پر مشتمل ہوگی،

اس سلسلہ میں اہل مدینۃ السلام یعنی (بغداد) کے خلفاء،واشراف،وکبراء،وقضاۃ،وفقہاء،ومحدثین،وقراء،وزہاد،وصلحاء،ومتأدبین،وشعراء کا تذکرہ ہوگا،اور اہل مدینۃ السلام سے وہ مراد ہیں جو وہاں پیدا ہوئے یا کسی دوسرے مقام سے آکر وہاں سکونت پذیر ہوئے،اور وہ جو بغداد کو چھوڑ کر دوسری جگہ فوت ہوئے،اور وہ جو اس کے قرب وجوار میں ساکن تھے یا وہاں آکر رہے،ان کی کنیت،ان کا حسب نسب،مشہور واقعات،تاریخ وفات وغیرہ بقدر اپنی علم ومعرفت جمع کیئے ہیں الخ

یہ تو کتاب " تاریخ بغداد " سے متعلق بات تھی،امام الاعظم ابی حنیفۃ رحمہ اللہ سے متعلق خطیب البغدادی رحمہ اللہ جو کچھ ذکر کیا ہے،اصل بات میں نے وہی عرض کرنی ہے،خطیب البغدادی رحمہ اللہ نے تقریبا (44) چوالیس صفحات پر امام الاعظم ابی حنیفۃ رحمہ اللہ کے فضائل ومناقب لکھے ہیں،پھر اس کے بعد وہ اقوال لکھے ہیں جو امام صاحب کے خلاف منقول ہیں،اور ان اقوال کو نقل کرنے سے پہلے خطیب البغدادی رحمہ اللہ یہ تمہید بیان کی ہے:

"خطیب البغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ہم نے ایوب السختیانی اور سفیان الثوری اور سفیان بن عیینۃ اورابی بکر بن عیاش وغیرہم ائمہ کرام سے ابی حنیفۃ رحمہ اللہ کی مدح وثناء وتعریف میں بیان کردیئے ہیں، لیکن ناقلین حدیث کے یہاں ائمہ مذکورین کے ایسے اقوال بہی محفوظ ہیں جو مذکورہ بالا بیان (یعنی امام الأعظم کے فضائل ومناقب) کے خلاف ہیں، اور انہوں نے اس بارے میں بہت کلام کیا ہے، اوراس کلام کی وجہ وہ امور شنیعہ ہیں جوان کے متعلق محفوظ کی گئ ہیں، ان میں سے بعض تواصول دین سے متعلق ہیں اور بعض فروع سے متعلق ہیں، ہم ان شاء اللہ ان کا ذکر کریں گے، جولوگ اس کو (یعنی امام الأعظم کے مخالف اقوال) سننا ناپسند کریں توہم ان سے معذرت کرتے ہیں، اس لیئے کہ ہم ابی حنیفۃ رحمہ اللہ کے جلالت قدر (بلند مرتبہ) کے قائل ہیں، لیکن ان کواس بارے میں دوسرے علماء کی طرح سمجھتے ہیں کہ ان (ابی حنیفۃ رحمہ اللہ) کے خلاف جو باتیں بیان کی گئ ہیں ان کو بہی ہم بیان کردیں جیساکہ ہم نے دوسرے علماء کے ذکر میں کیا ہے"۔

یہ تمہید لکھنے کے بعد خطیب البغدادی رحمہ اللہ نے پہر وہ اقوال نقل کیئے ہیں جو امام الأعظم ابی حنیفۃ رحمہ اللہ کے خلاف بیان کیئے گئے ہیں اور یہ یاد رہے کہ یہ مخالف اقوال اور جرحیں سب غیر مفسراور غیر مُبین السبب ہیں یعنی ان تمام جرحوں کی کوئ وجہ اور سبب اور تفصیل وتشریح بیان نہیں کی گئ ہے بس صرف فلاں فلاں سے نقل کی گئ ہیں، اسی طرح خود خطیب البغدادی رحمہ اللہ نے بہی ان مخالف اقوال اور جرحوں کے ناقلین اور راویوں کی عدالت کی توثیق نہیں کی ہے، لہٰذا یہ دونوں باتیں اہم ہیں یعنی جرحیں سب غیر مُفَسّراور غیر مُبَینُ السَبَب ہیں اور خود خطیب نے ان کے راویوں کی توثیق نہیں کی ہے۔

امام الأعظم رحمہ اللہ پر کی گئ جرحوں پرایک تحقیقی نظر:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی مُسند میں امام الأعظم رحمہ اللہ کی حدیث بہی نقل کی ہے اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی مُسند میں بے اصل احادیث کو نقل نہیں کیا اس لیئے اگر وہ کذاب سمجھتے توان کی حدیث کیوں نقل کرتے ؟؟ (حدیث ملاحظہ کریں مسند بریدہ ج 5، ص 35)

حضرت امام ابو حنیفہ اور سفیان ثوری:

حضرت امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ ان لوگوں میں سے تھے جن کو امام صاحب سے ہمسری کا دعویٰ تھا پھر بھی وہ امام صاحب کے علوم سے بے نیاز نہ تھے انہوں نے بڑے لطائف الحیل سے کتاب الرہن کی نقل حاصل کی اور اس کو اکثر پیش نظر رکھتے تھے، زائدہ کا بیان ہے کہ میں نے ایک دن سفیان کے سرہانے ایک کتاب دیکھی جس کا وہ مطالعہ کر رہے تھے ان سے اجازت لے کر میں اسکو دیکھنے لگا توامام ابو حنیفہ کی کتاب الرہن نکلی، میں نے تعجب سے پوچھاکہ کہ آپ ابو حنیفہ کی کتابیں دیکھتے ہیں؟ بولے کاش ان کی سب کتابیں میرے پاس ہوتیں. (عقود الجمان باب عاشر)

حسن بن مالک کا قول ہے کہ امام ابو یوسف فرمایا کرتے تھے، کہ سفیان ثوری مجھ سے زیادہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اتبار کرنے والے ہیں، حضرت علامہ عثمانی نے لکھا ہے کہ اس امر کا ثبوت جامع ترمذی کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے. (مقدمہ فتح الملہم)

اس کے علاوہ حضرت ابو نعیم اصبہانی نے بھی کچھ روایات امام اعظم کی شان کے خلاف نقل فرمادی ہے جن کے راوی درجہ اعتبار سے ساقط ہیں، کیا اچھا ہوتا ایسے بڑے لوگ جو روایت حدیث کے وقت بال کی کھال نکالتے ہیں اور کسی طرح کے شک وشبہ کے پاس بھی نہیں پھٹکتے ایک ایک لفظ کو جانچ تول کر اور کسوٹی پر کس کر نقل کرتے ہیں امام اعظم ایسی عظیم وجلیل شخصیتوں کے بارے میں بھی اپنی محتاط روش کو بے داغ رکھتے تاکہ جواب دینے والے بضرورت جواب بھی اپنے محبوب ومحترم امام بخاری یا محدث ابو نعیم کے متعلق کسی ادنی سے ادنی شکوہ بے احتیاطی وغیرہ پر بھی مجبور نہ ہوتے، یہ ظاہر ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی جلالت قدر کو وہ حضرات ہم سے بھی زیادہ جانتے پہچانتے تھے اور ہم سے زیادہ ان کے دلوں میں ان کی قدر ومنزلت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ محدث ابو نعیم اصبہانی نے امام اعظم کی مسانید کے 17 یا 21 روایت کرنے والوں میں سے ایک ہیں، اور امام بخاری امام اعظم کے شاگردوں کے شاگرد ہیں۔ امام بخاری حضرت بن المدینی کے شاگرد ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں نے علمی اعتبار سے اپنے آپ کو کسی سے حقیر وکمتر نہیں سمجھتا بجز علی بن مدینی کے (تہذیب التہذیب)

اور یہ علی بن مدینی یحییٰ بن سعید القطان کے شاگرد ہیں جو ہر مضیہ میں ہے حضرت یحییٰ نماز عصر کے بعد منارہ مسجد سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے تھے اور امام احمد، یحییٰ بن معین اور علی بن مدینی ان کے سامنے کھڑے ہو کر حدیثی سوالات کیا کرتے تھے اور نماز مغرب تک اسی طرح کھڑے کھڑے جواب سنتے تھے نہ وہ ان سے بیٹھنے کیلئے فرماتے تھے اور نہ یہ ان کی عظمت وہیبت کی وجہ سے بیٹھتے تھے، یہ حضرت یحییٰ القطان باوجود اس فضل وکمال کے امام اعظم کے حلقہ درس میں اکثر شریک ہوتے تھے اور ان کی شاگردی پر فخر کرتے تھے اور اکثر مسائل میں امام صاحب ہی کی تقلید کی ہے خود کہتے ہیں قد اخذنا باکثر اقوالہ (تہذیب التہذیب ترجمہ امام ابو حنیفہ) تذکرۃ الحفاظ میں ذہبی نے وکیع بن الجراح کے ذکر میں لکھا ہے کہ وہ اور یحییٰ القطان دونوں امام ابو حنیفہ کے اقوال پر فتویٰ دیا کرتے تھے اور یحییٰ بن معین نے اسی طرح لکھا ہے پھر امام اعظم کے بعد بواسطہ ابن مبارک بھی امام اعظم کے شاگرد رہے ہیں، نیز علی بن المدینی معلّٰی بن منصور کے بھی شاگرد ہیں اور وہ امام اعظم کے شاگرد ہیں اسی طرح اور بہت سے اساتذہ وشیوخ ہیں کہ ان کے واسطوں سے امام بخاری کو امام اعظم کے علمی فیوض وبرکات پہنچے ہیں اور امام بخاری نے بیسوں مسائل میں امام اعظم کی موافقت کی ہے۔

اس کے بعد تیسرے نمبر پر خطیب بغدادی کا ذکر بھی مناسب ہے کہ انہوں نے تاریخ بغداد میں سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر امام اعظم کی شان رفیع کے خلاف بے سروپا روایات کا ایک ڈھیر لگا دیا ہے جن کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو تک پہنچادی ہے، اس کے جواب میں ملک معظم عیسیٰ بن ابی بکر ایوبی نے السہم المصیب فی کبد الخطیب لکھا اور ہمارے استاذ محترم حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کو بڑی تمنا تھی کہ وہ چھپ جائے لیکن جب طبع ہو کر آئی تو اسکو جیسا خیال تھا نہ پایا، اس کے علاوہ سبط ابن الجوزی نے الانتصار لام ائمۃ الامصار دو جلدوں میں تالیف کی اور خطیب کا پورا رد کیا اور ابو المؤید الخوارزمی نے مقدمہ جامع المسانید میں بھی اچھا رد کیا ہے لیکن آخر میں حضرت الاستاذ المحترم شیخ محمد زاہد الکوثری قدس سرہ نے جو کافی وشافی رد لکھا وہ یقیناً سب پر فائق ہے اس کا نام 'تانیب الخطیب علی ماساقہ فی ترجمۃ ابی حنیفہ من الاکاذیب' ہے یہ لاجواب کتاب قابل دید ہے جس میں ایک چیز کا روایت ودرایت سے جواب لکھا ہے اور تحقیق وتدقیق کی پوری پوری داد دی ہے اور الحمد للہ امت پر جو خطیب کے جواب کا قرض تھا اس کو انہوں نے پورا پورا ادا کر دیا ہے۔ (انوا الباری شرح بخاری جلد اول ص 142 تا 143)

نعیم بن حماد کی جرح :

نعیم بن حماد ثقہ ہے یا نہیں؟

قال ابن حمّاد قالَ غيره كَانَ يضع الحديث في تقوية السنة وحكايات عن العلماء في ثلب أبي حنيفة مزورة كذب.

الکامل 8-251 ط العلمیۃ

"غیرہ" سے مراد غیر احمد بن شعیب ہیں۔ ہو سکتا ہے اس پر یہ اعتراض ہو کہ یہاں جارح مجہول ہے۔ لیکن اس جرح کو اسی جہالت کے ساتھ ابن عدی اور ذہبی نے ذکر کیا ہے۔

لیکن اس جرح کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے جسے ذہبی نے سیر میں ذکر کیا ہے:

ثُمَّ قَالَ ابْنُ عَدِيٍّ: ابْنُ حَمَّادٍ مُتَّهَمٌ فِيْمَا يَقُوْلُ؛ لِصَلاَبَتِهِ فِي أَهْلِ الرَّأْيِ .

وَقَالَ لِي ابْنُ حَمَّادٍ: وَضَعَ نُعَيْمٌ حَدِيْثاً عَنْ عِيْسَى بنِ يُوْنُسَ، عَنْ حَرِيْزِ بنِ عُثْمَانَ -يَعْنِي: فِي الرَّأْيِ-.

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نعیم کا یہ فعل صرف ابو حنیفہؒ کے خلاف نہیں تھا بلکہ وہ اہل الرائے کے بارے میں ایسے متشدد تھے کہ حدیث گھڑنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔

اسی لیے ذہبی نے اپنا فیصلہ یوں دیا ہے: قُلْتُ: لاَ يَجُوْزُ لأَحَدٍ أَنْ يَحْتَجَّ بِهِ، وَقَدْ صَنَّفَ كِتَابَ (الفِتَنِ) ، فَأَتَى فِيْهِ بِعَجَائِبَ وَمَنَاكِيْرَ. سیر اعلام النبلاء 10-609 ط رسالہ

امام ذہبیؒ کا ان کے بارے میں صریح قول ہے جو میں نے ما قبل میں سیر کے حوالے سے عرض بھی کیا ہے: قُلْتُ: لاَ يَجُوْزُ لأَحَدٍ أَنْ يَحْتَجَّ بِهِ

اشکال

امام ذہبی رحمہ اللہ (المتوفی 748) نے کہا: نعيم بن حماد الخزاعي المروزي الفرضي الحافظ أحد علماء الأثر سمع أبا حمزة السكري وهشيما وطبقتهما وصنف التصانيف وله غلطات ومناكير مغمورة في كثرة ما روى [العبر فی خبر من غبر 1/ 405]

جواب "میں کہتا ہوں: کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ان سے دلیل پکڑے۔" اس صریح قول کی موجودگی میں تاویلات کرکے انہیں ذہبی کے نزدیک ثقہ ثابت کرنا کوئی بہتر چیز نہیں ہے۔

خطیب کے جرح کی حقیقت:

حافظ محمد بن یوسف الصالحی الشافعی۔ (المتوفی 942ھ) فرماتے ہیں: حافظ ابو بکر خطیب بغدادی نے امام ابو حنیفہ کے بارے میں جو مخل تعظیم باتیں نقل کی ہیں ان سے دھوکہ نہ کھانا، خطیب بغدادی نے اگرچہ پہلے مدح کرنے والوں کی باتیں نقل کی ہیں، مگر اس کے بعد دوسرے لوگوں کی باتیں بھی نقل کی ہیں، سو اس وجہ سے انہوں نے اپنی کتاب کو بڑا داغ دار کر دیا ہے اور بڑوں اور چھوٹوں کے لیے ایسا کرنے سے وہ ہدف ملامت بن گئے ہیں اور انہوں نے ایسی گندگی اچھالی ہے، جو سمندر سے بھی نہ دھل سکے۔ (عقود الجمان بحوالہ مقام ابی حنیفہ، ص: 270)

قاضی القضاۃ شمس الدین ابن خلکان الشافعی (م 861ھ) خطیب بغدادی کی اس غلط طرز گفتگو پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
خطیب نے اپنی تاریخ میں امام صاحب کے بارے میں بہت سے مناقب ذکر کیے، اس کے بعد کچھ ایسی ناگفتہ بہ باتیں بھی لکھی ہیں جن کا ذکر نہ کرنا اور ان سے اعراض کرنا بہت ہی مناسب تھا؛ کیوں کہ امام اعظم جیسی شخصیت کے متعلق نہ تو دیانت میں شبہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ورع وحفظ میں، آپ پر کوئی نکتہ چینی بجز قلت عربیت کے اور نہیں کی گئی ہے۔ (تاریخ ابن خلکان 165/2)

خطیب اور چند دیگر حضرات کے علاوہ زیادہ تر مصنفین اور مؤرخین ائمہ جرح وتعدیل اور ائمہ حدیث نے امام صاحب کے فضائل ومناقب کو انصاف کے ساتھ ذکر کیا ہے اور کسی قسم کی جرح کو ذکر نہیں کیا، بلکہ صرف مناقب پر اکتفا کیا ہے، نمونے کے طور پر چند اسماء الرجال کی کتابوں اور چند ائمہ حدیث کے اقوال کو یہاں مختصراً ذکر کیا جاتا ہے، امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں، حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں، حافظ صفی الدین خزرجی نے خلاصۃ تذہیب تہذیب الکمال میں، علامہ نووی نے تہذیب الاسماء واللغات میں، امام یافعی نے مرآۃ الجنان میں امام صاحب کے حالات اور مناقب کو ذکر کیا ہے، لیکن کسی نے کوئی جرح نہیں کی ہے، جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان ائمہ جرح وتعدیل کے نزدیک امام صاحب پر جرح کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اسی طرح حافظ ذہبی اپنی دوسری کتاب تذکرۃ الحفاظ میں آپ کے ترجمہ کے عنوان کو معزز لقب "امام اعظم" سے مزین کرکے آپ کا جامع اخلاق حسنہ ہونا ان الفاظ میں ارقام فرماتے ہیں: "کان إماما ورعا عالما متعبدا کبیر الشان، لا یقبل جوائز السلطان، بل یتجر ویکتسب، تذکرۃ 10/1."

حضرت امام ابوحنیفہ کی شان میں بعض علماء امت کے اقوال:

* امام علی بن صالح (متوفی ۱۵۱ھ) نے امام ابوحنیفہ کی وفات پر فرمایا: عراق کا مفتی اور فقیہ گزر گیا۔ (مناقب ذہبی ص ۱۸)
* امام مسعر بن کدام (متوفی ۱۵۳ھ) فرماتے تھے کہ کوفہ کے دو کے سوا کسی اور پر رشک نہیں آتا۔ امام ابوحنیفہ اور ان کا فقہ، دوسرے شیخ حسن بن صالح اور ان کا زہد وقناعت۔ (تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۳۲۸)
* ملک شام کے فقیہ ومحدث امام اوزاعی (متوفی ۱۵۷ھ) فرماتے تھے کہ امام ابوحنیفہ پیچیدہ مسائل کو سب اہل علم سے زیادہ جاننے والے تھے۔ (مناقب کردری ص ۹۰)
* امام داؤد الطائی (متوفی ۱۶۰ھ) فرماتے تھے کہ امام ابوحنیفہ کے پاس وہ علم تھا جس کو اہل ایمان کے دل قبول کرتے ہیں۔ (الخیرات الحسان ص ۳۲)۔
* امام سفیان ثوری (متوفی ۱۶۷ھ) کے پاس ایک شخص امام ابوحنیفہ سے ملاقات کرکے آیا۔ امام سفیان ثوری نے فرمایا تم روئے زمین کے سب سے بڑے فقیہ کے پاس سے آرہے ہو۔ (الخیرات الحسان ص ۳۲)
* امام مالک بن انس (متوفی ۱۷۹ھ) فرماتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہ جیسا انسان نہیں دیکھا۔ (الخیرات الحسان ص ۲۸)
* امام وکیع بن الجراح (متوفی ۱۹۵ھ) فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ سے بڑا فقیہ اور کسی کو نہیں دیکھا۔
* امام یحییٰ بن معین (متوفی ۲۳۳ھ) امام ابوحنیفہ کے قول پر فتویٰ دیا کرتے تھے اور ان کی احادیث کے حافظ بھی تھے۔ انہوں نے امام ابوحنیفہ کی بہت ساری احادیث سنی ہیں۔ (جامع بیان العلم، علامہ ابن عبد البر، ج ۲ ص ۱۴۹)

* امام سفیان بن عینیہ (متوفی ۱۹۸ھ) فرماتے تھے کہ میری آنکھوں نے ابو حنیفہ جیسا انسان نہیں دیکھا۔ دو چیزوں کے بارے میں خیال تھا کہ وہ شہر کوفہ سے باہر نہ جائیں گی؛ مگر وہ زمین کے آخری کناروں تک پہنچ گئیں۔ ایک امام حمزہ کی قرات اور دوسری ابو حنیفہ کا فقہ۔ (تاریخ بغداد۔ ج۱۳ص ۳۴۷)

* امام شافعی (متوفی ۲۰۴ھ) فرماتے ہیں کہ ہم سب علم فقہ میں امام ابو حنیفہ کے محتاج ہیں۔ جو شخص علم فقہ میں مہارت حاصل کرنا چاہے وہ امام ابو حنیفہ کا محتاج ہوگا۔ (تاریخ بغداد ج ۲۳ ص ۱۶۱)

* امام بخاری کے استاذ امام مکی بن ابراہیم فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ پرہیزگار، عالم آخرت کے راغب اور اپنے معاصرین میں سب سے بڑے حافظ حدیث تھے۔ (مناقب الامام ابی حنیفہ۔ شیخ موفق بن احمد مکی)

* امام موفق بن احمد مکی' امام بکر بن محمد زرنجری (متوفی ۵۱۲ھ) کے حوالہ سے تحریر کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ نے کتاب الآثار کا انتخاب چالیس ہزار احادیث سے کیا ہے۔ (مناقب امام ابی حنیفہ)

آپ کی محدثیت اور مہارت حدیث پر شہادتیں

علم حدیث کے سلسلے میں، جس قدر آپ معرفت رکھتے ہیں اور جس قدر آپ نے اس سے حصہ وافر پایا ہے، اس کے جان لینے کے بعد کوئی انصاف پسند عالم، یہ نہیں کہہ سکتا کہ: "ولم یعدہ أحد من المحدثين" (حضرت امام صاحب کو کسی نے بھی محدثین کی فہرست میں شمار نہیں کیا) چوں کہ آپ کی محدثیت کا بے شمار لوگوں نے بار بار اعتراف کیا ہے، چند اقوال ملاحظہ فرمائیں:

۱۔امام ذہبی نے آپ کا شمار "حملۃ الحدیث" (حاملین حدیث) میں کیا ہے۔(۸)

۲۔ابن خلدون نے آپ کو "کبار المجتهدين في علم الحديث" (علم حدیث میں بڑا مجتہد) کہا ہے۔(۹)

۳۔ حضرت امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں: "میں نے امام ابو حنیفہؒ سے زیادہ جاننے والا نفس حدیث کو، کسی کو نہیں دیکھا اور نہ کوئی ان سے زیادہ تفسیر حدیث کا عالم، میری نظر سے گزرا"(۱۰)

۴۔ حضرت سفیان بن عینیہ فرماتے ہیں: "اول من صيّرني محدثا أبوحنيفة" "مجھے محدث بنانے والا، سب سے پہلا شخص، امام ابو حنیفہ کی ذات اقدس ہے۔(انجاء الوطن، ص:۳۱)

۵۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ نے بھی آپ کو محدثین کی فہرست میں شمار کیا ہے۔(۱۱)

۶۔ حضرت عبداللہ بن المبارک فرماتے ہیں کہ: اگر مجھے ابو حنیفہ اور سفیان کا شرف حاصل نہ ہوا ہوتا، تو میں بدعتی ہو جاتا۔(۱۲)

۷- شیخ الاسلام علامہ ابن عبد البر مالکی، تحریر فرماتے ہیں کہ : "روىٰ حماد بن زيد عن أبي حنيفة أحاديثَ كثيرة" (۱۳) (حماد بن زید نے امام ابو حنیفہؒ سے بہت سی حدیثیں روایت کی ہیں) اگر حضرت امام صاحب "محدث" نہیں تھے، تو احادیث کثیرہ کا کیا مطلب ہوگا؟ اور جب وہ "قلیل الحدیث" تھے اور ان کے پاس زیادہ حدیثیں بھی نہ تھیں، تو حماد بن زید نے، ان سے روایاتِ کثیرہ اور احادیث کثیرہ کس طرح لیں؟

۸- آپ کی مہارت و تبحر حدیث کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ اور امام بخاریؒ کے استاذِ حدیث، شیخ الاسلام حافظ ابو عبد الرحمن مقری، جب امام صاحب سے کوئی حدیث روایت کرتے، تو اِس لفظ کے ساتھ روایت کرتے کہ : "أخبرنا شاہنشاہ" (۱۴) (ہمیں علم حدیث کے شہنشاہ نے خبر دی) اندازہ فرمایئے ! ایک محدث کامل، امام صاحب کو حدیث کا "بادشاہ" ہی نہیں، بلکہ "شاہنشاہ" کہہ رہے ہیں؛ جس سے علم حدیث میں تبحر ظاہر ہے، جن لوگوں نے آپ کو محدثین میں شمار نہیں کیا ہے، ان کی بات قابل قبول نہیں۔(۱۵)

حافظ حدیث ہونے پر شہادتیں

یحییٰ بن معین، علی ابن مدینی، سفیان ثوری، عبد اللہ بن المبارک اور حافظ ابن عبد البر مالکی وغیرہ حضراتِ محدثین کا قول ثابت کرتا ہے کہ آپ "حافظ حدیث" بھی ہیں، جیسا کہ "تذکرۃ الحفاظ" سے معلوم ہوتا ہے؛ کیوں کہ علامہ ذہبی نے آپ کو "حافظ الحدیث" کہا ہے(۱۶)، اگر آپ حافظ حدیث نہ ہوتے، تو امام ذہبی جیسا شخص (جو مذہباً شافعی ہیں) امام ابو حنیفہ کو "حافظ حدیث" نہ کہتے۔ اسی بات کا اعتراف، حافظ یزید بن ہارون نے اپنے ان الفاظ میں کیا ہے کہ : "كان أبو حنيفة نقيًا ... أحفظ أهل زمانه" (۱۷) (امام ابو حنیفہ پرہیزگار... اور اپنے زمانے کے بہت بڑے حافظِ حدیث تھے) ابن حجر مکی فرماتے ہیں کہ : "علامہ ذہبی وغیرہ نے امام ابو حنیفہ کو حفاظ حدیث کے طبقے میں لکھا ہے اور جس نے ان کے بارے میں یہ خیال کیا ہے کہ وہ حدیث میں کم شان رکھتے تھے، تو اس کا یہ خیال یا تو تساہل پر مبنی ہے یا حسد پر۔(۱۸) حافظ محمد یوسف شافعی لکھتے ہیں کہ : "امام ابو حنیفہ بڑے حفاظِ حدیث اور ان کے فضلاء میں شمار ہوتے ہیں" (مقام ابی حنیفہ، ص: ۱۲۰)

امام صاحب اور جرح وتعدیل:

جس طرح امام بخاری اور ابن معین وغیرہ کے اقوال کو محدثین، اپنی کتابوں میں بطور احتجاج پیش کرتے ہیں، اسی طرح امام صاحب کے اقوال کو بھی پیش کرتے ہیں؛ چناں چہ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: ''حدثنا محمود بن غيلان عن جرير عن يحيى الحماني سمعت أبا حنيفة يقول: ما رأيت أكذب من جابر الجعفي ولا أفضل من عطاء''(۱۹) (ترجمہ ظاہر ہے) اسی طرح علامہ ابن حزم اپنی مشہور کتاب ''المحلی في شرح المحلی'' میں لکھتے ہیں: ''جابر الجعفي كذاب، و أول من شهد عليه بالكذب أبو حنيفة'' (جابر جعفی کذاب ہے اور سب سے پہلے جس نے اس کے کاذب ہونے کی شہادت دی وہ امام ابو حنیفہ ہیں) (انجاءالوطن، ص: ۳۱)

ان عبارات کی روشنی میں یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ امام صاحب کے اقوال ''جرح و تعدیل'' کے باب میں، اصح طریقے پر معتبر ہیں، کتب رجال: ''تہذیب الکمال'' (از امام مزی) ''تہذیب التہذیب'' (از امام ذہبی) اور ''تذہیب التہذیب'' (از حافظ ابن حجر) میں ''جرح و تعدیل'' سے متعلق امام صاحب کے مزید اقوال دیکھے جا سکتے ہیں۔

کثیر الحدیث ہونے پر شہادتیں:

تمام کبار محدثین کے نزدیک یہ بات محقق ہے کہ آپ اجلۂ محدثین میں ہونے کے ساتھ ساتھ، ''کثیر الحدیث'' بھی ہیں؛ لہٰذا ذیل میں چند اقوال پیش کیے جا رہے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ''کثیر الحدیث'' ہیں؛ چناں چہ ملا علی قاری ابن سماعہ سے نقل کرتے ہیں کہ: ''امام ابو حنیفہ نے اپنی (املائی) تصانیف میں ستر ہزار سے کچھ اوپر حدیثیں بیان کی ہیں اور چالیس ہزار سے، ''کتاب الآثار'' کا انتخاب کیا ہے۔(۲۰) اسی طرح یحییٰ بن معین فرماتے ہیں: ''كان النعمان جمع حديث بلده كله'' (امام صاحب نے اپنے شہر کوفہ (علم حدیث کا مرکز و مرجع ہے) کی تمام حدیثیں جمع کرلی تھیں) پھر خود حضرت امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ: ''عندي صناديق الحديث، ما أخرجت منه الا اليسير الذي ينتفع به'' (۲۱) (میرے پاس حدیث کے بہت سے صندوق بھرے ہوئے موجود ہیں مگر میں نے ان میں سے تھوڑی حدیثیں نکالی ہیں جن سے لوگ نفع اٹھائیں) یہاں لفظ ''صنادیق'' جمع کا ہے، جس سے واضح ہے کہ آپ کثیر الحدیث ہیں، علامہ ظفر احمد عثانی نے ''کثیر الحدیث'' سے متعلق بہت سے اقوال پیش کیے ہیں، تفصیل کے لیے دیکھیں مقدمہ اعلاء السنن۔

امام بخاری کی احادیث اور امام اعظم کی احادیث:

باتفاقِ محدثین عظام (جس میں خصوصیت کے ساتھ سفیان ثوری، امام شعبہ، ابن قطان، امام عبدالرحمن مہدی اور امام احمد بن حنبل، خصوصیت سے قابل ذکر ہیں) متون حدیث کی تعداد چار ہزار چار سو ہے: ''ان جملة الأحادیث المسندة عن النبی ﷺ یعنی الصحیحة بلا تکرار، أربعة آلاف و أربع مائة حدیث'' (احادیث صحیحہ، جو بلا تکرار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی گئی ہیں، ان کی تعداد چار ہزار چار سو ہے) اور یہ بات مسلم ہے کہ آپ چار ہزار متون احادیث کے حافظ تھے۔

چنانچہ امام صدرالائمہ مکی فرماتے ہیں کہ: "کان أبو حنیفة یروي أربعة آلافِ حدیث ، ألفین لحماد، والفین لسائر المشیخة"(۲۲) (یعنی امام صاحب نے چار ہزار حدیثیں روایت کی ہیں، دو ہزار صرف حماد کے طریق سے اور دو ہزار باقی شیوخ سے) معلوم یہ ہوا کہ اگر تعدد طرق و اسانید اور تکرار سے صرف نظر کر لی جائے تو چار ہزار حدیثیں امام صاحب سے مروی ہیں اور اگر تعددِ طرق کا لحاظ کیا جائے، تو ستر ہزار سے بھی آپ کی مرویات کی تعداد بڑھ جاتی ہے، جن کا تذکرہ آپ نے اپنی املائی تصانیف میں کیا ہے؛ چوں کہ امام صاحب اور بعد کے محدثین (مثلاً امام بخاریؒ) کے درمیان ۱۱۴/ سال کے طویل عرصے میں، ایک حدیث کو سینکڑوں، بلکہ ہزاروں اشخاص نے روایت کیا ہوگا (جس سے حدیث کی تعداد بدل جاتی ہے فی اصطلاح المحدثین) اس لیے دونوں کے درمیان جو لاکھوں اور ستر ہزار حدیثوں کا فرق ہے، وہ دراصل اسانید کی تعداد کا فرق ہے ورنہ صحیح بخاری کے مکررات نکال کر، احادیث کی تعداد، حافظ عراقی نے چار ہزار بتائی ہے(۲۳)، امام نووی نے صحیح مسلم کی تعداد کے بارے میں لکھا ہے: ''ومسلم باسقاط المکرر نحو أربعة آلاف''(۲۴) اور تقریباً یہی تعداد ''سنن ابی داؤد'' و ''ابن ماجہ'' وغیرہ کے متعلق ہے۔(۲۵) غرضیکہ امام صاحب، ان حضرات محدثین کے ''متونِ احادیث'' میں بالکل ہم پلہ ہیں؛ بلکہ تعدد سند میں بھی آپ، امام بخاری کے تقریباً برابر ہی ہیں؛ چنانچہ آپ نے اپنے بیٹے حماد کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''جمعتها من خمس مائة ألف حدیث(۲۶) (الوصیة، ص:۶۵)؛ لہٰذا معلوم ہوا کہ امام صاحب پر ''قلیل الحدیث'' ہونے کا الزام غلط ہے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ جس طرح، طلوع آفتاب سے رات کی تمام تاریکیاں ختم ہو جاتی ہیں، اسی طرح آپ سے ''قلیل الحدیث'' ہونے کا الزام ختم ہو جاتا ہے۔

قلتِ روایت کے اسباب:

مخالفین اور حاسدین، "قلتِ روایت" کی آڑ میں، امام صاحب کی حدیث دانی اور فقہی قدر و منزلت کو مجروح کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں واضح رہے کہ قلت روایت، کوئی عیب نہیں اور نہ یہ کوئی عار کی بات ہے اور نہ قلت روایت، قلت علم حدیث کو مستلزم ہے؛ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی مرویات کی تعداد ایک ہزار سے کم ہی ہے؛ جبکہ ان سے کم درجے کے صحابیؓ کی تعداد حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ وغیرہ سے کہیں زیادہ ہے، تو کیا اب یہ کہہ دینا چاہیے کہ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ زیادہ بڑے محدث نہیں تھے؟ نہیں ہرگز نہیں؛ بلکہ یہ حضرات نقل روایات میں، حد درجے احتیاط کرتے تھے، کہ مبادا نقل روایت میں کوئی فرق ہو جائے؛ اسی لیے ان کبارِ صحابہؓ نے، حدیث کے اپنے وافر معلومات کو مسائل اور فتاویٰ کی صورت میں بیان کیا۔ امام صاحب بھی انہی کے نقش قدم پر چلے اور حدیث کے اپنے وافر معلومات کو استنباط میں لگایا، (۲۷) اسی کو حافظ محمد یوسف صالحی شافعی یوں بیان فرماتے ہیں: "وانما قلّت الرواية عنه، لاشتغاله بالاستنباط، كما قلّت رواية أبي بكر وعمر" (۲۸) قلت کی دوسری وجہ، ابن خلدونؒ اس طرح لکھتے ہیں: "والامام أبو حنيفة انما قلت روايته، لما اشتد في شروط الرواية والتحمل" (۲۹) تیسری وجہ قلت کی یہ ہے کہ آپ صحابہؓ کی طرح غیر احکامی احادیث بیان کرنے میں حد درجہ احتیاط کرتے تھے؛ کیوں کہ حضرت عمرؓ نے اسی طرح کا ارشاد فرمایا ہے۔ اور یہی نظریہ امام مالک کا بھی ہے، فرماتے ہیں: "اگر میں لوگوں کو، وہ تمام روایت کروں جو میں نے سنیں، تو میں احمق ہوں گا، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں لوگوں کو گمراہ کر رہا ہوں۔ (۳۰) غرضیکہ امام صاحب قلت روایت میں، صحابہؓ کے ہی نقش قدم پر چلے ہیں؛ مگر یہ فضیلت، مخالفین کے لیے وجہ حسد بن گئی، جب کچھ نہ بن پڑا تو "قلت روایت" کا الزام دھر دیا، فیاللعجب!

اہل الرائے اور اہل حدیث:

"حدیث بیانی" اور "حدیث دانی" دو الگ الگ فن ہیں، تمام "رواۃ حدیث" (اہل حدیث) "حدیث بیاں" تو ہیں؛ مگر ضروری نہیں کہ وہ "حدیث داں" بھی ہوں؛ (کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان میں "رب حامل فقہ، غیر فقیہ (۳۱) کے ذریعے فرق بتلادیا ہے) البتہ "فقہاء" (اہل الرائے)، "حدیث داں" ضرور ہوتے ہیں۔ تو جو "حدیث دانی" کے ساتھ ساتھ "حدیث بیانی"

میں بھی مہارت رکھتا ہو، اس پر "اہل الرائے" کا اطلاق ہوتا ہے؛ اسی لیے محدثین نے آپ کو "اہل الرائے" کہا ہے، جو بلا ریب وشک صفتِ حمیدہ ہے؛ جس کی دلیل یہ ہے کہ محدثین اس کا اطلاق، صحابہؓ وغیرہ پر بھی کرتے ہیں؛ چنانچہ کہتے ہیں: "مغيرة بن شعبة كان من أہل الرأي، و ربيعة بن عبدالرحمن كان من أہل الرأي"(۳۲) یعنی یہ دونوں حضرات اہل الرائے میں سے ہیں) مگر غیر مقلدین نے "اہل الرائے" کو صفتِ قبیحہ اور "جرح وطعن" پر محمول کیا ہے، جو محدثین کی مراد سے خلاف ہے؛ اگر یہ لفظ "جرح وطعن" کے لیے ہے، تو کیا حضرت مغیرہ بن شعبہؓ مجروح ہوں گے؟! جبکہ تمام صحابہؓ عدول ہی ہیں، کوئی مجروح نہیں ہوسکتا (الصحابة كلهم عدول) کیا حضرت ربیعہ بھی مجروح ہوں گے؟ جبکہ ان سے تمام ائمہ حدیث نے روایت لی ہیں؟! نہیں ہرگز نہیں، بلکہ محدثین، لفظِ "اہل الرائے" کا اطلاق اسی پر کرتے ہیں جو "حدیث بیانی" کے ساتھ "حدیث دانی" میں بھی ماہر ہو، یہی فرق ہے "اہل الرائے" اور "اصحاب الحدیث" میں کہ "اہل الرائے" لفظ انسان" کی طرح خاص ہے اور "اصحاب الحدیث" لفظ "حیوان" کی طرح عام ہے، فبینهما نسبة عموم وخصوص مطلقاً اور چوں کہ خاص افضل ہوتا ہے؛ اس لیے محدثین کے یہاں "اہل الرائے" کا درجہ بڑھا ہوا ہے؛ اسی لیے محدثین، فقہاء کو اپنے سے آگے رکھتے تھے، جس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقوال سے ہوتا ہے:

حضرت امام وکیع بن الجراح لکھتے ہیں: "حديث يتداوله الفقهاء خير من أن يتداوله الشيوخ" (حدیث فقہاء کو ہاتھ لگے یہ اس سے بہتر ہے کہ شیخ الحدیث کے ہاتھ لگے)(۳۳) محدثِ عظیم حضرت اعمش فرماتے ہیں: يامعشر الفقهاء! "أنتم الأطبا" ونحن "الصيادلة"(۳۴) (اے گروہ فقہاء طبیب تم ہو، ہم تو صرف دوائیں لگائے بیٹھے ہیں)

حضرت امام ترمذی فرماتے ہیں: "وكذلك قال الفقهاء، وهم أعلم بمعاني الحديث"(۳۵) (اسی طرح فقہاء نے کہا ہے اور وہ حدیث کے معنی کو زیادہ بہتر جاننے والے ہیں)

ان اقوال سے معلوم ہوا "اصحاب الرائے" بہر حال محدث ہوتے ہیں (اسی لیے صاحب ہدایہ نے کہا ہے کہ فقیہ کے لیے حدیث دانی شرط ہے)(۳۶) تو معلوم ہوا کہ اس کا اطلاق آپ کی مہارتِ حدیث پر دال ہے۔

قیاس پر حدیث ضعیف کو مقدم کرنا، عظمت حدیث کی دلیل

امام صاحب کے اہم اصول میں سے ہے کہ "حدیثِ ضعیف" اور "مرسل حدیث" قیاس سے افضل ہے، جس سے آپ کی عظمت حدیث کا بین ثبوت ملتا ہے، اسی قاعدے پر ان کے مذہب کی بنیاد

ہے، اور اسی قاعدے کی وجہ سے : (۱) رکوع سجدے والی نماز میں قہقہہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہے جبکہ جنازے کی نماز میں نہیں ٹوٹتا۔ (۲) نبیذ تمر سے سفر میں وضو ہو جاتا ہے۔ (۳) دس درہم سے کم کی چوری پر، چور کا ہاتھ نہیں کٹتا۔ (۴) حیض کی اکثر مدت دس دن ہوتی ہے۔ (۵) جمعہ کی نماز میں مصر کی قید لگانا اور کنویں کے مسئلے میں قیاس نہ کرنا، یہ سب وہ مسائل ہیں جن میں قیاس کا تقاضا کچھ اور تھا؛ مگر "احادیثِ ضعیفہ" کے ہوتے ہوئے قیاس کو ردی کی ٹوکری میں رکھ دیا۔(۳۷) جس سے علم حدیث کے تعلق سے آپ کی غایت شغل کا اندازہ ہوتا ہے؛ اسی پر بس نہیں؛ بلکہ قیاس کی چار قسموں (قیاس مؤثر، قیاس مناسب، قیاس شبہ، قیاس طرد) میں سے، صرف قیاس مؤثر (اور ایک قول کے مطابق قیاس مناسب بھی) امام صاحب کے یہاں معتبر ہے، بقیہ قسمیں باطل ہیں؛ (جبکہ قیاس کی تمام اقسام کو حجت گرداننے اور احادیث ضعیفہ و مرسلہ کو غیر معتبر ماننے والے دوسرے حضرات مثلاً: حضرت امام شافعی رحمہ اللہ ہیں)(۳۸) اسی لیے تعجب ہے ان لوگوں پر جو آنکھ بند کر کے امام صاحب پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ آپ قیاس وغیرہ کو حدیث پر مقدم کرتے ہیں اور حدیث کی مخالفت کرتے ہیں؛ حالاں کہ حقیقت وہ ہے جو ابن قیم نے کہا : "فتقديم الحديث الضعيف و آثار الصحابة على القياس والرأي قوله (ابی حنیفة) وقول أحمد و على ذلک بنی مذهبه كما قدّم حديثَ القهقهة مع ضعفه على القياس والرأي"(۳۹) الخ یہی وہ عادتِ مستمرہ ہے جس کی وجہ سے کبار محدثین فقہ حنفی کے سایے میں ملیں گے۔

محدثین فقہ حنفی کے سایے میں:

حدیث کے ساتھ والہانہ لگاؤ ہی کے سبب، آپ کا بیان فرمودہ ہر مسئلہ، قرآن و حدیث کے مطابق ہے، آج تک کوئی یہ ثابت نہ کر سکا کہ آپ کا فلاں مسئلہ قرآن و حدیث کے خلاف ہے، اسی مہارتِ حدیث کی وجہ سے کبار محدثین نے آپ کے بیان کردہ مسائل و فتاویٰ کے سامنے، اپنا سر تسلیم خم کر دیا؛ چنانچہ بہت سے چوٹی کے محدثین اور ماہرین اسماء الرجال، امام صاحب کے قول کے مطابق ہی فیصلے دیتے تھے، جن میں سے امام وکیع (۴۰) ابن الجراح، ماہر اسماء الرجال امام یحییٰ بن سعید القطان(۴۱) اور امام بخاری کے استاذ (حضرت یحییٰ بن بکیر) کے استاذ امام لیث(۴۲) بن سعد، خاص طور سے قابل ذکر ہیں اور حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند نے کم و بیش چالیس کبارِ محدثین کا ذکر کیا ہے جو خالص حنفی تھے،(۴۳) جبکہ

حضرت موصوف ہی نے اپنی کتاب کشف الغمہ میں نمونہ کے طور پر چار ایسے نام ذکر کیے ہیں جنھوں نے دوسرے مذاہب چھوڑ کر حنفی مذہب اختیار کرلیا مثلاً: (۱)"امام طحاوی" یہ پہلے شافعی تھے، پھر حنفی بن گئے، (۲) امام احمد بن محمد بن محمد بن حسن تقی شمنی: یہ پہلے مالکی تھے، پھر حنفی مذہب کو اختیار کیا، (۳) تیسرے علامہ عبدالواحد بن علی العبکری: اول یہ حنبلی تھے، اس کے بعد حنفی مذہب اختیار کیا، (۴) چوتھے علامہ یوسف بن فرغلی البغدادی سبط ابن الجوزی: پہلے یہ حنبلی مذہب رکھتے تھے، پھر حنفی مذہب اختیار کیا۔(۴۴)

(تفصیل دیکھئے کشف الغمہ بسراج الامہ، ص: ۱۱۴)

یقیناً یہ اقتباس واضح دلیل ہے کہ حدیث سے آپ کا شغف اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ "فقہ حنفی" میں بھی حدیث ہی حدیث ہے، تبھی تو مذکورہ کبار محدثین آپ کی فقہ کی طرف مائل ہوئے؛ اسی لیے بہت سے اکابرین مثلاً عبداللہ بن المبارک فرماتے تھے کہ "ابوحنیفہ کی رائے" کالفظ مت کہو، بلکہ تفسیر و حدیث کہو۔" (۴۵)

سترہ حدیث اور ابن خلدون:

مذکورہ تصریحات سے معلوم ہوا کہ آپ کثیر الحدیث ہیں؛ مگر آپ کے حاسدین "قلیل الحدیث" ثابت کرنے کے لیے مؤرخِ اسلام، انصاف پسند، علامہ ابن خلدون ؒ کی منقول سترہ روایت کا حوالہ دیتے ہیں، تو عارضی طور پر ہم بھی حیران و ششدر رہ جاتے ہیں کہ اتنے بڑے اسلامی مؤرخ، امام صاحب جیسے عظیم محدث اور حافظِ حدیث کے حق میں صرف سترہ ہی روایت کے قائل ہیں؟! اس لیے حقیقت سمجھنی چاہیے۔

پس منظر اور حقیقت:

علامہ ابن خلدون کی منقول سترہ روایت کا پس منظر یہ ہے کہ امام محمد نے "مؤطا امام محمد" کی تمام احادیث کو، امام مالک سے ہی روایت کیا ہے؛ کیوں کہ انہوں نے خاص طور پر صرف امام مالک ہی کی روایات بیان کرنے کا التزام کیا ہے؛ لیکن موقع بہ موقع کہیں کہیں امام ابوحنیفہ ؒ وابویوسف ؒ کی روایتیں بھی ضمناً آگئی ہیں، جن کی تعداد سترہ یا ان کے لگ بھگ ہے،(۵۱) تو بعض لوگ آپ کے بقیہ تمام ذخیرۂ احادیث سے قطع نظر کر کے حداً یہ کہہ بیٹھے کہ: آپ "قليل البضاعة في الحديث" تھے تبھی تو سترہ حدیثیں ہی مروی ہیں۔ اس زبردست غلطی کا علامہ ابن خلدون نے اس طرح ازالہ کیا

ہے کہ : "امام صاحب کے حوالے سے "موطا امام محمد" میں جو صرف سترہ حدیثیں مروی ہیں، ان سے بغض و تعصب رکھنے والوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ آپ "قلیل البضاعة فی الحدیث" تھے اور حدیث میں آپ کا کل سرمایہ اتنا ہی تھا، حالانکہ سترہ روایت کا نظریہ، سرے سے باطل ہے؛ بلکہ سترہ کے واسطے سے "قلیل البضاعة فی الحدیث" کا نظریہ، جو ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تقوّل اور جھوٹ پر مبنی ہے اور راہِ راست سے بہت دور ہے، تو ابن خلدون کا مقصد امام صاحب پر لگائے گئے الزام کو دفع کرنا ہے، نہ یہ کہ آپ کے لیے اسے ثابت کرنا ہے؛ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابن خلدون کا مکمل حوالہ و عبارت نقل کر دی جائے تاکہ اصل حقیقت سامنے آسکے، ملاحظہ فرمائیں: ابن خلدون فرماتے ہیں:

"اور تو یہ بھی جان لے کہ ائمہ مجتہدین، حدیث کے فن میں متفاوت رہے ہیں، کسی نے زیادہ حدیثیں بیان کی ہیں کسی نے کم، سو امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا جاتا ہے، کہ ان کی روایتیں صرف سترہ یا ان کے لگ بھگ ہیں اور امام مالکؒ سے جو روایتیں ان کے یہاں صحیح ہیں، وہ وہی ہیں جو موطا میں درج ہیں اور امام احمد بن حنبلؒ کی مسند میں پچاس ہزار احادیث ہیں اور ہر ایک نے اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق اس میں سعی کی ہے۔ (مقدمہ ابن خلدون، ص: ۴۴۴، مصر)

اور بعض بغض و کج روی رکھنے والوں نے اس جھوٹ پر کمر باندھ لی ہے کہ "ائمہ مجتہدین میں سے جن سے کم حدیثیں مروی ہیں وہ محض اس لیے کہ ان کا سرمایہ ہی اس فن میں اتنا ہے لہٰذا ان کی روایتیں بھی کم ہیں"؛ حالانکہ ان بڑے بڑے اماموں کی نسبت ایسا خیال کرنا راہِ راست سے دوری ہے۔

یہ عبارت چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ امام صاحب پر مذکورہ الزام سرے سے ہی باطل ہے اور تقوّل و جھوٹ پر مبنی ہے، خاص طور پر، خط کشیدہ عبارت میں، نظرِ عمیق سے غور کرنے سے حاسدین کے جھوٹ کا پول کھل جاتا ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ پر اعتراضات:

حافظ ذہبیؒ کی کتاب تذکرۃ الحفاظ جلد اول سے چند ایسے لوگوں کا نام ذکر کرتا ہوں جو اپنی عبادت و ریاضت اور کثرت صلوۃ و صوم میں مشہور تھے:

(1) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں حافظ ذہبی لکھتے ہیں: حضرت عثمان سابقین میں سے تھے، نماز میں لگے رہنے، بہت روزے رکھنے اور اللہ کے راستہ میں بہت خرچ کرنے والے تھے، حضرت عثمان کے بارے میں کتابوں میں لکھا ہے کہ آپ نے پورا قرآن ایک رکعت میں ختم کیا تھا۔

(2) حضرت ابو موسی اشعری ﷺ کے بارے میں ذہبی فرماتے ہیں کہ حضرت ابو موسی اشعری ﷺ عابد تھے، بہت زیادہ روزے رکھنے والے اور نماز پڑھنے والے تھے۔

(3) حضرت ابو ہریرہ ﷺ کے بارے میں لکھا ہے: بہت زیادہ عبادت کرنے والے اور ذکر کرنے والے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ ﷺ نے ایک دھاگے میں ایک ہزار گرہ لگا رکھی تھی ایک ہزار تسبیح پڑھ ہی کر آپ سوتے تھے۔ ان کے گھر کا معمول یہ تھا کہ ان لوگوں نے رات کے تین حصے کر لئے تھے۔ ایک حصہ میں حضرت ابو ہریرہ ﷺ عبادت کرتے، ایک حصہ میں ان کی بیوی عبادت کرتی، اور ایک حصہ میں ان کا خادم عبادت کرتا۔

(4) مسروق بن اجدع مشہور تابعی اور امام فقہ وحدیث ہیں۔ ان کے بارے میں لکھا ہے: مسروق نے حج کیا تو ان کا سونا بس اس وقت ہوتا جب وہ سجدہ میں ہوتے۔ مسروق کی بیوی کا بیان ہے: انہ کان یصلی حتی یتورم قدماہ. یعنی وہ اتنی طویل نماز پڑھتے کہ ان کے دونوں قدم ورم کر جاتے تھے۔

(5) اسود بن یزید بھی مشہور امام فقہ وحدیث اور جلیل القدر تابعی ہیں، ان کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے اسی حج اور اسی عمرے کئے تھے۔ حج الگ تھا، عمرہ الگ، حج کے ساتھ عمرے کا شمار نہیں ہے۔ ان کے بھائی عبد الرحمٰن بن اسود کے بارے میں لکھا ہے: وہ روزانہ سات سو رکعتیں نماز پڑھا کرتے تھے، اور لوگ کہا کرتے تھے کہ یہ اپنے گھر میں سب سے کم عبادت کرنے والے ہیں۔

(6) حضرت عروہ بن زبیر مشہور تابعی اور محدث ہیں، ان کے بارے میں لکھا ہے حضرت عروہ کے زندگی کا معمول یہ تھا کہ وہ دن میں ایک چوتھائی قرآن دیکھ کر پڑھتے تھے اور پھر اسی کو رات میں نوافل میں پڑھا کرتے تھے۔

(7) عروہ بن میمون مشہور تابعی ہیں، حضرت ابو بکر ﷺ اور حضرت عمر ﷺ وغیرہما سے حدیث سنی تھی، ان کے بارے میں لکھا ہے: انہوں نے سو مرتبہ حج اور عمرہ کیا تھا۔ لکھا ہے کہ جب وہ بوڑھے ہو گئے تھے تو دیوار میں ایک کھونٹا گاڑ دیا گیا تھا، جب وہ نماز پڑھتے پڑھتے اکتا جاتے تو اس کو پکڑ لیا کرتے تھے (پھر کچھ آرام کرتے اور نماز شروع کرتے)۔

(8) حضرت ابو موسی نہدی بھی جلیل القدر تابعی ہیں کبار صحابہ مثلاً حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود ﷺ وغیرہما سے حدیث سنی تھی، ان کے بارے میں لکھا ہے: کتاب وسنت کے عالم تھے، بہت زیادہ روزے رکھنے والے تھے اور بہت زیادہ نماز پڑھنے والے تھے نماز پڑھتے ہوئے ان پر غشی طاری ہو جایا کرتی تھی۔

(9) مرۃ الطیب بن شراجیل بھی مشہور تابعی ہیں۔ حضرت ابو بکر حضرت معاذ حضرت ابن مسعود وغیرہم کے شاگرد ہیں، ان کے بارے میں لکھا ہے: ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے سجدہ کیا (اور اتنا سجدہ کیا کہ) ان کی پیشانی کو مٹی نے کھالیا۔

(10) علی بن حسین زین العابدین رحمہ اللہ خاندان نبوت کے چشم چراغ تھے ان کے بارے میں حضرت امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان کی ساری زندگی کا دستور یہ تھا کہ وہ روزانہ رات دن میں ایک ہزار رکعت نماز پڑھتے تھے۔

(11) سعید بن جبیر مشہور امام فقیہ اور محدث تھے۔ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ایک رات کعبہ کے اندر نماز پڑھنے کھڑے ہوئے تو پورا قرآن ایک رکعت میں پڑھ لیا، ان کا معمول تھا کہ وہ دن میں ایک قرآن ختم کرتے تھے۔

(12) خالد بن معدان جنہوں نے ستر صحابہ سے حدیث کو سنا تھا۔ ان کے بارے میں لکھا ہے: کہ وہ چوبیس گھنٹوں میں ستر ہزار مرتبہ تسبیح پڑھتے تھے۔

(13) میمون بن عمران کا ذکر حافظ ذہبی ان الفاظ سے کرتے ہیں: الامام، القدوۃ عالم اہل جزیرۃ میمون بن مہران کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے سترہ روز میں سترہ ہزار رکعتیں پڑھی تھیں۔ یعنی رزانہ ایک ہزار رکعت۔

(14) وہب بن منبہ مشہور محدث تابعی ہیں، ان کے بارے میں لکھا ہے: وہب بن منبہ نے بیس سال کی مدت اس طرح گزاری کہ عشاء اور صبح کے درمیان دوسرا وضو کرنے کی ضرورت ان کو پیش نہ آئی عشاء کی وضو سے صبح کی نماز ادا کی میں کہتا ہوں کہ اگر وہب بن منبہ بیس سال تک عشاء کی وضو سے صبح کی نماز پڑھ سکتے ہیں، تو پھر کوئی تیس سال کیوں نہیں پڑھ سکتا اور کیوں کوئی چالیس سال عشاء کی وضو سے صبح کی نماز نہیں پڑھ سکتا۔

(15) ثابت بنانی جن کو جن حافظ ذہبی الامام، الحجۃ القدوۃ کے لقب سے یاد کرتے ہیں یہ بھی مشہور تابعی ہیں ان کے بارے میں محدث شعبہ فرماتے ہیں: یہ چوبیس گھنٹے میں قرآن ختم کرتے تھے اور صائم الدہر (ہمیشہ روزہ رکھنے والے تھے)

(16) صفوان بن سلیم فقیہ تابعی تھے، ان کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ اپنا پہلو زمین سے نہیں لگائیں گے یہاں تک ان کی موت آجائے۔ چنانچہ تیس سال تک ان کا یہی حال تھا کہ وہ سوے نہیں بیٹھنے ہی کی حالت میں ان کا انتقال ہوا۔ لکھا ہے کہ انہوں نے اتنے کثرت سے سجدے کئے تھے کہ ان کی پیشانی میں اس کی وجہ سے سوراخ ہو گیا تھا۔

(17) منصور معتمر مشہور محدث ہیں بڑے بڑے محدثین نے ان سے روایت کی ہے حافظ حدیث تھے ان کے بارے میں لکھا ہے: منصور نے چالیس سال تک مسلسل روزے رکھے اور چالیس سال کی یہ پوری مدت رات میں نماز پڑھتے گزاری اور وہ پوری رات رویا کرتے تھے۔

(18) منصور بن زاذان کے بارے میں آتا ہے کہ وہ سورج نکلنے سے لے کر عصر تک برابر نماز میں رہا کرتے تھے۔

(19) داؤد بن ابی ہند زبردست محدث ہیں، ان کے بارے میں آتا ہے: انہوں نے چالیس سال تک اس طرح روزے رکھے کہ ان کو گھر والوں کو بھی پتہ نہیں چل سکا۔ گھر والوں سے ناشتہ اور کھانے کا سامان لے کر چل دیتے راستہ میں اس کو صدقہ کر دیتے اور پھر شام کو گھر آکر افطار کرتے۔

(20) عاصم بن سلیمان بھی زبردست محدث اور حافظ حدیث تھے۔ بڑے بڑے محدثین نے ان سے روایت کی ہے۔ ان کے بارے میں لکھا ہے کہ عشاء کی نماز پڑھ کر صبح تک نفل نماز میں مشغول رہتے۔

(21) سلیمان تیمی مشہور محدث حافظ ان کو الحافظ الامام شیخ الاسلام کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ان کے بارے آتا ہے کہ ہر سجدہ میں ستر مرتبہ سبحان اللہ کہتے مزید لکھا ہے کہ ان کی پور زندگی اس طرح گزری کہ انہوں نے صبح کی نماز عشاء کی وضوسے پڑھی۔

(22) ہشام بن حسان حافظ حدیث تھے ،بڑے بڑے فقہا اور محدثین ان کے شاگرد تھے ان کے بارے میں آتا ہے کہ جمعہ کے دن کے سوا ہر دن روزہ رکھتے تھے اوران کا یہ عمل دائمی تھا۔

(23) مسعر بن کدام مشہور محدث اور شیخ وقت تھے، ان کا معمول یہ تھا کہ پوری رات نماز میں گزارتے پہلے ایک روز ناغہ کرکے روزہ رکھتے تھے پھر روزانہ رکھنے کا معمول ہوگیا۔

(24) مسلم بن خالد امام فقیہ اور شیخ حرم تھے۔ان کے بارے میں ارزقی کہتے ہیں کہ وہ فقیہ عابد تھے اور ہمیشہ روزے رہتے تھے۔

(25) ابوبکر بن عیاش جن کے بارے میں حافظ ذہبی لکھتے ہیں الامام القدوۃ شیخ الاسلام، ان کے بارے میں یزید بن ہارون کہتے ہیں کہ انہوں نے چالیس سال تک اپنا پہلو زمین سے نہیں لگایا، یعنی اتنی مدت وہ سوئے نہیں جب ان کے وفات کا وقت قریب ہوا توان کی بہن رونے لگی تو انہوں نے ان سے کہا ملا بیکیک کیوں رورہی ہو؟ گھر کا وہ گوشہ دیکھو میں نے اس میں اٹھارہ ہزار مرتبہ قرآن ختم کیاہے۔

(26) یحیٰ بن سعید القطان سید الحفاظ کے لقب سے نام کئے جاتے ہیں زبردست محدث اور فقیہ تھے۔ان کے بارے میں ابن معین فرماتے ہیں: یحیٰ بن سعید القطان بیس سال تک مسلسل ہر رات ایک ختم قرآن کیا کرتے تھے۔

(27) غندر ابو عبداللہ بڑے محدث ہیں جن سے بڑے بڑے محدثین حدیث روایت کی ہے، ان کے بارے میں یحیٰ بن فرماتے ہیں کہ پچاس تک وہ ایک دن کا ناغہ کرکے روزہ رکھتے تھے۔

(28) وامام وکیع کا علم حدیث ورجال میں جو پایہ ہے اس کا علم اہل علم کو ہے، ان کی روایت سے کتب حدیث بھی ہیں۔ان کے بارے میں یحیٰ بن اکثم فرماتے ہیں: میں وکیع کے ساتھ سفر اور حضر میں رہا وہ صائم الدہر تھے اور ہر رات ایک قرآن ختم کرتے تھے۔اور یحیٰ بن معین ان کے بارے میں فرماتے ہیں: میں نے امام وکیع سے افضل کوئی نہیں دیکھا۔ وہ پور رات نماز پڑھتے تھے،ہمیشہ روزہ رکھتے تھے ،اور حضرت امام ابو حنیفہ کے قول پر فتوی دیتے تھے ،امام وکیع کے مقام ومرتبہ کا پتہ ابن عمار کے اس بیان سے چلتا ہے۔فرماتے ہیں: کوفہ میں امام وکیع کے زمانہ میں امام وکیع سے زیادہ فقہ کا ماہر اور حدیث کا جاننے جانکار نہیں تھا۔اس زمانہ میں یعنی دوسری صدی میں امام وکیع جیسا محدث او رفقیہ امام ابو حنیفہ کے مذہب کے مطابق فتوی دیا کرتے تھے۔

(29) امام شافعی رحمہ اللہ کا علم وفضل میں جو مقام ہے سب کو معلوم ہے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں: وہ رمضان میں ساٹھ ختم کرتے تھے۔

(30) علی بن جعد جلیل القدر محدث تھے۔ان کا حال یہ تھا کہ ساٹھ سال تک ایک دن ناغہ کرکے روزہ رکھتے تھے۔

(31) ابو قلابہ محدث بصرہ کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں، مشہور محدث اور بڑے زاہد تھے۔ ان کے بارے میں لکھا ہے: یہ رات دن میں چار سو رکعتیں پڑھتے تھے۔

(32) امام بخاری کی بھی عبادت وریاضت کو جان لیجئے، امام بخاری امام الحفاظ تھے اور اپنے وقت کے شیخ الاسلام تھے۔ ان کے بارے میں لکھا ہے کہ علم میں بھی بڑا مقام رکھتے تھے اور عبادت میں بھی بڑا مقام رکھتے تھے۔ حافظ ابن حجر مقدمہ فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ امام بخاری رمضان میں تراویح کے بعد نصف قرآن سے ایک تہائی قرآن کی تلاوت کرتے تھے، اور ہر تیسری رات میں قرآن ختم کرتے تھے، اور دن میں روزانہ ایک قرآن ختم کرتے تھے۔ امام بخاری اپنے بارے میں خود فرماتے ہیں کہ چالیس سال میں نے سالن کے ساتھ کھانا نہیں کھایا۔ امام بخاری جو کی خشک روٹی کھا کر زندگی گزارتے تھے۔ لکھا ہے جب وہ حدیث لکھتے تو ہر حدیث پر دو رکعت نماز پڑھتے اور غسل کرتے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ پر بعض کا اعتراض ہے کہ ان کا عشاء کی وضو سے چالیس سال تک صبح کی نماز ادا کرنا خلاف سنت عمل تھا، ہم نے صحابہ کرامؓ، تابعین عظامؒ، محدثین اور فقہا میں سے چند کے عبادتوں کا بہت مختصر ذکر کیا ہے، اگر تفصیل میں جاتے تو پوری ایک کتاب بن جاتی۔

اب سوال یہ ہے کہ صرف امام ابو حنیفہ ہی کی عبادت کیوں بدعت قرار پائے گی، دوسروں کی عبادت پر یہ سوال کیوں نہیں ہوگا؟۔

اصحاب الرائے:

امام اعظم سے پہلے یہ لقب امام مالک کے استاذ ربیعہ کو ملا تھا اور رائے ان کے نام کا جزء بنا ہوا تھا، ان کا تعارف ہی ربیعہ الرائی سے ہوتا ہے ان کو ربیعۃ الرای کیوں کہا جاتا ہے تو حافظ ذہبی فرماتے ہیں: کان بصیرا بالرای ولذلک یقال لہ ربیعۃ الرای (تذکرہ)

یعنی چونکہ ان کو رائے میں بصیرت حاصل تھی یعنی وہ علم شریعت کے بارے میں بڑے دانا بینا اور روشن ضمیر تھے اس وجہ سے ان کو ربیعۃ الرای کہا جاتا ہے۔

امام یحی بن سعید فرماتے ہیں: کہ ربیعہ بہت زیادہ پختہ عقل والے تھے (تاریخ بغداد)

قرآن پاک میں اصحاب بصائر، اور اصحاب عقل کی تعریف کی گئی ہے نہ بے عقلوں اور بے بصیرتوں کی بلکہ اللہ تو یہ فرماتا ہے کہ اصل بینائی تو دل ہی کی بینائی ہے جو اس نعمت سے محروم رہا وہی لوگ فی الاصل اندھے کہلانے کے مستحق ہیں، انہا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور. یعنی اندھا پن نگاہوں کا نہیں ہوتا حقیقت میں اندھا پن تو دلوں کا ہوتا ہے جو سینہ میں ہوتے ہیں۔

اسی وجہ سے ان کو بھی اصحاب الرائے کہا جاتا تھا، ملا علی قاری فرماتے ہیں: اصحاب امام ابو حنیفہ کو اصحاب الرائے اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کی رائے دقیق تھی۔ (مرقات ج:2/ص:78)

نوابؒ صدیق حسن خان بھوپالی فرماتے ہیں: ذکر ابن حزم الاجماع علی ان مذہب ان ضعیف الحدیث اولی عندہ من الرائ والقیاس اذا لم یجد فی الباب غیرہ. (دلیل الطالب ص: 887)

یعنی اگر مسئلہ میں صحیح حدیث نہ ملے تو ابن حزم نے اس پر اجماع ذکر کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ کا مذہب یہ تھا کہ ان کے نزدیک ضعیف حدیث قیاس اور رائے سے اولیٰ ہے۔

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط اور دین میں بے جا رائے و قیاس کے دخل دینے سے پرہیز کا عالم یہ تھا کہ وہ کتاب و سنت کے بعد اقوال صحابہ میں کسی ایک کو اختیار کرتے تھے، قیاس و رائے کا استعمال وہ بالکل آخر میں کرتے جب نہ کتاب میں اس کا حکم ہوتا اور نہ سنت رسول ﷺ میں اور نہ کسی صحابی کا اس مسئلہ میں قول ملتا۔ خود فرماتے ہیں: "میں پہلے کتاب اللہ کو اختیار کرتا ہوں پھر سنت رسول اللہ کو لیتا ہوں، اور جو چیز کتاب و سنت میں نہیں ملتی ہے تو میں صحابہ کے قول میں سے کسی ایک کا قول اختیار کرتا ہوں، لیکن جب معاملہ ابراہیم نخعی، شعبی، ابن سیرین، حسن بصری، عطاء، اور سعید بن مسیب تک پہنچ جاتا ہے، تو جس طرح ان لوگوں نے اجتہاد کیا میں بھی اس مسئلہ میں اجتہاد کرتا ہوں"۔ (تاریخ خطیب ج: 3 ص: 318)

یہ خود امام اعظم کا بیان ہے ان کا یہ کلام مختلف کتابوں میں منقول ہے۔ پس معلوم ہوا کہ حضرت امام اعظم کتاب و سنت بلکہ صحابہ کے قول کے موجودگی میں بھی اجتہاد و قیاس اور رائے سے کام نہیں لیتے تھے۔ جب کسی مسئلہ میں قیاس کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہو تب ہی قیاس کرتے تھے۔

حضرت سلیمان اور داؤد کا قصہ کا حدیث و تفسیر کی کتابوں میں مشہور ہے کہ دو عورتیں تھیں اور دونوں کا ایک ایک بچہ تھا کوئی بھیڑیا آیا اور ایک بچہ کو اٹھا کر لے گیا دونوں عورتوں میں جھگڑا ہوا ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ جو بچہ رہ گیا ہے وہ اس کا ہے، یہ مقدمہ حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس گیا، حضرت داؤد علیہ السلام نے جو عورت عمر کے لحاظ سے بڑی تھی اس کے حق میں فیصلہ کر دیا، جب یہ عورتیں حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس گزری تو انہوں نے ان سے معلوم کیا کہ ابا جان نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ عورتوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کے فیصلہ سے ان کو آگاہ کیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ تم دونوں کا فیصلہ میں کروں گا، پھر انہوں چھری منگا کر کہا کہ میں اس بچہ کو آدھا آدھا کروں گا اور تم دونوں کو اس کا آدھا آدھا حصہ دوں گا، یہ سن کر چھوٹی عمر کی عورت نے ان کا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ یہ بچہ میرا نہیں ہے اسی بڑی عورت کا ہے، چھوٹی عمر والی عورت کی حالت غیر ہو رہی تھی جب بڑی عمر والی عورت کے چہرے سے سلیمان کی بات سن کر کسی پریشانی کا اظہار نہیں ہو رہا تھا اس سے حضرت سلیمان نے سمجھ لیا کہ یہ بچہ بڑی کا نہیں ہے اسی چھوٹی عورت کا ہے، جو اس کے قتل کیے جانے پر راضی نہیں تھی اور اپنے دعویٰ سے بچے کے جان کے سلامتی کے خاطر دست بردار ہو رہی تھی۔

دیکھئے یہاں دو پیغمبر ہیں حضرت داؤد علیہ السلام اور اس کے صاحبزادے حضرت سلیمان علیہ السلام اور دونوں نے اپنے اجتہاد و اپنے رائے سے اس مسئلہ میں فیصلہ کیا، تو اگر کسی شرعی مسئلہ میں رائے اجتہاد کا استعمال حرام و ناجائز ہوتا تو کیا کوئی خدا کا نبی پیغمبر رائے اجتہاد کا استعمال کرتا۔ اگر غیر مقلدوں کی منطق کا استعمال کیا جائے تو معاذ اللہ کہنا پڑے گا حضرت سلیمان اور حضرت داؤد علیہم السلام نے حرام کام کیا اس سے آپ اندازہ لگالیں کہ شرعی مسائل میں مطلقاً قیاس و رائے کے استعمال کو حرام قرار دینا کس قدر خطرناک بات ہے اور اس سے حضرات انبیاء علیہم السلام پر کیسا الزام عائد ہوتا ہے۔

بخاری و مسلم کی روایت میں صاف اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد موجود ہے کہ فیصلہ کرنے والے اگر اپنی رائے و قیاس سے فیصلہ کریں گے تو غلطی پر بھی ان کو ایک اجر ملے گا۔ بخاری کی پور حدیث ملاحظہ ہو: حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اذا حکم الحاکم فاجتهد فاصاب فله اجران واذا حکم الحاکم فادجتهد فأخطأ فله اجر واحد۔(بخاري ج: 2/ص: 93)

بھلا بتائیں کہ اگر اجتہاد کرنا اور رائے کا استعمال کرنا مطلقا حرام ہوتا تو حضور ﷺ کے اس ارشاد کا مطلب کیا ہوگا؟

قیاس ورائے کے بارے میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث ہے کہ حضور ﷺ ان کو یمن کا مفتی اور گورنر بنا کر جب بھیجنے کا ارادہ کیا تو ان سے پوچھا تم فیصلہ کس طرح کروگے تو انہوں نے عرض کیا کتاب اللہ سے، آپ نے دریافت فرمایا کہ اگر وہ حکم کتاب اللہ میں نہ ہو؟ تو انہوں نے عرض سنت رسول اللہ سے فیصلہ کروں گا، پھر آپ نے دریافت فرمایا کہ اگر اس مسئلہ کا حکم تم کو سنت رسول ﷺ میں بھی نہ ملے تو کس طرح فیصلہ کروگے تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ پھر میں اجتہاد کروں گا اور اپنی رائے کا استعمال کروں گا اس پر آپ ﷺ نے خوشی کا اظہار فرمایا اور فرمایا الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضی رسول اللہ یعنی اللہ کا شکر ہے کہ اس نے رسول اللہ کے قاصد کو اس بات کی توفیق عطاء فرمائی جس کو اللہ کا رسول پسند کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دینی و شرعی مسائل میں اجتہاد تو اللہ کے رسول ﷺ کا پسندیدہ عمل تھا اور اگر یہ ناجائز اور حرام ہوتی تو اللہ کے رسول اس کو پسند کیوں فرماتے یہ عقل کی کمی ہے کہ رسول خدا کا پسندیدہ و محبوب عمل بھی ان کو حرام و ناجائز دکھائی دیتا ہے۔ جب کوئی چارہ نہیں دکھائی دیتا تو ان کی طرف سے اس حدیث کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے فرقہ ظاہریہ کے علاوہ کسی اور کو اس حدیث پر کلام کرنے اور اس کو ضعیف قرار دینے کی جرات نہیں ہوئی۔

صحیح بلکہ مشہور حدیث کو ضعیف بتلا کر رد کرنے کا یہ سہرا انہیں کے سر باندھا ہے۔

حافظ ابن عبدالبر اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: حديث معاذ صحيح مشهور رواه الائمه وهو اصل في الاجتهاد والقياس ۔(جامع بيان العلم ج: 2/ص: 77)

• یعنی حضرت معاذ کی حدیث صحیح اور مشہور ہے۔ جس کو عادل و ثقہ ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث اجتہاد و قیاس کے (مشروع ہونے کی) کی اصل ہے۔

اور خطیب بغدادی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث مشہور ہے اور اس کے رواۃ کثیر ہیں اور اس کی دوسری سند میں سب راوی ثقہ ہیں، تمام اہل علم نے اس حدیث کو قبول کیا ہے، اور اس سے حجت پکڑی ہے یہ اس کے صحیح ہونے کی مزید دلیل ہے۔

(الفقيه المتفقه ص: 189)

غرض یہ حدیث قیاس ورائے کی مشروعیت کے سلسلہ میں تمام اہل فقہ اور اہل علم کے نزدیک قابل قبول ہے، تمام ائمہ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے اور اسے قبول کیا ہے۔

امام ابو حنیفہ اپنے حاسدوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

ان يحسدوني فإني غير لائمهم

قبلي من الناس اهل الفضل قد حسدوا

فدام لي و لهم ما بي و بهم

و مات اكثرنا غيضا بما يجدوا

یعنی اگر میرے دشمن مجھ پر حسد کرتے ہیں تو میں ان کو ملامت کرنے والا نہیں ہوں اس لئے کہ مجھ سے پہلے اصحاب فضل پر حسد کیا جاچکا ہے جو میرے ہے، جو چیز میرے لئے ہے وہ ہمیشہ میرے لئے رہے گی اور جو چیز ان ساتھ ہے وہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہے گی اور بیشتر لوگ مارے حسد وغصہ کے مر گئے۔

اس کتاب میں جمع کردہ احادیث وآثار کا ایک اہم مقصد اس غلط فہمی کو دُور کرنا ہے کہ ہمارا طریقۂ نماز سنت یا احادیث کے خلاف ہے، اور ہم اصحاب الرائے ہیں، یعنی نعوذ باللہ احادیث وآثار کے ہوتے ہوئے اپنی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔

ہم محض الفاظ حدیث پر اکتفاء کرنے کے ساتھ ساتھ کبارِ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے افعال سے بھی استدلال کرتے ہیں، احکام شریعت کے علل ومقاصد پر بھی غور کرتے ہیں، خلیفۂ ثانی امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروق، خلیفۂ رابع امیر المؤمنین سیدنا علی اور فقیہ امت سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر کبارِ صحابہ بھی رائے پر عمل کرتے اور احکام شریعت کے علل ومقاصد پر غور کیا کرتے تھے، اسی غور وفکر، چھان بین اور خارجی قرائن کی روشنی میں حدیث شریف کو جانچنے اور پرکھنے کی وجہ سے ہم اور مالکیوں (جو بڑے بڑے محدثین تھے) کو "اصحاب الرائے" کہا جانے لگا، اور جس وقت اسلاف سے ہم کو یہ لقب ملا تھا اس وقت یہ لقب باعث مدح وتعریف تھا، باعث قدح ومذمت نہیں تھا، جیسا کہ اب کچھ کوتاہ نظر لوگ سمجھنے لگے ہیں۔

مشہور تابعی سیدنا سفیان الثوری رحمۃ اللہ علیہ جو اپنے زمانہ کے امام، شیخ الاسلام، سید الحفاظ اور امیر المؤمنین فی الحدیث تھے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح بخاری میں جا بجا ان کے اقوال نقل فرمائے ہیں، نوے فیصد (90%) سے زائد اختلافی مسائل میں احناف کی موافقت کیا کرتے تھے، کوئی ان کے بارے بھی یہ کہہ دے کہ وہ بھی احادیث وآثار کو چھوڑ کر رائے کا اتباع کرتے تھے ہر گز نہیں:

چنانچہ ڈاکٹر شیخ محمد طاہر حکیم جو محمد بن سعود یونیورسٹی سعودی عرب کے پروفیسر ہیں اصحاب الرائے کی حقیقت اور تعریف میں فرماتے ہیں:

قلت: (أي قال الدكتور محمد طاهر حكيم الذي حقق كتاب المروزي "اختلاف الفقهاء") واما الزعم بأن الحنفية انما سموا أهل الرأي لأنهم يتركون النصوص ويتبعون الرأي فهذا قول عار من الدليل ساقط عن الاعتبار، ويكفي لتفنيده كما يمر بك في الكتاب، أن سفيان الثوري وهو الامام شيخ الاسلام سيد الحفاظ أمير المؤمنين في الحديث (تذكرة الحفاظ: 20/1) يوافق الحنفية في أكثر من90% من المسائل المختلف فيها فهل معنى

هذا أن سفيان، وهو من هو؟ يترك النصوص ويتبع الرأي؟ ولعل النظرة المجردة الى الأصول التي بنى عليها الامام أبوحنيفة مذهبه تعطينا صورة حقيقية، عن مدى اعتبار المذهب الحنفي للنصوص، ها هو يقول: انا نعمل بكتاب الله ثم بسنة رسوله عليه الصلاة والسلام ثم بأحاديث الصحابة أبي بكر و عمر وعثمان ونحوهم (تاريخ بغداد: 368/13) ويقول: هذا القياس الذي نحن فيه نطلب فيه اتباع أمر الله تعالىٰ لأنا نرده الى أصل أمر الله تعالىٰ في الكتاب والسنة واجماع الصحابة والتابعين فلا نخرج من أمر الله تعالىٰ (الطبقات السنية، ص: 146) ان كل ما في الأمر أن فقهاء الكوفة ومنهم الحنفية كانوا لا يقفون عند النصوص بل يغوصون في معانيها ويعترفون عليها ويبنون على هذه العلل وتلك المعاني الأحكام الجديدة، وحجتهم في ذلك أن أحكام الشريعة معقولة المعنى، وانها اشتملت على مصالح العباد وبنيت على أساس تحقيق المصالح فلا بد من البحث عن تلك العلل والمصالح التي شرعت الأحكام من أجلها حتى يمكن الفقيه استنباط الأحكام الجديدة على ضوء هذه المصالح وتلك العلل، ويستدلون أيضًا بفعل كبار الصحابة مثل عمربن الخطاب وعلي وعبدالله بن مسعود حيث كانوا يأخذون بالرأي وينظرون في علل الأحكام ومقاصدها۔[1]

(خطیب بغدادی کی تاریخ جلد تیرہ کے صفحات 416،420،450،414،242،418،448 میں آپ کو نظر آئے گا:
حضرت امام مالک کے پاس صرف امام اعظم رحمہ اللہ کے ساٹھ ہزار مسائل تھے جیسا کہ حضرت امام طحاوی رحمہ اللہ نے اپنی سند سے عبدالعزیز الدراوردی سے روایت کیا ہے اس کا ذکر مسعود بن شیبہ کی "التعلیم" کتاب میں ہے۔(ص: 154 تانیب الخطیب)
آپ اندازہ لگائیں کہ کیا ان ساٹھ ہزار مسائل کی بنیاد محض قیاس اور رائے پر تھی یا کتاب وسنت کی نصوص کی روشنی میں؟ کیا امام مالک کے بارے میں یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ مسائل کی اتنی بڑ تعداد جن کی بنیاد کتاب وسنت پر نہ ہو اپنے پاس رکھیں گے۔ جس نے صرف امام ابو یوسف اور امام محمد کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہوگا کہ امام ابو حنیفہ کا حدیث میں کیا مقام تھا، ان دونوں شاگردوں نے اپنی کتابوں میں حضرت امام اعظم کی ہزاروں حدیثیں ذکر کی ہیں۔ آپ فقہ حنفی کی کتابوں کو پڑھیں اور پھر ان کا موازنہ ومقابلہ احادیث رسول اللہ ﷺ سے کریں تو آپ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ ہوگی کہ امام اعظم کے حاسدوں نے ان کو قلیل الحدیث ہونے کا طعنہ دے کر اپنی عاقبت کیسے بری طرح خراب کی ہے۔
فقہ حنفی کی بیشتر مسائل کتاب وسنت اور آثار صحابہ کی روشنی میں ہیں تو اگر احادیث رسول اللہ ﷺ کا علم امام ابو حنیفہ کو نہ ہوتا تو یہ ان کے مسائل اور احادیث رسول اللہ اتنی موافقت کیسے رکھتے تو چاہے حضرت امام اعظم رحمہ اللہ حدیث کا نام نہ لیں مگر ان کے فقہی مسائل کی بنیاد قرآن وحدیث پر ہی ہے۔

حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کی احادیث کو جب ان کی اور ان کی شاگردوں کی اور دوسرے محدثین کی کتابوں سے جمع کیا گیا تو ان کی تعداد سترہ سندوں تک پہنچی جن میں سے پندرہ مسانید کا ذکر تو صاحب کشف الظنون نے کیا ہے۔(مقدمہ تحفۃ الاحوذی از مولانا عبد الرحمن مبارکپوری ترجمہ امام اعظم)

ابن خلدون نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو اپنے مقدمہ میں علم حدیث کے کبار مجتہدین میں سے شمار کیا ہے اور ابن خلدون ہی فرماتے ہیں کہ حضرت امام اعظم کی حدیث کے قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کے بارے شرطیں سخت تھیں یہی بات تحفۃ الاحوذی میں مولانا مبارکپوری صاحب نے بھی لکھی ہے اس وجہ سے ان سے روایت زیادہ نہ ہو سکی اور روایت زیادہ نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ امام ابو حنیفہ کو احادیث کا علم بھی نہیں تھا، جامع بیان العلم میں حافظ ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ یحیٰ بن معین فرماتے ہیں کہ میں نے کسی محدث کو ایسا نہیں پایا کہ اس کو امام وکیع پر مقدم کروں اور امام وکیع حضرت امام اعظم کے اقوال پر فتویٰ دیتے تھے، وکان یحفظ حدیثہ کلہ اور ان کی ساری احادیث کے حافظ تھے، وکان قد سمع من ابی حنیفۃ حدیثا کثیرا۔

اور انہوں نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے بہت سے حدیثیں سنی تھیں۔

کیا ایسے شخص کو سترہ حدیثوں والا کہنا انصاف کا خون نہیں ہے، غور فرمائیں کہ امام وکیع جیسا حدیث کا ماہر تو فرمائے کہ امام ابو حنیفہ کثیر الحدیث تھے اور خود انہوں نے امام ابو حنیفہ سے بہت سے حدیثوں کا سماع کیا تھا اور بعض بے ادب کہتے ہیں کہ امام صاحب نور اللہ مرقدہ کو صرف سترہ احادیث یاد تھیں اس بات میں کہاں تک سچائی ہے، حضرت یحیٰ بن معین ہی فرماتے ہیں کہ قد حدث عنہ قوم صالحون، یعنی امام اعظم سے محدثین کی ایک صالح جماعت نے حدیثیں روایت کی تھیں۔

اور حضرت امام بخاری کے استاذ حضرت ابن مدینی فرماتے ہیں کہ حضرت امام اعظم رحمہ اللہ سے روایت کرنے والوں میں امام سفیان ثوری، حضرت عبد اللہ بن مبارک، حماد بن زید، ہیثم، وکیع بن جراح، عباد بن عوام، اور حضرت جعفر بن عون جیسے ائمہ حدیث ہیں اور امام ابو حنیفہ ثقہ محدث تھے۔(جامع العلم ص: 432)

کیا ایسے ہی شخص کو قلیل الحدیث اور سترہ حدیث والا کہا جائے گا جس سے روایت کرنے والے اور جس کے شاگرد ایسے ایسے کبار محدثین ہو، یہ محدثین کرام ہیں جن کی احادیث سے بخاری و مسلم بھری ہیں۔

ابن نقطہ مشہور محدث ہیں ان کی رجال حدیث میں ایک کتاب ہے جس کا نام "کتاب التقیید" ہے اس میں انہوں نے جن کتابوں کے رواۃ کا ذکر کیا ہے ان میں ایک کتاب مسند ابی حنیفہ بھی ہے (ص: 3) ابن نقطہ کا انتقال 629ھ میں ہوا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ان کے زمانہ میں مسند ابی حنیفہ چرچا تھا اور وہ احادیث کا اہم ماخذ سمجھا جاتا تھا تبھی ابن نقطہ مسند ابی حنیفہ کے راویوں کا بھی بخاری و مسلم اور احادیث کتابوں کے رواۃ کے ساتھ اہتمام سے ذکر کیا ہے محمد بن المظفر بن موسیٰ ابو الحسین البغدادی حافظ حدیث اور بڑی شان کے محدث تھے ان کا سن وفات 379 ہجری ہے ان کے ترجمہ میں ابن نقطہ لکھتے ہیں: وجمع مسند ابی حنیفۃ (کتاب التقیید ج: 1/ص: 113)

یعنی انہوں نے بھی مسند ابی حنیفہ کو جمع کیا تھا۔

ایک بات یاد رکھیں کہ حضرت امام اعظم کے شان گھٹانے اور ان کے برائی کرنے کے لئے عام طور پر دشمنان ابو حنیفہ کا سب سے بڑا سہارا اور ان کا سب سے مستند ذریعہ خطیب بغدادی کی تاریخ کی تیرہویں جلد ہے مگر حضرت امام ابو حنیفہ کے بارے میں تاریخ بغدادی پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا اس وجہ سے کہ بغدادی جس شخص کا نام ہے وہ امام ابو حنیفہ کا سب سے بڑا دشمن گزرا ہے، اس نے اپنی کتاب میں جعلی موضوع من گھڑت روایتوں کا ایک انبار جمع کیا ہے انہیں جھوٹی روایتوں پر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ کی برائی کرنے والے عام طور پر اعتماد کرتے ہیں۔

حافظ ابن حجر " الخیرات الحسان " میں فرماتے ہیں : ان الاسانید التي ذكرها للقدح لا يخلو غالبها من متكلم فيه او مجهول ولا يجوز اجماعا عرض مسلم بمثل ذلك فكيف بامام من ائمة المسلمين .

یعنی خطیب بغدادی نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی برائی بیان کرنے کے لئے جن روایتوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے اکثر کا حال یہ ہے اس کے رواۃ یا مجروح ہیں یا مجہول ہیں اور یہ بات اجماعی ہے کہ کسی عام مسلمان کی بھی اس طرح کی روایتوں سے برائی بیان کرنا جائز نہیں ہے چہ جائے کہ ائمۃ المسلمین میں سے کسی کی ان روایتوں کو بنیاد بنا کرکے برائی بیان کی جائے۔

حافظ سیوطی فرماتے ہیں: لا تغير بكلام الخطيب فان عنده العصبية الزائدة .

کہ اے مخاطب تو (امام ابو حنیفہ کے خلاف) خطیب کے کلام سے دھوکہ مت کھا اس کے اندر بہت زیادہ تعصب تھا۔ (تبعیض الصحیفة للسیوطی ص: 55)

اور میزان کبری میں حضرت امام شعرانی فرماتے ہیں: ولا عبرة بكلام بعض المتعصبين في حق الامام ولا بقولهم انه من جمعيت اهل الرائ بل كلام من يطعن في هذا الامام عند المحققين يشبه الهذايانات .

یعنی بعض متعصبین نے جو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے حق میں بدگوئی کی ہے اس کا کچھ اعتبار نہیں ہے اور نہ ہی درست ہے کہ امام صاحب پابند رائے تھے بلکہ ان کی بات جو امام صاحب کے حق میں طعنہ کرے محققین کے نزدیک بکواس سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی ہے۔

غرض حضرت امام اعظم رحمہ اللہ پر اللہ کا شروع ہی سے یہ فضل عظیم تھا کہ اس نے ان کے حاسدین کی ایک جماعت پیدا کردی تھی جن کا مقصد یہی تھا کہ وہ امام اعظم کے شان میں جھوٹی سچی باتیں سند کے ساتھ بیان کریں تاکہ امام اعظم رحمہ اللہ نے تدوین فقہ کا جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا تھا اس کی حقیقت کو کم کرسکیں مگر اللہ نے ان حاسدوں کو تحت خیبۃ وخسران کا مزہ چکھایا اور امام اعظم کی فقہ خود انہیں کے زمانہ میں اقطار ارض میں پھیل گئی اور اس وقت سے لے کر آج تک امت کا دو تہائی حصہ انہیں کے فقہ کے واسطہ سے شریعت پر عمل پیرا ہے۔

حافظ ابن عبد البر مالکی نے " جامع بیان العلم " میں بایں الفاظ واضح کیا ہے فرماتے ہیں: "امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ پر لوگوں نے ارجاء کی وجہ سے بھی جرح کیا ہے، حالانکہ ارجاء کے قائلین بہت سے اہل علم رہے ہیں، لیکن جتنی بری باتیں امام ابو حنیفہ کے بارے میں کہی گئی ہیں وہ کسی اور کے بارے میں نہیں کہی گئی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ (اللہ نے ان کو) امت کا پیشوا اور امام بنایا تھا، اسی کے ساتھ ساتھ لوگ ان پر حسد بھی کرتے تھے اور ان کی طرف وہ باتیں منسوب کرتے تھے جن سے ان کا دامن پاک تھا اور جو ان

کے مقام علم و فضل سے گری ہوئی تھیں حضرت امام ابو حنیفہ کی تعریف علماء کی ایک بڑی جماعت نے کی ہے اور ان کو دوسرے اہل علم پر فضیلت دی ہے۔(ص: 431طبع دار الکتب العلمیہ)

حافظ ابن عبد البر مزید فرماتے ہیں: "حضرت امام ابو حنیفہ سے جن محدثین نے روایت کیا ہے ان کی تعداد ان لوگوں سے زیادہ ہے جنہوں نے ان پر جرح کی ہے"۔ (ایضاص: 432)

پھر فرماتے ہیں: "کہا یہ جاتا رہا کہ اسلاف میں سے کسی کے بارے میں لوگوں کے راویوں کا الگ الگ ہونا اس آدمی کے بلند مرتبہ ہونے کی دلیل ہے۔ (ایضاص: 433)

یعنی جن کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی ہے اس کی طرف لوگوں کی نگاہیں نہیں اٹھتی ہے۔ نگاہ اس کی طرف اٹھتی ہے جو باحیثیت اور عظیم القدر شخص ہوتا ہے اور جس کا مقام جتنا بلند ہوتا ہے اس کے حاسدین بھی اسی قدر ہوتے ہیں، چونکہ وہ اس کے مقام بلند کو پا نہیں سکتے ہیں اس وجہ سے ان کی برائیاں کرکے اپنی دل کی بھڑاس نکالتے ہیں، آپ نے سنا ہوگا شجر ثمر دار پر پتھر زیادہ پڑتے ہیں خالی درخت پر کوئی پتھر نہیں مارتا۔

حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ کے بات سے آپ نے اندازہ لگالیا کہ عیب حضرت امام اعظم میں کوئی نہیں تھا جس کی بناء پر ان پر جرح کی جائے، عیب ان میں تھا جنہوں نے حضرت امام اعظم کو اپنے جرحوں کا نشانہ بنایا ہے اور وہ عیب حسد کا تھا۔ اور آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ وہ خطرناک اخلاقی بیماری ہے جس سے آدمی کا شفا پانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ حاسد اپنے محسود کے بارے میں ہر گھناؤنی حرکت کو آزماتا ہے حتی کہ وہ اس کے خلاف باتیں گھڑھتا بھی ہے اور جھوٹی تہمتوں کے لگانے میں اس کو شرم نہیں آتی ہے، مگر ذلیل و خوار حاسد ہی ہوتا ہے محسود کا درجہ دن بدن بلند ہوتا رہتا ہے، حضرت امام اعظم کا معاملہ بھی یہی رہا، کم ظرفوں نے حسد تو بہت کیا ان کے خلاف عوام میں بد ظنی پیدا کرنے کے لئے جو کچھ ان کے بس میں تھا سب کچھ کیا، خوب خوب روایتیں گڑھیں، جھوٹ کا انبار لگایا مگر امام اعظم کی عزت و رفعت اور امامت فی الدین اور مقبولیت عند اللہ کا ستارا ہر روز بلند ہی ہوتا رہا، اور آج دنیا کا دو تہائی حصہ انہیں کے فقہ کے پابند ہے اور انہیں کی تقلید کرتا ہے۔

ہر بوالہوس کے واسطے دار و رسن کہاں
یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

اور حاسدین اور جھوٹوں کا انجام کیا ہوا؟ تو آج میں اکثر کا نام لینے والا بھی کوئی نہیں کتابوں میں بس ان کا ذکر رہ گیا ہے، اور بعضوں کا انجام تو ایسا بھیانک ہوا کہ الامان والحفیظ، انہیں میں ایک صاحب نعیم بن حماد ہیں جو خیر سے امام بخاری کے استاذ بھی ہیں، یہ صاحب امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے پکے دشمن تھے اور ان کی ثقاہت اور امانت کا حال یہ تھا کہ یہ حضرت امام اعظم کے شان میں بدگوئی کے لئے روایتیں گڑھا کرتے تھے، امام اعظم کے خلاف جن محدثین نے حد درجہ گرے اخلاق کا ثبوت دیا ہے ان میں نعیم بن حماد کا نام سر فہرست ہے اس شخص کا حال بیان کرتے ہوئے حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: كان يضع الحديث في تقوية السنة و حكايات مزورة في ثلب نعمان كلها كذب.

یعنی نعیم بن حماد سنت کو تقویت دینے میں حدیث گڑھا کرتا تھا، اسی طرح امام ابو حنیفہ کے بد گوئی کے لئے افسانے تیار کیا کرتا تھا جو سب کے سب جھوٹ ہوتے۔(تہذیب التہذیب ج:10/ص : 463)

تعجب ہے کہ ایسے وضاع اور مزور اور کاذب کے روایتوں کو حضرت امام بخاری نے اپنی کتاب " صحیح بخاری " میں درج کیا ہے اور اس سے روایتیں لی ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ امام بخاری نے دوسروں کے حدیثوں کے ساتھ ملا کر اس کی روایتیں نقل کی ہیں، بلا شبہ بخاری نے ایسا ہی کیا ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا ایسا وضاع کذاب شخص اس لائق بھی تھا کہ اس کی روایتیں دوسروں کی روایتوں کو ملا کر ہی لی جائیں؟ امام ابو حنیفہ پر اس کا کذب وافتراء تو کہہ کر گوارا کرلیا جاسکتا ہے کہ اس شخص کو امام صاحب سے دشمنی تھی اور یہ اس کے لئے جو کرتا تھا سو کرتا تھا مگر اللہ کی رسول ﷺ کی سنت اس شخص کی محتاج تھی کہ وہ ان کو قوی بتلانے کے لئے احادیث گڑھنے کا گھناؤنا فعل انجام دے اور آپ ﷺ کی ذات مبارک کی طرف ان باتوں کو منسوب کرے جو آپ ﷺ کی زبان پاک سے ادا نہ ہوئی تھیں۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے ساتھ جن لوگوں نے حسد وعداوت کا معاملہ کیا اور ان کی شان میں بٹہ لگانے کی کوشش کی ان میں بعض کا انجام بہت برا ہوا انہیں میں یہ نعیم بن حماد بھی تھا، لوگوں نے لکھا ہے کہ حکومت وقت نے اس کو گرفتا کیا اور اس کو رسی میں جکڑ کر کھینچا گیا اور ایک گڑھے میں ڈال دیا گیا اور اس طرح اس کو زندہ دفن کر دیا گیا۔

ولم یکفن ولم یصل علیہ ۔ (تاریخ خطیب ج: 13 / ص: 314)

نہ اس کو کفن نصیب ہوا اور نہ اس کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔

نعیم بن حماد کا حوالہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی بد گوئی کرنے والے بہت دیتے ہیں، اور نعیم ہی کے حوالہ سے امام بخاری نے بھی حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں یہ شاندار روایت ذکر کی ہے امام بخاری نعیم کے حوالہ سے اپنی کتاب تاریخ صغیر میں لکھتے ہیں: " بیان کیا ہم سے نعیم بن حماد نے اس نے کہا کہ بیان کیا ہم سے فزاری نے اس نے کہا کہ میں سفیان کے پاس بیٹھا تھا کہ ان کے پاس ابو حنیفہ کے وفات کی خبر آئی تو انہوں نے کہا اللہ کا شکر ہے یہ شخص اسلام کو گھنڈی گھنڈی کرکے توڑتا تھا اسلام میں اس سے بڑا بد بخت کوئی پیدا ہی نہیں ہوا۔(ص: 171 مطبوعہ لاہور)

تعجب امام بخاری پر انہوں نے اس گندی اور ظاہر الکذب روایت کو جس کا گڑھا ہونا بالکل واضح ہے کیسے روایت کیا، کیا ان کو معلوم نہیں تھا کہ ان کا یہ استاذ کس کردار اور کس صفت کا آدمی ہے۔ حضرت سفیان ثوری ایک جلیل القدر محدث ہیں سب کو معلوم ہے کہ عام فقہی اعتقادی مسائل میں عموماوہ حضرت امام ابو حنیفہ کی موفقت کرتے ہیں، ان کے بارے میں اس کا تصور بھی کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک مسلمان چہ جائیکہ امام اعظم جیسے جلیل القدر فقیہ کی وفات سن کر انا للہ پڑھنے کے بجائے اپنی زبان سے یسے گندی الفاظ نکالیں گے جس کا تصور ایک عالم مسلمان سے بھی نہیں کیا جاسکتا، چونکہ یہ بات امام بخاری نے نقل کی ہے اس وجہ سے امام ابو حنیفہ کے دشمنوں کو امام صاحب کے خلاف بکواس کرنے کے لئے اور اپنا بغض ظاہر کرنے کے لئے ایک بڑا ہتھیار مل گیا، مگر اس سے امام اعظم کا تو کچھ نہیں بگڑا بلکہ امام بخاری ہی کو تنقید کا نشانہ بننا پڑا، اس روایت کو نقل کرکے مشہور غیر مقلد عالم مولانا ابراہیم سیالکوٹی فرماتے ہیں کہ " نعیم کے متعلق نقاد ائمہ حدیث میں سخت اختلاف ہے، بعض کی رائیں اچھی ہیں اور بعض کی بہت سخت ہیں۔

پھر فرماتے ہیں : "عباس بن مصعب نے اپنی تاریخ میں کہا ہے کہ نعیم بن حماد نے حنفیوں کے رد میں کئی جھوٹی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ یعنی نعیم بن حماد کا ایک دلچسپ مشغلہ یہی تھا کہ وہ احناف کے خلاف کتابیں لکھا کرے، اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ ان کتابوں میں حضور اکرم ﷺ کی طرف منسوب کرکے بے اصل روایتیں نقل کرتا تھا یعنی بے شرمی و بے دینی کے انتہا پر یہ شخص تھا کہ حضور اکرم ﷺ کی طرف بے دھڑک جھوٹ حدیث منسوب کرتا تھا محدث کبیر حضرت امام یحیٰ بن معین فرماتے ہیں کہ میں اس نعیم کے حال سے خوب واقف ہوں، پھر نعیم کے اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں جس میں اس نے رائے و قیاس کی مذمت میں ایک حدیث گڑھ کر حضور ﷺ کی طرف منسوب کی ہے لیس لہ اصل یعنی یہ حدیث بالکل بے اصل ہے۔

یہ سب کہہ کر مولانا ابراہیم سیالکوٹی صاحب فرماتے ہیں : اس روایت کو نعیم کی کتب در بارہ تردید حنفیہ کے ساتھ ملا کر غور کیا جائے تو صاف کھل جاتا ہے کہ نعیم کی مخالفت بنا پر تحقیقات نہیں ہے بلکہ بے اصل روایات کی بنا پر ہے۔

اور اس کے بعد حافظ ذہبی کے میزان سے انہوں نے بھی یہ نقل کیا ہے کہ نعیم سنت کی تقویت میں حدیث بنالیا کرتا تھا اور جھوٹی حکایتیں بھی امام ابو حنیفہ کی عیب گوئی میں جو سب کے سب جھوٹ ہیں۔(میزان ج: 2/ص:536 بحوالہ تاریخ اہلحدیث ص: 62)

پھر حافظ صاحب نعیم کے بارے میں امام نسائی کی یہ جرح نقل کرتے ہیں "نعیم ضعیف لیس بثقۃ" یعنی نعیم ضعیف ہے ثقہ نہیں ہے لیس بحجۃ وہ حجت نہیں ہے پھر فرماتے ہیں کہ ابن حبان نے اس کو ثقات میں لکھا ہے لیکن یہ بھی کہا ہے کہ کہ وہ غلطی بھی کرتا تھا اور وہم بھی۔ امام ابو دوٗد فرماتے ہیں کہ نعیم بن حماد کی بیس احادیث ایسی ہے جن کا کوئی اصل نہیں ہے۔

پھر فرماتے ہیں : "کہ خلاصۃ الکلام یہ کہ نعیم کی شخصیت ایسی نہیں ہے کہ اس کی روایت کی بنا پر حضرت امام ابو حنیفہ جیسے بزرگ امام کے حق میں بدگوئی کریں۔ (ص: 64)

حضرت امام ابو حنیفہ کے حاسدین اور اور ان سے عداوت و دشمنی رکھنے والے آپ کی بد گوئی کے لئے اسی طرح کی روایتوں کا سہارا لیتے ہیں۔

خیر یہ تو امام بخاری کے استاذ نعیم کا حال تھا، نعیم نے اس روایت کو فزاری سے نقل کیا ہے، یہ فزاری کون بزرگ ہیں تو دکتور محمود الطحان استاذ الحدیث الجامعہ محمد بن سعود الاسلامیہ بالریاض اپنی کتاب "الحافظ الخطیب البغدادی واثرہ فی علوم الحدیث" میں فرماتے ہیں : "فزاری حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی شان میں بہت زبان چلاتا تھا، اور اپنی تمام مجلسوں میں ان سے عداوت کا معاملہ کرتا تھا اور خلفائے عباسیین کے دربار میں ان کو قتل کرانے کے در پے رہا کرتا تھا اس طرح سے وہ ان کا تقرب حاصل کرنا چاہتا تھا وہ ان سے یہ کہتا تھا کہ امام ابو حنیفہ خلفائے عباسیین کے خلاف آگ بھڑکاتے ہیں اور اس کا سبب جیسا کہ کہا جاتا ہے یہ تھا کہ حضرت امام ابو حنیفہ نے ان کے بھائی کو فتوی دیا تھا کہ جعفر منصور کے خلاف ابراہیم بن عبد اللہ الطالبی کی جنگ میں مدد کرے، چنانچہ اس کا بھائی اس جنگ میں قتل ہوا تو اس فزاری کی عقل اس بھائی کی غم جاتی رہی وہ سمجھتا تھا کہ ابو حنیفہ اس کے بھائی کے قتل ہونے کا سبب بنے ہیں تو اس نے اپنے شیخ امام ابو حنیفہ کے خلاف نہایت جاہلانہ طریقہ پر زبان کو بے لگام کر دیا یہ سارا قصہ ابن حاتم کی کتاب جرح و تعدیل میں مذکور ہے"۔ (ص: 328)

ابو اسحاق فزاری کا حال یہ ہو گیا تھا کہ بقول ڈاکٹر محمد بن الطحان : یہ شخص ائمہ حدیث کے نام کو امام ابو حنیفہ پر جرح کا ذریعہ بناتا اور ان کے طرف کچھ باتیں منسوب کرکے اپنی طرف سے ان گڑھی حکایتوں اور قصوں کی تکمیل کرتا تھا۔ (ص: 331)

غرض ابو اسحاق فزاری پر اپنے بھائی کے قتل کئے جانے کا غم ایسا سوار ہوا کہ وہ امام ابو حنیفہ کا پکا دشمن بن ہو گیا اور اس نے ائمہ حدیث کے نام پر خوب خوب حکایتیں گڑھیں اور ان کو رواج دیا، جن کو امام ابو حنیفہ سے ذرا بھی کدورت تھی انہوں نے ان جھوٹی روایتوں اور حکایتوں کو مزا لے لے کر اپنی کتابوں میں درج کیا، حضرت امام بخاری کا معاملہ بھی یہی تھا کہ ان کا ذہن حضرت امام ابو حنیفہ کی طرف سے کسی وجہ سے صاف نہیں تھا۔ جس کی شہادت خود کی کتاب "صحیح بخاری" میں بھی موجود ہے جس سے ہر صاحب علم واقف ہے، سیرۃ امام بخاری غیر مقلد مصنف مولانا عبد السلام مبارکپوری فرماتے ہیں : امام بخاری نے صحیح بخاری میں اہل الرائے پر جس طرح تعریضات کی ہیں مخفی نہیں۔ (ص: 96)

اس وجہ سے انہوں نے بھی حضرت امام ابو حنیفہ کے بارے میں فزاری اور نعیم جیسے افاک وکذاب کی گڑھی روایتوں پر اعتبار کرلیا اور امام ابو حنیفہ کی شان میں اپنے مقام ومرتبہ سے ہٹ کر بالکل خلاف عقل باتوں کو بھی قبول کرلیا، صحیح سندوں سے امام ابو حنیفہ کی شان میں حضرت سفیان کی جو باتیں ہیں، بخاری نے ان سے صرف نظر کیا اور امام ابو حنیفہ کے بارے میں منحوس ہونے کی بات نعیم اور فزاری جیسے لوگوں پر اعتبار کرکے اپنی کتاب میں درج کردی، حضرت امام بخاری تو فن حدیث کے امام تھے احادیث کا خزانہ ان کے ذہن میں تھا ان کے بعض غالی معتقدین توان کے بارے میں اس طرح کی باتیں نہایت شوق وزوق سے لکھتے ہیں کہ:

ایک روز امام بخاری نے رات میں احادیث شمار کرنی شروع کی تو دولاکھ حدیثوں کو شمار کیا جو انہوں نے مختلف تصانیف میں داخل کی تھیں۔

غیر مقلد احباب اس طرح کی مبالغہ آرائیوں کو امام بخاری کی تعریف میں مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں، مگر امام ابو حنیفہ کا عشاء کی وضو سے تہجد کی نماز پڑھنے کا واقعہ ان کے سر میں درد پیدا کرتا ہے آپ غور فرمائیں! امام بخاری ایک رات میں دو لاکھ حدیث شمار کرتے ہیں اور صرف نماز کے بارے میں وہ دس ہزار حدیثیں صرف ایک مجلس میں بیان کرسکتے تھے، کیا یہ بات عقل میں آنے والی ہے اور کمال یہ ہے کہ جو امام بخاری ایسے تھے کہ ایک مجلس میں دس ہزار صرف نماز کے بارے میں روایت کرسکتے تھے، ان کو قرات خلف الامام کے سلسلہ کی نہ آمین بالجہر کے سلسلہ کی ایک صریح روایت نہیں مل سکی جس کو وہ اپنی صحیح بخاری میں درج کرسکیں، اور سینہ پر ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنے والی کا تو امام بخاری کی صحیح میں کہیں نشان بھی نہیں ملتا، نہ ایک ہاتھ سے مصافحہ نہ تین طلاق کے ایک ہونے کا نہ تراویح کے آٹھ رکعتوں کا، حالانکہ یہی وہ مسائل ہیں جن پر ان کا سارا زور صرف ہوتا ہے۔

اور فرمایا کہ اگر مجھ کو کہا جائے تو میں ابھی بیٹھ کر صرف ایک نماز سے متعلق دس ہزار حدیثیں روایت کرسکتا ہوں۔ (سیرۃ امام بخاری از مباکپوری، ص: 92)

ایسے جلیل القدر امام کو یہ کیسے معلوم نہیں ہوسکا کہ اسلام میں شوم ارو نحوست کوئی چیز نہیں ہے، اور اگر ہیں بھی تو صرف تین چیزوں میں ہے حضرت امام بخاری کی نگاہ سے اللہ کے رسول کے یہ ارشادات کیوں اوجھل رہے۔

حقیقت میں بات وہی ہے جس کو اہل بصیرت نے نقل کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ پر جرح کرنے والے دو ہی طرح کے لوگ تھے، یا تو حاسد تھے، یا جاہل تھے، حضرت امام بخاری کا علمی مقام تو مسلم ہے، مگر حسد وہ مرض ہے کہ اس سے وہ محفوظ رہ سکتا ہے، جس کو اللہ محفوظ رکھے، اور جب استاذ بھی امام بخاری کو نعیم اور حمید جیسے لوگ مل جائیں جن کی جلن اور کڑھن امام ابو حنیفہ سے اور احناف سے معروف زمانہ ہے تو امام بخاری کے زبان و قلم سے امام ابو حنیفہ کے متعلق جو بھی نہ نکل جائے مقام تعجب نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہ جو امام بخاری کے استاذوں کے استاذ تھے کے بارے میں امام بخاری نے جو جرحیں کی ہیں شاید وہ اللہ کو پسند نہیں آئیں اور غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ امام بخاری جیسا جلیل القدر محدث اور فن حدیث کا امام جس کی شہر سے عالم اسلام گونج رہا تھا اور جس کے شاگردوں کی تعداد ہزاہا ہزار تھی اپنی عمر کے آخری ایام میں بڑی تکلیف ہوئی تھی اور ان پر دنیا کی زمین تنگ ہو گئی تھی حضرت امام ذہلی نے ان کو اپنے دربار سے اس طرح باہر کیا کہ نیشاپور سے جب وہ نکلے ہیں تو ان ساتھ امام مسلم اور ایک صاحب کے سوا کوئی اور نہیں تھا اور نیشاپور سے نکلنے کے بعد ان کو کبھی قرار سے رہنے کا موقع نہیں ملا، ان کی مخالفت کرنے والے اتنے ہوگئے کہ کسی جگہ پناہ لینا مشکل ہوگیا اور آخر کار امام بخاری کو اللہ سے یہ دعا کرنی پڑی "خدایا تیری زمین باوجود کشادہ ہونے کے مجھ پر تنگ ہو گئی ہے، مجھے اپنے پاس بلالے" خدا نے یہ دعا قبول فرمائی اور چند روز بعد امام بخاری کا انتقال ہوگیا۔ (سیرۃ امام بخاری ص: 99)

جنازے میں کتنے آدمی شریک ہوئے نماز جناہ کس نے پڑھائی اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا، حضرت امام اہل سنت احمد بن حنبل کا جب انتقال ہوا تھا تو ان کی نمازہ جنازہ پڑھنے والوں کی تعداد لوگوں نے دس لاکھ بتلائی ہے۔ مگر امام المحدثین بخاری کا ایک گمنام جگہ میں انتقال ہو جاتا ہے اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ان کی نماز جنازہ کس نے پڑھائی اور کتنے لوگ اس میں شریک تھے، اور معنوی طور پر امام بخاری کی شخصیت ایسی مجروح ہوئی کہ امام مسلم جیسے ان کے شاگرد نے صحیح مسلم میں امام بخاری سے کوئی روایت نہیں لی اور بہت سے محدثین نے ان پر جرح کی اور طرح طرح کے ان کے اوپر موخذات ہوئے ان کی لوگوں نے غلطیاں نکل لیں، اس بارے میں انہوں نے تصانیف کیں امام ذہلی اور ابو حاتم نے ان کو متروک قرار دیا، صحیح بخاری کے روایوں تک پر دار قطنی جیسے محدث نے کلام کیا، امام بخاری اور ان کے کتاب کے ساتھ یہ معاملہ کرنے والا الحمدللہ کوئی حنفی اور اہل الرائے میں سے نہیں تھا بلکہ یہ سب کے سب امام بخاری کے ہم مسللک و ہم مشرب محدثین ہی تھے، احناف نے تو امام بخاری کے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود بھی کہ ان کا معاملہ ابو حنیفہ کے ساتھ کیسا رہا ہے ان کو ہمیشہ اپنے سر ہی پر بٹھایا اور ان کو امیر المؤمنین فی الحدیث ہی سمجھا۔

امام بخاری جس کسمپری سے آخری ایام گزار کر اس دنیا سے تشریف لے گئے، اور جس طرح سے ان کا جنازہ پڑھا گیا اس میں ان لوگوں کے لئے بڑی عبرت ہے جو امام اعظم حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی شان میں اپنی زبان دراز کرتے ہیں۔

حضرت امام اعظم کے خلاف جن لوگوں نے بکواسیں کی ہیں یہ لوگ عقیلی کی کتاب "کتاب الضعفاء" سے بھی بہت کچھ نقل کرتے ہیں، محدث عقیلی نے کتاب الضعفاء میں امام ابو حنیفہ کا ذکر کرکے ان کا حدیث ضعیف ہونا ثابت کیا ہے، اور امام ابو حنیفہ سے جلنے بھلنے والے لوگ اس کتاب کی باتوں کو نقل کرکے عوام کو امام ابو حنیفہ سے بھڑکاتے ہیں، چونکہ محدث عقیلی اور ان کتاب سے عام طور پر لوگ ناواقف ہوتے ہیں اس وجہ وہ ان باتوں کو سچ سمجھ لیتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر محدث عقیلی اور ان کی کتاب پر اعتماد کیا جائے اور اس کو قابل اعتبار سمجھا جائے اور عقیلی کو محدثین کے ضعیف ہونے یا نہ ہونے میں معیار قرار دیا جائے تو نفیہ

محدثین کی ایک بہت بڑی تعداد مجروح قرار پائے گی، حتی کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے رواۃ بھی ناقابل اعتبار قرار پائیں گے اور اس طرح صحیحین کا پایہ اعتبار بھی جاتا رہے گا، عقیلی کا حال تو یہ ہے کہ وہ امام بخاری کے سب سے بڑے استاذ جن کی روایتوں سے بخاری نے اپنی صحیح کو بھر رکھا ہے یعنی علی بن المدینی کو بھی اس کتاب میں ذکر کیا ہے، حالانکہ علی بن المدینی وہ ہیں جن کے ثقہ ہونے اور جن کے جلالت قدر پر سارے محدثین کا اتفاق عام ہے، مگر عقیلی نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے۔ عقیلی نے کثیر بن شنیطر کو بھی ضعیف قرار دیا ہے حالانکہ نسائی کے سوا اصحاب ستہ نے ان کی روایتوں کی اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔(کتاب الضعفاء ج:1/ص: 6)

کثیر بن شنیطر کی روایتوں کی تخریج امام بخاری نے کی ہے اور ایک روایت کی تخریج امام مسلم نے کی ہے، بخاری والی روایت کو ابوداؤد اور امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔

عقیلی نے کتاب الضعفاء میں کثیر مولی ابن سمرہ کا بھی ذکر کیا ہے، اور کمال یہ ہے کہ صرف ذکر کیا ہے کسی سے ان پر جرح نقل نہیں کی ہے۔(ج: 4/ص: 3)

عقیلی نے اس کتاب میں محمد بن ابراہیم تیمی کا بھی ذکر کیا ہے۔(ج:4/ص: 20)

حالانکہ محمد بن ابراہیم تیمی کی توثیق پر سارے محدثین کا اتفاق ہے، امام بخاری نے ان کی روایت سے اپنی صحیح میں احتجاج کیا ہے، ابن معین ان کو ثقہ قرار دیتے ہیں، ابو حاتم نے بھی ان کو ثقہ قرار دیا ہے امام نسائی ابن خراش، ابن حبان یعقوب بن شیبہ سب ان کو ثقہ قرار دیتے ہیں امام ذہبی فرماتے ہیں: وثقہ الناس واحتج بہ الشیخان وتفزالقنطرۃ یعنی عام طور پر لوگوں نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، شیخین یعنی امام بخاری و مسلم نے ان سے احتجاج کیا ہے اور یہ زبردست قسم کے ثقہ تھے۔

عقیلی نے محمد بن اسحاق کو بھی ضعفاء میں ذکر کیا ہے، حالانکہ ان کی روایت سے غیر مقلد بزرگ قرات خلف الامام کے مسئلہ میں احتجاج کرتے ہیں اور یہ شخص ان کے نزدیک زبردست ثقہ ہے۔

عقیلی نے محمد بن جحادہ کو بھی ضعیف قرار دیا ہے۔(ج: 4/ص: 50)حالانکہ یہ شخص بالاتفاق ثقہ محدث ہے بخاری، مسلم، ابوداود، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ ان تمام کتابوں میں ان کی حدیثیں ہیں۔

عقیلی نے محمد بن حسن الاسدی کو بھی ضعیف قرار دیا ہے۔(ج: 4/ص: 50)حالانکہ یہ بخاری کے نزدیک حجت ہیں بخاری نے اپنی صحیح میں ان کی روایت ذکر کی ہے، نسائی میں بھی ان کی روایت ہے اور بڑے بڑے محدثین نے جیسے ابن المدینی، دارقطنی اور ابن شاہین وغیرہ نے بھی ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔

عقیلی نے محمد بن ارشد الخزاعی کو بھی ضعیف بتلایا ہے ۔(ج 4/ص:65)جب کہ امام احمد بن حنبل، ابن معین، علی بن المدینی، نسائی، جیسے لوگ ان کو ثقہ بتلاتے ہیں ان کے تلامذہ میں کبار ائمہ فقہ وحدیث ہیں مثلا امام ثوری، شعبہ، ابن المبارک، ابن المہدی وغیرہ نے اس سے روایت کی ہے۔

عقیلی نے محمد بن طلحہ کو بھی ضعیف قرار دیا ہے۔(ج: 4/ص: 85)جب کہ یہ صدوق مشہور ہیں بخاری و مسلم میں ان کی روایتوں سے احتجاج کیا گیا ہے، بڑے بڑے ائمہ حدیث جیسے عبدالرحمٰن بن مہدی اب سلام ابوداؤد طیالسی وغیرہ نے ان سے روایت کی ہے، امام احمد عجلی ابن حبان وغیرہ نے ان کو ثقہ کہا ہے، عقیلی نے محمد بن عبداللہ بن مسلم کو بھی ضعیف قرار دیا ہے۔(ج: 4/ص: 88)

جب کہ ان کے صدوق و ثقہ ہونے پر عام اتفاق ہے، بخاری و مسلم اور سنن اربعہ میں ان کی روایات موجود ہیں۔

اسی طرح عقیلی نے محمد بن عمر کو بھی ضعیف قرار دیا ہے۔(ج: 4/ص: 109)جب کہ ان کی توثیق پر اتفاق عام ہے بخاری و مسلم اور سنن اربعہ میں ان کی حدیثیں ہیں۔

عقیلی نے محمد بن عجلان المدینی کو بھی ضعیف قرار دیا ہے۔(ج: 4/ص: 118)

حالانکہ یہ جلیل القدر اور عظیم المرتبت محدث تھے ان سے روایت کرنے والوں میں امام مالک، امام شعبہ، یحیٰ بن سعید القطان جیسے ائمہ حدیث ہیں سنن اربعہ میں ان کی روایت موجود ہے۔

عقیلی نے محمد بن فضیل بن غزوان کو بھی ضعفاء میں ذکر کیا ہے۔(ج:4/ص: 118)جب کہ ان کا ثقہ ہونا متفق علیہ بات ہے بخاری، مسلم اور سنن اربعہ میں ان کی ورایت موجود ہے۔

اس طرح نہ معلوم کتنے ثقہ محدثین اور صحاح ستہ کے راویوں کو عقیلی نے اپنی کتاب الضعفاء میں ذکر کرکے ان کی مقدس شخصیتوں کو داغدار کرنے کی کوشش کی اس لئے اگر انہوں نے حضرت امام اعظم کے بھی اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے تو ثقہ کو غیر ثقہ قرار دینا غیر مجروح کو مجروح قرار دینا یہ عقیلی کا کام ہی رہا ہے، ان ثقہ راویوں کا کچھ نہیں بگڑا البتہ اس سے خود عقیلی کی شخصیت مجروح ہوگئی۔ عقیلی نے جب المدینی بخاری کے استاذ تک کو نہیں چھوڑا تو وہ ابو حنیفہ اور ان کے تلامذہ کو کب بخشنے والے تھے، امام ذہبی ابن المدینی کو عقیلی کی مجروح اور ضعیف قرار دینے کی حرکت پر برافروختہ ہو کر عقیلی سے یو مخاطب ہوئے ہیں:

فمالك عقل يا عقيلي اتدري فيمن تتكلم كانك لاتدري ان كل واحد من هؤلاء منك بطبقات بل اوثق من ثقات كثير من لم توردهم في كتابك.(الميزان ج: 3/ص: 14)

یعنی اے عقیلی کیا تجھے عقل نہیں ہے کہ تو کس کس کو مجروح قرار دے رہا ہے، گویا تو یہ بھی نہیں جانتا کہ ان میں ہر تجھ سے کئی درجہ بڑھ کر ثقہ ہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر ثقہ ہیں جن کا تو نے اپنی کتاب میں ثقہ جان کر ذکر نہیں کیا ہے۔

تعجب ہے کہ امام ابو حنیفہ کے معاندین عقیلی کی جرح کو امام ابو حنیفہ کے بارے میں تو بڑی خوشی سے نقل کرتے ہیں مگر عقیلی نے جن دوسرے بخاری و مسلم کے راویوں پر کلام کیا ہے اسے وہ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، یہ ان دشمنان ابو حنیفہ کے انصاف کی بات۔

عقیلی کی کتاب الضعفاء کے محقق و محشیٰ امام ابو حنیفہ کے بارے میں عقیلی کے جرحوں کے بارے میں رقمطراز ہیں: "یہاں مجھے یہ کہے بغیر چارہ نہیں ہے کہ عقیلی کے بعض ثقات کے بارے میں جو جرحیں ہیں جن کی بناء پر اس نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے اس کو اظہار انصاف کے طور پر حافظ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب "الانتقاء" میں رد کر دیا ہے، اور عقیلی کے راوی ابن دخیل نے امام ابو حنیفہ فضائل میں ایک رسالہ تالیف کیا ہے جس میں اس نے عقیلی کا رد کیا ہے، اس لئے کہ اس نے امت کے فقیہ امام ابو حنیفہ اور ان کے

نیک وصالح شاگردوں کے بارے میں اپنی زبان کو لمبا کیا ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے عقیلی کا یہ عمل جاہل بے وقوفوں کا ہے جو حقیقت کے بالکل خلاف ہے، اس رسالہ کو ابن الدخیل سے مکہ میں حکم بن المنذر البلوطی اندلسی نے سنا اور بلوطی سے حافظ ابن عبدالبر نے سنا پھر انہوں نے اپنی کتاب الانتقاء میں امام ابو حنیفہ کے ترجمہ میں اس کتاب کا اکثر حصہ نقل کیا ہے"۔

عقیلی نے امام ابو حنیفہ کے بارے میں جو بکواسیں کی ہیں اس کا رد خود اس کے خاص شاگردوں نے ہی کر دیا تھا اور عقیلی کا یہ عمل ان کے نزدیک جاہلوں اور بے وقوفوں کا عمل قرار پایا اور انہوں نے اس کی بکواسوں کو حقیقت سے دور بتلایا ہے۔

بہر حال کہنا یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ کے بارے میں جن کی امامت وثقاہت اور علمی تبحر اور فضائل ومناقب زبان زد عام ہیں کسی کی جرح کو قبول نہیں کیا جائے گا، چاہے وہ اپنے وقت کا کتنا بھی بڑا عالم ہو اس لئے کہ بقول حافظ ابن حجر امام ابو حنیفہ پر جرح کرنے والے دو ہی طرح کے لوگ ہیں یا تو ان کے علم وفضل اور خداد مقبولیت ومحبوبیت کی وجہ سے ان پر حسد کرنے والے ہیں یا ان کے مقام ومرتبہ سے جاہل ہیں۔

حافظ ابراہیم سیالکوٹی مشہور غیر مقلد عالم ہیں وہ تاریخ اہلحدیث میں فرماتے ہیں: حافظ ذہبی کے بعد خاتمۃ الحفاظ ابن حجر کو بھی دیکھئے علوم حدیثیہ وتاریخیہ میں ان کے تبحر وفضل وکمال اور احوال رجال سے پوری آگاہی کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، آپ تہذیب التہذیب جو اصل میں امام ذہبی کی کتاب تہذیب کی تہذیب ہے امام ابو حنیفہ کے ترجمہ میں آپ کے دینداری اور نیک اعتقادی اور صلاحیت عمل میں کوئی خرابی اور کسر بیانی نہیں کرتے بلکہ بزرگان دین سے ان کی از حد تعریف نقل کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: الناس في ابي حنيفة حاسد وجاهل، یعنی حضرت امام ابو حنیفہ کے متعلق بری رائے رکھنے والے لوگ کچھ تو حاسد ہیں اور کچھ جاہل سبحان اللہ کیسے اختصار کے ساتھ دو حرفوں میں معاملہ کو صاف کر دیا (ص: 60) جناب سیالکوٹی صاحب مزید حافظ ابن حجر کی یہ بات لکھتے ہیں: "حافظ صاحب ممدوح (یعنی ابن حجر) لکھتے ہیں کہ قاضی احمد بن عبدہ قاضی رے نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے کہ ہم ابن عائشہ کے پاس بیٹھتے کہ اس نے ابو حنیفہ کے ایک حدیث بیان کرکے کہا کہ تم لوگ اگر آپ کو پاتے تو ضرور آپ کو چاہنے لگتے پس تمہاری اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے یہ شعر کہا گیا ہے:

اقلوا عليهم ويلكم لا ابالكم

من اللوم او سدوا لكان الذي سدوا

یعنی لوگو! تمہارا برا ہو تمہارے باپ مر جائیں ان پر ملامت کی زبان کو تاہ کرو، ورنہ اس مکان کو پر کرو جس کو انہوں نے پر کیا تھا، یعنی ویسے بن کر دکھاؤ۔ سبحان اللہ کیسے عجیب پیرائے میں اعلیٰ درجہ کی تعریف کی ہے۔ (ص: 60)

معلوم ہوا کہ امام ابو حنیفہ اور ان کے ممتاز تلامذہ کے بارے میں کسی کے جرح کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور ان جرحوں کی بنا یا تو مذہبی منافرت ہے یا حسد وجہل کا جذبہ، حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، اور امام ابو حنیفہ اور ان کے شاگردوں کے بارے میں محدثین کی طرف جو منسوب حکایتیں ہیں وہ سب دشمنان ابو حنیفہ کی گڑھی ہوئی باتیں اور سراسر کذب واختراع ہیں، جن ائمہ کی طرف ان باتوں کو امام حق میں منسوب کیا گیا ہے ان کا دامن اس طرح کی باتوں سے قطعاً پاک ہے

ابن ابی حاتم نے بھی اپنی کتاب "کتاب الجرح والتعدیل" میں امام ابو حنیفہ پر زبان تنقید کھولی ہے، مگر ان کی اس کتاب کا سارا مادہ امام بخاری کی کتاب "تاریخ کبیر" سے چرایا ہوا ہے، اور چرایا ہوا اس لئے کہہ رہا ہوں کہ انہوں نے کہیں یہ اشارہ نہیں کیا ہے کہ انہوں نے اپنی یہ کتاب امام بخاری کی کتاب کو سامنے رکھ کر تیار کی ہے۔

خطیب کہتے ہیں کہ: ابن ابی حاتم نے امام بخاری کی کتاب تاریخ کبیر سے سارہ مادہ لے کر اپنی کتاب الجرح والتعدیل تیار کی ہے اور اس کتاب کو اپنی طرف منسوب کیا ہے،

پھر خطیب لکھتے ہیں: عجیب بات ہے کہ ابن ابی حاتم نے بخاری کی کتاب پر ڈاکہ ڈالا اور اس کو اپنی کتاب "الجرح والتعدیل" میں نقل کیا ہے۔

اور لطف کی بات یہ ہے کہ بخاری کی تاریخ کبیر میں جن اسماء کا ذکر ہے ان کو اکٹھا کیا اور ان کے بارے میں اپنے ابو حاتم اور امام ابوذرعہ سے معلومات حاصل کر کے پھر امام بخار پر اعتراض کیا اور ان کی غلطیوں کو جمع کیا اور اپنی ان تمام حرکتوں پر کسی طرح کا کوئی عذر بھی پیش نہیں کیا۔(الموضع للخطیب ص: 18/7 الخطیب واثرہ ص: 358)

جس کی دیانت ومانت کا یہ حال ہو وہ خود کتنا بڑا مجروح شخص ہوگا اور اس کی جرح کسی کے بارے میں کب قابل قبول ہوگی افسوس ایسے مجروح اور غیر ثقہ او غیر امین لوگوں کو بھی حوصلہ ہوتا ہے کہ وہ امام ابو حنیفہ سے جیسے امام فقہ وحدیث پر زبان طعن دراز کریں اور ان کو مجروح قرار دیں جن کی امانت ودیانت امامت وعدالت مشہور زمانہ ہے اور جن کا علم اقطار عالم میں پھیلا ہوا ہے اور جمہور نے جس کو اپنا مقتدی بنایا ہے۔

امام ابو حنیفہ کی شان میں سب سے زیادہ بکواس کرنے میں جس شخص کو بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہے وہ خطیب بغدادی ہے۔انہوں نے اپنی تاریخ کی تیرہویں جلد میں حضرت امام اعظم اور ان کے تلامذہ کے برائیوں کو ذکر کرنے میں بڑی دراز نفسی سے کام لیا ہے ان کی تاریخ میں سب سے طویل ترجمہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ ہی کا ہے صفحہ 333 سے لیکر 454 تک یعنی سو صفحات سے بھی زائد میں یہ ترجمہ پھیلا ہوا ہے شروع میں ائمہ دین سے امام ابو حنیفہ کے بارے میں توثیق اور تعریف کے کلمات نقل کئے پھر ان کے قلم کارخ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی برائی بیان کرنے کی طرف جو مڑا تو اس وقت رکا جب ان کے ترکش کا آخری تیر اس خواب پر ختم ہوا، میں ناظرین کی عبرت اور خطیب کو امام ابو حنیفہ سے جو بغض وعداوت رہی ہے اس کو بتلانے کے لئے یہاں وہ خواب نقل کرتا ہوں خطیب اپنی سند سے بشر بن ابی الازہر کا یہ خواب نقل کرتے ہیں بشر سے یہ خواب سننے والے حضرت ابن المدینی ہیں، حضرت ابن المدینی فرماتے ہیں کہ میں نے بشر بن ابی الازہر سے سنا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک جنازہ ہے جس پر کالا کپڑا پڑا ہوا ہے اور اس آس پاس نصاری کے علماء ہیں میں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کس کا جنازہ ہے تو لوگوں نے کہا کہ یہ ابو حنیفہ کا جنازہ ہے بشر کہتے ہیں کہ میں نے اس خواب کو ابو یوسف سے بیان کیا تو انہوں نے کہا کہ اس کو کسی سے بیان مت کرنا۔(تاریخ بغداد ج: 13/ص: 454)

فقیہ ملت فقہائے امت کے سردار امام اعظم کے بارے میں خطیب کی ذہن میں کتنی گندگی بھری تھی اس کا اندازہ اس خواب سے ناظرین لگائیں جس پر خطیب نے امام اعظم کے ترجمہ کو ختم کیا ہے کون ابو حنیفہ جن کے بارے میں مشہور مؤرخ محمد بن اسحاق بن ندیم

المتوفی 385 ہجری اپنی فہرست میں فرماتے ہیں والعلم برا رو بحرا و شرقا و غربا بعدا و قربا تدوینہ رضی اللہ عنہ (ص: 299 فہرست ابن ندیم) یعنی بر و بحر مشرق و مغرب دور اور نزدیک جتنا بھی ہے یہ امام ابو حنیفہ (اللہ ان سے راضی ہو) ہی کا مدون کردہ ہے اور جن کے بارے میں حافظ ابن کثیر الشافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت ابو حنیفہ امام تھے عراق کے فقیہ تھے اسلام کے اماموں سے ایک تھے اور اونچے درجہ سرداروں میں سے ایک تھے علما کے ارکان میں سے ایک رکن تھے ائمہ اربعہ میں سے ایک تھے اور ان میں سے تھے جن کے مذہب کی اتباع کی جاتی ہے یہ ایک شافعی امام وقت کی شہادت ہے کسی حنفی کی نہیں۔(البدایة ج: 10 ص: 107)

دکتور محمد بن الطحان خطیب کی اس حرکت نازیبا کے بارے میں فرماتے ہیں " کیا وہ روایتیں جن کو خطیب نے امام ابو حنیفہ کی برائی بیان کرنے میں ذکر کی ہے اور جو تقریبا اس تاریخ کے ساٹھ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں کم تھیں کہ خطیب کو امام ابو حنیفہ کے مثالب کی تکمیل کے لئے شیطانی خوابوں کا سہارا لینے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔

پھر فرماتے ہیں: حدیث شریف میں آیا ہے کہ اچھا خواب تو ذکر کیا جائے مگر برے خواب کا لوگوں سے تذکرہ نہ کیا جائے او ر برا خواب دیکھنے والا صرف یہ کرے کہ اللہ کے ذریعہ سے شیطان سے پناہ مانگے اور بائیں جانب تین دفعہ تھوک دے تاکہ اس خواب کا نقصان اس کو نہ پہنچے۔

تو بفرض محال اگر یہ خواب سچا ہی رہا ہو تو اگر خواب دیکھنے والے نے حدیث کی مخالفت کی تھی تو خطیب کو کیا ہو گیا تھا کہ اس کو عام کرنے اور پھیلانے کا کارنامہ انہوں نے انجام دیا، شاید خطیب نے اس کو اچھا خواب سمجھا ہے اسی لئے اس کو اپنی تاریخ میں ذکر کیا اور لوگوں میں عام کیا اس طرح اس نے اللہ کی رضا حاصل کرنے اور سنت کا ثواب حاصل کرنے کو سوچا۔(الحافظ الخطیب البغدادی واثرہ فی علوم الحدیث ص: 344،345)

حقیقت میں خطیب نے امام ابو حنیفہ کا ترجمہ اس خواب پر ختم کرکے بتلادیا کہ اس کے دل میں امام اعظم سے کتنا بغض بھرا ہے۔ جو شخص اتنا گیا گزرا ہو جو اس طرح کا خواب بھی امام اعظم جیسے جلیل القدر و عظیم المرتبت شخصیت کے بارے میں نقل کرنے سے خدا کا خوف نہ کھائے وہ امام اعظم کے بارے میں جتنا بھی افتراء کرے کم ہے، اگر خطیبب میں انصاف پسندی کی ذرا بھی بو ہوتی تو وہ اس خواب پر جس کو خود خطیب نے اور حافظ ابن عبد البر وغیرہ نے نقل کیا ہے حضرت امام اعظم ترجمہ ختم کرتے، خطیب ہی اپنی سند سے محمویہ سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے محمد بن الحسن کو خواب میں دیکھا میں نے کہا کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا تو انہوں نے کہا کہ اللہ نے مجھ سے فرمایا کہ میں نے تجھ کو علم کا ظرف اس لئے نہیں بنایا تھا کہ میں تجھ کو سزادوں میں نے کہا ابو یوسف پر کیا گزری تو انہوں نے کہا کہ مجھ سے اوپر ہیں تو میں نے کہا کہ ابو حنیفہ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ ابو یوسف سے کئی طبقات (کئی درجے) اوپر ہیں اور بعض روایت میں ہے کہ وہ اعلی علیین میں ہیں۔

مثالب ابو حنیفہ بیان کرنے میں خطیب بغدادی عجیب وغریب تضاد کا شکار ہوئے ہیں یعنی امام ابو حنیفہ کی برائیاں بیان کرنے میں انہوں نے بیشتر جگہ انہیں راویوں کا سہارا لیا ہے جن کی تضعیف خود انہوں نے کی ہے اور ان کو ناقابل اعتبار قرار دیا ہے، مگر یہ ناقابل اعتبار لوگ مثالب امام ابو حنیفہ بیان کرتے وقت خطیب کے نزدیک قابل اعتبار ہو گئے ہیں اور ضعیف راویوں کی روایتیں خطیب کے نزدیک محفوظ روایتیں بن گئی ہیں۔

دکتور محمد طحان فرماتے ہیں: خطیب مثالب اور مطاعن والی روایتوں کو کس طرح محفوظ بتلاتے ہیں جبکہ ان روایتوں کو انہوں ایسی سندوں سے بیان کیا ہے جن میں ایسے لوگ ہیں جن پر خود خطیب نے اس کتاب میں جرح کی ہے اور ان کو ضعیف قرار دیا ہے۔(ص:308 الخطيب واثره في علوم الحديث)

پھر فرماتے ہیں: جو شخص امام ابو حنیفہ عیب جوئی و برائی بیان کرنے میں ایسے راویوں کے راویتیں ذکر کرتا ہے جن پر وہ خود کلام کر چکا ہے اور ان کو ضعیف قرار دے چکا ہے، اور پھر انہیں ضعیف راویوں کے روایتوں کو وہ محفوظ کہے اور ان پر اعتماد کریں وہ شخص خود اپنے ہی کو اعتراض اور طعن کا نشانہ بناتا ہے۔ (ص: 308 ایضا)

خطیب بغدادی کی جب یہ تاریخ مصر میں چھپ رہی تھی تو اس وقت کی مصری حکومت (1) نے جامعہ ازہر کے علما کی ایک کمیٹی تشکیل دی کہ اس تاریخ میں امام ابو حنیفہ کے تذکرے میں خطیب نے روایتوں کے سہارے امام ابو حنیفہ کو مجروح و مطعون کرنے کی کوشش کی ہے ان روایتوں کا جائزہ لیں اور ان کی جانچ پڑتال کریں چنانچہ جب علمائے ازہر نے ان روایتوں کا جائزہ لیا تو ان کا تبصرہ خطیب کے بارے میں یہ تھا۔ (اس کے پہلے ایڈیشن کی تیرہویں جلد کی جس میں امام اعظم کا ترجمہ تھا ضبط کرلیا تھا اور اس کا دوسرا ایڈیشن جامعہ ازہر کے علما کی نظر ثانی کے بعد چھپا۔)

"اس کتاب کا پڑھنے والا یہ محسوس کرے گا کہ خطیب نے امام ابو حنیفہ کو بدنام کرنے اور ان کی قدر و منزلت گھٹانے بہت اسراف سے کام لیا ہے خطیب نے امام ابو حنیفہ کی برائی بیان کرنے میں جن روایتوں پر اعتماد کیا ہے۔ ہم ان سب کی چھان بین کی تو ان روایتوں کو واہی اور کمزور سندوں والا پایا یہ روایت معنوی طور پر ایک دوسرے کے متعارض بھی ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہبی تعصب کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے خطیب کا مذہبی تعصب ان روایتوں میں نمایا ہے" ۔

بہت سے جلیل القدر اور ذی مرتبت عالموں نے انصاف پسندی سے کام لیا ہے اور انہوں نے امام اعظم کی بھرپور تعریف کی ہے اور ثقہ علما سے امام اعظم کے بارے میں ایسے تعریفی کلمات منقول ہیں خطیب کی ان جرحوں کی دھجیاں اڑادیتے ہیں جن کو خطیب نے محفوظ کیا ہے، اگر تم ان علما کی باتوں کو جاننا چاہتے ہو تو حافظ ابن عبد البر کی "الانتقاء" خوارزمی کی "جامع المسانید" حافظ ذہبی کی "تذکرۃ الحفاظ" ملک معظم کی "السہم الخطیب" سید مرتضی زبیدی کی "الجواہر المنیفہ" وغیرہ کتابوں کا مطالعہ کریں۔

امام ابو حنیفہ کی جلالت قدر، زہد و ورع اور علم میں ان کا درجہ طبعیت کی عمدگی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو ان کا مضبوطی سے تھامنا یہ باتیں مشہور زمانہ ہیں۔ امام ابو حنیفہ کی وہ صفات ہیں جو ان کے قابل اعتماد شاگردوں اور دوسرے ثقہ اہل علم کی ایک جماعت سے بطور شہرت کے پہنچی ہیں، اس لئے کہ امام اعظم کی شان کو خطیب کی یہ ضعیف اور کمزور روایتیں بٹہ نہیں لگا سکتی ہیں دیکھیں کہ حافظ ابن عبد البر نے "الانتقاء" میں امام سفیان ثوری سے کیا نقل کیا ہے۔

امام ثوری حضرت امام ابو حنیفہ کے بارے میں فرماتے ہیں: حضرت امام ابو حنیفہ بہت زیادہ علم حاصل کرنے والے تھے، اللہ کے حرمتوں کے مدافعت میں لگے رہنے والے تھے تاکہ اسے حلال نہ سمجھ لیا جائے، وہ انہیں حدیث کو اختیار کرتے تھے جو ان کے نزدیک صحیح ہوتی اور جسے ثقہ راوی روایت کرتے، امام ابو حنیفہ حضور ﷺ کے آخر فعل اور علمائے کوفہ کے جو طریقے تھے اسی کو اختیا

ر کرتے تھے۔ پھر بھی کچھ لوگوں نے امام صاحب پر طعن و تشنیع کیا ہے، اللہ ہم کو اور ان کو معاف کرے۔(حاشیہ تاریخ بغداد ج:13ص: 319)

اور آپ پڑھ چکے ہیں کہ خطیب نے امام ابو حنیفہ کے ایک دشمن کی زبان سے انہیں امام سفیان سے وہ گندی بات نقل کی ہے کہ اسلام میں امام ابو حنیفہ سے زیادہ کوئی منحوس پیدا نہیں ہوا اور آپ حافظ ابن عبد البر سے جن کا علمی مرتبہ سب کو معلوم ہے یہ بھی سن رہے ہیں کہ امام ابو حنیفہ سنت رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحیح احادیث کے بہت حریص تھے اور آپ مذہب وفقہ کی بنیاد صحیح حدیث پر ہے اور دینی غیرت کا یہ عالم تھا کہ اللہ نے جس چیز کو حرام کیا ہے اسے کوئی حلام سمجھ لے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اس کو برداشت نہیں کر سکتے تھے حسد وجہل کی وجہ سے جن لوگوں نے ایسے امام پر طعن و تشنیع کیا ہے وہ ان کا ایسا برا عمل ہے کہ امام ثور ی ان کے لئے بخشش کی دعا کرتے ہیں۔

بہر حال ان حقائق سے معلوم ہوا کہ ہمارے جن دوستوں نے امام ابو حنیفہ پر اعتراضات کرنے کے لئے اور اپنی عاقبت خراب کرنے کے لئے خطیب بغدادی کا سہارا لیا ہے ان کا آشیانہ بہت ہی زیادہ شاخ نازک پر قائم ہے۔

آپ خطیب بغدادی کے تناقض کی دو ایک مثال بھی ملاحظہ فرمائیں تاکہ خطیب نے امام ابو حنیفہ کے مثالب میں جو روایتیں نقل کی ہیں ان کی حقیقت آپ پر مزید واشگاف ہو:

1- محمد بن حبویہ النخاس کی روایت سے خطیب نقل کرتے ہیں کہ امام وکیع نے فرمایا کہ میں نے سفیان ثوری سے سنا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ ہم مومن ہیں اور ہمارے نزدیک سارے اہل قبلہ مومن ہیں اور ہمارا اللہ کے یہاں کیا حال یہ ہم نہیں جانتے (کہ ہم مومن ہے یا نہیں) پھر امام وکیع فرماتے ہیں کہ ابو حنیفہ فرماتے تھے کہ جو سفیان کے قول کو اختیار کرے گا وہ ہمارے نزدیک اپنے ایمان میں شک کرنے والا ہوگا ہم یہاں بھی قطعی طور پر ایمان والے ہیں اور اللہ کے یہاں بھی ہم ایمان والے ہیں امام وکیع فرماتے ہیں کہ ہم تو سفیان کے قول کو اختیار کرتے ہیں امام ابو حنیفہ کی بات ہمارے نزدیک جرات کی بات ہے۔

یہ روایت خطیب محمد بن حبویہ سے نقل کرتے ہیں اس کو ابو العباس خزاز کہا جاتا ہے اس کے بارے میں خود خطیب کا یہ بیان ہے کہ یہ ناقابل اعتبار راوی ہے، خطیب کی ان پر د جرح ان کلمات کے ساتھ ہے: كان متساهلا فيما يرويه يحدث عن كتاب ليس عليه سماعه.

یہ شخص حدیث کے بیان کرنے میں بہت ڈھیلا ڈھالا تھا یہ ان کی کتابوں سے بھی روایتیں بیان کرتا تھا جو اس کی سنی ہوئی نہ ہوتی تھیں (دیکھیں رقم 1139) ایسے بے اعتبار شخص سے جس کی بے اعتباری پر خود خطیب شہادت مہیا کرتے ہیں امام ابو حنیفہ کی برائی میں امام وکیع جو امام صاحب کے قول پر فتوی دینے والے محدث تھے کی زبان سے امام صاحب کی شان میں برائی نقل کرتے ہیں۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ اام ابو حنیفہ کا یہ قول جو خطیب کی نگاہ میں اللہ کی شان میں جرات ہے عین صواب ہے، اس لئے اپنے ایمان کے بارے میں کسی کو اگر ذرا بھی شک ہو تو وہ پکا مومن ہی کب شمار ہوگا؟ اللہ پر ایمان کے ساتھ شک کی کیا گنجائش ہے؟ او ریہی وجہ ہے کہ حضرت سفیان ثوری نے بعد میں اس شک والے قول سے رجوع کرکے حضرت امام ابو حنیفہ کا قول اختیار کرلیا

تھا، جامعہ ازہر کے علماکی کمیٹی نے خوازمی کے حوالہ سے سفیان کی رجوع والی بات اس جگہ اپنے حاشیہ میں نقل کی ہے اور اپنے حاشیہ میں لکھاکہ یہ قول تنہاامام ابو حنیفہ کا نہیں ہے بلکہ بہت سے علمااسی کے قائل ہیں کہ ایمان میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔(ص: 371،372 ج: 13)

2- متعدد روایتیں خطیب نے حارث بن عمیر کی سند سے روایت کی ہیں، یہ حارث پکے نمبر کا جھوٹا تھا، ذہبی فرماتے ہیں کہ ابن خزیمہ نے اس کو جھوٹا قرار دیا ہے۔ حاکم کا بیان ہے کہ یہ امام جعفر صادق سے موضوع اور گھڑی ہوئی روایتیں بیان کرتا تھاابن صادق کہتے ہیں کہ ثقہ اور پختہ لوگوں سے موضوع رویتیں نقل کرتا تھا۔

3- بعض روایتیں خطیب نے محمد بن محمد باغندی سے روایت کی ہیں، جن کے بارے میں محدثین فرماتے ہیں کہ یہ شخص بہت زیادہ تدلیس کرنے والا تھااور جو باتیں اس کی سنی ہوئی نہیں ہوتی تھیں اس کو بیان کرتا تھا، یہ حدیثوں کا چور بھی تھا یعنی دوسروں کی حدیث کو اپنی حدیث بتلاتا تھااور اس کی روایت کرتا تھا، ابراہیم اصبہانی اس کو کذاب کہتے ہیں یعنی یہ شخص بہت جھوٹا تھا اس کے بارے میں خود خطیب نے اس طرح کی جرحیں نقل کی ہیں۔(دیکھیں نمبر 1285)

ایسے کذابوں کی روایت کو خطیب امام ابو حنیفہ کے حق میں محفوظ کہتے ہیں۔

4- بعض روایات میں عباد بن کثیر ہے جس کے بارے میں حافظ ذہبی فرماتے ہیں: ثقہ نہیں تھااور نہ اس کی کوئی حقیقت تھی۔

ان روایتوں کے طرف اشارہ کرکے جن میں اس طرح کے کذاب راوی ہیں دکتور محمد بن طحان فرماتے ہیں "بکذیکون المحفوظ وفی السند کذابون وغیر ثقات.

یعنی محفوظ روایتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی سند میں اس طرح کے جھوٹے اور غیر ثقہ راوی ہو۔(ص: 314)

5- بعض روایات کے سندوں میں عبد السلام بن عبد الرحمٰن واصبی اور شریک بن عبد اللہ جیسے راوی ہیں ان کو خود خطیب نے مجروح اور ضعیف قرار دیا ہے۔(دیکھے نمبر: 4838)

شریک نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ پر یہ افتراء کیاکہ وہ کہتے تھے کہ نماز کا تعلق دین سے نہیں ہے، حالانکہ صحیح روایت میں ہے کہ امام ابو حنیف فرماتے ہیں کہ نماز ایمان کا جز نہیں ہے، یعنی ایسا نہیں ہے کہ نماز چھوڑنے سے آدمی کا ایمان ہی چلا جائے اور وہ کافر ہوجائے اگرچہ نماز امام صاحب کے نزدیک شریعت کے اہم ارکان میں سے ہے۔(دیکھیں حاشیہ ص: 375 اور 276)

6- ایک روایت خطیب یہ نقل کی ہے کہ امام ابو حنیفہ فرماتے تھے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت آدم علیہ السلام کا ایمان ابلیس کی ایمان کی طرح ہے، اس کی سند میں محبوب بن موسیٰ الانطاکی اور ابواسحاق فزاری ہے یہ دونوں ناقابل اعتبار اور منکر الحدیث راوی ہیں۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں خطیب ہر طرح کی بات نقل کرتے ہیں چاہے وہ کتنی ہی خلاف عقل کیوں نہ ہو، ایک ادنی درجہ کا مسلمان بھی وہ بات نہیں کہہ سکتا جو امام ابو حنیفہ کی زبان سے کذاب راویوں کی سند سے خطیب نے نقل کی ہے کیا

خطیب کو اتنا پتہ بھی نہیں ہے ابو حنیفہ کے نزدیک کسی بھی دینی حکم کا ادنی سا بھی استخفاف باعث کفر ہے، اور اس سے ان کے نزدیک انسان دائرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے وہ ابو حضرت ابو بکر ؓ اور حضرت آدم علیہ السلام کے ایمان کے ابلیس کے ایمان کے برابر قرار دیں گے ! غرض خطیب جو کچھ بھی نہ کر گزریں کچھ تعجب نہیں ہے کہ ان کے دل میں امام ابو حنیفہ کے خلاف بغض عناد بھرا ہوا تھا۔

7- بعض روایت کی سندوں میں محمد بن موسی بربری ہے، جس کے بارے میں خود خطیب کا کہنا ہے کہ اس کو صرف دو حدیثیں یاد تھیں اس میں ایک حدیث الطیر ہے جس کے موضوع ہونے پر محدثین کا اجماع ہے۔(دیکھیں نمبر 1326)۔

8- بعض روایات کی سند میں حسن بن الحسین الدوماء النعال ہے جس کے بارے میں خطیب خود کہتے ہیں کہ اس نے اپنا معاملہ خود ہی خراب کر رکھا تھا، بہت سی وہ باتیں جو اس نے سنی ہوئی نہیں تھیں ان کو اس نے اپنے مسموعات میں شامل کر لیا تھا ذہبی فرماتے ہیں کہ اس نے حدیثوں کو گڑھ لیا تھا۔

خطیب نے ایک حرکت یہ کی ہے کہ امام ابو حنیفہ کو جہمیہ ثابت کرنے پر زور دیا ہے اور اس کے لئے اس نے امانت و دیانت کو بالکل بالائے طاق رکھ کر ہر طرح کی رطب و یابس اور جھوٹی من گھڑت روایتوں کو ذکر کیا ہے۔ جبکہ خود خطیب ہے نے امام ابو یوسف سے امام ابو حنیفہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے:

حضرت امام ابو حنیفہ فرماتے تھے کہ خراسان کے دو گروہ لوگوں میں سب سے بدترین گروہ ہے ایک جہمی فرقہ دوسرا مشبہ کا فرقہ، نیز خطیب ہی عبد الحمید بن عبد الرحمن حمانی سے نقل کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ جہم بن صفوان کو کافر کہتے تھے اس کے باوجود خطیب نے امام ابو حنیفہ پر ان کے شاگرد رشید امام ابو یوسف کے واسطہ سے جہمی ہونے کا الزام تھوپا ہے، گویا خطیب نے شرم و حیاء کو بالکل بالائے طاق رکھ دیا ہے کیا خطیب کو امام ابو حنیفہ کی کتاب "الفقہ الاکبر" کا بھی مطالعہ کرنے موقع نہیں ملا تھا جس میں انہوں نے فرقہ جہمیہ اور تمام باطل فرقوں کا زبردست رد کیا ہے۔

اسی طرح بہت سی روایتوں سے امام ابو حنیفہ کی مرجیٔ اور راس المرجئہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تمام روایتیں باطل سندوں سے ہیں، علامہ زاہد الکوثری نے خطیب کی ایک ایک روایت کا بھرپور جائزہ لے کر باطل ہونا ثابت کیا ہے۔

البتہ یاد رہے کہ ارجاء کی دو قسمیں ہے ایک ارجاء سنی اور دوسری ارجاء بدعی سنی ارجاء کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اعمال میں کوتاہی سے انسان ایمان اور سلام سے نہیں نکلتا ہے، مگر اس کو گناہ ہوتا ہے اور بدعی ارجاء یہ ہے کہ اعمال کو گناہ اور ثواب سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا ہے ارجاء کی پہلی قسم تمام اہل سنت کا مذہب ہے۔

خواہ اس کا امام بخاری جیسے لوگ زبان سے اقرار نہ کریں مگر عملا واعتقادا وہ بھی اس کے قائل ہیں کہ عمل کے نہ ہونے سے ایمان نہیں جاتا ہے سنجیدہ علمائے غیر مقلدین کا بھی یہی مذہب ہے، حافظ ابرہیم سیالکوٹی صاحب تحریر فرماتے ہیں "بعض مصنفین سے سیدنا امام ابو حنیفہ کو بھی رجال مرجئہ میں سے شمار کیا ہے حالانکہ آپ اہل سنت کے امام ہیں اور آپ کی زندگی اعلی درجہ کی تقوی اور تورع پر گزری جس سے کسی کو بھی انکار نہیں۔(تاریخ اہلحدیث ص: 56) اگر عمل کی کوتاہی کی وجہ آدمی کو ایمان سے

خارج قرار دیا جائے جیساکہ خارجیوں کا مذہب ہے تو پھر کوئی مسلمان مومن کہلانے کا مستحق بہت مشکل سے ہوگا اس لئے کہ عمل میں کوتاہی سے کوئی محفوظ ہونے کا دعوی نہیں کر سکتا ہے۔

اور دوسری قسم کے عمل کے کوتاہی سے انسان گناہ گار بھی نہ ہو یہ اہل باطل کا مسلک ہے۔ امام ابو حنیفہ پر اجاء کا الزام لگانے والے اس فرق کو یا تو سمجھ نہیں پائے ہیں یا سمجھ کر نادان بنتے ہیں، اور جس ارجاء کے امام صاحب قائل نہیں ہیں خوامخواہ کا وہی ارجاء اس کے سر تھوپتے ہیں۔

حافظ ابن عبدالرب نے امام صاحب پر اس طرح کے تمام الزامات کا انکار کرکے صاف صاف اپنی کتاب "الانتقاء" میں لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ کا مسلک وہی تھا جو کہ تمام اہل سنت والجماعت کا مسلک تھا۔(الانتقاء ص: 165)

بعض باتیں تو خطیب بغدادی کی بہت ہی عجیب وغریب ہیں، جن سے ان کی دیانت وثقاہت سخت مجروح ہو جاتی ہے، مثلا انہوں نے ایک روایت نقل کی ہے کہ سلمہ بن عمرو قاضی نے برسر منبر کہا کہ لا رحم اللہ ابا حنیفۃ فانہ اول من زعم ان القرآن مخلوق یعنی اللہ ابو حنیفہ پر رحم نہ کرے یہ پہلے شخص تھے جنہوں نے قرآن کو مخلوق قرار دیا، اصل میں مارحم اللہ ابا حنیفۃ نہیں تھا بلکہ مارحم اللہ ابا فلان تھا جیساکہ تاریخ ابن عساکر میں موجود ہے خطیب بغدادی نے اس کو اپنی روایت میں مارحم اللہ ابا حنیفۃ بنادیا۔ خطیب کو یہ کہاں سے معلوم ہوگیا کہ وہ ابا فلان ابو حنیفہ ہی ہیں، پھر یہ کہ ملل ومذاہب کے بیان میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں سب میں یہ ہے کہ قرآن کے مخلوق ہونے کا قول سب سے پہلے جعد بن درہم نے ایجاد کیا ہے، پھر اس مذہب کو جہم بن صفوان نے خوب پھیلایا اسی وجہ سے اس فرقہ کے لوگوں کو جہمیہ کہا جاتا ہے، پھر اس کو آگے بڑھانے میں بشر بن غیاث کا ہاتھ تھا۔ حافظ لالکائی نے اپنی کتاب "شرح السنۃ" میں لکھا ہے کہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ ان اول من قال القرآن مخلوق الجعد بن درہم فی سنۃ نیف وعشرین ومائۃ یعنی سب سے پہلے القرآن مخلوق کہنے والا شخص جعد بن درہم ہے جس نے اس کو قول کا 120 ہجری میں اختراع کیا۔(خطیب واثرہ فی علوم الحدیث ص: 322) القرآن مخلوق والی بات کو بھی متعدد سندوں سے خطیب نے ذکر کیا ہے اور سب ناقابل اعتبار راوی ہیں، ڈاکٹر محمود الطحان نے ایک ایک روایت کی حقیقت کو واضح کردیا ہے۔(دیکھیں ص: 322 وبعدہا)

ان چند باتوں سے تاریخ خطیب میں مذکور ان تمام روایتوں کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے، جو امام ابو حنیفہ کے مثالب کو بیان کرتی ہیں اور خطیب نے جن کو مزالے لے کر ساٹھ سے زیادہ صفحوں میں نقل کیا ہے خطیب کی ان روایتوں کی حقیقت جاننے کے لئے جامعہ الملک الامام سعود کے استاذ الشیخ محمود الطحان کی کتاب کا مطالعہ کافی ہوگا، نیز اگر کسی کو میسر ہو تو تانیث الخطیب بھی دیکھ لے ،علامہ زاہد کوثری نے اس کے خود ساختہ ایک ایک روایت کا بخیہ ادھیڑ دیا ہے، چونکہ علامہ کوثری کا نام سنتے ہی حاسدین کو بخار آنے لگتاہے ،اس وجہ سے میں نے تعمداان کتابوں سے کچھ نقل نہیں کیا ہے مگر حق یہ ہے کہ یہ کتاب تحققات کاایک شاہکار ہے او رخطیب کے کتاب کااس سے بہتر کوئی جواب نہیں۔

افسوس ان ہی باطل روایتوں کے سہارے حسد اور بغض کے جراثیم میں مبتلاافراد آج کے اس دور میں امام ابو حنیفہ پر اعتراض کرتے ہیں اور ان کو اسلام سے خارج قرار دیتا ہے ان کو بدعتی بتلاتا ہے ان کی فقہ کو قیاسات ورائے کا مجموعہ قرار دیتاہے، یہ فرقہ اپنے شیش محل سے حنفیت کے مضبوط آہنی قلعہ پر بمباری کرنے کا خواب دیکھتا ہے۔

خطیب کی دیانت کا حال تو یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ کی تعریف میں انہوں نے جو روایتیں ذکر کی ہیں اس کو وہ غیر محفوظ قرار دیتے ہیں خواہ اس کی سند کتنی بھی مضبوط ہو، اور ابو حنیفہ کے مثالب کے روایتوں کو وہ محفوظ قرار دیتے ہیں چاہے ان کے راوی کذاب ہی کیوں نہ ہوں۔ جب وہ امام ابو حنیفہ کی مناقب والی روایتیں ذکر کرتے ہیں تو اس کے روایوں پر بھی کلام کرتے ہیں اور جب ان کے مثالب والی روایتیں لاتے ہیں تو خاموشی سے گزر جاتے ہیں اور یہ نہیں بتلاتے کہ ان روایتوں میں فلاں فلاں راوی ضعیف کمزور اور غیر ثقہ ہے مثلاً انہوں نے یہ روایت ذکر کی کہ حضرت ابو ہریرہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں ایک شخص ہوگا جس کا نام نعمان ہوگا اور اس کی کنیت ابو حنیفہ ہوگی وہ میری امت کا چراغ ہے وہ میری امت کا چراغ ہے۔

اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد چونکہ امام ابو حنیفہ کی اس میں تعریف تھی تو خطیب اس پر نقد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

یہ موضوع روایت ہے اس کا روایت کرنے والا تنہا بورقی ہے اور ہم نے گزشتہ صفحات میں اس کا حال بیان کر دیا ہے (یعنی وہ ناقابل اعتبار راوی ہے)

اس طرح یحیٰ بن معین سے پوچھا گیا کہ سفیان ثوری نے امام ابو حنیفہ سے روایت کی ہے تو انہوں کہاں کہ ہاں اور پھر فرمایا کہ امام ابو حنیفہ حدیث وفقہ میں بہت زیادہ سچے تھے اور اللہ کے دین کے بارے میں بڑے امانت دار تھے تو یحیٰ بن معین یہ تعریف خطیب کو امام کے حق میں پسند نہیں آئی اور انہوں نے اس روایت پر اس طرح جرح کی کہ اس کی سند میں احمد بن عطیہ ہے جو ثقہ نہیں تھا۔

مگر جب امام ابو حنیفہ کی معائب اور مثالب والی روایتیں ذکر کرتے ہیں تو خواہ وہ کتنی بھی جھوٹی روایتیں ہو اس کو کذب اور دروغ کی طرف ادنی اشارہ بھی نہیں کرتے ہیں کیا اسی کا نام دیانت وامانت ہے اور کیا اس بعد بھی خطیب کی شخصیت امام ابو حنیفہ کے حق میں قابل اعتبار ہو سکتی ہے؟ اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں۔

اب ایک بات عرض کرتا ہوں اور وہ یہ کہ ائمہ حدیث اور کبار اہل علم کا یہ فیصلہ ہے کہ جس کی امامت حدیث وفقہ میں مسلم ہو اور جس پر امت کا عام اعتماد ہو اور جس کا ورع زہد و تقوی مشہور زمانہ ہو جس سے کذب اور دروغ گوئی کا کبھی کوئی ثبوت نہ پایا گیا ہو اس پر کسی کی جرح خواہ وہ اپنے وقت کا امام المحدثین اور امیر المؤمنین فی الحدیث ہی کیوں نہ ہو مقبول نہیں ہو سکتی اور اس جرح کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔ حافظ ابن عبد البر اسی بات کو اس طرح کہتے ہیں:

والصحيح في هذا الباب من صحت عدالته وثبتت في العلم امامته وبانت ثقته وعنايته بالعلم لم يلتفت فيه الي قول احد الا ان ياتي في جرحته ببينة عادلة تصح بها جرحته علي طريق الشهادات.

یعنی جرح و تعدیل کی باری میں صحیح بات یہ ہے کہ جس کی عدالت صحیح طور پر ثابت ہو اور اس کی امامت فی العلم ثابت ہو اور اس کا ثقہ ہونا ظاہر ہو اور یہ معلوم ہو کہ اس کی علم کی طرف توجہ رہی ہے اس کے بارے میں کسی کے قول کا اعتبار نہ ہوگا الا یہ کہ وہ شخص کوئی صحیح جرح پیش کرے جس سے اس شخص کا مجروح ہونا شہادت کے طریق پر ثابت ہو جائے یعنی اس کا قول شرعی شہادت کے معیار پر پورا اترے۔ (جامع بيان العلم)

پھر حافظ ابن عبد البر فرماتے ہیں: لا يقبل في من اتخذه جمهور من المسلمين اماما في الدين قول احد من الطاعنين.

یعنی جمہور مسلمین نے جس کو اپنا امام بنایا ہو اس کے بارے میں طعنہ کرنے والوں کی کوئی بات قابل قبول نہ ہوگی۔
دکتور طحان حافظ ابن عبد البر کا یہ کلام نقل کرکے فرماتے ہیں:
توامام ابو حنیفہ جن کی امامت دین میں ثابت ہے اور جن کی عدالت وامانت مسلمانوں کے درمیان مشہور ہے، اور جن کا علم دنیا میں پھیلا ہوا ہے اور جن کی فقہ کی پیروی کرنے والے صدیوں سے آج تک مسلمانوں کا اکثریتی طبقہ رہا ہے پس اس جیسے امام کے بارے میں کسی کی بھی جرح قبول نہیں کی جائے گی اور نہ حاسدوں کی حسد کی طرف متوجہ ہوا جائے گا۔ (خطیب واثرہ ص: 341)
خطیب کے بارے میں دکتور اپنے کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں بلکہ اسی پر اپنی کتاب کو ختم کرتے ہیں: "خطیب نے امام ابو حنیفہ کے بارے میں جن کی امامت پر مسلمانوں کا اجماع ہے اس امام کے بارے میں تمام رطب ویابس کو جمع کر دیا ہے بیشک وہ اس بارے میں خطاکار ہیں وہ اس بارے میں انصاف کے راستہ سے ہٹے ہوئے اور تعصب کی راہ اختیار کرنے والے ہیں خطیب نے امام ابو حنیفہ کے بارے میں ان کے عیب جوئی کے لئے جو روایتیں نقل کی ہیں سب کے سب واہی کمزور سندوں والی ہیں"۔ (ص: 491)
دکتور طحان یہ ایک غیر حنفی عالم ہیں اس وجہ سے ان کے خیالات کو بڑی اہمیت ہے، انہوں نے جامعہ ازہر سے خطیب بغدادی پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا ہے ان کے پی ایچ ڈی کا یہی مقالہ جو جامعہ ازہر کے دو فاضل اساتذہ کے کی نگرانی میں تیار ہوا، پانچ سو صفحات سے زیادہ ایک ضخیم کتاب "الخطیب البغدادی واثرہ فی علوم الحدیث" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ پھر یہ جامعہ الملک الامام سعود ریاض میں استاذ رہے ہیں خطیب کے بارے میں اتنی محقق ومفصل کتاب میرے علم میں کوئی دوسری نہیں ہے۔
ناظرین اس کو بھی دھیان میں رکھیں کہ خطیب کے قلم کا نشانہ صرف امام ابو حنیفہ ہی نہیں بنے ہیں، بلکہ اکابر امت اور اجلا فقہا محدثین ان کے قلم کا نشانہ بنے ہیں بلکہ ان کے قلم سے کم ہی فضلائے امت محفوظ رہے ہیں، امام مالک کو خطیب نے قلیل الحفظ قرار دیا ہے، امام حسن بصری اور امام ابن سیرین کو قدریہ فرقہ میں شمار کیا ہے، مالک بن دینار کو ضعیف قرار دیا ہے۔
سبط میں ابن جوزی فرماتے ہیں: لم یسلم منہ الا قلیل
یعنی خطیب کے قلم سے بہت ہی کم لوگ محفوظ رہے، عجیب بات یہ ہے کہ خطیب حنابلہ اور محدثین کے بھی سخت دشمن رہے ہیں، اپنی اس تاریخ میں حنابلہ علماء محدثین کا ایسے انداز میں ذکر کیا ہے کہ اس کا اندازہ اس کتاب کے مطالعہ سے ہوگا۔
اب آخر میں اپنی بات ختم کرنے سے پہلے ان ناعاقبت اندیش سے میں عرض کرنا چاہتا ہوں جو خطیب بغدادی کی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ہر رطب ویابس روایتوں اور قصوں کو بڑی وسعت ظرفی سے قبول کرتے ہیں اور ان جھوٹی باتوں سے اپنا ضمیر روشن کرتے ہیں اور اپنے ایمان ودینداری کو جلا دیتے ہیں، میں ان سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خطیب بغدادی کے قلم نے حضرت امام بخاری رحمہ اللہ کو بھی نہیں چھوڑا ہے، خطیب نے اپنی موضح اوہام الجمع والتفریق میں امام بخاری کی جو بہتر غلطیوں کو پکڑا ہے جس سے امام بخاری کی شخصیت سخت مجروح ہو گئی ہے اور ان کے حافظہ اور تاریخ میں ان کی مہارت وتبحر کے جو قصے مشہور ہیں سب پر پانی پھر گیا ہے۔ براہ کرم غیر مقلد بزرگ حق ودیانت اور انصاف کے ساتھ کبھی اس کی طرف بھی توجہ فرمائیں۔ وللہ الحمد اولا وآخرا وصلی اللہ علی النبی الامی الف الف تحیۃ وسلام.

مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ مشہور غیر مقلد واہلحدیث عالم تھے، ان کے والد حضرت مولانا عبد الجبار صاحب رحمہ اللہ بھی اہل حدیث تھے مگر صاحب دل اور صاحب معرفت تھے، مولانا داؤد غزنوی اپنے والد کے بارے میں فرماتے ہیں :

"ایک روز حضرت والد بزرگوار کے درس بخاری میں ایک طالب علم نے کہہ دیا کہ امام ابو حنیفہ کو پندرہ حدیثیں یاد تھیں، مجھے ان سے زیادہ حدیثیں یاد ہیں، والد صاحب کا چہرہ مبارک غصہ سے سرخ ہوگیا، اس کو حلقہ درس سے نکال دیا اور مدرسہ سے خارج بھی کر دیا، اور بفحوائے اتقوا بفراسۃ المؤمن فانہ ینظر بنور اللہ. یعنی مؤمن کی فراست سے ڈرو اس لئے کہ وہ اللہ کی نور سے دیکھتا ہے۔ فرمایا کہ اس شخص کا خاتمہ دین حق پر نہیں ہوگا، ایک ہفتہ نہیں گزرا تھا کہ معلوم ہوا کہ وہ طالب علم مرتد ہوگیا"۔(داؤد غزنوی ص: 384)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اس بحث کے ضمن میں فرماتے ہیں : بل الذین کانوا قبل جمع هذه الدوارین اعلم بالسنة من االمتأخرين بكثير.

(یعنی یہ کہنا درست نہیں ہے کہ کتب احادیث کے مؤلفین وجامعین کا علم زیادہ ہوگا) بلکہ جو ائمہ متبوعین احادیث کی ان تالیفات ومدونات سے پہلے تھے وہ اپنے متاخرین ائمہ حدیث کے مقابلہ میں سنت کے بہت زیادہ جاننے والے تھے۔

بقول ابن تیمیہ یہ فرماتے ہیں : "اس لئے کہ بہت سی احادیث جو انہیں پہنچیں اور جن کی صحت ان کو پایہ ثبوت کو پہنچی ممکن ہے کہ وہ حدیث ہم تک کسی مجہول سند سے پہنچی ہو یا ایسی سند سے جو منقطع ہو یا وہ حدیثیں ہم کو بالکل پہنچی ہی نہ ہوں۔ "(فتاوی ابن تیمیہ، ج: 20/ص: 239)

ان ائمہ کرام کے دواوین ان کے سینے تھے اور ان سینوں میں کتابوں سے زیادہ علم تھا اور یہ وہ حقیقت جس کے بارے میں وہ شبہ نہیں کر سکتا جو صورت حال اور اصل قضیہ سے واقف ہے۔

دوسری جگہ ابن تیمیہ محدثین کے حدیث کے قبول کرنے یا نہ کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

فان الاحاديث كانت قد انتشرت واشتهرت لكن كانت تبلغ كثيرا من العلماء من طرق ضعفة وقد بلغت غيرهم من طرق صحيحة غير تلك الطرق فتكون حجة من هذا الوجه (ایضاً ص: 240)

یعنی احادیث (بعد کے ادوار میں) پھیلیں اور مشہور ہوئیں لیکن بہت سے محدثین کو وہ حدیثیں کمزور سندوں سے پہنچیں (تو وہ ان کے نزدیک ناقابل حجت قرار پائیں) جبکہ دوسروں کو یہ حدیثیں صحیح سندوں سے پہنچیں تو اس وجہ سے وہ ان کے نزدیک حجت قرار پائیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے اس کلام میں آپ بار بار غور کریں تو وہ تمام حقیقتیں آپ کے لئے ایک ایک کرکے کھلتی چلی جائیں گی۔

کتاب الاصل (جس کو المبسوط بھی کہا جاتا ہے جو اب پانچ جلدوں میں شائع ہوچکی ہے الجامع الکبیر، الجامع الصغیر،) صاحب ہدایہ بھی ان کتابوں سے روایت لے کر شرح کرتا ہے، اور یہ تینوں کتابیں امام محمد کی ہیں جو براہ راست امام اعظم کے شاگرد ہیں الجامع الصغیر میں وہ بسند امام ابو یوسفؒ امام اعظم سے روایت کرتے ہیں، اور اس طرح امام محمدؒ کی کتاب "کتاب الحجۃ علی اہل المدینہ " میں بھی فقہ حنفی یعنی امام اعظمؒ کے مؤطا محمد اور کتاب الآثار لمحمد میں بھی فقہ حنفی کے مسائل موجود ہے۔

خدشہ 3:

اور اسی طرح تیسرا خدشہ یہ ہوتا ہے کہ فقہ میں اختلاف ہے اور حضور اکرم ﷺ تو ایک دین لے کر آئے تھے۔ تو جواباً عرض ہے کہ فروعی مسائل میں اختلاف ہمیشہ سے چلا آرہا ہے یہ فطری ہے اور برا نہیں ہے، اور اصول اور عقائد میں اختلاف برا ہے، چنانچہ جو قرآن میں تحریف کے قائل ہیں، یا حدیث کے منکر ہیں اور صرف قرآن کو مانتے ہیں یا ختم نبوت کے منکر ہیں تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں، باقی سب مسلمان ہیں، چاہے کوئی ناف کے اوپر ہاتھ باندھے یا نیچے باقی اس کے علاوہ جو اختلافات ہیں وہ کفر اور شرک کا اختلاف نہیں ہے، اختلاف یا تو مسائل کا ہے اور یہ برا نہیں ہے اور یا انتظامی ہے اور یا پیٹ کا اختلاف ہے یہ بھی کفر و شرک نہیں[1]۔

السیر الکبیر اور السیر الصغیر میں بھی فقہ حنفی موجود ہے۔ السیر الکبیر بھی راقم الحروف نے دیکھی ہے البتہ مطالعہ کا وقت نہیں مل سکا یہ چاروں کتابیں بھی امام محمد کی ہیں۔ کتاب الآثار لابی یوسف و کتاب الخراج لابی یوسف میں بھی فقہ حنفی موجود ہے۔ یہ امام ابو یوسف کی کتابیں ہیں جو براہ راست بلاواسطہ امام اعظمؒ کے شاگرد ہیں، کتاب ---لامام لابی یوسف و کتاب النوادر لامام محمد میں بھی فقہ حنفی موجود ہے یہ دونوں کتابیں بھی امام اعظمؒ کی خصوصی شاگردوں کی ہیں جس میں وہ امام اعظم کے اقوال و مسائل نقل کرتے ہیں اس کے علاوہ بھی سند کے ساتھ امام اعظمؒ سے مسائل نقل کئے گئے ہیں۔

اہل حدیث علما نے اپنی اپنی کتابوں میں امام ابو حنیفہؒ کو امام اعظم کہا ہے (1) تاریخ اہل حدیث (2) حقیقۃ الفقہ (3) تقصار (4) الحیاۃ بعد المماۃ (5) صلوۃ الرسول (6) سبیل الرسول (7) حدیث نماز (8) رسائل ثنائیہ (9) فتاوی ثنائیہ (10) الغات الحدیث (11) اسلام خطبات۔

مندرجہ ذیل علما نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو تابعی شمار کیا ہیں:

1- مولانا بدیع الدین راشدی صاحب (تنقید سدید، ص: 354،278)
2- مولانا امین اللہ پشاوری صاحب (حقیقۃ التقلید، ص: 163،67،42)
3- مولانا عبد الغفار محمدی صاحب (35 سوالات، ص: 407،312،293)
4- مولانا عبد المنان نوری پوری صاحب (مکالات نور پوری، ص: 534)
5- مولانا عبد المجید سوہدری صاحب (سیرۃ ثنائی، ص: 65)
6- مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب (حاشیہ حیات امام اعظم ابو حنیفہ، ص: 121)

[1] **فقہ میں اختلاف:**

فقہ میں جتنا زیادہ اختلاف ہے اسی طرح اختلاف حدیث میں ہے، اگر آدمی ماہر کا فیصلہ نہ قبول کرے صرف اختلاف دیکھ کر گھبرا جائے تو ہزاروں حدیثوں کو چھوڑنا پڑے گا، فقہا کا اختلاف تو نظری چیزوں میں ہوتا ہے، یعنی ایسی جگہوں پر جہاں غور فکر اور عقل ورائے کی ضرورت پڑتی ہے، اور فکر ورائے والی چیزوں میں اختلاف کا پیدا ہونا فطری بات ہے مگر محدثین جو احادیث نقل کرتے ہیں اور جن سے احادیث کرتے ہیں ان کا تعلق صرف نقل روایت سے ہوتا ہے اس میں رائے وعقل کا دخل نہیں ہوتا اس کے باوجود محدثین کے اقوال اور ان کی احادیث میں اتنا اختلاف ہوتا ہے کہ احادیث اور ان سے متعلقہ فنون کی کتابیں مثلاً اسماء الرجال ،اصول حدیث وغیرہ کی کتابیں اختلاف کا جنگل نظر آتی ہیں، مگر غیر مقلد بزرگوں کو فقہا کا اختلاف تو قابل اعتراض نظر آتا ہے، لیکن محدثین کے اختلاف کا جنگل ان کو نظر نہیں آتا مثلاً اسی بات کو لیجئے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی عمر مبارک انتقال کے وقت کتنے سال تھی؟ حضرت انس ﷺ کی ایک حدیث میں ہے کہ ساٹھ سال کی تھی "توفاہ اللہ علی راس ستین سنۃ" اور حضرت انس ﷺ ہی کے دوسرے حدیث میں ہے کہ آپ کی عمر ترسٹھ سال کی تھی "توفی رسول اللہ ﷺ وھو ابن ثلاث وستین سنۃ.

حضرت عبد اللہ بن عمر ﷺ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کی عمر مبارک باسٹھ سال کچھ مہینہ کی تھی" وتوفی وھو ابن ثنتین وستین سنۃ واشھر"

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کی عمر ساٹھ سال کی تھی"وتوفی وھو ابن ستین سنۃ "

حضرت انس ﷺ کی ایک تیسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ کی عمر پینسٹھ سال کی تھی"توفی رسو ل الل ہ ﷺ وھو ابن خمس وستین سنۃ"

حضرت عبد اللہ بن عباس ﷺ کی بھی ایک روایت میں اس طرح کی ہے اور انہیں سے ایک روایت یہ ہے کہ آپ ﷺ کی عمر مبارک ترسٹھ سال کی تھی " قبض وھو ابن ثلاث وستین سنۃ " (تفصیل کے لئے حافظ ابن عبد البر کی کتاب "التمہید" جلد ثالث ملاحظہ فرمائیں۔)

غرض حضور ﷺ کی عمر مبارک کے بارے میں کوئی ایک قطعی بات نہیں ہے کہ آپ ﷺ کی عمر وفات کے وقت کتنے سال کی تھی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ باسٹھ سال کچھ مہینے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ترسٹھ سال اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی عمر مبارک پینسٹھ سال کی تھی۔

کہا جاتا ہے اور صحیح کہا جاتا ہے کہ محدثین نے احادیث کے بارے میں بڑی چھانٹ پھٹک کی ہے اس بڑی چھانٹ پھٹک کا نتیجہ ناظرین دیکھ رہے ہیں کہ محدثین یہ بھی نہیں طے کر پا رہے ہیں کہ حضور ﷺ کی عمر مبارک وفات وقت کتنی تھی، کیا اب ان اختلافات سے گھبرا کر احادیث کی کتابوں سے بدگمانی قائم کرلی جائے اور محدثین کے بارے میں سوء ظنی کو کام میں لایا جائے اور احادیث کا انکار کردیا جائے۔

ایسی صورت میں عقل سلیم کا فیصلہ ہوگا کہ دیکھو ماہرین کا کیا فیصلہ ہے وہ کیا کہتے ہیں اب فن حدیث کے ماہروں کا جو فیصلہ ہوگا اس کو قبول کیا جائے گا یہاں ایرے غیرے نتھو خیرے کی بات نہیں چلے گی، تو اب سنیئے کہ علم حدیث کے ماہروں نے آپ ﷺ کی عمر

مبارک کے بارے میں کیا فیصلہ فرمایا ہے اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی عمر مبارک وفات کے وقت ترسٹھ سال کی تھی حافظ ابن عبدالبر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت نقل کرتے ہیں: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ کی عمر مبارک آپ کے وفات کے وقت ترسٹھ سال کی تھی۔

حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں: ہذا اصح شئی جاء فی ہذا الباب یعنی آپ ﷺ کے عمر مبارک کے بارے میں یہ سب سے صحیح بات ہے۔(التمہید ج: 3/ص: 25)

جس طرح کے آپ ﷺ کی عمر مبارک کے بارے میں مختلف احادیث کے پیش نظر مختلف باتیں سامنے آئیں اور متعدد اقوال پیدا ہوئے مگر ان متعدد متعارض اور مختلف اقوال کو دیکھ کر منکرین حدیث کے سوا کسی نے حدیث کا انکار نہیں کیا اور ماہرین کے فیصلہ پر اعتماد کیا اور ایک صحیح تر قول کو تسلیم کیا، اسی طرح کا اختلاف فقہ اور فقہا کا ہوتا ہے ان کے اختلافات کی بنیاد کہیں تو قیاس ورائے کے الگ الگ ہونے پر ہوتی ہے اور کبھی ان اختلافات کی وجہ متعارض اور مختلف احادیث کا ہونا ہی ہوتا ہے تو جس طرح متعارض و مختلف احادیث کے مابین ماہرین محدثین کا فیصلہ ہی قبول کیا جائے گا، اسی طرح متعارض اقوال فقہیہ میں سے اس کو قول کو ترجیح دی جائے گی جس کے بارے میں فقہ کے ماہرین فیصلہ کر دیں گے کہ یہ قول صحیح تر ہے اسی پر فتوی ہے اور میں نے عرض کیا کہ فقہائے احناف نے فقہ حنفی کے بارے میں یہ کام بڑے خوبی سے انجام دیا ہے اس وجہ سے مسائل فقہیہ پر عمل کرنے میں قطعاً کوئی دشواری اور پریشانی نہیں ہے جو قول مفتی بہ ہوگا اس پر عمل کیا جائے گا۔

یہ کہنا کہ بخاری شریف میں کوئی ایسی حدیث نہیں کہ جس کے بارے میں شک وشبہ کیا جائے محض مبالغہ ہے امام دار قطنی نے بخاری کی بہت سے حدیثوں پر شک وشبہ کا اظہار کیا ہے ان کے بعض اعتراضات تو اتنے قوی ہیں کہ حافظ ابن حجر جو امام بخاری رحمہ اللہ بہت بڑے عقدت مند اور بہت بڑے مدافع ہیں وہ بھی ان اعتراضات کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس کا جواب نہیں ہو سکا، فرماتے ہیں: منہا ما الجواب غیر متخصص. (مقدمہ فتح الباری ص: 346)

امام دار قطنی کے ان اعتراضات کو حافظ ابن حجر نے نقل کرکے اس کا تفصیل سے جواب بھی نقل کیا ہے، مگر بعض اشکالات کے بارے میں ان کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ اس کو جواب نہیں دیا جا سکتا اور جس نے جواب دیا ہے اس نے انصاف سے کام نہیں لیا ہے ان کے الفاظ عبارت بالا کے علاوہ یہ بھی ہیں "والیسیر منہ فی الجواب عنہ تعسف"

یعنی کچھ اشکالات ایسے بھی ہیں جن کے جواب میں انصاف کو کام نہیں لایا گیا ہے۔(مقدمہ ص: 383)

یہ تو ابن حجر کا خود اعتراف ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ امام دار قطنی کے اشکالات کے جو جوابات دیئے گئے ہیں بہت سے جوابات محل نظر ہیں تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ امام بخاری کے بارے میں جمہور امت کا یہی فیصلہ ہے کہ قرآن کے بعد اصح ترین کتاب ہے، امام بخاری نے حدیث کی چھان بین میں بڑی محنت صرف کی ہے اور لاکھوں حدیثوں کے ذخیرہ سے اس کتاب کا انتخاب کیا ہے جس میں صرف چار

ہزار کے آس پاس ان کے معیار کے مطابق قرار پائیں بخاری شریف میں مکررات کے ساتھ بقول ابن صلاح سات ہزار دو سو پچہتر حدیثیں ہیں۔(مقدمہ فتح الباری ص: 465)

لاکھوں حدیثوں کے ذخیرہ صرف چار ہزار حدیثوں کے انتخاب میں امام بخاری رحمہ اللہ نے کتنی دیدہ وری کا ثبوت دیا ہوگا اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں مگر بشر کا کوئی کام خواہ وہ کوئی بھی ہو کبھی مکمل نہیں ہو سکا ہے غلطی سہو ونسیان سے کسی انسان کا کام خالی نہیں ہو سکتا امام بخاری رحمہ اللہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ کے بارے میں یہ کہنا کہ ان کی قوت حفظ ایسی تھی کہ ان کے کسی حدیث میں غلطی کا امکان نہیں، یہ بھی مبالغہ ہے ابھی اوپر معلوم ہوا کہ امام دارقطنی نے ان کے بہت سے احادیث پر اعتراض کیا ہے ان کے بعض اعتراضات کا تعلق امام بخاری کے اوہام سے امام بخای جس زمانے میں تھے اس زمانہ میں عام طور پر محدثین کی قوت حفظ بہت زیادہ ہوا کرتی تھی بخاری بھی اسی صف کے آدمی ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ امام بخاری سہو ونسیان اور غلطی سے بالکل مبرا تھے، یہ صرف خدا کی صفت ہے، حضور ﷺ کا ارشاد ہے: انما انا بشر النسی کما تنسون (بخاری)

حضور ﷺ کا فرمان مبارک ہے کہ میں بھی بشر ہی ہوں جیسے تم لوگ بھولتے ہو میں بھی بھولتا ہوں، جب نبی کریم ﷺ پر سہو ونسیان طاری ہو سکتا ہے تو امام بخاری یا دوسرے محدث کی حقیقت کیا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث ذکر کرتے ہیں:

ان رسول اللہ ﷺ کان اذا اعتکف المؤذن للصبح وبدا الصبح. صلی رکعتین خفیفتین قبل ان تقام الصلوۃ۔

امام بخاری نے " اعتکف "کا لفظ ذکر کیا ہے جو ان کا سہو ہے یہاں " سکت " کا لفظ ہے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: والحق ان لفظ اعتکف محرف من لفظ سکت. یعنی حق یہ ہے کہ اعتکف کا لفظ سکت سے محرف ہے۔(فتح الباری ج: 2/ص: 102)

خطیب بغدادی نے امام بخاری کے بہت سے اوہام کو اپنی کتاب "المتفق والمفترق" میں ذکر کیا ہے۔

امام بخاری سے عقیدت ومحبت اور ان کی عظمت شان وجلالت علم اور احادیث کے بارے میں ان کی خدمات ہمیں مجبور کر رہی ہیں کہ میں بات کو صرف اسی ایک مثال پر ختم کردوں۔

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: من اعتقد ان کل حدیث صحیح قد بلغ کل واحد من الائمۃ او اماما معینا فھو مخطی خطاء فاحشا قبیحا (رفع الملام ص: 17)

یعنی اگر کوئی یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ ہر امام کو ہر صحیح حدیث پہنچی ہے یا کسی امام کو ہر صحیح حدیث پہنچی ہے تو وہ بڑی سخت غلطی پر ہے۔

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: "کوئی ہر گز یہ نہ کہے کہ جس کو تمام احادیث کا علم نہ ہوگا وہ مجتہد نہیں ہو سکتا اس لئے کہ اگر مجتہد ہونے کے لئے تمام فعلی وقولی احادیث کے علم ہونے کی شرط لگادی جائے تو امت میں اس طرح کا کوئی مجتہد ہی نہیں ہے۔ مجتہد کے لئے زیادہ سے زیادہ یہ بات کہ اسے بیشتر سنتوں کا علم ہو اور کم اور شاذ ونادر طور پر اس سے کچھ سنتیں رہ گئی ہو اور یہ بات تمام ائمہ رضی اللہ عنہم کو حاصل تھیں۔(رفع الملام ص: 19)

احادیث اور فقہ میں اختلاف کی وجہ:

حقیقت حال یہ ہے کہ امام بخاری ہو یا کوئی اور محدث اس کے نزدیک جو حدیث قابل ذکر نظر آئی اس نے اس کو اپنی کتابوں میں درج کرلیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حدیث کے نام پر جو چیز بھی حدیث کے کتابوں میں مذکور ہو گئی ہے اس پر عمل کرنا یا اس کے ظاہر پر کرنا ضروری ہے، احادیث پر عمل کرنے کے لئے بہت سی چیزوں کو دیکھنا ہوتا ہے اور یہ کام فقہا کا ہے اسی وجہ سے کبھی کوئی حدیث خواہ بخاری میں ہی کیوں نہ ہو فقہا کے نزدیک عملا قابل قبول نہیں ہوتی ہے یا اس کے ظاہر پر عمل کرنا ان کے نزدیک ضروری یا جائز نہیں ہوتا۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا عام قاعدہ یہ ہے کہ ان کو ان کے شرطوں کے مطابق جو حدیث مل گئی اور اس کی صحت کا ان کو اطمنان ہوا انہوں نے بخاری میں اس کو لکھ لیا امام بخاری صرف سند کو دیکھتے ہیں فقہا سند کے علاوہ حدیث پر عمل کے لئے اور بہت سی چیزوں کا لحاظ کرتے ہیں، صرف سند کا لحاظ کرنے سے کبھی کبھی بڑی پیچیدہ صورت حال پیدا ہو جاتی ہے مثلا دیکھئے: امام بخاری رحمہ اللہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ذکر کرتے ہیں: قال جائت امرأة من الانصاري الي النبي ﷺ فخلا بها فقال ان كن لا حب الناس الي.

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انصار کی ایک عورت حضور ﷺ کے پاس آئی تو حضور ﷺ اس کے ساتھ تنہائی میں ہوئے پھر آپ نے فرمایا اے عورتوں تم لوگ لوگوں میں سب سے زیادہ مجھے محبوب ہو۔

چونکہ یہ حدیث امام بخاری رحمہ اللہ کے شرطوں کے مطابق صحیح تھی اس وجہ سے انہوں نے اس کو ذکر کر دیا آپ غور فرمائیں کہ اگر اس حدیث کے صرف ظاہر ہی کو دیکھا جائے تو اس سے فتنہ کا دروازہ کھلتا ہے۔ اور آدمی اس حدیث کو بنیاد بنا کر اجنبیہ عورت کے ساتھ تنہائی میں رہنے کو جائز قرار دے گا، جب یہ قطعاً حرام ہے اس طرح کے نازک موقع پر فقہا سامنے آتے ہیں اور وہ جو مطلب بیان کریں گے اس پر عمل کرنا ہوگا بخاری کی ظاہر حدیث پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

اسی طرح بخاری رحمہ اللہ حضور ﷺ کے عمر مبارک کے سلسلہ میں تین کے طرح کی حدیثیں ذکر کی ہیں 60 سال والی حدیث 63 سال والی حدیث 65 سال والی حدیث چونکہ یہ تینوں حدیثیں ان کی شرطوں کی مطابق تھیں انہوں نے اس کو ذکر کر دیا، مگر اس سے جو پیچیدگی پیدا ہوئی امام بخاری کو اس کا احساس نہیں ہوا، اب آپ سوچیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ تینوں باتیں صحیح ہوں، ہرگز نہیں بلکہ ان تینوں میں ایک ہی بات صحیح ہوگی۔

میں ان دو مثالوں سے یہ بتلایا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ بخاری شریف میں کسی حدیث کا ہونا یہ اس کی دلیل تو ہے کہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہے مگر یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہو اس پر عمل بھی ضروری ہو یا حدیث میں جو بات ہے وہ فی الواقع بھی صحیح ہو، اس کا احساس محدثین کو بھی ہوا، اسی جہ سے انہوں نے دو قاعدے بتائے ایک یہ کہ یہ ضروری نہیں کہ جو حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہو وہ متن کے اعتبار سے بھی صحیح ہو دوسرا قاعدہ یہ بنایا کہ یہ ضروری نہیں کہ جو حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہو وہ متن کے اعتبار سے بھی ضعیف ہو یعنی نہ یہ ضروری ہے کہ ہر صحیح حدیث قابل عمل ہے اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر ضعیف حدیث قابل رد ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ دین کی جو سمجھ اور جو دین کا شعور عطا فرمایا تھا اس کا ادراک ہمارے اور آپ کے بس کی بات نہیں ہے، امام شافعی رحمہ اللہ نے یوں نہیں فرمایا تھا کہ سارے لوگ فقہ میں امام ابو حنیفہ کے محتاج ہیں، حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کے سامنے کسی فقہی مسئلہ میں صرف صحیح حدیث پر مدار نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ اس کے ساتھ بہت سے چیزوں کو دیکھتے تھے اور پھر ان تمام چیزوں کی رعایت سے کے ساتھ فقہی مسائل میں بہت جچی تلی رائے ظاہر کرتے تھے۔

آمین زور سے کہی جائے یا آہستہ سے اولی اور افضل کیا ہے؟ اس میں سب کا اتفاق ہے کہ آمین زور سے بھی کہی جا سکتی ہے اور آہستہ سے بھی مگر اولویت میں اختلاف ہے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ آہستہ آمین کہنے کو اولی قرار دیتے ہیں، جبکہ امام بخاری رحمہ اللہ کا مذہب جسر کا ہے یعنی ان کے یہاں اولی یہ ہے آمین امام اور مقتدی زور سے کہیں، امام بخاری رحمہ اللہ نے اس بارے میں جو حدیث پیش کی ہے وہ یہ ہے:

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو اس لئے کہ جن کی آمین ملائکہ کے آمین کے ساتھ موافقت کرے گی اس کی گزشتہ کی گناہ معاف ہو جائیں گی۔

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب امام غیر مغضوب علیہم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو اس لئے کہ جس آمین کہنا ملائکہ کے آمین کہنے سے موافق ہوگا اس کی گزشتہ تمام گناہ معاف ہو جائیں گی۔

یہ دونوں حدیثیں ابو ہریرہ ﷺ سے مروی ہے اور یہ اصلا دو حدیثیں نہیں ہیں بلکہ فی الاصل ایک ہی حدیث ہے صرف الفاظ کا تغیر ہے محدثین کے یہاں اس طرح کے تغیر سے ایک حدیث کئی حدیث بن جاتی ہے آپ پہلی حدیث میں غور فرمائیں، تو اس میں حضور ﷺ کا یہ حکم مروی ہے کہ جب امام آمین کہے اس وقت تم بھی یعنی مقتدی بھی آمین کہیں، جبکہ دوسری حدیث میں ہے کہ جب امام ولا الضالین کہے تو اس وقت مقتدی آمین کہے دونوں روایت میں مقتدی کے آمین کہنے کی جگہ الگ الگ بتلائی گئی ہے کیا یہ ممکن ہے کہ اس اختلاف کے باوجود دونوں روایت پر عمل ہو سکے گا۔

محدثین کے یہاں اس طرح کے تغیرات سے ایک حدیث کئی حدیثیں بن جاتی ہے اب آخر میں یہ بھی جان لیجئے کہ غیر مقلد حضرات کا عمل جہاں بخاری شریف کے بہت سے احادیث کے خلاف ہے اسی طرح بہت سے مسائل میں بخاری کا مذہب الگ ہے اور ان کا مذہب الگ ہے مثلاً:

1- طلاق حیض کی حالت میں دی جائے بخاری کی مذہب میں وہ واقع ہو جاتی ہے، یہ کہتے ہیں کہ زمانہ حیض میں جو طلاق دی جائے گی وہ واقع نہیں ہوگی۔

2- امام بخاری کا مذہب ہے کہ بسم اللہ ہر سورۃ کا جز نہیں ہے یہ کہتے ہیں بسم اللہ ہر سورۃ کا جز ہے۔

3- بخاری کا مذہب ہے کہ آدمی احرام کی حالت میں نکاح کر سکتا ہے ان کا مذہب ہے کہ نہیں کر سکتا

4- امام بخاری کا مذہب ہے کہ حج و عمرہ کا احرام میقات سے باندھنا چاہیئے میقات سے پہلے باندھنا جائز نہیں اور ان کے نزدیک جائز ہے۔

5- امام بخاری کا مذہب کہ روزانہ ایک ختم قرآن کرنا جائز ہے بخاری کا اس پر عمل تھا اور غیر مقلد حضرات کا مذہب ہے کہ تین دن سے کم قرآن کا ختم کرنا مکروہ ہے نواب وحید الزماں غیر مقلد فرماتے ہیں اہلحدیث نے اس کو مکروہ جانا ہے اور یہ ادب کے خلاف بھی ہے یعنی امام بخاری غیر مقلدین کے بقول ایک دن میں قرآن ختم کرکے قرآن کی بے ادبی کیا کرتے تھے۔

6- امام بخاری کے مذہب میں نمازی کے آگے سے ہر جگہ گزرنا منع ہے اور غیر مقلدین کا مذہب یہ ہے کہ بیت اللہ میں نمازی کے آگے سے گزرنا جائز ہے۔

7- امام بخاری کے نزدیک اونٹ کے باڑہ میں نماز پڑھنا جائز ہے اور ان کے یہاں حرام ہے۔

امام بخاری کے مذہب میں وضو کے اعضا کا پے در پے دھونا واجب نہیں ان کے یہاں واجب ہے۔

8- امام بخاری کے مذہب میں غسل جنابت میں کلی اور ناک میں پانی ڈالنا واجب نہیں اور ان کے یہاں واجب ہے۔

9- امام بخاری کے یہاں منی ناپاک ہے اور ان حضرات کے یہاں منی پاک ہے

ان دس مثالوں سے آپ اندازہ لگائیے کہ ان حضرات کا یہ کہنا کہ ان کا مذہب بخاری کے مذہب کے مطابق ہوتا ہے کتنا غلط ہے ان کا عمل نہ تو بخاری کی تمام احادیث پر ہے جیسا کہ پہلے کی دس مثالوں سے واضح ہوا اور نہ ان کا عمل بخاری کے مذہب کے مطابق ہر جگہ ہوتا ہے۔

اور چونکہ ان آخری دس مثالوں میں امام بخاری نے اپنا مذہب بخاری میں ذکر کردہ احادیث کی روشنی ہی میں اختیار کیا ہے اس وجہ ان تمام احادیث کے بھی انکار کا ان پر الزام عائد ہوگا۔

بعض ناعاقبت اندیش نوجوانوں کا کام ناواقف عوام کو صرف بھڑکانا ہوتا ہے، بیچارے جو ناواقف ہوتے ہیں ان کی باتو میں آجاتے ہیں یہ نوجوانوں کو حنفی مذہب سے بیزار کرنے کو دین کی بڑی خدمت سمجھتے ہیں، بس اللہ سے ان کے لئے ہدایت کی دعا کرتے رہیے۔

میں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ الحمد للہ احناف کا عمل صحیح حدیثوں پر ہوتا ہے احناف کی کتابوں کو پڑھیئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ احناف سے زیادہ کوئی احادیث کی رعایت کرنے والا کوئی دوسرا نہیں، البتہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ بخاری یا کسی او رکتاب کی احادیث کا جو مطلب یہ سمجھیں وہی مطلب احناف کی بھی سمجھ میں آئے۔

بعض کم قیمت لوگوں کی پوری قوت آج کل اس پر خرچ ہورہی ہے کہ وہ لوگوں کو بدظن کریں آپ جیسے لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ ان کی باتوں کو سن کر متاثر نہ ہو بلکہ اہل علم سے معلومات حاصل کریں۔

حضور اکرم ﷺ کے ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرام میں سے ہر فرد فقیہ تھا، یہ بھی مبالغہ ہے، خود غیر مقلد بزرگوں کو یہ تسلیم نہیں ہے۔

مولانا عبدالسلام مبارکپوری مشہور غیر مقلد عالم ہیں، ان کی کتاب سیرۃ البخاری بھی مشہور کتاب ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں:

"یہ بات حیرت سے دیکھی جائے گی کہ اصحاب رسول ﷺ اس کثرت سے تھے کیونکہ ان کے تعداد ایک لاکھ کئی ہزار تک پہنچی ہے، باوجود اس کے ان میں صاحب فتوی فقیہ ایک سو کئی تھے"۔(ص: 217)
یعنی عبد السلام کے بقول ایک لاکھ کئی ہزار صحابہ میں سے صرف سو سے کچھ ہی زائد فقیہ وصاحب فتوی تھے بقیہ صحابہ کرام اس منصب کے حامل نہیں تھے مولانا عبد السلام مبارکپوری مزید لکھتے ہیں: "اس طرح گویا ہر ایک صحابی حضور اکرم ﷺ کی حدیثوں کا بڑا حصہ یاد رکھتا اور اس کو روایت کرتا لوگوں کو سکھاتا اس کے مطابق فتوی دیتا اور اس خدمت کو اپنے فرائض سے جانتا، اس پر بھی چند ہی صحابہ فقیہ اور مجتہد کے لقب سے شہرت پذیر ہوئے جو لاکھوں کی تعداد کے سامنے بہت قلیل ہیں"۔(ص: 218)
مزید مولانا مبارکپوری کا یہ ارشاد سن لیں فرماتے ہیں: "بہت سے مسائل ایسے پیش آتے ہیں جن کی نسبت حدیث میں کوئی حکم بتصریح موجود نہیں، بلکہ قواعد استنباط کے ذریعہ حکم مستخرج ہوتا ہے یا حکم کی تصریح ہے لیکن اور حدیثیں اس کے معارض ہیں، ایسی صورتوں میں اجتہاد اور استنباط کی ضرورت پڑتی ہے اور فقہ دراصل اسی کا نام ہے اس قسم کے مسائل کا فیصلہ کرنا انہیں لوگوں کا کام تھا جو اس فن کے امام تھے۔(ص: 218)
احناف اس سے زیادہ نہیں کہتے جو مولانا مبارکپوری کی تحقیق ہے۔
مزید غیر مقلد عالم دین مولانا نواب صدیق حسن صاحب بھوپالی فرماتے ہیں: علما کی اصطلاح کے اعتبار سے تمام صحابہ کرام فقیہ نہیں تھے، اس لئے کہ ان میں قصبے اور دیہات کے رہنے والے بھی تھے اور ایسے بھی جنہوں نے حضور اکرم ﷺ سے صرف ایک حدیث سنی اور آپ کی صحبت میں رہنے کا ایک ہی مرتبہ ان کو اتفاق ہوا[1]۔
ہمارے اسلاف کے دین ومذہب میں شرک وبدعت کی قطعاً گنجائش نہیں ہے، نواب صاحب صدیق حسن بھوپالی مرحوم کا یہ شعر:

زمرہ رای در افتاد بارباب سنن
شیخ سنت مددے قاضی شوکاں مددے

یعنی رائے وقیاس والے سنت والوں کے پیچھے پڑ گئے ہیں اے سنت کے شیخ اور اے قاضی شوکانی آپ مدد فرمایئے۔
مصیبتوں میں غیر اللہ سے مدد مانگنا اہل سنت والجماعت کا مذہب نہیں ہے، یہ خالص مشرکانہ مبتدعانہ عمل ہے اور جس کا اس قسم کا عقیدہ ہو اس کا توحید سے رشتہ کٹ جاتا ہے۔
نواب صاحب یہ شعر بھی سن لیں فرماتے ہیں:

گفت نواب غزل در صفت سنت تو
خواجہ دیں صلہ قبلہ پاکاں مددے (ایضا)

یعنی نواب صدیق حسن نے اے نبی اکرم ﷺ آپ کی سنت کی تعریف میں غزل کہی ہے، تو اے دین کے سردار مجھے صلہ دیجئے اور متقیوں کے قبلہ وکعبہ میری مدد فرمایئے۔

قبلہ پاکاں، حضور اکرم ﷺ کو کہا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نواب صاحب کے عقیدہ میں آپ ﷺ ہی ہر مصیبت و پریشانی میں صالحین کی قبلہ توجہ تھے وہ عقیدہ اہل سنت والجماعت کا ہرگز نہیں ہے، پریشانی و مصیبت میں مسلمانوں کا مرکز توجہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے۔

نواب صاحب کے عقیدہ میں قاضی شوکانی اور حضور اکرم ﷺ سے مدد چاہنا جائز تھا ہی، اس کے علاوہ ان کا زعم و عقیدہ یہ بھی ہے کہ نواب صدیق حسن کے بخت وطالع یعنی ان کی قسمت سے بھی مدد چاہی جاسکتی ہے، سنئے نواب صاحب فرماتے ہیں:

ہوس ما است حدیث از لب جاناں مددے

مدد طالع صدیق حسن خاں مددے (ایضا)

یعنی میری خواہش ہے کہ محبوب کے زبان سے حدیث سنوں، نواب صدیق حسن خان کی قسمت تو میری مدد کر مدد کر۔

نواب صاحب کے یہ تمام اشعار شرکیہ ہیں ان اشعار میں غیر اللہ سے مدد حاصل کرنے کی ترغیب و تعلیم ہے، بھلا بتلایا جائے کہ جن کے عقائد اس قسم کے ہوں ان کو اہل سنت والجماعت کہنا کس طرح درست ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ من حلف بغیر اللہ فقد اشرک یعنی جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔

اب دیکھئے نواب صاحب جو مجدد سلفیت ہیں اور ان کے مقتدا اور پیشوا ہیں وہ کس شان سے غیر اللہ کی قسم کھاتے ہیں، ان کا شعر ہے:

قسم بشاہ رسالت قسم بشوکت او

کہ نیست در سر من جز ہوائے سنت او (ایضا ص: 56)

یعنی میں شاہ رسالت ﷺ اور ان کی شوکت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے میں سر میں ان کی سنت کے شوق کے علاوہ اور کوئی شوق نہیں ہے۔

دین اسلام میں جس طرح اور مخلوق کی قسم کھانا حرام اور شرک ہے اسی طرح رسول اللہ ﷺ یا اور کسی پیر و پیغمبر کی قسم کھانا شرک وضلالت ہے۔

غیر اللہ کو سجدہ کرنا یا اللہ کے در کے علاوہ کسی اور در پر سجدہ کرنا یہ انتہائی درجہ کا شرک ہے، مگر نواب صاحب کا عقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے آستانہ پر سجدہ کیا جاسکتا ہے بلکہ اس شوق نے ان کو بے چین کر رکھا ہے فرماتے ہیں:

بخاک رفتم و لیکن زتاب آتش عشق

ہوائے سجدہ براں خاک آستانہ باقیست (ایضا)

یعنی میں مٹی ہو گیا ہوں مگر آتش عشق کی لپک یہ ہے ابھی ان کے آستانہ کے خاک پر سجدہ کرنے کی خواہش باقی ہے۔

جن کا اس قسم کا عقیدہ ہو ان کو اہل سنت واہل حق کے زمرہ میں کیسے شمار کیا جاسکتا ہے۔

سارے مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ہر طرح کے فتنوں سے سلامتی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں ہے، مگر نواب صاحب مجدد کا شعر ہے کہ اگر تم دین و عقیدہ کی سلامتی چاہتے ہو تو قاضی شوکانی کی کتابیں پڑھو، فرماتے ہیں:

اگر سلامت دین خود از خرد خواہی
بخواں صحیفہ علم جناب شوکانی (ص:64)

یعنی اگر تم عقل ورائے کے فتنہ سے اپنے دین کی سلامتی چاہتے ہو تو قاضی شاکانی صاحب کی کتابیں پڑھو۔

اللہ اللہ کیا مقام ہے قاضی شوکانی کی کتابوں کا، بخاری مت پڑھو، مسلم مت پڑھو، حدیث کی اور کتابیں نہ پڑھو، قرآن بھی مت پڑھو، اگر دین کی سلامتی چاہتے ہو تو قاضی شوکانی کی کتابیں پڑھو۔

مولانا محمد جونا گڑھی مشہور عالم ہیں، ان کی ایک کتاب "مشکوۃ محمدی" پڑھنے کا اتفاق ہوا، کتاب میں نے جب ہاتھ میں لی تو اس کے اندرونی ٹائیٹل پر ایک آیت اور اس کا ترجمہ دیکھ کر میں نے سر پیٹ لیا، آیت اور اس کا ترجمہ اہل علم ملاحظہ فرما کر بتلائیں کہ اس کو تسامح کا نام کس طرح دیا جاسکتا ہے: ىرد الذين كفروا بغيظهم لم ينالو خيرا

حق چھپانے والوں کو اللہ تعالیٰ نے لوٹا دیا اور انہیں زبردست نقصان کے ساتھ واپس ہونا پڑا۔

یہ آیت اکیسویں پارہ کے آخر صفحہ کی ہے، صحیح آیت اس طرح ہے: ورد الله الذين كفروا بغيظهم لم ينالوا خيرا

آیت کریمہ سے لفظ اللہ ساقط ہوگیا ہے، اگر اس کو سہوا تسامح اور پروف ریڈنگ کی غلطی مان بھی لیا جائے تو اس ترجمہ کو کیا نام دیا جائے گا، کیا اس آیت کریمہ کا یہی ترجمہ ہے

خاص نوٹ: یہ پورا مضمون کسی کتاب سے میں نے نقل کی ہے جس میں راقم الحروف (طورو) بالکل متفق نہیں ہوں، بس صرف اتنا کہنا ہے کہ یہ عمل بدکا بدرد عمل ہے، یہ سلسلہ دوطرفہ چالو ہے۔

فقہ حنفی:

حافظ عبداللہ روپڑی صاحب (فقہ حنفی کا تمسخر اڑاتے ہوئے) صاحب ہدایہ اور شرح وقایہ سے نقل کرتے ہیں کہ ان کی کتابوں میں حنفیہ کی نماز کا طریقہ یہ لکھا ہے فرماتے ہیں:

حنفیہ کی نماز:

دیکھئے شرح وقایہ اور ہدایہ وغیرہ میں یہ لکھا ہے: "اگر بسم اللہ پڑھ کر کتا ذبح کرکے اس کی کھال کا تہبند بنا کر کھجوروں کی شربت سے وضو کرکے اللہ اکبر کی جگہ خدا بزرگ تراست کہہ کر قرآن مجید کی جگہ کسی آیت کا ترجمہ پڑھ کر جس طرح مرغ چوگہ چگتا ہے اس طرح جلدی جلدی نیچے اوپر ہوتا جائے نہ رکوع سے پیٹھ سیدھی کرے نہ دو سجدوں کے درمیان بیٹھے نہ رکوع سجود قومہ جلسہ میں کچھ پڑھے یہاں تک التحیات بھی نہ پڑھے اور سلام پھیرنے کے بجائے زور سے پادے تو بس اس کے ذمہ سے فرض اتر جائے گا خواہ فاتحہ وغیرہ کے ترک سے گناہگار ہی ہو جائے۔ (اہلحدیث کے امتیازی مسائل ص: 102)

یہ حافظ عبد اللہ روپڑی صاحب کے نزدیک ہدایہ اور شرح وقایہ سے حنفیہ کی نماز کا نقشہ ،اس قسم کا نقشہ حاسدین کی فیکٹری میں تیار ہوتا ہے ،نواب صاحب بھوپالی کے بارے میں ان کے لڑکے نے لکھا ہے کہ نواب صاحب بھوپالی ہمیشہ حنفیہ کے مذہب کے مطابق نماز پڑھتے تھے ، میرا خیال ہے کہ نواب صاحب ضرور زندگی بھر اسی طرح کی نماز پڑھتے رہے ہوں گے۔

اللہ کے رسول ﷺ کی مدح و منقبت میں نواب صاحب کی ایک طویل عربی نعت شریف ہے اصل عربی عبارت نقل کرنے میں طول ہے ،اس کے چند شعروں کا ترجمہ سن لیجئے جس کو اصل شعر دیکھنا ہو نواب صاحب کی سوانح حیات میں دیکھ لے۔

"اے میرے آقا میرے سہارا اور وسیلہ اور اے خوشحالی اور بدحالی میں میری متاع میں روتا گڑگڑاتا اور ٹھنڈی آہیں بھرتا آپ کے در پر آیا ہوں آپ کے علاوہ میرا کوئی فریادرس نہیں سوائے رحمۃ اللعالمین میرے گریہ رازی پر رحم فرمائیے۔

کیا ان اشعار میں نواب صاحب نے حضور ﷺ سے استعانت اور توسل نہیں کیا ہے؟

نواب وحید الزماں حیدر آبادی صاحب تو صاف صاف لکھتے ہیں کہ غیر اللہ سے توسل مطلقا جائز ہے ،زندوں سے بھی او رمردوں سے بھی فرماتے ہیں : التوصل الي الله تعالي بانبيائه والصالحين من عباده جائز ويستوي فيه الاحياء والاموات (نزل الابرار ص: 5)

یعنی اللہ کے بندوں سے انبیاء اور صالحین سے توسل پکڑنا جائز ہے اور اس میں زندہ اور مردہ سب برابر ہے۔

یہی نواب صاحب ہدایۃ المہدی میں لکھتے ہیں: "پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ سوال مردوں سے نہیں ہوتا بلکہ صلحاء کی ارواح سے ہوتا ہے اور ارواح موت کا ذائقہ نہیں چکھتی ہیں ان پر فناطاری نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ ادراک اور احساس کے ساتھ باقی رہتے ہیں خصوصا انبیاء اور شہدا زندوں کے حکم میں ہیں ۔ نیز اسی کتاب میں لکھتے ہیں : "ہاں یہ ضروری ہے کہ یہ استعانت اور طلب مدد ان کی قبروں کے پاس ہو"۔

نواب صاحب نے اپنی کتاب "التاج المکلل" میں جن بزرگوں کا تذکرہ کیا ہے ان تمام کے بارے میں اپنا عقیدہ یہ بیان کرتے ہیں، فرماتے ہیں: "اگرچہ لوگ تعداد میں کم ہیں تاہم کیفیت میں بہت زیادہ ہیں اس لئے کہ یہی لوگ کامل کا ذریعہ ہیں۔

غیر مقلد احباب اپنے اکابر کی ان صریح عبارتوں کیا کہیں گے کہ ہم ہمارا عقیدہ توسل اور غیر اللہ سے استعانت اور مدد کرنے کا نہیں ہے ،اگر نہیں ہے تو فیصلہ فرمادیں اپنے ان اکابر کے بارے میں یہ لوگ مشرک تھے یا مؤمن؟

آج کل ان حضرات نے ایک طریقہ اختیار کیا ہے کہ وہ اپنے اکابر کی باتوں کا بھی یہ کہہ کر انکار کر دیتے ہیں کہ ہم تو صرف کتاب و سنت کی مانیں گے اکابر نے کیا لکھا ہے اس سے ہمیں مطلب نہیں ہے سوال یہ ہے کہ ان اکابر کے سامنے ان چھوٹوں کی کیا حقیقت ہے ،اگر آپ اپنے اکابر کا انکار کرتے ہیں تو صاف صاف ان کے بارے میں فیصلہ کریں کہ جنہوں نے اس طرح کی باتیں اپنی کتابوں میں لکھی ہیں ان کا یہ عقیدہ تھا یا نہیں اور اگر تھا اور یقینا تھا تو شرکیہ عقیدہ رکھنے کے باوجود ان کو اپنے آپ اہلحدیث اور اہلسنت والجماعت کا مقتدی اور پیشوا کیوں سمجھتے ہیں اور ان کی عزت و تکریم کیوں کرتے ہیں؟۔

ایک غلط پرپیگنڈہ:

جہاں فقہ مالکی کا شیوع تھا وہاں اس زمانہ میں مالکی قاضی مقرر ہوتا حضرت شاہ عبدالعزیز کا کتاب "بستان المحدثین" میں ہے: "در اندلس یحی بن یحی رانزد سلطان آں وقت بحدے مکنت وجاہ حاصل گشت کہ ہیچ قاضی وحاکم بے مشورہ او منصوب نمی شود پس او غیر از یاراں ہمدماں خود را متولی نمی ساخت۔

یعنی اندلس میں یحی بن یحی کو سلطان وقت کے نزدیک بڑا مقام حاصل ہوگیا تھا کوئی قاضی ان کے مشورے کے بغیر مقرر نہیں ہوتا تھا، اور وہ صرف اپنے ہی لوگوں کو اس منصب پر مقرر کرتے تھے۔

سب کو معلوم ہے کہ اندلس میں فقہ مالکی کا شروع ہی سے غلبہ ودبدبہ تھا اور عام طور پر اندلس کے لوگ اسی مذہب کے پیروں تھے تو اب یہاں کسی اور مذہب کے قاضیوں کو مقرر کرکے فقہ مالکی کے خلاف فیصلہ کرانا کس قدر بے دانشی کی بات ہوتی اور اس سے مملکت کا نظام کیسا درہم برہم ہوتا۔

بہر حال یہ صرف پروپیگنڈا ہے جس کو ابن حزم نے بڑے بڑے زور وشور سے پھیلایا تھا اور پھر اس بات کو بلا تحقیق غیر مقلدوں نے بھی دہرانا شروع کیا۔

ابن حزم کا حال یہ ہے کہ ان کو فقہاسے خصوصا مالکیہ اور احناف سے بڑا اختلاف تھا وہ ان دونوں مذہبوں کے سخت مخالف تھے اس لئے احناف اور مالکیہ کے خلاف ان کی زبانیں بڑی تیز تھی اور ان کی تحریروں میں ان دونوں مذہبوں کے خلاف نفرت وعداوت کی بو ہر شخص محسوس کرسکتا ہے، یہ صاحب پہلے شافعی المسلک تھے پھر غیر مقلدیت کا شوق دامن گیر ہوا تو غیر مقلد ہو کر مجتہد مطلق ہونے کے مدعی بن گئے فقہ حنفی اور فقہ مالکی کو بطور خاص اپنا نشانہ بنایا اور جب زبان اسلاف کے خلاف چل پڑی تو ان کی زبان سے بہت ہی کم لوگ محفوظ رہے اکثر اہل اور کبار امت کی انہوں نے پگڑیاں اچھالی ہیں بعض لوگ تقلید کے خلاف زہر اگلنے میں ابن حزم کا بڑا سہارا لیتے ہیں اور چونکہ ابن حزم اکابر کے بارے میں بڑی جری تھے اس لئے بعض ناسمجھ بھی اکابر اسلاف کے بارے میں اسی جرات کا مظاہر کرتے ہیں ابن حزم کے بارے میں نواب صاحب فرماتے ہیں: "وبود کثیر الوقوع در علمائے متقدمین ونزدیک نیست کہ ہیچ یکے از بانش سالم ماند ازیں جہت ولہا از دے گریخت وہدف فقہاء وقت شد.... لہٰذا ملوک اوراں اندختہ واز بلاد بدر کردند"۔ (اتحاف لنبلاء ص: 321)

یعنی یہ شخص (ابن حزم) علمائے متقدمین کے شان میں بہت زیادہ بکواسیں کرتا تھا بہت کم ہی لوگ اس کی زبان سے محفوظ رہے اسی وجہ سے لوگوں کے دل اس سے پھر گئے اور اہل علم کے اعتراضات کا یہ نشانہ بنا......ان کی انہیں باتوں کی وجہ سے بادشاہوں نے ان کو نظر انداز کیا اور ملک بدر کردیا۔

خدشہ 4:

اور چوتھا خدشہ یہ ہوتا ہے کہ فقہ میں گندے گندے مسائل ہے۔جوابا عرض ہے کہ یہ اعتراض تو منکرین حدیث، حدیث پر بھی کرتے ہیں کہ اس میں غسل، ملاپ وغیرہ کے عجیب عجیب مسائل ہیں[1]۔

---

[1] **فقہ پر اعتراض کہ اس میں گندے مسائل ہیں؟**

بہت ساری اہل حدیث حضرات علمائے کرام نے جن مسائل کو بہت مکروہ سمجھ کر ہدایہ سے نقل کیا ہے وہ اور اس طرح کے مسائل زمانہ نبوت اور زمانہ خیر والقرون میں واقع اور پیش آچکے ہیں اور ان کا ذکر خود حدیث کے کتابوں میں ہے، صحابہ کرام میں سے بعض حضرات سے زنا کا صدور ہوا، حضور اکرم ﷺ نے خود ان کا فیصلہ فرمایا، بعض عورتوں سے بھی زنا کا صدور ہوا، ان کا بھی فیصلہ حضور ﷺ نے خود فرمایا۔ حضور ﷺ کے زمانہ میں بعض ہجڑے تھے ان کا ذکر اور ان کا حکم بھی احادیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں ایسا بھی واقعہ پیش آیا کہ چوپایہ کے ساتھ کسی آدمی نے اپنی خواہش پوری کی آپ نے ایسے شخص کا حکم بھی بیان فرمایا۔ حضور ﷺ کو اس کی اطلاع ملی کہ کچھ لوگ اپنی بیویوں سے پاخانہ کے راستہ میں خواہش پوری کرتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ وہ شخص ملعون ہے جو یہ کام کرے غرض اس کا بھی آپ نے حکم بیان فرمایا ہیں، خود حدیث میں اس کا ذکر ہے کہ آپ نے حالت حیض میں بیویوں سے مقام خاص کے علاوہ جگہوں پر مباشرت کرنے کی اجازت دی ہے، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک شخص کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ لوگ وہ فعل کرتے ہیں جو عورتوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے باقاعدہ صحابہ کرام کی جماعت کو بلایا اور مشورہ کیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کو جلا کر مار ڈالا جائے۔

عینی میں لکھا ہے: "ایسے کام کرنے والے کو سزا دی جائے گی اور اسے تاحیات قید میں رکھا جائے گا الا یہ کہ وہ توبہ کرلے اور اگر وہ فعل کا عادی ہے تو امام اس کو تعزیراً اور حداً قتل کردے گا"۔

حضرت امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں اور ہدایہ کا جو مسئلہ ہے وہی حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ مصنف ابن عبد الرزاق میں ہے: "عبد اللہ بن عباس کا فتوی یہ تھا کہ جو شخص جانوروں سے بد فعلی کرے اس پر حد نہیں ہے"۔

حضور ﷺ کا ارشاد بھی جو اس بارے میں منقول ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایسے شخص پر حد شرعی زنا والی سزا نہیں جاری کی جائے گی، آپ نے فرمایا کہ چوپایہ اور چوپایہ کے ساتھ جو بد فعلی کرے دونوں کو قتل کردو۔(مصنف ج: 7/ص: 264)

خدشہ 5:

پانچواں خدشہ یہ ہوتا ہے کہ ان مقلدین کا عقیدہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنے قبر مبارک میں زندہ ہے اور مردے سنتے ہیں، جبکہ یہ تو شرک کا دروازہ کھولنا ہے[1]۔

---

[1] **حیات انبیاء:**

صحیح حدیث ہے کہ: "نبی ﷺ مشرکین کے قبروں کے پاس سے گزرے کہ آپ کا خچر بدکا (مسلم شریف) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان قبروں کے بیچ میں ضرور ضرور کچھ ہوتا ہے"۔

حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع حدیث کے متعلق لکھتے ہیں انسان کسی شناسا کی قبر پر سلام کہے تو جواب دینے کے لئے اللہ تعالی اس کی روح کو لوٹا دیتا ہے۔اس میں بھی حمید بن زیاد ہے۔

سوال: حدیث الانبیاء احیاء فی قبورہم یصلون کے متعلق لکھا ہے اس کی سند میں حسین بن قتیبہ کو ذہبی نے ہالک اور دارقطنی نے متروک اور حاتم نے ضعیف اور اوزاعی نے واہی اور عقیلی نے کثیر الوہم کہا ہے۔ (میزان الاعتدال، ج: 1/ص: 241)

جواب: صحیح سند جس پر حدیث کا دار ومدار ہے اس کا ذکر تک نہیں کیا پھر مجروح راوی کا نام حسن بن قتیبہ ہے مگر بعض نے غلطی سے حسین بن قتیبہ بنادیا ہے۔

بعض نے اس راوی پر امام اوزاعیؒ سے بھی جرح نقل کی ہے حالانکہ امام اوزاعی اس آدمی کے پیدا ہونے سے بھی پہلے فوت ہوچکے تھے۔

الانبیاء احیاء فی قبورھم ویصلون فیہا علامہ سخاوی (القول البدیع، ص: 167) میں اس کے راویوں کے توثیق نقل کرتے ہوئے امام بیہقیؒ سے اس کی تصحیح نقل کرتے ہیں۔حافظ ابن حجرؒ بھی امام بیہقی سے اس کی تصحیح نقل کرتے ہیں (فتح الباری، ج: 6/ ص: 352)حافظ ابن حجر کے استاد علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں " رجال ابی یعلی ثقات " (مجمع الزوائد، ج: 8/ ص: 211)علامہ عبدالرؤف مناویؒ فرماتے ہیں " لما صح ان الانبیاء احیاء فی قبورہم " اس لئے کہ حدیث انبیاء (علیہم السلام) اپنی قبروں میں زندہ ہے صحیح ہے۔ (فیض القدیر الجامع الصغیر، ج: 5/ ص: 467)نیز فرماتے ہیں " وہو حدیث صحیح " (فیض القدیر، ج: 3/ص: 184) علامہ عزیزی فرماتے ہیں " وہو حدیث صحیح (السراج المنیر، ج: 2/ ص: 256)علامہ سیوطی فرماتے ہیں " عن انس (الجامع الصغیر، ج: 1/ ص: 133) یہ حدیث مسند ابو یعلی میں حضرت انسؓ سے مروی ہے حسن درجہ کی ہے۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں " صح خبر الانبیاء احیاء فی قبورہم (مرقات، ج: 2/ ص: 212) حدیث انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں صحیح ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں " ابو یعلی بنقل ثقات از روایت انس بن مالکؓ اوردہ الخ (مدارج النبوۃ، ج: 2/ ص: 447، وجذب القلوب، ص: 180) قاضی شوکانی صاحب غیر مقلد فرماتے ہیں " لما صح الانبیاء احیاء فی قبورہم (تحفۃ الذاکرین شرح حصن حصین، ص: 28)اسی طرح قاضی صاحب (نیل الاوطار، ج: 3/ ص: 264) میں لکھتے ہیں " وقد ثبت فی

الحدیث ان الانبیاء احیاء فی قبورہم، رواہ المنذری وصححہ البیہقی) حدیث انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں بے شک صحیح ہے علامہ منذری نے اس کو روایت کیا ہے اور امام بیہقی نے اس کی تصحیح کی ہے۔

مولانا حافظ محمد گوندلوی فرماتے ہیں: "الجواب: انبیاء علیہم السلام برزخ میں زندہ ہیں بلکہ سب لوگ زندہ ہیں اسی لئے وہاں تعظیم (لفظ صحیح تنعیم ہے، حافظ حبیب اللہ) وتعذیب کی صورت ہے۔ حدیث الانبیاء احیاء فی قبورہم ویصلون، حافظ ابن حجر نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے (فتح الباری) اور علامہ ذہبی نے اس کو منکر قرار دیا ہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نماز پڑھنے کی روایت کا تعلق بھی عالم برزخ سے ہے نہ کہ دنیا سے اور یہ حدیث مسلم میں ہے، اور قبر کے پاس درود پڑھنے سے آپ سنتے ہیں اس حدیث کو حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے (کہ) اس کی سند جید ہے، مگر اس میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن اعرج ہے جو مجہول الحال ہے، مگر درود کے قبر کے پاس سننے میں بحث نہیں"۔ (مولانا حافظ محمد گوندلوی، الاعتصام، ج: 2/ شمارہ: 8، وفتاوی علمائے حدیث، ج: 9/ ص: 125تا126)

علامہ ناصر الدین البانی غیر مقلد نے سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ والموضوعہ (ج: 1/ ص: 239) میں اس حدیث کو ضعیف قرار دیا تھا، لیکن اس کے کتاب کے صفحہ 560 میں عنوان قائم کیا ہے " الاحادیث الصحیحہ مرتبۃ علی الحروف (یعنی صحیح حدیثوں کا ذکر حروف تہجی کے ترتیب سے) پھر اس کے تحت حدیث " الانبیاء احیاء فی قبورہم" ذکر کی ہے پھر اس کے نیچے لکھتے ہیں:

تنبیہ: یہ حدیث میں نے وہاں ذکر کرکے کہا تھا کہ ضعیف ہے، پھر مجھے معلوم ہوا کہ صحیح ہے اس لئے میں نے دوسری کتاب کے (ص: 622) میں ذکر کرکے اس کو ضعیف کہنے کی پھر صحیح کہنے کی وجہ بتائی ہے، الحمد للہ کے مجھے ہدایت نصیب ہوئی۔

علامہ ذہبی نے اس حدیث کے راوی حجاج بن الاسود کو مجہول کہا ہے (المیزان الاعتدال) شاید پہلے اسی وجہ سے علامہ البانی کو بھی دھوکہ لگا ہو، لیکن بعد میں علامہ ذہبی نے اس سے رجوع کرلیا ہے، چنانچہ تلخیص مستدرک (ج: 4/ ص: 332) میں حجاج بن الاسود کی حدیث کو صحیح قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں" (قلت) حجاج ثقۃ" (میں ذہبی کہتا ہوں) حجاج ثقہ ہے۔

حیاۃ انبیاء اور عقیدہ غیر مقلد احباب:

"اہل سنت والجماعت کی متفقہ رائے ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اپنی قبر میں حیات برزخی حاصل ہے جس سے آپ کو اللہ کی نعمتوں کا احساس ہو جاتا ہے اور اس طرح ناز ونعمت میں آپ ﷺ زندگی بسر کر رہے ہیں تاہم آپ کی روح مبارک آپ کی طرف اس طرح لوٹ کر نہیں آئی ہے کہ آپ جیسے دنیا میں تھے ایسے دوبارہ زندہ ہوگئے ہوں۔"

یہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کے متبعین سلفی حضرات کا عقیدہ ہے، لیکن غیر مقلدین کا عقیدہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نزدیک سے پکارنے والے کی آواز سنتے ہیں، کھاتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، مدد کرتے ہیں، سوتے جاگتے ہیں، اس طرح کی تمام امور میں جو دنیا کے زندوں کے ساتھ مخصوص ہیں غیر مقلدین انہیں رسول اللہ ﷺ کے لئے قبر میں ثابت کرتے ہیں۔

یہ تمام امور برصغیر کے غیر مقلدین کے عقیدہ میں رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کے لئے ثابت ہیں، اس سلسلہ میں آپ نے بہت کچھ ماقبل میں پڑھ لیا، یہاں ہم مزید کچھ تفصیل ذکر کرتے ہیں۔ علامہ وحید الزمان حیدرآبادی اپنی کتاب " ہدایۃ المہدی" میں فرماتے ہیں:

" اور اح موت کا ذائقہ چکھ کر فنا نہیں ہوتی ہیں بلکہ احساس اور ادارک کے ساتھ باقی رہتی ہیں خصوصا انبیاء اور شہداء کی اور اح، کہ ان کا وہی حکم ہے جو زندوں کا ہے۔" (ص: 22)

اسی مقام کے حاشیہ میں فرماتے ہیں: "حضرت انسؓ سے امام بیہقی اور ابو نعیم نے مرفوعا روایت نقل کی ہے کہ " الانبیاء احیاء فی قبور ہم ویصلون " انبیاء اپنے قبروں میں زندہ ہیں، نماز پڑھتے ہیں، اور امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت نقل کی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت موسی علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ اپنی قبر میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے، اس مسئلہ میں امام بیہقی کی ایک مستقل کتاب ہے جس کا نام انہوں نے " حیاۃ الانبیاء " رکھا ہے " (ایضا حاشیہ)

ان امور کو ثابت کرنے کے بعد کوئی شخص انبیاء، شہداء اور صلحاء کی حیات کا انکار کر سکتا ہے کہ حیات کہ تو یہی معنی ہیں۔

تنبیہ: یات انبیاء کے سلسلے میں جمہور امت کا یہی عقیدہ ہے کہ آنخضرت ﷺ اور تمام انبیاء علیہم السلام برزخ میں جسد عنصری کے ساتھ زندہ ہیں ان کی حیات برزخی صرف روحانی نہیں بلکہ جسمانی حیات ہے جو حیات دنیوی کے مماثل ہے بجز اس کے کہ وہ احکام کے مکلف نہیں۔ (دیکھئے: عقائد علمائے دیوبند، ص: 46 از مولانا مفتی عبد الشکور ترمذی)

یہی جمہور علمائے اہل سنت کا عقیدہ ہے اور اکابر غیر مقلدین اور سلفی ائمہ کا بھی تقریبا یہی عقیدہ ہے، نواب صدیق حسن خانؒ وغیرہ کی عبارتیں موجود ہیں کہ سلفی علماء کے امام علامہ شوکانی رحمہ اللہ کی مندرجہ ذیل عبارت بھی ملاحظہ فرمائیں علامہ لکھتے ہیں:

" نبی کریم ﷺ وفات کے بعد اپنی قبر میں زندہ ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے " الانبیاء احیاء فی قبور ہم " بیہقی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں: " محققین کا مذہب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی وفات کے بعد زندہ ہیں اور اپنی امت کی طاعات سے خوش ہوتے ہیں اور انبیاء کے اجساد نہیں گلتے جبکہ مطلق ادراک مثلا علم، سمع تمام مردوں کے لئے ثابت ہے، قرآن کریم میں وفات کے بعد شہداء کی زندگی کی تصریح ہے بلاشبہ ان کی زندگی جسمانی ہے اور جب شہداء زندہ ہیں تو حضرات انبیاء کی حیات کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے۔"

(دیکھئے نیل الاوطار للشوکانی، ج: 3/ص: 264، ج: 5/ ص: 101، بحوالہ وجہ جدید للسلفیہ للشیخ بدر الحسن القاسمی، از مترجم)

"الانبیاء احیاء فی قبورہم یصلون" امام ذہبی فرماتے ہے یہ حدیث منکر ہے جبکہ امام سیوطی انبیاء الاذکیاء اور اپنے فتاوی میں فرماتے ہیں کہ انبیاء اپنے قبروں میں زندہ ہیں والی احادیث متواتر ہیں، علامہ ---بن سلیمان بغدادی نے بھی متواتر لکھا ہے، (المنحۃ الوہبیہ، ص: 11) ابن حجر عسقلانی فتح الباری (22/7) پہ یہی فرماتے ہیں، قاضی شوکانیؒ یہی فرماتے ہیں (نیل الاوطار، 101/5) اور شمس الحق عظیم آبادی عون المعبود (406/1) اور مولانا عطاء اللہ حنیف التعلیقات السلفیہ (237/1) تیسیر الباری رفع العجاجہ میں وحید الزمان صاحب نے یہی کچھ فرمایا ہے۔

اعتراض کیا جاتا ہے کہ حدیث میں ہے جو شخص مجھ پر سلام کرتا ہے تو اللہ تعالی میری روح مجھ پر لوٹا دیتا ہے۔ اس میں مزید ابو ہریرہ سے روایت کرتا ہے جبکہ اس نے ابو ہریرہ کو دیکھا ہی نہیں جبکہ ابو حاتم فرماتے ہیں بالسند القوی اور دیگر یہ کہ یزید کی ولادت 32ھ کو ہے اور ابو ہریرہؓ کی وفات 58ھ کو ہے تو ابو ہریرہ کو نہ دیکھنے کا دعوی غلط ہے۔

اور امام ابن عبد البر نے ابو حاتم کا رد کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ یزید ثقہ ہے (تہذیب التہذیب، 343/11) اور تو بخاری مسلم کا راوی ہے، دلیل الطالب میں نواب صاحب فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو امام نووی نے اذکار میں ابن حجر نے صحیح کہا ہے، اہل حدیث صلاح الدین یوسف نے شرح ریاض الصالحین زبیر علی زئی نے فرمایا حسن اور امام عراقی نے اس حدیث کی سند کو جید کہا ہے، تخریج ریاض الصالحین (حدیث نمبر 1402) اور صحیفہ اہل حدیث یکم محرم 1384ھ صفحہ 18 اسلام خطباب مولانا بستوی لغات الحدیث وحدیث الزمان صاحب ابن القیم زاد المعاد وکتاب الروح میں اس کی تصحیح موجود ہے۔

حدیث ہے کہ جمعہ کے دن مجھ پر درود شریف پڑھا کرو کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے (ابو داؤد) ابن کثیر فرماتے ہیں کہ امام ابن خزیمہ ابن حبان، دار قطنی، نووی نے اس کو صحیح کہا ہے۔ ابن حجر نے فتح الباری میں ابن القیم جلاء الافہام اور اہل حدیث عالم نے ریاض الصالحین مترجم اور مولانا صلاح الدین یوسف نے شرح ریاض الصالحین اور ر قاضی شوکانی نے نیل الاوطار (ج: 3/ص: 264) اور شمس الحق عظیم آبادی نے عون المعبود (405/1) اور علامہ البانی نے السلسلۃ الاحادیث الصحیحہ میں اس کو صحیح فرمایا ہے۔

اور امام بخاری رحمہ اللہ پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: " امام جعفر صادق مشہور امام ہیں، بارہ اماموں میں سے اور بڑے ثقہ اور فقیہ اور حافظ تھے، امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے شیخ ہیں، اور امام بخاری کو معلوم نہیں کیا شبہ ہو گیا کہ وہ اپنی صحیح میں ان سے روایت نہیں کرتے۔ اللہ تعالی امام بخاری پر رحم کرے۔ مروان اور عمران بن حطان اور کئی خوارج سے تو انہوں نے روایت کی اور امام جعفر صادق سے جو ابن رسول اللہ ﷺ ہیں ان کی روایت میں شبہ کرتے ہیں۔" (لغات الحدیث........

مردہ سنتا ہے:

صحیح حدیث میں ہے " فیعاد روحہ فی جسدہ" پھر اس میت کی جسم میں روح لوٹا دی جاتی ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ (381/3) کے بارے میں زبیر علی زئی صاحب علمی مقالات میں فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ (ج: 2/ص: 38

امام بخاری نے باب باندھا ہے کہ مردہ لوٹ جانے والوں کے قدموں کی آواز سنتا ہے اور ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ میت سلام کرنے اور قرآن پڑھنے والے کی آواز سنتا ہے (اقتضاء الصراط المستقیم، ص: 181) یہی بات علامہ بن تیمیہ نے کتاب الروح میں لکھی (ص: 55) اور یہی علامہ قاضی شوکانی نے نیل الاوطار (ص: 264، ج: 3) میں لکھی ہے اور نواب صدیق حسن خان صاحب نے " دلیل الطالب " میں اور عبد التواب ملتانی نے حاشیہ بلوغ المرام (ص: 198) میں اور حافظ عبد الستار حماد نے مختصر صحیح بخاری (ج: 1/ص: 437) اور وحید الزمان صاحب نے لغات الحدیث میں ذکر فرمائی ہے۔

سماع موتی اور عقیدہ غیر مقلد بزرگ حضرات:

ایک بڑے غیر مقلد عالم مولانا وحید الزمان حیدر آبادی فرماتے ہیں: " بے شک شہداء اور تمام مردوں کے لئے سماع ثابت ہے.... قبروں کے زیارت کرنے والے " السلام علیکم دار قوم مومنین " کے الفاظ کہتا ہے، ظاہر بات ہے یہ خطاب اسی کو ہو سکتا ہے

خدشہ 7:

ساتواں خدشہ یہ ہوتا ہے کہ عالم الغیب اللہ تعالی ہے، اور مقلدین کے بزرگ کل کی خبر دیتے ہیں، دل کا حال بتاتے ہیں، اپنی موت کی خبر دیتے ہیں، اور اس کشف اور کرامت نے ان مقلدین کے عقائد خراب کئے ہوئے ہیں، اگرچہ علماء جانتے ہیں، کلی ذاتی الگ چیز ہے، جزی واقعہ الگ چیز ہے، اللہ تعالی

نواب وحید الزماں اپنی کتاب نزل الابرار میں لکھتے ہیں: "اللہ کے بندوں انبیاء اور صالحین سے وسیلہ پکڑنا جائز ہے، اس میں مردے اور زندے سب برابر ہیں"۔ (ص: 5)

قاضی شوکانی نے وسیلہ کے جواز پر باقاعدہ کتاب لکھی " الدر النضید) اور معیار الحق (ص: 410) بھی وسیلہ کے جواز کے قائل ہے۔ اور اس طرح نواب صدیق حسن خان صاحب بھی۔ (لغات الحدیث، 27/4)

وسیلہ کی حدیث کو امام حاکم نے مستدرک میں سمودی نے خلاصۃ الوفاء میں، تاج الدین سُبکی شفاء السقام میں اور ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ: لولاک لما خلقت الافلاک

اگر حضور نہ ہوتے تو یہ کائنات پیدا نہ ہوتی، والی روایت لفظ کے اعتبار سے موجود ہے لیکن معنا بالکل صحیح ہے۔ جس طرح "اصحابی کالنجوم" لفظا موضوع ہے معنا صحیح ہے مسلم شریف کی ایک روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے (مرقاۃ شرح مشکوۃ)

مسنون درود یا دعاء کے علاوہ سلف صالحین کے درود یا مجرب دعاؤں کو بھی ہم پڑھ سکتے ہیں، چنانچہ علامہ ابن القیمؒ کے جلاء الافہام اور علامہ سخاوی نے القول البدیع میں ایسے درود اور دعائیں نقل فرمائی ہیں، چنانچہ اہل حدیث عالم دین بستوی صاحب فرماتے ہیں کہ " امام بیہقی نے مناقب میں اور تیمی نے ترغیب میں بوالحسن شافعی کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ پاک نبی ﷺ کو ---- نے خواب میں کہا ہے کہ امام شافعی آپ پر یہ درود پڑھتے تھے " صلی اللہ علی محمد کلما ذکرہ الذاکرین وغفل عن ذکرہ الغافلون وجل وثناءک"۔ تو آپ نے ان کو کیا بدلہ دیا تو ارشاد ہوا کہ قیامت میں ان سے حساب کتاب نہ ہوگا (اسلامی خطباب، 237/2)

اور ملا علی قاری نے اسی درود کو الحزب الاعظم میں لکھا ہے، اور عظیم اہل حدیث مؤرخ بھٹی صاحب فرماتے ہیں: کہ وظیفہ اور دعا کے تین قسمیں ہیں (1) قرآن میں (2) حدیث میں (3) بزرگان دین سے منقول جو مجرب ہیں سب پر ہمارے بزرگ علما کا عمل ہیں۔ (نقوش عظمت رفتہ 24)

اس طرح فتاوی اہل حدیث میں ہے کہ مسلم شریف میں ہے کہ ابن عمرؓ لبیک کے سنت عمل میں اپنی طرف سے یہ اضافہ فرماتے تھے " لبیک وسعدیک والخیر بیدک والرغباء الیک والعمل"، بہت مواضع میں ثابت ہے۔ اسی طرح ایک صحابی نے از خود ربنا ولک الحمد کے بعد " حمدا کثیرا طیبا مبارکا فیہ" کا اضافہ فرمایا تو حضور ﷺ نے فرمایا تیس سے زائد فرشتے اس کے لکھنے کے لئے آتے ہیں، (ابو داؤد، نسائی، ترمذی، فتاوی علمائے اہل حدیث 57/1) یہی بات حافظ نعیم ملتانی نے ارشاد فرمائی ہے۔ (بھینس کی قربانی کا تحقیقی جائزہ، ص: 76، طبع دوم) یہی بات لغات الحدیث (91/2) میں بھی ہے۔

عالم الغیب ہے ذاتی کلی اور اگر کسی والی پر کبھی کوئی چیز یا اپنی موت یا کل کی خبر واضح ہو جائے، اور کبھی طویل مسافت مختصر وقت میں طے کریں تو کشف اور کرامت ہے، اور یہ ایک جزئی واقعہ ہے ہمیشہ کا سلسلہ نہیں ہے، چنانچہ کشف اور کرامت ولی کے اختیار میں نہیں ہوتا اور نہ ہمیشہ ہوتا ہے، نہ پہلے سے اس کو پتہ ہوتا ہے، ایسے افراد ولی اور ابدال ہوتے ہیں سب سنت کے پابند اور بدعت کے خلاف ہوتے ہیں[1]۔

---

[1] **کشف اور کرامت:**

امت محمد یہ ﷺ کو یہ شرف حاصل ہے کہ اللہ تعالی اس امت کے نیک بندوں کے ہاتھوں پر خرق عادت امور ظاہر کرتے ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: کرامات کا ظہور امت محمد یہ کے ان افراد کے لئے جو حضور ﷺ کے ظاہری و باطنی طور پر متبع ہوتے ہیں۔

نیز فرماتے ہیں: "اللہ کے متقی بندے وہ ہیں جو محمد ﷺ کے اتباع کرتے ہیں، آپ ﷺ نے جس کا حکم دیا اس کو کرتے ہیں اور جس سے منع کیا اس سے رکتے ہیں۔ تو اللہ اپنے ملائکہ اور روح القدس سے ان کی تائید کرتا ہے اور ان کے دلوں میں اپنے انوار ڈالتا ہے، ان کے لئے کرامات ہوتی ہیں، ان سے اللہ اپنے متقی بندوں کو نوازتا ہے اور ان کو اعزاز بخشتا ہے" (ایضاص: 274)

نیز فرماتے ہیں: "اولیاء اللہ کے کرامات آنحضور ﷺ کی اتباع کی برکت کی وجہ سے ظاہر ہوتی ہیں، یہ کرامات حقیقت میں آنحضور ﷺ کے معجزات ہی کا حصہ ہیں۔ ایضاص: 275)

غرض اولیاء کی کرامات اپنی جگہ برحق ہیں جس طرح معجزات کا انکار کرنا گمراہی ہے اور بددینی اور الحاد کی علامت ہے، اسی طرح الیاء کے کرامات کا انکار کرنا بھی بددینی و گمراہی اور الحاد ہے۔

معجزات اور کرامات میں صرف اتناہی فرق ہے کہ خوارق عادت امور اگر انبیاء سے ظاہر ہوں تو معجزہ کہلاتے ہیں، اور اگر اولیاء سے ظاہر ہوں تو انہیں کرامات کا نام دیا جاتا ہے، دونوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے، صرف نسبت بدلنے سے نام کا فرق ہو جاتا ہے۔

صحابہ و تابعین اور بزرگوں سے کرامات کے بے شمار واقعات ہیں، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ان میں سے کچھ کا ذکر کیا ہے مثلا:

اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

کہ وہ جب سورۃ کہف پڑھتے تو آسمان سے چھتری نما بادل پیدا ہو جاتا اور اس میں چراغوں کی طرح روشنی ہوتی، یہ فرشتے ہوتے جو ان کے تلاوت سننے کے لئے آسمان سے تشریف لاتے۔

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کو فرشتے سلام کرتے تھے۔

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ جس پلیٹ میں کھانا کھاتے تو پلیٹ تسبیح کرتا یا پلیٹ میں جو کھانا ہوتا وہ تسبیح کرتا۔

حضرت عباد بن بشر اور اسید بن حضیر ایک دفعہ اندھیری رات میں آپ ﷺ کے پاس سے اپنے گھر جارہے تھے تو ان کے لئے روشنی پیدا ہوگئی اور جب ایک موڑ پر دونوں الگ ہوئے تو دونوں کے ساتھ الگ الگ روشنی ہوگئی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے تین مہانوں کو اپنے گھر لے گئے، کھانا کم تھا چراغ کو حیلہ سے بجھادیا، مہماتوں نے آسودہ ہو کر کھانا کھایا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کچھ نہیں کھایا، بعد میں دیکھا تو بچا ہوا کھانا پہلے سے زیادہ تھا پھر اس کھانے کو آپ ﷺ کے بہت سے اصحاب نے کھایا اور سب آسودہ ہوئے۔

حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا ہجرت کے سفر پر تھیں، ان کے ساتھ کھانا پانی کچھ نہیں تھا، روزہ سے تھیں پیاس کی شدت سے پریشان حال تھیں۔ جب افطار کا وقت ہوا تو اپنے سر پر کچھ آہٹ محسوس کی سر اٹھایا تو دیکھا کہ ایک ڈول لٹک رہا ہے اس سے پانی پیا، اور اس ڈول کی برکت کا اثر یہ تھا کہ ساری زندگی انہیں پیاس ہی نہیں لگی۔

حضور ﷺ کے غلام حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ راستہ بھول گئے، راستہ میں ایک شیر ملا انہوں نے شیر سے کہا کہ وہ حضور ﷺ کے قاصد ہیں تو شیر نے ان کو صحیح راستہ کی راہنمائی کردی۔

حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ کا حال یہ تھا کہ جب وہ کسی بات پر قسم کھالیتے تھے تو اللہ ان کی قسم کو پورا کرتا تھا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ قلعہ کا محاصرہ کیا قلعہ والوں نے کہا ہم قلعہ کو تمہارے سپرد اس وقت کریں گے جب تم یہ زہر پی لو تو انہوں نے پی لی اور انہیں کچھ نہیں ہوا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی کے منبر سے یاساریۃ الجبل کی آواز لگائی اور حضرت ساریہ کو یہ آواز شام میں سنائی دی۔

حضرت زبیرہ رضی اللہ عنہا کو اسلام لانے کی وجہ سے مشرکین ستاتے تھے، مشرکین کے ستانے سے ان کی آنکھ کی روشنی جاتی رہی اور وہ اندھے ہوگئیں، مشرکین نے کہا کہ تمہاری آنکھ کی روشنی ہمارے معبود لات وعزی نے ختم کردی ہے، حضرت زبیرہ نے کہا ہر گز نہیں، اور اللہ نے ان اس ایمان ویقین سے بھرے انکار پر ان کی آنکھ کی روشنی لوٹادی۔

اروی بنت حکم نے حضرت سعید بن زید کے اوپر ایک جھوٹا الزام لگایا، حضرت سعید نے اس کے لئے بددعا کردی کہ اللہ اس کو اندھا کردے اور اس کی زمین ہی میں تو اس کو موت دے، چنانچہ اروی اندھی ہوگئی، اور خود اپنی زمین کی ایک گڑھے میں گر کر مرگئی۔

علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ رسول اکرم ﷺ کی طرف سے بحرین کے گورنر تھے، بڑے مستجاب الدعوات تھے، ان الفاظ سے دعامانگتے : یاعلیم، یاحلیم، یاعلی، یاعظیم اور ان کی دعائیں قبول ہوتیں، ایک دفعہ لوگوں کو پینے اور وضو کے لئے پانی نہیں مل رہا تھا، چنانچہ انہوں نے دعا کی اور پانی برس گیا۔

صحابہ کرام سمندر پار کرنا چاہتے ہیں، سمندر کا پار کرنا مشکل تھا، حضرت علاء نے دعا کی تمام اصحاب رسول سمندر میں گھوڑوں کے ساتھ کود گئے اور سمندر پار کرلیا اور گھوڑوں کی زین تک نہیں بھیگی۔

اپنی لئے انہوں نے دعا کی مرنے کے بعد ان کا بدن لوگ نہ دیکھیں قبر میں جب ان کو اتارا گیا تو ان کا بدن قبر سے غائب تھا۔

حضرت ابو مسلم خولانی اپنے اصحاب کو لے کر دجلہ چلتے ہوئے پار کرگئے،

اسود عنسی جو نبوت کا دعوی کرتا تھا اس نے ابو مسلم خولانی سے اپنی رسالت کا اقرار لینا چاہا انہوں نے انکار کر دیا، اس نے کہا تم محمد کو اللہ رسول سمجھتے ہو اس نے کہا ہاں میں آپ ﷺ کے رسول ہونے کی گواہی دیتا ہوں، اس پر اسے غصہ آیا اور ان کو آگ میں ڈال دیا لوگوں نے دیکھا کہ آگ میں یہ کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں، اور آگ ان کے لئے برد وسلام بن گئی ہے۔

انہیں کا وقعہ ہے کہ خادمہ نے ان کے کھانے میں زہر ملا دیا، انہوں نے کھانا کھالیا اور زہر نے اثر نہیں کیا۔

انہیں کا وقعہ ہے کہ ان کی بیوی کو ایک عورت نے ان خلاف بھڑکایا تو انہوں نے اس عورت کے لئے بد دعا کر دی وہ اندھی ہو گئی، اس نے آکر ان سے معافی مانگی اور توبہ کی تو دوبارہ دعا کی اور اس کی آنکھ واپس آگئی۔

حضرت عامر بن عبد قیس اپنا وظیفہ دو ہزار درہم اپنی آستین میں لے کر نکلتے، راستہ میں جو سائل ملتا اس کو بلا گنے اس میں سے دیتے جاتے پھر جب گھر آکر اس کو شمار کرتے تو وہ جوں کا توں رہتا۔

انہوں نے اللہ سے دعا کی تھی کہ جاڑے کے دنوں میں ان کو وضو کرنے کی سہولت رہے تو ان کے پاس وضو کا پانی لایا جاتا اور سخت سردی میں اس میں سے گرم گرم بھاپ نکلتی۔

حسن بصری رحمہ اللہ کو حجاج تلاش کر رہا تھا وہ انہیں سزا دینا چاہتا تھا ان کے سپاہی چھ دفعہ ان کے گھر گئے انہوں نے اللہ سے دعا کی تھی کہ وہ ان سپاہیوں کو نظر نہ آئیں، چنانچہ وہ موجود رہتے مگر حجاج کے سپاہی ان کو دیکھ نہ پاتے۔

انہیں کا وقعہ ہے کہ ایک خارجی ان کو ستاتا تھا انہوں نے بد دعا کی وہ اسی وقت گرا اور مر گیا۔

صلۃ بن اشیم ایک بزرگ ہیں وہ جہاد میں تھے ان کا گھوڑا مر گیا، انہوں نے دعا کی اور ان کا مرا گھوڑا زندہ ہو گیا۔

ایک دفعہ انہیں بھوک لگی اور کھانے کو کچھ نہیں تھا، انہوں نے دعا کی تو ان کے پیچھے تر و تازہ کھجور ریشمی کپڑے میں لپٹا ہوا خوشہ گرا، انہوں نے اسے کھایا اور شکم سیری حاصل کی اور یہ بابرکت کپڑا ان کے بیوی کے پاس بہت دنوں تک رہا۔

واقعہ حرہ میں مسجد نبوی میں کئی دنوں تک نماز او راذان نہیں ہوئی حضرت سعید بن مسیب تنہا مسجد میں ہوتے اور نماز کے وقت حضور اکرم ﷺ کی قبر سے انہیں اذان کی آواز سنائی دیتی۔

قبیلہ نخع کا ایک آدمی اپنے ساتھیوں کے ساتھ سفر کر رہا تھا، راستہ میں اس گدھا مر گیا، اس نے دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ سے دعا کی اور اس کا گدھا زندہ ہو گیا۔

اویس قرنی کا جب انتقال ہوا تو ان کے کپڑوں میں تیار شدہ کفن بھی ملا، حالانکہ یہ پہلے موجود نہیں تھا اور قبر بھی کھدی ملی قبر کو بھی پہلے کھودا نہیں گیا تھا۔

عمرو بن عقبہ بن فرقد گرمی کے زمانہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ آسمان بادل ظاہر ہوا اور ان کے سر پر چھتری بن گیا، یہ جانور چراتے اور ان کی حفاظت درندے کرتے۔

مطرف بن عبد اللہ جب گھر میں داخل ہوتے تو ان کے برتن بھی ان کے ساتھ تسبیح کرتے۔

عبد الواحد بن زید کو فالج کا اثر ہو گیا تھا، انہوں نے اللہ سے دعا کی تھی کہ وضو کے وقت ان کے اعضاء اصلی حالت پر ہو جایا کریں، چنانچہ جب وہ وضو کرتے تو ان کے اعضاء ٹھیک ہو جاتے اور وضو کے بعد پھر فالج زدہ ہو جاتے۔

ان کرامات کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "وھذا باب واسع "یعنی اس طرح کے واقعات بے شمار ہے۔ (ج: 11 ص:282)

آپ ان کرامات میں غور فرمائیں ہر طرح کی کرامتیں ہیں، اللہ والوں کی بد دعا سے مردہ کے زندہ ہونے کا وقعہ بھی ہے اور ان کے بد دعا سے کسی کے مرنے کا وقعہ بھی ہے، اللہ والوں کی دعا سے آنکھ کی روشنی واپس بھی آجاتی ہے، اور ان کے بد دعا سے آدمی اندھا بھی ہو جاتا ہے، دریا و سمندر میں بھی انسان اس طرح چلتا نظر آتا ہے کہ اس کے کپڑے بھی نہیں بھیگتے، اور ابو مسلم خولانی پر آگ اس طرح برد و سلام بن جاتی ہے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آگ گلزار بن گئی اور وہ آگ میں نماز پڑھتے نظر آتے ہیں، حضرت سعید بن مسیب کو اللہ کے رسول ﷺ کے قبر مبارک سے آذان کی آواز سنائی دیتی ہے، اور ایسے بھی اللہ والے نظر آتے ہیں کہ آسمان سے ان کے لئے رزق نازل ہوتا ہے۔

بزرگوں سے کرامات کا ظہور تواتر سے ثابت ہے، اس کا انکار کرنا مشاہدہ و محسوس چیز کا انکار کرنا ہے۔

اب اگر اس طرح کی کوئی کرامت ہمارے دارالعلوم کے اکابر اور بزرگوں سے ظاہر ہو جائے تو بعض کو اس پر تعجب کیوں ہو جاتا ہے۔

اور اگر حضرت نانوتوی کے ہاتھ پر یہ کرامت ظاہر ہو جائے کہ ان کی بد دعا سے ان کا کوئی دشمن مر جائے اور اس کا فائدہ یہ ہو کہ بہت سے گمراہ راہ حق پر آجائیں اور بد عقیدہ صحیح العقیدہ بن جائیں تو آخر ہمارے بعض دستوں کے پیشانی پر شکن کیوں پڑ جاتی ہے۔

غیر مقلد احباب کے اکابر میں بھی کچھ لوگ ایسے گزرے ہیں جو تقلید نہ کرنے کے باوجود اللہ والے تھے، ائمہ دین اور بزرگوں کا اکرام واحترام کرتے تھے، سنت کے پابند تھے، سلسلہ تصوف سے جڑے ہوئے تھے، ان کی زندگی پاکیزہ تھی، ان کے اخلاق اسلامی تھے، ان کی راتیں عبادت میں گزرتی تھیں، اور ان کی زبان پر اللہ کا نام رہتا تھا، حرام اور مشتبہات سے بچتے تھے، تقوی اور ورع میں ممتاز تھے، وہ اہلحدیث تھے، سنت کا اتباع ان کا مقصود تھا، تو اللہ والے اہلحدیث غیر مقلد مخلص علمائے کرام کے ہاتھوں پر بھی کرامات کا ظہور ہوتا تھا، اور ان کے کرامت کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔

مولانا عبد اللہ غزنوی مشہور بزرگ صوفی غیر مقلد اہل حدیث عالم تھے، انہوں ایک دفعہ اپنے شاگرد میاں غلام رسول سے غصہ میں فرمایا کہ مولوی رسول تو مولوی شدی محدث شدی عالم شدی واعظ شدی واللہ ہنوز مسلمان نہ شد، یعنی مولوی رسول تم مولوی بن گئے، محدث بن گئے، عالم بن گئے، واعظ بن گئے مگر خدا کی قسم ابھی مسلمان نہیں بنے، یہ کہنا تھا کہ مولوی غلام رسول میاں فرش پر گر گئے اور تڑپنے لگے، پھر مولانا عبد اللہ غزنوی نے ان سے کہا کہ بگو لا الہ الا اللہ یعنی لا الہ الا اللہ کہو، کہنا تھا کہ مسجد کے در و دیوار سے لا الہ الا اللہ کی آواز آنے لگی۔

مولانا غلام رسول صاحب قلعوی رحمہ اللہ کے ایک مرید فرماتے ہیں کہ میں غریب آدمی تھا میرے پاس پیسے نہیں تھے کہ دودھ گھی خرید کر کھا سکوں میرے پاس ایک بہت بڑی اور کمزور بھینس تھیں جو گابھن نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے مولانا سے کہا کہ دعا کریں کہ خدا کوئی دودھ گھی کا انتظام کر دے، مولانا نے کہا کہ تمہاری وہی بھینس گابھن ہو چکی ہے اور عنقریب بچہ دینے والی ہے،

وہ مدت تک دودھ دیتی رہے گی، اس مرید کا بیان ہے کہ سچ مچ وہ بھینس تھوڑی ہی دنوں میں دودھ دینے لگی اور قریبا گیارہ مرتبہ وہ گابھن ہوئی اور اس نے بچہ دیا اور ہمیں بہت دنوں تک دودھ ملتا رہا[1]۔

اگر کسی صاحب کو اس قسم کی کرامتوں سے انکار ہے تو رہا کرے، ان کی انکار سے حقیقت تو نہیں بدل جائے گی، بزرگوں کی کرامتیں برحق ہیں اور برحق رہیں گی کسی کے انکار سے سورج کی روشنی مدھم نہیں پڑتی۔

البتہ کرامتوں کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان کو کائنات میں تصرف کا اختیار حاصل ہو گیا ہے، جیسا کہ بعض گمراہ فرقوں کا خیال ہے، اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ کرامت کا ظہور بزرگوں سے ہوتا ہے مگر وہ فعل خدا کا ہوتا ہے۔ بزرگوں کا صرف اس سے ظاہری تعلق ہوتا ہے۔

خواب کے ذریعے سے بھی مسلمانوں کی رہنمائی ہوتی ہے، جس طرح ابن عباسؓ کے مشکوۃ میں روایت ہے کہ انہوں نے حسینؓ کی شہادت پر عجیب خواب دیکھا۔ اور حافظ زبیر علی زئی فرماتے ہیں کہ یہ خواب ایک مثال ہے کہ حضرت حسین مظلومانہ شہید کئے گئے (علم مقالات 418/1)۔

کشف کا ثبوت مسلم شریف (268/2) میں ہے کہ حضرت موسی علیہ السلام حضور ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے نظر آئے، اور بخاری شریف ہے کہ جنت اور دوزخ حضور ﷺ پر مکشوف ہوئے غیر مقلد احباب اپنے بزرگ قاضی سلیمان پوریؒ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ آپ صاحب کشف ہے اور آپ کو اپنی موت کا علم پہلے سے ہو چکا تھا (کرمات اہل حدیث، ص: 22)

بڑے بزرگ ولی اللہ صاحب کے متعلق اہل حدیث بزرگ فرماتے ہیں آپ پر اسرار علم منکشف ہوتے تھے۔ (تذکرہ اہل صدق، صادق پور، ص: 59)

اور ایک اور کے بارے میں اسی کتاب میں فرماتے ہیں: "امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو کسی کے وضو کے دوران ایسا لگتا کہ گناہ جڑ رہے ہیں، یہ کیسے نظر آتے تھے؟ جواب اس اشکال کا یہ ہے کہ کرامت ہے، جیسا کہ حضرت مریم علیہا السلام کے پاس اللہ کی جانب سے پھل آتے تھے۔ (تفصیل احسن البیان، ص: 142، مولانا صلاح الدین یوسف اہل حدیث)

اور کیا پلک جھپکنے کی ہی مدت میں کتاب کا علم رکھنے والا ایک شخص بلقیس کا تخت لے آیا (احسن البیان) اور اکثر مفسرین کا قول ہیں کہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا وزیر عاصف بن برخیہ تھا (فواد سلفیہ اشرف الحواشی، ج: 1/ص: 53)

اور بعد کے لوگوں میں پہلوں سے کرات زیادہ ظاہر ہوئے اور تیمیہ فرماتے تھے کہ تابعین کے کرامات صحابہ سے زیادہ ہیں۔ صحابہ نے کرانہ جمادات کا کلام سنا چنانچہ فرماتے ہیں کہ جو کھانا کھایا جاتا تھا ہم اس کے تسبیح سنتے تھے اور کیا بخاری شریف کے حدیث کے مطابق کھجور کا تنہ جس پر حضور ﷺ خطبے دوران ٹیک لگاتے تھے نہیں روئے! جب نئے ممبر پر حضور ﷺ بیٹھے۔

ابن حجر عسقلانی بھی فرماتے ہیں کہ ابو درداء اور سلیمانؓ نے اس برتن کی تسبیح سنی جس میں وہ کھانا کھا رہے تھے (فتح الباری، 734/6) اور حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ مکہ کے درخت اور پہاڑ حضور ﷺ پر درود پڑھتے تھے (مشکوۃ)

متفقہ دستاویز "المہند" جو اکابر علمائے کے عقائد کے لئے بمنزلہ آئینہ کے جاننے پہچاننے کے لئے سب سے زیادہ مستند و ثقہ ہے اس کے شروع میں واضح طور پر لکھا ہے:

"اس سے پہلے جاننا کہ ہم اور ہمارے مشائخ اور ہماری ساری جماعت بحمد اللہ تعالیٰ فروعات میں مقلد ہیں مقتدائے خلق، امام ہمام، امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رحمہ اللہ تعالیٰ کے اور اصول واعتقادات میں پیروکار ہیں امام ابو الحسن اشعریؒ اور امام ابو منصور ماتریدیؒ کے الخ۔ (ص: 3)

" دوسری بات یہ ہے کہ ہم دین کے بارے میں کوئی بات ایسی نہیں کہتے جس پر کوئی دلیل نہ ہو قرآن مجید کی یا سنت کی یا اجماع امت یا قول کسی امام کا۔ (ص: 3)

لیکن ہم کو بدنام کرنے کے لئے بعض حضرات کا طرز استدلال یہ ہے کہ وہ حضرات ایک عنوان قائم کرتے ہیں، اس کے تحت اکثر وعظ، سوانح یا حکایات کی کسی کتاب سے کوئی واقعہ لیتے ہیں، اس واقعہ سے از خود ایک مشرکانہ عقیدہ کشید کرکے علمائے کرام کے سر تھوپتے ہیں اور پھر اس خود ساختہ عقیدہ کے خلاف سلفی علما کے فتاویٰ مسلسل نقل کرتے چلے جاتے ہیں، مثال کے طور پر دیکھیے:

حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کا یہ واقعہ " سوانح قاسمی مؤلفہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ " کے حاشیہ سے نقل کیا ہے کہ کچھ لوگوں نے حضرت کے ساتھ استہزاء اور تمسخر کے طور پر ایک زندہ شخص کا جنازہ پڑھانے کا اصرار کیا حضرت نانوتویؒ نے اصرار کے بعد منظور فرمالیا اور نماز ادا کردی، نماز کے بعد دیکھا گیا تو وہ واقعۃً مردہ تھا (ملخصا) یہ ایک کرامت تھی حضرت نانوتویؒ کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں تھا اور کرامت میں صاحب کرامت کا کوئی دخل ہوا ہی نہیں کرتا، مگر مؤلف " الدیوبندیۃ " نے اول تو خیانت کی کہ اس جملہ کا ترجمہ ہی نہیں کیا جس میں اس کے کرامت ہونے کی تصریح تھی اور واقعہ کی صحیح نوعیت واضح ہو رہی تھی، دوسرے اس واقعہ سے یہ عقیدہ اخذ کیا کہ " انسان زندگی اور موت پر قادر ہے" (نعوذ باللہ من ذلک) پھر اس عقیدے کو علمائے دیوبند کے سر منڈھ دیا اور عنوان قائم کیا" " مشائخ علمائے دیوبند زندگی اور موت کے مالک ہیں " اور دیوبندی حضرات اپنے مشائخ کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ موت اور زندگی پر قادر ہیں مؤلف " الدیوبندیۃ" کا اس واقعہ سے یہ عقیدہ اخذ کرنا کہ انسان زندگی اور موت پر قادر ہے قطعاً غلط ہے اور اس عقیدے کو ہمارے علما حضرات کی طرف منسوب کرنا قطعاً افتراء اور بہتان ہے، اس وقعہ میں جو کچھ ہوا بطور کرامت کے ہوا اور کرامت میں کسی صاحب کرامت کے اختیار وقدرت کو دخل نہیں ہوتا۔

عمدۃ المحققین العلامہ السید محمود آلوسی بغدادیؒ حضرت مریم علیہا السلام کے واقعہ کے ذیل میں فرماتے ہیں:

واستدل بالاية على جواز كرامة الاولياء، لان مريم لانبوة لها على المشهور، وهذا ماذهب اليه اهل السنة والشيعة، وخالف في ذلك المعتزلة . (روح المعانی، ج: 3/ص: 14)

ولی کی کرامت حق ہے، مگر ولی کے اختیار اور کسب کا اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا، اور نہ کرامت ولی کا فعل ہوتا ہے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کا فعل ہوتا ہے جو ولی کے ہاتھ پر ان کی تکریم کی بنا پر اللہ تعالیٰ صادر فرماتے ہیں جیسا کہ حضرت مریم علیہا السلام کے جواب " قالت ہو من عند اللہ " سے بھی واضح ہو رہا ہے۔ جب یہ ثابت ہے کہ کرامات اور خوارق عادات امور کے صدور میں ولی کے اختیار اور کسب کو دخل نہیں ہوتا تو پھر کرامات وخوارق عادات امور کے صدور سے اس عقیدے کا اختراع کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ جو فعل ولی سے صادر ہوا ہے وہ ولی کے اختیار میں ہے تو کسی اور کے لئے اس کے اختیاری ہونے کا عقیدہ رکھنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ اور نہ اہل سنت والجماعت میں سے یہ عقیدہ کسی کا ہے، تمام اہل والجماعت کرامت کے غیر اختیاری ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں، اور یہ تو بالکل غلط

طرز استدلال ہے کہ کسی والی کے کرامت کے واقعہ جزئیہ سے کلیہ بنا کر اس کو بطور عقیدہ کلیہ کے پیش کیا جائے، البتہ اگر کسی شخص کا یہ عقیدہ ہو کہ ولی اپنے قصد واختیار سے کرامت صادر کرتا ہے تو پھر چونکہ اس عقیدہ میں ولی کے اختیار و قصد کو تسلیم کر لیا گیا ہے، اور کرامات خوارق عادات امور سے متعلق ہوتی ہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس شخص کا یہ عقیدہ ہے کہ خارق امور کا صدور بھی ولی کے اختیار میں ہے اور اس مثال میں بھی یہ کہنے کی گنجائش نکل سکتی ہے کہ موت کا وقوع اختیار سے ہوا اور موت اختیار میں تھیں، لیکن پھر بھی ایک واقعہ جزئیہ سے کلیہ کا استنباط کر لینا اور اس واقعہ جزئیہ سے کلیہ بنالینا کہ ہر شخص کی موت قبضہ میں ہے کسی طرح بھی صحیح طریقہ استدلال نہیں ہے۔

دل کی بات کا پتہ کشف سے چلا:

"التاج المکلل میں شیخ عبد القادر جیلانی کے بارے میں اہل حدیث عالم دین نواب صدیق حسن خان فرماتے ہیں کہ " ان کو آدمی کے دل کی بات کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔

جب تقوی سے دل آباد ہوتا ہے تو آدمی کے لئے معاملات بالکل واضح اور کھل جاتے ہیں[1]۔

نیز فرماتے ہیں: جب دل میں ایمان قوی ہو جاتا ہے تو اس کا کشف بھی بڑھ جاتا ہے اور چیزیں اس کے لئے کھل جاتی ہیں وہ حقیقتوں کو پالیتا ہے اور جب ایمان کمزور ہوتا ہے تو دل کا کشف بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ (ایضا)

نیز فرماتے ہیں: جب بندوں کے لئے اس کے ایمان کی قوت کے مطابق عالم کون یعنی دنیا وآخرت کے امور کبھی یقین اور کبھی ظن کی شکل میں کھل جاتے ہیں تو دینی امور کا کشف تو ان کو بدرجہ اولی آسان ہے۔ (ص: 46ایضا)

اور اب یہ آخری بات بھی اسی فتاوی سے سن لیں، فرماتے ہیں:

بہت سے اہل ایمان اور اہل کشف کے دل میں اللہ یہ ڈالتا ہے کہ یہ کھانا حرام ہے، یہ آدمی کافر ہے، یہ آدمی فاسق ہے، یہ آدمی دیوث ہے، یہ آدمی لوطی ہے، یہ آدمی شرابی ہے، یہ آدمی گویا ہے، یہ آدمی جھوٹا ہے ان باتوں کو بتلانے کے لئے اس کے پاس کوئی ظاہری اور کھلی دلیل نہیں ہوتی ہے، محض اللہ کے دل میں ڈالنے سے اللہ والے ان باتوں سے باخبر ہوتے ہیں۔ (ص: 47ایضا)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے ان عبارتوں کا واضح مطلب یہ ہے کہ عام آدمی کی قوت علم اور ہے اور خاصان خدا کی قوت علم اور ہے، اور عام آدمی کے وسائل علم و معرفت اتنے نہیں ہیں جتنے سے مقربان بارگاہ الہی کو نوازا گیا ہے، عالم آدمی کو قوت ادراک صرف اسی عالم تک ہے جب کہ خاصان خدا اور اہل ایمان و تقوی کی حد ادراک اس عالم کو پار کرکے اس عالم تک بھی ہے۔ مگر اس کی وجہ سے ان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا کہ انہیں علم غیب حاصل ہے، یہ غیب داں ہیں، یہ جہالت اور بد دینی ہے عالم الغیب ذات صرف اللہ کی ہے اور تمام غیوب کا وہی جاننے والے ہے، اگر کسی کی قوت کشفیہ اور علمیہ میں ایمان و تقوی کی وجہ سے عالم لوگوں کے مقابلہ میں قوت پیدا ہو جائے اور اس کی وجہ سے وہ مانند دور بین ان چیزوں کا بھی مشاہدہ کرے جو عام نگاہوں سے او جھل ہیں تو اس کا نام غیب کا جاننا نہیں رکھا جائے گا ورنہ اس کی وجہ سے کوئی غیب داں ہوگا۔

بزرگوں سے کشف و کرامات کے واقعات کا منقول ہونا تواتر سے ثابت ہے، اور اہل صلاح و تقوی سے کشف و کرامت کا صادر ہونا عین ممکن ہے، تمام اہل سنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہے۔ اسی طرح ہمارے بزرگان کا معاملہ ہے، ان میں بھی اہل اصلاح اور

خدشہ 8:

آٹھواں خدشہ یہ ہوتا ہے کہ یہ تصوف کے قائل ہیں اور اولیاء کے سردار ابن القیم، ابن تیمیہ تصوف وحدۃ الوجود اور ابن عربی کے بڑے خلاف رہے ہیں اور تصوف کو دین میں اضافہ، بدعت اور

اہل تقوی او رکامل الایمان او ر اللہ کے مخلصین کی ایک جماعت ہر دور میں رہی ہے، او ران سے بھی سنت اللہ کے مطابق کشف وکرامت کے واقعات ظہور میں آئے ہیں ہمیں اس کا انکار نہیں، کشف وکرامت کے ان واقعات سے اللہ کے یہاں ان کا مقام ومرتبہ اور علو ومنزلت کا پتہ لگتا ہے، اوران کے اہل حق ہونے کی یہ بھی ایک بڑی دلیل ہے۔

خواب:

خواب یا بیداری میں حضور ﷺ کی زیارت اور خواب کا تذکرہ ابن حجر شافعی مکی نے بھی نقل کیا ہے اور یہ کرامت ہوتی ہے، چنانچہ فقہائے پاک وہند اہل حدیث کی کتاب (ج: 3/ص: 87) میں ہے جب سے حضور ﷺ کی زیارت خواب میں ہوئی ہے تو کرامات کا ظہور ہو رہا ہے۔

اور یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ سید احمد رفاعی جب سن 555ھ میں زیارت مدینہ کے لئے تشریف لے گئے تو قبر مبارک سے پاک نبی ﷺ کا ہاتھ مبارک باہر آیا اور انہوں نے اس کو چوما تو کیا حضور ﷺ نے حضرت موسیٰ کو قبر میں نہیں دیکھا تھا غیر مقلد احباب اس کو معجزہ سمجھتے ہیں (توضیح الاحکام، 20/3)

توہم کہتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ پورے کے پورے مبارک بدن کے ساتھ باہر تشریف لاکر معجزے کے طور پر نماز پڑھ سکتے ہیں، سرخ ٹیلے پر نماز نظر آتے ہیں تو ہاتھ کیوں نہیں نکل سکتا اور اس واقعہ کو تو علامہ سیوطی نے الحاوی للفتاوی میں نقل کیا ہے اور محمد بن سید نجدی وہابی بزرگ (اسنی المطالب، ص: 229) میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے اور دیکھو بیت المقدس میں حضور ﷺ سے انبیاء کی جماعت کرائی گئی تو اگر خواب میں نبی پاک ﷺ کی مدرسے کی بنیاد کی جگہ کی نشاندہی کرادے اور صبح وہی نشانات بھی موجود ہو تو اس پر اعتراض کردیا جاتا ہے، جناب وحید الزمان صاحب نے لغات الحدیث (223/2) میں تذکرہ اہل صادق پور از حضرت مولانا عبدالرحیم زبیر اہل حدیث (ص: 263) مولانا اسحاق بھٹی اہل حدیث فقہائے پاک وہند (442/3) مولانا غلام رسول اہل حدیث (سوانح حیات حضرت العلام مولانا غلام رسول (ص: 141) میں مولانا وحید الزمان رفع العجاجہ عن سنن ابن ماجہ (452/1) مولانا عبد السلام بستوی اہل حدیث (اسلامی خطبات، 325/1) حضرات نے اس طرح مکاشفوں اور اس طرح کے کرامتوں اور بیداری میں حضرت الیاسؑ کی زیارت کا تذکرہ کیا ہے۔

شیخ علی متقی کو حضور ﷺ نے خواب میں کہا کہ شراب پی لو اگرچہ تمام علما کا اتفاق ہیں کہ خواب میں نبی ﷺ کا حکم دینا قول سنت پر پیش کیا جائے گا، مولانا عطاء اللہ ڈھیروی اہل حدیث اور شاہ ولی اللہ صاحب نے البلاغ میں (ص: 186) پر اس خواب کا تذکرہ کیا ہے۔ اگرچہ یہ حکم دھمکی ہے یعنی شراب مت پیو اور مسئلہ خواب کا ہے زبیر علی زئی صاحب فرماتے ہیں خواب کی یہ بات ظاہر پر محمول نہیں ہوئی، بعض وقت تعبیر الگ سی ہوتی ہے، (علمی مقالات، 431/3) اور ماہنامہ الحدیث (37،65)

دین میں ایک زائد چیز ہے، خوب واضح رہے کہ علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن القیم بہت بڑے صوفی رہے ہیں تصوف پر ان کی کتابیں موجود ہیں " مدارج السالکین" اس موضوع پر اچھی کتاب ہے یہ حضرات شیخین جن کی قدر و عزت ہمارے علمائے کرام شروع سے کرتے چلے آرہے ہیں یہ حضرات فلاسفہ، اور متکلمین کے تصوف کے خلاف رہے ہیں نہ اصل تصوف کے، اصل تصوف کیا ہے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے ، شیخین تو تصوف کے بزرگوں کی جابجا تعریف کی ہے، جس چیز کو قرآن نے "تزکیہ" حدیث نے " احسان" کہا ہے اسی کو بزرگوں نے تصوف کہا ہے تاہم تصوف کی مخالفین کی یہ بات سو فیصد صحیح ہے کہ ننانوے فیصد تصوف پیری، مریدی، گدیاں اور گدی نشینی کی جگہیں شرک، کفر، بدعات، بے پردگی اور بے حیائی کے اڈے بنے ہوئے ہیں، بلکہ مزارات بھی اس کے ایسے اڈے بن گئے ہیں کہ یہی اڈے مجاہدین کی جاسوسی اور ان کو پکڑوانے کے ذرائع ہیں، حتی کہ امریکن تھنک ٹینک نے سروے کے بعد ایک عالم تنظیم بنائی صوفی ازم، جس میں پاک و ہند کے خاص خاص افراد پیر، فقیر شریک ہوئے اور کافروں، عیسائیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں میں عہدے بانٹے گئے کہ اگر ہم جہاد کو رد کر سکتے ہیں تو ہمارے لئے بہترین سہولت کار یہ دو نمبر پیر ہیں، اور ان کو پیسے بھی دیئے گئے اور ماہانہ امداد بھی شروع ہو گئی، گوگل پر سرچ کرکے صوفی ازم کو دیکھا بھی جاسکتا ہے[1]۔

---

[1] تصوف:

اسلام خدا کی طرف سے بندوں کے حق میں کامل ترین و جامع ترین پیام رحمت ہے، انسان کی ذہنی و عقلی، اخلاقی و معاشرتی، جسمانی و روحانی، انفرادی و اجتماعی تمام ضرورتوں کا کفیل اور ہر شعبہ حیات میں ترقیوں کا ضامن، خداری و خداشناسی کی تعلیم اس کا اصل مقصود تھی، اس پر اس نے خاص طور سے زور دیا اور اس کے ذرائع و وسائل اس نے اس جامعیت کے ساتھ بیان کیے کہ ان میں کسی قسم کے تغیر و ترمیم، تخفیف و اضافہ کی گنجائش نہ چھوڑی۔

مسلمانوں میں ابتداء سے ایک گروہ ایسا موجود جس نے تمام مقاصد دنیوی سے قطع نظر کر کے اپنا نصب العین محض یاد خدا و ذکر الہی کو رکھا اور صدق و صفا و سلوک و احسان کے مختلف طریقوں پر عامل رہا۔

شروع شروع یہ گروہ دوسرے ناموں سے ملقب رہا، ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد رفتہ رفتہ اس کے مسلک کا نام مسلک "تصوف" پڑ گیا اور یہ گروہ "گروہ صوفیہ" کہلانے لگا۔

اصطلاح "تصوف" کب سے رائج ہوئی اس بحث کا یہاں موقع نہیں، نہ اس لفظ کے اشتقاق اور تحقیق لغوی کو اس وقت بیان کرنا مقصود ہے۔ یہاں کہنا صرف یہ ہے کہ اس گروہ کے اکابر قدیم پہلے مسلمان تھے، پھر صوفی، وہ تصوف کو اسلام کے مقابل ایک جداگانہ مسلک کی حیثیت سے نہیں لاتے تھے، بلکہ اسلام کے ماتحت اسی کی پاکیزہ ترین صورت کو کہتے تھے وہ اپنے اسلام کو، اپنے تصوف پر مقدم رکھتے تھے اور تصوف کو محض اس لئے عزیز و محبوب رکھتے تھے کہ وہ ان کی نظر میں اسلام کی خالص ترین و پاکیزہ ترین تعبیر تھی۔

اکابر صوفیہ رحمہم اللہ کے نزدیک تصوف کا مفہوم محض اس قدر تھا کہ اتباع کتاب و سنت میں انتہائی سعی کی جائے، اسوہ رسول اللہ ﷺ کو دلیل راہ رکھا جائے، اوامر و نواہی کی تعمیل کی جائے، طاعات و عبادات کو مقصود حیات سمجھا جائے، قلب کو محبت و تعلق ماسوا سے الگ کیا جائے، نفس کو خشیت الٰہی سے مغلوب کیا جائے اور صفائے معاملات و تزکیہ باطن میں جہد و سعی کا کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ ہونے پائے۔

حضرت شیخ جیلانیؒ بلکہ ان کے مرید باختصاص اور بانی سلسلہ سہروردیہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی تک کی تصانیف میں یہ اسلامی عنصر قائم اور یہی رنگ غالب ہے، اس زمانہ کے بعد شیخ ابن عربی کے اثر سے نظام تصوف میں فلسفیانہ عنصر کا غلبہ حاصل ہونے لگا، اور ابن القیم اور ابن تیمیہ اس فلسفیانہ تصوف کے سخت مخالف تھے جس پر بحث آئیگی، وحدت وجود وغیرہ کے مسائل پیدا ہونے لگے اور فارسی شاعری کے اثر سے ان تخیلات کو اور تقویت ہوتی گئی، چنانچہ ملا جامی کی "لوائح" ایک اچھی خاصی فلسفیانہ تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے، تاہم نویں صدی کا یہ تصوف بھی اگرچہ ابتدائی صدیوں کے تصوف سے بہت کچھ منحرف ہو چکا تھا، ان رسم پرستیوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا جس پر آج اکثر خانقاہوں اور درگاہوں میں تصوف کا اطلاق ہوتا ہے۔

تصوف کی موجودہ مسخ شدہ شکل یونانی اوہام، ایرانی تخیلات، ہندی مراسم اور دیگر غیر اسلامی عناصر کا ایک معجون مرکب ہے جس کے صرف بعض اجزاء تو اسلامی کہے جا سکتے ہیں اور وہ بھی بڑی تلاش و دیدہ ریزی کے بعد نظر آتے ہیں، حاشا ثم حاشا اسلامی تصوف نہیں، بلکہ موجودہ خانقاہیں اور گدیاں تو

شرک، بدعت، بے پردگی، بے حیائی اور کاروبار کے اڈے بن چکے ہیں یہ دین کی روحانیت کیا لائیں گے یہ تو دین دشمن اور دین کو بدنام کرنے کی اماجگاہیں ہیں، اسلامی تصوف وہ تھا جو خود حضور ﷺ کا تھا اور ابو بکر صدیق، حضرت علیؓ، حضرت سلمانؓ، اور حضرت ابوذرؓ تھا جس کی تعلیم جنید بغدادی اور رابعہ بصری نے دی ہے: جس کی ہدایت شیخ جیلانی اور شیخ سہروردی اور خواجہ اجمیری محبوب دہلوی خواجہ نقشبندی اور مجدد سرہندی کرتے رہیں، جس کی دعوت اس دور آخر میں شاہ ولی اللہ کی زبان قلم دیتی رہی۔

خواجہ معین الدین اجمیری سلسلہ چشتیہ کے مسلم مقتدائے بزرگ گزرے ہیں ملفوظات مبارک کا مجموعہ " دلیل العارفین" کے نام سے خواجہ قطب الدین بختیار کا فراہم کیا ہوا شائع ہو چکا ہے، رسالہ مذکورہ اول سے آخر تک نماز وعبادات کی تاکید واتباع سنت رسول کے فضائل سے لبریز ہے، وضو وغیرہ کے بعض معمولی سنن کے پابندی پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ آج اکثروں کے فرائض میں اس کا نصف اہتمام بھی نصیب نہیں اور اس باب میں اس سے بھی زیادہ قابل ذکر بانی سلسلہ عالیہ قادریہ محبوب سبحانی حضرت شیخ جیلانی کی کتاب " غنیۃ الطالبین" ہے جو شروع سے آخر تک بجائے کسی درویش وصوفی کے ایک ٹھیٹھ فقیہ اور عالم متشرع کی فقہی تالیف نظر آتی ہے، اور اہل حدیث حضرات نے تولاہور سے اس کا بہترین ترجمہ چھاپا ہے۔

سلسلہ عالیہ چشتیہ کے ایک اور گوہر درخشاں خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی دہلویؒ تھے جن کے ملفوظات میں سب سے زیادہ معتبر رسالہ فوائد الفواد مرتبہ (امیر حسن علاء سنجری) اور حالات وسوانح میں رسالہ سیر الاولیاء (مرتبہ میر خورد دہلویؒ) موجود ہیں ان رسائل کے چند اقتباسات ملاحظہ ہو: "بندہ راپیش طلبید وفرمود کہ باید کہ مشغول پیوستہ بہ طاعت وعبادت باشی" (فوائد الفواد مطبوعہ نولکشور)

"حکایت جماعت متحیراں افتاد...... یکے از حاضران حکایت کرد کہ من وقتے جائے رسیدم وایں چنیں ہفت کس را دیدم دو چشم در آسماں داشتہ، شب وروز متحیر ماندہ، مگر آنکہ وقت نماز دری آمد، ایشاں نمازی گزاردند وباز ہمچناں متحیری ماندند، خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ آرے نبیاء معصوم اند واولیاء محفوظ ہمچنیں باشد کہ گفتی، اگرچہ شب ورز متحیر باشد، امانماز ایشاں فوت نہ شود۔ (ص: 144، ایضا)

"چوں عمر عزیز سلطان المشائخ بہ ہشتاد کشید، پنج وقت نماز بجہت جماعت از بلائے بام جماعت خانہ کہ عمارتے بس رفیع است فروز آمدے و بادرہ یشاں و عزیزں کہ در آں جمع ملکوت حاضر می شدند نماز گزاردے۔ (سیر الاولیاء، ص: 124)

اکابر چشتیہ کے ساری زندگیاں، صحیح تصوف اسلامی کا نمونہ تھیں، تفصیل کسی مناسب موقع پر بیان ہوگی۔

عہد نبوت سے تقریباً ایک ہزار سال گزرنے پر شیخ احمد سرہندیؒ پیدا ہوئے جنہوں نے نہ صرف سلسلہ نقشبندیہ بلکہ تمام سلاسل تصوف میں تجدید واصلاح کا صور اس بلند آہنگی کے ساتھ پھونکا کہ اس کی صدائے بازگشت آج تک دنیائے اسلام کے درودیوار سے آرہی ہے، شیخ موصوفؒ کے مکتوبات کے ضخیم دفتر ملک میں شائع ہوچکے ہیں۔ان میں شروع سے آخر تک مختلف اسلوبوں اور پیرایوں میں صرف ایک ہی دعوی کا تکرار، صرف ایک دعوت اور ادعا ہے اور وہ یہی ہے کہ صوفیہ کو عقائد واعمال ہر شے میں کتاب وسنت ہی کو اپنا دلیل راہ بنانا چاہیئے اور اس کے خلاف جس کسی کے بھی اقوال ہوں انہیں مردود سمجھنا چاہیئے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہو:

"بدانکہ از جملہ ضروریات طریق سالک اعتقاد صحیح است کہ علمائے اہل سنت آں را از کتاب وسنت وآثار سلف استنباط فرمودہ اند...... واگر بالفرض خلاف آں معانی مفہومہ بکشف والہام امرے ظاہر شود، آں را اعتبار نہ باید کرد، ازاں استعاذہ باید نمود (مکتوبات مجددی، حصہ:5/ص: 47، مطبوعہ امرتسری)

شریعت را صورتے است وحقیقتے صورتش آن ست کہ علماظواہر بہ بیان آں متکفل ان وحقیقتش آں کہ صوفیہ علیہ بآں ممتازاند (حصہ: 3/ص: 57)

آنچہ برما فقیراں لازم است دوام زل است وافتقار وانکسار تضرع والتجا وادائے وظائف عبودیت ومحافظت حدود شرعیہ ومتابعت سنت سنیہ (حصہ: 3/ص: 56)

"ولایت را درجات اند بعضہا فوق بعض، زیرا کہ بر قدم ہر نبی ولایت است مخصوص بآں واقصائے درجات آں ہماں درجہ ایست کہ بر قدم پیغمبر است.......وازیں مقام عزیز الوجود نصیبہ کامل وحظ وافر حاصل است مہر کمل تابعان آں سرور ماعلیہ الصلوۃ والسلام پس لازم گیرید متابعت آں حضرت را ﷺ اگر شمایاں بتحصیل ایں دولت قصوی وتکمیل ایں درجہ علیا متوجہ اید (حصہ اول، ص: 47)

محمد رسول اللہ محبوب رب العالمین است ، ہرچیز کہ خوب مرغوب است از برائے مطلوب و محبوب است، لہذا حق سبحانہ تعالی در کلام مجید خود می فرماید، انک لعلی خلق عظیم، ونیز می

فرماید تعالی وتقدس " انک لمن المرسلین علی صراط مستقیم" ونیز فرمودہ تعالی وتقدس " ان ہذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولاتتبعوا السبل" اورا علیہ الصلوۃ والسلام صراط مستقیم خواندہ وماسوائے اور داخل سبل گردانیدہ واتباع آں منع فرمودہ......... باطن متمم ظاہرات ومکمل آں سر موئے بایکدگر مخالفت ندارد .... پس سالکان سبل طریقت وحقیقت رااگر دراثنائے راہ اموریکہ بہ ظاہر باشریعت در جنگ اند ظاہر شوند وظاہر سازند مبنی بر سکر وقت وغلبہ حال است ،اگرازآں مقام گزرانند وبہ صحو آرند، آں منافات بالکیہ مرتفع می شود وآں علوم متضادہ بہ تمام ہبا منثوری گردند" ۔ (ایضا، حصہ: 2/ص: 302)

مکتوبات مجددی کی ایک ایک سطر اسی تعلیم محمدی سے لبریز ہے ،اور آخر میں یہی دعوت شاہ ولی اللہؒ دہلوی نے اپنی مختلف تصنیفات " وصایا" القول الجمیل" حجۃ اللہ البالغہ " فوزالکبیر" وغیرہ کے ذریعہ سے پیش کی خدائے پاک وبرتر اس حقیر خدمت کو قبول فرمائے اور دور حاضر کے مسلمانوں کو صحیح اسلامی تصوف کے سمجھنے اور اس کے اختیار کرنے کی توفیق نصیب کرے ۔ (تصوف ،ازعبد الماجد درآبادی)

کیا تصوف دین میں اضافہ ہے؟

نہیں! "دین میں اضافہ " جب ہوتا ہے کہ جب مقصود اور امر شرعی بناکر کیا جائے ،لیکن اگر کسی دینی مقصد کے حل کرنے کے لئے کوئی نیا جائز طریقہ اختیار کیا جائے تو اس کو " دین میں اضافہ " نہیں کہا جائے گا اور نہ وہ بدعت ہوگا۔

فرمایا: بس سلوک کے جن اعمال واشغال پر آپ کو بدعت ہونے کا شبہ ہے ،ان سب کی نوعیت بھی یہی ہے ،ان میں سے کوئی چیز بھی مقصد سمجھ کر نہیں کی جاتی جس طرح 8 سال پڑھنا چھ چھ پیریڈز دورہ تفسیر تین روزہ کورسز مجلس روزہ کورسز ،بلکہ یہ سب نفس کے تزکیہ اور تحلیہ کے لئے کرایا جاتا ہے ،جو دین میں مقصود اور مامور بہ ہے ۔ مثلا یوں سمجھیے کہ اللہ تعالی کی محبت اور ہر وقت اس کا اور اس کی رضا کا دھیان، فکر رہنا اور اس کی طرف سے کسی بھی وقت غافل نہ ہونا، یہ کیفیتیں دین میں مطلوب ہیں ۔ اور قرآن وحدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بغیر ایمان اور اسلام کامل ہی نہیں ہوتا۔

مولانا اسماعیل شہید کی " صراط مستقیم" ہی کو دیکھیے کہ اس میں اسی قسم کی بدعات پر متنبہ کرنے کے لئے پورا ایک باب موجود ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے مکتوبات جلد سوم میں شیخ روز بہان بقلی کی کتاب " تبیین غلطات المتصوفہ " (یعنی بتکلف صوفی بننے والوں کے غلطیاں) کا ذکر موجود ہے جو اسی عنوان پر ہے (مکتوب ہشتاد و نہم)

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ "صراط مستقیم" میں تحریر فرماتے ہیں : "جاننا چاہیئے کہ اولیاء اللہ کے ہر طریقے میں مجاہدات ، ریاضیات ،اذکار ، اشغال اور مراقبات مقرر ہیں۔ ان امور میں سے ہر ایک طالب کے اندر ایک اثر پیدا کرتا ہے۔ جس کے سبب طالب کو عالم قدس سے ربط ہو جاتا ہے ،اسی کو صوفیہ کی اصطلاح میں نسبت کہتے ہیں" ۔ (ص: 165)

حضرت شہید رحمہ اللہ فرماتے ہیں : "حصول نسبت ولایت، سلوک راہ نبوت کو آسان کر دیتا ہے۔ اور جس کو نسبت ولایت حاصل ہوتی ہے، وہ نسبت نبوت کو تھوڑی محنت میں حاصل کر لیتا ہے" ۔ (صراط مستقیم، ص: 8)

"ایضاح الحق الصریح" میں مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ فرماتے ہیں : "صوفیہ کے نفع بخش اشغال کی حیثیت سے دوا و معالجہ کی ہے کہ بوقت ضرورت ان سے کام لے کر اور بعد کو پھر اپنے کام میں مشغول ہو"۔ (ص: 78) (یعنی یہ بطور علاج و تعلیم کے ہے سنت سمجھ کر نہیں ہے)

معالجے کے یہ طریقے حالات کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ "صراط مستقیم" میں ہے : "ہر وقت اور ہر قرن کے اشغال جدا ہوتے ہیں۔اس لئے ہر طریق کے محققین تجدید اشغال کی کوشش فرماتے رہتے ہیں" ۔ (ص: 7)

اسی کے ضمن میں محققین، خصوصاً شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے تصریح فرمادی ہے کہ : "یہ ہر گز خیال نہ کرنا کہ نسبت بجز ان اشغال کے اور کسی طرح حاصل نہیں ہوتی" ۔ (القول الجمیل)

بلکہ اگر تصوف کے ان دو طرق واضاع اور اعمال واشغال کو کوئی مقصود جانتا ہے، تو یہ حضرات اس پر سخت انکار فرماتے ہیں۔

"ایضاح الحق الصریح" میں ارشاد ہے : "وظائف واذکار، ریاضیات، خلوت، چلہ کو مقرر کرنا، ذکر جہری اور ذکر خفی کی وضعوں کو مقرر کرنا، ضرب عدد اور مراقبہ برزخیہ کا مقرر کرنا، اگر طالب ان سب کو اصل کمال شرعی یا مکملات میں سے جانتا ہے تو یہ سب بدعات حقیقیہ ہیں، لیکن خواص جو اس کو صرف وسائل وذرائع جان کر رواج دیتے ہیں، ان کے حق میں بدعت حکمیہ ہیں او راخص الخواص میں جو ان چیزوں سے بوقت ضرورت کام لیتے ہیں اور پھر کام نکلنے کے بعد چھوڑ دیتے ہیں، ان کے حق میں یہ بدعت نہیں ہے" ۔ (ص: 37)

حسن بصریؒ، ابراہیم بن ادہمؒ، فضیل بن عیاضؒ، معروف کرخیؒ، بشر حافیؒ، شفیق بلخیؒ، جنید بغدادیؒ، سہل تستریؒ، ابو طالب مکیؒ، اور شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے دی ہے ؟ یہ لوگ ہیں جن کے متعلق شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں : "یہ اسلام کے مشائخ ہیں، ائمہ ہدایت ہیں، خدا نے ان کے حق میں امت کے اندر "لسان صدق" رکھ دیا ہے" ۔ (جلاء العینین، ص: 59) تو یہ تصوف کے امام ہیں، اگر تصوف مطلقاً ہی غلط ہوتا تو حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ ان کی تعریف ہر گز نہ کرتے۔

انہیں ابراہیم بن ادہمؒ، فضیل بن عیاضؒ، معروف کرخیؒ، ابو سلیمان درانیؒ، احمد بن الجواریؒ، اور سری سقطیؒ، کے متعلق ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں : "واکابر شیوخ الصالحین" کہ یہ بزرگ نیک شیوخ صالح لوگ ہیں۔

ایک موقع پر فضیل بن عیاضؒ، ابراہیم بن ادہمؒ، ابو سلیمان درانیؒ، معروف کرخیؒ، جنید بن محمدؒ، سہل بن عبد اللہ تستریؒ، اور انہیں کے مثل لوگوں کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ : "یہ کتاب وسنت کے مشائخ ہیں" ۔

شیوخ عارفین کا اجماع نقل فرماتے ہیں کہ : "تصوف کتاب وسنت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے" ۔ اور سند کے طور پر حسب ذیل بزرگوں کے اقوال نقل فرماتے ہیں : "سید الطائفہ جنیدؒ، ابو حفصؒ، ابو سلیمان درانیؒ، سہل بن عبد اللہؒ، سریؒ، ابو یزیدؒ، احمد بن ابی الحواریؒ، او عثمان نیشاپوریؒ، ابو الحسن نوریؒ، محمد بن الفضلؒ، عمرو بن عثمان مکیؒ، ابو سعید خرازؒ، ابن عطاءؒ، ابو

حمزہ بغدادیؒ، (ان کو امام احمد بن حنبل صوفی کہہ کر پکارا کرتے تھے) ابواسحاق رقیؒ، ابو یعقوب نہر جوریؒ، نصر بازیؒ، ابوبکر طمستانیؒ، ابو عمرو بن نجیدؒ" ۔

حافظ صاحب موصوف فرماتے ہیں: "اس راستہ سے جو صوفیہ الگ ہیں، وہ طریق کے رہزن اور ابلیس کے کارندے ہیں" ۔ (مدارج السالکین، ج: 2/ص: 237)

ایک جگہ تصوف کے متعلق بحث فرماتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ: "تصوف سنت ہی پر عمل کا نام ہے" (جبکہ حدیث جبریل میں اسی کو احسان کہا گیا ہے) اس موقع پر حسب ذیل اہل استقامت، ائمۃ الطرق اور علمائے طائفہ کے اقوال سے استشہاد کرتے ہیں۔ "سریؒ، سید الطائفہ جنیدؒ، ابراہیم بن نصر آبادیؒ، اسماعیل بن نجیدؒ، احمد بن ابی الحواریؒ، شبلیؒ، ابویزید بسطامیؒ، سہل بن عبداللہؒ ۔ (ایضا، ج: 3/ص: 74)

"اغاثۃ اللہفان" میں فرماتے ہیں: "اہل استقامت صحیح راستے پر ہیں، اور کتاب وسنت کے بغیر وہ خواطر وہوا جس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے ہیں"۔ (ص: 68)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ: "کتاب وسنت کا ہر معاملہ میں لحاظ، اولیاء اللہ کے نزدیک متفق علیہ ہے اور مشائخ کے اقوال میں بہ کثرت اس کی ہدایات موجود ہیں"۔ (الفرقان، ص: 31)

حافظ ابن قیمؒ اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ: "جس علم صافی کی طرف اشارہ کیا ہے، یہ وہی علم ہے جس کی قوم (یعنی صوفیہ اصحاب طریقت) نے وصیت کی ہے اور اس کی مفارقت سے ڈرایا ہے۔ اور جس نے اس علم کو چھوڑا اس کو بالکلیہ اہل طریق میں سے نکال دیا ہے۔ اور یہی وہ علم ہے جس کو حضرت نبی کریم ﷺ لے کر تشریف لائے تھے"۔

قلیل غور:

اصل بات یہ ہے کہ ناقدین کو غلط فہمی ہے کہ شیخ ابن تیمیہ اور ابن القیم تصوف کے خلاف تھے، ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کی تنقید تصوف اور اہل حق صوفیہ پر نہیں ہے، بلکہ ان کو فلسفیانہ تصوف سے اختلاف ہے۔ فلسفیانہ تصوف کسے کہتے ہیں؟ اس کو حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کی زبان سے سنیے:

"فلسفیانہ تصوف سے مقصود الٰہیات کے متعلق حکیمانہ خیالات رکھنا اور فلاسفہ کی طرح خشک زندگی اختیار کرکے ان کی اخلاقی تعلیمات پر عمل کرنا ہے، اس فلسفیانہ تصوف کا ماخذ ہونا ان کا اشراقی اور اسکندریہ کا افلاطونی اسکول کا ہونا بعض قدیم مسلمان حکماء کے نزدیک بھی مسلم تھا" ۔

مشہور حکیم ابوریحان البیرونی کہتا ہے کہ: "سوف" یونان میں "حکمت" کو کہتے ہیں اور اسی سے فلیسوف کو یونانی میں "پیلا سوپا" کہتے ہیں۔ یعنی حکمت کا عاشق، چونکہ اسلام میں بعض ان کے قریب گئے اس لئے وہ بھی اسی نام (صوفیہ) سے پکارے گئے۔

علامہ ابن تیمیہؒ اپنے رسالہ "فی السماع والرقص" میں لکھتے ہیں: "اور ابن سینا نے ایک فلسفہ پیدا کیا، جس کو اس نے پہلے کے یونانی فلاسفہ اور (مسلمانوں میں سے) بدعتی متکلمین جہمیہ وغیرہ کے خیالات سے ملا کر بنایا تھا، اور بہت سی علمی اور عملی باتوں میں وہ اسماعیلی ملحدوں کے راستے پر چلا اور کچھ باتیں اس میں صوفیہ کے ملادیں، جو حقیقت میں اس کے ہم خیال اور اسماعیلی قرامطہ باطنیہ کے

خیالات سے ماخوذ تھیں، کیوں کہ ابن سینا کے اہل خاندان مصر کے حاکم بامر اللہ (فاطمی اسماعیلی) کے پیروؤں میں سے تھے۔ یہ لوگ اسی زمانہ میں تھے، اور ان کا مذہب رسائل اخوان الصفا والوں کا مذہب تھا۔

خارجی خلیفہ چلپی "کشف الظنون" میں تصوف کے ضمن میں لکھتا ہے کہ: "اور جاننا چاہئے کہ حکمائے الٰہیات میں سے اشراقی مشرب اور اصطلاح میں صوفیوں کے مانند ہیں۔ خصوصا ان میں پچھلے (اشراقی) ۔ لیکن فرق صرف ان مسائل میں ہے جن میں اشراقیہ کا مذہب اسلام کے مخالف ہے اور یہ کچھ بعید نہیں ہے کہ یہ اصطلاح (تصوف) انہیں کی اصطلاح (سوف)' سے ماخوذ ہو، جیساکہ یہ بات اس شخص سے چھپی نہیں ہے جس نے اشراقیہ فلسفہ کی کتابیں دیکھیں ہیں" ۔

شیخ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ کو اسی فلسفیانہ تصوف سے اختلاف تھا اور اسی تصوف سے پیدا شدہ مسائل پر وہ کڑی تنقید کرتے تھے۔ خود ابن تیمیہ کہے ہیں: "ان لوگوں سے تصوف میں گفتگو کی، لیکن مسلمانوں کے طریق پر نہیں، بلکہ فلاسفہ کے طریق پر" ۔ (جلاء العینین، ص: 34)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ایک موقع پر فرماتے ہیں: "صوفیہ میں بعض متکلمین کے طریق پر ہیں، اور بعض اہل فلسفہ کے طریق پر اور ایک جماعت وہ ہے جو اہل حق کے مسلک پر اور سنت پر ہے۔ جیسے فضیل اور تمام وہ لوگ جن کا (امام قشیری) نے رسالہ میں ذکر کیا ہے" ۔ (جلاء لعینین، ص: 35)

ابن تیمیہؒ ان صوفیاء وائمہ کو مسلک اہل السنۃ پر مانتے ہیں، اور یہی وہ حضرات ہیں کہ محققین صوفیہ آج بھی انہیں بزرگوں کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ ابن تیمیہؒ اپنے رسالہ "فی السماع والرقص" میں غالی متصوفین کے سلسلہ میں لکھتے ہیں: "یہ لوگ محققین صوفیہ اور ان کے ائمہ کے برعکس ہیں" ۔

معلوم ہوا کہ ابن تیمیہؒ کو محققین صوفیہ سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حافظ ابن قیمؒ نے "مدارج السالکین" میں صوفیہ کے چار قسمیں ان کے احوال کے اعتبار سے بیان کی ہیں اور ان کی مدح فرمائی ہے۔ (مدارج السالکین، ج: 3/ص: 81)

ابو العباس بن العریف نے اپنی کتاب "محاسن المجالس" میں محبت اور شوق پر گفتگو کی ہے، حافظ ابن قیمؒ اس پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ہم ان کے کلام کو ذکر کرتے ہیں اور اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے جو مضامین منکشف فرمائے ہیں ان کو بھی نفع کی امید سے لکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر احسان فرمائے اور اس کو علم سے حال کی طرف اور وصف سے اتصاف کی طرف لے جائے ۔ (یعنی اس کے علم کو ان کا حال بنادے) اور ان اوصاف کا متصف بنادے۔ (طریق الجہرتین، ص: 380)

"مدارج السالکین" میں امام شافعیؒ کا ایک قول نقل کرتے ہیں کہ: "میں نے صوفیہ کی صحبت اختیار کی اور ان کی باتوں سے بڑا نفع اٹھایا، ایک یہ کہ وقت ایک تلوار ہے، اگر تم اس کو نہ کاٹوگے تو وہ تم کو کاٹ دے گا، اور دوسری بات یہ کہ اگر تم اپنے نفس کو حق میں مشغول نہ کردگے تو وہ تم کو باطل میں مشغول کرے گا" ۔

حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں: "یہ کتنے قیمتی فقرے ہیں اور اپنے قائل کے علو ہمت پر دلالت کرتے ہیں۔ امام شافعیؒ کی یہ منقبت اس طبقہ (صوفیہ) کے جلالت شان کے لئے کافی ہے" ۔ (ایضا، ص: 80)

شیخین کو صوفیہ کے جس مسئلہ سے زیادہ تر اختلاف تھا وہ "وحدۃ الوجود" کا مسئلہ تھا۔ جس وحدت الوجود سے ان کو اختلاف تھا اس کی حقیقت بھی انہی کی زبان سے سن لیجئے: "اس وحدت الوجود کی غایت یہ ہے کہ اس کے ماننے والے عبد اور معبود، خالق اور مخلوق، آمر اور مامور، طاعت اور معصیت میں فرق نہیں کرتے۔ (طریق الہجرتین، ص: 333)

ملاحدہ اہل وحدت الوجود کے نزدیک غیر حق، عین حق میں گم ہو جاتا ہے، بلکہ غیر حق کا وجود نفس حق کا وجود ہوتا ہے، حس دونوں وجودوں میں فرق کرتا ہے، لیکن جب حس غائب ہوتا ہے تو کھل جاتا ہے کہ غیر حق کا وجود عین حق ہے" ۔ (مدارج السالکین، ج: 3/ص: 87)

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا ارشاد ہیں: "عینیت کے یہ معنی نہیں کہ دونوں ایک ہوگئے، یہ تو صریح کفر ہے" ۔ (تعلیم الدین، ج: 1/ص: 95)

مسئلہ کی اس تفصیل کو ذہن میں رکھیے اور اب دیکھیے کہ شیخین کے ارشادات اس سلسلہ میں کیا ہیں؟ حافظ ابن قیمؒ کے ایک تقریر کا مفہوم حسب ذیل ہیں: "جس انوار مخلوقہ نور حق کے سامنے اور علم خلق علم حق کے سامنے اور مخلوق کی قدرت خدا کی قدرت کے سامنے مضمحل ہے، اسی طرح زمان، دہر اور وقت دوام الٰہی کے سامنے مضمحل ہے۔ جب سالک پر یہ استغراق طاری ہوتا ہے، قوت تمیز کمزور ہوتی ہے، اور حال غالب ہوتا ہے تو اہل استقامت کی زبان سے نکل جاتا ہے کہ " مافی الوجود الا اللہ، ما من موجود علی الحقیقۃ الا اللہ، ہناک یفنی مالم یکن ویبقی من لم یزل" بے شبہ وجود حق اور جب اس کا دوام ماسوا پر غالب آتا ہے تو ہر چیز ایسی ہوتی ہے جیسے کہ وہ نہیں ہے، اور یہیں سے " وحدت الوجود" کے قائلوں کو غلط فہمی ہوگئی کہ واقعی کوئی دوسرا وجود نہیں ہے، اور اس قسم کے مشتبہ کلمات کو (جو اہل استقامت کے زبان سے نکل گئے) انہوں نے اپنے کفر کا سنگ بنیاد قرار دے دیا" ۔ (مدارج السالکین، ج: 3/ص: 86، اس بحث کو طریق الہجرتین، ص: 334، نیز مدارج السالکین، ج: 1/ص: 83 میں ملاحظہ کیا جائے)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فنا کی تین قسمیں کرتے ہیں: پہلی فنا انبیاء اور کاملین اولیاء کا حصہ ہے۔ دوسری قسم قاصدین اولیا وصالحین کو نصیب ہوتی ہے، اس دوسری قسم کے ضمن میں شیخ فرماتے ہیں: "دوسری قسم ماسوا کے شہود سے فنا ہے اور یہ اکثر سالکین کو پیش آتی ہے۔ خدا کی محبت، عبادت اور یاد کی طرف انجذاب سے یہ صورت پیدا ہوتی ہے۔ محبوب و مطلوب کا استغراق غیر کا شعور نہیں باقی رہنے دیتا ہے۔ پس موجود کا وجود، مشہود کا شہود اور مذکور کا ذکر اس سے غائب ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ مخلوق (اس کی نگاہ میں) فنا ہو جاتی ہے اور صرف خدا باقی رہ جاتا ہے۔ چونکہ پہلی قسم کی فنا سے اس فنا کا درجہ کم ہے اس لئے) انبیاء اور اکابر اولیاء اللہ مثلاً: حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور سابقین اولین کو یہ فنا پیش نہیں آئی، ان امور کی ابتدا تابعین کی عہد سے ہوئی ہے اور شیوخ صوفیہ سے، مثلاً ابو یزیدؒ، ابو الحسن نوریؒ، معروف کرخیؒ، فضیل بن عیاضؒ، بلکہ جنید بغدادیؒ کو بھی یہ صورت پیش نہیں آئی" ۔ (العبودیہ، ص: 98)

غور کیجئے کہ محققین صوفیہ کے " وحدت الوجود" یا " وحدت الشہود" میں اور شیخین کے بیان کردہ اس فنا میں کیا فرق ہے؟

کوئی شبہ نہیں کہ فنا کے اس مرتبہ کو شیخین وہ اہمیت نہیں دیتے ہیں جو فنا کی پہلی قسم کو ان کے نزدیک جو حاصل ہے، مگر اس مرتبہ کو نہ صرف یہ کہ وہ گمراہی نہیں قرار دیتے ہیں بلکہ اقرار کرتے ہیں کہ حضرات تابعین کے وقت سے یہ کیفیات پیدا ہونا شروع

ہو گئی تھیں۔ حافظ ابن قیمؒ کے وسعت خیال کا تو یہ اندازہ ہے کہ اگر سالک غلبہ حال میں " سبحانی" یا" مافی الجبۃ الا اللہ " کہہ دے تو وہ اس کو بھی معذور اور معافی کے لائق جانتے ہیں۔ (مدارج السالکین، ج: 1/ص: 84، وطریق الہجرتین)

ایک عجیب بات سنو کہ مصر کے ایک مشہور عالم شیخ حامد فقی (جو شیخین کے خاص محبین میں سے ہیں اور ان کے علوم کے نشر واشاعت کا بہت شوق رکھتے ہیں) کو بڑا غم ہے کہ حافظ ابن قیمؒ نے اس کتاب میں شیوخ صوفیہ سے بہ کثرت نقل کیوں کیا ہے اور ان کے کلام کو اسلامی کیسے قرار دیا ہے؟ (حاشیۃ العبودیۃ، ص: 29)

شیخ حامد کو یہی شکایت ابن تیمیہؒ سے بھی ہے کہ انہوں نے مشائخ صوفیہ کی تعریف کیوں کی ہے ؟ (حواشی العبودیۃ) اللہ اکبر ! یہ "للناس اعداء لما جہلوا" کی کیسی دردناک صورت حال ہے۔ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کے ہر رائے بہتر اور قابل ترجیح، لیکن جب وہ کوئی ایسی چیز بیان کریں جس کو اپنا نفس نہ قبول کرے تو وہ کسی دلیل کے بغیر رد کر دی جائے ؟

علامہ رشید رضا مصری نے اس کتاب پر ایک مقدمہ لکھا ہے۔ انہوں نے بھی تصوف کے متعلق عام خیال بہتر نہیں ظاہر کیا ہے مگر مجبوراً یہ اقرار کرتے ہیں کہ بلا شبہ صوفیہ کے حقائق ہیں جن کے سامنے فقہاء و متکلمین کی گردنیں جھک گئی ہیں اور یہ در حقیقت علماء حکماء ہیں۔ اسی دیباچہ میں کہتے ہیں کہ صالح صوفیہ نے اسرار شریعہ کے بیان اور تربیت اخلاق کے ذریعہ سے اسلام کی خدمت کی ہے۔

حافظ ابن رجب حنبلی فرماتے ہیں: "ابن قیمؒ کو تصوف میں بڑا مرتبہ حاصل تھا اور ان اذواق و مواجید صحیحہ کا بڑا حصہ ملا تھا، جس پر ان کی کتابیں شاہد عدل ہیں" ۔ (جلاء العینین، ص: 20)

ابن قیمؒ کی رائے کو قبول کر لیں جو انہوں نے شطحات صوفیہ کے ضمن میں ظاہر کی ہے۔ فرماتے ہیں: " ان شطحات سے دو مصیبتیں پیدا ہوئیں، ایک یہ کہ ان شطحات کی وجہ سے ایک جماعت ان بزرگوں سے بدظن ہو گئی اور پاکیزگی نفس، صدق معاملہ اور محاسن ان سے چھپ گئے اور ان حضرات کا مطلقاً انکار کر دیا گیا۔ لوگ ان سے بدگمان ہو گئے، حالانکہ یہ صریح زیادتی ہے، کیوں کہ جس شخص سے کوئی غلطی ہو جائے اگر اس کے تمام محاسن کا انکار کر دیا جائے تو تمام علوم اور صناعات بے کار ہو جائیں اور ان کے نشانات مٹ جائیں۔ دوسری مصیبت یہ کہ بعض بزرگوں نے ان بزرگوں کے محاسن، صفاء قلب اور حسن معاملہ کو دیکھ کر ان کے شطحات کو بھی قبول کر لیا۔ ان سب میں صحیح تر وہ لوگ ہیں جو ہر چیز کو اپنے مرتبہ میں رکھتے ہیں۔ صحیح کو قبول کرتے اور غلط کو رد کرتے ہیں۔ (مدارج السالکین، ج: 2/ص: 30)

حافظ ابن قیمؒ " مدارج السالکین" میں ایک موقع پر شیخ الاسلام ہروی سے اختلاف کرتے ہیں، مگر فوراً ناظرین کو متنبہ کرتے ہیں کہ : "یہ غلطی شیخ الاسلامؒ سے بدظن نہ کردے اور ان کے محاسن کو نظر سے گرا نہ دے، اس لئے کہ علم، امامت معرفت اور سلوک میں ان کا جو مرتبہ ہے وہ پوشیدہ نہیں ہے۔ (ایضا، ج: 1/ص: 108)

حافظ موصوف کی یہی انصاف پسندی ہے کہ " شیخ الاسلام حبیب الینا والحق احب الینا منہ " (ایضا، ج: 2/ص: 19) کے پیش نظر وہ ہروی سے جابجا اختلاف بھی کرتے ہیں لیکن ان کے محاسن اور رسوخ علم کے اعتراف میں بھی پیش پیش ہیں، ایک موقع پر کہتے ہیں: "استشہادہ بہذہ الآیۃ فی ہذا الباب یدل علی رسوخہ فی العلم والمعرفۃ والقرآن" (ایضا، ج: 3/ص: 122)

اور انجام کار یہی حافظ ابن قیم انہیں صوفی شیخ الاسلام ہرویؒ کے متعلق کہتے ہیں : "اللہ شیخ الاسلام کی سعی کو مشکور فرمائے، ان کے درجے بلند فرمائے، ان کو بہترین جزادے اور محل کرامہ میں ہم کو اور ان کو جمع فرمائے" ۔ (ایضا، ج: 2/ص: 27)

اب خاتمہ سخن پر خاکسار کو یہ عرض کرنا ہے کہ جن ہمارے دوستوں کو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، حافظ ابن قیمؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ سے حسن ظن ہے ان کو علمائے حق میں سے جانتے ہیں یا تو وہ یہ فیصلہ کرلیں کہ یہ سب حضرات بایں ہمہ اتباع سنت ایک غلط چیز کو قبول کرنے پر متفق ہوگئے تھے، اور ان سب نے عمداً یا جہلاً امت کو نادرست چیز کی تعلیم و تلقین کی۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر خود اپنے متعلق غور کریں کہ کہیں اس باب میں انہی سے تو غلطی نہیں ہورہی ہے۔

ناچیز راقم کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ ہمارے یہ ناقدین اتنے اعتراض و تنقید کے وقت نہایت ہی مخلص ہیں جب یہ حضرات اس مروجہ تصوف کو پیش نظر رکھتے ہیں اور بہت اخلاص سے ہی مروجہ صوفیوں کے کرتوتوں پر رد کرتے ہیں بلکہ ان مروجہ ننانوے فیصد صوفیوں کی بارگاہ میں گستاخی کے مجرم ہم نیاز مند بھی ہیں۔ متصوفین آج بھی سمجھ رہے ہیں بلکہ خوب خوب رد کرتے ہیں کہ یہ تصوف کو نہیں مانتے لیکن فرق یہ ہے کہ ہم جس اسرائیلیات کے بنا پر تفسیر کو، موضوعات کی بنا پر فن حدیث کو اور مرجوع مسائل کی بنا پر دفاتر فقہ کو رد نہیں کرتے ہیں، اسی طرح تصوف کے نام پر آج بہت کی خانقاہوں اور مزاروں پر جو کچھ ہوتا ہے، اس کی بنا پر نفس تصوف کو ہم رد نہیں کرتے ہیں، بلکہ بحمد اللہ اصل اور نقل کے امتیاز کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

اور صحیح تصوف کے بارے میں شک کرنے والے یہ بھی سوچا کریں کہ وہ تبع تابعین کے بعد اسلام پر --- یہ صوفی لڑے یہی ہیں جہاد کے برکت سے اسلام کو انچا کیا امام طریقت حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ تھے۔ انیسویں صدی عیسوی میں جب عالم اسلام پر فرنگی، "تاتاریوں" یا مجاہدین صلیب کی یورش ہوئی تو ان کے مقابلہ میں عالم اسلام کے ہر گوشہ میں جو مردان کار سر سے کفن باندھ کر میدان میں آئے، وہ اکثر و بیشتر شیوخ طریقت اور اصحاب سلسلہ بزرگ تھے، جن کے تزکیہ نفس اور سلوک راہ نبوت نے ان میں دین کی حمیت، کفر کی نفرت، دنیا کی حقارت اور شہادت کی موت کی قیمت دوسروں سے زیادہ پیدا کردی تھی۔ الجزائر (مغرب) میں امیر عبد القادر نے فرانسیسیوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور 1832ء سے 1947ء تک خود چین سے نہ بیٹھے نہ فرانسیسیوں کو چین سے بیٹھنے دیا۔ مغربی مؤرخین نے ان کی شجاعت، عدل وانصاف، نرمی و مہربانی اور علمی قابلیت کی تعریف کی ہے۔

امیر عبد القادر مرحوم پورے عالم اور ادیب، عالی دماغ اور بلند پایہ صوفی تھے، صرف نظری طور پر نہیں بلکہ عملاً اور ذوقاً بھی صوفی تھے، تصوف میں ان کی ایک کتاب "المواقف" ہے۔ وہ اس سلسلے کے یکتائے روزگار لوگوں میں سے تھے۔ اور ممکن ہے کہ متاخرین میں ان کی نظیر دستیاب نہ ہوسکے۔

1813ء میں طاغستان پر جب روسیوں کا تسلط ہوا تو ان کا مقابلہ کرنے والے نقشبندی شیوخ تھے، جنہوں نے علم جہاد بلند کیا اور اس کا مطالبہ اور جدوجہد کی کہ معاملات و مقدمات شریعت کے مطابق فیصل ہوں۔ اور قوم کی جاہلی عبادات شرک و بدعت کو ترک کردیا جائے۔

اس جہاد کے علم بردار طاغستان کے علما اور طریقہ نقشبندیہ کے (جو طاغستان میں پھیلا ہوا ہے) شیوخ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس حقیقت کو عام مسلمانوں سے پہلے سمجھ لیا تھا کہ اصل نقصان حکام سے پہنچتا ہے، جو خطابات، عہدہ و اقتدار، جھوٹی قیادت و سرداری، عیش ولذت اور تمغوں اور مرتبوں کی لالچ میں قوم فروشی کا ارتکاب کرتے ہیں، یہ سمجھ کر انہوں نے ملکی حکام اور ان کے حامی روسیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اور اس کا مطالبہ کیا کہ معاملات کا فیصلہ شریعت کے مطابق ہو، نہ کہ قوم کے قدیم جاہلی عادات کے۔ اس تحریک کے قائد غازی محمد تھے، جن کو روسی " قاضی ملا" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ وہ علوم عربیہ میں بلند پایہ رکھتے تھے۔ ان جاہلی عادات کے ترک کرنے کے بارے میں ان کی ایک تصنیف " اقامۃ البرہان علی ارتداد عرفاء طاغستان " (طاغستان کے چدھریوں اور برادری کے سرداروں کے ارتداد کا ثبوت) ہے۔

1832ء میں غازی محمد شہید ہوئے، ان کے جانشین حمزہ بے ہوئے، ان کے بعد شیخ شامل نے مجاہدین کی قیادت سنبھالی، جو بقول امیر شکیب میر عبدالقادر الجزائریؒ کے طرز پر تھے اور مشیخیت سے امارت ہاتھ میں لی تھی۔

شیخ شامل نے 25 برس تک روس سے مقابلہ جاری رکھا اور مختلف معرکوں میں ان پر زبردست فتح حاصل کی۔ روسی ان کے شوکت اور شجاعت سے مرعوب تھے، اور چند مقامات کو چھوڑ کر سارے ملک سے بے دخل ہوگئے تھے۔ 1843ء اور 1844ء میں شیخ نے ان کے سارے قلعے فتح کر لیے اور بڑا جنگی سامان مال غنیمت میں حاصل کیا۔

تصوف و جہاد کی جامعیت کی ایک اور بڑی اونچی درخشاں مثال سیدی احمد الشریف السنوسی کی ہے۔ اطالویوں نے برقہ وطرابلس کی فتح کے لئے پندرہ دن کا اندازہ لگایا تھا، اس جنگ میں پورے تیرہ برس لگ گئے اور اطالوی پھر بھی اس علاقہ کو مکمل طریقہ پر سر نہ کرسکے، یہ سنوسی درویشوں اور شیخ طریقت سیدی احمد الشریف کی مجاہدانہ جدوجہد تھی، جس نے اطالیہ کو پندرہ سال تک اس علاقے میں قدم جمانے نہیں دیئے۔

امیر شکیب نے صحرائے اعظم افریقہ کی سنوسی خانقاہ کی جو تصویر کھینچی ہے، وہ بڑی دل آویز اور سبق آموز ہے، یہ خانقاہ" واحۃ الکفرۃ" میں واقع تھی اور سید احمد الشریف کے چچا اور شیخ السیدی اور المہدی کے انتظام میں تھی، اور افریقہ کا سب سے بڑا روحانی مرکز اور جہاد کا دارالتربیت تھی۔ امیر مرحوم لکھتے ہیں: "سیدی مہدی صحابہؓ وتابعینؒ کے نقش قدم پر تھے، وہ عبادت کے ساتھ بڑے علمی آدمی تھے، ان کو معلوم تھا کہ قرآنی احکام حکومت واقتدار کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتے۔ اس لئے وہ اپنے برادرانہ طریقت اور مریدین کو ہمیشہ شہ سواری، نشانہ بازی کی مشق کی تاکید کرتے رہے۔ ان میں غیرت اور مستعدی کے روح پھونکتے، ان کو گھڑ سواری اور سپہ سالاری کا شوق دلاتے رہتے اور جہاد کی فضیلت واہمیت کا نقش ان کے دل پر قائم کرتے، ان کی یہ کوشش بارآور ہوئیں اور مختلف مواقع پر اس کے اچھے نتائج برآمد ہوئے، خصوصاً جنگ طرابلس میں سنوسیوں نے ثابت کر دیا کہ ان کے پاس ایسی مادی قوت ہے، جو بڑی بڑی حکومتوں کی طاقت سے ٹکر لے سکتی ہے اور بڑی باجبروت سلطنتوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ صرف جنگ طرابلس ہی میں سنوسیوں کا جوش وغضب ظاہر نہیں ہوا، بلکہ علاقہ کانم اور وادی سوڈان میں وہ 1319ء سے 1332ء تک فرانسیسیوں سے برسر جنگ رہے ہیں۔

عالم اسلامی پر سید جمال الدین افغانی مرحوم کی شخصیت و دعوت نے جو اثر ڈالا ہے وہ کسی صاحب نظر سے مخفی نہیں، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نئے دنیائے اسلام کے فکری معماروں میں ہیں۔ سید جمال الدین افغانی سر تا پا دعوت و عمل اور ایک شعلہ جوالاں تھے، جس نے افغانستان سے لے کر ترکی تک تمام عالم اسلام میں حمیت اسلامی کی روح اور اتحاد اسلامی کا صور پھونکا۔ یہی حال کے ان کے شاگرد رشید اور دست راست شیخ محمد عبدہ کا ہے، جو تصوف کے لذت آشنا اور اس کوچے سے واقف تھے۔ قاہرہ میں مصر کے مشہور فاضل و مصنف ڈاکٹر احمد امین بے نے (جن کو شیخ محمد عبدہ سے شخصی واقفیت اور اسباق میں شرکت کا شرف حاصل ہے) سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کی اس مناسبت اور اشغال کا تفصیل سے ذکر کیا۔

معاصر دینی تحریکوں میں "الاخوان المسلمین" کی تحریک سب سے زیادہ طاقت ور اور منظم تحریک ہے۔ اور عالم عربی کے لئے تو وہ احیائے دین اور اسلام کے نشاۃ ثانیہ کی واحد تحریک ہے۔ اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا زندگی سے پورا ربط ہے اور ممالک عربیہ کے عمومی زندگی پر اس نے بڑا گہرا اور محسوس اثر ڈالا ہے اس کے بانی شیخ حسن البنا مرحوم کی شخصیت بڑی موثر، دل آویز اور ہمہ گیر شخصیت تھی، وہ سر تا عمل اور مجسم جد و جہد تھے، نہ تھکنے والے، نہ مایوس ہونے والے، نہ پست ہونے والے سپاہی اور عظیم داعی تھے۔ ان کی ان خصوصیات میں ان کے روحانی نشو و نما اور سلوک کو بڑا دخل ہے وہ (جیسا کہ انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح میں تصریح کی ہے) طریقہ حصافیہ شاذلیہ میں بیعت تھے۔

اخوان کی پانچویں مؤتمر 1357ھ میں انہوں نے اخوان کی تحریک کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی تعریف میں حسب ذیل جملے کہے تھے: دعوۃ سلفیۃ و طریقۃ سنیۃ و حقیقۃ صوفیۃ و ہیئۃ سیاسیۃ و جماعۃ ریاضیۃ و رابطۃ علمیۃ ثقافیۃ و شرکۃ اقتصادیۃ و فکرۃ اجتماعیۃ۔ (رسالۃ المؤتمر الخاص، ص: 18-19)

ایک ایسی جماعت جس میں سلف کی دعوت، اہل سنت کا طریقہ، تصوف کی حقیقت سیاست، ورزش، علم و ثقافت، اقتصادی تعاون اور اجتماعی فکر جمع ہیں۔

ہندوستان میں تصوف و جہاد کا ایسا امتزاج و اجتماع ملتا ہے، جس کی نظیر دور دور ملنی مشکل ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت سید احمد شہیدؒ کا تذکرہ تحصیل حاصل ہے۔

سید صاحب کے جانشینوں میں مولانا سید نصر الدین اور مولانا ولایت علی عظیم آبادی، سید صاحب کے پرتو تھے۔ ان کے جانشینوں میں مولانا یحیٰ علی اور مولانا احمد اللہ صادق پوری بھی دونوں حیثیتوں کے جامع تھے۔ ایک طرف ان کے جہاد و ابتلاء اور امتحان کے واقعات امام احمد بن حنبل کی یاد تازہ کرتے ہیں، اور وہ کبھی گھوڑے کی پیٹھ پر، کبھی انبالہ کے پھانسی گھر میں اور کبھی جزیرہ انڈمان میں محبوس نظر آتے ہیں۔ دوسرے وقت وہ سلسلہ مجددیہ و سلسلہ محمدیہ (سید صاحب کے خصوصی سلسلہ) میں لوگوں کی تربیت و تعلیم میں مشغول دکھائی دیتے ہیں۔

شاملی کے میدان میں حضرت حاجی امداد اللہ حضرت حافظ ضامن مولانا محمد قاسم نانوتوی مولانا رشید احمد گنگوہی انگریزوں کے خلاف صف آراء نظر آتے تھے حضرت حافظ ضامن ہوئی شہید ہوتے ہیں حضرت حاجی صاحب کو ہندوستان سے ہجرت کرجانی پڑتی ہے، مولانا نانوتویؒ اور مولانا گنگوہیؒ کو عرصہ گوشہ نشین اور مستور رہنا پڑتا ہے۔

پھر مولانا محمود الحسن دیوبندی (جن کو ہندوستان کے مسلمانوں نے بجا طور پر شیخ الہند کے لقب سے یاد کیا) انگریزوں کے خلاف جہاد کی تیاری کرتے ہیں اور ہندوستان کو ان کے وجود سے پاک کرکے ایک ایسی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے جس میں مسلمانوں کا اقتدار اعلی اور ان کے ہاتھ میں ملک کی زمام کار ہو (ان کی بلند ہمتی ان کو ترکی سے تعلقات قائم کرنے اور ہندوستاو افغانستان وترکی کو ایک سلسلہ جہاد میں منسلک کرنے پر آمادہ کرتی ہے ریشمی خطوط انور پاشا کی ملاقات مالٹا اسارت ان کے عالی ہمتی اور قوت عمل کا ثبوت ہے: من المؤمنین رجال صدقوا ماعاہدوا اللہ علیہ فمنہم من قضی نحبہ ومنہم من ینتظر وما بدلوا تبدیلا

وحدۃالوجوداورابن العربی:

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں: "اس مغالطہ کا اصل منشاء مسئلہ وحدۃالوجود سے بے خبری ہے، اس لئے مختصرا عرض ہے کہ یہ مسئلہ نہ مقاصد تصوف سے ہے، نہ مقامات سلوک میں اس کا شمار ہے..... اس مسئلہ کی حقیقت معلوم کرنے سے پہلے یہ امر اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہیئے کہ اسلام کے تمام فرقے اللہ تعالی کی وحدانیت پر کامل اتفاق رکھتے ہیں، اسلام میں توحید کی جیسی سادہ، بے تکلف اور صاف تعلیم ہے اس کی نظیر کوئی مذہب اس وقت پیش نہیں کر سکتا، محققین کے نزدیک اسلام کی سرعت اشاعت کا بڑا سبب یہی ہے کہ توحید کی تعلیم جیسی اسلام میں ہے کسی مذہب میں نہیں۔"

آگے مولانا اس مسئلہ کی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے جس کے نقل کرنے کی یہاں ضرورت نہیں ہے اس کے بعد لکھتے ہیں:

" اس میں شک نہیں کہ علمائے ظاہر کا قول بظاہر نصوص شرعیہ کے موافق ہے، مگر صوفیائے کرام کا قول بھی کسی نص کے خلاف صراحتا نہیں کیونکہ شریعت نے ممکنات کے وجود کا کوئی درجہ متعین نہیں کیا، اگر کسی کی سمجھ میں صوفیا کا قول نہ آئے تو اس کو علمائے ظاہر کے قول پر اعتقاد رکھنا چاہیئے، مگر صوفیا سے مزاحمت بھی نہ کرنا چاہیئے کیونکہ یہ ان کا کشف اور ذوق ہے جو اگرچہ حجت نہیں مگر جب تک نصوص شرعیہ کے خلاف نہ ہو اس کو غلط بھی نہیں کہا جاسکتا، بالخصوص جب کہ منشا اس کا توحید کی تکمیل ہے، نہ تنقیص! اور اگر کسی کی عقل میں اس کا کشفی اور ذوقی ہونا بھی نہ آئے تو وہ یہ سمجھ لے کہ وحدۃالوجود ان حضرات کی خاص حالت اور کیفیت کا نام ہے، جو غلبہ عشق اور محبت الٰہیہ سے ان پر وارد ہوتی ہے، جیسا کہ عشاق مجازی پر بھی اس قسم کی کیفیت بعض دفعہ طاری ہوجاتی ہے کہ محبوب کے سوا کسی چیز پر التفات نہیں ہوتا، سوتے، جاگتے، اٹھتے، بیٹھتے ہر وقت اسی کا دھیان لگا رہتا ہے، اسی طرح حضرات صوفیا کو غلبہ محبت وعشق اور غلبہ استحضار محبوب کی وجہ سے حضرت حق کے سوا کوئی بھی موجود معلوم نہیں ہوتا، قلب پر سلطان حق کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ اس کے سوا ہر چیز حتی کہ اپنی ذات بھی معدوم نظر آتی ہے۔

اب اگر مغلوب الحال کے شاعرانہ کلام یا والہانہ عنوان سے کسی ایسے مضمون کا ابہام ہوتا ہو جو بظاہر توحید اسلامی کے خلاف ہے تو اس کے سمجھنے کے لئے کسی محقق عارف سے رجوع کرنا چاہیئے جو اصطلاحات صوفیہ سے واقف ہو، خود اپنی رائے سے کوئی مطلب متعین نہ کرنا چاہیئے۔" (طریق السداد فی اثبات الوحدۃ ونفی الاتحاد، ص: 25)

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ کی عبارت کا یہ اقتباس ان کے اس رسالہ سے لیا گیا ہے جو در حقیقت مسئلہ وحدۃ الوجود پر حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کے ایک رسالہ کی تلخیص وتسہیل ہے اور اس مسئلہ کے متعلق غلط فہمیوں میں پڑنے

والوں کے لئے اس میں بڑا بہترین اصول بیان کیا گیا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: وحدۃ الوجود، حضرت حاجی امداد اللہ مکی رحمہ اللہ، بوادر النوادر، ص: 640، تکملۃ فتح الملہم: ج: 4/ص: 426، شریعت و تصوف، مولانا مسیح اللہ خان صاحب، ص: 348)

شیخ ابن العربی کا معاملہ بھی اسی طرح کا ہے، ان کی کتابوں میں شطحیات اور ایسی عبارتیں پائی جاتی ہیں جو بظاہر شریعت پر منطبق نہیں ہوتی ہیں اور ان ہی شطحیات کی وجہ سے ان کی شخصیت اہل علم میں متنازعہ رہی ہے، بہت سے محدثین اور فقہا ان سے نالاں اور برگشتہ رہے ہیں، خصوصا شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ نے ان کی بڑی سخت تردید کی ہے اور انہیں "ملحد" اور "زندیق" تک کہا ہے، آج کے عرب سلفی علما کا بھی یہی خیال ہے لیکن دوسرے بہت سے علما نے شیخ ابن عربی کی ان شطحیات کو غلبہ حال پر محمول کرکے انہیں معذور قرار دیا ہے اور ان کی براءت میں کتابیں لکھی ہیں، علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے بھی ان کی براءت پر ایک مستقل رسالہ "تنبیہ الغبی بتبرئۃ ابن العربی" کے نام سے لکھا ہے، اس میں علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

"شیخ ابن عربی کے بارے میں قول فیصل یہ ہے کہ ان کے ولی ہونے کا اعتقاد رکھا جائے لیکن ان کے کتابوں کے مطالعے کو ناجائز قرار دیا جائے کیونکہ خود انہوں نے فرمایا ہے کہ "ہم ایسے لوگ ہیں کہ ہماری کتابیں (مذاق ناشناس لوگوں کے لئے) دیکھنا ناجائز ہے"۔......اس کی وجہ یہ ہے کہ صوفیائے کرام نے بعض ایسے اصطلاحات مقرر کر رکھی ہے جن سے وہ ان کے معروف معنی کے سوا کچھ اور معنی مراد لیتے ہیں، اب اگر کوئی شخص ان کے الفاظ کو معروف معنی پہنائے گا تو وہ کافر ہو جائے گا، امام غزالی رحمہ اللہ نے بھی یہ بات اپنی بعض کتابوں میں لکھی ہے۔" (شذرات الذہب لابن العماد، ص: 91)

شیخ ابن عربی کے بارے میں غیر مقلد بزرگوں کا مؤقف: "شیخ ابن عربی کو غیر مقلدین" خاتم الولایۃ المحمدیۃ" البحر الزاخر فالمعارف الالہیۃ" حجۃ اللہ الظاہرۃ آیاتہ الباہرۃ" جیسے القاب واصاف سے یاد کرتے ہیں اور ان کے شطحی اقوال اور بے دلیل باتوں میں تاویل کرتے ہیں، ذیل میں شیخ ابن عربی کے متعلق ان کا مؤقف پیش خدمت ہے:

مولانا نذیر حسین صاحب کے زندگی پر ان کے شاگرد مولانا فضل حسین صاحب نے" الحیاۃ بعد المماۃ" کے نام سے کتاب لکھی ہے، اس میں مؤلف لکھتے ہیں: " مولانا میاں نذیر حسین صاحب جب کتاب الرقائق کا درس دیتے اور تصوف کے نکات و حقائق بیان فرماتے تو کہتے " صاحبو! ہمیں یہاں احیاء العلوم دکھائی دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ کا طبقہ علما میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کو بڑی عظمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور فرمایا کرتے تھے "شیخ ابن عربی خاتم الولایۃ المحمدیۃ" ہے۔"

کتاب کے مؤلف اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اور حق وہی ہے جو حضرت نے فرمایا اس لئے کہ ظاہری اور باطنی علوم کی اس طرح کی جامعیت، انفرادیت اور ندرت سے خالی نہیں۔" (الحیاۃ بعد المماۃ، ص: 123)

استاذ اور شاگرد دونوں ابن عربی کے "خاتم الولایۃ المحمدیۃ" ہونے پر متفق ہیں بلکہ شاگرد نے اتنا اضافہ بھی کر دیا کہ شیخ ظاہری اور باطنی علوم کے جامع اور امت محمدیہ میں ایک منفرد اور نادر شخصیت کے مالک ہیں۔

"الحیاۃ بعد المماۃ" کے مؤلف مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: "مولانا قاضی بشیر الدین قنوجی شیخ اکبر ابن عربی کے بڑے مخالفین میں سے تھے، ایک مرتبہ میاں نذیر حسین صاحب کے ساتھ شیخ اکبر کے متعلق ان کے موقف کے سلسلہ میں دہلی

مناظرہ کرنے آئے اور دو ماہ تک دہلی ٹھہرے رہے، ہر دن مناظرے کی مجلس لگتی لیکن میاں نذیر صاحب اپنے سابقہ مؤقف سے نہ ہٹے، بالآخر قاضی موصوف دو ماہ بعد نامراد ہو کر واپس چلے۔" (ص: 123)

"شیخ شمس الدین بھی میاں نذیر حسین صاحب سے شیخ اکبر کی شان اور ان کی کتاب "فصوص الحکم" کے بارے میں بحث کرنے لگے تھے، میاں صاحب نے تو اولا انہیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن جب دیکھا کہ شیخ اکبر پر ان کے اعتراضات میں اضافہ اور اصرار ہو رہا ہے تو فرمانے لگے "شیخ ابن عربی کے تصانیف میں سے "فتوح مکیہ" آخری تصنیف ہے، وہ آپ سابقہ تمام تصانیف کے لئے ناسخ ہے۔" (ص: 123)

کوئی ان سے پوچھے کہ اس ناسخ و منسوخ سے کیا علامہ ابن تیمیہ واقف نہیں تھے اور کیا ابن عربی کی کوئی تصریح موجود ہے کہ انہوں نے اپنی سابقہ کتابوں سے رجوع کر لیا تھا، جب کہ اس کی کوئی تصریح نہیں ہے تو شیخ ابن عربی پر یہ سراسر جھوٹ اور بہتان نہیں تو اور کیا ہے؟

"الرحیق المختوم" کے مصنف نے ان کی تعریف میں یہاں تک لکھا ہے کہ "انہ من ملئی الافاق علما ومعرفۃ" یعنی آپ نے آفاق کو علم و معرفت سے بھرا ہے۔ غیر مقلدین انہیں بڑے ضخیم القاب سے یاد کرتے ہیں جن سے ان کا علمی مرتبہ اور ان کی حیثیت نمایا ہو جاتی ہے، چند القاب ملاحظہ ہوں:

"السيد الامام" العلامة الهمام " ابو البطين" الحائز الشرقين" السامي على الفرقدين " صدر العلماء المسندين" عظيم المقدار" الذي افتخرت به بوقال على جميع الاقطار" وانتشرت بجوده علوم السنة والاثار" . (الروضۃ الندیۃ، ص: 11)

اپنی کتاب "التاج المکلل" میں شیخ ابن عربی کا تذکرہ تقریباً سات صفحات میں بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ تذکرہ کے آخر میں لکھتے ہیں: ترک تقلید اور عمل بالدلیل کے سلسلہ میں شیخ ابن عربی کا کلام دوسرے لوگوں کے کلام سے فائق ہے اور اس بارے میں ان کا شغف اور ان کی دلچسپی احاطہ بیان سے بلند ہے، پس اللہ تعالی انہیں ہماری طرف سے اور سب مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر عطاء فرمائے، ان کے انوارات سے ہمیں مستفیض فرمائے، ان کے اسرار و باطن کا لباس ہمیں پہنائے، ان کی شراب علم کی حرارت سے ہمیں سیراب فرمائیں اور ان کے احباب کے زمرے میں ہمارا حشر فرمائیں، نبی اکرم ﷺ کے جاہ و مرتبہ کے صدقہ ہماری یہ دعا قبول فرمائیں۔ (التاج المکلل، ص: 180)

شیخ ابن عثیمین اپنے فتاوی میں کہتے ہیں: " تیسری قسم! فناء الحادی اور کفری ہے اور وہ ہے، اللہ جل شانہ کے علاوہ ہر چیز کو اس طرح فناء سمجھنا کہ خالق کو عین مخلوق خیال کیا جائے اور موجود عین موجد سمجھا جائے، وہاں رب اور مربوب، خالق اور مخلوق، عابد اور معبود، آمر اور مامور کا فرق نہ ہو بلکہ تمام ایک چیز ہو اور ایک عین ہو۔

یہ ملحدین کا عقیدہ فناء ہے جو وحدۃ الوجود کے قائل ہیں جیسے ابن عربی، تلمسانی، ابن سبعین اور قونوی وغیرہ ہیں، یہ لوگ نصاری سے بھی بڑھ کر کافر ہیں، دو وجہ سے، ایک تو اس لئے کہ انہوں نے رب خالق کو عین مربوب اور مخلوق بنادیا جبکہ نصاری نے رب کو اس کے برگزیدہ بندہ کے ساتھ متحد بنادیا ہے جو پہلے غیر متحد تھے، نصاری کے نزدیک دونوں کی ذات ایک دوسرے سے جداگانہ ہے صرف صفت ربوبیت میں اتحاد ہے نہ کہ ذات میں۔ دوسرے اس لئے کہ ان لوگوں نے اتحاد رب کو ہر چیز میں جاری کر دیا، کتوں

چانچہ کاروباری مولوی نکاح کے پیسے، فتوے کے پیسے، دم کے پیسے، بچے کے کان کے اذان کے پیسے، تیجہ، چالیسواں، برسی، جمعراتاں، گیارویں شریف وغیرہ کے پیسے لیکر لوگوں کے ٹکے ٹکے کے محتاج تھے آج بڑے بڑے چوکوں پر غیر مشہور پیر لاکھوں روپے پر ملنے والے سائن بورڈ بک کرتے ہیں یہ پیسہ کہاں سے؟

خدشہ 9:

نواں خدشہ یہ ہوتا ہے کہ مقلدین ماتریدی ہے اور ان کے عقائد خراب ہیں، صفات میں ان کا عقیدہ کفریہ ہے اور یہ صفات کی تاویل کرتے ہیں جو کہ کفر ہے، ہم کہتے ہیں جواباً کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے، بلا جسم، بلا مکان، بلا کیفیت، بلا جہت اور عرش والی آیت، آسمان والی حدیث اور اللہ کی صفات والی بحث میں اس پر ایمان رکھتے ہیں اور کیفیت مجہول ہے، اور اس کے بارے میں سوالات بدعت ہے، ہم تفویض مع التنزیہ کے قائل ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ صفات کی مطلب کو اللہ کی طرف سونپتے ہیں، جو اس کا مطلب ہے اللہ خوب جانتا ہے اور تنزیہہ کے ہم قائل ہیں یعنی جو صفات قطعیات قرآن، سنت اور اجماع سے ثابت ہیں ان کے ثبوت کے بعد اللہ کے سپرد کرتے ہیں اور ساتھ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ مخلوق کی مشابہت سے پاک ہے، ان صفات سے یہی حقائق اور ظواہر مراد نہیں بلکہ اس کی مراد اللہ کی جانتا ہے اور اس کی معانی متعین کرنا غلط ہے، اور ہر قسم کی کیف کی نفی

میں، خنزیروں میں، میل کچیل اور گندگیوں میں جبکہ نصاری نے اتحاد رب کو صرف اس ذات کے ساتھ مخصوص کیا جس کی وہ تعظیم کرتے تھے، یعنی حضرت عیسی علیہ السلام، ان حضرات کے قول کا تو پھر تقاضہ یہ ہے کہ رب اور بندہ ایک شے ہوں، آکل اور ماکول (کھانے والا اور کھائی جانے والی چیز) دونوں ایک ہوں، ناکح اور منکوح ایک ہوں، مجرم اور قاضی ایک ہوں، مشہود لہ (جس کے حق میں گواہی دی گئی ہو) مشہود علیہ (جس کے خلاف گواہی دی گئی ہو) اور شاہد (گواہی دینے والا) یہ سب ایک ہوں اس کو انتہائی حماقت اور ضلالت کے سوا اور کیا نام دیا جاسکتا ہے۔

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ لوگوں نے یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک اپنے بیٹے کے پاس بدکاری کی نیت سے آتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ اللہ رب العالمین ہے، پس اللہ برا کرے اس فرقہ کا کہ اس کا معبود جس کی وہ عبادت کرتا ہے وہی اس کا موطوء اور بدکاری کا نشانہ ہو۔" (فتاوی ابن عثیمین، ج: 4/ص: 242)

کرتے ہیں، ذات سے بھی اور صفات سے بھی اس لئے کہ کیف عالم کی ایک قسم ہے اور عالم تو حادث ہے، بعض لوگ مسئلہ صفات میں غلو کے شکار ہو گئے تو۔۔۔۔، مشبہ اور مجسمہ کے قریب ہو گئے، اور بعض لوگوں نے تاویل میں اتنا غلو کیا کہ معطلہ، جہمیہ اور معتزلہ بن گئے، لیکن ہم اہل سنت والجماعت اعتدال کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ صفات کے معانی کو متعین کرنے سے اسلاف نے گریز کیا ہے اور ہمارا یہ مؤقف مسلم ہے جس کے دلائل ان کتابوں میں موجود ہیں فتح الباری (ج:13/ص:306) امام بیہقی، کتاب الاسماء والصفات (ص:408) لالکائی شرح اصول (ج:1/ص:214) سیر اعلام النبلاء (ج:105/8)

ان کتابوں میں ہے کہ " امرہا کما جاءت بلا تفسیر " امام احمد، امام ترمذی، نؤمن بہا ولا یقال کیف سفیان بان عیینہ ارو امام محمد کے اقوال، کتاب الاسماء للبیہقی، 300 ہجری سے پہلے اسلاف ہیں، 300 کے بعد اخلاف اور یہ سب کا اتفاقی مسئلہ ہے[1]۔

---

[1] اسماء صفات:

یہ یقینی اور ظاہر ہے کہ جسم اور جسمانیت اور اس کی تمام خصوصیات سے بالاوبرتر ہے نہ اس کا وجود کسی خاص سمت اور جہت سے تعلق رکھتا ہے نہ اس کا کسی مکان میں قیام اس طرح کا ہے جس طرح دنیا کی چیزوں کا قیام اپنی اپنی جگہ میں ہوتا ہے، پھر عرش پر قیام فرمانا کس طرح اور کس کیفیت کے ساتھ ہے، یہ ان متشابہات میں سے جن کو انسان کی عقل وفہم نہیں پا سکتی اسی لئے قرآن حکیم کا ارشاد ان کے بارے میں یہ ہے کہ " ومایعلم تأویله الا الله والراسخون في العلم یقولون امنا به " یعنی ان کو سوائے خدا تعالیٰ کے کوئی نہیں، اور مضبوط اور صحیح علم والے اس پر ایمان لانا کا اقرار کرتے ہیں مگر اس استواء کی حقیقت جاننے کی فکر میں نہیں پڑتے، اس لئے اس قسم کے تمام معاملات میں جن میں حق تعالیٰ کی نسبت کسی مکان یا جہت کی طرف کی گئی ہے یا جن میں حق تعالیٰ کے لئے اعضاء ید، وجہ، ساق وغیرہ کے الفاظ قرآن میں وارد ہوئے، عقیدہ جمہور علمائے امت کا یہ ہے کہ اس بات پر ایمان لایا جائے کہ یہ کلمات اپنی جگہ برحق ہیں اور اس سے جو مراد حق تعالیٰ کی ہے وہ صحیح ہے اور اس کی کیفیت وحقیقت کے جاننے کی فکر کو اپنی عقل سے بالاتر ہونے کی بناء پر چھوڑ دیا جائے۔

اور جن متاخرین علماء نے ان چیزوں کے کوئی معنی بیان فرمائے ہیں ان کے نزدیک بھی وہ محض ایک احتمال کے درجہ میں ہیں کہ شاید یہ معنی ہوں، اس معنی کو یقینی وہ نہیں فرماتے اور نرے احتمالات ظاہر ہے کہ کسی حقیقت کا انکشاف نہیں کر سکتے، اس لئے صاف اور سیدھا مسلک سلف صالحین اور صحابہ وتابعین ہی کا ہے جنہوں نے ان چیزوں کی حقیقت کو علم الٰہی کے سپرد کرنے پر قناعت فرمائی۔

احناف نے اسلاف کے اس مؤقف کی تائید کی ہے کہ تفویض مع التنزیہ، لیکن لوگوں کو فتنے سے بچانے کے لئے صفات کی اجمالی تاویل کی نہ کہ یقینی تاکہ لوگ مشبہ اور مجسمہ فرقوں کے عقیدوں سے بچیں، یا جو لوگ اللہ کے لئے جسم ثابت کرنے والے ہیں، چنانچہ بعض نے کہا اللہ ہمارے جیسے بیٹھتے ہیں، بعض نے کہا نعوذ باللہ تعالی ادھیڑ عمر والے ہیں، تو اہل سنت والجماعت نے اجمالی تاویل اس لئے کی کہ لوگ فتنوں سے بچ جائیں، بعض حضرات اشکال کرتے ہیں کہ سنی مذہب کے امام ابو حنیفہؒ نے اہل تاویل کو معطلہ شمار کیا ہے جس طرح کہ فقہ اکبر میں ہے روایت سے حماد سے ہے "فماذکر اللہ تعالی فی القرآن من ذکر الوجہ، والنفس، والید، فھو لہ صفات، بلا کیف، ولا یقال ان یرہ قدرتہ او نعمتہ لانہ فیہ ابطال ..... ."

جوابا عرض ہے کہ وہاں لکھا ہوا ہے "وھو قول اہل القدر والاعتزال" کی ایسی تاویل جس سے اصل کلمات معطل رہ جائیں تو یہ معطلہ، معتزلہ اور قدریہ کا قول ہے جبکہ متاخرین اہل سنت فرماتے ہیں کہ یقینی اور بالجزم تاویل حرام ہے جس سے اصل کلمات معطل ہو جائے، ہماری تاویل صرف احتمال کے درجے میں ہے لوگوں کو فتنے سے بچانے کے لئے، چنانچہ ابن الہمام مسایرۃ میں فرماتے ہیں "وھذا التاویل لھذہ الالفاظ لما ذکرنا من صرف فھم العامۃ عن الجسمیۃ وھو ممکن أن یرادولا یجزم بارادتہ" (المسائرۃ مع المسامرۃ، ص: 62)ایسی بات شیخ الاسلام مدنی صاحب بھی فرماتے ہیں۔ (معارف مدنیہ، ص: 114، میں تفصیل موجود ہے)

فقیہ العصر مفتی عبد الشکور ترمذیؒ فرماتے ہیں ہمارے اور معتزلہ وجہمیہ کے تاویل میں فرق یہ ہے کہ ہم جزم نہیں کرتے اور خوب واضح رہے کہ یہ اجمالی تاویل بدعت اور کفر نہیں ہے، چنانچہ حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ نے "ساق" کی تاویل شدت سے کی ہے۔ (فتح الباری، ج: 2/ص: 408) یہی تاویل مجاہد سے ابن جبیر، امام قتادہ کی بھی ہے " قال جماعۃ من الصحابۃ والتابعین من اہل التاویل یبدو عن امر شدید" اور ابن عباسؓ نے " اید" کی تاویل قوت سے کی اس میں " والسماء بنیناہا باید وانا لموسعون" _ابن جریر طبری، ج: 7/ص: 27)اور امام احمد نے بھی تاویل کی ہے وجاء ربک ای جاء ثوابہ (الہدایہ----ج: 10/ص: 327)

اور امام بیہقی کا ایک مخطوطہ مناقب امام احمد اور امام خلال سے بھی اسی طرح منقول ہے، یہ صریح تاویل ہے کیا یہ کفر اور بدعت ہے؟ اسی طرح امام مالک سے بھی تاویل ثابت ہے، جیسے ابن عبد البر نے تمہید (143/7) اور حافظ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء (105/8) میں نقل کی ہے " قال مالک یتنزل ربنا تبارک وتعالی ای معناہ تنزل امر ربنا فاما ہو (اللہ) فدائم لایزول. اس طرح امام بخاریؒ سے تاویل ثابت ہے اللہ تعالی کے لئے لفظ ضحک جو استعمال ہوا ہے، تو اس سے امام بخاری نے رحمت مراد لیا ہے، کیا یہ تاویل نہیں ہے؟ اس کے علاوہ بھی سلف میں امام سفیان ثوریؒ، سفیان بن عیینہ، ابن حبان، نضر بن شمیل (المولود: 122ھ) امام ہشام بن عبید (المتوفی: 221ھ) حافظ ابن جریر طبری، امام ابو الحسن الاشعری اور امام ماتریدیؒ سے جابجا تاویل ثابت ہیں۔

تنبیہ: یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ سلف صالحین اور متاخرین کے مواقف قطعاً ایک دوسرے سے متضاد اور مقابل نہیں ہے، عقیدہ تو سلف اور خلف کا ایک ہے جس میں ایک بال برابر بھی اختلاف نہیں البتہ زمانے کے تبدیلی کے ساتھ جب اہل الہواء اور اہل البدع اور دشمنان اسلام اعتراضات اور شبہات کے نئے طریقے اختیار کر گئے تو ان کے مقابل میں اہل السنۃ والجماعۃ کے علماء کے دفاعی طریقے بھی تبدیل ہوتے گئے تاکہ ترکی جواب ہو چنانچہ جب معتزلہ، جہمیہ، قدریہ اور مجسمہ نے فلسفہ اور منطق کے

ذریعے اپنے دلائل علمائے حق کے خلاف استعمال کئے تو علمائے حق نے انہی فنون کو سیکھ کر اور ان میں مہارت تامہ اور مجتہدانہ صلاحیتیں حاصل کرکے ان اہل بدعہ کو ان ہی کے فلسفہ ومنطق سے منہ توڑ جواب دیا۔

خلاصہ یہ کہ زمانے کے تبدیلی کے ساتھ طرق دفاع بھی تبدیل ہوتے گئے، ہاں عقیدہ صحیحہ سب کا ایک ہی ہے یہی وجہ ہے کہ علمائے محققین کہتے ہیں کہ جس طرح صفات میں مذہب خلف احکم ہے تو مذہب سلف بھی احکم، اسلم اور اتقن ہے (مقدمۃ علی العقیدۃ النظامیہ، بقلم الامام الکوثریؒ والاستحالۃ لمعیۃ بالذات ومایضاہیہا من متشابہۃ الصفات، للشیخ محمد الظفرا لشنقیطی)

سوال کیا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ جو کہے کہ اللہ کا مجھے پتہ نہیں کہ آسمان میں ہے یا زمین میں تو وہ کافر ہے چنانچہ فقہ اکبر میں ہے (فقہ اکبر، ج:6/ص:107)

تو اس کے جواب میں امام سمرقندی (متوفی: 373) فرماتے ہیں کہ اس لئے کافر ہے کہ یہ آدمی اللہ کے لئے مکان کا تاثر دے رہا ہے (شرح فقہ اکبر سمرقندی، مطبوعہ الرحیم اکیڈمی کراچی، ارشادات المرام عن عبارات الامام، ص: 200، مطبوعہ زمزم کراچی)

اللہ کے بارے میں سوال میں "لما" اور "کیف" اور "این" اور "حیث" لانا مکان کے تقید کے ساتھ حرام ہے۔ (فتح الباری، ج:1/ص:221)

تو سوال اٹھتا ہے کہ مسلم شریف میں جاریہ والی حدیث این اللہ کہ اللہ کہاں ہے؟ جو ہے تو وہاں تو "این" ہے تو کیسے حرام ہوا؟ تو جوابا عرض ہے کہ یہ حدیث معلول ہے، اور شاذ ہے، اور مضطرب ہے جیساکہ امام بیہقی نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے (الاسماء والصفات: 422/ کشف الا----- امام بزاز 14/1، ابن حجر تلخیص الحبیر: 223/3، حافظ عراقی، امالی تنقیح المفهوم الجاریۃ: 355 ضمن مجموعۃ رسائل للسقاف) اور زاہد الکوثری حاشیہ اسماء الصفات، مغرب طنجہ کے بزرگ علامہ بن صدیق الغملدی نے بھی اس حدیث کے شاذ اور مضطرب ہونے کا کہا ہے۔ (فتح المعین، ص: 27 اور حاشیہ تمہید، ج: 135/7)

اور اس حدیث میں وکیع بن عدس مجہول ہے، اور اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس "این" سے مکان مراد نہیں ہے بلکہ عزت اور مرتبہ مراد ہے۔ (ابن حجر فتح الباری: 1/221، ابن جوزی، دفع الشبہ، ص: 186، نووی شرح مسلم: 24/5، قاضی عیاض شرح مسلم: 24/5 علامہ سبکیؒ، السیف الصیقل، ص:94)

ان الذي يجب علينا وعلى كل مسلم ان يعلمه ان ربنا ليس بذي صورة ولا هيئة ، فان الصورة تقتص الكيفية وهي عن الله وعن صفاته منفية" (الاسماء والصفات، ص:296، شرح مقاصد: 28/3)

تنبیہ: لما ثبت ان الواجب ليس بجسم ظهر أنه لايتصف بشيء من الكيفيات المحرمة بالحواس الظاهرة او الباطنةمثل الصورة، واللون، والطعم، والرائحة، وللذة ، وللالم، والفرح، والغم، والغضب، ان لايعقل منها لا ما يخص الاجسام" فيقولونه الاستواء حقيقة والمراد به ليس بحقيقة" (الامتراد علی مسئلۃ الاستراد، مطبوعہ مطبع محمدی لاہور، 1399ھ، الانتقاد الرجح فی الشرح الاعتضاد الصحیح، مطبوعہ افغانستان، قطف الثمر فی بیان عقیدۃ اہل الاثر، مطبوعہ وزارۃ الاوقاف سعودی عرب)

بعض حضرات کی یہ بات بالکل غلط ہے کہ اللہ کے لئے حد، جہت، اور مکان ہے جیساکہ نزل الابرار میں ہے "وہو فی جہۃ الفوق ومکانہ العرش جبکہ حضرت تھانویؒ اس کے برخلاف فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی سے جہت کی نفی ہے (امداد الفتاوی 46/6)

عقید طحاویہ میں ہے "ولا تحویہ الجہات الست... کہ اللہ چھ کے چھ جہات سے منزہ اور پاک ہے۔

امام تاج الدین السبکی فرماتے ہیں: "وهؤلاء الحنفية والشافعية والمالكية وفضلاء الحنابلة ولله الحمد في العقائد يد واحدة كلهم على رأي اهل السنة والجماعة يدينون الله تعالى بطريق ......السنة الى الحسن الاشعري لايعيد عنها الا ..... من الحنفية والشافعية لحقوا باهل الاعتزال .... من الحنابلة لحقوا باهل التجسيم"

نوٹ: ایک نہایت ہی اہم بات عقیدۃ الطحاویہ ایک مقبول اور عقیدے کی ہماری کتاب ہے جس کو سب جانتے ہیں سلفا و خلفا اس کو اتنی مقبولیت حاصل ہے کہ آج بھی مکہ ومدینہ کے یونیورسٹیوں میں شامل نصاب ہے لیکن ابن ابی العزجو عقیدۃ الطحایۃ ہے تو یہ ابن ابی العز صحیح اور درست آدمی نہیں تھا اور اس کو پیش کرکے ہمارے اوپر اشکالات کئے جاتے ہیں، انور شاہ کشمیریؒ نے عقیدۃ الطحاویۃ کو جو حنفیہ کے عقائد کی جتنی کتابیں ہیں سب کو اس پر ترجیح دی ہے چنانچہ واضح رہے کہ ابن ابی العز کی ولادت 731ھ میں اور وفات 792ھ ہوئی ہے ان کے اصولی اور اعتقادی تفردات موجود ہیں جو مذاہب اربعہ کے خلاف ہیں، ابن ابی العز الحنفی کی کتابوں سے ان کی تفردات معلوم ہوسکتی ہیں چنانچہ (علی مشکلات الہدایۃ) یہ ہدایہ کے مضامین پر اس کی تفصیلی رد ہے اس کا تفصیلی جواب قاسم بن قطلوبغا نے دیا ہے یہ تقلید کا قائل نہیں تھا، اور اس نے کہا تھا کہ معین امام کی تقلید کرنے والا جاہل اور گمراہ ہے تو علما نے اس کے مدلل جوابات دیئے تھے محدث کبیر عبداللطیف سندھی نے "ذب الذباب الدراسات" کتاب اس کے رد میں لکھا ہے نے خود لکھا کہ اس ابی ابی العز نے تو مصر کے علما اور حنفی علما نے اس کا رد کیا ابن حجر کی کتاب "انباء الغمر فی انباء المعر" نامی کتاب میں اس طرح علامہ زین الدین ابن رجب نے اور تقی الدین ابن مفلح نے ابن ابی العز پر باقاعدہ رد کیا ہے، ملا علی قاری نے بھی اس پر تنقید کیا ہے، لہٰذا یہ ہمارا آدمی ہے ہی نہیں حنفی بھی نہیں ہے، اس کی بات اٹھاکر ہمارے خلاف پیش کرنا ٹھیک نہیں ہے، اس کے بارے میں تفصیلی کلام جس کو مطلوب ہے وہ رابطہ کرسکتا ہے۔

تاویل پر دلائل:

سلف سے نقل کی ہے جن میں مجاہدؒ، قتادہؒ، منصورؒ، ابن زیدؒ اور سفیانؒ حضرات ائمہ قابل ذکر ہیں۔ (تفسیر ابن جریر الطبری، ج: 7/ص: 27)

اب دیکھئے اگر تاویل بدعت ہے تو ابن عباس اور مجاہد، قتادہ اور دوسرے صحابہ وتابعین کا بدعتی ہونا لازم آئے گا، لہٰذا یہ کہنا کہ تاویل بدعت ہے اور سلف سے ثابت نہیں ہے خود ایک قول مبتدع ہے۔

دلیل 1: حضرت عبداللہ ابن عباسؓ:

اسی طرح حافظ ابن حجرؒ نے سورۃ طہ میں اسی لفظ "استوی" کے متعلق ابن بطالؒ کا کلام نقل کرنے کے بعد آخر میں لکھا ہے کہ "استوی" کی تفسیر "علا" سے صحیح ہے یہی مذہب حق اور اہل سنت والجماعت کا قول ہے۔ (فتح الباری، ج: 13/ص: 496-497)

دلیل 2: عبداللہ ابن عباسؓ:

حضرت امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ بعض حضرات نے اس آیت " یوم یکشف عن ساق " کے معنی میں تاویل کی ہے، عبد اللہ ابن عباسؓ نے فرمایا ہے " شدت اور کرب سے "

دلیل 3: امام ابو سلیمان خطابی:

امام ابو سلیمان خطابی فرماتے ہیں کہ " یوم یکشف ربنا عن ساقہ " قیامت کے روز ہمارا رب اپنی پنڈلی کو کھولے گا، اپنی قدرت سے جس سے شدت ارو کرب کا ظہور ہوگا۔ (کتاب الاسماء والصفات، ج: 2/ص: 182_183)

دلیل 4: عبد اللہ ابن عباسؓ:

اسی طرح حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اور امام بغوی نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور اکثر مفسرین نے آیت پاک " الرحمٰن علی العرش استوی" (سورۃ طہ: 5) میں استوی کی تاویل " ارتفع" سے کی ہے۔ (فتح الباری ج: 13/ص: 497، دار السلام، ریاض و تفسیر بغوی، سورۃ طٰہٰ آیت: 5)

دلیل 5: حضرت امام مجاہدؒ:

اخبرنا ابو عبد اللہ الحافظ .... امام بیہقی نے اپنی سند سے "فثم وجہ اللہ" کی تفسیر میں حضرت امام مجاہد سے نقل کیا ہے کہ اس سے مراد " قبلۃ اللہ " ہے، یعنی تم مشرق مغرب میں جہاں بھی ہو اپنا رخ قبلہ ہی کی سمت میں کرو۔

دلیل 6: حضرت امام مالک:

امام مالک دور سلف کے بڑے علما و فقہاء اور مجتہدین میں شمار ہوتے ہیں خود ان سے تاویل ثابت ہے۔

حافظ ابن عبد البر نے " التمہید" (ج: 7/ص: 143) میں اپنی سند اور حافظ ذہبی نے اعلام النبلاء (ج: 8/ص: 105) میں امام مالکؒ سے حدیث نزول میں تاویلی تفصیل نقل کی ہے۔

قال مالکؒ: یتنزل ربنا تبارک وتعالی: امرہ فأما ہو فدائم لایزول.

کہ ہمارے رب تبارک ربنا نازل ہوتا ہے یعنی اس امر و حکم نازل ہوتا ہے اور اللہ تعالی تو دائم ہے کبھی بھی زائل نہیں ہوتے۔

امام مالکؒ نے نزول باری تعالی سے بطور تاویل نزول امر الہی اور حکم الہی مراد لیا ہے۔

دلیل 7: حضرت امام شافعیؒ:

حضرت امام بیہقیؒ سورۃ بقرۃ (آیت: 115) "وللہ المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ ان اللہ واسع علیم " کے ذیل میں رقمطراز ہیں " فقد حکی المزنی عن الشافعی رضی الله عنه انه قال فی هذه الآیة: یعنی والله اعلم فثم الوجه الذي وجهکم الله الیه "۔ اس آیت کریمہ میں امام مزنیؒ نے امام شافعیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے، یہ وہ رخ ہے جس کی طرف منہ کرنے کا حکم اللہ تعالی نے تم کو دیا ہے۔

دلیل 8: حضرت امام احمد بن حنبل:

حکي حنبل عن الامام احمد انه سمعه یقول احتجوا علی یوم المناظرة فقالوا . . . وانما تأتي قدرته .

حضرت امام احمدؒ نے ذکر کیا ہے کہ مناظرہ کے دن مخالف نے میرے خلاف یہ دلیل دی کہ حدیث میں ہے کہ سورۃ بقرۃ اور سورۃ تبارک قیامت کے دن آئیں گی، میں نے جواب دیا کہ اس سے مراد ان کا ثواب ہے۔

اللہ تعالی نے فرمایا" وجاء ربک والملک صفا صفا" یعنی اس کی قدرت آئے گی۔ (العقیدہ وعلم الکلام، ص: 504)

دلیل 9: امام احمد بن حنبلؒ:

حافظ ابن کثیرؒ نے بھی (البدایۃ والنہایۃ، ج: 10/ص: 327) میں امام بیہقیؒ کے ایک مخطوط سے (جو مناقب احمد بن حنبل کے نام موسوم ہے) سند جید کے ساتھ نقل کیا ہے۔

"روی البیہقی عن الحاکم عن ابی عمرو بن السماک عن احمد بن حنبل أن احمد بن حنبل تأول قول اللہ تعالی (وجاء ربك) أنه جاء ثوبه "

حافظ ابن کثیرؒ نے بیہقیؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اس سند میں کوئی غبار نہیں۔

دلیل 10: امام احمد بن حنبلؒ:

ایک اور مقام پر امام احمد سے یہ بات ثابت ہے کہ انہوں نے سورۃ فجر کی آیت (22) "وجاء ربک" اور تمہارا رب آیا، اس کے بارے میں فرمایا کہ اس سے مراد ہے کہ تمہارے رب کا حکم آیا جیسا کہ آیت میں ہے، "ہل ینظرون الا ان تاتیہم الملائکۃ او یاتی امر ربک (نحل، آیت: 33)

اور قرآن کا ایک حصہ دوسرے کی تفسیر کرتا ہے اسی طرح سے ابن جوزی نے اپنی تفسیر زاد المسیر میں نقل کیا ہے، اسی طرح متعدد مواضع میں تاویل تفصیلی طور پر ثابت ہے۔ (العقیدۃ وعلم الکلام، ص: 504)

دلیل 11: امام حسن بصریؒ:

"وجاء ربک" قال الحسن: جاء امرہ وقضاءہ

امام حسن بصریؒ نے (سورۃ فجر کی آیت: 22) "وجاء ربک صفا صفا" میں وجاء ربک کی تفسیر اللہ تعالی کا حکم اور اس کے فیصلہ آنے سے کی ہے۔

دلیل 12: امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاریؒ:

ایک متفق علیہ طویل حدیث (جس میں مہمان رسول ﷺ کی انصاری صحابیؓ کے یہاں مہمانوازی اور میاں بیوی کے بھوکے سونے کا واقعہ ہے) میں فرمان نبوی ہے:

"فقال: ضحک اللہ اللیلۃ او عجب من فعالکما (بخاری، ص: 3798)

یعنی اللہ تعالی کو آج رات تمہارے کام سے ہنسی آ گئی، حضرت امام بخاری نے اس جگہ " امرونہا بلا کیف" ولا ضابطہ نظر انداز کر کے ضحک کی تاویل" رحمۃ" سے کی ہے۔

" قال البخاری: معنی الضحک: الرحمۃ " (کتاب الاسماء والصفات، ج: 2/ص: 403)

دلیل 13: امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاریؒ :

حافظ ابن حجرؒ امام بخاری کا یہ قول امام خطابی کے واسطے سے نقل کرتے ہیں :

قال: وقال ابو عبد الله : معني الضحك هنا : الرحمة . (فتح الباری، ج: 8)

دلیل 14: علامہ ابن تیمیہؒ :

خود ابن تیمیہؒ " وجہ " کو " جہت " کے معنی میں لیتے ہیں اس لحاظ سے آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ہر چیز ہلاک ہو جائے گی بجز اس کے کہ جس کا مقصد جہت باری تعالی ہو۔ وذلك ان لفظ " الوجه " يشبه ان يكون في الاصل مثل الجهة .

امام ابن تیمیہ یہ سب نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں " جمہور سلف کا یہی مذہب ہے " (حوالہ ؟)

دلیل 15: علامہ ابن تیمیہؒ :

وقال ان الاسم للمعضو فقط ....." كل من عليها فان. و يبقى وجه ربك ذولجلال والاكرام" فإن بقاء وجهه المزوي بالجلال والاكرام هو بقاء ذاته .

سورۃ رحمٰن کی آیت (26) "کل من علیھا فان. ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام" میں لفظ " وجہ" کی ابن تیمیہؒ نے جس طرح جائز تاویل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، اس کو مد نظر رکھا جائے تو شاید اس موضوع کے جملہ اختلافات ختم ہو جائے۔ (مجموعۃ الفتاوی، ج: 2/ص: 434)

دلیل 16: امام حماد بن زیدؒ :

احادیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالی آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں " وقال حماد بن زید نزل اقباله " حضرت حماد بن زید اسی نزول کی تاویل بندوں پر " توجہ " سے فرماتے ہیں جیسا کہ امام بیہقیؒ نے نقل کیا ہے۔ (کتاب الاسماء والصفات، ج: 2/ص: 380، جدہ)

دلیل 17: حضرت امام جعفر صادقؒ :

امام جعفر صادقؒ نے سورۃ قصص (آیت: 88) " کل شیء ہالک الا وجہہ " کی تاویل " دین " سے کی ہے۔

عن جعفر الصادق " الا دینہ "

دلیل 18: حضرت امام ضحاکؒ :

حضرت امام ضحاکؒ نے " وجہ " کی تاویل ذات باری، جنت جہنم اور عرش سے کی ہے۔

"عن الضحاك " كل شيء هالك الا الله والجنة والنار والعرش . "

دلیل 19: حضرت امام بیہقیؒ :

حضرت امام بیہقیؒ فرماتے ہیں " فی کف الرحمٰن " کا معنی اہل علم و نظر کی رو سے اللہ تعالی کے ملک اور سلطنت میں ہونا ہے۔

دلیل 20: علامہ مجد الدین فیروز آبادی لغویؒ :

"یوم یکشف عن ساق" کے معنی " عن شدة " کے کی ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد باری ہے : "والتفت الساق بالساق" یعنی دنیا کی آخری شدت، آخرت۔

خدشہ 10:

دلیل 21: مولانا حسین احمد مدنیؒ:

مولانا حسین احمد مدنیؒ فرماتے ہیں کہ اعتراض ہوتا ہے کہ جس طرح گروہ اشاعرہ اور ماتریدیہ تاویلات کرتے ہیں، معتزلہ وجہمیہ بھی تاویلات کرتے ہیں ان میں اور ان میں فرق کیا ہے؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں کے تاویلات میں فرق ہے، اشاعرہ، ماتریدیہ تاویلات پر جزم نہیں کرتے. برخلاف معتزلہ وغیرہ (اہل باطل) کے کہ وہ تاویلات کرتے ہیں ان کے متعلق کہتے ہیں کہ بس یہاں یہی معانی مراد ہیں۔ (معارف مدنیہ، ص: 147)

مسئلہ استواء علی العرش اور عقیدہ غیر مقلد احباب:

اللہ تعالی کے عرش پر جلوہ افروز ہونے کو قرآن اور حدیث میں استواء علی العرش سے تعبیر کیا گیا ہے، استواء علی العرش کا یہ مسئلہ اہل علم میں بڑا معرکۃ الآراء رہا ہے، عام اہل سنت والجماعت کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ قرآن شریف میں جو کچھ ہے بغیر کسی قسم کی تاویل اور تحریف کے اس پر ایمان لایا جائے کہ یہی سب سے اسلم اور صحیح راستہ ہے۔

اس مسئلہ میں سلفیوں کا جو عقیدہ مشہور ہے وہ جیسا کہ شیخ عبد اللہ بن باز نے فرمایا یہ ہے کہ: "اہل سنت والجماعت یعنی صحابہ اور تابعین سب اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالی آسمان میں ہے اور عرش کے اوپر ہے، ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالی عرش کے اوپر بلندی کی جہت میں ہے۔"

لیکن غیر مقلدین کا عقیدہ اس مسئلہ میں سلفیوں سے بالکل مختلف ہے، حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اپنی کتاب " القول الجمیل" میں فرماتے ہیں: "اللہ تعالی ہر قسم کے نقص وزوال، جسمیت، تحیز، عرضیت، جہت اور الوان واشکال سے بالکل منزہ اور پاک ہے۔"

اسی کتاب میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں: "بہر حال قرآن کریم میں استواء علی العرش وارد ہوا ہے اور اللہ کے لئے ہاتھوں کا ثبوت بھی وارد ہوا ہے ہم اجمالا اس پر ایمان لاتے ہیں اور تفصیل اللہ کے حوالہ کرتے ہیں۔"

اپنے رسالہ " العقیدۃ الحسنۃ" میں فرماتے ہیں: " اللہ تعالی نہ جوہر ہے، نہ عرض ہے، نہ جسم ہے، نہ کسی جگہ میں ہے اور نہ ہی کسی جہت میں ہے۔ اللہ تعالی عرش کے اوپر ہے جیسا کہ اللہ نے خود اپنی یہ صفت بیان کی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اللہ تعالی کسی جگہ میں متحیز ہے یا کسی جہت میں ہے بلکہ اس تفوق اور استواء کی حقیقت صرف اللہ ہی کو معلوم ہے۔"

اور اپنی عظیم تالیف حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں: " پھر ان آیات کے معنی بغیر کسی تشبیہ اور بغیر کسی جہت کے تصور کئے جائیں بلکہ ان اوصاف کے ساتھ اللہ تعالی کا صرف متصف ہونا متحضر کیا جائے۔"

یہ عقیدہ علامہ ابن تیمیہ کے اس قول کے بالکل برخلاف ہے کہ: اللہ تعالی آسمانوں کے اوپر عرش پر اپنی مخلوق سے الگ ہے۔" اور جس کا یہ عقیدہ نہ ہو اس کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ کہتے ہیں" وہ گمراہ، خبیث، مبطل بلکہ کافر ہے۔"

اور شیخ عبد اللہ بن باز کہتے ہیں: "سلف صالح کا کلام اس سلسلہ میں معلوم اور متواتر ہے اور وہ وہی کلام ہے جس کی وضاحت علامہ ابن تیمیہؒ نے استواء کی تفسیر میں کی ہے۔"

دسواں خدشہ یہ ہوتا ہے کہ مقلد حضرات ایک مجلس کے تین طلاقوں کو تین ہی شمار کرتے ہیں [1]۔

---

[1] **تین طلاق:**

حافظ ابن حجر اور علامہ عینی فرماتے ہیں: فإنه ظاهر كونها مجموعة يعني طلقها ثلاثا

یعنی "طلقها ثلاثا" جو حدیث میں وارد ہوا ہے تو اس کا ظاہر یہی ہے کہ اس آدمی نے ایک ساتھ تین طلاقیں دی تھی۔

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اکرم ﷺ سے پوچھا کہ اگر میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیتا تو کیا میرے لئے اس سے رجوع کرنا جائز ہوتا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں وہ تجھ سے جدا ہو جاتی اور تیرا یہ عمل گناہ ہوتا۔

اس روایت کو متعدد محدثین نے اپنی کتابوں میں روایت کیا ہے، مثلا یہ روایت سنن بیہقی میں ہے، اور دار قطنی میں ہے اور منصف ابن ابی شیبہ میں ہے۔

یہ روایت بھی مسئلہ زیر بحث میں بالکل واضح ہے۔ اور اس میں صاف یہ بھی مذکور ہے کہ حضور ﷺ نے اس عمل کو گناہ قرار دیتے ہوئے طلاق کو نافذ قرار دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی عمل کا گناہ ہونا اور بات ہے اور اس حکم کا مرتب ہونا اور بات ہے یعنی کسی عمل کے گناہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ عمل ہی باطل ہو، مثلا اگر روزہ دار روزہ کی حالت میں گالم گلوچ کرے، غیبت کرے تو یہ گناہ تو ہے مگر اس سے اس کے روزے کا بطلان لازم نہیں آتا۔

غیر مقلد احباب کہتے ہیں کہ چونکہ تین طلاقیں اکٹھی دینا گناہ کام ہے اس وجہ سے اس کا طلاق دینا باطل ہوگا۔ حضور ﷺ تو گناہ بتلاتے ہوئے تین طلاق دینے کو لازم قرار دیں اور غیر مقلدین حضور ﷺ کے فرمان کے خلاف یہ کہیں کہ طلاق لازم نہیں ہوگی۔ اور ان کی دوسری بات جو حد درجہ مضحکہ خیز ہے وہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں ایک طلاق پڑے گی۔ سوال یہ ہے کہ جب گناہ ہونے کی وجہ سے تین طلاق نہیں پڑسکتی تو ایک طلاق کیوں پڑے گی؟ دار قطنی وغیرہ کی یہ روایت بہت واضح ہے کہ تین طلاق پڑجائے گی تو انہوں نے اس روایت کو رد کرنے کا ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا کہ دار قطنی کی روایت جس سند سے ہے اس میں ایک راوی عطاء خراسانی ہیں اور وہ مجروح ہے اس وجہ سے یہ روایت ضعیف ہے اس لئے اس کا اعتبار نہیں۔

ابن تیمیہ نے یہ حدیث ذکر کی ہے من قرا القرآن فاعربہ فلہ بکل حرف حسنات ۔ یعنی جس نے قرآن کو اعراب کے ساتھ پڑھا تو اس کے لئے ہر ہر حرف کے بدلہ میں دس نیکیاں ہیں، اس رسالہ کا محقق محمد بن المحمود لکھتا ہے ضعیف جدا، یعنی بہت زیادہ ضعیف حدیث ہے۔ ابن تیمیہ نے جو حدیث ذکر کی ہے وہ صرف ضعیف ہی نہیں ہے بلکہ بہت زیادہ ضعیف ہے، اس سند میں ایک راوی نہشل نامی ہے جو متروک ہے امام بخاری کے استاذ ابن راہویہ اس کو جھوٹا قرار دیتے ہیں مگر ابن تیمیہ اس حدیث کو نہ صرف قبول کرتے ہیں بلکہ اس کو دلیل بناتے ہیں۔

پھر یہ ضعیف حدیث تو بخاری و مسلم کے صحیح روایت کے عین مطابق ہے تو اس کا اعبار کیوں نہ ہوگا؟ اگر کوئی حدیث ضعیف ہی ہو مگر اس کی تائید صحیح حدیث سے ہو رہی ہو تو اس کا اعتبار سارے محدثین کے یہاں ہوتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اس کا ضعیف ہونا امام مالک کو معلوم، امام شافعی کو معلوم، امام احمد بن حنبل کو معلوم، امام اعظم ابو حنیفہ کو معلوم ہوا پھر بھی وہ تین طلاقوں کے تین ہی کے وقوع کے قائل ہیں۔

اور نہ ان حضرات کو یہ معلوم ہوا کہ تین طلاق دینا گناہ ہے، اور اس گناہ کی وجہ سے تین طلاق نہیں صرف ایک طلاق پڑے گی .یہ بات صرف آپ حضرات ہی کو معلوم ہوئی؟۔

بہر حال چاہے تقلید نہ کرنے والے بزرگ اس کا انکار کریں مگر جمہور امت نے اس کا اعتبار کیا ہے۔

امام ترمذی اس حدیث کو نقل کرکے فرماتے ہیں: اہل علم اصحاب النبی ﷺ اور ان کے علاوہ کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ جس نے طلاق البتہ دی تو کتنی طلاقیں پڑے گی۔ حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ ایک طلاق ہوگی۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ تین طلاقیں پڑے گی۔ اور بعض اہل علم نے فرمایا کہ اگر طلاق دینے والے نے ایک کی نیت کی تو ایک پڑے گی اور اگر تین کی نیت کی تو تین واقع ہوگی اور اگر دو کی نیت کی تب بھی ایک ہی واقع ہوگی اور یہی مذہب امام ثوری اور تمام اہل کوفہ کا ہے اور امام مالک کا قول ہے کہ اگر عورت مدخول بہا ہے پس تین طلاقیں واقع ہوگی اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ اگر ایک کی نیت کی ہے تو ایک دو کی نیت کی ہے تو دو اگر تین کی نیت کی ہے تو تین طلاقیں ہوں گی۔

حضرت عبداللہ بن عباس کا اثر: "موطا امام مالک اور احادیث کی دوسری کتابوں میں بھی ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دے ڈالیں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ تین طلاقوں سے اس کی بیوی اس پر حرام ہو جائے گی اور باقی طلاقوں کا گناہ اس پر ہوگا جن کے ذریعے سے اس نے اللہ کی آیتوں کا ٹھٹھا کیا ہے۔

یعنی تین طلاقیں تو حکم خداوندی کے مطابق ہیں اس کا حکم قرآن میں مذکور ہے باقی جو بلاوجہ اس نے جو ستانویں طلاقیں دی ہیں وہ آیات قرآنیہ کے ساتھ گویا مذاق کرنا ہوا اس کا گناہ اس کے سر پر ہوگا۔

فتح الباری میں ہے کہ: "راجح بات متعہ حرام ہونے اور تین طلاق کے وقع ہونے میں یہی ہے کہ تین طلاقیں پڑ جائیں گے اور متعہ حرام ہے۔ اس لئے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اس پر صحابہ کرام کا اجماع منعقد ہو چکا ہے اور یہ بات کسی سے منقول نہیں ہے کہ ایک صحابی نے بھی ان دونوں باتوں میں سے کسی ایک میں بھی ان کی مخالفت کی ہو۔"

حضرت ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: "اور اکثر علمائے کرام سےؒ (صریح) عبارتیں تین طلاقیں اکٹھی واقع ہونے کی ہم نے نقل کردی ہیں، اور ان علمائے کرام کا کوئی مخالف ظاہر نہیں ہوا پس حق کو چھوڑنا گمراہی ہے۔" (مرقاۃ، ج: 6/ ص: 295)

خواجہ صاحب خود لکھتے ہیں " مثلا طلاق ثلاثہ کے مسئلہ کو لیجئے ائمہ اربعہ اور امام بخاریؒ تک اس کے قائل ہیں مگر ہم قائل نہیں۔ (تعویذ اور دم، ص: 12)

نیز موصوف لکھتے ہیں " امام بخاری نے جو طلاق ثلاثہ واقع ہوجانے کے حق میں باب باندھا ہے تو کیا ہوا ان کی تحقیق یہی ہوگی۔ (تین طلاقیں، ص: 44)

حافظ ابن حزم ظاہری بھی تین طلاقیں اکٹھی واقع ہونے کے قائل ہیں، حتی کے بعض اہل حدیث غیر مقلد علمائے کرام بھی اس کے قائل ہیں (دیکھئے فتاوی ثنائیہ، فتاوی مولانا اشرف الدین دہلوی) مولانا محمد علی لکھوی غیر مقلد مدینہ منورہ میں بیٹھ کر ایک

خدشہ 11:

گیارہواں خدشہ یہ ہوتا ہے کہ مقلدین ضعیف احادیث پر بھی عمل کرتے ہیں اور ہم صرف صحیح حدیث پر عمل کرتے ہیں[1]۔

تحریر لکھتے ہیں جو بہت طویل ہے، اس کو ایک نمبر رائپور نے 23 شعبان 1385ھ بمطابق 17 دسمبر 1965ء شمارہ نمبر 22 میں شائع کیا ہے، اس کے صفحہ 18 میں لکھتے ہیں۔

[1] **ضعیف حدیث پر عمل:**

مولانا عبدالوہاب ملتانی کے صاحبزادہ مولانا عبدالستار غیر مقلد کے فتاوی کا مجموعہ چار جلدوں میں فتاوی ستاریہ شائع ہوا ہے اس کی جلد چہارم میں اس کا فتوی موجود ہے، اس فتوے کو ملاحظہ فرمائیں۔

(سوال نمبر 476): کیا ضعیف حدیث پر عمل کیا جاسکتا ہے؟ شاہ ولی اللہ کے متعلق سنا ہے کہ وہ کمزور حدیث پر عمل کرتے تھے۔

(جواب نمبر 476) ضعیف حدیث بھی قابل عمل ہوتی ہے۔

میت کے لئے جمع ہو کرکے اور اس کا کوئی خاص دن مقرر کرکے قرآن پڑھنے کا اسلاف میں معمول نہیں تھا، اور جو چیزیں سلف میں نہ پائی جاتی ہو اس کا شرعی ہونا محل نظر ہے۔

حافظ جلال الدین سیوطی کا بیان ہے: یحکم للحدیث بالصحة اذا تلقاه الناس بالقبول وان لم یکن له اسناده صحیح.

یعنی اگر کسی حدیث کو عام طور پر لوگوں نے قبول کیا ہے تو اس پر صحیح ہونے کا حکم لگایا جائے گا اگرچہ اس کی سند صحیح نہ ہو۔

بلکہ بعض محدثین نے تو اس کی صراحت کی ہے کہ اگر امت نے ضعیف حدیث کو قبول کیا ہے تو اس حدیث پر عمل کیا جائے گا یہی صحیح مذہب ہے، یہاں تک کہ اس کا درجہ متواتر کا ہو جاتا ہے۔ اس سے قطعی خبر کو منسوخ بھی کیا جاسکتا ہے[1]۔

مثلا وضو میں بسم اللہ والی حدیث کے بارے میں امام ترمذی فرماتے ہیں: لا اعلم في هذا الباب حديث له اسناد جيد .

میرے علم میں اس سلسلہ کی کوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں جس کی سند عمدہ ہو۔ اور بزور فرماتے ہیں کہ: کل ماروی ہذا لباب فلیس بقوی. یعنی اس باب میں جو بھی حدیث روایت کی گئی ہے وہ قوی نہیں ہے (یعنی ضعیف ہے) اور حافظ ابن منذی فرماتے ہیں: اس باب کی بہت سی روایتیں ہیں مگر کوئی بھی صحیح نہیں ہے امام احمد فرماتے ہیں کہ: لیس فیہ مایثبت یعنی اس بارے میں کوئی بھی حدیث ثابت نہیں ہے مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری نے ترمذی کی شرح میں اس سلسلہ کی جتنی روایات ان کو مل سکیں سب کو ذکر کیا اور سب کو ضعیف بتلایا ہے لیکن اس کے باوجود اس فیصلہ یہ ہے فرماتے ہیں: "میں کہتا ہوں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ حدیث اس بارے میں نص اور صریح ہے کہ وضو میں بسم اللہ پڑھنا رکن ہے یا شرط ہے۔

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں: "میں کہتا ہوں کہ اس باب کی بہت سی احادیث ہیں جس سے ایک دوسرے کو قوت حاصل ہوتی ہے ان کا مجموعہ بتلاتا ہے، کہ اس کی اصل ہے۔"

امام منذری سے نقل کرتے ہیں: "اس میں کوئی شک نہیں کہ وضو میں بسم اللہ پڑھنے کے سلسلہ میں ایک حدیث بھی جرح سے خالی نہیں ہے۔ لیکن کثرت طرق کی وجہ سے اس میں قوت پیدا ہو جاتی ہے۔"

مولانا ثناء اللہ مدنی صاحب غیر مقلد عالم دین لکھتے ہیں: "کچھ ضعیف (احادیث) ایسی بھی ہیں جن کے مدلول (مفہوم) پر عمل کرنے میں اہل علم کا اتفاق ہے اور انہیں قبول کرکے ان پر عمل کرنا واجب ہو جاتا ہے۔" (فتاوی ثنائیہ مدنیہ: 297/1)

مولانا داؤد ارشد صاحب غیر مقلد عالم دین لکھتے ہیں: "گویا یہ دونوں روایات ضعیف ہیں..... لیکن اس کی تائید صحیح احادیث سے ہوتی ہے۔" (دین الحق: 494/1)

داؤد صاحب آگے لکھتے ہیں: "ہر سند کے ضعف سے متن کا ضعف لازم نہیں آتا کیونکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ضعیف کا راوی کا کوئی ثقہ متابع موجود ہوتا ہے جس کی وجہ سے سند کا ضعف دور ہو کر متن کی صحت ثابت ہو جاتی ہے یا پھر وہی روایت متعدد اسناد سے مروی ہوتی ہے جس میں (بعض) اسناد ضعیف اور بعض صحیح ہوتی ہیں۔" (دین الحق: 59/1)

حافظ عبد الستار حماد صاحب غیر مقلد عالم دین لکھتے ہیں: "علامہ البانیؒ نے اس حدیث کو سند کے لحاظ سے ضعیف قرار دیا ہے.... قرآنی آیات اور دیگر مؤیدات سے معلوم ہوتا ہے کہ معنی کے لحاظ سے یہ حدیث صحیح اور قابل حجت ہے۔" (فتاوی اصحاب الحدیث: 434/3)

مذکورہ بالا عبارات کے پیش نظر ہم کہتے ہیں کہ فضائل اعمال کی وہ روایات جن کی سند پر غیر مقلدین نے اعتراض کیا ہے لازمی نہیں کہ ان کا متن بھی ضعیف ہو کیونکہ خود نہیں اعتراف ہے کہ بسا اوقات سند کے ضعف کے باوجود حدیث کا متن صحیح ہوتا ہے۔

غیر مقلد بزرگ علما نے یہ بھی لکھا ہے کہ کثرت طرق سے ضعیف حدیث قبولیت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی حدیث کی بہت سی ضعیف سندیں ہوں تو سندوں کی کثرت کی وجہ سے وہ حدیث ضعیف الاسناد ہونے کے باوجود قابل عمل ہوا کرتی ہے۔

چنانچہ مولانا ثناء اللہ مدنی صاحب غیر مقلد عالم دین لکھتے ہیں: "بعض ضعیف روایات ایسی ہیں جو کثرت طرق کی بناء پر کسی نہ کسی انداز میں قبولیت کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں" (فتاوی ثنائیہ مدینہ: 297/1) مزید دیکھئے فتاوی ثنائیہ مدنیہ (431/1، 299/1)۔

مولانا محمد گوندلوی صاحب غیر مقلد عالم دین لکھتے ہیں: "یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے مگر کثرت طرق سے اس کا ضعف جاتا رہا ہے" (خیر الکلام، ص: 452)

مولانا حافظ محمد امین صاحب غیر مقلد عالم دین لکھتے ہیں: "جب کمزور حفظ والے راوی کو دیگر رواۃ کی تائید حاصل ہو جائے تو غلطی کا شبہ سرے سے مفقود ہو جاتا ہے اور روایت معتبر قرار پاتی ہے"۔ (نماز کے بعد دعائے اجتماعی اور طائفہ منصورہ کا مسلک اعتدال، ص: 122)

مولانا عبدالرؤف سندھو صاحب غیر مقلد عالم دین لکھتے ہیں: "ان سب احادیث انفرادی طور پر تو سند ضعیف ہیں مگر سب اسانید کو ملا لینے سے یہ حسن یا صحیح حدیث ہے۔" (القول الجمیل، ص: 164)

سندھو صاحب لکھتے ہیں: "اس کی سند بھی اگرچہ صحیح نہیں مگر سب حدیثوں کو ملانے سے یہ درجہ صحت کو پہنچ جاتی ہے۔" (القول الجمیل، ص: 323) مزید دیکھئے القول الجمیل، صفحہ: 166

سندھو اپنی دوسری کتاب میں لکھتے ہیں: "یہ اثر اپنی مختلف سندوں کی بناء پر حسن درجے کا ہے۔" (احناف کی چند کتب پر ایک نظر، ص: 174)

حافظ عبدالستار حماد صاحب غیر مقلد عالم دین لکھتے ہیں: "ہر حدیث کی سند کے متعلق محدثین نے کلام کیا ہے، تاہم ان کے مجموعہ سے قوت پیدا ہو جاتی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی اصل لامحالہ موجود ہے۔" (فتاوی اصحاب الحدیث: 82/2)

حماد صاحب دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: "اگرچہ تمام مرویات میں کچھ نہ کچھ ضعف پایا جاتا ہے، تاہم کثرت طرق کی وجہ سے اس کی تلافی ممکن ہے، جیسا کہ علامہ البانیؒ نے اس حدیث کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے اسے صحیح قرار دیا ہے" ۔ (فتاوی اصحاب الحدیث: 86/2)

حماد صاحب ہی لکھتے ہیں: "حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث کثرت طرق کی بناء پر حسن درجہ کی ہے"۔ (فتاوی اصحاب الحدیث: 178/2)

چنانچہ مولانا علی محمد سعیدی غیر مقلد عالم دین لکھتے ہیں: " حدیث ابن عمرؓ سنداً ضعیف ہے اور معنی صحیح ہے۔" (فتاوی علمائے حدیث: 44/1)

سعیدی صاحب دوسری جگہ لکھتے ہیں: " یہ حدیث سنداً ضعیف ہے اور معنی صحیح ہے" (حوالہ مذکورہ، ص: 52)

حافظ زبیر علی زئی صاحب غیر مقلد عالم دین لکھتے ہیں: " اس روایت کے ضعیف ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ روایت مذکورہ میں جو مسئلہ بیان کیا گیا ہے وہ غلط ہے صحیح روایت سے یہ (مسئلہ) ثابت ہے۔" (اضواء المصابیح: 68/1 تحت حدیث: 3)

مرحوم علی زئی صاحب ہی لکھتے ہیں: "بعض اوقات حدیث ضعیف ہوتی ہے لیکن مسئلہ صحیح ہوتا ہے، مسئلہ اس وجہ سے صحیح ہوتا ہے کہ اس کی تائید اجماع یا آثار سے ہوتی ہے۔ فی الحال اس کی تین مثالیں پیش خدمت ہیں۔ " (علمی مقالات: 278/2)

مرحوم علی زئی صاحب آگے لکھتے ہیں: =" یہ روایت ضعیف ہے لیکن یہ مسئلہ بالکل صحیح ہے" (علمی مقالات: 279/2)

مرحوم علی زئی صاحب ہی لکھتے ہیں: "اس کی سند عبداللہ بن ابی نجیح کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے، لیکن اس کا مفہوم دوسرے دلائل کی رو سے صحیح ہے۔" (اشاعۃ الحدیث شمارہ: 120/ ص: 17)

آگے پڑھیں: "یہ روایت سعید بن ابی عروبہ کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے، لیکن اس کا مفہوم دوسری احادیث سے ثابت ہے۔" (اشاعۃ الحدیث شمارہ: 120/ص: 17)

پڑھتے جائیں: " واقدی متروک اور متہم بالکذب ہے۔ اس کی توثیق مردود ہے۔ اور باقی سند سلمہ بن عمر اور عمر بن شیبہ کی وجہ سے ضعیف ہے، لیکن یہ روایت اپنے شواہد کے ساتھ صحیح ہے۔" (اشاعۃ الحدیث شمارہ: 120/ ص: 18)

"یہ سند ابن ابی نجیح کے عنعنہ کے وجہ سے ضعیف ہے، البتہ اس کے صحیح معنوی شواہد موجود ہیں۔"

(اشاعۃ الحدیث شمارہ: 120/ ص: 28)

مولانا بدیع الدین شاہ راشدی نے باقاعدہ مستقل ایک مقالہ لکھا ہے کہ ضعیف حدیث سے دلیل پکڑنا جائز ہے۔ اور القول اللطیف فی الاحتجاج بالحدیث الضعیف اور مقالات راشدیہ (205/2) میں بھی لکھا ہے۔

غیر مقلد بزرگوں میں مولانا میاں نذیر حسین اور نواب صدیق حسن اور شوکانی، ان حضرات کا مسلک یہ ہے کہ ضعیف حدیث پر عمل کرنا جائز ہے اور اس سے شرعی حکم ثابت ہوتا ہے تو گردن کی مسح کا انکار درست نہ ہوگا۔

احناف کا مشہور مذہب ہے کہ ضعیف حدیث کا ضعف اگر بہت زیادہ نہیں ہے اور اس کا ٹکراؤ بھی صحیح حدیث سے نہیں ہو رہا ہے تو اس پر عمل کرنا جائز ہے بلکہ اولی اور افضل ہے، اس وجہ سے ان کے یہاں گردن پر مسح کرنا بہتر ہے۔

فتاوی ستارہ کا یہ فتوی ملاحظہ فرمایئے، سوال کیا گیا کہ ضعیف حدیث پر عمل کیا جا سکتا ہے جواب دیا جاتا ہے کہ: ضعیف حدیث بھی قابل عمل ہوتی ہے

اور غیر مقلد احباب کے شیخ الکل عالم میاں صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ضعیف حدیث سے جو موضوع نہ ہو استحباب وجواز ثابت ہوتا ہے۔

اور مشہور غیر مقلد عالم مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوری صاحب فرماتے ہیں کہ محرم کی دسویں تاریخ کو کھانے میں وسعت کرنے کا ثبوت حدیث سے ہے پھر وہ حدیث پیش کی ہے اور پھر اس حدیث کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

اس حدیث کو اگرچہ بعض محدثین ضعیف اور ناقابل احتجاج اور بعض نے موضوع (من گھڑت) کہا ہے مگر حق بات یہ ہے کہ حدیث موضوع نہیں ہے

غیر مقلد عالم مولانا صادق سیالکوٹی کی کتاب "صلوۃ الرسول" میں تقریبا 84 ضعیف حدیثیں ذکر کی گئی ہیں۔

جب غیر احباب کے اکابر کا فیصلہ آپ کے سامنے آگیا کہ ضعیف حدیث سے مسئلہ شرعی ثابت ہوتا ہے تو پھر یہ کہنا کہ گردن پر مسح بتلانے والی احادیث ضعیف ہیں اور اس سے گردن پر مسح کا ثبوت نہیں ہو سکتا، غلط اور باطل ہو گیا گردن پر مسح کو بتلانے والی دو ایک حدیث ملاحظہ فرمائیں:

میں صرف ترجمہ کر رہا ہوں حدیث کے، جن کو الفاظ دیکھنے ہیں وہ " حدیث اور اہلحدیث " کتاب کی طرف رجوع کریں۔

(1) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس نے وضو کیا اور دونوں ہاتھ سے اپنی گردن پر مسح کیا قیامت کے دن طوق پہنائے جانے کے عذاب سے محفوظ رہے گا۔

(2) حضرت طلحہ بن مصرف اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے اگلے سر سے پچھلے سر گردن کے آخر حصہ تک مسح کیا[1]۔

(3) معجم طبرانی میں حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ ثم مسح رقبتیہ وباطن اللحیۃ کہ آپ ﷺ نے وضو کیا تو آپ نے گردن کا اور داڑھی کے نچلی حصہ کا مسح کیا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: گردن پر مسح کو جس نے مستحب سمجھا ہے تو اس نے اس بارے میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ایک اثر پر اور ضعیف حدیث پر اعتماد کیا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے حدیث پر ضعف کا حکم تو لگایا ہے مگر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ والے اثر پر آپ نے ضعف کا حکم نہیں لگایا، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا اثر صحیح ہے، اگر وہ بھی ضعیف ہوتا تو شیخ الاسلام ابن تیمیہ اس کا بھی ضعف ظاہر کرتے جس طرح سے انہوں نے حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔

حضرت عدی بن حاتم کی حدیث ہے: میں رسول اللہ ﷺ سے باز کے شکار کردہ جانور کے بارے میں پوچھا کہ اس کا کھانا حلال ہے یا نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جس شکار کو اس نے تمہارے لئے باقی رکھا ہے یعنی اس میں سے خود نہیں کھایا ہے تو اس کو کھاؤ۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو ہم صرف مجالد بن عبد الرحمٰن عن الشعبی کی سند سے جانتے ہیں یعنی شعبی سے اس حدیث کا روایت کرنے والا صرف ایک شخص مجالد ہے اور شعبی کے علاوہ کسی اور سے یہ حدیث مروی نہیں ہے۔

اور مجالد بن عبد الرحمٰن کے بارے میں تقریب میں ہے کہ "لیس بالقوی وقد تغیر فی آخر عمرہ" یعنی یہ قوی نہیں ہے اس کا حافظہ بھی آخری عمر میں خراب ہو گیا تھا، اور منذری فرماتے ہیں "فیہ مقال" یعنی مجالد کے بارے میں محدثین نے جرحیں کی ہیں یعنی یہ حدیث محدثین کے قاعدے کے مطابق ضعیف ہے باوجود اس کے امام ترمذی فرماتے ہیں "العمل علی ہذا عند اہل العلم" یعنی اہل علم کا اسی پر عمل ہے۔

ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ حدیث کا ضعف اصول محدثین پر بالکل واضح ہے، مگر اہل علم یعنی صحابہ و تابعین اور تبع تابعین اور تمام ائمہ فقہ و حدیث کا اس پر عمل ہے۔

یعنی ضعیف حدیث پر عمل کرنے کے بارے میں ان اہل علم کا اجماع ثابت ہوتا ہے، اب کیسے یہ کہا جائے کہ ضعیف حدیث پر عمل کرنا جائز نہیں ہے، اور ضعیف حدیث کا مطلب یہ ہے کہ وہ رسول پاک ﷺ کی حدیث ہی نہیں ہے۔

زندہ جانور سے اس کے بدن کا جو حصہ کاٹ تو اس حصہ کا حکم مردار کا ہے،

اس کی سند میں ایک راوی عبد الرحمٰن بن عبد اللہ بن دینار المدنی ہے، اس کے بارے میں امام الجرح والتعدیل یحیٰ بن معین فرماتے ہیں "فی حدیثہ ضعف" یعنی اس کی حدیث میں ضعف ہے،

ابو حاتم فرماتے ہیں: لایحتج بہ یعنی اس سے حجت نہیں پکڑی جاتی ہے دوسرے محدثین نے بھی اس پر کلام کیا ہے یعنی محدثین کے اصطلاح کے اعتبار سے یہ حدیث ضعیف ہے، لیکن امام ترمذی فرماتے ہیں "والعمل علی ہذا عند اہل العلم" یعنی تمام اہل علم یعنی فقہاء و محدثین کا اسی پر عمل ہے۔

بھلا بتلائے کہ کتنے بڑے ظلم کی بات ہے کہ ضعیف حدیث کے بارے میں آج پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے کہ اس پر عمل کرنا ناجائز اور حرام ہے، فی الاصل ضعیف حدیث کا انکار کرنا رسول اللہ ﷺ احادیث کے بہت بڑے ذخیرے پر ہاتھ صاف کرنا ہے یہ کام ایک دشمن اسلام تو کر سکتا ہے مگر کسی مخلص اہل ایمان سے اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا، یہ انتہائی جاہلانہ بات ہے کہ جو علم و تحقیق کے نام پر

عوام میں پھیلائی جارہی ہے کہ ضعیف حدیث پر عمل کرنا جائز نہیں ہے، یا ضعیف حدیث سے استدلال کرنا حرام و ناجائز ہے یہ دور حاضر غلط کا پروپگنڈہ ہے۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: من ملک ذا رحم محرم فھو حر

یعنی اگر کوئی شخص اپنے کسی محرم کا مالک ہو جائے تو وہ آزاد ہوگا۔

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "لایصح" یعنی یہ حدیث صحیح نہیں ہے، امام بخاری کے استاذ ابن المدینی فرماتے ہیں کہ "انہ حدیث منکر" یعنی یہ حدیث منکر ہے یعنی محدثین کی اصطلاح میں یہ حدیث ضعیف ہے مگر ابن اثیر "نہایہ" میں فرماتے ہیں:

اسی حدیث پر اکثر صحابہ و تابعین کا عمل ہے، اور اسی کے قائل امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب ہیں اور یہی مذہب امام احمد کا بھی ہے یعنی ان حضرات کے یہاں کوئی شخص اپنے کسی ذی رحم کا مالک ہو جاتا ہے تو وہ محرم آزاد ہو جائے گا خواہ وہ محرم مذکر ہو یا مؤنث۔ (ص: 29)

ابوداؤد اور نسائی میں شاذ و نادر اس طرح کی حدیثیں ہیں ابن ماجہ میں کچھ ایسی حدیثیں ضرور ہیں جن پر لوگوں نے شدید جرح کی ہے، امام ابوداؤد رحمہ اللہ خود اپنی کتاب کی احادیث کے بارے میں فرماتے ہیں:

امام ثوری امام مالک اور امام شافعی کے جو مسائل ہیں تو میری کتاب کی حدیثیں ان کی اصل ہیں، یعنی عام طور پر ان ائمہ کے مذاہب کی بنیاد انہیں احادیث پر ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ ابوداؤد کی کچھ حدیثیں اصول محدثین کے مطابق ضعیف بھی ہوں تو بھی ان ائمہ کرام نے ان احادیث پر اپنے قول اور اپنے فقہ کی بنیاد رکھی ہے یعنی یہ تمام احادیث ان ائمہ کرام کے یہاں معمول بہا ہیں۔

امام ابوداؤد مزید فرماتے ہیں: "میں نے اپنے سنن میں جو احادیث داخل کی ہیں ان میں سے بیشتر مشہور ہیں، یہاں مشہور ہونے کے یہی مطلب ہے کہ عام طور پر ان پر فقہا اور ائمہ کا عمل ہے اگرچہ وہ اصطلاحا ضعیف ہیں مگر حقیقت کے اعتبار سے صحیح ہیں۔ (ایضا ص: 47)

حافظ حجر فرماتے ہیں کہ امام ابوداؤد نے جن احادیث کو ذکر کرکے ان پر سکوت اختیار کیا ہے وہ چار قسم کی ہیں:

(1) بعض وہ ہیں جو بخاری و مسلم میں موجود ہیں یا وہ صحیح کے شرط پر ہیں۔

(2) بعض وہ ہیں جو حسن لذاتہ کے قبیل کی ہیں۔

(3) بعض وہ ہیں جو حسن لغیرہ (حافظ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں قسمیں زیادہ ہیں)

(4) بعض وہ ہیں جو ضعیف ہیں۔

پھر فرماتے ہیں: وکل ھذہ الاقسام عندہ تصلح للاحتجاج بھا (ص: 425)

یعنی یہ تمام قسمیں امام ابوداؤد کے نزدیک احتجاج کے قابل ہیں۔

دیکھئے محدثین کے نزدیک ضعیف حدیث سے حجت پکڑی جاتی تھی اور اسی وجہ سے ان محدثین نے ضعیف احادیث کو اپنی کتاب میں داخل کیا ہے مگر آج ان احادیث کو ہمارے سلفی دوستوں نے ایسا شجرہ ممنوعہ بنا رکھا ہے اس کے قریب بھی جانا ان کے نزدیک حرام ہے۔

صحیح بخاری میں امام بخاری نے تعلیقا جن احادیث اور آثار کو ذکر کیا ہے اس میں سے بہت سے سنداً ضعیف ہیں نمونہ کے طور پر اس کی تین مثالیں پیش کرتا ہوں:

1- امام بخاری نے باب قائم کیا ہے "باب من لم یر الوضوء الامن المخرجین من القبل والدبر" یعنی باب یہ مسئلہ بیان کرنے کے لئے کہ وضو صرف اسی صورت میں ٹوٹتا ہے جب پیشاب یا پاخانہ کے راستہ سے کوئی چیز خارج ہو اس کے ضمن میں امام بخاری نے حضرت جابر کی یہ روایت تعلیقا نقل کی ہیں" وقال جابر بن عبد اللہ اذا ضحک فی الصلوۃ اعادۃ الصلوۃ ولم یعد الوضوء "یعنی اگر نماز میں کوئی ہنسا تو صرف نماز کو دھرائے گا وضو کو نہیں، یہ حدیث مرفوعا ضعیف ہے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: واخرجہ الدارقطنی من الطریق اخری مرفوعا ولکن ضعفہ، یعنی امام دارقطنی نے اس کو دوسری سند سے مرفوعا نقل کیا ہے مگر اس کو ضعیف قرار دیا ہے، حافظ ابن حجر کہتے ہیں، صحیح یہ ہے کہ یہ حضرت جابر کا قول ہے، مگر حضرت جابر کا قول بھی تو حدیث موقوف ہوئی اور حدیث موقوف بھی ضعیف احادیث کی قسموں میں سے ہے۔

غیر مقلد علما کا عام نعرہ ہے کہ" در موقوفات صحابہ حجت نیست" یعنی صحابہ کرام کے موقوف حدیثوں میں حجت نہیں ہے۔ بہر حال یہ حدیث موقوف تو بھی ضعیف اور مرفوع ہو تو بھی ضعیف۔ اور یہ ضعیف حدیث امام بخاری کے یہاں قابل احتجاج ہے اور امام بخاری نے اس کو اپنی صحیح میں تعلیقا ذکر کیا ہے۔

1- امام بخاری نے باب قائم کیا ہے "باب وجوب الصلوۃ فی الثیاب "یعنی اس کا بیان کہ نماز کپڑوں میں پڑھنا واجب ہے، پھر فرماتے ہیں ویذکر عن سلمۃ بن الاکوع ان النبی ﷺ یزرہ ولو بشوکۃ، یعنی حضرت سلمہ بن اکوع سے روایت کی جاتی ہے کہ حضور ﷺ بٹن لگایا کرتے تھے اگرچہ کانٹا ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت سلمہ بن اکوع کی یہ حدیث ضعیف ہے، خود امام بخاری فرماتے ہیں: فی اسنادہ نظر، یعنی اس کی سند میں کلام ہے، یعنی سنداً یہ حدیث ضعیف ہے۔

دیکھئے امام بخاری کے نزدیک یہ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہے مگر پھر بھی اس سے وہ استدلال کر رہے ہیں اور اپنی کتاب میں درج کرتے ہیں۔

2- حضرت امام بخاری نے باب قائم کیا ہے" باب مایذکر فی الفخذ" یعنی باب ران کے بیان میں۔ یعنی ران شرمگاہ میں سے ہے یا نہیں، اس کے ضمن میں امام بخاری فرماتے ہیں: ویروی عن ابن عباس وجرہد ومحمد بن جحش عن النبی ﷺ الفخذ عورۃ. یعنی حضرت ابن عباس حضرت جرہد اور حضرت محمد بن دجحش سے مروی ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ران شرمگاہ ہے، جرہد کے سند سے جو حدیث ہے وہ خود امام بخاری کے نزدیک ضعیف ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: ضعفہ المصنف فی التاریخ للاضطراب فی

اسنادہ ، یعنی اس حدیث کو مصنف یعنی امام بخاری نے اپنی تاریخ میں ضعیف قرار دیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف کے نزدیک اس کے سند میں اضطراب ہے۔

اور حضرت ابن عباس والی حدیث بھی ضعیف ہے اس کی سند میں ایک راوی ابو یحیٰی قتات ہے، حافظ ابن حجر اس کے بارے میں فرماتے ہیں: وہو ضعیف مشہور بکنیتہ

یعنی وہ ضعیف ہے اپنی کنیت سے مشہور ہے۔

اور حضرت محمد بن جحش والی حدیث بھی صحیح نہیں ہے اس کی سند میں ایک راوی ابو کثیر ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔ لم اجد فیہ تصریحا بتعدیل یعنی میں نے کسی محدث کو نہیں پایا کہ اس نے صراحۃً اس کو عادل کہا ہو۔

آپ ملاحظہ فرمائیں کہ الفخذ عورۃ والی حدیث تین سندوں سے تین صحابہ کرام سے مروی ہے ،اور اس میں ایک حدیث بھی محدثین کے قاعدے کے مطابق صحیح نہیں ہے ،جرہد والی حدیث کو خود امام بخاری نے صراحۃً ضعیف کہا ہے ، مگر ان تمام کے باوجود حضرت امام بخاری ان تینوں حدیثوں کو اپنی صحیح کتاب بخاری شریف میں لائے ہیں ،اور ان احادیث کا ضعیف ہونا امام بخاری کو ان سے استدلال کرنے سے مانع نہیں بنتا کیا امام بخاری کے اس طرز سے یہ حقیقت نہیں کھلتی کہ ضعیف حدیث کا مطلقا انکار کرنا متقدمین محدثین کا طریقہ نہیں تھا، اور ان کے نزدیک ضعیف حدیث سے استدلال کرنا اور حجت پکڑنا ممنوع نہیں تھا یہ اس زمانہ کی بدعت ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اصطلاحا حدیث ضعیف ہوتی ہے اور اس کا مضمون خلاف قیاس ہوتا ہے یعنی قیاس کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے اور حدیث کا مضمون کچھ اور ہوتا ہے تو ایسی صورت میں تمام فقہا خصوصا ائمہ اربعہ قیاس کے مقابلہ میں اس ضعیف حدیث پر عمل کرتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ کے بارے میں یہ بات پایہ شہرت تک پہنچ چکی ہے کہ ان کا مذہب تھا " الحدیث اولی من القیاس" یعنی ضعیف حدیث پر عمل کرنا قیاس پر عمل کرنے سے بہتر ہے۔ ابن قیم فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل کا بھی یہی مذہب پھر فرماتے ہیں۔

"عام طور پر سبھی ائمہ اس بارے میں امام احمد کے موافق ہیں ائمہ میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ضعیف حدیث کو قیاس پر مقدم نہ رکھتا ہو۔" (اعلام الموقعین ج 1/ص 25)

پھر ابن قیم نے ائمہ اربعہ میں سے ہر ایک سے اس کی کئی کئی مثالیں دی ہیں مثلا امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں کہا ہے کہ: امام ابو حنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ نماز میں قہقہہ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ وضو نہ ٹوٹے اس لئے کہ ناقض وضو فی الاصل وہ چیز ہے جو پیشاب پاخانہ کے راستہ سے نکلے قہقہہ سے وضو ٹوٹنے کی کوئی وجہ عقلا سمجھ میں نہیں آتی ہے مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے پیش نظر وہ حدیث ہے جس میں قہقہہ سے وضو ٹوٹنے کا حکم ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب کے بارے میں فرمایا کہ اس بارے میں امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب بہت وسیع ہے ، کسی بھی طرح کے ضعیف حدیث کو خواہ وہ مرسل ہو یا منقطع یا موقوف قیاس پر مقدم رکھتے ہیں۔

امام شافعی کا مذہب ہے کہ مکہ مکرمہ میں اوقات ممنوعہ اور مکروہہ میں بھی نماز پڑھی جاسکتی ہے ،حالانکہ اس بارے میں جو حدیث وہ ضعیف ہے جبکہ قیاس کا تقاضا ہے کہ اوقات مکروہہ میں نماز ہر جگہ مکروہ ہو خواہ مکہ میں ہو یا مکہ کے علاوہ کوئی اور دوسری جگہ ،امام شافعی نے قیاس پر ضعیف حدیث کو مقدم کیا۔

غرض امام احمد ،امام شافعی، امام مالک، امام اعظم ابو حنیفہ رحمہم اللہ سب اسی کے قائل ہیں کہ قیاس پر ضعیف حدیث کو مقدم کیا جائے گا تو کیا کسی کے وہم وگمان میں یہ بات آسکتی ہے کہ ضعیف حدیث ایک شئ باطل ہو پھر بھی ان ائمہ کرام نے جن کا اسلام میں مقام ومرتبہ سب کو معلوم ہے اس سے مسائل شرعیہ میں دلیل لائیں اور شرعی مسائل کی اس پر بنیاد رکھیں۔

علامہ ابن حزم کے متعلق اہل علم کو معلوم ہے کہ وہ پکے ظاہری تھے اور دنیائے غیر مقلدیت کے بے تاج بادشاہ تھے لیکن ان کو بھی بہت سے مسائل میں ضعیف احادیث کو قبول کرنا پڑا، اپنی مشہور کتاب " محلی" میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

هذا الاثر وان لم يكن ممايحتج بمثله فلم نجد عن رسول الله ﷺ غيره وقد قال احمد بن حنبل ضعيف الحديث احب الي من الرائ.

یعنی نے جس حدیث سے استدلال کیا ہے اس جیسی حدیث کو اگرچہ حجت نہیں بنایا جاتا مگر ہمیں اس کے علاوہ حضور ﷺ کی کوئی حدیث ملی نہیں اور امام احمد رحمہ للہ کا قول ہے کہ ضعیف حدیث مجھے رائے سے زیادہ پسند ہے۔(ج: 4/ص: 148)

ابن حزم ضعیف حدیث سے استدلال کرنے کے لئے وہ امام احمد کی تقلید کررہے ہیں ،ایک طرف ان کی کتابوں میں تقلید کے خلاف ایک طوفان ہے اور دوسری طرف امام احمد کی تقلید کا قلادہ بھی اپنے گلے میں علی الاعلان ڈالا جارہا ہے، معلوم ہوا کہ بلا تقلید کے گاڑی چلنے والی نہیں ہے۔

حافظ ابن عبد البر جلیل القدر محدث ہیں فرماتے ہیں: لم يثبت عن النبي ﷺ في نصاب الذهب شئ الا ماروي الحسن بن عمارة وهو مجمع علي ترك حديثه لكن عليه جمهور العلماء.

یعنی حضور اکرم ﷺ سے سونے کے نصاب کے بارے میں کوئی صحیح حدیث نہیں ہے ہاں ایک حدیث ہے جو حسن بن عمارہ کے کی سند سے ہے مگر حسن بن عمارہ کے متروک ہونے پر محدثین کا اجماع ہے (یعنی ان کی یہ حدیث اجماعا ضعیف ہے) لیکن جمہور کا عمل اس حدیث کے مطابق ہے۔(زرقانی علی المؤطا ج: 2/ ص: 97)

حضرت بن عمارۃ حضرت علی ؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: هاتوا زكوة الذهب من كل عشرين دينار نصف دينا. یعنی سونے کی زکوۃ بیس دینار میں سے نصف دینار نکالو۔

حاصل گزارش یہ ہے کہ ضعیف حدیث کا ائمہ متقدمین نے مسائل شرعیہ میں اعتبار کیا ہے اور اس پر اپنے عمل کی بنیاد رکھی ہے اس کا انکار کرنا دن کے اجالے میں سورج کا انکار کرنا ہے۔

یہ گفتگو تو احکام اور مسائل کی سلسلہ کی تھی کہ ائمہ دین نے مسائل اور احکام میں ضعیف حدیث کا اعتبار کیا ہے یا نہیں، باقی رہا فضائل اور ترغیب وترہیب کے بارے میں ضعیف حدیث کو قبول کیا جائے گا یا نہیں، تو جمہور ائمہ فقہ حدیث کا مذہب یہ ہے کہ

فضائل اور ترغیب وترہیب میں ضعیف حدیث مقبول ہوں گی، چونکہ یہ بات عام طور پر اہل علم کو معلوم ہے اس وجہ سے ہم اس بارے میں اختصار کام لیتے ہوئے اکابر محدثین سے چند نقول پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ حضرت امام بخاری کی کتاب "الادب المفرد" جن کو پڑھنے کا اتفاق ہوا ہو گا اسے خوب معلوم ہو گا کہ امام بخاری نے اس کتاب میں فضائل اور ترغیب وترہیب کے بارے میں پچاسوں حدیثیں ضعیف نقل کی ہیں اور ان کا ضعف واضح بھی نہیں کیا ہے۔ یعنی یہ بھی نہیں بتلایا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اس سے معلوم ہوا کہ فضائل اور ترغیب وترہیب میں عام طور پر محدثین کے یہاں ضعیف حدیث پر عمل تھا۔ حتی کہ امام بخاری رحمہ اللہ فضائل کے باب میں بلا تکلف ضعیف احادیث سے استدلال کیا کرتے ہیں۔

شیخ ابو غدہ فرماتے ہیں حضرت امام بخاری نے الادب المفرد میں فضائل کے باب میں ضعیف حدیث قبول کرنے کی جو روش اختیار کی ہے یہی طریقہ ان کے شیخ امام احمد کا بھی تھا جیسا کہ ان کے کتاب "کتاب الزہد" سے واضح ہے۔ اور یہی طریقہ اس سے پہلے حضرت عبداللہ بن مبارک کا بھی تھا جیساکہ ان کی کتاب "کتاب الزہد والرقائق" سے واضح ہے اسی طرح سے جن لوگوں نے بھی زہد اور رقائق کے بارے میں تالیف کی ہے ان تمام محدثین نے فضائل میں ضعیف احادیث سے استدلال کیا ہے۔

ظفر الامانی جو شیخ ابو غدہ کی تحقیق وتعلیق سے شائع ہوئی اس کا صفحہ 262 سے صفحہ 286 تک پڑھیے، اس موضوع پر شیخ نے بڑی محققانہ اور منصفانہ گفتگو کی ہے۔

بلکہ امام بخاری تو اپنی سب سے صحیح کتاب صحیح بخاری میں بھی ضعیف احادیث سے استدلا کرتے ہیں او راس کی وجہ ان کے مدافعین نے یہی بیان کی ہے کہ چونکہ اس حدیث کا تعلق فضائل اور ترغیب وترہیب سے ہے، اس وجہ سے امام بخاری نے اس میں زیادہ تشدد سے کام نہیں لیا، مثلا بخاری کا ایک راوی محمد بن عبد الرحمٰن الطفاوی جس کے بارے میں ابو غدہ فرماتے ہیں منکر الحدیث ہے یہ منکر حدیثوں کو بیان کرتا ہے، بخاری میں اس کی تین روایتیں ہیں ایک روایت کتاب الرقائق میں ہے اس روایت کو بیان کرنے والا تنہا یہی طفاوی ہے۔ اور منکر الحدیث راوی کی متفرد روایت ضعیف شمار ہوتی ہے، اب بخاری پر اعتراض ہوا کہ انہوں نے اپنی صحیح میں ضعیف حدیث کو کیوں ذکر کیا ہے، تو اس کا جواب حافظ ابن حجر نے یہ دیا ہے: فهذا الحديث قد تفرد به الطفاوي وهو من غرائب الصحيح وكان البخاري لم يتشدد فيه لكونه من احاديث الترغيب والترهيب (مقدمه فتح الباري ص: 441)

یعنی اس حدیث کا بیان کرنے والا تنہا طفاوی ہے، یہ روایت بخاری کی غریب روایتوں میں سے ہے (یعنی ضعیف ہے) گویا امام بخاری نے اس حدیث میں تشدد سے کام نہیں لیا اس لئے کہ اس حدیث کا تعلق ترغیب وترہیب سے ہے۔

خود امام بخاری کا ضعیف حدیث کے سلسلہ میں کیا پیانہ رہا ہے؟ اس سے غافل بنے رہتے ہیں اور مطلقاً ضعیف احادیث کا حتی کا فضائل میں بھی ضعیف حدیث سے استدلال کو حرام جانتے ہیں، اگر ان کی بات کسی بھی درجہ میں صحیح مان لی جائے تو پھر امام بخاری کی بخاری شریف سے بھی امت کا اعتماد اٹھ جائے گا۔

بخاری شریف کا ایک راوی فلیح بن سلیمان جس کے بارے میں ساجی فرماتے ہیں کہ: من اہل الصدق کان یہم یعنی وہ اہل صدق میں سے تھا مگر وہمی تھا، یعنی احادیث کے بیان میں بہت زیادہ غلطیاں کرتا تھا۔ یحی بن معین، امام نسائی، اور ابو داؤد نے ان کو ضعیف

قرار دیا ہے ابن عدی فرماتے ہیں کہ :لہ غرائب یعنی اس کی پاس غریب حدیثیں تھیں جب امام بخاری پر اعتراض ہوا کہ ایسے ضعیف راوی سے انہوں نے کیوں روایت کیا ہے تو اس کا جواب حافظ ابن حجر نے دیا: امام بخاری نے اس راوی پر اتنا اعتماد نہیں کیا ہے جتنا اعتماد امام مالک ، سفیان ابن عیینہ اور جیسے محدثین پر کیا ہے ، بخاری میں اس کچھ حدیثیں ہیں، زیادہ تر کا تعلق مناقب سے ہے او ربعض رقاق سے ہے۔ (ایضاً ص: 435)

اس سے معلوم ہوا کہ مناقب، زہد اور رقاق میں کمزور روایت سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے، خود امام بخاری نے اپنی سب سے صحیح کتاب میں اس کا نمونہ پیش کیا ہے تاکہ کسی کو ضعیف احادیث کے خلاف نعرہ بلند کرنے کا حوصلہ نہ رہے۔

بخاری شریف کا ایک راوی اسید بن زید الجمال ہے اس کے بارے میں نسائی فرماتے ہیں کہ متروک یعنی محدثین کے نزدیک یہ متروک ہے ،ابن معین فرماتے ہیں: حدث باحادیث کذب یعنی اس نے جھوٹی حدیثیں بیان کی ہیں۔ دار قطنی اس کو ضعیف کہتے ہیں ابن عدی کہتے ہیں کہ اس کی متابعت نہیں کی جاتی ہے ابن حبان کہتے ہیں کہ یروی عن الثقات المناکیر ویسرق الحدیث یعنی یہ ثقہ راویوں سے منکر روایت بیان کرتا تھا اور حدیث چوری کرتا تھا بزار کہتے ہیں کہ لوگوں نے اس کی حدیث کو برداشت کیا ہے حالانکہ اس میں سخت قسم کی شیعیت تھی ابو حاتم کہتے ہیں کہ لوگ اس پر جرح کرتے ہیں اور حافظ ابن حجر کہتے ہیں: قد روی عنہ البخاری فی کتاب الرقاق حدیثا واحدا یعنی امام بخاری نے کتاب الرقاق میں اس کی ایک حدیث ذکر کی ہے۔

امام بخاری نے گویا فیصلہ کر دیا کہ ان کے نزدیک شدید قسم کا مجروح راوی بھی فضائل کے باب میں مقبول ہے اور اس کی روایت کو قبول کیا جائے گا۔

آج کل بعض لوگوں نے حضرت شیخ ذکریا کی کتاب فضائل اعمال کے بارے میں طوفان برپا کر رکھا ہے کہ اس کتاب میں ضعیف احادیث ہیں اگر ان میں سوچ اور فکر آخرت ہوگی تو امام بخاری کے ضعیف احادیث کے بارے میں اس عمل کو دیکھ کر اپنی زبان بند کرلیں گے ورنہ ایمان کا تقاضا یہ ہوگا کہ امام بخاری کے خلاف بھی وہ لب کشا ہوں۔

بخاری کا ایک اسمٰعیل بن مجالد ہے امام نسائی اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ لیس بالقوی یعنی وہ قوی نہیں ہے دار قطنی فرماتے ہیں ضعیف یعنی یہ ضعیف ہے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ بخاری نے اس کی صرف ایک حدیث حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے فضیلت میں نقل کی ہے "اخرج لہ فی الصحیح حدیثا واحدا فی فضل ابی بکر رضی اللہ عنہ یعنی امام بخاری نے اپنی صحیح میں اس کی صرف ایک حدیث حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے فضائل کے بیان میں ذکر کی ہے۔ معلوم ہوا کہ فضائل کے باب میں امام بخاری بھی جمہور کے ساتھ ہیں کہ اس میں ضعیف احادیث سے استدلال کرنا جائز ہے۔

بخاری شریف کا ایک راوی حسن بن ذکوان ہے امام احمد ، ابن معین ، ابو حاتم ، امام نسائی اور ابن مدینی نے اس کو ضعیف کہا ہے ، ابن عدی کے نزدیک یہ تدلیس کیا کرتا تھا اور فرماتے ہیں وہ متروک ہے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں : فھذا احد اسباب تضعیفہ یعنی اس کا مدلس ہونا اور متروک ہونا اس کے ضعیف ہونے کے اسباب میں سے ایک سبب ہے، اور دوسرا سبب یہ ہے کہ کان قدریا یعنی وہ اعتقادا بھی اہلسنت والجماعت میں سے نہیں تھا قدری تھا، پھر وہ فرماتے ہیں کہ روی لہ البخاری حدیثا واحدا فی الرقاق یعنی کتاب الرقاق میں امام بخاری نے اس کی حدیث نقل کی ہے۔

بخاری شریف کا ایک راوی ہے سلمہ بن رجاء اس کے بارے میں نسائی فرماتے ہیں کہ ضعیف ہے ابن معین فرماتے ہیں کہ لیس بشئ یعنی وہ کچھ نہیں تھا، اس راوی کی ایک حدیث فضائل میں امام بخاری نے ذکر کی ہے، حافظ ابن حجر کہتے ہیں لہ حدیث واحد فی الفضائل یعنی اس راوی کی ایک حدیث فضائل کے باب میں امام بخاری نے ذکر کی ہے۔

بخاری شریف کا ایک راوی سلام بن ابی مطیع ہے ابن عدی فرماتے ہیں کہ لیس بمستقیم الحدیث یعنی وہ ٹھیک حدیث والا نہیں، ابن حبان فرماتے ہیں: کان سیٔ الاخذ لا یجوز الاحتجاج بہ یعنی اس کے حدیث حاصل کرنے کا ڈھنگ خراب تھا اس سے احتجاج درست نہیں ہے، حاکم فرماتے ہیں کہ اس کو غفلت اور سوء حفظ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے اس کی دو حدیثیں اپنی صحیح میں ذکر کی ہے ایک کا تعلق فضائل قرآن سے ہے احد ہما فی فضائل القرآن۔ (ایضاً ص: 400)

بخاری شریف کا ایک راوی عثمان بن ہشیم ہے اس کے بارے میں ہے کہ اس کا حافظہ خراب ہو گیا تھا، دار قطنی کہتے ہے کہ صدوق تھا لیکن بہت زیادہ غلطیاں کرنے والا تھا امام احمد فرماتے ہیں کہ لیس بثبت کہ وہ ثبت اور پختہ کار نہیں تھا، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام بخاری آیۃ الکرسی کی فضیلت میں اس کی حدیث کو ذکر کیا ہے۔

بخاری شریف کا ایک راوی محمد بن طلحہ بن مصرف الکلوفی ہے، ابن سعد کہتے ہیں کہ وہ اپنے باپ سے روایت کرتا ہے حالانکہ اس کا باپ قدیم الموت تھا، لوگ اس کو جھوٹا سمجھتے تھے، امام ابوداؤد کہتے ہیں کہ وہ حدیثوں میں غلطیاں کیا کرتا تھا۔

ابو کامل مظفر بن مدرک کہتے ہیں کہ محدثین میں یہ بات تھی کہ تین آدمیوں کی حدیث سے بچا جاتا تھا، ان میں سے ایک محمد بن طلحہ ہے، ابن معین نے کبھی اس کو صالح کہا اور کبھی کہا کہ ضعیف ہے امام نسائی فرماتے ہیں کہ لیس بالقوی یعنی وہ قوی نہیں ہے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ بخاری شریف میں اس راوی کی تین حدیثیں ہیں ایک تعلق فضائل سے ہے حافظ کا لفظ یہ ہے الا انہ فی فضائل الاعمال یعنی اس حدیث کا تعلق فضائل اعمال سے ہے۔ (ص: 439)

بخاری شریف کا ایک راوی یحی بن ابی ذکریا ابو اسحٰی ہے، امام ابوداؤد اس کو ضعیف قرار دیتے ہیں، ابن معین کہتے ہیں کہ میں اس کے حال سے بے خبر ہوں۔

ابو حاتم کہتے ہیں کہ وہ مشہور نہیں ہے، ابن حبان کہتے ہیں کہ لا یجوز الروایۃ عنہ اس سے روایت کرنا جائز نہیں ہے امام بخاری نے ہدیہ کی بیان میں اس کی روایت ذکر کی ہے۔

میں یہاں یہ دس مثالیں صرف بخاری شریف سے ذکر کی ہیں تاکہ جو لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ فضائل اعمال او رترغیب وترہیب میں ضعیف احادیث سے حجت نہیں پکڑی جا سکتی ان کی آنکھ سے پردہ ہٹ جائے اور ان کی زبان پر لگام رہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ طرز عمل بتلا رہا ہے کہ محدثین نے فضائل کے باب میں ضعیف احادیث اور کمزور راویوں کی روایت سے کبھی گریز کا راستہ اختیار نہیں کیا۔

اب بعض دوسرے ائمہ محدثین حضرات کا بھی اس بارے میں فیصلہ ملاحظہ فرمائیں:

1- امام حاکم فرماتے ہیں: واذا روینا في فضائل الاعمال والثواب والعقاب والمباحات والدعوات تساهلنا في الاسانيد.

یعنی جب ہم فضائل اعمال اور ثواب وعذاب اور مباحات اور دعاؤں کے بارے میں احادیث ذکر کرتے ہیں تو اس میں کمزور حدیثوں کو بھی داخل کرتے ہیں۔(مستدرک کتاب الدعاء ج:1/ص: 490)

2- امام احمد فرماتے ہیں: واذا روینا في فضائل الاعمال تساهلنا في الاسانید. (الکفایة ص: 213)
یعنی جب ہم فضائل اعمال کی حدیثیں ذکر کرتے ہیں تو اس میں کمزور روایتوں کو بھی لاتے ہیں۔

3- ابن قدامہ فرماتے ہیں: النوافل والفضائل لا یشترط صحة الحدیث فیها (مغنی ج: 1/ص: 1044)
یعنی نوافل اور فضائل میں صحیح حدیث کا ہونا شرط نہیں ہے۔

4- شیخ الاسلام ابن تیمیہ ابو محمد مقدسی سے نقل کرتے ہیں کہ صلوۃ تسبیح پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اگرچہ اس بارے میں جو حدیث ہو وہ ضعیف ہے۔ قال الفضائل لا یشترط لها صحة الخبر لیکن فضائل میں حدیث کا صحیح ہونا شرط نہیں ہے۔(الاختیارات والعملیة ص: 100)

5- ابو حاتم رازی فرماتے ہیں: "راوی کی ایک قسم ایسی ہوتی ہے کہ اس میں صدق وورع کی صفت تو ہوتی ہے مگر مغفل ہوتا ہے وہم کا اس پر غلبہ رہتا ہے غلطی اور بھول چوک اس پر غالب رہتی ہے اس طرح کی راویوں کی روایتیں ترغیب وترہیب اور زہد وآداب میں قبول کی جاتی ہیں۔ (مقدمہ الجرح والتعدیل)

6- امام نووی نے "کتاب الاذکار" میں بہت سی ضعیف احادیث ذکر کی ہیں اس لئے کہ ان کا تعلق فضائل سے ہے ایک حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں وهو حدیث ضعیف لکن احادیث الفضائل یتساهل فیها
یعنی یہ حدیث ضعیف ہے مگر فضائل والی احادیث میں شدت اختیار نہیں کی جاتی ہے۔

وہ حدیث یہ ہے من احی لیلتی العیدین لم یمت قلبه حین تموت القلوب یعنی جو شخص عیدین کی راتوں کو جاگ کر گزارے یعنی عبادت میں مصروف رہے تو جب دوسرے کے دل مردہ رہیں گے تو اس کا دل مردہ نہیں رہے گا۔

یہ تحریر طویل ہوتی جارہی ہے، اس طول کلام کی مجھے زحمت اس لئے اٹھانی پڑی کہ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ موجودہ زمانہ کا ایک بڑا دینی فتنہ ضعیف احادیث کے انکار کا بھی ہے۔ اور اس فتنہ کی آگ بھڑکانے والے وہ لوگ ہے جن کا یہ زعم ہے کہ وہ اہلحدیث ہیں اور اسلاف کے طریقہ پر ہیں، میری اب تک کی گفتگو سے واضح ہو چکا ہے کہ ضعیف حدیث کا انکار کرنا اور اس پر عمل نہ کرنا یہ اسلاف اور متقدمین محدثین کا طریقہ نہیں رہا ہے، ہمارے محدثین کرام اور فقہائے عظام نے ضعیف احادیث کو احکام میں بھی قبول کیا ہے اور فضائل میں بھی فضائل میں تو بعض شاذ لوگوں کے علاوہ کسی سے انکار سنا ہی نہیں گیا ہے۔

اس لئے اگر اس زمانہ میں کوئی جماعت اس کا انکار کرتی ہے تو وہ محدثین کی طریقہ سے بھٹکی ہوئی اور گم کردہ جماعت ہے، ہمارے لئے سلامتی کا راستہ یہ ہے کہ ہم اسلاف کے طریقہ پر رہیں انہیں کی تقلید واتباع میں دین اسلام کی سلامتی ہے۔

اگر کوئی سوال کرے کہ محدثین نے اپنی کتابوں میں ضعیف احادیث کیوں ذکر کی ہیں میری اس مفصل گفتگو میں اس کا سوال کا مفصل جواب موجود ہے اور مختصر جواب یہ ہے کہ محدثین نے اپنی کتابوں میں ضعیف احادیث اس لئے ذکر کی ہیں کہ اسلام ساری تعلیمات محفوظ اور مدون رہیں اور امت اس کو اپنی زندگی میں داخل کرے بہت سے شرعی مسائل انہیں ضعیف احادیث سے

خدشہ 12:

بارہواں خدشہ یہ ہوتا ہے کہ یہ حضرات فضائل اعمال نامی کتاب کو بہت ترجیح دیتے ہیں اور پوری دنیا میں قرآن کے بعد یہ پڑھی جانے والی کتاب ہے لیکن اس میں ضعیف روایات بکثرت ہیں اور کتاب لکھتے وقت شیخ ذکریاؒ کی دماغی کیفیت درست نہیں تھی، لہٰذا یہ کتاب درست نہیں ہے [1]۔

معلوم ہوتے ہیں اعمال کی فضیلتیں انہیں ضعیف احادیث سے معلوم ہوتی ہیں ترغیب وترہیب کی بہت سی باتیں انہیں احادیث سے معلوم ہوتی ہیں۔

حنفی مسلک اور عمل بالحدیث یا ضعیف احادیث کی حقیقت:

(۱) صحیح احادیث صرف بخاری اور مسلم ہی میں منحصر نہیں بلکہ حدیث کی صحت کا دار ومدار اس پہ ہے کہ اس کی اسناد اصولِ حدیث کی شرائط پر پوری اترتی ہیں یا نہیں چنانچہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے علاوہ سینکڑوں آئمہ حدیث نے احادیث کے مجموعے مرتب فرمائے ان میں جو حدیث بھی مذکورہ شرائط پر پوری اُترتی ہو وہ درست ہے یہ بھی ممکن ہے کہ ان کتابوں کی کوئی حدیث سنداً صحیحین سے بھی اعلیٰ معیار کی ہو مثلاً ابن ماجہ صحاح ستہ میں چھٹے نمبر پر ہے لیکن اس میں بعض احادیث جس اعلیٰ سند کے ساتھ آئی ہیں وہ صحیحین میں بھی اتنی اعلیٰ سند کے ساتھ نہیں ہیں۔ (ملاحظہ کریں ماتمس الیہ الحاجہ)۔

لہٰذا محض یہ کہ وہ بخاری یا مسلم کی حدیث نہیں۔ یہ درست نہیں۔ تو یہ نظریہ درست نہیں۔ بلکہ اصول یہ ہے کہ وہ حدیث اصول حدیث کے لحاظ سے کیا مقام رکھتی ہے۔

(۲) آئمہ مجتہدین کے درمیان سینکڑوں فقہی مسائل میں جو اختلاف واقع ہوئے اسکا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہر مجتہد کا طرز استدلال (Reasoning) اور طریقہ استنباط میں فرق ہوتا ہے مثلاً بعض مجتہدین کا طرز یہ ہے کہ اگر ایک مسئلے میں احادیث بظاہر متعارض ہوں۔ تو وہ اس حدیث کو لے لے۔ جس کی سند سب سے زیادہ صحیح ہو خواہ دوسری احادیث بھی سنداً درست ہوں اسکے بر خلاف بعض حضرات ان روایات کی ایسی تشریح کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو جائیں اور تعارض باقی نہ رہے خواہ کم درجہ کی صحیح یا حسن حدیث کو اصل قرار دے کر صحیح حدیث کی خلاف ظاہر توجیہ کرنی پڑے اور بعض مجتہدین کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اس حدیث کو اختیار کر لیتے ہیں جس پر صحابہؓ وتابعینؒ کا عمل رہا ہو اور دوسری احادیث میں تاویل کرتے ہیں امام ابو حنیفہؒ نے احادیث میں تطبیق کی کوشش کی اگر ضعیف احادیث کی متعارض کوئی حدیث نہ ہو تو اسپر بھی عمل کرنے میں اگر کسی دلیل کے معارض دلیل موجود ہو جس سے ثابت ہوتا ہو کہ یہ دلیل مراد نہیں مثلاً عام کے مقابلے میں خاص کا ہونا مطلق کے مقابلے میں مقید کا ہونا، مثلاً قہقہ سے وضو ٹوٹ جانا، شہد پر زکوۃ واجب ہونا)۔

(۳) احادیث کی تصحیح ایک اجتہادی معاملہ ہے اسی وجہ سے علمائے جرح و تعدیل کے درمیان اس بارے میں اختلاف رہتا ہے ایک حدیث ایک امام کے نزدیک صحیح یا حسن ہوتی ہے جبکہ دوسرا اُسے ضعیف قرار دیتا ہے بعض اوقات امام ابو حنیفہؒ اپنے اجتہاد سے کسی حدیث کو قابل عمل قرار دیتے ہیں اور دوسرے مجتہدین اسے ضعیف سمجھ کر ترک دیتے ہیں امام ابو حنیفہؒ چونکہ خود مجتہد ہیں اسلئے دوسرے مجتہدین کے اقوال ان پر حجت نہیں ہیں۔

(۴) بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک حدیث امام حنیفہؒ کو صحیح سند کے ساتھ پہنچی جس پر انہوں نے عمل کیا (اس لئے کہ وہ خیر القرون کے آدمی ہیں) لیکن اُنکے بعد کے راویوں میں سے کوئی راوی ضعیف آگیا اسلئے بعد کے آئمہؒ نے اُسے چھوڑ دیا لیکن امام ابو حنیفہؒ نے جو حدیث روایت کی وہ بالکل درست تھی۔

(۵) اگر کوئی محدث کسی حدیث کو ضعیف قرار دیتا ہے تو بعض اوقات اسکے پیش نظر اس حدیث کا کوئی خاص طریقہ ہوتا ہے لہٰذا یہ عین ممکن ہے کہ کسی دوسرے طریقہ میں وہی حدیث صحیح سند کے ساتھ آئی ہو۔

مثلاً من کان لہ امام فقراءۃ الامام لہ قراءۃ (ترمذی) کی حدیث کو بعض محدثین نے کسی خاص طریق کی بناء پر ضعیف کہا ہے لیکن مسند احمد بن منیع اور کتاب الاثار وغیرہ میں یہی حدیث بالکل صحیح سند کے ساتھ آئی ہے۔

(۶) بسا اوقات ایک حدیث سنداً ضعیف ہوتی ہے لیکن وہ چونکہ متعدد طرق اور سندوں سے نقل کی گئی ہوتی ہے اور اُسے مختلف راوی روایات کرتے ہیں اسلئے اُسے قبول کر لیا جاتا ہے اور محدثین اسے حسن لغیرہ کہتے ہیں ایسی حدیث پر عمل کرنے والے کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے ضعیف حدیث سے استدلال کیا ہے مثلاً شب برآت کی رات کو جاگنے کی فضیلت ایک نہیں بلکہ متعدد احادیث ہیں جو کہ دس صحابہؓ سے منقول ہیں وارد ہوئی ہیں تو باوجود اسکے ضعف کے اس حدیث کے تحت تابعینؒ تبع تابعینؒ علماء کرام محدثینؒ اور اُمت محمدیہ میں اس رات کو جاگ کر عبادت کا اہتمام کرنا ثابت ہے۔

(۷) بعض اوقات ایک حدیث ضعیف ہوتی ہے اور حدیث کے ضعیف ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسکی سند میں کوئی راوی ضعیف آگیا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر ضعیف راوی ہمیشہ غلط ہی روایت کرے۔ لہٰذا اگر قوی قرائن اسکی صحت پر دلالت کرتے ہوں تو اسے قبول کر لیا جاتا ہے۔ جیسے کوئی حدیث تو ضعیف تھی لیکن تمام صحابہؓ اور تابعین نے اس پر عمل کیا۔ تو یہ اس بات کا قوی قرینہ ہے کہ یہاں ضعیف راوی نے صحیح روایت نقل کی۔ اس کو "تلقی بالقبول" کہا جاتا ہے۔ ایسی احادیث کو مسلمان فقہا اور محدثین نے صحیح سمجھ کر اسکی بنیاد پر قانون سازی کی۔ ایسی احادیث بسا اوقات متواتر کے حکم میں جانی گئی ہیں۔

(۸) حافظ ابن قیمؒ "تلقین وصیت" کے بارے میں ایک حدیث نقل کر کے لکھتے ہیں " یہ حدیث اگرچہ کسی صحیح سند سے ثابت نہیں لیکن پھر بھی تمام بلادِ اسلامیہ کا ہر زمانے میں بغیر کسی انکار کے اسکے مطابق عمل کرنا اس حدیث کو معمول بہ بنانے کے لیئے کافی ہے۔ (کتاب الروح صفحہ 14)

علاوہ ازیں " تلقی بالقبول" کی تائید میں بہت سے فقہا نے اسی آراء کا اظہار کیا ہے۔ ساری بات کا نتیجہ یہ ہے کہ حدیث ضعیف کو جب تلقی بالقبول حاصل ہو جائے اور مسلمان عوام و خواص اور فقہا و محدثین اسے معمول بہ بنالیں تو وہ صحیح سمجھی جائے گی۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ اس تلقی بالقبول کی وجہ سے متواتر کا درجہ اختیار کر سکتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہ اسلامی کے چاروں

مکاتب فکر کے بانی آئمہ یعنی امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اس زمانے میں پیدا ہوئے۔ جسے عہدِ رسالت سے قریب ہونے کا فخر حاصل تھا۔ اور جسوقت علوم اسلامیہ مدون ہو رہے تھے اور جس وقت مسلمانوں میں عام طور پر انہی اخلاق و عادات کا چلن تھا۔ جن پر رسول اللہ ﷺ انھیں ڈال گئے تھے۔ اس وقت علم حدیث اپنے عروج و شباب پر تھا۔ ہزاروں افراد نے اپنی زندگیاں حدیث کی خدمت کیلئے وقف کر رکھی تھیں۔ لہٰذا اس دور میں کسی حدیث پر ان بزرگوں کا باتفاق اور پوری امت کا بلا اختلاف عمل کرنا اسی وقت ممکن تھا جب وہ اس دور میں تواتر کی حد تک مشہور رہی ہو۔ اور ایسی صورت میں محض اتنی بات کی وجہ سے اس حدیث کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ بعد میں اس کو کسی ضعیف راوی نے روایت کر دیا۔

" اسناد اسلیئے ہوتی ہیں تا کہ دین میں کوئی ایسی چیز داخل نہ ہو جو در حقیقت دین میں شامل نہیں۔ نہ کہ اسلیئے کہ دین سے کوئی ایسی چیز خارج کر دے۔ جو خود سند بیان کرنے والوں کے عمل سے بھی دین میں ثابت ہے۔ (الاجوبۃ الفاضلۃ ص۔ 238)

(۹) بعض اوقات ضعیف احادیث کو صحیح سند والی روایت پر ترجیح دی جاتی ہے مثلاً آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کا واقعہ ہے کہ وہ حضرت ابوالعاصؓ کے نکاح میں تھیں۔ وہ شروع میں کافر تھے۔ بعد میں مسلمان ہوئے اب اس میں روایت کا اختلاف ہے کہ انکے اسلام قبول کرنے کے بعد آنحضرت ﷺ نے انکا سابق نکاح برقرار رکھا یا نیا نکاح کرایا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کے مطابق آپ ﷺ نے نیا نکاح کرایا۔ یہ روایت ضعیف ہے اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق سابق نکاح برقرار رکھا۔ یہ صحیح ہے لیکن امام ترمذی نے تعامل صحابہؓ کی وجہ سے پہلی ضعیف روایت کو ترجیح دی ہے۔ (جامع ترمذی۔ کتاب النکاح)

(۱۰) جب کوئی محدث کسی حدیث کو ضعیف کہتا ہے تو اسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ حدیث جس سند سے آ رہی ہے اس میں صحیح اور حسن کی شرائط نہیں پائی جاتیں۔ اور حدیث کو بیان کرنے والے ثقہ اور قوی راوی نہیں ہیں۔ یہ مطلب ہر گز نہیں ہوتا کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ نے یقیناً نہیں فرمائی۔ کیونکہ کسی راوی کو ضعیف اس لیئے قرار دیا گیا کہ اسکے حافظے ضبط یا عدالت میں کوئی نقص ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اسکی روایت کردہ کوئی مخصوص حدیث بھی صحیح نہ ہو۔ کیونکہ جس شخص کا حافظہ (مراد وہ حافظہ جو محدثین کے ہاں راوی کیلئے مقصود ہے اور بڑی کڑی شرائط چاہتا ہے) اچھا نہ ہو۔ اسکے لیئے یہ لازم نہیں کہ وہ جب کبھی کوئی بات بیان کرے تو اسے بھول چوک ضرور ہو یا جس شخص کا ضبط اچھا نہیں وہ اکثر خلط ملط کا شکار ہوتا ہے۔ اس کے لیئے یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر مرتبہ غلطی کرے لہٰذا ضعیف حدیث کے بارے میں یہ خیال کہ وہ فی نفسہ غلط ہے۔ بہت بڑی غلط فہمی ہے حدیث ضعیف میں بھی احتمال صدق پایا جاتا ہے اور اس بات کا پورا امکان ہوتا ہے کہ بیان کرنے والے راوی نے اپنے ضعف کے باوجود حدیث نبوی کی امانت بالکل صحیح منتقل کی اور خطا و نسیان اور کذب و اختلاط سے پرہیز کیا۔ اسلیئے علماء امت اور فقہاء و محدثین کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ حدیث ضعیف کو اسلام کے دوسرے اصول و ضوابط اور دین و شریعت کے عام مزاج کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ اگر وہ اسلام کے بنیادی اصولوں اور شریعت کے عام مزاج کی کسوٹی پر پورا اترے تو اسکے بعد وہ قرائن سے اس حدیث کو جانچتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا ایسے قرائن پائے جاتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ یہ حدیث واقعۃً حضور ﷺ نے ارشاد فرمائی ہو گی یا نہیں؟ چنانچہ اگر قرائن سے ضعیف حدیث کی تائید ہوتی ہو تو اسے معمول بنایا جاتا ہے۔

اسی طرح کئی ضعیف احادیث ایسی ہیں جنکا متن قرآنی آیات کی تفسیر ہے مثلاً یہ حدیث دیکھیں: " حضرت ابو امامہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ابلیس زمین پر آنے لگا تو اس نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا۔ " اے پروردگار تو مجھے زمین پر بھیج رہا ہے اور راندہء درگاہ کر رہا ہے میرے لیئے کوئی گھر بھی بنادے" تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا" تیرا گھر حمام ہے" اس نے عرض کیا" میرے لیئے کوئی بیٹھک (مجلس) بھی بنادے" فرمایا" بازار اور راستے تیری بیٹھک ہیں" عرض کیا" میرے لیئے کھانا بھی مقرر فرمادے" فرمایا" تیرا کھانا ہر وہ چیز ہے جس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے" عرض کیا میرے پینے کیلئے بھی کوئی چیز مقرر کر دیجئیے۔ فرمایا۔ " ہر نشہ آور چیز تیرا مشروب ہے" عرض کیا۔ مجھے اپنی طرف بلانے کا کوئی ذریعہ بھی عنایت فرمادے۔ فرمایا" باجے تاشے تیرے موذن ہیں" عرض کیا میرے لیئے قرآن بار بار پڑھی جانے والی چیز بھی بنادے۔ فرمایا "شعر تیرا قرآن ہے" عرض کیا۔ مجھے کچھ لکھنے کے لیئے بھی دے دے۔ فرمایا" گودنا تیری لکھائی ہے"۔ عرض کیا۔ میرے لیئے کلام بھی مقرر فرمادے فرمایا" جھوٹ تیرا کلام ہے" عرض کیا۔ میرے لیئے جال بھی بنادے۔ فرمایا" عورتیں تیرے جال ہیں"۔

اس حدیث کو امام طبرانی نے روایت کیا اور اسکی سند میں علی بن یزید الہانی نامی راوی ضعیف ہیں۔ اس حدیث کو امام طبرانی معجم کبیر میں لائے اسکی سند میں ایک راوی یحیی بن صالح ایلی ضعیف ہیں۔ لیکن حافظ ابن قیمؒ نے کہا کہ انفرادی طور پر اس حدیث کا ہر ہر جزء انفرادی طور پر قرآن کریم یا احادیث نبوی ﷺ سے ثابت ہے۔ کتاب " اغاثۃ اللھفان" میں لکھتے ہیں " اس روبعیت کے شواہد کثیر ہیں اور اسکے ہر ہر جملہ کیلیے قرآن یا حدیث میں بہت سے شواہد پائے جاتے ہیں "لہٰذا یہ حجت ہے۔

علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنے رسالہ،، رفع الملام،، میں کبھی امام کے کسی حدیث کو چھوڑ دینے کی دس وجوہ لکھی ہیں۔ جن میں یہ بھی ہے کہ ایک امام کو حدیث پہنچی مگر انکے نزدیک ثابت نہیں ہوئی یا یہ کہ انہوں نے جزِ خبرِ واحد کیلیئے کچھ شرائط مقرر کی ہیں جو اس حدیث میں نہیں پائی گئی نیز یہ کہ حدیث تو پہنچی مگر اس کے نزدیک دوسری احادیث معارض تھیں۔ جس وجہ سے اس حدیث کی تاویل کرنی لازم ہوئی۔ دس وجوہ لکھنے کے بعد کہتے ہیں کہ " یہ وجوہ تو ظاہر ہیں اور بہت سی احادیث میں ممکن ہے کہ عالم کے نزدیک کوئی اور ایسی وجہ ہو جسکا ہمیں پتہ نہ چلا ہو اسلیئے کہ علم کی گہرائیاں بہت کشادہ ہیں ہم اسکا احاطہ نہیں کر سکتے۔ بہت سے ان رموز پر جو علماء کے سینے میں پوشیدہ ہیں اور عالم کبھی اپنی دلیل کو ظاہر کرتا ہے اور کبھی نہیں کرتا۔ اور جب ظاہر کرتا ہے تو کبھی ہم تک وہ پہنچتی ہے اور کبھی نہیں پہنچتی۔ اور اگر پہنچتی بھی ہے تو اسکی وجہ استدلال (Reasoning) کو کبھی ہم ادراک کر سکتے ہیں اور کبھی نہیں۔ وہ دلیل فی نفسہ خواہ درست ہو خواہ خطا۔ آئمہ اربعہؒ کے پاس بہت سی ایسی صحیح وصریح حدیثیں پہنچیں لیکن بعض دلائل قویہ کی وجہ سے انہوں نے انکو نہیں لیا۔

آئمہ مقبولین میں سے کوئی ایسا نہیں جو دیدہ ودانستہ احادیث کی مخالفت کرتا ہو۔ کہ یہ خلفاء رسول اور سنتوں کو زندہ کرنے والے سب اس بات پر متفق ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع واجب ہے۔ اگر کا ہوگا"۔

ضعیف حدیث پر مزید تفصیلی بحث:

حدیث صحیح کی تعریف یہ ہے ہو ما اتصل سندہ بعدول الضابطین من غیر شذوذ ولا علۃ جس کی سند متصل ہو اور راوی عادل ضابط ہوں اور نہ وہ روایت شاذ ہو اور نہ اس میں کوئی ضعف کی علت ہو۔

اب حدیث کے ضعف اور صحت کے متعلق ائمہ جرح کے اصول مختلف ہیں۔ امام بخاریؒ حدیث تب لیتے ہیں جب دو نوں راویوں کے مابین ملاقات بھی ہو چکی ہو اور زمانہ بھی ایک ہو اور امام مسلمؒ اور جمہور ائمہ جرح (جس پر اتفاق ہے) کے نزدیک زمانہ تو ایک ہو لیکن ملاقات کا صرف امکان ہو بلکہ امام مسلمؒ جو امام بخاری کے شاگرد ہیں اپنے اس استاد کو، ،برائے نام محدث،، تک کے الفاظ سے یاد کیا ہے تو کیا اگر دو راویوں میں ملاقات نہیں ہوئی ہو تو ہم امام بخاریؒ کے اس روایت کو ضعیف کہہ کر قناعت کر کے بیٹھ جائیں؟ جسکو اس تفصیل کا علم نہ ہو گا وہ تو امام بخاریؒ کے ضعیف کہنے کو ہی حق سمجھے گا لیکن مذکورہ بات کا اس کو علم نہ ہو گا۔ اسی طرح حدیث کے صحیح اور ضعیف کہنے کے بارے میں آئمہ جرح کے اصول مختلف ہوتے ہیں۔ بعض (اصول جرح سے ناواقف) حضرات کسی اردو کی کتاب میں ضعیف کا لفظ دیکھ کر اور راوی کے بارے میں چند افراد کی آراء کو دیکھ کر ضرور غلط فہمی کا شکار ہوں گے۔ جیسا کہ امام ابو داؤدؒ ایک حدیث کو ضعیف کہتے ہیں اور ترمذیؒ اسی حدیث کو حسن صحیح کہتے ہیں۔ اب اگر ایک شخص ابو داؤدؒ کی رائے لے لے تو کیا ترمذیؒ کی بات غلط ہے جب کہ دیگر آئمہ بھی تصحیح ذکر کریں؟ للذا کسی کی تقریر یا اردو کتاب میں کسی حدیث کو ضعیف کہنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ روایت واقعی ضعیف ہے۔

سنن نسائی کا مذہب یہ ہے کہ جبتک محدثین کسی حدیث کو بالاجماع ضعیف نہ کہیں وہ اس کو چھوڑتے نہیں بلکہ نسائیؒ (جو صحاح ستہ میں ہے۔) اس کو ذکر کرتے ہیں۔ اور امام ابی داؤدؒ کا مسلک صحیح حدیث کو اپنی کتاب میں لاتا ہے۔ لیکن اسی باب میں اس کے ہاں حدیث صحیح نہ ملے تو ضعیف حدیث کو ذکر کرتے ہیں۔ اور دیگر محدثین کے اقوال وآراء سے اس کی تصحیح پیش فرماتے ہیں۔ (زھر الربی علی المجتبیٰ ۱ ۳)

علامہ ابن تیمیہؒ ،،رفع الملام عن الائمۃ الاعلام،، میں لکھا ہے کہ کوئی امام بھی حضور اکرم ﷺ کی مخالفت قصداً ان کی سنت چھوڑ کر نہیں کرتا اس لئے کہ فلانی حدیث تو صحیح ہے جسکو اس نے چھوڑا لیکن اس کے سامنے ایسی دلیل آئی ہو گی جو پہلے سے اس کے نزدیک قوی ہو (ص ۱۵) بلکہ ابن تیمیہؒ کی کتاب کا مقصد بھی اس کے نام سے ظاہر ہے کہ بعض آئمہ کا موقف جو کمزور بتایا جاتا ہے غلط ہے بلکہ حدیث کی تصحیح وتضعیف اجتہادی الہامی اور غالب گمان کا مسئلہ ہے کہ ایک کے نزدیک وہ حدیث صحیح اور دوسرے کے نزدیک ضعیف ہو گی ابن تیمیہؒ کی کتاب کا نام ہے،،اونچے ائمہ کرامؒ سے ملامتی کو اٹھانا،،

(۱) کبھی کبھی ایک حدیث (بالکل ضعیف حدیث۔ راوی بالکل کمزور) صحیح بن جاتی ہے جبکہ امت اور اہل علم کی عملی قبولیت اس کو حاصل ہو جائے۔ چنانچہ ابن عبد البر مالکیؒ امام ترمذیؒ سے نقل کرتے ہیں کہ سمندر کا پانی پاک اور اس کا مردار حلال ہے، ھو الطھور ماءہ والحل میتتہ محدثین نے ضعیف کہا ہے لیکن امام بخاریؒ نے اسکی تصحیح کی ہے اس لئے کہ امت نے اس کو قبول کیا ہے۔

(استذکار۔ اجوبۃ الفاضلہ لعبد لحی الکھنوی)

(۲) ابن عباس کی حدیث ہے من جمع بین الصلوتین فقد اتی بابا من الکبائر (ترمذی ۳۰۳) ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ حسینؒ نے کہا کہ امام احمدؒ نے اس حدیث کو ضعیف کہا اور آگے کہا کہ والعمل علیہ عند اہل العلم کہ اہل علم کا اسپر عمل ہے تو گویا اشارہ کیا کہ اہل علم کے عمل سے یہ حدیث قوی ہو گئی۔ اور بہت سارے محدثین نے لکھا ہے کہ اہل علم اگر کسی حدیث پر عمل کریں تو وہ صحیح ہو جاتی ہے۔

(سیوطیؒ کی تعقبات)

(۳) ابن حجرؒ فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ امام ترمذی کا یہ کہنا کہ والعمل علیہ عند اھل العلم کہ اہل علم کا اسپر عمل ہے تقاضا کرتا ہے کہ اس حدیث کی اصل قوی ہے طلاق الامۃ ثنتان اھل علم نے اسکو غریب کہا ہے لیکن عمل نے اسکو مضبوط بنا دیا۔

(۴) صلوۃ التسبیح کی روایت کو محدثین نے ضعیف لکھا ہے لیکن ابن المبارکؒ اسکو پڑھتے تھے اہل علم اور صالحین اسکو پڑھتے ہیں لہذا اسکو پڑھنا ٹھیک ہے اور روایت صحیح بن گئی. (تعقبات للسیوطی ۱۳)

(باقی اسکو جماعت کے سے پڑھنا کسی حدیث سے ثابت نہیں) ۔

(۵) طلاق الامۃ اطلقتان وعہد تہاحیضتان (ابو داود ، ابن ماجہ) اور اسی طرح کی اور حدیث دار قطنی میں ہے یہ ضعیف ہیں لیکن قبولیت سے صحیح بن گئی (احکام القرآن للجصاص)اور امام مالکؒ تو فرماتے ہیں کہ مدینہ میں کسی حدیث کا مشہور معمول ہونا صحت کی علامت ہے چاہے سند صحیح نہ ہو۔

(٦) اور علامہ ابن حجرؒ نے فتح الباری شرح بخاری میں اس بات پر شدید تنقید کی ہے اور فرمایا کہ ،، اس موقف کی تقلید بالکل جائز نہیں ہے کہ بخاری مسلم کی احادیث صحیح ہیں پھر جو صرف بخاری میں ہیں اور پھر جو جو صرف مسلم میں ہیں پھر جو انکی شرائط پر ہیں ،، بلکہ انکی شرائط پر اگر کسی اور کتاب میں روایت ہو یا راویوں کی ثقاہت کے ساتھ کسی بھی حدیث کی کتاب میں روایت ہو تو صحیح ہو گی۔ (۳۱۸۱)

(۷) اور تدریب الراوی میں ہے کہ امام حاکمؒ نے فرمایا کہ حدیث صحیح کی دس قسمیں ہیں پانچ کی صحت میں اتفاق اور پانچ کی صحت اور ضعف میں اختلاف ہے۔ (ص ٦۵ تدریب مدخل ص ۱۱)

اب جو شخص اردو کی کتاب میں ایک حدیث کو ضعیف تحریر لکھا دیکھے گا تو دینی علوم میں مہارت نہ ہونے کی وجہ سے اسی کو لے کر بیٹھا رہے گا اور اسکو اپنی غلطی کا علم نہ ہو گا۔ کسی حدیث یا راوی کے بارے میں اگر صحیح و یا ضعیف ہونے کا اختلاف ہو اور بہت سارے حضرات اگر ضعیف کہیں اور دیگر محدثین اسکو صحیح کہیں تو وہ حسن روایت اور راوی ہوتا ہے جسطرح ابن ابی لیلیٰؒ، ابن عمارہؒ، ابن حکیمؒ عن ابیہؒ عن جدہ، عمروؒ بن شعیبؒ عن ابیہؒ عن جدہ اور ابن اسحاقؒ عن الیتمیؒ کی احادیث اور راویوں میں حارثؒ، عاصمؒ بن حمزہ اور شریک القاضیؒ شہر بن حوشبؒ وغیرہ حضرات یہ راویات اور راوی حسن ہونگے (تدریب ۱۹) الا یہ کہ بالا جماع وہ روایت یا ،، ی ضعیف ہو اور اہل علم کا اس پر عمل نہ ہو۔

۱) شمس الدین حنبلیؒ فرماتے ہیں کہ دو آدمی (یعنی تمام اس فن اسماء الرجال کے ماہرین میں سے) کسی ضعیف کو ثقہ کہنے یا ثقہ کو ـ کہنے پر جمع نہیں ہوتے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ بعض نے اگر ثقہ کہا اور اسی راوی کو دیگر حضرات نے ضعیف کہا ہے تو وہ حسن یت ہو گا اسی وجہ سے امام نسائیؒ نے تو نسائی شریف میں ہر راوی سے روایت لی جب تک تمام آئمہ حدیث اس سے روایت نہ لینے متفق نہیں ہوتے ہوں۔ (الرفع والتکمیل ص ۱۸۱ فتح المغیث للسخاوی ص ۴۸۲) اس سے معلوم ہوا کہ جبتک اس راوی اور حدیث ے بارے میں تفصیلی علم نہ ہو آپ کے لئے کسی طرح بھی (اپنے موقف کے خلاف) اردو میں کتاب لکھنے والے کی تحریر پر یقین کرنا درست نہیں ہے اور یہ علم عربی میں ہے اردو میں منتقل نہیں ہوا ہے۔

(۹) علامہ سبکیؒ شفاء السقام میں فرماتے ہیں کہ بہت سارے احادیث ضعیفہ کا (ایک مسئلہ پر جمع ہونا) قوت پیدا کرتا ہے اور بھی وہ روایت حسن یا قوی بن جاتی ہے۔ (شفاء السقام ص ۱۱)

جس طرح کہ مرد اور عورت کی نماز میں فرق کے حوالے سے ہمارے پاس سات آٹھ سے زیادہ روایات ہیں (حضور ﷺ سے صریح مرسل روایات اور صحابہؓ کے فتوے) جو ایک دوسرے کیساتھ ملکر یہ روایات حسن بن جاتی ہیں لیکن جو حضرات ان روایات کے فرق کے مطابق نماز نہیں پڑھتے انکے کے پاس ایک صریح روایت بھی موجود نہیں ہے بلکہ حدیث کے مقابلے میں صرف قیاس پر چلتے ہیں۔ مثلاً وہ اس فرق کو نہ مان کر اپنی دلیل میں بخاری شریف کی عام روایت لاتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ صلوا کمارایتمونی اصلی نماز پڑھو جسطرح مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو۔ اس میں عورتیں بھی شامل ہیں تو یہ تو قیاس ہے جسکو یہ مانتے ہی نہیں اس حدیث میں تو صراحت نہیں کہ یہ عورتوں کیلئے بھی ہے اور اگر یہ عام ہے تو اس حدیث کو آگے بھی پڑھو اسی حدیث میں آگے یہ الفاظ ہیں ولیئوذنکم احدکم اور تم میں ایک اذان کہے تو کیا اس عام الفاظ سے یہ کشید (Deduct) کرنا جائز ہوگا کہ عورت بھی اذان دے سکتی ہے؟ اسیطرح اس حدیث کا حوالہ دینا کہ کتے کیطرح سجدہ کی ممانعت ہے لہٰذا عورتیں سمٹ کر سجدہ نہ کریں بلکل درست نہیں اسلئے کہ ان دونوں صورتوں میں آپ حضرات کی دلیل قیاس ہے جو آپ کے نزدیک حجت ہی نہیں۔ دیگر یہ کہ اس حدیث میں یہ لفظ قابل غور ہے کہ کتے کیطرح اس طرح سجدہ مت کریں کہ پورا ہاتھ زمین کیساتھ کہنی سمیت لگا ہو۔ اور ہمارے پاس جو روایات ہیں وہ اپنی کثرت کی بناپر حسن ہیں۔ تو آپ بتائیں کہ قیاس پر عمل بہتر ہے یا حسن روایت پر؟

بخاری شریف میں جو یہ مروی ہے کہ ام الدرداء رحمۃ اللہ علیہا مردوں کیطرح نماز پڑھتی تھیں تو یہ تو ہماری دلیل ہوی کہ عام عورتیں سمٹ کر نماز پڑھتی تھی اور وہ مردوں کی طرح نماز پڑھتی تھی تو یہ انکا اپنا اجتہاد تھا اسلئے تو امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ وہ فقیہہ تھیں دوسری بات یہ ہے کہ یہ صحابیہؓ نہیں تھیں بلکہ تابعیہؒ تھیں (شرح بخاری فتح الباری لابن حجرؒ) اور تابعیہ کیا صحابی کا قول مرسل بھی ان حضرات کے ہاں قبول نہیں؟ تو یہاں مرسل روایت سے کس طرح دلیل پکڑتے ہیں؟۔

ضعیف حدیث فضائل اعمال میں مقبول ہے:

علامہ ابن حجرؒ،، شرح اربعین،، میں فرماتے ہیں کہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل کرنا درست ہے اور اس کو ثواب بھی ملے گا۔ جب کہ اس حدیث کا تعلق حلت اور حرمت کے ساتھ نہ ہو۔ بلکہ علامہ سیوطیؒ تو فرماتے ہیں کہ احکام میں بھی اس پر عمل کرنا درست ہے جبکہ اس میں احتیاط ہو۔ (طحطاوی۔ رد المحتار ا۔۸۷) ابن القیمؒ نے اعلام الموقعین اور علامہ سیوطیؒ نے تقریب میں یہی کچھ فرمایا ہے۔ اور ضعیف پر عمل مستحب کہلایا جائے گا۔ اور حدیث کو صحیح و ضعیف کہنے والے علماء ہی یہی بات کر رہے ہیں۔ جس طرح کہ شعبان کی رات کی احادیث ابن ماجہ اور ابو بکر بن ابی شیبہؒ میں ہیں۔ تو ایک طرف بدعتی لوگوں شعبان کی رات لاؤڈ سپیکر کھول کر غیر شرعی اجتماعی اعمال اور بدعات میں مصروف ہوتے ہیں۔ تو دوسری طرف تمام مقلدین کو اندھے کہنے والے مستحب اور انفرادی اعمال کا ہی انکار کر لیتے ہیں۔ اور خواتین میں صلوٰۃ التسبیح کی باجماعت نمازوں کا اہتمام ہو رہا ہے جو قرآن وحدیث میں ثابت ہی نہیں۔ تاہم حدیث ضعیف پر اپنی طرف سے اضافہ بدعت شمار ہوگا مثلاً حضور ﷺ کا شعبان کی رات ایک بار

قبرستان جانا حدیث سے ثابت ہے لہٰذا جو اس کو دیکھ کر ہر شعبان جانے گا تو یہ غلط ہو گا اس لئے کہ حضور ﷺ ایک بار گئے ہیں۔(ہا ں ویسے عبرت کیلئے جانا درست ہے)

مرسل روایت پر علمی بحث:

مرسل اس روایت کو کہتے کہ صحابیؓ کہے کہ حضور ﷺ نے یہ فرمایا لیکن حضور ﷺ سے سننے کی صراحت نہ کرے یہ بالاجماع مقبول ہے اسمیں کسی کا اختلاف نہیں اور مرسل یہ بھی ہے کہ تابعیؒ کہے کہ حضور ﷺ نے یوں فرمایا جسطرح کہ مسلم شریف میں ہے کہ سعید بن المسیبؒ نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے مزابنہ سے منع فرمایا ہے تو اسمیں اختلاف ہے کہ آیا یہ مرسل مقبول ہے یا نہیں؟ تو محدثین اسکو صحیح نہیں مانتے لیکن ائمہ ثلاثہ۔(امام ابو حنیفہؒ مالکؒ احمدؒ) کے نزدیک یہ حجت ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک چند شرائط کیساتھ حجت ہے (تبع تابعی کی مرسل روایت میں بھی یہی اختلاف ہے) اب جو حضرات مرسل کو حجت نہیں مانتے اسکا مطلب آپکو سمجھاتے ہیں۔

(۱) ابن الحنبلیؒ نے ,, قفوالاثر ,, میں لکھا ہے کہ مرسل روایت میں تفصیل ہے اور صحابیؓ کا مرسل بالکل اجماعا مقبول ہے اور تابعینؒ کا مرسل بھی حجت ہے اور تبع تابعین کا مرسل امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک حجت ہے مطلقا اور امام شافعیؒ کے نزدیک پانچ شرائط سے حجت ہے۔(ص ۱۴)

(۲) علامہ آمدی شافعیؒ ,, الاحکام ,, میں فرماتے ہیں کہ محدثین نے مرسل روایت کو قبول کرنے کے بارے میں اختلاف کیا ہے اور مرسل اسکو کہتے ہیں کہ ایک عادل کہے کہ حضور اکرم ﷺ نے یوں فرمایا اور اس نے حضور ﷺ سے ملاقات نہیں کی ہو تو امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی مشہور روایت اور تمام فقہاء کے ہاں ایسی روایت قبول ہے۔

(۳) ابن رجب حنبلیؒ فرماتے ہیں کہ مرسل کے ساتھ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ اور ان کے ساتھیوں نے دلیل پکڑی ہے اور امام شافعی اور احمدؒ نے بھی ان شرائط کے تحت مرسل کو حجت مانا ہے۔

(۱) جبکہ ایک اور مسند روایت سے اسکی مضبوطی آجائے (۲) یا اس معنی پر دوسرا مرسل آجائے (۳) یا بعض دوسرے صحابہؓ کا اسطرح قول آجائے جو مرسل سے ثابت ہے (۴) یا اکثر اھل علم اسی مرسل پر فتوی دیں۔ تو ان شرائط کے تحت مرسل حجت ہے۔

(۴) بعض محدثین نے جو مرسل کو صحیح نہیں کہا اسکا مطلب یہ ہے کہ انکے ہاں جو معین حدیث صحیح کی تعریف ہے وہ اس پر صحیح نہیں بیٹھتی باقی فقہاء کرامؒ جو اسکو صحیح قرار دیتے ہیں تو اسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس مرسل کا جو معنی ہے وہ صحیح ہے۔

(۵) حافظ ابن حجرؒ ,, تہذیب التہذیب ,, میں فرماتے ہیں کہ دو سو سال تک کسی نے بھی مرسل روایت کا انکار نہیں کیا ہے

(۶) مندرجہ ذیل تابعین کی مرسل روایات بالاتفاق مقبول ہیں شعبیؒ (تذکرۃ الحفاظ ۱/۷۹) نخعیؒ (نصب الرایہ ۱/۵۲) سعید بن المسیبؒ (تدریب ۱۲۳) قاضی شریحؒ (اصابہ ۳۔۳۰۲) حسنؒ (مقاصد حسنہ للسخاویؒ ص ۱۸۳) ابن سیرینؒ (تمہید ۱۔۳۰) سعید بن جبیرؒ (تدریب ۱۲۵) مالک بن انسؒ (تدریب ۱۲۵) عطا بن ابی رباحؒ (ابن المدینی) زھریؒ (رسالہ ص ۴۶۹) قتادہؒ (بن سعیدؒ) اور ان جیسے بڑے حضرات کی مراسیل کو مذکورہ کتب میں مقبول گردانا گیا ہے جو حضرات مرسل کو نہیں مانتے وہ ان مراسیل کو بلا چوں چراں مانتے ہیں۔

خدشہ 13:

تیرہواں خدشہ یہ ہوتاہے کہ آپ کے پاس البانی کی طرح آدمی نہیں ہے وہ بڑے محدث ہیں۔یقینا یہ حضرت بہت اچھے محدث ہیں لیکن میرے سمیت ہر کسی سے غلطیاں ہوتی ہیں [1]۔

---

(۷) امام احمدؒ توفرماتے ہیں۔کہ تین علوم ایسے ہیں کہ جنکی سند نہیں۔بلکہ وہ مرسل روایات پر قائم ہیں۔ تفسیر۔۔۔مغازی(اسلامی لڑائیاں)۔۔اور ملاحم(مطلق لڑائیاں)۔۔۔لہٰذا جو مرسل روایت کو نہیں مانتا اس نے توان چیزوں میں شریعت کے بہت بڑے حصے سے ہاتھ دھولیا۔

(۸) اسلئے توشام کے عالم علامہ زاہد الکوثریؒ فرماتے ہیں کہ جس نے مرسل روایت کو رد کیا گویا اس نے آدھی شریعت کو رد کیا۔(تعلیق علی الشروط الائمہ الخمسہ للحازمی ۵۲)

تو معلوم ہوا کہ مرسل بالاجماع حجت ہے۔صرف دو آئمہ کچھ شرائط کیساتھ اسکو حجت مانتے ہیں۔بعض حضرات محدثین کی بات نہ سمجھنے کیوجہ سے کہتے ہیں کہ مرسل حجت نہیں اکثر لاعلم حضرات اپنے موقف کی کتب نہ پڑھنے اور علماء کرام کیساتھ نہ بیٹھنے کی بناپر کسی الگ مکتب فکر کی اردو کتب خالی الذھن ہو کر پڑھ لیتے ہیں ان اردو کتب سے وہ پریشان یا گمراہ ہو جاتے ہیں۔

(۹) علامہ ابن تیمیہؒ کی اس بات پر بحث کو سمیٹتے ہیں کہ وہ منہاج السنۃ النبویہ (۴۔۱۱۸) میں فرماتے کہ آیات کے شان نزول اکثر مرسل ہیں اگر ہم مرسل کو نہ مانیں توابن تیمیہؒ کی اس ارشاد کی روسے ہم آیات کی تفسیر ہرگز بیان نہیں کرسکتے۔اگرچہ جب بھی ہم قرآن کا درس دیتے ہیں تو پورا درس صحابہؓ اور تابعینؒ کی مرسل روایات ہی سے مزین ہوتا ہے۔

(۱۰) مرسل پر تفصیلی بحث کے بعد آپ کو حقیقت سمجھ میں آگئی ہوگی۔

[1] یہ بیماری 57ھ میں عارض ہوئی اس سے پہلے فضائل قرآن 48ھ میں، فضائل رمضان 49ھ میں اور فضائل تبلیغ 50ھ میں تصنیف کرچکے تھے لہٰذا یہ کہنا کہ فضائل اعمال کاآغاز کرتے وقت مصنف کادماغ ٹھیک نہیں تھا قطعاً غلط اور سو فیصد خلاف واقعہ بات ہے۔

تنبیہ: حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کے مذکورہ رسالوں کا سن تالیف آپ بیتی (176/1، 177) پر دیکھا جاسکتاہے اور ان رسائوں کے آخر میں بھی ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔

فضائل اعمال میں کل سات رسالے ہیں ان میں سے تین تو 57ھ سے پہلے کے تالیف شدہ ہیں، ایک رسالہ " مسلمانوں کی موجود پستی کا واحد علاج " مولانا احتشام الحسنؒ کا لکھا ہواہے۔بعض ناشرین نے فضائل اعمال میں فضائل درود شریف کو مندرج کردیاہے اور یہ رسالہ تواس بیماری کے 27 سال بعد 84ھ میں لکھاگیا۔(آپ بیتی: 183/1)

[1] **شیخ البانی اور احادیث رسول اللہ ﷺ:**

"حضرت اعظمی رحمہ اللہ کاالبانی کی تحقیقات کے بارے میں جو قلمی کارنامہ ہے اس کانام ہے "البانی شذوذہ واخطاءہ"۔

ایک عرب کادرد مند عالم دین سوال کرتا اور اہل علم سے پوچھتا ہے:

"یہ جو امام بخاری کی کتاب "الادب المفرد" اور ابن قیم کی کتاب "الوابل الصیب" کو ان کی طرف سے دو حصوں میں تقسیم کیا جارہا ہے ذرا بتلاؤ تمہارا خیال کیا ہے، کیا امام بخاری رحمہ اللہ نے جس طرح اپنی کتاب الجامع کا صحیح احادیث والا مجموعہ تیار کیا تھا وہ امام بخاری الادب المفرد میں صرف صحیح احادیث لانے پر قادر نہیں، امام بخاری اس سے عاجز تھے، حافظ ابن قیم عاجز تھے وہ "الوابل الصیب" اپنی کتاب میں صرف صحیح احادیث لاتے یا ان دونوں کو سنت اور صحیح سنت کے بارے میں وہ غیرت حاصل نہیں تھی جو آج ان کا حصہ بنی ہوئی ہے۔"

ان کا یہ کیسا خطرناک عمل ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے یہی عرب عالم کہتا ہے۔

اور یہ شاندار کارنامہ جیسا کہ البانیوں کا دعوی ہے کہ وہ انجام دے رہے ہیں ان کا وہ عمل ہے جو امت اور آنے والی نسلوں کا رشتہ احادیث وسنت کی اصل کتابوں سے کاٹ دینے والا ہے۔ (ایضاح: 1/ص: 29)

الاستاذ محمد عبداللہ شاکر فرماتے ہیں: "علمائے سلف اور ائمہ حدیث کا حدیث کے سلسلہ میں جو عظیم الشان کارنامہ اور ان کی جو مفید اور عظیم کوشش رہی ہے اس میں اور تمہارے اس عمل میں کہ تم پینسل پکڑ کے کسی حدیث پر صحیح کا نشان لگا کرکے اس کو ایک کتاب میں جمع کردو اور کسی پر ضعیف کا نشان لگا کر دوسری کتاب تیار کرو، کتنا فرق ہے۔ (ص: 32)

احادیث کے بارے میں البانی صاحب کی تحقیق کا یہی انداز تھا البانی احادیث کی تحقیق اور اس کی بحث میں کتنی محنت برداشت کرتے تھے اس کا اندازہ کرنے کے لئے ان کے ایک شاگرد کا وہ بیان کافی ہے جو آئندہ سطروں میں آرہا ہے۔

قصہ یہ ہے کہ ایک حدیث کے بارے میں البانی صاحب نے اپنی تحقیق کی روشنی میں ضعیف ہونے کا فیصلہ کردیا اور اس کی سند کے ایک راوی کو مجہول بتلایا، اس پر اعتراض ہوا کہ حضرت صاحب یہ حدیث نہ ضعیف ہے اور نہ راوی مجہول ہے آپ نے حافظ ابن حجر کی صرف تقریب دیکھ کر فیصلہ کیا ہے، اگر تراجم کی مزید کتابیں دیکھتے بلکہ حافظ ہی کی تہذیب بھی دیکھ لیتے تو بھی آپ نے حدیث پر اور اس کے سند کے راوی پر جو حکم لگایا ہے، یہ غلط تحقیق آپ سے صادر نہ ہوتی تو ان کے ایک شاگرد نے شیخ البانی کے قصور اور ناقص کارکرگی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے شیخ کا دفاع اس انداز سے کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: ہمارے شیخ حفظ اللہ کو تہذیب کی مراجعت کے لئے نشاط نہیں رہا۔ (ص: 331)

اندازہ لگایئے کہ احادیث رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ حضرات کتنے جری ہیں البانی صاحب رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث کو ضعیف قرار دینے کی ہمت کر رہے ہیں اور یہ توفیق نصیب نہیں ہو رہی ہے کہ اس کے بارے میں رجال کے متداول کتابوں اور تہذیب جیسی معروف ومشہور اور عام طور پر ہر کتب خانہ میں پائی جانے والی کتاب کی طرف بھی رجوع کریں شاگرد کا اپنے استاذ کی طرف سے یہ کتنا شاندار دفاع اور جواب ہے شیخ محمود سعید شاگرد کے اس جواب کے بارے میں فرماتے ہیں:

میں کہتا ہوں معاملہ یہاں ایک ایسے راوی کا ہے جس کے بارے میں فیصلہ یہ کرنا ہے کہ اس کی حدیث قابل اخذ ہے یا قابل رد، اور معاملہ صرف وہم کی بنیاد پر ایک سنت کو رد کرنے اور ایک بدعت کو ثابت کرنے کا ہے پس جب ایسے اہم موقع پر تہذیب جیسی عام طور پر پائی جانے والی کتاب کے بارے میں بحث وتحقیق اور نشاط معدوم ہے تو دوسری جگہوں اور دوسری کتابوں میں تو بدرجہ اولی یہ بحث وتحقیق اور یہ نشاط معدوم ہوگا۔ (ج: 1 / ص: 332)

حدیث رسول اللہ کے بارے میں البانی صاحب کی جرات اور سہولت پسندی کا یہ حال ہے جو ناظرین نے ملاحظہ فرمایا اور بحث وتحقیق کی اسی نادر مثال کے بل بوتہ پر ان کو جرات ہوتی ہے کہ وہ امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابن ماجہ اور دوسرے ائمہ حدیث کے کتابوں کے بارے میں فیصلہ فرمائیں اور ان کتابوں کو صحیح ضعیف میں تقسیم کریں اس جرات وجسارت پر افسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔

کسی حدیث پر صحت وضعف کا حکم لگانا بچوں کا کھیل نہیں ہے معاملہ احادیث رسول ﷺ کا ہے اس وجہ سے ایک محتاط محدث کسی حدیث کے بارے میں پہلے تمام متعلقہ امور پر غور کرتا ہے، اس حدیث پر ہر زاویہ سے نگاہ ڈالتا ہے کتنی سندوں سے یہ حدیث مروی ہے، اس حدیث کے شواہد اور کیا ہیں ان شواہد کا حال کیا ہے امت کا اس حدیث پر عمل ہے یا نہیں ائمہ حدیث کا اس حدیث کے بارے میں فیصلہ کیا ہے غرض پور تحقیق اور چھان بین کے بعد ہی ایک محتاط محدث حدیث کے بارے میں فیصلہ کرتا ہے پھر اس محدث کو دین اور دیانت کے اعتبار سے بھی بہت اعلیٰ معیار ہونا چاہیئے تاکہ حدیث کے بارے میں کوئی فیصلہ اس کے نفس کا تقاضانہ ہو۔

افسوس اس کا ہے کہ البانی صاحب نے ان تمام باتوں کا اپنی کتابوں میں خیال نہیں کیا اور قلم برداشتہ جو چاہا لکھ دیا، اور اب یہی ذہن زمانہ حال کے ان بعض لوگوں کا بھی ہوگیا ہے جو البانی کے فکر ومزاج سے متاثر ہیں۔

ایک کتاب جس کا پورا نام " التعریف باوھام من قسم السنن الی صحیح وضعیف "اس کتاب کے مصنف کا نام شیخ محمود سعید ہے دبئی کے دار البحوث والدراسات الاسلامیہ واحیاء التراث میں حدیث کی خدمت انجام دیتے ہیں اور بڑے محقق اور وسیع المطالعہ فی حدیث کے عالم ہیں شیخ محمود نے اپنی اس کتاب میں بطور خاص البانی صاحب کی چاروں کتابوں کا یعنی ضعیف ابوداؤد، ضعیف ترمذی، ضعیف نسائی، اور ضعیف ابن ماجہ کا بڑی دقت نظر اور مہارت فن سے جائزہ لیا ہے، اور احادیث کے بارے میں البانی صاحب کی جرات بیجا کا پورا محاسبہ کیا ہے اور ان کے غلطیوں سے اہل علم کو باخبر کیا ہے اور یہ دکھلایا ہے کہ شیخ البانی کا علم حدیث بہت ناقص اور سرسری مطالعہ والا تھا اس وجہ سے انہوں نے بہت سے ان احادیث کو بھی ضعیف قرار دیا ہے جن کا ضعف محدثین کو تسلیم نہیں ہے، یا اگر وہ ضعیف بھی ہیں تو امت کا اس پر عمل رہا ہے امت کی تعامل کی وجہ سے اس حدیث کا ضعف جاتا رہا ہے یہ کتاب بڑی دلچسپ اور اہل علم کے لئے لائق مطالعہ ہے اس وقت میرے زیر مطالعہ اس کی چوتھی جلد ہے۔ چنانچہ حوالے ملاحظہ ہوں:

1- ابوداؤد اور ترمذی میں ابو بسرۃ الغفاری کی حضرت براء بن عازب کی یہ حدیث ہے۔

حضرت براء ﷛ فرماتے ہیں: کہ میں اٹھارہ سفروں میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہا آپ ﷺ نے سورج ڈھلنے کے بعد ظہر کی نماز سے پہلے دو رکعت کو کبھی نہیں دیکھا کہ آپ نے چھوڑا ہو۔

البانی صاحب ترمذی اور ابوداؤد کی اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے اور ابوابسرہ الغفاری کے بارے میں اپنی تحقیق پیش کی ہے کہ وہ غیر معروف ہیں اس وجہ سے ان کی یہ روایت ضعیف ہے۔

البانی صاحب کا یہ کہنا کہ ابوبسرہ غیر معروف ہیں اور اس کی وجہ سے ان کی یہ روایت ضعیف ہے، بالکل غلط ہے ابوبسرہ راوی ثقہ تابعی ہیں امام بخاری نے ان کا ذکر اپنی تاریخ میں کیا ہے اور ان پر کوئی جرح نہیں کی ہے، ابوحاتم نے بھی ان کو ضعیف نہیں قرار دیا ہے، امام ابوداؤد نے ان کی حدیث نقل کرکے ان پر کوئی کلام نہیں کیا ہے، امام بخاری کو ابوبسرہ کا نام کیا ہے صرف یہ معلوم نہیں

تھا کسی راوی کی کنیت معلوم ہو اور اس شخصیت معروف ہو محدثین کو اس ثقہ قرار دیتے ہو اس کی روایت ذکر کرتے ہو تو صرف اس کا نام معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اس کی حدیث ضعیف نہیں قرار پا سکتی، کتنے ایسے راوی ہیں جن کا نام معروف نہیں مگر ان کی کنیت معروف ہے اور وہ اپنی کنیتوں ہی سے پہچانے جاتے ہیں۔

غرض جلیل القدر محدثین اور ماہرین فن تو ابو بسرہ کی اس حدیث کو صحیح اور حسن قرار دیتے ہیں مگر البانی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور کیوں؟ تو اس وجہ سے کہ البانی صاحب کو ابو بسرہ کا نام معلوم نہ ہو سکا حضرت ابو بکر ؓ تو صحابی رسول ﷺ ہیں ان کا نام کتنے لوگوں کو معلوم ہے؟

کاش البانی صاحب یہ سمجھتے کہ جس طرح ضعیف حدیث کو صحیح قرار دینا جرم ہے، اسی طرح صحیح حدیث کا انکار کرنا اور اس کو بلاوجہ ضعیف قرار دینا بھی بہت بڑا سنگین جرم ہے۔ (اس حدیث پر پور بحث کے لئے دیکھئے ج: 4/حدیث 493)

جعفر بن ابی مغیرہ سعید بن جبیر سے اور وہ حضرت ابن عباس ؓ سے روایت کرتے ہیں کہ: "اللہ کے رسول ﷺ مغرب کے بعد کی دو رکعت میں اتنی طویل قرات فرماتے تھے کہ مسجد والے مسجد سے چلے جاتے۔

یہ روایت ابو دوٗد شریف کی ہے، البانی نے اس کو ضعیف ابی داوٗد میں ذکر کیا ہے، یعنی یہ ان کے نزدیک ضعیف اور مردود ہے، البانی صاحب فرماتے ہیں کہ جعفر بن ابی مغیرہ سعید بن جبیر سے روایت کرنے میں قوی نہیں ہے۔

البانی نے اس کے لئے محدث ابن مندہ کا حوالہ دیا ہے اب محدثین اور ماہرین حدیث کا اس روایت کے بارے میں فیصلہ ملاحظہ فرمایئے: "حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے محدث عبد الحق کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے، حافظ ذہبی نے جعفر کو صدوق کہا ہے، ابن مندہ کی جرح کو محدثین نے قبول نہیں کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ ابن مندہ کی جرح جعفر پر عقیدہ میں اختلاف کی وجہ سے ہے اور عقیدہ کے اختلاف کی وجہ سے جو جرح ہو محدثین اس کو عام طور پر قابل اعتبار نہیں سمجھتے، جعفر ابن ابی مغیرہ سعید بن جبیر سے روایت کرنے میں مشہور ہیں اگر سعید بن جبیرے سے ان کی روایت صحیح نہ ہوتی تو دوسرے محدثین کا اس کا تذکرہ ضرور کرتے، امام ترمذی نے جعفر بن مغیرہ عن سعید بن جبیر کی سند کو حسن قرار دیا ہے، ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے، امام بخاری نے بھی جعفر کی حدیث کو ضمناً ذکر کیا ہے، اور تعجب بالائے تعجب یہ ہے کہ خود البانی صاحب نے بھی اس سند کو اپنے صحیحہ میں حسن قرار دیا ہے اور صاف صاف لکھا ہے "ہذا اسناد حسن ورجالہ ثقات یعنی یہ سند حسن ہے اور اس کے سب روی ثقہ ہیں"۔

ذرا آپ انصاف سے کام لیں اور بتلائیں کہ کیا حدیث کی خدمت اس طرح ہوتی ہے، البانی صاحب کو یہ بھی پتہ نہیں کہ اس سند کے بارے میں اپنے صحیحہ میں وہ خود کیا فرما چکے ہیں، اب اس قسم کے علم والے لوگ احادیث رسول کے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ قابل عمل ہے کہ نا قابل عمل، مردود ہے کہ مقبول صحیح ہے کہ ضعیف، اور ہمارے علمی افلاس کا یہ حال ہے کہ ہم ایسے ناقص لوگوں کے تحقیقات پر اعتماد کرتے ہیں۔ (پور بحث کے لئے اس جلد کی حدیث نمبر 527 دیکھیں)

1- ابن ماجہ میں حضرت ابن عمر ؓ کی روایت ہے: حضور ﷺ نے فرمایا کہ رات کی نماز دو دو رکعت ہے۔

البانی نے اس حدیث کو ضعیف ابن ماجہ میں شامل کیا ہے، اور اس پر کوئی کلام نہیں کیا ہے ضعیف ابن ماجہ میں اس حدیث کو داخل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث البانی کے نزدیک معتبر نہیں ہے، حالانکہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی ہے اور متعدد طرق سے

نقل کی گئی ہے مگر البانی صاحب کے جرات کا عالم یہ ہے کہ صحیحین یعنی بخاری و مسلم کی اس روایت کو بھی ضعیف بتلا رہے ہیں۔ (پوری بحث کے لئے دیکھیں حدیث نمبر 539)

2- سنن ابی داؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث آتی ہے: رسول اللہ ﷺ عشاء کی نماز پڑھ کر آٹھ رکعت نماز کھڑے ہو کر پڑھی اور دو رکعت فجر کی آذان اور اقامت کے درمیان ادا کی اور ان رکعات کو آپ کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔

البانی نے اس حدیث کو ضعیف ابی داؤد میں داخل کیا ہے اور بتلایا ہے کہ یہ حدیث بین الاذانین کے جملہ کے ساتھ ضعیف ہے اور البانی صاحب کی تحقیق میں بین الاذانین کے بجائے بعد الوتر کا لفظ محفوظ ہے۔

یہ شیخ البانی کی تحقیق کا حاصل ہے حالانکہ البانی صاحب کی یہ تحقیق بالکل ناقص ہے، اور بین الاذانین کے ساتھ یہ حدیث بالکل صحیح ہے شیخ محمود سعید فرماتے ہیں بل الحدیث صحیح جدا بہذ اللفظ یعنی اس لفظ کے ساتھ یہ حدیث بالکل صحیح ہے، امام بخاری نے بخاری شریف میں اس کو ذکر کیا ہے، بخاری شریف کی روایت میں صاف موجود ہے ورکعتین بین الندائین۔

البانی صاحب کی ساری زندگی بقول البانیوں کے حدیث کی خدمت میں گزری، مگر افسوس کہ ان کو پتہ بھی نہیں چل سکا کہ اللہ کے رسول کی رات نماز کی حالت میں ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہی، کبھی آپ نے کسی طریقہ سے پڑھی اور کبھی کسی طریقہ سے آپ کی نماز بتلانے والے صحابی نے کبھی ایک حالت کا ذکر کیا ہے، اور کبھی دوسری حالت کا ذکر کیا ہے، کبھی اس نے رات کی نماز کی پوری تصویر کھینچ دی کبھی اس کا ذکر مختصر انداز میں کیا اس وجہ سے روایت کے الفاظ مختلف ہو جاتے ہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر کسی حدیث میں راوی نے کسی بات کو ذکر نہیں کیا یا اس کو اختصار کے ساتھ ذکر کر دیا اور دوسری راویت میں وہ بات مذکور ہے تو اس دوسری حدیث محض اس وجہ سے انکار کر دیا جائے کہ اس میں وہ بات ہے جو دوسری روایتوں میں نہیں ہے محض زبردستی کی بات ہے اگر کوئی متضاد اور مخالف بات دو حدیثوں میں ہے تب تو اس کی تحقیق کی جاتی ہے کہ کون سی بات محفوظ ہے اور کونسی بات غیر محفوظ مگر جب روایات میں تضاد نہیں کوئی اختلاف نہیں تو پھر محض اس وجہ سے کہ فلاں بات فلاں راوی نے ذکر کی ہے اور فلاں نے ذکر نہیں کی ہے اس وجہ سے وہ لفظ غیر محفوظ ہے اور اس کو ذریعہ بنا کر بخاری و مسلم کی بھی راوایات کا انکار کیا جائے، کتنی جسارت اور انانیت کی بات ہے، شیخ محمود سعید فرماتے ہیں کہ البانی کا اعتراض بالکل غلط ہے اس لئے کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی ہے، فرماتے ہیں: وقوله بين الاذانين صحيح متفق عليه من حديث البخاري (1164) ومسلم (738) وغيرهما.

یعنی حدیث میں بین الاذانین کا لفظ ہے اور متفق علیہ ہے یہ بخاری و مسلم کی مذکورہ بالا نمبر والے حدیث میں موجود ہے -(پوری بحث کے لئے دیکھئے حدیث نمبر 543)

3- ابو داؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے اسود نے بن زید نے ان سے حضور ﷺ کی رات کی نماز کے بارے میں دریافت کیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

حضور ﷺ رات میں تہجد کی نماز تیرہ رکعت ادا کرتے تھے پھر دو رکعت چھوڑ دیا اور گیارہ رکعت پڑھتے تھے اور پھر وفات کے وقت آپ کی تہجد کی نماز نو رکعت ہوا کرتی تھی اور آخر میں وتر پڑھتے تھے۔

شیخ البانی نے اس حدیث کو ضعیف ابوداؤد میں ذکر کیا ہے شیخ محمود فرماتے ہیں "ہذہ خرافۃ والحدیث صحیح یعنی یہ البانی کی محض بکواس ہے یہ حدیث ضعیف نہیں صحیح ہے، نو رکعت والی حدیث کو امام احمد، امام مسلم، امام ابوداؤد، اور امام نسائی، غیرہ نے بھی ذکر کیا ہے، ابوداؤد کی مذکورہ نو رکعت والی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کو امام ترمذی ذکر کرکے فرماتے ہیں حسن صحیح، یہ حدیث حسن صحیح ہے اس حدیث کا آخری حصہ جس میں وتر کا ذکر ہے اس کی تخریج مسلم نے بھی کی ہے، شیخ محمود سعید فرماتے ہیں : والحاصل ان تضعیف الالبانی لہذا الحدیث خطأ. یعنی خلاصہ کلام یہ ہے کہ البانی نے اس حدیث کو جو ضعیف قرار دیا ہے وہ غلط ہے پھر لکھتے ہیں : "اگر البانی زحمت اٹھاکر حافظ منذری کی مختصر سنن ابی داؤد کو دیکھ لیتے تو ان کو نظر آتا کہ حافظ منذری نے اس حدیث کو ذکر کرکے صراحت سے لکھ دیا ہے کہ اس حدیث کی تخریج امام ترمذی اور نسائی نے کی ہے اور اس کے آخر کا ٹکڑا امام مسلم نے ذکر کیا ہے" -(پوری بحث کے لئے حدیث نمبر 544 دیکھئے)

4 حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے ابن ماجہ میں اور اس کے الفاظ یہ ہیں :

كان النبي ﷺ يصلي من الليل ثلث عشرة ركعة .

یعنی نبی ﷺ رات کی نماز تیرہ رکعت پڑھتے تھے۔

البانی نے اس حدیث کو ضعیف ابن ماجہ میں ذکر کیا ہے اور تیرہ رکعت کے لفظ کو شاذ بتلایا ہے اور کہا ہے کہ گیارہ کا عدد محفوظ ہے پھر کہا کہ تیرہ کہنا ہشام کی غلطی ہے۔

البانی صاحب کی اس تحقیق کو دیکھ کر طبیعت پھڑک گئی اور دل نے کہا کہ اگر احادیث کی اسی قسم کی تحقیق ہوتی رہی تو احادیث کا خداہی حافظ۔ تیرہ کے لفظ کو شاذ کہنا البانی صاحب کی ایسی فحش غلطی ہے کہ جس کو حدیث کا معمولی سا بھی علم حاصل ہے وہ البانی صاحب کی اس جرات پر تعجب ہی کرے گا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تیرہ رکعت والی حدیث تو خود بخاری میں ہے، یہ حدیث ضعیف اگر ہے تو بخاری پر سے اعتماد ختم۔

حضور ﷺ کی رات کی نماز تیرہ بھی تھی اور گیارہ بھی، اور نو بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی مختلف احادیث میں سب کو بتلایا ہے اس میں سے کوئی عدد بھی شاذ نہیں ہے۔

5- ابوداؤد میں ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں :

وہب بن منبہ عن عبداللہ بن عمرو انہ سأل النبی ﷺ فی کم یقرا القرآن ، قال فی اربعین یوما ثم قال فی شہر ثم قال فی عشرین ثم قال فی عشر ثم قال فی سبع ثم لم ینزل من سبع.

وہب بن منبہ حضرت عبداللہ بن عمرو ؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں حضور ﷺ سے پوچھا کہ کتنے دنوں میں قرآن ختم کرنا چاہیئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا چالیس روز میں پھر فرمایا ایک مہینہ میں پھر فرمایا بیس روز میں پھر فرمایا دس روز میں پھر فرمایا سات روز میں اور پھر آپ ﷺ سات سے نیچے نہیں اترے۔

خدشہ 14:

چودہواں خدشہ یہ ہوتا ہے کہ ہم صرف قرآن وحدیث کو مانتے ہیں، جبکہ مقلد حضرات رائے، ضعیف حدیث اور شطحیات پر چلتے ہیں تو کیا محمدی اچھا ہوا یا حنفی؟ تو جواباً عرض ہے کہ حدیث بخارا کی ہے یا مکہ، مدینہ کی ہے؟ یقیناً حدیث بخاری کی ہے اور بخارا روس میں ہے، لیکن حدیث مدینہ والے کی

البانی صاحب نے اس حدیث کو ضعیف ابی داؤد میں شامل کیا ہے اور کہا ہے کہ لم ینزل من سبع کا لفظ شاذ ہے اور شاذ اس لئے کہ اس سے پہلی روایت میں تین تک کی اجازت ہے۔

شیخ محمود فرماتے ہیں کہ: الحدیث صحیح محفوظ بهذا اللفظ یعنی یہ حدیث صحیح ہے اور اس لفظ کے ساتھ محفوظ ہے اس حدیث کو امام احمد نے اپنی مسند میں کئی جگہ ذکر کیا ہے، بخاری نے بھی کہیں اس کو مطول اور کبھی مختصر ذکر کیا ہے، امام مسلم نے بھی اس لفظ کے ساتھ ذکر کیا ہے ترمذی نے بھی اس کو مختصر ذکر کیا ہے نسائی اور ابن ماجہ نے بھی اسی لفظ کے ساتھ اس کو ذکر کیا ہے۔

باب فضائل القرآن میں بخاری کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

عن عبدالله بن عمرو قال لي رسول الله ﷺ اقرأ القرآن في شهر قلت اني اجد قوة حتي قال فاقرأه في سبع ولا تزد علي ذالك.

یعنی حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قرآن ایک مہینہ میں پڑھو میں نے کہا کہ مجھ میں اس سے زیادہ کی قوت ہے (تو آپ نے مزید کچھ دن کم کر دیئے) مگر آخر میں فرمایا کہ سات دن سے کم میں مت پڑھو، غرض سات کا لفظ عام طور پر روایات میں موجود ہے، بلکہ بخاری کے بقول تین سے زیادہ سات کا لفظ محفوظ ہے بخاری کی بات یہ ہے "وقال بعضهم في ثلاث او في سبع واكثرهم علي سبع" بعض نے تین یا سات کا ذکر کیا ہے مگر اکثر سات ہی کا ذکر کرتے ہیں۔ (پوری بحث کے لئے دیکھئے حدیث نمبر 553)

البانی صاحب کی احادیث رسول کے بارے میں اس جرات بیجا پر تعجب کرتے ہوئے شیخ محمود فرماتے ہیں:

ويا اسف محب السنة لتضعيف الاحاديث الصحيحة بهذه الجراة والشناعة نعوذ بالله من شهوة التظاهر بالاستدراك علي متقدمين والله اعلم بالنيات.

یعنی صحیح حدیثوں کو اس جرات اور قباحت کے ساتھ ضعیف قرار دینے کے عمل پر ایک سنت کا شیدائی افسوس کرتا رہ جاتا ہے، متقدمین کے برخلاف احادیث پر احکام صادر کرنے کی خود نمائی کی شہوت سے اللہ کے ذریعہ ہم پناہ چاہتے ہیں۔

ناظرین کرام یہ قضیہ بڑا طویل ہے اور یہ المیہ بڑا دردناک ہے اور یہ داستان بڑی عبرتناک ہے ہم نے محض ان چند مثالوں سے احادیث رسول کے خلاف جو احادیث رسول کے خلاف ایک محاذ قائم کر دیا گیا ہے اور جس کی سربراہی البانی نے کی تھی اس کا کچھ نمونہ پیش کیا ہے ہم اہل علم حضرات اور عام لوگوں سے گزارش کریں گے کہ البانی اور البانیوں کے اس فتنہ سے وہ آگاہ رہیں، اور حدیث کی خدمت کے نام پر جو حدیث دشمنی کا مظاہرہ کیا جارہا ہے اس سے وہ دھوکہ نہ کھائیں۔

ہے، اس طرح نماز نبی پاک ﷺ کی ہے دلیل کی اختلاف کی صورت میں اجتہاد امام ابو حنیفہ کی ہے[1]

[1] اجماع کی حجیت:

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ وہ نہ صرف اجماع کے قائل ہیں بلکہ اجماع کے منکر کو کافر سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں: "لوگوں کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ اجماع کی مخالف کی تکفیر کی جائے گی یا نہیں اور تحقیقی بات یہ ہے کہ معلوم اجماع کا مخالف اسی طرح کافر ہے جیسے نص کا چھوڑنے والا اور اس کا مخالف کافر ہوتا ہے۔(فتاوي ج: 19/ ص: 270)

پھر فرماتے ہیں کہ اس میں لوگوں کا اختلاف ہے کہ اجماع دلیل قطعی ہے یا دلیل ظنی پھر اپنی تحقیق ذکر کرتے ہیں کہ: "تحقیقی بات یہ ہے کہ اگر اجماع قطعی ہے تو وہ دلیل قطعی ہے اور اگر وہ ظنی ہے تو وہ دلیل ظنی ہے۔ (ایضا)

بعض حضرات کے اکابر فرماتے ہیں کہ شریعت میں اجماع کوئی چیز نہیں اور اصول شرع صرف کتاب وسنت ہیں، جبکہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ دین کے احکام کا مدار تین چیزوں پر ہے، کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ، اور اجماع ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہے: "اجماع کا مطلب یہ ہے کہ علمائے مسلمین احکام میں سے کسی حکم پر اکٹھے ہو جائیں۔(فتاوي ج: 20/ص:9)

پھر فرماتے ہیں: "جب امت کا اجماع کسی چیز پر ثابت ہو جائے تو کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اس سے باہر ہو اس لئے کہ امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی۔(ایضا ج: 30/ص: 10)

ایک جگہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: "مسلمانوں کے دین کی بنیاد کتاب اللہ سنت رسول اللہ ﷺ اور اجماع امت پر ہے۔ یہی تینوں چیزیں اسلام کے وہ اصول ہیں جن میں خطا کا امکان نہیں۔(فتاوي ج: 2/ ص: 164)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا یہ صاف اور واضح اعلان یہ بتلا رہا ہے کہ جنہوں نے اجماع کا انکار کیا ہے یا جن کا دعوی یہ ہے کہ اصول شرع صرف دو ہیں ان کا نظریہ درست نہیں ہے، اور یہ اہلسنت والجماعت کا مذہب نہیں ہے، اہل سنت والجماعت کی کتابوں کو آپ پڑھئے خود شیخ الاسلام کی کتابیں پڑھئے وہ جس طرح کتاب وسنت سے احتجاج واستدلال کرتے ہیں اسی طرح اجماع سے بھی استدلال کرتے ہیں۔

میں نے بطور خاص اجماع کے سلسلہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا پہلے حوالہ دیا تاکہ بعض احباب کے لئے خاص طور پر باعث اطمنان ہو۔

شرح مختصر ابن حاجب میں، اجماع کے اصل شرعی ہونے پر کلام کرتے ہوئے بتلایا ہے کہ اجماع کی حجیت خود حدیث رسول ﷺ سے ثابت ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: لا تجتمع امتی علی الضلالۃ یعنی میری امت ضلالت اور گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی، خوب یاد رہے کہ امت سے مراد اس امت کے علما وفقہا ہیں عام افراد نہیں ہیں، جیسا کہ شیخ الاسلام کے بیان سے پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے۔ اور شرح مختصر حاجب میں بھی اس کی تصریح ہے۔(ص: 524)

شرح ابن حاجب میں اجماع کے متعلق لکھا ہے: "اجماع سب کے نزدیک حجت ہے، نظام معتزلی اور خوارج اور شیعوں نے جو اجماع کا انکار کیا ہے تو ان کا کچھ اعتبار نہیں"۔(ص: 529)

حافظ ابن عبد البر اس مسئلہ کے ذکر میں کہ پرانی قبر پر نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی اجماع سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "علما کا اس پر اجماع ہے کہ پرانی قبروں پر نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی اور علما کا جس پر اجماع ہو وہ حجت ہے۔

(التمهيد ج: 6/ص: 279)

سر کے بال منڈوانا مکروہ ہے یا نہیں مکروہ اس بارے میں فرماتے ہیں: "جس نے سر منڈوانے کو مکروہ سمجھا ہے اس کے پاس کتاب وسنت اور اجماع سے کوئی دلیل نہیں ہے"۔(ایضا ص: 78/ج:6)

اس سے معلوم ہوا کہ اسلاف کے نزدیک کتاب وسنت کے ساتھ اجماع میں بھی دلیل شرعی ہے۔

ایک جگہ فرماتے ہیں: "کہ اس مسئلہ میں حدیث سے زیادہ قوی اجماع ہے"۔(ص: 368)

امام اگر بیٹھ کر نماز پڑھائے تو مقتدی کھڑے ہو کر نماز پڑھیں یا بیٹھ کر اس بارے میں کلام کرتے ہوئے حافظ ابن عبد البر مالکی فرماتے ہیں: "اس بات کی دلیل کہ امام کے بیٹھ کر نماز پڑھنے کی حالت میں مقتدی کو بیٹھ کر پڑھنے کے حکم والی حدیث منسوخ ہے علما کا اجماع ہے کہ نماز میں کھڑے ہونے کا حکم وجوبی ہے نہ اختیاری"۔(ج:6/ص:40)

اگر اجماع امت دلیل شرع نہ ہوتا تو امت کے اکابر اجماع سے استدلال نہ کرتے۔امام غزالی رحمہ اللہ نے المستصفی میں اجماع کے موضوع پر بہت طویل گفتگو کی ہے اس کی حجیت اور دلیل شرعی ہونے کو عقل ونقل کی روشنی میں ثابت کیا ہے، اور پھر اس کا حکم بتلاتے ہوئے فرماتے ہیں: "اجماع کا حکم یہ ہے کہ اس کی اتباع کی جائے گی اور اس کی مخالفت حرام ہوگی"۔(ص: 154)

ایک جگہ داؤد ظاہری اور ظاہریہ کا رد کرتے ہوئے امام غزالی فرماتے ہیں: "داؤد ظاہری اور ان کی جماعت ظاہریہ نے یہ کہا ہے کہ صحابہ کرام کے بعد کے لوگوں کا اجماع دلیل شرعی نہیں ہے، امام غزالی فرماتے ہیں کہ ان کی یہ بات فاسد اور غلط ہے، اس لئے کہ جن تین دلیلوں سے یعنی کتاب وسنت اور اجماع کا حجت ہونا معلوم ہوا ہے وہ زمانہ اور زمانہ کی تفریق نہیں کرتے ہیں"۔(ص: 149)

پھر فرماتے ہیں کہ اگر کسی بات پر تابعین اجماع کریں تو وہ تمام امت کا اجماع کہلائے گا اور جو ان کی مخالفت کرے گا وہ سبیل المؤمنین سے برگشتہ قرار پائے گا۔ان کی اصل عبارت بھی ملاحظہ: فالتابعون اذا جمعوا فهو اجماع من جميع الامة ومن خالفهم فهو سالك غير سبيل المؤمنين.

امام غزالی فرماتے ہیں کہ تمام امت کا اتفاق ہے کہ اجماع حجت ہے اور اجماع کی پیروی واجب ہے، امام غزالی کی اصل عبارت یہ ہے: اجمعت الامة على وجوب الاتباع الاجماع وانه من الحق الذى يجب اتباعه

امام غزالی رحمہ اللہ تو اجماع کے سلسلہ میں ایک ایسی بات بھی فرما گئے ہیں کہ ناآشنائے حقائق کے لئے بڑی شاق ہوگی مگر عارفان حقائق اور رفقائے شریعت اس کو سر آنکھوں پر رکھیں گے۔امام غزالی فرماتے ہیں:

خدشہ 15:

پندرہواں خدشہ یہ ہوتا ہے کہ یہ مقلد حضرات شیخ ابن تیمیہؒ، ابن القیمؒ ار و عبد الوہاب نجدی کے خلاف ہیں۔ جبکہ ایسی بات نہیں یہ ہمارے سروں کے تاج ہیں [1]۔

اگر کسی مسئلہ میں اجماع ثابت ہو تو اب کتاب وسنت میں غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ کتاب وسنت میں تو نسخ ہوتا ہے رہا ہے جبکہ اجماع نا قابل منسوخ دلیل ہے اس لئے کہ (بظاہر) کتاب وسنت کے خلاف بھی کسی بات پر اجماع ہو رہا ہے تو یہ دلیل ہے کہ کتاب وسنت کا حکم منسوخ ہے اس لئے کہ امت مسلمہ غلط بات پر اکٹھی نہیں ہو سکتی ہے۔

امید ہے کہ ہماری یہ چند سطریں آپ کے لئے باعث اطمنان ہوں گی اور اس مسئلہ میں آپ کا ذہنی خلجان رفع ہو گیا ہوگا۔

[1] **علامہ ابن قیم اور ہمارے علما:**

مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ " قواعد فی علوم الحدیث" (ص: 461) میں فرماتے ہیں: "علامہ ابن قیم کی شان اس سے بلند و بالا ہے کہ ہم جیسوں میں سے کوئی ان کے بارے میں کلام کرے، بخدا ان کے جوتوں کے خاک بن جانا ہمارے رفعت مرتبہ کا باعث ہے"۔

مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور شیخ الاسلام ابن قیم رحمہ اللہ کا ذکر کر کے لکھتے ہیں: "ہمارے علمائے کے نزدیک بھی یہ دونوں بزرگ بڑے مرتبہ کے عالم ہیں۔" (اکابر کے خطوط، از شیخ محمد بن عبد الوہاب)

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ہم ہمیشہ سے حافظ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے ہیں، ان سے مستفید بھی ہوئے ہیں اور بعض تفردات وغیرہ میں ان پر علمی انتقاد بھی کرتے رہے ہیں۔" (خطبات عثمانی، ص: 405)

مولانا منظور نعمانی رحمہ اللہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ابن قیم کے متعلق علمائے حق کا رویہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ہمارے اساتذہ واکابر کا رویہ ان حضرات کے بارے میں یہ ہے کہ بہت سے مسائل اور تحقیقات میں اختلاف کے باوجود ان کو اکابر علمائے امت میں شمار کرتے ہیں اور ان کا نام ہمیشہ عزت واحترام سے لیتے ہیں۔" (شیخ محمد بن عبد الوہاب ص: 50)

علمائے حق کا ان دو جلیل القدر علمی شخصیتوں کے متعلق یہی مؤقف رہا ہے کہ ان کے کتابوں سے استفادہ کرتے رہے ہیں، ان کی علمی مہارت، تفوق اور جلالت شان کا اعتراف کرتے رہے ہیں، تاہم ان کے تفردات کا رد بھی ضرور کیا ہے، اور کرنا بھی چاہیئے، لیکن سنجیدہ علمی انداز میں ادب کو ملحوظ رکھ کر ہی ان سے اختلاف کیا گیا، اس طرح نہیں جس کا تاثر دیا گیا ہے!

سلطان ابن سعود نے 1344ھ میں مکہ مکرمہ میں ایک مؤتمر منعقد کرایا تھا، جمعیت علمائے ہند نے اس مؤتمر میں شرکت کے لئے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ کی زیر قیادت جو وفد بھیجا تھا اس میں علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ بھی شامل تھے، سلطان ابن سعود کے سامنے تقریر کرتے ہوئے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فرمایا: "ہم ہمیشہ سے حافظ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے ہیں ان سے مستفید ہوئے ہیں لیکن خاص طائفہ نجدیہ کے معتقدات کا حال ہم کو محقق نہ تھا، چند روز ہوئے ہم نے دو کتابیں آپ کے پڑھیں "الہدیہ السنیہ" اور مجموعۃ التوحید" ان کے مطالعہ سے بہت سی چیزیں جو آپ کی طرف منسوب ہو رہی

خدشہ 16:

سولہواں: یہ ہوتا ہے کہ یہ حضرات عرض اعمال کا ایک غلط عقیدہ رکھتے ہیں، کہ انبیائے کرامؑ اور مردوں پر زندوں کے اعمال پیش ہوتے ہیں [1]۔

تھیں، ان کا افتراء ہونا ثابت ہوا، پھر بھی چند مسائل میں اختلاف رہا، بعض اختلاف چنداں وقیع اور اہم نہیں جیساکہ" مسئلہ شفاعت" میں، بعض میں قریب قریب نزاع لفظی کے ہے، ہاں سخت اختلاف ان لوگوں کے تکفیر میں ہے جو قبر کو سجدہ کرتے ہیں یا اس پر چراغ جلاتے ہیں یا غلاف چڑھاتے ہیں ہم ان امور کو "بدعت اور منکر" سمجھتے ہیں اور ہمیشہ مبتدعین سے جہاد بالقلم واللسان کرتے ہیں لیکن عباد الاوثان اور یہود ونصاری کی طرح مباح الدم والمال نہیں سمجھتے، جس کا ذکر میں پہلی ملاقات میں آپ سے تفصیلا کر چکا ہوں اور آئندہ اگر وقت نے مساعدت کی اور خداوند نے توفیق بخشی تو شیخ عبد اللہ بلیہدی وغیرہ سے اس پر مفصل کلام کیا جائے گا۔

ہمارے ہاں یہ مشہور تھا کہ نجدی تقلید کے دشمن اور اس کو شرک سمجھتے ہیں اور ائمہ اربعہ کی کچھ پرواہ نہیں کرتے لیکن ہم نے " الہدیہ السنیہ " میں شیخ محمد بن عبد الوہاب کے بیٹے شیخ عبد اللہ کی تحریر پڑھی، جس میں لکھا ہے کہ "ہم دعوی اجتہاد کا نہیں رکھتے بلکہ فروع واحکام میں امام احمد بن حنبلؒ کے متبع ہیں" الا یہ کہ کوئی نص جلی صریح غیر مخصص، غیر معارض قوی سند ناقابل تاویل آجائے تو مذہب احمد بن حنبلؒ کو چھوڑ کر ائمہ اربعہ میں سے کسی کا قول اختیار کر لیتے ہیں، بہر حال ائمہ اربعہ کے دائرہ سے باہر نہیں جاتے حتی حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کا قول طلاق ثلاث کے مسئلہ میں ہم نے اسی لئے چھوڑ دیا ہے کہ وہ ائمہ اربعہ سے علیحدہ تھا، اگر آپ ایسے حنبلی ہیں تو ہم ٹھیک ٹھیک ایسے ہی حنفی ہیں اور یہ حنبلیت ایسی ہے کہ کہ مسلمانوں کا سواد اعظم یعنی مقلدین ائمہ اربعہ کے نزدیک چنداں محل طعن نہیں ہو سکتی اگر ہو گی تو شرذمہ قلیلہ کے نزدیک اپنے آپ کو " اہل حدیث " کہتی ہے اور ہمارے ہاں ان کا نام " غیر مقلدین کی جماعت " ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو ہر ایک امام کی تقلید سے علیحدہ رکھتے ہیں بلکہ ان بعض تقلید ائمہ کو شرک بتلاتے ہیں، ہم امید کرتے ہیں کہ آپ کی یہ حنبلیت زیادہ نمایاں اور اس سے زیادہ مشہور ہو، جتنی کہ اب تک ہوئی ہے۔" (خطبات عثمانی، ص: 252)

اس تقریر میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے سلطان ابن سعود کے سامنے اپنے اختلاف کا ذکر بر ملا کیا ہے پھر ایسی جماعت کے ان مخلص علماء پر " خاص اغراض ومقاصد " کے لئے اپنے مذہب میں مداہنت کا اعتراض کیسے جا سکتا ہے، عصر حاضر کے مشہور عالم دین مفتی تقی عثمانی زید مجدہم لکھتے ہیں: " سعودی عرب کے سلفی علما سے فروعی مسائل میں علمی اختلاف اپنی جگہ اب بھی موجود ہے، جس کے بارے میں نجی مجلسوں میں ان سے کھل کر گفتگو بھی ہوتی رہتی ہے لیکن یہ اختلاف ان کے ساتھ تعلقات، مشترکہ مقاصد میں تعاون اور ان کے اچھے کاموں کی قدر دانی پر بحمد اللہ کبھی اثر انداز نہیں ہوا" ۔ (البلاغ، ص: 6، ذی الحجہ 1417ھ)

[1] **عرض اعمال:**
رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

خدشہ 17:

اٹھارہواں یہ ہوتا ہے کہ مسروق تابعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے تمام صحابہؓ کو سونگا تو سب کا علم چھ صحابہ کے پاس پایا اور ان چھ کو سونگا تو ان کا علم دو صحابہ کے پاس ہیں اور وہ دو صحابہؓ حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعود اور فقہ حنفی کے بھی یہی دو ستون ہیں لیکن غیر مقلد بزرگ فرماتے ہیں کہ ابن مسعودؓ تطبیق کو بھول چکے تھے لہٰذا ہم کو ان کے ترک رفع یدین والی روایت پر اعتماد نہیں کرتے۔ تو جواباً عرض ہے کہ وہ بھولے نہیں تھے، تحقیق کی کمی سے یہ خدشات آتے ہیں[1]۔

ان اعمالکم ترد علی اقاربکم وعشائرکم .....

ترجمہ: بے شک تمہارے اعمال تمہارے قریبی لوگوں اور رشتہ داروں پر پیش کئے جاتے ہیں۔

(المعجم الکبیر للطبرانی: 129/4، ح: 3887)

سیدنا ابوایوب انصاریؓ سے موقوف حدیث بھی اسی مفہوم کی مروی ہے۔ (کتاب الزہد لعبد اللہ بن المبارک، ح: 343)

علامہ البانی غیر مقلد عالم دین اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اسنادالموقوف صحیح" موقوف کی سند صحیح ہے۔ (سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ: 604/6، ح: 2758)

[1] **سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ:**

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کی بعض ایسی خصوصیات اور وہ فضائل ہیں کہ یہ تمام دوسرے صحابہ سے اس اعتبار سے ممتاز و منفرد ہیں، سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کی فضیلت میں رسول کریم ﷺ نے ایک ایسا جملہ ارشاد فرمایا ہے جو کسی بھی صحابی کے بارے میں نہیں فرمایا، یہ جملہ عجیب ہے، اس جملہ کے معانی و مفہوم پر جتنا غور بھی کریں، اسی قدر سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کی عظمت و فضیلت سامنے آتی ہے، وہ لوگ جو چودہ سو سال بعد آج رسول کریم ﷺ کے اس چہیتے، محبوب صحابیؓ کے بارے مین گستاخانہ جملہ استعمال کرکے یہ لکھتے ہیں کہ ابن مسعود تو بے مقامات پر بھول گئے تھے، یہ لوگ رسول کریم ﷺ کے اس جملہ مبارکہ کو بار بار پڑھیں، تاکہ ان کے سامنے سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کی شخصیت کا وہ پہلو بھی سامنے آجائے جس کا اظہار سرکار دو عالم ﷺ نے اپنے اس جملہ میں فرمایا ہے: رضیت لامتی ما رضی لھا ابن ام عبد ۔

میں اپنی امت کیلئے ہر اس چیز پر راضی ہوں جو میری امت کیلئے ابن ام عبد (عبداللہ ابن مسعودؓ) پسند فرمالیں۔

سبحان اللہ! کیا عجیب جملہ ہے کہ اس میں لفظ ما عام ہے کہ میری امت کیلئے عبداللہ بن مسعودؓ جو کچھ پسند کرلے میں بھی اسی کو پسند کروں گا۔

صحابہؓ قرآن وسنت کو کتنا سمجھتے تھے اور ان کا علم کیسا اور کتنا تھا؟ آیئے! اس کا جواب شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ سے پوچھیں، تاکہ ان لوگوں پر حجت قائم ہو جائے جو سرکار دو عالم ﷺ کے محبوب صحابہؓ کے بارے میں اپنے خبث باطن کا زہر اپنی تحریر میں اگلتے ہیں،

امام ابن تیمیہؒ نے فرمایا: صحابہؓ قرآن پاک کے فہم کو صحیح اور مکمل طور پر سمجھتے تھے اور یہ بات بعد میں آنے والے لوگوں سے مخفی رہی ہے، اسی طرح صحابہؓ سنت سے متعلق بھی تمام باتوں (اور مسائل سے آگاہ تھے) اور رسول کریم ﷺ کے احوال سے بھی خوب واقف تھے جن سے بعد میں آنے والے لوگ واقف نہیں تھے، کیوں کہ ان لوگوں (صحابہؓ نے رسول کریم ﷺ کو دیکھا اور قرآن پاک کا نزول بھی ان کے سامنے ہوا، یہ لوگ صحابہؓ رسول کریم ﷺ کے تمام اقوال، افعال، اور احوال سے واقف تھے، اور اسی بنیاد پر صحابہؓ اپنے لئے دلائل بھی حاصل کر چکے تھے (کہ رسول کریم ﷺ کی تمام سنتوں سے واقف تھے) البتہ بعد میں آنے والے لوگ ان تمام مسائل سے واقف اور باخبر نہیں تھے۔

رسول کریم ص نے سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کی تعریف کرتے ہوئے یہ جملہ ارشاد فرمایا: انک غلام معلم

تم ایسے نوجوان ہو جو معلم بھی ہو یعنی تم جوان ہو اور معلم بھی ہو (علم والے، علم سیکھنے والے اور سکھانے والے ہو)۔

دوسری اہم فضیلت یہ ہے کہ ان کو سابقین اولین ہونے کا شرف بھی حاصل ہے، کہ اسلام قبول کرنے والوں میں ان کا نمبر چھٹا ہے، تیسری اہم فضیلت یہ ہے کہ تمام صحابہؓ میں کتاب اللہ کے بارے میں یعنی 114 سورتوں اور 6000 کم و بیش سے زیادہ آیات کے بارے مین سب سے زیادہ جاننے والے تھے، ایک ایک آیت اور ایک ایک سورت کے بارے میں ان کا شان نزول ،وجہ تسمیہ وغیرہ سب جانتے تھے اور یہ قرآنی علم بلکہ قرآنی علوم ہیں جو صرف اور صرف انہی کو عطا کیا گیا تھا، یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ گواہی دیتے ہیں کہ بلاشبہ رسول کریم ﷺ کے انتقال کے بعد تمام صحابہ میں قرآن پاک کا سب بڑا عالم یہی شخص ہے، رضی اللہ عنہم اجمعین۔

سیدنا ابو موسیٰ اشعریؓ اور دوسرے صحابہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی والدہ ہر وقت جناب رسول کریم ﷺ کی خدمت میں اور آپ ﷺ کے ہمراہ رہتے تھے اور اس کی وجہ سے ہم لوگ عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی والدہ کو رسول کریم ﷺ کے گھرانے کا ایک فرد سمجھتے تھے۔

رسول کریم ﷺ نے اپنی زندگی میں جن چار صحابہؓ کے بارے مین بار بار فرمایا تھا کہ قرآن پاک ان سے سیکھو ان میں سب سے پہلے عبداللہ بن مسعود کا نام لیا گیا ہے، جیسا کہ متفق علیہ روایات میں ہے،استقرؤا القرآن من أربعة ، من عبد الله بن مسعود الخ

سیدنا عمرؓ نے انہیں عراق میں مفتی و قاضی بنا کر بھیجا تو اہل عراق کے نام اپنے فرمان میں لکھا کہ عبداللہ بن مسعودؓ کو اپنے اوپر ترجیح دیتا ہوں، یعنی ان کو اپنے سے افضل سمجھتا ہوں، عراق میں اور مدینہ منورہ میں گذری ہوئی عمر مبارک کا حصہ اس قدر بابرکت ہے کہ ان کا علم حجاز و عراق سے پورے عالم میں پھیل گیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے شاگردوں اور احباب میں ایسی برکت عطا فرمائی کہ ان کا علم، ان کی فقہ جو کہ حقیقت میں فقہ دین اور فقہ رسول اللہ ﷺ ہے، پورے عالم میں منتشر و معروف ہو گئی، فقہ حنفی در حقیقت فقہ ابن مسعودؓ ہے جو کہ براہ راست رسول کریم ﷺ کے اقوال و اعمال و افعال کا مجموعہ ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کے اہم ترین فضائل میں ایک وہ اہم فضیلت ہے اور وہ دعویٰ ہے جو تمام صحابہ میں کسی دوسرے صحابی نے نہیں کیا کہ قرآن پاک کی تمام سورتوں اور آیات کے بارے میں یہ جاننا کہ یہ سورت یا یہ آیت کہاں، کب اور کیوں نازل ہوئی ہے؟ بلکہ ان کے بارے میں یہی بات تو دوسرے تمام صحابہ بھی جانتے تھے اور انہوں نے برملا اس کا اظہار بھی کیا:

ابو الاحوص فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ابو موسیٰ اشعریؓ کے گھر میں عبد اللہ بن مسعودؓ کے ساتھیوں اور ان کے شاگردوں کے ساتھ بیٹھے قرآن پاک کے درس میں مشغول تھے کہ عبد اللہ بن مسعودؓ اٹھ کھڑے ہوئے اور جانے لگے تو ابو مسعودؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے انتقال کے بعد اس کھڑے ہونے والے شخص عبد اللہ بن مسعودؓ سے زیادہ اور کوئی کتاب اللہ کے بارے میں زیادہ جاننے والا نہیں چھوڑا، اس پر ابو موسیٰ اشعریؓ نے فرمایا کہ ہاں، یہ اسلئے کہ جب ہم لوگ ادھر ادھر چلے جاتے تھے تو یہ عبد اللہ بن مسعودؓ پھر بھی خدمت نبویؐ میں حاضر رہتے تھے اور جب ہمیں بارگاہ رسالت ﷺ میں حاضری سے روک دیا جاتا تھا، انہیں عبد اللہ بن مسعودؓ کو خصوصی اجازت مل جایا کرتی تھی (اور یہ رسول کریم ﷺ کے ساتھ ساتھ رہتے تھے)

سیدنا عبد اللہ ابن مسعودؓ خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ :لقد قرأت علی رسول اللہ ﷺ بضعا وسبعین سورة ولقد علم أصحاب رسول اللہ ﷺ أني اعلمهم بكتاب الله ولو أعلم أن أحدا أعلم مني لرحلت اليه

گھروں میں خیر و برکت اور نور:

أما صلاة الرجل في بيته فَنُوْرٌ، فَنَوِّرُوْا بُيُوْتَكُمْ

"آدمی کا اپنے گھر میں نماز (سنن ونوافل) ادا کرنا نور ہے، لہٰذا تم اپنے گھروں کو اس نور سے منور کرو"

اذا قضى أحدكم الصلاة في مسجده فليجعل لبيته نصيبا من صلاته فان الله جاعل في بيته من صلاته خيرا

"جب تم میں سے کوئی شخص اپنی مسجد میں نماز ادا کرے تو اسے چاہئے کہ کچھ نمازیں اپنے گھر میں بھی پڑھے، اس کی نماز کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے گھر میں خیر و برکت ڈال دے گا"۔

فصلوا أيها الناس في بيوتكم فان أفضل الصلاةِ صلاةُ الرجل في بيته الا المكتوبة

"اے لوگو! اپنے گھروں میں نماز پڑھا کرو، اس لئے کہ مرد کی افضل نماز وہ ہے جو اپنے گھر میں پڑھتا ہے، سوائے فرض نمازوں کے"

اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کی فطرت میں یہ بات ڈال دی ہے کہ اس کے مستقل رہنے اور زندگی گزارنے کے لئے ایک پناہ گاہ ہو جہاں رات دن آرام وسکون سے اپنی اولاد کے ساتھ رہ سکے اور مستقل ٹھکانہ بناسکے اسے گھر کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اسی فطرت کو قرآن پاک میں بیان فرمایا:

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا [1]

"اور اللہ تعالیٰ ہے جس نے تمہارے لئے تمہارے گھروں کو جائے سکون بنایا ہے"

اس آیت کی تفسیر میں امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: يذكر تبارك وتعالى تمام نعمه على عبيده بما جعل لهم من البيوت التي هي سكن لهم يأوون اليها ويستترون بها وينتفعون بها سائر وجوه الانتفاع

"اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اپنی نعمتوں کے اتمام کے ذکر میں فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے ان کے گھروں کو ان کے سکون وآرام کی جگہ بنایا ہے کہ لوگ اپنے گھروں میں آرام وراحت محسوس کرتے ہیں، یہ گھر ان کا لباس وستر بھی ہیں اور ان گھروں کی وجہ سے لوگوں کو دوسرے بہت سارے فائدے اور راحتیں ملتی ہیں"

امام القرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: وهذه الآية فيها تعديد نعم الله تعالى على الناس في البيوت (سكنا) أي تسكنون فيها وتهدأ جوارحكم من الحركة

"یہ آیت اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کو بیان کر رہی ہے کہ اللہ نے تم لوگوں کیلئے تمہارے گھروں کو تمہارے سکون وآرام کی جگہ بنایا ہے"

وہ گھر بابرکت ہیں جن میں گھر والے تلاوت قرآن میں مشغول رہتے ہیں اور اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں، گھروں کی برکت ونور وہ سنت ونفل نمازیں بھی ہیں جو ان گھروں میں ادا کی جاتی ہیں، خود احادیث صحیحہ میں ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا اور دوسرے صحابہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ مغرب اور جمعہ کے بعد کی سنتیں اپنے حجرہ مبارکہ یعنی اپنے گھر میں پڑھا کرتے تھے اور فرماتے تھے: أما صلاة الرجل في بيته فَنُورٌ فَنَوِّرُوا بيوتكم

"تم میں سے کسی کا اپنے گھر میں نماز (سنت ونوافل) ادا کرنا نور ہے للذا تم اپنے گھروں کو اس نور سے منور کرو"

ایک حدیث میں ہے: فصلّوا أيها الناس في بيوتكم، فان أفضل الصلاة صلاة المرء في بيته الا المكتوبة

"اے لوگو! اپنے گھروں میں نماز پڑھا کرو اس لئے کہ مرد کی افضل نماز وہ ہے جو اپنے گھر میں پڑھتا ہے سوائے فرض نماز کے"

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں فرمایا کہ: ان الله جاعلٌ في بيته من صلاته خيرًا [1]

"گھر میں نماز پڑھنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس گھر میں خیر وبرکت نازل فرماتا ہے"

خواتین گھروں میں نمازوں اور تلاوت کا خصوصی اہتمام رکھیں کہ یہ گھر کا نور ہے اور گھر کی برکت ورونق ہے اور اس نیکی کی برکت سے ہمارے گھروں میں قدوسی ملکوتی پاک مخلوق فرشتوں کی آمد ورفت جاری رہتی ہے اور زندگی آرام وسکون سے گزرتی ہے۔

سنت موکدہ اور نوافل کی گھروں میں ادائیگی، ان گھروں کے سکون وآرام اور ان گھروں کی برکت کا ایک سبب وذریعہ ہے، مسلمان مردوں کو چاہئے کہ وہ سنت ونوافل کو پابندی کے ساتھ گھروں میں ادا کریں، تاکہ گھروں میں بھی ان نمازوں کا نور وبرکت عام ہو، اور دوسری طرف گھر کے بڑوں کی نمازوں کی ادائیگی والے عمل کو دیکھ کر گھر کے دوسرے افراد اور اولاد بھی والدین اور بڑوں کی پیروی میں نمازیں ادا کریں گے۔

اللہ تعالیٰ کا صد ہزار بار شکر ہے کہ اس نے نماز جیسے اہم رکن اسلام کے بارے میں ایک مجموعۂ احادیث صحیحہ اور آثار صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم ورحمۃ اللہ علیہم اجمعین مرتب کرنے کی توفیق عطا فرمائی، اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ وہ اس عمل کو قبول فرما کر اسے افادۂ عام بھی بنادے، آمین۔

سیدنا عبد اللہ بن مسعودؓ مشہور، جلیل القدر صحابی ہیں، جن کے مناقب تمام کتب احادیث وسیر میں موجود ہیں، ان کی فضیلت کیلئے یہی ایک حدیث کافی ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر فرمادیا کہ میں اپنی امت کیلئے ہر اس چیز اور ہر

خدشہ 18:

انیسواں خدشہ یہ ہوتا ہے کہ مقلدین احباب میں تشدد ہے، تو بات ٹھیک ہے لیکن ہر عمل کا رد عمل ہوتا ہے تو تشدد والی غلطی دو طرفہ مکاتب فکر میں موجود ہے اللہ ہم سب کو سمجھ عطا فرمائے۔ تشدد اتنا بڑھ چکا ہے کہ وہ ہم کو اور ہم ان کو کافر اور مشرک سمجھتے ہیں نستغفر اللہ العظیم[1]۔

اس کام پر راضی ہوں جو میری امت کیلئے ابن مسعود پسند فرمالیں، سبحان اللہ! اس جملے پر غور کیجئے اور ذرا تصور کیجئے کہ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ہی تو نہیں فرمایا بلکہ ابن مسعود کی شخصیت کو خوب تربیت اور خوب تزکیہ کرکے انہیں اپنی امت کا معلم و محسن قرار دیا ہے، جیسا کہ اس حدیث کا مفہوم ہے: رضيتُ لأمتي ما رَضِيَ لها ابن أم عبد

میں اپنی امت کے لئے وہی پسند کرتا ہوں جسے ابن ام عبد (عبد اللہ بن مسعود) پسند کرتے ہوں

ہم نے اس کتاب میں سرکارِ دوعالم ﷺ کے اس طریقۂ نماز کو بیان کیا ہے جسے سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور دوسرے جلیل القدر صحابہ نے بنفس نفیس دیکھا، ان صحابہ نے برسوں رسول کریم ﷺ کی صحبت سے استفادہ کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو برسوں جس طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اس طریقہ کو امانت کے ساتھ امت تک پہنچادیا۔

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے علوم ان کے مایہ ناز شاگردوں کے ذریعہ حدیث وفقہ کے امام نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچے اور انہوں نے اس مسنون طریقۂ نماز کو اختیار فرمایا جو سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اختیار فرمایا، اور یہ وہی طریقہ ہے جس کے بارے میں خود سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: صلوا كما رأيتموني أصلي

ایسے نماز پڑھو جیسے تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔

[1] **صحابہ رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین کو معاذ اللہ فاسق کہنا:**

نزل الابرار نواب وحید الزماں صاحب حیدر آبادی کی کتاب ہے اس میں صحابہ کرام کے بارے میں لکھا ہے:

ان جاءكم فاسق بنبأ فتبينوا نزلت في وليد بن عقبه وكذالك قوله تعالي من كان مؤمنا كمن كان فاسقا، ومنه يعلم ان من الصحابة من هو فاسق كالوليد ومثله يقال في حق معاوية وعمر ومغيرة وسمرة

اس عبارت کا ترجمہ بدرجہ مجبوری آپ کے لئے کررہا ہوں ورنہ دل نہیں چاہتا کہ اس بیہودہ عبارت کا ترجمہ کروں۔

ترجمہ: ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا والی آیت ولید بن عقبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اور اسی طرح یہ آیت بھی من کان مؤمنا کمن کان فاسقا اور اس سے جانا جاتا ہے کہ صحابہ میں سے کچھ فاسق بھی تھے۔ جیسے ولید، اور یہی بات کہی جائے گی معاویہ، عمرو، مغیرہ، اور سمرہ کے بارے میں بھی۔

حضرت ولید بن عقبہ، حضرت معاویہ بن ابی سفیان، حضرت عمرو بن عاص، حضرت مغیرہ بن شعبہ، اور حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہم اجمعین یہ سب جلیل القدر اور عظمت شان والے صحابہ ہیں، ان صحابہ کرام کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا

مثلاً ہم میں یا کسی بھی اہل حدیث بزرگ عالم دین نعت میں یا شعر وشاعری میں یارسول اللہ کہہ گئے تو دو طرفہ متشدد علما نے شرک کے فتوے داغنے شروع کر دیئے، اس لئے کہ ہم سب نے اپنے بھیڑوں کو رنگ کیا ہوا ہے کہ ہمارا بھیڑ کسی اور کے پاس نہ جائے، اور یہ ہم تمام مکاتب فکر کے علماء میں اتفاقی مرض ہے کہ ہم سب "اتفقوا علی ان لا تتفقوا" کے مصداق بن چکے ہیں سب مولویوں نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ ہم کبھی بھی آپس اتفاق نہیں کریں گے، اب جو قرآن، حدیث اور ختم نبوت کو مانتے ہیں وہ مسلمان ہیں بشرطیکہ شرک اکبر سے بچے اور بدعت مکفرہ سے بچے [1]۔ (ص: 51)

ارشاد ہے کہ اللہ نے رسالت کے لئے مجھے پسند کیا۔ اور (میری رفاقت اور صحبت کے لئے) میرے اصحاب کو میرے لئے چنا۔ ان صحابہ کرام کے بارے میں اللہ نے رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کہا، اور ان کی اتباع کا مسلمانوں کو حکم فرمایا۔

انہیں نواب وحید الزماں صاحب کا ایک کتاب کنز الحقائق ہے، اس میں ان صحابہ کرام کے بارے میں لکھا ہے:

ویستحب الترضي للصحابة غير ابي سفيان ومعاويه وعمرو بن العاص ومغيرة بن شعبة وسمرة بن جندب (ص: 243)

یعنی صحابہ کرام کو رضی اللہ عنہم کہنا مستحب ہے مگر ابوسفیان، معاویہ، عمرو بن عاص، مغیرہ بن شعبہ، اور سمرہ بن جندب کو رضی اللہ عنہ کہنا مستحب نہیں ہے۔

افسوس یہ ہے کہ صحابہ کرام کے بارے میں نزل الابرار کے مصنف کا جو بیہودہ کلام ہے اس پر مولانا ابوالقاسم نے کوئی حاشیہ نہیں لگایا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ بنارسی صاحب خود بھی اس سے متفق ہے۔ معاذ اللہ

مرکزی ادارہ جامعہ سلفیہ بنارس سے شائع شدہ تنویر الآفاق نامی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے وہ کسی سنی کے قلم سے صحابہ کرام کے بارے میں نہیں لکھا جاسکتا، اس کتاب کی صرف دو عبارتیں پیش کرتا ہوں مصنف کتاب لکھتا ہے:

"ہم آگے چل کر کئی ایسی مثالیں پیش کرنے والے ہیں جن میں احکام شرعیہ ونصوص کے خلاف خلفائے راشدین کے طرز عمل کو پوری امت نے اجتماعی طور پر غلط قرار دیکر نصوص واحکام شرعیہ پر عمل کیا ہے۔ (ص: 107)

ایک جگہ یہ خلفائے راشدین ہی کے بارے میں لکھتا ہے:

"اسی بناء پر ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی ذاتی مصلحت بینی کی بنیاد پر بعض خلفائے راشدین نے بعض احکام شرعیہ کے خلاف بخیال خویش اصلاح ومصلحت کے غرض سے دوسرے احکام صادر کر چکے تھے، ان احکام کے سلسلہ میں ان خلفاء کی باتوں کو عام امت نے رد کر دیا" (ص: 107)

[1] **اختلاف کا نقصان:**

جہاد کی برکت سے حضور ﷺ نے ہم کو تین پاکستان جتنی زمین فتح کر کے دی اور حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ نے 9 پاکستان جتنی جگہ دی ہیں، حضرت عثمان اور حضرت علی نے 13 پاکستان دی ہیں اور امام حسنؓ اور معاویہؓ نے 24 پاکستان جتنی جگہ دی ہیں، ثوری،

غوری عالم تھےاور محمود غزنوی مفتی تھے، انہوں 67 پاکستان جتنی جگہ دی ہیں، توجب ہم آپس میں لڑے تو ٹوٹ گئے، چاہے بغداد کا ٹوٹنا تھا یا مغل حکمرانوں کا یا خلافت عثمانیہ کا1934 میں، کفر عالم اسلام پر چڑھ دوڑا تھا، عربوں کو ترکوں کے خلاف اکسایا گیا، اور اس وقت کتاب لکھی گئی" دوام العیش فی ان الائمۃ من قریش" کہ بادشاہ تو قریش میں سے ہوگا، تو کیسے ترکی عجمی عربوں پر حکومت کر رہے ہیں۔ بات ٹھیک تھی لیکن اس ٹھیک بات نےاتنا نقصان پہنچایا کہ عرب ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے خلافت عثمانیہ ٹوٹ گئی اور کفر مضبوط ہوگیا، مولانا احمد رضا خان صاحب نے دوسری یہ کتاب لکھی" اعلام الاعلام بان ہندوستان دارالاسلام "کہ ہندوستان دارالاسلام ہے، اور جس وقت دیوبند کا مہتمم مولانا حسین احمد مدنیؒ مدینہ منورہ سال وسال سے درس دے رہے ہیں، اسی عین وقت میں حسام الحرمین کتاب تیار کرکے اوراحمد رضاخان صاحب ائمہ حرمین سے فتوی لیتے ہیں کہ دیوبندی کافر ہیں، ان کے یہ یہ عقائد ہیں، اور پوری دنیا میں یہ کتاب تقسیم کی گئی اور ایسے وقت میں ہوا کہ حضرت مدنیؒ صاحب ان کے ہاں درس دے رہے ہیں ان کو پتہ بھی نہیں لگنے دیتے اور پھر ہوایوں کہ سوال کو صحیح کرکے پیش کیا جاتا ہے، اور "المھند" تیار ہوتی ہے اور حرمین کے بزرگ صحیح سوال پڑھ کر حق جواب شائع کرتے ہیں تواختلاف ختم ہونا چاہیئے تھا لیکن مرض بڑھتا گیاجوں جوں دوا کی آج کے ائمہ حرمین اگر بریلویوں کو قبوری اور کافر کہتے ہیں توکیا یہ تسلیم ہے، اللہ رب العزت ہم سب کو بغض وحسد کی آگ سے بچائے کہ ہم علما کی معمولی غلطی سے کتنا بڑا نقصان ہوتا ہے، اور امت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے لیکن حسات آخرت میں ہوگا، بغض وحسد کی ایک مثال پیش کرتا ہوں کہ جنید جمشید سے ایک غلطی ہوئی انہوں رورو کے معافی بھی مانگی لیکن ایک نوجوان نے جنید مرحوم کو منہ منہ پر تھپڑ رسید کئے یہ ہے بغض وحسد اور علما کا آپس کا اختلاف چنانچہ وہ لوگ ہماری امی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو ننگی گالیاں دیتے ہیں ان کو کسی نے تھپڑ نہیں ماری، بلکہ الٹا یہ نعرہ لگایا گیا کہ شیعہ سنی بھائی بھائی تیسری قوم کہاں سے آئی یہ بغض وحسد دل کوایسا سخت بنادیتی ہے کہ مدرسہ کی سینکڑوں بچیاں آگ سے جلادی جاتی ہے لیکن بغض کرنے والوں کو رحم نہیں آتا ہےاور کہہ دیتے ہیں کہ مردار ہوگئیں اس لئے کہ یہ گستاخ ہیں، اللہ کے بندوں! دن رات ہم یہ نعت پڑھتے ہیں" ہم مدینہ کو جائیں واپس نہ آئیں" لیکن ہمارے ستر سے زائد علمائے دیوبند مکہ مدینہ کے قبرستان جنت المعلی اور جنت البقیع میں دفن ہےاور پھر بھی کہا جاتا ہے کہ یہ گستاخ رسول ہیں اللہ ہم سب کو اتحاد عطاء فرمائے، جوڑ عطاء فرمائے، امن اور سمجھ عطاء فرمائے۔ آمین

شروع تکبیر تحریمہ سے لیکر نماز کی آخری سلام تک نماز کے بعض فروعی مسائل میں جو اختلاف ہے یہ فطری اختلاف ہے جو شروع سے چلاآرہاہے، دوطرفہ دلائل صحابہؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ موجود ہیں، لہٰذا صرف اپنے آپ کو سنت کے موافق اور دوسرے طریق والے کو بالکل خلاف سنت کہنا دین کا شدید نقصان ہے، اور امت کو پارہ پارہ کرنا ہے، جس طرح کہ ہورہاہے، اگر ہر عالم دین انہی موضوعات پر بیان کرتے اور کتاب لکھتے، یہ کہے اور لکھے کہ دونوں طریقے سے نماز پڑھنا درست اور جائز ہے لیکن ہمارے نزدیک سنت کے قریب اور مستحب طریقہ یہ ہے تو بڑا اچھا ہوگا، تاہم اپنے طریق کے دلائل اور تصحیح شوق سے بیان کریں گے، لیکن ساتھ یہ کہیں گے اور لکھیں گے جس کا تذکرہ ہوا تشدد ختم ہو جائے گا، تاہم کوئی ساتھی اس بات پر ناراض نہ ہو کہ جس طرح امام نوویؒ کا نام آپ حضرات نے اپنی کتابوں میں گیارہ ہزار ایک سو اکہتر مرتبہ نہایت ہی ذوق اور شوق سے اپنی دلیل کی تصحیح مؤقف کی تحقیق اور راوی روایت کی توثیق کے لئے پیش کی ہے، وہ بخاری ومسلم کی اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں "اذااجتھد الحاکم فاصابہ

فله اجران الخ" کہ جب کوئی فقیہ یا مسلم حکمران کوئی اجتہادی فیصلہ کرے اور صحیح فیصلہ کرے تو اس کے لئے دو اجر ہیں، اور غلطی ہو جائے تو اس کے لئے ایک اجر ہے۔ اس حدیث کے تشریح میں فرماتے ہیں کہ اجر تب ملے گا کہ کوشش کرنے والا مجتہد اور فقیہ ہو، لیکن اگر ایک آدمی اختلافی مسئلے میں ایک مؤقف اختیار کرتا ہے نہ تو وہ مجتہد ہے اور نہ کسی مجتہد کی بات ماننے والا تو اس کو بہر صورت گناہ ملے گا چاہے رفع یدین کرے یا نہ کرے خون سے وضو کرے یا نہ کرے دونوں صورتوں میں سزا کا مستحق ہے اور شافعی مقلد کو رفع یدین پر ثواب ملتا ہے اور حنفی مقلد کو ترک رفع یدین پر ثواب ملتا ہے چنانچہ علامہ نووی کی عبارت ملاحظہ ہو:

وفي الحديث محذوف تقديره اذا اراد الحاكم فاجتهد قالوا فامامن ليس باهل للحكم فلايحل له الحكم فان حكم فلا اجر له بل هو آثم ولا ينفذ حكمه سواء وافق الحق ام لا لان اصابته اتفاقية ليست صادرة عن اصل شرعي فهو عامي في جميع احكامه سواء وافق الصواب ام لا وهي مردودة كلها ولا يعذر في شيء من ذلك . (مسلم ثانی، ص: 76)

لیکن میں نے اپنے استاد مفتی اعظم بنگلہ دیش مفتی عبدالسلام چاٹگامی سے پوچھا! کہ اہل حدیث حضرات کو رفع یدین پر ثواب ملتا ہے تو حضرت نے فرمایا کہ ہاں اس لئے ان کے عام لوگ اپنے بڑے علما کی قدر بھی کرتے ہیں ان کی بات پر مکمل یقین کرتے ہیں ان کے بڑے علما گزشتہ مجتہدین ہی سے مدد لیتے ہیں تو گویا یہ ان کے پیچھے چلنے والے ہیں، لہٰذا ان کو ثواب ملے گا جیسے کہ بہت سارے اہل حدیث حضرات حج پر جاتے ہیں واپس آ جاتے ہیں بے چارے عامی نیک لوگ ہوتے ہیں ان کو حج کے فرائض واجبات اور سنت طریقہ معلوم نہیں ہوتا لیکن ان کا حج ہو جاتا ہے اس لئے کہ ان کا حج تقلیدی ہوتا ہے جو ان کے حضرات علمائے کرام ان کو بتاتے ہیں اسی پر چلتے ہیں کام کے لوگ دلیل کیا جانیں بلکہ مقلد اور غیر مقلد کی اکثریت کی قراءت اور تجوید ٹھیک نہیں ہوتی تو ترجمہ اور دلیل تو دور کی بات ہے، بہر حال رفع یدین کے حوالے سے ہم بات چیت کر رہے تھے کہ اکثر صحابہ کرامؓ رفع یدین نہیں کرتے تھے بعض صحابہ کرتے تھے، چنانچہ امام ترمذی فرماتے ہیں: "وبه يقول بعض اهل العلم من اصحاب النبي ﷺ ----- وبه يقول غير واحد من اهل العلم من اصحاب النبي ﷺ اور اسی طرح دو بڑے بزرگ امام مالک اور امام ابو حنیفہ رفع یدین کے قائل نہیں جبکہ بعد کے دو امام، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ رفع یدین کے قائل ہیں، آج بھی اکثریت رفع یدین نہیں کرتی واضح رہے کہ کم و بیش 24 جگہوں پر رفع یدین تھا سلام کے وقت، سجدے کے وقت اور ہر اٹھتے بیٹھتے رفع یدین تھا، جو اجماعا بعد میں منسوخ ہوا، باقی چار رکعتوں میں جو 10 جگہ رفع یدین ہے ہم کہتے ہیں پہلی تکبیر کے علاوہ 9 جگہ پر رفع یدین بھی منسوخ ہے اور یہ نسخ، نسخ حقیقی نہیں ہے نسخ اجتہادی ہے (اہل علم اس بات کو جانتے ہیں) چنانچہ امام نوویؒ لکھتے ہیں اختلافی مسئلے میں جب محدث دو باب قائم کرتے ہیں تو دوسرا باب نسخ اجتہادی کی طرف اشارہ کرتا ہے، لہٰذا یہ سوال کرنا غلط ثابت ہوا کہ اگر رفع یدین منسوخ ہے تو نسخ کا لفظ دکھاؤ، اس لئے کہ اتفاقی منسوخ رفع یدین کے بارے میں بھی تو نسخ کا لفظ نہیں ہے، پاک رب ہم کو سمجھ دے، اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ رفع یدین کے بارے میں صحیح روایات سینکڑوں ہیں یا سینکڑوں صحابہ کرامؓ رفع یدین کرنے والے ہیں تو یہ بات درست نہیں جس کی تفصیل آرہی ہے، رفع یدین کے حوالے سے ان کے ہاں بھی صحیح روایتیں صرف اور صرف سات ہیں جو امام بیہقی نے نقل کی ہے، اور بخاری میں صرف 2 اور مسلم شریف میں 2 کے علاوہ ایک ہے۔ دو طرفہ روایات پر تفصیلی تبصرہ آرہا ہے۔

خدشہ 19:

بیسواں خدشہ یہ ہوتا ہے کہ مقلد حضرات تعویذ، گنڈے کے شرک میں مبتلا ہے، جبکہ ہم اس دم کو مانتے ہیں جو قرآن وحدیث سے ہو اور اس میں غیر اللہ سے استعانت نہ ہو، جہاں تک تعویذ کا مسئلہ ہے تو جتنے تعویذ کے اڈے ہیں وہاں بے پردگی کاروبار عام ہیں، اکثر یہ کام کرنے والے شرک وبدعت کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں، اور غیب کی خبریں بتاتے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ صحیح دم اور تعویذ جائز ہے لیکن مذکورہ گناہوں سے بچ کر، پاک نبی ﷺ نے ان کے تعویذ کاٹے او پھینکے ہیں جو فرد یا وفد اسلام لانے کے لئے آیا تھا، اور اسلام سے پہلے ان کے گلے میں جو تعویذ تھی اس کو پاک نبی نے کاٹا تو یقینا وہ تعویذ شرکیہ ہوگی، بعض حضرات کہہ دیتے ہیں کہ " التمائم الشرک" تعویذات شرک ہے، اور پوری حدیث پیش نہیں فرماتے "ان الرقی والتمائم و التولة شرک" تمام دم اور تعویذات اور محبت کے منکے شرک ہیں تو یہاں تعویذ کے ساتھ دم کا بھی ذکر ہے اور اگر صحیح دم جائز ہے تو صحیح تعویذ بھی جائز ہے[1]۔

---

[1] **تعویذ وغیرہ کو شرک کہنا:**

ترمذی شریف میں حضرت عمیر مولی ابی اللحم کی ایک حدیث ہے جس کو امام ترمذی نے حسن صحیح قرار دیا ہے، اس حدیث کے آخر میں حضرت عمیر فرماتے ہیں کہ: عرضت علیه رقية كنت ارقي بها المجانين فامرني بطرح بعضها وحبس بعضها۔

یعنی میں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے جھاڑ پھونک کے وہ کلمات سنائے جن کے ذریعہ میں پاگلوں کا علاج کیا کرتا تھا تو آپ ﷺ نے ان کلمات میں سے کچھ نکالنے کا حکم دیا اور کچھ کو باقی رکھا۔

مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوری صاحب تحفۃ الاحوذی میں اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں: وفيه دليل على جواز الرقية من غير القرآن والسنة بشرط ان تكون خالية عن كلمات شركية وعما منع عنه الشريعة

یعنی اس حدیث میں اس کی دلیل ہے کہ جھاڑ پھونک قرآن وسنت کے علاوہ سے بھی جائز ہے، بشرطیکہ وہ کلمات شرکیہ سے خالی ہو اور اسی طرح خلاف شرع باتوں سے بھی خالی ہو۔

شیخ ابن باز رحمہ اللہ جھاڑ پھونک کے سخت مخالف ہیں مگر بالکلیہ جھاڑ پھونک انکار نہیں کرتے فرماتے ہیں: "مسلمانوں پر واجب ہے کہ شرک پر مشتمل دعا، تعویز سے پرہیز کریں اور شرعی دعا تعویذ پر اکتفا کریں"۔(مجموع فتاوي ج: 1/ص: 214)

خدشہ 20:

بیسواں خدشہ یہ بھی سنایا گیاہے کہ مقلدین حضرات کے عید کے دین کی قربانیاں ہی صحیح نہیں ہے، جب کہ چوتھے دن یہ قربانی کر سکتے ہیں تو یہ کرتے کیوں نہیں ہے، اور عظیم عبادت سے یہ محروم ہوجاتے ہیں۔ جواباً عرض ہے کہ یہ بھی ایک فروعی مسئلہ ہے تو کیوں ہم آپس میں لڑے،بڑیں اور اپنے اختلافات سے کفر کو مضبوط کرے اور حکومت کے راستے ان کے لئے ہموار کریں، اور خلافت سے دن بدن پیچھے ہٹتے رہیں اور آپس میں کمزور ہوتے رہیں "وتنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم ای قوتکم " چنانچہ شیخ طاہرؒ ارو مولانا حمد اللہؒ کتنے بڑے علم کے سمندر، قرآن کے خادم تھے اور دونوں ایک مکتبہ فکر کے تھے، لیکن افراط اور تفریط میں اتنے دور چلے گئے کہ اکثر افراد اس طرف کے اہل حدیث کی طرف چلے گئے بشمول اکابر واصاغر کے اور اس طرف تشدد اتنا بڑا کہ بریلوی احباب کی کتاب " الصلوۃ السلام علیک یارسول اللہ " پر تقریظ لکھی۔ اسی طرح مولانا یونس نعمانیؒ ارو قاضی شمس الدین ارو مولنا غلام اللہ خان، مولانا سرفراز خان صفدر صاحب اور مولانا امین اکاڑویؒ کس طرح علم کے چلتے پھرتے کتب خانہ تھے لیکن سنتوں کے بعد دعا، وسیلہ پر اتنے آگے بڑھ گئے کہ اب وہ مکاتب فکر نہ رہے بلکہ عملی طور پر گویاکے فرقے بن گئے ایسا لگتاہے کہ ان کا آپس میں اصولی اختلاف ہے، اسی طرح میاں نذیر حسین صاحب، نواب صدیق حسن خان صاحب، وحید الزمان صاحب، سیالکوٹی صاحب، کیلانی اور مبارکپوری صاحب معمولی علما نہیں تھے اس طرح محترم جناب زبیر علی زئی صاحب مولانا عبد اللہ بہاولپوری صاحب بڑے علما تھے اور مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، شبیر احمد عثمانیؒ، اور ان جیسے اور اکابر اور امین اکاڑوی علم کے سمندر تھے، لیکن آپس میں مل نہ بیٹھنے اور آپ میں کھانا چائے نہ پینے کی وجہ سے اتنے دور چلے گئے کہ امت مسلمہ کا عظیم نقصان ہوا، میری اب کی یہ بات دوطرفہ دونوں علما کو برداشت نہیں ہوگی لیکن بات یہی ہے کہ بڑے علما کا اصل مسائل کو چھوڑنا اور ایک مؤقف کو پکڑ کر دوسرے پر سخت فتوے لگانا، امت مسلمہ کا شیرازہ بکھیرنا ہے اور بکھر رہا ہے اور دور کے کافر اور قریب کے منافق خوشی سے بغلے بجاتاہے کہ ہم حکومت کریں گے اور یہ مولوی لڑتے رہیں گے اور خلافت جائے بھاڑ میں۔

علمائے کرام اللہ کے بندو! ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھو، کھانا کھاؤ، چائے پیو، علمی مسائل پر دوستانہ ماحول میں بات چیت کرو، تو اللہ تعالی خیر کی دروازے کھولے گا[1]۔

---

[1] **قربانی کی آیام:**

مشہور غیر مقلد عالم اور محدث مولانا عبد الرحمن مبارک پوری فرماتے ہیں : "ابن عربی نے شرح ترمذی میں فرمایا ہے کہ قربانی کی فضیلت کے بارے میں کوئی بھی صحیح حدیث نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں (یعنی مولانا مبارک پوری فرماتے ہیں) کہ بات وہی ہے جو ابن عربی نے کہی۔ (تحفة الاحوذي ج:2/ص:353)

یہ اتنا بڑا اختلاف نہیں ہے جی ! حضرت عمر ﷺ، حضرت علی ﷺ، حضرت عبد اللہ بن عمر ﷺ، حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ، حضرت ابوہریرہ ﷺ، حضرت انس ﷺ، امام مالک، امام احمد بن حنبل، ان تمام اسلاف کا عمل حدیث کے خلاف ہے۔

شیخ ابن باز کے زیر اہتمام ریاض کے دار الافتاء سے شائع ہوئی ہے، اس میں قربانی کے سلسلہ میں لکھا ہے:

"قربانی کے تین دن ہیں، عیدین کا دن اور دو دن اس کے بعد کے، اور یہی قول حضرت عمر ﷺ، حضرت علی ﷺ، حضرت عبد اللہ بن عمر ﷺ، حضرت عبد اللہ بن عباس ﷺ، حضرت ابوہریرہ ﷺ، اور حضرت انس ﷺ کا بھی ہے حضرت امام احمد نے کہا کہ قربانی کے تین دن ہیں اور یہی بہت سے صحابہ کرام سے مروی ہے اور یہی قول امام مالک امام ثوری اور امام ابو حنیفہ کا بھی ہے۔ (المغني ج: 8/ص:938)

حافظ ابن عبد البر مشہور مالکی حافظ حدیث، محدث فقیہ ہیں، مذہب مالکی میں ان کے مشہور کتاب کا نام الکافی ہے یہ کتاب بھی شیخ ابن باز کے دار افتاء ریاض سے شائع ہو کر مفت تقسیم ہوئی ہے، اس کتاب میں ایام النحر کے بارے میں لکھا ہے: "قربانی کے دن قربانی والا یعنی عید کا دن ہے اور دو دن اس کے بعد ہیں، اور چوتھے روز قربانی نہیں کی جائے گی۔ (ج: 1/ ص: 423)

دیکھا آپ نے، امام احمد اور امام مالک کا مذہب بھی قربانی کے دن کے سلسلہ میں وہی ہے جو امام ابو حنیفہ کا ہے۔

قربانی کے صرف تین دن ہیں، المغنی میں اس کی جو دلیل ذکر کی گئی ہے وہ یہ ہے فرماتے ہیں: "ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے تین سے زیادہ قربانی کا گوشت ذخیرہ کرنے سے منع فرمایا تھا، پس اس روز قربانی نہیں جائز ہوگی جس دن میں گوشت کے ذخیرہ کرنے کی ممانعت کی گئی تھی۔ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ چوتھے دن رمی (شیطان کو مارنا) ضروری نہیں ہے، پس اس دن قربانی بھی جائز نہ ہوگی، جیسے ان کے بعد کے دنوں میں۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ یہی مذہب ان صحابہ کرام کا بھی ہے جن کا اوپر ہم نے نام لیا ہے۔ اور ان کا کوئی مخالف نہیں ہے سوائے حضرت علی کی ایک روایت کے، ان کی ایک دوسری روایت ہمارے مذہب کے موافق ہے"۔

مؤطاامام مالک صحیح سند سے نقل کرتے ہیں: "نافع سے روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر ﷺ نے فرمایا کہ عید کے دن کے بعد قربانی کے دو دن ہیں، امام مالک نے یہ بھی فرمایا کہ حضرت علی ﷺ سے بھی اس طرح کی بات مجھے پہنچی ہے۔

کل ایام تشریق ذبح. (زاد المعاد ج: 2/ ص:318)

خدشہ 21:

اور اکیسواں خدشہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اہل حدیث ہیں اور آپ لوگ حنفی ہیں تو ہم حدیث کی طرف منسوب ہیں تو جوابا عرض ہے کہ ہم اہل سنت والجماعت ہیں یعنی پاک نبی کی سنت اور صحابہ کی جماعت کے طریقے پر چلنے والے جس طرح ہم بولتے ہیں کہ یہ حدیث بخاری کی ہے، تو اس کا مطلب یہ نہیں

خود ابن قیم رحمہ اللہ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: "الحديث منقطع لا يثبت وصله. (زاد المعاد ج: 2/ ص: 317)

یعنی حدیث منقطع ہے آنحضور ﷺ تک اس کا موصول ہونا ثابت نہیں ہے۔

غیر مقلد احباب کا دوسرا استدلال حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ اثر ہے، آپ کا ارشاد ہے: ایام النحر یوم الاضحي وثلاثة ایام بعده . (ایضاص ج: 2/ص: 319)

یعنی قربانی کے چار روز ہیں ایک روز عید کا اور تین روز اس کے بعد کے۔

تو اس سلسلہ میں پہلی گزارش یہ ہے کہ حضرت علی صحابی ہیں اور صحابی کا قول غیر مقلد حضرات کے یہاں حجت نہیں۔

نواب صاحب بھوپالی فرماتے ہیں: وقول الصحابي لاتقوم به حجة الروضة. (الندایة ج: 1/ص: 141)

یعنی صحابی کے قول سے حجت قائم نہیں ہوتی ہے۔

دوسرے یہ کہ جیسا کہ المغنی اور مؤطا امام مالک کے حوالہ سے معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دو طرح کے روایت ہے، ایک یہ کہ قربانی کے ایام تین ہیں اور دوسرے یہ کہ قربانی کے ایام چار ہیں، تو ان دونوں روایتوں میں سے چار والی روایت کو اختیار کرنے کی کوئی مضبوط دلیل ہونی چاہیئے، اور وہ دلیل غیر مقلد بزرگوں کے پاس نہیں ہے، البتہ تین والی روایت کو ترجیح اس لئے حاصل ہوگی کہ جیسا کہ المغنی میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مذہب قربانی کے بارے میں تین دن کا تھا، تو وہ حدیث جو قول و فعل دونوں کے مطابق ہو اس کی ترجیح ظاہر ہے اس کو چھوڑ کر دوسری روایت کو اختیار کرنا عقل کے بالکل خلاف ہے، ان دونوں حدیث کے علاوہ کوئی اور صحیح حدیث اس بارے میں نہیں ہے جن سے غیر مقلدین کا استدلال درست ہو، اور ان دونوں حدیث کا حال معلوم ہو چکا کہ یہ قطعاً غیر مقلد احباب کے اصول پر قابل استدلال نہیں ہیں۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا یہ فرمان بھی قارئین اپنے ذہن میں رکھیں، وہ فرماتے ہیں: ایام الاضحی التی اجمع علیها ثلاثة ایام .(المغني ج: 8/ ص:)

یعنی قربانی کے ایام جن پر اجماع ہے تین دن ہیں۔

بخاری میں حضرت عبد اللہ بن عمر کی روایت ہیں: عن ابن عمر قال كان النبي ﷺ يذبح وينحر بالمصلي .

(رواه بخاري، مشكوة)

یعنی حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ دوگانہ ادا کرنے کی جگہ قربانی کیا کرتے تھے۔

ہے کہ یہ حدیث روس کی ہے مکہ مدینہ کی نہیں ہے، بلکہ حدیث مکہ، مدینہ کی ہے لیکن نقل کرنے والے امام بخاریؒ ہے اسی طرح نماز بھی نبی ﷺ کی ہے اجتہاد ابو حنیفہؒ کا ہے، باقی اہل سنۃ والجماعت کا یہ پیارا نام حدیث اور قرآن کی آیت کی تفسیر میں ہے جبکہ اہل حدیث کا نام تو ٹھیک ہے لیکن یہ قرآن کی آیت کی تفسیر یا حدیث میں نہیں ہے، سب سے پہلے اہل حدیث کا لفظ استعمال کرنے والے، امام احمدؒ، عبد القادر جیلانیؒ، اور ابن کثیرؒ وغیرہ ہیں۔ اور یہ امتی ہیں، نہ قرآن ہے اور نہ حدیث ہے قرآن کی جو آیت ہے" جس دن بعض لوگوں کے چہرے سفید ہوں گے اور بعض لوگوں کے چہرے کالے ہوں گے " (یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ) جن کے چہرے سفید ہوں گے وہ اہل سنت والجماعت ہوں گے (تفصیل کے لئے تفسیر در منثور دیکھئے) لفظ "اہل حدیث" ضعیف حدیث میں بھی استعمال نہیں ہوا ہے اسی طرح سلفی اوراثری نام بھی قرآن وحدیث میں نہیں آیا ہے، اگر منکرین حدیث اپنے آپ کو اہل قرآن کہیں اور بدعتی اہل سنت کہیں تو ہم اپنا اصلی نام نہیں چھوڑیں گے اور یہ بات نہایت ہی توجہ سے واضح رہے کہ اہل الصرف، اہل النحو، اہل التجوید کس کو کہتے ہے؟ اس فن کے ماہرین کو کہتے ہیں ہر دیہاتی اور شہری کو اہل النحو نہیں کہتے، بلکہ یہ فنی طبقے کا نام ہے افراد کا نام نہیں، تو اہل حدیث، حدیث کے فنی طبقے کا نام ہے جو حدیث کے متن، سند اور رجال سے بحث کرتے ہیں، (شاہ ولی اللہ) ہم سب کو اہل سنۃ والجماعت کہنا چاہیئے۔

خدشہ 22:

بائیسواں خدشہ یہ ہوتا ہے کہ امام مہدی اور حضرت عیسیٰؑ جب آئیں گے تو وہ حنفی ہوں گے یا شافعی؟ تو جواباً عرض یہ ہے اور یہی جمہور فرماتے ہیں کہ وہ مجتہد مطلق ہوں گے، لیکن اگر وہ حنفی ہوں گے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے اس لئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام امتی بن کر تشریف لائیں گے اور حضرت عیسیٰؑ کے ہوتے ہوئے امتی امام مہدی ہی امامت کرائیں گے تو امتی کے پیچھے اگر وہ نماز پڑھ سکتے ہیں تو ایک تابعی (امام ابو حنیفہؒ) کی تقلید میں کیا نقصان ہے؟

دوبارہ یہ گزارش کروں گا کہ حضرات علمائے کرام جب بھی اس فروعی، اختلافی موضوع پر لکھیں تو یہ ضرور لکھیں کہ دو طرفہ نماز صحیح ہے دو طرفہ دلائل موجود ہیں، لہٰذا تشدد نہ کرو اور اس موضوع پر جب بھی بولیں لکھے یا بیان کریں تو ادب کا دامن نہ چھوڑیں، اور گالی سے پرہیز کریں، جب شرک اور بدعت کی نفی پر ہمارا اتفاق ہے تو ہم آپس میں مل بیٹھتے کیوں نہیں؟ مل بیٹھنے سے بھی بڑے مسائل حل ہوتے ہیں، آپس میں چائے پینے سے 80 فیصد مسائل حل ہو جاتے ہیں اس لئے کہ یہ لڑائی جھگڑے کے مسائل ہے ہی نہیں، تو مفت میں ہم آپس میں نبرد آزما اور دست بہ گریباں باہمی چپقلش ذہنی خلفشار اور ایک دوسرے کے سامنے چیں بہ جبیں ہے اور وہاں کے کافر اور یہاں کے منافق خوش ہیں کہ مولوی لڑتے جائیں اور ہم حکمرانی کرتے جائیں گے یہ چیزیں خلافت کو دور کرتی ہیں اور کفر کو مضبوط۔

نہایت ہی خاص نصیحت:

میرے نہایت ہی پیارے! اگر اس بات پر آپ غور فرمائیں تو ہمارے آپس کا تشدد ختم ہو جائے گا، اور وہ بات یہ ہے کہ ہم گزشتہ قابل قدر جمہور اسلاف کو نہ چھوڑیں، ایک ہزار سال تک جن باتوں پر اتفاق رہ چکا ہے ہم نئی تحقیق پیش نہ کریں، بس انہیں جمہور سے جڑیں رہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ہی میڈیکل کے مسئلے پر تحقیق کرے گا نہ کہ انجنیئر، وکیل ہی دفعہ اور ایکٹ پر بولے گا نہ کہ مولوی تو دینی مسئلہ کی تحقیق کون کرے گا؟ تو جواب یہ ہے کہ اس فن کا ماسٹر ہی تحقیق کرے گا نہ کے انجنیئر، تو میٹرک پاس لڑکوں کا دینی علمی مسئلہ کے بارے میں یہ کہنا کہ تحقیق کرنی چاہیئے، میں تحقیق کر رہا ہوں اے لوگو! تحقیق کرو، کتنی غلط بات ہے۔

اور تیسری اہم بات یہ ہے کہ اگر تھوڑا سا ہم سوچیں کہ قرآن وسنت اور حدیث حق ہے تو قرآن کی جتنی تفسیریں ہیں ہزاروں اور صحاح ستہ کی جتنی شروحات ہے ہزاروں وہ کس نے لکھی ہے؟ آپ خود اپنے دماغ سے 10 تفسیروں کے نام لے، بخاری کی 10 شروحات کا نام لے کون ہیں یہ سارے؟ یہ سارے کے سارے مقلد ہیں اس لئے کہ یہ سارے کہتے ہیں کہ تراویح بیس رکعات ہیں، اور

ایک بھی تین طلاقوں کو ایک نہیں کہتے بلکہ سب کے ہاں تین طلاقیں تین ہی ہیں تمام مفسرین و محدثین کا جو مؤقف ہیں بس اسی کو ہم اختیار کرے، قرآن حق، صحاح ستہ حق اس کے جو شارحین ہیں، نماز نبوی 1880ء کے بعد ہم جتنی بھی کتابیں لکھ چکے ہیں تمام گزشتہ بزرگوں کے ناموں سے وہ مزین ہیں امام نووی، ابن حجر عسقلانی، ذہبی، ابن عبدلبر مالکی وغیرہ وغیرہ یہ کون ہیں؟ ہماری کتابوں میں تمام علما کے جو حوالے پیش کئے جاتے ہیں ہم سب صرف نماز نبوی کو لے لیں۔ الف تا یا جتنے بزرگوں کے نام اس میں موجود ے سب کہتے ہیں تراویح بیس رکعات ہے، سب کہتے ہیں ایک مجلس میں تین طلاقیں تین ہی ہیں، تو ان تمام بزرگوں کے نام جو آپ کی کتابوں میں ہیں سب ایک بات کرتے ہیں اور ہم دوسری، ایک ہے فروعی اختلاف اس میں تو اختلاف کی گنجائش ہے، لیکن جہاں اجماع ہے وہاں ایک نیا راستہ اختیار نہ کریں، اللہ ہم سب کو سمجھ عطا فرمائے۔

چوتھی اہم بات یہ ہے کہ ہمارے ماشاء اللہ بڑے بڑے مدارس ہیں، اس میں حفاظ اور علما بنتے ہیں، تو ہمارے جو مدارس اہل حدیث بزرگوں کے ہیں ان کے جو سلیبس ہے وہ آپ اٹھائیں اور ان سب سے پوچھ لیں کہ آپ میراث میں کون سی کتاب پڑھاتے ہیں؟ آپ 1880ء سے پہلے تفسیر کی کتاب، حدیث کی، اصول حدیث کی، اسماء الرجال، صرف، نحو، علم بدیع، علم معانی، جتنے 14 اور علوم ہیں ان میں سے کون کون سی کتابیں پڑھاتے ہیں 1880ء سے پہلے اس میں ایک عالم بھی نہیں ہوگا جس کا مؤقف آج کے ہمارے اہل حدیث کے مؤقف کے مطابق ہوگا ہم اس آسان بات کو کیوں نہیں سمجھتے؟

پانچویں بات یہ ہے کہ جتنے ہمارے اکابر ہیں، حضور ﷺ نے 3 پاکستان جتنی جگہ دی ہے، ابو بکرؓ، عمرؓ نے 9 پاکستان جتنی جگہ دی ہے، عثمانؓ و علیؓ نے، 13 پاکستان جتنی جگہ دی ہے، امیر معاویہ نے 67 پاکستان جتنی زمین ہمیں دی ہے، سوری، غوری، ٹیپو سلطان، التمش، ہارون الرشید وغیرہ وغیر جتنے بھی ہیں یہ کمانڈر کون تھے؟ کیا ان کی سوچ تھی؟ کیا ان کی فکر تھی؟ جنہوں نے آدھا یورپ لیا، سکیاتک، چائنا لیا یہ کمانڈر کون تھے؟ مفسر کون تھے؟ محدث کون تھے؟ حکومتیں کونسی گزری ہیں؟ خلافت

عثمانیہ سات، آٹھ سوسال، مغل خاندان، سلجوق خاندان، خاندان غلامان، توری خاندان، غوری خاندان، وغیرہ وغیرہ ایک لمبی فہرست ہے یہ سب مقلد تھے، قاری حفص کی تلاوت ہم پڑھتے ہیں، تجوید کی جتنی کتابیں ہیں 1880ء سے پہلے کس کی ہیں؟ جمہور کا دامن ہم سب پکڑلیں تو سارے فتنے کافور اور ذہن صاف ہو جائے گا، باقی ہم نے جو شروع اور آخر میں سوالات دیئے ہیں، اس کا مقصد یہ ہے کہ ہماری سوچ جاگ جائے، اس کی پہلے تحقیقی جواب دی جائے اور پھر الزامی اگر چاہو تو دواس کا مقصد یہ ہے کہ تشدد ختم ہو جائے، اور اتفاق اور اتحاد کے راستے ہموار ہوں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

نہایت سخت بات:

اس بات سے اگرچہ دو طرفہ افراد مجھ سے ناراض ہوں گے لیکن غصہ نہ کرو۔ صفات اور استواء علی العرش کے بارے میں اگر گہری نگاہ سے مطالعہ کیا جائے تو اتنا فرق نظر نہیں آتا لیکن الزام در الزام لگانے کی وجہ سے جنگ دور جاچکی ہے کہ ہم ان کو نعوذ باللہ من ذلک مجسمہ ثابت کرتے ہیں اور وہ ہم کو مرجئہ اور دیگر فرق باطلہ میں شمار کرتے ہیں، اگرچہ دونوں اہل حدیث، مسلمان ہیں تو اس پر بھی علمائے کرام اگر آپس میں مل بیٹھیں تو بڑا فائدہ ہو گا بہر حال ہمارا کیا مؤقف ہے اس پر علمی بحث تو ہم (اہل حدیث، سلفی، اثری، اہلسنت) سب نے کرلی، لیکن دوستانہ ماحول میں مل بیٹھنے کی ضرورت ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

اختلافات سے بچنے کیلئے اچھے اچھے سوالات :

اگر صرف قرآن و حدیث کا ہی مطالعہ کرنے والے ساتھی ان سوالوں کے جوابات پر غور فرمادیں توانکو نہ زیادہ مباحث میں پڑنے اور نہ اس موضوع پر بہت ساری کتابوں کو پڑھنے کی ضرورت ہے۔ انکو خود بخود شریعت کے اصول، تقلید اور ہماری باتیں سمجھ میں آجائینگی۔ ان سوالوں کے جوابات پر غور فرمانے سے جو آپ کو سمجھ میں آئے گا لمبی لمبی تقریروں اور بڑی بڑی کتابوں کو پڑھنے سے آپکو سمجھ میں نہیں آسکتا۔ انسان کا دماغ گوندھے ہوئے آٹے کی طرح ہے۔ خالی الذھن ہونے یا اپنے مو

قف کا مطالعہ نہ کرنے کی صورت میں جو بھی آپکے سامنے اپنا مسئلہ اور اسکے دلائل پیش کرے گا آپ اسکا ہی ہو جائینگے خود یا اپنے استاذوں سے ان سوالوں کے جوابات پر غور کریں تو خود بخود آپ کو بات سمجھ میں آجائیگی، بلکہ پیارے بھائیو۔ میں آپ کو تاکید کرتا ہوں کہ آپ ضرور اس پر غور فرمائیں تو تقلید کے حوالے سے اختلاف خود بخود ختم ہو جائے گا۔

1- نماز کے اندر کتنے فرئض (اگر اس میں فرق آئے تو نماز ٹوٹ جائے) کتنے واجبات (اگر وہ چھوٹ جائیں تو سجدہ سہوہ لازم آئے گا) اور کتنی سنتیں ہیں تعداد بتائیں؟ کیا ابھی تک ہم کو بتایا گیا ہے یا اگر آپکے نصاب میں ایسی کتاب ہو تو نشاندہی فرمائیں؟ اور جواب پہلے قرآن وحدیث صحاح ستہ سے دیں؟ اس سوال کو ہم اس طرح بھی کر سکتے ہیں کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کو آپ فرض خیال کرتے ہیں۔ لیکن سورۃ فاتحہ کی طرح اور فرائض کی تعداد بھی آپ بتادیں، الزامی جواب سے پہلے تحقیقی جواب بھی دیں، پھر خیر الزامی جواب بھی دیں، اور اسی طرح الگ سے سوالات کی ایک لسٹ تیار کرکے ہم سے بھی کریں۔

2- فرض واجب اور سنت کی قرآن وحدیث سے تعریف بھی فرمائیں؟

3- دادی نانی کیساتھ نکاح حرام ہے؟ قرآن وحدیث سے دلیل پیش فرمائیں؟ قیاس نہ کریں کہ اصل میں بات یہ ہے کہ یہ ماں کی طرح ہے اس لئے کہ یہ بات تو نہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں؟ ۴۔ بھینس کا دودھ اور گوشت حلال ہے یا حرام؟ اگر کسی کی سو بھینیں ہوں تو سال گذرنے پر محمد ﷺ نے کتنی زکوۃ ارشاد فرمائی ہے؟

4- دادا کی میراث اور بیٹے کی عدم موجودگی میں پوتے کی کیا میراث ہے؟ اس پر مرفوع روایات کی روشنی میں بحث فرمائیں؟

6- اکیلا نمازی (مرد یا عورت) دو پیروں کے درمیان کتنی جگہ چھوڑے گا؟

7- تقلید شخصی کیا ہے (شرک یا جمود یا اندھا پن یا غلط یا نہیں ہونا چاہیئے)؟ وہ بڑے بڑے علمائے کرام جنکے ہم حدیث کے صحیح اور ضعیف کہنے میں محتاج ہوتے ہیں اور ہماری تمام لکھی ہوئی

کتب انہی علمائے کرام (ابن حجرؒ، نوویؒ، ذہبیؒ، مزیؒ، سیوطیؒ اور القطانؒ) کے ناموں اور حوالوں سے مزین ہوتی ہیں کیوں تقلید شخصی پر کاربند تھے؟

8- اجتہاد کی ضرورت جسطرح آج ہے کل بھی تھی (اور اجتہاد ہو رہا تھا اور ہو رہا ہے جسکے اپنے لوگ ہیں) تو ہم سوال یہ کرتے ہیں کہ اجتہاد پچھلے اصولوں کے مطابق فروع (مسائل) کا نکالنا (استخراج) ہوگا؟ یا نئے سرے سے اصول بنانے کی ضرورت ہے؟

9- محترم جناب! فروعی اختلافات پر کتب کے علاوہ کتنی جلدوں میں یا کوئی ایک کتاب یا کوئی کاپی یا ایک چھوٹا سا رسالہ موجودہ جدید مسائل (بزناس، ٹیسٹ ٹیوب بے بی، برتھ کنٹرول، کلوننگ، انشورنس، شئیرز، منی چینجرز، لاؤڈ سپیکر، ہوائی جہاز میں نماز وغیرہ) پر ہے؟ جو ان حضرات علماء کرام کا ہو جو صرف قرآن و حدیث کے داعی ہیں پیش فرمائیں۔ جسکی عوام کو ضرورت ہے اور وہ علماء کرام جو قرآن و حدیث اور اسلامی فقہ پر کاربند ہیں ان علمائے کرام (مفتی محمد شفیعؒ، مفتی رشید احمد لدھیانویؒ، مولانا یوسف لدھیانویؒ، مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا مجیب اللہ ندوی، مولانا خالد، مفتی نظام الدین اعظمیؒ، علام وھبۃالزحیلی وغیرہ) کے فقہی کونسلوں (جدہ فقہی کونسل، کراچی فقہی کونسل، مرکز الاقتصاد کراچی اور فیصل آباد جامعہ امدادیہ، فقہی کونسل بنوں وغیرہ) کی سینکڑوں کتب ہزاروں صفحات میں لاکھوں کی تعداد میں بار بار چھپ کر عوام اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔

10- جن کے حصے قرآن میں مقرر ہیں اگر ان سے مال بچے اور کوئی عصبہ یا ذوالرحم نہ ہو تو مال قرآن و حدیث کی رو سے کس کو ملے گا؟

11- ابوداؤد اور ترمذی مترجم اپنے سامنے رکھیں پڑھتے جائیں ایک ہی مسئلہ پر دو باب دو مختلف احادیث دو آراء دونوں طرف صحابہؓ تابعینؒ ہونگے آپ (تقلید چھوڑ کر) کس طرف جائینگے؟ جو آسان لگے یا آپ اجتھاد کرینگے تو کیا آپ عالم ہیں اور آپ میں اجتھاد کی صلاحیت ہے؟

12- اجتھاد کیلئے بڑے آئمہ دین نے کیا شرائط طے کی ہیں؟

13- ایک جید ناقد عالم دین (مثلاً ابن حجرؒ) نے فرمایا یہ حدیث ضعیف ہے اور ہم نے کہا ٹھیک ہے اور ہم کو اس عالم کی دلیل کا علم نہیں ہوتا ہے کیا یہ تقلید نہیں تو اور کیا ہے؟

14- ہم نماز روزہ حج اور زکوۃ وغیرہ کے مسائل پر عمل کر رہے ہیں ہم کو نہ ہر مسئلہ کی دلیل معلوم ہے اور نہ یہ معلوم ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے ہاں اتنا یاد ہے کہ فلانے نے یہ کہا تھا کہ اسطرح عمل کرو اسکی فلانی دلیل ہے اور (بقول اسکے) یہ صحیح ہے تو کیا یہ آجکل کے مولوی کی اندھی تقلید نہیں ہے؟ (اور تابعی کی تقلید سے یہ بہتر ہے جس نے صحابہؓ کو دیکھا)

15- ۱۸۸۸ سے پہلے ہزار سال سے زائد کوئی مسجد موجود ہے جسمیں آٹھ رکعات تراویح پڑھی گئی ہوں؟ یا پاک و ہند کی جتنی مشہور مساجد (بادشاہی مسجد لاہور، سندھ کی سینکڑوں سال پرانی مساجد، دہلی، آگرہ، کشمیر، مغل دور کی تمام مساجد) ہیں۔ کیا ان میں آٹھ رکعات تراویح کبھی بھی پڑھی گئی ہیں؟

16- اگر ایک شخص "سبحانك اللهم" کی جگہ "التحیات" یا "التحیات" کی جگہ "سبحٰنك اللهم" پڑھے تو قرآن و حدیث کی رو سے یہ شخص کیا کرے؟ سجدہ سہو کرے یا نہ؟ جواب کیساتھ دلیل بھی دیں؟

17- نیت دل کی چیز ہے (فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ زبان سے نیت کا اعتبار نہیں اصل اعتبار دل کا ہے) تو سوال یہ ہے کہ نماز کی مختلف (فرض، واجب، سنت، نفل، مختلف اوقات میں، امام کے پیچھے، اکیلے، مختلف رکعات) صورتیں ہیں تو دلیل کیساتھ فرمائیں کہ دل میں کون کونسی چیزوں کی نیت ضروری ہے؟ اور کونسی کی نہیں؟

18- کوئی ایسی آسان کتاب موجود ہے جس میں وضو، تیمم، غسل، نماز، زکوۃ، وغیرہ کے فرائض واجبات اور سنتیں ہوں؟ یا کوئی کتاب اس طرح مرتب نہیں؟ تاکہ لوگوں کیلئے آسانی ہو؟

19- حرام اور مکروہ کی تعریف قرآن و حدیث سے فرمائیں؟

20- قرآن پر اعراب، رکوع اور پارے حضور ﷺ اور صحابہؓ نے نہیں لگائے؟ اسکی تقلید درست ہے؟ کیا یہ زبر زیر پیش بالکل درست ہے؟ دلیل قرآن و حدیث سے؟

21- جنازہ کی تکبیروں کیلئے ھاتھ اٹھانے اور وتروں کی دعائے قنوت میں ہاتھوں کو دعاء کیلئے اٹھانے کی دلیل مرفوع روایت سے پیش فرمائیں؟

نوٹ: پہلے ذکر شدہ اختلافی موضوع پر جو ساتھی بحث کرے۔ اسکو دلائل دینے سے پہلے ان مذکورہ سوالات میں سے صرف چار سوالات نقل کرکے دیں اور اسکو پابند بنائیں کہ جواب قرآن و حدیث سے دیں اور الزامی جواب دینے سے قبل تحقیقی جواب دیں۔ تو اس ساتھی کو بات سمجھ میں آکر انشاء اللہ تعالیٰ اخوت اور محبت قائم ہو گی۔

کتابیات

ہر کتاب کی آخر میں کتابیات کا عنوان ہوتا ہے اور جن کتابوں سے مدد لی جاتی ہے ان کے نام ہوتے ہیں، جن کتابوں کے نام اس کتاب میں موجود ہے انہی سے ہم نے استفادہ کیا ہے، لہذا ان کتابوں کا یہاں تذکرہ کرنا فائدہ بخش نہیں ہے، لیکن جن کتابوں سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

(1)اعلاء السنن (2) نصب الرایہ (3) الدرایہ (4) مولانا حبیب اللہ ڈھیرویؒ کی کتب (5) مولانا عبد الغفار ذہبی کا تعاون (6) مولانا عطاء عمر صاحب کی کتاب " نماز نبوی کا علمی جائزہ " (7) مولانا محمد ابوبکر غازی پوریؒ صاحب کی کتب (8) ابن الحسن عباسی صاحب کا ترجمہ " وقفہ "

یہ تمام مستفادہ کتب میں سے قابل ذکر ہیں

جواب لکھنے والے حضرات کی خدمت میں

پہلی بات ہم تسلیم کرتے ہیں کہ دو طرفہ نماز درست اور احادیث سے ثابت ہے اور یہی شیخین ابن تیمیہ، ابن قیم اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور جمہور اسلاف کا موقف ہیں، اگر ہر عالم یہ لکھتا تو آج یہ مناظرے اور یوٹیوب اور فیس بک پر گالیاں نہ دی جاتی تاہم یہ کتاب اس لئے لکھی گئی کہ تشدد ختم ہو جائے اور ہم نے اپنے دلائل ذکر کردیئے کہ اس طریقے پر نماز پڑھنا بھی درست اور مدلل ہے اور ادھر بھی دلائل ہیں اور ہم نے اہل حدیث بزرگوں کے متعینہ اصول کو دیکھ کر ہی " نماز نبوی" کا جائزہ لیا مدلسین کے چونکہ طبقات ہیں اس وجہ سے ہمارے نزدیک ہر مدلس کی روایت ضعیف نہیں ہوتی لیکن انہوں نے فرمایا کہ ترک رفع یدین میں سفیان مدلس موجود ہے تو ہم نے پچاس مدلسین کی لسٹ ان کے سامنے رکھ لی کہ آپ کی فلانی فلانی روایت میں فلانا فلانا راوی مدلس موجود ہے تو پھر اس کے کیا جواب ہے؟

دوسری بات اسی طرح اہل حدیث حضرات کے نزدیک ضعیف حدیث پر عمل لازم نہیں بلکہ وہ واجب الترک ہے جبکہ اس کے صحیح شواہد نہ ہو اور اہل سنت کے نزدیک ضعیف حدیث قیاس سے بہتر ہے اور اس پر عمل کرنا مستحب ہے جیسے وضو سے پہلے بسم اللہ، گردن کا مسح، مرد عورت کی نماز میں فرق وغیرہ وغیرہ۔

تیسری بات اسی طرح 1984ء سے لیکر سے 2018ء تک میرا بار بار یہی مشاہدہ رہا ہے کہ ان حضرات کی طرف سے جمعہ کے بیانات اور گاڑیوں کے سٹیکرز وغیرہ پر یہی لکھا ہوتا تھا اور ہوتا ہے کہ بس صرف قرآن و حدیث، لیکن جب بھی مناظرے ہوئے ہیں تو ان کی طرف سے بار بار کہا گیا ہے کہ اجماع کو بھی مانتے ہیں اور قیاس کو بھی اور اس کے بعد کئی سال تقلید پر مناظرے ہوئے ایک گروہ نے کہا شرک ہے اور دوسرے نے کہا واجب ہے دو طرفہ معتدل علمائے کرام خوب جانتے ہیں کہ اس وقت تقلید شخصی کا نام نہیں لیا گیا ہے مطلّقا تقلید پر مناظرے ہوتے رہے ہیں اور آج جب اجماعی مسائل اور اجتہادی مسائل جو قرآن وسنت میں واضح نہیں ہوتے ہیں اس سے لاجوابی ہو تو اب تقلید شخصی پر مناظرے ہورہے ہیں اگر "تقلید شخصی حقیقی" ہے ہی نہیں تو کیوں ہم نے اتنے زیادہ مناظر کرتے رہیں" کھودا پہاڑ نکلا چھوہا" ہمیشہ سے ہی سارا تقلید شخصی حکمی ہے تو مناظرے ومباحثے کی ضرورت ہی نہیں ہے اس کی تفصیل تقلید کی بحث میں دیکھ لیں۔

چوتھی بات اگر بات یہی ہے کہ ہم اہل حدیث جماع، قیاس، اجتہاد اور تقلید کو مانتے ہیں تو اجماع اور اجتہاد پر ہماری کونسی کتابیں ہیں اور اجماع اور قیاس کی لغوی اور اصطلاحی تعریف کیا ہے؟ اور اجماع اور قیاس کی شرائط کیا ہیں؟ مثال کے طور پر ہماری جو یہ کتابیں ہیں "توضیح تلویح"، "نورالانوار"، "اصول الشاشی"، "حسامی" اور "اصول سرخسی" وغیرہ تو آپ حضرات کی کونسی کتابیں ہیں اصول پر؟ اب اس کے الزامی جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ ان کتابوں میں غلطیاں ہیں اور یہ ہیں او روہ ہیں بلکہ اس بات پر سوچنا چاہیئے کہ 220ھ سے لیکر 1200ھ تک ہم تاریخ کے صفحے پر کیوں نہیں ہیں نہ مفسر، نہ محدث، نہ فقیہ، نہ کمانڈر جو تقلید شخصی کو شرک کہے یا آٹھ تراویح کے قائل ہو،

لئے کہ اس دور میں جو بھی ہوگا یا تو مجتہد ہوگا یا مقلد یا مجتہد منتسب ہوگا یا شیعہ حضرات یا اصحاب الظواہر میں سے ہوگا میرے مطالعہ کے مطابق پانچویں کوئی کٹیگر نہیں ہے۔

پانچویں بات تاہم جو چیز جس درجے کی ہے اس کو اسی پر رکھنا چاہیئے اسی کے مطابق دلیل مانگنی چاہیئے، جس چیز کو فرض کہا جائے اس کے لئے دلیل قطعی الثبوت والدلالت پوچھی جائیگی، اسی طرح جس کو ہم واجب کہیں اس کے لئے دلیل حدیث مشہور یا اجماع امت سے ہوگی اور اگر کوئی مستحب امر ہے تو اس کے لئے ضعیف حدیث بھی چلے گی، اور اس پر بحث نہیں کی جائے تو ٹھیک ہے جیسے زبان سے نیت کرنا جو نہ فرض ہے نہ واجب ہے نہ سنت ہے نہ مستحب ہے جیسے کے فتاوی عالمگیری میں لکھا ہوا ہے "ولا عبرة بالذکر باللسان" (ج:1/ص:1) بلکہ وہمی کے لئے مستحب ہے۔

اور اسی طرح جس غلطی کی اطلاع آپ تمام حضرات ارشاد فرمائیں گے اس کی آئندہ ایڈیشن میں ہم اصلاح کرلیں گے انشاء اللہ اس لئے کہ فن اسماء الرجال وہ فن ہے جس میں تمام بڑوں بڑوں سے پھسلن ہوئی ہے، چاہے ابن حجر عسقلانی ہے یا البانی یا امین اکاڑوی ہو یا علامہ عینی بلکہ امام بخاری تک کے اوہام موجود ہیں:

امام بخاری چوٹی کے محدث اور عظیم ذہین ہیں مگر ان سے بھی جلت سے اوہام اور اغلاط ہوئے ہیں تو ہم کون ہیں؟ لیکن ہمارے زمانے کے علماء نے کتابیں لکھی اور کہا ہم اس میں صرف "صحیح احادیث" جمع کی ہیں لیکن جب جائزہ لیاگیا تو..... تاریخ کبیر میں راویوں کے سلسلہ میں جو ان سے اوہام واقع ہوئے ہیں اس پر امام ابو حاتم نے قلم اٹھایا ہے حتی کہ ان کے بیٹے عبد الرحمٰن بن ابی حاتم نے ان اغلاط کو "خطاء البخاری" کے نام سے کتاب مرتب کرکے جمع کردیا ہے اور دوسرے ائمہ رجال نے بھی موقع بموقع ان اغلاط پر تنبیہ کی ہے۔

وہم 1: حافظ ابن حجر لکھتے ہیں" نافع بن الحارث حدث عنه زیاد بن المنذر قال البخاری لم یصح حدیثه وہو کوفی، ولکن قول البخاری ہنا انه کوفی یرد علیه لان اباداؤد بصری.

(لسان المیزان، ج: 6/ص:145)

نافع ابن الحارث ابو داؤد ایک راوی ہے اس سے زیادہ بن منذر راوی نے حدیث بیان کی اور امام بخاری فرماتے ہیں کہ اس کی حدیث صحیح نہیں ہے یہ کوفی ہے، لیکن امام بخاری کا اس مقام پر اس کو کوفی کہنا درست نہیں ہے کیونکہ ابو داؤد بصری ہے کوفی نہیں۔

وہم 2: امام بخاری نے ایک راوی محمد بن عمران نامی پر جرح کی ہے علامہ ذہبی فرماتے ہیں "کذا سماہ البخاری وہو احمد بن عمران" (میزان الاعتدال، ج: 3/ ص: 673) امام بخاریؒ نے اس کا اس طرح نام لیا ہے حالانکہ اس کا نام احمد بن عمران ہے۔

وہم 3: ایک راوی ہے حرام بن حکیم جو ایک حدیث ذکر کرتا ہے لیکن درج والے ایک راوی نے اس روایت کی دوسری سند میں غلطی سے اس کا نام حرام بن معاویہ کہہ دیا تو امام بخاری نے ان کو دو مرد الگ الگ سمجھ کر دو راوی سمجھ لئے ہیں، چنانچہ علامہ احمد شاکر غیر مقلد فرماتے ہیں " فظنه البخاري رجلين قال الخطيب ووهم البخاري في فصله بين حرام بن حكيم وبين حزام بين معاويه لانه رجل واحد . (تعلیقات شاکر علی الترمذی، ص: 194)

امام بخاریؒ نے ان کو دو شخص سمجھ لیا ہے خطیب بغدادی فرماتے ہیں کہ حرام بن حکیم و حرام بن معاویہ کے الگ کرنے اور دو راوی سمجھنے میں امام بخاری سے بھول ہوئی ہے کیونکہ یہ ایک شخص ہے دو نہیں۔

وہم 4: ترجمہ: عطاء فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کی وہ زوجہ جس کی آپ ﷺ باری مقرر نہیں کرتے تھے وہ صفیہؓ تھیں، اور وہ سب ازواج مطہرات میں سے آخر میں مدینہ منورہ میں فوت ہوئیں (بخاری، مسلم) اور محدث زرین نے کہا کہ عطاء کے علاوہ دوسرے حضرات سودہؓ کے متعلق کہتے ہیں اور یہی زیادہ صحیح ہے۔

اب بخاری و مسلم کی روایت میں دو وہم واقع ہوتے ہیں:

(1) حضرت صفیہؓ کی باری مقرر نہیں تھی۔

(2) ااور دوسرا یہ کہ حضرت صفیہؓ سب سے آخر میں فوت ہوئیں، حالانکہ صحیح یوں ہے کہ حضرت سودہؓ کی باری مقرر نہ تھی کیونکہ انہوں نے اپنی باری حضرت عائشہؓ کو ہبہ کردی تھی اور حضرت صفیہ آخر میں فوت نہیں ہوئی کیونکہ وہ 50 ہجری میں فوت ہوئی ہیں اور حضرت سودہؓ 55 ہجری میں حضرت عائشہ 57 ہجری میں حضرت ام سلمہؓ 62 میں فوت ہوئیں۔

وہم 5: بخاری شریف (ج:1/ ص: 489) میں ہے" عن مجاہد عن ابن عمر قال قال النبی رأیت عیسي وموسي (الحدیث) ابن عمر لکھا گیا ہے اور بخاری شریف کے تمام نسخوں میں اس طرح لکھا ہوا ہے حالانکہ ابن عمر کے بجائے ابن عباس صحیح ہے۔ (فتح الباری، عینی)

چھٹی بات واضح رہیں کہ تقلید کے حوالے سے جو سوالات ہم نے صفحہ نمبر 984 پر کیے ہیں، پہلے ان پر غور کیا جائے اور ان کے جوابات دیئے جائے اور 1880ء سے پہلے اور 220 ہجری کے بعد کہ دس مفسرین، دس حدیث کے شارحین اور تقریبا ایک ہزار سال مختلف سلطنتوں پر آپ کی کتنی حکومت رہی اور اصول حدیث، اصول تفسیر، اصول فقہ، صرف، نحو، بلاغت، ادب، وغیرہ پر اپنی دس دس کتب کی نشاندہی فرمائیں اور خاص بات یہ ہے کہ نماز نبوی میں علامہ البانیؒ سے منقول ہے کہ نماز کی فرائض کا معلوم کرنا لازم ہے اور یہی بات سعودیہ سے چھپنے والی تفسیر میں بھی لکھی گئی ہیں، کہ نماز کے اندر کتنی فرائض ہیں؟ کتنے واجبات ہے؟ کتنے سنتیں ہے؟ کتنے مستحبات ہے؟ یہ جاننا چاہیئے اور اسی طرح امام بخاری نے فرائض، واجبات، سنن اور مستحبات کے الگ الگ باب باندھے ہیں، تو پورے فرائض اور سنتیں بھی بتائیں کہ کتنی کتنی ہیں؟

میری یہ کتاب بھی ایک غیر معصوم انسان کی ادنی کوشش ہے اس میں غلطیوں کا پایا جانا بعید از امکان نہیں جو متنبہ فرمائے گا میں اصلاح کروں گا اور اس کو دعا دوں گا۔ والسلام

یاداشت

صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي

(نماز ایسے پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو)

نبی کریم ﷺ کے درج بالا ارشاد گرامی کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کتاب میں صحیح مستند احادیث کی روشنی میں اس مسنون نماز کا طریقہ پیش کیا گیا ہے جو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ پڑھا کرتے تھے۔ اس کتاب میں مسائل طہارت، غسل، وضو اور تیمم کے علاوہ تمام فرض اور نفل نمازیں، مثلاً نماز جمعہ وعیدین، نماز کسوف، نماز استسقاء، نماز اشراق، نماز استخارہ، میت کی تجہیز وتکفین اور نمازِ جنازہ کے بارے میں صحیح احادیث کے ذریعے رہنمائی کی گئی ہے۔

رب کریم کی بے پایاں اور لامحدود حکمتوں (جن کا احاطہ کرنا محدود عقل انسانی کے بس کی بات نہیں) کے تحت دورِ نبوت میں بعض احکام شرع میں تدریجاً تبدیلی آتی رہی، ان احکام میں نماز کے بعض اجزاء بھی تھے۔ معاملہ تحویل قبلہ کا ہو یا نماز میں چلنے کا، حالت نماز میں جوابِ سلام ہو یا کسی چیز کا اشارہ...... تقریباً سبھی کا ثبوت احادیث صحیحہ سے ملتا ہے، تاہم تمام ذخیرۂ حدیث کو سامنے رکھا جائے، تو یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ مذکورہ بالا چیزیں ابتداء میں ایک معتدبہ وقت تک ہوتی رہیں، جنہیں بعد میں تدریجاً بحکم وحی تبدیل یا ترک کر دیا گیا۔

تبدیلیٔ حکم کے بعد ان کا جواز نہیں رہتا، چہ جائیکہ اُن کو مسنون کہنا۔ اس لئے مسنون نماز کی تلاش میں صرف روایات حدیث کا صحیح ہونا کافی نہیں، بلکہ صحیح اُصول دین کی روشنی میں جو عمل اور طریقہ آپ ﷺ کا آخری ہوگا، جسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نقل کیا اور ان کے بعد جمہور امت نے اپنایا وہی "مسنون" کہلائے گا۔

اُس دور میں کوئی نیا حکم سب لوگوں تک پہنچانے کے لیے وہ تیز ترین ذرائع ابلاغ میسر نہیں تھے جو آج کے دور میں ہیں، یہی وجہ ہے کہ فروعی مسائل میں اختلاف صحابہ کرامؓ کے زمانہ سے لیکر عصر حاضر تک چلا آرہا ہے، اور تا قیامت چلتا رہے گا۔ جن صحابہ کرامؓ نے ابتدائے اسلام میں نماز کا طریقہ سیکھا، پھر دوبارہ تشریف نہ لائے، یا آخری دور تک ساتھ نہ رہے، وہ اُسی طریقہ کی تبلیغ واشاعت کرتے رہے، حالانکہ اس دوران بہت سے احکام میں تبدیلیاں آچکی تھیں۔ لیکن کسی ایک جانب کو بھی کبھی "منکر" کہا گیا اور نہ کہا جاسکتا ہے کہ جس پر نکیر کی جائے۔

ان فروعی اختلافات کو اُتنا ہی مقام دینا چاہیے جتنا صحابہ کرامؓ دیا کرتے تھے، ان مسائل کو تکفیر یا سرے سے نماز نہ ہونے کا مسئلہ اُنہوں نے کبھی نہیں بنایا۔ ایسا ہر دور میں یا تو جہلاء نے کیا یا پھر اسلام دشمن قوتوں نے اس بحث کو بطورِ ہتھیار اسلام کے خلاف استعمال کیا، سو اس ذہنیت سے بچنے کی ضرورت ہے اور وسعت نظری وقلبی کے ساتھ حتی المقدور اُمت میں اتحاد، اتفاق اور باہمی محبت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

ادارہ الدلیل ٹرسٹ

[illegible] 7 [illegible] 2

[illegible] راولپنڈی پاکستان